ماہنامہ

شاہکار لاہور

اکتوبر
۱۹۴۰ء

قیمت فی پرچہ چھ آنہ (۶)

نگران
شمس العلماء علامہ تاجور

نگارش
اختر شیرانی

جلد ۱۲ — فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء — نمبر ۱

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار
لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار محمدی منزل واقع محمد الدین سٹریٹ فلیمنگ روڈ
لاہور سے شائع کیا

مختصرات

اشتعالِ محرومی

میں ڈھائی ماہ کشمیر میں بسر کر کے ستمبر کے آخری ہفتے لاہور پہنچا ہوں۔ فہرست خطابات کا علم بھی مجھے کشمیر ہی میں ہوا قیامِ کشمیر کا زیادہ حصہ تہنیت ناموں کے جوابات دینے میں صرف ہو گیا پھر بھی یہ کام ختم نہ ہو سکا۔ اب تک میں صرف ان اربابِ کرام کے نامہ ہائے کرم کا جواب دے سکا ہوں جن کے متعلق مجھے اندیشہ تھا کہ تاخیرِ جواب انہیں مجھ سے سرگراں کر دے گی۔ ان بے شمار احباب کے خطوط ابھی تک "جواب طلب" خریطوں میں بند پڑے ہیں جو مجھے بجا طور پر اپنی ہر ادا کا خریدار تصور کرتے ہیں۔

میں اس قدر افزائی کی تقریب پر جہاں ایک طرف ملک کے ہر گوشے اور ہر طبقے کے اہلِ نظر نے بے امتیازِ مذہب و ملت اپنے بلند نعرہ ہائے مسرت سے ماتم پرستوں کی خفیف فریاد کو نقار خانے میں طوطی کی آواز بنا دیا ہے وہاں الشاذ کالمعدوم کی ناقابلِ توجہ حیثیت کے مالکوں کے حق میں یہ خبر کچھ توقع سے بڑھ کر سکوں سوز ثابت ہوئی۔ ان میں جن حضرات کے ظرف وسیع تھے وہ تو "رضینا بالقضاء والصبر جمیل" کہہ کر کسی نہ کسی طرح اس ضبط آزما مصیبت کو جھیل گئے۔ اور جن کی درد ناشناس فطرت یارائے ضبط سے منزہ تھی، وہ اس چوٹ کو نہ سہ سکے، بلبلا اٹھے۔

مجھے ان تمام اصحاب سے ہمدردی ہے خصوصاً ان ماتم کار حضرات سے جن کے قلب و جگر نے اس زخم کو ناسور بنا لیا ہے

ایک لاہوری معاصر جس کا حلقۂ اشاعت سکڑتے سکڑتے اب سرکاری دفاتر کے ردی خانوں تک محدود ہو چکا ہے اس خطاب کو حکومت کی غلط بخشی پر محمول کرتے نہیں تھکتا۔ میں خوش ہوں کہ زندگی میں پہلی بار اسے حکومت کے طرزِ عمل کے خلاف آواز اٹھانے کی توفیق نصیب ہوئی، اور دعا کرتا ہوں کہ حکومت اپنے شیوۂ غلط بخشی کو انتہائی وسعتیں دے کر اس بیچارۂ صفِ نعال کو بھی کسی چھوٹے موٹے خطاب سے سرفراز بنا دے۔ (باقی آئندہ)

تاجور

تقریبِ خطابِ تہنیت و تبریک پیش کرنے والے

حضرات کرام کے اسمائے گرامی

۱۶۷- علامہ اجل مولینا میمن عبدالعزیز صاحب صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۶۸- مولینا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم - اے، فاضل دیوبند — مدیر رسالہ برہان دہلی -

۱۶۹- مولینا نیاز فتح پوری مدیر رسالہ نگار لکھنؤ -

۱۷۰- ڈاکٹر حمید خاں عوزی پی، ایچ، ڈی، انسپکٹر مدارس راولپنڈی

۱۷۱- میاں محمود حسن صاحب قبلہ بی، اے، ایس ڈپٹی ڈویژنل انسپکٹر مدارس راولپنڈی ڈویژن -

۱۷۲- ملک محمد حسین صاحب قبلہ ایم - اے بی - ای - ایس - ڈپٹی ڈویژنل انسپکٹر مدارس ملتان ڈویژن -

۱۷۳- رائے بہادر لالہ برکت رام کھوسلہ ایڈووکیٹ فیروزپور -

۱۷۴- خواجہ عزیز الدین احمد صاحب بی - اے - بی ٹی - بی - ای ایس - انسپکٹر مدارس سیالکوٹ -

۱۷۵- پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم - اے ایم او - ایل - ایل ایل بی - دیال سنگھ کالج لاہور -

۱۷۶- ایم عطاء اللہ صاحب کلیم ایم - اے ملٹری اکاؤنٹ آفیسر راولپنڈی -

۱۷۷- مولینا عبداللہ منہاس سابق ایڈیٹر اخبار وکیل -

۱۷۸- پروفیسر امرناتھ جھبین ایم - اے ماڈل ٹاؤن - لاہور

۱۷۹- پروفیسر پنڈت جے چند ایم - اے - ایم - او - ایل - شاستری (فاضل گروکل ہردوار) گوالمنڈی لاہور -

۱۸۰- پروفیسر پی - این پنڈت ایم، ایس - سی، لاہور

۱۸۱- خان عزیز اللہ خانصاحب ایم - اے، بی ٹی - گورنمنٹ ہائی اسکول عدن -

۱۸۲ لالہ گلزاری لال - بی - اے منشی فاضل اینڈ کمرشل کمپنی احمد آباد (گجرات)

۱۸۳- شیخ نذیر احمد قریشی بی - اے - بی ٹی سپرنٹنڈنٹ ایم - بی سکولز امرتسر -

۱۸۴- ڈاکٹر عبدالحکیم بسمل انچارج پولیس اسپتال ہوشیارپور -

۱۸۵- خواجہ غلام محمد صاحب بی - اے - ایل - ایل - بی سری نگر -

۱۸۶- لالہ مدن لال مدگل دیال سنگھ کالج لاہور

۱۸۷- مولینا محمد نصیر ہمایوں بی - اے - مالک قومی کتبخانہ لاہور

۱۸۸- ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب ایڈیٹر اخبار سدا بہار لاہور -

۱۸۹- مسٹر مسعود محمود بارنس کورٹ -

۱۹۰- مسٹر اعجاز حسین بٹالوی - بٹالہ ضلع گورداسپور

۱۹۱- سردار درشن سنگھ بی - اے (آنرز) منٹگمری

۱۹۲- مولینا سید اختر حسین تاباں بریلوی ماڈل ٹاؤن ہائی اسکول لاہور -

۱۹۳- مولینا محمد شاہ خانصاحب منشی فاضل، ادیب فاضل ایم، بی - کنڈ منٹ ہائی اسکول انبالہ چھاؤنی -

۱۹۴- سردار محمد اکرام خانصاحب رئیس واہ ضلع اٹک

۱۹۵ محترمہ وزیر بیگم ضیا ادیب فاضل مؤلف "لغات نسواں" اعوان منزل - لاہور

۱۹۶- آنسہ گوہر سلطان - ادیب فاضل -

۱۹۷- مولینا حمید اللہ خاں صاحب منشی فاضل ادیب فاضل ڈی - بی - ہائی اسکول دیال پور -

۱۹۸- مولینا نذیر احمد خانصاحب اسسٹنٹ لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لائبریری - لاہور

۱۹۹- منشی عنایت کریم صاحب خوشنویس - لاہور

۲۰۰- مسٹر حسن عفیفی سہروردی -

۲۰۱- شاہ سید مسعود اقبال مسعود لاج میرٹھ -

۲۰۲ مولوی محمد عاشق صاحب خطیب مسجد مزنگ لاہور

۲۰۳ - شیخ عبدالرحمٰن صاحب منیجر عالمگیر پریس - لاہور -

۲۰۴ - منشی عبدالشکور خاں صاحب خوشنویس - لاہور -

اقتباسات نامہ ہائے تہنیت و تبریک

مولینا عبدالعزیز المیمن صدر شعبہ عربی جامعہ اسلامیہ علی گڑھ

" ـــــــ ہر چند جسمانی طور پر دور رہا مگر جب کوئی اثر رشحۂ قلم نگاہ سے گزرا فوراً آپ کی یاد تازہ کر گیا -

إنّا على البعاد والتفرق : لنلتقي بالذكر ان لم نلتق

اس پندرہ سال (۲۵ - ۴۰ء) یعنی ٹھیک بری مدت قیام علیگڑھ یا لعدازہ لاہور میں خدا جانے کر کے کہیں وہ حقیقت جو آج سے بہت بہت پہلے آپ کے دل دادگان آثار قلم کو معلوم تھی گورنمنٹ کو اب معلوم ہو رہی ہے - بہرحال صبح کا بھٹکا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھٹکا نہیں کہا جا سکتا -

محض ہندوستان کے قدر دانان ادب و فن ہی پر آپ کا علمی احسان نہیں تھا - بلکہ تعلیمی ادارہ میں ایک طویل عمر گذارنے کی وجہ سے بھی آپ نے علوم مشرقیہ کی نہایت گراں قدر خدمت کی تھی -

اس لئے میں تہ دل سے لقب شمس العلماء کے عطا ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں -

ایڈیٹر برہان قرول باغ دہلی -

" ـــــــ میرے نزدیک آپ ایسے فاضل دلیہ بند کو شمس العلماء کے خطاب کا ملجانا آپ کے لئے کوئی قابل فخر اعجاز نہیں ہے لیکن اسی دنیا میں اور خصوصاً جس " ماحول " میں آپ رہتے ہیں کثرت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی انسان کی قدر و منزلت کا اندازہ سرکاری خطابات سے کرنے کے عادی ہیں اور اگر اس قسم کی کوئی چیز ان کے سامنے نہیں تو وہ ارباب علم و ادب کی فطری قابلیتوں پر رشک و حسد کی دھول اڑانے کی کوشش کرتے ہیں - آپ کے خطاب سے ان لوگوں کو بڑی مایوسی ہوگی ہوگی - ورنہ سچ یہ ہے کہ عرصہ دراز سے آپ پنجاب میں اردو زبان و ادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ایک نہیں بلکہ دس سرکاری خطابات سے بھی کہیں زیادہ آپ کے لئے باعث فخر و سرمایہ نازش ہیں - بہرحال میری طرف سے اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی جانب سے آپ اس خطاب پر اس لئے مبارکباد قبول کیجئے

کہ گویا شمس العلماء کا خطاب دیکر گورنمنٹ نے بھی آپ کی لسانی و ادبی خدمات پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے - دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از بیش ادبی خدمات کی توفیق عطا فرمائے - اور آپ آجکل کے عام سرکاری خطاب یافتہ حضرات کی طرح " عافیت کوش " ہو کر نہ بیٹھ جائیں - "

خان بہادر راجہ فاضل محمد خاں صاحب ریٹائرڈ ڈویژنل انسپکٹر مدارس

" ـــــــ ہم سب کو آپ کے شمس العلماء بننے پر دلی راحت ہوئی - یہ امتیاز مدتوں پہلے آپ کا حق تھا - مگر دیر آید درست آید - اس کے ساتھ تو وانت گھسائی - نہیں نہیں " قلم فرسائی " کا نقد معاوضہ بھی ہوتا ہے - اللہ تعالے آپ کو اس سے زیادہ عزت کا مستحق بنائے "

مولینا سید اختر حسن صاحب بی - اے بی ٹی ہیڈ ماسٹر ایم - بی ہائی اسکول بٹالہ و صدر پنجاب ٹیچرز لیوریڈ -

" ـــــــ مولینا پنجاب کے چند برگزیدہ فاضل علماء میں سے ہیں آپ کا تبحر علمی اسقدر عمیق ہے کہ جن اشخاص کو آپ کی ہمنشینی کا شرف حاصل ہے جانتے ہیں کہ آپ فارسی و عربی کے قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ پایہ کے ادیب اور علوم قرآن و فقہ پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں - آپ مدت مدید سے زمانہ کی ناہمواری کے شکار رہے ہیں حکومت نے ان کو یہ خطاب عطا کر کے ان کے حلقۂ اثر کو شکر گزاری کا موقع دیا ہے اور مولینا کی حوصلہ افزائی کی ہے - ہم مولینا کو صمیم قلب سے شمس العلماء بنائے جانے پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں -

مولینا سید علی اختر صاحب اختر حیدر آبادی

" ـــــــ شمس العلماء آپ کے لئے کیا ہے - آپ کی صفات اتنی بلند ہیں کہ دنیا سمجھ بھی نہیں سکتی - بہرحال دنیا کا یہ شیوہ ہے - تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں -

شفاء الملک زبدۃ الحکماء حکیم محمد حسن قرشی

" ـــــــ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے - دعا ہے کہ خداوند کریم آپ کے علمی و ادبی افادات میں بیش از بیش اضافہ کرے

اور آپ کو مزید سربلندیوں اور کامرانیوں سے بہرہ اندوز کرے۔"

ملک محمد حسین صاحب ایم۔اے پی۔ای۔ایس۔ ڈپٹی ڈویژنل انسپکٹر مدارس ملتان ڈویژن۔

"مخدومی و مکرمی جناب علامہ صاحب زاد لطفکم

سلام مسنون۔ سرکار عالیہ کی طرف سے آپ کو شمس العلماء کی عطائیگی پر جسقدر سچی اور روحانی خوشی مجھے حاصل ہوئی۔ وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ذات کی نسبت سے اس خطاب کی قدر و منزلت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

ارادہ تھا کہ لاہور حاضر ہو کر مبارکباد عرض کروں مگر بمصداق اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ یہ عزم شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا اور نہ ہی اس "فسخ عزم" سے "عرفان ربی" میں اضافہ نصیب ہوا۔ وائے کم بختی! اگست کے شاہکار میں آپ کے قیام کشمیر کی بابت پڑھا اس لئے برگ سبز پر چند سیاہ دانے پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ نسیم باغ کے باسیوں کو ملتان کے باسیوں کا بھی کچھ علم ہو سکے۔ اگرچہ اہل بہشت کو قرب کے باوجود دوزخیوں کی صحیح حالت کا احساس کیسے ہو سکتا ہے۔ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے علم و ادب کے ذریعے بیش از بیش قوم اور ملک کی خدمت کرنے کا موقعہ دے اور تمام ادبا فضلا، علماء وغیرہم کے سروں پر آپ کا سایہ دیر تک قائم رکھے۔ آمین۔

مسٹر عاشق حسین بٹالوی بی۔اے ایل۔ایل۔بی وکیل۔ اسسٹنٹ سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ۔

"— میں مبارکباد دینے والوں میں بہت پیچھے ہوں لیکن خلوص کے اعتبار سے آپ کے نیازمندوں کی فہرست میں سب سے آگے ہوں۔

غالب کی زبان میں اسی کو مبارکباد سمجھئے ؎

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں ؟
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں ؟

مولینا حکیم رضوان احمد صاحب قید پروفیسر طبیہ کالج دہلی۔

"— حقیقت یہ ہے کہ اس خطاب سے آپ کی عزت نہیں بڑھی بلکہ اس خطاب میں آپ کی ذات سے چار چاند لگ گئے۔

ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب بسمل انچارج پولیس ہسپتال ہوشیارپور۔

"— شمس العلماء مولینا تاجور کی خدمت میں ڈاکٹر بسمل ہوشیارپوری کی طرف سے ہدیۂ عقیدت و مبارکباد خطاب قبول ہو۔

حاسد نامراد کی پھبتیوں کو سوزش نہانی پر محمول فرمائیے گا ؎

حسد با اہل حسد کارے کند صائب
چنانکہ آتش سوزندہ سے خورد خود را

ان کو کسی مزید سرزنش کی ضرورت نہیں۔

پروفیسر بہاری لال آنند دیال سنگھ کالج لاہور

"— حکومت ہند اور ملک نے آپ کی علمیت۔ لیاقت اور خدمت علم و ادب کی وہ قدر کی ہے جس کے آپ واجبی طور پر مستحق ہیں اور یہ شمس العلماء کا اعزازی خطاب دیکر آپ پر کوئی بڑا احسان نہیں کیا گیا۔ میں آپ کو دل سے اس خوشی کے موقع پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ کی عزت افزائی سے کالج کی اور کالج کے خادموں کی جو عزت ہوئی ہے۔ اس کا بھی میں اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پروفیسر جیت سنگھ سیتل ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل منشی فاضل دیال سنگھ کالج

آج گلشن ہے ہمکنار بہار
ہو چکا ختم انتظار بہار

اب تک تو آپ ہمارے دلوں میں مثل آفتاب منور تھے۔ اب ایک زمانہ آپ کے شمس الانوار سے فیض یاب ہو گا۔ بے خودی میں یہ دعا منہ سے نکل جاتی ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

الحمد اللہ آج کے آفتاب نے آپ کے شمس کو ظاہر کیا۔ نتیجی تو آج تجلی بارہی ہزار گنا تھی۔ کاش کہ شاعر ہوتا اور آج ایک لمبا چوڑا قصیدہ لکھ کر روانہ کرتا۔

آپ ہمارے مہربان ہی نہیں استاد بھی ہیں۔ بندہ کے دل میں آپ کی عزت و احترام پہلے دن سے جاگزیں ہو چکی ہے۔ آپ کے نام سے کالج کا نام بھی روشن ہو گیا۔

صد ہزار مبارک ہو۔ یہ خطاب کوئی رائے بہادری یا خان بہادری کا نہیں۔ یہ علم و ادب کی قدر شناسی اور ادنیٰ قیمت ہے۔ ہم لوگ جتنا بھی اس پر فخر کریں بجا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں ؎

دل میں طوفان ہا و ہو بھی ہے
سر میں سودائے رنگ و بو بھی ہے

آپ کا حقیر شاگرد پروفیسر جیت سنگھ سیتل

پروفیسر رام سروپ کوشل ایم۔ اے (انبالہ)

"آج آپ کا نام نامی خطاب یافتگان کی فہرست میں دیکھ کر جسقدر خوشی مجھے ہوئی ہے۔ شاید ہی کسی کو ہوئی ہو۔ اس کے کئی وجوہات ہیں۔

(۱) آپ میرے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں۔

(۲) جسقدر خدمت اردو علم و ادب کی آپ نے انجام دی ہے اور کس نے کی ہوگی؟

(۳) آپ اس سے بھی بڑے خطاب کے مستحق تھے اور کچھ شک نہیں، آج سے بہت عرصہ پہلے۔

(۴) گورنمنٹ ادبا کا حق بھی کچھ کچھ پہچاننے لگی ہے۔

بہرحال اس نہایت مبارک موقع پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

مولانا تاباں بریلوی۔ ماڈل ہائی اسکول ماڈل ٹاؤن لاہور۔

"میں نے خطاب کے متعلق اخبار میں پڑھا تھا اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ مضامین بھی پڑھے جو آپ کی مدح میں لکھے گئے تھے۔ یہ احساس کہ خطاب نے آپ کے مخالفوں کو خوب خوب تڑپایا ہے۔ اب بھی میری مسرتوں میں بے انتہا اضافہ کا باعث ہو رہا ہے"

کپتان ڈاکٹر سید بشیر حسین صاحب۔ ایم۔ ڈی۔ جالندھر چھاؤنی

"۱۸-۱۹۱۷ء کا ایک شاگرد اپنے محترم استاد کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرنے کیلئے حاضر ہوتا ہے۔ شاید کہ آپ اسے بھول چکے ہوں۔ مگر وہ آپ کی محبت اور شفقت کو نہیں بھولا۔ اس کا نام بشیر حسین سید ہے اور وہ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب کا لڑکا ہے۔

دعا ہے کہ خدا آپ کو عمر دراز عنایت فرمائے تاکہ آپ اس اعزاز کو جو کہ آپ کی خدمات کا ادنیٰ صلہ ہے۔ ہر رنگ میں مفید بنا سکیں۔

آر۔ پی۔ کھوسلہ۔ بیرسٹر ایٹ لاء۔ مزنگ روڈ۔ لاہور

مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ گورنمنٹ نے آپ کو خطاب عطا کیا ہے جس کے آپ ہر طرح مستحق تھے۔

آپ کے ادبی کمالات نزدیک و دور مشہور ہیں، مشرقی ادب اور کلچر میں جو چیز بہترین ہے۔ اسے ملک نے آپ کی ذات میں دیکھ لیا ہے۔ نہایت خوشی کا مقام ہے کہ گورنمنٹ نے بھی آخرکار آپ کے کمالات کو تسلیم کر لیا ہے۔

چودھری دیوا سنگھ صاحب ایم۔ اے بی۔ ای۔ ایس انسپکٹر مدارس رہتک

"میں آپ کی اس عزت افزائی کیلئے جو گورنمنٹ کی طرف سے ہوئی ہے۔ تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ اس کے مستحق ہیں۔ بلکہ آپ اس سے بھی زیادہ عزت کے مستحق ہیں۔ اس کے لئے ہر بشر۔ ہندو، مسلمان یا سکھ شہادت دیگا۔ خدا آپ کی عمر کو دراز کرے کہ آپ اس عزت سے زیادہ عرصہ تک خوشی حاصل کرتے رہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ عزت کو پا سکیں۔

لالہ پیارے لال شاکر ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل۔ بی ٹی منشی فاضل

ادیب فاضل آنرز ان پنجابی ایم۔ بی ہائی اسکول پٹھانکوٹ۔

"تہ دل سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ "خان بہادر" کا خیال تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ میں تو آپ کے بارے میں شمس العلما کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ زہے نصیبے آپ کا نہیں بلکہ میرا خواب پورا ہوا ہے"

قرارداد تہنیت مجلس ادب پشاور

پشاور ۳ اگست ۱۹۴۰ء۔ آج شب کے آٹھ بجے جناب کاوش تابانی کے دولتکدہ پر "مجلس ادب" کی مجلس عاملہ کا ایک خاص اجلاس حضرت "سراج الشعراء" حکیم ضیاء الوارثی بالقابہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں دنیائے ادب کے محسن اعظم حضرت علامہ احسان اللہ خاں تاجور مدظلہ (نجیب آبادی) کو "شمس العلماء" کا خطاب ملنے پر انتہائی طور پر اظہار انبساط و مسرت کیا گیا۔ ہم "پراونشل مجلس ادب" کی طرف سے حضرت علامہ ممدوح کی خدمت اقدس میں ہدیۂ تبریک تہنیت پیش کرتے ہیں۔ نیز دوران اجلاس میں قبلہ ضیاء الوارثی نے ایک رباعی ارتجالاً ارشاد فرمائی وہ نذر ہے۔

"شمس العلماء" ہوئے ہیں، احسان اللہ
بارک اللہ ثم بارک ... اللہ
اس درجہ ہے پر مسرت مآل الہام
یہ دور نشاط گاہ ہے واللہ باللہ

قرارداد تہنیت انجمن تعمیر ادب لاہور

آج بتاریخ ۳ اگست ۱۹۴۰ء "انجمن تعمیر ادب" مزنگ لاہور کا ایک اجلاس خصوصی منعقد ہوا جس میں حسب ذیل قرارداد بالاتفاق رائے منظور کی گئی۔

انجمن تعمیر ادب مزنگ لاہور کا یہ جلسہ حضرت علامہ تاجور

بخیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور کو شمس العلماء کا گرانقدر خطاب ملنے پر ان کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا اور حکومت پنجاب بالخصوص آنریبل میجر سردار سر سکندر حیات خاں بالقابہ وزیر اعظم پنجاب کا شکریہ ادا کرتا ہے جن کی نگاہ معارف پرور نے اردو ادب شعر اور مشرقی علم و فن کی قدر کرتے ہوئے اردو دنیا پر یہ احسان فرمایا۔

محرک: احسان دانش ناظم انجمن تعمیر ادب مزنگ لاہور

موید: توقیر طاہر سکرٹری شعبہ تصنیف و تالیف انجمن ہذا

" : جمیل حسین ظفر ملتانی رکن ادارہ تعمیر ادب "

جناب عزیز الدین احمد صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی۔ پی سی۔ ایس

ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز (سیالکوٹ)

ــــــ آپ کے اعزاز پانے کی دلی مسرت ہوئی۔

ایک بار دل نے چاہا کہ حاضر خدمت ہو کر مبارکباد عرض کروں مگر افسوس آپ نہ مل سکے۔

دل تو نہیں چاہتا کہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر ایسے قابل قدر اعزاز کی تہنیت لکھوں مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اگر میں اس موقعہ پر جلد ہی نیاز حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو شاید آپ مل جاتے مگر اس وقت میں خود بیمار تھا۔

دیر سے خط لکھنے کی وجہ سے کم از کم یہ مصلحت تو ضرور ہو گی۔ کہ آپ تہنیت ناموں کے انبار سے پیچھا چھڑا چکے ہوں گے اور اس خط کو آرام سے پڑھ سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر خط پہلے لکھ دیتا تو آپ اس کو پڑھنے کی فرصت ہی نہ پا سکتے۔

میری طرف سے ایک بار پھر مبارکباد قبول فرمائیے۔

جناب محمد یوسف صاحب قریشی بی۔ اے۔ بی ٹی۔ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول لالہ موسیٰ۔

ــــــ جناب والا کی خطاب یافتگی شمس العلماء پر دلی خلوص سے ہدیہ تبریک و تہنیت پیشکش ہے۔ امید ہے شرف پذیرائی عطا ہو گا۔ اللہ تعالےٰ مزید ترقی جاہ و حشم عطا فرمائے۔

اساتذہ و طلباء اسلامیہ ہائی اسکول لالہ موسیٰ سے بھی مبارک قبول ہو۔

ہدیہ تبریک و تہنیت

آج ہیڈ ماسٹر صاحب قریشی محمد یوسف صاحب بی۔ اے بی۔ ٹی سکول ہذا نے صحن سکول میں جلسہ منعقد کیا۔ جس میں طلبہ و اساتذہ اسکول جمع تھے۔ آپ نے حاضرین جلسہ کو مطلع فرمایا کہ امسال حضور ملک معظم کے جشن دن کی تقریب پر۔

(۱) شیخ محمد شریف صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن سابق انسپکٹر آف سکولز راولپنڈی ڈویژن کو "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا ہے۔

(۲) مولانا احسان اللہ خاں صاحب تاجور مدیر "شاہکار" کو "شمس العلماء" کا خطاب عطا ہوا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ مندرجہ بالا ہر دو شخصیتیں واقعی قابل عزت اور حقدار صد اعزاز ہیں۔ مندرجہ بالا خطابات ان کی شخصیت کا حقیقی اعتراف ہے۔ گورنمنٹ عالیہ نے ہر دو صاحبان کو خطابات عطا کر کے اپنی قدر دانی اور مردم شناسی کا زندہ ثبوت دیا ہے۔

حاضرین جلسہ نے ان مسرت افزا خبروں کو سنکر دلی مسرت کا اظہار کیا اور بہ اتفاق رائے پاس ہوا کہ مذکورہ کارروائی کی ایک نقل اخبار احسان میں بغرض اشاعت بھیجی جائے اور ایک ایک نقل ہر دو ممدوح صاحبان کی خدمت میں ارسال کی جائے۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

منشی عنایت کریم صاحب سیالکوٹی۔

حکومت کی طرف سے شمس العلماء کے خطاب سے جناب کی جو عزت افزائی کی گئی ہے۔ اس پر جسقدر خوشی مجھے حاصل ہوئی ہے۔ وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتی۔ تاہم میں بھی رسمی طور پر تہنیت و تبریک پیش کرنے والے اصحاب میں شامل ہوتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ خدا کرے ملک و قوم آپ کے فیضان علم و ادب سے عرصۂ دراز تک مستفید ہوتی رہے۔ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک

اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو

آمین!

مسٹر ای۔ ڈی۔ ڈین سلیم۔ کرنال۔

آپ کی خطاب یافتگی شمس العلماء پر تہ دل سے مبارکباد پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ حقیقت میں آپ کے نام نامی سے منسوب ہونے پر اس خطاب کی عزت افزائی ہوئی ہے۔

حرف وحکایت

این خرابات مغان است دراں رندانند
شاہد وشمع وشراب وشکر ونائے وسرود

ہماری ڈاک

فضل حسین صاحب تبسم (غورغشتی)

"—— شاہکار دیکھا۔ ادب اردو کا شاہکار پایا —— جانے آیندہ کیا بن جائے —— ! شاہکار کی ہونے والی ترقی کی تصویر ذہن میں ہے لفظ نہیں ملتے کہ اس کا عکس کاغذ پر ظاہر ہو ——

برکھا رُت میں آپ نے عنانِ ادارت ہاتھ میں لی۔ ذیل میں اس واقعے کی طرف اشارات ہیں۔ پہلے دونوں شعروں کے شروع کے مصرعوں میں "رومان" کی یاد آ رہی ہے

جنتِ گم شدۂ یار بہ گلزار آمد — برشگال آمد وابر آمد وبسیار آمد
آب رفتہ بجوئے آمد۔ و آبش دگیر — چہ عجب صاحب اعجاز بہ کہسار آمد
دامنِ باغ وکف زاغ پراز دولتِ گل — حاتمِ ابرچہ دریا دل و دُربار آمد
عجب آواز خوش آیند۔ زہر سو آید — کیست این نغمہ سرائے کہ بسرکار آمد
ہمہ کس دامنِ دل از کفِ خود شاں دادہ — ہمہ آفاق ازیں بادۂ سرشار آمد
از سرِ عرش بگفتند کہ حیراں مشوید
حضرتِ اختر شیرانی بہ شاہکار آمد

"رومان" کے ساتھ ہم اپنا اختر بھی کھو بیٹھے تھے خدا کرے یہ بازیافت جس کی طرف میں نے ان اشعار میں اشارے کئے ہیں کسی دوسری گمشدگی کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ آمین ——"

رائے بہادر بی، پی ورما سابق رکن پبلک سروس کمیشن

"—— میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ نے شاہکار کی ادارت قبول فرمائی میں شاہکار کو آپ کا شاہکار تصور کر کے قبول کروں گا۔ امید کہ آپ کی صحت بالکل ٹھیک ہوگی ——"

خانصاحب شیخ عالم علی ایم، بی، ای، چیف منسٹر پاٹودی

"—— شکر ہے کہ آپ نے سال کے بعد جواب تو دیا۔ حالات معلوم ہو کر ادرد ہوا کہ ایسا اچھا رسالہ بند ہو گیا مافسوس ہے کہ دنیا قدر نہیں کرتی اور قدر کرتی بھی ہے تو مرنے کے بعد۔ غالب مرحوم ہی کو دیکھ لیجئے۔ اب اُن کا کلام سوا سو روپے میں بھی بکا۔ زندہ ہوتے تو خود ان کے مانگنے پر بھی سوا سو روپیہ شاید ہی کوئی دیتا۔ شاہکار میں نے دیکھا نہیں لیکن جب آپ اس کے ایڈیٹر ہوں تو میرے لئے یہی کافی ہے آپ بڑی خوشی سے اسے میرے نام جاری کر دیجئے۔

کیا آپ کی تمام نظمیں بصورت کتاب مل سکتی ہیں ہیں ان کو ضرور خریدوں گا مجھے یقین ہے کہ وقت آئے گا۔ جب زمانہ آپ کی قدر کرے گا۔ موجودہ حالت سے بیدل نہ ہوں سب کے ساتھ ایسی ہی ہوتی آئی ہے ——"

ایس۔اے۔رحمٰن۔ایم۔اے۔آئی۔سی۔ایس

"—— خط ملا۔ شاہکار کے اجرا سے خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ اسے رومان کی نسبت زیادہ ثبات ہوگا۔ کل یونہی کچھ گنگنا رہا تھا ذیل کے دو شعر ہوئے آپ کی تفنن طبع کے لئے لکھتا ہوں ؎

سمویا ترا غم جو تیری کی مے میں — نہیں لطف باقی کسی اور شے میں
اسی سے ہے پیدا نوا اسیری نے میں — یہی بن گیا سوز نغمے کی لے میں

خیال ہے کہ یہ اشعار ایک نظم کا سنگ بنیاد ہیں اگر نظم مکمل ہوگئی تو نذر کر دوں گا۔

مسٹر وحید احمد ایم۔ ایل۔ اے (یو۔پی)

—— والا نامہ باعث عزت افزائی ہوا

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اخبار "مدینہ" کی کسی اشاعت میں شاید گزشتہ ماہ میں آپ کی نظموں کے مجموعے کا اشتہار میں نے دیکھا تھا۔ بہرحال جب کوئی حصہ شائع ہو جائے آپ مجھے ضرور بھیج دیں ؎

عاشق شدم وبلا گشتم — افسانہ وماجرائے من چیست

یوں سمجھئے کہ فقیری کی دماغ میں سمائی۔ ریاضت کرنا شروع کی۔ دنیا ومافیہا سے گزر گیا لوگوں نے دیوانہ سمجھا میں نے اس کو گوارا کیا۔ اور اب تبسم بھی کرتا ہوں۔ دماغ کے پرخچے اڑ گئے حافظہ وطاقت رخصت۔ اب دم بخود ہوں سر حیرتی پاتا ہوں۔ میرے لئے نئی دنیا ہے اور ایک تماشائی کی حیثیت سے معائنہ کر رہا ہوں۔ مگر نہ کہاں سے پاؤں لے اور نہ پاؤں تو زمانے کی ہوا کے ساتھ کیسے چلوں؟

کونسل کی ممبری نصیب ہوئی ہے۔ شاید نبھ جائے۔ اور ممکن ہے کہ اس طرح بھولی ہوئی عادت پھر حاصل ہو جائے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ اب مضمون نگاری مجھ سے نہیں ہوتی۔ خدا کرے کہ آپ بعافیت ہوں ——"

مولانا نیاز فتح پوری مدیر "نگار" (لکھنؤ)

"—— کیوں، یہ کیا بات ہے۔ نہ نظم کی رسید، نہ انتخاب کلام میں تو بہرحال آخر وقت تک تقاضے کئے جاؤں گا۔"

سیاسیات

مسئلۂ امن عالم

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک یورپ میں انسانی زندگی کا جو آتشکدہ روشن تھا، اس کی آگ آج تک سرد نہیں ہوئی ہے، امن عالم کے مسئلہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ گذشتہ جنگ عظیم کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ نوع انسان کی یہ آخری جنگ اور اس کی حیوانیت و بربریت کا یہ آخری مظاہرہ ہے، لیکن موجودہ جنگ نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے، آج پھر اسی طرح فضا تیرہ و تار ہو رہی ہے۔ اور چاروں طرف سے جنگ کی گھنگھور گھٹائیں اٹھ رہی ہیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۴ء تک دنیا کی سیاسی فضا پرسکون اور ہموار سی نظر آ رہی تھی، لیکن اس کے بعد ہی انسان کی پچھلی وحشت و بربریت از سر نو اپنی بھیانک صورت دکھانے لگی، اور آج جنگ کے ہولناک نتائج کا خیال کر کے دنیا کے لاکھوں کروڑوں انسان خائف اور دہشت زدہ ہو رہے ہیں۔

ایک طرف انسان کی تہذیب و شائستگی ہے۔ دوسری طرف اس کی وحشت و درندگی، ان دونوں کے درمیان کشاکش ہو رہی ہے۔ آخر یہ کشاکش کس منزل پر پہنچ کر ختم ہوگی! کیا تہذیب و شائستگی پر وحشت و درندگی غالب ہو کر رہے گی؟ موجودہ ڈکٹیٹروں کے کرتوت اور تیور دیکھ کر تو اثبات ہی میں جواب دینا پڑتا ہے، فاشسٹ ملکوں کے آمر تو امن پسندی کو کھلے لفظوں میں ٹھکرا چکے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کی تخلیق و تکوین ہی جنگ کے ذریعہ ہوئی ہے۔ جو قوم جتنی جنگجو ہوگی اسے اتنی ہی شوکت و عظمت حاصل ہوگی، ہٹلر کی کتاب (MY STRUGGLE) میں بھی ہمیں جنگ کے پرجوش نعروں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

امن عالم کا مسئلہ کیسے حل ہو؟ کیا اپنے حقوق کی حرمت برقرار رکھنے کیلئے جنگ لازمی ہے؟ کیا جنگ علم الحیات کے نقطۂ نظر سے ایک لازمی شے ہے؟ جیسا کہ جرمن سپہ سالار ہنڈن برگ کا عقیدہ تھا؟ اس میں شک نہیں کہ جنگ کے متعلق انسان میں جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ امر واقعہ کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابھی تک انسان کامل طور پر اپنے بہیمانہ رجحانات پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہماری اکثریت ابھی وحشیانہ ذہنیت کی غلام بنی ہوئی ہے اور یہی ذہنیت انسان کو جنگلی جانوروں کی طرح باہم فساد و خونریزی کرنے اور کمزوروں کو دبا کر ان کو اپنا غلام بنا لینے پر اکساتی رہتی ہے۔

اسی ذہنیت اور تخیل کا نتیجہ ہے کہ آج بہت سے افراد کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا ہے کہ جنگ انسانی فطرت کا ایک جزو ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان جب تک اپنی خواہشوں کا غلام بنا رہیگا۔ اس وقت تک امکان جنگ کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ زیادہ تر انسان دلائل و براہین کی نسبت جذبات ہی کی تحریک پر گامزن ہوتے رہیں گے اور معمولی معمولی سی باتوں پر برانگیختہ ہو کر کشت و خون کیلئے تیار ہو جائینگے۔ لوگوں کا یہ بھی عقیدہ سا بن گیا ہے کہ زلزلہ سیلاب و با وغیرہ کی طرح جنگ بھی ایک قدرتی سانحہ ہے جس کے پیچھے کوئی غیبی طاقت کام کر رہی ہے اس لئے جس طرح دوسری قدرتی آفات کا کامل ازالہ انسان کی طاقت سے باہر ہے اسی طرح انسداد جنگ کی کوشش کرنا بھی ایک فعل عبث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گاندھی جی عدم تشدد پر زور دیتے ہیں اور رومان رولان، برنڈ شا، برٹرینڈ رسل جیسے لوگ کہتے ہیں کہ جنگ کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینا چاہیئے۔ تو بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ اس طرح کی باتیں محض اصول پسندوں کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ عملی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اصول پسندی اور امن و سلامتی کے ایسے بے معنی تصور سے انسان کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک انسان کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہوگی جنگ کی لعنتوں سے انسان نجات نہیں پا سکتا۔

انسان کا یہ عقیدہ جسے وہ عرصہ سے اپنے دل میں پرورش کرتا آ رہا ہے۔ اس کی فطرت میں اس طرح حل ہو گیا ہے کہ اس کے دل سے یہ خیال دور ہی نہیں ہوتا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب جنگ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا، اس لئے سب سے پہلے تو انسان کے دل کو اس غلط خیال سے پاک کرنے کی ضرورت ہے کہ جنگ ایک فطری اور دائمی چیز ہے۔ انسان کے دل میں جس وقت یہ یقین جاگزیں ہو جائے گا کہ جنگ لازمی طور پر کوئی قدرتی حادثہ نہیں ہے اور لوگ

بڑی تعداد میں عزم بالجزم کے ساتھ اس بات کا اعلان کر دیں گے کہ وہ کسی طرح بھی جنگ نہ ہونے دیں گے، اس وقت آپ دیکھیں گے کہ جنگ ایک لازمی مصیبت کی صورت میں باقی نہ رہ جائے گی۔

اگر جنگ واقعی کوئی قدرتی مصیبت ہوتی تو اس کا [illegible] ناممکن ہوتا۔ لیکن یہ کوئی قدرتی مصیبت نہیں ہے۔ [illegible] نے حال ہی میں اپنی کتاب (WHICH WAY TO PEACE) میں لکھا ہے۔ "جنگ زلزلہ کی طرح کوئی قدرتی مصیبت نہیں [illegible] کی خواہش سے ہی اس کی تخلیق ہوتی ہے اور انسان کی [illegible] اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔"

ایک ملک کے ساتھ دوسرے ملک کے، ایک قوم کے ساتھ دوسری قوم کے، ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کے تعلقات [illegible] جو نوعیت ہے۔ اس میں تو واقعی جنگ لازمی چیز ہے [illegible] لیکن اگر انسان کے ساتھ انسان کا تعلق، مساوات و محبت [illegible] ہو اور اس تعلق کو بے انصافی اور خود غرضی سے [illegible] ہر ملک کے حکمران حق و انصاف اور آزادی کی پالیسی کی [illegible] ہوئے دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنا تعلق قائم کریں [illegible] معمولی انسان کی ذہن کو بھی اپنے لئے ناقابل برداشت سمجھے [illegible] پھر جنگ کا ازالہ بھی ناممکن نہ معلوم ہو گا۔

سب سے پہلے انسان کے دل میں اس یقین کے [illegible] کی ضرورت ہے۔ کہ وہ اپنی دوست امادی سے جنگ [illegible] ہے۔ اگر تعلیم اور اچھی صحبت کے ذریعہ انسان کی عادت [illegible] ہو سکتی ہے تو جنگ کا انسداد بھی بعید از امکان نہیں۔ [illegible] کا تعلق بھی تو آخر انسان کے عادات و اخلاق ہی سے ہے۔ [illegible] علم و حکمت اور سیاست، اجتماعیت کے [illegible] انسان کے عادات و اخلاق میں کتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، ابتدا [illegible] کی جبلی طبیعت تھی کیا اس میں آج بہت کچھ تبدیلی نہیں ہو گئی ہے؟ [illegible] ایک روز انسان کا گوشت کھاتا تھا۔ دیوتاؤں پر انسان کی بھینٹ چڑھاتا تھا۔ ایک سے زیادہ عورتیں زبردستی گھر میں ڈال لیتا تھا اور جبر [illegible] کی طرح بازاروں میں انسان کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ لیکن آج یہ [illegible] کہاں ہیں؟ آج ہر مذہب کا آدمی ان باتوں کو خلاف انسانیت سمجھ کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہوا؟ اسی طرح انسان کے تخیل اور رسم و رواج میں تغیر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے جماعتی طور طریق و رسم و رواج میں بھی تبدیلی ہو گئی۔

انسان کے عادات و اخلاق میں رواہت پسندی اور درندگی کا جو [illegible] موجود ہے اس سے کوئی انکار نہیں [illegible] انسان کے اخلاق جب تک [illegible] کمزوریاں رہیں گی [illegible] کے لئے اسے لڑنا [illegible] انسان اس حقوق [illegible] متعلق [illegible] کے ساتھ [illegible] وضع کئے گئے ہیں [illegible] جنگ ہوتی [illegible] حقوق [illegible] کے ہمراہ [illegible] اس سے [illegible] اور عدالت [illegible] بھی لیا جائے [illegible] انسان کے عادات [illegible] گوشت خور [illegible] ممکن نہیں [illegible] کا کامل انسداد [illegible] انسان کو کوشش کرنے [illegible] انسان [illegible] وحشیانہ لذت و خون سے بچ [illegible] اس راہ میں وہ بہت [illegible] اس کی مسلسل سعی و سرگرمی [illegible] آج جنگ کا نتیجہ انسان [illegible] اس سے بچاؤ حاصل کرنے [illegible] جنگ کے اسباب [illegible] آج ہندوستان کے امن پسند [illegible] انسداد جنگ کے [illegible] اظہار فکر و رائے [illegible] گاندھی جی اس کے لئے عدم تشدد کو کافی سمجھتے ہیں [illegible] گاندھی جی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ متشددانہ طریقوں سے بھی انگلینڈ جرمنی سے اپنی حفاظت نہیں کر سکا۔ اگر وہ متشددانہ طریقوں کی بجائے عدم تشدد سے جرمنی کا مقابلہ کرتا تو یقیناً اس کی جو بری حالت ہوئی اس سے زیادہ بری نہ ہوتی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کا نتیجہ اس کے لئے نیز اس کے حملہ آور کیلئے اچھا ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ گاندھی جی کی اس رائے میں صداقت کا کوئی عنصر نہیں ہے؟

جس طرح گاندھی جی عدم تشدد پر زور دیتے ہیں اسی طرح برٹرینڈ رسل نے بھی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں کچھ ایسے طریقے بیان کئے ہیں جن سے جنگ کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے۔ اس کیلئے اُس نے سیاسی اور اقتصادی میدان میں انقلاب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے خیالات میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ظاہر کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ جب تک مختلف ملکوں کے ڈکٹیٹروں کو اپنی خواہش کے مطابق دوسرے ملکوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کی آزادی حاصل رہے گی اس وقت تک جنگ کا امکان بھی باقی رہے گا۔ لیکن اس کی امید بہت کم ہے کہ ممالک خود بخود اپنے اختیار کو نامناسب صورت میں استعمال کرنے کی آزادی کو محدود رکھیں گے۔ کیونکہ مجلس اقوام کے ہوتے ہوئے بھی جاپان اٹلی اور جرمنی کو بتدریج منچوریا، ابی سینیا، آسٹریا اور زیکوسلاواکیا پر حملہ کر کے انہیں تباہ کرنے سے کوئی روک نہ سکا۔ اس لئے ایک ایسے دستور کی ضرورت ہے کہ جب کوئی ملک مجلس اقوام کے فیصلے کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو تو اسے مجبور کیا جا سکے۔ اس کیلئے رسل نے ایک تدبیر یہ بتائی ہے کہ "حکومت عالم" یا "عالمگیر حکومت" (WORLD GOVERNMENT) عمل میں لائی جائے۔ اس عالمگیر حکومت کے اقتدار کو ماننے کیلئے تمام ملکوں کو مجبور ہونا پڑے گا کسی ملک کو اس کے حکم کی خلاف ورزی کی آزادی حاصل نہ ہو گی۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟ صرف قانون بنا کر تو عالمگیر حکومت کے اقتدار کو قبول نہیں کرایا جا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو مجلس اقوام اب تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوتی۔ اس لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا ہو گا جس سے عالمگیر حکومت کا اقتدار اس قدر مستحکم بن جائے کہ کسی ملک کو اس کی مخالفت کا حوصلہ نہ ہو۔ اس کیلئے عالمگیر حکومت کی طاقت کو ناقابل مقابلہ ہتھیاروں کے ذریعہ اس طرح محفوظ کرنا ہو گا کہ باغی ملک اس کی نافرمانی کرنے میں کامیاب نہ ہو۔ رسل کا کہنا ہے کہ ہر طرح کے جنگی اور غیر جنگی ہوائی جہازوں پر صرف عالمگیر حکومت کا اختیار ہو گا۔ کیمیاوی صنعت پر بھی صرف بین الاقوامی حکومت ہی کا قبضہ ہو گا جس سے باغی ملک گیس کا استعمال نہ کر سکے۔ مختلف ملکوں کو اسلحہ تیار کرنے کا اختیار تو ہو گا لیکن ان کے اپنے اسلحہ خانے میں صرف پرانے طرز کے ہتھیار رکھے ہوں گے۔ ہوائی جہاز کے ذریعے جنگ کرنے کا اختیار صرف بین الاقوامی حکومت کو ہو گا۔

یہ تو ہوئی سیاسیات کی گفتگو۔ اب اقتصادی مسئلے پر کیا کرنا ہو گا۔ اس کے متعلق رسل نے کہا ہے کہ زمین اور کچے مال پر "حکومت عالم" کا کامل اختیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک ان دونوں چیزوں پر شخصی اختیار باقی رہے گا اس کا نتیجہ خوش آئند نہیں ہو سکتا۔

مان لیجئے کسی ملک میں ایک کسان کے کھیت میں تیل کا چشمہ نکلتا ہے اور وہاں کے سرمایہ داروں کو اس کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس کے کھیت کو خرید لیں گے اور تیل نکالنے کیلئے ایک کمپنی قائم کر لیں گے۔ کمپنی کو فائدہ ہوتے دیکھ کر ملک کے بڑے بڑے لوگ ڈیویڈینڈ کی صورت میں بڑی بڑی رقم پانے کے لالچ سے اس کمپنی میں شامل ہو جائیں گے۔ کمپنی کا کام رفتہ رفتہ بڑھتا جائے گا اور ایک روز وہ کمپنی سرکاری کمپنی کی حیثیت میں تبدیل ہو جائے گی، چونکہ بڑے بڑے سیاسیین کا مفاد اس کمپنی سے وابستہ ہو گا۔ اس لئے یہ کمپنی آسانی سے ملک کے اختیار کو اپنے قبضے میں کر لے گی۔ اسی طرح مختلف ملکوں کے لوگ کمپنیاں قائم کر کے وہاں کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، اس کے بعد ملکوں میں ایک دوسرے پر قبضہ و تصرف حاصل کرنے کیلئے مخاصمت و عداوت شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اور اگر اس قسم کی کوئی چیز کسی نامہذب یا کمزور ملک میں ظاہر ہوئی ہے تو اس ملک پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کیلئے شہنشاہیت پسند ملکوں میں معرکہ آرائی لازمی ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مختلف ملکوں میں جمہوری حکومتوں کے قیام سے جنگ ناممکن ہو جائے گی، روس باکو کے تیل کے چشموں کا قبضہ نہیں چھوڑ سکتا اور نہ انگلستان ایرانی تیل کے چشموں کے اقتدار سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ جرمنی کو زمانۂ جنگ میں تیل . . . . نہ ملے گا۔ تو وہ یقیناً توسیع مملکت کی کوشش کرے گا، اس لئے اقتصادی میدان میں مساوات کا قیام اس طرح عمل میں لانا پڑے گا، کہ کچے مال سے جو فائدہ ہو وہ تمام ملکوں میں تقسیم ہو سکے۔ اس غرض کیلئے یہ ضروری ہے کہ کچے مال پر بین الاقوامی حکومت کا پورا پورا قبضہ اور اقتدار ہو۔

اقتصادی میدان میں حکومت عالم کا غلبہ و اقتدار قائم کرنے کے لئے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جنگی اعتبار سے اس کی طاقت کو ناقابل شکست و تسخیر بنا دیا جائے۔ اس کے ساتھ رسل کی یہ بھی تجویز ہے کہ آبنائے جبرالٹر، نہر سویز، نہر پانامہ وغیرہ اہم اور خاص مقامات پر کسی خاص قوم کا قبضہ نہ ہو بلکہ وہ حکومت عالم کے قبضے میں رہیں۔

یہ بات نہیں ہے کہ محض سیاسی اور اقتصادی مسائل ہی کی بنا پر جنگ ہوا کرتی ہے یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ انسان کے اندر قدیم سے جو وحشت اور درندگی جاگزیں ہے وہ جب تک کارفرما رہے گی اور

انسان کو اسے قابو میں رکھنے کی تعلیم نہ ملے گی اس وقت تک محض سیاسی اور اقتصادی اصلاح سے عالمگیر امن کا تخیل بروئے کار نہیں آسکتا۔ کیونکہ ان رجحانات کی سیری تو تشدد اور خونریزی ہی سے ممکن ہے۔ اس لئے سیاسی اور اقتصادی میدان میں انقلاب پیدا کرنے کے ساتھ دماغی اور اخلاقی اعتبار سے بھی انسان میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ ایسے انسانوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان فطرتاً جنگجو واقع ہوا ہے۔ اس طرح کے لوگ جنگ کی حمایت میں بہت سی دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ امن انسان کو نامرد اور بزدل بنا دیتا ہے۔ لیکن اس طرح کے دلائل کے پس پردہ ان کا بغض و عناد اور جذبۂ رقابت بھی کچھ کم کارفرما نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو بچپن ہی سے اس بات کی تعلیم دی جائے کہ وہ اپنے حیوانی رجحانات کو قابو میں رکھنا سیکھے۔

بچوں کو جو تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں ملک و قوم کے متعلق ان کے جذبات کو [illegible] درجہ مشتعل اور برانگیختہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاریخوں کے ذریعہ انہیں اس بات کی تعلیم نہیں دی جاتی کہ ان کے دلوں میں اپنی قوم سے محبت و ارادت تو پیدا ہو مگر دوسری قوموں سے نفرت و عداوت پیدا نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کے دلوں میں ابتدا ہی سے صرف اپنی قوم و ملک کو سب سے باعزت اور بہتر اور دوسرے ملکوں کو ذلیل و حقیر سمجھنے کا جذبہ جاگزیں ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ آگے چل کر بہت برا ہوتا ہے۔ تاریخی واقعات کتابوں میں اس طرح پیش نہیں کئے جاتے کہ بچے ان پر غیر جانبداری کے ساتھ غور کر سکیں۔

جن فاتح بادشاہوں اور سپہ سالاروں نے وحشیانہ قوت اور فساد و خونریزی کے ذریعہ کمزور ملکوں کی آزادی سلب کر کے انہیں تباہ و برباد کر ڈالا، وہ ٹھگوں، ڈاکوؤں اور قزاقوں ہی کے طبقے میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مگر تاریخوں میں ان کا تذکرہ بہادر انسان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، تاکہ بچوں کے دلوں میں ان کی عقیدت و ارادت پیدا ہو اور وہ بھی انہی کی طرح بننے کی کوشش کریں۔ کیا ایسے خونخوار بادشاہوں اور وحشی سپہ سالاروں کو بچوں کی نظروں میں بہادر اور عظیم الشان انسان ثابت کر کے ہم نے مردم کشی اور حریت دشمنی کی تحسین اور حوصلہ افزائی نہیں کی؟ سچ پوچھئے تو تاریخ کی یہ تعلیم بھی دلوں میں جنگجویانہ جذبہ پیدا کرنے کی کم ذمہ دار نہیں ہے۔

بچے بے احتیاطی یا غلطی سے کوئی نقصان کر ڈالتے ہیں یا پڑھا ہوا سبق اچھی طرح یاد نہیں رکھتے تو اعزہ یا معلم انہیں جسمانی سزا دیتے ہیں۔ اس طرح زدوکوب کرنے سے بچوں میں غم و غصہ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے اس وقت تو بچے دبانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر بعد میں ان کا یہی جذبہ جذبۂ انتقام میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ طے کر لیتے ہیں کہ بڑے ہو کر ہم اس کا بدلہ لیں گے۔

بچے جن عزیزوں سے محبت اور پیار کی امید رکھتے ہیں، وہ انہیں محبت اور پیار کے بدلے ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور مارتے پیٹتے ہیں تو بچوں پر ان کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بچہ ماں باپ اور بڑے بھائی کو اپنا ہمدرد اور خیرخواہ سمجھتا ہے مگر جب وہی غصہ ہو کر بچے کو زدوکوب کرتے ہیں تو اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ پیار اور محبت کا مجسمہ ماں بھی اس کے حق میں اتنی سنگدل ہو سکتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جب ماں اس کے ساتھ اس طرح دشمنی کر سکتی ہے تو اس سے دوسرا کون محبت و ہمدردی کر سکتا ہے؟ وہ اپنے کو بے کس و بے بس اور لاوارث خیال کرنے لگتا ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رحم و کرم اور محبت و ہمدردی کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے زبردستی اور طاقت ہے۔

والدین اور دوسرے اعزہ بچوں کو زدوکوب کرتے وقت خیال نہیں کرتے کہ ان کی طبیعت پر اس کا کتنا برا اثر پڑتا ہے اور ان کے دماغ میں کیسے کیسے خیالات پیدا ہوتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بچے تھوڑی دیر میں مار پیٹ کی بات بھول جاتے ہیں اور وہ اس کا کوئی خاص اثر نہیں لیتے۔ لیکن دراصل بچپن کی اسی زدوکوب سے بچوں کے دلوں میں جنگ کی تخم ریزی ہو جاتی ہے۔ بچوں کی بڑے ہو کر جنگجو بننے کی تمنا اور ماؤں کی اپنے بچوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کی آرزو کی تہ میں والدین کی یہی ہمدردانہ سخت گیری کارفرما ہوتی ہے۔

بچے فطری طور پر شریر اور بے باک ہوتے ہیں۔ اس عمر میں شرارتیں کرنا۔ ادھم مچانا، اپنے ہمجولیوں سے لڑنا جھگڑنا لڑکوں کی فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ ان کی اس آزادی میں والدین یا معلم اپنے ضابطے اور نگرانی کے ذریعے جو دست اندازی کرتے ہیں بچے اس کو مجبوراً برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں انتقام اور رقابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بڑے ہو کر ہر طرح کی قید و بند کی خلاف ورزی

گولے اور گولیوں کے ہنگاموں توپوں اور مشین گنوں کے دھوئیں کے بادلوں میں امن عالم کی شمع دھندلی ہو رہی ہے جنگ کے شور و غل میں امن عالم کی پکار سنائی نہیں دیتی ۔ تو کیا جو لوگ امن عالم کے قیام پر امید لگائے بیٹھے ہیں وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں؟ کیا ان کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا؟ انسان نے آج تک جتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں اوّل اوّل ان سب کی حقیقت ایک خواب سے زیادہ نہ تھی ۔ اگر انسان اپنے خواب کو عمل میں لانے کی کوشش نہ کرتا تو آج ان کی کامیابیوں سے ہمکنار نہ ہوتا۔

ممکن ہے کہ آج انسانیت کو سراپا لہولہان دیکھ کر بعض امن عالم کے قیام پر یقین نہ آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی اس وقت کے آنے میں دیر بھی ہو پھر بھی ہم امن عالم کے نصب العین کی طرف سے مایوس نہیں ہو سکتے ۔ دنیا جنگ کے آہنی بازوؤں کی گرفت سے رہائی حاصل کرنے کیلئے تڑپ رہی ہے ۔ دیکھئے کون سی قوم اور کون سی تہذیب دنیا کو نجات دلانے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔

(ادارہ)

نظم

سرودِ چناب

از سجاد ہاشمی

دلِ کہسار میں برسوں سے محوِ خواب رہتا تھا
صدائے رعد و باراں سے مری چھاتی دہلتی تھی
سکوتِ دائمی میں تھے نہاں محشر کے ہنگامے
بالآخر سازِ دل کو رعد کے مضراب نے چھیڑا
ازل کی آہنی زنجیر سے برہم ہوا آخر

ازل سے بن کے موجِ نغمۂ بیتاب رہتا تھا
صبا بھی اس جگہ وقتِ سحر تھرّا کے چلتی تھی
مرے سینے میں خوابیدہ تھے دنیا بھر کے ہنگامے
مری رفتار کو اس نغمۂ بیتاب نے چھیڑا
مری فریاد کا خاموش طوفاں کم ہوا آخر

چٹانوں کے جگر سے چھوٹ نکلا آب کی صورت
یہ وہ خطہ تھا جس کی شام بھی تھی صبح نورانی
اُتر آیا فرازِ کوہ سے گاتا ہوا اک دن
لڑھکتا لڑکھڑاتا شان دکھلاتا ہوا آیا
ہوا آباد آخر خطۂ پنجاب میں آ کر

میں پھیلا خطۂ کشمیر میں سیلاب کی صورت
چراغِ طور سے بڑھ کر تھا اس کا نورِ عرفانی
چلا اندازِ نو سے لغزشیں کھاتا ہوا اک دن
اُمڈتا بڑھتا چڑھتا پیچ و خم کھاتا ہوا آیا
ڈبویا خود کو حُسن و عشق کے سیلاب میں آ کر

مری امواج میں ہے اب بھی حُسنِ ہیر پوشیدہ
مرا گلشن خزاں ناآشنا معلوم ہوتا ہے
مرے ساحل پہ رقصاں ہیں تبسم لالہ زاروں کے
کہاں ہے اب سکندر اور پورس کی خوش اقبالی

دلِ رانجھا کے دردِ عشق کی تصویر پوشیدہ
مری امواج میں نورِ خدا معلوم ہوتا ہے
فرشتے آ کے سنتے ہیں ترنم آبشاروں کے
لیا ہے میرے ہر ذرے نے جن سے درسِ پامالی

میں برسوں سے اسی فردوس میں آزاد رہتا ہوں
زمیں ہے شاد مجھ سے اور میں بھی شاد رہتا ہوں

ایک نقّاد کا خطاب

از:-
سید علی اختر حیدرآبادی

(فلسفی - عالم - سرمایہ دار - مزدور سے)

فلسفی

سطح بیں! تاریکیِ اوہام میں کھویا ہوا — سرخوشِ پندارِ بیداری، مگر سویا ہوا
کچھ خبر بھی ہے تجھے اے جزوِ ذراتِ حقیر — کر رہا ہے تو ہوا کو اپنی مٹھی میں اسیر
اس فضا میں خود جہاں دانش ہے اک گہرا حجاب — تو الٹنا چاہتا ہے روئے فطرت سے نقاب
پھینکتا ہے زندگی پہ عقل کا دامِ زبوں — یہ خردمندی ہے یا طفلی کا ناپختہ جنوں
تو "گماں" کی سطح پر رکھتا ہے بنیادِ "یقیں" — کروٹیں لیتی ہے تیرے قصرِ دانش کی زمیں
چاہتا ہے کھول دے بابِ طلسمِ کائنات — اور خود تیری نظر ہے تشنۂ رازِ حیات

تیرا نغمہ ہے اہلِ بزم کو اک درسِ خواب
چھوڑ اے نامحرمِ رازِ نوا تارِ رباب

عالم

اے کہ تیری روح پر ہے پیرِ مکتب کا جلال — اے کہ شرحِ ناتمامی ہے تری شانِ کمال
خود سراپا درد، اور دیتا ہے تعلیمِ شکیب — کھو چکا ہے تجھ کو ناداں الفاظ و معنی کا فریب
اللہ اللہ زعم تیرے سطح بیں پندار کا — جیسے پردہ اٹھ چکا ہو خلوتِ اسرار کا
بے نیازِ منطق و حکمت ہے رازِ کائنات — یعنی اس حد سے بہت آگے ہے عرفانِ حیات
کچھ کتابوں پہ مدارِ زندگی سمجھا ہے تو — مدعائے خاطرِ ہستی کو بھی سمجھا ہے تو؟
زندگی بیگانۂ اندیشہ و اوہام ہے — ان کتابوں میں نہیں حُسنِ عمل کا نام ہے

جادۂ منزل سے یہ اظہارِ آگاہی نہ کر
تو کہ خود گمراہ ہے، تلقینِ گمراہی نہ کر

سرمایہ دار

تیرے ڈر سے لرزہ براندام ہے سارا جہاں   نوعِ انسانی کے لئے خونی درندے الاماں
خونِ تازہ سے بھرا جاتا ہے تیرا جامِ مے   ہر شکستِ دل میں پنہاں ہے ترے نغموں کی لَے
موت سے نامَد بھیانک جنگ سے بڑھ کر مہیب   اک تری ہستی ہے بے پایاں گناہوں کی نقیب
نالۂ دوزخ ہے یا تیرے گلستاں کی نسیم   ہے ترے خونیں تبسّم کی غذا اشکِ یتیم
پَے بہ پَے تھرّا کے رہ جاتی ہے سقفِ روزگار   اے معاذ اللہ تیرے زلزلوں کی گیر و دار
توُ نے شیطاں کی حقیقت کو نمایاں کر دیا
توُ نے آسائش کا شیرازہ پریشاں کر دیا

مزدور

اے کہ تیری مے سے رخشندہ ہے مینائے حیات   اے چراغِ بزمِ ہستی، اے طرازِ کائنات!
توُ نے اس دنیا کو بخشی اک بساطِ دلپذیر   روُح کو تو نے جگایا، تو نے جو بکائے ضمیر
جہل ہے تیرا چراغِ محفلِ علم و یقیں   تیری چوکھٹ پر جھکی رہتی ہے دانش کی جبیں
بہہ رہا ہے جس کی رَو میں فلسفی کا پیچ و تاب   تو اسی طوفاں کے چہرے سے اُلٹتا ہے نقاب
عزم تیرا مستقل، صبر آزما تیرا ثبات   یہ حقیقت ہے کہ تیرے دوش پر ہے کائنات
ہیں ترے ایامِ ہستی بے عروج و بے زوال   خاک ہے یاں آندھیوں کا زور، طوفاں کا جلال
قصرِ دولت کی فضا پر چھا گیا بیمِ اجل   دب سکی لیکن نہ تیری سطوتِ سعیٔ و عمل
کانپتا ہے تیرے آگے نارسی کا بند بند   روز اک دنیا بساتا ہے ترا عزمِ بلند
گرچہ تیری جھونپڑی کی شمع دھندلی ہے مگر   اس دھندلکے میں سنورتے ہیں خمِ زلفِ سحر
جس میں ہے توبادۂ ہستی، وہ مینا ہے یہی   قصر کے بے جان کیا جانیں کہ مینا ہے یہی
عشرتوں کی رَو میں پاسِ آدمیت ہے محال   وہ سراپا شب، ترے رُخ پر محبت کا جمال
چھا رہے ہیں ابرِ نارُسی اگر، چھایا کریں   قصر کے فرعون ٹھکرائیں تو ٹھکرایا کریں
غم نہ کر اب آچکا ہے قہرِ فطرت جوش میں

افسانہ

رومان

از:- شبیر محمد اختر

"کیا تصویر بنا سکو گے" سہیل نے مجھ سے پوچھا-

"تصویر بنا سکوں گا ———" میں نے حیرت سے سہیل کا منہ تکتے ہوئے دہرایا- "میں اور مصوّری ——— کیا تم مذاق کر رہے ہو سہیل-"

"بھائی صاحب! لفظی تصویر" اس نے میرے کندھوں کو دباتے ہوئے جواب دیا" ایک جوڑا آپ سے اپنی عشق و محبت کی داستان کی ایک قلمی تصویر کھنچوانا چاہتا ہے- ادب میں ڈوبی ہوئی کہانی ——— تاکہ ان کا فسانۂ عشق زندۂ جاوید بن جائے ———"

"یہ عجیب مضحکہ خیز بات ہے ———" میں نے تعجب سے کہا- "بہت ہی مضحکہ خیز!"

"وعظ کو رہنے دیجئے مولینا!" سہیل نے مجھے زور سے جھنجھوڑا- "اس میں تمہاری بہتری ہے- کیا ایڈیٹر رسالہ "افسانہ" اور "من کی موج" کے خطوط یاد نہیں رہے ———"

ایڈیٹر رسالہ "افسانہ" اور "من کی موج" کے خطوط مجھے کل ہی ملے تھے- میں ایک افسانہ نگار ہوں اور یہی میرا پیشہ ہے- میرے افسانے ملک کے اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہتے ہیں- لیکن میں نے جب بھی کسی سے اجرت یا معاوضہ کا مطالبہ کیا- اس کا جواب مجھے افسانہ کے مسودے کی واپسی میں ملا- رسالہ "افسانہ" اور "من کی موج" کے ایڈیٹر میرے دیرینہ کرمفرما ہیں- ان کے رسالوں کے صفحات کے صفحات میرے افسانوں سے سیاہ ہوتے رہتے ہیں- اب جو میں نے معاوضہ کیلئے انہیں بھی لکھا- تو ان کی طرف سے مجھے عجیب و غریب جواب ملا-

"آپ کے افسانے تو خوب ہوتے ہیں ———" ایڈیٹر "افسانہ" نے لکھا تھا "مگر ان میں رومان نہیں ہوتا- پبلک آج کل رومان کی دلدادہ ہے ——— صاحب! "رومان لکھیئے ——— ہم معاوضہ دینے کو تیار ہیں-"

"ہمارے رسالے کی کامیابی کا راز ———" ایڈیٹر "من کی موج" کا ارشاد تھا ——— "اسی میں ہے- کہ ہم پبلک کے مذاق کو دیکھیں

محبت اور عشق یہ دو لفظ ہیں جو افسانہ نگار کی کامیابی میں ممد ہو سکتے ہیں- آپ کے افسانے خشک سماجی بحثوں سے پُر ہوتے ہیں ———" "عشق اور "رومان" ——— دو متضاد چیزوں کا نام ہے- بھلا آج تک میں نے "رومان" کیا ہو، یا مجھے عشق کا سودا ہوا ہو- تو لکھوں؟ وہ شخص جو سراپا درد بن کر دوسروں کو درد کا کرب و بلا محسوس کرانا اپنا مقصدِ حیات سمجھتا ہو- اور جس کے نزدیک ادب اُس بغاوت کا نام ہے- جو انسان کے دل میں ظلم، بے انصافی، اور خود غرضی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہو اور ادیب کا کمال یہ ہے کہ وہ اس بغاوت کی ترجمانی خوبصورت پیرایہ میں کرے ——— دوسرے لوگ دوسروں کے دلوں میں بھی درد ہوتا ہے- لیکن وہ اپنی چوٹ کو دل ہلا دینے والے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتے- ادیب ان زخموں کی گہرائی کو اس طرح سے ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے بھی درد کی شدت سے چیخ اُٹھتے ہیں ——— یہ ہے میرا نظریۂ ادب" ایک ہندوستانی گھرانے کا فرد ——— جس کے لئے ہندوستانی ہونا ہی اس کی مفلسی کی ساری داستان بیان کر دیتا ہے ——— جسے دونوں وقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی ہو جس کے تخیل کی بلند پروازی دفتر کی کرسی سے آگے نہ بڑھ سکے جس کے لئے دولت کا تصور تیس روپے سے زیادہ نہ ہو ——— بھلا ایسی فضا کا پروردہ عشق اور رومان کو کیا جانے ———

سہیل میرا کلاس فیلو تھا اور اب وہ میرا دوست ہے- اسے میری حالت کا صحیح صحیح علم ہے- اس لئے اس نے ازراہِ ہمدردی میرے لئے کام ڈھونڈا ——— یا یوں کہئے کہ ایک بیوقوف امیرزادہ کو پھانسا- تاکہ اس طرح میری مدد ہو جائے ——— یہ اس کی مہربانی تھی اور احسان ——— احسان کرنے کا طریقہ بہرحال نرالا اور اچھوتا تھا-

مصوّر کے نگارخانے میں ماڈل آتے ہیں- اور انہیں روزانہ پہروں کھڑے رہ کر اپنی تصویر کی تکمیل کرانی ہوتی ہے- لیکن مصوّر اور افسانہ نگار میں زمین و آسمان کا فرق ہے- افسانہ نگار کو "عشق گاہ" میں حاضر ہو کر محبت کرنے والوں کا جائزہ لینا تھا- اور خود سراپا حسن و عشق بن کر

دونوں کے محسوسات کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ کی صورت میں منقش کر کے انہیں زندہ جاوید کرنا تھا۔ کتنا مشکل کام تھا۔ جو سہیل نے محض لاعلمی کی وجہ سے میرے سپرد کر دیا ——

"روحی مجھے تم سے کتنی محبت ہے!" امتیاز نے روحی کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔

یہ تھی ابتدا اس ناٹک کی جو میرے "ماڈل" شروع کرنے والے تھے۔ اور جسے "فلمانے" کا کام میرے سپرد تھا۔ ہم تینوں امتیاز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا اور شام کے پانچ بجے کا وقت۔ ہمارے سامنے میز پر پُرتکلف چائے رکھی تھی — آراستہ ڈرائنگ روم —— صوفہ سٹ، بھاری پردے، قالین —— مغربی طرز کا ایک بہترین نمونہ، اس پر لطف یہ ہے کہ کمرے اور سامان آرائش کے رنگوں میں ہمرنگی کا خیال رکھا گیا تھا ——

کمرے کی فضا ہی اسقدر عشق آفریں تھی کہ مجھے خود بھی دل میں کسک سی محسوس ہونے لگی —— اور مجھے اپنے بچپن کی یاد آ گئی۔ جب میں اور میرا یگانہ —— دو غریب بچے دولھا دلہن کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ مگر ——

—— میں حیران و سراسیمہ اس ماحول سے خود بھی متاثر ہو گیا —— شاید یہی وجہ تھی کہ میرے "ماڈل" بھی غیر شعوری طور پر عشق کرنے پر مجبور رہتے ——

"افسانہ نگار صاحب!" روحی نے مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پیسٹری کا بھی شوق کیجئے ——"

"شکریہ!" میں نے ہاتھ بڑھا کر پیالی لے لی۔

یہ ماحول اور فضا —— اس پر گرم چائے نے میرے جسم میں اور بھی حرارت پیدا کر دی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میرے دل و دماغ میں سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہو گئی ہیں۔ حسن اور حسین چیزوں سے لگاؤ پیدا کرنے کا مجھے آج تک موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ لیکن آج میری جمالیاتی حس بیدار ہو گئی تھی ——

"صاحب! آپکا ڈرائنگ روم باوجود سادہ ہونے کے نہایت پُرلطف اور پُرکیف ہے۔" میں نے سلسلۂ کلام کو جاری کرتے ہوئے کہا۔

"گڈ گاڈ" امتیاز نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ گویا اسے میری کور ذوقی کا یقین تھا۔ "آپ تو بڑے باذوق نکلے —— حضرت یہ حسن انتخاب میرا نہیں۔ بلکہ ان —— (روحی کی طرف اشارہ کر کے) —— کے ارشاد کی تعمیل ہے۔"

"شکریہ" روحی نے مسکراتے ہوئے داد کو قبول کیا —— "سادگی مجھے بہت پسند ہے۔ جمالیاتی تخیل کی انتہا میرے نزدیک سادگی ہے ——"

یونہی چائے کی پُرلطف صحبت ختم ہوئی —— اور ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تعارف —— انس —— محبت —— عشق" امتیاز نے کاروباری گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے ہمارے رومان کی اجمالی داستان —— اور اس کی مختصر تشریح —— کالج میں ہم کلاس فیلو ہیں۔ ہمارا تعارف ہوا۔ اس طرح کہ میں "مجلس مباحثہ" کا سکرٹری ہوں۔ اور آپ کالج کی بہترین مباحث (Debator) ہم مذاقی نے ہمیں اکٹھا کر دیا —— مجلس مباحثہ ایک مقصد مشترک تھا۔ ہم ملتے رہے —— ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ آشنائی اُنس میں تبدیل ہونے لگی۔ اور اُنس محبت میں بدل گیا —— اب حالت یہ ہے کہ ——"

"لیلیٰ اور مجنوں —— چکور اور چاند —— شمع اور پروانہ —— بھنورا اور پھول" روحی نے دل گداز ہنسی ہنستے ہوئے لقمہ دیا" —— کی داستان ہیچ ہے۔ رومیو اور جولیٹ کا قصہ ہمارے سامنے ایک افسانہ ہے —— افسانہ نگار تم کیوپڈ اور سائیکی کا ذکر ضرور کرنا اس کے بغیر ہماری تصویر مکمل نہ ہو گی۔ ہمارے افسانے کا آغاز یوں ہو" اس نے فضا کو اور بھی ڈرامائی بناتے ہوئے کلام کو جاری رکھا" —— دو بھولے بھالے پنچھی ایک باغ میں جا نکلے نہ جان نہ پہچان ——"

"بس رہنے دیجئے اپنی سحر بیانی" امتیاز نے روحی کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بات ختم کر لیں تو سیر کو چلیں —— ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ اب حالت یہ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ کالج کے طلبہ میں ہمارے خلاف رشک و حسد کے جذبات موجود ہیں —— لیکن ہم ان [illegible]

شام کے بعد ہم تینوں کار میں سیر کر [illegible]

ہم کئی میل تک گئے - چاند ابھی نہ نکلا تھا - خاموشی - کار کی نازک خرامی خنک ہوا ——— بجلی کے قمقموں کی مدھم روشنی ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہر ایک سفید لکیر ہے جو سیاہ کاغذ پر کسی نے کھینچ دی ہو - نہر کے کنارے کہیں کہیں پیدل سیر کرنے والے اور والیاں اٹھکھیلیاں کرتے یا کرتی جا رہی تھیں ——— مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا - کہ آسمانوں میں اڑے جا رہے ہوں - امتیاز اور روحی اشاروں اشاروں میں محبت کی داستان دہرا رہے تھے ——— روحی کا نکھرا ہوا حسن - اس کی سادہ اور پرکاری غضب ڈھا رہی تھی - امتیاز حسین و جمیل نوجوان ——— اس کے چہرے سے تندرستی اور جوانی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہی تھی - یہ حسین جوڑا دنیا اور اس کی مصیبتوں سے بے نیاز - فکر فردا سے لاپروا، کروڑوں انسانوں ——— جن میں سے ایک میں بھی تھا ——— کی بدحالی سے ناواقف - اور جو ایک حسینہ کو پہلو میں لے بیٹھنا منتہائے حیات سمجھے تھا -

اب ہم لارنس باغ میں تھے - چاند نکل آیا تھا - ہماری موٹر باغ کی سڑکوں کے چکر کاٹ رہی تھی - سکندر مونٹ سے لے کر مختلف قطعات تک ہر جگہ مرد اور عورتیں "جلوہ فرما" تھیں ——— گھنے درختوں کی بہار چاندنی میں زیادہ دل کش ہوتی ہے ——— سڑک کے دو رویہ اونچے اونچے درخت ——— درختوں کے نیچے روشنی ——— قطعات میں پھولوں کی کیاریاں ——— کیاریوں کے گرد انسانی "پھولوں" اور "بھنوروں" کا مجمع ——— کالج کے چند طلبا (جن کے نزدیک شاید "مطالعہ قدرت" ہی امتحان پاس کرنے کا بہترین طریق ہوتا ہے [یہ میرا تجربہ ہے] باغ میں مستعد پہرہ دار کی طرح محو گشت تھے - جہاں انھوں نے کسی کیوپڈ اور سائیکی کو دیکھا جھٹ آوازے کس دئے ———

ہماری کار درختوں کے جھنڈ میں لارنس روڈ والے دروازے کے قریب جا کر رکی ——— کار ہی میں ریڈیو سیٹ تھا - سوئچ آن ہوا ——— دہلی سے جگر مرادآبادی کی غزل ؎

سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

گائی جا رہی تھی -

میں بیٹھا بیٹھا واقعات کو غور سے دیکھ رہا تھا - مجھے تصویر کے نقش بھرنے کے لئے رنگوں کا انتخاب کرنا تھا ——— میں دونوں کو متبسم اشارات کرتے دیکھتا جاتا تھا ——— آنکھ کا اشارہ لب کا ہلنا، اور ہل کر رہ جانا، پاؤں کی جنبش، ہاتھوں کا دبانا، دونوں کے سروں کا ملنا، نکٹائی کی گانٹھ کو درست کرنا، ساری کے پلو کا انگلیوں کے گرد لپٹنا ——— غرض ان کی ہر معمولی سی حرکت میں ایک جہانِ آرزو، عشق و محبت کی ایک دنیا، جذبات کا سمندر، غرض ہزاروں افسانوں کا مسالہ پنہاں تھا -

---

امتیاز اور روحی کے عشق کے ناٹک کا میں نے ایک سین دیکھا تھا - جس کے پریشان نقوش میرے دماغ میں محفوظ تھے - مجھے ان سے ایک تصویر تیار کرنا تھی ——— ایک لاثانی اور زندہ جاوید تصویر - میں اپنے کمرہ میں ——— جسے کمرہ کہنا کمرہ کے لفظ کی توہین ہے ——— میز پر بیٹھا لکھ رہا تھا ——— بوسیدہ سی لالٹین میرے سامنے جل رہی تھی - مٹی کے تیل کی بو نے میرے خیالات کو پریشان کر دیا ——— عشق و داستان اور مٹی کے تیل کی بدبو ——— میں کچھ بھی نہ لکھ سکا -

میں بیٹھ کر سوچنے لگا ——— ادب کی بہترین تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ادیب کے محسوسات اور تاثرات کا آئینہ دار ہو ——— میں فضا اور ماحول سے متاثر ہو گیا تھا - لیکن اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ ایک واہمہ تھا - جس میں کہ میں گرفتار ہو گیا - میں غور کرنے لگا کہ اس عشق و رومان کے پس منظر میں کونسی چیز کارفرما تھی - حالانکہ شاید میرے اندر جمالیاتی قدردانی امتیاز سے زیادہ ہو - مگر اسے پہنچنے کا موقع نہیں ملا ———

میں نے گذشتہ واقعات کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا ——— تعارف انس، محبت اور رومان ———

تعارف ——— کیا کالج میں اور طلبہ نہ تھے - ضرور ہوں گے - لیکن جس چیز نے ان کو ایک دوسرے کی طرف راغب کیا وہ امتیاز کی کار اور اس کی امارت تھی - مجلس مباحثہ کا ناظم بننے میں بھی یہی عنصر زیادہ ممد رہا ہوگا - تعارف کے بعد انس ——— کیا پروفیسر فرائیڈ کا "جنسی نقطہ" اس جگہ کارفرما نہ تھا - اس کی تائید انس کی ترقی یافتہ شکل ——— محبت نے کر دی - جنسی احساس اور بیداری کا نتیجہ رومان کی شکل میں ظاہر ہوا میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا - وہ جنسی نظریہ کی تائید کرتا تھا - کوئی لاکھ بار محبت کو ایک سماوی چیز کہے - اس کے نزدیک دو معصوم دلوں کے ملاپ کا نام محبت ہو - ممکن محبت کی انتہا یہی اور مانا کہ رومانی دنیا

کا ارضی تصور ہے۔ مگر ان سب کی تہ میں وہی، ڈاکٹر فرائڈ کا نظریہ کام کرتا نظر آتا ہے۔

غربا کے جھونپڑوں میں بھی یہی عمل جاری وساری ہے۔ مگر فرق کتنا ہے؟ کونین کڑوی ہوتی ہے۔ مگر شکر میں لپٹی ہوئی گولی کسقدر حسین معلوم ہوتی ہے اور نگلنے والا کڑواہٹ کو محسوس تک نہیں کرتا۔ جنسی جذبات اسماج کے قوانین کی وجہ سے ——— غریبوں پر سماج اور قانون کی ضرورت کی گرفت ذرا مضبوط ہوتی ہے، غریبوں کے دلوں میں دب جاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ جرائم کی وہ خوفناک صورت ہے۔ جس کا تصور بھی آپ نہیں کر سکتے۔ قانون کی آہنی گرفت سزا کی سختی جیل کا دردناک عذاب، مگر اس کے باوجود جنسی جرائم بڑھ رہے ہیں۔ لیکن جب ان غریبوں کے خون سے نکالی ہوئی دولت محلات اور بنگلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وہی جرائم ڈرائنگ روم، کاروں میں سیر کرتے ہوئے یا کالجوں کے کمروں میں کئے جائیں۔ تو اُن کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اُن کا نام آرٹ کا کمال۔ جذبات اور تخیلات کی بلندی اور جمالیات کی قدردانی ہو جاتا ہے ———

مجھے ریحانہ یاد آ گئی ——— میرے دل و روح کی ملکہ، لیکن میں غریب تھا۔ اس کے والدین نے اُسے مجھ سے زیادہ مالدار، غریب کے ساتھ بیاہ دیا۔ اگر میں بھی مالدار ہوتا تو اس سے رومان کرتا ——— رومان ——— لارنس گارڈن ——— نہر کا کنارہ ——— ریڈ پوسٹ ——— سمٹے تو دل عاشق ——— لیکن جرم تو یہی ہوتا ——— رومان یا فرائڈ کا جنسی نظریہ ———

آرزو

تابش دہلوی

آغازِ آرزو، ہوا انجامِ آرزو!
مجھ سے زیادہ ہے کوئی ناکامِ آرزو
وہ ترکِ آرزو کی کشاکش بھی یاد ہے
دل کانپتا ہے لیتے ہوئے نامِ آرزو
یہ بھی تری نگاہِ کرم کا طفیل ہے
دل اور اُٹھا سکے غم و آلامِ آرزو
مایوسِ آرزو ہوں مگر اس کو کیا کروں؟
دیتی ہے ہر نظر تری پیغامِ آرزو
توڑا ہے دمِ امید نے اب دل کی خیر ہو!
آغاز ہو چکا ہے سرانجامِ آرزو
اب اعتبارِ عشرتِ غم بھی ہے ناگوار
میں ہوں فریب خوردۂ ایامِ آرزو
دل کو قبول ترکِ غمِ آرزو نہیں
اب آرزو ہے آپ ہی انعامِ آرزو
قیدِ امید و بیم سے دل کیا نجات پائے؟
ہر زخمِ دل ہے حلقۂ سر دامِ آرزو
تابش بصد سُرور و مسرت قبول کر
اِس عہدِ آرزو میں ہے، غم نامِ آرزو

سجدۂ مستانۂ دل

از:- دلیراج شرما۔ بی ایس۔ ڈی (فرینکلی)

شمعِ رعنا کا میسر نہ ہوا اس کو طواف
گرچہ اک عرصے سے بیتاب تھا پروانۂ دل
وہ بھی ہیں، چاند بھی ہے اور ہیں کلیاں بھی جواں
کر بھی لوں آج ادا سجدۂ مستانۂ دل

بربطِ درد

از:
اختر ہوشیارپوری بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔

رازِ جو دل میں چھپا ہے وہ چھپا رہنے دے ۔۔۔ بزمِ امید کو مصروفِ دعا رہنے دے
کامرانی کو مقدر سے خفا رہنے دے ۔۔۔ ابرِ غم چرخِ محبت سے چھٹا رہنے دے
بربطِ درد کو محروم نوا رہنے دے

یہ مری رات جو معمور ہے رومانوں سے ۔۔۔ کر نہ لبریز اسے درد کے افسانوں سے
پردۂ خواب نہ سرکا مرے کاشانوں سے ۔۔۔ رات ہے رات کو مصروفِ ادا رہنے دے
بربطِ درد کو محروم نوا رہنے دے

تیری نظروں کے میں قرباں کہ مخمور ہوں میں ۔۔۔ غم و آلامِ زمانہ سے بہت دور ہوں میں تو
طبع آزاد ہے دل شاد ہے مسرور ہوں میں ۔۔۔ سرحدِ حسن و محبت کو ملا رہنے دے
بربطِ درد کو محروم نوا رہنے دے

گائے جا مطربۂ عشق ترانے یونہی تو ۔۔۔ میری آنکھوں میں گذرنے دے زمانے یونہی
بند رہنے دے مصائب کے فسانے یونہی ۔۔۔ لبِ خاموش پہ قسمت کا گلا رہنے دے
بربطِ درد کو محروم نوا رہنے دے

غم کی نین ہے کیا چیز بھلائے جا تو ۔۔۔ گھول کر جام میں فردا کو پلائے جا تو
خود بھی ہنس ساتھ ہی مجھ کو بھی ہنسائے جا تو ۔۔۔ آج کی رات سماں یونہی بندھا رہنے دے
بربطِ درد کو محروم نوا رہنے دے

صبح کیا جانے سنائے گی خبر کیا مجھ کو ۔۔۔ کون جانے کہ دکھائے گی نظر کیا مجھ کو
اس مسرت کا ملے جانے ثمر کیا مجھ کو ۔۔۔ آج کی رات ہم آغوشِ نفا رہنے دے
بربطِ درد کو محروم نوا رہنے دے

تاریخی

ابوالحسن تاناشاہ

از:-
کوثر چاندپوری

ہندوستان میں کوئی شخص چاہے بچہ ہو یا بوڑھا ایسا نہ ملے گا جو ابوالحسن فرماں روائے حیدرآباد کو "تاناشاہ" کے نام سے نہ جانتا ہو۔ نازک مزاجی کے لحاظ سے تو "تاناشاہ" کا نام ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آم کا پودا بڑا نازک ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سے تغیر کو محسوس کرتا ہے۔ سردی، گرمی اور پالے کے اثر سے سوکھ جاتا ہے۔ ایک دوست نے آم کی اس نزاکت سے متاثر ہو کر کہا،
—— آم کے درخت میں شاید تاناشاہ کی روح داخل ہوئی ہے۔ نازک مزاج آدمیوں کو اب بھی لوگ "تاناشاہ" کہہ دیا کرتے ہیں —— بھائی تم نے تو تاناشاہ کو بھی مات کر دیا' —— تم تو بڑے تاناشاہ ہو! —— آئے وہاں سے تاناشاہ کے بچے! —— یہ اور اسی قسم کے بہت سے جملے ہماری روزمرہ کی بات چیت میں استعمال ہوتے ہیں مگر تاناشاہ کون تھا۔ کہاں پیدا ہوا۔ کیوں کر بادشاہ بنا۔ اس کا انجام کیا ہوا۔ اس کے متعلق بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ آج ہم تاناشاہ کی پوری مگر مختصر تاریخ اور سوانح عمری لکھتے ہیں۔

ابتدائی حالات

دکن کا آخری بادشاہ عبداللہ قطب شاہ جو پچاس سال فرماں روائی کر چکا تھا۔ اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی ایک لڑکی میراحمد سے بیاہی گئی تھی۔ میراحمد ساداتِ عرب کے کسی اچھے خاندان کا فرد تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اپنے داماد میراحمد کو امیر بنا دیا۔ اور امورِ سلطنت میں اس سے مشورہ کرنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد میراحمد کے باپ کا ایک شاگرد سید سلطان دکن میں آیا۔ یہ بھی عرب کے کسی اچھے خاندان کا فرد تھا۔ بلکہ اس کا حسب نسب میراحمد سے بھی اچھا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اپنی دوسری بیٹی کی منگنی سید سلطان سے کر دی۔ یہ رشتہ میراحمد کو پسند نہ تھا۔ وہ اس کا مخالف تھا اور سید سلطان سے بہت کینہ رکھتا تھا۔ شادی کا وقت آیا تو میراحمد نے عبداللہ قطب شاہ سے کہلا بھیجا کہ آپ اپنی لڑکی کو سید سلطان کے نکاح میں دینا چاہتے ہیں تو مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجئے، اسی کے ساتھ اس نے اپنی روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ حرم سرا کی اکثر عورتیں میراحمد کا ساتھ دے رہی تھیں۔ عبداللہ شاہ کو بھی بڑی بیٹی کی رعایت منظور تھی۔ اس نے مجبوراً اس رشتے کو ملتوی کر دیا۔ مگر اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ شادی کا جشن ہو رہا ہے۔ دولہا کے لئے کوئی اور آدمی ڈھونڈنا چاہئے جو اس کے لئے موزوں بھی ہو۔ آخر سب نے مل کر یہ طے کیا کہ ابوالحسن اس رشتہ کے لئے اچھا ہے۔ یہ ماں کی طرف سے عبداللہ قطب شاہ سے دور کا رشتہ بھی رکھتا تھا۔ مگر ابوالحسن کا چال چلن اچھا نہ تھا۔ وہ جوان ہوتے ہی تلنگ رندوں میں مل گیا تھا۔ اسی وجہ سے اب تک قطب شاہ نے ابوالحسن پر توجہ نہ کی تھی۔ اس کے ہم نشین بھی ابوالحسن کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ اس وقت ابوالحسن سید راجو کی خانقاہ میں رہا کرتا تھا۔ موقع چونکہ نازک اور وقت کم تھا۔ اس لئے اس کو تلاش کر کے غسل کرایا گیا۔ اور عمدہ کپڑے پہنا کر موتیوں کا سہرا باندھا گیا۔ پھر ایک اچھے عراقی گھوڑے پر سوار کر کے شاہانہ شان و شوکت سے اسے مجلس میں لایا گیا۔ اس طرح عبداللہ شاہ کی لڑکی کا نکاح اسی ساعت میں جو سید سلطان کے لئے پہلے سے مقرر ہو چکی تھی۔ ابوالحسن کے ساتھ ہو گیا۔

ابوالحسن دکنی زبان میں شعر بھی کہتا تھا اور تاناشاہ اس کا تخلص تھا وہ اپنے تخلص ہی سے زیادہ مشہور رہے۔

تخت نشینی

میراحمد کچھ تو اپنی ذاتی وجاہت اور رسوخ کی وجہ سے۔ اور کچھ اس بنا پر کہ بادشاہ کی بڑی لڑکی اس کی زوجیت میں تھی۔ امراء کے ساتھ نخوت سے پیش آتا تھا اور ارکانِ دولت کو نگاہ میں نہ لاتا تھا۔ سید مظفر اور موسیٰ خاں محل دار بہت اثر و اقتدار رکھتے تھے، سید مظفر نہایت اولوالعزم بہادر اور صاحب فوج تھا۔ ان دونوں کے ساتھ میراحمد کا برتاؤ اچھا نہ تھا۔ محل کی عورتیں بھی اس سے ناخوش ہو گئی تھیں۔ بخلاف اس کے ابوالحسن امیروں سے بہت اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ سب سے بھائیوں کی طرح برابری سے ملتا جلتا تھا اس وجہ سے سارے امیر اسے پسند کرتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے مرجانے پر جب تخت نشینی کا سوال اٹھا تو امیروں میں جھگڑا اور اختلاف ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ محل کے باہر میراحمد اپنی فوج لے کر لڑائی پر تل گیا اور محل کے اندر اس کی بیوی جو "ماں صاحب کلاں" کہلاتی تھی۔ حبشی اور ترکی لونڈیوں کو ساتھ لے کر ننگی تلوار ہاتھ میں لئے فتنہ و فساد پر آمادہ ہو گئی چنانچہ محل کے اندر اور باہر لڑائی کا میدان تیار ہو گیا۔ آخر کار سید مظفر صاحب [illegible]

[illegible]

سید مرتضیٰ لکھا ہے) موسیٰ خاں محل دار اور مادنا و آکنا کی کوشش سے جو سید مظفر کے ملازم اور معتمد تھے اور تمام امیر و منصب دار ابوالحسن کے طرف دار ہوگئے اور ابوالحسن کی تخت نشینی پر سب نے اتفاق کرلیا۔ چنانچہ ابوالحسن تختِ حکومت پر بیٹھا اور سید مظفر کو قلمدانِ وزارت سپرد کیا گیا۔

مادنا و آکنا برہمنوں کا تسلط

تخت نشینی کے بعد ابوالحسن اور سید مظفر وزیر کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور رفتہ رفتہ یہ کشیدگی بڑھتی رہی۔ ابوالحسن نے سید مظفر کے اختیارات کم کرنا چاہے مگر اس کی کوئی تدبیر نہ چلی۔ بات یہ تھی کہ سید مظفر بڑے اثر اور دبدبے کا آدمی تھا۔ اس کی معزولی قتل و خوں ریزی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اس لئے ابوالحسن اس سے الجھنا نہ چاہتا تھا۔ آخر مادنا جو سید مظفر کا پیشکار اور صاحب مدار تھا ابوالحسن کی سازش میں شریک ہوگیا۔ اس نے سید مظفر کی فوج کے بڑے بڑے سرداروں کو لالچ دے کر توڑ لیا۔ جن امیروں سے خطرہ تھا۔ انھیں ملک کے انتظامات کے بہانے سے باہر بھیج دیا۔ جب سید مظفر اکیلا رہ گیا تو وزارت کے اختیارات اس سے چھین لئے گئے۔ مگر منصب بحال رکھا گیا۔ سید مظفر گوشہ نشین ہوگیا۔ اور وزارت کے عہدے پر مادنا کا تقرر عمل میں آیا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی آکنا مقرر ہوا۔ یہ دونوں بھائی بہت متعصب تھے۔ چنانچہ مشہور مورخ خافی خاں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ:-

> ابوالحسن نے لہو و لعب میں مصروف ہو کر سارے کام مادنا و آکنا کے سپرد کر دئے تھے جو نہایت متعصب تھے اور مسلمانوں پر کھلم کھلا ظلم اور زیادتی کرتے تھے فسق و فجور اور شراب وغیرہ کا عام رواج ہوگیا تھا۔"

ابوالحسن کی آرام طلبی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے پندرہ سال کے زمانۂ حکومت میں حیدر آباد سے گولکنڈہ تک جانے کے علاوہ کبھی کوئی سفر نہیں کیا۔ ان مقامات کا درمیانی فاصلہ صرف ایک کوس تھا۔ تاریخ کی مشہور کتاب مآثر الامراء میں ہے کہ:-

> "ابوالحسن والیٔ تلنگ نے جو عیش و عشرت میں بہت زیادہ مشغول رہتا تھا اپنے پندرہ سالہ دورِ حکومت میں سوائے حیدر آباد سے محمد نگر گولکنڈہ تک کی ایک کوس کی مسافت کے اور کوئی سفر نہیں کیا۔ دراصل سوار ہونا بھی اس کے لئے مشکل تھا۔

... قطب شاہی بادشاہوں کے زمانے میں ہمیشہ وزیر یا امیر حکومت پر چھا جایا ... بادشاہ کے آس پاس رہا کرتے تھے۔ اسی لئے ابوالحسن کے عہد ... مادنا و آکنا کے ہاتھ ... حکومت بالکل ان کے ہاتھ میں آگئی۔ جو ان کا جی چاہتا تھا وہ کرتے تھے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اسی کمزوری نے عالمگیر بادشاہ کو دکن کی فتح پر متوجہ کیا۔ مادنا و آکنا کے تسلط کا یہ حال تھا کہ ابوالحسن کے سپہ سالار خلیل اللہ خاں نے جو مرتبہ اور عزت کے لحاظ سے بہت بڑا آدمی تھا اپنے نگینہ پر یہ شعر کھدوا لیا تھا ؎

> ز التفاتِ بادشاہ و پنڈتِ روشن رواں
> گشت ابراہیم سرِ لشکر خلیل اللہ خاں

ابوالحسن اور اورنگ زیب کی لڑائی کے اسباب

ابوالحسن کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ نہایت عیش پرست اور شراب خوار تھا اور مادنا و آکنا پر اعتبار کرکے اس نے سلطنت کے تمام کام ان کی سپرد کر دئے تھے۔ اس وجہ سے اس کی سلطنت میں عام طور پر مسلمانوں پر سختیاں ہوتی تھیں مگر صرف یہی وجہ دکن پر اورنگ زیب کی چڑھائی کو جائز قرار نہیں دے سکتی۔ اس لئے ذرا زیادہ تلاش اور جستجو کی ضرورت پڑے گی مگر تاریخوں میں یہ سب واقعات پوری تفصیل اور وضاحت سے موجود ہیں اس لئے ان اسباب کی تلاش میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی جو اورنگ زیب کی لشکر کشی کے ذمہ دار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب بڑا پرہیزگار اور دین دار بادشاہ تھا مگر ابوالحسن بھی مسلمان تھا اور صرف اس وجہ سے کہ وہ شراب پیتا تھا یا اس کی حکومت میں ہندو وزیر کو اتنا رسوخ حاصل تھا کہ وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ اس کے ملک پر اورنگ زیب حملہ آور نہیں ہوسکتا تھا۔ اصل چیز جس نے اورنگ زیب کو ابوالحسن کی طرف توجہ دلائی وہ شاہی دشمنوں کی امداد اور حکومت مغلیہ کے خلاف انھیں دست درازی کرنے پر آمادہ کرنا تھی۔

چنانچہ سیواجی مرہٹہ جب دہلی سے بھاگ کر دکن گیا تو اس نے ابوالحسن سے مل کر طے کیا کہ ہم دونوں متفق ہو کر اورنگ زیب کے مقبوضہ ممالک پر حملہ کریں ابوالحسن نے سیواجی کی رائے سے اتفاق کرلیا اور اس کو فوجی اور مالی امداد دی سیواجی نے عالمگیر کے سلطنت کے دسویں سن جلوس میں مغلیہ مقبوضات پر حملے شروع کئے اور جالنہ کو برباد کر دیا۔ مآثر الامراء کا مصنف ان واقعات کے متعلق لکھتا ہے:-

> "سیوا نے حیدر آباد کے بادشاہ سے متحد ہو کر طے کیا کہ ہم مل کر شاہی فوج سے لڑیں۔ پہلے قلعوں کی تسخیر میں میری کوشش اور ہمت دیکھیو اس طرح اس سے فوج اور روپیہ لے کر وہ تنجاور کی طرف گیا۔ دوسرے سال سیوا نے شاہی ملک پر چڑھائی کرکے جالنہ کے پرگنے کو ویران کر دیا"

سیواجی سنہ ۱۰۹۳ھ میں مرگیا تو ابوالحسن نے اس کے بیٹے سنبھا کو تاریخ ...

خلاف مدد دی - اور ایک لاکھ ہون نقد بھیجے۔

مآثر الامرا کا مصنف اور خافی خاں وغیرہ تمام مورخین اورنگ زیب خلاف ہیں اور ہر جگہ ابوالحسن کی طرف داری کرتے ہیں مگر تاریخ لکھتے وقت واقعات کو بالکل بدل دینا آسان نہیں ہے۔ اس لئے سچے حالات کو چھپانا ان کے بس میں نہیں۔ چنانچہ خافی خاں ابوالحسن اور سنبھا کے معاملہ میں لکھتا ہے:-

"علاوہ اس کے دارالحربی اور جہنمی سنبھا کو ملک اور قلعوں کو فتح کرنے کے سلسلے میں مدد دے کر اور ایک لاکھ ہون نقد بھیج کر اس نے اپنے آپ کو بدنام اور رسوا کیا۔"

عالمگیر بیجاپور میں فوج لئے پڑا تھا کہ ابوالحسن نے اپنے ایک سردار کو لکھا کہ ایک طرف سے سنبھا ٹڈی دل لشکر کے ساتھ حملہ کرتا ہے۔ دوسری طرف سے میں چالیس ہزار کی جمعیت بھیجتا ہوں۔ اب دیکھوں عالمگیر کس کس کو روکتا ہے۔ بیجاپور کے معاملے میں بھی ابوالحسن نے سکندر کی طرف داری کی تھی۔ چنانچہ اسی خط میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔

میر ہاشم سید مظفر سابق وزیر کا بیٹا تھا۔ سید مظفر ابوالحسن کی قید میں تھا۔ اس کے بیٹے یعنی میر ہاشم نے بھی درباری لوگوں کے ذریعے سے اورنگ زیب کے سامنے فریاد کی۔ ساتھ ہی یہ خبر آئی کہ چند عمدہ اور سیر حاصل پرگنوں پر ابوالحسن نے اس بنا پر قبضہ کر لیا ہے کہ پہلے ان کا تعلق تلنگانہ سے تھا۔ اب بادشاہ کو حیدرآباد کی فتح کا خیال پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ سلطنت کی ذمہ داریاں کس قدر سخت ہوتی ہیں۔ اور اپنے ملک نیز رعایا کی جان و مال کا بچانا۔ اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت بادشاہ ہی کے ذمہ ہے۔ اگر وہ ان امور میں دلچسپی نہ لے تو سچی بات یہ ہے کہ وہ بادشاہی کا اہل ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اورنگ زیب مدبر، بہادر، اور اولوالعزم بادشاہ تھا۔ اور حسن مردانگی۔ دلیری اور حسن تدبیر سے اپنے بھائیوں کو راستے سے ہٹا کر اس نے بادشاہت حاصل کی تھی یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے سیواجی اورنگ زیب کا باغی تھا سنبھا نے بھی اس کی حکومت سے سرکشی کی تھی اور وہ ان کے مقابلے کو برابر جنگی تیاریاں کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں ابوالحسن کا ان سے سازش کرنا۔ فوج اور روپے سے ان کی مدد کرنا بالکل کھلا ہوا اعلان جنگ تھا جس سے عالمگیر ایسا بہادر بادشاہ کسی طرح چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر کرتا تو پھر عالمگیر پر بزدلی، بے تدبیری اور غفلت کا الزام لگایا جاتا۔ اس نے مجبوراً ان خراب حالات میں ابوالحسن سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنی فوجی قوت استعمال کر کے دشمن کے مضبوط قلعے کو جس میں اسے پناہ ملی ہوئی تھی بالکل توڑ دیا۔

بعض کم نظر اور کوتاہ اندیش مورخوں نے اورنگ زیب کے اس حملے کو لالچ، طمع وغیرہ پر محمول کیا ہے مگر یہ خود ان کا اندھا پن ہے۔ انھوں نے واقعات کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ جب فوج کشی کے ایسے قوی اسباب موجود ہیں تو پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے حملے کی وجہ اس کی طمع یا روپیہ لوٹنے کا لالچ تھا۔

چند مورخین نے ان سب باتوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی لکھا ہے کہ بادشاہ نے دکن پر حملہ کرنے سے پہلے مفتی اعظم سے فتویٰ لیا تھا۔ اس نے اس حملے کو ناجائز بتایا۔ عالمگیر نے مرزا محمد شرف کو سفیر بنا کر ابوالحسن کے پاس بھیجا اور اس سے دو ہیرے طلب کئے جن میں سے ایک کا وزن پچاس رتی تھا۔ عالمگیر نے سفیر کو تنہائی میں ہدایت کر دی کہ ہیروں کا مانگنا تو ایک بہانہ ہے ہمیں ان کی بالکل ضرورت نہیں ہے ہم صرف حیدرآباد پر لشکر کشی کرنے کے اسباب مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا تم ابوالحسن کے پاس پہنچ کر اس سے سختی سے بات چیت کرنا تاکہ وہ بھی تمھارے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس طرح حیدرآباد کو فتح کرنے کی ایک حجت ہاتھ آ جائے۔

دیکھئے کس قدر کم زور بیہودہ اور لغو بات ہے۔ کون ایسا مفتی اعظم ہوگا جو پہلے بیان کئے ہوئے حالات اور واقعات کی روشنی میں دکن پر حملہ کرنے کی مخالفت کر سکے اور اس کو ناجائز قرار دے سکے، اور ابوالحسن کی دست درازی اس کے فسق و فجور اور مسلم آزاری کی موجودگی میں عالمگیر حملہ کرنے کا کوئی اور حیلہ تلاش کرے۔

ابوالحسن پر لشکر شاہی کی یورش

عالمگیر نے پہلے خان جہاں بہادر کو افواج شاہی کا سپہ سالار بنا کر حیدرآباد روانہ کیا۔ اس کے بعد شاہزادہ محمد اعظم کو اس کی مدد کے لئے بھیجا۔

ابوالحسن کی طرف سے ابراہیم المخاطب بہ خلیل اللہ خاں اور رستم راؤ جو ابوالحسن کا مشیر اور مادنا و اکنا کا چچا زاد بھائی تھا تیس چالیس ہزار فوج لے کر مقابلے کو آیا۔

شاہزادہ محمد اعظم نے پہنچنے کے دو دن بعد خان جہاں کی رائے سے لڑائی کی تیاری کی شاہی فوج اپنے لشکر اور مورچوں سے چند میل آگے بڑھ آئی تو دشمن کی فوج بھی بڑی شدّ و مد سے بڑھی۔ اور شاہزادہ معز الدین اور خان جہاں بہادر پر ٹوٹ پڑی۔ یہ دونوں ہراول پر تعینات تھے۔ لیکن کے پہلے ہی حملے میں لشکر شاہی کا یہ حصہ بد حواس ہو گیا۔ آخر [illegible] خواجہ ابوالمکارم اور راجہ مان سنگھ ہراول کی امداد کو آئے [illegible] کا بہادرانہ جواب دیا تین دن تک لڑائی جاری رہی۔ [illegible]

سوار اور پیادے زخمی اور ہلاک ہوئے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی لشکر کے مقابلے میں شاہی فوج نہ ٹھیر سکی اور اپنی قیام گاہ کو لوٹ گئی۔ شاہی امیروں میں سے بعض بہادروں نے پیچھا کرنے کا ارادہ کیا مگر خان جہاں نے انھیں اس ارادے سے روک دیا۔

عالمگیر کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو اس نے دشمن کا تعاقب نہ کرنے پر اظہار ناراضی کیا۔ اس کے بعد چار مہینے تک کوئی قابل ذکر لڑائی نہ ہوئی۔ بادشاہ نے اس بے کاری کو بھی پسند نہ کیا اور خان جہاں کو سخت فرمان بھیجا۔

دوبارہ صف آرائی ہونے سے پہلے شاہزادہ محمد معظم نے خلیل اللہ خاں سپہ سالار دکن کو پیام دیا کہ اگر ابوالحسن یہ چار شرطیں مان لے تو میں بادشاہ کے حضور میں اس کی سفارش کروں گا۔

(۱) اظہار ندامت کرے اور معافی مانگ لے۔

(۲) مادنا و اکنا کو معزول کر دے۔

(۳) پرگنات سیرم و رائچور جس پر اس نے قبضہ کر لیا ہے چھوڑ دے۔

(۴) پہلی اور حال کی پیش کش ادا کر دے۔

لیکن وہاں سے جواب آیا "سیرم کا قلعہ اور سرحد کا علاقہ ہماری برچھیوں کی انی اور تلوار کی دھار سے بندھا ہوا ہے"

اس جواب کے ساتھ ہی دکنیوں نے زیادہ شوخی شروع کی اور اس قدر بان برسائے کہ ایک بان کھانا لاتے وقت خاصہ کے خوان میں لگا اور خوان خواص کے سر سے گر گیا۔

حیدرآباد سے توپ خانہ آگیا تھا۔ اس لئے دکنیوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے توپوں کی گرج نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ان حالات میں شہزادے کی رگ شجاعت حرکت میں آئی اور شاہی فوج آراستہ ہونے لگی۔ ہراول پر شہزادہ معزالدین اور خان جہاں، چنداول پر سید عبداللہ خاں وغیرہ متعین ہوئے قلب لشکر میں خود شاہزادہ خواجہ ابوالمکارم کے ہمراہ کھڑا ہوا۔

دکنیوں نے بھی اپنی فوج کے تین حصے کئے اور شاہی فوج سے ٹکر لینے کو آگے بڑھے سخت لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف کے بہادروں نے جان توڑ کوشش کی۔ سید عبداللہ خاں نے اپنی شجاعانہ یلغار سے اپنے سامنے کی فوج کو آگے سے ہٹا دیا۔ اور شاہی لشکر کے دونوں بازوؤں کی امداد کو پہنچتا رہا۔ دوپہر تک کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ دن ڈھلتے ہی دشمن کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ اور وہ بے دم ہو کر بھاگ نکلی۔ شاہزادے نے پڑاؤ تک پیچھا کیا۔ دکن کے لشکر میں ایک قیامت برپا ہو گیا۔ شیخ منہاج نے شاہزادے کے پاس دو سوار بھیج کر ... کہا۔

"بادشاہوں نے ہمیشہ طرفین کے ناموس کی حفاظت کی ہے
مقابلہ مردوں کا ہے۔ عورتیں بے قصور ہیں ہمیں اتنا موقع دیا
جائے کہ عورتوں کو محفوظ طریقے پر لے کر نکل جائیں"

معزالدین نے اپنے باپ محمد معظم کے حکم سے اپنی فوج کو دکنیوں کی قیام گاہ پر لوٹ مار کرنے سے روک دیا۔ اور انھیں اتنا موقع دیا کہ وہ عورتوں کو گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار کر کے لشکر سے نکال لے گئے۔ عورتوں کو محفوظ مقام پر پہنچا کر دکنیوں نے شام کے وقت پھر ہجوم کیا اور سخت لڑائی ہوئی۔ جانبین کے بہت سے آدمی زخمی اور مقتول ہوئے۔

ابوالحسن کی شکست

غنیم کے سرداروں میں سے شیخ منہاج اور رستم راؤ برہمن زخمی ہو گئے شام تک دکنیوں نے مقابلہ کیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ حیدرآباد کی طرف چل دیئے۔ صبح کو جب دکنیوں کے بھاگ جانے کا حال معلوم ہوا تو شاہزادے نے فتح کے نقارے بجائے اور حیدرآباد تک پیچھا کیا۔ اسی درمیان میں مادنا وزیر نے ابوالحسن کو سپہ سالار دکن خلیل اللہ خاں سے بدظن کر دیا۔ ابوالحسن سپہ سالار کی گرفتاری اور اس کے قتل کے درپے ہو گیا۔ خلیل اللہ خاں جان بچا کر شاہزادے کے پاس آگیا۔ اس کے بعد ابوالحسن بغیر امراء کے مشورے اور اطلاع کے دفعتہً جواہرات وغیرہ کے صندوق اور عورتوں کو لے کر قلعہ گولکنڈہ میں چلا گیا۔ حیدرآباد کی رعایا اپنے بادشاہ کی اس بدحواسی پر بہت حیران و پریشان ہوئی۔ شہر پر شاہزادہ محمد معظم کا قبضہ ہو گیا۔

صلح کی درخواست

ابوالحسن نے نہایت عاجزی سے صلح کی درخواست کی محمد معظم نے ایک کروڑ بیس لاکھ کی پیش کش علاوہ سالانہ نذر کے قبول کی اور مادنا و اکنا کو بے دخل اور قلعہ سیرم نیز دوسرے محالات شاہی کی واپسی کی شرط پر بادشاہ سے معافی کی درخواست اور سفارش کرنے کا وعدہ کیا۔

مادنا و اکنا کا قتل

مادنا صاحب اقتدار تھا۔ ابوالحسن اس کی اور اس کے بھائی کی گرفتاری میں مذبذب تھا مگر بعض سرداروں نے ماہ جانی زوجہ ابوالحسن کی رائے سے ابوالحسن کی بغیر اطلاع ان دونوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اور مادنا و اکنا گرفتار کر کے قتل کر دیئے گئے۔

درخواست صلح کی نامنظوری

عالمگیر نے صلح کی درخواست منظور نہیں کی اور خان جہاں بہادر پر عتاب نازل ہوا۔ فتح دکن کے لئے دوسری فوج بھیجی گئی۔ ابوالحسن نے عبدالرزاق خاں لاری کو اس فوج کے مقابلے کے لئے منتخب کیا۔ عالمگیر شاہزادہ محمد معظم اور خان جہاں کی اس کارروائی کو پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے ان دونوں کو حیدرآباد سے واپس بلا لیا۔ اور خان جہاں کی جگہ عابد خاں اس مہم پر تعینات ہوا۔

ابوالحسن کی پیش کش

بیجاپور کو فتح کرکے اورنگ زیب نے ابوالحسن اور سعادت خاں حاجب حیدرآباد کو فرمان بھیجے جن میں پیش کش کے متعلق تاکید کی گئی تھی۔

سعادت خاں نے ابوالحسن کو عنایات شاہی کا امیدوار کرکے پیش کش ادا کرنے پر متوجہ کیا۔ ابوالحسن نے کہلا بھیجا کہ نقد روپے کا فراہم کرنا مشکل ہے۔ کسی خورد سال خواجہ سرا کو بھیج دیا جائے۔ اس کے سامنے زیور اور جنس جو کچھ موجود ہے جمع کرکے بھیج دوں گا۔

سعادت خاں نے خواجہ سرا بھیجنے سے انکار کردیا۔ اس گفتگو میں کئی دن گزر گئے اور بادشاہ کے گلبرگہ آنے کی خبر مشہور ہوگئی۔ ابوالحسن نے سعادت خاں حاجب کے آدمیوں کو بلا کر نو عدد خوان جن میں جواہر، زیورات اور مرصع آلات تھے سربمہر کرکے سعادت خاں کے پاس بھیج دیئے اور لکھ دیا کہ انکو اپنے گھر رکھیے۔ دو تین روز میں نقد روپیہ بھی جو کچھ ممکن ہوگا بھیج دیا جائے گا جواہرات وغیرہ کی قیمت کا اندازہ کرکے لکھیے۔ بعد میں اس پیش کش کو اطاعت کی عرضداشت کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ انہیں دنوں میں ابوالحسن نے میووں کی چند بہنگیاں بھی بادشاہ کے حضور میں بھیجی تھیں۔

اسی دوران میں یہ اطلاعات آئیں کہ بادشاہ گلبرگہ سے گولکنڈہ کی طرف آ رہا ہے۔ ابوالحسن نے سعادت خاں کو پیام دیا کہ پیش کش بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ گولکنڈہ کی تسخیر سے دست بردار ہو جائے گا۔ لیکن سنا جا رہا ہے کہ گولکنڈہ کی فتح کا خیال دل سے نہیں نکلا۔ ایسی صورت میں جواہر اور زیورات کے وہ خوان جو آپ کے یہاں امانتاً رکھے گئے تھے واپس کردئے جائیں۔ سعادت خاں نے جواب دیا کہ یہ خوان میووں کی بہنگیوں میں رکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیئے گئے تھے۔ ابوالحسن کو یہ حرکت ناگوار ہوئی۔ اس نے سعادت خاں کے گھر فوج بھیج دی دو روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ سعادت خاں نے ابوالحسن سے درخواست کی کہ میرے قتل کی کوشش سے باز آؤ۔ ورنہ بادشاہ کی ناگواری بڑھ جائے گی میں زندہ رہوں گا تو بادشاہ کو تمھارے حال پر مہربان کرنے کی کوشش کروں گا۔ ابوالحسن نے سعادت خاں کو چھوڑ دیا۔

اورنگ زیب کا عزم حیدرآباد

اورنگ زیب ایک ہفتہ گلبرگہ میں ٹھہر کر بندر ظفرآباد کی طرف گیا۔ وہاں سے شاہی پیش خیمہ حیدرآباد روانہ کیا گیا۔ ابوالحسن کو بادشاہ کی آمد سے سخت تردد ہوا۔ اس نے معافی جرائم کے لئے التجائیں کیں مگر اس کی یہ گھبراہٹ بعد از وقت تھی۔ بادشاہ نے سعادت خاں کو جو فرمان بھیجا اس میں ابوالحسن کے جرائم کی تفصیل بھی لکھی تھی۔ فرمان کا ترجمہ یہ ہے:-

"اگرچہ اس کم بخت کی بدکرداریاں تحریر میں نہیں سما سکتیں مگر ان میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑی شمار کرائی جاتی ہیں:-

(۱) سلطنت کے اختیارات کافر فاجر ظالم کو دے گئے۔

(۲) سادات اور مشائخ و علماء کو پریشان کیا گیا۔

(۳) فسق و فجور کے رواج میں کوشش کی گئی۔

(۴) ابوالحسن خود شراب خواری کرکے رات دن طرح طرح معاصی و کبائر میں مشغول رہا۔

(۵) اس نے کفر اور اسلام ظلم اور انصاف اور فسق و فجور اور عبادت میں فرق نہیں کیا۔

(۶) کفار حربی کی امداد میں اس نے اصرار کیا۔

(۷) اس نے اوامر و نواہی کی پروا نہیں کی۔ بالخصوص دار الحرب کی امداد کی ممانعت کے بارے میں جو آیت کلام مجید میں تاکید کے ساتھ آئی ہے، اس کی اطاعت نہیں کی اور خدا اور مخلوق کے نزدیک ملعون ہوا۔ چند بار اس معاملے میں نصیحت آمیز فرمان آداب داں اور مزاج داں لوگوں کے ذریعہ سے بھیجے گئے مگر یہ ہوشیار نہ ہوا۔ بلکہ حال ہی میں ایک لاکھ ہن سنبھا کو بھیجنے کی اطلاع گوش زد ہوئی۔ اس غرور و نخوت اور بدنصیبی کے عالم میں اپنے برے اعمال کو نہ دیکھنا اور دونوں جہان میں نجات کی امید رکھنا خیال خام ہے[1]"

ابوالحسن نے بادشاہ کے مقابلے کا انتظام کیا اور شیخ منہاج، شرزہ خاں مصطفےٰ خاں لاری وغیرہ کو لڑنے کی غرض سے بھیجا۔ ان امراء کو تاکیدی حکم دیا کہ "جہاں تک ممکن ہو بادشاہ کو زندہ گرفتار کرکے لائیں اور اس کی توہین نہ کریں" امراء نے کہا "عالمگیر کی طرف سے ہمارے دل زخمی ہیں، ہم سے اسکی عزت نہ ہو سکے گی"۔

اورنگ زیب اور ابوالحسن کی لڑائی

۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ کو اورنگ زیب نے حصار گولکنڈہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اور مورچے تقسیم کرکے قلعہ فتح کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ دکنیوں نے قلعہ سے گولے اور بان پھینکنا شروع کردیئے شاہی فوج نے بھی جواب دیا۔ قلیچ خاں بہادر گولہ لگنے سے مرگیا۔

شہزادہ محمد معظم کی گرفتاری

اورنگ زیب نے اپنے بیٹے محمد معظم سے بیجاپور کے محاصرے کے وقت بے ناخوش [illegible]

[1] سیر المتاخرین جلد اول و خافی خاں جلد دوم [illegible]

کے محاصرے میں محمد معظم کو دست راست پر تعینات کیا گیا تھا۔ اسی اثنا میں ابوالحسن نے شاہزادے کے پاس یہ پیام بھیجنا شروع کر دئے کہ وہ بادشاہ سے اس کا قصور معاف کرا دے۔ شاہزادے کا منشا تھا کہ اس نازک وقت میں ابوالحسن کی امداد سے گریز نہ کیا جائے بعض لوگوں نے بادشاہ سے اس کی چغلیاں کیں ادھر اس کی بیوی نورالنسا کی جس سے شہزادہ بہت محبت کرتا تھا شکایت ہوئی کہ ابوالحسن اور شاہزادے کے درمیان جو پیام سلام ہوتے ہیں وہ اسی کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ وہ بھیس بدل کر ابوالحسن کے پاس قلعے میں جاتی ہے۔ دونوں نے طے کر لیا ہے کہ بادشاہ، محمد معظم کی سفارش پر صلح کے لئے تیار نہ ہو تو شہزادہ ابوالحسن کے پاس قلعے میں آجائے۔ اسی کے ساتھ فیروز جنگ نے کچھ خفیہ خطوط جو گولکنڈے کے قلعہ میں بھیجے گئے تھے۔ بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کر دئے جن سے ان تمام امور کی تصدیق ہوگئی۔ شہزادے کے آدمیوں نے بہت کوشش کی کہ بادشاہ کا دل شہزادے کی طرف سے صاف ہو جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۸ ربیع الثانی سنہ ۱۰۹۸ھ کو شہزادہ مع بیٹے اور بیوی نورالنسا کے قید کر لیا گیا۔ اس کا تمام مال اور اسباب بھی ضبط ہو گیا کئی سال کے بعد یعنی سنہ ۱۱۰۷ھ میں شہزادے کو رہا کیا گیا۔

قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ اور اس کی فتح

محاصرے کے دوران میں ابوالحسن کے اکثر ملازم شیخ منہاج شیخ نظام وغیرہ بادشاہ کے پاس آگئے۔ بادشاہ نے انھیں خطابات اور مناصب عطا کئے۔

مصطفیٰ خاں عرف عبدالرزاق لاری، تاناشاہ کا بہت جاں نثار اور وفادار تھا۔ وہ آخر وقت تک اس کا رفیق و ہمدم رہا۔ دکنی قلعے سے برابر گولے اور پتھر پھینکتے رہے رات دن توپیں گرجتی رہتی تھیں جس سے شاہی فوج کو کافی نقصان پہنچتا تھا قلعہ کے فتح ہونے میں دیر ہو گئی۔ شاہی امرا میں سے فیروز جنگ اور صف شکن خاں جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے قلعے کی خندق تک ایک مہینے کی قلیل مدت میں مورچے پہنچا دئے اور خندق کو پاٹنے کا حکم دیا۔ عالمگیر نے وضو کرنے کے بعد اپنے ہاتھ سے ایک بورے میں ریت بھر کر اس کا منہ سیا۔ اور خندق میں ڈالا۔ دمدمے بنا کر ان پر توپیں نصب کی گئیں اور گولے برسائے گئے چونکہ محاصرے کی مدت بہت لمبی ہو گئی تھی۔ اس لئے اجناس سخت گراں ہو گئیں۔ گرانی کے باعث شاہی فوج کے اکثر امرا بددل ہو گئے اور ان کے [illegible] [illegible] بعض نے دکنیوں کے اتفاق سے رسد کا لشکر [illegible]

تیسری مصیبت یہ پیش آئی کہ لشکر میں وبا پھیل گئی جس سے بے انتہا تکلیف اور پریشانی پیدا ہو گئی نعمت خاں عالی نے جو عہد عالمگیری کا ایک مشہور ہزل گو شاعر تھا۔ اپنی تصنیف وقائع نعمت خاں میں اس محاصرے کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ مگر ہر جگہ ظرافت اور شاعری سے کام لیا ہے۔ اس بنا پر اس کے وقائع تاریخ نگاری کے اصول سے ہٹ گئے ہیں اور تاریخ کے طالب علم کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گرانی وغیرہ کی تکالیف سے متاثر ہو کر اکثر آدمی ابوالحسن کے پاس چلے گئے۔ اکثر نے خفیہ طور پر محصوروں کی اعانت کی۔ ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۰۹۸ھ کے آخر میں روح اللہ خاں نے رستم خاں بیجی کے ذریعے سے عبداللہ خاں بیجی سے سازش کی۔ عبداللہ خاں بیجی ابوالحسن کا بڑا معتمد تھا۔ وہ قلعہ گولکنڈہ کے ایک دروازے "کھڑکی" پر متعین تھا۔ رات کو روح اللہ خاں چند امرا کے ساتھ عبداللہ خاں کے اشارے سے قلعے میں داخل ہو گیا۔ ان لوگوں نے قلعے میں پہنچ کر دروازہ کھول دیا۔ شاہزادہ اعظم شاہ پہلے ہی سے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اور اپنی فوج کو لئے تیار کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی شہزادہ قلعے میں گھس گیا۔ اور اس طرح یہ قلعہ ایک طویل اور تکلیف دہ محاصرے کے بعد فتح ہو گیا۔

عبدالرزاق لاری نے اب بھی اپنے آقائے ولی نعمت کا حق نمک ادا کیا۔ مگر اسے ہتھیار لگانے کی مہلت نہ ملی۔ وہ بہادری کے جوش میں صرف ڈھال اور تلوار لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور اپنے بارہ آدمیوں کے ساتھ دولت خانے کے دروازے پر لشکر شاہی کے مقابلے میں ڈٹ گیا مگر قلعے کا دروازہ کھل چکا تھا۔ تمام قلعے میں عالمگیری لشکر طوفان کی طرح امنڈ آیا تھا۔ وہ تنہا کچھ نہ کر سکا۔ تاہم برابر نعرے لگائے جا رہا تھا کہ جب تک میرے بدن میں جان ہے اپنے آقا کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ آخر سر سے پیر تک اس کا جسم زخموں سے چور ہو گیا۔ مگر اس کے حوصلے میں فرق نہ آیا حتیٰ کہ اس کا منہ بھی زخمی ہو گیا اور پیشانی کا چمڑہ الٹ کر آنکھوں پر آگیا اور اس پردے نے اس کو دیکھنے سے معذور کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک آنکھ بھی گھائل ہو گئی۔ انجام کار اس کا گھوڑا جو خود بھی زخمی ہو چکا تھا اسے لے کر اس کے گھر چلا گیا[1]۔

ابوالحسن کی گرفتاری

اس واقعے کے بعد محل میں رونے پیٹنے کا شور برپا ہو گیا۔ ابوالحسن نے سب کو تسلی دی۔ پھر اپنے محل میں جا کر مسند پر بیٹھ گیا۔ اور امرائے شاہی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران میں کھانے کا وقت آگیا۔ ابوالحسن نے کھانا لانے کا حکم دیا۔ جس وقت روح اللہ خاں، مختار خاں وغیرہ شاہی امرا آئے تو ابوالحسن نے سلام میں سبقت کی اور نہایت وقار کے ساتھ ملائمت، فصاحت اور جوش کے ساتھ گفتگو کی۔ دن

[1] سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۳۶۷

نکلنے تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اتنے میں کھانا آگیا۔ حاضرین سے کھانے کی اجازت لی اور انھیں بھی کھانے میں شریک ہونے کے لئے مدعو کیا۔ بعض لوگوں نے تعجب سے پوچھا "کھانے کا یہ کیا وقت ہے ؟" ابوالحسن نے جواب دیا "میں اسی وقت کھاتا ہوں ۔"

روح اللہ خاں نے کہا "یہ تو صحیح ہے۔ مگر اس وقت کھانے کی طرف آپ کو رغبت کیونکر ہوگی"؟!

ابوالحسن نے کہا "واقعہ تو یہی ہے جو تم کہتے ہو۔ مگر میں خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ جو ہر وقت اپنے بندوں پر مہربان رہتا ہے اور انھیں رزق پہنچاتا ہے۔ اگرچہ میرے باپ دادا نے عزت کے ساتھ زندگی بسر کی تھی مگر میرے لئے یہ مقسوم ہو چکا تھا کہ اپنی عمر کا ایک حصہ فقیری میں گزار دوں۔ اس کے بعد اس کا فضل شامل حال ہوا تو اس نے مجھے ذرا سی دیر میں سلطنت عطا کر دی جس کا مجھے یا اور کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اب میرے دل میں کوئی ہوس اور آرزو باقی نہیں رہی۔ کروڑوں روپے میں نے صرف کر ڈالے۔ لاکھوں روپے لوگوں کو بخش دیئے۔ اب برے اعمال کی سزا میں جو زمانہ سلطنت میں مجھ سے سرزد ہوئے، بارگاہِ ایزدی سے مجھ پر عتاب فرمایا گیا ہے اور سلطنت چھین لی گئی ہے مگر میں اس پر بھی اس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری جان اور بقیہ زندگی ایک دین دار بادشاہ کے سپرد کر دی ہے" کھانا کھانے کے بعد ابوالحسن نے اپنی سواری کا گھوڑا منگا اور بڑے اطمینان سے موتیوں کا ہار پہن کر سوار ہوا اور امرائے شاہی کے ساتھ چلا۔ دروازے پر شاہزادہ محمد اعظم ایک چھوٹے سے خیمے میں منتظر تھا۔ امرا ابوالحسن کو شاہزادے کے پاس لے گئے۔ ابوالحسن نے موتیوں کی مالا اپنے گلے سے اتار کر شاہزادے کو نذر کی۔ شاہزادہ اس کو مطمئن کر کے بادشاہ کے پاس لے گیا۔

عالمگیر کا برتاؤ ابوالحسن کے ساتھ

عالمگیر نے ابوالحسن کا بہت احترام کیا اور خوراک، پوشاک، خوشبو وغیرہ اس کے لئے مقرر کر دی۔ یومیہ بھی دیا جانے لگا۔ چند روز کے بعد ابوالحسن کو دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا[۱]۔

صاحب سیر المتاخرین کے عالمگیر پر حملے

صاحب سیر المتاخرین نے ماثر الامرا۔ خافی خاں وغیرہ کے اتباع میں ابوالحسن کی رعایت سے حملۂ دکن کے حالات لکھتے وقت عالمگیر کے لئے نہایت برے الفاظ استعمال کئے ہیں اور ان کے لب و لہجے میں انتقامی جذبات نمایاں ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اس حملے کے تمام اسباب کو نظر انداز کر کے صرف عالمگیر کی طمع اور لالچ کو اس کا محرک قرار دیا ہے۔ آخری واقعہ لکھتے وقت ان کا انداز بیان دیکھئے :

عبارت

"شاہزادہ استمالۂ او نمودہ بحضور عالمگیر برد آں دا فراطمع نیز سلوک مناسب نمودہ بہ احترام نگہداشت و یومیہ بقدر معاش ضروری از خوراک و پوشاک و خوشبوئے وغیرہ مقرر ساختہ بعد چند روز در آں قلعہ دولت آباد نمودہ۔ در انجا مقید نگہداشت"۔

(سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۳۶۸)

عالمگیر نے اپنے معزز قیدی اور مخالف کے ساتھ جس شرافت اور فیاضی کا سلوک کیا اس کی تفصیلات چھپنے والی نہ تھیں۔ اس لئے لب کشائی کا موقع تو نہ تھا پھر بھی لالچ لکھ کر مورخ نے اپنے غصے اور نفرت کا ثبوت دے ہی دیا۔

ابوالحسن کی بیٹیاں اور ان کی شادی

ابوالحسن کی چار کنواری لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا اور یہ درخواست کی کہ مجھے وضو کے وقت بادشاہ کے ہاتھوں پر پانی ڈالنے کی عزت بخشی جائے میں اسی پر فخر کروں گی۔ عالمگیر نے اس کا یومیہ مقرر کر کے باپ کے پاس رہنے دیا۔ دوسری لڑکی کو سکندر والیِ بیجاپور سے بیاہ دیا اور قیدخانے میں اس کی رفاقت کے لئے اس کے پاس چھوڑ دیا۔ تیسری لڑکی عنایت خاں پسر اسد خاں کو بیاہی گئی۔ چوتھی کو خاندانِ نقشبندیہ کے ایک شخص سے منسوب کیا گیا۔ آخری رشتہ ابوالحسن کو پسند نہ آیا۔

ابوالحسن کی وفات

ابوالحسن نے چھپن[۵۶] سال کی عمر میں ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۱۱ھ کو انتقال کیا۔ اس کی قبر گولکنڈے میں ہے۔ اس کی عمر کے چھپن[۵۶] سال، چودہ چودہ سال کے چار دوروں میں منقسم ہیں۔ لڑکپن، فقیری، سلطنت، قید یہ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی کا ہر دور برابر برابر کی مدت میں تقسیم ہوا۔ فقیری کے چودہ سال ابوالحسن نے اپنے پیر طریقت سید راجو کی خدمت میں بسر کئے۔

عمارات

ابوالحسن کو اپنے اسلاف کی طرح عمارات کا بہت شوق تھا۔ ۱۰۸۲ھ میں اس نے آٹھ لاکھ روپیہ صرف کر کے ایک عالی شان عمارت موسیٰ ندی کے کنارے "چار محل" کے نام سے بنائی۔ پھر اسی نام سے ایک محلہ آباد کیا۔ آٹھ لاکھ روپیہ مسجد کی تعمیر پر خرچ کیا۔ پہلے اس مسجد کا نام بیت العتیق تھا۔ ۱۰۹۰ھ میں "مکہ مسجد" کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ مسجد اب بھی موجود ہے۔

[۱] سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۳۶۸

نظم

اے ابرِ رواں!

از: اختر شیرانی

اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن اے ابرِ رواں
اور چوم آ جا کر روئے وطن، ابروئے وطن اے ابرِ رواں
دامن میں چھپا لا بوئے وطن، خوشبوئے وطن اے ابرِ رواں
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن جا سوئے وطن اے ابرِ رواں!
اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں، میرا غمِ دل یارانِ وطن کو جا کے سُنا
اس بلبلِ دشتِ غربت کا افسانہ چمن کو جا کے سُنا
ہر سنبل و گُل کو جا کے سُنا ہر سرو و سمن کو جا کے سنا
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن جا سوئے وطن اے ابرِ رواں!
اے ابرِ رواں!

کہنا کہ دیارِ غربت میں اِک غمزدہ روتا رہتا ہے
دن رات تمہاری فرقت میں منہ اشکوں سے دھوتا رہتا ہے
گلہائے محن کو آنسوؤں کے تاروں میں پروتا رہتا ہے
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن جا سوئے وطن اے ابرِ رواں!
اے ابرِ رواں!

کہنا کہ وطن سے ہو کے جدا ہم سیرِ گلستاں کھو بیٹھے
وہ صحنِ چمن، وہ جلوۂ مہ، وہ حسنِ بہاراں کھو بیٹھے
وہ شوخیٔ گل، وہ رنگِ سمن، وہ نکہتِ ریحاں کھو بیٹھے
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن جا سوئے وطن اے ابرِ رواں!
اے ابرِ رواں!

کہنا کہ ہر اک راحت سے یہاں بیگانہ سے ہیں مجبور سے ہیں
قابو میں نہیں ہے یاد تری، اے خاکِ وطن مجبور سے ہیں
غمگین سے ہیں، غمدیدہ سے ہیں، رنجیدہ سے ہیں رنجور سے ہیں
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن جا سوئے وطن اے ابرِ رواں!
اے ابرِ رواں!

علمی

شاعر اور تخئیلی دنیا

[جدید نفسیات کی روشنی میں]

از:- شبیر محمد اختر

شعرا اور ادبا کے کلام کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ ہستیاں اس قدر بلند پروازی کیونکر حاصل کرتی ہیں ہم جیسے ایک عام ناظر کے لئے ان کا کلام حیرت انگیز ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے کلام کی تاثیر ہمیں بھی ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ اور جس تک رسائی کی قوت ہمارے تخیل میں نہیں ہوتی۔ اگر آپ کسی شاعر سے اس کا سبب دریافت کریں تو شاید وہ بھی آپ کو جواب نہ دے سکے۔ یا اس کا جواب تسلی بخش نہ ہو۔

آیئے ہم ذرا اس تخئیلی دنیا کے اندر جھانک کر دیکھیں۔ شاید ہمیں کچھ معلوم ہو سکے کہ ہمارے شعرا ــــ کے کلام کا خاصہ کیا ہے۔ اور ان کی تخئیلی قوت کیسی ہے؟ شاعر ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ وہ ایک عام شخص کے قریب ہو سکے، اور عوام کا آئینہ دار ہو۔ بعض تو اس قدر ہمارے نزدیک آ جاتے ہیں کہ ان کے خیال میں ہر انسان کبھی نہ کبھی شاعری کرتا ہے، اور یہ کہ جب دنیا کا اختتام ہونے لگے گا تو شاعر اس وقت باقی رہے گا۔ جب تک آخری انسان زندہ ہے۔

تخئیل کی دنیا میں جھانکتے ہی ہمیں سب سے پہلے جس چیز کو دیکھنا ہوگا۔ وہ بچہ ہے۔ اسی میں ہمیں تخئیل کی ابتدا نظر آئے گی۔ بچے کا محبوب ترین اور جاذب توجہ مشغلہ کھیل ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو یوں بیان کر دیں کہ بچہ جب کھیل میں مشغول ہو تو وہ بالکل ایک تخئیلی ادیب کی مانند ہوتا ہے تو بے محل نہ ہوگا۔ کیونکہ بچہ نہ صرف اپنی نئی دنیا بناتا ہے۔ بلکہ اپنی دنیا کی اشیاء کو اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ یہ خیال کہ کھیل کھیل ہی ہوتا ہے غلط ہے بچہ کھیل کو نہایت سنجیدگی سے دیکھتا ہے۔ اور اپنا سارا جذبہ (EMOTION) اس پر صرف کر دیتا ہے کھیل کے مقابل حقیقت اس کے لئے اتنی سنجیدہ نہیں ہوتی۔ بچے کے لئے کھیل کی دنیا ہی حقیقت ہے۔ اور وہ اسے حقیقت سے بہت دور رکھنا چاہتا ہے جس جس چیز کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ یا جو تصور یا منظر اسے پیارا محسوس ہوتا ہے۔ وہ حقیقی دنیا سے لے لیتا ہے بچے اور حقیقت کے اس تعلق کے پیش نظر ہی ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچے کے کھیل۔ اور بیداری کے خواب (DAY DREAMING) میں نمایاں فرق ہے۔

شاعر بھی بالکل بچے کی طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے اپنے واہمہ (PHANTASY) سے ایک دنیا بناتا ہے۔ اور اس پر اپنی تمام تخئیل ختم کر دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا کمال اسی میں ہے کہ وہ اس دنیا کو حقیقت سے دور رکھے۔ زبان نے بچوں کے کھیل اور شاعرانہ تخلیق کے رشتے کو محفوظ کر رکھا ہے جس کا نتیجہ بعض ایسی جدید ترکیبیں ہیں جن کا تعلق گو حقیقی زندگی سے ہوتا ہے مگر ان کو ہم کھیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو ان حقیقت کو کھیل کے رنگ میں پیش کرتے ہیں ان کو اداکار (PLAYER) کہتے ہیں تخئیل کی اس شاعرانہ دنیا کا بے حقیقت وجود اپنے اندر ادب کا حقیقی پہلو رکھتا ہے۔ ہمارے ادب کے بہت سے شعبے اسی "بے حقیقتی" کے مرہون منت ہیں کیونکہ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ہماری زندگی میں رونما ہوں تو ان سے ہم لطف اندوز نہیں ہو سکتے لیکن بعض دردناک اور تکلیف دہ حقیقتوں کا احساس جب شاعری کا جامہ پہن لیتا ہے۔ تو وہ سننے والوں کے لئے روحانی لذت کا باعث بنتا ہے۔

بچے جوان ہو کر کھیل ترک کر دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انھیں کھیل سے جو خوشی حاصل ہوتی تھی۔ وہ انھوں نے چھوڑ دی ہے لیکن وہ لوگ جو انسانی ذہنی زندگی کے متعلق ذرا بھی علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ خوشی جس سے ایک بار لطف اندوز ہوا جائے اسے کوئی چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتا حقیقتاً ہم کسی چیز کو چھوڑتے نہیں بلکہ اس کا تبادلہ کسی دوسری چیز سے کر لیتے ہیں۔ جب آپ کسی کو ایک عادت ترک کرتا ہوا پائیں تو جان لیجئے کہ اس نے کوئی اور عادت اختیار کر لی ہے۔ اسی طرح جب انسان جوان ہو کر کھیل کو ترک کر دیتا ہے تو وہ صرف حقیقی اشیاء سے اپنا تعلق قطع کر لیتا ہے۔ اور کھیلنے کی بجائے وہ ایک واہمہ کی تخلیق کا بانی بنتا ہے۔ وہ پھر ہوائی قلعے بنانے لگتا ہے اور بیداری کے خواب کی تخلیق اسی سے ہوتی ہے۔ ہماری تو یہی رائے ہے کہ بہت سے لوگ عمر بھر اسی واہمے کی دنیا میں ہی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے مدت دراز سے طاق نسیاں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اور اس کی اہمیت کو [illegible]

سمجھنے کی کوشش نہ کی گئی تھی۔

بچے کے کھیل کا سمجھنا آسان ہے۔ مگر انسانی واہموں (PHANTASIES) کا جاننا بہت مشکل ہے۔ یہ درست ہے کہ بچہ تنہا کھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا چند بچے مل کر اپنا ایک مخصوص سا ماحول پیدا کر لیتے ہیں یہی ان کی دنیا ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑوں سے اپنا کھیل مخفی رکھنے کی کوشش نہیں کرتے خواہ ان کا کھیل بڑوں کے مذاق سے کتنا ہی غیر متعلق ہو۔ اس کے برخلاف بڑے اپنے بیداری کے خواب کے افشا سے خوف کھاتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھیں شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ اس کو ہمیشہ دوسروں سے چھپائے رکھتے ہیں بیداری کا خواب انھیں ایک بے بہا کی طرح عزیز ہوتا ہے شاید وہ اپنے تمام جرائم اور گناہوں کا اقرار کر لیں مگر اپنے بیداری کے خواب کا اظہار کرنا ان کے لئے ناممکن ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک انسان یہی خیال کرتا ہے کہ ایسے خیالی پلاؤ شاید وہ اکیلا ہی پکاتا ہے۔ لیکن شاید اسے معلوم نہیں کہ اس واہمے میں دنیا کا ہر ایک انسان مبتلا ہے بیداری کا خواب کھیل کے تسلسل ہی کا نام ہے۔ اور ان دونوں کے بیچ میں وہ ہوتی ہے کہ ایک کا رنجا ہوتی ہے۔ وہ اس کے اس فرق میں جو ہمیں بچے کے کھیل اور بڑے کے واہمے میں نظر آتا ہے موجزن نظر آتی ہے۔

بچوں کے کھیل کا اندازہ اس کی خواہشات سے معلوم ہو سکتا ہے ——— بلکہ اس کی یہی ایک تمنا ہے۔ اور یہی ایک تمنا اسے بڑھنے میں مدد دیتی ہے بچے ہمیشہ ایسے کھیل کھیلتے ہیں۔ جن میں وہ بڑوں کا کردار بن سکیں۔ بچے اپنے بڑوں کی اس زندگی کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو زندگی ان کے سامنے ہوتی ہے۔ ان کو بڑا ہو جانے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اس خواہش کو چھپاتے نہیں لیکن بڑوں کے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایک طرف وہ محسوس کرتے ہیں کہ واہمہ اور بیداری کا خواب بھی ایک کھیل ہے جو انھیں کھیلنا نہیں چاہئے۔ بلکہ ان کو زندگی کی حقیقتوں میں اپنا راستہ ڈھونڈنا چاہئے لیکن دوسری طرف کی بعض تمنائیں جن سے واہمہ پیدا ہوا۔ ایسی ہوتی ہیں جن کو وہ ہمیشہ کے لئے مخفی رکھنا چاہتے ہیں اس لئے وہ خود بخود اپنی ان تمناؤں کو بچپنا سمجھ کر خود بخود شرمسار ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بات اس قدر پوشیدہ ہے تو پھر ہم اس انسانی رجحان کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں جو واہمے کی تخلیق کرتا ہے؟ بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کو احتیاج (NECESSITY) کی غیر ضروری مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے دلی جذبات ——— خواہ تکلیف کا احساس ہو یا خوشی کا برملا ظاہر کر دیں۔ یہ لوگ اعصابی شکایات میں مبتلا ہیں جنھیں مجبوراً اپنے طبیب کے سامنے اپنی دوسری تکالیف کے ساتھ اپنے واہمے کی حقیقت کو بھی بیان کرنا ہے تاکہ وہ ذہنی کشمکش کی عصبیت سے نجات پا سکیں۔ ہمارے علم کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ ہماری تحقیقات نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ مریض ہمیں کوئی ایسی بات نہیں بتاتے جو ہم تندرست لوگوں سے بھی نہ سن سکتے ہوں۔

اب ذرا بیداری کے خواب کی خصوصیات کا مطالعہ کریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خوش و خرم لوگ واہمے میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ اس کا شکار صرف محروم لوگ ہی ہوتے ہیں تشنۂ تکمیل خواہشات اور تمنائیں ہی واہمہ پیدا کرتی ہیں ہر ایک واہمہ بس ایک تمنائی تخیلی صورت ہی کا نام ہے جس کی نشوونما غیر تسلی بخش حقیقت پر ہوتی ہے۔ ان تشنۂ تکمیل تمناؤں کی تخلیق جنس، کیرکٹر اور حالات کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اور ان کی تقسیم دو طرح کی جا سکتی ہے ———

یا تو ان میں امنگ ہوگی اور ان کا خالق متمنی ہوگا۔ اپنی عزت و جاہ کا

یا وہ اپنے اندر عشق کا پہلو لئے ہوئے ہوں گے۔

تخیل کی یہ مختلف اشکال جو مختلف رنگوں میں ذہن انسانی میں نمودار ہوتی ہیں ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتیں بلکہ متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ زندگی کے نئے نئے تجربات ان اشکال کو بھی نئی صورت دیتے رہتے ہیں اس لئے واہمہ اور وقت کے تعلق کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے سلسلے میں تمنا منسلک ہو کر واہمہ یا بیداری کے خواب کی صورت اختیار کر لیتی ہے یعنی بچپن کی کوئی تمنا جو کھیل کے ذریعے پوری ہوتی رہی ہو۔ جب حال میں کسی اس بارے میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ واہمہ بن کر مستقبل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ———

ایک یتیم لڑکا، بے یار و مددگار کسمپرسی کی حالت میں آپ کے پاس آتا ہے آپ اسے ایک سفارشی رقعہ دے کر کسی امیر تاجر کے پاس بھجوا دیتے ہیں۔ اب راہ میں وہ ایک تخیل کی دنیا پیدا کرے گا ——— تاجر اسے نوکر رکھ لیتا ہے۔ لڑکا دیانت داری اور محنت سے اس قدر کام کرتا ہے کہ اس کا آقا اس سے صرف خوش ہی نہیں ہوتا بلکہ اسے اپنا متبنیٰ بنا لیتا ہے۔ اور بالآخر اس کی شادی تاجر کی اکلوتی بیٹی سے ہو جاتی ہے۔ اب وہ ساری جائداد کا واحد مالک ہے۔ اور کاروبار میں برابر کا حصہ دار، یہ ہے اس کا حال۔ یہ حال دراصل ماضی کی یادگار ہے۔ جب وہ اپنے گھر میں خوشی خوشی کھیلا کرتا تھا۔ اس کے والدین تھے۔ اور وہ تمام گھر کا راجہ تھا۔ اس مثال سے عیاں ہو جاتا ہے کہ کس طرح ماضی کی ناکام تمنائیں حال کے ایک واقعے سے واہمے کی صورت اختیار کر کے اس کے مستقبل کی تشکیل کرتی ہیں۔

اب شاعر کو لیجئے۔ اس کے اشعار کیا ہیں یہی تخئیل کی ایک نئی دنیا۔ اور ماضی، حال اور مستقبل کا ایک سلسلہ۔ شاعر کی زندگی کے واقعات کا پرتو ہی اس کی شاعری ہے ہم اس کے اشعار پڑھ کر ان کا تعلق شاعر کی گزشتہ زندگی سے قائم کر سکتے ہیں بعض اوقات شاعر کے بچپن کا کوئی واقعہ اس کے ذہن پر ایسا حاوی ہوتا ہے کہ وہ تمام عمر شاعر کے تخئیل پر حاوی رہتا ہے حضرت اختر شیرانی کی نظم ع "او دیس سے آنے والے بتا" اس کی ایک شاندار مثال ہے۔ شاعر یا ادیب بچپن کے تاثرات ہی سے متاثر ہو کر اپنے ذہن کو خاص طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کی وہ تمنائیں اور آرزوئیں جنہیں وہ کھیل کے ذریعے پورا کر لیا کرتا تھا۔ اب حقیقت کی روشنی میں ناقابل تکمیل نظر آتی ہیں۔ ان کے متعلق وہ ذہن میں مختلف تصورات بناتا رہتا ہے۔ واہمہ کو ہر انسان چھپاتا ہے لیکن عام انسان اور شاعر میں یہ فرق ہے کہ شاعر وہ بات اشعار کی رنگینی میں چھپا کر بیان کر دیتا ہے مگر عام انسان اسے بیان کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے

تخئیل کی تخلیق کے سلسلے میں مذہبی قصوں اور قومی روایات اور پریوں کی کہانیوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان قصوں اور کہانیوں میں قومی آرزوئیں نہاں ہوتی ہیں۔ اور جوان انسانوں کے جذبات کا عکس ان کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔

مضمون کے شروع میں ہم نے کہا تھا کہ شعراء کے کلام کی تاثیر ہمیں بھی تخئیل کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ اس سلسلے میں حکمائے علم النفس کی تحقیقات ابھی تک پوری نہیں ہو سکی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس وقت صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید ان کے ذہنی تصورات اور تخیلات ہمارے واہمے سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے ہم خود بخود ان کی طرف کھنچے جاتے ہیں۔

ایک عام شخص اگر ہمیں بتا دے کہ وہ کیسے کیسے ہوائی قلعے بناتا رہتا ہے۔ تو اس کی بات ہمیں زیادہ لطف نہ دے سکے گی کیونکہ ان باتوں کو سنکر خود بخود ہماری طبیعت میں ایک قسم کی کوفت سی پیدا ہونے لگتی ہے لیکن جب کوئی ادیب اسی بات کو ایک ڈرامے کی صورت میں پیش کرے۔ یا جب ایک شاعر اپنے واہمے کو شعریت کا جامہ پہنائے تو اسے سن کر ہمارے دلوں میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ذرا ان اشعار کو پڑھئے اور سر دُھنیئے!

سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!
بہار کیف کی بدلی اتر آئے گی وادی میں
سرور و نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
[illegible]

سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!
ابھی سے جاؤں اور وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں
بچھا دیں فرشِ گل، وادی میں گلزاروں سے کہہ آؤں
لٹا ئیں مستیاں، پھولوں کی مہکاروں سے کہہ آؤں
کہ سلمیٰ، میری سلمیٰ، نور برسائے گی وادی میں!
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!
بہار وادیٔ رنگیں کو یہ مژدہ سنا آؤں
زمیں کو نکہتِ گل ہائے مشکیں سے بسا آؤں
اور اس پر نازنیں کلیوں کا اک بستر بچھا آؤں
کہ وہ نازک بدن ہے اور تھک جائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

یہ بات اگر کوئی سادہ الفاظ میں بیان کرتا تو شاید ہمیں دھکا لگتا لیکن ان اشعار نے ہمیں بھی اسی تخئیل کی دنیا میں جا پھینکا ہے جس میں شاعر سرگرداں تھا۔ شاعر نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔

اوّلاً یہ کہ اس نے اپنے ذاتی ہوائی قلعے کو اس طرح تبدیل کیا ہے اور اسے ایک ایسا لباس پہنا دیا ہے جس نے واہمہ کی صورت ہی بدل دی۔

دوسرے۔ وہ اس واہمے کو اس طریقے سے پیش کرتا ہے کہ اس میں جمالیاتی خوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے سن کر سامع لطف اندوز ہوتا ہے یہی جمالیاتی مسرت ہماری ذہنی کشمکش پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دماغ اس جمالیاتی کیفیت سے جس قدر زیادہ مانوس ہوگا۔ اسی قدر شاعر کے اشعار اس کے دل پر اثر کریں گے۔ شاعر جس قدر فنکارانہ طریق سے اپنے واہمے کو پیش کرے گا اسی قدر ہم اپنے واہمہ کو اس کے خیالات کا آئینہ دار خیال کرنے میں کم شرم محسوس کریں گے۔

آج ہم رومانی شاعری کے کیوں اس قدر دلدادہ ہیں محض اس لئے کہ اس کی تہ میں خود ہمارے خیالات اور تخیلات ہوتے ہیں۔ جن کا بیان شاعر کی زبان سے سن کر ہمارا دل ہلکا ہو جاتا ہے ——— ہے جدید نفسیات کا نظریہ جو ڈاکٹر فرائڈ پیش کرتے ہیں +

اے موجۂ رواں! (نظم)

از:- ایس اے رحمٰن ایم اے آئی سی ایس، ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج

(اس نظم میں علامہ اقبال مرحوم کے مصرع "ستم اگر میرود گر ز دم نسیم" کی تفسیر و توضیح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔)

اے موجۂ رواں! لبِ ساحل سے دور رہ
خو کردۂ خرام! سلاسل سے دور رہ
رکھ جام کو نگوں ۔ غمِ حاصل سے دور رہ
صادق ہے تیرا عشق تو منزل سے دور رہ!

منظر ہزار آئیں گے اثنائے راہ میں
دل کو ترے لبھائیں گے اک اک نگاہ میں
زنہار! دام پھیلا ہے ہر جلوہ گاہ میں
دامن جھٹک کے چل ۔ دمِ قاتل سے دور رہ!

کہسار و باغ و راغ کی عشوہ طرازیاں
ریحان و یاسمن کی گلستاں نوازیاں
مینا و چنگ و رقص کی سب چارہ سازیاں
دیکھ اور دور رہ! بسمِ محفل سے دور رہ!

دل دردمند ہو ترا ۔ خاموش ہو زباں!
آیا جو لب تلک ۔ ہے غمِ عشق داستاں!
کیوں گردِ راہ بن کے رہے میرِ کارواں؟
مجنونِ دشت! پردۂ محمل سے دور رہ!

آہِ جگر گداز، نہ ہو سائل اثر
آبِ سرشکِ غم سے رہے آشنا نظر
اس راہ کی تلاش نہ کر، جو ہو بے خطر
مشکل اگر ہے سہل تو مشکل سے دور رہ!

کچھ اور چیز عشق ہے ۔ کچھ اور ہے ہوس
یہ بندگی کا زہر ۔ وہ آزادیوں کا رس
بیگانہ لطفِ رم سے ہے پابستۂ قفس
جس دل میں ذوقِ رم نہیں اس دل سے دور رہ!

حالات و سوانح

شیلے (زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے)

از: عبدالشکور ایم-اے-

انیسویں صدی کا آغاز ہے۔ فرانس کا انقلاب بھی انگلستان کی قدامت پسندی میں کوئی فرق نہیں لاسکا۔ ایٹن کا مشہور مدرسہ بدستور فرنگی امرا کے بچوں کو قدامت پسندی کے رنگ میں رنگ رہا ہے۔ اس مدرسے میں ایک عجیب قسم کے جور وستم کا دور دورہ ہے۔ یہاں یہ رسم ہے کہ طاقتور لڑکے کمزور لڑکوں پر رُعب ڈالا کریں اور اُن سے طرح طرح کی خدمات لیا کریں۔ اس طرز جفا سے کم ہی لوگوں کو شکایت ہو سکتی ہے۔ کوئی حساس رُوح تڑپے بھی تو کون سنتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک بہت بڑا فرنگی رئیس اپنے پوتے کو ایٹن بھیجتا ہے تاکہ وہ یہاں کی فضا میں رہ کر فرنگستان کا ایک اچھا شہری بن جائے۔ اس بچے کا نام شیلے ہے۔ وہ بلا کا حسین ہے۔ نزاکت میں لڑکیوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کے گورے رنگ کے ساتھ اس کی نیلی آنکھوں اور سیاہ گھنگریالے بالوں نے اُسے اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے۔ اس کی طبیعت انتہا درجے کی حساس ہے۔ رعب جمانے والوں کیلئے اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا ہے۔

وہ سب شیلے کی طرف لپکتے ہیں مگر جلد ہی اُن کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔ وہی نازک اندام بچہ اب ایک وحشی درندے کی طرح ظلم کے مقابلے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی نیلی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی دیکھتے ہوئے سب پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ شیلے کو پہلی بار پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں انسان کو اکثر جور وستم سے واسطہ پڑتا ہے۔ اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ دنیا مظلوموں سے بھری پڑی ہے۔ اس حسین بچے میں بغاوت کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ مدرسے کی اکثر روایات کے خلاف چلنا شروع کر دیتا ہے۔ یعنی کھیلوں کی بجائے اس کی توجہ زیادہ تر کتابوں کی طرف ہے، وہ اپنے بال نہیں سنوارتا، خوبصورت اور نازک گلے پر کالر کھلے رکھتا ہے۔ ان باتوں سے بغاوت کی بُو آتی ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ وہ کسی کے اقتدار کو برداشت نہیں کرتا۔ مدرسے میں وہ ایک دیوانہ مشہور ہو جاتا ہے مخالف نگاہیں ہر طرف سے اس کی طرف اٹھتی ہیں۔

شیلے کی باغیانہ طبیعت والٹیر، دیدیرو، ہالبک اور گوڈون ایسے فلسفیوں کے مطالعے سے فروغ پاتی ہے۔ خاص طور پر گوڈون کی معرکتہ آلارا تصنیف "پولٹیکل جسٹس" اسے بہت بھاتی ہے۔ گوڈون کی دنیا میں ظلم، پابندی اور مجبوری کا نام نہیں۔ ہر طرف آزادی ہی آزادی ہے۔

مذہب اور رسم ورواج کی کوئی قید نہیں۔ خدا کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں محبت بھی آزاد ہے اور نفرت بھی۔ یہ باتیں اس حسین بچے کی طبیعت میں ہیجان سا پیدا کرتی ہیں۔ وہ کتاب ہاتھ میں لیکر مدرسے کے باہر، ندی کے کنارے، سبز گھاس پر بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے۔ آج وہ اپنے ننھے سے دل کے ساتھ ایک حسین عہد کرتا ہے۔ وہ زندگی میں کبھی بھی خودغرضی اور ظلم کا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ ہمیشہ جفا پرستی کی مخالفت کرے گا اور حُسن کی پرستش کرنا اس کا شیوہ ہوگا۔ ایٹن کے مدرسے نے ایسا طالبعلم شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔

تعطیلات ہونے پر یہ حسین باغی اکثر گھر آتا ہے۔ ہر طرف سے اُس کی نازبرداری ہوتی ہے۔ اس کی چار خوبصورت بہنیں اور ایک ننھا بھائی اس کے لئے تفریح کا کافی سامان ہیں۔ قدامت پسند اور مذہب پرست گھرانوں میں جب کوئی بچہ باتیں کرنا سیکھے تو اُسے سب سے پہلے خدا کا نام ازبر کرایا جاتا ہے۔ شیلے اپنے ننھے بھائی کو شیطان کا نام لینا سکھاتا ہے۔ بزرگوں کی مشکوک نگاہیں اس کی طرف اٹھتی ہیں۔ شیلے جسے سب سے زیادہ چاہتا ہے وہ اس کے چچا کی حسین وجمیل لڑکی ہیریٹ ہے۔ دونوں کی شکل ایک سی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے۔ شیلے کی بڑی بہن الزبتھ اور ہیریٹ کو ایک دوسرے سے بہت پیار ہے۔ شیلے اکثر دونوں کو ساتھ لیکر قبرستان کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہاں کسی شکستہ قبر پر تینوں بیٹھ جاتے ہیں۔ دونوں لڑکیاں اسے اپنے درمیان بٹھاتی ہیں اور اُس کی باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سنتی ہیں۔ وہ انسانی دنیا کی تصویر نہایت سادگی سے کھینچتا ہے۔ ایک طرف گنہ میں ڈوبے امیر اور پادری لوگ۔ دوسری طرف نیکی یعنی فلسفی، بیکس اور مفلس

لوگ بھی ادھر مذہب ظلم کی حمایت میں، ادھر گوڈون اور اس کی تصنیف "پولیٹیکل جسٹس"۔ جب وہ لڑکیوں سے محبت پر گفتگو کرتا ہے تو بھی گوڈون کا فلسفہ ہی بیان کرتا ہے۔ بھلا محبت میں شادی کا کیا دخل۔ آزاد محبت کو زنجیروں میں کیوں جکڑا جائے۔ تو کیا شادی ایک زنجیر ہے، ہیریٹ بھولے پن سے پوچھتی ہے۔ شیلے اب ذرا جوش میں آجاتا ہے۔ ہاں زنجیر ہی تو ہے، تم کہو گی کہ یہ گراں معلوم ہونے والی زنجیر نہیں ہے — اگر یہ بات ہے تو پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہیریٹ کے منہ سے مذہب کا لفظ نکلنے پر تو شیلے برس ہی پڑتا، مذہب کیا چیز ہے، خدا کیا ہے۔ اس دنیا میں اسقدر ظلم اور برائی کا مطلب یہ ہے کہ یا تو خدا ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ ایک کمزور خدا ہے اور برائی کی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور زیادہ خود ایک برا خدا ہے۔

اس تمام گفتگو میں بہن بھائی کا ساتھ دیتی ہے۔ اس حالت میں ہیریٹ کیلئے سوائے خاموش رہنے کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ شیلے ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے آنکھیں چمکدار، نازک گلے پر کھلے کالر اور بال جیسے ریشم ——!

سکول سے فارغ ہو کر اب شیلے آکسفورڈ آچکا ہے۔ یہاں آنے کے چند ہی دن بعد اُس کی ملاقات ایک اور لڑکے سے ہوتی ہے جسے اپنا گرویدہ بنا لینے میں اسے کوئی دیر نہیں لگتی۔ اس لڑکے کا نام جیفرسن ہوگ ہے۔ اپنی محبوبہ کو شیلے اکثر خط لکھتا رہتا ہے مگر وہ خط کیا ہوتے ہیں۔ اچھے خاصے فلسفیانہ وعظ۔ ہیریٹ سمجھتی ہے اسے شیلے کی محبت کا یقین ہے۔ وہ بھی اسے چاہتی ہے۔ مگر کیا ایسے انسان سے جس کے خیالات اسقدر "خطرناک" ہوں شادی کرنا ٹھیک ہوگا، کیا شیلے جیسے بے پناہ انسان کی زوجیت اُسے خوش رکھ سکے گی۔ ایک حسین لڑکی کے دل میں ان خیالات کا آنا کوئی عجیب بات نہیں کم ہی حسین عورتیں خطرناک خیالات کو پسند کرتی ہیں۔ حسن فطرتاً قدامت پسند ہوتا ہے۔ جب شیلے کی بہن کو ہیریٹ کے ان خیالات کا پتہ چلتا ہے تو وہ فوراً بھائی کو اطلاع دیتی ہے۔ شیلے کو یقین آجاتا کہ وہ جا ہاتھ سے جا رہا ورنہ ہیریٹ کی اس ذہنی کشمکش کا کیا مطلب — محبت میں نیک و بد کی کسے تمیز ہوتی ہے۔ وہ فوراً گھر آتا ہے۔ ہیریٹ سے ملتا ہے اور اسے انتہا درجہ کی بے مروّت اور سرد پاتا ہے۔ اُس کی ناامیدی کی انتہا نہیں رہتی۔ آدھی رات تک قبرستان میں گھومنے کے بعد گھر آتا ہے۔ ایک زہر کی پڑیا اور ایک بھرا ہوا پستول سرہانے رکھ کر سو جاتا ہے۔ صبح اٹھتے ہی اپنے دل کا غبار اپنے دوست کو خط لکھ کر نکالتا ہے۔ اس کی نظروں میں ہیریٹ کا کوئی قصور نہیں۔ تمام جرم ہے ناروا داری کا۔ آج سے وہ اس دنیا میں ناروا داری اور تنگ نظری کا دشمن ہے۔ واپس کالج جاتے ہی وہ ایک مقالہ "دہریت کی ضرورت" کے عنوان سے لکھتا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ اسے چھپوا کر یونیورسٹی میں مفت تقسیم کر دیا جائے۔ کیوں نہ خدا کے نہ ہونے کو دنیا پر ثابت کر دیا جائے۔ اس بات کا پتہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو چلتا ہے تو وہ شیلے سے استفسار کرتے ہیں۔ اس سے سوال کرتے وقت اُن کے لہجہ میں تیزی ہوتی ہے۔ شیلے کو غصہ آجاتا ہے۔ انہیں یہ کہتے ہوئے کہ ایک آزاد ملک کے ایک آزاد شہری سے گفتگو کرنے کا یہ طریقہ نہیں یہ ان کے سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسے یونیورسٹی سے ہمیشہ کیلئے نکال دیا جاتا ہے۔ جب اس کے دوست کو پتہ چلتا ہے تو وہ ایک احتجاجی خط افسروں کے نام لکھتا ہے۔ جس کے جرم میں اُسے بھی یہی سزا ملتی ہے۔

شیلے کا باپ اپنے بیٹے کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ مگر شیلے تو اپنے خیالات کی خاطر سب کچھ چھوڑ دینے پر آمادہ ہے۔ دونوں دوست سیدھے لندن آتے ہیں۔ شیلے رہنے کے لئے پولینڈ سٹریٹ میں مکان لیتا ہے کیونکہ پولینڈ کے نام کو آزادی سے وابستگی ہے۔ ہوگ کی اپنے والد سے نہیں بگڑتی، وہ بیرسٹری کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ لندن کی زندگی میں شیلے کو تنہائی ستاتی ہے۔ اسے محبت میں ناکام رہنے کا خیال دکھ پہنچاتا ہے۔ مگر اس خیال میں ہیریٹ کو اب کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ تو اُس کے لئے کبھی کی مرچکی۔ اس کے غور کرنے کیلئے اب زندگی کے اور گہرے مسائل ہیں۔ اسے مالی مشکلات کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اُس کی بہنیں اُسے اپنے جیب خرچ بھیجتی رہتی ہیں۔ اس لئے اس کا وقت گزرنے لگتا ہے۔

اب اس من چلے فلسفی کی ملاقات ایک اور چھوٹی سی لڑکی سے ہوتی ہے۔ یہ لڑکی اس کی پہلی محبوبہ کی ہمنام ہے۔ شیلے اس کے سامنے اپنے خیالات کی تشریح ایک ارمان بھرے انداز میں کرتا ہے۔ بھولی بھالی لڑکی دل و جان سے فدا ہو جاتی ہے۔ شیلے اسے بتاتا ہے کہ دنیا میں ظلم سب سے بُری چیز ہے۔ مگر جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کی شاگرد پر گھر ہی میں ظلم ہوتا ہے۔ یعنی اُسے اسکی مرضی کے خلاف سکول بھیجا جاتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتا ہے۔ ایک ہی ملاقات میں سب باتیں طے

کرلی جاتی ہیں اور اگلے دن دو حسین جیزیں جن کی عمروں کا مجموعہ بھی ابھی ۳۵ سال نہیں ہوا۔ سکاٹ لینڈ کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ شادی کو ایک زنجیر سمجھنے والا، مذہب کو کلیسا کے خرافات کہنے والا، خدا کو نہ ماننے والا شیلے آج ایک چھوٹے سے گرجے میں جا کر انجیل مقدس کے آئینوں سے اپنی زندگی کو ایک لڑکی سے وابستہ کرتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس نے ایک معصوم لڑکی کو ظلم سے بچانے کیلئے کیا ہے اور کیا "پولیٹیکل جسٹس" کے مصنف نے دو دفعہ شادی نہیں کی۔ زندگی کچھ اور چیز ہے۔ خیالات کا اظہار کچھ اور، باغی کے دل کو تسلی ہو جاتی ہے۔ مگر اُسے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اُس کی بغاوت کو شکست ہو چکی ہے۔

اب یہ بیاہا جوڑا ہوگ کے پاس کچھ روز گزارنے کیلئے یارک کے شہر میں چلا جاتا ہے۔ نئی دلہن کو دیکھتے ہی ہوگ کے دل میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اُس کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ دوست کی آزادیٔ افکار پہ بھروسہ کرتے ہوئے وہ ایک دن اس کی بیوی سے اظہارِ اُلفت کر دیتا ہے۔ دنیا میں ناروا داری کا دشمن اب خود ناروا داری کا ثبوت دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں دوستوں میں لڑائی ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اسے شیلے کی بغاوت کی دوسری شکست کہنا چاہیئے۔

اسی عرصے میں شیلے اپنے باپ پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اُسے بغیر کسی قسم کی شرط منوانے کے ۲۰۰ پونڈ سالانہ دینا منظور کر لیتا ہے۔ تنگدستی کا خاتمہ ہوتے ہی شیلے کی زندگی کا ایک نیا اور پہلے سے بھی زیادہ طوفانی دور شروع ہوتا ہے۔ اُسے پتہ چلتا ہے کہ گوڈون زندہ ہے۔ وہی گوڈون جس کا فلسفہ اس کی رگ رگ میں سما چکا ہے۔ مرید اور پیر میں خط و کتابت شروع ہوتی ہے۔ اور تعلقات خوب بڑھ جاتے ہیں۔ شادی کے خلاف زہر اگلنے والا گوڈون خود دو دفعہ شادی کر چکا ہے اور بہت سی لڑکیوں کا باپ ہے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کا نام میری ہے۔

شیلے بھی اب ایک لڑکی کا باپ بنتا ہے۔ مگر اس واقعہ کے بعد ہی اس کی بیوی بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔ بھلا بیچاری بھولی بھالی لڑکی کب تک فلسفے کے بوجھ کے نیچے دبی رہتی۔ جب شیلے ایک اور لڑکی کے دماغ کی تربیت میں مشغول ہوتا ہے تو اس کی بیوی اس سے جدا ہو کر لندن آجاتی ہے۔ یہاں اُسے محبت کرنے کیلئے ایک [illegible]

ہو شیلے ایک دفعہ پھر محسوس کرتا ہے کہ وہ دنیا میں تنہا ہے۔ اس کی محبت میں حیوانی جذبات کو کوئی دخل نہیں۔ اُسے ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جس کی وہ پرستش کرے اور جس میں فطرت کے تمام اسرار پوشیدہ ہوں۔ اس کی محبت کا تعلق تمام تر روح سے ہے جسم سے نہیں۔ اُس کے خیال میں اُسے ابھی تک کوئی ایسی عورت نہیں ملی جس نے اُسے اُس کی مرضی کے مطابق چاہا ہو۔ اس کی زندگی کا خواب ابھی تک تشنۂ تعبیر ہے۔

انہی دنوں میری سکاٹ لینڈ سے گھر واپس آجاتی ہے۔ اُس کی عمر ۱۷ سال ہے۔ وہ حسنِ انسانی کا ایک لطیف مجسمہ ہے۔ مگر شیلے کے نزدیک اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس کے مرشد کی بیٹی ہے۔ اس نے "پولیٹیکل جسٹس" کے مصنف کی گود میں پرورش پائی ہے۔ گفتگو کرنے پہ اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ تمام زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی اُس کے فلسفیانہ معیار پہ پوری اُترتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر دل و جان سے فدا ہو جاتے ہیں۔ گوڈون کے فلسفے کی آزمائش کا وقت آجاتا ہے۔ وہ بدنامی سے ڈرتا ہے۔ لوگ اس کی لڑکی کو ایک شادی شدہ شخص سے محبت کرتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ دونوں کو سمجھاتا ہے مگر وہ نہیں سمجھتے۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے ایک دن دونوں غائب۔ گوڈون کے غصے کی انتہا نہیں رہتی۔ بوڑھا فلسفی اپنے ہی فلسفے پر عمل ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

انہی دنوں فرنگستان کی سوسائٹی میں ایک اور طوفان آتا ہے۔ لارڈ بائرن کی مشہور عالم غلط کاریاں فرنگی امراء کے لئے باعثِ زحمت اور ان کی بیگموں اور لڑکیوں کیلئے باعثِ کشش و دلچسپی بنتی ہیں۔ سفرنگی صنفِ نازک کو حکم ہوتا ہے کہ جس رقص گاہ میں بائرن ہو وہاں نہ جایا جائے۔ ایک رات ایک رقص گاہ میں بائرن کو آتے دیکھ کر تمام عورتیں (اپنی مرضی کے خلاف) باہر نکل جاتی ہیں۔ بائرن کو اس حماقت پر سخت غصہ آتا ہے۔ اُس کے نزدیک انگلستان ریاکاری کا گھر ہے۔ وہ ہمیشہ کیلئے اسے چھوڑ دیتا ہے۔ شیلے اور بائرن کی ملاقات یورپ میں ہوتی ہے۔ دونوں باغی ہیں مگر بائرن کی بغاوت میں سنجیدگی کو دخل ہے۔ شیلے ایسی بغاوت سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ اس کے نزدیک تو ایک ہی عورت سے ہمیشہ وابستہ رہنے میں بھی مجبوری ہے، وہ تو اسے بھی خلافِ فطرت سمجھتا ہے۔ اب شیلے اٹلی میں مقیم ہے۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک اطالوی حسینہ سے ہوتی ہے۔ یہ حسینہ اپنے

باپ کے مظالم سے تنگ ہے۔ شیلے اس پر دل وجان سے فدا ہو جاتا ہے۔ اس سے بیشتر کہ وہ اس کے لئے کچھ کر سکتا۔ اس کی اپنی موت سمندر میں ڈوب جانے سے ہو جاتی ہے۔ مرنے کے وقت اُس کی عمر مشکل سے ۳۰ برس ہو گی۔ انسانی زندگی کا ایک طوفانی ڈرامہ یوں ختم ہوتا ہے۔

غزل

از:- مجیدؔ لاہوری

روتے ہوئے یوں گزری ہیں ساون کی گھٹائیں
سونے سے مناظر ہیں تو اجڑی سی فضائیں

تھم تھم کے، اس انداز سے چلتی ہیں ہوائیں
جس طرح دبے پاؤں تصور میں وہ آئیں

آنکھوں میں جو آنسو ہیں وہ اک بار اُمڈ آئیں
رہ رہ کے جو روتا ہوں تو ہنستی ہیں قضائیں

کیا خوب ملیں ہم کو محبت کی سزائیں
جینے کی تمنا ہے نہ مرنے کی دُعائیں

حسرت نہ رہے دل میں وہ جی بھر کے ستائیں
یاد آئیں گی اک روز انہیں میری وفائیں

اشکوں کی زباں پر ہیں لرزتی سی دُعائیں
سنیئے دلِ ناکامِ تمنا کی صدائیں

اس واسطے روٹھے ہیں کہ ہم ان کو منائیں
کس درجہ دلآویز و حسیں ہیں یہ ادائیں

ہم عہدِ وفا توڑیں تو چھوڑیں وہ جفائیں
خود راہ پہ آئیں تو انہیں راہ پہ لائیں

گھر دل میں کریں یا مری آنکھوں میں سمائیں
یعنی یہ غرض ہے کہ وہ تشریف تو لائیں

آئیں تو ذرا بزمِ تصور کو سجائیں ؎
نیندوں میں جوانی کی بہاروں کو لبائیں

آؤ تو ذرا ہم بھی پئیں اور پلائیں ؎ ؎
افسانۂ بے کیف کو پُر کیف بنائیں

روٹھے ہو تو آؤ تمہیں ہم آج منائیں
چھوڑو بھی یہ من من کے بگڑنے کی ادائیں

سپیرا

(افسانہ)

دیہاتی

مترجمہ:- اختر شیرانی

وہ پُرانے بھٹے کے ایک کونے میں اینٹوں کا ڈھیر لگا رہا تھا اس کا حقیقی نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ بلکہ وہ آپ بھی مدتوں سے اسے بھول چکا تھا اس کے یار دوست اسے "شیخ" کہہ کر پکارتے تھے۔ بنگال میں ہر ایک مسلمان کو اس نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ اس نام کے مطابق ہلکی سی بھی جسمانی یا ذہنی موزونیت نہ رکھتا ہو۔

دوسرے لوگ اسے لنگڑا کہہ کر یاد کرتے تھے کیونکہ بچپن میں اس کا بایاں پیر ٹوٹ گیا تھا۔ اور اس نقص کی یادگار میں بیچارے کو تمام عمر کے لئے یہ خطاب حاصل ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ چونکہ اس کی جوانی بے احتیاطی اور بے پروائی میں کٹی تھی۔ اس لئے اسے ایک گھناؤنی بیماری سے پالا پڑا جس نے اس کی ناک کو بالکل غارت کر دیا۔ اور اس کی جگہ ایک ڈراؤنا گڑھا یادگار چھوڑ گئی اس کے بعد چیچک نکلی۔ اور چیچک کے گہرے داغوں نے اس کی بدصورتی کو بالکل مکمل کر دیا۔

واحد بھٹے کی طرف اپنا چھکڑا لئے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بیلوں کو تیز چلانے کے لئے اُن کی دُم مروڑی۔ اور ساتھ ہی ایک مخش سے گیت کی تان لگائی۔ مگر یہ تان جس تیزی سے پیدا ہوئی تھی اسی تیزی سے غائب ہو گئی بیل چلتے چلتے اچانک رک گئے۔ اور آنکھیں چڑھا کر اور نتھنے پھلا کر زور زور سے سانس لینے لگے۔ بیلوں کے ایک دم رکنے سے واحد اپنی جگہ سے آگے کی طرف لڑھکا اور بیلوں کو گالیاں دینے لگا۔ بیل کسی طرح آگے نہ بڑھے اور واحد نے اپنی پینی سنبھالی۔ وہ مارے غصے کے پاگل ہو گیا تھا۔ پینی اوپر اٹھی۔ مگر اس سے پہلے کہ بیل کی کمر تک پہنچتی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے چلایا "سانپ رے سانپ شیخ او شیخ!!"

چھکڑے سے آگے چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا سانپ پھن اٹھائے جھوم رہا تھا۔ واحد نے اپنے چھکڑے سے چھلانگ لگائی۔ اور دوڑ کر ایک اینٹ اٹھالی۔

شیخ نے واحد کی آواز سنی تو تیزی سے لنگڑاتا ہوا اور ساتھ ساتھ چلاتا ہوا دوڑا "ارے مارنا مت۔ مارنا مت! میں آتا ہوں"

واحد نے اٹھایا ہوا بازو نیچے کر لیا۔ اور اینٹ مارنے سے رُک گیا۔

"اللہ کی قسم کیسا خوب صورت سانپ ہے!" واحد بولا "اور دیکھنا شیخ منہ کتنا گہرے سرخ رنگ کا ہے۔ اور پھن کیسا خوب صورت ہے مگر یار جلدی کرنا۔ بھاگ رہا ہے یہ تو!"

سانپ نے خطرہ بھانپ لیا اور واحد سے دور بھاگنے لگا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ایک اور دشمن اس کی تاک میں ہے۔ اور پاس آ پہنچا ہے۔

"واحد ذرا اپنی پینی پھینکنا" شیخ چلایا۔ "او ہو بھٹے میں چلا گیا۔۔۔"

شیخ نے غور سے بھٹے کے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں سانپ غائب ہوا تھا "اسے اودرے ناگ کہتے ہیں واحد جانتے ہو۔ اودرے ناگ؟"

پھر بولا۔ "یہ کوبرے کی قسم کا ہوتا ہے مگر بہت کم ملتا ہے۔ خدا کی قسم اگر یہ ہاتھ آ گیا تو کچھ روپے کما ہی لوں گا"

شیخ عام سپیروں سے بڑا سپیرا تھا کیونکہ وہ سانپوں کا علاج معالجہ کرنا بھی جانتا تھا۔ وہ اکثر اوقات اپنے گاؤں اور آس پاس کے دیہات میں اپنے سانپوں کی نمائش کرتا تھا۔ اور دیہاتی دلچسپی سے تماشا دیکھنے آتے تھے۔ وہ سانپوں کو مٹی کے گھڑوں میں رکھتا تھا۔ جن میں سے اکثر اس کی گھاس پھونس کی جھونپڑی کی چھت سے لٹکے رہتے تھے۔

جیسا کہ عام سپیروں کا قاعدہ ہے شیخ بھی اپنے دہشتناک قیدیوں میں سے بیماروں اور کم زوروں کو آزاد کر دیتا تھا۔ ان میں سے بعض قید کے صدمے سے مر بھی ضرور جاتے تھے۔ شیخ کا یہ تجارتی سرمایہ اس کی اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اور جب تک اس کی یہ جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی پونجی پوری تعداد میں اس کے قبضے میں ہوتی وہ بھٹوں پر یا کھیتوں میں مزدوری کرنے نہ جاتا تھا۔

ایسی حالت میں وہ ایک ٹوکری میں اپنے سانپ ڈالے ہوئے، اور سپیروں کی تونبی منہ میں دابے پاس پڑوس کے دیہات میں نکل جاتا اور بہت کچھ کما لاتا۔ مگر اس کی یہ کمائی جلدی ختم ہو جاتی تھی کیونکہ وہ بھنگ اور افیم کا عادی تھا اور اس پر طرہ یہ کہ شراب کی چسکیاں بھی لگا لیتا تھا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا کہ جوں ہی شیخ کی جیب خالی ہوتی۔ وہ ایک پھاوڑا اور ٹوکرا لئے اپنے کھاتے پیتے پڑوسی کسانوں کے دروازوں پر نظر آتا اور پوچھتا "کوئی مزدوری ہے کوئی کام؟" ایسے لوگوں کے سامنے وہ بڑی لجاجت سے مسکراتا۔ اور اس کی مسکراہٹ [illegible]

اس کے بدنما چہرے پر جو شکنیں پڑتیں وہ چہرے کو اور زیادہ بدنما اور ہیبت ناک بنا دیتیں۔ شیخ میں یہ بات ضرور تھی کہ وہ اپنے اس قسم کے "گاہکوں" کو کبھی دھوکا نہ دیتا۔ اسے کیسا ہی سخت کام ملتا۔ وہ بڑی محنت اور دیانت داری سے اسے انجام دیتا۔ جس دن اسے کوئی کام نہ ملتا وہ بھیک مانگنے نکل جاتا۔ بھیک مانگنا، مزدوری کرنا اور سانپوں کا تماشہ دکھانا اس کے لئے سب یکساں کام تھے۔ یہ تھوڑی بہت خیرات بھی جو اسے ملتی حسب معمول اس کے نشے پانی پر خرچ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کچی شراب پی آتا۔ اور جھومتا جھامتا گھر لوٹتا۔ ایسی بدمستی کی حالت میں وہ اپنی گھر والی کے پاؤں پکڑ لیتا۔ اور شرابیوں کی طرح آنسو بہاتا ہوا کہتا "میں نے تمہیں بڑے دکھ پہنچائے ہیں زبیدہ۔ میں نے تمہیں فاقوں مار دیا ہے"۔

زبیدہ ہنس دیتی اور اپنے پیر چھڑاتے ہوئے کہتی "چھیڑ خانی کی باتیں نہ کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔ تمہارے کھانے کے لئے کچھ ہو تو لاتی ہوں"

اس پر شیخ دھاڑیں مار مار کر رو دیتا اور کہتا "ہائے میں نے تمہارے لئے کبھی نئے کپڑے بھی تو نہیں بنوائے"۔

(۲)

دوسرے دن صبح پو پھٹتے ہی شیخ بھٹے پر پہنچا۔ ایک چھوٹی سی تیلی اور سرکنڈوں کا بنا ہوا صندوق اس کے ہات میں تھا مشرق کی طرف آسمان پر ایک گہری سرخ روشنی کا طوفان منڈلا رہا تھا۔ گنجان درختوں پر چڑیوں کے جھنڈ سہانے گیت گا رہے تھے۔ دور کسی مندر سے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور دھیمی دھیمی ہوا کے جھونکے گھنٹیوں اور سنکھوں کی آوازیں لئے آ رہے تھے۔

شیخ مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ گیا اور غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شفق کی سرخی دم بدم پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کا بڑھتا ہوا رنگ اینٹوں کو بہت زیادہ سرخ بنا رہا تھا۔ یہاں تک کہ شیخ کے میلے کچیلے کپڑوں پر بھی رنگت آ گئی تھی۔ یک بیک اس نے کچھ دیکھا۔ "اوہ یہ رہا وہ" کہہ کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ فاصلے پر کھلی جگہ میں۔ کل والا سانپ آسمان کی سرخی کی طرف اپنا پھن پھیلائے خوشی سے جھوم رہا تھا۔ سورج کی ابتدائی کرنوں کا اس کے ننھے سے لمبے بدن پر عکس پڑ رہا تھا۔ اور اس کے سرخ رنگ کو شوخ اور خوش نما بنا رہا تھا۔ سرخ رنگت کے ساتھ اس کے پھن کی سیاہ دھاریاں رنگوں کے امتزاج کا بہت ہی سہانا سماں دکھا رہی تھیں۔ وہ اس وقت انتہائی خوبصورت معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تتلی جس کے سرخ بازوؤں پر پتلی پتلی سیاہ لکیریں ہوں۔

سپیرا بھی اس کی خوش نمائی سے بہت متاثر ہوا۔ اور سونٹھل ہی ہونٹوں میں واہ واہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ سانپ سورج کی کرنوں سے کچھ اس دھن میں کھیل رہا تھا کہ اسے کسی دشمن کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی نہ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ بدستور اپنی دھن میں مگن تھا مگر جب شیخ بالکل ہی قریب جا پہنچا۔ تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا پھن گھمایا۔ اور پھنکار ماری۔ مگر شیخ کے ماہر ہاتھوں نے سانپ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ تیلی سے اس کے پھن کو دبایا اور زمین سے ملا لیا۔ اب اس نے سانپ کی دم پکڑ لی اور اسے ڈرانے اور سدھانے کے لئے دو تین جھٹکے دئے۔ اس کے بعد اس نے اپنے قیدی کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ اور بڑبڑایا "یہ تو ناگن ہے"۔

(۳)

چھ ماہ گزر چکے تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت شیخ حلیم اپنی بیوی کے پاس آیا اور بولا "دیکھو بیوی میں کیا چیز لایا ہوں"؟

زبیدہ نے جو صحن کے اس کنارے کھڑی تھی۔ منہ پھیر کر پوچھا "کیا چیز ہے؟"

میاں نے اپنے کپڑوں کی تہ میں سے ایک چھوٹا اور مہین سا چھلا نکالا۔ اور اسے داہیں ہات کی ہتھیلی پر رکھ لیا۔ جب بیوی قریب پہنچی تو بولا "دیکھو!"

اس کی ہتھیلی پر ایک ننھی سی نتھنی رکھی تھی۔ زبیدہ اسے دیکھ کر بولی۔ "اتنی چھوٹی سی نتھنی کا کیا ہوگا۔ میری ناک میں تو یہ نہیں آنے کی"۔

شیخ نے کھکھلا کر ہنستے ہوئے کہا "ارے یہ تو چھوٹی بی بی کے لئے لایا ہوں"

شیخ نے ناگن کا نام "بی بی" رکھا تھا۔ زبیدہ نے حیران ہو کر اپنے میاں کی طرف دیکھا۔

شیخ ہنستا ہوا کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اور فوراً ہی ناگن کو اپنے گلے سے لپٹائے ہوئے باہر آ گیا۔ یہ وہی ناگن تھی جسے اس نے بھٹے سے پکڑا تھا۔ پچھلے چند ماہ میں وہ کافی بڑی ہو گئی تھی بلکہ اس کی وحشت اور دشمنی کی عادتیں بھی چھوٹ گئی تھیں۔ قید نے اس کا جوش و خروش مٹا دیا تھا۔ اس نے اپنا چھوٹا سا چوڑا پھن اٹھایا۔ اور بڑے پیار سے شیخ کی گردن اور کندھوں کے ادھر ادھر لہرانے لگی۔

یہ دیکھ کر شیخ کی بیوی بے چینی سے بولی "ایسا نہ کرو۔ مانا کہ تم نے اسے سدھا لیا ہے۔ مگر موذی جانور کا کیا بھروسہ ہے؟"

"بھروسہ تو صرف زہریلے دانتوں کا نہیں ہوتا زبیدہ" شیخ نے اپنی بیوی کو تسلی دینے کے خیال سے کہا "مگر یہ محبت بھی تو کرنا جانتے ہیں۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور "بی بی" کے تو زہریلے دانت ہیں ہی نہیں۔ ویسے دانت ضرور ہیں۔ مگر کیا اس نے آج تک مجھے کاٹا؟ دیکھو کیسی میرے گلے سے لگی ہے جیسے کوئی چاہنے والی عورت ہو"

اس نے پیار سے اپنی انگلیوں کے ساتھ ناگن کا منہ بند کیا۔ اور اسے چوما۔ یہ زبیدہ کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ پہلے بھی بیسیوں مرتبہ اسے ایسا کرتے دیکھ چکی تھی اور اس سے اس کے دل کو بڑا دُکھ پہنچتا تھا۔

اس نے کسی قدر تیزی سے کہا "میں نے کتنی دفعہ تمھیں سمجھایا ہے کہ اس کا منہ نہ چوما کرو۔ مگر تم ایک نہیں سنتے۔ غضب خدا کا۔ کوئی ایسے گندے کیڑے کا منہ بھی چومتا ہے"۔

شیخ زبیدہ کی بات سنی ان سنی کرکے بولا "دیکھنا زبیدہ بی بی میرے کندھے کے ساتھ کس پیار سے لپٹی ہوئی ہے۔ جب یہ سانپ بڑے پیار سے آپس میں لپٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ تم نے بھی کبھی اُن کا یہ پیار کا کھیل دیکھا ہے؟"

اس پر زبیدہ بہت ناراض ہوئی۔ اس نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا اور بولی "یہ لپٹنے چپٹنے کی کہانی تو سناؤ کسی اور کو۔ پر میں اتنا کہے دیتی ہوں کہ تمھاری موت ان ہی سانپوں کے کاٹنے سے ہوگی۔ یہ تمھارا ہی پیار کا کھیل ختم کرکے نہ رکھ دیں تو میرا نام زبیدہ "

اور زبیدہ نے منہ جو پھیرا تو کیا دیکھتی ہے کہ شیخ سوئی لئے "بی بی" کے نتھنے چھید رہا ہے۔ اس نے "بی بی" کی دُم کو تو پیر سے دبا رکھا تھا۔ اور بائیں ہاتھ سے اس کے چوڑے پھن کو پکڑ رکھا تھا۔

جب نتھنے چھد چکے اور نتھنی پہنا دی گئی تو شیخ نے "بی بی" کو چھوڑ دیا ناگن آزاد ہوتے ہی تڑپ کے کنڈلی کی صورت بن گئی۔ اس نے بے درد اور غصے کے زور سے پھنکار ماری اور دُم کے سہارے کھڑی ہو کر شیخ کو کاٹنے کے لئے وار پر وار کرنے لگی۔ شیخ نے۔ اس کے خون آشام دانتوں کے حملوں سے بچنے کے لئے بی بی والے صندوق کے ڈھکنے کو آڑ بنا لیا۔ جو بی بی کے زوردار حملوں سے لرز لرز اٹھتا تھا۔

"بی بی! میری پیاری، اتنی خفا مت ہو!" اُس نے چُمکارتے ہوئے کہا "خفا مت ہو۔ تم یہ نتھنی پہن کر بہت اچھی لگتی ہو" (زبیدہ سے مخاطب ہو کر) "زبیدہ، دینا تو آئینہ۔ ذرا بی بی کو بھی تو معلوم ہو کہ وہ کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہے"۔

غصے سے جلی بھنی زبیدہ بولی "میں نہیں دیتی آئینہ وائینہ . . . "

"لا بھی دو ذرا۔ ہم بھی تو دیکھیں۔ بی بی اپنی شکل آپ دیکھ کر کیا کرتی ہے"

زبیدہ چار و ناچار آئینہ لانے کے لئے۔ دوسری کوٹھڑی میں گئی

"اور ہاں ذرا سا سیندور بھی لیتی آنا" شیخ نے چلا کر کہا۔

جواب میں کوٹھڑی کے اندر سے کسی کی حیرت بھری آواز آئی "سیندور کا کیا ہوگا؟"

"یہ ابھی نہیں بتاؤں گا" اس کے شوہر نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا "تھوڑی دیر ٹھہرو۔ دیکھو میں کیا کرتا ہوں"

زبیدہ نے آئینہ اور سیندور کا پیالہ لا کر دور ہی سے اپنے شوہر کے قریب سرکا دیا۔

شیخ نے چالاکی سے دوبارہ ناگن کو پکڑ لیا۔ اور اس کے پھن پر چھوٹا سا تلک لگا دیا۔ جیسے ہندو لوگ شادی بیاہ کے موقعے پر دولہا دُلھن کے ماتھے پر لگا دیا کرتے ہیں۔ تلک لگا چکنے پر اس نے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور بولا:

"دیکھو زبیدہ! اب میں اور یہ میاں بیوی ہیں" میں نے اس سے بیاہ کر لیا ہے۔ آج سے "بی بی" میری دوسری بیوی بن گئی ہے"۔

زبیدہ گونگی بنی ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"بی بی! پیاری تم کیسی سندر دکھائی دیتی ہو!" اس نے آئینہ اٹھا کر اپنی "نئی بیوی" کے سامنے کیا۔ اور "بی بی" کے صندوق پر بانہہ رکھ دی اور اپنے بیٹھے ہوئے ڈھول کے سے گلے سے بھرائی ہوئی آواز میں گانے لگا ……

(۴)

چند ماہ بعد کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم تھا۔ آسمان سے ایک لگاتار طوفان برس رہا تھا۔ شیخ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ چونکہ اردگرد کے دیہات میں سیلاب آیا ہوا تھا اس لئے وہ گھر نہیں لوٹ سکتا تھا۔ زبیدہ نے ایک دن اپنی کوٹھڑی میں ایک انوکھی سی خوشبو محسوس کی۔ خوشبو نہ جانے کس چیز کی تھی اور نہ جانے کدھر سے آرہی تھی مگر تھی بہت سہانی۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اس قسم کی خوشبو نہیں سونگھی تھی۔ اس نے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ خوشبو کہاں سے آتی ہے مگر بے سود۔ کئی دن تک یہ اس کے لئے معمّا بنی رہی۔

ایک ہفتے بعد شیخ گھر لوٹا۔ اس نے جی کھول کر برسات کو کوسا جس نے اسے گھر سے دور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میرا تو مارے بھوک کے دم نکل رہا ہے"۔ اس نے ایک ہی وقت میں اپنے سانس اور بد دعاؤں کے ذخیرے کو ختم کرتے ہوئے کہا "جلدی کرو بیوی، کچھ کھانے کو دو"۔

اس نے اپنے پیروں اور پنڈلیوں سے کیچڑ صاف کیا۔ اور اس کی بیوی نے باسی چاول لا کر سامنے رکھ دئیے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ چاول کھانے کے لئے پالتی مار کے بیٹھے اس نے دریافت کیا۔

"یہ خوشبو کیسی ہے بیوی؟"

"اللہ ہی جانے" اس کی بیوی نے جواب دیا "میں آپ کچھ دن سے ہریان ہو رہی ہوں۔ اتنا تو پتہ ہے کہ یہ خوشبو اسی کوٹھڑی میں آتی ہے۔ باہر کہیں نہیں آتی۔"

شیخ کچھ نہ بولا۔ اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر منہ کر کے زور زور سے سونگھنا شروع کر دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ خوشبو کیسی ہے۔ اور کہاں سے آتی ہے۔

کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے یکایک وہ "بی بی" کے صندوق کے پاس رُک گیا۔ ناگن نے اس کے قدموں کی آہٹ سن کر پھنکار ماری۔

"اچھا . . . . !" شیخ کے منہ سے نکلا۔

"کیا بات ہے؟" زبیدہ نے فکرمندی سے دریافت کیا۔

"یہ خوشبو بی بی کے بدن سے نکلتی ہے۔"

شیخ نے سنجیدہ منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"بی بی مادہ ہے۔ اور کسی نر کے لئے بے چین ہے۔ یہ اس کے گرمانے کا موسم ہے زبیدہ۔ اور جب کوئی ناگن گرماتی ہے تو ہرن کی کستوری کی طرح اس کے بدن سے خوشبو نکلتی ہے۔ یہ خوشبو ایک طرح کی پکار یا آواز ہے کسی نر کو بلانے کے لئے۔"

زبیدہ کا منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے یہ باتیں اس کے لئے حیران کن بلکہ پریشان کن ہیں۔ آخر وہ بولی۔

"لو آؤ، اب چاول کھالو۔ مجھے ان باتوں سے کیا مطلب؟"

"بی بی کو چھوڑے دیتا ہوں میں" شیخ نے چاول کھاتے ہوئے جواب دیا "اس حال میں اُسے بند رکھنا بڑا ہی پاپ ہوگا۔" اس کی بات ایک ٹھنڈے سانس پر ختم ہوئی۔

زبیدہ نے بھی ایک لمبا سانس لیا مگر یہ سانس اطمینان کا تھا کہنے لگی "ہاں اس کا چلا جانا ہی اچھا ہے۔ مجھے یہ گھنونی کیڑے اچھے نہیں لگتے۔"

شیخ چاول کھا چکا تو اس نے "بی بی" کو صندوق سے باہر نکالا۔ اور اپنی انگلیوں سے اس کا پھن پکڑ کر چمکارنے لگا۔

دفعتاً زبیدہ کو یاد آیا کہ مدت سے ناگن کے زہریلے دانت نہیں چھیلے گئے۔ اور اب وہ پھر بڑھ گئے ہوں گے۔ وہ گھبرا کر کہنے لگی "جلدی کرو۔ اسے جانے دو میں کہتی ہوں۔ اب روکو مت چھوڑ دو جلدی سے۔"

"بی بی کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔ دیکھو کس چاؤ سے وہ میرے کندھے سے لگی ہوئی ہے۔"

شیخ نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"سانپوں کا لنگر جیکم اپنے جھونپڑے کے ایک اندھیرے کونے میں غمگین بیٹھا تھا۔ وہ "بی بی" کو قریب کے جنگلوں میں چھوڑ آیا تھا۔ زبیدہ نے اسے غور سے دیکھا اور ہمدردی سے بولی "آداس کیوں بیٹھے ہو۔ تمانکو پی لو نا۔ یا لیٹ ہی رہو۔"

شیخ نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور جواب دیا۔ "اس کے نہ ہونے نے مجھے بڑا دکھ پہنچایا ہے زبیدہ۔"

"اللہ اللہ کرو" زبیدہ ہنس کر بولی

"کیا وہ کوئی عورت تھی؟ بولتے کیوں نہیں عورت تھی کیا وہ؟!"

"نہیں بیوی مگر مجھے پھر بھی صدمہ ہے۔"

زبیدہ اپنے میاں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال کر پیار سے بولی "کیوں جی کیا تمہیں مجھ سے پیار نہیں؟"

شیخ نے اس کے گال پر منہ رکھتے ہوئے جواب دیا "تم تو اپنے جوڑے کا چین ہو۔"

یک بیک زبیدہ کا بدن کانپ اٹھا اور وہ چلائی "دیکھو بی بی آگئی۔ بی بی پلٹ کر آگئی۔ وہ دیکھو۔ وہ موری کے اندر!"

ناگن سچ مچ دیوار کے پاس موری کے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔

"اسے پکڑتا ہوں" شیخ نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

مگر زبیدہ نے اپنی پوری طاقت سے اسے پھر بٹھا دیا۔ اور چلائی "نہیں نہیں" پھر اس نے غصے سے سانپ کی طرف رخ کر کے کہا "چلی جا یہاں سے گندی کہیں کی!" وہ انتہائی غصے سے کھڑی ہو گئی۔ اور ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر زور سے ناگن کے ... یہ چوٹ ناگن کے انتہائی غیظ و غضب کا باعث ہوئی اور وہ فوراً اچھل کر ... زمین پر پھن ... نے اور کاٹنے لگی پھر آہستہ آہستہ موری میں ... چلی گئی۔

اسی دن آدھی رات کو زبیدہ نے اپنے سوئے ہوئے شوہر کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ اور بڑی دہشت کے ساتھ کانپتی ہوئی چیخ مار کر بولی "اٹھو ہائے اٹھو۔ مجھے کسی چیز نے کاٹ لیا ہے۔"

شیخ نے جلدی سے چراغ جلایا۔ زبیدہ کے دائیں بازو پر ایک چھوٹا سا خون کا قطرہ روشنی میں چمک رہا تھا۔

"بی بی" تمہاری پیاری "بی بی" نے مجھے کاٹا ہے" زبیدہ دوبارہ چلائی

"وہ دیکھو، وہ رہی چھنال، مال زادی"

---

[1] سپیرے جن زہریلے سانپوں کو پالتے ہیں۔ ان کے دانتوں کو باقاعدہ تراشتے رہتے ہیں۔ اور یہی ان کے پیشے کا ایک فرض ہے۔

زبیدہ کے مرنے کے بعد شیخ نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اور دور ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہنے لگا۔ اس کا پرانا گھر اب سانپوں کا مسکن تھا۔ جو سب کے سب اودے ناگ قبیلے کے سانپ تھے۔ یا بالفاظ دیگر بی بی اور اس کی اولاد نے اس گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔

ہر روز سورج کے طلوع ہونے پر اس کی زرد، زرد ناچتی ہوئی شعاعوں کے ساتھ اس گھر میں بیسیوں چھوٹے بڑے قرمزی رنگ کے سانپ جھومتے اور لہراتے نظر آتے تھے ——— !

بات یہ تھی شیخ نے زبیدہ کا انتقام لینے کے لئے "بی بی" کو مارا نہیں اور صرف یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔

"میں تمھیں الزام نہیں دیتا بی بی"۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ——— عورت ذات میں حسد کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے ——— اور سوتیا ڈاہ تو مشہور رہے۔ زبیدہ تم سے جلتی تھی پھر تم کیوں نہ اس سے جلتیں؟ سوکن کس کو پیاری لگتی ہے ——— "

[ٹی بنرجی کی بنگلہ سے بوساطت انگریزی تلخیص و ترجمہ]

ردِ عمل

نظم

از:- سید ضمیر جعفری بی۔ اے۔

زندگی کے حادثاتِ تلخ کی بے مہر خو
روح اک نازک کلی تھی، گھٹ گئی مرجھا گئی
اک اندھیری رات ارمانوں پہ ہے چھائی ہوئی
ولولے، بجھ سے گئے مٹ سے گئے، خاموش ہیں
رینگتے لمحوں میں رس باقی ہے نے کیف و سرور
دل دھڑکتا تو ہے، لیکن آہ اس انداز سے
تیرتے پھرتے ہیں روح و دل میں تا حدِ ضمیر
اب نہیں باقی مرے دل میں محبت کا جنوں
آرزو سمٹی ہوئی، امید شرمائی ہوئی
موت کے دن کو چراغِ رہنما سمجھے ہوئے

چاٹتی جاتی ہے روح زندگانی کا لہو
زندگی کو، زندگی کی نامرادی ——— کھا گئی
اک خموشی تند طوفانوں پہ ہے چھائی ہوئی
آرزوئیں اک خنک ظلمت سے ہم آغوش ہیں
مٹتی جاتی ہے جوانی، بجھتا جاتا ہے شعور
جیسے زخمی سی نوا ابھرے شکستِ ساز سے
سرسراتے چند نشتر، کسمساتے چند تیر
موت کی خنکی سے ٹھنڈا ہو گیا سوزِ دروں
زندگی خود موت کی دہلیز پر آئی ہوئی
جی رہا ہوں زندگانی کو ستم زدہ سمجھے ہوئے

کس لئے پھر مہرباں ہیں مجھ پہ، او امستِ شباب؟
چھیڑتی ہے کیوں مرے سوئے ہوئے جذبوں کے تار؟
کر رہے ہیں کیوں نیازِ عشق سے پھر ساز باز؟
عشق آمادہ ہے کیوں، اے جنتِ کیف و سرور؟
روح سے سرگوشیاں کرتی ہیں کیوں دیوانہ وار؟
اب نہ دو مجھ کو خدارا زندگانی کا فریب
پیار کرنے والی نظرو! اب نہ بہکاؤ مجھے

تیری زلفوں کے گھنے سائے، نگاہوں کی شراب
تیرے اعضا کی جوانی، تیری آنکھوں کی بہار
گرم ہونٹوں کے کنارے، نرم باہوں کا گداز
سرمگیں پلکوں کی مستی، مرمریں ماتھے کا نور
مست سانسیں، تھرتھراتی انکھڑیاں، زلفوں کے ہار
عشق کی جولانیوں کا، کامرانی کا فریب
ان طلسماتی کھلونوں سے نہ بہلاؤ مجھے

اب فریبِ حسنِ استقبال رہنے دیجئے
زندگی کو ظلمتوں کی رو میں بہنے دیجئے

سانیٹ

مادرِ فطرت

از:۔
احمد ندیم قاسمی بی۔ اے۔

دُور ـــــ پربت پر ہیں طوفانی گھٹائیں خیمہ زن
ندیاں ناگن سے بل کھاتی رواں ہیں جا بجا
آ رہی ہے ہر طرف سے بھُوری چڑیوں کی صدا

جھاڑیوں پر تازگی ہے۔ کونپلوں پر بانک پن
بدلیوں کی آڑ سے نکلی وہ اِک چنچل کرن
ڈھل گئے ہیں اک سنہرے نُور سے ارض و سما
آنکھ مل کر جاگ اُٹھا ہے سکوں زارِ فنا

آبشاروں میں ہیں سورج کی شعاعیں شعلہ زن
اِن مقدّس جلوہ زاروں پر مرے نغمے نثار
دہر کے آلام سے جب تنگ آ جاتا ہوں میں
مادرِ فطرت کے پہلو میں سکوں پاتا ہوں میں

پھول بن جاتے ہیں سینے میں محبت کے شرار
جب حسیں محلوں کی تنہائی ڈراتی ہے مجھے
سرد چشموں کے کنارے نیند آتی ہے مجھے

طنزیات

بی۔ ایس۔ سی

از:- مسٹر قدرت اللہ شہاب ایم۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ آئی۔ سی۔ ایس۔

کیونکہ میں بی۔ ایس۔ سی۔ ہوں!

لیکن یہ سن کر تمھارے منہ پر یہ بھونڈی سی مسکراہٹ کیوں پیدا ہو گئی؟ ذرا آئینہ اٹھا کر تو دیکھو ——— نہ شکل، نہ صورت . . . . . .

لیکن نجمہ روٹھ نہ جانا تم میرے دکھ درد کی ساتھی ہو۔ اس دل نے بڑی کاوشوں کے ساتھ تمھیں حاصل کیا ہے لیکن پھر بھی میری باتوں پر تم ہنس دیتی ہو ——— دیکھو سائنس اور سائنس داں دنیا کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہیں۔ تم ایک بی۔ ایس۔ سی۔ کی چہیتی بیوی ہو میں جانتا ہوں کہ تمھیں اس پر بڑا فخر ہے اور ہونا بھی چاہئے، کیونکہ نجمہ، تمھارا درجہ سورج کی بلندی سے بھی زیادہ اونچا ہے۔ خدا کی قسم، جن دنوں میں ابھی سائنس کی الف بے ہی پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت بھی تمھاری یاد میرا وظیفۂ حیات تھی ——— لیبارٹری میں رنگ برنگی شعاعیں دیکھ کر ان غزالی آنکھوں کے مست مست ڈورے یاد آتے تھے ——— بلوری صراحیوں میں جھلملاتے ہوئے تیزابی مادوں کی رنگت ہوبہو تمھارے عنابی ہونٹوں کا نقشہ پیدا کرتی تھی اور ہماری لیبارٹری کے گردا گرد قسم قسم کی گیسیں تیار کرنے والے جو بھبکے پڑے رہتے ہیں۔ دنیا کو ان سے بدبو آیا کرتی تھی لیکن دنیا کی ناکیں بگڑی ہوئی تھیں کیونکہ شعر و شاعری کی بے معنی ہاؤ ہو نے ان لوگوں کو ایک قسم کے عملی زکام میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ورنہ ان لہراتے ہوئے ابخروں میں وہ مشام نواز مہک ہوا کرتی تھی، جو تمھارے گرم، گرم، معطر سانس میں بھی نہیں . . . . . اور پھر کبھی کبھی یہ دل تمھارے لئے بے تاب بھی ہو جایا کرتا تھا لیکن ہم سائنس دان چیخنے چلانے اور غل غپاڑہ مچانے کے قائل نہیں کہ پکڑیو، دھکڑیو، لٹ گئے، مر گئے، ہائے نجمہ، وائے نجمہ، . . . . . نہیں، بلکہ جب ہم محسوس کرتے تھے کہ ضبط و قرار کے بیرومیٹر پر زیادہ ہی دباؤ پڑ رہا ہے تو جھٹ سے وائرلیس کا آلہ نکال کر ریڈیو کا سیٹ لگا لیتے تھے ——— اب ساون کی بہار ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ تم اپنے گاؤں میں سہیلیوں کے ساتھ مل کر میٹھے میٹھے گیت الاپ رہی ہو ——— اور اُدھر ہم لیبارٹری کے ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھے ہوئے تمھاری نشیلی اور مخمور آواز پر جھوم رہے ہیں۔ تمھاری سامعہ نواز آواز! ——— سائنس داں کا دل فولاد سے بھی زیادہ آہنی اور چٹان سے بھی زیادہ سنگلاخ ہوتا ہے لیکن تمھاری روح گداز تان وہ آگ لگا دیتی تھی۔ گویا لیبارٹری کی لیبارٹری آگ کے شعلوں میں تڑپ رہی ہے! ہم سائنس داں پردے وردے کے بھی قائل نہیں۔ اور ایک دن جب مقیاس الشوق کا ٹمپریچر بہت بڑھ گیا۔ تو ہم سب بی۔ ایس سیوں نے ٹیلی وژن کا آلہ منظم کر کے آخر تمھیں دیکھ ہی لیا: وہ تمھارا مرمریں جسم، تمھاری بھری ہوئی بلوری بانہیں، تم اس وقت نہا رہی تھیں: اور پانی کے قطرے موتیوں کی طرح تمھارے سڈول بدن پر پھسل رہے تھے . . .

لیکن اے لو! یہ کم بخت بجلی کیوں بجھ گئی؟ خیر کچھ نہیں کوئی کنکشن بگڑ گیا ہوگا ——— اگر چاہوں تو نجمہ ابھی دقت فاسفورس کے جگمگاتے ہوئے قمقمے روشن کر دوں ——— لیکن اہاہاہا! رات کی خوشگوار تاریکی! لیلیٰ کا رنگ بھی کالا تھا، تمھارے بال بھی تو سیاہ ہی ہیں! اور اس اندھیرے میں تم کیسی بھلی نظر آ رہی ہو، نجمہ! جگنو! بکل جگنو!! . . . . لیکن خدا کے لئے ذرا دیکھنا تو، وہ دادا جان، اور دادی اماں سو گئے یا نہیں؟ چلو چھٹی ہوئی۔ اچھا ہوا کہ سو گئے۔ ورنہ سر کھپائی ہوتی ——— ایک طرف سے دادا جان کھنکارتے ہوئے آتے۔ دوسری جانب سے دادی اماں چلاتیں کہ بیٹا ذرا دیکھنا تو بجلی کو کیا ہو گیا ——— ہاں، ذرا جلدی جلدی ٹھیک کر دو تا۔ ماشاءاللہ بی۔ ایس سی ہو . . . . . تو گویا بی۔ ایس سی نہ ہوا لوہار یا مستری ہوا، کہ بجلی بگڑی تو بیٹا بنوا دو؟ پانی کا نل اکھڑ گیا، تو بیٹا ٹھیک کر دو۔ سالن میں نمک زیادہ ہوا تو بیٹا کم کر دو؟ کھانسی نے زور کیا، تو بیٹا دوا لکھ دو . . . . ؟ اور پھر تم لوگ سمجھنے لگتے ہو کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں لاحول ولا قوۃ ——— اگر چاہوں تو دم بھر میں شہر کی بجلیاں توڑ تاڑ کے رکھ دوں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ایک بی۔ ایس سی ایسے اوسنے کاموں میں ہاتھ ڈالے ہی کیوں؟ نجمہ، ہمارا ٹھکانا ستاروں کی بلندی میں ہے ہماری نگاہوں کا مسکن چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی گہرائیوں میں ہے؟ ہم اڑتے ہیں تو آسمان کے پردے چیر کر دور نکل جاتے ہیں ——— بہت دور، جہاں تم اور تمھارے جیسوں کے فرشتے تک نہیں پہنچ سکتے! . . . .

ورثم ہو۔ یا دادا جان ہیں ، یا دادی اماں ہیں کہ خیال کرتے ہو کہ بی۔ ایس سی
کیا ہوا ، نائی بھی ہوا ، باورچی بھی ہوا ، درزی بھی ہوا . . .

مجھے خیال نہیں کہ اس انوکھے فلسفے کی ابتدا کیسے ہوئی لیکن کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ جس دن بی۔ ایس سی کا نتیجہ نکلا ہے۔ گاؤں بھر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ لڈو بٹ رہے تھے۔ اور چاروں طرف مبارک سلامت کا غل مچا ہوا تھا۔ خدا نانی جان کے مزار کو قندیل امن سے منور کرے۔ اور نانا جان کی لحد میں سوڈیم لائٹ کے چراغ جلائے ——— دونوں بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ گھر میں نانی جان بی ہمسائیوں کے ساتھ مزے مزے کی چہ مے گوئیاں کر رہی تھیں کہ بی بیو، بے خوف ہو کر گھر بار رچلاؤ، لائق نواسا بی۔ ایس سی ہو گیا ہے دم کے دم میں مشینیں چلا کر محلوں کے محل کھڑے کر دے گا! اور دوسری طرف نانا جان مجھے انگلی سے لگائے بکاؤ خچر کی طرح گلی گلی میں گھسیٹے لئے پھرتے تھے اور گاؤں کا گاؤں امڈ کر باہر نکل آیا تھا۔

رلمو نان بائی کہہ رہا تھا کہ خاں صاحب، کم بخت انگیٹھی کئی روز سے چھن چھن کر ٹوٹ گئی ہے۔ ذرا ہاتھ لگا دیں تو غریب کا بھلا ہو گا۔ جناب کا قدیمی خدمت گار ہوں

جگو بنیا دور ہی دور سے توند پر ہاتھ پھیر کر منہنا رہا تھا ———

"ہی، ہی، ہی قہ، قہ، قہ ہو، ہو، ہو
ابھی کل تو اتنا سا بچہ تھا، اپنے ہاتھوں پالا پوسا ہے .
قہ، قہ، قہ، . بڑا ہوشیار چھوکرا ہے اور ہاں، بیٹا
ذرا دیکھنا تو دروازے کو دیمک چاٹ گئی ہے۔ گھی کے پیپے میں چوہا مرا پڑا ہے... گندم کی بوری اس کونے سے پھٹ گئی ہے چاولوں کا بھاؤ روز بروز گر رہا ہے . "

دوسری طرف سے کریمو قصاب ہاتھ میں چھری لئے بھاگم بھاگ آ رہا تھا کہ میاں صاحب، ذری ٹیک کر آئیو تو، بکرا ذبح کر رہا تھا چھری کمبخت تیز نہ تھی۔ وہ جو طرارہ بھر کر اچھلا ہے تو جھپٹ کر ننھے کی اماں سے جا ٹکرایا

. . . . اور کچھ عرصے کے بعد جب میری نجمہ، ڈولی میں بیٹھ کر آئی، تو آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی کہ میرے سائنس دان سرتاج! اس سینے میں جلن ہو رہی ہے؟ دل میں تپش ہے؟ . . .

لیکن اوہو، پھر روٹھ گئیں، نجمہ؟ لو، میری قسم اٹھ بیٹھو تمھیں بتاتا ہوں کہ سائنس دان کے دماغ میں کیا کیا قیمتی راز پوشیدہ ہوتے ہیں ——— سنو، ہماری چھوٹی سے چھوٹی شیشیوں میں اتنا زہر قاتل ہوتا ہے، جو آدھی دنیا کو بڑے اطمینان کے ساتھ دائمی نیند سلا دے؟ ہمارے ڈائنامیٹ کا ایک ذرہ سارے کے سارے شہر کو بھک سے اڑا سکتا ہے ——— ؟ اگر تم کہو، تو نجمہ ابھی چھل کرتا رے توڑ لاؤں . اور وہ تمھاری سبز ساڑھی کیا ہوئی؟ کاش: کہ اس وقت تم وہ ساڑھی پہن کر تیار ہو جاتیں تو تمھیں اسی وقت چاند کی سیر کرا لاتا ——— ! اور ہاں، میرے منہ سے مہلک گیسوں کے بھبکے نکل سکتے ہیں؟ میری آنکھوں کی ایک جنبش نظام عالم کو درہم برہم کر سکتی ہے ——— ؟ میرے ہاتھ کا ایک دھماکا اس کرۂ زمین کے پرخچے اڑا سکتا ہے ——— ؟ اور لیکن ٹھہرو، تم ڈر جاؤ گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں پسینہ آنے والا ہے اور تمھاری آنکھیں خوف سے باہر نکلنے والی ہیں ——— بے شک۔ بیشک تمھیں ضرور ڈرنا چاہئے لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ ایک بی۔ ایس سی کا دل نقطہ سائنس کا لوتھڑا ہی نہیں۔ بلکہ اس میں جذبات کی رمق بھی موجود ہوتی ہے ——— ! اور جب تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔ تو میرے کیمیائی مرکبات کا ایک تنکا تمھارے سفید بالوں کو سیاہ کر دے گا۔ تمھارا ڈھلکا ہوا بدن اور جھریوں والا چہرہ چٹکی بجاتے میں جوان ہو جائیں گے ——— جیسے تم ایک نئی نویلی دلہن بن گئی ہو!!

صبح کے وقت ہم پیرس کی طرف گھومنے نکل جایا کریں گے؟ دوپہر کو گرمی زیادہ ہوئی تو سوئٹزرلینڈ کی آبشاروں میں چھپے گئے؟ تم اپنے کھانے کی سبزیاں لندن کی منڈیوں سے خرید لایا کرو گی؟ اور شام کو پھر یہیں ——— اسی کمرے میں واپس!! اور پھر جب کبھی تم مچل کر بھاگ جایا کرو گی تو میری لیبارٹری کے برقی خدمت گار تمھیں سمندر کی گہرائیوں سے بھی نکال لائیں گے لیکن ایں! یہ کیا نجمہ؟ بھاگ بھی گئیں؟ ——— اور شریر کہیں کی! ٹھہرو تو ——— اُف! میرا گھٹنا ——— میرے برقی خدمت گار . ٹھہرو تو، کہاں ہے امتحانی نلکی؟ کہاں ہے تیزاب کی بوتل؟ تھرمامیٹر؟ سائیکل کا پمپ؟؟ اور اس کم بخت بجلی کو کیا ہوا؟ مستری کو کیوں نہیں بلایا؟ . . اور وہ گدھا فضلو، کہاں کھو گیا؟ . گویا بی۔ ایس سی نہ ہوا، مذاق ہوا

کسی کی بے رُخی ہے، حسرتیں ہیں، جھوٹے وعدے ہیں
یہی لے دے کے میرے پاس ہے دولت جوانی کی
ستارے ٹوٹ کر، غنچے بکھر کر جان دیتے ہیں
میں سنتا ہوں کہانی چرخ جب بھی حسن فانی کی
(چرخ چنیوٹی)

نظم

وادیِ خواب و خیال

از:۔ جمیل رازؔ بنگش سرحدی

یہ قوسِ قزح کے حسیں راستوں سے!
خیالات کے دل نشیں راستوں سے!
پری خوابِ حسن آفریں راستوں سے!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

فضاؤں میں بکھری ہوئی چاندنی ہے!
یہ منزل تو سرچشمۂ زندگی ہے!
فضا خوب صورت مگر اجنبی ہے!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

ستاروں کا اک منتشر کارواں ہے!
یہی غالباً وادیِ کہکشاں ہے!
یہاں تو ہر اک شے حسین و جواں ہے!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

یہ خاموش منظر، یہ مدہوش منظر!
یہ کھوئے ہوئے مست گل پوش منظر!
بیگانۂ ہوش مے خانہ بردوش منظر!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

محبت کی اِن دل نشیں وادیوں میں!
تصور کی حسن آفریں وادیوں میں!
بہشتوں سے بڑھ کر حسیں وادیوں میں!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

یہاں فکر کو شاعری مل رہی ہے!
ہمیں اک نئی زندگی مل رہی ہے!
دلوں کو نرالی خوشی مل رہی ہے!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

جہاں سے بہت دور آئے ہوئے ہیں!
یہ دل آج پھر مسکرائے ہوئے ہیں!
کہ ہم تم بہاروں پہ چھائے ہوئے ہیں!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

طبیعت میں بدمستیاں پا رہے ہیں!
کہ ہم مسکراتے ہوئے جا رہے ہیں!
ہمیں زندگی کے مزے آ رہے ہیں!
بتا ہم نشیں ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

ملفوظاتِ جبران

(۱۴)

آدھی رات گئے وہ قبرستان کی طرف بڑھا ——— اور اپنی ماں کی قبر پر جس کے سرہانے ایک صنوبر کا درخت اگا ہوا تھا جا پہنچا ———

چاند کی روشنی کا سایہ تمام سبزہ زار کو منور کر رہا تھا ———

اور باغ زمین کی چھاتی پر ایک خوبصورت موتی کی طرح چمک رہا تھا ———

مصطفےٰ کا دل اس تنہائی میں بے اختیار ہو گیا اور وہ بولا۔

"میرا دل اپنے ہی پکے ہوئے پھلوں کے بوجھ سے دب رہا ہے ——— کون ہے جو اس وقت آئے ——— اور انھیں مجھ سے لے کر مطمئن ہو سکے؟

"کوئی ہے۔ جو روزے دار ہو ——— اور جس کے دل میں رحم اور سخاوت ہو۔ وہ آئے اور علم کے سرچشمے سے جو میرے اندر موجزن ہے روزہ افطار کرے ——— اور میرے دل کے بوجھ کو ہلکا کرے۔

"میری روح برسوں شراب سے بھرپور ہوتی چلی آئی ہے۔ کیا کوئی پیاسا نہیں جو آئے اور پیاس بجھائے ——— ؟

"ایک شخص جس کے دونوں ہاتھ جواہرات اور موتیوں سے پُر تھے سڑک کے کنارے کھڑا مسافروں کو بلا رہا تھا ——— اور کہتا تھا!"

"اے بھائی جانے والے! یہ جواہر اور موتی مجھ سے لے لے تاکہ میری روح کو سکون ہو،

"مگر مسافر اس کی طرف دیکھتے اور گزر جاتے ——— کسی نے اس کے ہاتھ سے کچھ نہ لیا ——— ؟

"کیا انھوں نے اسے بھکاری سمجھا ——— جو ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا ——— نہیں ——— وہ چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ ہر بار خالی ہو۔ اور وہ پھر اسے موتیوں سے بھر کر پھیلا دے ——— مگر وہاں تو لینے والا کوئی نہ تھا،

"ایک شہزادہ تھا ——— بہت نیک، اور سخی ——— اس نے کوہ اور صحرا کے درمیان اپنے ریشمیں اور قیمتی خیمے نصب کرا دئیے۔ اور اپنے خادموں کو حکم دیا کہ وہ آگ روشن کریں ——— تاکہ وہ مسافروں اور بھولے بھٹکے ہوؤں کے لئے ایک نشان ہو ——— امن کا اور راستے کا ———

افکار و خیالات

از:- "شما"

اس نے اپنے غلام ہر طرف بھیجے تاکہ وہ کسی مہمان کو ڈھونڈھ کر لائیں ——— مگر افسوس صحرا میں مسافر کہاں ——— اور وہ بے نیل مرام واپس آ گئے۔

"کیا وہ شہزادہ بے وطن تھا ——— جو کسی ٹھکانے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا ——— یا اسے روٹی کپڑے کی احتیاج تھی ——— یا وہ کوئی آوارہ گرد تھا ——— جو چند ملازم اور مٹی کے برتن لے کر دربدر پھر رہا تھا ——— اور رات کے وقت اپنے چند مہمانوں اور شاعروں کو بلا لیتا ——— یا وہ شاعروں کے تخیل اور خوابوں میں ان کا ساتھی بننا چاہتا تھا ———

ایک شہزادی تھی ——— حسین اور جمیل ——— خواب ناز سے بیدار ہوئی۔ اپنا ریشمیں لباس زیب تن کیا ——— اور جواہرات اور زیب گلو لباس پر مشک چھڑکا ——— اور عنبر سے انگلیاں تر کر لیں ——— اپنے بلند و بالا محل سے باغ میں آئی ——— اور سبزہ زار پر شبنم کے موتی روندتی ہوئی خرام ناز کرنے لگی۔ ———

"رات کی خاموشی اور باغ کی بہار ——— شہزادی مجسمۂ محبّت بن کر کسی کو ڈھونڈ رہی تھی ——— ڈھونڈ رہی تھی ——— کہ اسے اپنا بنا لے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ جذبات محبت کو بیدار کرے مگر وہاں کوئی نہ تھا ——— جو اُسے اپنا لیتا ———

"کیا وہ کسی کسان کی بیٹی تھی ——— جو کھیت میں بھیڑیں چرانے آئی تھی ——— اور شام کے اندھیرے میں خاک اڑاتی گھر لوٹ رہی تھی ——— اس حال میں کہ اس کے پرانے کپڑوں سے سڑے ہوئے انگوروں کی بو آ رہی تھی ———

اور رات کی تاریکی میں ——— جب ساری دنیا پر نیند کا فرشتہ غالب آ چکا تھا ——— گھر سے چھپ کر دریا کے کنارے اپنے کسی چاہنے والے سے ملنے جا رہی تھی ——— جو وہاں اس کا منتظر تھا ———

"کیا وہ کوئی راہبہ تھی۔ جو خانقاہ کے حجرے میں مقید تھی ——— اور اس کا دل بیرونی دنیا کے لئے مضطرب اور بے قرار ———

"یا وہ موم بتی تھی ——— جو آسمانی روشنی کی طرف بڑھ رہی تھی ———

تاکہ پجاریوں کی طرح محبت اور محبوب میں فنا ہو جائے ——— ———
"کیا وہ ایک بڑھیا تھی - جو سورج کی دھوپ میں بیٹھی ———
اُن کی یاد میں محو تھی ——— جنھیں اس سے جوانی میں محبت رہی ——— "
رات کافی سے زیادہ گزر چکی تھی ——— اور مصطفےٰ کی طبیعت پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی - اور اس کی روح ایک گھرے بادل کی طرح ناشگفتہ تھی ——— یکایک اس کے لبوں پر ایک نغمہ ——— پرسوز نغمہ جاری ہو گیا - ———
اور اس نے کہا -

"میرا دل بوجھل ہے - میرے اپنے ہی ثمر کے بوجھ سے ———
میرا اپنا پھل میرے دل کا بوجھ بن گیا ہے ——— کون آئے گا
جو اس پکے ہوئے پھل کو کھا سکے ——— میری روح اپنی ہی شراب سے اُمڈ
رہی ہے ——— کون اس سے اپنا جام بھرے گا - اور دل کی گرمی کو
بجھائے گا ؟ ———

اے کاش ! میں ایک درخت ہوتا ——— پھل پھول سے محروم
کیونکہ ان کی فراوانی زیادہ تکلیف دہ ہے ——— بنجر ہونے سے ———
دولت جسے کوئی قبول نہ کرے ——— اس کی مصیبت زیادہ رنج دہ ہے
اس دکھ سے جو بھکاری کو ہوتا ہے - جب اُسے کوئی بھی بھیک نہ دے ———

اے کاش ! میں ایک خشک اور ویران کنواں ہوتا ———
تاکہ لوگ مجھ میں پتھر پھینکتے ——— یہ تکلیف برداشت کی جا سکتی ہے
——— مگر جب اس میں پانی ہو، اور پیاسے مسافر پانی پیئے بغیر گزر جائیں
تو وہ دکھ زیادہ ناقابل برداشت ہوتا ہے ———

"اے کاش ! میں ایک شکستہ اور روندی ہوئی نے ہوتا ———
اس لئے کہ یہ زیادہ بہتر ہوتا" ——— ایک سنہری سرود و بربط ہونے سے
——— جس کے مالک کی انگلیاں نہ ہوں کہ وہ اُن کو بجا سکے ———
اور اس کے بچے بہرے ہوں کہ وہ نغمہ نہ سن سکیں ———

(۱۵)

سات دن اور سات راتیں گزر گئیں - اور کوئی فردبشر اس کے باغ کے قریب بھی نہ پھٹکا ——— اور وہ تنہا یاد رفتہ اور دلی رنج و غم کو دل میں چھپائے خلوت گزیں رہا ——— اس کے وہ تمام ساتھی جو کبھی محبت اور غور سے اس کی باتیں سنا کرتے تھے - دنیاوی جاہ و حشمت کی تلاش میں جا چکے تھے -

ایک دن کریمہ آئی ——— نقاب کی طرح اس کے چہرے پر خاموشی تھی وہ ایک تھالی میں کھانا اور پانی کا پیالہ لائی ——— اس کی بھوک بجھانے کے لئے ——— اور اس تنہائی میں کھانا اور پانی اس کے سامنے رکھ کر وہ بھی چلی گئی ———

وہ پھر باہر نکلا - اور باغ کے دروازے پر چنار کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا - تھوڑی دیر بعد اُسے سڑک پر غبار سا اُٹھتا دکھائی دیا ——— یہ غبار کا بادل اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا - تھوڑی دیر بعد وہ بادل پھٹا اور اس کے نو حواری نمودار ہوئے - کریمہ ان کے آگے چلی آ رہی تھی ———

اُن کے استقبال کے لئے وہ آگے بڑھا - اور انھیں ساتھ لے کر باغ میں لوٹا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی باہمی جدائی کو ایک گھنٹے سے زیادہ نہ گزرا تھا ——— وہ اندر داخل ہوئے - اور سب نے مل کر اس کے پرتکلف دسترخوان پر خوب سیر ہو کر کھایا - کریمہ ان کے لئے روٹی - مچھلی اور شراب لا رہی تھی - جب وہ شراب کا آخری گھونٹ تک ان کے جام میں ڈال چکی تو بولی ———
"آقا ! مجھے اجازت دو کہ شہر سے جا کر اور شراب لے آؤں تاکہ تمھارے جام خالی نہ رہیں - یہ شراب تو ختم ہو چکی ہے ———
اس نے کریمہ کی طرف دیکھا ——— اس کی آنکھوں سے سفر کے آثار نمایاں تھے - گویا وہ کسی دور دراز ملک میں تھا ——— تب اس نے کہا :-
"کریمہ رہنے دو - اس وقت اتنی ہی کافی ہے"
——— وہ سب اسی کھانے اور شراب سے مطمئن ہو گئے جب دور ختم ہوا تو وہ بولا ———

اس کی آواز میں ایک وسعت تھی ——— اور سمندر سے زیادہ گہرائی ——— ایک جوش تھا چودھویں رات کے چاند میں سمندر کی لہروں سے بھی بڑھ کر ———

"میرے رفیقو اور ہم سفرو ! اب ہمیں جدا ہونا ہے ——— ایک مدت دراز تک ہم نے خطرناک سمندروں میں سفر کیا ——— پہاڑوں کی خونی چوٹیوں پر چڑھے ——— اور طوفانوں کا مقابلہ کیا ——— ہم بھوکے رہے مگر پرتکلف دعوتوں کے بھی مزے اڑائے ——— بعض اوقات ہم ننگے بھی رہے ہوں گے ——— مگر ہم نے قیمتی شاہی لباس بھی پہنا ——— ہم نے بے شک ایک دور دراز سفر کیا ہے - مگر اب ہم جدا ہوتے ہیں ——— تم سب اکٹھے اپنا راستہ لو ——— اور میں اکیلا جاؤں گا

" اور اگرچہ سمندر اور وسیع ملک ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے مگر پھر بھی سفر آخرت میں ہم سب اکٹھے ہوں گے ——— مگر قبل اس کے کہ ہم

اپنے اپنے راستے پر روانہ ہوں ـــــ میں تمھیں اپنے دل کے پکے ہوئے پھلوں سے کچھ حصّہ دینا چاہتا ہوں ـــــ سنو!

"تم اپنی راہ پر گاتے ہوئے چلے جاؤ ـــــ مگر گانا مختصر ہو ـــــ کیونکہ وہ نغمہ جو لبوں پر آکر ختم ہو جائے ـــــ دلوں میں ہمیشہ رہتا ہے ـــــ

"سچی بات محبت سے چند لفظوں میں بیان کرو ـــــ سچی بات جس سے کسی کو دکھ پہنچے وہ بہت زیادہ الفاظ میں نہ کہو ـــــ

"جس حسینہ کے بال سورج میں چمکتے دیکھو ـــــ اس سے کہو کہ وہ تو دخترِ صبح ہے ـــــ مگر نابینا کو دیکھ کر یہ نہ کہو کہ تو رات کی تاریکی ہے۔

"بانسری کی لے سُن کر بانسری والے سے کہو ـــــ کہ تو موسمِ بہار کا پیغام بر ہے ـــــ مگر جب عیب جیں اور نقاد کو سنو ـــــ تو بہرے بن جاؤ۔ گویا تم اس سے حدِ نظر سے بھی زیادہ دور ہو ـــــ

"میرے رفیقو اور محبو! ـــــ

راہ میں تمھیں ایسے انسان بھی ملیں گے جن کے سُم ہوں گے ـــــ تم انھیں پر دے دینا ـــــ

اُن کے سینگ ہوں گے ـــــ انھیں پھولوں کے ہار پہنا دینا۔

اُن کے پنجے ہوں گے ـــــ تم اُن کے ناخنوں پر خوب صورت خول چڑھا دینا ـــــ

اور بعض انسانوں کی زبان خنجر سے زیادہ تیز ہوگی ـــــ مگر تم ان کے منہ میں الفاظ کی بجائے شہد ڈال دینا ـــــ

"تم ایسے لوگوں سے ضرور ملو گے ـــــ اور شاید ان سے بھی بڑھ کر جب تم دیکھو کہ لنگڑے عصا بیچ رہے ہیں ـــــ اور اندھے آئینہ ـــــ اور دولت مند ـــــ خانقاہوں اور معبدوں کے دروازوں پر بھیک مانگ رہے ہیں ـــــ

"تب تم لنگڑوں کو اپنی تیزی عطا کر دینا ـــــ اور اندھوں کو اپنی بینائی ـــــ اور دولت مند بھکاری کو بھی اپنی خیر سے حصّہ ضرور دیتے جانا ـــــ یہ سب لوگ حاجت مند ہیں ـــــ کیونکہ بغیر حاجت کون ہاتھ پھیلاتا ہے ـــــ

"دولت سے دل امیر نہیں ہوتا ـــــ دل کا غریب بھکاری ہوتا ہے ـــــ

"میرے رفیقو! اور دوستو!

میں تمھیں اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم جاؤ اور صحرا کے ان گنت راستوں کی طرح بن جاؤ ـــــ جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں ـــــ جہاں شیر اور خرگوش ایک ساتھ چلتے ہیں ـــــ اور جہاں بھیڑیا اور بکری ایک جگہ پانی پیتے ہیں ـــــ

"یاد رکھنا ـــــ میں نے تمھیں دینا نہیں سکھایا ـــــ بلکہ حاصل کرنا ـــــ انکار کرنا ـــــ بلکہ ہمیشہ کسی کے کام آنا ـــــ بات سے مرعوب نہ ہونا ـــــ بلکہ اسے سمجھنے کی پوری کوشش کرنا اس طرح کہ لبوں پر مسکراہٹ ہو۔ اور دل میں بات اُترتی رہے ـــــ

"میں تمھیں خاموشی کا درس نہیں دیتا ـــــ تم ایک نغمہ گاتے جاؤ ـــــ گہرا اور دھیما۔

"میں تمھیں خودی سکھانے آیا ہوں ـــــ مگر وہ خودی جس میں بنی نوعِ انسان ایک جسمِ واحد بن جائیں ـــــ"

وہ دسترخوان سے اٹھا اور سیدھا باغ میں سرو کے درختوں کے طویل سائے تلے جا کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے ان کے دل بوجھل اور زبانیں خشک تھیں ـــــ!

ترانۂ حُسن

از ـ باقی صدیقی

بہار میری نمائش کا اک بہانہ ہے
کلی کلی میں مرے شوق کا فسانہ ہے
چمک رہے ہیں مرے نور سے صنم خانے
کھنک رہے ہیں مری ساحری سے پیمانے
طلوعِ صبح مرا ایک گامِ رندانہ
غروبِ شام مری شوخیوں کا افسانہ
شفق ہے میری مسرت کی ایک انگڑائی
دمک رہی ہے ستاروں میں میری برنائی
ہیں کیف مری جستجو میں دیوانے
تپش رسیدہ مری آرزو میں ویرانے
مرے اثر سے خودی کا چراغ رخشندہ
مری نظر سے جہاں کا نظام پائندہ
خوشی کی روحِ رواں زندگی کی جان ہوں میں
تمام عالمِ ہستی پہ حکمراں ہوں میں!

آب و آتش

نظر حیدرآبادی

ر کسی کو ڈھونڈتی ہیں آج آنکھیں ہر طرف — پھر کسی کی یاد آنسو بن کے لہرانے لگی
ر وہی راتیں، وہی دن ہیں وہی جوشِ جنوں — پھر کسی ظلمت کدے میں روشنی آنے لگی
ر وفا کی کاوشوں سے کانپتی ہے زندگی — پھر جنوں کی لغزشوں سے روح گھبرانے لگی
ر مرے نغموں میں حل ہونے لگا دردِ فراق — پھر مرے رونے پہ دنیا کو ہنسی آنے لگی
ر دلوں کی آرزو گانے لگی کچھ جھوم کر — پھر نگاہوں کی تمنا رقص فرمانے لگی
ر اُدھر مہتاب کی کرنوں نے لیں انگڑائیاں — پھر ادھر اک شوخ کی باہوں کی یاد آنے لگی
ر اُدھر تاروں نے پانی میں کئے روشن چراغ — پھر ادھر تاریکیٔ اوہام تڑپانے لگی
ر اُدھر ناہید نے چھیڑا سرودِ جاں فزا — پھر ادھر روحِ تخیل وجد میں آنے لگی
ریکایک اُس طرف کالی گھٹائیں چھا گئیں — پھر یہاں اک برق سی رگ رگ میں لہرانے لگی
ر اُدھر بجنے لگا بے چین بوندوں کا ستار — پھر ادھر کافر پپیہے کی صدا آنے لگی
ج پھر ظالم ہواؤں میں نہاں ہیں بجلیاں — آج ساون کی گھٹا بھی آگ برسانے لگی

جوشِ وحشت، خوفِ رسوائی، الٰہی کیا کروں
آہ، یہ راتیں، یہ تنہائی، الٰہی کیا کروں

جدائی

از :- اختر شیرانی

بسا اوقات، غروب آفتاب کے وقت، اس غمگین اور افسردہ دل کو سہارا دینے، ایک سال خوردہ شاہ بلوط کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا ہوں اور وہاں سے ——— اس وسیع و سرسبز وادی کی طرف جس کا فانی اور بے ثبات منظر، میرے قدموں میں بچھا ہوتا ہے ——— نظر دوڑاتا ہوں۔

یہاں، ایک طوفانی آبشار، اپنی کف آلود موجوں کے ساتھ لہراتا، بل کھاتا اور شور مچاتا ہوا اپنا پیچ در پیچ راستہ طے کرنے میں مصروف رہتا ہے ——— اور ایک گہری اور دور دست تاریکی کے پردوں میں گم ہو کر دور ——— میدانی سطح پر جا کر ایک چھوٹا سا دریا بن جاتا ہے ——— جس کے خاموش پانی کی حسین سطح سے، طلائی ستارے ابھر کر، آسمان کی لاجوردی چادر پر طلوع ہوتے ہیں۔

ابھی غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاعیں - اس کوہسار کی چوٹیوں اور ٹیکریوں پر، جو گھنیرے درختوں اور جنگلوں کے زمردیں تاج پہنے نظر آتی ہیں ——— چمک رہی ہیں — اور ملکۂ ظلمات کی غبار آلود سواری، ان مقامات پر آہستہ آہستہ بلند ہو رہی ہے - اور افق کے دامنوں کو بتدریج روشن اور تابناک بناتی چلی جاتی ہے -

اس عالم میں، ایک مذہبی زمزمہ، تمام فضاؤں پر پھیل جاتا ہے - مسافر اور رہ نورد ٹھہر جاتے ہیں اور دیہاتی چرچ کے ناقوس کی صدا دن کی آخری آواز میں ڈوب کر ایک مقدس آہنگ سا پیدا کر دیتی ہے -

مگر، میری بے پروا اور محروم آرزو روح، ان تمام حسین و رنگین مناظر کی موجودگی میں ہر طرح کے جذبات اور ہیجان سے خالی ہے ——— زمین مجھے ایک گھومتا ہوا پریشان سا سایہ نظر آتی ہے ——— ہاں، زندوں کا آفتاب، مردوں کو حرارت نہیں بخشتا۔

میں بے ضرورت، طلوع صبح سے لیکر غروب شام تک شمال سے جنوب اور ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر اپنی حیرت زدہ اور خاموش نگاہیں لٹاتا رہتا ہوں - اور اس وسیع وادی کے تمام حصوں کی پیمائش میں مصروف ——— بالآخر چلا اٹھتا ہوں کہ
میرے لئے جہاں میں کہیں بھی خوشی نہیں

یہ وادیاں اور چشمے! یہ مکانات اور محلات! اور یہ جھونپڑیاں ——— یہ سب بیہودہ اور بیکار چیزیں ——— جن میں سے کسی کے حسن کا بھی مجھ پر ایک شمہ بھر اثر باقی نہیں رہا ——— میرے کس کام کی!

اے خوبصورت چشمو! موج آبشارو! اونچی چٹانو! سرسبز جنگلو! گلپوش وادیو! اور حسین خلوت گاہو! تمہاری فضاؤں میں صرف ایک متنفس کی کمی واقع ہوئی ہے ——— مگر اسی ایک کمی نے تم سب کو ویران اور سنسان کر دیا ہے ———!

آفتاب کے طلوع سے لے کر غروب تک، اس کی ابھرتی اور ڈھلتی پھرتی چھاؤں کا ایک بے حس و حرکت نظر سے مطالعہ کرتا رہتا ہوں ——— یہ آفتاب، جو تاریک یا شفاف آسمان پر چمکتا اور چھپتا رہتا ہے ——— میرے لئے کیا دلچسپی رکھتا ہے؟ میرے لئے تو اس لیل و نہار کی بستی میں کوئی آرزو اور انتظار ہی نہیں رہا۔

جب ماہتاب، اپنی وسیع جولانگاہ کو طے کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ اس وقت بھی میری نگاہیں ہر طرف ایک خلا سا محسوس کرتی ہیں ——— میں اس تمام کائنات میں جو ماہتاب کی روشنی سے لبریز نظر آتی ہے ——— کسی طرف سے بھی کوئی امید کی کرن

پھوٹتی نہیں دیکھتا ـــــ میرے دل میں اس وسیع کائنات اور غیر متناہی موجودات کی طرف سے کوئی مقصد اور ارمان پیدا نہیں ہوتا۔

اگر ممکن ہوتا کہ میں اس دائرۂ نور و سرور کو آسمان سے چھین کر زمین پہ اٹھا لاتا ـــــ تو شاید میں اپنے اُس پیکر رنگ و نور کا، جس کے متعلق میں ہمیشہ سوچتا رہتا ہوں اور عالمِ خیال میں پرستش کرتا ہوں ـــــ دُور ـــــ اُفق کے اُس پار، اس دنیا کی فضاؤں کے کناروں سے ماورا، ان مقامات میں، جو کسی اور ہی آسمان کے حقیقی ماہتاب کی کرنوں کا گہوارہ ہیں ـــــ مشاہدہ کر سکتا۔

ان مقامات میں ـــــ میں اُن سرچشموں سے جن کا میں اسقدر شیفتہ و مشتاق ہوں۔ شراب لعل فام پیوں گا۔ اور سرمست و سرشار ہو جاؤں گا ـــــ ان مقامات میں، مجھے امید اور عشق کی دولت حاصل ہوگی ـــــ اور ساتھ ہی وہ ایک وہمی اور تصوری متاع عزیز، ـــــ جس کی تمام روحیں آرزومند رہتی ہیں اور جس کا ہماری فانی سرزمین پہ کوئی نام نہیں ـــــ!

اے میری تمام آرزوؤں اور امیدوں کے تنہا مگر مبہم مطلوب و منتہا! میری بے بسی کے لئے ممکن نہیں کہ میں نسیم سحر کی آغوش میں سما جاؤں اور وہ مجھے تجھ تک پہنچا دے! آہ میں کیوں اب تک، اس سرزمین پہ، جو فراق کا نشیمن اور جدائی کا مسکن ہے ـــــ زندہ اور موجود ہوں۔ درحالیکہ مجھ میں اور زمین میں کوئی ربط و تعلق نہیں رہا ہے ـــــ!

جس وقت، درختوں کے پتے، سبزہ زار کے دامن میں، گرتے ہیں ـــــ تو نسیم شبانگاہی چلتی ہے اور ان کو وادیوں اور دروں کے آغوش سے زبردستی چھین کر دور پھینک آتی ہے ـــــ!

شمال کی طوفانی ہواؤ! تم بھی مجھے ان پتوں کی طرح اٹھا لو اور اپنے ساتھ لے چلو۔

(لامارٹین)

جرأتِ اظہار

از ڈاکٹر امتیاز اللہ خاں ہمائی ۔

مجھ کو گر جرأتِ اظہار محبت ہوتی!
تیری تصویر کو سینے سے لگانے کی جگہ
تیرے تخئیل کو ارمان بنانے کی جگہ
تجھ کو آغوشِ محبت میں بسا لیتا میں!
تیرے انکار کو اقرار بنا لیتا میں!
راز دارِ دل بیتاب بناتا تجھ کو!
اپنا افسانۂ غم آپ سناتا تجھ کو!
زُلفِ مشکیں کو بصد شوق میں بوسے دیتا
اور پروانہ صفت تیری بلائیں لیتا
رات دن شام و سحر پیار کیا کرتا میں
جذبۂ شوق کا اظہار کیا کرتا میں
چاندنی رات میں دریا کے کنارے جاکر
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے جاکر
وادیٔ عشق کے اسرار میں کھو جاتے ہم!
شوق و امید کے افکار میں کھو جاتے ہم!
مجھ کو گر جرأت اظہار محبت ہوتی!

نظم

بیمارِ غم

از:- ثاقب سلمانی بی۔ اے۔

کس قدر بیدرد ہے دنیائے ہستی کا نظام
کس قدر بے کیف ہیں بیمارِ غم کے صبح و شام

دیدہ پُرنم، مضمحل سی رُوح اور نظریں اداس
بسترِ خاموش تنہائی کا عالم اور یاس

دل میں ہیں جاں سوز نالے لب پہ آہوں کا ہجوم
اور چمکتے ہیں مری آنکھوں میں اشکوں کے نجوم

یہ مری مغموم آہیں یہ مری نیندیں حزیں
حسرتوں کا ڈھیر ہے پہلو میں میرے دل نہیں

سازِ انفاس کے جب چھیڑتا ہوں غم کا راگ
تو بھڑک اٹھتی ہے میرے دل میں ارمانوں کی آگ

یہ مری جاگی ہوئی راتیں یہ خوابیدہ سے دن
یہ جوانی کا حسیں موسم یہ میرے سال و سن

شامِ غم ہے بجھ رہے ہیں آرزؤں کے چراغ
پھر دلِ محزوں ہوا جاتا ہے میرا داغ داغ

رات کی آغوش کو اشکوں سے بھر دیتا ہوں میں
جب ستاروں کو پیامِ چشمِ تر دیتا ہوں میں

گھٹ رہا ہے آرزوؤں کا مرے پہلو میں دم
اس جوانی کے سمے، اتنا ستم ایسا ستم!

اپنا غم کس سے کہوں دردآشنا کوئی نہیں
اِس بھری دُنیا میں میرا ہم نوا کوئی نہیں

اے مری آنکھوں کی راحت اے مری آرامِ جاں
اے مرے دل کی تمنّا اے مری روحِ رواں

میری بیماری سے کیوں اندوہگیں رہتی ہے تُو
اپنی ننھی جاں پہ کس درجہ ستم سہتی ہے تُو

میری سلمیٰ ان سیاہ ریشم سے بالوں کو سنوار
چھوڑ دے اس غم کے بندھن کو نہ ہو یوں دلفگار

اس قدر لاغر ہوں میں جینے سے بھی بیزار ہوں
جس کو نیندوں نے ڈسا ہو میں وہی بیمار ہوں

کیا ستم ہے یہ کہ آنکھوں میں وہ رعنائی نہیں
رُوح میں گرمی تو ہے دل میں توانائی نہیں

کس لئے بیمار کلیوں کی طرح روتی ہے تُو
اپنے مُونہہ کو شبنمی اشکوں سے کیوں دھوتی ہے تُو

تجھ کو بالیں پر مرے ترا آستیں ہونا نہ تھا!
یہ تو ہنسنے کا زمانہ تھا تجھے رونا نہ تھا

تُو جوانی اور صحت کا ہے اک خوابِ حسیں!
چھوڑ دے مجھ کو یہیں اے نازنیں زہرہ جبیں

کیا پڑی ہے تجھ کو کیوں اس طرح تو مغموم ہے
پھول سے نازک ہے تو اور چاند سے معصوم ہے

ہے یہی دنیا میں سلمیٰ حسن و الفت کا مآل
ہر کمالے را زوال و ہر کمالے را زوال

میرے سینے میں فروزاں ہے ابھی اُلفت تری
میری پیشانی پہ لکھی ہے مگر قسمت تری

افسانہ

پڑوسن

مترجمہ۔ "داستان سرا"

تھالک بہت تھکا ہوا تھا۔ دوسری منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑا پسینہ خشک کر رہا تھا اس کے خیالات نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھر رہے تھے۔ قرض کے باعث اسے ... وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کے گھر والوں نے اسے نکال دیا تھا۔ صرف اتنی رقم دے دی تھی کہ وہ امریکہ پہنچ جائے۔ وہ جیسے اپنے گھر سے نکل کر شہر گیا تھا۔ اور جوا کھیلنے لگا تھا۔ وہ پوکر کھیل کھیل کر سہراؤ خصوصاً انگریزوں سے خوب روپے جیتتا۔ لیکن جب ایک نوجوان جوئے میں ہار کر جیل میں ... مرا تو تھالک نے جوا کھیلنا چھوڑ دیا۔ اور لگا نئے پیشے کی تلاش کرنے۔ اس نے سوچا ایک مذاکرہ کرائے پر لے کر ... کا انتظام کر کے لوگوں کو شمشیر زنی اور گھوڑے بازی کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اور اسی سے روزی کمائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ... کے ایک استاد ... سے ... سیکھی تھی۔

تھالک نے تلوار بازی کے کمالات دکھا دکھا کر رفتہ رفتہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں رسوخ حاصل کر لیا۔ اور ... سے متعدد بڑے بڑے سرٹیفکیٹ خصوصاً ... کے لئے حاصل کرلئے۔ ایک مقابلے میں اس نے اپنے حریف کو شکست دے کر دنیا کے سب سے بڑے ... کا خطاب حاصل کیا۔ اور اس کے بعد وہ پیرس جا کر وہاں آباد ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اپنی زندگی میں پہلی بار کچھ رقم پس انداز کرنے کا موقع ملا۔ وہ جوان ... تھا ہی۔ اس لئے بڑے بڑے گھروں کی دوشیزاؤں سے اسے کافی رقمیں ملنے لگیں۔ اس آمدنی کے ذریعے اس نے اپنے قرض کی ادائیگی بھی شروع کر دی۔ غرض یہاں اس نے ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ لوگ عام طور پر اب اسے خاص ... عزت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے آباؤ اجداد سرحدی فوجی افسر تھے۔ ... اچھے طور و طریق تو اس نے بچپن ہی سے سیکھے تھے۔ اس کی رگوں میں اس کے بزرگوں کا شریف خون اب تک موجود تھا۔ وہ جیسا خندہ رو تھا۔ ویسا ہی صاف دل بھی تھا اس کی طبیعت بالکل بچوں کی سی تھی کسی حد تک بچیوں کی سی بھی۔ اس کی نیک دلی اس کی روشن اور چمکیلی آنکھوں سے صاف نمایاں تھی۔ اس کا مردانہ حسن۔ اس کی نکیلی ناک کے نیچے گھنی مونچھیں اور داڑھی کی موجودگی کے باعث اور بھی شاندار معلوم ہوتا تھا۔ وہ باوجودیکہ ... سکوکس پہاڑی قوموں کا بہترین نمونہ تھا۔ یوں تو وہ سب سے محبت کرتا تھا لیکن کسی عورت سے اسے صنفی محبت نہ تھی۔ اس لئے کہ اس نے اپنے دل میں عورت کا ایک معیار قائم کر رکھا تھا۔ اور وہ معیار ایسا تھا جو کسی ہا...

... قوم کے بلند خیال اور حوصلہ مند نوجوان کا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا سا باغ نما خوبصورت اور پرفضا صحن تھا فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ پاس کی کسی کھڑکی سے کسی پنجرے میں بند پرند کی نغمہ سرائی کی آواز آ رہی تھی اور ... کوئی ... کا دردانگیں گیت گا رہا تھا۔

تھالک اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے کسی دلکش تصور میں غرق اپنے سگریٹ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک وہ چونک سا پڑا۔ اس کی پسینے سے تر گردن پر کچھ بوندیں گر پڑیں۔ اس نے رومال سے گردن پونچھ ڈالی۔ لیکن جون کے صاف و شفاف آسمان سے پھر کچھ بوندیں گریں۔ اس نے گھبرا کر اوپر کی طرف دیکھا گملوں اور پھولوں سے لدی ہوئی کھڑکی پر ایک حسین عورت کھڑی تھی معلوم ہوتا تھا وہ معافی مانگنا چاہتی ہے مگر اسے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ اس کی حیا آلود سرخ آنکھیں تھالک کے پریشان چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ اپنے پودوں کے ساتھ گو کھر کو بھی پانی دینا چاہتی ہیں"۔ تھالک نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فرنچ زبان میں کہا۔ اس کی بچوں کی طرح ٹیڑھی میڑھی زبان ہی کی وجہ سے عورتیں اسے اس قدر پسند کرتی تھیں۔

"میں اتنی زیادہ دوری پر ہوں کہ مجھے کانٹا چبھ ہی نہیں سکتا" عورت نے جواب دیا۔ اور بچوں کی طرح حیران نظروں سے تھالک کو دیکھتی رہی۔

"لیکن بغیر کانٹے کے بھی تو گوکھرو ہوتے ہیں"۔

"علم النباتات کے متعلق میرا مطالعہ بہت محدود ہے۔ تاہم میں آپ کے کہنے کو درست تسلیم کرتی ہوں"۔

"ارے جائیے مت۔ آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے پر آپ پھول پتیوں کے درمیان کتنی حسین معلوم ہوتی ہیں۔ پیچھے نیلا آسمان اور دائیں بائیں شاداب شگفتہ اور دلکش رنگین پھول"۔

"آپ کی بات چیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسافر ہیں"۔

"ہاں، مجھے اس کا افسوس ہے مگر یہ تو ایک حقیقت ہے کہ میں مسافر ہوں میں ایک تہمت فوجی افسر ہوں۔ اور شاید آپ کو معلوم ہو کہ میں آجکل لوگوں کو شمشیر زنی اور گھوڑے بازی سکھاتا ہوں"۔

"ہاں میں نے اخباروں میں آپ کا تذکرہ دیکھا ہے آپ تو ایک مشہور اور نامی آدمی ہیں۔"

"مشہور اور نامی آدمی تو کیا ہوں۔ یہی بہت ہے کہ چوری وغیرہ جیسا برا پیشہ نہیں کرتا۔ آدمی کو کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہی ہے۔ اگر میں اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا تو پیرس جاکر وہاں لوگوں کو شہسواری کی تعلیم دوں گا۔ مجھے شہسواری سے بہت دلچسپی ہے۔ آپ میری طبیعت کا اندازہ نہیں کرسکتیں کہ گھوڑے کی سواری کے بغیر مجھے یہاں کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ جب میں کوئی اچھا گھوڑا دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی بدقسمتی پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھوڑے کے سواروں کو معلوم ہے کہ گھوڑا اور سوار دونوں باہم ایک ہو جاتے ہیں۔ گھوڑے کی روح انسان کے جسم میں نہیں بلکہ انسان کی روح گھوڑے کے جسم میں ہوتی ہے۔"

"آپ تو پرانے زمانے کے بہادروں کی یادگار ہیں۔ ابھی آپ کو کوئی شریک زندگی ملی یا نہیں؟"

تھالک نے دیکھا۔ پہلے تو وہ لڑکی زرد پڑگئی پھر خود ہی کچھ جھینپ کر سرخ نظر آنے لگی۔ بعدازاں تھالک کی چمکیلی آنکھیں دیکھ کر وہ اور بھی شرما گئی۔

تھالک اس کے سوال کا جواب نہایت خلوص و محبت اور نرمی کے ساتھ دینا چاہتا تھا لیکن گملوں اور پھولوں کے درمیان صرف "آداب" کی ایک مترنم آواز اور بربط کے جھنکار کی طرح ایک دبی ہوئی ہنسی سنائی دی۔ اور وہ لڑکی اندر بھاگ گئی۔

اس طرح اس دوشیزہ کے ساتھ تھالک کی راہ و رسم کی ابتدا ہوگئی۔

شام کو تھالک کا جی بالکل نہیں چاہا کہ وہ شہر میں کھانا کھانے جائے۔ اس پر ایک طرح کی جھینپ سی طاری تھی۔ وہ اپنی اجنبی ہمسائی کے پڑوس سے شرما سا رہا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا مگر وہ اپنے بغیر روشنی کے کمرے میں دبی پلنگ نما لمبی چیز سے سے منڈھی ہوئی کرسی پر پڑا تھا۔ اسے اپنی تنہائی بہت تکلیف دہ معلوم ہو رہی تھی۔ اسے اپنی مری ہوئی ماں یاد آگئی جس نے اسے اپنا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث لاڈ پیار میں بگاڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک فوجی نوجوان ہونے کے بعد بھی اسے روزانہ ماں کے اٹھنے سے پہلے اس کے کمرے میں جانا پڑتا تھا۔

اسی سلسلے میں اسے باپ کا خیال بھی آگیا۔ وہ فوج میں کرنل تھا۔ صورت سے نہایت شوکت و وجاہت ظاہر ہوتی تھی۔ سرخ چہرہ۔ سفید مونچھیں۔ مزاج بے حد سخت۔ عام حالات میں بھی ایسے کپڑے پہنتا تھا گویا فوجی وردی میں ہو گھر پہ لال مخملی جوتے پہنتا تھا۔ تھالک فوج میں افسر بن گیا تھا پھر بھی باپ کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سگریٹ نہ پی سکتا تھا۔ پھر تھالک کو یاد آیا کہ گھر سے چلتے وقت اس کے گالوں پر گرم آنسوؤں کی ایک دھار سی بہ گئی تھی۔ جیسے پگھلا ہوا سیسہ جس کی سوزش اب تک اس کے گالوں میں محسوس ہو رہی تھی

"پیرو، کامیاب سپاہی نہیں ہوئے تو کیا ہوا، مگر شرافت کو ہاتھ سے نہ دینا۔ مزدوری کرکے پیٹ کیوں نہ بھرنا پڑے مگر باپ دادا کے نام کو بٹہ نہ لگانا یہ ریوالور تمہارے بکس میں رکھے دیتا ہوں۔ وقت پر کام آئے گا۔ اگر تم سے کبھی کوئی شرمناک حرکت سرزد ہوجائے تو اس کے ذریعے تم نجات حاصل کرسکتے ہو۔ اس طرح نہ تمہاری عزت پر حرف آئے گا نہ میری آبرو پر۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت مرجانا ہزار درجہ بہتر ہے۔"

تھالک کو اپنے پراگندہ سامان میں ایک فوٹو ملا کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ فوٹو کے اندر سے سفید بالوں والی ایک عورت نکل آئی ہے۔ چھوٹا قد، سفیدی مائل حسین رنگت۔ روشن اور سیاہ آنکھیں۔ ہونٹوں پر ایک دائمی افسردہ مسکراہٹ

اس مسافر نے دو سال کی غیر مربوط اور پریشان زندگی کے بعد اس پیاری یادگار کو پیشانی سے لگایا۔ وہ سونے سے پہلے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اپنی والدہ مرحومہ کی تصویر کو دیکھ کر اسے بے انتہا تسکین و تسلی حاصل ہوئی۔ وہ بغیر کپڑے بدلے سو گیا۔

وہ یکایک کھڑکی پر کچھ کھٹ پٹ کی آواز سن کر چونک پڑا۔ وہ ذرا تو بالکل نہیں مگر اسے تعجب ضرور ہوا۔ اس نے سمجھا یہ اس کے تخیل کی کارفرمائی ہے اس نے دوسری بار۔ اور پھر تیسری بار کھڑکی پر کھٹ کھٹاہٹ کی آواز سنی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا تو اوپر کی منزل سے تاگے میں بندھی ایک کنجی لٹک رہی تھی۔ کنجی کے ساتھ دل کی شکل کا ڈاپان کی طرح ایک چھوٹا سا بسکٹ بھی بندھا ہوا تھا جو میلے سے خرید کر لایا گیا تھا۔

چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا کبھی کبھی سڑک سے گزرنے والی موٹروں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ درمیان درمیان میں دور سے کچھ اطالین مزدور کے گانے اور وائلن کی آواز بھی آجاتی تھی۔

"ہم لوگ فرانس کی سرحد کے پاس ایک دیہاتی میلے میں گئے تھے۔ مجھے خیال تھا کہ تم تنہا ہو۔ اس لئے یہ تحفہ خرید لائی ہوں۔ میں بھی یہاں کی رہنے والی نہیں ہوں میں ایک فرنچ عورت ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا کتنی بڑی بدنصیبی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ تمہیں اپنے تاریک خالی کمرے میں تنہا رہنا کتنا شاق گزرتا ہوگا۔"

"شکریہ! شکریہ!!" تھالک نے تحفے کو کھولتے ہوئے کہا۔ گزشتہ دنوں کے جن تصورات و خیالات نے اسے تھپک کر سلایا تھا۔ وہ اب تک اس کے دماغ میں موجود تھے۔ اس کی آواز دبائی ہوئی سسکیوں کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔

کھڑکی کے اوپر سے لٹکتے ہوئے تاگے سے پیکٹ کو کھولتے ہوئے اس نے اوپر دیکھا چودھویں کے چاند کی نقرئی روشنی میں وہ حسینہ ایک بہشتی حور سی معلوم ہو رہی تھی۔

"اچھی پڑوسن! تم کتنی بھلی ہو، اگر تم سمجھ سکتیں کہ تم نے مجھے کتنا محبت آمیز تحفہ دیا ہے۔ اور تمھارے دئے ہوئے اس چھوٹے سے بسکٹ سے مجھے کتنی مسرت و شادمانی حاصل ہوئی ہے۔ تو یہ تحفہ دیتے ہوئے شاید تمھیں کچھ نہ کچھ تامل ضرور ہوتا میں تمھارے اس دل کی شکل کے بسکٹ کو ہاتھ میں لے کر محسوس کر رہا ہوں کہ تم نے اپنی روح اور قلب کا ایک حصہ میری نذر کر دیا ہے۔"

"ارے آہستہ آہستہ بولو کسی پڑوسی نے سن لیا تو؟"

"درست، جو لوگ نیچے رہتے ہیں۔ وہ زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہرتے۔"

تھالک نے کسرتی نوجوان کی طرح اچھل کر اوپر والی کھڑکی کا چھجا پکڑ لیا۔ اور تاریک صحن کی فضا میں جھولنے لگا۔

"ارے بابا! تم یہ کیا کر رہے ہو، پاگل تو نہیں ہو گئے؟ اگر یہ کہنہ اور فرسودہ لکڑی تمھارے بوجھ سے ٹوٹ گئی تو تمھاری گردن ہی ٹوٹ جائے گی۔ میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں اور تمھیں بھائی، بیٹا، دیوتا، تم جو سمجھو مان کر تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اپنے کمرے میں واپس چلے جاؤ۔"

عورت رونے لگی۔ تھالک کے ہاتھ سے چھجا چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ معلوم ہوا۔ اس کی پیشانی پر گرم گرم بوندیں گریں، شاید وہ اس عورت کے آنسو تھے۔

"اوہ! پڑوسن! مہربان اور ساتھی پڑوسن، مجھے اس وقت نیچے کودنا۔ پانی میں کود پڑنے سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس طرح میں تمھاری مصیبت و پریشانی کا باعث ہو رہا ہوں۔

"رحم کرو۔ رحم، دیوانے ہو رہے ہو کیا؟ کچھ اپنا تو خیال کرو بھائی ——

خوف و اضطراب کے باعث اس کی زبان سے صحیح الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"اگر تم چپ چاپ گھر میں واپس چلے جاؤ گے تو جو مانگو گے۔ دوں گی۔ مجھے! جو طلب کرو گے دوں گی۔"

کھڑکی کی لکڑی کو چڑ چڑاتے اور ٹوٹتے دیکھ کر عورت کے منہ سے ایک خوف آمیز چیخ نکل گئی۔ تھالک ہاتھوں پر زور دے کر مسکراتا ہوا دھم سے نیچے کود پڑا۔

"اب تک تو میں اندھیرے اور تمھارے۔ یا موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہا تھا۔ اور اب راحت و زندگی تمھاری چاندنی میں نہائی ہوئی کھڑکی سے مجھ پر مسکرا رہی ہے۔ سمجھیں پڑوسن!"

وہ پھر پہلے کی طرح اپنی کھڑکی کے چھجے پر سر رکھے ہوئے اوپر کی طرف دیکھتا ہوا لیٹ گیا۔ وہ چاندنی میں حسینہ کے مجسمے کو دیکھ رہا تھا جس کے گرد پیش چمکدار تارے جگمگا رہے تھے۔ حسینہ خاموش کھڑی اس عجیب و غریب جوان کو دیکھ رہی تھی۔ اس طرح دونوں دیر تک مہر بلب آنکھوں ہی آنکھوں کے ذریعے گفتگو کرتے رہے۔ پھر حسینہ بولی:-

"تم مجھے اس لئے اچھے معلوم ہوتے ہو کہ تم نے مجھ سے نہ کوئی وعدہ لیا۔ نہ کچھ طلب کیا۔ اچھا گڈ نائٹ!"

شکریہ: پھر گڈ نائٹ پیارے پڑوسی۔"

"ارے کچھ دیر تو اور ٹھہرو۔ کم سے کم یہ تو بتا دو کہ میں تمھیں کیا کہہ کر خطاب کروں؟"

"میرا خاندانی نام "بیلین تینا" ہے۔"

"کتنا پیارا نام ہے۔ مجھے صحت کے ساتھ تو یاد نہیں مگر پرانے زمانے میں اسی نام کی ایک شہزادی تھی۔"

"ہاں سیلان کی شہزادی بیلین تینا۔ اور تمھارا نام کیا ہے؟"

"بہت ہی معمولی نام ہے پیٹر۔"

"اچھا تو پھر مسٹر پیٹر گڈ نائٹ۔ پھر کبھی ملوں گی۔ تھوڑی دیر میں میرے شوہر آجائیں گے۔"

"کون؟"

"میرے شوہر!"

"ایں۔ اچھا تو آداب!"

شوہر! شوہر کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی پیشانی پر یکایک ٹھنڈے پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ وہ باہر نکل گیا۔ اور چاندنی رات میں صبح تک جھیل کے گرد چکر لگاتا رہا۔ جھیل کی سطح پر جگمگاتے ہوئے تاروں کے عکس لاکھوں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔

وہ واپس آکر لیٹنے ہی جا رہا تھا کہ کھڑکی کے شیشے پر کھٹ کھٹ کی آواز ہوئی اس کی حسین پڑوسن کھڑکی پر کھڑی تھی۔ صبح کی طرح راحت بخش، حیا آگیں تبسم ہونٹوں پر کھیل رہا تھا۔ سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ کھلے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر سفید ململ کی کامدار گاؤن زیب دے رہی تھی۔ اس کی روشن نیلی آنکھیں تا ہنوز نیند کے بوجھ سے دبی جا رہی تھیں۔ وہ چپ رہنے کے لئے چھوٹے چھوٹے کردندے جیسے سرخ ہونٹوں پر انگلی رکھے ہوئے تھی۔

"تمام رات جاگتے گزر گئی" اس نے تھکے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

"مگر اداس مت ہو پیٹر۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔ میں تمھاری ہی ہوں۔"

حسینہ کی لمبی سانس سے کھڑکی میں رکھے ہوئے پھول کی پنکھڑیاں ہلنے لگیں

تھائک نے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی شعاعوں سے روشن کھڑکی کی طرف اپنے شوق آمیز بازو پھیلا دئیے۔ اوپر کے کمرے میں کسی مرد کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی۔

دو ہفتے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز تھائک کو یک لخت غائب دیکھ کر سلین تینا کو بہت تعجب ہوا۔ وہ فکر و تشویش کے باعث بیمار پڑ گئی۔ ایک روز بارش سے لدی ہوئی شام کو اس کے شوہر نے ایک عجیب انداز سے بتایا کہ وہ ایک بڑے نامی گرامی مہمان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ ان سے تنہائی میں ملنا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھی کہ کوئی تجارتی خشک معاملہ ہوگا۔ کچھ کاغذوں پر دستخط کرنے ہوں گے لیکن جب اس نے کھانا کھاتے وقت بیرونی دروازے کے باہر بیٹھے کے قدموں کی آہٹ سنی تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ شوہر سے کچھ دریافت کرے پر بھی اسے پتہ نہ چلا کہ آخر وہ پھر اس سے اس طرح یکایک ملنے کیوں آیا ہے۔

نوکر نے بھاری آواز میں اطلاع دی کہ موسیو تھائک تشریف لے آئے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شروع شروع میں سلین تینا تھائک کو پہچان نہ سکی کیونکہ وہ گزشتہ چند روز کے اندر مضمحل ہو گیا تھا۔ اس کے شوہر نے اپنے زرد مونچھوں والے چہرے سے اس کی طرف دیکھا۔ تھائک کا چہرہ مدقوق سا ہو گیا تھا۔ جو اس کا چشمہ لگا ہوا تھا وہ بڑا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی ٹوپی چند بار دیکھتے ہوئے کھانس کر آگے بڑھا۔ تھائک نے جھک کر خوب ڈھنگ سے سلام کیا۔ اور جھینپتے ہوئے اس زمانے کے دستور کے مطابق حسینہ کی انگلیوں کا بوسہ لے لیا۔ پھر بیٹھ کر متانت آمیز خوشی کے ساتھ بولا:۔

"مسٹر کالیون! مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے مجھے اس طرح ملنے کا موقع دیا۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ آپ نے بیگم صاحبہ سے میرے آنے کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس زمانے میں کچھ فراخ دلی اور ہمدردی رہ گئی ہے تو وہ یہی کہ شریف لوگ ناگوار معاملات کو تھوڑی سی بدمزگی کے ساتھ دور کر دیتے ہیں"

"جی ہاں۔ جی ہاں" ——— حسینہ کے شوہر نے درمیان ہی میں زور سے سانس لیتے ہوئے کہا ———

"میں نے آپ کے بارے میں آج اچھی طرح سمجھ بوجھ لیا ہے۔ اور مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کے تمام معاملے بخیر و خوبی طے ہو گئے ہیں۔ اب آپ کے سامنے ایک باعزت اور مسرت بخش مستقبل ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ کچھ مشکلات بھی ہیں۔ میں تاجر ہوں مجھے کاروباری دنیا سے واقفیت ہے۔ اس لئے میں سمجھ گیا کہ آپ یہاں کس غرض سے آئے ہیں۔ آپ بیرونی آدمی ہیں۔ آپ کا کوئی ہمدرد، عزیز اور دوست یہاں نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے ملک میں ہوتے تو شاید آپ کو کسی کی امداد و اعانت کی ضرورت پیش نہ آتی آپ میرے یہاں شاید اس امید پر آئے ہیں کہ میں آپ کا پڑوسی ہوں۔ مجھ سے آپ کو ضرور مدد ملے گی آپ کے پاس صرف دیانت اور ایمانداری کی ضمانت ہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میری بیوی بھی موجود رہے۔ اس سے آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس اہم معاملے میں بھی ——— معاف کیجئے گا ——— آپ کو عورت کی گواہی میں بھی کوئی عذر نہیں۔ دیکھئے خدا نے مجھے کوئی لڑکا بالا نہیں دیا۔ میں کچھ پیسے والا بھی ہوں۔ پھر بھی میں جوانوں اور معرکہ حیات کے بہادروں کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہوں"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے"

"بس رہنے بھی دیجئے مسٹر تھائک۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ میں کچھ ایسا دولتمند آدمی نہیں ہوں پھر بھی آپ کو سہارا دینے کے لئے آپ کی مالی مدد کرنے کو تیار ہوں میں جانتا ہوں کہ آپ کا سمندری جہاز نا کامیابی کا منہ دیکھ رہا ہے۔ اور یہ سوچ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑے بڑے غیر ملکیوں خصوصاً یہاں کے رئیسوں اور نوابوں کو چھوڑ کر مجھ جیسے معمولی تاجر اور شہری کے پاس مدد مانگنے کیوں آئے ہیں"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھ سکے مسٹر کالیون"

تھائک نے بڑی مشکل سے یہ بات کہی۔ بڑھے کی غلط فہمی نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ وہ کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ کمرے کی فضا ساکن تھی۔ اور وہ زور زور سے سانس لے رہے تھے۔ اور گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز دلوں کی دھڑکنوں کی ہمسائیگی کر رہی تھی۔ سلین تینا کی آنکھیں جھک گئیں۔

"مسٹر کالیون آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ میرے اندازے سے بھی زیادہ مہربان اور فراخدل واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے میرا یہاں آنا۔ اور آپ کے سامنے یہ التماس کرنا زیادہ تکلیف دہ اور شاق معلوم ہو رہا ہے اگر میں آپ کی فراخدلی سے پہلے سے واقف ہوتا تو اس مقصد سے کبھی آپ کے پاس نہ آتا۔"

تھائک کی زبان سے یہ الفاظ اس طرح نکل رہے تھے۔ جیسے کوئی امڈتے ہوئے سیلاب میں سے بول رہا ہو۔

کالیون گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کسی زبردست جنونی پاگل سے پالا پڑ گیا ہے۔

"خیر۔ تو پھر کہئے کہئے آپ کا کیا مطلب ہے؟" تیزی سے سانس لیتے ہوئے کالیون بولا۔

وہ اپنی بیوی کو اپنی پریشانی سے آگاہ کرنے کے لیے میز کے نیچے سے اُس کے پاؤں میں ٹھوکر مار رہا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ تھالک کے عجیب رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر پہلے ہی اس کے حواس گم ہو چکے تھے۔

"جی نہیں، میں آپ کے پاس روپے کی مدد لینے نہیں آیا ہوں میں ان کے لئے آیا ہوں۔ آپ کی بیوی بیلین تینا کے لئے۔ اپنی پیاری کے لئے ——"

"تم حواس میں ہو کہ نہیں" کالیون نے سانس لے کر کہا۔ اور اس طرح اچھل کر کھڑکی کی طرف بھاگا جیسے چیخنا چاہتا ہو کر دوڑ آگ لگی۔ مگر تھالکت کی جذبات سے مشتعل نظروں کو دیکھ کر وہ پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

"جی ہاں آپ بجا کہتے ہیں۔ میں ایمان دار آدمی ہوں۔ مجھے کسی حالت میں جھوٹ بولنا پسند نہیں میں آپ کی بیوی کو چرانے سے پہلے اپنی جان دے دوں گا۔ اور دوسروں کی جان لے لوں گا۔ میں کسی کی محبت پر ڈاکہ ڈالنا نہیں چاہتا خصوصاً آپ جیسے نیک دل اور شریف انسان کی محبت پر۔ میں آپ کی بیوی سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے میں نہایت صفائی کے ساتھ یہی کہنے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں"

تھالکت نے ایک ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا اور پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"دیکھئے جناب۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں نہ دیوانہ ہوں، نہ خونی، آپ کے سامنے اگر کوئی دوسری راہ نہیں ہے تو ایک معمولی بدمعاش چور کی طرح مجھے گولی مار دیجئے۔ میں اف بھی نہ کروں گا"

کمرے میں پھر وہی اذیت ناک تکلیف دہ۔ اور جان گسل سناٹا چھا گیا۔ زور زور سے سانس چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ گھڑی ٹک ٹک کر کے دلوں کی ہم آہنگی کرنے لگی اور دل گھڑی کی طرح دھڑکنے لگے۔

"ارے میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا یہ سب صحیح ہے۔ بتا بتا دبیلیں تینا۔ نہیں نہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ کہہ دو۔ کہہ دو میری پیاری۔ اچھی بیلین تینا کہہ دو یہ سب غلط ہے" —— بیچارہ کالیون سسکنے لگا

"پیٹر تھالک زوبے کاے کا شہزادہ۔ اگرچہ غریب ہے۔ اور اب اس کے پاس کوئی وردی نہیں، پھر بھی وہ ایک سپاہی ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا" تھالکت۔ اس طرح سینہ تان کر فخریہ لہجے میں بولا جیسے وہ فوج کی کمان کر رہا ہو۔ بیلین تینا کی آنکھوں کی چمک زائل ہو گئی۔ جیسے وہ سوتے سوتے جاگ پڑی ہو۔ وہ اٹھ کر پیٹر کی طرف بڑھی اور اسے سر سے پیر تک گھورتی ہوئی بولی۔

"آپ آسٹرین ہوں یا ہنگرین۔ سلوواک ہوں یا کوئی اور۔ آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ میں فرانسیسی عورت ہوں۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ فرانس کا یہ دستور نہیں ہے کہ عاشق اپنی معشوقہ کے راز کو اس کے شوہر پر افشا کر دے۔ جناب عالی! میں نے اپنے آپ کو کبھی آپ کے سپرد نہیں کیا۔ تاہم میں آپ کو پسند کرتی تھی۔ مگر اب آج سے مجھے آپ سے بے حد نفرت ہو گئی ہے۔ اب آپ سمجھ لیں کہ میں آپ پر تھوکتی ہوں —— "آداب!" —— یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

تھالک کو اس طرح لڑکھڑاتے باہر جاتے دیکھ کر، جیسے پٹا ہوا پلا بھاگا جا رہا ہو۔ کالیون بولا۔

"مسٹر تھالکت۔ اگر میں آپ کی کچھ امداد کر سکتا ہوں تو ہمیشہ آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں"

جب وہ برآمدے میں پہنچا تو نوکر نے پیچھے سے دوڑ کر کہا "حضور! حضور! معاف کیجئے گا۔ آپ اپنا ریوالور چھوڑے جا رہے ہیں"

(کروشین ادیب آتون گستاد مالوس)

کمالِ نظر

از:۔ راج بلدیو راج ایم۔اے۔

ہر اک قطرے کی گہرائی میں اے دوست!
سمندر کے سمندر دیکھتا ہوں
ہر اک پستی کے دل میں کھا کے غوطہ
ثریا اوج منظر دیکھتا ہوں
ہر اک شبنم کے قطرے کے جگر میں
شرارِ برقِ مضطر دیکھتا ہوں
ہٹا کر تیرگی کے رُخ سے پردہ
جمالِ ماہ و اختر دیکھتا ہوں
رگِ ہر گل میں احساسِ نظر سے
سنان و تیغ و خنجر دیکھتا ہوں
سیاہی میں نظر آتے ہیں جلوے
تجلّی کو مکدّر دیکھتا ہوں
محبت سے پرے بھی کوئی شے ہے
محبت سے گزر کر دیکھتا ہوں
مآلِ حسن کے پردے میں اے راج
میں جبر [illegible] دیکھتا ہوں

غزل

از:- اختر انصاری بی۔ اے (آنرز)

ملالِ بے اثر اور گریۂ ناکام ملتا ہے
محبت میں مرے پیارے یہی انعام ملتا ہے

امیدوں کی بنا اِک شوقِ ناپختہ پہ ہے قائم
تمناؤں کی تہ میں اِک جنونِ خام ملتا ہے

مرے دن رات کیفیت سے خالی ہوتے جاتے ہیں
نہ لطفِ صبح پاتا ہوں، نہ عیشِ شام ملتا ہے

محبّت نے تڑپنا ہی سکھایا ہے مرے دل کو
مجھے دل کے تڑپنے ہی میں کچھ آرام ملتا ہے

طبیعت وجد کرتی ہے تری آوازِ پُرطرب!
ترے نغموں میں دل کو رقص کا پیغام ملتا ہے

جوانی زندگی کی عشرت آگیں رات ہے گویا
جوانی میں محبت کا چھلکتا جام ملتا ہے

بجا ہے خوفِ رسوائی مگر میں کیا کروں اخترؔ
کسی کا نام لینے سے مجھے آرام ملتا ہے

صبح جلتی

از:- مجید امجد بی۔ اے۔

اب دُھندلی پڑتی جاتی ہے تاریکیٔ شب! میں جاتا ہوں!
وہ صبح کا تارا اُبھرا! وہ پَو پُھوٹی! اب میں جاتا ہوں!
جاتا ہوں! اجازت! جاتا ہوں وہ دیکھو اجالے چھانے کو ہیں!
سورج کی سنہری کرنوں کے خاموش بلاوے آنے کو ہیں!
وہ پھولوں کے گجرے جو تم کل شام پرو کر لائی تھیں
وہ کلیاں جن سے تم نے یہ رنگیں سیجیں مہکائی تھیں
دیکھو ان باسی کلیوں کی پتّی پتّی مرجھائی ہے
وہ رات سہانی بیت چکی اور سحر کی ساعت آئی ہے
اب مجھ کو یہاں سے جانا ہے پُرشوق نگاہو! مت روکو!
او میرے گلے میں لٹکی ہوئی لچکیلی باہو! مت روکو!
جانے دو مجھے، اب وہ دیکھو غرفے سے شعاعیں جھلکی ہیں!
پگھلے ہوئے سونے کی لہریں مینائے سحر سے چھلکی ہیں
کھیتوں سے کسی چرواہے کی بنسی کی صدا ہی آئی ہے
اک ایک رسیلی سُر جن کی پیغام سفر کا لائی ہے
مجبور ہوں میں، جانا ہے مجھے، دل مانے نہ مانے، جاتا ہوں
دنیا کی اندھیری گھاٹیوں میں اب ٹھوکریں کھانے جاتا ہوں

حوّا کا روزنامچہ

از:- "شما"

سوموار - دوپہر

کرۂ ارض پر کونسی ایسی چیز ہے جس میں اُسے دلچسپی نہیں۔ قسم قسم کے جانور ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ سرسری نظر سے دیکھا۔ لیکن وہ تو ہر ایک سے مل جل جاتی ہے۔ ان سے پیار کرتی ہے۔ اس کیلئے تو وہ گویا ایک خزانہ ہیں۔ جو اسے مل جاتا ہے۔

کل ایک بے ہنگم جانور ہمارے گھروں میں گھس آیا۔ یہی مصیبت میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ لیکن وہ تو سمجھی کہ اسے شاید کوئی دولت مل گئی ——— افسوس اس معاملہ میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کسقدر مختلف ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم اس جانور کو سدھائیں۔ میں نے یہی مناسب جانا کہ گھر کو خیرباد کہہ کر کہیں اور جا رہا ہوں۔ اُسے یقین ہے کہ جانور ہم سے جلد ہی ہل مل جائے گا۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اکیس فٹ اونچا اور چوراسی فٹ لمبا جانور اگر ہل مل گیا۔ تو بھی کیا۔ اتنا لمبا چوڑا جانور بھلا کس کام کا ہے۔ اگر اس نے کسی دن ذرا بھی گھر پر بوجھ ڈالا۔ تو ایک گھر کیا کئی گھر گرا دیگا۔ اور جانور ہے بھی یونہی سا۔ عقل سے دشمنی ہی رکھتا ہے۔

مجھ سے کہنے لگی۔ کہ اس جانور پر سوار ہو کر ہم دور دور کا نظارہ کر سکیں گے۔ میں نے سوچا۔ چہ خوب۔ لیکن اتنے لمبے چوڑے جانور پر سوار ہونا بھی کارے دارد۔ چالیس فٹ لمبی دم۔ جیسے ایک موٹے درخت کا تنا ہو۔ وہ باز نہ آئی اور دم پر دوڑنے لگی۔ اس کا جسم اسقدر صاف تھا۔ کہ اس کا پاؤں بُری طرح پھسلا۔ اگر میں پکڑ نہ لیتا۔ تو اُسے سخت چوٹ آتی۔

وہ باز آ گئی؟ شاید یہ وہ جانتی ہی نہیں۔ وہ تو ہر ایک بات پر مصر ہے۔ کہ اسے کر کے ہٹے گی۔ اس کا یہ جذبہ ہے قابل داد۔ مجھے بھی بعض اوقات اس کی باتیں درست معلوم ہونے لگتی ہیں۔ لیکن میں ایسی حالت میں وہاں سے چلا آتا ہوں۔ اس دیو پیکر جانور کے متعلق اب اس نے دوسرا نظریہ قائم کر لیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کو اپنے پاس رکھ کر اسے پیار کیا جائے۔ تو وہ ندی کو پار کرنے کے کام آ سکتا ہے۔ وہ پانی میں لیٹ جائے تو اس کے اوپر سے ندی پار کر لیں گے۔ دراصل یہ جانور اس سے بہت حد تک مانوس ہو گیا ہے۔ مجھے تو وہ سانپ کی نسل سے معلوم ہوتا ہے ——— ایک دو بار جب وہ پانی میں لیٹ رہا تھا۔ تو اس نے اس کے اوپر سے پار جانا چاہا۔ لیکن جانور اسے دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ اور اس کے پاس آ گیا۔ ایک کرہ تھا جو رینگتا آ رہا تھا۔"

حوّا کا روزنامچہ

منگل وار - بدھوار - جمعرات اور جمعہ

ہونے کو آیا۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں۔ اکیلے میں یہ دن پہاڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔ پہاڑ کے دن گزر جاتے ہیں۔ مگر اس کی بے رُخی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میری فطرت مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ میں اپنا ساتھی ڈھونڈوں۔ اس لئے مجبوراً مجھے جانوروں سے دل بہلانا پڑتا ہے۔ وہ کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ ان سے ذرا پیار کرو۔ تو وہ ہل مل جاتے ہیں۔ اور پیار کرنے لگتے ہیں۔ میں جب انہیں پکارتی ہوں۔ وہ دم ہلاتے میری طرف بھاگے ہوئے آتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے کسقدر اطمینان ہوتا ہے۔ لیکن وہ ——— میں نے ذرا زیادہ باتیں کیں تو اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اور چلا گیا۔ اگر کبھی بات بھی کی۔ تو بالکل روکھی پھیکی۔ اس نے کبھی میرے دل کی بات نہ کی۔ عجیب سا جانور ہے۔ لیکن یہ جانور کتنے اچھے ہیں۔ ان سے کھیلتے دن بیت جاتے ہیں۔ نہ جانے میری کیا حالت ہو ——— اکیلے میں وقت گزارنا ایک مصیبت ہے۔

باغ میں جہاں میں جاتی ہوں۔ جھنڈ کے جھنڈ جانوروں کے جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک دن میں پہاڑی کی چوٹی پر جا چڑھی۔ کیا دیکھتی ہوں۔ کہ عجیب عجیب رنگ کے ہزاروں جانور وادی میں جمع ہیں۔ ان میں دھاریدار کھال والے جانور سب سے زیادہ پیارے دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ تو خوبصورت پرندے اپنے پر پھیلائے مجھ پر سایہ کئے تھے۔ سورج کی سنہری کرنیں رنگ برنگ کے پروں سے چھن کر آ رہی تھیں۔ وہ کتنا حسین منظر تھا۔ رنگ دار پروں پر سورج کی روشنی عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔

میں نے ان جانوروں کے ساتھ مل کر وادی کی خوب سیر کی ہے۔ باغ کا کونا کونا دیکھ لیا ہے۔ بھلا میرے سوا جنگل کی سیر کرنے والا اور کون انسان ہے۔ جب میں سیر کو نکلتی ہوں۔ تو وہ ایک عظیم الشان نظارہ ہوتا ہے۔ میں اکثر شیر یا چیتے پر سوار ہوتی ہوں۔ ان کا جسم بڑا نرم

ہوتا ہے اور ان کی گردن کی سواری بڑی آرام دہ ہوتی ہے - یہ دونو جانور ہیں بھی بڑے خوبصورت - لیکن جب مجھے ذرا دور جانا ہوتا ہے یا نظارہ کرنا ہو تو میں ہاتھی کی سواری کو زیادہ پسند کرتی ہوں - وہ مجھے سونڈ کی مدد سے اپنے سر پر بٹھا لیتا ہے - لیکن اُترتے وقت میں خود چھلانگ لگا کر نیچے آ رہتی ہوں - یا وہ ذرا جھکتا ہے اور میں اُتر آتی ہوں -

پرندوں کو میں نے دیکھا ہے - وہ آپس میں کس پیار سے رہتے ہیں - ان میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا - وہ آپس میں باتیں کرتے ہیں - وہ مجھ سے بھی باتیں کرتے ہیں - لیکن - افسوس کہ میں ان کی گفتگو کو نہیں سمجھ سکتی مگر وہ میری باتوں کو خوب سمجھ لیتے ہیں - کتا اور ہاتھی تو عجیب ہیں - میری بات تو کیا اشارہ تک کو جان جاتے ہیں - مجھے ان کی ذہانت دیکھ کر اپنے آپ پر شرم آتی ہے - وہ تو مجھ سے بھی ذہین اور تیز ہیں - بعض اوقات مجھے غصہ بھی آ جاتا ہے کہ وہ کیوں مجھ سے بڑھ کر ہیں - میں سمجھتی ہوں ذہانت اور ذکاوت میرا ہی حق ہے -

سانپ ہر روز میرے پاس آتا ہے - اس کی میٹھی میٹھی باتیں دل کو لبھانے والی ہوتی ہیں - نہ جانے وہ اتنی باتیں کیسے جانتا ہے - اس کی باتیں دل میں گھر کر لیتی ہوں - مجھے جب بھی "وہ" سانپ کے ساتھ باتیں کرتا دیکھتا ہے بس ناراض ہو کر دوسری طرف چلا جاتا ہے - نہیں جانتا - کہ سانپ ہم دونوں سے زیادہ جانتا ہے - اس نے مجھے سیب کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا - مگر سانپ نے بتایا کہ اگر سب کچھ جاننا چاہتی ہو - تو سیب کھا لو - اسی راز میں علم پنہاں ہے -

آہستہ آہستہ مجھے بہت سی باتوں کا علم ہوتا جا رہا ہے میں سوچتی تھی کہ پہاڑ سے جو پانی گرتا ہے وہ واپس کیسے پھر پہاڑ کو چلا جاتا ہے - میں پہروں بیٹھی دیکھتی رہی لیکن اب پتہ چلا - کہ رات کے اندھیرے میں پانی واپس جاتا ہے - آخر تجربہ سے ہی یہ بات حاصل ہوئی - تبھی تو آبشار کا پانی کبھی ختم نہیں ہوتا - علم جو تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہو وہ زیادہ بہتر ہوتا ہے - محض فرض کر لینا - علم کو بڑھاتا نہیں - تجربات میں اکثر دیر لگتی ہے - انتظار کرنا پڑتا ہے - لیکن یہ انتظار بڑا دلچسپ ہوتا ہے - اور جب نتیجہ کامیاب رہے - تو دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے — اگر تجسس کا شوق نہ ہو - تو شاید زندگی ایک بدمزہ چیز بن کر رہ جائے - میرے لئے تو جسقدر مزا کسی چیز کے حاصل کرنے کی سعی میں ہے - اتنا لطف مجھے اس کے حاصل کر لینے میں نہیں یہ پانی کا تجربہ ہی ہے — جب تک اس کا علم نہ تھا - مجھے راز معلوم کرنے میں ایک راحت محسوس ہوتی تھی - لیکن جب راز معلوم ہو گیا تو اب افسوس ہوتا ہے - کہ ایسا کیوں ہوا - وہ جوش و خروش جاتا رہا ہے -

پانی میں لکڑی تیرتی ہے - پتے - پرندوں کے پر اور بیسیوں ایسی چیزیں تیرتی ہیں - اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے - کہ چٹان بھی تیر سکتی ہے — کیسے تیر سکتی ہے - اس کا علم تجربہ سے ہی ہو سکتا ہے - کیسے؟ ایک تجسس ہے - اس کی تکمیل ایک مایوسی ہوگی - کیونکہ اس کے بعد تلاش ختم ہو جائے گی - آہستہ آہستہ میرا علم بڑھ رہا ہے اور جوں جوں میری معلومات زیادہ ہوتی جا رہی ہیں - میری افسردگی بھی بڑھ رہی ہے اور جوش کم ہوتا جا رہا ہے - مجھے معلومات حاصل کرنے میں ایک خاص لُطف حاصل ہوتا ہے اور اس لطف کا مدار سرگرمی اور جوش پر ہے - کل رات میں یہی باتیں سوچتی رہی - اور ساری رات سو نہ سکی -

میں سوچا کرتی تھی کہ میری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ میں پیدا ہی اس لیئے کی گئی ہوں - کہ اس عجیب و غریب دنیا کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کروں - مادر گیتی کے سینے میں پنہاں خزانوں کو نکال لاؤں - جب ان رازوں کو پا لوں - تو پھر اس خالق حقیقی کی حمد کروں - جس نے میری خوشی اور آسائش کے لئے یہ سب کچھ بنایا ہے -

اس نے میرے لئے اسقدر نعمتیں پیدا کی ہیں - جن کو معلوم کرنے کیلئے میں ہفتوں کیا مہینوں اور سالوں مصروف رہوں گی - میں نے اسی لئے اپنی جستجو کو کم کر دیا ہے - تاکہ میرے دن اسی مصروفیت میں گذر جائیں

میں نے ہوا میں ایک پر پھینکا - تو وہ اڑنے لگا - اور نظروں سے اوجھل ہو گیا - لیکن ایک کنکر کو جب بھی پھینکا گیا - تو وہ زمین پر آ رہا - میں نے کئی بار اس کا تجربہ کیا - اور ہر بار ایسا ہی ہوا - میں حیران ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے - شاید میری نگاہ کا دھوکہ ہو - اور وہ زمین پر نہ آتا ہو - اُسے زمین پر آنا نہیں چاہیئے - بہرحال یہ کیوں ہوتا ہے - میں ثابت نہیں کر سکتی - اتنا معلوم کر سکی ہوں پر اور پتے ہوا میں اڑتے ہیں - لیکن کنکر زمین پر گر پڑتے ہیں -

ستارے ہر رات نمودار ہوتے ہیں - لیکن اُن کی زندگی ایک رات سے زیادہ نہیں ہوتی - وہ آہستہ آہستہ مدھم ہوتے جاتے ہیں - جوں جوں رات زیادہ گذرتی جاتی ہے - وہ پھیکے پڑتے جاتے ہیں - ایسا کیوں ہوتا ہے - میں نے سوچا اور راتوں ان کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی ان کا نقش میرے دماغ پر اسقدر گہرا پڑ گیا ہے کہ جب وہ غائب ہو

جاتے ہیں۔ تو میں خیالی طور پر ان کا نظارہ کرتی رہتی ہوں اور ان کی یاد میں میری آنکھیں ستارہ بار ہو جاتی ہیں۔

جبوط کے بعد

باغ عدن کی یاد دل میں ایک کانٹا بن کر کھٹکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک میٹھا خواب تھا۔ جو ٹوٹ گیا۔ باغ عدن کیا تھا ایک حسین صنعت کا نمونہ۔ جہاں ہر طرف عطر بیز ہوا۔ خوشگوار مناظر۔ ایک سکون اور راحت۔ اب کچھ نہیں رہا۔ وہ دنیا ہی بدل گئی۔

باغ دیگر میں نے اُسے پالیا۔ میں مطمئن ہوں۔ میں نے سب کچھ پالیا۔ اب وہ ہے اور میں۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اب میری امیدوں کا مرکز وہی ہے۔ مجھے اس سے والہانہ عشق ہے۔ وہ میری محبت کا جواب اپنی محبت سے دیتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے کیوں محبت کرتے ہیں۔ یہ سوال فکر کی دنیا سے پرے ہے۔ میری فطرت مجھے اس کا ہو جانے کو مجبور کرتی ہے۔ میرا من مجھے پکار پکار کر کہتا ہے۔ حوّا تو آدم کے لئے پیدا کی گئی۔ آدم تیرا ہے۔

باغ ارض میں بھی پرندے چہچہاتے ہیں۔ مجھے اُن کے نغمات بہت پسند ہیں۔ آدم گوگانا نہیں جانتا۔ لیکن پھر بھی مجھے اس پر پیار آتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا تم بھی گاؤ۔ تو وہ مسکرانے لگا۔ میری حالت اب عجیب ہے۔ یہی چاہتی ہوں۔ کہ میں بھی وہی چاہوں جو وہ چاہتا ہے۔ وہی پسند کروں جو اس کی پسند ہو۔ اور وہی کروں جو اس کی رضا ہو۔

وہ اتنا ذہین نہیں۔ اور مجھے اس کا گلہ بھی نہیں۔ جو کچھ خدا نے اُسے بنایا ہے۔ وہی کچھ وہ ہے۔ اس کی پیدائش بھی حکمت سے خالی نہیں وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا جائے گا۔ اور مجھے اس کی یہی حالت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

میں اس سے اس لئے محبت نہیں کرتی، کہ وہ کوئی بڑا باوقار ہے یا اس کی طبع نفیس ہے۔ اس بارے میں بھی اس میں خامیاں ہیں۔ مگر مجھے اطمینان ہے کہ باوجود ان کمیوں کے وہ پھر بھی محبت کئے جانے کے قابل ہے۔

اس کی کاریگری یا صنعت بھی ایسی نہیں کہ مجھے اپنی طرف مائل کرسکے۔ ایک بات جانتی ہوں کہ اس میں بعض پوشیدہ جوہر ضرور ہیں جنہیں وہ مجھ سے چھپاتا ہے۔ باغ عدن سے نکلنے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے خوب گھل مل گئے ہیں۔ وہ مجھ سے کوئی بات مخفی نہیں رکھتا۔ مگر اس معاملہ میں اس کا اخفا میرے لئے قلق کا موجب ہے۔ بعض اوقات سونے سے پہلے جب مجھے یہ خیال آجاتا ہے۔ تو میری نیند اچاٹ ہو جاتی ہے اور میں ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں۔ میں کوشش تو یہی کرتی ہوں کہ یہ خیال میری خوشی کو تباہ نہ کرے۔ وہ خوشی جو میں نے باغ عدن دیکر حاصل کی ہے۔

اس کا علم الاشیاء اس کی بہادری کے کارنامے مجھے مرعوب نہیں کرتے۔ بعض اوقات وہ اپنی بہادری جتاتا ہے۔ لیکن میں باتوں باتوں میں گفتگو کا رُخ بدل دیتی ہوں۔ مجھے ان تعلیوں سے دلچسپی نہیں۔

آخر مجھے اس سے کیوں محبت ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ مرد ہے۔ اور میرا مرد۔ وہ مجھ سے محبت کرے یا نفرت۔ مجھے دھتکارے یا بُرا بھلا کہے۔ مجھے مارے بھی تو بھی میں اس کی ہوں۔ میرا جواب محبت کرنا ہے۔ یہ میری فطرت ہے اور میری جنس۔

وہ مضبوط ہے اور خوبصورت۔ اسی لئے مجھے اس سے محبت ہے میں اس کی پرستش کرتی ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ اگر اس میں یہ صفات نہ بھی ہوتیں۔ تو بھی میں اس سے محبت کرتی۔ وہ سادہ ہوتا یا کمزور تو بھی میری الفت میں فرق نہ آتا۔ میں اس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ وہ میرا آقا ہے۔ میں اس کے لئے دعائیں مانگتی ہوں۔ جب وہ استراحت کرتا ہے تو میں اس کے پاس پہروں بیٹھی رہتی ہوں۔ خدا کرے مجھے اسی حالت میں موت آجائے۔

وہ میرا ہے اور یہی میرے لئے کافی ہے۔ اس جذبۂ محبت میں عقل کو دخل نہیں۔ وہ میرے لئے ہے اور میں سراپا محبت بن کر اس کی ہو جانا چاہتی ہوں۔

میرا یہ نظریہ درست ہے یا نہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ یہ صرف میری فطرت کی آواز ہے۔ میرا تجربہ نہیں۔ شاید میری بیٹیاں میرے نظریے کے خلاف ہوں۔ انہیں میں الزام نہیں دے سکتی۔ ممکن ہے میری کم عمری اور ناتجربہ کاری نے مجھے ایک غلط خیال پر مستحکم کر رکھا ہو۔

چالیس برس بعد

یہ میری دعا ہی نہیں بلکہ آرزو ہے کہ ہم زندگی بھر اکھٹے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ آرزو کبھی رائگاں نہ جائیگی۔ جب تک دنیا قائم ہے۔ یہ پوری ہوتی رہے گی۔ میری ہر بیٹی کے دل میں یہی آرزو ہوگی کہ وہ کسی کی ہو کر رہے۔ ان کی ماں کی آرزو ہمیشہ پوری ہوگی۔

اگر ہم میں سے کسی کو پہلے ہی مرنا ہے۔ تو اے خالق ارض وسما تو مجھے اٹھا لے میں کمزور ہوں۔ وہ توانا ہے۔ میرے بغیر وہ زندگی کے دن

کاٹ لے گا۔ لیکن میرا سہارا کون ہوگا۔ اس کے بغیر میری زندگی موت سے بدتر ہوگی۔ خداوندا میری اس دعا کو جاوداں کر دے اور جب تک میری نسل قائم ہے یہ دعا قبول ہوتی رہے۔

میں سب سے پہلی بیوی ہوں۔ ابتدا پھر انتہا میں دوہرائی جائے۔

آدم حوا کی قبر پر

آہ! یہ جہاں وہ تھی وہی باغِ عدن تھا۔

اے دِل!

از:۔ سحرؔ رامپوری

بھول جا اے دل وہ دورِ زندگانی بھول جا
چودھویں کا چاند — دریا کی روانی، بھول جا

خوابگوں لمحے، وفورِ شادمانی، بھول جا
سیمگوں موجیں، نویدِ زندگانی، بھول جا

مخملیں سبزہ، فضاء کی دلستانی، بھول جا
مرمریں باہیں سرورِ کامرانی، بھول جا

جلوہ فرما تھی جوانی ہی جوانی، بھول جا
وہ جوانی ہر ادا جس کی سہانی، بھول جا

ہر نظر محوِ نشاطِ غیر فانی، بھول جا
ہر طرف جامِ شرابِ ارغوانی، بھول جا

ولولے تھے اور اک رنگیں جوانی، بھول جا
قہقہے تھے اور اک "پھولوں کی رانی"، بھول جا

کیا پیام آتے تھے تاروں کی زبانی، بھول جا
کیف میں ڈوبی ہوئی تھی زندگانی، بھول جا

اعتبارِ عشق کی دلکش کہانی، بھول جا
اعتمادِ حُسن باقی ہے کہ فانی، بھول جا

مل گئی ہے خاک میں کس کی جوانی، بھول جا
پڑ گیا ہے کس کی امیدوں پہ پانی، بھول جا

کس کی دُنیا کا سکوں ہے، اضطرابِ نو بہ نو
کس نے دیکھا انقلابِ ناگہانی، بھول جا

کس کی ناکامی پہ عالم کا تمسخر، رُو بہ رُو
کس کی بربادی ہے ننگِ زندگانی، بھول جا

کس کی وارفتہ نگاہی پر تحیّر، سُو بہ سُو
کس کی آشفتہ خیالی ہے کہانی، بھول جا

کس کو کہتا ہے جہاں، تصویرِ حسرت سر بہ سر
کس پہ آہیں بھر رہی ہے زندگانی، بھول جا

کس کی ہستی سے پریشاں بزمِ شعر و بزمِ رقص
کس کی ہستی، باعثِ ہر سرگرانی، بھول جا

کس کے ہونٹوں پر لرزتی ہے ہنسی آتے ہوئے
کس کے آنسو، درد و غم کی ترجمانی، بھول جا

اِک خلش ہے عہدِ ماضی کے حسیں قصّوں کی چھیڑ
کس روش پر ہے سحرؔ کی زندگانی بھول جا

بنسی کا خواب

ایک تاثر

از:۔
مسز ایف۔ مارٹین روزی (لاہور)

"ہماری قسمت بھی خوب ہے" بنسی دل میں کہہ رہا تھا "کہاں میں۔ اور میری یہ حالت! ——— اچھی محبت کی، جان کو روگ لگالیا۔ شیلا۔ شیلا میں تجھے چاہتا تھا۔ میں تیرے لئے دیوانہ وار پھرتا رہا۔ میں نے کیا کیا۔ میں خود نہیں جانتا۔ مگر تو جانتی ہے میں تجھے اب نہیں چاہتا۔ میں تیرا نہیں ہوں۔ مجھے تجھ سے نفرت ہے ——— تو۔ ہاں تو، اب میری امیدوں کا مرکز نہیں رہی شیلا تو مجھے بھلا دے۔

میں جانتا ہوں میری بے پروائی تیری تباہی کا باعث ہوگی۔ اور میری بے وفائی تیری جان پر بنا دے گی۔ تو مجھے چاہتی ہے۔ چاہے جا۔ تو مجھ سے وفا کرنا چاہتی ہے کئے جا۔ مگر میں اب تیرا نہیں ہو سکتا۔"

بنسی انہی خیالات میں محو جا رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک کھلے بازار میں پہنچ گیا ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بازار میں ایک مکان سے گانے بجانے کی آواز آ رہی تھی بنسی نے اوپر جو نگاہ اٹھائی تو اس کی ایک ہم جماعت لڑکی کھڑی نظر آئی اس نے اشارے سے بنسی کو بلایا۔ دونوں باتیں کرتے رہے۔ اب بارش موسلا دھار شروع ہو گئی تھی۔ بنسی نے غنیمت جانا کہ کوئی سر ڈھکنے کو جگہ مل گئی۔ بارش ختم ہونے پر بنسی نے جانے کی اجازت چاہی اور چل دیا۔

راستے میں پھر وہی خیالات ——— !" میری ہم جماعت لڑکی شیلا سے زیادہ حسین ہے۔ گاتی بھی اچھا ہے۔ نہ معلوم کیوں خود بخود طبیعت . . "

ٹانگے والے کی آواز آئی "بابو جی بچو"۔ اب بنسی کو معلوم ہوا کہ وہ باغ میں نہیں ٹہل رہا ہے۔ بلکہ یہ لاہور شہر کا ایک بازار ہے۔ موسم اچھا تھا بنسی کی طبیعت گھبرائی ہوئی تھی۔ سوچا۔ چلو۔ شالامار چل کر کسی درخت کے نیچے سو رہیں"

بنسی کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا۔ جگہ جگہ پھول کھل رہے تھے کہیں دور سے کوئل کی آواز آ رہی تھی۔ اور وہی ان کی ہم جماعت لڑکی بڑے ناز سے گلابی، ریشمی ساڑی پہنے چلی آ رہی تھی۔ بنسی آگے بڑھ کر اس کا حال پوچھنے لگا

"آپ میرے ساتھ چل کر ہوٹل میں چائے پئیں گی"

اس کی ہم جماعت لڑکی نے جواب دیا "بڑی خوشی سے"

ٹھیرالیا۔

جب بنسی اور یہ لڑکی ٹانگے میں جا رہے تھے۔ تو ایک جگہ دور سے شیلا کھڑی نظر آئی۔ مگر بنسی اس کی نظروں سے بچتا بچاتا چلا ہی گیا۔ شیلا غصے میں لال پیلی ہو رہی تھی۔

رنج و غم کی حد نہ رہی تھی۔ تمام جسم کانپ رہا تھا۔ دل میں کہہ رہی تھی۔ "کیا محبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وفا اسی کا نام ہے"

بنسی اپنی ہم جماعت لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوٹل میں داخل ہوا۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ ہوٹل کے نوکر نے ایک رقعہ لاکر دیا جس میں لکھا تھا "کیا پریم کا یہی است سوں ہے" ——— شیلا" شیلا رقعہ نوکر کو دے کر ٹانگے میں بیٹھ کر چلی گئی اس حال میں کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ ٹانگے والا حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اور اسی پریشانی میں بے تحاشہ ٹانگا دوڑا رہا تھا۔

کسی نے آواز دی "بچو بچو بھائی" مگر دیکھتے دیکھتے دونوں ٹانگوں کی ٹکر ہو گئی۔ شیلا نے ایک چیخ ماری۔ اور　　　لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا کسی نے شیلا کو نزدیک کے ہسپتال میں پہنچا دیا ——— بنسی رقعہ ملتے ہی بڑا پریشان ہوا۔ پچھلی محبت نے جوش مارا اس لڑکی سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر ——— بھاگا ——— ! وہ دیوانوں کی طرح دوڑا جا رہا تھا۔ اور شیلا شیلا پکار رہا تھا۔ سڑک پر لوگ حیران تھے کہ اس کو کیا ہوا۔ کسی نے آواز دی۔

"کیا اس ٹانگے میں کوئی آپ کا عزیز تھا"

"ہاں کون سا ٹانگا ؟"

"ہاں　نہیں　کون تھا . مگر کس کی . . کیا کہا شیلا ٹانگے میں　نہیں" اور بھاگنا چاہا۔ اس کا مخاطب جان گیا۔ کہ ضرور ٹانگے میں اسی کا کوئی عزیز ہوگا۔ اس کو ہسپتال کے راستے پر ڈال دیا۔

بنسی گرتا پڑتا۔ ہانپتا کانپتا ہسپتال پہنچا۔ معلوم ہوا کہ شیلا کے ہی ٹانگے کی ٹکر ہوئی ہے۔

وہ جلدی جلدی اپریشن کے کمرے کے سامنے پھر رہا تھا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ اور آنسو بہا رہا تھا کبھی آسمان کی طرف دیکھتا۔ اور کبھی دروازے

آیندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ غلطی ہوئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اسقدر محبت ہے "

نرسیں اسٹریچر پر شیلا کو لا رہی تھیں۔ شیلا کے چہرے کا رنگ اس کی سفید ساڑی کا ہم رنگ ہو رہا تھا۔ ہاتھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور وہ ابھی بیہوشی کی حالت میں تھی۔

ہنسی آہستہ سے شیلا کے پلنگ کے پاس بیٹھ گیا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کبھی آنکھوں سے لگاتا کبھی نبض دیکھتا۔ اتنے میں شیلا نے آنکھ کھولی ہنسی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "شیلا مجھے معاف کر دے۔ آیندہ ایسا نہ ہوگا"

اتنا کہا تھا کہ اس کا سر چکرایا محسوس ہوا کہ وہ بے ہوش ہو رہا ہے ....

نرسیں دوڑی آئیں۔ اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے گئیں ہنسی کی بھی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ کسی نے کنویں سے پانی کی بالٹی بھر کر اس کے سامنے رکھ دی ہے۔ اور کوا اس پانی سے اس کے منہ پر کلیاں کر رہا ہے —— !

وہ تالاب میں سو گیا تھا۔

نوائے ممتاز

(از سید ممتاز محمود ممتازؔ)

آیا ہوں دل میں کس کی تمنا لئے ہوئے
رگ رگ میں دردِ عشق کی دنیا لئے ہوئے

سلجھا رہا ہوں رشتۂ تقدیرِ عشق کو
دل میں خیال کاکلِ سلمےٰ لئے ہوئے

اللہ رے جذبِ حسن کی تاثیرِ بے کراں
ہر ذرہ ہے ہجومِ تمنا لئے ہوئے

پھر جلوہ گر ہے سامنے وہ بے خود شباب
اک اک نظر میں لرزشِ صہبا لئے ہوئے

ممتازؔ آ رہے ہیں کلفٹن کی سیر سے
چشمِ کلیمؔ وجلوۂ سینا لئے ہوئے

معصوم آرزوئیں

(از فضل ملک)

مدت ہوئی کہ بربطِ الفت خموش ہے
پھر زمزمۂ وصال سے اس کو جگا کے دیکھ

چہرے سے ہے عیاں غمِ فرقت کی داستاں
اپنی نگاہِ مست سے پردہ اٹھا کے دیکھ

دنیائے آرزو میں کہاں وہ بہار و کیف
اُجڑے ہوئے دیار کو اک دن بسا کے دیکھ

تیرے خرامِ ناز پہ میری خودی نثار!!
پامال روزگار کو پھر آزما کے دیکھ

ہاں تجھ کو اپنے حسن و تجمل کا واسطہ!
میرے سرِ نیاز کو ٹھوکر لگا کے دیکھ

طیورِ آوارہ

حجاب

از:-
ای۔ڈی۔ڈین مسلیم (کرنال)

وہ مدت کے بعد ملیں لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا اپنے
ل کی حالت بیان نہ کر سکا ۔ انھوں نے ہرچند میری حوصلہ افزائی کرنی
پاہی میں نے بھی چاہا کہ میں ان سے گفتگو کروں لیکن مجھ پر سکتے
؛عالم طاری تھا زبان کہنے سے قاصر تھی ۔ البتہ میری آنکھیں میری
ل محبت کی شاہد تھیں۔

وہ چلی گئیں میں بُت بنا ہوا انھیں تکتا رہ گیا ۔ چاہا کہ
وازدوں ۔ جا کر کہہ دوں کہ مجھے تم سے لیکن
یال آیا ۔ آدرش دینا مناسب نہیں پھر کبھی اپنی محبت کا اظہار
ردوں گا ۔ مگر

اب بھی ——— جب کبھی وہ ملتی ہیں میں خاموش ہی رہتا ہوں ——

"مہمان"

از:-
رونق کاشمیری

(۱)

کانپ کانپ کر میں نے دروازے کے پٹ کھولے !
بے سبب خوف آگے پیچھے میرا راستہ روکے ہوئے تھا !
میرے دوست آشنا میرے بال بچے میرا خوف دیکھ کر لرز اُٹھے !
وہ بھی میرے ساتھ دروازے تک آ گئے !

(۲)

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا
کتنا ہی سامان وہ اپنی پیٹھ پر اُٹھا لایا تھا ۔
کہاں سے ؟ یہ کسی نے اس سے نہیں پوچھا !
میرے ساتھی ڈر گئے !
انھوں نے انگلیاں دانتوں تلے دبا کر نظروں ہی میں ایک دوسرے سے
کہا ——— "مہمان آ گیا"

(۳)

مہمان نے پتلے پتلے ہونٹوں سے مسکرا کر کہا "قافلہ گاؤں کے باہر تمھارا
منتظر ہے"

(۴)

میں نے جلدی میں سفر کے لئے سامان باندھنا چاہا ۔
لیکن مہمان نے میرا ہاتھ روک لیا ۔ اور دھیرے سے کہا "اسے یہیں
رہنے دو اس پر تمھارا کیا حق ہے" ؟

(۵)

کتنا تعجب ۔
زندگی بھر جمع کی ہوئی پونجی سے بنایا ہوا مکان !
آدھی رات کو جاگ جاگ کر لکھی ہوئی کتابیں !
بڑے پیار سے خریدا ہوا ستار !
وفادار بیوی ——— معصوم بچے ——— پریمی ساتھی !
کیا ان میں سے میرا کوئی بھی نہیں ؟
کیا کسی بھی چیز پر اب میرا حق نہیں ؟
کتنا تعجب !

(۶)

دھکیل دھکیل کر ——— جلد جلد ——— آنکھوں میں ندیاں لئے !
میرے ساتھیوں نے دروازے سے باہر مجھے چھوڑ دیا !
اور میرے پیار سے بنے ہوئے مکان کا دروازہ بند کر لیا ۔
جواہرات سے لے کر گھاس کا ایک تنکا تک مجھ سے چھین لیا !

(۷)

باہر طوفان تھا ، رات کی تاریکی کا !
وہ روشنی جو میں نے عمر بھر آنکھوں میں چھپائی تھی ——— میرے ساتھ تھی !
لیکن اتنے عظیم طوفان میں جگنو کی روشنی سے زیادہ وہ نہ چمکی !

(۸)

میں نے کتنی غلطی کی تھی !
جس پیار کو میں نے بے حساب ان میں بانٹ دیا تھا جنھوں نے مہمان آتے ہی
مجھے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا ۔ اگر اسی پیار کو میں اپنی آنکھوں میں چھپا لیتا ———
تو شاید یہ راستے مجھے اتنے خوفناک ، اتنے تاریک نہ دکھائی دیتے !

(۹)

قافلے کے ساتھ میں چلا گیا راتوں رات ہی !
جانا کہاں ہے ؟ یہ قافلے میں کسی کو بھی معلوم نہ تھا !
سب چلے جا رہے تھے !

نئی کتابیں

عصرِ نو:- صفحات ۵۰ - سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۴ر -
مصنف محمد صادق ضیا بی - اے - ایل - ایل - بی وکیل آگرہ -
۵ر کے ٹکٹ مع محصول ڈاک بھیج کر مکتبۂ قصر الادب آگرہ سے منگائی جا سکتی ہے -

یہ ایک سو تین شعروں کی ایک مسلسل نظم ہے - جس میں جوان شاعر نے پچیس مختلف عنوانوں کے تحت عصرِ حاضرہ کی شاندار ترقیوں نئی نئی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی تحریکوں اور جدید نظریوں پر شاعرانہ انداز میں تنقید کی ہے - اور ان تمام خرابیوں کی نقاب کشائی کے بعد جو قدیم زمانے سے لے کر آج تک دنیا کے امن میں خلل انداز رہی ہیں - ایک مکمل اجتماعی زندگی کی بنیاد ڈالنے کی "صلائے نو" دی ہے اور ایسی متحدہ قومیت کی دیواریں استوار کرنے کی آرزو ظاہر کی ہے - جس کی بنیادوں میں جوانوں کا شاداب خون رقص کر رہا ہو - جس میں عورت کو اپنی عظمتوں کا پاس ہو اور وہ قوم کے زخموں پر نگاہ دل نواز رکھتی اور غمگساروں کی طرح تسکین بخشتی ہو - جس میں مزدور کو سر پہ جگہ دی جاتی اور اس کے قدموں کی خاک کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہو - جس میں ایسے لوگوں کی حکومت ہو جو کسی قیمت پر بھی حق و انسانیت کا خون کرنے کیلئے تیار نہ ہوں اور جو ایسا وفاق مرتب کریں جو خدائی سے نفاق و افتراق کو دور کر دے - جس میں کمزوروں کو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ؎

اب نہ یہ محفل کی زینت ہیں نہ ہیں دلدارِ دوش
عصرِ نو میں ان کی ہستی ہے فقط اک بارِ دوش

بلکہ ؎ آسماں پرواز ہوں گی عصرِ نو میں ملتیں
جن کو کھائے جا رہا ہے خاکساری کا مرض

اور اس میں شک نہیں کہ ؎

عصرِ نو کی قوتیں آجائیں گر بر روئے کار
خود بخود دنیا کرے دنیا کی عصمت کا لحاظ

نظم میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہماری جدید شاعری کی سدرہ نشاں ہیں - البتہ سولہ صفحے کا طویل مقدمہ جو انور محمد صاحب بی - اے ایل ایل بی نے لکھا ہے - اتنا روکھا پھیکا اور بے کیف ہے - کہ "عصرِ نو کی معنوی خصوصیات یا نفسِ مضمون کی تازگی اور اہمیت" پر روشنی ڈالنے کی بجائے الٹا نظم کی دلچسپیوں میں حائل ہو رہا ہے -

لیڈر:- صفحات ۴۸ - سائز ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا - قیمت تین آنے - مصنف فضل حق قریشی دہلوی -
ملنے کا پتہ :- ساقی بک ڈپو دہلی -

کسی قوم کی ملی ہستی کے قیام و بقا میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں - یہی وجہ ہے کہ ہمارے برادرانِ وطن ہندوستان کی قومی زبان اردو کو مٹانے اور اس کی جگہ ہندی کو لانے کی خاطر سازشوں کا ایک وسیع جال بچھا چکے ہیں اور اردو کی جڑیں کھودنے کیلئے عجیب عجیب حربے استعمال کر رہے ہیں - زیرِ نظر ڈراما جو بزمِ تہذیب ادب دہلی کے اراکین نے اینگلو عربک کالج ہال میں متواتر تین رات اسٹیج کیا - انہی ریشہ دوانیوں کی نقاب کشائی کے مقصد سے لکھا گیا ہے - اس کے مصنف ملک کے مشہور ادیب ہیں - انہوں نے مکالمہ میں بڑے بڑے لیڈروں کے بیانات کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے جگہ دی ہے - وہ انہی کا حصہ ہے - ڈرامے کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اسے پڑھ کر وہ ذہنیت سامنے آجاتی ہے جو اس وقت اردو کے خلاف کام کر رہی ہے -

خبطی:- صفحات ۱۲۰ - سائز ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی معمولی قیمت آٹھ آنے - مصنف محمد علی واحدی -
ملنے کا پتہ :- انوار بک ڈپو - لکھنؤ -

یہ ناول ایک طالبعلم کی ابتدائی کوشش کا نتیجہ ہے جس میں طالبعلموں ہی کا قصہ بیان کیا گیا ہے - اس کے مطالعہ کے بعد حضرت شوکت تھانوی کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے - کہ "افسانہ دلچسپ ہے - پلاٹ خوب ہے - زبان بھی بری نہیں - البتہ بعض جگہ انگریزی کی آمیزش نے ذوقِ ادب رکھنے والوں کے لئے ایک معجون مرکب کا نمونہ پیش کیا ہے - جو ذوقِ سلیم کے لئے گراں ضرور ہوگا - مگر طالب علمانہ ذہنیت اس سے ہٹ کر نہیں جا سکتی" کئی لفظوں کی املا بھی غلط ہے - اگر مشق جاری رکھی گئی تو واحدی صاحب کسی دن اچھے مصنف بن جائیں گے -

ماہنامہ

شاہکار لاہور

نومبر ۱۹۴۰ء

قیمت فی پرچہ چھ آنہ (۶)

نگراں

شمس العلماء علامہ تاجور

اِدھر انصاف تھا.........! اور اُدھر عشق.........!

دونوں کے درمیان "فرض" دم توڑ رہا تھا......!

حُسن نے رحم کی بھیک مانگی... مگر ہوس نے اُسے ٹھکرا دیا......!

تفصیل کے لئے

سیٹج فلم کمپنی بمبئی کا تیار کردہ

STAGE

پاکدامن

عُرف شہیدِ ناز

دیکھئے

خُون کا خُون (ہملٹ) پیش کرنے والی کمپنی کا دوسرا ہنگامہ خیز شاہکار......!

آغا حشر کاشمیری مرحوم

کے قلم کا ایک ادبی معجزہ

ہندوستانی ادب اور موسیقی کا ایک رنگین مرقع — اداکار:- غلام محمد، مینکا احمد آبادی، محمد اسحاق، لیلا، وحیدہ آبادی

فیروز دستور، میرا وغیرہ

یکم نومبر ۱۹۴۰ء

رٹز سینما میکلوڈ روڈ میں شروع

جلد ۲ فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۴۰ء نمبر ۲

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار

لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار محمدی منزل واقع محمڈن سٹریٹ فلیمنگ روڈ

لاہور سے شائع کیا

تقریب خطاب پر تہنیت و تبریک پیش کرنے والے حضرات کرام کے اسمائے گرامی

۲۰۵ - نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم - اے (آکسن) بار ایٹ لا - ریٹائرڈ ہوم سیکرٹری و جج عدالت عالیہ حیدر آباد -

۲۰۶ - حضرت مولینا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد - (دکن)

۲۰۷ - مولینا سید اولاد حسین شاعر صدر الافاضل سیکرٹری محکمۂ اوقاف ریاست رام پور یو پی -

۲۰۸ - خان بہادر راجہ عنایت اللہ خاں صاحب ریٹائرڈ انجنیر لاہور

۲۰۹ - ڈاکٹر تصدق حسین خالد ایم - اے - پی، ایچ ڈی بار ایٹ لا

۲۱۰ - خانصاحب چودھری محمد حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ پبلسٹی برانچ پنجاب گورنمنٹ

۲۱۱ - ڈاکٹر رشید احمد - ایم - اے (آکسن، فارس) پی، ایچ، ڈی - صدر شعبۂ فارسی گورنمنٹ کالج لاہور

۲۱۲ - چودھری اسد اللہ خاں صاحب بی - اے - ایل - ایل بی (لنڈن یونیورسٹی) بار ایٹ لا لاہور

۲۱۳ - ملک محمد شریف خاں صاحب ایم - اے (فارسی و فلسفہ) ایل ایل بی - ایڈوکیٹ پنجاب ہائی کورٹ - لاہور

۲۱۴ - شیخ رشید احمد ایم - اے مینجر امپیریل بنک راولپنڈی لاہور

۲۱۵ - مولینا محمد ظفر اقبال صاحب ایم - اے (عربی) بی، ای ایس رجسٹرار پنجاب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ لاہور

۲۱۶ - پروفیسر احسان الحق صاحب بی - سی - ٹی (لنڈن) گورنمنٹ کالج جھنگ پنجاب -

۲۱۷ - لالہ جے دیو ودہرہ ایم - اے - ایل - ایل بی - ایڈوکیٹ پنجاب ہائی کورٹ لاہور -

۲۱۸ - مسٹر ونے کمار ایم - اے (اکنامکس) ریسرچ سکالر پنجاب یونیورسٹی لاہور -

۲۱۹ - مولینا محمد حسن صاحب انسپکٹر تعلیم بالغاں ریاست جموں و کشمیر سری نگر -

۲۲۰ - خان صدیق احمد خانصاحب ایم - اے اورینٹل کالج لاہور

۲۲۱ - راجہ محمد افضل خانصاحب ایم - اے - پی سی ایس - اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور -

۲۲۲ - شیخ غلام حسین صاحب ایم - اے - گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی

۲۲۳ - چودھری فتح محمد صاحب ایم - اے - ایم او ایل (فارسی) آنریری مجسٹریٹ لاہور

۲۲۴ - شیخ محمد عباد اللہ صاحب بی - اے سپرنٹنڈنٹ پبلسٹی آفس این ڈبلیو آر

۲۲۵ مسٹر کے ایل رلیا رام ہیڈ ماسٹر رنگ محل مشن ہائی اسکول لاہور

۲۲۶ - مولینا سید اصغر علی صاحب احسن بی - اے بی ٹی - بی، ای ایس ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ٹانڈہ ضلع جالندھر -

۲۲۷ - لالہ سربنس لال صاحب سہگل بی - اے کنڈ گورنمنٹ ہائی اسکول (جالندھر)

۲۲۸ مولانا سید نذیر نیازی بی - اے (جامعی) مدیر رسالہ طلوع اسلام

۲۲۹ - مولینا ابو العلا چشتی معروف بہ "حاجی لق لق" مدیر معاون روزنامہ شہباز - لاہور

۲۳۰ - مولینا ابو محمد امام الدین صاحب مدیر اخبار ترجمان رام نگر (بنارس)

۲۳۱ - مولینا محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور -

۲۳۲ علامہ سیماب اکبر آبادی قصر الادب آگرہ -

۲۳۳ خان محمد سعید خانصاحب ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ - سیونی

۲۳۴ سید سلامت اللہ شاہ صاحب بی - اے (جامعی) مالک یونائیٹڈ آکشن مارٹ

۲۳۵ - آنسہ شرافت بیگم ادیب فاضل، منشی فاضل

۲۳۶ - آنسہ نصرت بیگم بی - اے - (زنانہ اسلامیہ کالج کوپر روڈ لاہور)

۲۳۷ - آنسہ سعادت بانو - ادیب فاضل، منشی فاضل، دختر ایم عبدالحی صاحب رئیس لاہور

۲۳۸ - ڈاکٹر عبد الغنی صاحب ایم بی، بی ایس میونسپل ڈسپنسری لاہور

۲۳۹ - حضرت اعجاز اکبر آبادی مدیر رسالہ شاعر آگرہ

۲۴۰ - مولینا آسی رامنگری بنارس (یوپی)

۲۴۱ - سید مصطفٰے بادشاہ صاحب شاہجہان آباد بھوپال -
۲۴۲ - بیگم صاحبہ شیخ عباداللہ صاحب - لاہور -
۲۴۳ - شیخ عتیق اللہ صاحب رئیس گجرات -
۲۴۴ - لالہ گھسیٹا رام صاحب سپرنٹنڈنٹ ایڈوائزری بورڈ فار بکس محکمہ تعلیم پنجاب - لاہور -
۲۴۵ - مسٹر ڈی آر چودھری رکن ادارہ روزنامہ ٹریبیون لاہور -
۲۴۶ - شیخ ہادی حسن صاحب احقر -
۲۴۷ - خان واحد حسین خانصاحب بی - اے - علیگ رئیس نجیب آباد
۲۴۸ ڈاکٹر بی جلال الدین ماہر امراض دنداں مال روڈ لاہور
۲۴۹ - مسٹر بی - ڈی بارین - ہیڈ ماسٹر ماڈرن اسکول - لاہور -
۲۵۰ - مسٹر عباس حسین ریڈ یو میکانیکل انجنیر (لنڈن) لاہور -
۲۵۱ - لالہ رام لبھایا سبھلوک - دیال سنگھ کالج لاہور -
۲۵۲ - مولینا نذیر احمد خانصاحب پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۲۵۳ - دیال سنگھ یونین کا ایڈریس -
۲۵۴ - پنجاب لٹریری لیگ لاہور
۲۵۵ - میونسپل بورڈ نجیب آباد
۲۵۶ - پنجاب اورنٹیل سوسائٹی لاہور -
۲۵۷ - بورڈ ٹیچرز یونین ضلع گورداسپور (پنجاب)
۲۵۸ - انجمن تعمیر ادب لاہور -
۲۵۹ - اخبار اتالیق - لاہور -
۲۶۰ - مسٹر ایم اسلم (افسانہ نگار) رئیس لاہور -
۲۶۱ - حضرت احسان دانش - لاہور -
۲۶۲ - حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر رسالہ نیرنگ خیال لاہور -
۲۶۳ - مرزا ادیب بی - اے ایڈیٹر رسالہ ادب لطیف لاہور -
۲۶۴ - ملک یوسف العزیز سابق مدیر معاون روزنامہ انقلاب لاہور
۲۶۵ - سید امام علی تاز بخش رضوی ایڈیٹر اخبار بہارستان دہلی -
۲۶۶ - مولینا قاضی فیض محی الدین صاحب استاد ادب زمیندارہ کالج گجرات
۲۶۷ - مولینا محمد نصیر استاد ادب فارسی و اسعد نگ محل ہائی اسکول لاہور
۲۶۸ - مولینا ابن ذوالفقار صاحب منور ایڈیٹر رسالہ بورڈ ٹیچر بٹالہ -
۲۶۹ - سید محمد شریف حسین صاحب بی - اے - ایل - ایل بی وکیل لاہور
۲۷۰ - ملک ارجن داس صاحب ایم - اے - ایل ایل - بی - سیکرٹری فرم رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

ہماری بولی

(ترجمہ از مسٹر ہری بھاؤ اپادھیہ)

انسان کے ساتھ ہی اس کی بولی پیدا ہوتی ہے - بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے اس وقت اس کی بولی وہی ہے - جب تک وہ الفاظ کا تلفظ صحیح صحیح ادا نہیں کرسکتا - تب تک وہ ہنس کر رو کر یا اشاروں سے بات چیت کرتا ہے - ہم جو کچھ منہ سے بولتے ہیں وہ بولی ہے - بلکہ اشاروں سے جو کچھ جتلاتے ہیں وہ بھی بولی ہے ہمارا بول زبان یا آواز بھی تو ایک اشارہ ہی ہے - ہم بولتے اس لئے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو (اپنے دلی جذبات کو) دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں - ہماری کامیابی اس میں ہے کہ مخاطب ہم کو اور ہمارے مطلب کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے - اس کامیابی کی کنجی یہ ہوگی کہ ہم اپنے تئیں سچے رہیں یعنی ہم جو کچھ بولیں وہ سچا ہو کم سے کم خود کی نظر میں صحیح ہو - ہماری بولی جب سچائی کی مائندہ بنے گی تب وہ دوسروں کی سچائی کو قبول کریگی - یہ ہماری بولی کا حسن و قبح ہے -

اب ہم حسن ظاہری پر غور کریں - ظاہری حسن بیرونی حالات سے بنتا اور بگڑتا اور متاثر ہوتا رہتا ہے - اصلی مطلب یا خیال یکساں ہوتے ہوئے بھی انگریز اپنی انگریزی میں، بنگالی اپنی بنگلہ میں اسے شائع کرتا ہے - ایک انسان انگریز بن کر انگریزی زبان بولنے لگتا ہے وہی انسان دیگر حالات کے تحت کابلی بن کر پشتو بولنے لگا - یہ بیرونی حالات اور وجوہات کا نتیجہ ہے - ہماری بولی ہندی کہلاتی ہے - اسے ہندوستانی بھی کہہ سکتے ہیں - ہم آپس میں بول لکھ کر جسے سمجھ سکتے ہیں وہی ہماری بولی ہے - ہم سب بولنے والوں کے نمائندے ایک جگہ بیٹھکر اس کا سوروپ یا خاکہ (ڈھانچہ) طے کریں - یہ اصلی بات ہے مگر یہ ڈھانچہ دوامی نہیں ہوسکتا - کیونکہ انسان خود آج دوامی نہیں ہے وہ ہمیشہ ترقی پسند اور متبدل ہے اس لئے اس کی بولی یا زبان بھی متبدل ہوگی - شکل و صورت اور خواص سے دیس اور قوم کے لحاظ سے اس کا نام رکھ دیا جائے سوروپ کے مقابلہ میں نام غیر اہم چیز ہے -

زبان کے سوروپ یا شکل کا فیصلہ میری ناقص رائے میں تلفظ کی لطافت معنی اور لکھنے کی آسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کرنا چاہیئے کیونکہ بولی صرف بولی ہی نہیں جاتی لکھی بھی جاتی ہے بولی جانے والی بولی سے لکھی جانے والی بولی زیادہ دور رس ہوتی ہے اور زیادہ عرصہ تک زندہ رہتی ہے یعنی بولی کیساتھ رسم الخط کا سوال بھی لگا ہوا ہے

ہماری زبان

اقتباسات نامہ ہائے تہنیت و تبریک

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی۔

قابلیت اور اثبار عشق و مشک کی طرح کسی کے چھپائے چھپ نہیں سکتے۔ لیلائے ادب خوش نصیب ہے کہ آپ جیسا جاں فروش قیس اسے میسر ہوا جس ناساز گار ماحول میں آپ نے زندگی کے ۲۵ سال جو اصل زندگی کہلاتے ہیں اور عمر بھر کی کمائی علم و ادب کی خدمت پر نثار کی۔ یہ خطاب اس کا ناقص اعتراف ہے۔ اور اس ہیلہ میں حاسدین کے زہر خند نے آپ کی عظمت کا روشن ثبوت مہیا کر دیا ہے۔

پروفیسر کرپال سنگھ بیدار نیشنل کالج لاہور

حضرت محتشم! خطاب کی سرفرازی مبارک، میرے لئے بہ تو بید دلنواز زندگی کی چند بہترین مسرتوں میں سے ایک مسرت ثابت ہوئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس حق رسی پر ملک کے کونے کونے سے مبارکبادوں کی بارش سی ہو رہی ہے۔ اور مبارکباد دینے والوں میں ایسے ایسے بلند مرتبت اہل علم و فضل حضرات بہ کثرت نظر آ رہے ہیں جن کی تہنیت حکومت کے عطا کردہ خطاب سے بھی زیادہ سند اعتماد و افتخار بنائی جاسکتی ہے۔

میں اس سلسلے میں ایک بے اصول اخبارچی کی حاسدانہ تحریریں بھی پڑھ رہا ہوں۔ وہ بار بار آپ کو "اردو کا لکچرر، اردو کا ٹیچر" لکھ لکھ کر اپنے فطری چھچھورپن کی نمائش کر رہا ہے۔ گویا اس کے خیال میں اردو زبان اس قابل ہی نہیں کہ اردو ادب کی خدمت پر اپنی تمام زندگی صرف کر کے بھی کوئی شخص شمس العلماء کے خطاب کا مستحق بن سکے۔ اگر فی الواقع وہ ایسا ہی خیال کرتا ہے تو پھر اردو کے اس خدائی فوجدار سے میں ایک غیر مسلم کی حیثیت میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر اردو زبان اسقدر ہی مایہ ہے تو وہ آئے دن غیر مسلموں کی اردو زبان سے بے اعتنائی پر کیوں چراغ پا رہتا ہے اور کس برتے پر اردو زبان کو ہندوستان کے چالیس کروڑ افراد کے منہ میں ٹھونسنا چاہتا ہے۔

ہندی زبان کے کئی خدمت گزار اس وقت "مہا مہا اپادھیا" بنائے جا چکے ہیں۔ یہ خطاب شمس العلماء کا ہم پایہ ہے۔ پھر اگر غیر مسلم بے مایہ اردو کی بجائے ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ ملکی زبان قرار دینے پر متحد نظر آتے ہیں تو اس کا آتش زیر پا ہونا بے معنی ہے۔

میں آپ کے تلامذہ کی جماعت میں ناقابل اعتنا حیثیت رکھتا ہوں لیکن اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اس ہمہ دان ہیچ مدان اخبارچی کو اردو فارسی عربی کئی سال تک پڑھا سکتا ہوں منشی فاضل وہ بھی پاس ہے اور میں بھی۔ لیکن میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ریکارڈ قائم کیا ہے اور عربی کے پرچے میں بھی اول رہا ہوں۔ وہ چاہے تو فارسی نظم و نثر، تقریر و تحریر میں میرا مقابلہ کر کے اپنی ہمہ دانی سے متعلق اپنی غلط فہمی کو دور کر سکتا ہے۔ باقی اس کی غلط اردو نثر جیسی بھیسی شاعری، اور خانساماں شاہی غلط نثر انگلش تو غالباً اس کے نزدیک بھی درخور توجہ نہیں ٹھہرتی۔ آپ کی زندہ تصانیف وہ اہل علم ہیں۔ جو صوبے کے کالجوں میں فارسی عربی اور اردو میں مدت سے تعلیم دے رہے ہیں اور وہ مشاہیر سند ہیں جو اردو ادب کی ہر صنف میں رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیدار

شیخ غلام حسین ایم۔ اے گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی۔

آپ کے خطاب کی خوشخبری پڑھ کر میں تو جوش مسرت سے اچھل پڑا۔ آنریبل سر سکندر حیات خاں صاحب وزیر اعظم کی جوہر شناس نگاہیں قابل صد ہزار تحسین ہیں۔ کہ انہوں نے سب سے موزوں شخص کو اس خطاب کے لئے انتخاب کیا۔

آپ کی اردو خدمات کو ہر شخص سراہ رہا ہے۔ یقیناً وہ اس اعتراف عام کی مستحق بھی ہیں لیکن غالباً کم حضرات کو اس کا اندازہ ہے کہ اردو ادب کی خدمت کی شہرت نے آپ کے علم و فضل پر پردہ ڈال رکھا ہے؟ مجھے اردو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ عربی فارسی ادب پر جو عبور آپ کو حاصل ہے آپ کے ہمعصروں میں اور کسی کو حاصل نہیں۔ ایم۔ اے کلاس میں نظیری کے مشکل اشعار مجھے یونیورسٹی پروفیسر نہیں سمجھا سکا تھا اور آپ نے بہ یک نظر انہیں ایک ہی نشست میں مجھے سمجھا دیا تھا۔ فیروز پور کالج کی عربک ایسوسی ایشن کا جو اجلاس خانصاحب قلندر علیخاں سرکاری وکیل کی صدارت میں ہوا تھا۔ میں اس میں شریک تھا۔ وہاں ہر شخص انگریزی میں تقریر کر رہا تھا۔ صرف آپ ہی تھے جنہوں نے فی البدیہہ عربی زبان میں تقریر کر کے اہل جلسہ اور صدر جلسہ سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ میں لاہور میں جب کبھی آپ کے دولتکدے پر حاضر ہوا ہوں۔ آپ کو مصری اخبارات کے مطالعے میں مصروف دیکھا ہے۔ میرے خیال میں تو مصر کی ترقی یافتہ جدید عربی لکھنے اور بولنے میں آپ کا کوئی

ہمعصر آپ کے سامنے نہیں آ سکتا۔ میں عربی و فارسی ادب کا شیدائی ہوں اور اس راہ میں آپ کی رہنمائی اور بے مثل قابلیت کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

نیازمند ۔ غلام حسین جیلانی

مولینا حکیم عبدالمومن صاحب سندیافتہ طبیہ کالج دہلی مزنگ لاہور۔

——آپ کے معزز خطاب کی مسرتوں میں اپنے آپ کو میں بھی برابر کا حصہ دار خیال کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خطاب آج سے بہت پیشتر سے آپ کا حق تھا، اب تو آپ کی شخصیت اس سے بہت زیادہ بلند ہو چکی ہے۔ بہرحال حکومت عالیہ کے اس حسنِ اعتراف پر علم و ادب سے محبت کرنے والے تمام حضرات شکرگزار ہیں۔ مجھے اپنے پیشے کے سلسلے میں بہت سے باخبر لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میں نے ان سب کو مختلف عبارات میں یہی کہتے پایا کہ اس خطاب کے لئے علامہ تاجور کی شخصیت سے زیادہ موزوں شخص کا انتخاب مشکل تھا۔

ملک محمد شریف خاں صاحب ایم۔ اے (فارسی و فلسفہ) ایم او ایل، ایل ایل بی۔ سابق صدر شعبہ فارسی اسلامیہ کالج لاہور

حضرت علامۂ محترم!

آپ کی دیرینہ خدمات علم و ادب اور اس سلسلے میں آپ کا تاریخی ایثار کسی بلند سے بلند اعتراف اور گراں قدر صلے سے بے نیاز ہے۔

میں السنۂ مشرقیہ کے ایک خدمت گزار کی حیثیت میں فارسی زبان اور عربی ادب میں آپ کے بے مثال علمی تبحر کا مدت سے معترف ہوں۔ آپ کی شخصیت تو اس خطاب سے بہت بلند ہو چکی ہے ــــ شمس العلماء کا خطاب پانے کے مستحق تو آپ کے آل انڈیا شہرت رکھنے والے شاگردوں کی جماعت میں متعدد حضرات نکلیں گے۔

آپ کا علمی تبحر اور علوم عربیہ کی جامعیت ایک ایسا شیریں چشمہ ہے۔ جس سے ہزاراں ہزار تشنگان علم و ادب سیراب ہو چکے ہیں۔ علوم عربیہ اور ادب فارسی میں آپ کے فیضان سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو اردو ادب میں آپ کی رہنمائی و تربیت سے آپ کے ہندوستان گیر شہرت کے درجنوں شاگرد جن میں بلندپایہ ادبا، شعرا، افسانہ نگار، ڈراماٹسٹ، اخبارنویس، نقاد، مصنف ہیں۔ اس وقت اپنی اپنی لائنوں میں ملک کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ آپ کی سالہاسال کی جدوجہد نے ملک میں ایک ایسا ادبی ماحول تعمیر کر دیا ہے جو نصف صدی تک آنے والی نسلوں کے لئے مینارہ روشنی بنا رہے گا۔

میں ملک کے اہل الرائے کے اس اعتراف کی کہ "یہ خطاب آپ کو آج سے بہت پیشتر ملنا چاہئیے تھا۔" اپنے علم الیقین کی بنا پر حرف بحرف تائید کرتا ہوں۔

میرا صوبہ چونکہ آپ کے علمی فیضان کا سب سے زیادہ حصہ دار رہا ہے۔ اس لئے وہ بجا طور پر آپ کا سب سے زیادہ سپاس گزار بھی ہے۔

حضرت خوشتر گرامی ایڈیٹر رسالہ بیسویں صدی لاہور

——حضرت مولینا میں کانگریسی خیال کا آدمی ہوں۔ سرکاری اعزاز کو اصلی عزت نہیں سمجھتا۔ لیکن جناب کے خطاب کی خبر سے علمی و ادبی حلقوں کو مخصوص طور پر خوش پا کر میں بھی خوش ہو رہا ہوں، آپ کی قابل قدر خدمات کا معاوضہ یہ خطاب ہرگز نہیں بن سکتا۔ بلکہ ملک کے اہل علم و اہل ادب کے دلوں میں جو آپ کی عظمت ہے وہ اصل وہ آپ کی بے مثال خدمات کا اصلی معاوضہ ہے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مولینا آزاد دہلوی اور شمس العلماء مولینا تاجور اردو لٹریچر کے دو سکولوں کے بانی ہیں۔ اپنے اپنے عہد میں ان دونوں حضرات نے علم و ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا کفر ہے۔

مولینا سید اصغر علی صاحب احسن بی۔ اے بی۔ ٹی۔ ای۔ ایس۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ٹانڈہ ضلع ہوشیارپور

——خطاب ملنے پر مبارکباد بہت دیر کے بعد پیش کر رہا ہوں۔ بہرحال یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے آپ کے شمس العلماء بنائے جانے پر بیحد مسرت ہوئی ہے۔ زبانِ اردو کی جو خدمت آپ کر رہے ہیں وہ آپ پر ختم ہے۔ خداوند کریم آپ کی عزت میں اور اضافہ کرے۔ آمین

پروفیسر احسان الحق قریشی۔ پی۔ سی۔ ڈی (لنڈن) گورنمنٹ کالج ــــ جھنگ مگھیانہ (پنجاب)

بخدمت اقدس استاذی محترم شمس العلماء علامہ تاجور مدظلہ العالی

السلام علیکم۔ آپ کو شمس العلما کے خطاب ملنے پر آپ کے ایک پرانے شاگرد کو اتنی مسرت ہوئی کہ آپ اس کا اندازہ کبھی نہیں کر سکیں گے۔ احقر کا ارادہ تو تھا کہ نسیم باغ ہی خط بھیج دیتا اور اس دلی مسرت کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا مگر تعطیلات موسم گرما میں علالت مانع رہی۔

میں نہ کوئی ادیب ہوں نہ شاعر ہوں۔ اور نہ کوئی دقائع نگار... الفاظ کے ہیر پھیر میں شکست کھا سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے پاس الفاظ نہیں مگر آپ کی عظمت ادب اور محبت کے نقوش میں شکست نہیں کھا سکتا۔

آپ تو کبھی کے مجھے بھول چکے ہوں گے۔ مگر میں آپ کو نہیں بھولا۔ اس وقت بھی آپ کی خیالی تصویر میرے سامنے ہے اور اس بحر علم و معانی کی خیالی تصویر کے ادب کے طور پر میں کرسی سے اُٹھ کر اس خط کو لکھ رہا ہوں۔

میرے محترم و مکرم استاد! شمس العلماء کے خطاب ملنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا آپ کو دیر تک سلامت رکھے اور آپ کی علم و ادب کی خدمت کی اور جزا دے ؂

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

لالہ ہربنس لال بی۔اے۔ جالندھر چھاؤنی

——اردو علم و ادب کی جو خدمات آپ نے سرانجام دی ہیں اگرچہ ان کی وجہ سے آسمانِ ادب پر آپ کا نام پہلے ہی آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہا ہے۔ مگر تاہم یہ سن کر اب مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ کہ حکومت نے آپ کو شمس العلماء کا ممتاز خطاب عنایت کر کے آپ کی علمی استعداد اور ادبی خدمات کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں آپ کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے فیض صحبت سے جو استفادے میں نے حاصل کئے ہیں۔ ان کی یاد میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے مستقبل کے بنانے میں آپ نے ایک بہترین انجنیئر کا کام کیا، جس کے لئے تا ابد میں آپ کا دعاگو رہوں گا۔

مولینا قاضی فیض محی الدین استاذ ادب زمیندارہ کالج (گجرات)

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

اس امتیاز خاص پر جو آپ کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات کا ایک بلیغ اندازہ اعتراف ہے۔ نیازمند کی طرف سے ہدیۂ تبریک و تہنیت قبول فرمائیے! خداوند تعالےٰ آپ کو صحت و شادکامی کے ساتھ ملک و ملت اور زبان و ادب کی بیش از بیش خدمت کا موقع ارزانی رکھے! آمین۔

فیض محی الدین

حافظ حمید حسن نگینوی پروپرائٹر مفید عام پریس لاہور

محترم و معظم جناب علامہ تاجور صاحب ہدیہ سلام مسنون۔ آپ کے شمس العلماء کے خطاب ملنے پر دلی محبت سے ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے خدا سے دُعاگو ہوں کہ آئندہ بھی آپ کا طالع روز روشن کی طرح درخشاں رہے آمین۔

مختصرات

دی ایوننگ ٹیوشنل کالج لاہور

مشہور اردو شاعر و افسانہ نگار مسٹر پرشوتم لال ضیا، ایم۔ اے کے دفتر سے حسب ذیل اطلاع ملی ہے :۔

"یہ کالج ان طلبہ کے لئے جاری کیا گیا ہے جو اپنے کسی مضمون میں خام ہیں اور امتحان کی تیاری کے لئے تعلیمی امداد کے طالب ہیں۔ سردست ایف۔ اے۔ بی۔ اے کی انگریزی۔ ریاضی۔ اکنامکس۔ فارسی اور اردو کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ السنۂ مشرقیہ۔ ادیب عالم اور ادیب فاضل کے نصاب کی تعلیم کا انتظام بھی زیر غور ہے۔ ہر مضمون کے قابل اساتذہ کا اسٹاف مقرر کیا گیا ہے۔ جو طلبہ اپنے کسی مضمون کی تیاری کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس اطمینان و یقین کے ساتھ اس کالج میں اپنا داخلہ کرائیں کہ ان کے مطلوبہ مضمون کی تیاری یہاں حسب مراد ہو سکے گی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر پرشوتم لال ضیا، ایم۔ اے خود ہوں گے۔ پنجاب کے مشاہیر علم و فن بھی وقتاً فوقتاً کالج میں لیکچر دیا کریں گے۔ ضرورت مند طلبہ سیکرٹری ایوننگ کالج ۱۶ بیڈن۔ لاہور سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

مشہور لبنانی ادیب و مفکر امین ریحانی کی وفات

انا الشرق، عندی فلسفات ـ فمن یبیعنی بھا طائرات

مصری جرائد میں لبنان کے مشہور انام شاعر و ادیب و مفکر امین الریحانی کی وفات کی خبر شائع ہوئی ہے۔ مرحوم نے یورپ اور ممالک متحدہ امریکہ میں زندگی کے بہت سے سال گزارے تھے ۱۹۲۲ء میں وہ مصر آئے تو مصر کے علمی اور صحافتی طبقات نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ قاہرہ میں انھوں نے ایک مجمع عظیم میں اپنی عربی تقریر ان الفاظ میں شروع کی تھی کہ :۔

"انا الشرق، عندی فلسفات ـ فمن یبیعنی بھا طائرات"

یعنی میں ہوں مشرق، میرے پاس بہت سے فلسفے ہیں۔ کوئی ہے جو میرے فلسفی نظریات کو ہوائی جہازوں کے بدلے میں خریدے؟

اس تقریر پر اس وقت قاہرہ میں بہت نکتہ چینی کی گئی۔ تقریر کے ختم پر ابن جلسہ یہ کہتے ہوئے جلسہ گاہ سے نکلے کہ یہ کیا خرافات ہے۔ "میں مشرق ہوں میرے فلسفوں کو ہوائی جہازوں کے بدلے کون خریدتا ہے؟" قاہرہ کے اخبارات میں اس تقریر پر بڑی تنقیدیں ہوئیں اور اس کا مضحکہ اڑایا گیا۔ مدت تک امین ریحانی اور اس کی تقریر کا ذکر مصری مجالس میں نقل محفل بنا رہا لیکن کیا در اصل امین ریحانی کوئی مجنون اور اس کی تقریر مجذوب کی بڑ تھی؟ آج تمام عالم مشرق عموماً اور مصر خاص طور پر اپنے فلسفیانہ نظریوں اور منطقی موشگافیوں کو بے کار دیکھ رہا ہے۔ ہوائی جہازوں کی ضرورت ان نظریوں سے پوری نہیں ہو سکتی۔ امین ریحانی مرحوم نے ایک دور میں مدبر کی نگاہیں پائی تھیں۔ وہ بجا طور پر سمجھ چکا تھا کہ مشرقی اور مصری علوم و فنون مشرق اور مصر کو جدید تہذیب کے عملی علوم و فنون کی زد سے پناہ نہیں دے سکتے۔

اس وقت اجتماعی زندگی کے حقوق کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ بے کار علوم و فنون کی اشاعت پر وقت رائگاں کرنے کا صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ علوم و فنون کی اشاعت تو کیا ہو سکے گی، مشرقی عظمت، مشرقی جمہوریت و آزادی کو تہذیب جدید کے مسلح علم بردار ختم کر دیں گے۔

امین مرحوم نے مغربی ممالک کے اسیال و عواطف کو بغور دیکھ کر یہ اندازہ کیا تھا کہ مشرقی و مغربی انداز تفکر میں قطبین کی مسافت حائل ہے۔ وقت کا اقتضا یہ ہے کہ مشرق اپنے ذراتی حالات کو بدل کر نئے حالات کے سانچے میں ڈھل جائے فلسفیانہ موشگافیوں کو طاق نسیاں کے سپرد کر کے عملی نظریات کو اختیار کرے۔ اس نے مشرق کو سمجھانا چاہا کہ یہ فلسفہ آرائیوں کا وقت نہیں۔ ہوائی جہازوں کا موسم ہے جب وہ یورپ اور ولایات متحدہ کے طویل قیام سے واپس ہوا تو اس نے اہل مشرق کو اپنے پرانے امراض میں مبتلا پایا۔ اور مشرق کی خوابیدہ اقوام کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنا چاہا۔ قاہرہ میں اس کا مذکورہ خطبہ اہل مشرق کو پہلی تنبیہ تھی اور اس خطبے کا پہلا فقرہ درحقیقت ہزاروں مشاہدات و افکار کا حاصل تھا عندی فلسفات فمن یبیعنی بھا طائرات کا فقدکس قدر بلیغ ابہام ہے۔ درحقیقت یہ فقرہ کہتے ہوئے شاعر کے لباس میں خود قدرت بول رہی تھی۔ اس تاریخی خطبے کے مخاطب قاہرہ کے دو چار سو حاضرین جلسہ نہ تھے بلکہ الہام نواز شاعر سارے عالم مشرق سے خطاب کر رہا تھا۔ وہ مشرقی اقوام سے یہ کہہ رہا تھا کہ کون ہے جو مشرق کے ان روحانی نظریات کو جو اس کے لئے مطلقاً بے کار ثابت ہو چکے ہیں ان عملی علوم و فنون کے بدلے میں خریدے جو اس عصر مادی میں جب کہ طاقت تہذیب کا مرکزی عنصر بن رہی ہے۔ مشرق کو زندگی کے میدان میں سے سرخرو نکال لے جائے۔ اور طائرات لہوائی جہازوں) کا ذکر کر کے اپنی غیر معمولی قوت تفکیر سے اہل مشرق کو آگاہ کر دیا کہ مستقبل کی مالک وہی قومیں بنیں گی جن کے پاس فضائی طاقت سب سے زیادہ ہوگی۔

امین ریحانی اگر یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوا ہوتا تو یہ زندہ ملک اس کی صحیح قدر کرتے۔

روزنامہ المقطم قاہرہ

ذاتیات

از: تاجور

"غیر معروف جرنلسٹ"

اردو خواں طبقہ بیس سال سے پنجاب کے اخبارات و رسائل میں غیر معروف جرنلسٹ کے ادبیاتِ افروز مقالات اور دلربا افسانے مطالعہ کر رہا ہے۔ جوہر شناس نگاہیں سرزمینِ ادب کے اس لالۂ صحرائی کی جستجو میں ہیں تاکہ اس مشہور نام گمنام کو ان نرگس حضرات ہی کی گمنامی کے چرچے داستانِ بزم و انجمن بنے ہوئے ہیں۔

کہیں یہ متاعِ گم کردہ نشانِ محکمہ اطلاعات پنجاب کے پنڈت رتن چند جی تو نہیں ہیں، وہی پنڈت رتن چند جو اب جواں سال و جواں بخت گریجویٹ بیٹے کے خوش نصیب باپ کی حیثیت سے ترقی کر کے اب ایک ہونہار پوتے کے جدِ امجد بننے کی فکر میں ہیں اور جن کی عمرِ جوانی کی دوڑ میں برق بے پروانہ جوانی سُست رفتار عمر کو گرد رہ بنا کر حسن و شباب کی فدا سامانی کے متعلق صوفیانہ شاعری کے تمام نظریات کو درہم برہم کر چکی ہے۔

ہاں ہاں یہ وہی پنڈت رتن چند ہیں۔ جو غیر معروف جرنلسٹ کے نقاب میں اپنے جلوۂ افکار سے سرزمینِ ادب کو حریفِ آسماں بنائے ہوئے ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ نوجوان نما ادیب جو اپنے معصوم حسن و شباب کی تابشوں سے اپنے افکار کو زرینی بخش رہا ہے۔ سالخوردہ تاجور سے بھی پانچ سات برس کی مسافت پر منزل سے قریب تر پہنچنے کی خوشی میں بزبانِ حال پکار رہا ہے۔

"اب لیا چشمۂ بقا میں نے"

اسے کوئی ہندو سمجھتا ہے، کوئی مسلمان تصور کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ہندو نہ مسلمان صرف ایک انسان ہے۔ پھر اگر یہ شاعرانہ نظریہ صحیح ہے کہ

"آدمی ہونا بہت دشوار ہے"

تو یقین کیجیے کہ غیر معروف جرنلسٹ نے اس دشواری کو اپنے لئے آسان بنا لیا ہے۔ وہ آدمی ہے، ہندو مسلمان بنے بغیر آدمی۔ انسان نما بہائم میں رہنے کے باوجود آدمی ——— آدمی از سرتا پا آدمی، اپنی حدِ نگاہ سے بھی بلند تر آدمی۔ یہ سچ ہے کہ مہاجنی ماحول نے اُسے اس قدر جزرس بنا دیا ہے کہ اگر صد سالہ زندگی اور صحت صرف سو روپے میں کہیں ملتی ہو تو اس سودے میں اپنی کمائی کا ایک روپیہ بھی پولیس کے جبر کے بغیر نکالنے پر آمادہ نہ ہو سکے گا۔ مگر مغربی لٹریچر کی خریداری نے ان کے سر پر سو فیصدی ٹیکس لگا رکھا ہے۔ عرصہ تک کے طویل قیام نے اس کی زبان کو اس حد تک مسلمان بنا لیا ہے کہ غیر معروف جرنلسٹ کے کسی مقالے پر سجاد حیدر یلدرم اور مولانا نیاز فتحپوری کے سوا کسی دوسرے بلند ادیب کا نام آسانی سے چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ماحول میں اخبار نویسی اور ناول نویسوں کا رہنما بھی ہے، یہ اسی کی مسلسل رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ بائیں سے دائیں کو اردو لکھنے والے اخبار جی بھی اب عزم اور قوتِ ارادی کی مدد کے بغیر ملتانی انداز میں اردو اور اخبار عام کے رنگ میں لیڈنگ آرٹیکل نہیں لکھ سکتے۔ یقیناً اس نے اردو صحافت کی شورہ زار زمین کو مرغزار بنا دیا ہے۔

ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا کہ غیر معروف جرنلسٹ کو بھی ہمارے ایک مسلم افسانہ نگار کی طرح "امریکہ" ہو گیا ہے۔ یعنی با ایں ہمہ کفایت و جزرسی وہ اپنے "باتھ روم" کے طویل اوقات تفریح کو تازہ امریکی ادب و صحافت کے مطالعے پر صرف کرنے کا عادی بن چکا ہے۔ مشہور ہندی افسانہ نگار جینندر ناتھ اشک کے بقول غیر معروف جرنلسٹ کا دارالمطالعہ اس کا باتھ روم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے زیرِ تعمیر مکان میں سب سے زیادہ روپیہ باتھ روم کے سجانے پر صرف کیا ہے۔ معاشرتی انگشت نمائی کا خوف نہ ہوتا تو یہ باتھ روم کبھی کا ڈرائنگ روم بھی بن چکا ہوتا۔ سوسائٹی کی سخت گیری پر خدا کی مار یہ انسان کی انفرادی آزادی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں تو امریکی ادب سے ہمارے فرسودہ سال افسانہ نگار کے شغفِ نادر نے اس کی ذہنیت پر "امریکہ" کو مسلط کر دیا ہے۔ آپ اسے جلوت و خلوت میں عموماً اردو لٹریچر اور امریکی ادب کی درمیانی مسافت ناپتے ہوئے دیکھیں گے۔ غریب ہندوستان کا جو ماہنامہ یا اخبار امریکن میگزین اور نیویارک ورلڈ کے بلند اور شاہانہ انداز پر جاری نہیں ہو سکتا، ہمارا بھارت نژاد امریکی جرنلسٹ اسے بحق ملک معظم قابلِ ضبطی خیال کرتا ہے۔

میں غیر معروف جرنلسٹ کے ذہن فریز مقالات اور دلگیر افسانے گذشتہ جنگِ عظیم سے موجودہ جنگِ عظیم تک برابر پڑھتا رہا ہوں۔ کسی رسالے یا اخبار میں اس کا کوئی مضمون نظر پڑ جائے تو اپنی ضروری سے ضروری مصروفیت کو بھی اوقاتِ فرصت کی چیز بنا دیا کرتا ہوں۔

مدت سے میرے فلاکت زدہ پرچے کے صفحات اس روشنی سے محروم ہیں۔ اور اس محرومی کا ذمہ دار یہ بدبخت "امریکہ" ہی ہے۔ کیونکہ امریکی جرنلسٹوں کے پاسِ احترام میں غیر معروف جرنلسٹ نے کبھی اپنے افکارِ نظر تاب کو "ہدیۂ مفت نظر" نہیں بنایا۔ بے مایہ اڈیٹروں اور بے سرمایہ رسائل و اخبارات کو ہمارا یہ مہاجن ادیب زندگی کا حق دینے سے باصرار انکاری ہے۔ میں اس بے رحمی کا گلہ گزار نہیں، بلکہ اپنے بلند نظر ادیب کے اس خرامِ پامال کار کو بنامِ عشق اردو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے کا خوگر ہو گیا ہوں۔

غیر معروف جرنلسٹ کی ادبی زندگی کے ابتدائی چند سال اس گروہ کی رہنمائی میں بسر ہوتے ہیں۔ جو پنجاب کی مردم شماری کے رجسٹروں میں میرا نام دیکھ کر "ایک سو" یا ساڑھے دو" کی قسم کے پہاڑے گانے لگتا ہے اور جیسے جائز طریقوں سے خوش رکھنے سے میں کفر کی حد تک مایوس ہو چکا ہوں۔ اس ظلمت رسیدہ جماعت میں میں نے غیر معروف جرنلسٹ کو چراغِ انجمن افروز کی حیثیت میں دیکھا۔ یہ نظارہ پاش منظر میرے لئے قابل برداشت نہ تھا۔ اس لیے راہ قافلے کو چراغِ منزل کا مستحق نہ سمجھ کر میں نے محبت کی ستارہ گیر کمند پھینکی۔ اور یہ غزالِ زرّیں شاخ صید کمند ہو گیا۔ اب وہ کاروانِ بے امیرِ راہ بے منزل میں گرد و غبار اڑا اڑا کر لفظ لبصر کے تمام مشتقات سے محروم بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی طرح تلاشِ منزل میں مارا مارا پھرتا ہے۔

"بہار"

از:- آقائے شایق (کابل)

بازآمد در ہوائے سرو دلجویت بہار — خرم و شاداب و زیبا چوں گلِ رویت بہار

درگلستاں سالہا سنبل پرستی می کند — گشتہ شاید ہمچو من دل بستۂ مویت بہار

میکند گلہائے دنیا را بقربانِ سرت — گر بچشمِ من بہ بیند یک نظر سویت بہار

ایں قدر کز رنگ و بوئے خویشتن دل می برد — یک سحر بگذشتہ، شاید از سر کویت بہار

گر بیائی در چمن، اے غنچۂ گلزارِ ناز! — مست و بیخود می فتد، شش ماہ از بویت بہار

خامہ از نرگس بکف اوراقِ گل زیرِ بغل — می نویسد نسخۂ زیبائے از رویت بہار

میزند قوسِ قزح را از خجالت بر زمیں — گر بہ بیند جوہرِ شمشیرِ ابرویت بہار

از نگاہے نرگس و بادام را دیوانہ کن
اے چو شایق مبتلائے چشمِ جادویت بہار

"کابل"

صفحۂ اختر

از :۔
اختر شیرانی

ایک دلچسپ حادثہ

دنیا میں یہ حادثہ اپنی نوعیت کا پہلا عجیب حادثہ نہیں ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اس حادثے نے شاہکار کے زیر تدوین نمبر پر بہت برا اثر ڈالا۔ شاہکار کے تمام مضامین نظم و نثر جو ڈیڑھ سال کے عرصے سے ہمارے یہاں موجود تھے کسی پراسرار طریقے سے چوری ہو گئے اور اب تک کوشش کے باوجود یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ "چور" کی اس عجیب و غریب حرکت کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جن صاحب نے اس حرکت کا ارتکاب کیا ہے وہ ان مضامین کو اپنے نام سے شائع نہیں کر سکتے اور نہ وہ ان سے کوئی اور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بہرحال ہم کو سخت افسوس ہے کہ شاہکار کا قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا۔ ہم محترم مضمون نگاروں کی خدمت میں معذرت کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین نظم و نثر نقل کر کے روانہ کر دیں۔

اس حادثے کی وجہ سے جہاں شاہکار کے نومبر نمبر کی اشاعت تاخیر سے بروئے کار آ سکی۔ وہاں ادارے کو بھی گوناگوں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آیندہ ہم مضامین کی پوری طرح حفاظت کریں گے۔

چندراوتی

یہ دلچسپ معاشرتی افسانہ ہمارے عزیز دوست مسٹر قدرت اللہ شہاب کے قلم کا رہین منت ہے۔ شہاب صاحب ہماری معاشرتی کمزوریوں سے خوب آگاہ ہیں۔ چنانچہ ان کا ہر افسانہ جو معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو سے تعلق رکھتا ہے تمام افسانوی خصوصیات کے لحاظ سے ادب کا ایک قابل تعریف کارنامہ ثابت ہوتا ہے ہمیں توقع ہے شہاب صاحب مستقبل قریب میں ایک نمایاں ادبی حیثیت حاصل کر لیں گے!

میدانِ جنگ کی صبح

پروفیسر حامد اللہ افسر اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ آپ کی یہ نظم میر انیس اور دبیر کی یاد دلاتی ہے جن حضرات نے اردو کے ان دو نامور شاعروں کے مراثی کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس نظم کو بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے۔

اطالوی آمریت

ہم عام طور پر سیاسی حالات کے متعلق مضامین شائع نہیں کرتے لیکن اس نمبر میں دو مضمون اس نوعیت کے شائع ہو رہے ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "اقوام عالم کی تقسیم" اور دوسرے کا عنوان ہے اطالوی آمریت۔ دونوں مضمون موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے قابل مطالعہ ہیں۔

لاہور چھوڑتے ہوئے

عزیزی سجاد ہاشمی تعلیمی اور تربیتی فضا سے رخصت ہو کر سیالکوٹ چلے گئے ہیں۔ یہ نظم ان کے دوامی افکار کا حاصل ہے۔ لاہور کے جن حضرات کو سجاد سے دوستی کا فخر حاصل ہے۔ انھیں سجاد کے لاہور چھوڑنے کا افسوس ہے۔

علاج

عزیزی مرزا ادیب بی۔ اے (آنرز) کا ڈرامہ ہے عزیزی "اب عزیزی" کی حد سے نکل کر خود بہت بڑے ادیب بن گئے ہیں۔ ان کا یہ ڈراما "علاج" جو ہر چند مغربی ادبیات سے ماخوذ ہے پھر بھی اپنی جگہ اہل نظر سے داد کا طلب گار ہے۔

ایک حسینہ کی شادی پر

یہ نظم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نظم "ایک خاتون کی شادی" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ خیالات میں فرق ہے۔ مگر روح خیالات وہی ہے۔

افکارِ پشتو

پشتو کے اس شاعر کے افکار صرف تین شعروں تک محدود تھے مگر ہمارے "گستاخ دستی" نے ع

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

کی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے معنویت اور بیان کے دامن کو وسیع کر دیا ہے ◆

سیاسیات

اقوامِ عالم کی تقسیم

مصری حکومت کی مذبذب پالیسی

(مشہور مصری مفکر و ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین بک کے قلم سے)

از:-

شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی

جمہوری قوموں میں جو امتیاز خاص ہے وہ یہ ہے کہ حیاتِ عامہ اُن پر ٹھونسی نہیں جاتی۔ بلکہ اُن سے خود بخود ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور یہ اقوام حیاتِ جمہورۃ کی جانب کشاں کشاں نہیں آتیں۔ نہ اسے اختیار کرنے پر مجبور کی جاتی ہیں بلکہ فطری جوشش اور قوتِ ارادی انھیں آپ سے آپ جمہوریت پسند بنا دیا کرتی ہے اسی وجہ سے اقوام جمہوری حیاتِ عامہ اور اس کے ثمرات کی ذمہ دار اور اس کی تکلیفات کی رضا کارانہ حصہ دار بنتی ہیں کیونکہ وہ جان لیتی ہیں کہ یہ جمہوری زندگی ان کی اختیار کردہ ہے کسی نے جور و جبر سے اُسے ان پر نہیں ٹھونسا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جمہوری زندگی کو خطرات پیش آجائیں تو ہر قوم اور قوم کے ہر فرد سے بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ تم اپنی جان کی، اپنے ناموس کی۔ اپنی آزادی کی۔ اپنے متعلقین اور اپنی ملت کی حفاظت کیوں نہیں کرتے خطرات کا انتظار کیوں کر رہے ہو۔ اور کیا تمھیں اپنی حریت اور آزادی کی راہ میں اپنا عزیز خون اور مال و متاع صرف کرنے میں کوئی تامل ہے؟

یہ سوالات جمہوری اقوام کے ضمیر۔ قوتِ ارادی، اور قوائے عمل کو بیدار کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ یہ سوالات بغیر سمجھائے ان کی سمجھ میں آجاتے ہیں اور وہ اپنے اعماقِ قلب میں احساسات کا ایک متلاطم سمندر موجود پاتے ہیں یہی قلبی احساسات کے ذریعے ان میں قوائے عمل بیدار ہو کر انھیں فرادیٰ فرادیٰ اور اجتماعی طور پر اپنی آزاد زندگی کے خطرات کی مدافعت پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہماری روزانہ زندگی آج آزاد ہے ہم اپنے کردار و گفتار میں آزاد ہیں۔ رفتار و اطوار میں آزاد ہیں۔ ہماری آزادی گفتار و کردار پر قانونِ وقت کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ جو سوچتے ہیں سوچ سکتے ہیں ہمارے دل و دماغ پر کوئی جبر مسلط نہیں۔ ہمارا ضمیر ہماری طرح آزاد اور بیدار ہے۔ ہم جس چیز سے اعراض کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس سے پہلو تہی کر سکتے ہیں۔ کوئی طاقت ہمیں ایسے امور کی جانب جنھیں ہمارا ضمیر ناپسند کرتا ہے لے چلنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

اس صورت حال میں جو فرد یا جماعت جب اپنے وطن کی حفاظت و حمایت میں سعی و جہد کرتی ہے۔ گویا وہ پہلے بلا واسطہ طور پر اپنی آزاد زندگی کی حفاظت میں سعی کرتی ہے۔ پھر اپنے وطن اور اہل وطن کو خطرات سے بچانے کی سعی کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ جمہوریت پسند اقوام و افراد جب اپنے وطن کی حفاظت یا خطرات کی صورت میں وطن کی جانب سے خطرات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تو وہ درحقیقت ایک طرح اپنی آزادی کی حمایت و حفاظت کرتے ہیں۔ اسی لئے جب ضرورت داعی ہوتی ہے تو راہِ وطن میں خوشی خوشی اپنا خون اور اپنا مال و متاع سب کچھ لٹا دینے میں مطلق تامل روا نہیں رکھتے۔

برعکس ان اقوام کے جن پر ان کے جابر ڈکٹیٹر ایک ایسی زندگی ٹھونس دیتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتیں۔ وہ قومیں جو کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ اس سے انھیں روک کر وہ کچھ کرایا جاتا ہے جسے وہ ناپسند کرتی ہیں۔ یہ مقہور قومیں جنگ میں جبراً جھونک دی جاتی ہیں۔ وہ جنگ سے نفرت کرتے ہوئے بھی لڑنے پر مجبور کی جاتی ہیں اور اس غیر رضا کارانہ جنگ میں اگر فتحیاب ہوتی ہیں تو فتح اور کامرانی کے ثمرات سے محروم رکھی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کی جاں فشانی اور خوں ریزی سے جو فتوحات حاصل ہوتی ہیں۔ اُن کا فائدہ ان اقوام کے ڈکٹیٹر اٹھاتے ہیں۔ اور اگر جنگ میں وہ شکست پاتی ہیں تو شکست کے تلخ مصائب تلخ ترین کر ان کی تقدیر بن جاتے ہیں کیونکہ مصائبِ شکست میں ان مجبور اور ہزیمت یاب قوموں کا یہ احساس انھیں بے چین کئے رہتا ہے کہ یہ تلخ مصیبتیں ہماری قوتِ ارادی کے علی الرغم ہمارے حصے میں آئی ہیں۔ اسی وجہ کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری قومیں جب کبھی حرب و ضرب کے سمندر میں داخل ہوتی ہیں تو اس جنگ کے مقاصد، فتح و کامرانی کے ثمرات۔ اور ہزیمت و شکست کے انجام سے ان کے رہنما پہلے سے انھیں پورے طور پر مطلع کر دیتے ہیں کیونکہ یہ رہنما کسی جنگ کے لئے تنہا ذمہ دار نہیں ہوتے بلکہ قوم کی

رائے عامہ انھیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ملکی و سیاسی حقوق کی حفاظت و حمایت کے لئے جنگ کا آغاز کریں۔ اس سے بھی بڑھ کر اکثر حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوم جب اپنے ملکی حقوق کو خطرات سے دوچار پاتی ہے تو اپنے نمایندگان نظم و نسق پر ان خطرات کے مقابلے کے لئے دباؤ ڈالتی ہے۔ اگر وہ اس دباؤ کو تسلیم نہ کریں تو ان کو معزول کر کے ان کی بجائے اپنے میں سے ایسے افراد کو نمایندگی سونپتی ہے جو قومی عزائم و مصالح کی حمایت کریں۔ اور قوم کی رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اس کی جنگی رہنمائی کریں۔

لیکن جن قوموں پر ڈکٹیٹر حکومت کر رہے ہیں وہاں یہ صورت ہے کہ ان کے جابر حکمراں اپنی محکوم اقوام کو جنگ پر مجبور کرتے ہیں اور ان سے اصلی مقاصد جنگ چھپاتے ہیں۔ جنگ کے مراحل و منازل اور خطرات سے انہیں بے خبر رکھتے ہیں اپنی مصلحتوں کو ان پر ظاہر نہیں کرتے ہیں مختصر یہ کہ بے عقل مویشیوں کی طرح انہیں ہنکاتے ہیں۔ ایسی قومیں اپنی مرضی کے بغیر ڈکٹیٹروں کے خوف اور سخت گیری کے پیش نظر لڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ اس جنگ میں ہماری جماعتی بھلائی کچھ نہیں۔ لڑتے ہیں۔ بے دلی اور بددلی کے جذبات سے ان کی قوت ارادی اور طاقت عمل مفلوج ہوتی ہے مگر خوف اور دہشت انہیں میدان جنگ کی جانب بڑھاتے ہیں۔ جذبۂ رغبت و رضا اور شعور مآل اندیشی سے وہ یکسر عاری ہوتی ہیں۔

جمہوری اور آمریت پسند اقوام کی جنگی کارپردازیوں کا یہ فرق کسی صاحب بصیرت سے مخفی نہیں مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ اور دیگر برطانوی وزراء کے بیانات اور اطالوی و جرمن ڈکٹیٹروں کے جنگی اعلانات اس دعوے کی تصدیق اور اس فرق کی بیّن مثالیں ہیں جمہوری وزراء اپنی قوم کو جنگ کے تمام خطرات و مشکلات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہتے ہیں۔ اسے جنگ کی منزل اور مرحلے پر صحیح حالات سے باخبر کرتے ہیں۔ اپنے نقصانات اور کامیابیوں سے تفصیلی اطلاعات دیتے ہیں۔ اور ہر صورت حال سے متعلق اپنی تدابیر اور جنگی پالیسی کی بابت قومی نمایندوں سے مشورے لیتے ہیں دوسرے لفظوں میں جمہوری رہنما قوم کے منتخب نمایندوں بلکہ اکثر اوقات قوم کے تمام افراد و طبقات کو جنگی حالات سے مطلع کر کے ان سے اپنی جنگی پالیسی کے لئے تائید اور اپنی سیادت پر سند اعتماد کی درخواست کرتے ہیں پھر اگر قوم کے نمایندے۔ ملکی پریس اور رائے عامہ ان کی تائید کرتی ہے تو اپنے منصب سیادت پر قائم رہتے ہیں۔ اور بصورت دیگر انھیں منصب سیادت سے دست بردار ہو جانا پڑتا ہے مختصر یہ کہ جمہوریت پسند قومیں اپنے سیاسی حقوق کے لئے جب جنگ کرنا ضروری خیال کرتی ہیں تو اپنے حسب پسند جنگی ذمہ داریاں سپرد کرنے کے لئے اپنے ہی میں سے موزوں نمایندے منتخب کر لیتی ہیں۔ اور اس طرح تمام قوم اور قوم کے تمام افراد اس جنگ کی ذمہ داریوں کے امین اور ذمہ دار بن جاتے ہیں جو راہ وطن میں کی جاتی ہیں۔ اور چونکہ وہ خود بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے ملکی حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ میں اپنا مال و متاع اور اپنی عزیز جانیں قربان کرنے میں انہیں ذرا تامل یا افسوس نہیں ہوتا۔

اسی طرح جب وہ یہ دیکھتی ہیں کہ ہم نے اپنے جن منتخب افراد کو جنگی معاملات کا ذمہ دار بنایا تھا۔ وہ اس کے اہل ثابت نہیں ہو رہے تو فوراً انھیں برطرف کر کے ان سے بہتر افراد کو منصب سیادت عطا کر دیتی ہیں مسٹر چیمبرلین کے کابینۂ وزارت کی شکست اور مسٹر چرچل کی حکومت کی تشکیل اس کی روشن مثال ہے۔ اس کے برعکس اطالیہ اور جرمنی کی قوموں کو مسولینی اور ہٹلر کو معزول کرنے کی مجال نہیں معزول کرنا تو بڑی بات ہے۔ ان کی کسی پالیسی کے خلاف اظہار خیال کرنے کی بھی جرأت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان ڈکٹیٹروں نے اپنے ملکوں میں رائے عامہ کو اس بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے کہ افراد قوم کوئی رائے رکھنے کی اہلیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

الغرض ایک جانب جمہوریت پسند کچھ قومیں ہیں جو اپنے حقوق زندگی اور حریت کی خاطر اپنے منتخب کردہ نمایندوں کی رہنمائی میں شوق و رضامندی سے جانیں لڑا رہی ہیں۔ اور اس اختیار و اقتدار کے ساتھ کہ جب وہ اپنے نمایندوں کو بے راہ یا سست رفتار پاتی ہیں انھیں بے تامل برطرف کر دیتی ہیں۔ اور دوسری جانب کچھ مجبور و مقہور اقوام آمریت پسند ہیں کہ بے رضا و رغبت اپنے جابر حکمرانوں کے جور و جبر کے پیش نظر جنگ کی آگ میں کود رہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جمہوری اقوام اپنے مصالح ملکی کے لئے نہایت کار آمد انداز میں اپنی زندگیاں موت کی بھٹی میں جھونک رہی ہیں اور اطالوی و جرمن باشندے اپنے ڈکٹیٹروں کی مصلحت کی قربان گاہ پر اپنا مال و متاع عیش و آرام اور سرمایہ زندگی نذر کر رہے ہیں گویا ایک جانب رضا و رغبت جنگ کا باعث بن رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ڈکٹیٹروں کے جبر و استبداد کا خوف اور دہشت جنگ کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جمہوری اقوام اس لئے جنگ کو اپنے لئے ناگزیر پاتی ہیں کہ انھیں اپنی آزادی اور اپنے ذاتی حقوق خطرے میں نظر آتے ہیں۔ اور وہ دیکھ رہی ہیں کہ اگر ہم نے جانی و مالی قربانی کر کے اس جنگ میں حصہ نہ لیا تو ہمیں غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہو جانا پڑے گا ہم اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے۔ اور اغیار کا جبر و قہر ہم پر مسلط ہو کر ہم سے انسانی مجد و شرف چھین لے گا۔ اور اطالوی و جرمن قومیں اس لئے جنگ میں شامل ہونے پر مجبور ہو رہی ہیں کہ انھیں خطرہ ہے کہ اگر ہم نے جنگ میں شامل ہونے سے انکار کیا تو ہماری زندگی کو ہمارے جابر ڈکٹیٹر ہمارے لئے موت سے تلخ تر بنا دیں گے۔ غنیم کی تلوار سے تو ہم بچ جائیں گے۔ مگر اپنے سخت گیر رہنماؤں کی شمشیر خارا شگاف ہمارے لئے ہماری مجبور زندگی کو جہنم کی زندگی میں تبدیل کر دے گی۔

ان جمہوری اور آمری اقوام کے علاوہ کچھ اقوام ایسی بھی ہیں جو ان دونوں

کے درمیان حیرت کے دوراہے پر بہ حالت اضطراب کھڑی ہیں۔ وہ بظاہر تو جمہوریت کی دلدادہ نظر آتی ہیں مگر زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھتیں وہ جمہوریت کی نمائش صرف الفاظ تک کرتی ہیں۔ ان کے کردار جمہوری رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ ایسی تذبذب زدہ قوموں میں سے جب کسی قوم کو مصائب جنگ پیش آجاتے ہیں تو وہ میدان جنگ تک اقدام کو اپنے لئے مشکل پاتی ہے۔ کیونکہ وہ یہ خیال کرتی ہے کہ اپنی حیات مستقلہ، اپنی جمہوری زندگی، اور آزادی کے لئے جنگ کی جانی چاہئے اور ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ مصائب جنگ کو لبیک کہی جائے۔ لیکن اس کی بہانہ ساز طبیعت اس سے ان حقیقتوں کو پوشیدہ رکھتی ہے کہ حیات مستقلہ کیا ہے جمہوری زندگی کسے کہتے ہیں اور آزادی کے حقیقی معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

جب اس کے رہنما اس سے کہتے ہیں کہ ہمارے ملک کو اپنی آزادی کے لئے قوم کے خون اور جانوں کی ضرورت ہے تو انھیں جواب ملتا ہے کہ "یقیناً" ہمیں جنگ کرنی چاہیے لیکن قوم کا دل ابا کرتا ہے۔ اور طرح طرح کے عذر تراشتا ہے۔ اس کا دماغ اسے سمجھاتا ہے کہ حریت اور آزادی ہے کہاں جس کی حمایت و حفاظت کے لئے جنگ کی جائے۔ اور جب اصل چیز یعنی حریت ہی ندارد ہے تو جنگ اور مقاتلے کے کیا معنی؟ کیوں بیٹھے بٹھائے اور بلا وجہ اجانب و اغیار سے بگاڑی جائے۔ ایسی قوم طاقت عمل و حریت افکار سے عاری، اور کوئی رائے قائم کرنے کی اہلیت سے محروم ہوا کرتی ہے۔

ان نمائشی اور نام نہاد جمہوریت پسند قوموں کے مقابلے میں تو وہ اقوام جو اپنے ڈکٹیٹروں کے جابرانہ احکام کے پیش نظر جنگ کرتی ہیں۔ ہزار درجہ بہتر ہیں کیونکہ جنگ کے لئے اپنی جبری فداکاری میں کبھی کبھی وہ کارہائے نمایاں بھی کر دکھاتی ہیں۔ فرانس میں نازی افواج کو حیرت آفریں جاں نثاری اور آنکھ بند کر کے آتش جنگ میں یقین رکھتے ہوئے بھی کو دپڑنا اگرچہ یہ جنگ جرمنوں کے لئے نہیں لڑی جا رہی ہے بلکہ ہٹلر کے مصالح کی خاطر کی جا رہی ہے اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ جو قومیں مخلص رہنمائی سے محروم اور گمراہ لیڈروں کے اشاروں پر جنگ کر کے فنا ہو رہی ہیں وہ ان اقوام سے کہیں بہتر ہیں جو تذبذب میں مبتلا ہیں۔ جن کی رائے "ڈانواڈول" اور جنھیں اپنی قوت ارادی پر کوئی اعتماد نہیں منہ سے جمہوریت کی حمایت کا دم بھرتے ہیں لیکن عملی طور پر انھیں جمہوریت کی قدروقیمت کا کوئی احساس نہیں۔ ایسی قومیں زمین کا بوجھ بنی رہتی ہیں۔ آسمان کے نیچے انھیں سانس لینے کا مطلق حق نہیں پہنچتا۔ ان کے لئے محفل عالم میں سر اونچا کر کے بیٹھنا ڈھٹائی اور بے حمیتی ہے۔ اب کوئی بتائے کہ ہم اہل مصر کیا کریں؟ جنگ کے خطرات ہماری طرف شش جہات سے دوڑ رہے ہیں۔ جنگ ہمیں چیخ چیخ کر پکار رہی ہے۔ اور وہ وقت سر پر منڈلا رہا ہے جبکہ ہمیں طوعاً و کرہاً جنگ میں شامل ہونا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب آسان ہے کسی طویل غور و فکر کا محتاج نہیں۔ ہم (اہل مصر) ایک جمہوری قوم کہلاتے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے جمہوریت و جمہوری آزادی کی راہ میں اپنا قیمتی خون پانی کی طرح بہایا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے آزادی کی خاطر تاریخی قربانیاں کی ہیں ہمیں اگر جمہوریت اور کسی بہا سے بہا بے بہا چیز میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لئے کہا جائے تو ہم بے تامل جمہوریت کو پسند کریں گے۔

ہم جمہوریت کے پرستار اور جمہوری زندگی کے دلدادہ ہیں اپنی آزادی کے فداکار اور وطن عزیز کے عاشق زار کہلاتے ہیں ہم نے اپنے وطن کی آزادی اور قومی استقلال کی خاطر جو صبرآزما اور ضبط پاش مصائب برداشت کئے۔ دنیا ان سے بے خبر نہیں۔ ہاں ہم جمہوری آزادی کو زندگی کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر خیال کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ سہی۔ یقیناً ہماری فطرت جمہوریت نژاد ہے اور یہ حقیقت شک و شبہ سے بالا ہے لیکن یہاں ایک اور حقیقت بھی ناقابل انکار ہے اور وہ مکروہ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے مصری اس امر میں شک کر رہے ہیں کہ وہ جمہوریت اور جمہوری زندگی کے ثمرات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے قلوب اس اطمینان و یقین سے خالی ہیں کہ وہ مصر کی جمہوری زندگی اور آزاد نظام حکومت سے اپنا حصہ لے رہے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ مصری جمہوریت کے فوائد کچھ مصریوں پر عائد ہوتے ہیں اور کچھ اہل مصر ان فرائض و واجبات کے پابند نہیں۔ اب جبکہ مہیب خطرات آفاق مصر پر چھا رہے ہیں تمام مصری ایسی حالت میں ہیں کہ ہماری زبانیں مصری جمہوریت کی حفاظت و حمایت میں متحد ہیں مگر ہمارے قلوب میں اتحاد نہیں۔ ہمارے ضمیر انتشار و خلفشار سے متاثر ہیں۔ اور ہمارے ایمان اپنے نصب العین آزادی کی طرف بڑھنے میں "ڈانواڈول ہو رہے" ہیں۔ اس سے زیادہ تباہ کن تذبذب مصر کی تاریخ میں مصری قوم میں کبھی پیدا نہیں ہوا یہ ایسی ناگفتہ بہ حالت ہے جس سے مصر کی قومی زندگی پاش پاش ہو جائے گی۔ اور مصر کی آزادی کے خواب کی تعبیر "خواب فراموش" بن جائے گی

ہمارے لئے اس وقت سب سے ضروری امر یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ خطرات جنگ جنگ کی صورت میں تبدیل ہو کر مصری معاشرت میں دراتے ہوئے گھس آئیں جمہوریت و آزادی سے متعلق اپنے قلوب میں اپنے ایمانوں میں۔ اپنے ضمائر میں اتحاد و یگانگت پیدا کریں۔ کیونکہ مصری جمہوریت ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ کوئی واہمہ نہیں۔ مصری آزادی ایک واقعہ ہے کوئی افسانہ یا خواب نہیں۔ مصری جمہوریت کے واجبات تمام مصریوں پر عائد ہوتے ہیں۔ وہ ناقابل تقسیم ہیں۔ وہ اس بے دلی کے مستحق نہیں کہ مصری لوگ فرداً فرداً اپنے آپ کو ان واجبات کی ادائگی سے مستثنیٰ کر دیں۔ انھیں متفقہ طور پر یقین حاصل کرنا چاہئے کہ ان کی تقدیر ہمہ گیر اور سب مصریوں کا مشترکہ مقسوم ہے اور یہ کہ سیاسی و جماعتی عدل کوئی ایسا درخت نہیں کہ اس کے سائے میں بیٹھنے کے حقدار کچھ مصری ہیں اور کچھ اس کے سائے سے الگ رہ سکتے ہیں۔ انھیں

سمجھ لینا چاہئے کہ مصری جمہوریت کے درخت کی جڑ زمین میں ہے۔ اور اس کی شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ آسمان فرسا شاخیں سب مصریوں کے سروں پر بلا استثنا رسایہ فگن ہیں۔ انھیں اس حقیقت پر ایمان لانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے سیاسی اور اجتماعی حقوق جنھیں مصر کا دستور حکومت استواری بخش رہا ہے تمام مصریوں کا حصہ ہیں۔ اور ہر مصری اپنے حصے کا مالک ہے۔ اسی طرح انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ مصری آزادی اور جمہوریت کے واجبات تمام مصریوں پر عائد ہوتے ہیں۔ ان فرائض کی مخاطب تمام مصری قوم ہے۔ ایک فرد بھی ان سے مستثنیٰ نہیں۔ اور ہماری جانب تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی جنگ ہم سب کو بلا استثنا پکار رہی ہے نام بنام پکار رہی ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص مجھ سے سوال کرے کہ اس مطلوبہ وحدۃ مصریہ کے حصول کا کیا طریقہ ہے؟ میرا جواب آسان اور سہل الفہم ہوگا۔ اور وہ یہ کہ جب مصر کی تباہی تمام مصریوں کا بے امتیاز حصہ بن سکتی ہے تو اس تباہی کو روکنے کے فرائض کی پابندی ہر مصری کو مجبور کرے گی کہ وہ مصر کی اجتماعی زندگی کے انجام کی تعمیر اپنے فرائض کی ادائیگی سے کرے اور اپنے کو مجبور پائے کہ اپنی انفرادی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر اس کی حفاظت و حمایت میں حصہ لے۔

البتہ مجھے بعض مصری رہنماؤں کی جانب سے یہ خطرہ ہے کہ وہ مصریوں کے ضمائر و خیالات میں انتشار پیدا کر کے مصری زندگی کو تباہ نہ کر دیں۔ اطالوی فوجیں   مصری حدود میں دور تک گھس آئی ہیں اور اگرچہ وہ نہر سویز کو اپنا مقصد اقدام ظاہر کر رہی ہیں لیکن یہ درحقیقت ان کا فریب ہے مصری اضلاع کو پامال کئے بغیر وہ نہر سویز تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ہماری نام نہاد غیر جانب داری کی پالیسی اطالوی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اطالوی تسلط کو مصر پر عائد کر دے گی۔ یہ امر یقینی ہے۔ یہ مستقبل اٹل ہے۔ پھر ہماری غلامی مصر کی تاریخ میں بے نظیر بن جائے گی۔ مصر کی آزادی اطالوی خطرات کے نرغے میں آ چکی ہے۔ مسولینی کے وعدے پر اعتماد کر کے مصر کا غیر جانب دار رہنا۔ اس سے زیادہ کوئی ہولناک پالیسی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت برطانیہ کو مصری تعاون کی ضرورت ہو یا نہ ہو مصر کے لئے مصر کی آزادی کے لئے اور مصر کی جمہوری زندگی کی بقا کے واسطے مصر کو برطانوی افواج کی ضرورت ہے۔

یہ نام نہاد غیر جانب داری جس پر اس وقت مصری حکومت چل رہی ہے برطانوی حمایت سے ہمیں محروم کر دے گی اور پھر کیا ہوگا؟ وہ کچھ ہو جائے گا جس کے تصور سے ہر مصری کا دماغ پاش پاش ہو سکتا ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈکٹیٹر جس ملک میں گھستے ہیں دوست بن کر یا دشمن کی حیثیت میں اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں نہر سویز پر اطالیہ کا قبضہ ہو گیا تو مسولینی اس قدر بیوقوف نہیں کہ اس سونے کی چڑیا (مصر) پر اطالوی تسلط عائد نہ کرے۔

(المصور۔ قاہرہ)

غزل

از:- الطاف مشہدی

مجھے پھر اک ستمگر سے محبت ہوتی جاتی ہے
الٰہی دن بدن کیسی طبیعت ہوتی جاتی ہے

میں بنیادیں گلستانوں کی رکھ سکتا ہوں پانی پر
مجھے روتے میں ہنس دینے کی عادت ہوتی جاتی ہے

اُتر کر رہ گئی ہیں جب سے نظریں ان کی سینے میں
مرے زخموں کو تیروں سے محبت ہوتی جاتی ہے

جفائیں ختم ہو جائیں گی جب اُن کی تو کیا ہوگا
کہ مجھ کو رنج و غم سہنے کی عادت ہوتی جاتی ہے

مجھے الطاف رسوا کر دیا صہبا پرستی نے
جوانی بھی مری وقفِ مصیبت ہوتی جاتی ہے

افسانہ

چندراوتی

از:- مسٹر قدرت اللہ شہاب ایم - اے، بی، ایس، سی، آئی، سی، ایس

چندراوتی سے میری محبت کا جب آغاز ہوا اُسے مرے ہوئے تیسرا چوتھا دن تھا میری آنکھوں کے سامنے اسے ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر شعلوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ اور بہت دیر تک ہمیں چُرمر۔ چُرمر کی سی آواز آتی رہی تھی۔ —— پھر اس کی راکھ بھی گنگا کی لہروں میں گُھل مِل گئی تھی۔ اور آج تیسرا دن ہے چندرا کی ماں کے سوا جیسے ساری دنیا نے اسے بھلا دیا ہو ——

لیکن پھر مجھے اس سے محبت ہو گئی - اور رات دن اس کی یاد ستانے لگی۔

اس کہانی کے اہم کرداروں میں سے ایک چندراوتی ہے - دوسرے شیاما - اور تیسرے یہ خاکسار —— یعنی ایف - بی - اے -

اگر آپ چندراوتی کو اس افسانے کی ہیروئن سمجھیں تو محض آپ کا حسنِ ظن ہو گا - ورنہ اس بچاری میں خود اس قسم کی کوئی صلاحیت نہ تھی یہی دیکھ لیجئے کہ عموماً ہیروئن کی زندگی پر کہانی کا مدار ہوتا ہے - اور اس کے سانس کی گرمی اس میں روح پھونکتی ہے لیکن جس وقت میری محبت کا آغاز ہوتا ہے - اس سے تین چار دن پہلے چندرا کی زندگی کی جوت بجھ چکی تھی اور اس کا جسم چتا کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو چکا تھا —— اور پھر وہ ایک معمولی غریب سی لڑکی تھی —— نہ اتنی معمولی کہ اس کی بے مائگی کائنات کی وسعتوں کے سامنے ایک عام انسان کی زندگی سے مقابلہ ہو اور اسے امتیازی نشان حاصل ہو۔ اور نہ اس قدر غریب کہ وہ بھوک اور افلاس کی ملکہ کہلا سکے یا کسی مرتے ہوئے جفاکش۔ فاقہ زدہ مزدور کے جیون ناٹک میں ہیروئن کا پارٹ کھیل سکے - وہ عام لڑکیوں کی طرح محض ایک لڑکی تھی جسے ایک بیوہ ماں کے ساتھ کسی تنگ و تاریک گلی میں رہنا پڑتا تھا اور جس کی زندگی میں گھر کی چار دیواری کے سوا اور کسی ماحول کا سایہ نہ پڑا تھا۔ وہ اچھی خاصی خوب صورت تھی —— جس طرح عام نوجوان لڑکیاں خوب صورت نظر آتی ہیں لیکن نہ تو اس کے گالوں میں قوسِ قزح کی گلابی رنگینیاں تھیں اور نہ اس کی آنکھیں شراب کی مستی سے بھرے ہوئے پیمانے - جب وہ ہنستی تھی تو صرف ہنستی تھی، اور اس کی مسکراہٹ پر ساری کائنات رقص کرتی ہوئی نظر نہ آتی تھی اور پھر اس کے بال بھی صرف سیاہ بال تھے، سورج کی کرنیں اس کے بالوں میں چاندی اور سونے کے تار نہ پروتی تھیں، —— میرے مطالعے کے کمرے کی کھڑکی سے سب سے پہلے چندرا کے گھر میں نگاہ پڑتی تھی میں نے بی - اے کا امتحان دے دیا تھا - اور اب میں اس ذہنی کشمکش کو دور کرنے کی کوشش میں تھا جو امتحان اور نتیجے کے درمیانی وقفے میں ہر طالب علم کا پریشان ترین خواب بن جاتی ہے - ایک جوانی، دوسرے فرصت، ضروری تھا کہ حسن اور عشق کے جذبات بیدار ہو جاتے - چنانچہ میں نے اپنے تخیل میں ایک علیحدہ رومانی دنیا بنائی تھی جس کی سب رنگینیوں اور مسرتوں کا مرکز عورت تھی! سینما کے پردے پر تھرتھراتی ہوئی نازک بدن عورتیں؟ بازاروں اور پارکوں میں چہچہانے والی خوش نما عورتیں؟ اور پھر عشقیہ ناولوں کی جاذبِ نظر ہیروئنیں جو چلنے کی بجائے ہوا میں تیرتی ہیں - اور بولنے کی بجائے گاتی ہیں —— لیکن جب میری نظر کمرے کی چار دیواری سے گھبرا کر آسمان کی وسعتوں میں کھو جانا چاہتی تھی، تو کھڑکی سے سر نکالتے ہی سب سے پہلے چندرا دکھائی دیتی تھی - جو پھکنی منہ سے لگائے گیلی لکڑیوں سے دھوئیں کے بادل اڑاتی نظر آتی تھی - یا دھوپ میں بیٹھی ہوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں ٹانکے لگانے میں مصروف —— یہ کثیف نظارہ مجھے روحانی بلندیوں سے گھسیٹ کر زمین پر پٹک دیتا تھا - اور میری طلسمی دنیا کا تصور تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ جاتا تھا —— اور اسی وجہ سے رفتہ رفتہ مجھے چندرا سے نفرت ہو گئی!

چنانچہ ایک دن میں نے ماں سے کہا کہ چندرا کی ماں نے چار ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا اس لئے اسے نوٹس دینا چاہیئے کہ اگر دس دن کے اندر حساب بے باق نہ ہوا تو مکان خالی کرا لیا جائے گا۔

ماں نے حیران ہو کر اپنی بھویں اٹھائیں - اور بولی:۔

"چھی چھی، بیٹا - ایسا نہیں کیا کرتے - تو نے آج یہ سبق کہاں سے سیکھ لیا ہے - بچاری بدھوا تو ہے جب ہو سکے گا کرایہ دے دے گی - اور اگر نہ بھی دیا تو چار روپے مہینے سے کونسا ہمارا . . . . ."

میں نے فوراً بات کاٹ دی، اور کہا "لیکن اصولاً انہیں ہمارے مکان . . . . ."

"چل چپ رہ" ماں نے غصے سے کہا "آیا بڑا مکان والا . . . . ."

مکان کی بات نہیں ماں، میں تو اصول کی بات کہتا ہوں"

"مجھے زیادہ وکالت نہیں آتی —— لیکن میرے جیتے جی ایسا نہ ہو گا بعد میں جو جی میں آئے کرنا —— اور کیا"

لیکن میں بھی تہیہ کئے ہوئے تھا کہ آج اپنی بات منوا کے رہوں گا اس لئے میں نے ایک اور حربہ استعمال کیا -

لیکن ماں چندرما۔ اور اس کی ماں کی شہرت بھی تو اچھی نہیں ہمارے محلّے میں شریف بہو بیٹیاں ......"

ماں نے آنکھیں اٹھا کر مجھے مسکرا کر گھورا۔ اور الفاظ خود بخود میرے گلے میں اٹک گئے جیسے ایک بھاگا ہوا بچہ استاد کے سامنے بہانہ تراشتے ہوئے بھول جائے کہ اب آگے کیا کہنا چاہیے ——— !

ماں کی تنی ہوئی پلکوں میں خدا جانے کیا چیز پوشیدہ تھی کہ میں دل ہی دل میں سخت نادم ہوا۔ اور اس کے بعد کئی روز تک مجھے اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہوئی۔

ماں کے سامنے میری اس ندامت کا باعث چندرا کے سوا اور کون تھا؟ میں کھڑکی میں کھڑے ہو کر بہت دیر تک اسے گھورتا رہا۔ میرے دل میں غم و غصّے کی آندھی چل رہی تھی۔ میں اسے چوٹی سے پکڑ کر کسی تاریک کنوئیں میں دھکیل دینا چاہتا تھا۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لئے میری نظر سے اوجھل ہو جائے۔ وہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی دھوپ میں بال سکھا رہی تھی۔ مجھے گھورتے دیکھ کر کچھ جھینپ سی گئی۔ اور اپنی کمر میں سلوٹیں پیدا کر کے میری طرف سے پیٹھ موڑ لی ——— مغرور! ان عورتوں کو اپنی ذات کے متعلق کیا کیا خوش فہمیاں ہوتی ہیں ——— خواہ مخواہ! میں اسی سوچ میں تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"یار اتنے ہی مصروف ہو تو چلا جاؤں؟"

"اوہو، کمار تم ہو؟ آؤ بیٹھو" میں نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم کہ تم چور کی طرح آئے کھڑے ہو ——— !"

"ہاں دوست، چور نے آکر تمہاری چوری پکڑ لی!"

"میری چوری؟"

"سچ ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے"

"میں نہیں سمجھا، کمار؟"

میرا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا لیکن ....؟"

"؟؟"

"اب اتنی بات کرو، اندر ——— کہ شیاما کو میرے لئے چھوڑ دو۔ میں اُسے دل سے چاہتا ہوں"

"؟؟؟"

"جی ہاں، آپ بیک وقت دو بازیاں نہیں کھیل سکتے!"

کمار۔ میرا ہم جماعت تھا۔ اور کتابِ عشق کا زبردست عالم۔ شیاما کے معاملے میں میری اس کی نہیں بنتی تھی اور وہ خود بھی میری طرف زیادہ ملتفت تھی کالج میں شیاما کی مسکراہٹوں کے پھول سب سے زیادہ میرے حصّے میں آتے تھے جب وہ میری بات سننے کے لئے اپنی گردن میں ایک ہلکا سا خم پیدا کرتی۔ یا جب چھٹی ملنے پر ہم دونوں ایک دوسرے کے بائیسکل کا ہینڈل پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلتے۔ تو کمار کے سینے میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے جنھیں بجھانے کے لئے وہ مس دوسی، یا پرتیما، یا مس کپور کی بائیسکلوں کا بے تحاشا تعاقب کرتا تھا اور پھر شام کے وقت دو چار جام پی کر کسی کثیف بالاخانے پر پژمردہ چہروں اور صابن کے بلبلوں میں نہائے ہوئے حسن میں اپنی تلخیوں کو بھلانے کی ناکام سعی کرتا تھا

"جی ہاں، بے شک" کمار نے دوبارہ کہا۔ "آپ ایک وقت میں دو بازیاں نہیں کھیل سکتے!" اور پھر وہ فاتحانہ انداز سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا واپس چلا گیا

ان دنوں دیوالی کی آمد آمد تھی۔ کالج میں ہم اس تہوار کا بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے ——— روشنی کے سیلاب میں تیرتی ہوئی رنگ برنگ ساڑھیاں؟ خلقِ خدا کا بے پناہ ہجوم؟ دھکّے؟ ریل پیل؟ ہنسی مذاق؟ اور پھر یکایک ہماری ٹھوڑیوں کا مشک بار زلفوں سے مس کرتے ہوئے گزر جانا۔ یا ہمارے بازوؤں کا نرم نرم، گداز گداز شانوں سے ٹکرانا ——— اوہ!

لیکن مجھے سب سے زیادہ یہ خوشی تھی کہ اس بار شیاما نے میرے ساتھ دیوالی دیکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ میرے دماغ میں عجیب عجیب خوش گوار خیالوں کی پن چکیاں چل رہی تھیں جب شیاما فرواکٹ پہن کر میرے ساتھ نکلے گی تو دوسرے لڑکے میری طرف کس حسرت سے دیکھیں گے۔ کمار کے سینے پر تو زہریلے سانپ لوٹیں گے اور جب ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے مسکراتے مسکراتے .....

لیکن دیوالی آئی۔ دنیا بھر کے چراغ روشن ہوئے اور میرا دل بجھا رہا۔ کمار کے چلائے ہوئے تیر اپنے نشانے پر ٹھیک بیٹھے تھے۔ اور اس روز وہ شیاما کے ساتھ دیوالی دیکھنے گیا انھوں نے "نیو لائف" ریسٹوران میں چائے پی اور پھر "الیگزینڈریا ہوٹل" کے شاہانہ تکلفات میں گم ہو گئے .....

مجھ پر چندرا کا یہ تیسرا وار تھا۔ وہ ہمیشہ سے میرے روحانی تخیلات میں دھوئیں کے بادل اور پرانے کپڑوں کے چیتھڑے بکھیرتی آئی تھی۔ پھر ایک بار وہ ماں کے سامنے میری سخت ندامت کا باعث بھی بنی۔ اور آج اس نے میرا دل دکھایا تھا۔ دنیا میں سب کچھ سہا جا سکتا ہے لیکن دل کے نشانے پر لگائی ہوئی چوٹ برداشت نہیں ہو سکتی۔ خدایا! میرے سر پر خون کا بھوت سوار تھا میں چاہتا تھا کہ میں چندرا کی آنکھیں نکال کر شیاما کے پاس لے جاؤں۔ اور کہوں، "میری جان، انھیں اپنے پاؤں سے مسل ڈالو ——— کیا شہر بھر کے بالاخانوں میں ایک چندرا کے لئے جگہ نہ تھی؟ کیا دنیا بھر کے مجرموں میں ایک بھی ایسا نہ تھا. جو اپنے جرم کی قیمت حاصل کرنا چاہتا ہو؟

لیکن پھر خود ہی مہربان قدرت میری مدد کے لئے تیار ہو گئی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے چندرا کو نمونیہ ہوا اور تیسرے روز وہ مر گئی ——— ! میں نے خورشیا ما کے پاس جا کر خوشی سے ناچ ناچ کر یہ خوش خبری سنائی۔ اور اس نے فوراً اپنی نازک نازک مخملیں باہیں میرے گلے میں لٹکا کر مجھ سے اپنی غلط فہمی کی معافی مانگ لی

میری کھوئی ہوئی شیاما مجھے واپس مل گئی تھی۔ اور اب میرے رومانی تصورات کی رنگینیاں پھر سے آباد ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں کو درست کیا۔ اور کھڑکی کے پردے اٹھا کر کائنات کی وسعتوں کے پٹ کھول دئے ——— دور، دور تک اینٹوں اور پتھروں کے بنے ہوئے خشک خشک مکان؟ گلیوں میں آدمی، بچے، کتے؟ پھیکا پھیکا ٹمیالا سا آسمان دور کارخانے کی چمنیوں سے بھک بھک کر کے نکلنے والا بدبودار دھواں ——— ؟ میری نگاہیں وحشت کھا کر خود بخود واپس آ گئیں۔ جیسے میں نے پہلے کبھی انھیں دیکھا ہی نہ تھا ——— ! سامنے چندرا کا مکان تھا چندرا کی کھری چارپائی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ اور کوٹھے کی منڈیر پر پیوند لگے ہوئے چند پرانے کپڑے پڑے تھے ———

نہ معلوم میں کب تک یوں ہی کھڑا رہتا لیکن ماں نے آکر مجھے جگا دیا۔

"اب یہ کھڑکی بند کر دو، بیٹا! چندرا تو ہمیں چھوڑ گئی"

ماں ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ اور پھر اس نے رومال اٹھا کر میری آنکھوں پر پھیرا ——— مجھے محسوس تک نہ ہوا تھا کہ میں بھی رو رہا تھا!

"جی سنبھالو، بیٹا!" ماں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ہر روز کھڑکی میں کھڑے رہنا لوگوں کو اچھا نہ لگتا تھا لیکن مجھے بڑی خوشی تھی، غریب اور امیر کا ملاپ دنیا کو منظور نہیں تھا۔ اس بیاہ پر سماج ضرور انگلیاں اٹھاتا لیکن بیٹا! جہاں پریم ہو . . . . . ."

نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا۔ اور ماں کی آنکھوں سے بھی ——— اس بہتے ہوئے پانی میں بھی مجھے گیلی لکڑیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادل نظر آتے تھے ———

اور ان کی چادر میں لپٹی ہوئی ایک معمولی سی، ایک غریب سی لڑکی . .

. . . . . .

غزل

از:- اختر شیرانی

شب کو پہلو میں جو وہ ماہ سیہ پوش آیا
ہوش کو اتنی خبر ہے کہ نہ پھر ہوش آیا

بے خودی سمجھی، ہم آغوش ہوئی مجھ سے بہار
کچھ اس انداز سے وہ یاسمن آغوش آیا

جب نشاں تک نہ رہا قبر کا میری باقی
تب مری قبر پہ وہ زود فراموش آیا

پھول بکھراتا ہوا، نکہتیں برساتا ہوا
وہ سمن رنگ و سمن بوی و سمن پوش آیا

ماہ و انجم سے کہو زینت کاشانہ بنیں
کہ پھر آغوش میں وہ عشرت آغوش آیا

ان کا زانو تھا، مرا سر، مرا دل، ہات ان کا
بے خودی تیرا برا ہو مجھے کب ہوش آیا

کس لئے رو دئیے یوں بیٹھے بٹھائے اختر
آج کیا یاد کوئی یاد فراموش آیا

میدانِ جنگ کی صبح

از:-
پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی بی۔ اے

(ایک رزمیہ نظم کے چند بند)

(۱)

پیچھے ہٹے عساکرِ انجم کے جب قدم — کھولا فلک پہ مہرِ جہاں تاب نے علم
نکلا سحر کا موکبِ زرّیں بہ صد حشم — احکامِ شاہِ شرق کے ہونے لگے رقم
ہوتا تھا پتے پتے سے انوار کا ظہور
گیتی کا ذرہ ذرہ تھا سرمایہ دارِ نور

(۲)

وہ جلوہ ریز نیّرِ مشرق ستاں ہوا — یعنی سوارِ توسنِ آتش عیاں ہوا
انجم کا رفتہ رفتہ رواں کارواں ہوا — اور رزم گاہِ ظلمت و نور آسماں ہوا
کرنیں ہیں یا نمائشِ تیر و تفنگ ہے
تاروں کا خون یا شفقِ لالہ رنگ ہے

(۳)

صحرا کے ذرہ ذرہ کو زردار کر دیا — گلشن کے پتے پتے کو دینار کر دیا
جھولی میں گل کی سونے کا انبار کر دیا — قطروں کو اوس کے دُرِ شہوار کر دیا
عالم تجلیِ شہِ خاور سے بھر گیا
دامن جہان کا زر و گوہر سے بھر گیا

(۴)

شبنم کے قطرے قطرے کو ضوبار کر دیا — پانی کو آبرو کا سزاوار کر دیا
یعنی چمن چمن کو گہربار کر دیا — غیرت دہِ ثوابت و سیّار کر دیا
نورِ سحر میں اوس کے قطرے ہوئے غریق
قوسِ قزح کا گھر تھا ہر اک گوہرِ رقیق

(۵)

یہ عرصۂ نبرد میں ظاہر ہوئی سحر — یا دامنِ شفق سے برسنے لگے شرر
ہے جلوہ ریز تارکِ مشرق پہ تاجِ زر — یا آئی آسمان پہ زرّیں سپر نظر
بہرِ وغا سلاحِ سر افشاں کی تھی طلب
شد آشکار تیغِ سحر از میانِ شب

جدید فلسفۂ تاریخ

علمی

مترجمہ:- اختر شیرانی

۱۹ ویں صدی کو تمام علما، تاریخ کی صدی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس صدی میں قدیم علم تاریخ میں تبدیلی ہوئی اور انسانی جماعتوں نے اپنی موجودیت اور ملیت کو پہلے سے بہتر و بیشتر جانا اور پہچانا۔ ہر چہار طرف تاریخی تحقیقات و تدقیقات کا جوش و خروش پیدا ہوا۔ ہر ایک قوم کے افراد نے سعی بلیغ صرف کی کہ تاریخ کے صفحات اور خاکی کھنڈرات کے تاریک پردوں سے اپنے اپنے قومی سیادت و عظمت کے جمال کو باہر نکالیں۔ اور دنیا کے سامنے پیش کریں۔

موجودہ دور میں علم تاریخ کے مختلف دلستان (Schools) پیدا ہو گئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے اساسی خدوخال علیحدہ علیحدہ رکھتا ہے۔ ان دلستانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) یعنی وہ مورخ جو تاریخی عناصر و وثائق کے کاملاً پابند اور عقیدت مند ہیں اور تاریخ نگاری کے سلسلے میں اپنے شخصی ذوق اور ذاتی شوق کے دخل کو پسند نہیں کرتے۔ اس صورت میں مورخ کا فرض اپنے موضوع کے مطابق صرف قدیم دستاویزیں اور وثیقے حاصل اور جمع کرنا اور ان سے کمال صداقت و امانت کے ساتھ استفادہ کرنا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ اُن مورخین کا یا بالفاظ دیگر عصری مورخین کا ہے جو تاریخی اسناد اور دستاویزوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں اور ساتھ ہی زیادہ تر موضوعات کی تحلیل و ترکیب پر زور دیتے ہیں۔ یہ گروہ مستند تاریخی وثائق کو، وثائق سے مطابق علمی مطالعات سے ملا کر، لہذا اس تمام سرمایہ میں اپنے فلسفیانہ افکار اور نتائج کی روح پھونکتا منطق و فلسفہ کے قوت کے ساتھ وقائع کو باہم مربوط کرتا اور تحلیل و ترکیب سے حل کرتا ہے۔

ان دو دلستانوں میں پہلے کو دلستان داستانی (Ecole- narrant-) اور دوسرے کو دلستان تحلیل و ترکیب تاریخی (Analyse etsynthesehistorique.) کہتے ہیں۔

جس مقالے کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ اس میں دوسرے دلستان کی اہمیت لازمیت اور طریقۂ اول کے متروک ہونے کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔

مقالہ، پروفیسر بکرڈ سابق وزیر تعلیم پروشیہ کا ہے اور رسالہ "ڈی نوی روندشاو" میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ یہ اس موضوع کے ایک بہت بڑے عالم اور اہل قلم کا اہم ترین مقالہ تھا۔ اس لئے وہاں سے ایک فاضل ترک اہل قلم ایم۔ نارمی نے انقرہ کے "مجلہ حیات" میں ترجمہ کیا۔ ترکی سے محمد قدیر (ترہ کی) مدیر کابل نے فارسی کا جامہ پہنایا اور یہاں سے ہم شاہکار میں اس کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

تاریخ نگاری کا قدیم دور، اس کا نہج و اسلوب اور لب و لہجہ ختم ہو چکا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کے قدم اپنے تمام حیاتیاتی میدانوں کی طرح، اس میدان میں بھی، ایک جدید مرحلے سے آشنا ہو رہے ہیں۔ جو اشخاص، تاریخ نگاری کے قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں مورخ کے شخصی مذاق کا دخل نہ ہوتا تھا، وہ عام طور پر، اپنے آپ کو ان جدید اوضاع کے مابین، محصور اور مجبور پاتے ہیں۔ یہ جدید اوضاع، وہ مصائب ہیں، جن سے انسان اپنے ابتدائی دور میں دوچار ہوتا ہے۔

جو افراد اب تک، گزشتہ عہد کے واقعہ نویسی کے اصول کے پابند ہیں اور چاہتے ہیں کہ تاریخ نگاری کے نازہ و جدید وثائق تک دسترس حاصل ہو۔ وہ اپنے آپ کو، تاریخ کے قدیم ذخائر اور اُن کے حوائج و نتائج سے بے بہرہ پاتے ہیں اور اُن کی نوشتہ تاریخیں یہ احتیاج پوری نہیں کر سکتیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود بخود تاریخ نگاری کے رویہ کی تبدیلی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ کہ اب تحریر تاریخ کا طریقہ بدل گیا ہے۔ کیونکہ وثائق تاریخ کی جمع آوری کا ذوق و شوق، جو کل تک مورخ کے ارادہ، مذاق، قلم اور قدرت تحریر پر غالب تھا اور آفاقی تحقیقات پر جو اعتماد ظاہر کیا جاتا تھا، وہ آج متروک ہو چکا ہے اور اس کی جگہ عندی تنقیدات نے لے لی ہے۔ بالفاظ واضح، تاریخ کے فلسفیانہ، جمالی، مذہبی اور قومی مفاہیم، جو پہلے مورخین کی نفرت کا باعث تھے۔ اب جان مضمون بن گئے ہیں۔ درحالیکہ تاریخ کی صحت و وثاقت کے اعتبار یا انکی حفاظت کی خاطر، تاریخ نگاری کے مسلک کو، اس خیال کے مقابلے میں لاقید ہونا چاہئیے تھا، اس کی وجہ ہے کہ علم تاریخ کے لئے، اپنی اہمیت و نزاکت کے لحاظ سے کبھی بھی وقائع سے سہل انگاری نہیں کرنی چاہئیے درحالیکہ تاریخ نگاری کا

موجودہ اصول، اُس کا وثیقہ نہ ہونے ہوئے مورخ کے مذہبی، جمالیاتی اور آخر میں قومی مسلک، ملاحظات، معتقدات، اور افکار کے ایک سلسلۂ دراز کی پیداوار ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہم عہد اور اصولی ——— سیاسی، ملی، اجتماعی اور تمدنی احتیاجات اور زمانے کے شعور کو، جنہیں کل تک مورخین، تاریخ نگاری کیلئے لازمی خیال کرتے تھے بدل دینا لازمی ہے۔ جو چیز آج ہمارے لئے حیرت و استعجاب کا باعث ہوتی ہے، یہ ہے، کہ تاریخ عملی سیاست اور رزمیات اقوام کے کسی دور میں بھی کبھی تاریخ کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی جسقدر آج دی جا رہی ہے۔ اور یہ کہ آج تاریخ، ہمارے افکار و عقائد اور آخر میں ہمارے ملت پرستوں اور جماعتوں کی آرزو اور نصب العین کی کنیز ہے۔ اس مسئلہ کا سبب کیا ہے؟

موجودہ مورخین میں سے جس مورخ کی بھی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تاریخی دستاویزوں اور اصول نگارش کے استعمال میں اس کے طرز تفکر پر، عنصری اصول کا غلبہ نظر آئے گا۔ درحالیکہ تاریخ نگاری کا اصول، کسی زمانے میں بھی اس رنگ کا حامل نہ تھا۔ بلکہ تاریخ اور مورخین کو جسقدر بھی حوادث پیش آئے، ان کے باب میں تاریخ ہمیشہ وقائع بہ وقائع اور مورخ کے شخصی امیال و عواطف سے محترز رہی ہے۔ مگر آج معاملہ دوسرا ہے اور اس اصولی قاعدے کی بنیاد متزلزل ہو رہی ہے۔ اسقدر کہ اس کی نشأۃ الثانیہ یا اعادے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ آج تمام اقوام و ملل کی زندگی اور زندگی کے رجحانات تبدیل ہو چکے ہیں اور افراد کی امیدیں اور آرزوئیں، ان کی استعداد قبول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے تفاوت اختیار کر چکی ہیں۔

ایک دوسری علت، جس نے تاریخ کو ان اوضاع سے آشنا کیا ہے، موضوع کی وسعت ہے، کیونکہ تاریخ کا موضوع اسقدر وسیع ہو چکا ہے کہ گذشتہ موضوع سے اسے کوئی نسبت ہی نہیں رہی ہے۔ —— قدیم تاریخ نگاری میں موضوع کی وسعت، صرف وسعت زمان سے عبارت تھی۔ لیکن آج وسعت زمان کے ساتھ، وسعتِ مکان بھی لازمی ہے [illegible] تاریخیں، تمام کرۂ زمین پر حاوی ہیں۔ اور وقائع کی [illegible] ت، کے مقابلے میں زیادہ تر مادی [illegible] صنعت و حرفت، اقتصادیات،

قانون و مذہب اور اسی قسم کے موضوعوں کی دوسری تاریخیں، جدید موضوعات کی حیثیت نہیں رکھتیں، لیکن یہ سب کی سب، موجودہ تاریخ نگاری کی دنیا میں انفرادی حیثیت و کیفیت سے خارج اور تہذیب و ثقافت کی تاریخوں کی صورت اختیار کر کے اس مقصد کی حامل ہو گئی ہیں کہ اپنی متقابل تاثیرات کو سیاسی تاریخ میں داخل کر کے پیش کریں —— تاریخ نگاری کے سلسلے میں اس محیر العقول وسعت کی علت یہی ہے۔

یہ مسلمہ ہے کہ اس نوع کے تمام تاریخی موضوعات میں ماہر ہونا کسی ایک ہی فرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ آجکل کے زمانے میں ہر قسم کی تاریخی تحقیقات، موضوع کے انتخاب اور اس موضوع کے حدود کی تعیین سے شروع ہوتی ہے۔ اسی لئے ہمعصر تاریخیں عنصری ہوتی ہیں۔ یہ عکس، صرف تاریخ کے میدان ہی تک محدود نہیں، بلکہ تمام دوسرے موضوعات مثلاً سیاسیات اور اقتصادیات کی تاریخی حیثیتوں میں بھی کارفرما ہے۔ بنا بریں، مسائل اسقدر مفصل ہو گئے ہیں کہ ایک شخص کی قدرت و مہارت، خواہ وہ کتنا ہی ذہین و فطین اور صناع کیوں نہ ہو، ان مسائل کا کاملاً استقصا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بجائے اس کے کہ صرف ایک ہی وسیع اور عمومی علم ایسا ہو جو تمام موضوعات پر حاوی ہو سکے۔ ہر ایک شعبے کیلئے ایک علم مخصوص ہے۔ جسے اختصاص کہنا چاہیئے اور یہ بھی عنصری علم کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان تازہ نگاہ اور اختصاصی مورخین کی نظر میں، تاریخ کے وقائع اور حوادث اپنی دیرینہ اور قدیم اہمیت کھو کر اس امر کا باعث بن چکے ہیں کہ انسانی زندگی میں، ترقی کے معانی، اسباب اور وسائل و تحویلات کا، استدلال، قیاس اور استقرا کے وسیلے سے مطالعہ کیا جائے نہ کہ تاریخی دستاویزوں کے وسیلے سے۔ بدیں وجہ آج ہم اپنی زندگی کے ہر ایک شعبے میں، ایک عنصری دور سے دوچار ہیں۔ مثلاً دیکھیئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوانح حیات سے آج کس طبقے کو دلچسپی ہے؟ معلوم ہے کہ حضرت کے سوانح صرف کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے لئے کشش رکھتے ہیں، جو اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ان کے سوانح سے اپنے مقاصد کی کامیابی کی خاطر دلائل و براہین تلاش کریں۔ اس طبقے کے مقابلے میں، اُن کتابوں سے کسی کو کچھ واسطہ نہیں، جو منکرین کی طرف سے حضرت کے باب میں لکھی گئی ہیں۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ آج انسانی افراد کے عقل و خیال پر جو چیز حکم فرما ہے وہ تاریخی حقیقت نہیں بلکہ صرف وہ نوشتہ جات ہیں جو لکھنے والوں کے نصب العین، ذوق

اور آرزوئے خاطر کے خلاق اور اُن کی ضروریات کو مطمئن کرتے ہیں۔

آج جس وقت کوئی مورخ کسی تاریخ کے لکھنے کا ارادہ کرتا ہے سب سے پہلے اپنے موضوع اور دستاویزوں کا انتخاب کرتا ہے۔ اب اگر ہم اس کے موضوع اور دستاویزوں کو آفاقی کہیں تو ساتھ ہی مجبور ہیں کہ اس کے انتخاب کی حیثیت و کیفیت کو عنصری کے نام سے یاد کریں۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچیں کہ فی زمانہ تاریخ نگاری کے اصول کے لحاظ سے آفاقی روش پر عنصری روش حکمراں ہے۔

مورخ جب تاریخی دستاویزوں کو عنصری آب و رنگ بخشتا ہے یعنی ان کو حقائق واقعی سے تحلیل کر کے، اپنے ذوق اور میلان کے مطابق ایک آزاد صورت میں پیش کرتا ہے تو اُس کی حیثیت اُس صنعت کار کی سی ہوتی ہے جو صنعت کے ابتدائی مسالے کے اوپر کام کر رہا ہو۔ آج وہ تاریخ جو صنعت کارانہ اور عنصری اصول کے مطابق نہ لکھی گئی ہو۔ دنیا کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اگر مشہور رومن مورخ ٹاسیٹ زندہ ہوتا اور موجودہ عہد کے مورخین کا مطالعہ کرتا تو حیرت سے دنگ رہ جاتا کیوں کہ اس کی نظر میں تاریخ صرف واقعہ نگاری تھی، صنعت کاری نہیں۔

ہم، موجودہ عہد کے مورخین کو جاننا چاہیئے کہ ہمعصر تاریخ کا تقاضا ہی یہ ہے کہ واقعے کی قرار واقعی قیمت و اہمیت کو اپنی منطق اور استدلال کی قوت سے ثابت کریں۔

جن اشخاص نے عصر حاضرہ کی نوشتہ تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آج کی تاریخ تجربات کی حامی ہے اور اس قسم کی تاریخوں کا اسلوب یہ ہے کہ اگر مورخ کسی چیز یا شخصیت کے باب میں خیالات یا اطلاعات پیش کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُس چیز یا شخصیت کو، ان تمام اثرات کے ساتھ منعکس کرے، جو انہوں نے اپنے عہد اور اس کے ماحول پر ڈالے ہوں۔

(باقی)

گمنام بیداری

نظم

از:- باقی صدیقی

میرے دل کا جائزہ لیتا ہے کیا اے ہمنشیں
تجھ کو میری ہستیوں کی تھاہ مل سکتی نہیں

تو ہے میرے فکر کی رعنائیوں سے بے خبر
میرے احساسات کی گہرائیوں سے بے خبر

ذہن تیرا میرے دل کا راگ سن سکتا نہیں
تو مرے نغموں کے رنگیں پھول چن سکتا نہیں

میری نظمیں تو سمجھتا ہے جنہیں میرا کمال
جن کی تابانی کے آگے سرد ہے تیرا جمال

جن کی ضو میں گامزن رہتے ہیں دل کے کارواں
جن کا ہر نقطہ ہے رازِ زندگانی کی زباں

ایک ہلکی سی جھلک ہے میرے احساسات کی
میری عالمگیر بیداری کے الہامات کی

اک پیام نو ہے ہر دھڑکن دلِ بیدار کی
آہ! وہ گمنام بیداری مرے افکار کی

کتنے ہی رنگیں فسانے حافظے کو یاد ہیں
کتنے ہی شیریں ترانے رُوح میں آباد ہیں

دل میں کتنے ہی انوکھے قہقہے خاموش ہیں
ذہن میں کتنے ہی زندہ معجزے روپوش ہیں

فکر جن کو شعر میں تبدیل کر سکتا نہیں

غزل

از:-
مسٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن ایم۔ اے۔ آئی۔ سی۔ ایس۔

جہانِ عشق میں دستِ فنا کو بار نہیں   یہاں حیاتِ زبون و نفس شمار نہیں
محیطِ عشق میں پیدا کوئی کنار نہیں   ہے تہ نشین جو پیہم ستیزہ کار نہیں
طلسمِ رنگ فسونِ نوا و بوئے لطیف   نگارِ شوخ ہے کوئی۔ یہ نوبہار نہیں
دلِ حزیں! نہ تجھے مست کر دے اُنکی نگاہ   مجھے نظر کی شہادت پہ اعتبار نہیں
میں لونگا چٹکیاں بن بنکے یاد دل میں سدا   بجھا کے جسکو مٹا دو۔ یہ وہ شرار نہیں
وہ جلوہ بار بھی ہیں رخصتِ نظر بھی ہے   رہا نہ شکوہِ ہستی کہ پایدار نہیں
چمن کو چھوڑ کے جاؤں تو میں کدھر جاؤں؟   مرے جنوں کو تو صحرا ابھی سازگار نہیں
صنم تراش تو اچھے ہیں دیریانِ خرد   مگر نگاہ پجاری کی دل شکار نہیں
خودی کا خون ہو جس سے جو عشق میں ہو نصیب   وہ جیت جیت نہیں ہے یہ ہار ہار نہیں

سنبھل کے اے دلِ ناداں! کہ حُسنِ زہرہ وشاں
ہے نشہ ایسا کہ جس کا کوئی اُتار نہیں

اطالوی آمریّت
(قیام اور مقصد)

از:- سیاسیات

اکرام قمر۔ بی۔ اے۔

اطالوی آمریت کا مطلب یہ ہے کہ اطالیہ میں فسطائیت کے خلاف کوئی جماعت قائم نہیں کی جاسکتی۔ مطبع کی شدید نگرانی کی جاتی ہے۔ سیاسی مخالفوں کو ہر طرح کی اذیت پہنچائی جاتی ہے ہر قسم کی نکتہ چینی کو دبا دیا جاتا ہے۔ عوام مسولینی کو خدا کا فرستادہ سمجھتے ہیں۔ اس کے ہر فعل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ قائد اعظم یعنی مسولینی اپنے مطمح نظر کے مطابق عوام کی رہنمائی کرتا ہے مغربی طرز کی شہری آزادی وہاں مفقود ہے قائد یا جماعت کے فیصلوں کے خلاف کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کی ہر چیز حکومت طلب اور سلب کر سکتی ہے جاسوسوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ انفرادی زندگی ہر وقت خطرے میں ہے۔ حکومت کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی میدان میں بھی سب پر فوقیت حاصل ہے۔ میکاولی کے اس نظریہ پر عمل کیا جاتا ہے کہ ریاست کا استحکام و تحفظ ہی انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے سب ذرائع جائز ہیں۔

جمہوری ریاست میں عدل و انصاف کی حکومت ہوتی ہے۔ غیر جانبدار عدالتیں موجود ہوتی ہیں۔ فرد کی زندگی محفوظ ہوتی ہے۔ وہ حکومت کے ہر فعل پر اپنی رائے کا اظہار آزادانہ طور پر کر سکتا ہے۔ سیاسی مخالفوں کو کسی قسم کے مصائب میں مبتلا نہیں کیا جاتا۔ شخصی ملکیت کا پورا پورا احترام کیا جاتا ہے پارلیمان حاکمیت کی مالک ہوتی ہے۔ اور پارلیمان کے اراکین عوام منتخب کرتے ہیں۔ پارلیمان کی اکثریت پر مشتمل جماعت کابینہ مرتب کرتی ہے جب کابینہ کو پارلیمان کا اعتماد حاصل نہ رہے تو وہ مستعفی ہوجاتی ہے یا نئے انتخابات کئے جاتے ہیں تاکہ رائے عامہ معلوم کی جا سکے۔

آمریت میں ایک فرد یا ایک جماعت حاکم ہوتی ہے۔ اور جمہوریت میں عوام۔ آمریت میں آمر من مانی کارروائی کرتا ہے مگر جمہوریت میں رائے عامہ کے خلاف کچھ اقدام کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ آمریت کی بنا جبر و تشدد پر ہے اور جمہوریت کی بنیاد تلقین و ترغیب اور تعلیم ہے۔

اس تجزیہ کے بعد یہ دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ اطالیہ نے جمہوریت اور آمریت میں سے موخر الذکر کو اختیار کیا ہے لیکن یہ امر کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں کیونکہ اطالیہ میں آمریت کا قیام کوئی نئی چیز نہیں ہے کیونکہ انسانی تاریخ میں سب سے پہلے آمروں کا ذکر تاریخ روما میں ہی پایا جاتا ہے لیکن موجودہ اطالوی آمریت اور قدیم اطالوی آمریت میں یہ فرق ہے کہ ازمنۂ قدیم میں آمر صرف ضرورت کے وقت مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا عہد آمریت ایک معینہ وقت کے لئے ہوتا تھا۔ اور اپنے افعال کے لئے وہ ایک مجلس عامہ یعنی ایوان اعلیٰ کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا مگر موجودہ اطالوی آمر کی حیثیت یہ نہیں۔ یہ توسچ ہے کہ ضروریات زمانہ ہی نے اب بھی اطالیہ میں آمریت قائم کی ہے لیکن موجودہ اطالوی کسی محدود مدت کے لئے حکمران نہیں اور نہ وہ کسی جماعت یا فرد کے سامنے جوابدہ ہے۔ وہ مختار مطلق ہے۔ فسطائی جماعت بھی اسی کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ مقننہ بھی اس کی تجاویز کو منظور کرنے پر مجبور ہے۔ اور بادشاہ بھی اس کے راستے میں مزاحم نہیں ہوسکتا۔

موجودہ اطالوی آمریت کے قیام کو بخوبی سمجھنے کے لئے اطالوی تاریخ پر ایک سرسری سی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ اطالیہ کی تاریخ کن ادوار میں سے گزر کر موجودہ آمریت تک پہنچی ہے۔

یہ امر تاریخی طور پر متین ہے کہ ازمنۂ قدیم میں اطالیہ صدیوں تک ایک عالمگیر شہنشاہیت رہی ہے۔ اور روما دنیا کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ۔ متذکرہ بالا آمر اسی دور میں پائے جاتے ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں سلطنت روما کا زوال شروع ہوگیا۔ اس جگہ اطالیہ کے اس عہد کی تاریخ پر شرح و بسط کے ساتھ تبصرہ کرنا نہ ہمارا مقصد ہے۔ اور نہ ممکن ہے۔ صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ملک میں بدامنی کا دور دورہ تھا۔ شاہی و کلیسائی مساعی کے باوجود ملک میں سکون و نظم قائم نہ ہوسکا۔ ملک تشتت و افتراق کا شکار تھا۔ اور اس کے حصے بکھرے ہوچکے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے اواخر میں یہ امید پیدا ہوچلی تھی کہ ملک ایک بار پھر سلسلۂ اتحاد میں منسلک ہوجائے گا مگر یہ امید عملی صورت اختیار نہ کرسکی خانہ جنگی کی وجہ سے بیرونی ممالک نے اس پر قبضہ کر لیا جو طویل عرصے تک جاری رہا۔ اور انیسویں صدی کے آخر تک اطالیہ کا وجود محض ایک جغرافیائی امر تھا۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں نپولین بونا پارٹ نے اطالیہ کو فتح کر لیا تمام جزیرۂ اطالیہ فرانس کے قبضے میں آگیا۔ اس طرح سے اطالیہ ایک بار پھر متحد ہو گیا لیکن یہ اتحاد عارضی ثابت ہوا اور نپولین کی ناکامی کے ساتھ ہی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا لیکن نپولین کے اس عارضی قبضے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اطالویوں میں متحدہ قومیت کا قدیم جذبہ پھر پیدا ہو گیا۔

۱۸۱۴ء میں ویانا کانگرس کا انعقاد ہوا۔ اس میں یورپ کے نقشے میں ترامیم کی گئیں۔ چونکہ اس کانگرس میں اطالیہ کا کوئی بھی خیر خواہ شریک نہ تھا۔ اس لئے ایک مرتبہ پھر اطالیہ کے ٹکڑے کر دئے گئے۔ صرف سارڈینیا کی سلطنت ایک اطالوی خاندان کے قبضے میں رہی۔ اور اس سلطنت میں سیوائے اور پیڈمونٹ کے علاقے بھی شامل تھے۔ اگرچہ ویانا کانگرس نے اطالیہ کی قطع و برید تو کر دی مگر وہ اطالویوں کے جذبۂ اتحاد کو فنا نہ کر سکی۔

سارڈینیا پیڈمونٹ کے وزیر اعظم "کاوور" نے انیسویں صدی کے وسط میں اس امر کی کوشش کی کہ تمام اطالیہ کو متحد کر دیا جائے جرمنی میں بسمارک کا ظہور بھی تقریباً اسی زمانے میں ہوا یعنی جرمنی اور اطالیہ دونوں میں موجودہ سرگرم قومی تحریکوں کی داغ بیل ایک ہی وقت ڈالی گئی۔ دونوں میں قومی رہنمائی ایک مضبوط ریاست نے لی۔ اطالیہ میں سارڈینیا پیڈمونٹ کی ریاست پیش پیش تھی اور جرمنی میں پروشیا کی بسمارک نے اپنی زندگی ہی میں اپنی مساعی کو ثمر آور دیکھ لیا لیکن کاوور چند مشکلات کی بنا پر اپنی تجاویز کو عملی جامہ نہ پہنا سکا بسمارک کی تجاویز کو ہٹلر نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور کاوور کے تخیل کو مسولینی نے عملی جامہ پہنایا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں دوسرے ممالک کی طرح اطالیہ میں بھی ایک اشتراکی جماعت قائم ہو گئی۔ اشتراکیوں نے عام حق رائے دہی تخفیف اسلحہ تخفیف محاصل اور سماجی اصلاحات وغیرہ کا مطالبہ کیا۔ چونکہ باقی سیاسی جماعتیں کمزور تھیں اور اطالیہ کے یہ مطالبات ہر دلعزیز ہو گئے تھے اس لئے بیسویں صدی کے عشرۂ اوّل میں اشتراکیوں نے کافی طاقت حاصل کر لی۔ اور ایوان زیریں میں ان کی حیثیت ایک اہم گروہ کی ہو گئی۔

۱۹۱۵ء میں اطالیہ جنگ میں شامل ہو گیا۔ اکثر اشتراکی اس کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اطالیہ غیر جانبدار رہے لیکن اشتراکی اخبار "آونتی" کے ایڈیٹر مسولینی کی قیادت میں یہ مظاہرے شروع کر دئے گئے کہ اطالیہ کو جنگ میں ضرور شامل ہونا چاہئے۔ اور اسے انگلستان، فرانس اور روس کی امداد کرنی چاہئے۔ جنگ کی حمایت کے جرم میں مسولینی کو "آونتی" کے ادارہ اور اشتراکی جماعت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس نے نسطائی جماعت قائم کر لی۔ اس میں نوجوان اور طلبہ کی اکثریت تھی۔ انھوں نے شرکت جنگ کا شدید مطالبہ کیا۔ علاوہ ازیں اتحادیوں کی طرف سے فتح کی صورت میں اطالیہ سے بڑے بڑے وعدے کئے گئے۔ اس سے آسٹریا ہنگری کے کئی علاقے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ بعض ایسے اطالوی مدبر بھی تھے جو جنگ یورپ میں نہ صرف قومی فائدے پنہاں دیکھ رہے تھے۔ بلکہ انھیں اس میں قومی اقتدار کا امکان بھی نظر آ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا کر اطالیہ مقتدر اقوام عالم میں جگہ حاصل کرے گا۔ چنانچہ حکومت اطالیہ نے اتحادیوں کی حمایت میں شرکت جنگ کا اعلان کر دیا۔

لیکن اطالیہ کی شمولیت جنگ اس کے لئے نقصان دہ رہی۔ جنگ نے خلاف توقع طول کھینچا۔ جنگ کے جانی و مادی نقصانات اور مصائب عظیم اطالیہ کے لئے پریشان کن ثابت ہوئے۔ قومی خزانے پر بھاری بوجھ آ پڑا۔ اطالیہ کی دولت انحطاط پذیر ہوئی اور اس کا مستقبل کمزور ہو گیا۔ اطالوی فوج نے بھی توقع کے مطابق کارہائے نمایاں سر انجام دئے۔ قوم کی امیدوں کا خون ہو گیا۔ ملک کو جنگ میں بہت ہی کم فائدہ ہوا۔ عوام کا یہ خیال تھا کہ اختتام جنگ پر اطالیہ کو کئی علاقے مل جائیں گے۔ مگر صلح کانفرنس نے اطالیہ کو جو کچھ دیا۔ اس سے ان کی امیدیں پوری نہ ہوئیں یہ خیال عام تھا کہ جنگ کے بعد فیوم۔ ڈالمیشی ساحل البانیہ، مشرق ادنیٰ میں ترکیہ کے کئی علاقے اور افریقہ میں جرمنی کے کئی علاقے اطالیہ کو مل جائیں گے لیکن یہ بڑی بڑی توقعات پوری نہ ہوئیں اور عوام ان لوگوں کے خلاف مشتعل ہو گئے جو اطالیہ کی شمولیت جنگ پر زور دے رہے تھے۔ علاوہ ازیں جنگ کے فوراً ہی بعد کے سالوں میں حکومت کو بہت زیادہ مالی خسارہ ہوا سکے کی قیمت گھٹ گئی۔ اشیاء کی قیمت بڑھ گئی، اور بے کاری عام ہو گئی۔ اطالوی حکومت ان مالی مشکلات سے عہدہ برآ نہ ہو سکی اور کوئی مناسب تجویز نہ پا کر اس نے کاغذی سکوں کی اشاعت شروع کر دی اس تزئید زر سے صورت حالات بد سے بدتر ہو گئی۔

سٹرائکیں عام ہو گئیں۔ ان سٹرائکوں کے نتیجے کے طور پر پولیس، فوجیوں و شہریوں کے درمیان خونیں فسادات رونما ہوئے۔ بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ اقتصادی قوت روز بروز کم ہو رہی تھی۔ اطالیہ کا ہوائی مستقر بند کر دیا گیا۔ پارلیمانی حقیقتیں جاری تھیں۔ وزارتی بحران اکثر وقوع پذیر ہوتے تھے۔ مثلاً چند ماہ کے ہی مختصر عرصے میں تین دفعہ وزارتی تغیرے رونما ہوئے۔ ایوان میں باقاعدہ پانی تک نوبت آ جاتی۔ اندریں حالات لوگ موجودہ نظام حکومت اور پارلیمانی طریق سے تنگ آ چکے تھے۔

مالکوں اور ملازموں میں مناقشات شروع ہو گئے۔ ملک کے جنوبی حصے میں کاشتکاروں نے زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ مزدور کارخانوں پر قابض ہو گئے۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو روسی اصول پر منظم کر لیا۔

ملک میں کوئی بھی مقتدر جماعت موجود نہیں تھی۔ اشتراکیوں نے اس بے چینی

وابتری کے دَور سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی تعداد دیوان زیریں میں کافی تھی۔ انھوں نے اپنی اس طاقت سے پورا استفادہ کیا اور بہت کچھ مراعات حاصل کرلیں۔

یہ امید قائم ہوتی چلی جارہی تھی کہ پرولتاری آمریت جلد ہی اطالیہ میں قائم ہوجائے گی لیکن معتدل اشتراکی اس بات کے لئے تیار نہ تھے اور یہ موقع اشتراکیوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

ہر قوم کی زندگی میں ایسا وقت آیا کرتا ہے۔ جب اسے ایک ایسے عزم راسخ کے مالک انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو قوم کو نئی زندگی بخشے۔ اور اسے قعرِ مذلت سے نکالے۔ ایسے دَور میں پارلیمانی نظام کی سست رفتاری چنداں کارآمد ثابت نہیں ہوتی بلکہ قوم کو ایک ایسے مستقل مزاج۔ روشن ضمیر اور صاحب بصیرت رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو چھوٹے چھوٹے آئین و قوانین کو خاطر میں نہ لائے اور قوم کے مرض کی صحیح تشخیص کرکے درست نسخہ تجویز کرے۔ یہی صورت حال اب اطالیہ میں پیدا ہوچکی تھی اور تکمیل ضروریات کے قانون نے اطالیہ کو مسولینی دے دیا۔

جیسا کہ قبل ازیں کہا جاچکا ہے۔ اوائل جنگ کے زمانے میں مسولینی نے اپنی فسطائی جماعت قائم کرلی تھی۔ اسے جنگ کی حمایت کے جرم میں اشتراکی جماعت سے خارج کردیا گیا تھا۔ چونکہ مسولینی کی فسطائی جماعت کا مقصد صرف یہ تھا کہ اطالیہ کو اتحادیوں کی امداد پر مجبور کیا جائے۔ اس لئے اطالیہ کی شرکتِ جنگ کے بعد اس جماعت کے زندہ رہنے کا کوئی مقصد نہ تھا لیکن میثاق متارکہ کے بعد یہ جماعت ' فسطائی مجلس حربیہ' کے نئے نام کے ساتھ مسولینی کی زیر قیادت دوبارہ قائم ہوگئی۔

جنگ عظیم کے بعد کے بدنظمی کے دور میں اطالیہ کے لئے صرف دو ہی راستے تھے یا تو وہ روس کی تقلید کرے اور یا سرخ انقلاب کی بجائے سیاہ فسطائی انقلاب کیا جائے۔ چند ہفتوں تک اطالیہ میں یہی خیال عام رہا کہ پرولتاری آمریت کا قیام یقینی ہے۔ مگر انجام کار میدان سیاہ پوش فسطائیوں کے ہاتھ رہا۔

فوجی عناصر اتحاد و یک جہتی کی خوب صورت عمارت ملک میں تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ ملک میں تشتت و افتراق کا دور دورہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد چونکہ اطالیہ کی توقعات برنہ آئی تھیں اس لئے اطالوی عوام اشتراکیوں کے زیر اثر آچکے تھے جو جنگ میں عدم مداخلت کے حامی تھے۔ چنانچہ فاتح پلٹنوں کے جھنڈوں کو کسی قسم کی سلامی نہ دی گئی اور نہ فوجیوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ بلکہ جب فوجی میدان جنگ سے لوٹے تو ان پر آوازے کسے گئے۔ بازاروں میں فوجی حکام کی محض اس لئے بے عزتی کی گئی۔ اور انھیں زدوکوب کیا گیا کہ وہ کیوں فوجی وردی پہنے ہوئے ہیں۔ اس لئے حکومت نے یہ فرمان جاری کردیا کہ کوئی شخص فوجی وردی پہن کر بازار میں نہ نکلے۔ اندریں حالات فوجیوں کا اشتراکیوں کے خلاف ہوجانا قدرتی تھا۔ مسولینی نے انھیں فسطائی مجلس حربیہ میں شرکت کی دعوت دی۔ تاکہ بعد از جنگ کے اطالوی مسائل کو سلجھانے کے لئے کوئی تنظیم کی جاسکے۔ چنانچہ سابق فوجیوں نے کثیر تعداد میں اس دعوت پر لبیک کہا۔

۱۹۲۰ء میں جب کہ بدامنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور حالات نازک صورت اختیار کرتے چلے جارہے تھے اکثر رجعت پسند اطالوی بھی فسطائی جماعت میں داخل ہوگئے تاکہ سٹرائکیں کرانے والے اشتراکیوں کا استیصال کرکے ملک میں امن قائم کیا جاسکے۔

متوسط طبقہ کو اشتراکی جماعت پرولتاری درجے پر لانا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے متوسط طبقے کا فسطائی ہوجانا یقینی تھا۔ چونکہ فسطائیت شخصی ملکیت کی حامی تھی۔ اس لئے سرمایہ دار بھی اس کے ساتھ ہوگئے خوش حال مزدوروں نے اس کی امداد کی۔

چونکہ فسطائی رضا کار اشتمالی سٹرائکوں کو ناکام کرنے کے لئے نہایت تن دہی سے کام کرتے تھے اس لئے مالکوں نے فسطائیت کو اشتمالیت کے خلاف سمجھا اور اس کی مالی امداد کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فسطائی جماعت کی تعداد میں روز بروز اضافہ شروع ہوگیا مسولینی کو نجات دہندہ تصور کیا جانے لگا۔ تمام ملک میں اس جماعت کی شاخیں قائم ہوگئیں سیاہ پوش نوجوان فسطائیوں نے اشتمالیت کے استیصال پر کمر باندھ لی۔ مرکزی حکومت بے اثر و ناکارہ ہوچکی تھی۔ وہ مالکوں اور مزدوروں کے مناقشات کو سلجھا نہ سکی اور نہ اشتمالیوں اور فسطائیوں کے جھگڑے کو نپٹا سکی فسادات شروع ہوگئے۔ گلی کوچوں میں خون بہنے لگا متعدد ہلاک اور مجروح ہوئے۔ اس گوریلا جنگ میں فسطائیوں کو فتح ہوئی۔

اشتراکی صفوں میں انتشار پیدا ہوچکا تھا حکومت کمزور ہوچکی تھی عوام امن و قانون کے قیام کے خواہاں تھے فسطائیت قومی جذبات کی مظہر۔ اتحاد کی علم بردار، امن کی خواہاں مستحکم حکومت قائم کرکے زوال پذیر سلطنت کو حیات جدید بخشنا چاہتی تھی۔ اس لئے عوام نے اسے قبول کرلیا۔ اور صنعتی انجمنوں نے اس کی مالی امداد کی۔

اطالوی قوم مضبوط اور وسیع النسل ہے۔ اسے خام اجناس برآمدات منڈیوں اور آبادی کی افراط کی بنا پر نئے علاقوں کی ضرورت تھی مگر اطالوی حکومت ٹرینٹ اور ٹریسٹی کے اطالوی علاقے بھی یوگوسلاویا کے قبضے میں دیئے کو تیار تھی۔ اور جب دالمیشیا اور فیوم سے بھی اطالیہ کو محروم کردیا گیا تو ملک کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا قوم میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی فسطائیوں نے مرکزی حکومت کا پوری طرح سے مقابلہ کیا۔ اس کی دھمکیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے فیوم اور دالمیشیا کو اطالیہ کے

ہاتھوں سے نہ جانے دیا اس لئے وہ اور بھی مقبول ہو گئے۔

لوگوں میں اشتراکیت کے خلاف احساسات پیدا ہوتے چلے جا رہے تھے۔ عوام میں پہلے پہل تو اشتراکیت کافی ہر دلعزیز ہو گئی تھی لیکن اطالیہ کا ایک وفد روس گیا اور اس نے آکر روس کی اقتصادی بدحالی کا نقشہ پیش کیا۔ عوام کو جو توقعات اشتراکیت سے تھیں وہ وفد کی اس رپورٹ پر ختم ہو گئیں۔

بلونا کے ایوان بلدیہ میں ایک المناک حادثہ پیش آیا۔ ایوان کے باہر عوام کا ہجوم ہو گیا۔ اشتراکیوں نے اس ہجوم کو فسطائی خیال کیا اور اس پر دستی بم پھینکے۔ بلونا میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ عوام اشتراکیت کے خلاف ہو گئے۔

میلان میں بھی اسی قسم کا خون آشام المیہ پیش آیا۔ اشتمالیوں نے تیاتر پر ایک بم پھینکا۔ اس تیاتر میں پر امن شہری تماشائیوں کا اجتماع تھا بیس اشخاص ہلاک اور پچاس ناکارہ ہو گئے۔ تمام میلان میں اشتعال، غصہ اور انتقام کے جذبات پیدا ہو گئے عوام نے اشتراکی جریدۂ "آونتی" کے دفتر پر حملہ کر کے اسے جلا دیا۔

اس قسم کے واقعات سے عوام کے دلوں میں اشتراکیت سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اور اس کی ہر دلعزیزی کا خاتمہ ہو گیا۔

ان وجوہ کی بنا پر فسطائیت کامیاب ہو گئی اور اس نے اطالیہ کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کا ارادہ کر لیا۔

جب مسولینی نے اپنی جماعت کو کافی مضبوط پایا تو اس نے سنہ ۱۹۲۲ء میں حکومت سے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ یا تو فسطائی وزارت قائم کی جائے۔ اور یا نیا انتخاب کیا جائے۔ حکومت ابھی تک تذبذب کی حالت میں تھی کہ مسولینی نے تمام فسطائیوں کو روما کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں ملک کے ہر حصے سے سیاہ پوش جتھے روما کے تاریخی شہر میں پہنچ گئے —— اور اس جادووانی شہر نے ایک اور انقلاب دیکھا! —— انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ حکومت فسطائیوں کے سپرد کر دی جائے۔

چنانچہ مسولینی کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اس نے مخلوط وزارت قائم کر لی۔ بعد ازیں اس نے ایوان نمائندگان کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے نظام جدید کی حمایت نہ کی تو اسے توڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ ایوان نے مسولینی کے احکام کی فوراً تعمیل کر دی اور اس کی ہر تجویز پر صاد کر دیا۔

عنان حکومت سنبھالتے ہی مسولینی نے مزدوروں کو یقین دلایا کہ ان کے جائز حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ چنانچہ بعد میں اس نے آٹھ گھنٹے کا دن مقرر کر دیا اس طرح سے مزدوروں کا اعتماد بھی حاصل کر لیا گیا۔

مسولینی نے کچھ عرصہ بعد اپنی کابینہ میں سے غیر فسطائی عناصر کو خارج کر کے خالصۃً فسطائی کابینہ مرتب کر لی۔ وہ اس اصول پر کاربند ہے کہ ہر سرکاری عہدہ کے مستحق صرف فسطائیین ہیں۔ چنانچہ زمۂ دار عہدے فسطائیوں ہی کے قبضے میں ہیں مسولینی نے ہر اطالوی کے دل میں حب الوطنی کا جارحانہ جذبہ پیدا کر دیا ہے ہر اطالوی شوکت رفتہ اور سلطنت گزشتہ کو قائم کرنا چاہتا ہے۔

مسولینی نے فسطائی تحریک ذاتی خواہشات کی بنا پر شروع نہیں کی۔ وہ صرف اطالیہ کو طاقتور مضبوط اور باوقار بنانا چاہتا ہے۔ وہ قدیم سلطنت روما کو پھر قائم کرنے کا خواہشمند ہے۔ وہ اطالیہ کو قومی اتحاد کے ارتفاع پر پہنچانا چاہتا ہے اور اطالیہ میں نشاۃ ثانیہ کا خواہاں ہے۔ اسے نوجوان طبقے کا اعتماد حاصل ہے۔ اصلاحی قوانین بنا کر اس نے مقبولیت حاصل کر لی ہے حتیٰ کہ اس کے سیاسی مخالف بھی ان اصلاحی قوانین کے معترف ہیں۔ اس نے اپنی قوم میں خودداری اور قوم پرستی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنی ذات پر اطالیہ کو ترجیح دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اطالوی قوم اسے عزیز سمجھتی ہے۔ اسے مسولینی پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ اس کے ہر اقدام کی تائید کرتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ مسولینی کا ہر فعل اطالوی مفاد کے لئے ہوتا ہے اور وہ اطالوی تہذیب و تمدن اور اثر و اقتدار کو عالمگیر بنانا چاہتا ہے۔

فسطائی آمریت کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ اس نے حبشہ کو غصب کر لیا۔ البانیہ کو ہڑپ کر لیا۔ مصر کے سکون کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ اور اب جرمنی کے دوش بدوش اس نے دنیا کے خرمن امن کو خونیں آتش کے سپرد کر دیا ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ صرف اطالیہ کی ایک اقلیت ہی برسر جنگ ہے ہر اطالوی پر سیزری شہنشاہیت دوبارہ قائم کرنے کا جنون سوار ہے وہ اپنے جنگ عظیم کے نقصانات کی تلافی چاہتا ہے اس لئے موجودہ جنگ ہر اطالوی کی حقیقی ذہنیت و فطرت کی صحیح آئینہ دار ہے۔

خون و آتش سے کھیلنے والے آمروں ہٹلر اور مسولینی نے دنیا کے امن کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ان کا وجود دنیا کے امن کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا ہے۔ وہ جوع الارض میں مبتلا ہیں اور حصول اقتدار کے نشے میں انسانیت کے سر قانون کو چکنا چور اور کمزور ملکوں کو ذرت کے گھاٹ اتارنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے حبشہ، البانیہ زیکوسلاویکیا، آسٹریا، پولینڈ، ناروے، بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، فن لینڈ اور رومانیہ کی بے گور و کفن لاشیں انسانیت کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ خدا جانے کہ ان نوحہ خوانوں کی رحم آفریں فہرست میں اور کون کون سے نحیف و نزار ممالک شامل ہوں گے۔

قوم پرستی کا جذبہ کوئی بری چیز نہیں۔ مگر اس جذبہ کو جس رنگ میں ان دو آہنیں شخصوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سے یہ جذبہ بدنام ہو گیا ہے اسے انسانیت کش تصور کیا جانے لگا ہے ہر شخص اس جارحانہ جذبے سے متنفر ہو گیا ہے۔ دنیا امن کی جستجو میں ہے۔ امن سوز دل نے اس کے ذہن کو ماؤف قلب کو

مفلوج، قویٰ کو مضمحل، اور سینے کو چھلنی کر دیا ہے۔ یہ قوم پرستی کے اس خون آشام دام سے نکلنا چاہتی ہے۔ دنیا کی اس ذہنی الجھن کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کا جواب مستقبل کی تاریخ دے گی کچھ عرصے تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بین الاقوامیت کی دعوے دار۔ روس کی پرولتاری آمریت اس پیچیدگی کا صحیح حل ہے مگر اس نے اپنے مبیّنہ "بین الاقوامی" نظریات کو بالائے طاق رکھ کر ان جارحانہ قوم پرستی کے جذبات کے علم برداروں کے ہاتھوں کو کمزور کرنے کی بجائے اور مضبوط کر دیا ہے

دنیا ابتدائے آفرینش سے خونیں ادوار میں سے گزر رہی ہے۔ ان خون آشامیوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ مستقبل ظاہر کرے گا۔

نیازگاہِ محبّت

از:-
بزمی انصاری بی۔ اے

مجھے اجازتِ فریاد و اذنِ آہ نہیں ۔۔۔ اور اس عتاب پہ یہ حکم ہم کو چاہ نہیں
چھپاؤں کیوں کسی محرم سے رازِ دل اپنا ۔۔۔ کہ اعترافِ محبّت کوئی گناہ نہیں
غلط ہے میں نے کیا تیرے عشق کا چرچا ۔۔۔ خدا گواہ ہے بندے اگر گواہ نہیں
ترے حضور نے بخشی وہ شانِ استغنا ۔۔۔ کہ اب مجھے کوئی پروائے مہر و ماہ نہیں
اسی میں بستے ہیں ارمان و آرزو اب بھی ۔۔۔ یہ دل حرم ہے محبّت کی قتل گاہ نہیں
بدل گیا ہے زمانے کے انقلاب سے تو ۔۔۔ کہ مملکت تو وہی ہے وہ پادشاہ نہیں
ہے میرے دل میں وہی سوزِ اندروں باقی ۔۔۔ جنوں میں تیرے مگر جوش بے پناہ نہیں
تری نظر میں نہیں اب وہ شعلہ سامانی ۔۔۔ ترے حسین ترنّم میں سوزِ آہ نہیں
مجھے خیال یہی ہے کہ خام کار ہے تو ۔۔۔ مقامِ عشق سے واقف تری نگاہ نہیں
تجھے بھی یونہی رہے آبروئے عشق عزیز ۔۔۔ یہ جام وہ ہے جو آلودۂ گناہ نہیں
گداز و سوز کرے روح سنگ میں پیدا ۔۔۔ نوائے شوق ہے آوازِ خانقاہ نہیں
جو پار کر نہ سکے پردۂ طلسمِ خرد ۔۔۔ وہ عشق عشق نہیں وہ نگہ نگاہ نہیں
کریں جو رحم تو یہ آپ کی عنایت ہے ۔۔۔ گلیم پوش ہوں میں صاحبِ کلاہ نہیں
قبول کیسے ہو مبّت کے حضور میری دعا ۔۔۔ نیازگاہ محبت ہے بارگاہ نہیں

عِلاج

ایک ایکٹ کا ڈراما

از:۔
میرزا ادیب بی۔ اے (آنرز)

کردار ——————
ڈاکٹر ——————
صفدر —————— مریض
نوردین —————— ڈاکٹر کا خادم
منظر —————— ایک کمرہ

(ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر۔ نوردین، او نوردین!!

نوردین۔ (باہر سے) آیا سرکار!

(نوردین آتا ہے)

ڈاکٹر۔ کہاں تھے تم؟

نوردین۔ صفدر میاں کے پاس بیٹھا تھا سرکار!

ڈاکٹر۔ وہاں بیٹھنے کی ضرورت۔ ڈاکٹر احمد یار کے یہاں گئے تھے؟

نوردین نہیں سرکار! وہاں جا ہی نہیں سکا۔ جب سے صفدر میاں آئے میں انہی کے پاس بیٹھا رہا ہوں سرکار! اگر ان کو بار بار ٹھہرنے پر مجبور نہ کرتا۔ تو وہ اب تک چلے گئے ہوتے۔ دو مرتبہ ان کی بیگم صاحبہ بھی ٹیلیفون پر تاکید کر چکی ہیں کہ جب تک ڈاکٹر صاحب نہ آئیں۔ ان کو جانے نہ دوں۔ بس یہی وجہ تھی سرکار کہ میں ان کے پاس بیٹھا رہا —————— اللہ کیا کہوں سرکار! کئی مرتبہ اٹھ کر چلنے پر تیار ہو گئے۔ بڑی مشکل سے بٹھایا۔ طرح طرح کے بہانے کئے۔ ان کی بیگم صاحبہ ——————

ڈاکٹر۔ تو اب بیٹھے ہیں یا چلے گئے۔

نوردین۔ بڑی مشکل سے انھیں بٹھایا ہے سرکار!

ڈاکٹر۔ کس کمرے میں ہیں۔

نوردین غسل خانے کے ساتھ کے کمرے میں۔

ڈاکٹر غسل خانے کے ساتھ کے کمرے میں؟ وہ کیوں۔ ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں لے گئے؟

نوردین سرکار! انھیں ڈرائنگ روم میں کیونکر بٹھاتا۔ میں نے تو کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ڈرائنگ روم میں ایک مریض کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں جھوٹ بولنا پڑا سرکار! مگر کیا کرتا۔ مجبوری تھی۔

ڈاکٹر۔ بڑے چالاک ہو —————— اب انھیں جا کر کہہ دو۔ میں دو تین منٹ تک آ جاؤں گا ہاتھ دھولوں —————— ہاں انھیں لے آؤ۔ ادھر

نوردین۔ بہت بہتر سرکار!

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

نوردین۔ لیجئے سرکار! ان کی بیگم صاحبہ نے پھر یاد فرمایا۔ کہہ دوں ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ کوئی فکر نہ کریں۔

ڈاکٹر۔ میں خود کہے دیتا ہوں بھئی (رسیور اٹھا کر کہتا ہے) ہیلو! کون مسز صفدر۔ ہیں۔ جی ہاں میں آگیا ہوں —————— بڑی مشکل سے آپ نے بھیجا ہے انھیں —————— وہ کیوں؟ —————— خیر اب فکر نہ کریں مرض دور ہو جائے گا —————— ابھی شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ —————— ہاں آپ خوش خبری ہی سنیں گی (رسیور رکھ دیتا ہے۔ صفدر آتا ہے)

ڈاکٹر۔ آہا ہا۔ مسٹر صفدر میں بھئی سب سے پہلے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ کہ آپ کو دیر تک زحمت انتظار اٹھانی پڑی۔

صفدر۔ کوئی بات نہیں۔ مگر میں آپ کی خدمت میں یہ عرض ضرور کروں گا کہ اپنے گستاخ نوکر کو برطرف کر دیں سخت بد اخلاق ہے شریفوں کے ساتھ بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے آپ کا ہر ایک دوست اس کا شاکی ہو گا۔

نوردین۔ میں نے کیا کیا حضور! آپ کو ٹھہرنے کے لئے کہا۔ یہی میرا قصور ہے؟

ڈاکٹر۔ بکو نہیں۔ نکل جاؤ فوراً —————— معاف کیجئے مسٹر صفدر!

(نوردین چلا جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ فرمائیے۔ کیا حال ہے طبیعت کا؟

صفدر۔ زندہ ہوں۔

ڈاکٹر۔ ادھر آکر کوچ پر بیٹھ جائیے۔ اب بتائیے کیا شکایت ہے؟

صفدر۔ (کوچ پر بیٹھتے ہوئے) بالکل تندرست ہوں۔

ڈاکٹر۔ ہاضمے کا کیا حال ہے۔ سر میں درد تو نہیں رہتا۔

صفدر۔ آپ نے صرف اسی مقصد کے لئے مجھے بلایا تھا؟

ڈاکٹر۔ آپ جانتے ہیں مسٹر صفدر! ہم ڈاکٹر لوگ تو روحانیت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ یہ ہمارے بس کا روگ ہے۔ جسم ہی کے متعلق جانتے ہیں۔ اور اسی کی گفتگو کرتے ہیں۔

صفدر۔ فی الحال تو مجھے کوئی شکایت نہیں کسی قسم کا عارضہ ہوتا تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ آپ ملک کے نامور ڈاکٹر ہیں۔ اور خوش قسمتی سے میرے دوست بھی ہیں۔ آپ کی ذات سے فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑی بدقسمتی ہے۔

ڈاکٹر۔ ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر اس وقت زیادہ شکرگزار ہوں گا۔ جب آپ اپنی کیفیت بے کم و کاست بتا دیں گے۔

صفدر۔ جب بیمار نہیں تو پھر کیفیت بتانے کا مطلب؟

ڈاکٹر۔ آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ دنیا میں بعض لوگ تخیل پرست ہوتے ہیں جو تخیل کی رنگینیوں میں کھو کر خود کو مادی دنیا کے حقائق سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اور سوسائٹی ان کے وجود سے فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹا نقصان اٹھاتی ہے۔ اور معاف کیجئے، میرا خیال ہے۔ آپ بھی ان ہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں میں دیکھتا ہوں آپ کے چہرے کی علامتیں آپ کی کمزور صحت کی چغلی کھا رہی ہیں۔ پھر بھی آپ اپنی حالت پر مطمئن ہیں۔ اور اس اطمینان کا دوسروں کو بھی یقین دلانا چاہتے ہیں۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔

صفدر۔ آپ سے کس نے کہا میں بیمار ہوں؟

ڈاکٹر۔ مجھ سے کس نے کہا۔ اس سوال کا مقصد؟

صفدر۔ بعض لوگوں کو میرے متعلق وہم سا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر۔ کیسا وہم؟

صفدر۔ یہی کہ میں بیمار ہوں کسی خطرناک مرض کا شکار ہوں (ہنستا ہے)

ڈاکٹر۔ ممکن ہے ان کا خیال صحیح ہو۔ آپ مہربانی کر کے اپنی تمام شکایتیں بیان کریں۔

صفدر۔ کوئی شکایت ہو تو بیان کروں فضول باتیں کرنے سے فائدہ میری صحت بہت اچھی ہے۔ نہ سر میں درد ہے۔ اور نہ پیٹ میں کوئی تکلیف۔ کھانا بھی باقاعدہ ہضم ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر۔ دل کی دھڑکن کا کیا حال ہے؟ (بلند آواز سے) نوردین، او نوردین!

نوردین۔ (دور سے) جی سرکار!

ڈاکٹر۔ کیا کر رہے ہو؟

نوردین۔ ننھے کو کپڑے پہنا رہا ہوں۔

ڈاکٹر۔ اچھا میں خود ہی جاتا ہوں۔ ایک منٹ انتظار کریں!

(وقفہ ڈاکٹر لوٹ کر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سٹیتھ سکوپ ہے)

ڈاکٹر۔ مسٹر صفدر! اپنی قمیص اتار دیجئے ——— رات کو کھانسی۔ یا کوئی اور تکلیف؟ ——— صاف صاف کہئے۔

صفدر۔ ڈاکٹر صاحب معاف کیجئے۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ مجھے کوئی بیماری ویماری نہیں

ڈاکٹر۔ تشخیص کے بعد آپ کی رائے کی تائید یا تردید کر سکوں گا۔ لیٹئے صاحب!

صفدر۔ مگر ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ وقت نہ ضائع کیجئے مسٹر صفدر! آپ جانتے ہیں میرا وقت کتنا قیمتی ہے۔

صفدر۔ تو کیجئے اپنا کام۔ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ اچھا رخصت۔ جلد ملنے کی کوشش کروں گا۔ آنے سے پہلے فون کر دوں گا۔

ڈاکٹر۔ ٹھہرئیے صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں میرے عزیز دوست! یہ رویہ آپ کے شایان شان نہیں میری باتیں آپ کو صرف ایک دومنٹ کے لئے پریشان کریں گی۔ اس کے بعد آپ تشریف لے جائیں نسخہ تیار کرا کر بھجوا دوں گا۔ اتارئیے قمیص۔

صفدر۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے ——— آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ کی اس حرکت سے مجھے کتنی تکلیف پہنچی ہے۔

(وقفہ)

صفدر۔ ڈاکٹر صاحب! میں اصل بات بتاتا ہوں سٹیتھ سکوپ کو پرے رکھ دیں۔

ڈاکٹر۔ اچھا فرمائیے۔

صفدر۔ مجھے کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں ہے ——— بات اتنی ہے۔ میں ہر وقت پریشان رہتا ہوں۔ یہ ہے میری بیماری، یا جو کچھ سمجھ لیجئے۔

ڈاکٹر۔ آپ فکرمند رہتے ہیں؟

صفدر۔ جی ہاں

ڈاکٹر۔ تو آپ کو کچھ عرصہ پیشتر کوئی جانکاہ صدمہ پہنچا ہو گا۔ آپ نے کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کی ہو گی۔ مگر وہ چیز آپ کو ملی نہ ہو گی

صفدر۔ یہ بات بھی نہیں۔ میرا بچپن ناز و نعم میں بسر ہوا کسی فکر یا رنج کا سایہ تک بھی میرے دماغ پر نہ پڑا۔ جوان ہوا تو ایسی عورت سے شادی ہو گئی جو

میری آرزوؤں کا مرکز بھی۔ میں ہوس اور لالچ سے سخت متنفر ہوں۔ ان حالات میں آپ سمجھ سکتے ہیں۔ مجھے کیا صدمہ پہنچ سکتا ہے؟

ڈاکٹر۔ میرے دوست کسی چیز کو چھپانے کی کوشش نہ کرو تمھیں ضرور کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہوگا۔

صفدر۔ سچ کہتا ہوں ڈاکٹر صاحب! مجھے آج تک کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ زندگی کی جدوجہد میں مجھے بہت کم حصہ لینا پڑا ہے۔ کیونکہ والد کی موت نے مجھے فکرِ معاش سے آزاد کر دیا۔ اور آج کل فکرِ معاش ہی سب سے بڑی فکر ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر۔ تو آپ محسوس کیا کرتے ہیں؟

صفدر۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ایک بھیانک اور تاریک غار ہے۔ جس میں ہم انسان پابجولاں تڑپ رہے ہیں۔ اور یہ تڑپ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک زندگی کا رشتہ منقطع نہ ہو جائے "شوپنہار" بالکل سچ کہا ہے کہ "انسان محض مجبور" ہے۔ قدرت اس کے ساتھ مذاق کرتی ہے، اسے کھلونا سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلتی ہے۔ اس کی آرزوؤں اور آرزؤں کو بے رحمی سے مسل کر قہقہے لگاتی ہے!

ڈاکٹر۔ ہوں ہوں، کہتے جائیے۔

صفدر۔ یہ میر تقی نے اس خیال کو بڑے خوب صورت انداز میں نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ڈاکٹر۔ آپ نے شوپنہار کا خوب مطالعہ کیا ہے۔

صفدر۔ میں نے اس کی تمام کتابوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر۔ تو صرف اسی فلسفی نے آپ کے دل و دماغ پر زیادہ اثر ڈالا ہے؟

صفدر۔ جی ہاں۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کہا ہے۔ بالکل بجا کہا ہے۔

ڈاکٹر۔ کاش میں بھی اس کا مطالعہ کر سکتا۔ آپ لوگ بہت خوش نصیب ہیں کہ مطالعے کے لئے آپ کو فرصت ہی فرصت ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ کتابوں کے لئے ترستے رہتے ہیں۔

صفدر۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔

ڈاکٹر۔ ایک بات اور ——— اس کے بعد آپ کو جانے کی اجازت ہے۔

صفدر۔ فرمائیے۔

ڈاکٹر۔ آپ مجھے کس قسم کا دوست سمجھتے ہیں۔

صفدر۔ نہایت مخلص دوست۔

ڈاکٹر۔ بہت بہت شکریہ۔ گویا آپ مجھے اپنا حقیقی ہمدرد سمجھتے ہیں۔

صفدر۔ اس میں کیا شک ہے؟

ڈاکٹر۔ جب یہ بات ہے تو فرمائیے۔ اس وقت آپ کی سب سے بڑی آرزو کیا ہے؟

صفدر۔ میرے دماغ میں تو کوئی چھوٹی سی آرزو بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے حقیقی ہمدرد نہیں سمجھتے؟

صفدر۔ کیوں نہیں سمجھتا؟

ڈاکٹر۔ تو پھر بتائیے میرے دوست! انسانی زندگی آرزوؤں کا ہی نام ہے جب یہ آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں۔ تو زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آپ بھولتے ہیں آپ کے دل میں بے شمار آرزوئیں موجود ہوں گی۔ اپنے دل کو ٹٹولئے۔ دیکھئے اس کی گہرائیوں میں کتنے شعلے لپک رہے ہیں۔

صفدر۔ ڈاکٹر صاحب آپ پریشان کرتے ہیں!

ڈاکٹر۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ تاہم مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے

صفدر! تم نے اب تک میری دوستی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تم نے اب تک محسوس نہیں کیا کہ میرے دل میں تمھاری کتنی قدر و منزلت موجود ہے۔

صفدر۔ مجھے اس کا احساس ہے ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ اگر احساس ہے تو مجھے اپنے دل کے قریب ہونے کا موقع دو۔ مجھے بتائیے تمھارے دل میں کیا کچھ ہے۔

صفدر۔ ڈاکٹر صاحب! ایک آرزو ہے۔ مگر بہت عجیب۔

ڈاکٹر۔ کوئی بات نہیں۔ میں یہ نہیں پوچھنا چاہتا کہ وہ آرزو کس قسم کی ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ آرزو ہے کیا؟

صفدر۔ کیا کہوں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ جرأت سے کام لو۔

صفدر۔ میں چاہتا ہوں کہ ——— دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ ایک لمبی خواب میں کھو جاؤں۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں۔ دنیا ایک تنگ و تاریک غار ہے جس میں ہم پابجولاں تڑپ رہے ہیں

ڈاکٹر۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ دنیا میں ہزاروں لوگ ایسے موجود ہیں جنکی آرزوئیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ موت کی آرزو تو بہت ہی عام۔ میرے پاس ہزاروں مریض آتے ہیں۔ اور ان میں سے پانچ فی صد ایسے ہوتے ہیں جو طویل بیماری کے ہاتھوں تنگ آکر موت کی آرزو کرتے ہیں۔

صفدر۔ اچھا، اب رخصت۔

ڈاکٹر۔ ہوں، ——— اوہ۔ معاف کیجئے۔ چائے کا وقت ہو گیا ہے

آپ متعجب ہوں گے۔ مگر میں اسی وقت چائے پیا کرتا ہوں۔ عادت سی ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ شریک ہوں گے۔

صفدر۔ بس شکریہ، اب مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔

ڈاکٹر۔ کوئی بات نہیں۔ چائے کی ایک پیالی پی لیں تو کیا حرج ہے۔

(ڈاکٹر باہر جاتا ہے —— مگر جلد واپس آجاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (قریب آکر) موت کی آرزو ہے بڑی عجیب۔

صفدر۔ جی

(نوردین چائے کا سامان لے کر آتا ہے)

نوردین۔ لیجئے، سرکار! اسی ٹیبل پر رکھ دوں۔

ڈاکٹر۔ نہیں اس ٹیبل پر رکھو۔

(نوردین چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر چائے بناتا ہے)

ڈاکٹر۔ شکر کے دو چمچ مسٹر صفدر؟

صفدر۔ ہاں دو چمچ

ڈاکٹر۔ بہتر۔

(دونوں پیالیوں کو لبوں سے لگا لیتے ہیں)

(وقفہ)

صفدر۔ (خالی پیالی میز پر رکھ کر) اچھا میں اب جاتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ کہاں جانے کا ارادہ ہے۔

صفدر۔ گھر جاؤں گا۔

(نوردین آتا ہے)

ڈاکٹر۔ دیکھو نوردین! ان تمام کاموں کا خیال رکھنا۔ تم بڑے غافل ہو اور کہیں برتن نہ گرا دینا۔ آہستہ آہستہ اٹھاؤ۔ میرے دوست تمھاری بے حیا شکایت نہیں کرتے۔

(نوردین برتن اٹھا کر چلا جاتا ہے)

صفدر۔ خیال ہے میں کل شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں گا۔

ڈاکٹر۔ کل شام کو دیکھتا ہے) چند منٹ کی بات ہے — یہیں ٹھیریئے۔

صفدر۔ چند منٹ کی بات۔ کون سی بات؟

ڈاکٹر۔ آپ کی آرزو کے پورا ہونے کی بات۔

صفدر۔ کیا مطلب؟

ڈاکٹر۔ بھولے کیوں بنتے ہیں۔ آپ نے ابھی ابھی ایک ایسی آرزو کا اظہار کیا۔ جو ہر وقت آپ کو مضطرب رکھتی ہے۔ اور میں نے بحیثیت ایک دلی ہمدرد ہونے کے اس آرزو کے پورا ہونے کا انتظام کر دیا۔

صفدر۔ کیا کہا؟

ڈاکٹر۔ میرے دوست! تم نے ابھی ابھی کہا میں مرنا چاہتا ہوں کیونکہ دنیا ایک تنگ و تاریک غار ہے جس میں ہم پابجولاں تڑپ رہے ہیں میں نے تمھیں اس تنگ و تاریک غار سے نکالنے کے لئے بہت سہل طریقے پر عمل کیا ہے۔ نہ کوئی تکلیف۔ نہ کوئی کوفت۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے دنیا کو الوداع کہہ دیں گے۔

صفدر۔ مجھے مار ڈالنے کا ارادہ ہے —— مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو؟

ڈاکٹر۔ اب تو ارادے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تم ابھی آخری سفر پر روانہ ہو جاؤ گے یہ تمھاری زندگی کے آخری لمحے ہیں۔ خوش قسمت ہو کہ اس طرح تمھاری سب سے بڑی آرزو پوری ہو رہی ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ ورنہ یہی موت پسند کرتا۔

صفدر۔ میرے آخری لمحے۔ یہ کیونکر —— تم کیا کہہ رہے ہو۔

ڈاکٹر۔ مسٹر صفدر، سنو۔ تمھاری آرزو کو پورا کرنے کے لئے میں نے چائے کی پیالی میں ایک ایسا سفوف ڈال دیا تھا۔ جو پیٹ میں جانے کے چند منٹ بعد زندگی کی تمام قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا ہے۔ اور مزہ یہ کہ مرنے والے کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مر رہا ہے۔ مرنے سے پہلے تم پر دو کیفیتیں طاری ہوں گی۔ ابھی ابھی تمھارے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگے گا۔ اس کے بعد پیٹ میں بوجھ سا محسوس ہوگا۔ پھر تم دنیا کے تنگ و تاریک غار سے نکل جاؤ گے۔ تمھاری روح ایک نئی دنیا میں پرواز کرنے لگے گی۔ کیوں، میرے شکر گزار ہو نا ؟

صفدر۔ تم نے مجھے زہر پلا دیا؟

ڈاکٹر۔ زہر تو نہیں، البتہ ایک ایسا سفوف پلا دیا ہے جو زندگی کو چند منٹ کے اندر ختم کر دیتا ہے۔ یہ سفوف دنیا میں صرف چند دکانوں پر ملتا ہے

صفدر۔ مذاق کر رہے ہو؟

ڈاکٹر۔ مذاق؟ وہ کیوں؟ میرے دوست! تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں میں نے آج تک کسی شخص سے بھی مذاق نہیں کیا۔

صفدر۔ نہیں کیا ہوگا۔ مگر اب کر رہے ہو۔

ڈاکٹر۔ چند منٹ کے بعد تمھیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کیا تمھارے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا ہے؟

صفدر۔ نہیں تو۔

ڈاکٹر۔ تو ابھی محسوس کرنے لگو گے۔

صفدر۔ ڈاکٹر! کیا تم نے سچ مچ مجھے زہر پلا دیا ہے۔

ڈاکٹر۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمھاری خواہش پوری کردی۔

صفدر۔ مرنے کی خواہش

ڈاکٹر۔ تم نے اسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ بھول گئے؟

صفدر۔ ڈاکٹر یہ بتاؤ۔ یہ ڈراما کب ختم ہوگا۔ بڑے ستم ظریف ہو۔ تمھارا آج کا مذاق واقعی قابل داد ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ ڈراما تمھارے آخری سانس پر ختم ہو جائے گا —— اور اس کے لئے تمھیں صرف چند منٹ کا انتظار کرنا ہوگا۔

صفدر۔ خوب بنا رہے ہو مجھے

ڈاکٹر۔ عجب انسان ہو۔ شریف آدمی! تم تو مر رہے ہو۔ تم نے زہر سے بھی زیادہ قاتل سفوف چائے کے ساتھ پی لیا ہے۔

صفدر۔ تم نے چائے کی پیالی میں صرف شکر ڈالی تھی۔

ڈاکٹر۔ میں نے شکر ڈالتے وقت سفوف بھی ڈال دیا تھا۔

صفدر۔ تو گویا ——

ڈاکٹر۔ دیکھئے۔ اب آپ کے سر میں درد ہو رہا ہوگا۔ آپ کی پیشانی کی نیلی رگ بہت ابھر آئی ہے۔ آپ پہلی سٹیج پر آ پہنچے ہیں۔ دو تین منٹ کے بعد میرے سامنے کرسی کے اوپر ایک بے حس و حرکت لاشہ پڑا ہوگا میرے دوست! ایک بولتے چالتے آدمی کا صرف چند منٹ کے اندر مردہ ہو جانا۔ ہے نا ایک عجیب بات —— کوچ پر لیٹ جاؤ۔ تمھارا آخری وقت آ پہنچا ہے

صفدر۔ ڈاکٹر! مجھے صاف صاف بتاؤ۔ کیا تم نے ایسی حرکت کی ہے؟

ڈاکٹر۔ تمھارے چہرے کا رنگ پیلا ہو رہا ہے۔ لیٹ جاؤ کوچ پر۔ جلدی کرو۔

صفدر۔ ڈاکٹر! تم سے کس کم بخت نے کہا تھا کہ مجھے زہر پلا دو؟

ڈاکٹر۔ کس زبان سے آپ کو کم بخت کہوں؟

صفدر۔ میں نے کیا کہا تھا؟ (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ تم نے مرنے کی انتہائی آرزو ظاہر کی تھی۔

صفدر۔ میں پوچھتا ہوں۔ تم نے کس کی اجازت سے یہ جرم کیا۔ میں تمھیں جیل بھجوا دوں گا۔

ڈاکٹر۔ مجھے افسوس ہے۔ تمھاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ تم کوٹھی کے دروازے پر پہنچتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑو گے۔ ادھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو ٹیلیفون اس کمرے میں نہیں ہے۔

صفدر۔ ڈاکٹر تم جانتے ہو۔ تم نے قتل کا جرم کیا ہے تمھاری سزا پھانسی ہے

ڈاکٹر۔ میں تمھاری رائے کی تائید نہیں کرسکتا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے تمھاری آرزو کے مطابق کیا ہے۔ اس سفوف میں یہ عجیب خاصیت ہے کہ اس کو کھانے والا دم بھر میں مرجاتا ہے لیکن زہر خورانی کی کوئی علامت لاش کے کسی عضو میں ظاہر نہیں ہوتی۔

صفدر۔ کتنا ظلم۔ میں تمھاری ہڈیوں کو چبا ڈالوں گا۔ ابھی تمھاری رپورٹ کرتا ہوں

(دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اور ایک ایک دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹاتا ہے)

ڈاکٹر۔ دروازے بند ہیں۔

صفدر۔ ظالم تو کس بات کا انتقام لے رہا ہے میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔

ڈاکٹر۔ سخت افسوس ہے مسٹر صفدر! تم نے اپنی آرزو ظاہر کی۔ میں نے تمھاری اس آرزو کو پورا کردیا مگر اب تم میرا شکریہ ادا کرنے کی بجائے مجھے قاتل سمجھ رہے ہو۔ میری رپورٹ کی جا رہی ہے مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکایا جا رہا ہے۔ بندۂ خدا عقل کے ناخن لو۔ یوں ہی بے سود شور و غل نہ مچاؤ۔ کوچ پر لیٹ کر اپنے آخری لمحوں کو نہایت سکون سے گزار دو۔

صفدر۔ میں انھیں توڑ کر چھوڑ دوں گا۔

(دروازوں پر لاتیں مارتا ہے)

ڈاکٹر۔ پاگل نہ بنو مسٹر صفدر! لڑکھڑا کر گر پڑو گے۔ سر پھٹ جائے گا۔ آخری لمحوں میں کیوں تکلیف اٹھانا چاہتے ہو۔ اوہ۔ تم لڑکھڑانے لگے ہو۔ خدا کے لئے خود پر رحم کرو۔ یہ بدتمیزی سخت نقصان دہ ہے۔

صفدر۔ دروازہ کھلواؤ۔ ورنہ میں چیخوں گا۔ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو خبردار کر دوں گا کھلواؤ دروازہ او۔ نوردین۔ دروازہ کھول کم بخت کے بچے جلدی آ

ڈاکٹر۔ چیخئے۔ زور سے چیخئے۔ شوق سے چیخئے۔ میرے سوا اس کوٹھی میں کوئی بھی نہیں ہے۔ نوردین سٹیشن پر میرے ایک دوست کو لینے کے لئے گیا ہے۔ وہ آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا۔ اور اس وقت تک تمام شہر میں یہ خبر مشہور ہو چکی ہوگی کہ مسٹر صفدر دل کی حرکت بند ہو جانے سے فوت ہو گئے۔

صفدر۔ بدبخت —— شیطان!! میں تیری گردن مروڑ ڈالوں گا —— تیری ہڈیوں کو پیس ڈالوں گا۔

ڈاکٹر۔ اب تمھارے پیٹ میں بوجھ سا محسوس ہو رہا ہوگا۔ یہ دوسری سٹیج ہے۔ الوداع میرے دوست! دیکھو آرام سے لیٹ جاؤ۔

(صفدر ڈاکٹر کے پیچھے بھاگتا ہے۔ دونوں کمرے میں کئی لمحے بھاگتے رہتے ہیں)

ڈاکٹر۔ اس طرح بھاگ کیوں رہے ہو۔ مجھ تک پہنچتے پہنچتے تمھارے بازو شل

ہوجائیں گے۔ خدا کے لئے اپنی جان کو آخری وقت میں تکلیف نہ پہنچاؤ ——— کہیں ایسا نہ ہو تمھاری کوئی رگ پھٹ جائے۔

صفدر۔ پاجی، شیطان۔ خواہ کچھ ہو۔ میں تمھاری گردن مروڑ کر چھوڑوں گا۔

ڈاکٹر۔ (ہنس کر) تمھاری ٹانگیں تو لڑکھڑا رہی ہیں ——— دیکھو گر پڑو گے ——— لیٹ جاؤ ——— تم سے قدم تو اٹھایا نہیں جاتا۔ چوٹ ——— لگ جائے گی تو بہت تکلیف ہوگی تمھیں ——— (ہانپتے ہوئے) کیا کررہے ہو تم۔

(صفدر ایک موٹی سی کتاب اٹھاکر ڈاکٹر کی طرف پھینکتا ہے)

ڈاکٹر۔ ظالم میری کتاب کا ستیاناس کردیا ——— اور کرسی کیوں اٹھا رہے ہو ——— وہ گرے ——— سنبھلو، خدا کے لئے سنبھلو، لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ میں سنبھالتا ہوں تمھیں۔

صفدر۔ (ہانپتے ہوئے) ظالم، ملعون۔

ڈاکٹر۔ جو چاہے کہہ لو۔ مگر ایک بار لیٹ جاؤ۔

صفدر۔ (نرمی سے) ڈاکٹر۔ خدا کے لئے مجھے بچالو۔

ڈاکٹر۔ موت سے بچاؤں، یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ دو تین منٹ میں تم مردہ ہوگے۔

صفدر۔ میرے حال پر رحم کرو۔ ڈاکٹر! تمام عمر ممنون رہوں گا۔ دیکھو میں جوان ہوں۔ میری بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ یہ سب کیا کریں گے۔ بیوی تو مارے صدمے کے مرجائے گی۔

ڈاکٹر۔ اب تمھیں آخری وقت میں بیوی بچوں کا کیوں خیال آگیا۔ تم تو ان سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔

صفدر۔ وہ میری بھول تھی۔ ڈاکٹر دیکھو تمھاری بھی بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ تم ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا چاہتے ہو؟

ڈاکٹر۔ اگر میرے دل میں موت کی آرزو ہو تو یقیناً جدا ہونے کے لئے تیار ہوجاؤں گا ——— تم نے چند منٹ پیشتر مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے دنیا ایک بھیانک اور تاریک غار ہے۔

صفدر۔ وہ میری غلطی تھی، سخت غلطی تھی ——— میرے پیارے دوست! میرے ہمدرد! کیا تمھاری ڈسپنسری میں کوئی ایسی دوا نہیں جو اس ظالم سفوف کے اثر کو زائل کردے۔ خدا کی قسم آخری سانس تک تمھارا ممنون رہوں گا۔

ڈاکٹر۔ آخری سانس تو لے رہے ہو۔

صفدر۔ میرے حال پر رحم کرو۔ دیکھو مجھے کچھ ہورہا ہے۔ جلدی کرو، ڈاکٹر! میرے دوست! میرے محسن!!

ڈاکٹر۔ مگر میرے پیارے دوست! تم نے خود ہی مرنے کی آرزو ظاہر کی تھی۔ کیا اب دنیا تنگ و تاریک غار نہیں۔

صفدر۔ معاف کرو میرے محسن! وہ میری سخت غلطی تھی۔ اب میں آیندہ ایک ——— لمحے کے لئے بھی ایسی بیہودہ آرزو دل میں نہیں لاؤں گا ——— میں پاگل تھا، سخت بے وقوف تھا۔

ڈاکٹر۔ عجیب معاملہ ہے۔

صفدر۔ تم سب کچھ کرسکتے ہو ڈاکٹر! تمھارے پاس اس زہر کو دور کرنے کی دوا ضرور ہوگی۔ دیکھو میرے پیارے ——— میرے اچھے ڈاکٹر! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا میرا دم گھٹ رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ میرے پاس ایک دوا ہے تو سہی۔

صفدر۔ ڈاکٹر تم تو رحمت کے فرشتے ہو۔ سچ مچ رحمت کے فرشتے ہو۔

ڈاکٹر۔ میں تمھیں موت کے چنگل سے نکال لوں گا۔ مگر پہلے وعدہ کرو کہ زندگی بھر ——— ایسی خواہش نہیں کرو گے ——— اپنی بیوی سے پہلے کی طرح محبت کروگے بچوں پر پدرانہ شفقت کروگے۔

صفدر۔ اس کا دل و جان سے وعدہ کرتا ہوں۔ بیشک مجھ سے تحریر لکھوا لو۔

ڈاکٹر۔ اچھا بھئی۔

(ڈاکٹر ایک دروازے پر جاکر دستک دیتا ہے۔ اور نوردین کو ——— بلاتا ہے۔ دروازہ کھل جاتا ہے۔ ڈاکٹر باہر جاتا ہے۔ اور شیشی ——— لے کر واپس آتا ہے)

ڈاکٹر۔ یہ دوا پی لو۔ بہت میٹھی ہے۔

صفدر۔ بہت بہت شکریہ! ڈاکٹر تم نے ——— (دوا پیتا ہے) مجھے نئی زندگی دی ہے کس زباں سے تمھارا شکریہ ادا کروں؟!

ڈاکٹر۔ گھر جاتے ہی ٹیلیفون کرنا۔ ہاں بھئی اپنا ہیٹ اور چھڑی تو لیتے جاؤ۔

(صفدر چلا جاتا ہے۔ نوردین آتا ہے)

نوردین۔ سب کچھ ٹھیک ہوگیا سرکار!

ڈاکٹر۔ سب کچھ ——— شیطان دروازے کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔

نوردین۔ بڑا عجیب تماشا تھا سرکار!

ڈاکٹر۔ ذرا ٹیلیفون کروں ——— ٹیلیفون پر سے کپڑا ہٹاکر رسیور اٹھاتا ہے ——— کون ——— ؟ مسز صفدر! میں ہوں ڈاکٹر۔ مبارک باد دیتا ہوں۔ اب آپ کا شوہر صحیح معنوں میں انسان بن گیا ہے ——— جی ہاں ——— عجیب طریقے سے ان کا علاج کیا ہے ——— کہنے لگے

ہیں مرنا چاہتا ہوں ——— اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ان کے دماغ میں ایک غلط اور خوفناک نظریہ پیدا ہو گیا ہے ——— اور یہ خوفناک نظریہ کیوں پیدا ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی عملی جد و جہد میں کوئی حصہ نہیں لیا ——— ہر وقت کی فرصت انسانی ذہن کو طرح طرح کے خیالات کا مرکز بنا دیتی ہے ——— آپ اپنے بچوں کی پرورش میں انتہائی احتیاط کیجئے ——— اچھا تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ انھوں نے مرنے کی آرزو ظاہر کی میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں نے چائے میں ایک قاتل سفوف ملا کر تمھیں پلا دیا ہے ——— اوہو۔ وہ زہر نہیں تھا ——— بے ضرر سفوف تھا۔ ہاں ہاں اس میں کوئی خطرناک بات نہیں تھی ——— تو سنئے بھی ——— اب جناب کو ہوش آیا ——— کہنے لگے خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ اور جب انھوں نے وعدہ کیا کہ بیوی بچوں کا خیال رکھیں گے ——— اور کبھی بھی موت کی خواہش نہیں کریں گے۔ اس وقت میں نے وہی بے ضرر سفوف انھیں پلا دیا ——— اب میرا شکریہ ادا کرکے گئے ہیں ——— آتے ہی تم سے معافی مانگیں گے ——— انھیں یہ باتیں معلوم نہ ہونی چاہئیں ——— نہیں ؟ آپ میرا شکریہ ادا کر رہی ہیں ——— یہی میری فیس ہے ——— اس وقت تو نہیں ——— کل شام کو آ سکوں گا ——— ضرور آؤں گا ———مطمئن رہیں۔

(ڈاکٹر ریسیور رکھ دیتا ہے۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ تبسم رقصاں ہے)

(پلاٹ ماخوذ)

ایک پیام

نظم

از:- محمد امتیاز اللہ خاں تہامی۔ اے۔

دریا پہ رہنے والو اس کو سلام کہنا! بعد از سلام اُلفت میرا پیام کہنا!
کہنا کہ تیرے غم میں آہ مر رہا ہوں بے حال ہو رہا ہوں جاں سے گزر رہا ہوں
ہوش و حواس کھو کر دیوانہ ہو گیا ہوں میں اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو گیا ہوں
آنکھوں میں پھر رہا ہے اُس کا حسین چہرہ اُف! وہ ادائے رنگیں وہ نازنین چہرہ!
اس کا خیال مجھ کو تڑپا رہا ہے آ کر! میرے دلِ حزیں کو برما رہا ہے آ کر!
دل یاد کر رہا ہے اس کی وہ پیاری باتیں نظروں کو جستجو ہے کاش آئیں پھر وہ راتیں
آنکھوں میں پھر رہی ہیں اس کی حسیں ادائیں دیوانہ کر رہی ہیں اُمڈی ہوئی گھٹائیں
مستِ شباب اس کی وہ فتنہ زا نگاہیں وہ کاکُلِ پریشاں وہ دل ربا نگاہیں

خنجر سا اک چلا کر تڑپا رہی ہیں مجھ کو
پھر وہ حسین آنکھیں یاد آ رہی ہیں مجھ کو

قطعات

نغماتِ بیدار

از:-
پروفیسر کرپال سنگھ بیدار سکھ نیشنل کالج لاہور

اُستاذی حضرت علامہ تاجور کے نام ——— شمس العلماء کا خطاب ملنے پر

(۱)

خطاب آمد، دلِ ما بندگاں بُرد
زحاسد امتیازِ این و آں بُرد

چہ خوش آں سیلِ بے پایاں کہ موجش
یکین بے خبر را با مکاں بُرد

درونت از خطاب آسائشے یافت
طرازِ آرزو زیبائشے یافت

مگر ایں نکتہ را کم می شناسی
کہ از نامت خطاب آرائشے یافت

جہاں از دانشِ تو بہرہ ور شد
جہات از رفعتِ تو باخبر شد

سَرت گردم، بدہ کحلِ بصیرت
کہ چشمِ حاسدِ تو کورتر شد

(۲)

نواب احمدیار خاں دولتانہ آنجہانی ——— اُن کی بے نظیر شخصیت کا تصوّر کر کے

بہ اوجِ خود حریفِ آسماں بود
بہ موجِ خود محیطِ بے کراں بُود

نظیرِ او ازاں پیدا نیامد
کہ او "نوّاب احمدیار خاں" بُود

مقامِ او ورائے ایں جہان است
دیارِ اُو دیارِ جاودان است

دلم از منزلش اندیشہ مے کرد
ندا آمد کہ او جنت مکان است

(۳)

راجہ حسن اختر پی سی ایس کے نام ——— اُن کے اخلاص اور حسنِ طبیعت سے متأثر ہو کر

دِلم از دُوریٔ او ناصبور است
گدازم کار و بارِ بے سرور است
چو اختر جلوہ افروزِ نظر نیست
سجُودِ من سجودِ بے حضور است

ضمیرش سرِّ معنی را عیاں کرد
نگاہش خاکداں را آسماں کرد
خوش آں اختر کہ از ضَو بخشیٔ او
بعالم آفتابی مے تواں کرد

(۴)

مسٹر پی این بھنوٹ، ای اے سی کے نام ——— اُن کا ایک گرامی نامہ پڑھ کر

تلاشِ ما غُلاماں خود بگو چیست؟
امیدِ تشنہ کاماں خود بگو چیست؟
چہ مے پُرسی دگر از منزلِ ما
مقامِ بے مقاماں خود بگو چیست؟

فرنگ از ما سرورِ جاں ربُودہ
کہ نورِ دیدۂ عرفاں ربُودہ
فغاں از فیلسُوفی ہائے مغرب
کہ دانش دادہ و ایماں ربُودہ

من از افرنگیاں حکمت خریدم
بہ نقدِ روشنی ظُلمت خریدم
بہ بیں اے دوست! ایں دادوستد را
کہ راحت دادم و کُلفت خریدم

فریبِ دِل

نفسیاتی

افسانہ

از :- ٹکا امتیاز اللہ خاں ہما - بی - اے -

ان لوگوں کے فائدہ کے لئے جو ابھی تک "فریب دل" کا مطلب نہیں سمجھتے - بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی واضح طور پر بیان کر دئے جائیں - اس کی ایک جامع تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بہت اہم واقعات پر فریب کی تپلی چادر پڑھا کر یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ چھپ گئے ہیں -

فریب دل کی متعدد اقسام ہیں اور اس کا استعمال بھی بہت سے طریقوں سے کیا جا سکتا ہے - مثلاً ایک بڑی سفید سڑک کو درختوں کی ٹہنیوں اور خشک پتوں سے ڈھانپ کر یہ سمجھ لینا کہ دشمن کی نظروں سے چھپ گئی ہے ---- فریب دل ! ---- یا خشک گھاس کے درمیان چھپ کر دشمن کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا اور دل میں یہ خیال کرنا کہ دشمن کی نظروں میں نہیں آسکتا ---- فریبِ دل ! ---- یا ایک بہت بڑی توپ پر ماہی گیر کا جال ڈالدینا اور اس پر چند پتے بکھیر کر یہ جاننا کہ دشمن کو دکھائی نہیں دے سکتی ---- پھر فریب دل ! ---- یا پھر میدان جنگ سے دشمن کی لاش لاکر اور اس کے لباس میں اپنے آدمی کو ملبوس کرکے دشمن کا حال معلوم کرنے کے لئے بھیج دینا ---- یہ بھی فریب دل ! لیکن سب سے زیادہ پر لطف و دلچسپ فریب دل وہ ہے جو مرد اور عورتیں اپنے خیالات و جذبات کو ایک دوسرے سے چھپانے کے لئے کام میں لاتے ہیں ----

جب اسے بتایا گیا کہ وہ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لئے ایک رات کے لئے اپنے گھر جا سکتا ہے تو اس نے اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا -

اس دور افتادہ جگہ ' ریل گاڑی کا انتظار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کے تین قیمتی گھنٹے ضائع ہو جائیں - دل منسٹر کے سٹیشن سے ایک ایکسپریس اس کے گھر کی طرف جاتی تھی ---- مگر دل منسٹر بھی تو وہاں سے چودہ میل دور تھا - اور وہاں کسی گھوڑا گاڑی یا کسی قسم کی سواری کا ملنا جو اسے دل منسٹر تک پہونچاتی محال تھا

اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ سامنے ایک افسر کے خیمہ کے پاس کھڑی ہوئی موٹر سائیکل کس کی تھی - مگر ایک موٹر سائیکل کا ایسے وقت پر موجود ہونا ایک اہم واقع سے کم نہ تھا - پھر اس کی ٹینکی بھی پٹرول سے بھری ہوئی تھی ---- کیا خدا کا دیا ہوا عطیہ نہ تھا !

جب موٹر سائیکل کا انجن ایک ہی دھکا لگنے سے چل پڑا تو وہ اپنی نیک بختی کا اور بھی ممنون ہوا - تھوڑے عرصہ میں ---- کیمپ سے باہر نکلتے ہوئے وہ پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑھکر پچیس میل کی رفتار پر پہنچ گیا - پہاڑ کی اونچائی پر پہنچ کر اس نے موٹر سائیکل کو اور بھی تیز کر دیا - اس قدر تیز جتنا تیز دوڑنے کی اس میں طاقت تھی -

میدان جنگ میں وہ موت کے چنگل سے اس قدر حیرت انگیز طور پر نہ بچ سکتا تھا - جسطرح ایک خطرناک موڑ پر ایک ٹریفک کانسٹیبل کو موٹر سائیکل کی زد میں آجانے سے بچاتے ہوئے بال بال بچا - اس نے پولیس مین کو اپنی زندگی کی خاطر بدحواس ہو کر چھلانگ لگاتے دیکھ کر ایک زور دار قہقہہ لگایا - اس کے بعد سڑک صاف تھی -

دل منسٹر کے اسٹیشن پر اس نے ٹکٹ خریدا اور ایک ثانیہ ضائع کئے بغیر گاڑی پر سوار ہوگیا - اول درجہ کے سب ڈبے رُکے ہوئے تھے - بغیر اس بات کی پرواہ کئے کہ وہ اس بات کا خطرہ مول لے رہا تھا کہ اگر کسی نے اس کو دیکھ لیا تو وہ اس الزام میں دھر لیا جائے گا کہ اس نے ایک ایسی حرکت کی جو افسروں کے شایان شان نہ تھی - وہ ایک تیسرے درجے کے ڈبہ میں گھس گیا - گاڑی بھی اس کی ہمدرد ثابت ہوئی - اور بغیر کسی سٹیشن کے باہر والے سگنل کے قریب لاین کلیر کے انتظار میں کھڑے رہ کر دو گھنٹے ضائع کرنے کے اپنے مخصوص وقت پر منزل مقصود پر پہنچ گئی -

مگر ٹیکسی ذرا مایوس کن سی تھی - ایک سے زیادہ مرتبہ اسے ڈرائیور کو اس بات پر جھڑکنا پڑا کہ وہ بہت محتاط تھا ---- یقیناً کچھ زیادہ تیز چلانے پر وہ اس لاری سے آگے نکل سکتا تھا اور اس طرح اسے سپاہی کے اشارے کے انتظار میں یوں نہ رکنا پڑتا !

آخرکار وہ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رُکے - اس مکان کی ہر ایک اینٹ سے اُسے اُنس تھا ---- اور یہ اُنس اس وقت والہانہ محبت میں تبدیل ہو چکا تھا - کیونکہ جنگ نے ہم سب کو اپنے مقبوضات کی اصل حقیقت سے آشنا کر دیا تھا -

وہ ایک ہی چھلانگ میں موٹر سے اوپر کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا اور اس زور سے دروازہ کو کھٹکھٹانا شروع کیا جیسے اسے توڑ کر ہی دم لیگا وہ پہلے سے ہی اس کھٹکھٹاہٹ سے واقف تھی۔ گو اس وقت وہ اس کی منتظر نہ تھی مگر پھر بھی فوراً سمجھ گئی کہ دروازہ پر کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے باہر نکلی اور جس تیزی سے وہ سیڑھیوں پر چڑھا تھا اس سے بھی دگنی تیزی کیساتھ اُس نے دروازہ کھول دیا۔

اسے اس بات کا مطلقاً خیال نہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے دونوں کو گلے ملتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ کسی کو اس بات کی پرواہ بھی کیا تھی۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور کو، جس کی اُجرت ابھی تک ادا نہیں کی گئی تھی، عارضی طور پر بھلا چکا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی چالاک نکلا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس سے اُسی وقت پوچھ لیتا اس نے موٹر کو ایک گھنٹہ تک چالو رکھا اور اس کے بعد اُس سے پوچھا کہ آیا وہ موٹر کا انجن بند کر کے اسکا انتظار کرے ؟

ایک مختصر سے ڈرائنگ روم میں غیر معمولی تیزی سے ہزاروں سوال و جواب ایک دوسرے سے پوچھے اور سنے گئے۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا کہ اسے فرانس کے محاذ جنگ پر بھیجا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ لوگ اسے کسی اور محاذ پر بھی بھیج سکتے تھے۔ مثلاً میسی پوٹیمیا ایسی ناخوشگوار جگہ پر۔ اسے بھی صرف اسی صبح ان احکام کی خبر ہوئی تھی کہ اس کی منزل مقصود فرانس ہے۔ کیونکہ حکام بالا جہاں تک ممکن ہوسکے ایسے معاملات کو پردۂ راز میں ہی رکھتے ہیں۔

پھر یہ امر بھی بہت تسلی بخش تھا کہ رود بار انگلستان میں دشمن کی کوئی آبدوز نہ تھی۔ نیز اس کے بستر کا تھیلا ایسی ساخت کا تھا کہ یقینی طور پر ایک آدمی کو آٹھ گھنٹہ تک پانی میں غرق ہونے سے بچا سکتا تھا۔

وہ اپنے نئے فراک میں کتنی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ سچ مچ اسوقت تو وہ ایک بہشتی حور کو مات کر رہی تھی مگر اس کی خاکی وردی بھی تو غیر معمولی طور پر اس کے جسم پر سجی ہوئی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ آج اس نے سام براؤن کی نئی پیٹی باندھی تھی اگرچہ اس کے خراب ہونے میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگیگا۔ مگر اس وقت تو وہ خوب چمک رہی تھی۔ اسے اس بات پر ناز تھا اور وہ بہت خوش تھی کہ اس کا خاوند مادر وطن کی خدمت کرنے کے لیئے جا رہا تھا ——— اور اس سے زیادہ اطمینان بخش یہ بات تھی "کہ وہ فرانس" جا رہا تھا۔

ننھی بچی کو تو وہ بھول ہی چلا تھا۔ وہ ہے کہاں! لاؤ تو! ـــ ارـــ ارـ واہ دیکھو تو یہ پچھلے سات ہفتوں میں کتنی حیران کن تیزی سے بڑی ہو گئی ہے۔ ابھی تو اس کے پیدائش کے دن گزرے ہوئے بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وہ دن جن کی وجہ سے ماں باپ کے دل میں محبت کی ایک نئی روشنی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔

ایک دوسرے کے بازؤں میں بازو حمائل کئے وہ سیڑھیوں کے راستے ننھی بچی کے کمرہ کی طرف بڑھے۔

بچی نے مُسکرا کر اپنے ابا کا استقبال کیا اور خوشی کے اظہار کے طور پر اپنی گڑیا کو کھڑکی سے باہر باغیچہ میں پھینک دیا۔ جہاں اسکے ننھے کتے نے بہت خوشی سے اُسے تار تار کر دیا۔

اس کے بعد وہ ایک دو ایسے دوستوں سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے جو اس عزت کے مستحق سمجھے گئے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ "ان کو اس بات پر بہت خوشی ہے کہ وہ فرانس جا رہا ہے۔ فرانس بہت اچھی جگہ ہے اور محفوظ بھی۔ قصہ مختصر یہ بات قسمت کا دھنی ہونے کے مترادف ہے۔ اور کسی کو خوش کرنے کے لئے بہت کافی [illegible] جواب میں وہ دونوں بھی اپنی خوش قسمتی کے اظہار میں کسی سے پیچھے نہ رہے

یہاں سے فراغت پانے کے بعد ایک دفعہ پھر وہ گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے جنگ کے متعلق کہانیاں سنائیں اسی اثنا میں اس کی بیوی نے صبح کا لباس تبدیل کر کے شام کا لباس زیب بدن کر لیا تھا۔

ٹیکسی کافی عرصہ سے باہر کھڑی تھی اس لئے اسے کچھ دیر اور انتظار کرنے کے لئے کہہ دیا گیا پھر وہ اس میں سوار ہو کر ایک ایسے رستوران میں پہنچے جہاں شادی کی رات انہوں نے کھانا کھایا تھا۔ اس نے شادی کی رات والے تمام کھانوں کو مہیا کرنے کا حکم دیا۔ اسی رات والی شراب پی گئی۔ رستوران کے سازندوں کو بھی اس پر راضی کر لیا کہ وہ اسی رات والا راگ چھیڑیں۔ ہر ایک چیز وہی تھی کھانا، شراب، راگ۔ مگر نوکر اس رات والا نہ تھا ـــ اس وقت وہ گراف زیپلن پر سوار رود بار انگلستان کو عبور کر رہا تھا۔

جب وہ کھانے کا آخری حصہ ختم کر چکے تو اس کی بیوی نے ایک چھوٹا سا سگرٹ کیس نکالا۔ یہ اس نے اپنی بیوی کو شادی کے بعد بطور تحفہ دیا تھا۔ اور نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس کا استعمال خاص خاص تقاریب پر محدود رکھا گیا تھا۔

اس کے بعد تھیٹر کی باری تھی وہاں پہنچکر اس نے سب سے اعلیٰ درجہ کے ٹکٹ خریدے۔ اور کھیل کے وقفوں کے درمیان ایک دفعہ بھی تنہائی میں سگرٹ سے لطف اندوز ہونے کے لئے باہر نہ نکلا۔ بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ رہے جیسے ان کی شادی حال ہی میں ہوئی ہو۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ شادی شدہ اور ایک بڑھتے ہوئے گھر کے افراد تھے۔

بڑی سہانی رات تھی۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دونوں دوسرے دن "ماہِ عسل" منانے کے لئے باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کے برخلاف کل وہ ایک دوسرے سے جُدا ہونے والے ہیں۔ شاید ہمیشہ کے لئے۔

اس وقت ان کی ہر حرکت میں خوشی اور شادمانی جھلک رہی تھی۔ اس وقت وہ ہنس رہے تھے۔ گپیں ہانک رہے تھے۔ ان بچوں کے لئے جو ایک دن کے لئے سکول کی قید و بند سے آزادی ملنے پر اکھٹے ہو جاتے ہیں۔ اور استاد کے "خوفناک ڈنڈے" کو بھول کر دنیا بھر کی شرارتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے بھی یہ ویسا ہی دن تھا۔ ویسی ہی رات تھی۔ ان کی مسرت اس وقت غم پر غلبہ پائے ہوئے تھی۔ —— وہ اس لفظ سے بے نیاز تھے —— شادمانی نے اس کو نقاب پوش کر دیا تھا۔ نئے رنگ میں رنگ دیا تھا —— پردہ ڈال دیا تھا —— یہ ہے "فریب دل"!

گھر کی طرف واپسی پر بھی ان کے دل میں کسی قسم کا انتشار نہ تھا شاید ان کی باتیں قدرے کم ہو گئی تھیں —— شاید ان کے لطائف و ظرائف میں پہلی سی شگفتگی مفقود ہو چکی تھی۔ لیکن شام کی روح ان میں ابھی تک موجود تھی —— اور زندہ ——

گھر پہنچ کر سونے کے وقت۔ بتی بجھاتے ہوئے انہیں کچھ ڈر محسوس ہو رہا تھا —— اندھیرے میں چہرے کے ذریعہ خوشی کا اظہار ناممکن تھا —— اندھیرے میں خشک ٹہنیوں اور پتوں کے درمیان چھپی ہوئی سفید سڑک بہت آسانی سے نظر آ جاتی ہے۔ یا ماہی گیر کے جال کے نیچے سبز پتوں سے ڈھکی ہوئی توپ صاف دکھائی دیتی ہے۔

وہ اس بات سے باخبر تھے —— اور ڈر رہے تھے۔ چونکہ وہ خائف تھے اس لئے ہر ایک یہی بہانہ کر رہا تھا کہ وہ اب ایک منٹ کے لئے بھی بیدار نہیں رہ سکتا۔ بستر کے پاس پڑی ہوئی ہاکی سے اس نے بٹن دبا کر بجلی کی روشنی گل کر دی اور شب بخیر کہنے کے بعد دونوں نے آنکھیں بند کر لیں اور بہانہ کر لیا کہ وہ سو رہے تھے۔

کئی گھنٹے وہ اسی طرح پڑے رہے ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ایک دوسرے سے محبت کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ باتیں جن کے کہنے سننے کے لئے ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیوی سو رہی ہے۔ وہ اپنے بستر سے اٹھکر دبے پاؤں اپنی ننھی بچی کے بستر کے پاس پہونچا۔

"ننھی —— پیاری —— پیاری بچی —— تم سلامت رہو" اس نے کہا۔

ایک لمحہ کے لئے وہ اس کے ننھے خوبصورت چہرہ پر جھکا رہا۔ اس وقت اس کو نرم نرم تکیوں پر سر رکھ کر سونے کی قیمت کا خیال آ رہا تھا —— اور کس طرح ساری رات —— خوفناک رات دعائیں مانگنے میں کٹی۔ اسے بالکل معلوم نہ تھا کہ اس کی بیوی بھی بیدار تھی اور لحاف کے ایک کونے سے اس کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہی تھی۔

صبح کو تھوڑے وقت میں کرنے کے بہت سے کام تھے ابھی ہمارا ہی میں صبح کا ناشتہ کھانا تھا۔ واٹرلو کے اسٹیشن سے ٹیلیفون پر یہ بھی دریافت کرنا تھا کہ آیا دس بجکر پینتالیس منٹ پر دل منسٹر کو جانے والی گاڑی کے اوقات کے متعلق ریلوے ٹائم ٹیبل میں درست لکھا ہوا تھا یا غلط۔

وقت قریب آ رہا تھا۔ نوکرانی کو ٹیکسی لانے کے لئے بھیجا جا چکا تھا۔ کیونکہ ضرورت کے وقت ایسی چیزوں کا میسر آ جانا شاذ و نادر ہی ہوا کرتا ہے۔ اس کی بیوی ابھی سے دوسری منزل پر تبدیل لباس کو جا چکی تھی۔ اس نے خلاف معمول اپنی بیوی کا تعاقب نہ کیا۔ بلکہ کھانے کے کمرے میں کھڑے رہ کر اپنے پانچ قیمتی منٹ ضائع کر دئے —— کچھ سوچتے ہوئے نرس بچی کو اٹھائے ہوئے نیچے آ رہی تھی۔ وہ سجاوٹی پردہ کی اوٹ میں ہو گیا۔ مبادا ان کی نظر اس پر پڑ جائے۔ وہیں سے اس نے اپنی بچی کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اور باغ کی طرف سیر کرنے کے لئے جاتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے پردہ کی اوٹ سے باہر نکل کر اپنی مملکت کے ولیعہد کو رخصتی پیار کرنے کی بھی کوشش نہ کی۔ —— وہ خائف تھا —— ایک سیدھا سادھا بزدل شخص —— اسی بزدلی کی وجہ سے بیوی کے ساتھ اوپر جانے کی جگہ وہ کھانا کھانے کے کمرہ میں جکڑا رہا۔ بہت پریشانی کے عالم میں اس نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا پھر اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور شانوں کو جھٹکا دے کر ایک پختہ ارادے کے ساتھ وہ باورچی خانہ میں اپنی باورچن کو الوداعی سلام

کہنے کے لئے داخل ہوا:

مجھے یقین ہے۔ میرے آقا! کہ آپ ضرور صحیح وسلامت واپس آئیں گے" اس نے کہا

اس یقین دلائے جانے سے اس کے دل کو اطمینان سا نصیب ہوگیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور سیٹی بجاتے ہوئے دوسری منزل کی طرف بڑھا۔

اس کی بیوی کی پشت اس کی طرف تھی وہ آئینہ دیکھ رہی تھی۔ اور بظاہر اسے ہیٹ کا ربن باندھنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔

"ہر ایک چیز تیار ہے کیا" اس نے دریافت کیا

"ہاں" اس کی بیوی نے جواب دیا

"فاگیتی ٹیکسی لانے کے لئے جا چکی ہے میرے خیال میں بروقت پہنچ جائے گی"

ہاں ان دنوں ٹیکسی کا ملنا دشوار ہو رہا ہے۔ پرسوں صبح کتنی ہی دیر تک تلاش کرتی رہی مگر نہ ملی"

"اوہ کتنی خراب بات ہے"

"کیا تمہیں بچی کا فراک پسند آیا؟"

"میرے خیال میں فراک پر میری نظر ہی نہیں پڑی"

"مگر رخصتی پیار کرتے ہوئے تو دیکھا ہوگا"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اسے رخصتی پیار بھی نہیں کیا۔ نہیں یقیناً ——— میرا مطلب ہے ——— واٹرلو اسٹیشن کو ٹیلیفون کرنا پڑ گیا تھا"

ہاں میرا خیال ہے کہ ایک آدھ ہفتہ میں اس کا پہلا دانت نکل آئے۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ اس وقت تم یہاں نہیں ہوگے"!

یہ ایک صریح کوشش تھی کہ وہ اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرے اپنے جذبات واحساسات اپنی شریک زندگی پر ظاہر کردے۔ اس نے سوچا واقعی کتنی شرم کی بات ہے۔ بچہ کا دانت نکلنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا ——— لیکن جواب میں اس نے صرف "ہاں" کہا اور خاموش ہوگیا۔

خاموشی کا ایک وقفہ ——— وہ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اور شیشوں سے باہر کی طرف اس وقت تک جھانکتا رہا۔ جب تک کہ اس کے سانس کے بخارات سے شیشہ دھندلا نہ ہوگیا اس کی بیوی کو ابھی تک گرہ لگانے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ اور اسکی پیٹھ ابھی تک اس کی طرف تھی۔

آخر کار اس نے کہا

مجھے بہت خوشی ہے کہ خرچ کے معاملہ میں تمہیں تکلیف نہ ہوگی؟

"نہیں بہت اچھی طرح گزارہ ہو جائیگا۔"

"اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت پڑے تو مجھے فوراً اطلاع دینا"

"کوئی ایسی ضرورت نہ پڑیگی ——— کیا تم ——— کیا تم ... خط لکھ سکو گے۔"

"میں کوشش کروں گا۔ وہ لوگ ہمیں بہت مصروف رکھیں گے۔ اسلئے اگر کبھی تمہیں خط نہ پہنچے تو پریشان نہ ہونا"

"نہیں میں سمجھ جاؤں گی"

"فرانس میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ خطوط باقاعدہ ملتے رہتے ہیں"

مجھے بہت پریشانی ہوتی اگر وہ لوگ تمہیں کسی اور جگہ روانہ کر دیتے"

"یقیناً یہ بہت بڑی خوش نصیبی ہے"

"میں بہت ہی خوش ہوں"

"اور میں بھی"

اب وہ دروازے کے پاس کھڑا ہوا اس کے کواڑوں کو آگے پیچھے کرنے کے کھیل میں مصروف تھا:

"خوب۔ اور میں۔ بہت۔ بہت۔ بہت۔ بہت۔ ہی زیادہ مسرور ہوں"

گلی سے سیٹی کی آواز سنائی دی اور اس کیساتھ ٹیکسی کی 'ہانک ہانک' کی صدائیں بھی کانوں میں آنے لگیں۔ دونوں نے یہ آوازیں سنیں۔ یکلخت اس کا سر دروازے کے ساتھ ٹکرایا اور اس نے چیخ کر کہنا شروع کیا۔

"میری جان۔ میں۔ بہت۔ بدنصیب خستہ۔ پریشان اور راندہ ہوں"

"فریب دل کا طلسم ٹوٹ کر چاروں افلاک کی ہواؤں میں پریشان ہو چکا تھا۔ اور اسکے بعد ——— صاف ——— ایک نوجوان جوڑے کی دو صورتیں ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈالے ——— روتی ہوئی نظر آرہی تھیں"

نظم

میرا مقام

از:۔ اخترؔ ہوشیار پوری بی۔اے ایل۔ایل۔بی۔

دیارِ کیف میں کاشانہ ہے مدام مرا
ہے اُن کی میکدہ بردوش آنکھ جام مرا
کلی کلی کی نظر میں ہے احترام مرا
سیہ گھٹاؤں میں رقصاں ہے فیضِ عام مرا
بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

کسی کے حسن کا افسانہ کہہ رہا ہوں میں
شراب و شعر کی موجوں میں بہہ رہا ہوں میں
جمالیات کے انداز سہ رہا ہوں میں
دیارِ عشق و وفا میں ہے انتظام مرا
بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

جواب مل نہ سکے جس کا وہ سوال ہوں میں
جہانِ عشق و محبت میں لازوال ہوں میں
جبینِ عرش سے ٹپکا ہوا جلال ہوں میں
کلی کلی کے جگر پر رقم ہے نام مرا
بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

مرے حضور میں رہتے ہیں نور کے جلوے
بسے ہوئے ہیں نگاہوں میں طور کے جلوے
فضائے قلب میں رقصاں ہیں حور کے جلوے
سحر کا نور مرا ہے فروغ شام مرا

بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

نشیبِ عشق کی پستی سے بے خبر ہوں میں
فلک نشیں ہوں فرشتوں کا ہم سفر ہوں میں
مقرّبینِ محبت کا راہبر ہوں میں

ہے حدِ فکر و نظر سے پرے قیام مرا
بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

جہاں مَیں رہتا ہوں جاوید ہے بہار وہاں
مچلتے رہتے ہیں نغموں کے آبشار وہاں
ہر ایک لمحہ ہے پیغمبر قرار وہاں

ہے بے نیازِ نظامِ خرد نظام مرا
بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

جہان والوں سے ہمدم! مرا جہاں ہے بلند
زمیں بلند مری۔ میرا آسماں ہے بلند
ضیائے اختر و تنویرِ کہکشاں ہے بلند

ہے ترجمانِ حدیثِ نظر کلام مرا
بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

غرض کہ بلبلِ سدرہ کا ہم نوا ہوں میں
نظامِ خلد کے رازوں سے آشنا ہوں میں
حضورِ حضرتِ یزداں غزل سرا ہوں میں

رواں ہے بوئے چمن کی طرح پیام مرا
بہت بلند ستاروں سے ہے مقام مرا

افسانہ

کرشنا

از:- حفیظ رومانی

پجاری نے آنکھیں کھول کر دیکھا، ملاح کی بیٹی، کنول کے پھولوں کا تھال لئے کھڑی تھی، وہ ابھی ابھی اپنی چھوٹی سی کشتی کے سہارے سامنے کی پہاڑی ندی کو پار کر کے آئی تھی، اُس کا سانس ابھی تک درست بھی نہیں ہوا، اور سانس لیتے وقت اس کی چھاتی کا اُبھار جو ذرا زیادہ نمایاں ہو جاتا، اسے چھپانے کیلئے اپنی ساری کے آنچل کو تھوڑا سا درست کر لیتی۔

پجاری نے دلکش آواز میں کہا: "کرشنا!——" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کرشنا کے جسم میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑتی معلوم ہوتی اور اس نے اس احساس کو چھپانے کیلئے بھگوان کی مورتی کے سامنے پھول ڈال دیئے اور خود ہاتھ باندھ کر پرارتھنا کرنے لگی۔ وہ دیکھنے کو تو اپنی غلافی آنکھیں بند کئے مورتی کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن خیالات کہیں دور بھٹک رہے تھے، وہ سوچ رہی تھی، پہاڑی لوگوں کی سرگوشیاں آخر کیا رنگ لائیں گی؟ اس نے دو تین مرتبہ ارادہ بھی کیا کہ پجاری کے پاس آنا جانا ترک کر دے۔ لیکن جب وہ ایسا کرنے کا خیال بھی کرتی اس کے دل کی حرکت بند ہوتے معلوم ہوتی۔ لیکن آج وہ کسی خاص عزم کے ساتھ آئی تھی وہ پجاری کو اپنے من کی بات سے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتا دینا چاہتی تھی، پہاڑی لوگ اس کے دل کے سکون کو اپنے شکوک سے کس طرح برباد کر رہے ہیں۔ وہ جانے کب تک مورتی کے سامنے انہیں خیالات میں گم کھڑی رہتی، دفعتہً اسے پجاری کا خیال آگیا اور پھر بھگوان کی مورتی کا خوف——اس نے اپنے ہاتھ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح گرا دیئے۔

پجاری نے نرم لہجہ میں پوچھا۔ "آج تو ٹھیک ہے کرشنا؟" کرشنا ایک مرمریں بُت کی طرح جو منتِ کشِ سنگ تراش نہ ہو کھڑی تھی۔ پجاری نے پھر پوچھا "کرشنا کیا بات ہے؟" پجاری کی آواز میں ایک خاص ملنت تھی۔ کرشنا نے دبی زبان میں جواب دیا "گورودیو! میرا من ہمیشہ چنتا کے ساگر میں ڈوبا رہتا ہے۔" پجاری نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ "کیا کوئی دکھ ہے تمہیں؟" کرشنا نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔ "گورودیو! میں کچھ نہیں جانتی، بس اتنا محسوس کرتی ہوں۔ مجھے کچھ ہو گیا ہے میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا حلق خشک ہو گیا، الفاظ اس کی زبان سے چمٹ گئے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

پجاری کا سلسلۂ خیال فوراً کسی گذشتہ گفتگو کی طرف چلا گیا۔ جو اس نے کبھی مندر کی دیوار کے پیچھے کچھ عورتوں کے درمیان سُنی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں "کرشنا پریم کرتی ہے نا، جبھی تو مندر میں بلا ناغہ آتی ہے۔" وہ ابھی کچھ اور یاد کر رہا تھا، کرشنا نے دھیمے آواز میں کہا "گورودیو! میں نے بسا اوقات سوچا، میں یہاں نہ آیا کروں، شاید میرے یہاں نہ آنے سے لوگ باتیں بنانا چھوڑ دیں لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ایسا کر کے زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

"پچھی پچھی! کرشنا" پجاری نے جلدی سے کہا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔ تمہارا آنا جانا مشکوک سمجھا جاتا ہے، آہ! کرشنا، تم نے میری تمام پوجا خاک میں ملا دی۔ تمہارے من میں میل ہے 'تم ناری ہو، ناری سے ہمیشہ خطرہ ہے ——تم مجھے پریم کرتی ہو، یہ پریم پاپ ہے۔"

کرشنا پجاری کی طرف ایک معصوم بچہ کی طرح دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل پہ چھریاں چل رہی تھیں، وہ بہت کچھ اپنے دل کی پاکیزگی کے متعلق کہنا چاہتی تھی، نسائیت اور حجاب نے اس کی طاقتِ گویائی چھین لی۔ اور وہ بغیر کچھ کہے مندر سے باہر چلی آئی، اسے تھال اٹھانا بھی یاد نہ رہا۔

شام کا خوفناک دھندلکا، پہاڑیوں کی سلسلہ وار بلندیوں کو گہرے اندھیرے میں تبدیل کر چکا تھا، ندی اور آبشاروں کی آواز شام کی خاموشی میں ایک حشر برپا کر رہی تھی، کبھی کبھی کوئی پہاڑی جانور چلّا اٹھتا جس کی آواز دُور تک خاموش فضا کو چیرتی پہاڑوں سے ٹکراتی معلوم ہوتی، دُور ندی میں ایک چھوٹی سی کشتی ہچکولے کھاتی جا رہی تھی، جیسے کوئی سسکیاں بھر کر رو رہا ہو، اور کشتی میں ایک بُجھتا سا سایہ ہلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

کرشنا کی جھونپڑی ندی کے اس پار ایک نشیب میں واقع تھی اور وہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ جوانی کے سادہ و معصوم دن گزار رہی

تھی، جھونپڑی کے اردگرد چیل کے درخت کثرت سے اُگے تھے۔ ہوا جب ذرا بھی تیز چلتی پتوں میں سے ایک مترنم آواز نکلتی اور کرشنا بے خودی کے عالم میں کوئی محبت میں ڈوبا بھجن میٹھے میٹھے ہلکے ہلکے سروں میں الاپنے لگتی، اور جب وہ گاتی ہوتی کوئی مبہم سا خیال اسے گدگداتا اور وہ شوخی سے ادھر اُدھر ناچنے لگتی کبھی خودرو پھولوں کو توڑ کر سینے سے لگاتی کبھی مسل ڈالتی۔

لیکن آج جب وہ گھر پہنچی، اس کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا، اس کے دل کا سکون تباہ ہو چکا تھا، وہ بار بار سوچتی، خیالات کو ایک نکتہ پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتی، لیکن اس کا فہم و ادراک کسی زلزلہ کے ایک ہی جھٹکے نے نیست و نابود کر دیا تھا۔

اس نے چپکے سے دیا جلایا، ماں اس کی سو رہی تھی، اس نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں بیٹھ گئی۔ ہوا تیز تھی۔ دیے کا شعلہ خفیف، ایک تند جھونکے نے دیا بجھا دیا، دیے بجھنے کا اسے احساس تک نہ ہوا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی، اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا تھا، چیل کے پتوں کی صدائیں ہوا کے تموج کے ساتھ کبھی بلند ہوتیں کبھی مدھم ——— اس کا دل بھی بیٹھتا معلوم ہوتا اس کے کانوں میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "پریم پاپ ہے، پریم پاپ ہے۔" وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور جھونپڑی کے باہر نکل آئی۔ اس نے کسی غیر ارادی اقدام سے چلنا شروع کیا——

آسمان بالکل صاف تھا، ستاروں کی روشنی پہاڑی ماحول کے اندھیرے میں ایک ملکوتی شان سے کچھ سوچ رہی تھی، ستارے اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے، گویا انہوں نے کرشنا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا، اس کے جسم کا رُواں رُواں خوف و ہراس سے کانپنے لگا، اس نے دل کی دھڑکن ہاتھ سے محسوس کی۔ پھر ستاروں کی طرف دیکھا—— دونوں دھڑکنیں ہم آہنگ معلوم ہوئیں۔ وہ ایک تارے کی طرف جو مقابلتاً زیادہ روشن تھا للچائی ہوئی امیدوں کی آنکھوں سے دیکھنے لگی، اسے معاً خیال پیدا ہوا، لوگ ستاروں سے قسمتیں منسوب کرتے ہیں کیوں نہ وہ اس ستارے سے اپنی قسمت کا رشتہ جوڑ لے۔ اسنے دل میں تسلیم کر لیا، یہ ستارہ اس کی قسمت سے وابستہ ہے، ابھی وہ اس تازہ احساس کی ہلکی سی لہر سے مسرور بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ ستارہ ٹوٹ کر ایک لمبی روشن لکیر پیدا کرتا ہوا بجھ گیا اور اس کا دل ساتھ ہی دھک سے رہ گیا۔

وہ اب ندی کے قریب پہنچ چکی تھی، وہ یہاں ٹھہری، اس نے وہ مندر میں سے ہلکی سی روشنی کو دیکھا، اسے بھگوان کا خیال آ گیا، ——— اس نے دل میں دہرایا "کیا بھگوان، پریم پاپ ہے؟" وہ آگے بڑھی۔ وہ بھگوان سے پوچھنا چاہتی تھی، رات کی خاموشی میں، ستاروں کی روشنی میں، فضا کی پاکیزگی میں، تن تنہا، مندر میں جا کر بھگوان کی مورتی سے کیا پریم پاپ ہے؟

اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ———

وہ ایک عزم صمیم کے ساتھ کشتی کی طرف بڑھی، کشتی پانی کی لرزتی لہروں کے ساتھ معنی خیز اضطراب سے سر ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہی تھی، کرشنا نے گھبراتے ہوئے کشتی کو دیکھا، پھر کچھ سمجھ کر خود ہی بڑبڑائی ——— "نہیں! مجھے ضرور پوچھنا ہے بھگوان سے۔" وہ چپوؤں کو سنبھال کر کشتی میں سوار ہو گئی اور اس نے تیزی کے ساتھ کشتی کو کھینا شروع کیا، وہ ابھی کچھ دور گئی ہو گی کہ اس نے محسوس کیا، ہوا بہت تیز ہو گئی ہے اور لمحہ بہ لمحہ پانی بھی چڑھ رہا ہے۔ اس نے ایک تازہ جوش کے ساتھ چپوؤں کو حرکت دی، کشتی زور سے آگے بڑھی، اور ایک بڑے سے پتھر کے ساتھ ٹکرا کر اُلٹ گئی اور وہ چند لمحوں کے لئے ساتھ ہی پانی میں کھو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ابھری، اس کا سر چکرا رہا تھا، اور سر پر شدید چوٹ آئی تھی، وہ تیرتے ہوئے کنارے تک پہنچی۔ وہ بالکل بے دم ہو رہی تھی، اس کا سانس رُک رُک کر چل رہا تھا، اور وہ بہت اضمحلال محسوس کر رہی تھی، مندر ابھی دور تھا، وہ اور زیادہ تیزی کے ساتھ بھاگنے لگی ——— چیل کے پتوں کی سائیں سائیں، پانی کا شور، اور وہ بھاگی چلی جا رہی تھی، اس طوفانی فضا میں، بھگوان سے پوچھنے "کیا پریم پاپ ہے؟"۔

اگر اور لوبان کی بتیوں سے مندر ایک شاعر کے خواب کی طرح مہکا ہوا تھا، مورتی کے سامنے گھی کے دیے جل رہے تھے، کرشنا نے خاموش قدموں سے دروازے اور مورتی تک کا فاصلہ طے کیا۔

پجاری مورتی کے سامنے ایک طرف سو رہا تھا، اس کا سڈول جسم، اُبھرے اُبھرے شانے، کشادہ سینہ، چندن کا ٹیکہ، سیدھی مانگ کرشنا دیکھتے ہی بے خود ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا، کرشنا نے پجاری کو نظر بھر کر دیکھا، وہ چوٹ سے پہلے ہی ہوش باختہ سی تھی، اب تو بالکل مجنون ہو گئی۔ اور اس نے آگے بڑھ کر پجاری کو ایک پُرجوش بوسہ دینا چاہا۔ وہ اپنے لرزتے ہونٹ ابھی پجاری کے لبوں کے

پاس لائی تھی۔ اس کی نظریں بھگوان کی مورتی کی طرف اُٹھ گئیں۔ مورتی کی چمکتی ہوئی روشن آنکھوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ کرشنا آنکھیں چار نہ کر سکی، کرشنا کی نظریں جھپٹ چکی تھیں۔ کرشنا کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر پوچھنے کی کوشش کر رہی تھی" اے بھگوان پریم پاپ ہے؟" آخر وہ بے دم ہو کر گر پڑی اور آخری بار ایک ہچکی کے ساتھ اس نے یہ الفاظ ختم کئے۔" پ.... یم.... پاپ ہے بھگوان؟؟"

گھی کے دیئے بے پروائی سے جل رہے تھے، ندی کے پانی کی آواز ایک وحشیانہ قہقہہ بلند کر رہی تھی جنگل کے درختوں کی آوازیں ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ مندر میں آ کر بھگوان کی حالت کا اندازہ لگا رہی تھیں ——— بھگوان کی مورتی مسکرا رہی تھی، پتھر کی سفید سفید آنکھوں سے، ایک بے نیازی کے عالم میں۔

ناگاہ! پجاری اُٹھا۔ جیسے کسی ہولناک خواب سے ڈر گیا ہو۔ اس نے دھندلی نظروں سے کرشنا کی لاش دیکھی، جو ابھی موت کی خنکی سے پوری طرح ٹھنڈی نہ ہونے پائی تھی۔ اس کے اعضا میں ابھی تک حسین لوچ تھا اور دلکشی دم توڑ رہی تھی ——— اس کی خوبصورت ناک، پتلے پتلے ہونٹ اور سرمگیں آنکھیں بیجان ہو کر شرم و حجاب کی پابندیوں سے آزاد ہو گئیں تھیں۔ اس لئے فطرت نے جتنا حسن کرشنا کو بخشا تھا، وہ سمٹ سمٹا کر اس کے چہرے پر رقصاں نظر آ رہا تھا، اس کی بھیگی ہوئی چولی میں خزینۂ جذبات جو سانس کی حرکتوں سے ہمیشہ ہیجان خیز بنا رہتا تھا اب خاموش صرف ایک ایسا گول سا اُبھار نظر آ رہا تھا۔ جس کی سختی محسوس کرنے کو دل چاہتا ہو، رخساروں کی باریک رگیں موت کی تلخی سے نمایاں ہو گئی تھیں، اور اس کے لمبے لمبے سیاہ بالوں کی بھیگی ہوئی لٹیں پریشان ہو کر اس کے شانوں پر بکھر رہی تھیں ———

پجاری نے یہ سب کچھ مشاہدہ کیا، پجاری کی آنکھیں جھپکنے کی طاقت ضائع کر چکی تھیں، وہ اس منظر سے آنکھیں لڑائے کھڑا رہا۔

کرشنا مر کر پجاری کے لئے ایک عبودیت اور صدق و صفا کی دیوی بن گئی تھی، اور پہلے جو اس کا دل پتھر کی مانند سختی سے کرشنا کی نرم و لطیف محبت کو مسل چکا تھا، اب پشیمان ہو رہا تھا، ——— اس نے رحم و محبت سے کرشنا کی طرف دیکھا، اسے یہ محسوس ہوا، گویا لباس کی چستی کرشنا کے جسم کو تکلیف دے رہی ہے ——— پھر اس نے محبت بھرے جذبہ سے کرشنا کے لباس کے بند ڈھیلے کر دیئے ———

باہر خوفناک آوازیں بدستور بلند ہو رہی تھیں۔ درختوں کے پتوں کی سائیں، سائیں ہوا میں ایک طوفان پیدا کر رہی تھیں، پجاری کو دفعتاً وہ الفاظ یاد آ گئے جو کرشنا نے کہے تھے۔ اس کا دل رو رہا تھا، ———

اس نے پھر مورتی کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا وہ ایک مضحکہ خیز تبسّم سفید سفید آنکھوں میں چھپائے ہوئے تھی، پجاری کو مورتی کی یہ بے وقت ہنسی اتنی بُری معلوم ہوئی وہ غصہ سے کانپنے لگا ——— اور ایک آتشیں جوش کے ساتھ آگے بڑھا۔ مورتی کے گلے میں جو پھولوں کی مالائیں تھیں اس نے اُتار کر زمین پر پھینک دیں، تمام دیئے بجھا دیئے اور مورتی کے منہ پر جو پردہ لٹک رہا تھا۔ اسے کھول کر مورتی کا منہ ڈھک دیا۔ اس کے بعد کرشنا کی لاش کو اٹھا کر مندر سے باہر نکل گیا۔

آسمان بادلوں سے تاریک ہو چکا تھا۔ ہر چہار سمت اندھیرے کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جنگل کے درختوں سے تاریک الوؤں کی چیخیں اٹھ رہی تھیں جو خاموش ماحول کو اور بھی وحشتناک بنائے ہوئے تھیں ——— دور پجاری، کرشنا کو اٹھائے لئے جا رہا تھا، نہ معلوم کہاں ——— ؟ اتنی رات گئے!

غزل

از:- رفیع شارق (گجرات)

آنکھ کو اشکبار ہونا تھا ‎ ‎ غیرتِ لالہ زار ہونا تھا
اتنے دامن پہ گل کھلانے تھے ‎ ‎ شرحِ فصلِ بہار ہونا تھا
اُس نظر کا شکار ہونا تھا! ‎ ‎ عمر بھر بے قرار ہونا تھا
دلِ بدبخت سے خدا سمجھے ‎ ‎ میری ہستی پہ بار ہونا تھا
میرے کم بخت دل کی قسمت میں ‎ ‎ حسرتوں کا مزار ہونا تھا

حیرتِ آئینہ کو اے شارق
اُن کے دل کا غبار ہونا تھا

افکارِ پشتو

ترجمہ از:
اختر شیرانی

[ذیل میں پشتو کے ایک بلند پایہ شاعر پیر محمد کاکڑ کے اشعار کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اشعار ۲۰۰ سال قبل لکھے گئے تھے]

جب التجائے بوسہ کی محبوبۂ طنّاز سے
ابریشمیں لب ہو گئے پیچیدہ باہم ناز سے
جیسے کوئی نازک کلی
نازاں مگر محجوب ہو!

محبوبۂ شیریں ادا بستر پہ یوں خوابیدہ ہے،
جیسے غزالِ نازنیں مدہوش و آرامیدہ ہے
پھولوں کی نازک سیج پہ
جو رُوح کو مرغوب ہو!

گر میرا تکیہ بن سکیں وہ بازوئے سیمیں کبھی
سر کو اٹھاؤں میں نہ پھر اے خاطرِ غمگیں کبھی!
اس حال میں کیا رہ گیا؟
تا حشر جو مطلوب ہو!

افسانہ

مادر وطن کے فدائی

از:- اعجاز احمد خاں

یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب فرانس جرمنی سے شکست یاب نہیں ہوا تھا۔

فرانسیسی موت اور زندگی سے بے نیاز ہو کر وطن کی عزت اور اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان کے دل میں اپنی شکست کا خیال تک نہ گزرتا تھا۔

جرمنی تعداد میں زیادہ نہ تھے۔ مگر ہلاکت اور تباہ کاری کے فن میں غیر معمولی مہارت و دستگاہ رکھتے تھے۔ سائنس کو انھوں نے زرخرید لونڈی کی طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ ہولناک اور تباہ کن آلات سے آراستہ جرمن فوج فرانس کے سینے کو روندتی۔ اس کے پایہ تخت پیرس کی طرف طوفانی رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ جو لوگ جرمنوں کا مقابلہ کرنا اور ان کا راستہ روکنا چاہتے تھے وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح نیست و نابود کر دئیے جاتے تھے۔

سب سے آگے ہوائی جہازوں کا غول تھا۔ جو گولوں کی دھواں دھار بارش سے مدافعت کرنے والوں کو تباہ و برباد کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے زمین پر لرزہ طاری کرنے والے دیو پیکر آہنی ٹینکوں کی قطار تھی پھر اسلحہ اور آلات سے آراستہ پیدل اور سوار فوج اور سب سے پیچھے بدقسمت اسیران جنگ تھے۔

پیرس ایک سو میل کے فاصلے پر تھا۔

جرمنوں کی بغیر روک ٹوک آگے بڑھتی ہوئی فوج یکایک اپنے سپہ سالار اعظم کے حکم سے رک گئی۔ سامنے ایک دریا تھا جس کے پل کو فرانسیسیوں نے اڑا دیا تھا۔ دریا کو عبور کرنے کی ترکیب سوچی جانے لگی تین روز کے مسلسل مارچ کے بعد جرمنوں کو دم لینے کا موقع ملا۔

گورستان کی طرح ویران اور سنسان سرزمین پر خیمے نصب کر دئیے گئے قیام سے پہلے ہر چیز کی جانچ اور تحقیقات کی جا رہی تھی کہ قیدیوں کی محافظ فوج میں ایک بے چینی سی پھیل گئی۔ دو قیدی غائب تھے۔ ایک قد آور لحیم شحیم جوان جس کا نام جیاج تھا۔ دوسرا سترہ سال کا ایک لڑکا موسنٹے۔

ہر طرح کا شور و غل اور جبر و تشدد کر کے بھی قیدیوں کی محافظ فوج کے افسر کو کچھ پتہ نہ چلا کہ اتنی سخت نگرانی کے باوجود قیدی کیسے بھاگ گئے۔ اس نے دانت پیس کر کہا:" اچھا وہ بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ ہم انھیں خوب پہچانتے ہیں۔" افسر کی یہ بھیانک آواز دور دور تک گونج کر فضا میں گم ہو گئی۔

اس کے بعد جنگلی راستے کے کنارے کی گھنی جھاڑی سے ایک لڑکا چپکے سے باہر نکلا۔ اور اس نے ادھر ادھر دیکھ کر آواز دی" جیاج!" "چپ چپ خبردار!" یہ کہتا ہوا ایک قد آور مضبوط نوجوان سامنے کی جھاڑی سے نکلا۔ پھر دونوں اسی جھاڑی میں گم ہو گئے۔

وہ تھک کر اس قدر چور ہو چکے تھے جیسے ان میں کسی طرح کی حس ہی باقی نہ تھی۔ وہ بھوک پیاس کی شدت کو بھی محسوس نہ کر سکتے تھے۔ دو روز تک مسلسل پیدل چلنے کے باعث وہ ہلکان ہو گئے تھے۔

موسنٹے اپنے وطن میں پہنچ کر بھی اپنے وطن کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ سارا علاقہ تباہ و برباد ہو کر کھنڈر سا بن گیا تھا۔ گرے پڑے مکان کسی طرح پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ راستہ بالکل سنسان تھا۔ دن کا وقت ہوتے ہوئے بھی کہیں کوئی انسانی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف سکوت و سکون تھا۔

اس نے بہت مشکل سے اپنے مکان کو پہچانا۔ ایک طرف کے صرف تین کمرے کھڑے تھے۔ باقی مکان اینٹ پتھر۔ اور لوہے لکڑی کا ڈھیر بن گیا تھا۔

موسنٹے کے بار بار پکارنے پر بھی جب کھنڈر کے اندر سے کچھ جواب نہ ملا تو شدت غم سے موسنٹے کا کلیجہ پتھر سا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ اس کے ماں باپ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بہن سب کیا ہو گئے؟

جیاج نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:" اس طرح کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟"

موسنٹے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:" میرے ماں باپ اور . . ."

جیاج بڑے صبر و ضبط کا آدمی تھا۔ وہ اپنی سرد آہ کو چھپانے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کم سن موسنٹے کو کیا کہہ کر تسلی دے۔ جیاج کی آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئیں۔ اس کی بوڑھی ماں۔ بیوی۔ اور آٹھ برس کا بچہ سب گویا ابھی ابھی آنکھوں کے سامنے بموں سے اڑ کر ہلاک ہو گئے ہوں۔

جیاج مبہوت بنا ان پر نظر جمائے دیکھتا رہا۔ کوئی چارہ کار اس کی سمجھ میں نہ

آتا تھا۔ وہ سوچنے لگا رنج و غم سے کچھ فائدہ نہیں جو مر کھپ گیا اس کے لئے اب رنج و غم فضول ہے جو لوگ زندہ بچ گئے ہیں۔ ان کے لئے اب بھی بہت سے ضروری کام موجود ہیں۔

جیاج اٹھا اور مونٹے کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا "رونے کا وقت آیا تو رو بھی لیا جائے گا۔ ابھی اس کی فرصت کہاں ہے؟" جیاج کو زور کی بھوک لگی تھی۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد ایک کمرے میں اسے پاؤ روٹی کا کچھ چھاسکا ملا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ مزید تلاش سے کچھ چینی اور ایک بوری آلو بھی مل گئے۔ اس مصیبت اور پریشانی کی حالت کے باوجود جیاج کا چہرہ خوشی سے چمک گیا۔

کمرہ بالکل سنسان تھا۔ اس نے بڑی کوشش سے آگ جلائی۔ اور آلو بھوننا شروع کئے۔ آلو بھونتے بھونتے جیاج نے پکار کر کہا "مونٹے آؤ دیکھو تمھاری ماں ہمارے لئے بہت کچھ رکھ گئی ہیں"

کئی گھنٹے تک سستانے کے بعد دونوں باہر نکلے۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے سوا کہیں کسی آدمی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف قیامت کا عالم تھا۔ معلوم ہوتا تھا تمام انسانی دنیا تباہ ہو چکی ہے صرف یہی دونوں زندہ ہیں۔ بغیر دیکھے کوئی شخص ان تباہیوں اور بربادیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

لوگوں نے تہذیب و تمدن کے جس سرمائے کو مدتوں کی کوشش و جانفشانی سے جمع کیا تھا اسے جرمنوں کی صرف چند گھنٹے کی بے رحمی اور سنگ دلی نے نیست و نابود کر دیا۔ چاروں طرف اینٹ، پتھر، لوہے، لکڑی، سرخی، چونے کے ڈھیر اور انسانوں کے اعضاء و اجسام بکھرے پڑے تھے۔

جیاج اور مونٹے کی آہٹ پا کر اس علاقے کے بہت سے فرانسیسی جمع ہو گئے لیکن کوئی کسی کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ خوف و ہراس، رنج و غم اور بھوک و پیاس کے مصائب نے ان کی صورتیں مسخ کر دی تھیں۔ وہ ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے اور چھپے چھپے پھرتے تھے۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا سب اپنی حالت میں مبتلا تھے ان میں کسی طرح کا عزم و حوصلہ باقی نہ تھا لیکن جیاج اور مونٹے کے صبر و استقلال کو دیکھ کر لوگوں کی گم شدہ جرات و ہمت عود کر آئی اور انھیں محسوس ہونے لگا کہ ابھی وہ زندہ ہیں۔

شام ہو چکی تھی سب کے سب مونٹے کے گھر کی طرف چلے اس لئے کہ مونٹے کے گھر روٹی کے ٹکڑے اور آلو تھے۔ اور وہ بھوک کی شدت سے بے قرار ہو رہے تھے۔

مونٹے چلتے چلتے یکایک رک گیا۔ اس کے کانوں میں کچھ ہلکی ہلکی آواز آئی

ایک منہدم مکان کے انبار کے نیچے دبا ہوا کوئی آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سب نے مل کر انبار کے نیچے سے ایک بے ہوش سپاہی کو باہر نکالا۔ جیاج نے اس کی نبض دیکھی وہ بہت نحیف و نزار ہو گیا تھا۔ ایک شخص کے پاس برانڈی کی بوتل تھی تھوڑی سی برانڈی اس کے منہ میں ڈالی گئی کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے لوگوں کو تشکر و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "فرانس کا کیا حال ہوا؟ کیا دشمن ہمارے ملک کو خالی کر کے واپس چلے گئے؟"

مونٹے نے جواب دیا "نہیں فرانس کا بہت برا حال ہے۔ تمام ملک دشمن کے پیروں تلے دبا ہوا کراہ رہا ہے"

سپاہی نے جوش میں آ کر کہا "فرانس کا برا حال ہے اور تم لوگ جی رہے ہو؟ کیا تم لوگ فرانسیسی نہیں ہو؟"

"ہم فرانسیسی ضرور ہیں لیکن بے بس اور مجبور ہیں۔ ہمارے پاس اسلحہ ہے نہ رسد۔ ایسی حالت میں ہمت ہار کر ہم بیٹھ نہ جائیں تو کیا کریں؟"

"خدا تم کو سلامت رکھے" یہ کہہ کر سپاہی نے آنکھیں بند کر لیں۔

سب واپسی کے لئے بے قرار تھے لیکن معلوم نہیں جیاج بیٹھا موت کے پنجے میں گرفتار سپاہی کے چہرے کی طرف کیا دیکھ رہا تھا؟

کچھ دیر چپ رہ کر سپاہی نے یکایک حرکت کی، اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا" ہے . ہے . سب کچھ . . . . ہے . . . . بندوق ہے رسد ہے . پوسٹ آفس کے نیچے . . زمین کے اندر . سب کچھ ہے . . "

پھر رفتہ رفتہ سپاہی کا جسم سرد ہو گیا۔

واقعی کھودنے پر پوسٹ آفس کے نیچے بڑے بڑے بندھے ہوئے بکس ملے جن کے اندر اعلےٰ درجے کی رائفلیں۔ کارتوس، پاؤ روٹی اور خشک گوشت بھرا ہوا تھا۔

جیاج نے کہا "خدا نے ہمارے لئے غیب سے مدد بھیج دی ہے"

مونٹے نے اپنا گروہ تیار کرنا شروع کیا۔ بے گھر، بے در کے بوڑھے جوان اور بچے ہر طرف سے آ آ کر اس کے گروہ میں شامل ہونے لگے۔ کم و بیش سب کے سب فوجی تعلیم سے واقف تھے۔ انھوں نے فن جنگ کے ماہر جیاج کی نگرانی میں مزید فوجی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ استخلاص وطن کے لئے سب نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ سب ایک دل اور ایک زبان تھے۔ ان میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ جیسے سب ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہوں۔

جنگ کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ دشمنوں کے متعلق کسی طرح کی کوئی

خبر نہ مل سکتی تھی۔ کوئی سرکاری آدمی نظر نہ آتا تھا۔ بڑی ابتری کے ساتھ دن گزر رہے تھے۔

تمام ملک میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ پہلی حکومت شکست ہوگئی۔ اور نئی حکومت نے دشمنوں سے صلح کی بھیک مانگی ہے۔ مگر اس خبر پر کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ آخر نئی حکومت کی طرف سے اس بات کا اعلان ہوگیا کہ فرانس کی جنگ ختم ہوگئی۔ دشمن اب دشمن نہیں بلکہ دوست ہے کمپین کے عہد نامے پر دستخط بھی ہوگئے۔

معاہدے کی شرطوں کو پڑھ کر ان لوگوں کو بہت تعجب اور صدمہ ہوا۔ مونٹے نے روتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہی معاہدہ کرنا تھا تو ہم لوگوں کو جنگ کی تباہی میں کیوں مبتلا کیا گیا؟"

اس کے ساتھیوں نے گلوگیر آواز کے ساتھ مادر وطن کی قسم کھا کر عہد کیا کہ ہم اس توہین آمیز صلح کو کبھی تسلیم نہ کریں گے۔

معاہدے کے بعد نئی گورنمنٹ نے عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی۔ تمام سابق ارکانِ حکومت بدل دئے گئے۔ اور آزاد فرانس میں جن لوگوں کے بنائے ہوئے آئین اور قوانین رائج تھے۔ ان کی سختی سے نگرانی کی جانے لگی۔ مونٹے کے علاقے میں بھی فوج و سپاہ کے ساتھ نیا گورنر آیا۔ اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ علاقے کا اکثر و بیشتر حصہ تباہ اور ویران ہوچکا تھا۔ اس کے بعد وہاں کے باشندے جو ادھر اُدھر تباہ حال پھر رہے تھے۔ وہ واپس آ گئے۔

فاتح جرمن فوج واپس جانے والی تھی۔ اس کے اعزاز میں گورنر نے ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا۔ مرکزی حکومت کی طرف سے ہدایت کی گئی تھی کہ جرمن فوج کے اعزاز میں کسی طرح کی کوتاہی نہ ہونے پائے۔

جلسہ گاہ کے ایک کنارے ایک لمبے بانس میں فرانسیسی جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے نیچے جرمن پھریرا بھی لگا ہوا تھا۔ گورنر اپنی فوج کے ساتھ جلسہ گاہ میں آیا مقررہ وقت گزر گیا۔ اور جس جرمن فوج کے اعزاز میں جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ وہ نہیں آئی۔ دور، مارچ کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنے والے تھوڑی ہی دیر میں پہنچ جائیں گے۔ گورنر سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہئے؟

تھوڑی ہی دیر میں شہریوں کی ایک رائفل بند جماعت آتی ہوئی دکھائی دی گورنر کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ان سب نے جلسہ گاہ میں آنے کے بجائے جھنڈے کے پاس جا کر اس کے بانس کو پکڑ لیا۔ حکومت کے کارندے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

احرار نے جھنڈے کے بانس کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر سرکاری آدمی دوڑے گورنر بھی دوڑا۔

گورنر بولا "تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟"

جواب ملا "فرانس کے جھنڈے کے ساتھ جو بدنما نشان نظر آ رہا ہے۔ ہم اسے دور کر دینا چاہتے ہیں"

گورنر نے گھبرا کر کہا "تم لوگ پاگل ہوگئے ہو؟ جرمن فوج آیا ہی چاہتی ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس جھنڈے کو ہاتھ لگانے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور تمہاری یہ حرکت تمھیں کس تباہی اور مصیبت میں مبتلا کر دے گی؟"

مونٹے نے جواب دیا "جو ہو لیکن ہم اس بات کو جتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم جرمنوں کے اعزاز میں ایک نئے طرز کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں"

رائفل بند احرار وطن نہایت مضبوطی سے جھنڈے کے بانس کو تھامے ہوئے تھے جن کو بزور علیحدہ کرنا ناممکن تھا۔

گورنر نے عاجز آ کر کہا "جانتے ہو تمہاری اس مجنونانہ حرکت کا نتیجہ کیا ہوگا ہزاروں عورتوں اور بچوں کی جانیں مفت ضائع ہو جائیں گی۔ اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہو جائے گی"

مونٹے نے جواب دیا "ہاں جانتا ہوں جب آپ لوگوں نے نشیب و فراز کی پروا نہیں کی۔ اور اپنی رائے کے مطابق جنگ چھیڑ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام فرانس تباہ و برباد ہوگیا۔ تو ہمیں بھی حق ہے کہ ہم بھی جو مناسب سمجھیں کر گزریں۔ اگر ہماری وجہ سے نقصان بھی ہوا تو کتنا ہوگا؟ یہاں نہ عورتیں ہیں نہ بچے۔ جن کے مارے جانے کی ہمیں پروا ہو۔ جو لوگ امن پسند اور بزدل ہیں۔ ان کے پاس موٹریں ہیں۔ وہ اپنی جانیں لے کر بھاگ جائیں گے"

"تمھارے اس کام میں کتنے آدمی شریک ہیں؟"

"اگر آپ اسے دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو دیکھئے" مونٹے کے اتنا کہتے ہی اس کے ساتھیوں نے سرسر کر کے جرمن پھریرا نیچے کھینچ لیا۔

قریب ہی مارچ کرنے اور بینڈ بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اتنے میں مختلف مقامات سے ایک ساتھ گڑ گڑ دم گڑ دم کر کے بہت سی رائفلیں سر ہوئیں۔

مونٹے گورنر سے مخاطب ہو کر بولا "دیکھا"

گورنر گھبرا گیا اور پاگلوں کی طرح "ملک کو تباہ کر دیا" کہتا ہوا اپنی موٹر کی طرف جھپٹا۔

تھوڑی دیر کے لئے جرمن فوج میں بھی سراسیمگی پھیل گئی لیکن جلد ہی صورت حال ان کی سمجھ میں آ گئی غضب آلود دیووں کی طرح آگ اگلنے والے ٹینکوں مسلح گاڑیوں اور مشین گنوں۔ سواروں اور پیدلوں نے آ کر مونٹے اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے مروجہ اصطلاح میں شاید جنگ نہ کہا جائے "صرف چند سرپھروں کا خبط و جنون" قرار دیا جائے لیکن حریت پسند فرانسیسی عوام اسے ہرگز خبط و جنون قرار نہ دیں گے۔

مسلسل کئی گھنٹے تک سلسلہ جنگ جاری رہا جس کا انجام اس طرح ہوا کہ کوئی حریت پسند فرانسیسی جاں باز زندہ و سلامت باقی نہ رہا سب کے سب حرمت وطن پر قربان ہو گئے۔

قیدیوں کی محافظ فوج کا افسر ختم ہوتے ہوئے دن کی آخری روشنی میں اپنے مفروروں کو تلاش کر رہا تھا کہ ناگہاں اس کی نظر مونٹے پر پڑی جو اب تک خون میں نہایا ہوا۔ فرانسیسی جھنڈے کے چوب کو سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے کو چوب سے باندھ دیا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک لمبے قد کا نوجوان پڑا تھا۔ وہ مونٹے کا ساتھی جیاج تھا۔

محافظ فوج کے افسر نے دونوں کو دور سے دیکھ کر کہا "موقع پاکر بھاگ گئے تھے۔ اب دیکھیں بھاگ کر کہاں جاتے ہیں؟"

لیکن اسے جلد ہی اپنی غلط فہمی کا پتہ چل گیا۔ اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس عالم میں پہنچ چکے ہیں۔ جہاں نہ انھیں کوئی گرفتار کر سکتا ہے اور نہ ان کو محکوم اور غلام بنا سکتا ہے۔

(براہ راست بنگلہ سے ماخوذ)

نظم

تمھیں بتاؤ

از:- ابوالفطرت میر زیدی

تمھاری نذر اپنی ابتدائی مسرتوں کی بہار کر کے — تمھارے قدموں پہ اپنے بچپن کی شوخیوں کو نثار کر کے
زباں سے بے اعتبار ہو کر نگاہ کا اعتبار کر کے — قرار کی بے قراریوں میں تمھارے بچپن سے پیار کر کے

تمھیں بتاؤ کہ نوجوانی میں ہم تمھیں کس طرح نہ چاہیں؟

تمھیں بھی ہوں گے وہ یاد شاید جو کھیل کھیلے تھے گھر تمھارے — وہ کھیل ایسے تھے کچھ کہ ان میں نہ تم ہی جیتے نہ ہم ہی ہارے
وہ دن وہ راتیں، وہ گل وہ بوٹے، وہ قصر شاہی وہ چاند تارے — نہیں اگر یاد۔ یاد کر کے وہ دیکھے بھالے حسیں نظارے

تمھیں بتاؤ کہ نوجوانی میں ہم تمھیں کس طرح نہ چاہیں؟

وہ اپنی تعریف کر کے بچپن میں اپنی خوبی ہمیں سنا کر — وہ راز کی بات سن کے ہم سے وہ دونو ہاتھوں سے منہ چھپا کر
وہ انگلیوں سے اشارہ کر کے وہ جاتے جاتے ہمیں بلا کر — پھر ایک بار آج اسی ادا سے گلوں کے سائے میں مسکرا کر

تمھیں بتاؤ کہ نوجوانی میں ہم تمھیں کس طرح نہ چاہیں؟

بھلا دیا اپنے دل سے شاید ہمارا مطلق خیال تم نے — تمھارا حصہ ہے یہ بھی صاحب کیا ہے یہ بھی کمال تم نے
کیا نہ ہم سے جوان ہو کر کسی طرح کا سوال تم نے — کیا تھا اول بھی ہم کو حیراں دکھا کے اپنا جمال تم نے

تمھیں بتاؤ کہ نوجوانی میں ہم تمھیں کس طرح نہ چاہیں؟

نظم

وادیِ ماوراجوار

از:-

مولانا محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری"

چاندنی راتیں بیابانوں کی دیکھ
بستیاں خاموش انسانوں کی دیکھ
سبزی جنگل کے ویرانوں کی دیکھ
بے خودی فطرت کے مے خانوں کی دیکھ
خطۂ ماور[1] کے سبزہ زار دیکھ
جلوۂ نظارۂ رجوار دیکھ

وہ پہاڑوں کی قطار اندر قطار
جس کی ہر وادی پہ خود قدرت نثار
قلۂ کہ پر وہ سبزے کی بہار
دیکھ کر پھر جس کو دیکھیں بار بار
وہ ذرہ اور وہ ہوائی سائیں سائیں
دامن کہ کے وہ منظر دائیں بائیں

آسماں پیما چڑھائی اک طرف
اور پھر تحت الثرائی اک طرف
دست قدرت کی صفائی اک طرف
صبح کی نغمہ سرائی اک طرف
اک طرف گلہائے خود رو رنگ رنگ
اک طرف جنگل میں وہ صحرائے بنگ

اک ندی آتی ہے لہراتی ہوئی
زور پر پانی کے اتراتی ہوئی
راہ کی ہر شے کو ٹھکراتی ہوئی
بلکہ آگے آگے لے جاتی ہوئی
ہے نڈر وہ حق پرستوں کی طرح
چال بھی اس کی ہے مستوں کی طرح

---

[1] وادی ماور نالۂ مادر کے نام پر مشہور ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "آب مادر بہ از آب کوثر"

شور و غل کرتی ہوئی گاتی ہوئی — سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی
جوش میں کچھ جھاگ سے لاتی ہوئی — پتھروں سے سر کو ٹکراتی ہوئی

سوئے پستی ہے رواں کس شوق سے
سوئے آبادی دواں کس شوق سے

پُرفضا میداں فرازِ کوہ پر — جس کے ہر گوشے میں جنت کا اثر
جس کی وادی وادیٔ گلہائے تر — کہتے ہیں ہنگس جسے اہلِ نظر

جس جگہ نزہت بھی ہے نکہت بھی ہے
سیر بھی، تفریح بھی صحت بھی ہے

راج پور دیکھ اور نرچل ڈارہ بھی دیکھ[۵۲] — نادرِ قدرت کا گہوارہ بھی دیکھ
خلق کے گلشن کا فوارہ بھی دیکھ — فوق سا پھر کوئی آوارہ بھی دیکھ

ڈھونڈھ اس کو اور وہ مل جائے اگر
خطۂ کشمیر کی پھر سیر کر

پر بتا اے ناظرِ فرخندہ فال — گر نہ ہو تیری طبیعت کو ملال
ان کا بھی اس سیر میں آیا خیال — جن کی صورت ہی ہے خود صورت سوال

کہہ رہا ہے جن کا بوسیدہ پھرن[۵۳]
میں تنِ مردہ کا ہوں کہنہ کفن

---

۵۲ راج پور اور نرچل ڈارہ وادی راج وار کے علاقہ داروں کے دو مشہور گاؤں ہیں جو سرسبز جنگل اور شاداب کہسار کے دامن میں واقع ہیں۔

۵۳ پھرن، پیراہن کا بگڑا ہوا نام ہے جو کشمیریوں کا عام لباس ہے۔ یہ کبھی بدلا جاتا ہے نہ دھویا جاتا ہے۔ بلکہ سانپ کی کینچلی کی طرح بوسیدہ ہو کر بالعموم خود بخود ہی اتر جاتا ہے۔

افسانہ

دیوانی عورت

از:- صادق اسلام آبادی۔ بی۔ اے۔

اس چیز نے میرے دل میں فرانس اور روشیا کی یاد تازہ کر دی مسٹر اینڈرلن نے کہا۔ "آپ میرا نیمبرگ ڈی کاسیل والا مکان تو جانتے ہی ہیں۔ پرشیا کی افواج کے داخلے کے وقت میں وہیں ٹھیرا ہوا تھا۔ یہاں میری ہمسائی ایک دیوانی عورت تھی۔ جو بعض مصائب کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ لوگ بتاتے ہیں کہ پچیس سال کی عمر میں ایک ہی ماہ کے عرصے میں اس کا باپ شوہر اور ننھا بچہ چل بسے تھے۔

جب موت کسی گھر میں داخل ہوتی ہے تو ہمیشہ اچانک ہی واپس بھی ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت اپنا راستہ جان جاتی ہے یہی حال اس عورت کا تھا جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا۔ اور وہ زیادہ دیر تک غم برداشت نہ کر سکی تو مجبوراً اسے اپنے آپ کو سپرد بستر کرنا پڑا چنانچہ وہ تقریباً چھ ہفتوں کے قریب مرض سرسام میں مبتلا رہی۔ اس بیماری کے بعد ضعف کے دورے پڑنے شروع ہوئے۔ اور وہ چلنے پھرنے سے بالکل عاری ہو گئی۔ اس کے لئے کھانا بالکل حرام ہو گیا۔ ضعف کی وجہ سے وہ اپنی آنکھیں گھمانے کے سوا بالکل کچھ نہ کر سکتی تھی۔ لوگ اسے بٹھانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ ہر بار اُن سے اس طرح چیخ مارتی۔ گویا وہ اسے ہلاک کرنا چاہتے ہیں یہاں تک کہ لوگ پھر اسے اسی حالت میں چھوڑ دیتے۔ وہ اسے صرف غسل کے لئے۔ یا کپڑے بدلنے کے لئے یا کبھی کبھی اس کا بستر بدلنے کے لئے باہر لاتے۔

اس عورت کے ساتھ ایک بوڑھا نوکر رہتا تھا جو اسے کبھی کبھی پینے کو پانی اور کھانے کو گوشت وغیرہ دے دیتا۔ لیکن اس غمناک دل میں کونسی چیز گھر کر گئی تھی۔ اس چیز کو کوئی نہ جانتا تھا کیونکہ مندرجہ بالا واقعات کے بعد عورت نے اپنی قوت گویائی کھو دی تھی۔ کیا وہ ان مرحوموں کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی؟ کیا وہ اپنے اندوہناک خواب دیکھ رہی تھی؟ کچھ بھی ہو لیکن وہ یقیناً اپنے دیرینہ واقعات بھول چکی تھی۔

پندرہ برس تک وہ اسی سکون اور خلوت میں رہی۔

اسی اثناء میں جنگ چھڑ گئی اور جرمن شہر کاسیل میں داخل ہو گئے۔ مجھے یہ سب باتیں بالکل اس طرح یاد ہیں جیسے یہ سب واقعات صرف کل ہی رونما ہوئے۔ اس وقت سردی نہایت شدت کی پڑ رہی تھی۔ اور میں خود نمونیا کے درد کی وجہ سے آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ میں جرمن سپاہیوں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن رہا تھا۔ میں ان سب کو اپنے مکان کی کھڑکی میں سے بآسانی دیکھ سکتا تھا۔

وہ ایک بحر بے پایاں کی طرح بڑھتے اور ایک سیل بے پناہ کی طرح بکھرے چلے آ رہے تھے چنانچہ جب جرمن فوجی افسروں نے سپاہیوں کو لوگوں کے گھروں کی حفاظت کے لئے تعینات کیا تو میرے حصے میں سترہ سپاہی آئے۔ میری ہمسائی یعنی دیوانی عورت کے مکان کی حفاظت کے لئے بارہ سپاہی مقرر کئے گئے۔ ان بارہ سپاہیوں میں ایک میجر بھی شامل تھا۔

شروع کے چند ایام نہایت اچھی طرح گزرے لیکن جلد ہی ساتھ کے ایک مکان کے فوجی افسر کو کسی نے بتا دیا کہ یہ عورت بیمار ہے۔ مگر متعینہ افسر نے عورت کی بیماری کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور اسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس افسر نے لوگوں سے پوچھا کہ اس عورت کو کیا بیماری ہے اسے بتایا گیا کہ وہ پندرہ برس سے ایک بہت بڑے صدمے کی وجہ سے بستر علالت پر پڑی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افسر نے اس بات کو بالکل نہ مانا اور اس کے برعکس یہ سوچا کہ یہ بستر علالت پر محض اس لئے پڑی ہے کہ وہ پرشیا کے سپاہیوں کو دیکھنا نہیں چاہتی۔

اس افسر نے اس عورت سے ملنے پر بہت اصرار کیا۔ چنانچہ اسے مریضہ کے کمرے میں لے جایا گیا اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ستم رسیدہ عورت کو یوں مخاطب کیا۔ "خاتون! میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر نچلی منزل میں تشریف لے چلیئے تاکہ ہم سب آپ کو دیکھ سکیں۔" اُس عورت نے فوجی افسر کی طرف نہایت مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور اس کی درخواست کا بالکل کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر اس فوجی افسر نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ میں اس سے زیادہ گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اگر آپ خود بخود نہ اٹھ کھڑی ہوئیں تو میں بڑی آسانی سے آپ کو مجبور کر سکتا ہوں کہ آپ بغیر کسی چیز کے سہارے کے خود چل پڑیں۔

لیکن وہ عورت اس پر بھی خاموش رہی۔ اور ایسا ظاہر کیا۔ جیسے اس نے کسی کی بات تک نہیں سنی۔ وہ بالکل غیر متحرک رہی۔ اس پر فوجی افسر بھڑک گیا

ہوا۔ کیونکہ وہ اس خاموشی کو اپنے لئے باعثِ توہین سمجھتا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر گرجا اور کہا: "اگر تم کل تک نیچے نہیں اترو گی ۔۔۔ " یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن خوف زدہ بوڑھے نوکر نے اس عورت کو کپڑے پہنانے کی کوشش کی لیکن دیوانی عورت نے بڑے زور سے چلانا شروع کر دیا اور اپنی تمام طاقت کپڑے نہ بدلنے پر صرف کر دی اس پر وہ فوجی افسر نہایت تیزی سے اوپر آیا۔ نوکر نے فوجی افسر کو دیکھتے ہی دیوانی عورت کو اس کے قدموں پر ڈال دیا اور خود چلا چلا کر کہنے لگا

"جناب وہ نیچے نہیں آئے گی! جناب وہ نیچے نہیں آئے گی مہربانی فرما کر آپ اس پر رحم کریں۔ کیونکہ یہ بڑی بدنصیب ہے۔" اس وقت وہ فوجی افسر ایک عجیب کشمکش میں پھنسا ہوا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اپنے سپاہیوں کو حکم دے کر وہ اسے جبراً گھسیٹ کر باہر لے آئیں۔ یکایک اس افسر نے ہنسنا شروع کیا۔ اور اپنے سپاہیوں کو جرمن زبان میں چند احکام صادر کئے تھوڑی دیر بعد سپاہیوں کی ایک ٹولی ایک بستر کو سنبھالے ہوئے نظر آئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی مجروح شخص کو کسی نے اٹھا رکھا ہے۔ اس بستر پر وہ عورت نہایت خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔ اور ان سب واقعات سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک لیٹے رہنا ہی سب کچھ تھا۔ اس بستر کے پیچھے ایک نوکر زنانہ کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھائے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔ عین اس وقت اس فوجی افسر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "ہم ابھی دیکھیں گے کہ تم اس طرح اکیلی کپڑے نہیں پہنتیں۔ اور ہمارے ساتھ تھوڑی دور سیر کس طرح نہیں کرتیں۔"

اس کے بعد تمام جلوس ہمارے گھر کے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب وہ سپاہی واپس آئے تو انھوں نے دیوانی عورت کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ انھوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ اسے کہاں لے گئے۔ ان سوالات کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہ تھا

برف دن رات مسلسل پڑ رہی تھی جس نے کہ تمام میدانوں اور جنگلوں کو سفید چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ بھیڑئے۔ ہمارے گھروں تک آ پہنچے اور ہمارے دروازوں پر پنجیں مارنے لگے۔

اس حالت میں اس عورت کا خیال رہ رہ کر میرے دل میں چٹکیاں لیتا۔ میں نے پرشیا کے حکام سے درخواست کی تاکہ اس عورت کا کوئی سراغ مل سکے یہاں تک کہ میں اس کوشش میں تھک کر چور ہو گیا۔ آخر کار جب موسم بہار آ گیا بعض فوج واپس چلی گئی لیکن میری ہمسائی کا مکان بند رہا یہاں تک کہ اس کے باغ کی روشوں پر بہت گھنا گھاس اگنا شروع ہو گیا۔ بوڑھا نوکر موسم سرما میں مر چکا تھا۔ اور کسی کو میرے پڑوس کا خیال تک نہ گزرتا تھا۔ دنیا میں صرف میں ہی ایک ایسا انسان تھا جو اس مکان کے متعلق ہمیشہ سوچتا رہتا۔ انھوں نے اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کیا وہ جنگل میں ان سے بچ کر نکل گئی؟ یا کسی شخص نے اسے دیوانگی کی حالت میں دیکھا۔ اور اسے شفاخانے لے گیا؟ لیکن ان میں سے کوئی چیز میرے شکوک کو دور نہ کر سکی حتیٰ کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میری پریشانی دور ہوتی گئی۔

ہاں تو اس خزاں میں جنگلی پرندے عام تھے۔ اور خوش قسمتی سے گٹھیا کے درد سے مجھے بھی کچھ آرام تھا میں اپنے آپ کو گھسیٹ کر جنگل تک لے گیا۔ میں اس سے قبل چار یا پانچ لمبی چونچ والے پرندوں کا شکار کر چکا تھا۔ اس وقت میں نے ایک اور پرندے کو اپنے شکار کا نشانہ بنایا۔ اور وہ ایک گڑھے میں جا گرا۔ یہ گڑھا سوکھی ٹہنیوں سے بھرا تھا۔ چنانچہ مجھے اس گڑھے میں اترنا پڑا تاکہ میں اس پرندے کو وہاں سے نکال سکوں جب میں گڑھے میں اترا تو یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پرندہ کسی انسان کے کاسہ سر کے قریب گرا ہے یکایک مجھے اس دیوانی عورت کا خیال آیا جو میرے دل میں ایک نشتر کی طرح چبھ کر رہ گیا۔ شاید اور کتنے انسان اس سال میں اس ہولناک جنگل کی نذر ہوئے ہوں گے میں نہیں بتا سکتا کیونکر؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے اس مقتول دیوانی عورت کا کاسہ سر دیکھا۔

اچانک تمام واقعہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا وہ اس کو بستر سمیت اس سردی میں یہاں چھوڑ گئے ۔۔۔۔ یہاں اس ویرانے میں ۔۔۔۔ تاکہ وہ اپنی یادگذشتہ میں محو رہے۔

اس نے اپنے آپ کو اس برف کے نیچے اپنا ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہلاک کر لیا۔

اس کے بعد جیسے اسے کھا گئے ہوں ۔۔۔ اور آدم خور پرندوں نے اس کے پھٹے ہوئے بستر کی اون سے اپنے گھونسلے بنا لئے ہوں گے میں نے اس کی بچی ہوئی ہڈیوں کو ایک جا اکٹھا کیا۔ اور اب میری صرف یہی دعا ہے کہ ہماری نسل میں سے آئندہ کوئی بھی جنگ جیسی ہیبت ناک چیز نہ دیکھے۔ "ماپساں"

نظم

محبّت!

از:۔
محترمہ ع۔ جہاں بیگم ادا بدایونی

محبت ایک راز ہے!
وہ راز جو دماغ میں ہو نشّہ بن کے جلوہ گر
وہ نشّہ جو حیات کو بہشت کر دے سربسر
شعور سے بلند تر
محبّت ایک راز ہے

محبت اک نگار ہے!
تمام صدق و سادگی، تمام حسن و کافری
تمام شورش و خلش مگر بطرز دلبری
شکست جس کی برتری!
محبت اک نگار ہے

محبت اک سحاب ہے!
کہ ہے یہ کوئی نازنیں بکھیرے زلف عنبریں
لئے جلو میں صد ہزار عشوہ ہائے دل نشیں
گہر نواز در مریں
محبت اک سحاب ہے

محبت ایک ناز ہے!
وہ ناز جو حیات کو نشاطِ جاوداں کرے
زمیں کے رہنے والوں کو جو عرش آشیاں کرے
نہ فرقِ این و آں کرے
محبت ایک ناز ہے!

محبت ایک خواب ہے!
حسین و ناز آفریں فرشتے جس کو دیکھ کر
کریں نثار رات بھر ستارہ ہائے سیمبر!
مسرتوں سے بے خبر!
محبت ایک خواب ہے

محبت اک گناہ ہے!
لٹے نہ کاروانِ بو، رہے جو غنچہ میں نہاں
صدف سے باہر آکے پھر گہر کی آبرو کہاں!
ہوئی جو محرمِ زباں
محبت اک گناہ ہے!

مطائبات

شہ پارے

از:- (ابرمی انصاری ۔ بی۔ اے)

(۱) چوں چوں کا مربہ

ایک ادیٹر کی زندگی تنوع کے لحاظ سے چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے اگر آپ کو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے کبھی کسی کرسیٔ ادارت کو زینت دینے کا فخر حاصل ہوا ہے تو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ایڈیٹر کی زندگی کس طرح "چوں چوں کا مربہ" بن جاتی ہے۔ لیکن قارئین "شاہکار" کی ایک بڑی تعداد کو چونکہ یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ کہ مدیرانِ رسائل و جرائد پر کیا گزرتی ہے۔

دفتر میں کام ہو رہا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کا قلم سیاہ و سپید کا مالک بنا ہوا کاغذ پر برابر گھس رہا ہے۔ اتنے میں ایک صاحب چھڑی گھماتے اور ٹائی کو درست کرتے ہوئے تشریف لاتے ہیں اور آتے ہی خود ایڈیٹر سے سوال کرتے ہیں۔ "ایڈیٹر صاحب کون سے ہیں؟" جواباً عرض کیا جاتا ہے۔ فرمائیے کیا ارشاد ہے۔ آنے والے صاحب جھٹ جیب سے ایک بھاری پلندہ نکالتے ہیں اور اسے بصد تمکنت ایڈیٹر کی میز پر دے مارتے ہیں اور پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ میرا ایک غیر مطبوعہ مضمون ہے جسے میں نے ایک سو ایک کتابیں اور دو ہزار لغت دیکھنے کے بعد تحریر کیا ہے۔ مولانا چراغ نگار ایڈیٹر "آبشار" کئی مرتبہ اس مضمون کو حاصل کرنے کیلئے تحریر کر چکے ہیں۔ لیکن میں نے نہ چاہا کہ ایسا معرکہ آرا مضمون ان کے ذلیل رسالہ میں شائع ہو۔ یہ مضمون اس لئے آپ کے پاس لیکے آیا ہوں۔ اوّل تو مجھے آپ کے جریدہ فریدہ سے بے حد محبت ہے۔ دوسرے اس کا معیار بہت بلند ہے۔ تیسرے آپ کی ذات والا صفات سے مجھے کامل امید ہے کہ آپ میری محنت کی داد دیں گے اگر یہ مضمون آپ نے اس رسالہ میں شائع کر دیا تو میں آپ کو اپنے دادا جان کی سوگند کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ ناظرین اسے بیحد پسند کریں گے۔ اور صرف اس ایک حیرت انگیز اور بلند پایہ مضمون کی بدولت آپ کے رسالہ کی اشاعت تنگی کیا چوگنی ہو جائے گی۔ اور یہ چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جائے گا۔ اور بک سٹالوں پر ڈھونڈے سے ایک جلد بھی نظر نہ آئیگی

شکریہ کے ساتھ مضمون قبول کیا جاتا ہے۔ یہ صاحب دس پانچ سگریٹ اور دس بیس گلوریاں ضائع کرنے کے بعد تشریف لے جاتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب سراپا حیرت بنے بیسویں صدی کے اس علمی شاہکار کو ملاحظہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن پہلی ہی سطر پڑھتے قلم ہاتھ سے چھوٹ پڑتا ہے۔ اور ناک پر لگا ہوا چشمہ دور جا گرتا ہے۔ لکھا ہوتا ہے:۔

"آپ سے ملنے کی مدت سے آرضو تھی۔"

ایڈیٹر صاحب "آرضو" کو دیکھ کر سر پیٹ لیتے ہیں۔ اور بال نوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر قارئین کہیں اس مضمون کو پڑھ لیں تو شاید انہیں رونا ہی آجائے۔ اور وہ مضمون نگار کو پوری دو ہزار ایک سو ایک دعائیں دیں۔

یہ تو مقامی حضرات کا تذکرہ تھا۔ آپ ذرا ان مضمون نگاروں کا ذکر سنئے جو اپنے "رشحاتِ قلم" بذریعہ ڈاک روانہ فرماتے ہیں۔ ایک صاحب غزل ارسال کرتے ہیں۔ غزل تو جیسی کچھ ہے سو ہے اس کی "پیشانی" پر یہ عبارت کندہ فرماتے ہیں:۔

"تسلیم بصد تعظیم! آپ کے رسالے کے لئے ایک عدد غزل بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ اسے پسند ہی نہیں بلکہ جلی حروف میں پورے صفحہ پر شائع فرمائیں گے۔ سب سے پہلے میرے دو مضمون "منقار" دہلی میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد دو غزلیں رسالہ "زمیندار" میں چھپیں اب ایک غزل "شاہکار" کو بھیج رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ اسے ضرور چھاپ دیں۔ ورنہ آپ کی خیر نہ ہوگی۔" غزل کے نیچے آپ نے اپنا اسم گرامی و نام نامی یوں ثبت کیا ہے:۔

"از قلم معزز رقم خانصاحب الف خاں مدظلہ العالی۔"

پہلی دو سطور میں غریب ایڈیٹر پر دھونس جمانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ "معزز رقم" پرانے لکھنے والے ہیں۔ ان کے دو مضمون "منقار" میں چھپ چکے ہیں۔ اور اب جناب کی یہ حالت ہے سہ

مدت ہوئی کہ اپنا منقار زیر پر ہے

ان مضامین کی اشاعت کے بعد دو غزلیں رسالہ "زمیندار" کو بھیجیں۔ لیکن ایڈیٹر نے کور ذوقی کا ثبوت دیتے ہوئے دونوں کی دونوں ردی کی

ٹوکری میں ڈال دیں۔ ہائے افسوس وائے افسوس! بچاروں نے مایوس ہو کر اب "شاہکار" پہ نظر عنایت کی لیکن ہمیں ڈر ہے کہ "خانصاحب معزز رقم" کی غزل کے ساتھ ایڈیٹر صاحب "زمیندار" کے مدیر کا سا سلوک نہ کریں۔

اپنے آپ کو اپنے قلم سے "معزز رقم" یا "چلتی رقم" اور خانصاحب لکھنا ان صاحب کا ہی کام ہے۔ اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو اور معزز رقم صاحب کا "اعزاز ارقام" دیکھئے کہ کسی مصلحت کی بنا پہ آپ روزنامہ کو رسالہ بتاتے ہیں۔ ان سے کیا بعید ہے جو یہ کل کلاں "معارف" اعظم گڑھ کو اخبار لکھ دیں اور اگر ایسا نہ کریں تو بچارے ان کا معزز رقم ہونا کس طرح ثابت ہو۔ حکومت نے انہیں خانصاحب کا خطاب نہ دیکر ان کی ذوقی ادبی علم دشمنی کا مظاہرہ کیا۔ اس جذبہ کی تسکین کیلئے آخر انہوں نے خود ہی "خانصاحب" کا لفظ دیکھتے ہی ایڈیٹر پہ لرزہ طاری ہو جائے گا اور فوراً ان کی مرسلہ غزل کاتب کے حوالے کر دے گا اور اسے حکم دیگا۔ کہ دیکھو فلاں "معزز رقم" کی غزل ہے۔ نہایت احتیاط سے لکھنا ایسا نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں مگر خانصاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ مدیران جرائد بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ ان پہ جاپانی "خان حاجی" کا جادو نہیں چل سکتا اور نہ "معزز رقم" ایسے پرشوکت القاب انہیں کسی قسم کی خرافات شائع کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

ایک دوسرے شاعر غزا ایک نظم روانہ فرماتے ہیں۔ "مکتوب لف ہذا" میں تحریر ہے "چند اشعار حاضر خدمت ہیں۔ واضح ہو کہ ان اشعار پر آپ کو نظر ثانی کی زحمت اٹھانی نہیں پڑے گی۔ کیونکہ ایک قابل استاد ان پر اصلاح دے چکے ہیں۔ آئندہ بھی جو کلام آپ کو بھیجا جائے گا وہ اصلاح شدہ ہوگا۔"

یہ الفاظ ان صاحب کو تحریر کرنے کی زحمت اس لئے اٹھانی پڑی کہ گزشتہ اشاعت میں ایڈیٹر نے ان کے اشعار پہ اصلاح دیکر اس لئے شامل منظومات کر لیا تھا کہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ کیونکہ ؎

مباش درپے آزار ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

لیکن اس شاعر بے بدل کو ایڈیٹر کی "استادی" قبول نہیں۔ اس لئے کسی دوسرے "قابل استاد" کا دامن پکڑا ہے کہ جگ ہنسائی نہ ہو۔ مگر لطف یہ ہے کہ جو اشعار آپ نے ارسال فرمائے ہیں وہ ابھی تشنۂ اصلاح ہیں۔ اب اگر ایڈیٹر نے ان کے اشعار پر اب کی پھر اصلاح دیدی تو بچارے کسی تیسرے قابل استاد کو تلاش کریں گے اور نہ معلوم کے اسی پھیر میں ایک روز جان سے ہاتھ دھو لیں گے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجعُون۔

ایک اور شاعر صاحب جن کا خیال ہے کہ ان سے بڑا شاعر آج تک مادر ہند نے پیدا نہیں کیا۔ اپنے ایک عتاب نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ —
"واہ صاحب واہ آپ نے میری فلاں غزل کیوں نہ چھاپی۔ حالانکہ میں نے اسے لختِ جگر کھا کر اور خونِ دل پی کر لکھا تھا۔ آپ نے میری غزل سے سوتیلانہ سلوک کیا اور اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ گویا ان کی غزل نہ ہوئی بلجیم کا ملک ہو گیا۔ البتہ اتنی فرو گذاشت ایڈیٹر سے ضرور ہوئی کہ تعویذ خیال کر کے ان کی غزل کو جو لختِ جگر کھا کر اور خونِ دل پی کر لکھی گئی تھی حرزِ جان نہ بنایا اور چاندی کے خول میں منڈھوا کر بازو پر نہ باندھا کہ ایک بے نظیر شاعر کی یادگار تھی۔ اور بقول ذوق ؎

چھلا نہیں تو چھلے کا گل اے نگار دے
پر کچھ نشانی اپنی ہمیں یادگار دے

یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ ورنہ اس قسم کے بیسیوں خطوط ہر روز غریب ایڈیٹر کو موصول ہوئے ہیں جنہیں پڑھ کر وہ بیچارا پاگل تو نہیں لیکن نیم دیوانہ ضرور ہو جاتا ہے اور جب تک چند یا پر دو چار دفعہ ہاتھ نہیں پھیر لیتا اور سگریٹ کے دو چار کش نہیں لگا لیتا۔ اس کی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہوتی ہے۔ اب آپ ہی خدا لگتی کہئے کہ ایک ایڈیٹر کی زندگی جوں چوں کا مربہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اگر آپ کو یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے تو خدا آپ کو بھی کبھی ایک عمدہ ایڈیٹر بنا دے۔ پھر آپ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کلاش نے صحیح لکھا تھا۔ مگر ؎

ہر چہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

(۲) بارش اور عروض

بظاہر بارش اور عروض میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن آپ کو اگر خدا نے چشم بصیرت عطا فرمائی ہے اور ذوقِ سخن آپ کو ارزاں ہوا ہے تو آپ قدرے غور و خوض کے بعد اس نکتہ کو سمجھ جائیں گے کہ بارش اور عروض میں کیا تعلق ہے۔ ممکن ہے یہ عقدہ حل کرتے ہوئے آپ کو زحمت ہو اس لئے بندۂ درگاہ یہ خدمت بجا لاتا ہے۔

لاہور میں ان دنوں ساون بھادوں کا سماں بندھا ہوا ہے۔ آسمان پہ نیلی نیلی بدلیاں جھوم جھوم کر آتی ہیں اور آن کی آن میں جل تھل کر جاتی ہیں

شاید حضرتِ میکائیل موسم برشگال کے "بارانی خسارہ" کو کثرت سے پورا کرنا چاہتے ہیں - تاکہ دنیا کا آبی میزانیہ متوازن ہو جائے - اس رعایت سے جناب میکائیل کو عالمِ آب و گِل کے فنانس ممبروں کا استاد کہنا ناموزوں نہیں ٹھہرتا - ایک تو استاد اور پھر آسمانی یعنی ایک تو زر اور پھر کامل عیار -

کبھی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے - کبھی بوندا باندی شروع ہو جاتی ہے - کبھی ایک دم موٹی موٹی بوندیں اس زور سے پڑتی ہیں کہ نو رونز کی پریڈ میں خالی بندوقوں کے فائر بے اختیار یاد آ جاتے ہیں - مینہ کے جھالے آتے ہیں اور باغ و راغ کو سیراب کرتے ہوئے کوہستان کی بارش کا نقشہ محو کر جاتے ہیں -

اسی مضمون کو اگر علمِ عروض کی اصطلاحوں میں بیان کیا جائے تو یوں کہنا ہوگا - کبھی شاعرِ فطرت غزل سرا ہوتا ہے اور گاہے وفورِ شوق میں دو غزلہ سہ غزلہ پڑھ جاتا ہے - کبھی سامعین گیتی کو پُرزور اور پُرشکوہ قصیدہ سناتا ہے - اور کبھی ترجیع بند اور مسمط سے سامع نوازی کرتا ہے - اگر بارش لگاتار ہوتی رہے - تو اسے مثنوی سے تعبیر کرنا چاہیئے - البتہ ملک الشعراء حضرتِ میکائیل کے دیوان میں رباعیات کا پتہ ہی نہیں چلتا - شاید اخرب و اخرم اوزان سے پرہیز کیا ہو - کیونکہ جہانِ خراب کو اخرب کہنا بھلا معلوم نہیں ہوتا - پانی مسدود گڑھوں میں کھڑا النغمہ سرائی کر رہا ہے اور کہیں مستطیل گہرائیوں میں شاہدِ فطرت سے محوِ تکلم ہے - کہیں سطحِ زمین سے اسقدر نیچا ہے کہ اسے وتدِ مفروق کا نام دینا چاہیئے اور جہاں دو بڑی بڑی جھیلیں قریب قریب مصروفِ شعر خوانی ہوں اسے وتد مجموع اور مکالمۂ شعری سمجھنا چاہیئے - جس کسی بازار میں تیس تیس گز تک پانی کی چادر پھیلی ہوئی ہو اسے فاصلۂ کبریٰ خیال فرمائیے اور جس جگہ مسافت قدرے کم ہو اسے فاصلۂ صغریٰ کہہ لیجئے -

اگر آج خلیل بن احمد بصری اور نظامی عروضی زندہ ہوتے تو نہ معلوم اور کتنی اصطلاحیں عروض میں داخل ہو جاتیں اور عین ممکن تھا کہ "اصولِ افاعیل" دس کی بجائے بیس تیس یا خدا جانے کتنے ہو جاتے - یوں سمجھئے بچ گئے ورنہ طالبانِ عروض اصولِ افاعیل دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑتے اور لوگ لخلخہ لیکر ان کی طرف دوڑتے -

کیچڑ کے لئے ابھی ایک اصطلاح رہ گئی - اسے جملہ مصائبِ سخن کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے - یعنی خواہ کیچڑ کو حشو و زوائد کہیئے خواہ رکاکتِ مضمون و سخافتِ سخن کا نام دیجئے - غرض جو آپ کے جی میں آئے کہہ لیجئے - "کیچڑ" کے بارے میں نادرست نہ ہوگا -

اگر گارا سخت ہو تو اسے "اثقال" کہئے - اگر نرم اور دلدلی ہو تو سست بندش بتائیے - اور اگر اس میں اینٹ پتھر بھی ہوں تو پھر اسے حشوِ قبیح اور زیادتیٔ زحاف کہئے - اور اگر پانی زیادہ اور کیچڑ کم ہو تو اسے مضمونِ رکیک و سخیف کا نام دیجئے - لوگ آپ کی عروض دانی پر ایمان لے آئیں گے - اور آپ کو پیغمبرِ سخن کے لقب سے یاد کیا کریں گے -

اگر آپ نے تھوڑے سے غور و فکر سے کام لیا اور ہماری معروضات کو گوشِ ہوش سے سماعت فرمایا تو ہمیں یقین ہے کہ پھر آپ کو "حدائق البلاغت" اور "بحر العروض" دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہ ہوگی اور حسرت موہانی کی "نکات سخن" اور نزمی انصاری کی "امیر العروض" الماریوں کی زینت ہو کر رہ جائیں گی -

اگر یہ اصطلاحات چل نکلیں تو ان درسگاہوں کے اساتذہ جہاں السنۂ شرقیہ پڑھائی جاتی ہیں - اپنے شاگردوں کو کسی بارش کے دن گلی کوچوں کی سیر کرایا کریں گے اور کہیں گے لو بھئی یہ دیکھو سبب خفیف اور وہ رہا وتدِ مجموع - اسے کہتے ہیں عیب تنافر اور یہ ہے شتر گربہ - اس عملی تربیت اور عینی مشاہدہ کے بعد بھی اگر طلبا عروض کو مشکل بتائیں تو ان کے کودن اور غبی ہونے میں کس احمق کو شک ہو سکتا ہے -

(۳) مسٹر چیمبرلین کی چھتری

پچھلے دنوں مسٹر نیول چیمبرلین سابق وزیر اعظم برطانیہ کی چھتری کی تصویر اکثر اخبارات اور رسائل میں چھپی تھی - شاید آپ نے بھی دیکھی ہو - کہنے کو تو وہ ایک معمولی قسم کی چھتری ہے - مگر اس میں کچھ ایسی تاثیر ہے کہ برطانوی اخبارات کے مطابق اس کے دستہ پر ہاتھ رکھتے ہی پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل چٹکی بجانے میں حل ہو جاتے ہیں، اور یہ وہی تاریخی چھتری ہے جو معاہدۂ میونخ کے وقت مسٹر چیمبرلین کی رفیق سفر تھی

لاہور کے گورے اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا بیان ہے کہ یہ چھتری مسٹر چیمبرلین کو ان کی زوجۂ محترمہ یا نصفِ بہتر نے بطور تحفہ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ پر پیش کی تھی - اس چھتری کی عمر اس حساب سے چالیس سال ہوتی ہے - اور یہ کپڑا ان چار مرتبہ جو لا بھی بدل چکی ہے - مسٹر چیمبرلین اپنی رفیقۂ حیات کی خاطر سے اسے چھاتی سے لگائے پھرتے ہیں - ورنہ چالیس چالیس سال کی بوسیدہ اشیا کون اپنے پاس رکھتا ہے -

یہ چھتری اپنے مالک کی طرح اب عمر رسیدہ ہوگئی ہے جب یہ جوان تھی تو لوگ اس کے حسنِ عالمگیر پر فریفتہ تھے۔ دورِ زمانہ سے بچاری کے گال پچک گئے ہیں اور چہرہ پر جھریاں نمودار ہوگئی ہیں ؎

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

چونکہ اب وہ پہلا سا حُسن نہیں رہا۔ نہ اس میں وہ دلکشی اور دلربائی رہی۔ اس لئے اب یہ بیچاری فقط پیرانِ سالخوردہ کی محبوبہ ہے۔ مگر وفاداری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ بہتیرے ہوس پیشہ عشاق نے اس سے ربط ضبط پیدا کرنا چاہا۔ مگر یہ اللہ کی بندی ایک کی ہو کر رہ گئی۔ اور چالیس برس کی طویل مدت فردِ واحد کی آغوش میں گزار دی ؎

آفریں باد بریں ہمتِ جانانۂ تو

اور سچ پوچھئے تو صاحب یہ اس طرح وار لونڈی کا ہی کام تھا۔ دوسری کوئی ہوتی تو چنچل نار کی طرح ہر شخص سے یارانہ گانٹھتی پھرتی۔

کسی شاعر نے کہا تھا ؎

نشاطِ عمر باشد تا بسی سال
چو چل آید فرو ریزد پر و بال

مگر چالیس برس پورے کرنے پر بھی اس چھتری کے دم خم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی جوانوں کی سی پھُرتی۔ وہی مستعدی اور وہی تیکھاپن جو شباب کا آئینہ دار ہوتا ہے اس میں پایا جاتا ہے اور دنیا کا ایک بڑا آدمی اس کے سہارے بڑے بڑے کام کر گزرتا ہے۔ میر انیس نے تلوار کی شان میں کہا تھا

دم خم وہی چم خم وہی گھر گھاٹ وہی ہے
تلوار تو کہنہ ہے مگر کاٹ وہی ہے

تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اس شعر کو مسٹر چیمبرلین کی چھتری کی شان میں خیال فرمائیے۔ اگر تمام دنیا کی تاریخ آپ کی آنکھوں تلے نہ پھرنے لگے تو ہمارا ذمہ۔

حُسنِ اتفاق سے یا سوءِ اتفاق سے اگر یہی ”چھتری“ کو ”کلتاش“ کے قبضہ میں ہوتی تو لوگ کہتے لو جی کیا کنجوس آدمی ہے۔ چالیس برس سے ایک ہی چھتری کو لئے لئے پھرتا ہے۔ کوئی کہتا بیچارا مفلس آدمی ہے۔ غریب میں اتنی ہمت کہاں کہ نئی چھتری خریدے۔ کوئی بول اٹھتا اسے چرانا کیا ہے۔ ہم سے تو کبھی اسے آسودہ حال دیکھا ہی نہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ جو ذرا ہمدرد قسم کے لوگ ہوتے وہ اسے ہمارے ہاتھ میں دیکھ کر فرماتے ”مولانا اسے کلکتہ کے عجائب گھر میں بھیجدیجئے۔ وہاں نوادر میں شمار رہوگی اور آپ کو بھی کچھ پیسے ہاتھ آجائیںگے“ مگر ہم میں اتنا شعور کہاں کہ چالیس برس کی اشیاء کو سنبھال کر رکھتے پھریں۔

ہمارے پاس تو خیر سے ایک چھتری ہے بھی لیکن ہمارے ایک دوست نے لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کی خاطر پورے اٹھارہ سال سے کوئی چھتری خریدی ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے نہ چھتری ہوگی نہ لوگ اس کی بابت چہ مے گوئیاں کریں گے۔ ٹھیک ہے نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھے ناچے گی۔

ہمارے ان دوست کی دور اندیشی کی داد دینا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے پاس اگر اٹھارہ برس کی پرانی چھتری ہوتی تو کیا عجب کہ اس کی تصویر بعض اخبارات و رسائل کی زینت ہوتیں اور اس کی شان میں قصیدہ خوانی ہوتی۔ آخر مسٹر چیمبرلین کے پاس ایک بوڑھی چھتری ہے تو اس کا ذکر چند اخبارات میں آیا۔ اگر سرے سے کوئی چھتری موجود ہی نہ ہوتی تو آپ ہی انصاف کیجئے کہ کس طرح ہمارا قلم اس کی تعریف میں صفحہ کے صفحہ سیاہ کر ڈالتا۔

اور ہاں ایک بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ کبوتروں کی بھی ایک چھتری ہوتی ہے۔ جس پر وہ اڑنے سے پہلے اور اُڑنے کے بعد دم لیا کرتے ہیں۔ مسٹر چیمبرلین جب میونخ تشریف لے گئے تھے تو وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر گئے تھے۔ تو کہیں اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ مسٹر چیمبرلین کوئی کبوتر ہیں اور وہ ”اڑنے سے پہلے اور“ اڑنے کے بعد اس چھتری پر بیٹھ کر سستایا کرتے ہیں۔ حاشا و کلاّ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں اور نہ اسے آپ ”سانپ کی چھتری“ سمجھ لیجئے جو موسم برشگال میں اکثر نظر آیا کرتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہی چھتری ہے جسے بنگالی بابو سردیوں میں دھوپ سے بچنے کی خاطر لگائے پھرا کرتے ہیں۔ اور بمبئی میں سرِ شام چوپاٹی کے ریگ زار پر اکثر فیشن ایبل تتلیاں افزائشِ حسن کے لئے ساتھ لئے گھوما کرتی ہیں۔

(۴) پڑھنا اور لکھنا

اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ صاحب پڑھنے اور لکھنے میں کیا فرق ہے۔ تو آپ یہی کہیں گے کہ سیدھی سی بات ہے۔ پڑھا جاتا ہے آنکھوں اور زبان کی امداد سے اور لکھا جاتا ہے قلم کے ذریعہ۔ لیکن بندہ نوازنہ گستاخی معاف۔ پڑھنے اور لکھنے میں یہ فرق نہیں۔ بلکہ اصل فرق یہ ہے کہ پڑھنا جلد آتا ہے اور لکھنا دیر میں۔ پڑھ تو غالباً ہر شخص سکتا ہے لیکن

لکھ کوئی کوئی ہی سکتا ہے۔ اور ہم نے اکثر پڑھے ہوؤں کو دیکھا ہے کہ وہ ایک سطر نہیں لکھ سکتے۔ اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اور اس روشنی میں دیکھتے ہیں کہ لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ امید ہے آپ لکھنے اور پڑھنے کے فرق کو سمجھ گئے ہوں گے۔
ہم جب پڑھا کرتے تھے۔ تو لکھنا نہیں جانتے تھے اور جس روز سے لکھنا سیکھا ہے پڑھنا بھول گئے ہیں۔ کیا آپ کو کبھی کبھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے۔ لکھنے پڑھنے میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ طوطی باوجود حیوان ہونے کے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن لکھ نہیں سکتا۔ اب فرمائیے جو لوگ لکھ نہیں سکتے ہم انہیں کیا کہیں۔

لاہور چھوڑتے ہوئے

از:- سجاد ہاشمی چنیوٹی

گلشنِ لاہور کی رنگین بہارو الوداع — الوداع ارضِ مقدّس کے نظارو الوداع
آسمانِ دل کے تابندہ ستارو الوداع — الوداع اے خلدِ چمن کے ماہ پارو الوداع

چھوڑ کر لاہور پھر سوئے وطن جاتا ہوں میں
فرقتِ احباب کی دل میں خلش پاتا ہوں میں

ہائے کیا کیا نعمتیں پائی تھیں میں نے بے بہا — تا ابد جن کو نہ بھولے گا دلِ دردآشنا
خواب میں تڑپائے گی لاہور کی رنگیں فضا — محفلیں احباب کی یاد آئیں گی صبح و مسا

قمریاں باغِ وطن میں جب ترانے گائیں گی
یادگاریں گلشنِ لاہور کی تڑپائیں گی

فرقتِ احباب سے دل غرقِ خوں ہونے لگا — خانۂ بیکس کا پرچم سرنگوں ہونے لگا
حالِ دل غم کے تصور سے زبوں ہونے لگا — ہائے میرا بخت کیسا واژگوں ہونے لگا

حسرت و اختر کی محفل آج چھٹ جانے کو ہے
دولتِ علم و ادب سب میری لٹ جانے کو ہے

آہ اے چرخِ کہن تیرا نہیں کچھ اعتبار — تیری گردش سے لباسِ فصلِ گل ہے تار تار
جنسِ آدم کو نہیں تیری ہوائیں سازگار — ایک شاعر اور سو فکریں تف اے لیل و نہار

اے فلک معلوم کیا تجھ کو مرا کیا حال ہے
اس جہاں میں میری ہستی کسقدر پامال ہے

نظم

ایک حسینہ کی شادی پر

از:- مشتاق بھٹی بی۔ اے (آنرز)

شاعر کا نظریہ ہے کہ حسن سادگی اور معصومیت کا ایک پیکر ہے جس کا مقصد محض تخلیق شعر ہے۔ ایک سبک خرام مترنم ندی ہے جس کے نغمات کی شیرینی صرف اس کی آزادروی تک ہے۔

سن رہا ہوں تیرے گلشن میں خزاں آنے کو ہے
زندگانی کا تری نقشہ بدل جانے کو ہے

رنگ دانش کے لئے معصومیت آمادہ ہے
آہ! گل کھانے کو تیرا پیکر گل زادہ ہے

سادگی پر عقل کی عیاریاں چھانے کو ہیں
حسن کو بھی آہ! پختہ کاریاں آنے کو ہیں

آرہا ہے گلستاں میں لالۂ صحرا ترا
ہو رہا ہے جذب جوئے آب میں دریا ترا

لٹ رہا ہے کائناتِ شعر کا رنگیں وجود
کھو رہی ہے اپنا مقصد تیری ہستی کی نمود

موجِ بوئے گل میں اب آمیزشیں ہونے کو ہیں
مستیٔ سادہ سے پیدا لغزشیں ہونے کو ہیں

آہ! یہ انفاس کا نشہ چھلک جانے کو ہے
جوشِ بو سے فطرتِ سادہ بہک جانے کو ہے

رنگِ خوبی اڑ رہا ہے شعر کی تصویر سے
حسن جکڑا جا رہا ہے رسم کی زنجیر سے

حسن کا سازِ ترنم ریز اب خاموش ہے
آہ! اب وہ نغمۂ عشرت رہینِ گوش ہے

میرے افسانے میں اک خاموش عنصر تھا ترا
بے خبر سرخی سے تیری نقش رنگیں تھا مرا

تیرا پیکر شعریت کو سر بہ سر الہام تھا
تیری ہر جنبش میں شاعر کے لئے پیغام تھا

سیلِ موسیقی مرا اس ساز میں آسودہ تھا
نقشِ تخییلِ محبت راز میں آسودہ تھا

عالم ایجاد تھا حیراں مرے افکار پر
جھومتے تھے نغمہ ہائے نو بنو اس تار پر

آہ! جذبِ شعریت کا اب وہ مرکز مٹ گیا
کاروانِ شوق اپنا گردِ رہ میں گم ہوا

مجھ کو لیکن اپنی مرگِ شعریت کا غم نہیں
میں تو روتا ہوں کہ اب آہوں میں تابِ رم نہیں

غنچۂ نورستہ لٹوانے کو ہے نقدِ حیات
لفظِ عورت لا رہا ہے تیرا پیغامِ ممات

موجِ مضطر کس لئے مشتاقِ ساحل ہو گئی؟
کیا خیال آیا کہ تو پابندِ محمل ہو گئی؟

طیور آوارہ

ملاپ

از :-
حفیظ رومانی

پہلے صرف روحیں ملتی تھیں اور جسم ملنے کے لئے بیتاب تھے اب جسم بھی مل گئے ہیں اور روحیں مسکرا رہی ہیں۔ آرزوئیں جھوم رہی ہیں۔ اور شوق مرتعش —— آ اس ملاپ کی ملکوتی فضا میں زندگی کا کوئی ایسا شاہکار کھینچیں کہ ہماری محبت نقش دوام بن جائے۔ اور ہمارا راز ایک ابدی افسانہ

آہیں، آنسو اور انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں —— آ! محبت سے ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایسی فضا میں پہنچ جائیں ؛ جس کے خواب ہماری برسوں کی تگ و دو دیکھتی رہی ہے آ! کہ اب ہر خواب کو حقیقت میں منتقل کر دینے کا اختیار مل چکا ہے۔

ہم محبت کرتے تھے۔ محبت کی کٹھن، دشوار اور مشکل راہیں ہمارے حوصلوں کو کبھی کبھی کمزور کر دیتی تھیں۔ لیکن دلوں کے خلوص۔ اور محبت کے استقلال نے ہماری مشکلات کو آسان کر دیا۔ ہماری محبت کی ناؤ ہچکولے کھا کھا کر آخر زندگی کے ایک شاداب اور سدا بہار ساحل سے آلگی ہے۔ اب ہماری زندگیاں ہمارے لئے طویل شیرینیاں بن سکتی ہیں۔ اگر ہم اپنے نئے مشاغل کی دلچسپیوں اور اہمیتوں سے توازن کا ایک ایسا رنگ پیدا کریں جو حوادث کی دھوپ سے اور زیادہ کھلے۔

ہم محبت سے اس طرح گھل مل جائیں، ہماری سانسوں میں نئے شام و سحر رقص کرتے ہوں۔ ہماری آرزوئیں نکہت گل کی طرح لطیف اور سبک خرام ہوں، ہمارے قہقہے نغموں کی ایک ابدی جھنکار، اور ہمارے آنسو شعلہ و شبنم کے امتزاج کا لازوال حسن!

یہ سب کچھ ہو، مگر زندگی ایک شعلہ کی اڑتی ہوئی سانس کی طرح بے بضاعت نہ ہو کہکشاں صرف ایک رات چمکنے والے ستاروں کا بجھتا سا تبسم نہ ہو بلکہ قوس قزح ازل سے لے کر ابد تک چھائی ہو۔ اور ہماری محبت اور ملاپ کا ماحصل کچھ اتنا بلند ہو کہ ہمارے ہونے اور نہ ہونے میں ایک غیر معمولی امتیاز نظر آئے۔

اک سانس میں جہاں کی حلاوت سمیٹ لے
اک لمحہ گرم محفل راز و نیاز ہو!

مسرت

از :-
ای۔ ڈی۔ ڈین سلیم (کرنال)

اے مسرت! تو نے لڑکپن میں مجھ سے وعدہ کیا تھا... کہ میں ایک وفادار محبوبہ کی مانند زندگی بھر ساتھ رہوں گی.... لیکن بچپن کا زمانہ گذرتے ہی تو نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں اور ایک بے وفا حسینہ کی مانند جدا ہو گئی......

میں اب تک عاشق صادق کی طرح دن رات تیرا انتظار کرتا، ماہی بے آب کی مانند تڑپتا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہاتا ہوں.... تیرے بغیر زندگی بے مزہ و بے لطف معلوم ہوتی اور دنیا اجاڑ دکھائی دیتی ہے..... قدموں میں ڈگمگاہٹ، ہاتھوں میں رعشہ اور آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں... برسوں کا مریض معلوم ہوتا ہوں

مجھے یاد ہے، میں نے عالم طفولیت میں تجھے کبھی نہیں ستایا اور رولایا.... تیرے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہا۔ پھر تو عالم شباب میں مجھ سے کیوں روٹھ گئی؟

خدا کے لئے اتنی سنگدل و بے وفا نہ بن......

میں نے دنیا کے پہاڑوں، میدانوں اور بیابانوں کا گوشہ گوشہ چھان مارا..... لیکن تیرا نشان نہ مل سکا.... دنیا کے شاعر، فلاسفر اور مدبر بھی تیرا پتہ بتانے سے قاصر ہیں... کیا تو زمین والوں سے خفا ہے یا صرف مجھی سے جدا ہو گئی ہے؟

شاید قدرت نے نئی دلہن کی مانند تجھے ہزاروں پردوں میں چھپا رکھو ہو.... تاکہ تیرا حسین چہرہ کوئی نہ دیکھ سکے...... میں خدا سے دعائیں، منتیں اور التجائیں کرکے تجھے دیکھوں گا....

ممکن ہے تیرا مسکن کسی ستارے میں ہو.... اگر مجھے اسکا پتہ معلوم ہو جائے ... تو میں وہ ستارہ بھی نوچ کر لے آؤں.....

دیکھ تجھے بلانے کیلئے شہنشاہ وقت اپنی سلطنت امیر دولت اور جوانمرد اپنی صحت نثار کرنے کو تیار ہیں۔ مگر میرے پاس سلطنت دولت اور صحت کچھ بھی نہیں جو تیری بھینٹ چڑھا سکوں۔ ... لیکن... اے مسرت! اگر تو ایکبار مجھے مل جائے تو میں اپنی آدھی عمر تجھ پر قربان کر دوں!

نظم

مزدور بیوہ کی عید

از ثاقب سلمانی بی۔ اے۔

ایک بیوہ ڈس چکے تھے جس کو سیم وزر کے ناگ — کھو چکی جس کی جوانی لُٹ چکا جس کا سُہاگ
زندگی کی تازگی چہرے پہ مُرجھائی ہوئی — مَوت کی خُونی ہنسی آنکھوں میں شرمائی ہوئی
پابرہنہ، پیرہن چاک اور آلودہ جبیں — دیدہ پُرنم مضمحل، ژولیدہ مو، تر آستیں
سسکیاں بھرتی تھی سینے میں جوانی کی اُمنگ — سینۂ مجروح و پُر آشوب میں انفاس تنگ
سُوکھ کر کانٹا ہوئی خشکی سے تالُو میں زباں — پپڑیاں ہونٹوں پہ اور چہرے پہ پیدا جُھرّیاں
میل سے چکٹے ہوئے گاڑھے کے کپڑوں کے سوا — محرمِ رازِ دلِ حسرت زدہ کوئی نہ تھا
کچھ نہ پوچھو گھاس کے ٹوٹے ہوئے چھپر کا حال — رینگتے تھے جن میں زہریلے سنپولوں کے خیال
جل رہے تھے دیدۂ بے خواب میں اشکوں کے داغ — ایک ننھا لال تھا اجڑے ہوئے گھر کا چراغ
تیسرا دن تھا کہ فاقوں میں بسر ہوتی تھی رات — رُوکھے سُوکھے چند ٹکڑوں پر گزر ہوتی تھی رات
ضعف سے لرزی ہوئی جاں اور فاقوں سے نڈھال — رات دن اپنے اُسی معصوم بچے کا خیال
زندگی اپنے گناہوں کی سزا سمجھے ہوئے — یعنی جینے کو بھی ہے اک ابتلا سمجھے ہوئے
گھورتی تھی آسماں کو دیکھ کر باصد عتاب — اس طرح کرتی تھی رو کر اپنے مالک سے خطاب
"ہائے اک مزدور بیوہ کا کوئی پرساں نہیں — تیری دُنیا میں غریبی کا کوئی درماں نہیں
بے اثر ان زر کے بندوں پر مری آہ و فغاں — جن کے گھر بہتی ہیں دولت کی سنہری ندیاں
اس نظامِ سیم و زر کو آج ٹھکراتی ہوں میں — بزمِ ہستی سے یوں ہی ناشاد اُٹھ جاتی ہوں میں

عید کا دن اور اک مزدور بیوہ سوگوار
شرم اے قارونِ اعظم شرم اے سرمایہ دار

نئی کتابیں

یادِ ہمنشیں

مرتبہ قاضی محمد شکیل عباسی ندوی - استاذ فارسی جارج اسلامیہ انٹر کالج - گورکھپور۔

ضخامت ۵۰ صفحے - کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ - قیمت درج نہیں مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ چھوٹی سی کتاب ان چند پرسوز نظموں اور رباعیوں اور قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے جو قاضی صاحب نے اپنی وفا پرست، نیک سیرت، خاموش طبیعت، خوش اخلاق اور با مروت نوجوان بیوی کی بے وقت اور ناگہانی موت سے متاثر ہو کر وقتاً فوقتاً کہے اور دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ ہجوم غم کی وجہ سے کلام اگرچہ کچھ بے ربط سا ہو گیا ہے۔ اور بعض بعض اشعار میں زبان کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مگر جذبات اثر سے خالی نہیں ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رونے والا لاغر روتا چلا گیا ہے اور اشک ہائے بے قرار دل کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر اشعار کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ نظم "کس طرح بھولوں" سارے مجموعہ کی جان ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

تجھے بھولوں مگر تیری محبت کس طرح بھولوں
تجھے بھولوں تری پاکیزہ سیرت کس طرح بھولوں

اس مجموعہ کی اشاعت سے مقصد دوستوں کو غم میں شریک کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرنا اور اس حقیقت کا اظہار کرنا ہے کہ ایک محبت کرنے والی نیک بیوی کس طرح شوہر کے دل پر حکومت کر سکتی اور اپنی یاد کے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ سکتی ہے ؎

شکیلؔ اشعار میں رونا ہے - دل کا میل دھوتا ہے
اسے یونہی سپرد نالہ و فریاد رہنے دو

ہندوستانی عورتوں کو اس کتاب کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے۔

اردو مثنوی کا ارتقا

صفحات ۱۴۳ - سائز ۲۲x۲۹ - کاغذ سفید عمدہ - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے مصنف عبدالقادر سروری ایم - اے - ایل - ایل بی - استاد ادب اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (حیدرآباد دکن)

مثنوی ہماری شاعری کی ایک اہم صنف ہے جو مظاہر قدرت کی مصوری، جذبات انسانی کی ترجمانی اور تخیل کی صورت گری میں خاص طور پر کام آتی ہے۔ تاریخ کے طویل واقعات - فرضی افسانے عشق و محبت کی داستانیں - رنج و فرقت کے قصے اور فلسفہ و تصوف کے مسائل اس میں بڑی آسانی سے سما جاتے ہیں - چونکہ طویل شعری کارناموں کی تکمیل میں زیادہ توجہ، محنت، فکر، ربط خیال - احساس تناسب، ترتیب اور تعمیر کی ضرورت ہوتی ہے - اس لئے یہ صنف غزل اور قصیدے کی نسبت ہمارے شعراء کی بہت کم تختۂ مشق بنی ہے اور غالباً اسی لئے اس کی علیحدہ کوئی ارتقائی تاریخ نہیں لکھی گئی —

پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ایم - اے - ایل ایل بی - استاذ ادب اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب میں اردو مثنوی کی پیدائش سے لے کر موجودہ دور تک اسکی ترقیوں اور تبدیلیوں کی مختصر تنقیدی تاریخ پیش کر دی ہے اور ہر عہد کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے - اپنے بیان کی تصدیق اور مختلف ادوار کی زبان اور انداز بیان کا فرق ظاہر کرنے کیلئے اگرچہ زیادہ مثالیں نہیں دی گئیں تاہم ایسی مثنویوں کے اقتباسات دے دیئے گئے ہیں - جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں - یا اگر چھپ گئی ہیں تو عام طور پر مشہور نہیں ہوئیں - چونکہ اس کتاب کی داغ بیل قطب شاہی عہد کے ایک شاعر "ابن نشاطی" کی مشہور مثنوی "پھول بن" کے مقدمے کے طور پر رکھی گئی تھی جو بعد میں اتنا پھیل گیا کہ علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کرنا پڑا - اس لئے اردو کے دیگر مراکز کی نسبت مصنف کی توجہ زیادہ تر دکن کی طرف ہی رہی ہے - یہاں تک کہ موجودہ ترقی یافتہ شاعری کو "فطرت کی طرف واپسی" اور سلاست پسندی کے جدید رجحان کو "ایک رجعت پسندانہ تحریک" قرار دے کر آخر میں یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ "جب یہ تحریک ارتقا کے پورے مدارج طے کر لے گی تو اردو کی جدید ترین شاعری قدیم ترین اور خاص طور پر دکھنی دور کی شاعری سے قریب تر ہو جائے گی۔" کتابت کی بعض فرو گذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب اردو زبان اور ادب کے متعلمین کیلئے بیحد مفید ہے۔

ماہنامہ

شاہکار لاہور

دسمبر

۱۹۴۰ء

قیمت فی پرچہ

نگران

شمس العلماء علامہ تاجور

پنجاب کے قادر الکلام شاعر حضرت منظور بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کا مجموعۂ کلام

دیروحرم

کے نام سے شائع ہو چکا ہے

شمس العلماء علامہ تاجور مدظلہ کی رائے

میں نے "دیروحرم" کے جستہ جستہ مقامات کو دیکھا میری رائے میں ادبی مذاق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے

ایڈیٹر شاہکار کی رائے

منظور صاحب شاعری کے جدید دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اور پنجاب کے جواں نگار شعرا میں خاص پایہ رکھتے ہیں

دیروحرم کا تعارف ہندوستان کے پایہ ناز ادیب علامہ کیفی دہلوی نے لکھا ہے۔

دیروحرم میں رومان کے ساتھ ساتھ آپ کو وطنی۔ قومی اور اصلاحی شاعری کے بلند پایہ شاہکار ملیں گے۔

دیروحرم غزلوں، نظموں، گیتوں اور منظوم افسانوں کا دلفریب مجموعہ ہے۔ جس کے ہر صفحہ پر شاعر نے ادب کے شاہوار موتی بکھیر دئے ہیں۔

دیروحرم کی زبان پاکیزہ۔ تخیل ارفع اور اسلوب بیان دلکش ہے۔

دیروحرم کی ہر نظم اور ہر غزل ندرت نگاری کا شاہکار ہے۔ ہر شعر اور ہر مصرع شاعر کے وسعت مطالعہ۔ عمیق نگاہ اور پرواز تخیل کا بین ثبوت ہے۔

علامہ کیفی دہلوی دیروحرم کو پنجاب کی بہترین ادبی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ ضخامت ... ۲۰۰ صفحہ۔ سائز ...

قیمت مجلد :- دو روپے (عہ)

پتہ :- لاہور بک شاپ۔ نسبت روڈ۔ لاہور

جلد ۱۲ فہرست مضامین ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴ عیسوی نمبر ۳

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے ←
عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر ←
دفتر "شاہکار" محمدی منزل واقع محمڈن سٹریٹ ←
فلیمنگ روڈ لاہور سے شائع کیا ←

صفحۂ اختر

تہنیت نامے شاہکار کے مدیر اور ہمارے محترم بزرگ شمس العلماء علامہ تاجور مدظلہ کی خطاب یافتگی پر ملک کے ہر گوشے اور ہر طبقہ ادب سے جو تہنیت نامے موصول ہوئے ان کی تعداد دائرۂ شمار سے باہر ہے ہم گزشتہ پرچہ میں ان خطوط میں سے اکثر کا انتخاب اور خلاصہ شائع کر چکے ہیں لیکن اب یہ حال ہے کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رکھا گیا تو کئی سال تک جاری رہے گا ہم اس سلسلے کو ختم کرتے ہیں اور شاہکار اور مدیر مولٰنا کی طرف سے ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے تقریب خطاب پر اپنی مخلصانہ مبارکباد کے پیغامات سے یاد فرمایا۔

الہامات علامہ سیماب اکبرآبادی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اُن چند شعراء میں سے ایک ہیں جن کو اردو شعر کے نامی اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس اشاعت میں ہم ان کی ایک تازہ غزل شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں ہمیں امید ہے کہ علامہ محترم آئندہ بھی وقتاً فوقتاً "شاہکار" کو یاد فرماتے رہیں گے۔ زیر نظر غزل اُن کے صاحبزادے اعجاز صاحب نے ارسال فرمائی ہے ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں

طوفان کے بعد ہمارے عزیز دوست شہزاد صاحب اختر کے مضامین شاہکار کی سابقہ اشاعتوں میں شائع ہو کر قبول عام حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس اشاعت میں ان کا جو افسانہ شائع کیا جا رہا ہے وہ خصوصیت کے ساتھ قابل داد ہے۔ اس میں نفسیاتی کا کردار کامیاب انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہم اس پر اختر صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان کے افسانہ نگاری کے عروج اور ترقی کے متمنی ہیں۔

دوراہے ریاض شمیم صاحب کا افسانہ دوراہے بھی اپنی نفسیاتی تحلیل کی بلندی کے لحاظ سے قابل تحسین ہے اس میں نوجوانی کی نفسیاتی کا تجزیہ جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ ناظرین کی توجہ خاص حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔ اسے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے خود افسانہ نگار کو ان حالات سے سابقہ پڑا ہے جن کو افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کے مجموعی اثرات اس ماحول کی غمازی کر رہے ہیں جس کا اظہار لکھنے والے نے کامیابی سے کیا ہے۔ اس سے پیشتر بھی ہم شمیم صاحب کا ایک قابل داد افسانہ شائع کر چکے ہیں۔

جلوہ گزشتہ اشاعت میں محمد امتیاز اللہ خاں تاجؔ کا جو افسانہ شائع ہوا ہے وہ ان کا طبعزاد نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔ اور باوجود اس کے کہ تاجؔ صاحب نے افسانے کے آخر میں مصنف کا نام لکھ دیا تھا کاتب صاحب نے غلطی سے ... دیا۔ تاجؔ صاحب نظم و نثر میں کامل مہارت رکھتے ہیں اور کئی رسالے ... کا ادبی اشاعت اس رسالے کی ... پائیگی کی دلیل ہو سکتی ہے ... یہ ہے کہ وہ ... "شاہکار" سے دلچسپی رکھتے ... کی ... لوگ ... اور اس کا افسوس ہے کہ مذکورہ افسانے کے ... کی غلطی سرزد ہو گئی۔ اس نمبر میں ان کی نظم "جلوہ" شائع ہو رہی ہے۔ ... نعرہ سیاست کی ... مستحق داد ہے

انتقام محترمہ حفیظہ سلطانہ کا افسانہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے ہماری تحسین و داد کا مستحق ہے "رومان" ... کے نام سے افسانے چھپ رہے ہیں۔ اور ان کے افسانے "قبول خاطر و حسن و سخن" کی حیثیت کے حامل ہیں۔

فضائی طاقتیں ہمارے دیرینہ دوست اور ... جماعت کوکب شادانی ... "شاہکار" کی بزم تحریر میں شامل ہو رہے ہیں۔ افسانہ جو انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے علمی رنگ کا حامل ہے اور اپنی نوعیت انداز کے لحاظ سے عام افسانوں سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں امید ہے کوکب آئندہ بھی اس نوع کے افسانوں کا ترجمہ کرتے رہیں گے

نرسی بھگت ہمیں پچھلے دنوں ... تاشش کمپنی کی مشہور فلم "نرسی بھگت" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ فلم دھارمک ہے۔ اور قربانی۔ سچائی بھگتی اور صبر و ضبط کی ایسی اعلیٰ مثالیں پیش کرتی ہے جو زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کی ترقی اور پاکیزگی سے مالا مال ہیں۔ کہانی ایم۔ بی دیو کی ہے۔ اور مکالمے پنڈت شری ... نے لکھے ہیں۔ ہیرو کا پارٹ وشنو پنت پگنس نے اور ہیروئن کا مسز درگا کھوٹے نے کیا ہے ہم اس فلم کو ہندو پبلک کے لئے خصوصیت کے ساتھ قابل دید خیال کرتے ہیں اور ان کی بہترین توجہات اس طرف مبذول کراتے ہیں۔

ا۔ش

حرف و حکایت

مولانا نیاز فتحپوری

"—— پیارے اختر۔ خدا کرے کہ آپ اچھے ہوں۔ اور یہ خط آپ کو اس وقت ملے جب آپ خوش بھی ہوں۔

میں آپ کی غزلوں کا ایک انتخاب کم از کم پندرہ یا زیادہ سے زیادہ تیس اشعار کا چاہتا ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ انتخاب آپ ہی کا کیا ہوا ہو اور آپ کے دستخط سے مزین ہو۔

کیا آپ میری اس التجا کو قبول فرمائیں گے ——"

جناب دیوانہ مصطفےٰ آدی

"—— اس طرز خطاب نے ہی آپ کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ کیا مُردہ بول رہا ہے۔ — بہرکیف عزت زندہ ہے "جیا ہے حیات نہ ہو" اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لئے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ یہ معلوم کہ آپ کو اس ثبوت کی ضرورت نہ ہوگی۔ کون محبت کی پذیرائی کیا کرتا ہے۔ رہ گئی محرومی قسمت کی شکایت تو کس سے کہوں — اس حال میں کہ یہ ایک حقیقت ہو کہ ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہو —— ڈال دیں آہوں کی صدائیں کیونکر بجھ دی جائیں

عجیب حال ہے کہ آپ کو سب اپنا حال دل بیتاب لکھ ڈالتے ہیں وہ لوگ بھی جن کی زندگی بڑی تشنۂ تعلیق گزری ہو لیکن جن کو یہ شگفتہ دنوں کی یاد۔

—— یہ طرز محبت بھی خوب ہے "داستان" سن کر آپ صرف مسکرا دیں جن کی خاطر نا تھا انہوں نے اپنی جفاؤں کو اتنا رنگین بنا دیا کہ ان پر وفاؤں کا دھوکہ ہونے لگا۔ اور اسی نے زندگی پر مجبور کر دیا۔ اور پھر کسی کا معقولہ ہے کہ کوئی مر سکے یہ بہت ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یقین بھی کہاں ہے کہ یہ ایسے ہوا۔ یہ حسین یہ وعدے یہ پھول "جو "جنت سے کم نہیں ہیں" وہاں مل سکیں گے۔ سو کون "مرنے کا قدر" کرے۔ علم بھی ہوا کہ آپ اپنے سابق عشرت گاہ میں قیام فرما ہیں۔

جو نقوش پرچہ حاصل کرنے کی "بیتابیاں بنکر" دوسرے دلوں پر ثبت ہوتے ہیں ان کو کبھی "بہر ملاقات" بطور تقریب پیش کیا جا سکیگا۔ —— یہ علم آپ کے لئے موجب مسرت ہوگا کہ عزت کی خاطر شاہکار عریاں مجرمین ناہیدوں کے قریب —— رکھ کر۔ اگر نازنین اس سے اپنی زلفوں کا جال بنتی ہیں!!

خطوط کے اقتباسات

محترمہ این۔ بی۔ ناز شاہجہاں پوری

"—— چونکہ "رومان" کے پرستاروں میں ناچیز بھی شامل تھی لہٰذا اس کے "مرحوم" ہونے سے میرے دل کو بھی بہت کافی قلق ہوا۔

لیکن میرے دل کو آس تھی —— کہ "رومان" پھر آپ کے ہاتھوں زندہ ہو کر مطلع ادب پر نمودار ہوگا۔ اور اپنی رنگینیوں سے دل و دماغ کو منور کرے گا مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

پھر میں نے یہ نوید جانفزا سنا کہ آپ کی ادارت میں ایک اور پرچہ نکل رہا ہے "شاہکار"۔ اس کا ناقابل بیان مسرت میں نے محسوس کی۔ آخر پہلا "شاہکار" میری نظر سے گزرا۔ خدا کی قسم آپ مستحق مبارکباد ہیں۔ "شاہکار" صحیح معنوں میں "شاہکار" ہے!

بہرحال میرے خواب اب تکمیل ہوتی نظر آرہی ہے۔ لیکن ایک بات کھٹک رہی ہے کہ خدا نہ کرے کہیں یہ بھی اپنی جھلک دکھا کر روپوش نہ ہو جائے! کہیں اسے شگون نہ سمجھ لیجئے گا۔ خدا کرے یہ خیال اندیشہ باطل ہو کر رہ جائے الغرض میری دعائیں "شاہکار" کے ساتھ ہیں ——"

حضرت ثاقب سلمانی بی۔ اے

"—— "داستان" اور پھر "رومان" ہر رنگ میں آپ کی جلوہ آرائیوں کا دیوانہ رہا۔ آپ کی شوخ نگاری پر جان چھڑکتا ہوں۔ مدتوں اس آرزو کو دل میں پرورش کرتا رہا ہوں کہ آپ کے رنگین و دلفریب کلام کا مجموعہ جلد شائع ہو تو اپنی اولین فرصت میں اس کی سیر کروں۔ بحمد اللہ کہ یہ حسین خواب اب شرمندۂ تعبیر ہو چلا ہے آپ یقین کریں خوش ہوں گے کہ شاعری کے جدید رومانی اسکول میں میں آپ ہی کا مقلد ہوں۔

جناب اثر چکوالی بی۔ اے

"—— "شاہکار" مدت سے آپ کی راہ تک رہا تھا شکر ہے کہ آپ نے اس کی گزارش کو مان لیا۔ اردو ادب کو آپ ایسی ہستیوں پر ناز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ آپ ہی سے زندہ ہے۔ اگست اور جولائی کے پرچے آپ کے بلند ذوق کے آئینہ دار ہیں ہم شاہکار کو صحیح معنوں میں شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ "رومان" کو محض آپکی نظموں کیلئے خریدا جاتا تھا۔ یہی حال اب "شاہکار" کا ہے جو صرف آپ کے کلام کے لئے خریدا جاتا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔"

یورپین لیگ

تاریخ انسانیت کا دہشتناک باب

مترجمہ:۔
شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی

ہر ہٹلر اور اس کا شریک فتنہ کاری مسولینی یورپ کے پامال ممالک کی لیگ بنانے کی اسکیم سوچ رہے ہیں۔ یہ لیگ فرانس۔ ہالینڈ۔ بلجیم وغیرہ پر مشتمل ہوگی۔ نازی محکمۂ اشاعت اس مجوزہ لیگ سے دنیا کی بہت سی امیدیں وابستہ کر رہا ہے۔ اور اس تجویز کو امن عالم کی واحد کفیل ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔

مصری جرائد اس اسکیم کو اہل مشرق کے لئے آمریت کے دام تزویر سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اگر یہ لیگ قائم ہو گئی تو اس میں ہر ہٹلر اور مسولینی اقتدارِ محیط کی حیثیت حاصل کر لیں گے اور پھر ان کی طاقت فتنہ آرائی کے لئے مستقل کا ایک خطرۂ عظیم بن جائے گی۔ برطانیہ عظمےٰ اور امریکہ کے خلاف تو یہ ہولناک محاذ غیر مفتوح صورت اختیار کر ہی لے گا لیکن روس۔ ٹرکی۔ بلاد عرب۔ ایران۔ افغانستان اور ہندوستان بھی اس آتشکدے کے شعلوں سے محفوظ نہ رہ سکیں گے جمہوریت اور دوسرے لفظوں میں انسانی آزادی اور حریت کے واسطے یہ وقت سخت بے بسی کا ہوگا۔ مذاہب عالم اور تہذیب اقوام ایک نئے سامان گرداب میں مبتلا کر دئے جائیں گے۔ ہر ہٹلر کی اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ اقوام عالم میں ایک ایسی جنگ مستقل طور پر قائم ہو جائے جو عرب جاہلیت کی "حرب بسوس" کی حیثیت حاصل کر لے۔ حرب بسوس نے قبائل عربیہ کو ایک صدی تک خونریزی میں مشغول رکھا تھا لیکن یورپین لیگ کے ذریعے جو جنگ باہمی رونما ہوگی۔ اس کے خاتمے کے لئے مستقبل کی بے کراں پہنائی کے کسی حصے کو بھی یقین کے ساتھ محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یورپین لیگ کی تشکیل کے پس منظر ہر ہٹلر کے جو مشئوم مقاصد ہیں اس کے سابق سکرٹری روشنگ نے ان کی نقاب کشائی کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب "ہٹلر بول رہا ہے"۔ میں ہٹلر کے خیالات کو اسی کی زبان سے ادا کیا ہے۔ ہٹلر کہتا ہے:

"جنگ حیات عامہ کی فطرت کا ایک لازمی خاصہ ہے۔ ازل سے آج تک حیاتِ عامہ نے جنگِ باہمی کو اپنے قیام و استقرار کا ایک ضروری مسئلہ بنایا ہے۔ دنیا میں مستقل امن اسی وقت قائم ہو گی جب ہر جاندار کی زندگی ختم ہو جائیگی زندگی اور جنگ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں سکون موت کا نام ہے اور حرکت زندگی ہے۔ حرکت میں جب طغیانی پیدا ہوتی ہے تو دنیا اسی کا نام جنگ رکھ دیتی ہے۔ اور حیات عامہ میں یہ طغیانی حرکت روح زندگی کا کام دیتی ہے۔

جنگ کو امن پسند لوگ وحشیانہ حرکت بتاتے ہیں لیکن وہ بے مغز یہ نہیں سمجھتے کہ یہ وحشیانہ حرکت ہی زندگی کی ضمانت ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اقوامِ عالم جنگ کو اپنی زندگی بنا لیں اور اس طرح انسانیت کو ارتقا و ارتفاع کے مواقع مسلسل طور پر حاصل ہوتے رہیں۔ جمہوریت ایک دھوکا ہے۔ اور زندگی بھی جنگ ہی کے برابر ایک دھوکے کا نام ہے۔ وہی قومیں اور وہی لوگ عرصۂ ہستی پر حکومت کا حق رکھتے ہیں جو اپنے فریب و خدع کو سجا کر دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں ظلم یہ نہیں کہ کمزور اقوام کو مغلوب و مقہور کر دیا جائے۔ بلکہ سب سے بڑی ستم کاری یہ ہے کہ کمزور قوموں کو آزاد زندگی کا حق دیا جائے۔ کمزور قومیں زمین کے لئے بوجھ ہیں۔ زمین کو حق پہنچتا ہے کہ کمزور افسردہ اور بے حیثیت اقوام کو اپنی پشت پر سوار کرنے سے انکار کر دے میں دنیا کو طاقتور اور زندہ اقوام سے معمور کر کے ملبند کرنا چاہتا ہوں۔ اس جدوجہد میں ضروری ہے کہ کمزور اور پست قوموں کو کچلنا پڑے گا۔ جمہوریت کا سب سے بڑا گناہ اور ناقابل عفو جرم یہی ہے کہ وہ کمزور قوموں کی حفاظت اور پشت پناہی کر کے حیات عامہ کے ارتقائی و ارتفاعی حقوق کو پامال کرتی ہے۔"

ہٹلر کے یہ فرعونی خیالات خود منہ سے بول رہے ہیں کہ امن عالم کی تباہ کاری ہی میں اس کا مقصد کیا ہے۔ وہ جمہوریت کا دشمن کیوں بنا ہے؟ کمزور قوموں پر اس کے ستم ہائے ناروا کیوں ہیں؟ یورپین لیگ کی مجوزہ اسکیم کو کن ملعون اغراض کیلئے بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ (اقتباس)

نظم

الہامات

از: علّامہ سیماب اکبر آبادی

گر نظرِ ہوس تری دامنِ حُسن چھو گئی — عشق کی آبرو کہاں! نفس کی آبرو گئی
بن کے سکون دِل سے تو اے مری آرزو گئی — سوز کہاں کہ تو نہیں، ساز کہاں کہ تو گئی
کاہشِ نارسائی نے توڑ کے پاؤں رکھ دئے — حوصلۂ طلب کے ساتھ ہمّتِ جستجو گئی
اُس کی نظر کے سامنے کس کی نظر ہو باریاب؟ — آئینہ بن کے چشمِ شوق حُسن کے روبرو گئی
ختم ہوئی شبِ بہار، صبحِ خزاں ہوئی طلوع — اہلِ جنوں ہوئے خموش عشرتِ ہاؤ ہو گئی
دِل کی طرف جھکا کے سر کہہ دیا حالِ مختصر — دُور بھی رہ کے آپ سے اپنی نہ گفتگو گئی
دامن و جیب تک ہی تھا رشتہ گری کا سلسلہ — اب ہوا سینہ چاک چاک اب خلشِ رفو گئی
تھے تمہیں مرکزِ خیال حدِ تصوّرات تک — یوں تو نگاہِ ناشکیب جانے کو چار سو گئی
باغ کی طرح ہمنشیں اب ہے اُداس زندگی — سرخوشیٔ دل و نظر ہمرہِ رنگ و بو گئی
تیرے مقامِ قُرب سے اِس کو بھی آگہی رہی — ٹیس جگر سے جب اُٹھی تا بہ رگِ گلو گئی

رہ گئی کھو کے وارثی بزم ہی میں صدائے ناز
اُن کے حریمِ ناز تک صرف ہماری ہو گئی

جدید فلسفۂ تاریخ

علمی

مترجمہ

اختر شیرانی

موضوع اصول اگر کوئی شخص معلوم کرنا چاہے کہ تاریخ نگاری کے سلسلے میں تاریخی دستاویزوں کے انتخاب کے بعد آج کل کے مورخین کیا روش اختیار کرتے ہیں تو اسے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ اب تاریخ نویسی میں آفاقی اصول پر مطلقاً اعتماد باقی نہیں رہا ہے۔ اس عہد کی نوشتہ تاریخیں منتخب تاریخوں سے عبارت ہیں کیونکہ آج مورخین پر ایک جدید نظریہ - ایک نیا طرز تحریر اور ایک نیا قاعدہ اثر انداز ہے۔ آج کل کے نوجوان تاریخی حالات کی تشریح سے نہیں بلکہ ان کے معانی کی تعیین سے سروکار رکھتے ہیں۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ نگاری کی یہ روش روحی اور نفسیاتی ہے۔ اور ہم اپنے ہم عہد تاریخی شعور کو دقائق کی اشاعت نہیں بلکہ قلمی تجزیہ خیال کرتے ہیں۔

مندرجۂ بالا اسباب کے علاوہ جو تاریخ نگاری کی جدید روش کے ذمہ دار ہیں ہم ایک اور سبب کا تذکرہ بھی کرنا چاہتے ہیں -

بالائی عوامل کے زیر اثر تاریخی رومانوں یہاں تک کہ کلاسیکل ادب کا ذوق بھی روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور آج شیکسپیئر کے ہیملٹ کے متعلق بھی کوئی بحث نہیں کی جاتی۔ بلکہ ہمیشہ کسی نہ کسی محقق کی تالیفات موضوع گفتگو رہتی ہیں گویا حسیات کا وہ نقصان جو تاریخی واقعات میں نمودار ہوا تھا۔ اس کی تاثیر آج صنعتی آثار میں بھی کارفرما ہے۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ خواہ آپ خوش ہوں یا ناخوش —— !

ان دونوں تاریخ نگاری کے اصول، مشتبہ دور سے نکل کر، کچھ کچھ، عملی دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ اصول بھی جو عندی رنگ میں رنگا ہوا ہے اختصاصی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ان علمار کی نظر میں جو اس طریقے کے مخالف ہیں عملی دور کوئی تاریخی مسئلہ نہیں، بلکہ ادبی مسئلہ ہے بالفاظ دیگر ایک ایسا عمل ہے جو تاریخ کے حقیقی معنی کا اثبات نہیں بلکہ تاریخ کے لئے معنی ایجاد کرتا ہے۔ بے شک جن لوگوں نے تاریخی مادیت[1] کے حامی علمار کے مبالغہ آمیز دعووں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ تاریخ میں یہ دورۂ عمل تاریخی مادیت اور مادئیین کے مبالغہ طراز نظریوں کا ردِ عمل ہے۔

ہم نے اپنی زندگی میں بیسیوں تاریخوں اور تاریخی اصولوں کا مطالعہ کیا ہے پڑھا ہے اور لکھا ہے۔ مگر آج جو تاریخیں لکھی جا رہی ہیں اور جو اصول تاریخ نگاری میں برتے جا رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں ماضی، دراصل، انداز اور لکھنے والے کے میلان اور رجحان کے مطابق محاکمہ اور مباحثہ کا موضوع بنانا چاہئے۔ ہم ان تاریخوں سے واقعات کے عدم استقرار یعنی تاریخ کے مسلسل دور کے فقدان اور حوادث کی تحریف کے امکان کا ایک ایسا نظریہ پیدا کر سکتے ہیں جو مورخ کی خواہش اور میلان کے عین مطابق ہوگا۔ تاریخی واقعات میں جو چیز ثابت و پائدار رہی ہے یہی عدم استقرار ہے۔ اس لئے کہ قومیت اور جماعت کے حامی افراد اور مورخین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ عندی تحریر و انشا کے ذریعے تاریخی دستاویزوں اور وثیقوں کا اپنی خواہش کے مطابق تجزیہ کر کے اپنے، اپنی حکومت، اپنی قوم اور جماعت کے کارناموں کو زندہ کریں یہی وجہ ہے کہ انسان بالمحاکمہ قدیم تاریخ نگاری کے اصول اور حقانیت کا طرفدار ہو جاتا ہے لیکن افسوس کہ ہم ایک ایسے عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس نے تاریخ کو وثیقہ آفاقیت کے لباس سے نکال کر اسے عندی فلسفیانہ اور ادبی جامہ پہنا دیا ہے۔ اور اسے قومی ملکی اور فوجی و حکومتی مقاصد کے لئے آلہ کار کی حیثیت سے استعمال کرنے میں مشغول ہے۔ ان مورخین کی نگاہ میں جو چیز حقیقت ہے اور پروپیگنڈے اور تبلیغ کے قابل ہے حکومتوں کے [illegible] کا باعث ہے

اس امر کی تنہا علت یہ ہے کہ آج کوئی بھی مورخ یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ آمر یا ڈکٹیٹر کے عزائم و افکار کے خلاف جس کے ہاتھوں میں ایک قوم کی باگ ڈور ہے۔ اور جسے وہ جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے۔ لب کشائی کرے یا حالات کو پوری طرح درک کر کے ان کو تاریخ کی صورت میں متشکل کر سکے کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ پیش آمدہ اور وقتی افکار و خیالات تنہا آمر کے دماغ کا نتیجہ ہیں۔ یا ان افراد کے دماغوں کی پیداوار جو اس کے گرد جمع ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بیسیوں افراد آج کی دنیا میں بھی آباد ہیں اور مزاروں کی دنیا میں بھی خوابیدہ و بوسیدہ —— جن کی طرف کسی بھی مورخ کے قلم نے کبھی توجہ نہ کی اور وہ دنیائے علم کے خیال میں بھی نہ سما سکے۔ درحالیکہ ان میں سے ہر ایک فرد تیمارک اور ہولسٹائن کو اپنے شاگرد کے برابر بھی نہ سمجھتا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے: "دورِ عمل" ایک خالص ادبی مسئلہ ہے

[1] تاریخی مادیت کارل مارکس نے اپنی اقتصادیاتی تحقیقات اور نظریات کی بحث کے ضمن میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تمام تاریخی واقعات کی اقتصادی مسائل کی بنا پر تشریح ہو سکتی ہے۔ اس کے عقیدے کی رو سے انسانی تاریخ شکم انسانی کے مقتضیات کی پیداوار ہے نہ کہ دماغ انسانی

یعنی جس وقت مورخ دستاویزوں کو سامنے رکھ کر کوئی تاریخ لکھنا چاہے تو وہ اسی اصول سے دوچار ہوگا یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا کے خیالات وایجابات اور قومیت وطنیت کے باحرارت احساسات جو عہد حاضر کی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اسی اصول کے حامل ہوں گے۔ بدیں سبب ہمارا موجودہ تاریخ نگاری کا شیوہ زندہ اور زندہ تر۔ اور ایک خاص نصب العین کا حامل۔ بلکہ قدیم تاریخ نگاری کے طرز وطراز سے بہتر ہے عملی سیاسیات میں کسی عہد میں بھی آج کی طرح تاریخ کی طرف توجہ کرنے کا زیادہ رجحان موجود نہ تھا۔ کیونکہ آج کل کی حکومتوں کے سیاسی اسالیب مورخین کی ذہانت وذہنیت پر خاص اثر کر رہے ہیں مثلاً اگر جنگ عظیم کے بعد کے مذاکرات ومعاہدات صلح اور مشرقی یورپ کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے اور اس صورت حال کو بھی جو آخر میں مشرق میں رونما ہوئی —— تو ہمارے اس دعوے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ تاریخی حالات حکومتوں کی داخلی سیاست اور تہذیب وتمدن کی دنیا میں خاص اثرات پیدا کرتے ہیں۔

موجودہ تاریخ نگاری کے اصولی نقطہ نظر سے تیسرا اہم نقطہ نظر یہ ہے۔

یہ تو ہم سمجھتے ہیں کہ موضوع اور اصولی دستاویزوں کے انتخاب جن پر آج زیادہ زور دیا جا رہا ہے عندی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس امر کو تاریخ کے دور کی روشنی میں۔ زمان وایجابات زمان کی حیثیت سے مطالعہ کریں

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ کی ابتدا سے اب تک یا دوسرے الفاظ میں ہیروڈوٹ سے لے کر جنگ عظیم سے قبل کے مورخین تک تاریخ نگاری میں دستاویزوں اور وثیقوں کو خاص اہمیت دی جاتی رہی۔ اس وقت تک جو تاریخیں لکھی جاتی رہیں۔ وہ سب آفاقی تھیں لیکن آج دنیا میں کوئی مورخ ایسا نہیں جو دستاویزوں کا پابند ہو اور اپنی ذاتی آرزوؤں اور تمناؤں کو نظرانداز کر دے

گزشتہ زمانے میں تاریخ کے سلسلے میں کتر دو جماعتیں کام کرتی تھیں۔ ایک واقعات لکھنے والی جو بلاکم وکاست واقعات کو کما حقہ جمع کرتی تھی اور مورخ کے حوالے کر دیتی تھی یا بھجوا دیتی تھی۔ مورخ ان واقعات کے مبنے پر بلاکسی ترمیم وتنسیخ کے یا اپنی ذاتی وشخصی دخل کے بجنسہ قلمبند کر لیتا تھا اور ان کی بنیاد پر اپنی مستند تاریخ کی عمارت قائم کرتا تھا —— دنیا ان تاریخوں پر اعتماد کرتی تھی۔

جب جنگ عظیم کا زلزلہ نمودار ہوا۔ اور سیاسی اور تجارتی تعلقات کی موت نے اقتصادی مسائل کو اہمیت دی، اور خوراک اور دوسری ضروریات نے اپنا احساس کرایا تو متعلقہ اقوام نے جو تولید واستہلاک کے دام میں بے طرح گرفتار تھیں۔ مگر وہ اپنی اور دوسروں کی زراعتی تجارتی اور صنعتی نقصانات کو جنگ سے پہلے کے مدرسین سے زیادہ سمجھتی تھیں جرمن قوم نے اس سے عزت کا سبق لیا اور سوچا کہ حقائق اور واقعات میں فرق ہے اس تجربہ کی بنا پر تاریخی باب میں ایک نئی بنیاد ودلیل کی مالک ہوگئی۔

جرمن قوم جو آج تک تاریخی میدان میں آفاقی تاریخ کے موضوع پر کامل اہتمام رکھتی تھی۔ آج اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ تاریخ کی عندیت پر اعتبار کر رہی ہے۔ اور آج متیقن ہے کہ اخبار وو ثائق میں واقعہ نگار یا تاریخ نویس کے ذاتی خیالات وافکار کی موجودگی ضروری ہے۔

ہم نے یہ تجربہ نہ صرف سیاست خارجی میں کیا بلکہ سیاست داخلی میں بھی —— اور یہ حقیقت ہے کہ آج ہر جگہ اور ہر حالی حیثیت میں اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگلے زمانے میں گو متبحر ترین عالم اس مسئلے کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ مگر آج عوام کا ایک معمولی فرد بھی اس کو سمجھ سکتا ہے

وہ قاعدہ۔ جسے گزشتہ عہد میں تاریخ نگاری کے سلسلے میں تاریخ نگار انجام دیتے تھے اب ارباب جرائد وصحائف انجام دیتے ہیں مثلاً کوئی رسالہ یا اخبار اٹھائیے جس میں خارجی اور داخلی سیاسیات کی تاریخ سے بحث کی گئی ہو اسے پڑھئے اور دیکھئے کہ اس نے اپنے خیالات کے مطابق کوئی تحریف نہیں کی؟

اسی نظریئے کے ماتحت مخصوص جماعتوں کے رسالے اور اخبار اس ادعا کو آپ پر واضح کرتے ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر یہ رسالے اور اخبار نہ صرف تاریخی دستاویزوں اور وثیقوں کی بلکہ ایک قسم کی ادبی افسانہ نگاری کی پیداوار کے ذمہ دار ہیں۔

اگرچہ یہ روش یعنی تاریخی دستاویزوں میں تصرف کرنا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ مگر پہلے اس انداز میں مبالغہ آمیزی نہ تھی مثلاً اگر آج ہم قرون وسطی وقرون اولی کی فضول نشر واشاعت کے متعلق اطلاع حاصل کر سکیں تو ہم سمجھیں گے کہ یہ سلسلہ اس عہد میں بھی اسی طرح تھا۔ مگر اس روپے کو معاہدہ لوکارنو کی وجہ سے شدت حاصل ہوگئی۔ اس لئے کہ لوکارنو کے معاہدے کے متعلق موافق ومخالف جرائد اپنے حسب منشا سیاسی افراد کی عملیات ونظریات کا تجزیہ کرنے کے لئے اپنے حسب منشا خبریں اور حالات شائع کرتے تھے۔

یہ بجائے خود ایک تجربہ تھا کہ دنیا میں تاریخی حقائق ووثائق کی قوتوں سے زیادہ بہت سی اور قوتیں کارفرما ہیں جو مجازی حیثیت رکھتی ہیں۔

اب جیسا کہ ہم اور آپ سمجھ رہے ہیں، آج کی تاریخ زیادہ تر فوجی، قومی اور سیاسی مفادات کی حامل ہے۔ اور ایک مورخ کا فرض قوم کے نزدیک حکومت کے نزدیک اور بالآخر اپنی جماعت کے نزدیک بہت زیادہ مجبورانہ اور سنگین ہے۔

تاریخ کی عندیت یعنی تاریخی واقعات اور دستاویزات کا بدل جانا۔ یا ان میں تحریف ہو جانا صرف موقف یا مورّخ کی شخصیت کے ماتحت نہیں ہے بلکہ اس زمانے کی ذہنیت کی تاثیر کے ماتحت ہے جس میں مورّخ اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

ہم ابھی تک کسی تاریخی ذہانت سے دوچار نہیں ہوئے ہیں لیکن کوشش کر رہے ہیں کہ اس ذہانت کو وجود میں لائیں لیکن کہنا پڑتا ہے کہ اس ذہانت کو پیدا کرنے کے لئے اس ذہنیت کی موجودگی میں جو ہمیں وراثت میں ملی ہے کوئی امکان نہیں ہے۔ اور ہم مجبور ہیں کہ اس ذہانت کو موجودہ خواہشات اور آرزوؤں اور تاریخی افادات کی روشنی میں جو ہماری سوسائٹی میں موجود ہیں پیدا کریں۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے اقدامات جو اس وضعیت اور تشکیل کی طرف راستہ اختیار کریں گے۔ ارباب صلاح و خرد کو اس مسئلے کے حل کرنے میں رہنمائی کریں گے +

نظم

نغمۂ سرمدیؔ

از:- اعجاز صدیقی اکبرآبادی

طور ہے کیوں بجھا ہوا، نور و ضیاء کو کیا ہوا! — یہ مرے دور میں تری جلوہ سرا کو کیا ہوا!
پرسشِ عشق کے لئے حسن ہے التجا بہ لب — غیرتِ عشق کیا ہوئی آج قضا کو کیا ہوا؟
ہے یہ نمودِ بےخودی ایک فریبِ آگہی — تیری خودی سے واسطہ تیرے خدا کو کیا ہوا!
اپنے کو میں سمجھ گیا تجھ سے بہت قریب تر — دل کی حدود سے رابطہ بیم و رجا کو کیا ہوا!
یاد تو اُن کی آئی تھی میرے دلِ فسردہ میں — کیوں یہ اُداس ہو گئے ماہ و سُہا کو کیا ہوا؟
مجھ سے ہی اُن کا ہے وجود میں ہی ہوں باعثِ نمود — ہو گئے دشمنِ حیات ارض و سما کو کیا ہوا؟
دین ہے تیری بےسبب دیکھ نہ خامیٔ طلب — میں تو نہ کر سکا سوال تیری عطا کو کیا ہوا؟
نغمۂ سرمدی نے کیں روح میں کیف باریاں — بر ربطِ دل سے ربطِ خاص تیری نوا کو کیا ہوا؟

باب اثر میں آج ہیں جذب و کشش کی قوتیں
دستِ دعا نہیں بلند دستِ دعا کو کیا ہوا؟

میں نے چاہا تھا...

میں نے چاہا تھا تجھے اپنا بنالوں لیکن
خواب دیکھا تھا جوانی کی مئے رنگیں کا
صرف تعمیر ہوئی خونِ جگر کی سرخی
گرچہ اشک اٹھ کے نموشی میں بہائے اکثر

میں نے چاہا تھا تجھے اپنا بنالوں لیکن
اک زباں سوزِ خموشی تھی محبت کی زباں
مجھ کو روکا مری الفت کی فراوانی نے
درد و غم طالب امداد اِسے کر نہ سکے

میں نے چاہا تھا تجھے اپنا بنالوں لیکن
میری راتوں کی جنوں خیز خموشی کا فسوں
خونِ دل پینے پہ مجبور تھا میں اور ادھر
آبلہ پائی سے مجنوں تھا ترا زار و زبوں

میں نے چاہا تھا تجھے اپنا بنالوں لیکن
محرمِ لب نہ ہوئی حسرت و امید کبھی
آتشِ عشق میں خاموش پگھلتا ہی رہا
گرم آنسو تھے فقط اپنی متاعِ ہستی

میں نے چاہا تھا تجھے اپنا بنالوں لیکن
دیدِ بربط ہی میں پنہاں تھا گدازِ نغمہ
غیرتِ نشّہ رہینِ مئے و ساقی نہ ہوئی
لذّتِ عشق میں طے جادۂ الفت نہ ہوئی

نظم

از مشتاق بھٹی۔ بی۔ اے۔ (آنرز)

کامراں عشق کی تدبیر کوئی ہو نہ سکی
میرے اُس خواب کی تعبیر کوئی ہو نہ سکی
باعثِ دلکشی تصویر کوئی ہو نہ سکی
پیدا اشکوں میں بھی تاثیر کوئی ہو نہ سکی

میری یہ آہِ سحرگاہ زیاں کار رہی
میری یہ قوتِ گفتار زبوں سار رہی
گرچہ بیگانہ تری چشمِ حیا دار رہی
قفسِ عشق میں قمری یہ گرفتار رہی

تھا مرے دستِ تصرف سے پرے تیرا قیام
تیری محفل گہِ عشرت کو تھا پیغام دوام
بادۂ الفت و عشرت کا چھلکتا ہوا جام
اور لیلیٰ! ترا محمل تھا بہت تیز خرام

قید و پابند رہی ہمتِ آزاد مری
جرأت آموز نہ تھی لذّتِ فریاد مری
جاں گدازی میں رہی فطرتِ ناشاد مری
اور آہوں میں نہاں عمر کی روداد مری

حُسنِ تعبیر سے خوشتر تھا کہیں خواب مجھے
اور تھی شامِ سفر صبحِ وطن تاب مجھے
شبنمِ تاک سے حاصل تھی مئے ناب مجھے
میں نے چاہا تھا تجھے اپنا بنالوں۔
لیکن!

سیاسیات

روسی آمریت

از:-
اکرام قمر بی۔ اے۔

بیسویں صدی میں دنیا کی جو سب سے پہلی آمریت قائم ہوئی وہ روس کی آمریت ہے۔ سوویٹ رہنما اپنی ریاست کو آمری بھی کہتے ہیں اور جمہوری بھی۔ اُن کا قول ہے "کہ ہماری جمہوریت کا انحصار پرولتاری آمریت پر ہے۔" وہ اس امر کو مذموم خیال نہیں کرتے کہ انکی ریاست میں ایک اقتصادی طبقے کی آمریت قائم ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ہر ریاست کسی ایک طبقے کے مفاد کا آلۂ کار ہوتی ہے۔

۱۹۱۷ء سے روس پر آمریت کا قبضہ ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ آمریت زار شاہی استبداد سے چنداں مختلف نہیں۔ ان دونوں میں صرف نام کا فرق ہے۔ اب حکومت کا نام زار شاہی کی بجائے پرولتاری آمریت ہے اور یہ حکومت شاہی نظریۂ سرمایہ داری کی بجائے مارکسی نظریۂ اشتمالیت پر مبنی ہے۔ اقتصادی میدان میں تو اس نے کافی تبدیلیاں کی ہیں۔ مگر سیاسی استبداد بدستور موجود ہے۔ جس نے قدیم اور جدید روس کو باہم منسلک کر رکھا ہے۔

۱۹۱۷ء سے روس میں لینن کی آمریت قائم ہے۔ جب لینن کی صحت گر گئی تو اس نے اپنے نائب کے ذریعے حکومت چلائی۔ لینن کے جانشین کا نام سٹالن ہے لیکن اس کی جانشینی سے پرولتاری آمریت میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ درست طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ ۱۹۱۷ء سے لیکر اب تک عملی لحاظ سے روس پر لینن کی حکومت ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ روس کی کروڑوں کی وسیع و کثیر آبادی میں سے صرف بیس لاکھ افراد اشتمالی جماعت میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتمالی حکومت کا طرۂ امتیاز جبر و تشدد سے کام لینا ہے۔ پرولتاری طبقے کی تعداد آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں اور توقع یہ کی جاتی ہے کہ پرولتاری اشتمالیت پہ بھروسہ کیا جائے۔ روس کسانوں کا ملک ہے۔ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ ہیں۔ مگر پرولتاری طبقہ جس کی تعداد بہت ہی کم ہے، حکومت پہ قابض ہے۔

پھر روس میں یہ پرولتاری آمریت کس طرح قائم ہو گئی؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں روس کی تاریخ پہ ایک سرسری سی نظر ڈالنی ہوگی۔

پطرس اعظم (۱۶۸۹-۱۶۲۵ء) کے زمانہ تک روس پر یورپی تہذیب نے کچھ نمایاں اثر نہ کیا۔ پطرس اعظم نے اسے یورپی رنگ میں رنگنے ..... کے لئے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی لیکن اس میں وہ چنداں کامیاب نہ ہوا۔

ملک کی وسعت، اقوام کی کثیر تعداد، عوام کے فوجی جذبے پسماندہ تہذیب اور مشرقی روایات کی بنا پر روس میں مطلق العنان حکومت قائم تھی بعض اوقات زاروں نے جمہوریت کیلئے کچھ اقدامات کئے۔ مگر یہ صرف برائے نام ہی تھے۔ حکام عوام کو طاقت تفویض کرنے کو تیار نہ تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں مغربی یورپ میں جمہوریت کے حق میں ایک تحریک اٹھی جس کی بنا پر فرانس، اطالیہ اور پرشیا میں نئے آئین بنائے گئے۔ آسٹریا میں بھی کچھ سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مگر روس پر یہ تحریک کچھ اثر انداز نہ ہو سکی۔

۱۸۶۱ء تک روس میں غلامی کا رواج تھا۔ اور جب اس رواج پر قانونی قیود عائد بھی کر دی گئیں تو بھی کھیتوں میں کام کرنے والے کمیرے باقی رہے۔ قانونی طور پر کسان آزاد تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ اپنے گاؤں سے وابستہ تھا۔ کیونکہ ہر گاؤں کو انچاس سال کا قرضہ اور سود ادا کرنا تھا۔ اس لئے کسان کی آزادی محض برائے نام تھی۔

اس قانونی آزادی کے بعد بھی بڑے بڑے زمینداروں کا چھوٹا سا طبقہ بہت بڑے بڑے قطعات اراضی کا مالک تھا۔ غریب کسان اتنا قلاش ہو چکا تھا کہ اس کے پاس ضروری زراعتی آلات تک موجود نہ تھے اور کھیتی باڑی کا کام وہ پرانے آلات اور اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔

یہ سچ ہے کہ زار سکندر دوم نے روس میں کمیرے رکھنا خلافِ قانون قرار دیدیا تھا اور اس طرح کسانوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس نے جاگیرداروں کی طاقت کو ختم نہ کیا اور نہ مرکزی حکومت میں عوام کو کچھ حصہ دیا۔ اس نے صرف صوبجات اور اضلاع میں تھوڑی سی خود مختاری قائم کی، لیکن یہاں بھی انتخابات براہِ راست نہ تھے بلکہ بالواسطہ تھے۔

ان ضلاعی اور صوبائی اسمبلیوں نے سیاسی اصلاح کے لئے ایک اعتدال پسند تحریک شروع کر دی۔ وہ آئین کو از سرِ نو مرتب کرنا اور ایک

قومی پارلیمان کو طلب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ اعتدال پسند تحریک کچھ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

انیسویں صدی کے ربعِ آخر میں صنعتی انقلاب شہروں میں پہنچ چکا تھا۔ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد طبقۂ امرا کے لئے خوش کن نہ تھی۔ مزدوروں کی تنظیمیں ممنوع قرار دی گئیں مگر پھر بھی ۱۸۸۵ء میں سٹرائکیں ہوئیں جو بعد میں خطرناک صورت اختیار کر گئیں۔ ان سٹرائکوں کو دبانے کے لئے فوجی دستے منگوائے گئے۔ مزدوروں کو ابتدائی شہری حقوق بھی حاصل نہ تھے۔ مغربی طرز کا پارلیمانی نظام ناپید تھا۔ تمام انتخابی طاقت زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تھی۔ آزاد خیالی کو حکام بغاوت سے تعبیر کرتے تھے۔ اخبارات پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ اس اثنا میں کارل مارکس اور اس کے شاگردوں کی تعلیمات نے بہت سے نوجوان اعتدال پسندوں کو اشتراکی بنا دیا۔ جنہوں نے بعد میں جمہوری اشتراکی جماعت قائم کی۔

۱۹۰۵ء میں جنگ روس و جاپان میں روس کو شکست ہوئی۔ اس قومی توہین کی بنا پر عوام مطلق العنان حکومت کے خلاف ہو گئے۔ جمہوری اشتراکیوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ حکومت کے جبر کے باوجود ان کے حوصلے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کوئی انقلابی تحریک بغیر رہنما کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس تحریک کا رہنما لینن تھا۔ اس جماعت کا نام "روسی اشتراکی جمہوری مزدور جماعت" تھا۔ بیلجیم اور لندن میں ایک کانفرنس کرنے کے بعد اس جماعت نے ۱۹۰۳ء میں اپنا کام نہایت سرگرمی سے شروع کر دیا تھا۔ اسے خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ ان پابندیوں کی بنا پر اس جماعت نے اپنا کام روس سے باہر شروع کر دیا اور روس میں اس کے اجلاس تہ خانوں میں ہوتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں روشن خیال امرا، دماغی کام کرنے والوں اور طبقاتی احساس کے مالک مزدوروں کی زیر قیادت عوام نے مرکزی حکومت میں نمائندگی کا مطالبہ کر دیا۔ صنعتی مزدوروں میں بھی اشتعال پیدا ہو چکا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر حکومت خائف ہو گئی۔ اسے رجعت پسندی اور جبر کی پرانی حکمت عملی میں ترمیم کرنی پڑی۔ زار نے مختلف طبقوں کے چنے ہوئے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ مگر اس مجلسِ شوریٰ میں جاگیرداروں کو زیادہ نمائندگی دی گئی۔ مزدوروں اور کاروباری اشخاص کو بالکل حقِ رائے دہی نہ دیا گیا چنانچہ رجعت پسندوں نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔

اس تجویز کے خلاف اتنا شدید احتجاج کیا گیا کہ حکومت کو ایک ڈوما (Dumma) کے قیام کا اعلان کرنا پڑا جسے قانون سازی کے اختیارات دئے گئے اور جس میں مزدور اور دماغی کام کرنے والے اپنے نمائندے بھیج سکتے تھے۔ مگر ڈوما کے قیام کا مطلب غیر محدود جمہوریت نہ تھی۔ دیہات میں صرف سرکاری طبقے کو حقِ رائے دہی حاصل تھا اور شہروں میں صرف وہی رائے دے سکتے تھے جو ایک مقررہ سکونتی ٹیکس ادا کرتے تھے۔ ایک نامزد امپیریل کونسل بھی قائم کی گئی جسے ڈوما کے برابر حقوق حاصل تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ایوانِ زیریں کی تجاویز کو ایوانِ اعلیٰ میں روکا جا سکتا ہے۔ زار کو ہر تجویز کے ملتوی کرنے کا حق حاصل تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر اعتدال پسندوں کو بھی اشتراکیوں کی طرح یہی خیال کرنا پڑا کہ روس میں پارلیمانی نظام آئینی ذرائع سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جنگِ عظیم کے آغاز کے وقت سوائے امیروں، چند جاگیرداروں، اور بڑے بڑے مالکوں کے ہر شخص کا یہی خیال تھا۔ اس جنگ نے ملک میں کچھ عرصے کے لئے اتحاد پیدا کر دیا۔ ۱۵-۱۹۱۴ء کی شکستوں کے بعد جب ڈوما نے بعض ضروری اصلاحات کا مطالبہ کیا تاکہ جنگ کامیابی کے ساتھ لڑی جا سکے تو حکومت نے ان اصلاحات کو ٹھکرا دیا۔ فوجی اور سول حکام کی ناقابلیت نے عوام کو حکومت کے خلاف کر دیا۔ ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں زار نے ایک اور فاش غلطی کی۔ اس نے رجعت پسند وزرا منتخب کئے جو بے چینی کو سوائے جبر و تشدد سے دبانے کے اور کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ ڈوما اگرچہ رجعت پسند تھی مگر وہ حکومت کی پالیسی سے تنگ آ چکی تھی۔ اس کے اجلاسوں میں وزرا پر سخت ترین نکتہ چینیاں کی گئیں۔ حکام پر غداری کا الزام لگایا گیا۔ یہ کہا گیا کہ روس کے مزدور تو بھوکوں مر رہے ہیں۔ مگر جرمنی کے سے دشمن ملک کو اناج بھیجا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک انقلاب کا طوفان نہ آیا حکومت اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

جب حکومت اس طرح جمہوریت کے خلاف لڑ رہی تھی تو ملک میں ایک انقلابی جمہوری تحریک فروغ پا رہی تھی۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں پیٹروگراڈ کے مقام پر پہلی روسی بغاوت ہوئی۔ پیٹروگراڈ کی فاقہ زدہ آبادی گلی کوچوں میں نکل آئی۔ وہ روٹی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ حکومت نے عوام کو فوج کے ذریعے سے منتشر کرنا چاہا۔ مگر فوج نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور مشتعل عوام کے ساتھ شامل ہو گئی۔ سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے جیلوں پر حملہ کر کے عوام نے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس اثنا میں ڈوما نے اپنی ایک کمیٹی خود بنائی جس نے حالات پر قابو

پالیا۔ ایک نئی وزارت اور ایک عارضی حکومت قائم کی گئی۔ ایک نئے آئین کا وعدہ کیا گیا۔ ان حالات میں زار کے لئے سوائے دستبردار ہونے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

جس دن عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اُسدن پیٹروگراڈ کے مزدوروں کے نمائندوں نے ایک سوویٹ بنائی جسے ایک دو دن بعد "پیٹروگراڈ کے مزدوروں اور فوجیوں کے نمائندوں کی سوویٹ" کا نام دیدیا گیا۔ عارضی حکومت اور یہ سوویٹ مختلف خیالات رکھتی تھیں۔ دونوں نے متضاد احکام جاری کئے۔ سوویٹ نے پرانا فوجی ضبط ختم کردیا۔ حکومت بھی ان احکام کی منظوری پر مجبور ہوگئی۔ اس سے فوج کا رہا سہا ضبط ونظم بھی ختم ہوگیا۔ سوویٹ اور عارضی حکومت نے مئی میں ایک مخلوط وزارت قائم کی، مگر ملک کی فوجی اور اقتصادی ابتری کو ان دونوں کی مشترکہ مساعی بھی نہ روک سکیں۔

حالات بدتر ہوگئے۔ موسم خزاں میں جمہوری اشتراکیوں کے ایک انتہا پسند گروہ نے جسے بالشویک کہا جاتا ہے حکومت میں کافی سے زیادہ حصہ حاصل کرلیا اور اس گروہ نے یہ اصرار شروع کردیا کہ انقلاب اقتصادی بھی ہونا چاہیئے اور سیاسی بھی۔ مزدور اور کسان اس کے حامی تھے۔ کارخانوں کے مزدوروں نے ملک میں اقتدار حاصل کرلیا تھا، مزدور کارخانوں پر قبضہ کررہے تھے اور کسان جاگیرداروں کو بیدخل کرکے زمینوں پر قابض ہورہے تھے۔ روسی عوام کی اکثریت بالشویک نہ تھی۔ بالشویکوں کا پروگرام فوجی اور مزدور ہی سمجھ سکتے تھے۔ مزدور اپنے آپ کو پرولتاری طبقہ کا نمائندہ بتلاتے اور نہ صرف اپنی بلکہ دیگر محنتی لوگوں مثلاً کسانوں اور زراعتی کام کرنے والوں کی بھی نمائندگی کا دعوے کرتے۔ انہیں ایسے اشخاص کی رہنمائی حاصل تھی جنہوں نے "انقلابی سائنس" کا مطالعہ کیا تھا اور جو یہ جانتے تھے کہ انقلاب کو کس طرح کامیاب کیا جاتا ہے۔ فوری امن اور پرولتاری آمریت کا قیام ان کے مقاصد تھے۔ موسم گرما کے اواخر تک بالشویک رہنماؤں نے پیٹروگراڈ، ماسکو اور دوسرے شہروں کی بھی سوویٹوں پر قبضہ کرلیا۔ بعدازیں فوج کی امداد سے وہ نومبر ۱۹۱۷ء میں عارضی حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہوگئے اس پرولتاری انقلاب نے پرانے نظام کو ختم کردیا۔ اور پرولتاری آمریت کے اندر مزدوروں کی انجمنیں اور فوجیوں کے نمائندے جابر جمہوریت کی جان تھے۔ جلد ہی کسان بھی شامل کرلئے گئے۔ مزدوروں، فوجیوں اور کسانوں کا یہ اتحاد ثلاثہ ملک پر حاکم ہوگیا۔

انقلابی کامیابی حاصل کرلینے کے بعد یہ امر یقینی نہیں ہوتا کہ اقتدار انقلابیوں کے ہاتھ ہی رہے گا۔ جب کبھی انقلابی جماعتوں نے شکست خوردہ حکام کی طاقت کو کم سمجھا تو رجعتی انقلاب کامیاب ہوجاتا رہا ہے اس لئے سوویٹوں کی ایک کانگرس نے افسرانِ عامہ کی ایک کونسل لینن کی زیر سیادت مقرر کردی۔ بالشویکوں کا خیال تھا کہ اقتدار حاصل کرلینے کے بعد بھی انقلابیوں کے لئے اپنے مقاصد کے دشمنوں سے جنگ جاری رکھنا ضروری ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ مزدوروں کی آمریت قائم کی جائے۔ وہ کہتے تھے کہ جدید نظام کو قائم رکھنے کے لئے نہایت سختی سے حکومت کی جائے۔ حتیٰ کہ شکست خوردہ زمینداروں اور مالکانِ کارخانہ کا خطرہ دور ہوجائے۔

نئی حکومت نے یورپ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ تمام متحارب ممالک صلح کرلیں۔ جب یہ تجویز نہ مانی گئی تو روس نے اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور جرمنی سے سمجھوتہ کرلیا۔

زار اور اس کا خاندان موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ امیروں، جاگیرداروں اور زار کے سابقہ افسروں کو قتل، قید یا جلاوطن کردیا گیا۔ ریلوے، بنکوں، کارخانوں، کانوں اور زمینوں کو پیداواری استعمال کے لئے لوٹ مار کے طریقے سے چھین لیا گیا۔ ہر کارخانے پر سوویٹ ناظر مقرر کردئے گئے۔ شخصی ملکیت کے ادارے کو کم از کم عبوری دور کے لئے کلیتہً ختم کردیا گیا۔ صرف کتابوں، لیٹروں، فرنیچر، سواری گاڑیوں، مرغیوں، خرگوشوں، سؤروں اور جانوروں کی ایک محدود تعداد ہر فرد رکھ سکتا ہے۔

ہر مقدمے کی سماعت علانیہ ہوتی ہے۔ صرف زنا کے مقدمے کی سماعت بند کمرہ میں ہوتی ہے یا اس مقدمے کو بند کمرہ میں سُنا جاتا ہے جس میں کسی سیاسی یا فوجی راز کے افشا کا ڈر ہو۔

شروع شروع میں تو مذہب کو بالکل خلافِ قانون قرار دیا گیا تھا مگر اب مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اجازت ہے لیکن علانیہ طور پر مذہبی تعلیمات نہیں دیجا سکتیں۔ مذہبی تعلیم صرف

المختصر جہاں تک احکام کا تعلق تھا چند ہی ماہ کے عرصہ میں اجتماعی واشتمالی طریق پر گامزن کردیا گیا۔ رجعتی انقلاب کے لئے بہت کوششیں کی گئیں مگر وہ ناکام رہیں اور سرمایہ دار طبقات اب تک حصولِ اقتدار کے لئے کوشاں ہیں۔ اشتمالی جماعت نے بزورِ شمشیر انقلاب پیدا کیا اور بغیر کسی شرم یا پردہ کے یہ اس انقلاب کو بزورِ شمشیر قائم رکھ رہی ہے۔

روس میں اس آمریت کا قیام اس کی ہولناک تاریخ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اقتصادی بربادی، عوام الناس کی روزانہ مصیبت کشی، میدانِ جنگ میں ہزیمت کی شرم اور ان سیاسی رہنماؤں کی کمزوری

نے جنہوں نے ۱۹۱۷ء میں مشکلات کا حل سمجھتے ہیں سمجھا۔ سوائے تباہ کن ہنگامے کے اور کوئی راہ نہ چھوڑی تھی۔

ہر جماعت جو حکمرانی کی آرزو رکھتی ہے اقتدار حاصل کرتے ہی خطرے میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ انتہائی اشتراکی جماعت کا خطرہ اس خطرۂ عمومی سے بڑھ کر ہے۔ روس کی پرولتاری آمریت کو جو خطرۂ عظیم درپیش ہے۔ وہ یہ ہے کہ کہیں وہ بھی آہستہ آہستہ اپنے ماتحت عوام کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ نہ شروع کر دے، جیسا کہ پرانی دفتری حکومت کیا کرتی تھی۔ روسی کئی سال سے شکایت کر رہے ہیں کہ سوویٹ نظام کے ماتحت بھی وہی چیز پیدا ہو رہی ہے جسے وہ "دفتری حکومت" کہتے ہیں۔

لینن اس خیال کا حامی تھا کہ خواہ اشتمالی جماعت مختصر ہی ہو، مگر ضبط کی پابند ہو۔ جو اشخاص اس تحریک کے محض معاون تھے لینن کا خیال تھا کہ وہ اس جماعت کے رکن نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے مخالفوں کی تجاویز کو مسترد کر دیا کرتا۔ اس کا یہ مطالبہ تھا کہ صرف وہی اشخاص جماعت کے رکن بنائے جائیں جو انقلاب کیلئے عملی طور پر کام کر رہے ہوں۔ وہ کمزور دل اصحاب کو جماعت میں شامل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ ۱۹۰۳ء میں لینن کی یہ تجاویز منظور نہ ہو سکیں۔ مگر ۱۹۰۵ء میں اسے کامیابی ہو گئی اور اس کے یہ اصول ابھی تک جماعت کے اہم اصولوں میں شامل ہیں۔

جن اراکین نے ضبط کو توڑا انہیں جماعت سے خارج کر دیا گیا بے عمل افراد کو بھی جماعت سے نکال دیا گیا۔ جماعت کی رکنیت کو ایک اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اور رکنیت کا مطلب شخصی آزادی کو ترک کر دینا ہے کیونکہ جماعت کا رکن بنکر انسان ایک ایسی مشین کا پرزہ بن جاتا ہے جو ایک مشکل مقصد کے حصول کیلئے منظم کی گئی ہے۔ جماعت کا رکن یا تو جماعتی احکام کی پابندی کرے اور یا مستعفی ہو جائے۔ اشتمالی جماعت کے اراکین کو دہریت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ انہیں مارکس کی تعلیمات کی پیروی کرنی ہوتی ہے کہ مذہب انقلابی تحریک کے راستہ میں ایک سنگ گراں ہے۔ مذہب ایک افیون ہے جو یہ کہہ کر انسان کو غفلت کی نیند سلا دیتا ہے۔ کہ ارضی مصائب کی تلافی جنت میں کی جائے گی۔ چنانچہ روس میں مذہبی جماعتوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ سرمایہ داروں کا ساتھ دیا ہے۔

اشتمالی جماعت پر ہمیشہ مزدور قابض رہے ہیں لینن دماغی کام کرنے والوں پر اعتبار نہ کرتا تھا۔ وہ کسانوں کو بھی مساوی نمائندگی دینے سے انکاری تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کسانوں کو انقلابی راستے سے گمراہ ہونے سے بچانے کے لئے ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ مزدوروں کی فوقیت کا یہ اصول جماعت میں ابھی تک رائج ہے۔ جوں جوں کسانوں میں طبقاتی احساس پیدا ہوتا جاتا ہے، کسان اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ امیدواری کی شرائط مزدوروں، کسانوں اور دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایک ہی ہیں۔ مگر کسان اراکین کی تعداد مزدور اراکین سے کم ہوتی ہے۔ تعدادی مساوات کو ابھی تک غیر مناسب سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ابھی تک یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ کسانوں کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔

موجودہ روسی نظامِ حکومت میں آبادی یا رائے دہندگان کی تعداد کے تناسب سے نمائندگی نہیں دی جاتی۔ شہری مزدوروں کو زیادہ نمائندگی حاصل ہے، کیونکہ انہیں حقیقی پرولتاری اور جدید نظام کا زیادہ وفادار سمجھا جاتا ہے۔ قصبات کی نمائندگی رائے دہندگان کی تعداد کے مطابق ہے مگر دیہات کی نمائندگی باشندوں کی تعداد کے مطابق ہے۔

روسی نظام کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ باقی تمام نمائندہ حکومتوں میں نمائندگی کی بنیاد جغرافیائی حدود پر ہے۔ ایک علاقے کے رائے دہندگان خواہ ان کے پیشے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں اکٹھے رائے دیتے ہیں۔ مگر روس میں پیشہ وارانہ نمائندگی رائج ہے اور مختلف پیشوں کے لوگ علیحدہ علیحدہ رائے دیتے ہیں۔

دیگر جمہوری ممالک میں تو لوگ براہِ راست پارلیمان چنتے ہیں اور پارلیمان کابینے کو بناتی ہے۔ مگر روس کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں سوویٹوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ پہلے دیہاتی سوویٹ چنی جاتی ہے پھر وہ سوویٹ ایک اور سوویٹ چنتی ہے، پھر وہاں سے صوبائی کانگریس کے لئے نمائندے چنے جاتے ہیں۔ پھر صوبائی کانگریس کل روسی کانگریس اور یونین کانگریس میں نمائندے بھیجتی ہے۔ اور یہ دونوں کانگریسیں علیحدہ علیحدہ مجالسِ انتظامیہ مقرر کرتی ہیں اور ہر مجلسِ انتظامیہ ایک سب کمیٹی اور ناظروں کی ایک کونسل بناتی ہے جو انتظامی کاروبار کو چلاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک کسان اور ایک ناظر میں کتنا بُعد ہے۔ اس طرح ذمہ داری کا راستے ہی میں خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ پیچیدہ نظام ٹوٹتا کیوں نہیں اور یونین اور صوبوں کے حکام میں غلط فہمیاں کیوں نہیں پھیلتیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام ناظر بالشویک ہیں۔ وہ سب اشتمالی جماعت کے رکن ہیں، اور وہ تمام سوویٹوں، کانگرسوں، کمیٹیوں اور کونسلوں پہ

قابض ہیں۔ جو شخص ان کے خیالات کا حامی نہیں وہ برسرِ اقتدار نہیں آسکتا۔ کسی قسم کی مخالف جماعت قائم نہیں کی جاسکتی۔ اشتمالی جماعت کا ہر مخالف "مخالفِ انقلاب" اور غدار ہے۔ جب کبھی کوئی تنازعہ پیدا ہوجاتا ہے تو اسے سیاسی کی بجائے جماعتی معاملہ سمجھا جاتا ہے اور اس کا فیصلہ جماعت کرتی ہے۔ تمام روس پر ایک جماعت کا قابض ہونا ہی دراصل اس نئے نظام کی کامیابی کا سبب ہے۔

۱۹۱۸ء کا روسی آئین یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ تمام شہریوں کے مساوی حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن دوسرے پیرے ہی میں یہ درج ہے کہ کسی شخص کو ایسے حقوق حاصل نہیں جو اشتراکی انقلاب کے لئے نقصان دہ ہوں۔ روس کے کسی شہری کو ریاست کے خلاف کوئی حق حاصل نہیں۔ اشتراکی ریاست ایک غایت ہے۔ اور شہری ایک ذریعہ۔ مغربی طرز کی آزادیٔ تحریر و تقریر روس میں موجود نہیں جتنی آزادی نظامِ جدید کے استحکام کیلئے ممد ہوسکتی ہے، اس کی اجازت ہے۔ المختصر روس میں انفرادیت کے متضاد فلسفہ رائج ہے اور یہ کافی حد تک معقول بھی ہے۔ کیونکہ اگر انسان کا منتہا اشتمالی ریاست کا استحکام اور ایک مخصوص طرزِ حکومت کی بقا ہے تو اسے کوئی ایسی آزادی نہیں مل سکتی جو اس کے ان مقاصد کے حصول کے راستے میں حائل ہو۔

سوویٹ رہنما یہ کہتے ہیں کہ ان کے انقلاب کی محرک ذاتی خواہشات نہیں بلکہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کو وہ محنت و مشقت کرنے والے لوگوں کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزادی حاصل کرنے کی تحریک کہتے ہیں۔

سوویٹ مصنف یہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ تمام پیداواری ذرائع پر ریاست قبضہ کر لے تو تمام اقتصادی طبقات ختم ہوجائیں گے کیونکہ سماج کا ہر فرد محنت و مشقت کرنے والا بن جائے گا اور جس سماج میں ہر شخص محنت و مشقت کرے وہاں ہر شخص کو مناسب حصہ ملے گا اور وہ مساوی محنت کرے گا۔

سوویٹ پروگرام کا مقصد اقتصادی بہبات ہے۔ مگر اس مقصد کو دیگر مقاصد کے حصول کا ایک ابتدائی ذریعہ بتایا جاتا ہے۔ سوویٹ رہنماؤں کا خیال ہے کہ جب انسان کو صحت اور فرصت حاصل ہوگی تو وہ صرف ضروریاتِ زندگی کے حصول کیلئے ہی کوشاں نہیں ہوگا بلکہ وہ تمدنی ترقی کے لئے بھی کوشش کرے گا۔

سوویٹ نظریہ یہ ہے کہ موجودہ وقت میں مضبوط طبقاتی آمریت کی ضرورت ہے۔ مگر ایک وقت آئے گا جب یہ سختی نرم کر دی جائے گی اور خود ریاست کے وجود کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کیونکہ اس وقت کسی دوسرے طبقے کی لوٹ کھسوٹ کا خطرہ نہیں رہے گا۔ وہ اس نظام کو "صحیح اشتمالیت" کہتے ہیں مگر وہ نظام کب قائم ہوگا؟ اس کے متعلق کچھ کہنا ناممکن ہے۔ لیکن روسی اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ وہ دور آئے گا ضرور۔

ان کا ابتدائی مقصد اقتصادی بہبات ہے۔ مگر یہ کارخانوں کی زیادتی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ لوگوں میں سماجی شعور کا ارتقا بھی ضروری ہے۔ سماجی شعور سے ان کا مطلب یہ ہے کہ فرد معاشی سیاسی یا ذاتی ضرورت کے لئے محنت نہ کرے بلکہ اس کے مدِنظر محض قومی مفاد ہونا چاہیئے۔ جب یہ شعور پیدا ہوجائے گا تو وہ دور آجائے گا جس میں "ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے گا اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے گا"۔ اسے وہ حقیقی اشتمالیت کہتے ہیں۔ اس شعور کی راہ میں صرف جاہلیت ہی حائل نہیں بلکہ اس کے لئے دیگر اقوام کے حملے کا خطرہ بھی دور کرنا ضروری ہے۔

اگر بیرونی خطرہ نہ بھی ہو تو بھی اقتصادی بہبات، عام تعلیم اور بنا سماجی شعور پیدا کرنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے سوویٹ مفکر موجودہ روسی عہد کو عبوری دور کہتے ہیں اور اسے "اشتراکیت" یا "اشتمالیت کا پہلا درجہ" بھی کہا جاتا ہے۔ موجودہ روسی نظام سختی پر کاربند ہے وہ اپنے مخالفوں اور انضباط کو توڑنے والوں کو کچل دینا چاہتا ہے۔ اور انہیں بھی ختم کر دینا چاہتا ہے جو محنت کرنے کے سماجی فرض سے تغافل کرتے ہیں۔ موجودہ عہد میں انضباطی کارروائیوں اور جابرانہ اقدامات میں نرمی کرنا مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ جماعتی ضبط کو توڑنے والوں کے خلاف پبلک طور پر مقدمات چلائے جاتے ہیں اور انہیں موت کے گھاٹ تک اتار دیا جاتا ہے۔ انہیں نہ صرف جماعتی پالیسی سے انحراف کرنے کا بلکہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے کا موجب گردانا جاتا ہے کسی مقصد کے حصول کیلئے تشدد کا استعمال خواہ کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اس مقصد کے حصول کے راستے میں حائل ہوجایا کرتا ہے۔ . . . .

یہ کہنا کہ ذرائع انجام پر اثر انداز ہوتے ہیں سوویٹ رہنمائی کو ایک چیلنج ہے۔ اگر سوویٹ رہنما اس بات کو غلط ثابت کر دیں اور سیاسی ان کے اختتام پر پابندیوں کو دور کر دیں تو انہیں تمام دنیا کی اقوام کا اعتماد حاصل ہوجائے گا اور اگر انہوں نے اپنا وعدہ ... کا ذکر ... [illegible]

خیالاتِ پریشاں

از:- اختر شیرانی

اُٹھ، اور شکوے نہ کر، جورِ آسمانی کے! — ستارہ وار، کھلا پھول شادمانی کے!

خزاں کی طرح نہ کر، رنجِ خانہ ویرانی — بہار بن کے سکھا طرزِ گلفشانی کے!

فغانِ قیس غلط، شورِ کوہ کن، بے کار — ہیں آج اور ہی انداز خونفشانی کے!

چمن میں دیکھتا ہوں جب بھی لالہ و گل کو — نظر میں پھرتے ہیں نقشے تری جوانی کے!

جنابِ خضر جنھیں آج تک سمجھ نہ سکے — وہ راز ہیں ہمیں معلوم زندگانی کے!

وہ رات، آہ ترے گیسوؤں کی چھاؤں کی رات — ستارے آج بھی شاہد ہیں اس کہانی کے!

گلِ فسردہ و شمعِ مزار و نجمِ سحر — یہ نقش ہیں مری اُجڑی ہوئی جوانی کے!

کبھی عروج ملا ہے، کبھی زوال اختر — یہ رنگ دیکھے ہیں ہم نے جہانِ فانی کے!

معاشرتی

افسانہ

انتقام

از:-
محترمہ رضیہ سلطانہ

موسم خزاں کی ایک اداس شام تھی۔ گلاب کی ایک خشک جھاڑی پر بیٹھی ہوئی مایوس بلبل حسرت سے اس زمین کی طرف تک رہی تھی جس کی مٹی میں سیکڑوں مرجھائے ہوئے پھول مل چکے تھے۔ شاید اب اس مٹی سے اب بھی خوشبو آ رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک نوعمر لڑکی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی تھی۔ وہ غم میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ ٹیوں کی کھڑکھڑاہٹ بھی اسے متوجہ نہ کر سکی۔ اچانک ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں پہنچی۔

"پریم! کیا بات ہے پریم لتا؟"

ایک نوجوان سامنے کھڑا حیران نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

"کچھ نہیں موتی بھیا" پریم نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"کچھ تو ضرور ہے" موتی نے کہا "بغیر وجہ کے تو کوئی نہیں روتا"

"سچ مچ موتی بھیا" پریم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یوں ہی میرا دل بھر آیا تھا"

"دل بھر آنے کا بھی تو کوئی باعث ہوا کرتا ہے" موتی نے کہا "لیکن تم بتانا نہ چاہو تو علیحدہ بات ہے"

"آپ کو میری بات کا یقین نہیں؟" پریم نے پوچھا۔

"اور جب مجھے وجہ معلوم ہو چکی ہو تو؟" موتی نے جواب میں کہا۔

"پھر پوچھنے سے فائدہ؟" پریم نے سر جھکا کر کہا۔ اس کے لہجے سے غصہ ظاہر تھا۔

"تم اپنی شادی کے لئے پریشان ہو نا؟" موتی نے پھر سوال کیا۔

پریم خاموش رہی۔ وہ جواب ہی کیا دے سکتی تھی۔ موتی کا قیاس صحیح تھا۔ سترہ برس کی لڑکی کو سینتالیس سالہ مرد کے حوالے کرنے کی تجویز ہو رہی تھیں جو دو بار رنڈوا ہو چکا تھا۔ چھ بچے موجود تھے جن میں سے آدھے بیاہے جا چکے تھے۔ بھلا اس گھر میں جہاں بہو بیٹیاں اس سے بھی بڑی ہوں اس کی کیا عزت ہوگی "یہی غم پریم کو گھلائے دے رہا تھا۔

پریم کو اپنی عمر کا پتہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ یتیم تھی۔ دس برس پہلے موتی کے والدین یاترا کے لئے ہردوار گئے تو اسے گھاٹ پر روتے ہوئے پایا۔ جب باوجود کوشش کے اس کے والدین یا کسی عزیز کا سراغ نہ ملا تو اسے اپنے ہمراہ گھر لے آئے۔

گمنام والدین کی بیٹی کا سماج میں کہاں ٹھکانا!

"نہ جانے کس ذات کی لڑکی ہے" "کیا معلوم اس کی ماں کون تھی" "اور باپ" جتنے منہ اتنی باتیں۔ موتی کے والدین کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ وہ اگر امیر ہوتے تو اس قدر پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ دولت تمام عیبوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لیکن ان کے لئے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ جو پہلا پیغام آئے۔ اسی کو آخری سمجھ کر پریم کو بیاہ دیں۔

"کیوں پریم یہی بات ہے نا؟" موتی نے پھر پوچھا۔

"مجھے تنگ نہ کرو موتی بھیا" یہ کہتے ہوئے پریم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

موتی چند سیکنڈ کے لئے دم بخود رہ گیا۔ اٹھتے ہوئے طوفان کی خاموش علامتیں اس کے چہرے پر عیاں تھیں۔

"پریم" آخر وہ بولا "پریم تم رونے کے لئے نہیں بلکہ پریم کے لئے پیدا کی گئی ہو۔ پریم لتا"

"جتنا پریم قسمت میں تھا وہ مل چکا" پریم جواب میں بولی "تمہارے والدین نے ماں باپ بن کر مجھے دیا اور تم نے بھائی بن کر۔ اب تو عمر بھر کا رونا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں یتیم ہونا اتنا بڑا پاپ ہے تو میں گھاٹ پر کھڑے ہو کر رونے کی بجائے اسی وقت گنگا میں چھلانگ لگا دیتی تاکہ میرے سب عیب چھپ جاتے"

"بس" موتی بے قراری سے بولا "یہ بات مت کہو پریم لتا۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ تمہاری خوبیوں کو نہیں جانتے ——— تم صرف میرے برادرانہ پریم سے واقف ہو لیکن میرے دل میں تمہارے لئے ایک اور پریم بھی موجود ہے ——— ایسا پریم جیسا آج تک تمہارے ساتھ کسی نے نہیں کیا"

پریم رونا بھول گئی اور پاگلوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔

"تم نو برس تک میرے ساتھ رہی ہو" موتی بولا۔ اب میں تمہیں علیحدہ

نہیں کرسکتا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لینا چاہتا ہوں۔"

پریم کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھکا لیں اور بولی۔

"میں شکرگزار ہوں بھیا کہ تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو۔"

"ترس!" موتی کے لہجے سے کرب ظاہر تھا۔ "یہ جواب ہے میری محبت کا۔"

اب پریم اور بھی حیران تھی۔ وہ نہ جانتی تھی کہ کیا جواب دے۔

"کاش!" موتی پھر بولا۔ "میں کچھ عرصے کے لئے اپنا دل تمہارے دل میں ڈال سکتا۔ تاکہ . . . . ."

"خیر" پریم جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔ "کچھ بھی ہو بھیا میں احسان فراموش نہیں ہو سکتی۔ میں تمہاری زندگی کو جہنم نہیں بنا سکتی۔ سماج کی نظروں میں ذلیل نہیں کرا سکتی اور تمہارے ماتا پتا . . . ." موتی مسکرایا۔

"اگر تمھیں صرف یہی اعتراض ہے تو معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب انتظام کروں گا۔"

پریم نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن موتی فوراً ہی رخصت ہو گیا۔

آخر شادی ہوئی۔ اور پریم کو معلوم ہو گیا کہ موتی ایک لاجواب منتظم ہے محلہ بھر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ برادری میں ناک کٹ گئی۔ ماں باپ نے غصے میں آکر موتی کو گھر سے نکال دیا۔

(۲)

"آف مظلوم لڑکی! مردوں کی سنگ دلی کی حد ہو گئی۔ ماتا جی یہ لوگ انسان کہلانے کے مستحق ہیں! خوب صورت نہ ہونے اور جہیز کم لانے کی سزا موت ہو گئی۔ یہ لوگ گویا شعور سے جنگ کر رہے ہیں۔"

ادما صدمہ پہنچانے والی لڑکی ایک افسوسناک خبر کے متعلق ماں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر رہی تھی۔

"کیا معلوم یہ خبر صحیح ہے یا غلط۔" ماں نے ٹالنے کی خاطر کہا۔ "ادما! اخباری خبروں کا کیا اعتبار؟"

"لیکن آپ جانتی ہیں کہ ذمہ دار اخبار غلط خبریں نہیں چھاپا کرتے۔" ادما نے جواب میں کہا۔

"تو اگر یہ خبر صحیح ہو تو آپ کیا کہیں گی؟"

"مجھے کیا کہنا ہے بیٹی۔" ماں نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا۔ "ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ اسی کشمکش حیات کا نام دنیا ہے۔"

"گویا آپ ان درندہ صفت مردوں کے مظالم کو حق بجانب سمجھتی ہیں؟"

ادما نے جوشیلے انداز میں سوال کیا۔

ماں کچھ جواب دینے کو ہی تھی کہ ادما کا باپ ڈاکٹر موتی لال کو لئے اندر آ گیا۔ ادما چند روز سے انھیں کے زیر علاج تھی۔

"مس رام چند!" موتی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمارے غریب فرقے نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اسے کوس رہی ہیں!"

"یہ دیکھئے اپنے معصوم فرقے کی کارستانی۔ ملاحظہ فرمائیے ان کی کرتوت!" کہتے ہوئے ادما نے اخبار ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اگر آپ خبروں کو ہیجان کا باعث بنائیں گی تو میں اس کمرے میں اخبار کا داخلہ ممنوع کر دوں گا۔" اس کا چہرہ متین تھا۔

"خوب! گویا اس طرح مردوں کے مظالم بے کس عورتوں کی نظروں سے چھپ جائیں گے۔" ادما کے لہجے میں طنز تھا۔

"ادما!" مسٹر رام چند نے تنبیہہ کے انداز میں کہا۔

"ہماری بیٹی کو اپنے فرقے کی بہبود کا بہت زیادہ خیال ہے۔" مسٹر رام چند ہنستے ہوئے بولے۔ "اسی لئے بعض اوقات وہ مردوں کو جلی کٹی سنا دیتی ہیں۔"

"یہ ایک قدرتی امر ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "لیکن اس کا مطلب یہ تو نہ ہونا چاہئے کہ اس کا اثر ان کی صحت پر پڑے۔"

اس روز کے بعد اس موضوع پر اکثر بحث چھڑ جاتی۔ ادما کی تلخ کامی کا باعث یہ تھا کہ وہ خود ایک مرد کے ہاتھوں تکلیف اٹھا چکی تھی۔ اس کے منگیتر نے اسے چھوڑ کر ایک اور لڑکی سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ ادما امیر تو بیشک تھی لیکن محروم جمال ہونے کے باعث ایک حسن پرست نوجوان کے لئے کوئی کشش نہ رکھتی تھی۔

اس واقعے کا علم ہونے پر موتی نے اس کا علاج اور بھی ہمدردی سے شروع کر دیا۔ ادما کے صحت یاب ہونے تک یہ ہمدردی دوستی و موانست کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

(۳)

پریم کی شادی کو دو برس ہو چکے تھے۔ پہلا سال سراسر شادمانی و مسرت سے بسر ہوا۔ گویا دنیا میں اسے بہشت کی نعمتیں میسر تھیں۔ وہ ایک دیوی تھی اور موتی پجاری۔ مگر دوسرے سال جیسے زمانے کا ورق ہی الٹ گیا۔ اب وہ پجارن تھی۔ اور موتی ایک دیوتا۔ اور دیوتا بھی وہ جس کے دل میں ایک اور مورت بس رہی تھی۔

پریم لتا اگرچہ حقیقت حال سے بے خبر تھی۔ تاہم وہ جانتی تھی کہ موتی کا

کھو یا کھو یا سا رہتا ہے وہ نہیں جانتے ہیں کہ اس کا احساس تھا کہ موتی کے دل میں وہ دن بدن نا معلوم طور پر کس قدر مجبور ہو رہی ہے۔ وہ دل ہی دل میں جان چکی تھی کہ مستقبل اپنے اندر کوئی انقلاب لئے ہوئے ہے۔ اس نے کئی راتیں اسی سوچ میں گزاریں۔ وہیں بدل بدل کر گزاری تھیں۔ کہ کیا بات ہو رہی ہے۔

شاید موتی اپنے رویے پر پشیمان تھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ سوچ بھی نہ سکا۔ اس وقت اسے رہ رہ کر وہ شام یاد آ رہی تھی جب موتی نے اس سے اظہار محبت کیا تھا۔ خزاں کے دن تھے۔ اس شام کس طرح یکایک ہر شے کیف بن گئی تھی۔ آج بھی ایک شام تھی۔ شفق کا دل یوں خون ہو رہا تھا جیسے کسی کے دل کی طرح خون ہو رہا تھا۔ کائنات پر ایک کسل چھائی ہوئی تھی۔ خود موتی کا دل اداس تھا۔ پریم آج بھی غمگین تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ بہت رو چکی تھی۔ تنہائی میں آنسو بہا بہا کر اب اس کی آنکھوں کا پانی ختم ہو چکا تھا۔

"پریم!"

موتی کی آواز سنتے ہی وہ جلدی سے گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر یکایک اس کا سر چکرا گیا۔ اور وہ لڑکھڑائی۔ موتی نے بڑھ کر تھام لیا۔

"کیا معاملہ ہے پریم!" وہ انتہائی گھبراہٹ سے بولا "یہ کیا حالت ہے؟"

"کچھ نہیں!" وہ نقاہت سے بولی۔ "ذرا سر چکرا گیا تھا"

موتی نے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ سنگ مرمر کی ایک سپید مورتی نظر آ رہی تھی۔ آج پہلا موقع تھا کہ اسے اس کا چہرہ نحیف و زرد نظر آیا۔

"پریم!" وہ جلدی سے بولا "تمہاری صحت کو کیا ہو گیا۔ کب سے یہ حالت ہے؟"

"خوب!" پریم نے جواب میں کہا "آپ گویا گھر پر آج پہلی مرتبہ ڈاکٹر کی حیثیت سے تشریف لائے ہیں۔ شکریہ۔"

"معاف کرنا پریم" موتی ندامت سے بولا۔ "مجھے غفلت و بے پروائی کا اقرار ہے —— تکلیف بتاؤ۔ میں دوا تجویز کرتا ہوں —— آہ! تمہاری نبض کس قدر کم زور چل رہی ہے۔ سانس بھی کچھ تکلیف سے آ رہا ہے تم ۔ تم . . . . . . "

"ڈاکٹر صاحب!" پریم بولی "اس قدر تشویش کی ضرورت نہیں ہے میں اب اچھی ہوں۔ ہاں پرسش حال کا شکریہ"

"تمہاری خفگی بجا ہے" موتی نے جلدی سے کہا "میں تمہارا گنہگار ہوں لیکن اس وقت صحت کا خیال مقدم ہے۔ بعد میں جو سزا جی چاہے دے لینا"

"پران ناتھ!" پریم فوراً بولی "مجھے شرمندہ نہ کیجئے داسی اپنے مالک کو کیا سزا دے گی؟ مجھے اپنے موتی سے کوئی گلہ نہیں۔ ہاں ڈاکٹر موتی سے شکایت ضرور ہے۔ جب انھیں اپنے پیشے سے اس قدر محبت تھی تو انھوں نے شادی کیوں کی؟ جب ڈاکٹری سے بیاہ ہو چکا تھا تو میری کیا ضرورت تھی؟"

"سمجھ گیا" موتی بولا "تمھیں مار ڈالا ہے تنہائی نے۔ تم اس سنسان زندگی سے گھبرا گئی ہو —— پریم تمھیں دھوکا ہوا ہے۔ اصل تصور وار ڈاکٹر نہیں ہے بلکہ تمہارا اپنا موتی ہے میری تمام تر توجہ کا مرکز میرا پیشہ نہیں بلکہ ایک اور شے ہے —— میں سوشل کاموں میں حصہ لینے لگا ہوں۔ تم جانتی ہو رائے صاحب رام چند جی کانگریس کے ایک معزز رکن ہیں۔ ان کی بیوی اور ان کی صاحبزادی عورتوں کے اصلاحی کاموں میں بہت زیادہ حصہ لیتی ہیں انھوں نے میری توجہ بھی اس طرف منعطف کر لی ہے۔ اس لئے میرا زیادہ تر وقت ادھر ہی گزرتا ہے۔ مگر پریم تم کیوں نہیں اس نیک کام میں ہماری شریک ہو جاتیں؟"

"ان زمانوں میں تیرا احسان" پریم برق پاش تبسم سے بولی "آپ نے کب مجھے دعوت دی تھی۔ جو میں شامل نہ ہوئی؟"

"اوہو!" موتی شرمندگی سے بولا "مجھے خیال ہی نہیں رہا ہم شروع ہی سے مل کر کام کرتے تو میری پریم کو یوں تنہائی میں وقت نہ کاٹنا پڑتا۔ مجھے اس بات کا نہایت افسوس ہے —— خیر اب بھی اس کا تدارک ہو سکتا ہے۔ ہے نا پریم؟"

پریم مسکرا دی۔ اس کے دل کی بستی اسی کی محبت سے آباد تھی۔ آج اس کی شام غم پھر صبح مسرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مگر غریب نہ جانتی تھی کہ یہ مسرت عارضی ہے۔ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور اوما نے موتی کو یاد دلایا کہ انہیں اس رات ایک پبلک میٹنگ میں جانا ہے۔ موتی نے پریم کی ناسازی طبع کا عذر کر دیا کچھ دیر بعد کار کا ہارن سنائی دیا۔ اور دوسرے لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا اور اوما مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"میں نے موتی لال کی خیریت دریافت کرنے آئی ہوں" اس نے آتے ہی کہا۔ "کہیے بہن طبیعت کیسی ہے؟ اخاہ! آپ تو بہت ہی خوبصورت ہیں۔ اور واقعی پریم کے قابل ہیں مسٹر موتی میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔ اور شکایت کرتی ہوں کہ آپ نے ہمیں اب تک ملایا کیوں نہیں؟"

"اس معاملے میں ہم دونوں مجرم ہیں" موتی نے ایک بھیانک قہقہے کے ساتھ کہا "نہ میں نے کبھی دعوت دی۔ نہ آپ نے کبھی خواہش ظاہر کی"

خیر آئندہ ہم اس کا تدارک کر دیں گے۔ اوما نے ہنستے ہوئے کہا "تلافی مافات کے طور پر خوب ملیں گے" "میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب میں بھی آپ کے ساتھ قومی کاموں میں حصہ لیا کروں گی" پریم نے نوچدار آواز اور مخصوص سادگی سے کہا۔

اوما کا چہرہ ایک لمحے کے لئے سفید پڑ گیا۔

"مجھے نہایت خوشی ہوئی ہے یہ سن کر" وہ سنبھلتے ہوئے بولی "لیکن ایسا اقدام کرنے پر آپ کو قوم کے لئے چند قربانیاں کرنی ہوں گی جن کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ اس وقت مسٹر موتی کو ایک گھنٹے کے لئے میرے ہمراہ کر دیجئے" اس کا تیر نشانے پر بیٹھا

"مجھے کوئی عذر نہیں لے جائیے" پریم نے بھولے پن سے کہا۔

"لیکن . .."

موتی کے منہ سے نکلتے ہی اوما نے ٹوک دیا۔

"لیکن ویکن کوئی عذر قابل سماعت نہ ہوگا۔ آپ کو چلنا پڑے گا"

"جب قابل سماعت ہی نہ ہوگا تو عذر کرنا ہی فضول ہے" موتی کا مختصر جواب تھا۔

اوما کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس وقت اسے اتنی مسرت ہوئی جتنی شاید کسی فاتح کو بھی اپنی فتوحات پر نہ ہوتی ہوگی۔ اس نے فاتحانہ انداز سے مسکرا کر پریم کی طرف دیکھا اور بائی بائی کہتے ہوئے نکل گئی۔

(۴)

"آج میں آپ سے ایک بھیک مانگنے آئی ہوں" اوما نے اپنی خوبصورت ساڑھی کے دامن سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"اوما بہن!" پریم لتا نے دلفریب تبسم سے کہا "آپ مجھے بھاتی بہت ہیں۔ میں اگر آپ کی مدد کروں گی تو آپ پر کوئی احسان نہ ہوگا بلکہ فرض ہوگا۔ جو میں ملک اور قوم کے لئے ادا کروں گی۔

"یہ ملک اور قوم کا معاملہ نہیں ہے بلکہ . . ." اوما آگے بول نہ سکی۔

"فرمائیے" پریم نے تعجب سے کہا "آپ کیوں رک گئیں؟"

"یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے" اوما کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں

"ذاتی!" پریم نے اپنی جبلی سادگی سے کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"ہاں ذاتی اور اس کا تعلق مجھ سے زیادہ آپ کی اور موتی کی ذات سے ہے"

"آپ۔ آپ . . کیا کہہ رہی ہیں۔ ذرا واضح طور پر مجھے سمجھائیے"

اب پریم کے قلب کی خاموش اور ساکن گہرائیوں میں ایک انتشار اکبر سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی روح پر ایک نامعلوم خوف غلبہ پاتا جا رہا تھا۔ اس عورت کو اس کے اور موتی کے حالات میں اس بے باکی سے دخل دینے کا کیا حق ہے؟ آخر اس کا موتی سے کیا تعلق ہے؟! اب اس کے دل میں غصے اور رشک کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

"سنیئے" اوما نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "موتی نے آپ کے ساتھ شادی کرنے میں بڑی فاش غلطی کی ہے"

پریم نے بے ساختہ نکلتی ہوئی چیخ کو روکنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اوما نے گفتگو جاری رکھی۔ "انھوں نے آپ کی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لئے اپنا مستقبل قربان کر دیا۔ گویا آپ کو بچانے کی خاطر خود برباد ہو گئے۔ آپ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ قربانی کر رہے ہیں۔ انھیں نہ روکا . . . ."

"میں . . میں" پریم نے بولنے کی بے سود کوشش کی۔

"آپ کا مطلب ہوگا کہ آپ نے کوشش کی تھی" اوما پھر بولی "لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ کوشش سرسری تھی۔ برائے نام تھی۔ شاید آپ کو احساس نہیں۔ پورا پورا احساس نہیں کہ آپ نے موتی پر کس قدر ظلم کیا ہے۔ اور ان کی شہرت کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے ——— کاروبار کی کامیابی کا راز صرف نیک شہرت ہے اور خاص کر ڈاکٹروں کے لئے تو نیک نامی بے حد ضروری ہے۔ جہاں ان کے خلاف کوئی بات سنی اور لوگوں نے ان سے مقاطعہ جوئی شروع کر دی بھلا کون شریف آدمی ایسے ڈاکٹر کو گھر میں بلائے گا جس نے ایک گمنام عورت سے شادی کر لی ہو؟"

پریم اب خاموشی سے رو رہی تھی۔ اس کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے تئیں اوما کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی تو اسے یہ تصویر نہایت بھیانک نظر آئی۔ اور اپنی ہستی بے حد حقیر اور قابل نفرت دکھائی دی۔ واقعی موتی ایک دیوتا تھا جس نے اس کی یہ قدر دانی کی!

"ایک ہونہار نوجوان کا مستقبل تباہ ہو رہا ہے" اوما نے پھر بولنا شروع کیا "ایک شریف آدمی کی شہرت خاک میں مل رہی ہے۔ ایک لائق ڈاکٹر کی پریکٹس خراب ہو رہی ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ فاقوں کی نوبت پہنچ جائے ——— لیکن ابھی معاملات آخری حد تک نہیں پہنچے۔ اب بھی وقت ہے کہ انھیں تباہی کے گڑھے سے بچا لیا جائے۔ اس کی صرف ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ ——— آپ انھیں کسی شریف گھرانے میں شادی کی اجازت دے دیں۔

پریم پاگلوں کی طرح اوما کی صورت تک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ اوما کا مطلب تاڑ گئی۔ اس لئے اوما جلدی سے بولی۔

"آپ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اس میں میرا اپنا فائدہ مضمر ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ...... اب آپ سے کیا چھپاؤں —— بات یہ ہے کہ مجھے ایک اور شخص سے محبت ہے لیکن اس کے باوجود میں ملک اور قوم کے ایک نوجوان [illegible] رہنے کے لئے اس کو قربانی کرنے پر آمادہ ہوں۔ پتا جی کی واحد اولاد ہونے کے باعث ان کی کثیر دولت کی میں ہی مالک ہوں۔ موتی میرے شریک حیات بن کر اس دولت سے اپنی کھوئی ہوئی عزت اور شہرت واپس لے سکتے ہیں۔"

وہ پھر چپ ہو گئی۔ پریم کی طرف سے سسکیوں کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

"میں آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی" اوما کچھ دیر بعد پھر بولی "لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں آپ کو تمام حقیقت سے باخبر کر دوں۔ موتی کے دل میں آپ کی کچھ اپنی عزت بھی نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ دو برس تک وہ آپ کی خوشی پر اپنی خوشی کو مقدم رکھتے رہے ہیں۔ کیا ان کی قربانیوں اور احسان کا معاوضہ آپ کچھ بھی نہیں دے سکتیں؟ وہ مرد ہو کر قربانیاں کریں اور آپ عورت ہو کر اتنا ایثار بھی نہ کر سکیں کہ انھیں دوسری شادی کی اجازت دے دیں؟"

"میں نے کب انکار کیا ہے" پریم دکھی آواز سے بولی "وہ میری طرف سے بالکل آزاد ہیں۔ صرف اجازت ہی نہیں بلکہ میں انھیں مجبور کروں گی کہ وہ آپ سے شادی کر لیں۔"

اوما کا چہرہ کھل گیا۔ اسے اس وقت ایک ناقابل بیان مسرت محسوس ہو رہی تھی۔

"اوہ! بہت بہت شکریہ" کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔

پریم کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ افسوس کہ ایک کلمہ بھی نہیں۔ ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں۔ کیسی پتھر دل عورت ہے۔ ملک کی خدمت گزار۔ قوم کی خیر خواہ۔ عورتوں کی ترقی و اصلاح کی گرویدہ۔ پیکر ایثار۔ قربانی مجسمہ۔ آہ ایشور! قوم کی ناؤ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے اقوال و افعال میں کس قدر اختلاف ہے۔ میں اپنے موتی کو اس عورت کے ہاتھ میں دے رہی ہوں۔ اپنے موتی کو۔ تو کیا موتی اب میرا ہے بھی؟ اف" وہ دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر رہ گئی۔ کہنے کو تو اس نے اوما کے ساتھ یہ عہد کر لیا۔ لیکن اب ایک دم اسے محسوس ہوا کہ اس کی حالت آگ کے ساتھ کھیلنے والے بچے کی سی ہے جو دور سے آگ کے شعلوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن جب قریب آ جاتا ہے تو اس کی تپش سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ وہ خاوند کی خوشی کے لئے۔ اس کی کھوئی ہوئی عزت واپس لانے کے لئے اسے دوسری شادی کی اجازت دے رہی تھی مگر جس وقت اس نے اس کے انجام پر غور کیا تو اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ روح کانپ اٹھی لیکن کچھ بھی ہو۔ اب تو وہ عہد کر چکی۔ اسے نبھائے گی۔ کیا وہ موتی کے لئے اتنی قربانی بھی نہیں کر سکتی؟ کر سکتی ہے۔ اور کرے گی۔

چند روز بعد شہر میں یہ خبر بجلی کی سی سرعت سے پھیل گئی کہ مس اوما راجہ [illegible] کی شادی ڈاکٹر موتی سے ہو گئی۔

اس واقعے نے موتی کے ماتا پتا کا دل پریم کی طرف سے صاف کر دیا اور وہ جو کہ بیٹے ہی کو تمام قصور کی جڑ سمجھنے لگے۔ اب پریم بھی ان کے گھر میں تھی۔ ان کی ہمدردی و محبت کا مرکز۔

— ۵ —

"تم ... تم ... آہ۔ پریم! میں تمھیں کس حیثیت میں دیکھ رہا ہوں؟"

"اس حیثیت میں کہ پریم لیڈی ہیلتھ وزیٹر ہے۔" اوما ایک کیس کے سلسلے میں اس کی اور ڈاکٹر موتی کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی ہے" پریم نے شوخی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پتا جی اور ماتا جی کیسے ہیں؟" موتی اشتیاق و حسرت کے ملے جلے انداز میں بولا "آہ! پریم! ان کے ساتھ میں نے تمھیں بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔ قدرت کی ستم ظریفی!"

"ماتا جی۔ پتا جی اچھے ہیں" پریم بولی "آپ اوما بہن کی کہئے وہ کیسی ہیں؟"

"تم ... تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟ ماتا جی۔ پتا جی نے کیسے اجازت دے دی ہے؟" موتی نے سوال کیا۔

"میں نے بڑی مشکل سے انھیں راضی کیا" پریم جواب میں بولی "بیکار زندگی کس مصرف کی۔ اس طرح اپنی بہنوں کی کچھ خدمت کر سکوں گی۔ آپ ہی تو اس تحریک کے محرک تھے۔"

اس واقعے کے تیسرے دن موتی۔ لیڈی ہیلتھ وزیٹر کے دفتر میں تھا۔

پریم:۔ کیوں خیر ہے؟ اوما بہن کیسی ہیں؟

موتی:۔ اوما کو مارو گولی۔ اور میری حالت پوچھو۔

پریم:۔ کیوں آپ کے دشمنوں کو کیا تکلیف ہے؟

موتی:۔ (دل پر ہاتھ رکھ کر) یہ تکلیف ہے۔

پریم:۔ اب ان باتوں سے حاصل؟ پچھلی ملاقات میں میں نے آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ آپ مجھ سے کسی قسم کی امید نہیں رکھ سکتے۔ میں جو عہد کر چکی نباہوں گی پھر آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا کی؟ پتا جی کو

معلوم ہو گیا تو وہ مجھ سے بدظن ہو جائیں گے۔

موتی:۔ آہ۔ ان کا دل اس قدر سخت کیوں ہو گیا۔ پریم کیا میرے لئے معافی کی کوئی امید نہیں؟ کیا مجھے اب کافی سزا نہیں مل چکی؟ میں نے جتنی مدت بے وفائی کی تھی۔ تم بھی ایک برس ناراض رہتیں۔ بدلہ اتر جاتا! زیادہ سے زیادہ دگنی سزا دے لی ہوتی۔ مگر اُف تین برس کے لمبے عرصے میں ایک بار بھی تو کسی کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ اور پتا جی —— پتا جی نے تو پانچ برس سے مجھے مردہ تصور کر لیا ہے کہیں مل بھی جاتے ہیں تو میرے پرنام کا جواب اس سرد مہری سے دیتے ہیں کہ میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ آہ! جن کا ایک ہی بیٹا ہو۔ ان کے دل اس طرح پتھر ہو جائیں! اور ماتا جی —— ماتا جی پہلے بھی تو ناراض تھیں پھر بھی پتا جی سے چوری چوری مل لیا کرتی تھیں۔ اب ان کا دل بھی سخت ہو گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں تم سے محبت تھی تمھیں دیکھنے آ جاتی تھیں۔ اب تم ان کے پاس پہنچ گئی ہو تو انھیں میری پروا نہیں رہی —— یہ —— یہ سب تمھارا ہی قصور ہے پریم! تم نے میری رسی ڈھیلی کیوں چھوڑ دی؟ تم نے مجھے آزادی کیوں دی؟

پریم:۔ اب نہ تو باتوں سے کچھ فائدہ ہو گا۔ نہ ان خفیہ ملاقاتوں سے۔ مہربانی کر کے . . . . . .

موتی:۔ (دانت پیستے ہوئے) مہربانی کر کے میں چلا جاؤں یہی مطلب ہے نا تمھارا؟ (بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہے) مگر میں نہیں جاؤں گا سنتی ہو نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا۔ جب تک تم سے وجہ دریافت نہ کروں۔ بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟ —— بولو۔ جواب دو میں پوچھتا ہوں۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ —— آہ! تم نہ بتاؤ گی —— اس روز شام کو میں عہد کر چکا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا —— میں نے اپنے تئیں جھنجھوڑا اور خواب سے بیدار کر لیا۔ شادی کے روز تم سے جو عہد کئے تھے۔ ان کی تجدید کر لی مگر —— مگر پھر —— آہ۔ پریم۔ اس رات تم نے مجھے جانے کیوں دیا؟ یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔ اگر تم ایک بار بھی مجھے روکتیں۔

پریم:۔ (بے اختیاری سے) آہ! میں کیسے روکتی۔ جب کہ تقدیر آپ کو مجھ سے کھینچے لئے جا رہی تھی"

موتی کے چہرے پر مسرت کی جھلک نمودار ہوئی۔

"خوب! تو معلوم ہو گیا کہ تمھیں بھی افسوس اور رنج ضرور ہے"

پریم:۔ (موتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) آہ! آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں عورت نہیں۔ بیوی نہیں۔ میرے سینے میں دل نہیں دل میں جذبات نہیں شکریہ۔ اس حسن ظن کا شکریہ!

موتی:۔ معاف کرنا۔ جب تم نے اس آسانی سے مجھے چھوڑ دیا تو میرے دل میں بدگمانی پیدا ہونی لازمی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر تمھارے دل میں ذرا بھی میرا خیال ہوتا تو رشک و رقابت ضرور . . . .

پریم:۔ (بات کاٹ کر) آپ تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ رہے ہیں عورت کی فطرت کا دوسرا رُخ آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

موتی:۔ وہ کیا؟

پریم:۔ قربانی اور ایثار۔

موتی:۔ قربانی اور ایثار! مان لیا! مگر اس قربانی اور ایثار کی ضرورت کیا تھی؟ میرے صحیح جذبات سے خبردار ہوئے بغیر۔ میرے منہ سے کچھ سنے بغیر . . . . . .

پریم:۔ زیادہ تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میرے صرف ایک سوال کا جواب دیجئے۔ وہی کافی ہو گا۔ کیا آپ نے اوما سے کہا نہیں تھا کہ اگر آپ آزاد ہوتے تو ضرور ان سے شادی کر لیتے؟ . . . . . .
اب خاموش کیوں ہیں؟ گردن کیوں جھک گئی؟ کہہ دیجئے۔ آپ نے ایسا نہیں کہا!

موتی:۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھے اقرار ہے۔ لیکن شاید تمھیں معلوم نہیں کہ میں نے کن حالات کے ماتحت ایسا کہا تھا . . . . . .

پریم:۔ خیر ہو چکا جو ہونا تھا۔ اب گڑے مردے اکھیڑنے سے کیا حاصل؟ میں آپ کو اپنے ہاتھوں ایک دوسری عورت کو سونپ چکی —— اب —— اب آپ —— اس کے ہیں۔

موتی:۔ (بے قراری و اضطراب سے) اور . . . . اور تم بھی تو میری ہو۔ آہ۔ پریم!

پریم نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے

موتی:۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تم پتھر بن چکی ہو لیکن تمھارے آنسو بتا رہے ہیں کہ تم ابھی انسان ہو۔ تو آؤ۔ اب میرا گناہ بخش دو پریم!

پریم:۔ (پیچھے ہٹ کر) ایشور کے لئے اب چلے جائیے۔ میرے لئے عہد کو نباہنا زیادہ دشوار نہ بنائیے۔ اوما کے کیس کے لئے میں ڈاکٹر چھایا سے گفتگو کر چکی ہوں۔ جب ضرورت ہو۔ انھیں ٹیلیفون کر دیجئے گا۔ وہ حاضر ہو جائیں گی۔

موتی ۔ تو کیا تم نہ آؤ گی ؟

پریم ۔ نہیں مجھے ان کی بہت نہیں آتی ۔ ایک غیر مرد سے ملنا مناسب بھی نہیں ہے ۔ میں اپنے ذاتی سے ... ہوں ۔۔۔۔ آپ گھبرائیے نہیں ... ہیں ۔ اور مجھ سے بہت پہلے سے ... ہیں ۔ دیکھو ۔۔ بہتر ہیں ۔ اچھا اب تشریف لے جائیے ۔ ... بات سن لیجئے ۔ ماتا جی کل سے بیمار ہیں ۔ ... نے انھیں بہت بے قرار کر رکھا ہے ۔ میں سوچتی تھی کہ آپ کو کس طرح خبر دوں ۔ اب آپ خود ہی آ گئے تو ۔۔۔۔ اگر آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں تو

موتی ۔ (مسرت سے) میں ملنا چاہتا ہوں ! ... اس سعادت کے لئے میں اپنی آدھی زندگی دینے کو تیار ہوں ۔

پریم ۔ تو نو بجے گھر پر تشریف لائیے ۔ پتا جی کا کہنا باہر ہے ۔ وہ گھر پر نہ ہوں گے ۔

(۶)

انسان خواہ کچھ ہی سوچے کیسی ہی تدابیر کیوں نہ کرے ۔ ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہو چنانچہ پریم لتا کی پیش بندیوں کے باوجود ۔ دما کے کیس پر اس کو جانا پڑا ۔ ادما کی طبیعت یک لخت بگڑ گئی جس وقت ٹیلیفون ہو ۔ ڈاکٹر چھایا موجود نہ تھی ۔ نہ بلوانے پر فوراً پہنچ سکتی تھی ۔ ادھر اتفاق یہ کہ ڈاکٹر موتی بھی اس وقت گھر سے باہر تھے ۔ اب پریم کے لئے خود جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔

وہ عورت جس نے اس کا سہاگ لوٹ لیا اس کی پھولوں بھری سیج کو کانٹوں کے بستر سے بدل دیا ۔ اب انتہائی بے کسی کی حالت میں اس کے سامنے تھی محبت کی جگمگاتی دنیا کو تیرہ و تار کرنے والی ۔ امیدوں کو ملیا میٹ کرنے والی ۔ توقعات کو غلط اور عقیدوں کو باطل ثابت کرنے والی ہستی اب بالکل اس کے بس میں تھی ۔ پریم کا دل نفرت کے جذبات سے معمور تھا ۔ اس نے حقارت بھری نگاہ ادما پر ڈالی ۔ جو اس وقت گلاب کی ایک کچلی ہوئی ڈنٹھی کی طرح پلنگ پر پڑی تھی ۔ وہ مسکرائی ۔ ادما کی زندگی ۔ اس وقت بالکل اس کے رحم پر تھی ۔ قدرت نے انتقام کا سامان خود ہی مہیا کر دیا تھا ۔ اس سے بہتر موقع ملنا ناممکن ہے ۔ اس سنہری موقعے سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے ۔ اس نے پھرتی سے بکس کھولا ۔ اور خوفناک سامان کے ساتھ پلنگ کی طرف بڑھی ۔۔۔۔ ادما کراہی ۔۔۔۔ پُر درد چیخ نے پریم کے ارادے کو متزلزل کر دیا ۔ اس کے قدم رک گئے ۔ اسے اپنے انسانیت سوز فعل پر پشیمانی سی محسوس ہوئی ۔۔۔۔ بیمار پر ظلم ! اُف ! میں درندوں سے بھی بڑھ گئی ... خود ... زخمی کو نہیں چھیڑتا ۔ اور میں ڈاکٹر ہو کر ۔۔ ۔۔۔ لعنت ہے میری انسانیت پر ۔۔۔۔ اُف ۔ ایشور مجھے معاف ... وہ واپس مڑی جب اس کے ہاتھ دوبارہ بکس سے باہر نکلے تو نئے ارادے کے ساتھ ہاتھوں کا سامان بھی بدل چکا تھا ۔ اس کے بعد وہ تن دہی سے کام میں مصروف ہو گئی ۔

ادھر ادما کی زندگی اور موت میں جنگ ہو رہی تھی ۔ ادھر پریم کے دل اور ضمیر میں ۔ دل کہتا تھا کہ دشمن آخر دشمن ہے ۔ اس پر رحم کیسا ؟ ضمیر کا تقاضا تھا کہ فرض کو جذبات پر غلبہ حاصل ہونا چاہیئے ۔ اس کی زندگی کی یہ گھڑیاں نہایت پُر درد تھیں ۔۔۔۔ پُر درد اور ناقابل برداشت ۔ اس کے دل سے بار بار یہ دعا نکلتی تھی کہ ایشور اسے اس صبر آزما اور مشکل کام کے سرانجام دینے کی ہمت عطا فرمائے ۔ جس وقت موتی اور چھایا نے گھر میں قدم رکھا تو اس نے یہ سمجھ کر کہ اس کی دعاؤں نے قبولیت کا جامہ پہن لیا ہے ۔ اطمینان کا سانس لیا ۔ دل میں اگرچہ اب بھی جذبات کا طوفان برپا تھا ۔ تاہم اب وہ دشمن کے پاس تنہا نہ تھی ۔ اور یہی اس کی تسکین کا باعث تھا ۔

ادھر ادما کی حالت اس سے بھی ابتر تھی جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ وہ روحانی اذیت برداشت کر رہی تھی ۔ یہ نہیں کہ وہ پریم کے خیالات یا ارادے کو بھانپ چکی تھی بلکہ اس کے اپنے ہی خیالات اسے پریشان کرنے کے لئے کافی تھے ۔ پریشانی ۔ ندامت ضمیر کی ملامت ۔ رشک و رقابت ۔ بقول شاعر ؎

اک دل ہے اور سینکڑوں صدمے ہزار غم
اک آسمان ٹوٹ پڑا زندگی کے ساتھ

تندرستی کی حالت میں انسان اکثر بڑے سے بڑا گناہ بے خوف کر جاتا ہے ۔ اور اس پر غور کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتا لیکن بیماری میں ہر چھوٹے سے چھوٹا جرم خوفناک گناہ کی صورت میں آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جاتا ہے اور پریشانی اور بے چینی پیدا کر کے اکثر اوقات بیماری کی طوالت کا باعث بنتا ہے ۔

شاید بیماری کی حالت میں انسان خدا کے زیادہ نزدیک ہوتا ہے !

ادما کو اپنی غلطی کا احساس تو شروع ہی سے تھا لیکن وہ ضمیر کی سرزنش سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانے تراش تراش کر اپنے جرم کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکام ۔ آخر پشیمانی کی گھڑی آ ہی پہنچی ۔ پریم

کے ایثار و خدمت نے اس وقت اس کے ساتھ وہ کیا جو نمک زخموں پر کرتا ہے۔ اوّل اوّل تو وہ اسے قریب دیکھ کر گھبرائی۔ پھر اس کی نیک نیتی کا یقین ہونے پر تأسف و ندامت کے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ جب موتی ڈاکٹر چھایا کو ساتھ لئے گھبرایا ہوا کمرے میں آیا تو پریم کو وہاں پا کر اور اس کی کارگزاری دیکھ کر اس کی آنکھیں تحسین و مسرت سے چمک اٹھیں۔ اور اظہار تشکر کے لئے اس کا سر جھک گیا۔ اس وقت ارما کے کلیجے پر سانپ ہی تو لوٹ گئے۔ جب پریم اس کے ننھے سے بچے کو لے کر موتی کی طرف بڑھی اور بولی۔

"دیکھئے۔ میں آپ کے لئے کیا لائی ہوں؟"

"اوہو!" موتی کے منہ سے تعجب و مسرت کے انداز میں نکلا۔

"شاید آپ اس پیاری پیاری شے کو بھول ہی گئے تھے"۔ پریم نے کہنا شروع کیا۔

"منے تمہارے پتا جی بڑے بے پرواہ ہیں۔ تم ان سے نہ بولنا"

"اب دے بھی ڈالئے۔ میں نے کب سے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں" موتی کے لہجے سے جلدی ظاہر تھی۔

"اوہو! اب بے قرار بھی ہونے لگے۔ اگر میں نہ دوں تو آپ کیا کریں گے؟"

پریم کے لہجے سے شوخی ظاہر تھی۔

موتی ہنس دیا۔ اس کا چہرہ بے حد مسرور تھا۔ "بتاؤں میں کیا کروں گا؟" اس نے پریم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں محبت کا پیغام دے رہی تھیں۔ "میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔"

ارما برداشت نہ کرسکی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی——

اور —— اب ——"

"کیوں؟" موتی نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہے ارما؟"

"مسز موتی لال کی طبیعت کیسی ہے" چھایا نے پوچھا "آپ اتنا گھبراتی کیوں ہیں؟"

ارما نے جواب نہ دیا تو پریم فکر مند ہو کر بولی۔

"سول سرجن صاحب نہیں آئے۔ ڈاکٹر صاحب انہیں پھر ٹیلیفون کر دیجئے"

"سول سرجن کے آنے سے جسم سے پرواز کرتی ہوئی روح واپس آسکتی ہو تو بلا لیجئے۔ ورنہ کوئی ضرورت نہیں" ارما کمزور آواز میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے مسرت ظاہر تھی۔

"ہش" موتی کے منہ سے اس کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔

"یہ کیا وہم بیٹھ گیا ہے۔ آپ کے دن ہیں بہن" پریم نے تسلی کے انداز میں کہا۔

"خطرے کی کوئی بات نہیں" لیکن اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ خطرہ ضرور ہے۔

"سنو پریم! تم مجھے فریب نہیں دے سکتیں۔ ایک مرنے والا شخص اچھی طرح جان سکتا ہے کہ وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے" ارما کے لبوں پر افسردہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔ یہ تینوں دم بخود تھے۔ سمجھ نہ سکتے تھے کہ کیا کہیں۔ آخر ارما نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"پریم بہن۔ میں نے تمہارے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے ۔ ۔ ۔"

"ایشور کے لئے خاموش رہئے" پریم گھٹی ہوئی آواز میں بولی "آپ کو زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں"

"مت ٹوکو" وہ منت سے بولی "میں تھوڑی دیر کی مہمان ہوں۔ وقت قیمتی ہے کہیں دل کی باتیں دل ہی میں نہ رہ جائیں۔ بہن پریم میں تمہارے ساتھ دھوکا کر کے خوشی حاصل نہ کرسکی۔ مجھے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی غلطی معلوم ہوگئی تھی۔ موتی تمہارے تھے اور اب تک تمہارے ہیں۔ میں نے انہیں زبردستی اپنا بنانے کی کوشش کی تمہاری طرف سے ان کا دل پھیر کر ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارما!" موتی نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم میرا قصور بھی اپنے سر لے رہی ہو۔ شاید اس لئے کہ پریم کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ایشور جانتا ہے کہ آپ بے قصور تھے" ارما نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "میں نے ہی آپ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی اور کامیاب بھی ہوئی مگر میری کامیابی عارضی تھی —— مجھے اپنی ناکامی کا افسوس نہیں بلکہ خوشی ہے۔ اس لئے کہ میری ناکامی پریم کی کامیابی ہے —— بہن میں تمہاری امانت واپس کرتی ہوں۔ اور ساتھ ہی اپنی امانت بھی تمہارے حوالے کرتی ہوں میرا لال تمہارے سپرد ہے۔ میرے بعد تمہیں اس کی پرورش کرنی ہوگی"

"ایشور کے لئے ایسی دل شکن اور مایوس کن باتیں نہ کیجئے" پریم روتے ہوئے بولی "اگر آپ مجھے قابل التفات سمجھتی ہیں تو میں اب آپ کی خدمت کو اپنا شیوہ سمجھوں گی۔ ہم بہنوں کی طرح ساتھ رہ کر زندگی گزار دیں گی۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پریم ان باتوں کا وقت گزر چکا" وہ رک رک کر بولی "اس وقت اگر مجھے کسی بات سے خوشی ہوسکتی ہے تو وہ معافی ہے۔ اگر تم معاف کر دوگی

تو میں سمجھوں گی کہ ایشور بھی معاف کرے گا (موتی سے) آپ . . . .
آپ بھی مجھے معاف کر دیجئے۔ اور . . . اور بن ماں کے
بچے کو خوش رکھنے کا وعدہ کیجئے"۔
"کس خیال میں ہو ماں؟ تمہارا بچہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے" موتی
نے روتے ہوئے کہا۔
"نہ . نہ . . روئیے نا۔" یہ کہتے ہوئے اوما نے
کروٹ بدلی۔ لیکن اس ذرا سی حرکت سے۔ کھانسی کا سخت دورہ اٹھا۔ اور

ساتھ ہی دم اُکھڑ گیا۔ سول سرجن کے پہنچنے تک اس کی روح مالک حقیقی کے
پاس پہنچ چکی تھی۔
پریم کو اب بھی جس وقت اپنے انتقام کا خیال آتا ہے۔ وہ کپکپا اٹھتی
ہے۔ اس کا دل اندر ہی اندر لرز اٹھتا ہے۔ اگر واقعی اس وقت وہ کوئی اقدام
کر بیٹھتی تو ضمیر کی ملامت اسے چین نہ لینے دیتی۔
آہ بہترین انتقام وہی ہے جس کی تکمیل قدرت کے ہاتھوں ہو ●

پروازِ تخئیل (غزل)

از: سیدہ سردار بیگم اختر حیدرآبادی

شعلہ نکلا ہے کہ مے چھلکی ہے پیمانے سے
ساقیا کون یہ اٹھا ترے مے خانے سے

یوں تو بے کیف و اثر تھا مرا افسانۂ غم
جان سی پڑ گئی لیکن ترے شرمانے سے

ہاں اگر یونہی رہی چشمِ عنایت تیری
پھر مجھے کام ہے شیشے سے نہ پیمانے سے

تیری وہ ایک تغافل کی نظر اچھی تھی
ہم تو برباد ہوئے دادِ وفا پانے سے

ایک اک ذرّے میں ہے جلوۂ حسنِ محبوب
سرنگوں شہر ہے اختر مرے ویرانے سے

جوانی کے دن

از: اعجاز سکندر نازش یکتائی

ابھی یاد ہیں وہ جوانی کے دن
محبت کی رنگیں کہانی کے دن

مجھے یاد آتے ہیں رہ رہ کے پھر
وہ گزرے ہوئے شادمانی کے دن

نہ جانے کہاں چل دیئے چھوڑ کر
وہ فردوس کی مہربانی کے دن

وہ راتیں وہ باتیں وہ کیف و سرور
گئے ساتھ لے کر جوانی کے دن

نہ آئیں گے کیا مڑ کے نازش کبھی
مرے دل نشیں عمرِ فانی کے دن

تسلی

نظم

از:- اختر ہوشیارپوری۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

میری مجبوری پہ یہ آنکھ میں آنسو کیوں ہیں؟
میری ناچاری پہ ہر لمحہ یہ رونا کیسا؟
تجھ کو معلوم ہے سب۔ ہے جو حقیقت دل کی
پھر یہ دامن کو شکووں سے بھگونا کیسا؟
اک ترے قرب کی خاطر یہ بکھیڑا ہے تمام
ورنہ مقصودِ دلِ خستہ نہ ساقی ہے نہ جام

یوں ترے عشق میں سو بار بہائے آنسو
یوں ترے قدموں پہ سو بار لٹائے ہیں سجود
اے خداوندِ نظر تیری وفا کی سوگند
میری پیشانی کا تھا اور نہ کوئی مسجود
اب مگر کیا دلِ بیمار کی باتیں کیجئے
ایک گرتی ہوئی دیوار کی باتیں کیجئے

اپنی گزری ہوئی صحبت کے فسانے مت چھیڑ
اب مجھے دامنِ الفت سے ہوائیں مت دے
مجھ کو جانے دے زمانہ لئے جاتا ہے جدھر
عمرِ رفتہ سے یہ کہدے کہ صدائیں مت دے
تو مگر میری جدائی میں کبھی بار نہ ہو
اے مری نرگسِ بیمار تو بیمار نہ ہو

کیا ہوا آج مقدر نے جو آنکھیں بدلیں
گر نہیں آج موافق یہ ہوا بھی نہ سہی؟
ہوتی آئی ہے کہ دنیا کو رہی عشق سے ضد
یہ جہاں والے تو کیا حق میں خدا بھی نہ سہی
تو مگر رنج نہ کر آج بھی تیرا ہوں میں
میری دنیا تو ہے طلعت تری دنیا ہوں میں

معاشرتی

راضی برضا (افسانہ)

از:-
عبدالحمید خاں بی اے

(۱)

مورخہ ۱-جون۔ پیارے دیا!

اگر آج جانے میں آپ کا کوئی خاص حرج نہ ہو۔ یہ تو نہ جائیے نہ جائیں گے نا؟

آپ کی کملا

(۲)

مورخہ ۲-جون۔ پیارے دیا!

آپ کا خط پڑھا خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اسدن اماں نے ہم لوگوں کو باتیں کرتے دیکھ لیا تھا جیسے آکر بہت ناراض ہوئیں۔ وہ وقت بھگوان ہی جانتا ہے۔ مگر آپ کو اس کا کچھ بھی افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے یقین دیا مت چالاک ہے۔ آپ اس کا خواب میں بھی خیال نہ کیجئے کہ میں آپ سے ناراض ہوں۔ بلکہ اماں کے ڈر کی وجہ سے میں آپ سے بات چیت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ مجھ پر کافی نگرانی رکھتی ہیں۔ جب آپ ہمارے ہاں آتے ہیں۔ اس وقت جتنی خواہش مجھے آپ سے بات کرنے کی ہوتی ہے وہ بس مجھ میں ہی جانتی ہوں۔ میں آپکے سامنے اس لئے نہیں کھڑی رہتی کہ کہیں اماں کے سامنے لگا ہوں لگا کر میں اپنے دل کے بھید نہ کھول دوں اسی وجہ سے دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہوں۔ معاف کیجئے گا۔ میری اس غلطی کو۔ لیکن آپ ہی بتائیے میں کروں کیا۔ میں واقعی لاچار ہوں۔ میری کسی بات سے بھی آپ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ میں آپ سے ناراض ہوں —— کبھی نہیں . . . خواب کے ایک لمحہ میں بھی نہیں . . . . . دوسرے جیون میں بھی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ سے ناراض ہی نہیں ہو سکتی۔

میں ہر وقت آپ کو دیکھنے کے لئے بے چین رہتی ہوں۔ اس لئے آپ کو چاہیئے کہ دن میں اپنا ہنس مکھ چہرہ ضرور دکھا دیا کریں۔ میں آپ کی شکر گذار رہوں گی۔ میں آپ کو پا کر بہت خوش ہوں۔ نہ جانے کونسی طاقت لگا تار مجھے آپ کی طرف کھینچے لئے جاتی ہے۔ آپ کی دلچسپ باتوں کو سن کر میں خود بھی کھچی چلی جا رہی ہوں۔ میں تو سوچا کرتی تھی کہ آپ صرف بچوں کے ساتھ ہی دل لگی کرنے میں ماہر ہیں۔ مگر نہیں میری آنکھیں کھلیں۔ آپ جتنے شریر ہیں اُس سے کہیں زیادہ آپ سنجیدہ بھی ہیں۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ آپ اتنی اچھی طرح باتیں کریں گے نہ جانے آپ اپنا دل ہی کھول رہے ہیں۔ آپ کی محبت میری رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ آپ کو اداس دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے بتائیے پرسوں ایک دن سے آپ اُداس کیوں تھے۔ آپ کا ہر وقت ہنسی سے کھلا رہنے والا چہرہ کل غمگین کیوں تھا۔ ناامیدی سے کیوں جھکا ہوا تھا۔ میں ہر ایک کام کر رہی تھی۔ لیکن دل آپ کی ہی طرف تھا۔ جب آپ کو اتنی دیر دیکھے بغیر یہ حالت ہو جاتی ہے تو کہہ نہیں سکتی کہ جب آپ میرٹھ چلے جائیں گے تو کیا ہوگا۔ . . میری جیسی کا ٹھکانہ نہ رہیگا۔ میں آپ کو ایک منٹ کو بھی نہیں بھولتی۔ کمرہ میں زیادہ وقت کھڑکی پر گذرتا ہے۔ اماں کے ڈر کی وجہ سے میں تصویروں میں آپ کو دیکھتی ہوں۔ کیونکہ گلی میں چلنے والوں کی ان میں پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ آپ نہ جانے مجھے اتنے کیوں اچھے لگتے ہیں۔ میں اب اوپر بھی نہیں آ سکتی۔ صرف سوتے وقت آتی ہوں اس وقت پھر وہی بات یاد آ جاتی ہے۔ ڈر کے مارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی رات ایسی نہ جاتی ہوگی۔ جب میں دو ڈھائی بجے سے پہلے سو جاتی ہوں۔ یہ سب وقت آپ ہی کی یاد میں گذرتا ہے۔ خواب میں بھی آپ کو میں ڈھونڈتی ہوں لیکن آپ نہیں ملتے۔

میں ایک طرح سے نظر بند ہوں۔ کیونکہ آپ کے یہاں تو اب بالکل ہی نہیں جا سکتی۔ بہت جی چاہتا ہے کہ جاؤں لیکن . . . . . مجبوری۔ اُس دن میری بہت خواہش تھی کہ ناؤ میں کچھ رکھکر پھینک دوں۔ لیکن ہمت ہی نہیں ہوئی۔ میں دن میں بالکل نہیں پڑھتی۔ صرف سامنے کتابیں رہتی ہیں۔ اب رات کا وقت ہے۔ خط لکھ رہی ہوں۔ لیکن ڈر ہے کہ کہیں اماں جاگ نہ پڑیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ سب گہری نیند سو رہے ہیں۔ صرف سٹرجیل (کتے کا نام ہے) ہی جاگ رہے ہیں وہ اور چوکیدار اتنی خاموش رات میں چلا کر ڈرا دیتے ہیں۔ اس وقت آپ بہت یاد آ رہے ہیں۔ اسدن میں نے آپ کا پراٹھا اور آلو کا ساگ نہیں کھایا تھا۔ معاف کیجئیگا۔ من بہت چاہ رہا تھا کہ میں کھا لوں اور آپ کا کہا نہ توڑوں لیکن شرم نے اتنا مجبور کر دیا کہ ہاتھ آگے کو نہ بڑھے۔ میں اپنی بیوقوفی کی آپ سے معافی مانگتی ہوں

را سوچئے تو سہی کہ آپ نے اُسدن وہ کریم کی شیشی کیوں واپس کردی۔ سے تو آپ کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہیئے تھا۔ اب آپ کو اسے ضرور ینا ہوگا۔ مجھے تو بُرا معلوم ہوا کہ آپنے اسے واپس کردیا۔

اب آپ کو بتانا چاہیئے کہ آپ کب میرٹھ جارہے ہیں۔ اُسدن ہت افسوس تھا کہ آپ چلے جائیں گے۔ ہم دیکھ بھی نہ سکینگے۔ میری قسمت ست دیسی ہے۔ اس رنج کیوجہ سے میں تو نیچے والے کمرہ سے باہر نکلی تھی۔ سچ ہے کہ جسے جس کی تمنا ہوتی ہے وہ اسے مل ہی جاتا ہے مجھے آپ کی تلاش تھی تو آپ مل ہی گئے۔ میں ایشور کی بہت شکر گذار ہوں س دن میں نے آپ کا آم نہیں لیا تھا۔ معاف کردیجئے گا۔ میں نے سمجھا کہ آپنے مذاق میں کچا آم دے دیا ہے۔ اس لئے پھینک دیا تھا ر اب آپ دیں تو لے لوں گی اور کچا بھی ہوگا تو میٹھا سمجھکر کھا لوں گی۔

آپ کی "بملا"

(۳)

مورخہ ۱۴- جولائی۔ پیارے دیا!

میں آپ کو تکلیف ہی دینے کے لئے ہوں اور شاید بھگوان نے پیدا بھی اسی لئے کیا ہے۔ اماں نے آج جو کچھ آپ کو کہا وہ میری ہی وجہ سے کہا گیا ہے۔ مجھے اس بات کا بہت رنج ہے۔ نہ جانے میں کیسی بدقسمت ہوں۔ مجھے اس وقت بہت بُرا معلوم ہو رہا تھا مگر میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ آپ اس بات کو بھول جایئے۔ آج دوپہر جب سب سو رہے تھے میں اوپر چڑھ گئی۔ اور دو ڈھائی گھنٹے بعد نیچے لوٹ ئی۔ تقریباً دو گھنٹے تک میں دیوار پر کھڑی رہی۔ لیکن افسوس دھوپ ں سوکھتی ہی رہی۔ میں دل میں طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکا رہی تھی کہ شاید اب بھی آپ جائیں۔ لیکن نہیں . . . . گلی میں سب ہی آئے یک کے بعد . . . . ایک.. لیکن آپ ہی نہ آئے۔ مجھے آپ کے یرٹھ جانے کا بہت رنج ہے۔ کیا آپ سچ مچ ہی ۱۹ تاریخ کو چلے جائیں گے۔ کیا آپ کا ٹھہرنا بالکل ناممکن ہے۔ آپ کچھ دنوں اور ٹھہر جایئے !!

آپ کی "بملا"

(۴)

مورخہ ۲۲- ستمبر:- سہارنپور پیارے دیا!

آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کو بھول ہی گئی۔ یسے کہوں کہ آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ آپ مجھے ایسی اُمید کبھی نہ رکھئے۔ میں آپ کو خواب میں بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ہاں خط لکھنے میں دیر ضرور ہوگئی۔ جس کی معافی چاہتی ہوں۔ بات یہ ہوئی کہ آپ کا خط نہ معلوم کس طرح اماں کو مل گیا۔ انہوں نے پڑھ لیا۔ پھر کیا تھا غصہ میں آگ بگولا ہوگئیں۔ تیور چڑھے ہوئے تھے۔ غصہ میں چہرہ تمتمایا ہُوا تھا۔ میں دیکھتے ہی ڈر گئی۔ لیکن خاموش کھڑی سب کچھ سنتی رہی آخر ہماری ہی غلطی تھی نا۔ وہ کہ رہی تھیں کہ اب میں تیری ڈاک روز دیکھا کروں گی۔ وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہم اور پتے پر خط منگا سکتے ہیں۔ شانتی کو تم جانتے ہی ہو نا بس اسی کے نام پر خط بھیجا کرو۔ وہ مجھے فوراً پہنچا دیا کریگی۔ کل رات کوئی بارہ ایک بجے میں اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی تمام دنیا اندھیرے میں ملفوف تھی۔ میں خاموش رات میں شاید اکیلی ہی جاگ رہی تھی۔ لیکن نہیں میرا خیال غلط نکلا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نیچے سے ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔ پتاجی آہستہ آہستہ اماں سے کہہ رہے تھے کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں ور ڈھونڈنے جاؤں گا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ پرماتما کرے یونہی ناکام واپس لوٹ آئیں کوئی ور ملے ہی نہ تو اچھا ہے۔"

لیکن تم فکر نہ کرو۔ بملا تمہاری ہی ہے۔ اور تمہاری ہی رہے گی لیکن جیون کے اس کٹھن راستہ میں تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ اس دکھی سنسار میں تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ سماج کے بندھنوں کو توڑنے میں تمہیں ہی میری مدد کرنا ہوگا۔

دیا! سماج کے یہ بندھن کتنے غلط ہیں۔ جب ہم ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے پسند کرتے ہیں تو پھر اس کمبخت سماج کو ہماری محبت کی اس بہتی گنگا میں رکاوٹ پیدا کرنے سے کیا حاصل دو دلوں کو دکھانے سے کیا فائدہ۔ کیا یہ اس لئے ہے کہ محبت کرنا سماج کی نظر میں گناہ ہے۔ آخر گناہ ہے کیسے۔ محض اس لئے کہ سماج اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یا اس لئے کہ ہم نے سماج سے شادی یعنی محبت کرنے کا لائسنس نہیں لیا۔ لیکن آخر اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ سماج کی رنگین عینک کو اُتار کر اگر اسے دیکھا جائے تو ضرور یہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آ جائے گی لیکن اتنا شعور ہے کسے۔ بہرحال ہمیں سماج کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تم اطمینان رکھو کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتی۔ اور اگر تم خود ہی کنارہ کشی اختیار کرلو تو اس کا کچھ علاج نہیں۔

آپ کی "بملا"

(۵)

مورخہ ۱۷- اکتوبر۔ سہارنپور

پیارے دیا!

اب میں کسی قدر ٹھیک ہوں۔ بخار تو قریب قریب جا چکا ہے۔ بس کمزوری باقی ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ دور ہو جائے گی۔ پرہیز برابر کر رہی ہوں۔ تبدیل آب و ہوا کی خاطر یہاں کافی دن سے آئی ہوئی ہیں۔ وہاں شاید آپ کی خیریت معلوم نہ ہو سکے گی۔ جب واپس آؤں گی تو فوراً خط بھیجوں گی۔ تم اس دوران میں کوئی خط نہ بھیجنا کیونکہ مجھے مل نہیں سکتا۔

آپ کی کملا

(۶)

مورخہ ۹ جنوری۔ سہارنپور

پیارے دیا!

تمہاری آزمائش کا وقت قریب ہے۔ وہ مل چکا ہے۔ اور کوئی کی بات چیت ہو رہی ہے۔ وہ لکھنؤ میں وکیل ہے اس کا نام ہے۔ شاید شریف آدمی ہو۔ تم فوراً اس سے ملو۔ ممکن ہے ہماری تمہاری حالت پر رحم کھائے۔ تھوڑے لکھے کو بہت سمجھو۔ اور اس میں دیر نہ کرو۔

(آپ کی کملا)

(۷)

مورخہ ۲۴- مارچ۔

۱۵۲، کنگ اسٹریٹ لکھنؤ

مسٹر دیا!

اب سانپ نکل چکا ہے اور اس کی لکیر کو پیٹنا بالکل بیکار ہے بات یہ ہے کہ ہر کام کا وقت ہوتا ہے اگر اس وقت ہم اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو پھر ہاتھ ملنے پڑتے ہیں۔ جب لوہا گرم ہوتا ہے تو ہم جس شکل میں چاہیں اسے تبدیل کر سکتے ہیں لیکن وقت سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو پھر کسی صورت سے بھی ٹس سے مس نہیں ہو سکتا تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک بات کا وقت اور موقع ہوتا ہے۔ اب تم مجھ سے خط و کتابت بھی بند کرو کیونکہ یہ سب بیکار ہے۔ میں نے تو تمہارے بھروسے پر اس چھوٹے سے سنسار میں ہر ایک کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ والدین مجھ سے بیزار تھے۔ گھر والے پریشان تھے۔ ان کی بنی بنائی بات بگاڑ رہی تھی۔ ان کی بات میں فرق آ رہا تھا۔ لیکن ہمارے سہارے میں اکیلی تمام دنیا کا مقابلہ کرتی رہی۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ لکھا کہ آ کر مجھے جلد کہیں لے جاؤ۔ اور یہ کہ ہم کسی دور دراز شہر میں شادی کر لیں گے۔ تمہیں میں نے کیسے کیسے یقین دلایا تھا کہ تم ذرا مت گھبراؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہر طرح اور ہر حالت میں خوش رہوں گی۔ لیکن تمہاری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تمہیں نہ آنا تھا اور نہ آئے۔ چند میں اکیلی کیا کرتی میں سچ مچ اکیلی رہ گئی۔ تم نے تو خط بھی نہ بھیجا۔ اس ذرا سی بات سے گھبرا گئے۔ اور ہمت ہار گئے۔ تم میری کچھ بھی خطا نہیں بتا سکتے۔ میں تو تمہیں ذرا ذرا سی بات بتاتی رہی۔

میں اب بیاہتا ہوں۔ ہندو استری کا فرض جانتے ہو کیا ہے اسے ہر حالت میں اپنے شوہر کی سیوا کرنی ہوتی ہے۔ وہ پھر بھی اسکا شوہر ہوتا ہے۔ اور مجھے تو اپنے شوہر کی حالت پر رحم سا آتا ہے۔ غریب بڑی ہی محبت کرتا ہے۔ سچ جانو میری تو پرستش کرتا ہے۔ دیا! اب مجھے بھول جاؤ۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ نہ بھولنے میں تمہیں زیادہ تکلیف ہوگی۔ اور دیکھو آئندہ مجھے خط بھی کبھی نہ لکھنا۔ ایک بیاہتا عورت کو خط لکھنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ بس اب مجھے میری حالت ہی پر چھوڑ دو . . . . . شکریہ

بدنصیب

(کملا)

چند اشعار

از:- لالہ جگن ناتھ بی۔ اے۔

جو دل نشیں ہے تو ذوقِ نظر ہے ورنہ
چمن میں خاکِ چمن کے سوا کچھ اور نہیں
حیات نام ہے جس کا جہانِ فانی میں
وہ چیز دردِ وطن کے سوا کچھ اور نہیں
کسی[1] کا فیضِ نظر ہے وگرنہ شعر مرے
نوائے سازِ کہن کے سوا کچھ اور نہیں
نثار آرزوئے تاجِ قیصری جس پر
وہ شے کمالِ سخن کے سوا کچھ اور نہیں

---

[1] شمس العلما مولانا تاجور

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

مفرور

از:-

سید نصیر احمد بی۔ اے۔

(آذرین برونل کا ایک ڈرامہ، تصرف، ترمیم اور تغیر و تبدل کے ساتھ)

کردار:-

۱ - کریم خاں	ایک مفرور
۲ - مس ستارہ انور	ایک ایکٹرس
۳ - ہوٹل کا مالک	
۴ - رمضان	ہوٹل کا ملازم
۵ - احسان علی خاں	ایک نوجوان سب انسپکٹر پولیس

منظر:- ایک چھوٹے سے سرحدی قصبے کے معمولی ہوٹل کا ایک چھوٹا سا کمرہ۔

وقت:- زمانہ حال - گلابی جاڑوں کی ایک رات۔

موسیقی:- پردہ اٹھنے سے پہلے دور سے موسیقی کی آواز آتی ہے پشتو زبان کا کوئی گیت آہستہ آہستہ گایا جا رہا ہے۔

پردہ اُٹھنے پر کمرہ تاریک سا نظر آتا ہے صرف چاند کی کرنوں سے مدھم سی روشنی ہو رہی ہے۔

دفعتًا ایک شخص کا ہاتھ کھڑکی کے چھجے پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور فوراً ہی بعد دوسرا ہاتھ دکھائی دیتا ہے پھر وہ اپنا منہ اوپر کر کے کمرہ کا جائزہ لیتا ہے۔ اور اس کے بعد کھڑکی پر چڑھ آتا ہے ساتھ ہی اپنا پستول جو وہ اپنے منہ سے پکڑے ہے نکال کر پیٹی میں رکھ لیتا ہے۔ وہ ننگے سر ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں اور ان میں گرد بھری ہے۔ وہ شلوار، خاکی قمیص اور کوٹ پہنے ہے شکل و صورت اچھی ہے اور عمر تیس اور چالیس کے درمیان۔ اس کا نام کریم خاں ہے۔ اس کے مونچھیں اور گھنی داڑھی ہے۔

وہ کھڑکی سے کمرے کے اندر آ کر کوٹ کی جیب سے دیا سلائی نکال کر جلاتا ہے۔ اور کمرے کے چاروں طرف غور سے دیکھتا ہے۔

باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ فورًا دیا سلائی بجھا دیتا ہے۔ اور جلدی سے کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے۔ جیسے باہر جانے کا ارادہ ہو مگر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا ہے اور چارپائی کے نیچے گھس جاتا ہے۔

ہوٹل کا مالک:- (باہر سے) جی ہاں مس صاحبہ، دوسرا کمرہ، جی ہاں ایسا...

(دروازہ کھلتا ہے۔ اور مس ستارہ انور اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین ہے۔ اور دوسرے میں چھوٹا سا بیگ۔ وہ ہوٹل کے مالک اور ملازم رمضان کے لئے دروازہ کھلا رکھتی ہے۔ جو اس کا بڑا بیگ اٹھائے ہوئے ہیں مس ستارہ انور لانبے قد کی خوب صورت عورت ہے اور ایک بیش قیمت ساڑھی پہنے ہے)

ستارہ انور:- (چارپائی کی پائنتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اسے وہاں رکھ دیجئے جی ہاں نیچے وہاں

(وہ اس کا بیگ وہاں رکھ دیتے ہیں۔ خود ستارہ انور اپنا بیگ چارپائی پر اور لالٹین میز پر رکھ دیتی ہے۔ ملازم باہر جانا چاہتا ہے۔ مگر مالک اسے روک لیتا ہے)

مالک:- رمضان ذرا ٹھہرو۔ مس صاحبہ آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟

ستارہ انور:- کھانا؟ کیا تیار ہے۔ آپ کے ہاں اسوقت؟

مالک:- (لالٹین جلاتے ہوئے) جو آپ پسند فرمائیں۔ آلو گوشت پلاؤ۔ نان اور کباب۔ اور اگر آپ پسند کریں تو انڈوں کا کوئی سالن بھی تیار ہو سکتا ہے

ستارہ انور:- آلو گوشت اور پلاؤ بھجوا دیجئے۔ اور ہاں دیکھئے۔ اگر چائے بھی مل جائے تو کیا کہنا۔

رمضان:- آلو گوشت۔ پلاؤ اور چائے بس یہی نا مس صاحبہ؟

ستارہ انور:- کیا کوئی چٹنی بھی تیار ہو سکتی ہے۔ یا اچار؟

رمضان:- کیوں نہیں۔ بہت اچھا مس صاحبہ۔ ابھی ابھی سب چیزیں لاتا ہوں۔

مالک۔ آپ اپنے کمرے ہی میں کھانا پسند کریں گی؟

ستارہ انور۔ ہاں۔

مالک۔ بہت بہتر۔ رمضان جلدی کرو

[رمضان مسکراتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ ہوٹل کا مالک کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے]

مالک۔ کھڑکی بند کردوں نا؟ صبح سویرے ہی یہاں سے کمرے میں دھوپ جاتی ہے۔ اور پھر سونا دشوار ہو جاتا ہے

ستارہ انور۔ نہیں نہیں بند نہ کیجئے۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ہی بیدار ہو جاتی ہوں میری عادت صبح سویرے سیر کرنے کی ہے۔

مالک۔ اگر بیگ کھولنے اور چیزیں وغیرہ نکالنے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔

ستارہ انور۔ بیشک۔ شکریہ۔

[مس ستارہ انور اپنا چھوٹا بیگ جو اس نے چارپائی پر رکھا تھا کھولتی ہے۔ اور اس دوران میں ہوٹل کے مالک سے برابر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ وہ بیگ میں سے مختلف چیزیں مثلاً صابن۔ پوڈر تیل اور کریم وغیرہ نکال کر میز پر رکھتی جاتی ہے]

ہوٹل کا مالک۔ (بیگ کے تسمے کھولتے ہوئے) آپ کی گاڑی آج بہت لیٹ تھی۔ ہے نا؟

ستارہ انور۔ ہاں بہت لیٹ۔ پچھلے اسٹیشن پر پولیس نے گاڑی رکوالی اور تمام ڈبوں کو چھان مارا۔

مالک۔ پولیس نے، اچھا؟

ستارہ انور۔ پولیس والے کسی غریب مجرم کی تلاش میں تھے

مالک۔ تو کیا انھیں وہ مجرم مل گیا؟

ستارہ انور۔ نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ نہیں۔

مالک خدا کا شکر!

ستارہ انور۔ میرے دل میں ہمیشہ سے کسی مجرم اور بدنصیب کے لئے رحم کے جذبات موجود رہے ہیں۔

مالک۔ اگر آپ کے سامنے کوئی ایسا مجرم آجائے تو پھر شاید رحم کے یہ سب جذبات مفقود ہو جائیں۔ ہاں اس وقت آپ کو اپنے آپ پر ضرور رحم آئے (ستارہ انور ہنستی ہے) بیگ کی چابی کہاں ہے؟

ستارہ انور۔ (چابیوں کا گچھا دیتے ہوئے) یہ لیجئے۔ یہ رہی چابی۔ یہ بڑی کی

مالک۔ شکریہ۔ (بیگ کھولتے ہوئے) اس طرف تو قتل کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں کوئی ڈاکہ ڈال کر یا کسی کا خون کر کے ... بچوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ کیا یہ چادر باہر نکال دوں؟

ستارہ انور۔ جی ہاں۔

[مالک چادر نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے]

اسے چارپائی پر بچھا دیجئے۔ میں آپ کا زیادہ وقت تو ضائع نہیں کر رہی؟

مالک (چادر کو چارپائی پر بچھاتے ہوئے) جی نہیں مس صاحبہ اس کے علاوہ میں ... مشتاق ہی ہے ... آپ کے سینما کے لباس دیکھنا چاہتا ہوں کیا آپ کے بیگ میں اور کپڑے ہیں جو آپ نے فلم ... کام کرتے ہوئے پہنے تھے؟

ستارہ انور۔ سینما کے کپڑے یہاں کہاں۔ وہ تو وہیں۔ جہاں فلمیں لی جاتی ہیں۔ میرے پاس تو بس معمولی سے کپڑے ہیں۔

[وہ کچھ کپڑے نکال کر ہوٹل کے مالک کو دیتی ہے]

نہیں اس کرسی پر رکھ دیجئے۔ دیکھ لیجئے معمولی سے ہیں سب۔

مالک۔ (ہنس کر) معمولی سے کیوں ہونے لگے۔ بڑے قیمتی ہوں گے؟!

ستارہ انور۔ قیمتی۔ نہیں بالکل نہیں۔ میں اپنے کپڑے خود سیتی ہوں۔ اور مجھے خوب معلوم ہے۔ یہ کیسے ہیں۔

[رمضان کھانا لے کر آتا ہے]

مالک۔ رمضان میز پر رکھ دو۔ آلو گوشت پلاؤ۔ اندے۔ چٹنی اور سب ٹھیک ہے۔ شاباش۔

ستارہ انور۔ ٹھیک ہے۔ اچھا اب میں کھانا شروع کرنا چاہتی ہوں۔ اب مجھے آپ میں سے کسی کی ضرورت نہیں میں سب کام خود کرلوں گی (بیٹھ جاتی ہے)

مالک۔ بہت اچھا مس صاحبہ ہم اجڈ اور جاہل سے لوگ ہیں۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ کو یہ انتظام اور کھانا پسند آئے گا۔

ستارہ انور۔ (کھانا شروع کرتے ہوئے) معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

مالک شکریہ مس صاحبہ۔ اچھا اب اجازت ہے۔

ستارہ انور۔ یہ چٹنی تم نے خوب بنائی ہے۔ رمضان خوب ہے!

رمضان۔ شکریہ جناب مس صاحبہ۔ آپ کی مہربانی!

ستارہ انور۔ اچھا شب بخیر!

مالک / رمضان } آداب عرض ہے مس صاحبہ!

[دونوں چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے چند لمحوں بعد کریم خاں چپکے سے چارپائی کے نیچے سے نکل کر کھڑا ہو جاتا ہے]

اس کے پستول کی نالی ستارہ انور کی طرف ہے جس کی اس طرف پشت ہے۔ اس وقت وہ جگ سے گلاس میں پانی ڈال رہی ہے۔ جب تک وہ جگ اور گلاس میز پر نہیں رکھ دیتی۔ وہ خاموش رہتا ہے]

کریم خاں۔ (نہایت اطمینان سے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری آواز سننے پر آپ کے ہاتھ سے گلاس اور جگ نہ چھوٹ جائیں (ستارہ انور جلدی سے پیچھے دیکھتی ہے) بے خوف ہو کر بیٹھی۔ بیٹے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تاہم مجھے دروازہ ضرور مقفل کر دینا چاہئے۔

[دروازہ مقفل کرتا ہے اور چابی اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے]

بس یہ ٹھیک ہے۔ جب تک ہم میں اعتماد باہمی نہ پیدا ہو جائے۔ اور یہ ابھی پیدا ہو جائے گا۔ جوں ہی کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں گا۔ آپ ڈر تو نہیں رہیں . . . ؟

[کھڑکی کے پاس جا کر اسے بند کر دیتا ہے]

ستارہ انور۔ نہیں لیکن۔

کریم خاں۔ آپ کے دل کی دھڑکن کی آواز تو یہاں تک آ رہی ہے میں صاف سن رہا ہوں مجھے بڑا افسوس ہے۔ واقعی۔ مگر یہ دھڑکن خود ہی جاتی رہے گی۔ دیکھئے۔ میں اس چیز کو پیٹی میں رکھ لیتا ہوں۔

[پستول پیٹی میں رکھ لیتا ہے]

ٹھیک ہے نا؟ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟

ستارہ انور۔ میں آپ کو روک نہیں سکتی۔ . . . . !

کریم خاں۔ کیوں نہیں روک سکتیں۔ روک سکتی ہیں آپ۔ آپ کہئے میں نہ بیٹھوں۔ کہہ کر دیکھئے تو سہی۔ میں ہرگز نہیں بیٹھوں گا۔ میری تربیت نہایت اعلےٰ پیمانے پر ہوئی ہے۔ اگرچہ میں یتیم ہوں۔ جی ہاں۔ واقعی۔ یتیم!

ستارہ انور۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مہربانی کر کے بیٹھ جائیے۔

کریم خاں (کرسی پر بیٹھ کر) شکریہ۔

ستارہ انور۔ اچھا تو اب؟

کریم خاں۔ اب کیا؟

ستارہ انور۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟!

کریم خاں۔ معاف کیجئے گا۔ میں بھول ہی گیا تھا۔ آپ میرا بیان سننا چاہتی ہیں۔ لیکن . . . . کیا آپ کو بہت زیادہ بھوک لگی ہے؟

کریم خاں۔ کیا آپ کچھ سالن اور چاول میرے لئے نہیں چھوڑ سکتیں۔ آج صبح سے میں نے صرف ایک بسکٹ کھایا ہے۔

ستارہ انور۔ ضرور، کھائیے اور چائے بھی پیجئے

کریم خاں۔ شکریہ۔ آپ واقعی بہت نیک دل اور مہربان ہیں!

[وہ اسے ایک پلیٹ میں چاول اور سالن دیتی ہے۔ اور پانی کا ایک گلاس بھی]

(پانی پیتے ہوئے) عنایت۔ شکر ہے خدا کا۔

ستارہ انور (وقفہ سے) اچھا۔ اب؟

کریم خاں۔ یہ کہ میں صبح سے کیوں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اور یہاں کیا کر رہا ہوں (وہ سر ہلاتی ہے) بہت معمولی سی بات ہے میں عدل وانصاف کا مفرور ہوں (وہ اس کی طرف تعجب سے دیکھتی ہے) ہم سب اس سے ڈرتے ہیں۔ مس صاحبہ عدل بڑی ظالم شے ہے۔ بہت سی عورتوں کی طرح ظالم!

ستارہ انور واقعی۔

کریم خاں۔ بالکل۔ عورتیں۔ تقریباً اسی قدر بری ہوتی ہیں جس قدر مرد لیکن سراسر نہیں۔ بات یہ ہے۔ عورتوں کو اتنے مواقع نہیں ملتے۔

ستارہ انور۔ ٹھیک۔ اچھا آپ پر الزام کیا ہے؟

کریم خاں۔ الزام کیا ہے میرا خیال ہے اسے قتل کہتے ہیں۔

ستارہ انور۔ (خوف زدہ ہو کر) قتل؟

کریم خاں جی۔ لیکن اس میں پرلطف چیز یہ ہے کہ میں بالکل بے گناہ ہوں واقعی بالکل بے گناہ۔ کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں ——؟

ستارہ انور ہاں آپ کی شکل تو قاتلوں جیسی نہیں۔

کریم خاں۔ درست فرمایا۔ اب آپ کم خوف زدہ ہیں نا؟

ستارہ انور۔ ہاں میرا خیال ہے۔ آپ بالکل بے ضرر ہیں۔

کریم خاں۔ آپ کے سینے میں نیک دل ہے خاتون۔ اگر میں گرفتار ہو گیا۔ اور اپنی بے گناہی کا یقین دلایا تو ہر ایک میرا مخالف ہو جائے گا۔ وہ سمجھیں گے کہ میں انہیں بے وقوف بنا رہا ہوں۔ اور پھر وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ میں صرف ایک ہی بات کر سکتا ہوں اور وہ یہ اقرار کر دوں میں نے واقعی جرم کیا ہے۔

ستارہ انور۔ لیکن کیوں؟

کریم خاں۔ اس لئے کہ میرے اس رویّے سے بہت سے لوگ میرے ہمدرد

ستارہ انور۔ آپ اپنے ہم جنسوں کی نسبت بہت خراب رائے رکھتے ہیں۔

کریم خاں۔ اس ہوٹل کے مالک کی بات۔ اس نے جو کچھ کہا تھا میں چارپائی کے نیچے سن رہا تھا۔ مگر آپ سوچ کیا رہی ہیں ؟

ستارہ انور۔ میں یہ سوچ رہی تھی۔ آپ آئے کہاں سے ہیں۔

کریم خاں۔ اور مجھے اس سے اتفاق ہے۔ اسے ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اور یہی حالت میری ہے

ستارہ انور۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ ہم فطرتاً اچھے ہیں ؟

کریم خاں۔ آپ بہت سنجیدہ ہوتی جاتی ہیں مس صاحبہ۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ فطرتاً ہم کیا ہیں۔ میرا خیال ہے۔ اصولاً ہم اچھے ہیں لیکن ہم میں سے اکثر میں بہت سی خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً خود مجھ میں خامیاں ہیں مگر آپ یہ سب کچھ سننا ہرگز نہ چاہتی ہوں گی اور اس میں کچھ لطف بھی نہیں !

ستارہ انور۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کے ہاتھوں میں ہوں۔ مگر میں ان باتوں سے لطف اندوز ہو رہی ہوں

کریم خاں۔ مجھے اس میں کچھ شک ہے۔ اگرچہ آپ کی عنایت کہ آپ ایسا فرما رہی ہیں۔ عورت کے دل بہلانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے اپنے متعلق بے انتہا درد بھری کہانیوں کے افسانے سنا کر اس کا دماغ چاٹ لیا جائے مگر قبل اس کے کہ میں یہی شروع کر دوں کیا آپ ابھی تک خوف زدہ ہیں؟

ستارہ انور۔ میں نے کب کہا کہ میں خوف زدہ ہوں

کریم خاں۔ خوب۔

ستارہ انور۔ آپ چائے پیجئے تھکن میں یہ خوب چیز ہے

کریم خاں۔ مس صاحبہ آپ بہت مہربان ہیں۔ آپ ایک مفرور مجرم سے کتنی اچھی طرح پیش آ رہی ہیں۔

ستارہ انور۔ خیر یہ چائے تو پیجئے۔

کریم خاں۔ (مسکرا کر) آپ لوگوں کو مطمئن کرنا خوب جانتی ہیں۔ خیر اب میری کہانی سنئے :۔ میرا نام کریم خاں ہے اور کبھی میں اسلامیہ کالج میں ریاضیات کا پروفیسر تھا۔ اب میرا پیشہ ہے گھوڑوں کی تجارت اور سیاست میں حصہ لینا۔ دونوں جان جوکھوں میں ڈالنے والے کام ہیں۔ اور ہاں کل میری عمر پورے پینتیس برس کی ہو جائے گی۔

ستارہ انور۔ خوب !

کریم خاں۔ ہاں تو اس قتل کے متعلق سنئے بیچارہ آدمی جو قتل ہوا ہے اس کا نام ہے رحمن خاں۔ وہ، فرمان علی خاں اور میں اسمبلی کے انتخاب میں ایک ہی حلقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ اور ہمارا آپس میں مقابلہ تھا میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اپنے حلقے کا گاؤں گاؤں پھر کر دورہ کروں گا رحمن خاں اور فرمان کی اگرچہ آپس میں رقابت اور عداوت تھی مگر صرف مجھے نیچا دکھانے کے لئے وہ دونوں متحد ہو گئے۔ جہاں میں جاتا تھا میرے پیچھے پہنچ جاتے تھے۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ میں ایک گاؤں میں اپنے گھوڑے کی پشت پر بیٹھا تقریر کر رہا تھا کہ کچھ لوگ رحمن خاں کو ایک کرسی پر بٹھا کر وہاں لے آئے۔ اور میرے مقابلہ میں دوسرا جلسہ شروع کر دیا۔ اس نے مجمع کو یہاں تک میرے خلاف مشتعل کیا کہ کچھ لوگوں نے میرے گھوڑے کو لنگڑا کرنے کی کوشش کی۔ اور

ستارہ انور۔ بعض اوقات انسان بھی حیوانی حرکتوں پر اتر آتے ہیں۔

[کریم خاں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اپنی بقیہ کہانی سنانے کے دوران میں گاہے گاہے۔ یہ دیکھنے کے لئے دروازے کے پاس جاتا ہے کہ کوئی ان کی باتیں تو نہیں سن رہا۔]

کریم خاں۔ یقیناً۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ انسانی اور نیک حرکت کر رہے ہیں۔ سیاسیات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس وقت رحمن خاں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ غدار دیہات زندہ باد۔ منافق مردہ باد ہمیں خلوص اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ نہ کہ منافقت اور کذب و دروغ کی ہم پیرے سے خلوص و صداقت کے پیکر میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں"۔ میں نے جواب دیا سیاسیات میں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔

ستارہ انور۔ ٹھیک ہے لیکن رحمن خاں قتل کیسے ہوا۔ اور کس نے اسے قتل کیا ؟

کریم خاں۔ یہ میں نہیں جانتا کل رات دورہ کرتے کرتے مجھے ایک گاؤں سے دور رات آ گئی۔ سڑک کے کنارے ہی ایک پرانا سا اجاڑ مکان ہے میں وہاں جا سویا۔ صبح کو یونہی میں دوسرے کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رحمن خاں فرش پر پڑا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔

ستارہ انور۔ اُف۔ توبہ۔

کریم خاں۔ جی ہاں کچھ نہ پوچھئے کیا ہوا میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پہلے میرا یہ خیال ہوا کہ گاؤں کے لوگوں کو اس کی خبر کر دوں پھر مجھے یاد آیا کہ اس گاؤں میں میرے مخالفوں کی کثرت ہے۔ اس لئے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور دوڑ کر گھوڑے کی طرف بڑھا۔ میں ابھی گھوڑے پر سوار ہو ہی رہا تھا

کہ میں نے دور سے چند اشخاص کو گھوڑوں پر آتے دیکھا - میں نے فوراً ایک قریبی راستے میں گھوڑے کو سرپٹ بھگا دیا - میں نے سوچا کہ اگر ان لوگوں نے جمن خاں کی لاش دیکھ لی - جسے کہ ضرور دیکھ لیں گے - لازماً وہ میرا تعاقب کریں گے - چنانچہ ایسا ہی ہوا - مگر میں ان سے بہت آگے نکل چکا تھا - تین گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد میں اور میرا گھوڑا - دونوں تھک گئے - اور آخر کار ایک گاؤں بھی آ گیا - میں نے اپنے گھوڑے کو دانہ کھلایا - اور پانی پلایا - اور خود اپنے لئے ایک دیہاتی سے کھانا تیار کرنے کو کہا - مگر میری بدقسمتی ! آپ بتا سکتی ہیں کیا ہوا ؟

ره انور - کیا ؟

یم خاں - جن لوگوں کو میں نے دیکھا تھا - ان میں سے ایک میرے پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی جمن خاں کے قتل کی خبر لے کر وہاں آ پہنچا - وہ ہر ایک سے پوچھ رہا تھا کہ "کیا کسی نے ایک شخص کو گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرتے تو نہیں دیکھا ؟"

"ہاں ایک آدمی اس کے گھر میں ہے " ایک دیہاتی نے میرے میزبان کی طرف اشارہ کر کے کہا - "وہ کوئی نصف گھنٹہ ہوا یہاں آیا تھا "

یہ سنتے ہی وہ شخص گھوڑے سے اتر پڑا اور اس مکان کی طرف چلا جس میں کہ میں موجود تھا - اس کے ساتھ چند لوگ اور بھی ہو گئے میں نے فوراً دروازہ اندر سے بند کر لیا - اور کھڑکی سے باہر کود کر گھوڑے پر چڑھا اور دیکھتے دیکھتے ہوا ہو گیا -

اره انور - بہت خوب -

م خاں - اس وقت سے میں برابر بھاگ رہا ہوں - جب اندھیرا ہوا تو میں گھوڑے سے اتر پڑا - اس کو کھلا چھوڑ دیا - اور اب میں یہاں ہوں -

ره انور - (کھڑے ہو کر) میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں -

یم خاں - آپ کی عنایت -

[وہ اپنے کاندھے ہلاتا ہے - وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتی ہے اور کچھ سوچ کر ٹہلنا شروع کر دیتی ہے - دفعتاً دروازے پر دستک ہوتی ہے - اور وہ خاموش کھڑی ہو جاتی ہے -]

ره انور - کون ہے ؟

ضان - (باہر سے) میں ہوں مس صاحبہ - رمضان

ره انور - کیوں کیا ہے ؟

ضان - (باہر سے) ہو [illegible] لینے آیا ہوں مس صاحبہ -

ستاره انور - میں نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا -

رمضان - (باہر سے) میں ٹھہرتا ہوں پھر -

ستاره انور - ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے جب میں کھانا ختم کروں گی تو برتن خود ہی باہر رکھ دوں گی -

رمضان - (باہر سے) میں ٹھہرتا ہوں مس صاحبہ - آپ اطمینان سے کھانا ختم کر لیجئے -

[ستاره اور کریم خاں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں]

ستاره انور - مگر میں جو کہتی ہوں - ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں

رمضان (باہر سے) مجھے برتن ابھی سے صاف کرنے ہیں - ہمارا قاعدہ ہے کہ ہم رات کے برتن رات ہی کو صاف کر لیتے ہیں -

[ستاره انور اور کریم خاں پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں - وہ اس کے پاس جا کر کان میں کچھ کہتا ہے - اس کے اشارے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چارپائی کے نیچے چھپ جانے کو کہا ہے تاکہ رمضان آ کر برتن لے جائے اس کے بعد کریم خاں پنجوں کے بل چارپائی کی طرف جاتا ہے]

ستاره انور - (بلند آواز سے) اچھا رمضان - میں نے کھانا ختم کر لیا ہے - ذرا ٹھہرو - میں ابھی تمہیں برتن دے دیتی ہوں -

رمضان - (باہر سے) نہیں آپ تکلیف نہ کریں میں خود اٹھا لیتا ہوں (وہ ہینڈل گھماتا ہے) مس صاحبہ دروازہ تو مقفل ہے -

[کریم خاں چارپائی کے نیچے گھستے وقت یہ الفاظ سنتا ہے - اور چابی نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے]

ستاره انور - (بلند آواز سے) چابی - چابی میں نے کہاں رکھ دی -

[کریم خاں سے چابی لے لیتی ہے - اور وہ جب تک چارپائی کے نیچے اچھی طرح چھپ نہیں جاتا کھڑی رہتی ہے] یہ رہی اوہ -

[جا کر دروازہ کھول دیتی ہے - رمضان داخل ہوتا ہے] میں نے دروازہ مقفل کر دیا تھا - تم جانتے ہو سرحدی قصبہ ہے یہ -

رمضان - جی ہاں لیکن خدشے کی کوئی بات نہیں -

ستاره انور - اچھا - اب برتن لے جاؤ - جلدی کرو -

رمضان - بہت بہتر -

[برتن اکٹھے کر کے باہر جاتا ہے - تھوڑی دیر بعد ستاره انور دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتی ہے - ا[illegible] کریم خاں

باہر نکل آتا ہے۔ وہ چابی میز پر رکھ دیتی ہے]

ستارہ انور۔ اچھا اب آپ کے متعلق کیا کرنا چاہئے۔ اگر آپ یہیں بیٹھ رہیں تو؟

کریم خاں۔ ہاں۔ اس سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

ستارہ انور۔ (اپنے بیگ کی طرف جاتے ہوئے جو پاس ہی پڑا دکھائی دیتا ہے [قینچی نکال کر اسے دیتی ہے]

یہ لیجئے۔

کریم خاں۔ قینچی۔ کیا کروں اسے۔ اپنے کپڑے کاٹ لوں کیا؟

ستارہ انور۔ (مسکرا کر) نہیں نہیں نہیں (سنجیدگی سے) آپ اپنا حلیہ آواز سے نہ بدلئے میرا خیال ہے۔ آپ اپنی مونچھیں اور داڑھی صاف کر سکتے ہیں کر لیجئے۔ یہ قینچی بہت تیز ہے۔ اور اس سے آپ کا چہرہ بالکل صفاچٹ معلوم ہوگا۔

کریم خاں۔ اچھا یہ بات کسی نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ تمام عورتیں احمق ہوتی ہیں۔

ستارہ انور۔ مگر عورتیں نہیں ہوتیں۔ دروازے کے پاس آئینہ ہے میں انہیں پکڑ کر اوپچی کئے رہوں گی۔

کریم خاں۔ عنایت

[آئینے کے پاس جا کر اپنی داڑھی کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔

بہت تیز قینچی ہے واقعی۔ داڑھی۔ داڑھی کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا (اس کی طرف مڑ کر) کچھ بری تو نہیں لگی؟

ستارہ انور۔ اچھی خاصی لگی ہے۔ ریاضیات کے علاوہ آپ اس فن کے بھی ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ٹھیک ہے اس طرف ذرا وہاں بال باقی رہ گئے ہیں

کریم خاں (آئینہ دیکھ کر) ہاں۔ وہ تو کٹ گئے (کاٹ دیتا ہے) اور اب میں مونچھوں کو الوداع کہتا ہوں۔ الوداع۔ اے میری پیاری مونچھو (کاٹتا ہے) ایک طرف کا ہو گیا خاتمہ۔ اب دوسری طرف۔

[مونچھیں کاٹ کر ستارہ انور کی طرف دیکھتا ہے۔ کیا رائے ہے

ستارہ انور بہت ہی خوب۔ اب آپ جوان معلوم ہوتے ہیں۔

کریم خاں مگر بوڑھا میں پہلے ہی کب تھا۔ اب میں ان کا کیا کروں۔

[داڑھی اور مونچھوں کے بالوں کی طرف اشارہ کرتا ہے]

ستارہ انور۔ مجھے دے دیجئے۔ میں انہیں اپنے پاس رکھ لیتی ہوں اور موقع پا کر کہیں پھینک دوں گی۔

کریم خاں (اسے دیتے ہوئے) اگرچہ یہ کوئی رومانی تحفہ تو نہیں لیکن پھر بھی تہ دل سے میں آپ کی خدمت میں یہ پیش کرتا ہوں۔

ستارہ انور۔ میں یہ تحفہ قبول کرتی ہوں مگر ذرا سنئے۔

[دروازے کے باہر کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور پھر ہلکی سی ایک دستک]

کون؟

ہوٹل کا مالک (مس صاحبہ) کیا ہم اندر آ سکتے ہیں۔ پولیس کے ایک افسر آپ کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔

ستارہ انور۔ پولیس کا افسر؟ (آہستہ سے) چابی مجھے دے دیجئے۔ اور بیگ میں گھس جایئے (زور سے) مگر یہ بھی کوئی وقت ہے تلاشی کا۔ خواہ مخواہ شریف مسافروں کو بے آرام کرنا

[ایک شخص کی آواز ہوٹل کے مالک سے کچھ کہتے سنائی دیتی ہے

کریم خاں بیگ کی چیزیں کرسی پر پھینک کر اس میں گھس جاتا ہے]

ہوٹل کا مالک۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ ضروری ہے۔ ان کے ساتھ سپاہی بھی ہیں۔ ہر ایک ہوٹل اور سرائے کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ وہ ایک قاتل کی تلاش میں ہیں۔

ستارہ انور۔ (بیگ کو بند کر کے) اچھا ایک منٹ۔ میں کپڑے بدل لوں۔

[تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھول دیتی ہے۔]

احسان علی خاں مس صاحبہ۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں حکومت کو رحمن خاں کے قاتل کی تلاش ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس ضلع کے سارے ہوٹل اور جتنی بھی سرائیں ہیں۔ ان سب کی تلاشی لوں (اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا ہے)

ستارہ انور۔ ضرور۔

احسان علی خاں۔ کیا آپ کو اس کی کچھ خبر تو نہیں؟

ستارہ انور۔ مجھے اور خبر۔ مجھے کیا معلوم۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ بہر حال۔ اور پھر اس کمرے میں کوئی ایسا سوراخ نہیں۔ جہاں وہ چھپ سکے۔

احسان علی خاں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اچھی طرح دیکھ لوں۔

ستارہ انور۔ یقیناً۔

احسان علی خاں۔ شکریہ (ادھر ادھر دیکھتا ہے) نہیں یہاں نہیں۔ آپ نے اس قتل کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

ستارہ انور۔ جی نہیں۔

احسان علی خاں۔ ایک اجاڑ سے مکان میں یہ قتل ہوا تھا۔ مگر قاتل ایک ایسی نشانی چھوڑ گیا ہے جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کون ہے۔

ستارہ انور۔ خوب!

احسان علی خاں۔ قاتل کے مقابلے میں اسمبلی کی ایک نشست کا امیدوار ہیں اسے گرفتار کرنے کے لئے بڑا مضطرب ہوں۔ یہاں وہ بہرحال موجود نہیں بڑا افسوس ہے کہ آپ کو بے وقت زحمت دی۔ مجھے امید ہے آپ معاف کر دیں گی۔

[دروازے کی طرف بڑھتا ہے]

ستارہ انور۔ نہیں کوئی بات نہیں سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ محض اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

احسان علی خاں۔ آپ کی یہ بے جا عزت افزائی ہے۔

ستارہ انور۔ بے جا کیا؟

احسان علی خاں۔ ایک تو آپ کا یہ فرمانا کہ میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ اور دوسرے مجھے سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ تک پہنچا دینا۔

ستارہ انور۔ (ہنس کر) آپ کی خوش خلقی اور موقع شناسی سے میں یہ سمجھی کہ آپ اس بڑے عہدے پر فائز ہیں لیکن خیر کیا ہوا۔ آپ جلدی ہی اس تک پہنچ جائیں گے۔

احسان علی خاں۔ خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ اچھا خدا حافظ۔

[مسکراتا ہوا وہ مالک ہوٹل کے ساتھ کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ ستارہ انور دروازہ مقفل کر دیتی ہے اور ٹرنک کھول کر آہستہ سے کہتی ہے] سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

کریم خاں (ٹرنک میں سے نکل کر) توبہ۔ بال بال بچا میں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ کیا یہ پولیس افسر جوان تھا۔ سانولا رنگ۔ موٹی بھویں ذرا سی مونچھیں

ستارہ انور۔ ہاں۔

کریم خاں چوڑے چکلے کاندھے۔ لانبی ٹانگیں۔ اور سینہ پر سنہری تمغہ جس کا فیتہ زرد رنگ کا تھا۔

ستارہ انور۔ بالکل۔

کریم خاں خبیث۔ سور کہیں کا۔

ستارہ انور۔ کیوں؟ آدمی تو معقول تھا وہ۔

کریم خاں۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ وہ میرا بھانجا ہے۔ احسان علی خاں خوب۔ تو وہ میری گرفتاری کے لئے بڑا مضطرب تھا۔ "اگر تم کو دشمن کی ضرورت ہو تو اپنے عزیزوں میں تلاش کرو"۔ یہ ایک قدیم کہاوت ہے۔

ستارہ انور۔ تعجب ہے۔ آدمی تو وہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔

کریم خاں۔ جی ہاں مگر اسے مجھ سے دشمنی ہے۔ نہ معلوم کیوں؟ معلوم ہوتا ہے۔ پولیس کی ملازمت میں آ کر آدمی کی فطرت بدل جاتی ہے۔

ستارہ انور۔ مگر۔ دیکھئے نا اسے کون پسند کرتا ہے کہ اس کا کوئی عزیز قاتل ہو۔ اور مفرور۔ اور پھر اتنا قریبی عزیز۔

کریم خاں۔ ٹھیک ہے کوئی نہیں پسند کرتا۔ مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا۔ واقعی تمام مرد احمق ہوتے ہیں۔ مگر جانے دیجئے ان باتوں کو۔ آپ نے مجھ سے نہایت عمدہ سلوک کیا ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ حد سے زیادہ۔

ستارہ انور۔ واقعی؟

کریم خاں۔ جی ہاں اور اسے ثابت کرنے کے لئے میں ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔

ستارہ انور۔ (خوف زدہ ہو کر) نہیں نہیں۔ ابھی نہیں۔ ذرا انتظار کیجئے۔

کریم خاں۔ اچھا شاید انتظار ہی ٹھیک ہو۔ عجلت سے کام لے کر میں نہیں چاہتا کہ آپ کی یہ تمام کوششیں بے کار ہو جائیں۔

ستارہ انور۔ یہ تو کہئے یہاں سے چلے جانے کے بعد آپ کیا کریں گے۔ کیا ہوگا؟

کریم خاں۔ میں کچھ ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ میں آج ہی رات اس صوبہ سے بھاگ جاؤں گا۔ اور پھر پھر ممکن ہے میرا تعاقب کیا جائے۔ اور پھر ممکن ہے۔ مجھے اس ملک سے کہیں باہر پناہ لینی پڑے۔ مگر میں آپ سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے آپ کہاں تشریف لے جائیں گی؟

ستارہ انور۔ اگلے ہفتے میں لاہور چلی جاؤں گی۔

کریم خاں۔ پھر میں آج رات ہی لاہور روانہ ہو رہا ہوں۔

ستارہ انور۔ مگر اس میں خطرہ ہے۔

کریم خاں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لاہور بہت بڑا شہر ہے۔ اور آدمی آسانی سے وہاں چھپ سکتا ہے۔

ستارہ انور۔ مگر آپ کے پاس کچھ روپیہ بھی ہے؟

کریم خاں۔ کافی۔ اس کے علاوہ میں روپیہ کما سکتا ہوں۔ میں بہت سے ہنر جانتا ہوں۔ میں اس کا قائل نہیں کہ چونکہ آدمی کے پاس کچھ سرمایہ ہے۔ اس لئے وہ کچھ نہ کرے اور بیٹھا مکھیاں مارتا رہے۔

ستارہ انور۔ کریم خاں صاحب آپ نے میرے لئے تفریح طبع کا سامان خوب بہم پہنچایا ہے۔

کریم خاں۔ اور مس صاحبہ، مجھے بھی بے اندازہ مسرت ہوئی ہے۔ آپ سے مل کر۔ آپ ایکٹرس ہیں اور نہایت عمدہ ناچ جانتی ہیں۔ اور .. اور

مگر میں آپ کا نام نہیں جانتا۔

ستارہ انور۔ میرا نام ہے ستارہ انور۔

کریم خاں۔ بس ستارہ انور۔ میں نے آپ کا نام سنا ہے

ستارہ انور۔ نہیں آپ نے نہیں سنا ہوگا۔ میں نے فلمی پیشہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔

کریم خاں۔ مگر میں نے نام سنا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ میں ہمیشہ تقریباً سچ بولتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی یونہی ذرا انسانیت قائم رکھنے کے لئے جھوٹ سے بھی کام لیتا ہوں۔

ستارہ انور۔ ٹھیک۔

کریم خاں۔ سچ کہتا ہوں کہ

[ستارہ انور اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتی ہے باہر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ اور پھر دروازے پر دستک۔ ستارہ انور اور کریم خاں ایک دوسرے کی طرف پرمعنی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ دستک دہرائی جاتی ہے۔]

ستارہ انور۔ کون ہے؟

احسان علی خاں۔ (باہر سے) مس صاحبہ میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں مجھے سخت ندامت ہے۔

ستارہ انور۔ (بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے [illegible]) اب بات کیا ہے۔

احسان علی خاں۔ (باہر سے) کیا میں ایک منٹ کے لئے اندر آ سکتا ہوں؟

(کریم خاں بیگ میں گھس جاتا ہے]

ستارہ انور۔ مگر آپ چاہتے کیا ہیں؟

احسان علی خاں۔ (باہر سے) بات یہ ہے کہ [illegible] میری ایک چیز کھو گئی ہے۔

ستارہ انور۔ کیا؟

احسان علی خاں۔ (باہر سے) میرا خیال ہے میری ایک چیز آپ کے کمرے میں گر گئی ہے۔

ستارہ انور۔ کیا چیز ہے وہ؟

احسان علی خاں۔ (باہر سے) لاحول ولا قوۃ۔ مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر آپ مجھے کمرے میں آنے کی اجازت دیجئے۔ تو سب کچھ بیان کر دیتا ہوں

ستارہ انور۔ اچھا (دروازہ کھولتی ہے) میں بہت تھک گئی ہوں۔

احسان علی خاں۔ (داخل ہو کر اس کے سینہ پر تمغہ نہیں) مس صاحبہ مجھے بڑا افسوس ہے کہ

ستارہ انور۔ کیا؟

احسان علی خاں۔ ہوٹل کے مالک نے ابھی مجھے بتا دیا ہے کہ آپ کون ہیں آپ کی خدمت میں احسان علی خاں حاضر ہے۔ سب انسپکٹر پولیس۔ بات یہ ہے کہ میرا تمغہ کمرے میں کہیں گر گیا ہے۔

ستارہ انور۔ (ادھر اُدھر دیکھ کر) مگر میں نے تو کہیں نہیں دیکھا۔

احسان علی خاں۔ مجھے یہ تمغہ بے حد عزیز ہے۔ گورنر صاحب بہادر نے خود اپنے ہاتھوں سے مجھے دیا تھا (مسکرا کر) میں تمغے جمع کر رہا ہوں اگر میں اس شخص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ایک تمغہ مجھے اور مل جائے گا۔

ستارہ انور۔ لوگوں کو گرفتار کرنے کے لئے تمغہ؟

احسان علی خاں۔ جی ہاں۔ تمغے اور ترقیاں آج کل اس سے بھی زیادہ بُرے کام کرنے پر مل جاتی ہیں۔

ستارہ انور۔ خوب! تو میں آپ کے تمغے اور آپ کے آدمی کو تلاش کر رکھوں گی بالفرض اگر وہ مجھے مل جائیں تو؟

احسان علی خاں۔ تو میں صبح حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ کیا میں ہو سکتا ہوں؟

ستارہ انور۔ شوق سے۔ مگر کیا اس وقت تک میں تمغہ اور آدمی اپنے قبضہ میں کئے رہوں؟

احسان علی خاں۔ (قہقہہ لگا کر) آپ فکر نہ کیجئے میں دو سپاہیوں کو یہاں نگرانی کے لئے بھیج دیتا ہوں۔ ہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ قاتل کا رنگ سیاہ ہے۔ اور اس کے ڈاڑھی مونچھیں بالکل نہیں۔ بالکل صفاچٹ۔

ستارہ انور۔ صفاچٹ؟

احسان علی خاں۔ جی ہاں۔ اس کا نام فرمان علی خاں ہے۔ اپنے آپ کو ہمدرد عوام کہتا ہے۔

ستارہ انور۔ خوب!

احسان علی خاں۔ وہ گدھا میرے ماموں کریم خاں کے لئے میدان صاف چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

ستارہ انور۔ خوب۔ آپ کے ماموں۔

احسان علی خاں۔ جی ہاں۔ ماموں۔ وہ پہلے پروفیسر تھے گھوڑے کی سواری کے ماہر ہیں۔ مگر مس صاحبہ آپ بہت تھکی ہوئی ہیں۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

ستارہ انور۔ اچھا خدا حافظ۔ کل صبح آپ سے ملاقات ہوگی۔

[وہ دروازے کے پاس جا کر تھوڑی دیر کے لئے رکتا ہے۔ اور

پھر مسکراتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ ستارہ انور دروازہ مقفل کر دیتی ہے۔ اور کریم خاں باہر نکل آتا ہے۔]

کریم خاں۔ اب ؟

ستارہ انور۔ اب کیا ؟

کریم خاں۔ اب آپ کا میرے متعلق کیا خیال ہے ؟

ستارہ انور۔ میرا خیال ہے کہ آپ ایک بار پھر بال بال بچے ہیں۔

کریم خاں۔ یقیناً۔ مگر وہ گدھا کہیں کا

ستارہ انور۔ مگر اب تو آپ کو اس سے خفا نہ ہونا چاہئے۔

کریم خاں۔ کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ اس کا تمغہ یہاں کھو گیا ہے۔

ستارہ انور۔ ہاں کیوں نہیں ؟

کریم خاں۔ میں احسان علی خاں کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ تمغہ اس کی جیب میں بڑی حفاظت سے پڑا ہے یقین کیجئے۔

ستارہ انور۔ مگر اس نے تمغہ کھو جانے کا بہانہ کیوں کیا ؟

کریم خاں۔ کیوں ؟ کیا واقعی۔ آپ اس قدر سادہ لوح ہیں۔ سادہ لوح نہیں معاف کیجئے گا بھولی بھالی۔ مگر واقعی آپ ہیں۔ اس میں ایک خاص بات بھی نہیں۔ سب آدمی احمق نہیں ہوتے۔ کم سے کم میرا بھانجا تو ہرگز نہیں۔ تمغہ۔ خوب! مگر کچھ نہ پوچھئے اس وقت میری کیا حالت ہوئی جب اس نے کہا کہ قاتل کا چہرہ بالکل صفا چٹ ہے۔ میرے دل کی حرکت بند ہوتے ہوتے رہ گئی۔

ستارہ انور۔ ہاں!

کریم خاں۔ آپ نے ضرور غور کیا ہوگا کہ میرا نام اپنی کہانی میں گھسیٹنے کے لئے وہ کتنا بے چین تھا۔ اس کا نظریہ غالباً یہ ہے کہ "رشتہ داروں پر اعتماد رکھو"۔ میرا خیال ہے کہ عدالت میں لیکن مجھے جانا چاہئے۔ آپ بہت تھک گئی ہیں۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں

[کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھتا ہے]

اگر لالٹین بجھا دی جائے تو آپ کو کچھ اعتراض تو نہ ہوگا۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔ مجھے آپ کے قدردانوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

ستارہ انور۔ (لالٹین بجھا کر) اور اب آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہئے۔

[پاس جا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی ہے۔]

اچھا الوداع۔

کریم خاں۔ نہیں خدا حافظ

[اس کا ہاتھ چومتا ہے]

اس سعید و مبارک ملاقات کے بعد میں اپنی زندگی سے آپ کو ہرگز جدا نہیں ہونے دوں گا۔

ستارہ انور۔ آپ تو ایکٹروں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔

کریم خاں۔ اگر یہی بات ہے تو پہلا ایکٹ بہت ہمت افزا تھا۔

ستارہ انور صرف پہلے ایکٹ سے آپ کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے۔

کریم خاں۔ مگر پہلا ایکٹ مجھے بہت پسند آیا۔ بہت ہی۔ مگر میں سوچ رہا ہوں دوسرا ایکٹ کیا ہوگا۔ کیا ممکن ہے کہ یہ جذبات پرستانہ ڈرامہ ایک رومانی ڈرامہ میں بدل جائے۔

ستارہ انور۔ یہ ایکٹروں کی شخصیت پر منحصر ہے۔

کریم خاں۔ ہاں اگر آپ ہیروئن ہوں تو (کھڑکی میں سے باہر دیکھتا ہے) کاش اس کمرے کے آگے کوئی شہ نشین ہوتا۔

ستارہ انور۔ تو پھر آپ کیا کرتے ؟!

کریم خاں۔ میں غالب کا ایک شعر اس طرح پڑھتا کہ اگلی فلم میں آپ اپنے ہیرو کو بدلنے پر مجبور ہو جاتیں۔

ستارہ انور۔ خوب۔ بہت خوب۔

کریم خاں۔ کیا مطلب اس سے آپ کا۔

ستارہ انور۔ وراثت۔ آپ نے اور آپ کے بھانجے نے اپنے مشترک آبا سے ایک ہی قسم کی خصوصیات وراثت میں پائی ہیں۔

کریم خاں۔ ممکن ہے ٹھیک ہو مگر مجھ میں وراثت میں پائے ہوئے رجحانات نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔

ستارہ انور مجھے اس سے اختلاف ہے۔ آپ کا بھانجا اس لئے میرے کمرہ میں دوبارہ واپس آیا کہ میں تنہا تھی۔ اور اب چونکہ روشنی گل ہے اس لئے اب آپ اپنے فن سے کام لے رہے ہیں۔

کریم خاں۔ آپ مجھ پر ظلم کر رہی ہیں۔ احسان علی خاں نے آپ کے کمرے میں اس وقت دوبارہ آنے کی جرأت کی جب

ستارہ انور۔ لالٹین سے کمرہ روشن تھا۔

کریم خاں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر رند ہے۔ اور ادھر میں ہوں میں نے جو کچھ بھی میرے دل میں تھا۔ اس کے متعلق اب تک ایک بھی لفظ کہنے کی جرأت نہ کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں کس قدر شرمیلا ہوں۔

ستارہ انور۔ (مسکرا کر) لفظ شرمیلا میرے ذہن میں کبھی نہیں آسکتا تھا۔

کریم خاں۔ تو پھر آپ میری نسبت کیا الفاظ استعمال کریں گی ؟

ستارہ انور۔ اپنے بھانجے کی نسبت زیادہ پختہ کار۔ زیادہ محتاط۔ اور خطرناک۔ اچھا تو اب آپ جا سکتے ہیں۔ کریم خاں صاحب الوداع

کریم خاں۔ الوداع نہیں۔ خدا حافظ۔

ستارہ انور۔ اچھا خدا حافظ۔ لاہور میں ملیں گے۔

(کریم خاں کھڑکی پر چڑھنے کو ہے لیکن ٹھہر جاتا ہے)

کریم خاں۔ لاہور۔ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ اس وقت تک میں انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے اس پر اصرار کرنے کا پورا حق ہے۔ اس لئے کہ کل میرا یوم پیدائش ہے۔

(کھڑکی پر چڑھنا شروع کر دیتا ہے۔)

ستارہ انور (ہنس کر) بہت اچھا خاں صاحب کل گیارہ بجے تک۔

(کریم خاں نیچے اتر جاتا ہے)

ہاں خاں صاحب گیارہ بجے کل۔

کریم خاں (باہر سے ہنستے ہوئے) بہتر مس صاحبہ مس ستارہ انور۔ اب آپ آرام کیجئے۔ سو جائیے اور میں مجھے نیند کہاں۔ ہائے غالب نے کیا خوب کہا ہے

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

ستارہ انور (ہنستے ہوئے) میرا ہیرو۔ زندگی کی اصلی اور حقیقی فلم میں میرا رفیق۔

(موسیقی کے ساتھ پردہ گرتا ہے)

قطعات

از ذوقی کاندھلوی

(۱)

تمھیں ہو گلوں کی، ستاروں کی ملکہ — تمھیں ہو بہشتی نظاروں کی ملکہ
فرشتوں سے پاک اور حوروں سے معصوم — تمھیں ہو محبت کے ماروں کی ملکہ

(۲)

چمن میں ہیں رقصاں بہاروں کی پریاں — فضا میں پریشاں نظاروں کی پریاں
چلی آؤ ایسے میں تم حور بن کر — تمھیں ڈھونڈتی ہیں ستاروں کی پریاں

(۳)

ستاروں کی مانند معصوم ہو تم — گلوں کی لطافت کا مفہوم ہو تم
رہینِ خزاں ہیں مگر یہ بہاریں — کلی کی طرح ہائے مغموم ہو تم

(۴)

طرب خیز ہیں چاندنی کی فضائیں — شرابوں میں ڈوبی ہوئی ہیں ہوائیں
ترنم سے معمور ہے سازِ فطرت — چلو ہم بھی نغمے محبت کے گائیں

(۵)

ابھی غم اٹھانے کے قابل نہیں تم — یہی ہے بہت، مجھ سے غافل نہیں تم
بہارِ بہشتی کی ننھی کلی ہو — ابھی تو گلوں میں بھی شامل نہیں تم

(۶)

محبت میں آنسو بہائے ہیں تم نے — مگر ہنس کے مجھ سے چھپائے ہیں تم نے
تمھارا پرستار ہوں جانتا ہوں — ستاروں میں موتی ملائے ہیں تم نے

کثرت و وحدت

نظم

از:-
حرماں خیرآبادی

شام کی ہلکی سیاہی میں فضا تھی کچھ اُداس — میں کہ اُس دن جا رہا تھا تاجور صاحب کے پاس
.. رعشرت کے تصور میں لنڈھاتا خم پہ خم — ہوش سے نزدیک تر تخئیل کے عالم میں گُم
بادۂ رنگیں سے تشنہ تھا ابھی میرا سبو — سامنے آیا یکایک اِک ہجوم رنگ و بُو
صنفِ نازک کا حسیں انبوہ فردوسِ نظر — "سینما" سے جا رہا تھا "میٹنی" شو دیکھکر
چاند کا سایہ، شفق کا حُسن، ساون کی پھوار — شوخ، مستانہ، تبسم ریز، رنگیں، مشکبار
حُسن کی صنعت گری کا کیف برساتا ہؤا — راستے پر ابر کے مانند بل کھاتا ہؤا
خاک پر جس طرح تھرآیا ہوا سیماب ہو — جس طرح طوفان کا بڑھتا ہؤا سیلاب ہو
پھیل جائے جس طرح ہاتھوں سے بوتل چھوٹ کر — کہکشاں جیسے بکھر جائے فلک سے ٹوٹ کر
جس طرح امواج سطح بحر پر ہلچل میں ہوں — راجہ اندر کے اکھاڑے جس طرح چھل بل میں ہوں
جس طرح نافے کی بندش توڑ دے مشکِ تتار — ناز کرتی جس طرح گلشن میں آجائے بہار
فوج جیسے چل کھڑی ہو دشمنوں کی گھات میں — رُخ پلٹ دے جس طرح دریا بھری برسات میں
بلبلے پانی کے گویا بہہ رہے ہوں رود میں — کوند جائیں بجلیاں جیسے شفق کی گود میں
یا کسی منزل پہ ہم آہنگ ہوں حُسن و شباب — یا خرام انداز ہوں کچھ آفتاب و ماہتاب
یا بہم آہوئے صحرا مل کے نکلیں گشت میں — یا کہیں چشمے اُبلتے ہوں فضائے دشت میں

راہ میں ہمجولیوں کے ساتھ چلنے کی صدا — اک تلاطم، ایک ہلچل، ایک طوفانِ ادا
نرم و نازک ساریاں اک اک اشارے پر ہیں — جھلملاتے آنچلوں پر جگمگاتی جدولیں
شاہدانِ حُسن آجائیں حجاب اُٹھے ہوئے — شانِ استغنا سے برقعوں کے نقاب اُلٹے ہوئے
راہ میں اٹکھیلیاں مبہم قطار اندر قطار — شرم کے پردے میں دزدیدہ نگاہی باربار
بھولے بھالے رہبروں کی صورتوں میں رہزنی — رنگ و رُخ پر سادگی اطوار میں چشمک زنی
اپنے گردوپیش کی سرگوشیوں سے بے خبر — کر رہی تھیں شوخیاں باہوں میں باہیں ڈال کر
چلتی جاتی ہیں سڑک کے قالب پر تیزی کیساتھ — روندتی جاتی تھیں ذروں کو شکر ریزی کیساتھ
اپنی فطری کیف آور مستیوں میں چُور چُور — کچھ اُمنگوں کی کشاکش، کچھ جوانی کا سرور

جارہی تھیں سینۂ گیتی کو برماتی ہوئی
اک ادائے ناز سے ہر شے کو ٹھکراتی ہوئی

اپنے شانوں کو چھپانے کی کسے تھی جستجو
تھے دوپٹے صرف "مفلر" کی عوض زیب گلو

تھی خدا معلوم اس منظر میں کیا جادوگری
آہ کرنے کی بھی اک شاعر کو گنجائش نہ تھی

جب نظر کی حد سے اوجھل ہوگیا یہ کارواں
حسن کی زد سے ملی جب دیدہ و دل کو اماں

جب زمیں کی سطح پر پھیلی سی نکہت آگئی
جب تڑپ کے زور سے دل پر اداسی چھا گئی

ایک گہری سانس لیکر تھام کر قلب و جگر
میں بڑھا کچھ دور ماتھے سے پسینہ پونچھ کر

اپنے احساس پراگندہ کو سمجھاتا ہوا
گتھیاں دنیائے ظلمت کی سلجھاتا ہوا

محو تھا اس جستجو میں [illegible] پاتا یہ فرق
ذہن کی وادی میں غلطاں فکر کے دریا میں غرق

مل گئی "المختصر" ظلمت گہ ہستی کی تھاہ
آخر اس نکتے پہ پہنچی میری شاہین نگاہ

کوئی شے ہو بے حساب و بے کراں اچھی نہیں
قلت و کثرت کسی شے کی یہاں اچھی نہیں

رات تو کیا روز روشن کا اگر بڑھ جائے طول
یہ سمجھ لینا وہیں مخلوق ہو جائے ملول

گو شعاع مہر اپنی اصل سے کمیاب ہے
لیکن اتنی ہی [illegible] ریزی کی کس کو تاب ہے

ایک ذرے کا نہیں معلوم ہے راز حیات
ورنہ اڑ جائے دھواں بن کر یہ ساری کائنات

عقل حد سے بڑھ کے مل جائے اگر انسان کو
یہ حقیقت ہے جنوں ہو جائے اس نادان کو

سارے عالم پر حکومت کی تمنا قہر ہے
حد سے بڑھ کر سیم و زر کی حرص کرنا زہر ہے

گر مسرت ہی مسرت ہے مگر کچھ غم نہیں
تو دل انساں پہ نشتر ہے وہ مرہم نہیں

غم نہ ہو شامل تو ساری بزم ہستی سرد ہے
اور بے کیف مسرت زندگی اک درد ہے

یاد رکھنا کوئی شے اچھی نہیں بے اعتدال
برق کی چشمک ہو وہ یا ماہ تاباں کا جلال

ایک ہی حالت نہیں دلچسپ ہو سکتی کبھی
وہ طرب آمیز نغمہ ہو، کہ آہ بیکسی

ساز مطرب، بادۂ پرجوش، اشکال حسیں
یہ بھی دل کو ہر گھڑی تسخیر کر سکتے نہیں

اوس کی بوندیں، ستارے، کوہ، دریا، آبشار
یہ مناظر بھی نہیں ہر وقت ہوتے خوشگوار

پھول کی جنبش، ہوا کی چال، شاخوں کی لچک
ان کی ارزانی بھی ہے اک مستقل سر کی دھمک

گر بکثرت ہو تو ارزاں ہے دُرِ نایاب بھی
حد سے بڑھ جائے تو پھیکی ہے شب مہتاب بھی

شاخ پر غنچوں ہی غنچوں کی لطافت بار ہے
جس میں خار و خس نہ ہوں وہ گلستاں بیکار ہے

حادثوں سے صاف بچ جانا خطا سے کم نہیں
بے اجل اس دہر میں جینا سزا سے کم نہیں

افسانہ

طوفان کے بعد

از:- شیر محمد اختر

تہذیب و تمدن کا شہسوار تیز رفتاری سے بھاگا جا رہا ہے۔ رات کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے بجلی ضو پاشی کر رہی ہے۔ لیکن ہمارے قصبے کی قسمت میں وہی مٹی کے تیل کے لمپ اور وہی سیڑھی پر چڑھ کر انھیں جلانے والا رمضانی، کہاں میز پر بیٹھا ہوا ایک انسان لمحے بھر میں بٹن دبا کر کئی لاکھ کی آبادی کو روشن کر دے، اور دوسری طرف رمضانی بیچارا گلے میں بانس کی سیڑھی لٹکائے سرِ شام نکلتا اور کہیں نصف رات گئے گھر لوٹتا۔

رات جتنی تاریک ہوتی اتنا ہی اسے زیادہ پھرتی سے کام کرنا پڑتا ایک بار وہ ایسی ہی تاریک رات میں سیڑھی سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے گر پڑا۔ خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی بیچارا چند دن کے بعد پھر کندھے پر سیڑھی اٹھائے بھاگا جا رہا تھا —— بدقسمت رمضانی۔ گرنے کی یادگار چہرے کا ایک نشان اور لنگڑاتا ہوا پاؤں رہ گئے تھے۔ اس مصیبت اور بے کیف زندگی کے باوجود کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا تھا اور جونہی وہ سیڑھی پر بڑھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا۔ گویا وہ دنیا سے بلند ہو رہا ہے۔ اور اس کے دماغ میں عجیب و غریب خیالات آنے لگتے۔ وہ سوچتا کہ جس بات سے کسی کو نفرت ہوتی ہے دنیا والے کیوں بار بار اسی کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک خاوند کو جب اپنی بے وفائی کا علم ہو جاتا ہے۔ تو وہ اس واقعے کو بھول جانا چاہتا ہے لیکن لوگ اسے بھولنے نہیں دیتے۔ اور اگر وہ بے شرم بن کر ان کی بات کی پروا نہ کرے اور سنی ان سنی کر دے تو بہت سے لوگ ایسے پیدا ہو جائیں گے جو اسے وہ بات سنا کر ہی چھوڑیں گے۔ اور تو اور بچے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

یہی حال اس کا تھا۔ وہ اس بات کو بھول جانا چاہتا تھا لیکن لوگ بھلا کب برداشت کر سکتے تھے۔ انھیں ایک زخمی دل کو چھیڑنے میں مزا آتا تھا۔ دل کو تڑپتا دیکھ کر دنیا خوش ہوتی ہے۔ نمک پاشی کرنے سے اسے مزا آتا ہے۔ جب رمضانی سیڑھی کی آخری منزل پر ہوتا تو بوڑھے جوان بچے گزرتے ہوئے آوازے کستے: "کیوں میاں رمضانی! کیسے ہو! کیا حال ہے۔ تمھاری بیوی کا؟"

"کیا حال ہے تمھاری بیوی کا" یہ ایک نشتر تھا جو ہر ایک راہ گیر چبھو جاتا تھا۔

"کیا حال ہے تمھاری بیوی کا" وہ منہ چڑا کر ان کی نقل اتارتا۔ "میں یہاں لمپ روشن کر رہا ہوں یا بیوی کا حال دیکھ رہا ہوں —— بے شرم کہیں کے۔ میری بیوی کے حال سے تمھیں کیا؟!" وہ یوں ہی بڑبڑاتا رہتا۔

وہ سیڑھی پر کھڑا اکثر سوچتا کہ اس میں لوگوں کا اتنا قصور نہیں جتنا اس کا اپنا ہے۔ اگر وہ یہ پیشہ اختیار نہ کرتا۔ اور رات بھر یوں بھٹکتا نہ رہتا تو اس کی بیوی بھی اس سے بے وفائی نہ کرتی۔ اب وہ اس کی حفاظت کیسے کر سکتا تھا۔ شام سے نصف رات تک وہ لمپ روشن کرتا اور پھر پچھلے پہر اسے تمام قصبے کے لمپ گل کرنے ہوتے تھے۔ اور اسی میں ساری رات بیت جاتی۔ دن بھر وہ سویا کرتا۔ یوں ہی اس کی زندگی کے دن گزر رہے تھے۔ اور اس وجہ سے اس کی بیوی ——

ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ وہ دن کو سیدھا اس میونسپل کمشنر کے گھر پہنچا۔ جو "روشنی کی سب کمیٹی" کا صدر تھا۔ اسی کی سفارش سے رمضانی کو یہ ملازمت ملی تھی۔ اور اس کی رپورٹ پر کہ رمضانی کا کام نہایت اعلیٰ ہے رمضانی کو چند سال میں کافی سے زیادہ ترقی بھی ملی میونسپل کمشنر کے ہاں اسے سب جانتے تھے۔ اس لیے اندر جانے میں اسے زیادہ دیر نہ لگی۔

"جناب! کیا میں سرکاری ملازم نہیں ہوں؟" اس نے بیٹھتے ہی یہ سوال کر دیا۔

"کیوں نہیں! کیوں نہیں!!" صدر نے جواب دیا۔

"پھر جو میری بے عزتی کرے وہ سرکار کی بے عزتی کرتا ہے۔"

"یہ بات نہیں رمضانی۔" صدر اس کا مطلب سمجھ گیا بھلا قصبے میں کون تھا جو رمضانی کی اس چھیڑ خانی سے واقف نہ ہو۔

"وہ تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔ سرکاری کام میں روک ڈالنے والا مجرم ہوتا ہے۔"

"حضور! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں لیکن جب میں قصبے کو روشن کرنے کے لیے سیڑھی پر چڑھ کر چراغ جلا رہا ہوتا ہوں۔ اور میرے ایک ہاتھ میں دیا سلائی دوسرے میں چمنی ہوتی ہے تو اس وقت لوگ میری بے عزتی کرتے ہیں بھلا اگر میں اس وقت گھر جا کر بیوی کی حفاظت کرنے لگوں تو روشنی کون کرے —— اور اندھیرے میں چھپکار کو موقع مل جائے گا۔ ورنہ جی تو چاہتا ہے کہ اسی وقت جا کر اپنی بیوی اور اس کے آشنا دونوں کا سر پھوڑ ڈالوں۔ پھر راستے میں جو آ

کرے اسے بھی مار ڈالوں ——— حضور ذرا خیال فرمائیے اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے ؟"

بیوی اور آشنا کے بھاگ جانے کے الفاظ پر اس نے زور دیا کیونکہ اسے احساس تھا کہ ایک خاوند کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دے۔ اور یہ غیرت کا تقاضا تھا لیکن اس معاملہ میں صدمہ سے وہ کہنے سے قاصر تھا۔

حضور! اور سنئے۔ چاندنی راتوں میں لمپ روشن نہیں کئے جاتے ان ایام میں مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر نہیں ہوتا۔ دیکھ لیا آپ نے۔ یہ لوگ مجھے اس وقت تنگ کرتے ہیں جب میں سرکاری ڈیوٹی پر ہوتا ہوں ——— سرکار! یہ میری بے عزتی نہیں سرکار کی بے عزتی ہے۔ آپ پولیس کو اطلاع کر دیں"

رمضانی کا استدلال درست تھا لیکن بات ذرا ٹیڑھی تھی ذاتی معاملات میں پولیس کیا دخل دے سکتی ہے۔ صدر نے اسے سمجھایا

"رمضانی! بات یہ ہے" صدر نے سوچتے ہوئے کہا "کہ اگر تم بیوی کی حفاظت چاہتے ہو تو نوکری چھوڑ دو۔ اور گھر بیٹھ کر اس کی حفاظت کرو لیکن اگر یہ نہیں کر سکتے تو چھیڑنے والوں کو کہنے دو۔ خود بک بک کر خاموش ہو جائیں گے۔"

"جناب! بس یہی ٹھیک ہے"

"ہاں! اور کیا ہو سکتا ہے رمضانی۔ سرکار اس معاملے میں مجبور ہے"

رمضانی یکایک اٹھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تو حضور کی مرضی! میں ملازمت تو نہیں چھوڑ سکتا"

دن گزرتے گئے اور سیڑھی رمضانی کے کندھوں کو روز بروز بھاری محسوس ہونے لگی۔ اس کا لنگڑاتا ہوا پاؤں اور بھی زیادہ لنگڑانے لگا۔ اب یہی کام جو وہ خوش خوش کیا کرتا تھا۔ اور جس کے صلے میں اسے ترقی ملتی رہی۔ اسے تکلیف دہ اور تھکا دینے والا ثابت ہو رہا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ تمام قصبے کے لمپ روشن کر کے آخری لمپ پر پہنچتا تو وہ دم بھر کے لئے وہاں رک جاتا اور سیڑھی پر کھڑا ہو کر لمپ کے کھمبے کے سہارے سستانے لگتا۔ لمپ کے شیشے میں سے وہ دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ گویا وہ کسی دریچے میں سے کسی کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا سر ایک طرف جھک جاتا۔ تھکے ماندے مسافر کی طرح جیسے منزل کی آخری حد پر اس کے پاؤں جواب دے جائیں۔ وہ بھی نڈھال ہو کر سوچنے لگتا۔ اس وقت ہزاروں قسم کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے۔ اسے اپنا کام اور صدر کی نصیحت بھول جاتی۔

وہ سوچتا عجیب عجیب اور مایوس کن باتیں ———!

آسمان پر ان گنت ستارے ٹمٹما رہے ہیں۔ وہ کتنے روشن ہیں لیکن وہ زمین کو روشن نہیں کرتے۔ پھر ان کا فائدہ ہی کیا ہے۔

ستاروں کی روشنی سے اگر زمین کی تاریکی دور ہو سکتی تو کیسا حسین منظر ہوتا۔ اسے ایک خواب یاد آ گیا جو اس نے مدت ہوئی دیکھا تھا کہ وہ ستاروں کو روشن کرنے چلا ہے۔ اس کے پاس اتنی لمبی سیڑھی تھی کہ اس کا دوسرا سرا وہ خود بھی دیکھ نہ سکتا تھا۔ جب وہ اسے اٹھاتا تو وہ اتنی بوجھل تھی کہ وہ اسے تھام بھی نہ سکتا۔ یہ کتنا خوفناک اور ڈراؤنا خواب تھا۔ جب اسے یہ محسوس ہوا کہ اسے اس قدر اونچی سیڑھی پر چڑھنا ہو گا تو وہ خواب میں ہی کانپنے لگا۔ جب وہ جاگا تو اس وقت تک دہشت محسوس ہو رہی تھی۔ گو یہ خواب تھا۔ مگر بھیانک اور خوف زدہ کرنے والا ———

بعض اوقات رمضانی فلسفی ہو جاتا اور ایک چراغ روشن کرنے والا انسان حوادث زمانہ سے خود بخود فلسفے کی باریکیوں میں الجھ جاتا ہے ——— مایوسی انسان کو فلسفی بنا دیتی ہے۔ وہ سوچتا کہ چراغ روشن کر کے وہ سائے کی تخلیق کرتا ہے۔ ہر چیز کی ضد ہوتی ہے۔ روشنی کی ضد سایہ۔ زندگی کے ساتھ ساتھ موت کا عمل چلتا ہے۔ یہی حال سائے کا ہے جس طرح موت زندگی کی حفاظت کرتی ہے بالکل اسی طرح سایہ انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے جب کبھی وہ کسی راہگیر کا سایہ سیڑھی پر دیکھا کرتا تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا "لوگ سمجھتے ہیں کہ میں چراغ روشن کر کے ان کو تاریکی سے نجات دیتا ہوں۔ لیکن وہ کتنے بیوقوف ہیں جو نہیں جانتے کہ روشنی کی پہلی شعاع کے ساتھ ہی سایہ موت بن کر ان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اور وہ ایک سرد آہ بھر کر زیر لب کہتا "سایہ موت۔ موت سایہ"

لیکن بعض اوقات وہ دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچا کرتا کہ اس کا کام کتنا اہم ہے قدرت کے نظام میں جب کمی ہونے لگتی ہے۔ وہ فوراً اسے پورا کر دیتا ہے۔ اسے اپنی بڑائی بیان کرنے کی عادت نہ تھی۔ مگر کیا یہ حقیقت نہ تھی کہ وہ قصبے کے لئے سورج کا قائم مقام تھا۔ سورج کے قائم مقام دو تھے ایک چاند۔

دوسرا رمضان۔

جب چاند نکلتا تو رمضانی آرام کرتا لیکن جب رمضانی کام پر جاتا تو چاند طلوع نہ ہوا کرتا۔ چاند اور وہ دونوں قدرت کے نظام کی تکمیل میں برابر کے حصے دار تھے۔ بادل ہوں یا آندھی۔ بارش ہو یا طوفان، رمضانی بیچارہ اپنا

کام کیے جا رہا تھا۔ لیکن چاند، بادل کا ایک ٹکڑا بھی اسے ڈھانپ لیتا تھا۔ چاند اور رمضانی میں کتنا فرق تھا ——

اندھیری رات میں قصبے کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کس قدر حسین اور پیارے دکھائی دیتے تھے۔ یہ ستارے تھے جنھیں رمضانی روشن کرتا تھا۔ آسمان پر بے شمار ستارے۔ اگر چاند کی روشنی مستعار لے کر ٹمٹما سکتے ہیں تو کیا قصبے کے چراغ ان سے کم تھے؟ جنھیں دوسرا چاند —— رمضانی روشن کرتا تھا۔ آخری چراغ جلانے کے بعد اسے اپنا بوجھ ہلکا سا محسوس ہونے لگتا وہ ذرا سستانے کے لئے۔ یا اپنی تخلیق پر ایک اطمینان کی نگاہ ڈالنے کے لئے ذرا رک جاتا۔

ایک باغ میں جہاں سایہ دار درخت، تاریک رات کو اور بھی تاریک بنا رہے ہوں۔ اگر چند جگنو کہیں سے آنکلیں تو ان کی روشنی بھی اس اندھیرے میں غنیمت ہوتی ہے۔ وہ باغ کی تاریک اور گھناؤنی فضا کو لمحے بھر کے لئے نورانی کر دیتے ہیں یہی حال ہمارے قصبے کا تھا گھروں کے تاریک سائے اندھیری رات کو اور بھی زیادہ تاریک بنا دیتے تھے۔ اور اس کالی رات میں ٹمٹماتے چراغ راہ چلنے والوں کے لئے ایک روشنی کا مینار ثابت ہوتے تھے مسافر کی امید کا سہارا۔ اور بھولے بھٹکے کے لئے ایک آسمانی ستارہ کبھی کبھی ہوا کا جھونکا آتا تو چراغ کی لو تھرتھرا اٹھتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا اس نے ایک آہ بھری ہے۔

وہ دور کھڑا شہر کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ سارا شہر اس کے سامنے ہوتا۔ اور وہ بلندی سے اونچے مکانوں کو دیکھتا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا کہ انسانوں کے مل بیٹھنے کی برکت کا نتیجہ ہے کہ ویرانوں میں بستیاں آباد ہو جاتی ہیں لیکن ایسا نہ تھا۔ اسے قصبے والوں کا مل بیٹھنا معلوم تھا۔ ان کا آپس کا سلوک ہی ان کی ہمدردی اور میل ملاپ کا ایک بیّن نمونہ تھا! ایک گھر تعمیر ہوا تو دوسرا اس کے ساتھ نہیں بنتا جس سے معلوم ہو کہ لوگوں کو آپس میں پیار ہے۔ بلکہ اس کے سامنے گھر بنایا جاتا ہے۔ تاکہ مقابلہ کیا جا سکے۔ ایک دشمن کی طرح جو راہ روک کے کھڑا ہو۔ مقابل کا مکان پہلے مکان کے نظارے کو خراب کر دیتا ہے قصبے میں نت نئے جھگڑے ہوتے رہتے تھے کیا یہ بھی امداد باہمی اور مل بیٹھنے کا نتیجہ تھے؟ اور اس باہمی تعلقات کا نتیجہ ہی شاید جنگ ہو۔ وہ خوب جانتا تھا کہ گھرانے کے وہ تمام افراد جو دوسروں کے مقابلے میں اکٹھے جان تک دیتے کو تیار ہو جاتے ہیں گھر میں خود رات دن دست و گریباں ہوتے رہتے ہیں۔

[illegible]

اس کی رفیقۂ حیات تھی یا دشمن؟ اس نے کئی بار ٹھکرا دیا۔ کس لئے؟ تاکہ وہ گھر کی ناچاقی کو بھول جائے۔ تھوڑی دیر کی خود فراموشی کے لئے۔ اس نے گناہ کیا اور شراب کو منہ لگایا ——

وہ اس رات کیوں گشت پہ نکلا؟ وہ جانتا تھا کہ ٹھیکہ دار اور میونسپل کمیٹی کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور اس نے تیل دینا بند کر دیا۔ اس رات وہ چراغوں میں تیل نہ ڈال سکا لیکن وہ حسب معمول سیڑھی اٹھائے جا رہا تھا۔ تاکہ جن چراغوں میں گزشتہ رات کا بچا کھچا کچھ تیل ہو تو ان کو جلا دے لیکن اس نے دیکھا کہ تمام شہر اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ گویا اس رات چراغ روشن نہ ہونے میں سارا قصور رمضانی کا تھا —— نزلہ ہمیشہ عضو ضعیف پر گرتا ہے۔

قصبے کے شرارتی لڑکوں کو اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ چلّانے لگے۔

"رمضانی چچا! تمھاری بیوی کا حال کیسا ہے؟ آج تمھیں چھٹی ہے ذرا گھر کی خبر لو۔"

بیوی کا تذکرہ یوں برسرعام سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ بچوں کا شور بڑوں کے قہقہے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ ان آوازوں کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس شور و غل سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن اسے بھاگنے کون دیتا؟ وہ سیڑھی کندھوں پر رکھے ایک گلی میں گھس گیا۔ اور ایک چراغ کے کھمبے کے ساتھ سیڑھی لگا کر اسے جلانے کے بہانے اوپر چڑھ گیا شاید اس کا خیال تھا کہ اس طرح لوگ اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیں گے۔ لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ لڑکوں کا گروہ ابھی تک چلّا رہا تھا۔

"چچا رمضانی! جا کر بیوی کی خبر لو۔" بیچارے کا غصہ حسرت و نامرادی میں تبدیل ہو گیا جب کوئی جانور اپنے آپ کو ہر طرف سے شکاریوں میں گھرا پائے۔ اور اس کے تمام راستے مسدود ہو جائیں تو پھر وہ مایوس ہو کر اپنی زندگی کو ان شکاریوں کے رحم پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہی حال رمضانی کا ہوا بیچارے نے کھمبے کا سہارا لے کر چند لمحات کے لئے منہ دوسری طرف کر لیا۔ ایک شرارتی لڑکے نے موقع پا کر اس کے پاؤں تلے سے سیڑھی کو کھینچ لیا بیچارہ رمضانی ہوا میں معلق رہ گیا۔

فرطِ غم سے اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ لوگ اسے کیوں اس قدر تنگ کرتے تھے۔ اس نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ اور پھر اس کی گھریلو زندگی سے انھیں کیوں اس قدر دلچسپی تھی؟ اس نے کبھی جا کر ستانے والوں کے خانگی

[illegible]

وہ بیوی کو قتل کر ڈالے۔ اس کے آشنا کو مار ڈالے! اگر وہ شراب سے بواہیں کیا؟ اس کی بیوی ہے۔ اس کے ذمے دو فرض تھے۔ چراغ روشن رکھنا اور بیوی کی حفاظت! پہلا فرض زیادہ ضروری ہے۔ جسے سالہا سال سے وہ پورا کرتا چلا آرہا ہے۔ دوسرے فرض میں اس سے کوتاہی ہو جاتی تھی ——— لیکن آج وہ کچھ نہ کچھ کر کے دم لے گا۔

اس نے چلا کر سیڑھی لانے کو کہا۔ دو تین آدمیوں نے اس عملی مذاق کو ختم کرتے ہوئے سیڑھی لا کر کھمبے کے ساتھ رکھ دی وہ نیچے اترا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ طوفان بن کر اتر آیا تھا۔ اور وہ فوراً گھر کی طرف روانہ ہوا۔

"تمہارے پاس چاقو ہے؟" مجمع میں سے ایک نے دوسرے سے ہنس کر کہا۔

"ہاں! ہے تو سہی" دوسرے نے فوراً جواب دیا۔

"تو ذرا رمضانی کو دے دو ——— بیوی کے آشنا کو مارنے جا رہا ہے وہ"

رمضانی نے چاقو لے لیا اور ان لوگوں کے آگے آگے دیوانوں کی طرح چلا جا رہا تھا۔ تاریک رات تھی اور کبھی کبھی ہوا کرکٹ کر گرتے گرتے بچی۔ پھر بھی وہ ایک طوفان کی طرح بڑھا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہجوم کا شور اور بھی بڑھتا گیا ———!

"چلے آؤ! چلے آؤ۔ تم نا رمضانی آج کیسے دونوں کا صفایا کرتا ہے"

وہ پیچھے مڑ مڑ کر بار بار یہ الفاظ کہتا جاتا۔

جہاں تک یہ مذاق تھا لوگوں کو اس سے دلچسپی رہی لیکن جونہی انہیں موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ آہستہ آہستہ ہجوم کم ہونے لگا۔ لوگ ذرا حقیقت سے دوچار ہونے سے گھبراتے ہیں۔ نہ جانے رمضانی بیوی کا آشنا ان میں سے کسی کا باپ۔ بھائی یا چچا ہی ہو۔ جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو صرف چار آدمی اس کے ہمراہ رہ گئے تھے۔ تماشا دیکھنے کے لئے بلکہ معاملے کو حد سے بڑھنے سے روکنے کے لئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک مذاق المیہ صورت اختیار کرے۔ جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو انھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اور اسے شراب کی دعوت دی لیکن آج وہ غم غلط کرنا نہ چاہتا تھا بلکہ غم کی وجہ کا ہی خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ غضب ناک ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے سے بازوؤں کو چھڑا لیا۔ اور زور زور سے دروازے پر دستک دینے لگا ———!

"دروازہ کھولو! دروازہ! جلدی کرو!"

لوگ اسے سمجھا رہے تھے کہ ہوش سے کام لو۔ لیکن اس کا غصہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ تم سب کو بھی قتل کر دوں گا" کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس دھمکی کا اثر ہوا۔ اور لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ انھیں ڈر تھا کہ رمضانی بیوقوف واقعی حملہ نہ کر دے۔ اندر سے کواڑ کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ اور بگولے کی طرح اندر داخل ہو گیا۔

آدھی رات میں جب سارے لوگ سو رہے ہوں۔ اگر یکایک طوفان آ جائے تو ایک عجیب قسم کی چل چل مچ جاتی ہے۔ طوفان۔ ہوا کا شور۔ کالی رات۔ بچوں کی چیخ پکار۔ بڑوں کی گھبراہٹ۔ غرض یہ چیزیں منظر کو اور بھی ہولناک بنا دیتی ہیں یہی حال رمضانی کا تھا۔ وہ اندر کیا داخل ہوا۔ گھر میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ اس نے جاتے ہی بیوی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر زمین پر دے مارا۔ بیوی کی چیخ نکلی۔ لیکن اس کے ہاتھ میں چاقو اور آنکھوں میں خون دیکھ کر وہ سراسیمہ ہو گئی۔

وہ دیوانوں کی طرح چارپائی کے نیچے۔ کونوں میں۔ سامان کے پیچھے کسی کو تلاش کر رہا تھا۔

وہ چلایا "کہاں ہے وہ؟ کہاں ہے؟"

بیوی نے پوچھا "کون۔ کہاں ہے؟ کیا تم پی آئے ہو یا دیوانے ہو گئے ہو۔"

گلی میں ہجوم کچھ بڑھ گیا تھا۔ رمضانی کی آواز اور اس کی بیوی کی چیخ سن کر ہمسایوں نے کھڑکیوں سے جھانکنا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے دوست" ایک دوسرے سے پوچھتا ہے۔

"رمضانی بیوی کو قتل کر دے گا" ایک کھڑکی والی دوسری سے کہہ رہی تھی۔

اندر سے لاتوں۔ مکوں اور دروازوں پر دھکے لگنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کہاں ہے۔ وہ؟ میں آج دونوں کا خون کر دوں گا۔ کمینے کہیں کے"

"لیکن کون؟"

"تمہارا یار اور کون؟ جسے دیکھنے کے لئے لوگ نیچے جمع ہیں"

گھر کا کونہ کونہ اس نے چھان مارا۔ مگر کسی دوسرے شخص کا پتہ نہ تھا وہ حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہوا؟

تمام گاؤں میں جس کے قصے مشہور تھے۔ وہ وہاں موجود نہ تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک بند کھڑکی کی طرف گئی جو مکان کے پچھواڑے کھلتی تھی۔

"اس کھڑکی کو کھولو" اس نے بیوی کو حکم دیا۔ لیکن اس نے ذرا پس و پیش

گیا۔ وہ خود بجلی کی طرح اس طرف لپکا۔ اور ایک لمحے میں کھڑکی کھل گئی۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہیں کا وہیں ٹھٹھر کر کھڑا رہ گیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ غضبناک رمضانی پتھر کا بت بن گیا۔ کھڑکی کی دہلیز کے سہارے بونسپل کمیٹی کی سب کمیٹی کا صدر لٹک رہا تھا۔

"سرکار! آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ ——————" وہ رُکتے رُکتے بولا" لائیے ہاتھ۔ میں حضور کو اوپر کھینچ لوں حضور ذرا سنبھل کر پاؤں رکھئے۔"

جب صدر اندر آگیا تو رمضانی نے بیوی کے منہ پر ایک تھپڑ لگاتے ہوئے بولا!

"کمینی کہیں کی! تو نے حضور کو چھپایا کہاں؟ اگر سرکار گر پڑتے تو؟ —————— سرکار لائیے میں آپ کے کپڑے جھاڑ دوں سب گرد آلود گئے ہیں —————— لیکن سرکار آپ نے مجھے اس دن ہی بتا کیوں نہ دیا؟ —————— [باہر سے شور سُن کر] سرکار! آپ ذرا اوپر دالان جا کر چھپ جائیں؟ —————— اور تو [بیوی کو مخاطب کر کے] ادھر سے کواڑ بند کر دے۔ میں لوگوں کو بھیج دوں۔ ورنہ اگر انھیں سرکار کا علم ہوگیا۔ تو وہ مار ڈالیں گے سرکار کو —————— جناب صرف چند منٹ کے لئے آپ چھپ جائیں۔ اور پھر ——————؟"

طوفان جب تھم جائے تو فضا میں ایک سکون سا پیدا ہو جاتا ہے طوفان کی یادگار صرف ٹوٹے ہوئے درخت بے ترتیب پتے۔ اور تباہ و برباد آشیاں رہ جاتے ہیں۔ یہی حال رمضانی کا تھا۔ اس کے سامنے اس کا تباہ و برباد آشیان تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں سکون آچکا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ گلی کی طرف گیا۔ اور اوپر کی کھڑکی سے پکارا۔

"کمینو! تم ابھی تک یہیں ہو! —————— پاجی کتو! تم نے کیا سمجھا تھا؟ میں اتنا بے وقوف ہوں کہ اپنی ہی بیوی کو قتل کر دوں گا —————— ! شرم نہیں آتی۔ دوسروں کے گھر برباد کر کے تماشا دیکھنے آجاتے ہیں۔ جاؤ۔ اپنے گھروں کی خبر لو —————— —————— ورنہ"

لوگوں کو پہلی بار یہ جواب سننا پڑا۔ ہجوم چند منٹوں میں منتشر ہو گیا۔ اور پھر خاموشی طاری ہوگئی ——————

انوارِ لطیف

از:۔ لطیف انور گورداسپوری

انتظارِ فصلِ گل ہے یا حجابِ نغمہ ہے
بُلبلوں کی خامشی کسلِ شبابِ نغمہ ہے

مصلحت یہ ہے کہ لب بستہ رہیں اہلِ قفس
لیکن اُن کی خامشی گویا جوابِ نغمہ ہے

یا نہیں ہے فطرتِ صیاد کو نغمہ پسند
یا قفس کی زندگی ناکامیابِ نغمہ ہے

کاش! کانٹا کام کر جاتا کوئی مضراب کا
سینۂ بلبل میں باقی اضطرابِ نغمہ ہے

تو نے صادر کر دیا حکمِ زباں بندی تو کیا
فطرۃً سودائیٔ نغمہ خرابِ نغمہ ہے

گوش برآوازِ گلبانگ اب ہیں کیوں اہلِ چمن
یہ خزاں کا دَور، دورِ احتسابِ نغمہ ہے

صحنِ گلشن میں اگر ہو دیدۂ بینا نصیب
برگِ مردہ، شکستہ رُبابِ نغمہ ہے

ساقیِ مطرب کا کیا کہنا کہ انور بزم میں
ہر شگفتہ پھول اک جامِ شرابِ نغمہ ہے

از :—

"یہیں پہ رہنے دے صیّاد آشیانہ مرا"

مجید امجد بی۔ اے۔

یہ باغ تیرا ہے، یہ پھول تیرے ہیں چُن لے — گلوں کے ریشوں سے دامِ حسیں کوئی بُن لے
ابھی ہٹا نہ اِسے ایک التجا سُن لے
مرے بغیر اجڑ جائیگا ٹھکانا مرا! — یہیں پہ رہنے دے صیّاد آشیانہ مرا

یہیں پہ بیٹھ کے میں چپکے چپکے رو لوں گا — کلی کلی مجھے چھیڑیگی میں نہ بولوں گا،
نہ گاؤں گا، میں زباں تک نہ اپنی کھولونگا
تری فضاؤں پہ گر بار ہے ترانہ مرا — یہیں پہ رہنے دے صیّاد آشیانہ مرا

تجھے ہے یاد؟ یہاں ایک پنچھی رہتا تھا — وہ جس کے نغموں کی رو میں زمانہ بہتا تھا
یہاں سے جانے لگا وہ تو رو کے کہتا تھا۔
"رفیق! جاتا ہوں! پھر جانے کب ہو آنا مرا — ترے سپرد ہے چھوٹا سا آشیانہ مرا"

اندھیرے میں کوئی پتہ جو سرسراتا ہے — تو اب بھی راتوں کو دِل میرا چونک جاتا ہے
سمجھتا ہوں وہ مراہم سرود آتا ہے
ہے جس کی ایک امانت یہ آشیانہ مرا! — یہ ٹوٹی ٹہنی پہ برباد سا ٹھکانا مرا،

کبھی تو آئیگا وہ مژدۂ اُمید لئے! — اک اور جنّتِ گلپوش کی کلید لئے
اک اور گلشنِ امید کی نوید لئے!
زباں پہ نام باندازِ مجرمانہ مرا! — وہ آکے سر پہ اٹھا لیگا آشیانہ مرا!

وہ دیکھ شاخیں ہلی ہیں! وہ آ رہا ہوگا — حسین کلیاں کھلی ہیں! وہ آ رہا ہوگا!
رتیں رتوں سے ملی ہیں، وہ آ رہا ہوگا
[illegible] پہ آنا مرا — یہیں پہ رہنے دے صیّاد آشیانہ مرا

دوراہہ

ایک تاثر

از: ریاض شمیم

سہیل اپنے سر کو ہاتھوں پر جھکائے میز پر رکھے ہوئے شیشے کے گلاس کو گھور رہا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ شہر کے ہنگامے تاریکی کی آغوش میں خاموش پڑے تھے۔ بازار سنسان اور گلیاں ویران نظر آ رہی تھیں دور و بیہ مکان اندھیرے میں لپٹے ہوئے ماتم پوش کھڑے تھے — کیسی خواب کی گود میں بے ہوش! ہر طرف موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

سہیل کی پشت پر، چھوٹے سے کمرے کے وسط میں چھوٹی میز پر بجلی کا لیمپ رکھا تھا — مدھم سی روشنی کی کمزور شعاعیں تاریکی کو چیرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کونے اندھیرے میں مستور تھے — کلاک کی ٹک ٹک کسی مضطرب دل کی اداس دھڑکن کی طرح سنائی دے رہی تھی!

سہیل اپنے ماحول سے بے خبر — گلاس کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں پانی میں تحلیل ہوتے ہوئے سفید ذرات پر جم کر رہ گئی تھیں۔

دور کہیں سے گانے کی نحیف آواز آ رہی تھی — کوئی گراموفون بجا رہا تھا۔

"زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے — !"

لیکن سہیل کے کانوں کو اس آواز کا احساس نہ تھا — اس کا دماغ کسی گہری سوچ میں غرق تھا، نظریں گلاس پر اور گوش بے حس!

"موت اور زندگی میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں!" وہ سوچ رہا تھا "مجھے معلوم تھا کہ یہ دونوں راستے ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک واقع ہیں۔ پاؤں کی معمولی سی لغزش انسان کو ایک راہ سے ہٹا کر دوسری پر ڈال دیتی ہے — قدم کو ذرا دوسری طرف ہٹا لینے سے آدمی دوسرا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ مجھے موت بہت خوش آئند نظر آ رہی ہے۔ شاید اس لئے کہ میں ایک ہی راستے پر چلتا چلتا اس کے مصائب اور دشواریوں سے اکتا گیا ہوں — لیکن یہ راستہ نکلے گا کونسی وادی میں جا کر — ؟ یہ میں نہیں جانتا کوئی بھی نہیں جانتا۔ بالآخر زندگی کا راستہ بھی تو ایک نہ ایک جگہ پر جا کر اس میں مل جاتا ہے۔ تو پھر کیا ضرورت ہے کہ میں پہلے ہی سے چھلانگ کر دوسری رہگذر پر ہو لینے کی بجائے اسی سڑک پر چلتا جاؤں — جہاں ہر قدم پر ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے — کیوں نہ میں —"

ذرات آہستہ آہستہ پانی میں جذب ہو کر غائب ہو گئے۔

سہیل نے اپنی کمر کو سیدھا کیا اور ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا — وہ اسے اپنی آنکھوں کے قریب لایا اور بڑبڑانے لگا۔

"زہر! نجانے لوگ اس لفظ کو سن کر کیوں دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ میرے تو ہاتھ تک بھی نہیں لرز رہے۔ پانی کی سطح ساکن ہے۔ — مجھے موت کا تصور بھی خوفناک نہیں محسوس ہوتا۔ میرا دل پُرسکون ہے — شاید لوگ موت کو سمجھ نہیں سکے کیونکہ اس سے ملنے کا اتفاق انہیں صرف ایک مرتبہ ہوتا ہے اور پھر شاید وہ سوچ نہیں سکتے۔ لیکن میں — میں تو زندگی میں کئی بار مر چکا ہوں۔ میں ایک لاش کی طرح زندہ رہا ہوں — ہاں شاید یہی وجہ ہو!"

یکایک اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر کھڑکی کی طرف پھرایا۔ وہ گانے کی آواز سن رہا تھا

"لے نہ ٹوٹے زندگی کے ساز کی
زندگی آواز ہی آواز ہے"

"زندگی آواز ہی آواز ہے" اس نے زیرِ لب دہرایا وہ ایک مرتبہ پھر فکر میں محو ہو گیا "ہاں۔ زندگی آواز ہی آواز ہے۔ لیکن کتنی پرسوز، کتنی دردناک آواز! ایک نالہ، نہ ختم ہونے والا نالہ آرام و مصائب کے نیچے دبی ہوئی روح کی دکھی پکار — ! مگر اس کی لے نہ ٹوٹے؟

— کیا نیم بسمل مرغ کے کراہنے کی صدا اتنی ہی محظوظ کن ہے کہ اسے سنتے ہی رہنے کو جی چاہے؟

— نہیں توڑ کر رکھ دینا چاہئے ایسے ساز کو!"

اس کے خیالات نے کروٹ لی۔

"زندگی کے ساز سے بیدار ہونے والی آواز — ایک نغمہ؟ یہ غلط ہے! وہ اسے ایک نغمہ، کیف آگیں نغمہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ اس کی آواز بند نہ ہو۔ وہ غلط سمجھے ہیں۔ وہ غلط سنتے ہیں۔ ان کے کان عیش و عشرت کی وجہ سے پچاسنے لگے ہیں۔ آسودگی [illegible]

ریاست اور امارت کے نشہ نے انہیں اسقدر مخمور کر دیا ہے کہ وہ ایک نغمہ اور نالہ میں بھی تفریق نہیں کر سکتے۔"

وہ یکایک رک گیا، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو ——— اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

"لیکن — کیا یہ میرے کان تو نہیں جو غلطی کر رہے ہیں؟ شاید میری خستہ حالی نے میری سننے کی قوت تو سلب نہیں کر لی؟ کیا یہ بھی ایک نغمہ ہے جو میرے کانوں میں ایک نالے کی طرح گونج رہا ہے۔ کیا میں خود ———"

اس کی نظریں کھڑکی سے ہٹ کر پھر گلاس پر جم گئیں۔

"خواہ کچھ ہو ———" اُس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا، "میں اپنی زندگی کو ایک خواب بنا کر رہوں گا، یہ گھونٹ حلق سے اترنے کی دیر ہے اور میری آنکھ کھل جائیگی ——— اس خواب کی یاد آہستہ آہستہ خود بخود معدوم ہو جائے گی۔ وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔"

کلاک نے دو بجائے۔

وہ چونک پڑا، پہلی مرتبہ اسے اپنے ماحول کا احساس ہوا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے کلاک کی طرف دیکھا۔ کیا کہا ہے اس نے؟ اس کی نظر نے تمام کمرے کا وحشیانہ حیرت سے جائزہ لیا۔ گویا وہ ایک قیدی تھا۔ جو قید خانہ میں بند کر دئے جانے کے بعد تاریک کوٹھری کا حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے نظارہ کر رہا ہو!

اس کی نظر بائیں ہاتھ کی دیوار سے آویزاں اپنے بوڑھے باپ کی قد آدم تصویر پر آ کر رک گئی۔

وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ گلاس میں سے کچھ پانی اچھل کر باہر آ رہا۔ اور اس کی قمیض بھیگ گئی ——— آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ کبھی تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنی بھیگی ہوئی قمیص کی طرف۔ پھر اس نے گلاس کی طرف دیکھا ——— جس کا ایک گھونٹ اس کی زندگی ختم کرنے کے لئے کافی تھا ——— اس نے اپنے باپ کی طرف نظر اٹھائی۔ جس نے اسے زندگی بخشی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کی تصویر نے حرکت کی۔ اس کا سر بلند ہوا۔ اور نظریں سہیل کی طرف اٹھیں!

وہ لرز گیا ——!

"سہیل!" اسے اپنے باپ کی کمزور آواز سنائی دی۔ "تم ہار بیٹھے؟ تم نے ارادہ کر لیا کہ میری آرزوؤں کو کچل ڈالو؟ تم نے مجھے بربادی کے [illegible] دیکھنے کا تہیہ کر ہی لیا نا؟ ——— کیا میرے خواب تشنۂ تعبیر ہی رہیں گے اب؟ یہ تمہارے ہاتھ، جن سے مجھے توقع تھی کہ تم میری سعادت کی تصاویر میں رنگ بھرو گے ——— زہر کا پیالہ تھامنے کے لئے تو نہیں تھے! تم میرے ہاتھوں سے میرا سہارا چھین رہے ہو۔ تم دو ٹکڑے کر دینا چاہتے ہو۔ میرے بڑھاپے کے سہارے، میری لکڑی کو ——— تم اپنے باپ کو در در کی ٹھوکریں کھاتے دیکھ سکو گے؟ ——— رحم کرو سہیل۔ اپنے بوڑھے باپ — اپنی غریب ماں پر ترس کھاؤ!"

سہیل دیوانوں کی طرح چلا اٹھا اور طلسم ٹوٹ گیا!

اس نے آہستہ سے گلاس میز پر رکھ دیا اور دیوار کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا ——— اس نے کھڑکی سے باہر کھلی فضا میں دیکھتے ہوئے سرچنا شروع کیا:

"وہ لوگ مجھے سمجھ نہیں سکتے۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھے غلط سمجھے! مصیبت تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو نہیں سمجھا بھی نہیں سکتا۔ میری فطرت آزاد ہے! اور وہ مجھے اپنی امیدوں کے جال میں جکڑ لینا چاہتے ہیں۔ وہ مجھ سے جو کچھ چاہتے ہیں۔ میں نہیں کر سکتا! اپنے آپ کو مجبور کرنے کے باوجود نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ میری مجبوریاں نہیں سمجھتے ——— وہ انہیں میری کوتاہیوں پر محمول کرتے ہیں ——— اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا ——— مکان خاموش اور تاریک کھڑے تھے۔ سڑکوں پر اداسی برس رہی تھی ——— بجلی کے کھمبے، سرنگوں، پروانوں کی موت پر افسردہ سے محسوس ہو رہے تھے!

"یہ دنیا!" سہیل نے دور تک پھیلے ہوئے شہر کی طرف گھورتے ہوئے کہا، "جس میں اپنی مختصر سی زندگی میں کوئی راحت نہ پا سکا اب مجھے اس نامعلوم وادی کی طرف پاؤں بڑھانے سے نہیں روک سکتی۔ جہاں ہر شخص کو جانا ہے۔ اور جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ——— اس دنیا کا مجھ پر کوئی احسان نہیں ——— اور نہ یہ مجھے اتنی دلکش محسوس ہوتی ہے!"

وہ مڑا اور پیالے کو دوبارہ اٹھا کر اپنے قریب لایا۔

"میرے ہونٹوں اور گلاس کے کنارے میں صرف ایک چیز حائل ہے۔"

اس کی نظریں گلاس سے نہ ہٹیں لیکن اس کے باپ کی تصویر پانی کی سطح پر جھلک رہی تھی!

"مگر میں اس ترغیب پر بھی فتح پاؤں گا ——— کیا ہوتا اگر کل میں کسی حادثہ سے مر چکا ہوتا۔ میری موت کا صدمہ والدین کے لئے ناقابل برداشت ضرور ہوگا لیکن ——— وقت، ہر زخم کا مرہم ہے ——— اور پھر میری زندگی! یہ تو صدمات کا ایک سلسلہ ہے اُن کے لئے!" وہ میری

فکر میں گھل گھل کر نیم جان ہو گئے ہیں ـــــ کیوں نہ اسے ایک آنری صدمے کیساتھ ختم کر دیا جائے ؟"

اس کے خیالات ماضی کے ایک رومان تک پہنچ کر رک گئے۔

" شکر ہے آج وہ زندہ نہیں ! اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ ورنہ شاید میں اس ترغیب کی تاب نہ لا سکتا ـــ آہ ! میں بھی کس قدر سادہ لوح تھا۔ سراب کی طرف دیوانوں کی طرح دوڑ پڑا۔ ان دنوں دنیا مجھے کس قدر رنگین نظر آتی تھی۔ لیکن یہ تو سب فریب تھا۔ محض سراب! زندگی میں راحت کہاں ؟ محبت انسان کو عقل سے دور کر دیتی ہے۔ میں نے بھی یہی سمجھ لیا کہ زیست ایک خوشگوار نغمہ ہے۔ لیکن کہاں ! جب میں نزدیک پہنچا تو سراب کی حقیقت عیاں ہو گئی۔ وہ مجھ سے چھین لی گئی ـــــ غریب نجمہ ! پھر میں اس آواز کو واضح طور پر سن سکا جسے میں نغمہ سمجھے ہوئے تھا۔ یہ ایک جگر سوز نالہ کے سوا اور کچھ نہ تھا!"

اُس نے مسکرا کر گلاس کی طرف دیکھا۔

" کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے یہ مجھے ! ـــ موت، میری نجمہ کی امین ہے۔ اور یہ اس کا قاصد ! میں کس طرح خوف کھا سکتا ہوں اُس سے !

اس نے نفرت انگیز نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔

" ذلیل اور فرومایہ دنیا ! ـــ آخر خدا نے اسے بنایا ہی کیوں ! اے کاش آدم گندم کے درخت کی طرف ہی نہ بڑھا ہوتا ـــ لیکن ہمارے بڑے بوڑھے بھی تو غلطیوں سے مبرا نہ تھے ـــ سب جانتے ہیں۔ لیکن سمجھتا کوئی نہیں ! اے کاش میں ان دنیا والوں کو سمجھا سکوں !"

یکا یک اسے کچھ خیال آیا۔ اور اس نے گلاس ایک طرف رکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کی چوکھٹ کو پکڑ کر سوچنا شروع کیا ـــ

" لیکن کیا میرے اس طرح مرنے سے دنیا کچھ متاثر ہو سکے گی ، موت مجھے اس کٹھن زندگی سے نجات دلا سکتی ہے لیکن دنیا سے میرا انتقام نہیں لے سکتی۔ میں انتقام چاہتا ہوں ـــ دنیا کے ان ٹھیکیداروں سے جنھوں نے یہاں کی عارضی خوشیوں کو اپنے لئے محدود کر لیا ہے۔ تپتے ہوئے صحرا میں ہزاروں انسان پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ اور ریت کے چمکتے ہوئے ذرات کو پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ غریب فریب کے شکار ! کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پاس بوتلوں میں پانی موجود ہے۔ وہ خود پیتے ہیں لیکن اپنے نیم جان ہمراہیوں کو ایک گھونٹ بھی نہیں دیتے۔ خود غرض کہیں کے ! میں ان سے انتقام لوں گا ـــ ! انہیں محسوس کرنا ہو گا کہ جان ہر شخص میں ایک سی ہوتی ہے ! وہ آرام و راحت کو اپنے لئے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ وہ اجارہ دار ہیں زندگی کی مسرتوں کے

وہ رک گیا ـــ

" لیکن ـــ میں خیالات کی رو میں کہاں بہہ نکلا ! مجھے جنون ہو گیا ہے کیا۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں بھول گیا اس سبق کو۔ جو دنیا میں میں نے حاصل کیا۔ جو میری تلخ زندگی کا ماحصل ہے۔ دنیا میں کوئی راحت نہیں۔ زندگی مصائب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے ـــ پھر ؟ ـ نہیں میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ! میں اس حالت میں اس دنیا سے اپنا انتقام لینے کے لئے تیار نہیں !"

کلاک نے تین بجائے۔

اس نے میز سے کاغذ اور قلم اٹھایا ـــ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے پیچھے کیا پیغام چھوڑ جائے۔ زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے صرف اتنا لکھا۔ ـ

' میں خودکشی کر رہا ہوں '

اس کے بعد وہ گلاس کی طرف متوجہ ہوا اور چاہا کہ اسے میز سے اٹھائے لیکن ـــ وہ رک گیا !

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

" اللہ ! مجھے کیا ہو گیا ہے !"

پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر جھلک رہے تھے۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ گلاس کو اٹھا کر ہونٹوں تک لا سکے ـــ وہ خوفزدہ نظروں سے گلاس کی طرف گھور رہا تھا ـــ

" آخر کیوں ؟ ـــ اس نے اپنے آپ سے پوچھا " کیا میں موت سے ڈر گیا ! ـــ کیا زندگی پھر مجھے پیاری محسوس ہو رہی ہے۔ ـــ نہیں ! زندگی اب تک مجھے بھیانک نظر آ رہی ہے۔ لیکن موت ـــ شاید وہ اس سے بھی زیادہ ڈراونی ! ـــ مگر کیوں ؟"

وہ کرسی پر گر گیا !

تھوڑی دیر تک وہ یونہی بیٹھا اپنی کھوئی ہوئی سکت کو واپس لانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب وہ دوبارہ اٹھا تو اس کا چہرہ پُرسکون تھا۔ وہ اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا۔

وہ دیوار سے سہارا لئے بہت دیر تک اس کاغذ کو گھورتا رہا جس پر اُس نے اپنی خودکشی کا اقبال کیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ گلاس کو تھامنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

چار بج گئے ـــ

اس نے ایک نظر کلاک کی طرف دیکھا ، پھر کاغذ کے پرزہ کی طرف

اور اس طرح جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔۔۔ آگے بڑھ کر گلاس اٹھا لیا!

ایک دفعہ پھر اس کے دماغ میں کشمکش شروع ہو گئی ۔۔

گلاس کو منہ سے لگائے وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا!

سہیل ۔۔۔ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ۔ اپنے آپ کو یہ فیصلہ کرنے سے عاجز نیاں کر رہا تھا کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے۔

اس کے دماغ نے تیزی سے ان تمام خیالات کو دہرایا جو وہ کچھ گھنٹے پیشتر سوچ رہا تھا!

آدھ گھنٹہ اور گذر گیا ۔۔۔

مرغ کی اذان نے اسے چونکا دیا ۔۔ صبح کی سفیدی افق ۔ تاریکی کو چیر رہی تھی ۔ سڑکوں پر بجلی کی روشنیاں غائب ہو چکی تھیں! ۔۔۔ باہر برآمدے میں جہاں اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا ۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔

سہیل نے گلاس ہونٹوں سے ہٹا لیا ۔۔۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔۔۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا ۔۔۔ کچھ دیر بعد گلاس کھڑکی سے باہر سڑک پر گر کر پاش پاش ہو گیا

دور ... ہوئے کچھ سوچ رہا تھا ... اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ ... کر رہے تھے ۔۔۔ باہر گلی میں کوئی گنگناتا ہوا گذر رہا تھا ۔۔۔

ع زندگی کس زندگی کا ساز ہے

ع ... اور بے آواز ہے!"

"تجدید محبت"

ستید محمد ... ی

کیوں مرے سوئے ہوئے جذبات بھڑکاتی ہو تم
کیوں کسی کو ارتکابِ جرمِ الفت کے لئے
کل تو دزدیدہ نگاہی سے کبھی تھی دیکھتی
مگر ... کیا دیکھتے ہو پہلے یہ ارشاد تھا
خوفِ ناموس و حیا سے کپکپاتی تھیں کبھی
کیوں سکوتِ حسن سے پھر ... نادیدہ

کیوں مری مردہ رگوں میں خون دوڑاتی ہو تم؟
کیف زا نظروں سے نشہ دے کے بہکاتی ہو تم؟
بے محابا آج دل نظروں سے برماتی ہو تم!
آج "دردِ من ماشا" کہکے پھسلاتی ہو تم!
آج یہ جرأت کہ رازِ عشق سمجھاتی ہو تم!
کیوں پرانی داستاں کو آج دہراتی ہو تم؟

کیا کیا تم نے کہ افشا راز پنہاں کر دیا
تنگنائے دل کو کیوں نشہ بداماں کر دیا

اے حبیبہ! ان نشیلی مست آنکھوں کی قسم
کھلکھلاتی ہو کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
پھول سے ترشے ہوئے ہونٹوں سے کنگر شکریہ
مرمریں باہوں میں دھانی چوڑیوں سے کھیلتے
کھیلتی ہوتی ہیں جب لب پر ہنسی کی شوخیاں
دھیمے دھیمے سے سروں میں گنگنا کر بارہا
آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیتی ہو میرا حالِ دل

کیف سا بنکر فضائے دل پہ چھا جاتی ہو تم!
اور کبھی نظریں ملانے سے بھی شرماتی ہو تم!
کیوں مرے ناچیز ارمانوں کو ٹھکراتی ہو تم!
ایک بھولے پن کے عالم میں، چلی آتی ہو تم!
خود بخود میری نگاہوں میں سما جاتی ہو تم!
میرے دل پر بارشِ نغمات کر جاتی ہو تم!
باتوں باتوں میں کہ دل کی بات کہہ جاتی ہو تم!

ثبت ہیں دل پر محبت کی حسیں گلکاریاں
یادگارِ شعلۂ افسردہ ہیں چنگاریاں

کشمکش

نظم

از:-
اختر بریلوی۔ بی۔ اے۔

جوانی کشمکش کی وادیوں میں کھوئی جاتی ہے — جو قسمت جاگ اُٹھی تھی وہی اب سوئی جاتی ہے
الٰہی کیا کروں کیونکر ہو اس اُلجھن سے چھٹکارا — ہوا جاتا ہے دل فکر و پریشانی سے صد پارا
محبت اپنی جانب کھینچتی ہے گرمجوشی سے — اطاعت باز رکھتی ہے مجھے اس سرفروشی سے
محبت کہہ رہی ہے میرا کہنا ماننا ہوگا — اطاعت کہہ رہی ہے میرا حق پہچاننا ہوگا
محبت کہہ رہی ہے جو بھی کرنا ہے وہ کر ڈالو — اطاعت کہہ رہی ہے میرے آگے تم سپر ڈالو
محبت کہہ رہی ہے جان کی بازی لگا دونا — اطاعت کہہ رہی ہے راہ میں کانٹے نہ تم بونا
نظر کے سامنے منزل ہے لیکن راہ کھوئی ہے — اطاعت نے محبت خوب ہی لوٹی کھسوٹی ہے
اگر چاہوں تو جس کو چاہتا ہوں اُسکو اپنا لوں — جو دولت کھو چکا ہوں اُسکو آسانی سے اب پالوں
مگر ظالم اطاعت میرے آڑے آئے جاتی ہے — نظر ماں باپ کی ہر لحظہ مجھ کو کھائے جاتی ہے
بغاوت ہاں بغاوت سے اطاعت ہار سکتی ہے — محبت اس طرح میدان شاید مار سکتی ہے
مگر اک اپنا دل خوش کر کے دو دو دل غمزدہ کر دوں — میں اپنے سکھ کی خاطر ان کو دکھ میں مبتلا کر دوں
کشاکش دیکھنے کی ہے ادھر خوابوں کی رانی ہے — اُدھر خوش خلق و نیک اطوار دُخترِ خاندانی ہے
وہ محبوبہ جو منسوبہ کسی کی تھی لڑکپن سے — بندھا ہی چاہتا تھا جس کا دامن "اپنے" دامن سے
جسے میں نے نصیبِ دشمناں ہی جان رکھا تھا — شریکِ زندگانی "اور" ہی کی مان رکھا تھا
مگر جو بات ہونی تھی نہ ہونی ہو گئی آخر — جو قسمت جاگتی تھی ایک دن وہ سو گئی آخر
مجھے موقع ملا ہے اب مقدر آزمانے کا — مگر اُلٹا نظر آتا ہے مجھ کو رُخ زمانے کا
محبت اور اطاعت کی کشاکش جان لیوا ہے — خدا جانے کہ کیا انجام اس اُلجھن کا ہونا ہے

کیا ہے غمزدہ اس کشمکش نے زندگانی کو
یہ کیسا ناگہانی گھن لگا میرا جوانی کو

سادگی و پُرکاری (نظم)

از:-
سید نفیس جالندھری ایم-اے (آنرز)

کچھ دور اُدھر گاؤں میں اک پیڑ کے نیچے — دیکھے ہیں اِن آنکھوں نے ستم کوش نظارے
سکھیوں کو جلو میں لیئے اک غیرتِ ناہید — برگد کی حسیں چھاؤں میں پھرتی تھی طرارے
آزاد و تکلف وہ پُر آشوب جوانی — وہ شانوں پہ ڈھلکے ہوئے پلّو کے کنارے
شانہ زدہ زلفوں میں لرزتا ہوا جادو — رخسار میں مستی کے اُبلتے ہوئے دھارے
وہ حسنِ جواں، پیکرِ صد شوخی و انداز — نظروں میں چھپائے ہوئے بیباک اشارے

وحشت مجھے ہر گام پہ دیتی تھی سہارے!!

اٹھکیلیاں کرتے ہوئے آہو بھی ٹھہر جائیں — اس طرح ٹپکتی تھی اداؤں سے شرارت
پاکیزہ تھی کلیوں کے تبسم سے زیادہ — آئینہ بہ کف جسم بلوریں کی صباحت
موضوعِ نظر اور وہ اک چاند سا چہرہ — مضمونِ ادا اور وہ چنچل سی نزاکت
ہنستے ہوئے وہ کیف درآغوش لبِ لعل — پھولوں کو بھی شرمندہ کرے جن کی طراوت
وہ سادگی اور اُس کی وہ معصوم ادائیں — ہر ناز میں فتنہ تو ہر انداز قیامت

اب تک ہیں تصور میں وہ معصوم نظارے!!

لبریزِ فسوں، ناز سے بہکی ہوئی آنکھیں — پیالوں میں چھلکتی ہوئی صہبائے مُغانہ
چہرے پہ جوانی سے وہ دوڑی ہوئی سُرخی — خاموش لبوں پہ کوئی رنگیں سا ترانہ
سیلاب پہ تھا دونوں طرف موجۂ جذبات — نظروں سے ادا ہوتا تھا نظروں کا فسانہ
پابندِ حیا وہ، میں اِدھر ضبط سے مجبور — خالی نہ گیا پھر بھی اداؤں کا نشانہ
ہر گام پہ تھیں اس کے تعاقب میں نگاہیں — ہر لمحہ معین تھا نگاہوں کا ٹھکانہ

محفوظ ہیں آنکھوں میں وہ رنگین اشارے!!

محتاجِ سکوں خاک ہو آوارہ مزاجی — ہے قسمتِ ساغر میں وہی گردشِ پیہم
ویرانوں میں سرمایۂ فردوس نثار کر — پہلو میں چھپا لایا ہوں خاموش جہنم
دیہات کے نظارے تصنع سے بری ہیں — لہراتا نہیں گاؤں میں تہذیب کا پرچم
وہ سادہ و پُرکار، جنوں خیز فضائیں — اللہ رے فراوانیٔ جذبات کا عالم

جاتا ہے تصور بھی اسی راہ گزر میں
اب تک وہ حسیں شعر ہے دامانِ نظر میں

علمی

فضائی طاقتیں

(افسانہ)

از:-
کوکب شادانی

میں نے اُس کے متعلق آنے والے خطرے کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا۔ مگر وہ اس سے بالکل ناواقف تھا۔ حالانکہ اُس کی بینائی شہر کی تیرہ و تار گلیوں اور غبار آلود سڑکوں میں قریب قریب جا چکی تھی۔ ناواقفیت کا یقین عقلمندی کی ابتداء ہوتی ہے لیکن یہ شہری لوگ کتابی معلومات میں کھوئے رہتے ہیں۔ اور کتابوں کے مطالعے سے دماغی بینائی ضائع ہو جاتی ہے۔

میں نے اُسے اکتوبر کے آغاز ہی میں متنبہ کرنا شروع کر دیا تھا جبکہ ہوا کے تیز و تند جھونکے آسمان کی بلندیوں میں شور مچاتے رہتے ہیں۔ اسوقت وہ خطرے سے خالی ہوتے اور صرف خرمنوں کھپریل کی اونچی چھتوں اور درختوں کی شاخوں میں سنسناہٹ پیدا کر کے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور تاریکی شروع ہونے سے پہلے ہم قطعی طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔

میں اُسے باہر کھیتوں میں لے گیا اور سمندر کی سیاہ لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں ذرات ہوا میں سوکھے ہوئے منتشر پتوں کی طرح اُڑ رہے تھے۔

"موسم بدل چکا ہے اور تاریکی آنے والی ہے۔" میں نے کہا

وہ فضا میں ناچتے ہوئے ذروں پر نگاہ جمائے خاموش کھڑا تھا

"کیا وہ کوئی کھیل کھیل رہے ہیں؟" اُس نے دریافت کیا

میں نے سر ہلایا "ان کا تعلق تاریکی سے ہے۔"

اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے دیکھ کر کہا "یہ تمہاری توہم پرستی کی نشانی ہے۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ پھر فصل ربیع کے لئے جُتے ہوئے کھیتوں کی مٹی کو دیکھنے اور اُس کے نیچے لکھی ہوئی تحریر اور اُن تمام علامات کا خیال کرنے لگا جنھیں میں کسی طرح نہ پڑھ سکتا تھا "علم" میں نے کہا۔ میں اُس کے متعلق خائف تھا۔ اور اُسے کسی نہ کسی طرح خطرے سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ ایک سادہ لوح طائرِ محبوس کی طرح شہر کی چھوٹی سی دُنیا میں مقید تھا۔ اور اپنے زنداں کے در و دیوار کو مسلسل دیکھتے دیکھتے اندھا ہو گیا تھا۔

وہ اپنی برتری کے خیال سے مسکرایا۔ "تم ابھی تک ابتدائی دور کے انسان معلوم ہوتے ہو۔ کیا تم پوشیدہ طور پر سورج یا بجلی کی پرستش کرتے ہو"

میں نے یہ سمجھ کر کہ الفاظ کے پامال اور فرسودہ ذریعے سے اُسے سمجھانا پڑے گا ایک لمبا سانس لیا۔ ان مہذب لوگوں کا یہی ایک مخصوص اور واحد طریقہ ہے۔ عقل تو در اصل اُن کو چھو بھی نہیں گئی۔ یہ صرف اسی چیز کو مانتے ہیں جو الفاظ اور کتابوں کے ذریعے اُن تک پہونچے۔

"میں تمہیں یہاں متنبہ کرنے کے لئے آیا ہوں۔" میں نے کہا

"کس بات کے متعلق"

"اُن قوتوں کے متعلق جن میں تاریکی کے زمانے میں مزید طاقت آ جاتی ہے۔ ان کی طاقت بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ اور ایک مہینے میں تمہارا ان چٹانوں پر غروب آفتاب کے بعد آنا خطرناک ہو جائے گا۔ تمہیں یقین آئے یا نہ آئے لیکن تم دوستی اور خلوص کے نام پر میرے مشورے کو قبول نہ کروگے؟"

اُس نے پھر مسکرا کر اپنی برتری کا اظہار کیا "وہ کونسی قوتیں ہیں؟"

ان کتابی لوگوں کا یہی قاعدہ ہے۔ یہ ہمیشہ چیزوں کے نام دریافت کرتے ہیں۔ اگر کسی چیز کی تشریح ایک لفظ یا ایک ضخیم کتاب کے ذریعے ہو جائے تو وہ مطمئن ہو جاتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ انہوں نے اس کی انتہائی واقفیت بہم پہنچا لی۔ شاید یہ ناموں کو طلسم سمجھتے ہیں۔

"خدا ہی جانتا ہے" میں نے جواب دیا "مگر میں نے اُن کی طاقت کو سمجھ لیا ہے۔ تم انہیں جن ناموں سے چاہو موسوم کر دو مگر تم اُن کے اثرات کو نہیں بدل سکتے۔"

"ان قوتوں کا کیا کام ہے؟ کیا تم نے کبھی اُن کو دیکھا ہے؟" اُس نے اس طرح سوال کیا جیسے وہ مجھے دھوکا دے سکے گا۔ میں نے یقیناً انہیں دیکھا تھا مگر کیا میں انہیں کسی صورت سے اُس کے سامنے بیان کر سکتا تھا۔ کیا کوئی شخص کسی پیدائشی اندھے کو مختلف رنگوں کا امتیاز کرا سکتا ہے! جس خطرے کا احساس صرف میری روح کو تھا اُس کا اظہار کس طرح ممکن تھا۔ "کیا تم نے کبھی ہوا کو دیکھا ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ ہنس پڑا "اچھا تمہارے پاس اُن کا کیا ثبوت ہے"؟

میں نے کسی ایسی چیز کے لئے اپنے دماغ کو ٹٹولا جو اُس کے نزدیک ثبوت ٹھہر سکتی۔ "لوگوں کا پہلے عام طور پر یہ خیال تھا کہ سمندری چڑیاں روشنی کے مینار کی طرف اسی طرح دوڑتی ہیں جیسے پروانے شمع کی طرف اور اسیطرح جان دے دیتی ہیں لیکن اب سب یہ جان گئے ہیں کہ یہ چڑیاں فضائی طوفان سے گھبرا کر کسی جائے پناہ کی تلاش میں روشنی کی طرف آتی ہیں تاکہ وہاں طلوعِ سحر تک آرام کر سکیں۔"

"بالکل ٹھیک" اس نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "مگر اس سے تمہارا مطلب؟"

"چھوٹی چڑیاں ہوائی طاقتوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کی زندگی کا واحد سہارا روشنی کے پاس آکر پناہ لینا ہوتا ہے۔ لیکن اگر انہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی تو وہ تن بہ تقدیر پھڑپھڑانے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ مسلسل پرواز سے مضمحل ہو کر اور بلندی کی طرف اڑتی اور لقمۂ اجل ہو جاتی ہیں۔"

"لیکن سمندری شکاری پرندوں کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"ہاں کچھ جن کا خود تاریکی سے تعلق ہے۔ وہ چھوٹی چڑیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لوٹ مار اور افراتفری کی حالت میں بعض انسان دوسرے انسانوں کو ہضم کرنے کی فکر کیا کرتے ہیں۔"

"نہایت دلچسپ کہانی ہے" اس نے کہا۔ مگر میں نے دیکھا کہ شک کا ایک سایہ سا اس پر مسلط ہو چکا ہے۔ چنانچہ جب اس نے پھر سوال کیا تو میں نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ میں اسے اس رات دس بجے گھر لے گیا اور بلندی میں ہوا کے شور کی طرف متوجہ کیا۔ نیچے فضا بالکل خاموش اور تاریک تھی کیونکہ چاند گھٹ رہا تھا اور بادل شمال کی طرف بھاگ رہے تھے جو بارش کی علامت تھی۔ "کیا تم ان کی آواز سن رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ اس سوال پر کانپ سا گیا مگر خنکی کا بہانہ کر کے خاموش ہو رہا۔

راتیں تاریک تر ہوتی گئیں۔ اور مجھے امید ہو گئی کہ میری ہدایت کو اس نے سمجھ لیا ہے۔ کیونکہ اب وہ غروب آفتاب کے وقت چہل قدمی کر کے واپس آ جاتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کہ ابھی کچھ دور اندیشی اس میں باقی ہے خوشی اور اطمینان ہوا۔

ایک روز دوپہر کے بعد میں اس کے ہمراہ سمندری چٹانوں تک گیا مجھے اس کی بینائی کا امتحان مقصود تھا۔ ہوا بند تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ افق کی نیلگوں گہرائیوں میں مصروف انتظار ہے۔ اس کی کچھ پیش رو ہوائیں افق کے سفید بادلوں میں ہیجان و اضطراب پیدا کر رہی تھیں اور سمندر کی موجیں بلند ہو کر خوف سے چیخیں مارتیں اور پھر موت کی آغوش میں سو جاتی تھیں۔

میں نے آنے والے خطرے کی نسبت اس سے کچھ نہ کہا۔ ہم چٹانوں کی طرف بڑھتے گئے جن کے سیاہ کناروں سے ٹکرا کر سمندر کی موجیں چاند کی بلندی تک پہنچ رہی تھیں۔ ہم نے سیاہی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ سمندر لوٹتے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ آنے والا سایہ اپنی آمد سے قبل ہی پہاڑیوں کی جان خشک کر رہا تھا۔ اور زمین ہر طرف رات کی آمد کے انتظار میں کراہ کراہ کے سانس لے رہی تھی۔

"یہ کیسی ویران جگہ ہے" اس نے کہا۔ "اسے یہ جگہ ویران نظر آ رہی تھی۔ مگر میں جھاڑیوں کی سیاہ جڑوں میں بے شمار متحرک سایوں کو دیکھ رہا تھا۔ میرے نزدیک یہ جگہ غیر معمولی طور پر آباد تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے کم سے کم ویرانی کا احساس تو ہے۔ یہ اچھی علامت تھی۔ کیونکہ احساس اکثر معلومات کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور جب تاریکی کا زمانہ آیا تو میں نے خیال کیا کہ وہ ہر طرح محفوظ ہے۔ وہ اب غروب آفتاب سے پہلے گھر آ جاتا اور چٹانوں کی طرف بہت کم جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس کی نظروں سے مخالفت کا اظہار ہوتا گویا وہ ابھی تک مباحثے کے لئے تیار تھا۔ اگرچہ میں نے اس سلسلے میں بھی اس کی ہمت افزائی نہ کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ طریقہ اس کے لئے سود مند نہ ہوگا مگر اس نے مجھے گفتگو پر مجبور کر ہی دیا۔ ایک روز عین تاریکی کے زمانے میں وہ میرے پاس آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سراپا مخالفت بنا ہوا ہے۔

"اپنے تئیں دوسروں سے زیادہ عقلمند سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ یا کم از کم اس کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ اگر اپنے اس وہم کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو میں خود اس کی آزمائش کروں گا۔"

مجھے اپنی کمزوری کا اندازہ تھا میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا

"میں تمہیں وجہ بتا چکا ہوں۔"

"مگر اس کے دونوں پہلو کچے ہیں۔"

"کچھ روز اور انتظار کرو۔ تم ابھی بالکل نوعمر ہو۔ فطرت کی طاقت کو دیکھنے کے لئے تجربے کی نگاہیں درکار ہیں۔"

وہ میری کمزوری کا احساس کر کے کسی قدر نرم پڑ گیا

"نوعمری ہی تجربات اور ہمت کا زمانہ ہے۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"دیوانگی اور لاپروائی کا"، میں نے اصلاح کرنا چاہی۔

"میں جا رہا ہوں"

"مگر تم کبھی واپس نہ آؤ گے۔"

"اور اگر میں لوٹ آیا!"

"میں ایسی حماقت آمیز دعوتِ مقابلہ کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ کوئی شاذ و نادر ہی بچتا ہے۔ اور الشاذ کالمعدوم"

"میں ہر شب کو جاؤں گا۔ یہاں تک کہ تمہیں یقین آ جائے۔ موسم سرما کے اختتام سے پہلے تم بھی میرے ہمراہ چلنا تو تمہارے بے جا خوف و ہراس اور وہم کا مداوا ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔ مجھے اس کی حماقت پر طیش آ گیا اور میں نے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ مجھے امید تھی کہ وہ غروب آفتاب کے وقت ضرور واپس آ جائے گا۔ مگر وہ نہ آیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا مغرب میں ابھی تک کسی قدر سرخی نمایاں تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا صبح

کوئی ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو کو دیکھتا ہے۔ ایک طرف سیاہ اور ڈراؤنے بادل سمندر کے ایک کنارے سے اٹھ کر بازو پھیلائے وحشتناک انداز میں آسمان پر پھیلتے جا رہے تھے۔

میں نے بڑے کمرے میں جا کر ٹوپی اٹھائی اور کچھ دیر شام کی دھیمی روشنی میں قدموں کی آہٹ پر کان لگائے کھڑا رہا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ وہ عین تاریکی کے زمانے میں غروبِ آفتاب کے بعد سمندری چٹانوں پر ٹھہرنے کی جرأت کرے گا۔ میں نے کچھ تامل کیا اور سنتا رہا۔ یہاں تک کہ کمرے کے چاروں کونوں میں سیاہی پھیل گئی۔

اس نے میری بزدلی کا مذاق اڑایا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب مجھے باہر جا کر اسے تلاش کرنا چاہئیے تاہم دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے کچھ اور انتظار کیا اور صدر دروازے کی آواز پر اس طرح کان لگائے کہ میرے دماغ میں خودبخود ایک قسم کی گونج سی پیدا ہو گئی۔ یہ تصور اور قوتِ واہمہ کا کرشمہ تھا۔ بالآخر میں دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ صدر دروازے تک پہنچتے پہنچتے ہوا کے ایک تیز اور سرد جھونکے نے میرے تمام جسم میں کپکپی پیدا کر دی

بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک اور ہوا کی سنسناہٹ مل کر عجیب خوفناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ عناصر کے بھوت بڑی سرگرمی سے مصروفِ پیکار تھے مجھے اوپر نظر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اور لڑکھڑاتا ہوا اس راستے پر ہو لیا۔ جو غیر محفوظ چٹان کی بلندی تک جاتا تھا۔ میں نے اسے پکارنے کی کوشش کی۔ مگر میری آواز ہوا کے شور میں گم ہو گئی اور میری چیخیں سمندر کے اس پانی میں منتشر ہو کر فنا ہو گئیں۔ جو چند لمحوں کے لئے چٹانوں میں گڑگڑاہٹ پیدا کر کے لوٹ جاتا تھا۔

جھاڑیوں کے قریب ہو کر مجھے ان کے نیچے پناہ لینی پڑی۔ اس سے آگے جانے کی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ کیونکہ وہاں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ وہاں ہولناک گردابوں اور ہوا کے تیز و تند تھپیڑوں کے ساتھ وہ پراسرار خاموشی بھی تھی جو ایک انجان کو تحریص و ترغیب کے ساتھ چٹان کے کنارے تک لے گئی تھی۔ میرے خیال میں اسے اب وہاں تلاش کرنا بیکار تھا۔

ہوا کا طوفان خوفناک حد تک بڑھ گیا تھا اور اس حالت میں کہ چٹان پر زندہ و سلامت رہنا قطعاً ناممکن تھا۔ میں سڑک کی طرف مڑا اور دوڑ کر ایک جگہ پناہ لیکر بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک میں آگ کے سامنے بیٹھا کچھ سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں اپنے تئیں الزام دے رہا تھا کہ کیوں نہ میں نے اسے روکا۔ کیوں اپنی ضد پر قائم رہا۔ کاش میں اس کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر لیتا۔ یا کم سے کم اس کی پرجوش نادانی پر غصے کی بجائے اظہارِ ہمدردی کرتا۔ پھر مجھے یہ سوچ کر کچھ سکون ہوا کہ اس کا یہ انجام ناگزیر تھا۔ اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ فضا میں ابھی تک ہلچل مچی ہوئی تھی اور مسلسل خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ عناصر کے ان خوفناک بھوتوں اور فضا کی ان غیر معمولی طاقتوں کے مقابلے میں میری کوشش کیا کام آ سکتی تھی . . .

یکایک باہر کا دروازہ کھلا اور مجھے اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ معاً مجھے خیال ہوا کہ موت کے وقت وہ مجھ سے ملنے کے لئے بیقرار ہے۔ لیکن جب وہ حسبِ معمول چمکتی ہوئی آنکھوں اور دمکتے ہوئے رخساروں کے ساتھ پیشانی سے بال ہٹاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو مجھے غصہ آ گیا

"ابتک کہاں رہے جناب! میں آپ کو چٹان تک دیکھ آیا اور سمجھ رہا تھا کہ آپ داخلِ بہشت ہو چکے ہیں۔"

"آپ چٹانوں پر تشریف لے گئے تھے"

"نہیں میں صرف وہیں تک گیا تھا جہاں سے چٹانیں شروع ہوتی ہیں۔"

"ہاں آپ کو تاریکی کے زمانے میں اس سے آگے کبھی نہیں جانا چاہئیے۔ میں نے پوچھا اب تو تمہیں میرا یقین آیا؟"

"مجھے یقین ہے کہ تمہارے لئے آج رات چٹانوں پر سخت خطرہ ہے۔ کیونکہ تم فضائی طاقتوں کو مانتے اور ان سے خائف ہو۔"

وہ دروازے میں کھڑا ہوا ہوا سے مقابلے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی آنکھیں کسی جدید تحقیق کے نور سے جگمگا رہی تھیں مگر وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ میری رہنمائی کا نتیجہ تھا۔

(ترجمہ)

غزل

از جناب [illegible]

یہ جذبِ سوزِ دردِ دل ہے کہ خود فراموشی
سکوتِ دہر میں محشر بپا نہ ہو جائے
اک آرزوئے مسلسل ہے زندگی میری
یہ انتظار کی راتیں یہ گریۂ سحری
غریقِ بحرِ گنہ ہو کے آج اے واعظ
نہ پوچھ کشمکشِ زندگی کا افسانہ

کسی کو ڈھونڈھ رہا تھا کہ کھو گیا ہوں میں
پھر آج ان کو لبِ بام دیکھتا ہوں میں
کسی کے وعدۂ فردا پہ جی رہا ہوں میں
کسی کی راہ میں موتی لٹا رہا ہوں میں
خدا کا ذوقِ کرم آزما رہا ہوں میں
اک اضطرابِ مسلسل سا ہن گیا ہوں میں

نظم

جلوہ — !

از :- ملک امتیاز اللہ خان سحابی - اے -

"آپ کے حسنِ جہاں سوز کا جلوہ دیکھا"
چشمِ مشتاق نے کیا جانئے کیا کیا دیکھا ؟

کمسنی بال فشاں سوئے جوانی دیکھی
حسنِ معصوم کو ہم تاب ثریا دیکھا

سروقامت میں نظر آئی جوانی کی بہار
نخوت و حسن کا بہتا ہوا دریا دیکھا

مصحفِ رخ پہ ترے زلفِ پریشاں کی بہار
ظلمتِ شب میں نہاں طور کا جلوہ دیکھا

نقرئی چہرے پہ وہ شعلہ فشاں ہونٹ ترے
شفقِ سرخ کو لرزاں سرِ دریا دیکھا

صبحِ روشن میں نظر آیا ہلالِ اسود
تیغِ ابرو کو سرِ عارضِ زیبا دیکھا

اور وہ صورتِ معصوم کہ نومیدی میں
ڈوبنے والے نے تنکے کا سہارا دیکھا

آخرش آ ہی گئے بسترِ بیمار پہ وہ
ہم نے گھر پھونک کے خوب آج تماشا دیکھا

نظم

دو رنگ

از :- اثر صہبائی - بی - اے -

تم کو مری نگاہ سے کیوں اجتناب ہے
آغازِ رسم و راہ سے کیوں اجتناب ہے

تم کو مرے خلوص کا احساس کیوں نہیں
میرے خموش آنسوؤں کا پاس کیوں نہیں

کیوں میرا جوشِ ضبط نہیں لائقِ سپاس
شامل نہیں ہے اس میں کیا میرے جنوں کی باس

کیوں منحرف ہو میرے فسونِ خیال سے
الفت کے ناگزیر و حسیں اندمال سے

تم چاہتے ہو عشق کا اظہار میں کروں !
اور دائمی نباہ کا اقرار میں کروں !

خاموشیوں کو نطق کے سانچے میں ڈھال دوں
احساسِ کیفِ ضبط کو دل سے نکال دوں

رسوائی کے خیال پہ چھا جاؤں جھوم کر
ہو جاؤں بے شعور و نظر تم کو چوم کر

لیکن مرے حبیب یہ بالکل محال ہے
کتنا ہوس پرست تمہارا خیال ہے -

طیورِ آوارہ

موت

مترجمہ:۔ شیخ عبدالرحمن

یہ موت نہیں ہے! جو آخری ہچکی میں نطق کی طاقت کو سلب کر جاتی ہے۔
یا ان آنکھوں کو جو ستاروں کو بھی شرماتی ہیں
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک کر دیتی ہے۔
اور گرم جسم کو سرد جسم میں تبدیل کر دیتی ہے۔
سُرخ خون جو ہماری رگوں میں رواں ہے یک دم منجمد ہو جاتا ہے۔
اور غیر فانی روح جسم کو چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوتی ہے!

- - - - - - -

لیکن یہ موت ہے ——
ہمارے رشتہ داروں اور عزیزوں کے مقدس خیالات جو ہماری قبروں کا طواف کرتے ہیں۔ جب قبروں پر آنا چھوڑ دیں۔
جیسے کہ وہ پیشتر اکثر و بیش آیا کرتے تھے۔ جب قبروں پر گھاس لہرائے۔
اور —— دلِ انسان سے ہماری یاد ہی مٹ جائے۔
وہ موت ——— ہے

(تھامس ہڈ)

بھول

از:۔ "پاگل" بریمی

گاؤں سے باہر جو ندی ہے نا سکھی
وہیں تو میں نے دیکھا تھا اُسے
میں کھیت سے لوٹ رہی تھی۔
رات ہوگئی تھی۔ اُس روز
اور چاند نکل چکا تھا۔
وہ وہاں ندی کے کنارے کھڑا ہوا کچھ گا رہا تھا
کیسا اچھا لگتا ہے وہ سکھی
میں بہت دیر تک سنتی رہی
مگر میں تو نہ سمجھ سکی۔ مو...
اور شاید اسی لئے میں کچھ آگے بڑھ آئی۔
اس نے مجھے دیکھ لیا بس
اور بس وہ چپ ہوگیا
اُس نے ایسا کیوں کیا
کاش کہ میں ہی اس وقت تک انتظار کرلیتی جب تک
کہ وہ خود وہاں سے نہ چلا گیا ہوتا
آہ۔ کیا خیال کیا ہوگا اُس نے۔

لمحاتِ انتظار

از:۔ مہرا احمد نواز خاں بھروانہ بی۔ اے۔

موسم سرما کی ایک رات کا پچھلا پہر تھا۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ اندھیرے میں ستیانہ کا خاموش گاؤں اپنے تنگ و طویل کوچوں کے ساتھ اس طرح معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا دیو لمبے لمبے بازو اور ٹانگیں پھیلائے نیند کا لطف لے رہا ہو۔ ہر چہار طرف گیہوں کے وسیع کھیت تھے۔ گویا مارے سردی کے زمین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کہرا اوپر سے نیچے کو گر رہا تھا۔ جیسے آسمان صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنی بیشمار آنکھوں سے نیند کو بھگا کر دور کر رہا ہو۔ اس مہیب سکوت میں کبھی کبھی کسی ٹھٹھرے ہوئے کتے کی کانپتی ہوئی آواز ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کسی ٹوٹے ہوئے ساز کے ایک آخری بچے ہوئے تار کو بھولے سے ہاتھ لگ جائے۔ . . . .

. . . دنیا محوِ خواب تھی۔ خوابیدہ آبادی سے کچھ دور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر میں محوِ خیال تھا —— کل ان کی آمد تھی۔

صبح صادق ہوئی۔ میری امید کی جھلک پھیل کر دن کی روشنی بن گئی۔ پرند چہچہانے لگے۔ دنیا کا شور ظلمت بڑھ گیا۔ جیسے کسی دور جانے والے سوئے ہوئے راہی کو منزل کی یاد اچانک جھنجھوڑ کر بیدار کر دے —— بادل آہستہ آہستہ مشرق کی طرف جا رہے تھے۔
. . . . . . شاید سورج کا استقبال کرنے کے لئے . . . . .

مشرق سے سورج نکلا۔ مسکراتا ہوا۔ اُن کی آمد کا مژدہ لایا تھا۔ دنیا کا ذرہ ذرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ تاریک گوشے روشن ہو گئے۔ میرا انتظار بیتابی میں تبدیل ہوگیا۔ سورج آہستہ آہستہ چڑھنے لگا . . . . .

. . . . دن ڈھلنے لگا دور افق پر سے چلتے ہوئے نقطے سواروں اور پیادوں کی شکل اختیار کرتے ہوئے میرے پاس سے گزر گئے۔ مگر آہ! ... اکو ... گئے ...

... وہ نہ آئے

دن ختم ہونے کو آیا۔ چراگاہ سے واپس ہوتے ہونے جانوروں کی گھنٹیوں کی آواز جنگل کی ہر سمت سنائی دینے لگی۔ ساتھ ہی کبھی کبھی تھکے ہونے چرواہے کے بے معنی راگ کی الاپ اس طرح گونج اٹھتی جیسے خوشی کے چند خیالات کیساتھ کسی جانکاہ صدمے کی یاد ملکر تمام کو بے لطف کردے۔ . . . .

. . . . کوے قطار در قطار اپنے آشیانوں کی طرف اڑے جا رہے تھے . . . . .

وہ نہ آئے . . . . . سورج کا پیغام جھوٹا ثابت ہوا آخر وہ اسی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے دنیا کیطرف پیٹھ کرکے آسمان کے اس پار غروب ہونے کی کوشش کرنے لگا . . . . .

. . . . آسمان پر چند بدلیاں مودار ہوئیں شاید یہ اس کے احساسات تھے۔ یا میری آہوں کے دھوئیں۔

کون؟

از:- "پاگل" پریمی

اکثر تو مجھ سے ایک سوال کرتا ہے کہ "وہ کون ہے"؟
آہ۔ میں کسطرح کہوں محبوب کہ تو
ہاں کوئی مجھے ایسا کہنے سے روک دیتا ہے۔ معلوم کون؟
میں کچھ گھبرا سا جاتا ہوں۔ اُس وقت
میری نگاہیں جھک جاتی ہیں۔
اور چپ چاپ میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔
"میں نہیں جانتا"

دردِ زندگی (قطعہ)

از:- محترمہ ع۔ جہان بیگم آزاد بدایونی

جذب خورشید کو ہے دیدۂ شبنم بے خواب
لہر کی زیست ہے دریا کا غم مہجوری
ہوس گل ہے گرہ دل میں ہر اک غنچے کے
بحر کے شوق میں دریا کی ہے بیتاب روی

زندگی نام ہے محرومیِ پیہم کا ادا
[illegible] تمنائے بہاراں کیسی؟

نظم

دعوت

از:- لالہ جگن ناتھ آزاد بی۔ اے۔

شاعرِ بے قرار کے دل کا قرار بن کے آ
کشتِ اُمید کے لئے ابرِ بہار بن کے آ
دل کے چمن کو آ کے چھیڑ بادِ نسیم کی طرح
اپنا قیام کر یہاں موجِ شمیم کی طرح
میری شریک بن کے آ کارگہِ حیات میں
میری رفیق بن کے رہ عالمِ بے ثبات میں
میرے جہانِ شوق کو محرمِ سوز و ساز کر
کشمکشِ فسردہ سے روح کو بے نیاز کر
نغمۂ شوق بن کے آ عالمِ روح میں اُتر
شعرِ لطیف بن کے چھا میرے دل و دماغ پر
میرے دلِ فسردہ میں ذوق نیا اُبھار کر
میرے نفس نفس کو تو نغمۂ نوبہار کر

میری شریکِ زندگی آ مری کائنات میں
تازہ سرور لے کے آ میری مئے حیات میں

انتخاب

لالہ زار

تیسرے درجے میں ایک سو اسّی میل

شبّر نے کہا صبح میرے ساتھ لائل پور چلو۔ تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد میں نے یہ وعدہ کر لیا کہ اگر وقت پہ آنکھ کھل گئی تو صبح پانچ بجے تک بس کے اڈے پہ پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اگر اس وقت سوتا رہا تو تم اکیلے ہی چلے جانا۔ جب گھر پہنچا تو گھڑی رات کے بارہ بجا رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور چھت پہ جا کر سو رہا۔ اب آنکھ جو کھلی تو کانوں میں "اللہ اکبر" کی صدا آ رہی تھی۔ پڑوس کی مسجد میں مولوی صاحب اذان دے رہے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ اتنی دیر تک کیوں سوتا رہا۔ گھڑی دیکھی تو تعجب ہوا کہ ابھی صرف پونے دو بجے تھے۔ لگا سوچنے کہ پونے دو بجے کس نماز کی اذان ہوتی ہے، لیکن جب مولوی صاحب اذان کے آخری حصے پہ پہنچے تو شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔ اذان نماز فجر کی تھی۔ دوبارہ گھڑی اٹھا کر دیکھی پونے دو کا وقت تھا۔ شک پیدا ہوا کہ کہیں بند ہی نہ ہو گئی ہو۔ لیکن ٹک ٹک کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ آخر میں اسی نتیجہ پہ پہنچا کہ یا تو مولوی صاحب پلا پہ لے درجے کے احمق ہیں یا مجھے صبح ہسپتال جا کر عینک کا نمبر بدلوانے کے علاوہ اپنی سماعت کا علاج کرانا چاہیئے۔ لیکن بہر دست یہی بہتر ہے کہ سو جاؤں۔ مگر اب نیند کہاں؟ دو گھنٹے کی ناکام کوشش کے بعد بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گھڑی چار بجا رہی تھی۔ چنانچہ اتنا اطمینان ہو گیا کہ میری آنکھیں اور کان دونوں اپنے فرائض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا اور گھبرا کر جو اُٹھے تو سوچے سمجھے بغیر کانوں میں انگلیاں دے آذان شروع کر دی۔

اب آنکھ تو وقت سے پہلے کھل چکی تھی۔ اس لئے وعدہ خلافی کی کوئی وجہ جواز نہ تھی لیکن مجھے بس کے سفر پہ سخت اعتراض ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ لاریوں کے حادثے بہت ہوتے ہیں۔ مجھے مرنے میں کچھ زیادہ عذر نہیں۔ آخر زندگی میں امیدوں کی بربادی اور آرزوؤں کی شکست کے سوا رکھا ہی کیا ہے؟ اور پھر شبّر جیسے دوست کے ساتھ مرنے میں (نہ جانے میں نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ اگر میں مرا تو میرا دوست بھی میرے اس نئے سفر میں میرے ساتھ ہوگا) تو مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے عذر تو صرف لنگڑے ہونے میں ہے اور لاری کے سفر میں قدم قدم پہ یہ اندیشہ ہے کہ آپ ہمیشہ کیلئے تیمور کا منہ چڑانے کے قابل ہو جائیں۔ غریب کیلئے ایک ہی بات وجہ تسکین ہے اور وہ یہ کہ ملک خدا کی وسعت کے ساتھ ساتھ "پائے گدا لنگ" نہیں ہے۔ اگر یہ بات بھی نہ رہے تو اس کی زندگی مُردوں سے بدتر ہو جائے۔ امیر لنگڑا ہو تو روپے سے یہ عیب ڈھک جاتا ہے اور روپے سے کونسا عیب خوبی نہیں بن جاتا؟ اگر ایک عیاش امیر کا روپیہ اس کی اخلاق باختگی کے لئے زندہ دلی کا نام ایجاد کر سکتا ہے۔ تو کیا عجب کہ اس کے لنگڑا چلنے میں بھی لوگوں کو فتنہ خرامی نظر آ جائے۔

امارت و غربت کی یہ بحث میرے ذہن میں جاری رہی تھی کہ میں بس کے اڈے پہ جا پہنچا۔ ابھی پانچ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ معلوم ہوا کہ بس پورے پانچ بجے چھوٹتی ہے۔ چونکہ شبّر کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس لئے خود ہی اس پابندیٔ وقت پہ اپنے آپ کو داد دی لیکن پانچ بج گئے۔ اور شبّر ابھی تک غائب۔ بس پانچ منٹ لیٹ ہو گئی۔ یہ پانچ منٹ میرے لئے پانچ گھنٹوں سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ آخر بس چھوٹ گئی اور میں شبّر کی راہ تکتا رہ گیا۔ اپنی حماقت اور اپنے دوست کی ستم ظریفی پہ سخت غصّہ آیا۔ لیکن یہ غصّہ صحیح معنوں میں "قہر درویش برجانِ درویش" کی تفسیر تھا کیونکہ غصّے کا قدرتی ردِّ عمل یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو شبّر کو سزا دی جائے یا باہم دونوں میں لڑائی ہو، سزا دینا میرے بس کی بات نہ تھی اور لڑائی شاید کسی کے بس میں بھی نہ ہو۔ ناچار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ہوسٹل پہنچنا چاہیئے۔ اور شبّر کے کان کھینچنے چاہئیں۔ اگر حضرت اس وقت تک محوِ خواب ہوئے تو لفظی و معنوی دونوں لحاظ سے کان کھینچنے کا موقع مل جائے گا۔

ہوسٹل پہنچا تو حضور سو کر اٹھے ہی تھے اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے۔ میں نے کہا "یہ کیا ستم ظریفی کی تم نے۔" کہنے لگے "ابھی تو پانچ نہیں بجے ہوں گے۔ میں پندرہ منٹ میں تیار ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اب سوا پانچ کا وقت ہے۔ آپ تیار ہوں یا نہ ہوں۔ بس تو اب شیخوپورہ سے پہنچ چکی ہوگی۔" اس کے بعد انہوں نے رسمی معافی مانگی لیکن یہ بھی تکلف ہی کیا کیونکہ میں تو وہیں اڈے پہ ہی انہیں معاف کر گیا تھا۔ طے یہ ہوا کہ ریل سے چلیں۔ ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی [illegible]

پڑھتی ہے۔ چائے پیتے بیٹھے تو مظفر صاحب نے کہا "جناب پیٹ بھر کر کھا لیجئے۔ خواجہ صاحب کے ساتھ جا رہے ہیں اور سارا راستہ کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔" لیکن میں نے اس انتباہ پر کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔

تانگہ اسٹیشن کے قریب پہنچا تو کوچوان نے پوچھا "کس درجے کی طرف لے جاؤں؟" خیر نے مجھ سے کہا کہ "انٹر میں چلو گے یا تھرڈ میں؟" میں نے کہا "مجھے تو ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں" اور یہ سچ بھی تھا۔ ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے کے کارنامے میں بارہا سر انجام دے چکا ہوں۔ ان میں سے دو سفر تو مجھے عمر بھر نہیں بھولیں گے۔ ایک بار تو انوار کے ساتھ الہ آباد سے لے کر کلکتہ تک ٹکٹ کے بغیر گئے۔ یہ حضرت اب سول سروس میں ہیں اور خدا جانے کتنے لوگوں کو اس قسم کے "لغزش" جرائم کی پاداش میں جیل بھیج چکے۔ اس سفر میں مجھے پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ کیونکہ انوار اس فن لطیف میں میرے بھی استاد تھے۔ دوسرا سفر علی گڑھ سے لیکر دہلی تک سری کرشن صاحب کے ساتھ کیا۔ میں نے علی گڑھ سے چلتے وقت انہیں ٹکٹ لانے کو روپے دئے لیکن یہ خالی ہاتھ واپس آگئے اور کہنے لگے کہ [illegible] کی خاطر ٹکٹ نہیں خریدا۔ مجھے بھلا اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ میں نے کہا اچھا کیا۔ لیکن گاڑی چلی تو سری کرشن صاحب مضطرب نظر آنے لگے۔ بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک ٹی ٹی کو بھی گاڑی میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے ان کی پریشانی دیکھ کر کہا "سری کرشن! اب گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے بیٹھے رہو" لیکن اس بیچارے کا غالباً پہلا جرم (اس قسم کا) اطمینان کہاں سے آتا۔ کبھی اٹھتے ہیں کبھی بیٹھتے ہیں۔ گاڑی اگلے اسٹیشن پر جاکر رکی تو یہ غڑاپ سے باہر۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے کہا "حضرت! یہاں آکر آرام سے بیٹھ جائیے۔ ورنہ میں خود جاکر ٹی ٹی بلا لاؤں گا۔" اس وقت تو انہوں نے میرا کہا مان لیا۔ لیکن گاڑی چلی تو ان کی حالت پھر متغیر ہونے لگی۔ میں نے کہا "آخر بنیے ہی نکلے نا۔ اسی جرأت پر تم رام راجیہ کے خواب دیکھ رہے ہو؟" اس طنز نے کام کیا اور سری کرشن صاحب تن کر بیٹھ گئے لیکن گاڑی رکتے ہی پلیٹ فارم پر کود گئے۔ میں نے سوچا اس شخص کو سمجھانا بیکار ہے۔ لیکن سری کرشن صاحب کی یہ ساری اچھل کود رائیگاں ثابت ہوئی۔ غازی آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی ہی تھی کہ ٹی ٹی ہمارے ڈبے میں گھس آیا۔ اس نے ٹکٹ مانگا تو میں نے کہا "آپ تشریف تو رکھئے۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنی ہے۔" وہ حیران ہوا کہ مجھ سے انہیں کیا کام ہے۔ بولا "فرمائیے" میں [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔ ہم تو بڑی دیر سے آپ کی راہ تک رہے تھے۔ ذرا تشریف تو رکھئے" اب وہ سمجھا کہ کالج کے لڑکے ہیں اور مذاق کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا نرمی سے بولا "صاحب! تنگ نہ کیجئے اور ٹکٹ دکھا دیجئے"۔ میں نے کہا "ٹکٹ تو نہیں ہے" وہ کہنے لگا "یہ ہے تو ضرور مگر آپ مذاق کرنا چاہتے ہیں" میں نے کہا "مذاق کرنے والا کافر۔ ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہے" ٹی ٹی یو۔ پی کا رہنے والا مسلمان تھا۔ کہنے لگا "واللہ آپ کے پاس ٹکٹ ہے اور آپ مذاق کر رہے ہیں" میں نے کہا "واللہ ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہے اور ہم بالکل سچ عرض کر رہے ہیں۔" اس ڈبے میں ہم سب لڑکے ہی بیٹھے تھے۔ دہلی تک واللہ کی یہ گردان جاری رہی۔ ادھر ٹی ٹی صاحب کہہ رہے ہیں کہ "واللہ آپ کے پاس ٹکٹ ہے" ادھر ہم سب مل کر سوائے کرشن صاحب کے، چلا رہے ہیں کہ "واللہ ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہے"۔ گاڑی دہلی رکی تو ٹی ٹی صاحب نے بھی ہمارا پیچھا چھوڑ دیا۔ وہ بھلا مانس آج تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوگا کہ ہمارے پاس ٹکٹ تھے اور ہم محض اسے تنگ کرنے کی خاطر دکھانے سے انکار کر رہے تھے۔ دہلی پہنچ کر سری کرشن صاحب کی جان میں جان آئی۔ کیونکہ دہلی سے لاہور تک کا واپسی ٹکٹ ہمارے پاس تھا۔ ورنہ دہلی تک ان کا چہرہ مرجھایا رہا اور رنگ تو — اڑنے سے پہلے بھی زرد تھا!

بات کہاں کی کہاں جا پہنچی۔ شبر نے انٹر کے دو ٹکٹ خریدے۔ میں نے کرایہ پوچھا۔ ایک ٹکٹ کے دو روپے چھ آنے سن کر سخت غصہ آیا۔ لاہور سے لائل پور تک کا تھرڈ کا کرایہ صرف چودہ آنے ہے۔ میں نے کہا "بھائی جان! یہ تین روپے مفت میں ضائع جا رہے ہیں۔ تھرڈ اور انٹر میں فرق ہی کیا ہے؟" یہ دونوں ٹکٹ واپس کئے اور ایک روپیہ بارہ آنے دے کر تھرڈ کے دو ٹکٹ لئے۔ دروازے پر جو ٹکٹ کلکٹر صاحب کھڑے تھے، ان سے پوچھا "لائل پور جانے والی گاڑی کس نمبر پر ہوگی؟" کہنے لگے "نمبر ۴ پر چلے جائیے" گاڑی میں بیٹھنے لگے تو شبر نے کہا "گارڈ سے پوچھ تو لیں کہ لائل پور کب پہنچے گی" یہ گارڈ صاحب بھی اس قابل تھے کہ کسی عجائب گھر میں رکھے جاتے۔ کہنے کو گارڈ اور وہ بھی ایک معمولی سی میل فی گھنٹہ چلنے والی پسنجر گاڑی کے، لیکن بولتے اس شان سے تھے گویا ہندوستان میں گستاپو کے انچارج لگے ہوئے ہیں۔ بڑی رعونت سے فرمایا "یہ گاڑی لائل پور نہیں جاتی" سہم کر پوچھا "پھر لائل پور جانے والی گاڑی کس پلیٹ فارم پر ملے گی؟" حکم ملا "نمبر ۹ پر جاؤ" نمبر ۹ پہنچے تو گاڑی تیار کھڑی تھی۔ مگر اسے لائل پور کی بجائے راولپنڈی جانا تھا۔ سخت تعجب ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ ایک بابو صاحب پلیٹ فارم پر ٹہل رہے

تھے۔ انہیں سلام کیا اور کہا "جڑانوالے کے رستے لائل پور جانا ہے۔ گاڑی کب چلتی ہے اور کس پلیٹ فارم سے چلتی ہے؟" انہوں نے جیب سے ایک چھوٹی پرانی نوٹ بک نکالی اور عینک کو ناک پر جماتے ہوئے بولے "۹ بج کر دس منٹ۔ نمبر ۳" میں نے کہا "وہاں سے تو ہم آ رہے ہیں۔ گارڈ کہتا ہے کہ یہ گاڑی لائل پور نہیں جائے گی۔" بابو صاحب نے ایک "ہونہہ" کہا اور اپنی نوٹ بک پر نظر دوڑاتے ہوئے کہنے لگے "دس بجے جائے گی نمبر ۹ سے۔" میں نے کہا "ہم سانگلا کے راستے نہیں جانا چاہتے جڑانوالہ کے رستے بتائیے"۔ آپ پھر نوٹ بک پر جھکے اور فرمانے لگے: "۹ بج کر ۴۰ منٹ نمبر ۳" اور اس کے بعد ہمارے شکریہ کا انتظار کئے بغیر چل دئے۔ میں نے شبر سے کہا "یک بام و دو ہوا تو سُنا تھا یہ 'یک بابو سہ آرا' بھی دیکھ لیجئے۔ ایک قلی سے پوچھا کہ "کبھی لائل پور جانے والی گاڑی کب ملے گی" وہ بولا "نمبر ۴ پر کھڑی ہے اور اب چھوٹنے والی ہے۔" دوڑ کر وہاں پہنچے۔ گاڑی وسل دے چکی تھی اور ہم نے ڈبے میں قدم رکھا ہی تھا کہ چل پڑی۔ شبر نے کہا "اور اگر یہ گاڑی لائل پور نہ جاتی ہو؟" میں نے کہا "خواہ یہ جہنم میں جاتی ہو۔ اب تو اس میں بیٹھ گئے۔"

شاہدرہ گاڑی رُکی تو شبر نے کہا کہ گارڈ سے ایک دفعہ پھر پوچھ لینا چاہئیے۔ میں نے کہا کہ بیٹھے رہو۔ لیکن وہ دوڑ کر ایک ٹکٹ کلکٹر کے پاس جا پہنچے۔ اس نے کہا "میں گارڈ سے پوچھ کر بتاتا ہوں" گارڈ سے پوچھا تو وہ اپنے مخصوص فوجی اور فرعونی انداز میں بولا "یہ تو مجھ سے کوئی چھ دن مرتبہ پوچھ چکے ہیں۔ یہ گاڑی بالکل لائل پور نہیں جائے گی" مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر ہی کھڑے رہ گئے اور گاڑی چل دی۔ اب ریلوے ٹائم ٹیبل لے کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ گاڑی واقعی لائل پور جاتی ہے اور گارڈ محض اخلاق ہی نہیں بلکہ حواس بھی کھوئے بیٹھا تھا۔ میں نے شبر سے کہا "نہ جانے آج صبح صبح کس منحوس کا منہ دیکھا ہے۔" انہوں نے کہا "کم از کم میں نے تو سب سے پہلے تمہارا ہی منہ دیکھا ہے۔" بات بھی ٹھیک تھی۔ اسی لئے میں نے اس قصّے کو یہیں ختم کرنا مناسب سمجھا۔

دوسری گاڑی پورے ایک گھنٹے کے بعد آئی لیکن اب اتنا یقین ضرور تھا کہ یہ گاڑی لائل پور ہی جائے گی۔ میں نے شبر سے کہا "آج تو تم دیہاتی عورتوں کو بھی مات کر گئے۔ سفر میں اس بدحواسی کا ثبوت تو وہ بھی نہیں دیتیں۔" لیکن انہیں اصرار تھا کہ غلطی ساری گارڈ کی ہے اور اس طرح گاڑی سے رہ جانے میں بھی ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت ہو گی۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس طرح ایک گھنٹہ تک شاہدرہ کے اسٹیشن پر مارے مارے پھرنے میں کونسی مصلحتِ خداوندی پوشیدہ تھی۔

گرمی کا موسم، تھرڈ کلاس کا ڈبہ اور لائل پور کا سفر۔ مجھے اشتراکیت کے خلاف جو تحفظات تھے بہت اعتراض تھے پندرہ ہی منٹ میں دور ہو گئے۔ ریلوے ایک تجارتی اور کاروباری محکمہ ہے اور اسے امارت و افلاس کے امتیاز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گاہکوں کی سہولت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جس درجے میں زیادہ لوگ بیٹھتے ہیں اور جس سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے، اسے زیادہ آرام دہ بنانا چاہیئے تھا۔ یا کم از کم اتنی سہولتیں تو بہم پہنچانی چاہئیے تھیں کہ مسافر کو اپنے سفر پر جہنم کا شبہ نہ ہو لیکن تیسرے درجے میں نہ پانی کا انتظام ہے، نہ ہوا کا۔ تختے ہیں کہ گرمی کی شدت سے تپ رہے ہیں اور ان پر بیٹھنا ناممکن ہے۔ اس کے باوجود سارے ڈبے مسافروں سے بھرے پڑے ہیں۔ دوسری طرف پہلے اور دوسرے درجے ہیں جن میں سفر کرنے والے عام طور پر بغیر ٹکٹ کے ہوتے ہیں۔ یا وہ سرکاری افسر سفر کرتے ہیں، جنہیں پاس ملتا ہے۔ ورنہ جن افسروں کو ٹکٹ لینا ہوتا ہے وہ اوّل تو یہ تکلّف گوارا ہی نہیں کرتے۔ اور اگر ٹکٹ خرید بھی لیں تو سرکار سے فسٹ کا کرایہ وصول کرتے ہیں اور بیٹھتے سیکنڈ میں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں درجوں میں ریلوے کی طرف سے تمام آرام اور سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ وجہ وہی غریب اور امیر کا فرق۔ غریب اٹھارہ گھنٹے محنتِ شاقہ کرے اور اس کے باوجود اس کے بیوی بچے رات کو بھوکے سوئیں۔ امیر سات مہینے لاہور میں اور پانچ مہینے شملہ میں دادِ عشرت دیتا رہے لیکن بنک میں اس کے حساب میں ہمیشہ پانچ سات لاکھ جمع ہی رہیں اور اس کی دلکش جبیں پر بھی حرف نہ آنے پائے۔ مزارع مجبوری سے وقت پر لگان نہ ادا کر سکے تو کڑاکے کی سردی میں اس کا اشتراکی آقا اس کی حاملہ بیوی سمیت اسے اس کی جھونپڑی سے نکال سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک اخبار کا مالک بارہ روپے ماہوار کے چپراسی کی چھ مہینے کی تنخواہ دبائے رکھے تو اسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں کیونکہ چپراسی مزدور ہے اور وہ سرمایہ دار۔ اور اس کے علاوہ وزیروں کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنے کے فن میں ماہر۔ اور جسے اس فن میں دستگاہ حاصل ہو اسے ہر چیز معاف ہے۔

شیخو پورہ سے ایک لڑکا ہمارے ڈبے میں [illegible]

اس سے نام پوچھا۔ "کام کیا کرتے ہو؟" کہنے لگا۔ "پھل بیچتا ہوں۔ تین دکانیں ہیں۔ بڑی بھاری۔ کبھی شیخوپورہ آؤ تو دکھاؤں۔" میں نے شبتر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ بھی پھل بیچتے ہیں۔" لڑکے نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا۔ میں نے شبتر سے انگریزی میں کہا۔ "تمہارا ہم پیشہ بھائی ہے۔ تم پھل پیدا کرتے ہو۔ یہ بیچتا ہے۔ فرق تو کچھ زیادہ نہیں۔" شبتر نے فیروز کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کی اور اب جو اس لڑکے نے باتیں شروع کیں تو چپ ہونے ہی میں نہیں آتا۔ پہلے تو اپنی دکانوں کا حال بتلایا۔ پھر آپ بیتی کا آغاز ہوا۔ اپنے چچا کے پیار کے افسانے سنائے اپنی دوست نوازی کی داستانیں کہیں۔ پھر جیب سے ایک لمبا چوڑا کاغذ نکالا اور شبتر سے کہنے لگا۔ "اسے پڑھو۔" انہوں نے کہا۔ "میں تو اردو نہیں جانتا۔" میں نے فیروز کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔ یہ ایک نامۂ عشق تھا جو غالباً "محبوب بک ڈپو کی کتاب" عاشقانہ خط و کتابت" کی مدد سے لکھا گیا تھا۔ میں خط پڑھ چکا تو فیروز مسرے پوچھے بغیر فخریہ لہجہ میں کہنے لگا۔ "میں نے لکھا ہے۔" یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ خط اسی قسم کے کسی احمق نے لکھا ہے۔ لیکن یہ امید نہ تھی کہ پندرہ سولہ سال کا یہ لڑکا اس خط کا مجنوں ہوگا۔ میں نے کہا۔ "تمہاری عمر کیا ہے؟" بولا "سولہ سال۔" شبتر نے کہا۔ "غلط کہتا ہے چودہ سال کا ہوگا۔" انہوں نے ہم دونوں پر اپنی ڈاکٹری کا رعب جمایا اور اس کے دانت وغیرہ دیکھ کے فتویٰ دیا کہ اس کی عمر چودہ سال سے زیادہ کسی صورت میں بھی نہیں۔ لیکن فیروز ان کی ڈاکٹری کو کب مانتا تھا؟ دراصل وہ تو انہیں پھل بیچنے والا ہی سمجھے بیٹھا تھا۔ تنک کر بولا۔ "میری عمر پورے سولہ سال کی ہے۔ یقین نہ آئے تو جب شیخوپورہ آؤ گے میرے چچا سے پوچھ لینا۔" بات یہ تھی کہ دونوں پھل بیچنے والوں میں دوستی کی بات طے ہو چکی تھی۔ اس نے شبتر کو شیخوپورہ آنے کی دعوت دی تھی اور انہوں نے قبول بھی کر لی تھی۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارے پاس ہی نوکر ہو جاؤ۔ پانچ روپے تنخواہ ملے گی اور روٹی کپڑا مفت ہے۔ پھر میں نے اس سے کہا۔ "یہ خط کسے لکھا ہے؟" کہنے لگا۔ "دو لڑکیاں ہیں۔ دونوں بہنیں ہیں۔ میں ان سے عشق کرتا ہوں۔" یہ عجیب بیک وقت دو بہنوں سے عشق کا دعویٰ! ہم حیران ہی تو رہ گئے۔ ... اس تعجب پر تعجب ہوا اور کہنے لگا۔ "میں تو اور بھی ... کئی بڑی لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر۔" میں نے کہا۔ "یہ ... عاشق مزاج ہیں۔ لیکن ان کی قدر تو کوئی لڑکی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔" فیروز چمک کر بولا۔ "تو میرے ساتھ چلیں نا شیخوپورے۔ جس لڑکی کی طرف ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لوں ان کے قدموں میں نہ آ بیٹھے تو فیروز نام نہیں۔ بڑی لڑکیاں ہاتھ میں ہیں۔ دو لڑکیاں درزی ہیں۔ ایک نائن کی لڑکی ہے۔ ایک چنگڑی بڑی نخرے والی تھی۔ مگر میں نے ایسا جادو کیا ہے کہ اب ہر وقت میرا نام جپتی رہتی ہے۔" مجھے اس لڑکے کی یہ خود فریبی پر بڑی ہنسی آئی۔ پونے چار فٹ کا قد۔ میرے جیسا آدمی بھی چاہے تو کھڑکی سے اٹھا کر پھینک دے لیکن اپنے معاشقے اس فخر سے بیان کرتا ہے کہ بائرن کی روح بھی قبر میں تڑپ رہی ہوگی۔ میں نے کہا۔ "آخر لڑکیاں تم پر اسقدر مرتی کیوں ہیں؟" مسکرا کر بولا۔ "بس ایسے ہی۔" شبتر نے کہا۔ "آخر کوئی بات تو ہوگی۔" فیروز نے جواب دیا۔ "بات تو ہے۔ ہر کسی پہ لڑکیاں نہیں مرا کرتیں۔" میں نے کہا۔ "پھر تمہارے پاس ضرور کوئی تعویذ ہوگا۔ اپنے دوست کو دے دو۔ اس غریب کی بھی مراد بر آئے۔" کہنے لگا۔ "ان پر تو جان بھی قربان ہے۔ میری یاری ایسی ویسی نہیں ہوتی۔" شبتر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فیروز سے کہا۔ "مجھے تو یہ تعویذ نہیں چاہیئے۔ انہیں دو۔ آجکل انہیں اس قسم کے تعویذوں کی بڑی ضرورت ہے۔" اس لڑکے کو سانگلے اترنا تھا۔ میں نے شبتر سے انگریزی میں کہا "یہ شیطان مجھے جانتا ہے، اور اگر کہیں سانگلے میں اس نے مجھے اس قسم کا "تعویذ حُب" پیش کر دیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ اس لئے تم میرا نام نہ لو۔" لیکن اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ شبتر نے فیروز پر اور زیادہ زور دینا شروع کیا کہ تعویذ انہیں ضرور دینا۔ آخر بڑی مشکل سے میں نے اس سے پیچھا چھڑایا۔ سانگلے کا سٹیشن آیا تو فیروز نے دوبارہ شبتر سے یہ وعدہ لیا کہ شام کو یہ شیخوپورہ آئیں گے۔ وہ وہیں اتر گیا اور ہم دونوں کافی دیر تک سوچتے رہے کہ ہم تو تیئس چوبیس برس کی عمر تک ایک جگہ بھی عشق نہ کر سکے! اور یہ شیطان درزنوں، نائنوں اور چنگڑیوں کا ذکر اس انداز میں کرتا تھا گویا مرغیاں ہیں۔ جب جی چاہا ڈربے سے نکال لیں اور جب جی چاہا بند کر دیں۔

دو بجے لائل پور پہنچے۔ پہلے ارادہ تھا کہ اسٹیشن پر کھانا کھائیں گے لیکن لائل پور پہنچنے تک بھوک بالکل مٹ چکی تھی اور صرف پیاس ہی پیاس باقی رہ گئی تھی۔ مجھے والد مرحوم کے ایک پرانے دوست کی خدمت میں حاضر ہونا تھا۔ اس لئے شبتر نے مجھے تو وہاں چھوڑا اور خود زراعتی کالج میں فروٹ سپیشلسٹ سے ملنے چلے گئے۔ سب سے پہلا سوال مجھ سے

یہی کیا گیا کہ کھانا کھاؤ گے یا نہیں؟ میں نے کہا "کھانا تو ہم کھا چکے ہیں"۔ یہ جھوٹ صحیح معنوں میں گناہِ بے لذت تھا۔ بعد میں احساس ہوا کہ ایک تو جھوٹ بولنا اور دوسرے بھوکوں مرنا سراسر ایک احمقانہ فعل ہے۔ میرا خیال تھا کہ شبّر کو زراعتی کالج میں کافی دیر لگے گی۔ مگر حضرت ٹھیک ساڑھے چار بجے آ پہنچے اور آتے ہی کہنے لگے "اٹھو اب واپس چلیں"۔ صاحبِ خانہ تو موجود نہ تھے۔ ان کے صاحبزادے سے اجازت لی اور لائل پور کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ تانگے میں بیٹھے بیٹھے یہ طے کیا تھا کہ اسٹیشن پر پہنچ کر چائے پئیں گے۔ لیکن ریفریشمنٹ روم ڈھونڈتے ڈھونڈتے گاڑی کے چلنے کا وقت ہو گیا اور ہم چائے پیئے بغیر تھرڈ کے ایک ڈبے میں جا بیٹھے۔

واپسی کا سفر بے حد سوہانِ روح تھا۔ سارا رستہ ناقابلِ برداشت لُو چلتی رہی۔ مجھے بے حد پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن پینے کا پانی ندارد یا تو سوڈا ملتا تھا یا غلیظ بالٹیوں میں کھولتا ہوا ہندو اور مسلمان پانی۔ سوڈا میں پیا نہیں کرتا اور مسلمان پانی اس قابل ہی نہ تھا کہ پیا جائے۔ شیخوپورہ پہنچ کر ایک سٹال پر شربت پیا اور ذرا اطمینان ہوا۔ لیکن گرمی کی شدت، بھوک پیاس اور کئی گھنٹے کے مسلسل سفر سے میں اسقدر تھک گیا تھا کہ اپنے آپ سے بیزار تھا۔ میں نے شبّر سے کہا "جی چاہتا ہے کہ ریل پر سے کود جاؤں"۔ دروازہ کھولتے ہوئے ارشاد فرمایا "بسم اللہ کیجئے"۔ میں نے کہا "تم بھی ساتھ دو گے؟" کہنے لگے "مجھے تو ابھی دنیا میں بہت کام کرنا ہے"۔ کام تو مجھے بھی بہت سے کرنے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے تو گھر پہنچ کر غسل کرنا تھا۔ پھر کھانا کھانا تھا اور اس کے بعد سونا اور پھر دوسرے دن ——— اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال واصل بحق ہونے کے ارادے کو ملتوی کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ میں نے شبّر تک یوں پہنچایا کہ میرا ساتھ دو تو ابھی چھلانگ لگاتا ہوں۔ ورنہ انگریز شاعر کے الفاظ میں I can not play alone

اس ڈبے میں تین بنئے بھی بیٹھے تھے۔ یہ لوگ چک جھمرہ کے اسٹیشن پر اُتر گئے۔ لیکن اپنا پیتل کا بڑا سا برتن وہیں بھول گئے۔ اسی ڈبے میں ایک مولوی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ حاجی معلوم ہوتے تھے۔ اثنائے سفر میں وقت کا زیادہ حصہ انہوں نے بیت الخلا میں کاٹا۔ وہاں سے باہر نکلتے تھے تو نماز شروع کر دیتے تھے اور نماز سے فارغ ہوتے تھے تو مٹی کا لوٹا لے کر پھر وہیں گھس جاتے تھے۔ گاڑی لاہور پہنچنے لگی تو شبّر نے مجھ سے کہا "یہ برتن حاجی صاحب لے جائیں گے"۔ میں نے کہا "کیوں مسلمان کے متعلق سوءِ ظن سے کام لے رہے ہو"۔ وہ کہنے لگے "تم خود دیکھ لو گے کہ میں غلط کہہ رہا ہوں یا درست"۔ گاڑی لاہور پہنچی تو معلوم ہوا کہ شبّر نے مولوی صاحب کو خوب سمجھا تھا۔ حضرت قبلہ کے ایک ہاتھ میں مصلےٰ اور بستر تھا اور دوسرے میں وہی برتن اس شان سے اٹھائے ہوئے تھے گویا جہاد کے بعد مالِ غنیمت حصے میں آیا ہے۔ مولوی صاحب کی اس حرکت پر تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ پھر سوچا کہ ان باتوں پر کڑھنا بیکار ہے۔ مولوی صاحب نے تو ایک بنئے کا برتن ہی اڑایا ہے ہمارے مولوی اور لیڈر تو پوری قوم کو بغل میں دبائے پھرتے ہیں اور جہاں اچھے دام ملنے کی امید ہوتی ہے بیچ ڈالتے ہیں۔

آٹھ بجے لاہور پہنچے۔ گیارہ گھنٹے میں ایک سو اسی میل کا سفر کیا۔ تیسرے درجے کے بنچوں کی نوازش سے سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ بھوک اب بالکل مٹ چکی تھی۔ دو چار گھنٹے اور گاڑی میں رہتے تو شاید پیاس بھی باقی نہ رہتی۔ کھانا اگرچہ اپنی مرضی سے نہ کھایا تھا اور ایک جگہ جان بوجھ کر رد کیا مگر معظم صاحب کی یہ پیشن گوئی کہ "خواجہ صاحب کے ساتھ جا رہے ہو۔ سارا رستہ کھانے کو کچھ نہیں ملے گا" بہرحال پوری ہوئی۔

از ہمایوں

اے تیز رو ہواؤ ———!

از:۔ انجم رومانی

اے تیز رو ہواؤ! لے جاؤ یہ گھٹائیں!

تاروں کی انجمن میں میری نگاہیں جائیں
اور ان سے چھین کر کچھ سرمستیاں سی لائیں
جن سے اک ایسی دنیا دل میں مرے بسائیں
خوابوں کے جس میں منظر ہر سمت لہلہائیں

لہرائے رنگیں جس میں سلمیٰ کے مسکرائیں
جنت کی بھی بہاریں جس پر کہ رشک کھائیں
اور مست مست نغمے مستی میں گنگنائیں
وہ میٹھے میٹھے نغمے جو دل کو گدگدائیں
باغِ ارم سے جن کے سننے کو حوریں آئیں!

اے تیز رو ہواؤ! لے جاؤ یہ گھٹائیں!
[illegible]

مطبوعاتِ جدیدہ

شعرائے عثمانیہ } مجلد۔ صفحات ۲۲۲۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ عمدہ۔

مرتب سید معین الدین قریشی ایم۔ اے (عثمانیہ) اور عبدالعظیم خاں باقی ایم۔ اے ریسرچ اسکالر (عثمانیہ) قیمت دو روپے بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد (حیدرآباد دکن)،

یہ دراصل مرقع سخن کی چوتھی جلد کا نام ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے چھبیس فارغ التحصیل شعراء کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ پہلی تین جلدوں میں شعرائے دور آصفیہ کے تحقیقی اور تنقیدی حالات ہیں لیکن اس جلد میں کسی شاعر کے حالات زندگی سے متعلق کوئی نوٹ نہیں دیا گیا۔ البتہ دو دو چار چار سطروں میں ان کے خصوصیات کلام پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر شاعر کے کلام میں سے اوسطاً دس نظمیں اور پانچ غزلیں پیش کی گئی ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے ان کے ذاتی رجحانات۔ ذہنی وفکری کمالات اور خصوصیات کلام کا خود اندازہ لگا سکیں۔ شعرا میں بعض تو ایسے ہیں جن کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جو اپنی حیات مصروف کی دوسری نوعیات میں کھو کر یا تو شعر گوئی کم کر چکے ہیں یا بالکل چھوڑ چکے ہیں۔ اگر اس مجموعے میں ایک محدود رقبے کے شعرا لینے مقصود نہ ہوتے تو شاید انتخاب کا معیار کچھ اور بلند ہوتا اور ان میں سے چند ایک اس میں جگہ نہ پا سکتے۔ بہرحال موجودہ صورت میں شعراء کے خیالات اگرچہ مختلف ہیں۔ نظموں کے عنوان الگ الگ ہیں۔ ہر ایک کی طرز ادا جدا جدا ہے۔ پھر بھی کلام کی یکسانیت اور ہم آہنگی غمازی کرتی ہے کہ وہ ایک ہی ماحول کی پیداوار ہیں۔ ان کے پیچھے ایک ہی روح کارفرما ہے اور وہ روح شباب ہے۔ جوانی کے جذبات اور شباب کے ولولے شعریت کے لباس میں رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ قدیم و جدید علوم اور ادب و آرٹ کے مطالعے سے ان کے دماغ مالامال دکھائی دیتے ہیں۔ اور طبیعتوں کا ابھار ایک خوشگوار مستقبل کا پتہ دیتا ہے اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ جامعۂ عثمانیہ نے اردو زبان کو [illegible] دے کر فکر و نظر کے لئے نئی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ [illegible] کہ جیسا کہ اس کے مرتبین نے لکھا ہے ایک قسم کی ادبی یادداشت سمجھنا چاہیئے جس میں آئندہ کام کرنے والے بہت کچھ اضافہ کر سکتے اور اسے ایک مستقل تاریخی یادگار بنا کر جامعہ عثمانیہ کا نام زندہ رکھ سکتے ہیں۔

افی جے نیا } مجلد۔ صفحات ۸۷۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$۔ کاغذ۔ لکھائی چھپائی گوارا۔ قیمت دس آنے مترجم ابوالقلم دبیر۔

ملنے کا پتہ :۔ ابوالقلم دبیر۔ محبوب پورہ حیدرآباد دکن۔

یہ جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے ایک ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل ڈراما فاؤسٹ کے بعد یورپ میں سب سے زیادہ مقبول ڈراما شمار کیا جاتا ہے۔ اور یورپ کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ بیحد دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نثر ترجمہ میں اگرچہ وہ شاعرانہ محاسن اور نزاکتیں پیدا نہیں ہو سکیں۔ جو اصل ڈرامے میں ہیں۔ تاہم ترجمہ بھی غنیمت ہے۔ مترجم کا فوٹو بھی شریک کتاب ہے۔

حور } یہ حسین رسالہ جس کے لئے ع
عروسِ جمیل و لباسِ حریر

استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نیا نیا لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کے ادارۂ تحریر میں بعض مشہور قلمکار خواتین کے نام نظر آتے ہیں۔ رسالے کی مالک اور مدیرۂ خاص کشیدہ و دستکاری کی مشہور زمانہ ماہر محترمہ امۃ اللہ قریشی ہیں۔ دوسرے شریک کار خواتین شاعرِ شہیر محترمہ زیب عثمانیہ لدھیانوی اور محترمہ جہاں بانو نقوی ایم۔ اے حیدرآبادی ہیں۔

رسالے کا اصلی مقصد دستکاری سے بحث کرنا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں 'حور' جن خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے وہ اسی تک محدود ہیں۔ دستکاری کے علاوہ ادبی اور اخلاقی و تاریخی مضامین کا معیار بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے مشہور مضمون نگار خواتین اور اصحاب کے نام اس کی بلند پائگی کے ضامن ہیں۔ جو نمبر ہمارے پیش نظر ہے خصوصیت کے ساتھ دستکاری کے متعدد دلکش و حسین نمونے پیش کرتا ہے۔ اور "دستکاری نمبر" کے نام سے موسوم ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد نسوانی پرچوں میں ایک قابلِ رشک مقام حاصل کرے گا۔ ہم "شاہکار" کی ناظرات سے اس کی خریداری کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ چندہ سالانہ چار روپے ہے۔

ملنے کا پتہ : مینجر رسالہ "حور" اللہ یار اسٹریٹ۔ برانڈرتھ روڈ لاہور۔

PUBLISHED UNDER THE SUPERVISION OF

Vol. 12 THE "URDU MARKAZ," LAHORE

MASTER PIEC

India's Foremost Illustrated Literary & Educational Month

December 1940

Editor :
AkhtarSheerani

Subscription :
Annual Rupees
Per copy :
Annas

جلد ۱۲ فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۵

راحسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس بیرون بھاٹی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار محمدی منزل واقع [illegible] سے شائع کیا

صفحۂ اختر

اعتذار

ہمیں جہاں اس بات پر افسوس ہے کہ بوجوہ ناگزیر شاہکار اس مرتبہ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ وہاں مسرت کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ آئندہ پرچہ وقت پر بلکہ وقت سے بھی پہلے آپ کی نگاہ و لطف سے خراج تحسین حاصل کرنے کے قابل ہوگا۔ خیر اشاعت اگر بروقت اشاعت کا باعث بن جائے تو باعث [illegible] ہے۔

سیاسی مضامین

زیر نظر اشاعت میں آپ کو سیاسی مضامین کثرت سے نظر آئیں گے۔ اس کی وجہ موجودہ عالمگیر جنگ کا وحشیانہ دور دورہ ہے۔ [illegible] ہر ایک قوم اس وقت اپنے ہر گونہ مستقبل اور اس کی بہبود کے متعلق بلا واسطہ یا بالواسطہ اپنی مساعی میں منہمک ہے۔ اور ادبیات کا مذاق فراموش کر چکی ہے۔ ہم بھی اپنے ملک کے سیاسی مستقبل کی طرف سے بہت کچھ سیاسی اور انقلابی امکانات کی اُمید رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمارا لازمی فرض ہونا چاہئے کہ سیاسیات کی طرف ابھی امکانی توجہ کو وسیع کریں۔

اُردو زبان پر حامیان ہندی کے عام حملے

اس عنوان سے ہم ایک جدید سلسلۂ مضامین کی اشاعت کا آغاز کر رہے ہیں جس کا مقصد اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ دنیا کے دوسرے اہم تمدنی اور سیاسی انقلابوں کی طرح ہمارا ملک بھی بہت سی ادبی اور بین الملکی انقلابی تحریکوں سے دوچار ہے۔ سب سے بڑی تحریک کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی چپقلش ہے جس کے ایک بڑے حصے کا باعث بحث موضوع ہماری ملکی زبان اس دور کا خاص مسئلہ ہے۔ مضمون نگار کے خیالات اور آئندہ شائع ہونے والے مضامین کی توقع کی طرف اپنے ناظرین اور ناظرات کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

بعض بزرگ شعرا کا کلام

اسے ہم شاہکار کا حسن تقدیر سمجھتے ہیں کہ اسے اردو دنیا کے ممتاز ترین ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔

اس کا ثبوت جہاں پرچے کے دوسرے مشاہیر اہل قلم کے کارنامے گرامی سے ملے گا۔ وہاں ہمارے محترم بزرگ خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر پنڈت ترلوک چند محروم اور (خدا بخشے) افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی کے نام دلی توجہ اور کشش کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔

روگ کا راگ

جیسا کہ نظم کے آغاز میں ظاہر کیا گیا ہے اس گیت کا تعلق ہمارے ایک غیر مطبوعہ ڈرامے سے ہے جس میں ایک دوشیزہ کے منہ سے یہ گیت ادا کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ صرف انہی سادہ مگر رنگین احساسات کا اظہار کیا جائے جو آغاز محبت میں ایک حسن اور خلوص مندی دوشیزہ کے دل میں پرورش پا سکتے ہیں۔ ہندی ٹھمریاں اور دوہے اس رنگ کی قیامت انگیز مثالیں پیش کرتے ہیں مگر اردو بڑی حد تک ان معصومانہ جذبوں سے کماحقہ عہدہ برآ نہ ہو سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس رائے کے اظہار میں شاید حق بجانب ہوں کہ اردو ہندی کی موجودہ آویزش کا اس طرح خاتمہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہمارے برادران وطن اردو کو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان تسلیم کر لیں تو ہم ہندی کو تمام ہندوستان کی موسیقی کی زبان مان سکتے ہیں۔

متوالی بدری

اسی ضمن میں اردو کو ہندی ٹھمریوں کے انداز سے مالا مال کرنے اور ہندی سے قطعی بے نیاز کر دینے کے سلسلے میں ہم ایک اور دلکش مثال پیش کر رہے ہیں۔ اور ان دونوں نظموں کی موجودگی اور آئندہ کوششوں کی کامیابی کی بنا پر ہندی والوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے اردو کی موجودہ حیثیت کے قیام و دوام پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کیا تو ہم مجبور ہوں گے کہ ہندی موسیقی سے بھی قطعی قطع تعلق کر لیں اور اس طرح اس رہے سہے ربط و ضبط کا بھی خاتمہ کر دیں جو ہمیں اب تک ہندی سے رہا ہے ؎

کچھ ہم کھچے کھچے رہے۔ کچھ وہ کھچے کھچے ٭ اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

ایک بصیرت افروز لیکچر

۱۸ تاریخ کی شام کو وائی ایم سی اے ہال میں آنریبل میاں عبدالحق وزیر تعلیم کی صدارت میں شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی نے آزاد، حالی اور شبلی کے انداز نگارش کے موضوع پر ایک بصیرت افروز اور دلکش لیکچر دیا۔ حاضرین میں بیسیوں بلند پایہ اہل قلم، مدیران جرائد، وکلاء غرض ہر طبقے کے ممتاز و معزز اصحاب موجود تھے۔ لیکچر کے اختتام پر محترم صدر نے حالی اور شبلی سے اپنی ذاتی ملاقات کا حال سناتے ہوئے مسدس حالی سے بہت سے خرد افروز اشعار سنائے۔

موجودہ جنگ کے تین مرحلے

(۱) انتظار، (۲) حرب و ضرب، (۳) حیرت

(مدیر روزنامہ "الاہرام" قاہرہ کے قلم سے)

مترجمہ:-

شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی

موجودہ جنگ کو شروع ہوئے سولہ ماہ گذر چکے ہیں یہ کب ختم ہوگی؟ اسے خدا ہی جانتا ہے۔ البتہ یہ بات کہ گذشتہ سولہ ماہ میں جنگ کن کن منزلوں سے گزری۔ یہ ہم بھی جانتے ہیں۔ اور اس مقالے کی تحریر کا یہی مقصد ہے۔ آغازِ جنگ سے اب تک یہ سولہ ماہ کی طویل مدت تین مرحلوں پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱- مرحلۂ انتظار

یہ مرحلہ پہلے سات ماہ کی وسعت پر حاوی ہے۔ برطانیہ و فرانس نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔ اس وقت سے لیکر اپریل ۱۹۴۰ء تک متحاربین جنگ میں جو لڑائی ہوتی رہی وہ بری جنگ کہلائی جاسکتی ہے جرمنی کے پولینڈ پر قبضہ پانے کے بعد سے جرمن اور فرنچ افواج میں سگفریڈ اور میجنوٹ لائنوں کے عقب میں باہم جھڑپوں کے سلسلے نے اتنا طول پکڑا کہ جنگ پرست لوگ میدانِ جنگ کی یک رنگ خبریں سنتے سنتے اکتا گئے۔ امریکن صحافت نے اس دورِ جنگ کو دھوکا کا نام دیا ہے۔ اس طویل چھیڑ چھاڑ سے نہ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ فریقین جنگ کر رہے ہیں نہ صلح کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ البتہ برطانیہ اور فرانس کی بحری طاقتوں نے جرمنی کا بحری محاصرہ کرکے اس کے لئے باقی دنیا کے راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ لیکن بحری حصار بندی جنگ کا ایک سلبی یا منفی پہلو تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس ناکہ بندی سے اقوامِ عالم کی حکومتوں کا تجارتی و اقتصادی تعاون اثر پذیر ہوا مگر تماشائی دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جرمنی کی جانب سے فضائی ہنگاموں کا انتظار کرتی رہی۔ اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ تماشا پسند لوگ جرمنی کی مافوق الفطرت طاقت کی جانب سے شک اور حیرت میں پڑ گئے۔ اور شک و حیرت سے ملے جلے انداز میں یہ انتظار کرنے لگے کہ دیکھئے اب جرمنی کے موعودہ و بینہ فیصلہ کن حملے کب اور کس سمت سے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی چھوٹی بڑی آزاد اور غیر جانبدار حکومتیں اس فکر میں مبتلا ہوگئیں کہ پولینڈ کی تسخیر کے بعد نازی دراز دستیوں کا شکار کون سا ملک بننے والا ہے؟ اس طرح دنیا نے سات ماہ اسی انتظار میں بسر کر دیئے۔ کہ مستقبل حال کے لئے کس قسم کے مصائب فراہم کر رہا ہے۔ غیر جانبدار قوموں نے یہ ہفت ماہہ مدت کچھ خوف و اضطراب میں اور کچھ امید و رجا میں گزاری۔ مختصر یہ کہ دنیا اپنے مستقبل کو تشویش آفریں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ یہ مرحلۂ انتظار ڈنمارک پر جرمن تسلط اور ناروے پر جرمن فجائی حملے پر ختم ہوا۔ اس ہولناک منظر کو دیکھ کر یورپ کی ہر چھوٹی بڑی حکومت پر جرمن طریقِ جنگ کا رعب طاری ہوگیا۔

۲- مرحلۂ حرب و ضرب

یورپ کی امن پسند۔ آزاد مگر کمزور جمہوری طاقتوں پر جرمنی کے فجائی اقدام اور خصوصاً ناروے کی سرزمین پر برطانوی مدافعت کی ناکامی کے زیر اثر مسٹر چیمبرلین کی وزارت بے مرکز ثقل سے الگ ہوگئی۔ اور عنانِ اقتدار مسٹر چرچل کے ہاتھ میں آگئی۔ ماہ مئی کے دنوں میں برطانوی وزارت کے تغیر کے دوسرے ہی دن ہالینڈ پر جرمنی نے ہلہ بول دیا۔ ہالینڈ پر جرمن حملہ چشمک برق کی سرعت سے ہوا۔ دنیا حیرت زدہ انداز میں اس حملے کی برقی رفتار کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہالینڈ پر جرمن عسکریت ٹڈی دل کی طرح چھا گئی۔ اور نقشۂ عالم سے آزاد ہالینڈ حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ اس کے بعد فوری طور پر میدانِ جنگ بلجیم کی سرزمین پر منتقل ہوگیا۔ اس مرحلے پر پہونچ کر مبصرین کو یہ امر واضح صورت میں دکھائی دینے لگا کہ فرانس پر جرمنی کی افواج قاہرہ شمالی سمت سے حملہ آور ہوں گی۔ اور میجنو لائن کو مغربی سمت پر چھوڑ دیں گی۔ بلجیم میں حیات و ممات کا ہنگامہ اپنے طبعی عروج کو بھی حاصل نہ کرسکا تھا کہ کنگ لیوپولڈ سوم نے اپنے پانچ لاکھ سپاہی جنگی دیوتا کی بھینٹ چڑھا کر جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اس غیر متوقع حادثے کے بعد وہ مشہور معرکہ شروع ہوا جسے صحافتِ عالم "معرکۂ فرانس" کا نام دیتی ہے۔ اس معرکے میں فرانس نے اپنے متعلق دنیا کے حُسنِ ظن کو شرمندۂ رسوائی کر دیا۔ اُس نے بہت قلیل مدت تک مدافعت کی یہاں تک کہ ۱۴ جون سے پہلے ہی پیرس پر جرمن افواج کا تسلط مکمل ہوگیا۔ اس سے چار روز قبل اطالیہ جنگ میں شامل ہوگیا تھا۔ یہ متواتر و تابڑ توڑ

یہی صورت خوف و ہراس میں بالکل اچانک طور پر رونما ہوتے۔ بڑے بڑے قوی دل سورماؤں کے دل ان حوادث فاجعہ کو دیکھ کر کمزوری محسوس کرنے لگے۔ اور تماشائی دنیا اس غلط توقع سے پریشان ہوگئی کہ برطانیہ اپنے سب سے قوی دست حلیف کی شکست کے بعد نازی افواج کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہ کر سکے گا۔

۳۔ مرحلۂ حیرت

لیکن برطانیہ عظمیٰ نے اپنی قوت معنوی سے متعلق کو نا دشمنوں کے سوء ظن کو سرخرو نہ ہونے دیا۔ لندن۔ انگلستان کے ساحلی مقامات اور بندرگاہوں پر جرمنی کے بمبار طیاروں کے دل بادل آگ برساتے ہیں۔ موت اپنے آتشیں لباس میں جلوہ گر ہے۔ زندہ انسانوں کے لئے سطح خاک تختۂ لحد بن رہی ہے۔ اسپتال۔ گرجے۔ مقابر۔ صنعتی ادارے اور مضافاتی سول آبادیوں پر لاکھوں ٹن بم برسائے جا چکے۔ اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ انگلستان کے حسین شہر ہمہ تن خاک ہو رہے ہیں۔ بین الاقوامی آئین جنگ صرف کاغذ پر موجود ہے۔ ورنہ نازی درندوں نے عملی طور پر تمام اصول جنگ اور آئین جنگجوئی کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اس قیامت کبریٰ کے آتشیں ہنگاموں سے انسانی خون کی قیمت پانی سے کم ہو رہی ہے۔ لیکن برطانیہ عظمیٰ مانند ایورسٹ کی طرح آج بھی وہیں ہے جہاں کل عہد امن میں کھڑا تھا۔ آتشیں حوادث کی موسلادھار بارش اس کے پائے استقلال کو معمولی جنبش نہ دے سکی۔ فلک کے قہار و متلاطم سمندر کے طوفان اٹھتے ہیں اور برطانیہ کی فولادی چٹان سے ٹکر کھا کر خود فنا ہو جاتے ہیں۔ اس کو وقار اور پامردی و ثباتی نے برطانوی انسانیت کو انسانیت کے انتہائی عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جرمنی کا رعب و صولت حباب سطح آب کی صورت فنا ہو رہا ہے۔ اب دنیا حیرت و خوف کی ان بلند چوٹیوں سے آہستہ آہستہ اتر رہی ہے جو بربریت نے تعمیر کی تھیں۔

جنگ اپنی برق رفتاری۔ ہنگامہ آفرینی اور فجائی حوادث کی روانی میں ایک واضح انحطاط محسوس کر رہی ہے۔ اس انقلاب نے ہزیمت یافتہ فرانس اور چھوٹی بڑی دہشت زدہ قوموں کو اتنی فرصت بخشی کہ انھوں نے حالات کے تطورات پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ جرمنی سلسلہ وار انگلستان پر جارحانہ حملوں میں اپنے ان طریقہائے جنگ کو استعمال نہیں کر سکا جن کے ذریعہ وہ چشم زدن میں ہالینڈ۔ بلجیم اور فرانس پر مسلط ہو گئے تھے۔

یہ وہ مرحلہ ہے کہ انسان کی قوت متفکرہ شمالی میدانوں سے مشرقی میدانوں کی طرف منتقل ہوئی۔ اور صاف نظر آنے لگا کر جرمنی کیلئے اور ڈنکرک کی بجائے بحر ابیض میں برطانوی قوت پر ضرب لگانا چاہتا ہے۔ جنگ نے بلقانی ممالک کو اپنا محور بنایا ہے۔ رومانیہ کا محوری طاقت کے سامنے سرنگوں ہونا۔ رفتار جنگ کی تبدیلی ہی کا نتیجہ ہے۔ اب بم باری کو نازی عسکریت غیر مؤثر پا رہی ہے۔ اب سیاسی عیاریوں اور تدبر کی دسیسہ کاریوں نے بم باری کی جگہ لے لی ہے۔ برطانیہ کیلئے امریکی امداد محوری طاقتوں کے لئے خدشہ بڑھتی بن رہی ہے اسی لئے جاپان کو محوری اتحاد میں شامل کیا گیا ہے۔ تاکہ امریکہ برطانیہ کی امداد و تعاون سے دست بردار ہو جائے۔ اور جاپانی خطرہ سے اپنی حفاظت کے راستے پر آ جائے۔ محوری اتحاد کا یہ اقدام رومانیہ، ہنگری۔ اور سلوواکیہ کو محوری نظام میں منسلک کرنا تھا اس میں وہ کامیاب ہو چکا ہے۔ اب بلغاریہ۔ ترکی اور یوگوسلاویہ کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ چاہتے اور نازی اتحاد کا ممبر بنانے کی ملعون مساعی میں سرگرم کار رہے۔ ... اس عرصہ میں ... سب روس کی پالیسی قلوب ... معمہ بنی ہوئی ہے۔ ... اطالوی حملہ اور یونانی جنگ ... یہ تمام حادثات اس واقعیت کے شاہد ہیں کہ ہٹلر کے نئے برطانیہ ... حیران بن رہے ہیں۔ ... اب دنیا کو ... درجہ حیرت ... انتظار میں ڈال دیا گیا ہے کہ دیکھئے نازی ڈکٹیٹر برطانوی طاقت پر کس ... اور کس فیصلہ کن حملہ کرے گا؟

اس جنگ کا ہر پہلا مرحلہ دوسرے مرحلے کی تعمیر کر رہا ہے۔ مرحلۂ انتظار نے مرحلۂ حرب و ضرب کی تخلیق کی اور اس سے مرحلۂ حیرت پیدا ہوئی۔ مرحلۂ حیرت اب ... مرحلے کی تعمیر کر رہے ہیں ... مرحلہ ... کا نام پائے گا۔ اور اس مرحلے کو جنگ کی آخری منزل بننا پڑے گا۔ حالات کی رو ... محوری طاقتوں کے خطرات ... بہت ہی ... درحقیقت اطالیہ کی تاریخی شکست کے بعد ... مرکز ... بن گئی ہے۔ امریکہ کانگریس نے برطانوی امداد کا بل پاس کر دیا۔ یہ بل بھی دول محور کے جگر پر ایک ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلغاریہ ترکی اور یوگوسلاویہ اپنی اپنی جگہ پہاڑ کی طرح قدم جمائے کھڑے ہیں۔ مختصر یہ کہ بلقانی سیاست ہٹلر کے لئے اب ... بنتی جا رہی ہے۔ اسپین اور روس یہ ہٹلری سب کچھ سنتے ہیں اور خاموش کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ محوری سیاسیات کا شاہوار فرانس اطالیہ تو اب محوری گلے کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

یہ حالات ہیں جو محوری دول کے انجام کی تعمیر کر رہے ہیں۔ ہٹلر پر اشتعال یاس طاری ہے۔ وہ اس افسردہ اور یخ بستہ فضا میں گرمی پیدا کرنے کے لئے سنبھالے کے طور پر برطانوی طاقت پر ایک آخری اور فیصلہ کن حملہ ضرور کرے گا اور اس قمار پر تمام جرمن طاقت کو لگا دے گا۔ اور یقیناً یہ حملہ فیصلہ کن ہی ثابت ہوگا کہ اس کے بعد محوری خاکستر کی ہر چنگاری سرد پڑ جائے گی۔

(الاہرام قاہرہ)

دول محور اور برّ اعظم افریقہ

افریقہ کی اہم ترین طاقتیں

موجودہ جنگ کے بادل جو پہلے صرف یورپ کی سرزمین پر آگ اور خون کی بارش کر رہے تھے۔ گذشتہ جون سے افریقہ پر بھی گرجنے اور برسنے لگے ہیں چنانچہ کشت و خون کی یہ ہولناک گھٹائیں شمالی افریقہ تک محیط ہو چکی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ جنوبی اور وسطی افریقہ تک پھیلتی جا رہی ہیں۔

افریقہ کی سرزمین جنگجو اور حرب پسند طاقتوں کی جولانگاہ کیوں بنی؟ کون کون سی طاقتیں اس جنگ سے دلچسپی رکھتی ہیں؟ اس میدان جنگ سے کون کون سے نئے مسائل تخلیق پذیر ہوتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو عموماً لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

دنیا میں جتنے براعظم ہیں ان میں رقبہ کے اعتبار سے افریقہ کا دوسرا نمبر ہے۔ لیکن یہاں کی سرزمین یورپ اور امریکہ کی طرح قابلِ زراعت اور زرخیز نہیں ہے۔ اس براعظم کا بڑا حصہ ریگستان اور گھنے جنگلوں پر مشتمل ہے۔ شمالی افریقہ کا حصہ قدرے بہتر ہے۔ خصوصاً وادیٔ نیل جس میں کپاس اور اشیائے خوردنی کی اچھی پیداوار ہوتی ہے۔

معدنیات کے اعتبار سے افریقہ بے شک دوسرے براعظموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے جنوب و مشرق میں سونے اور ہیرے کی کانیں ہیں تانبہ۔ ربر۔ کپاس۔ اور ہاتھی دانت بھی افریقہ میں پایا جاتا ہے۔

افریقہ کی تاریخ پر اک نظر

مصر دنیا کا قدیم ترین مہذب اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ ریاضی اور نجوم کے علوم یہیں سے یونان میں پہونچے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان نے سب سے پہلے وادیٔ نیل ہی میں کھیتی کی۔ سلطنت روما کے عروج و اقبال کے زمانے میں مصر سے لے کر مراکش تک بحیرۂ روم کا سارا ساحل رومیوں کے قبضہ و تصرف میں تھا۔

یورپ کی جس قوم نے سب سے پہلے افریقہ میں حاکمانہ دخل و تصرف حاصل کیا۔ وہ پرتگیز تھے۔ افریقہ کا مغربی حصہ پوپ کے قبضہ میں تھا جسے پوپ نے پرتگیزوں کے حوالے کر دیا۔ پرتگیز اسی طرف سے افریقہ میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ اس کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں ایک جدید دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں یورپ کی ہر قوم نئی نئی سرزمین کی تلاش و جستجو میں سرگرداں تھی۔ ایک عرصہ تک تو براعظم امریکہ مغربی اقوام کا میدان تگ و دو بنا رہا۔ لیکن اس کی آزادی کے بعد جب وہاں ہوس استعماریت کو ہاتھ پاؤں پھیلانے کی گنجائش باقی نہیں رہی تو یہ قومیں افریقہ کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء تک سارا براعظم افریقہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مغربی اقوام میں تقسیم ہو گیا۔

افریقہ کی قطع و برید کی تفصیل

۱۸۸۰ء کے پہلے تک پرتگال کے سوا کسی مغربی قوم کو افریقہ سے دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اس کے بعد ہالینڈ۔ فرانس۔ انگلستان اور اسپین نے بھی اس براعظم کی جانب رخ کیا۔ الجیریا۔ سوڈان۔ کانگو۔ سمالی لینڈ۔ اور مغربی ساحل کے کچھ حصے فرانس کے حصے میں آئے۔ کچھ حصہ مراکو کا بھی اسے ملا۔ اسپین کو مراکو کے کچھ حصے اور راؤڈی اورو پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ انگورہ اور موزامبیک وغیرہ پرتگال کو ملے۔ مشرقی سمندر میں مدغاسکر فرانس کے ہاتھ لگا۔ افریقہ کا کچھ حصہ اٹلی۔ جرمنی اور بلجیم کے حصے میں بھی آیا۔

افریقہ کی تقسیم میں سب سے زیادہ کامیاب انگلستان رہا۔ مغربی ساحل کی تمام اہم اور کارآمد بندرگاہیں اس کے حصے میں آئیں۔ تمام زرخیز اقطاع اور تقریباً پورے جنوبی افریقہ پر اس نے قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ بلجیم۔ پرتگال اسپین اور فرانس کے مقبوضات میں بھی اس نے تجارتی حقوق حاصل کر لئے۔ آگے چل کر مصر اور مصری سوڈان کی اقتصادی پالیسی بھی اس کے ہاتھ آ گئی۔ مختصر یہ کہ انگلستان کے افریقی مقبوضات رقبہ کے اعتبار سے جرمنی اور فرانس کی نوآبادیوں سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن جتنے بھی تھے زرخیز اور معدنی پیداوار سے مالا مال تھے۔

افریقہ کے حصے بخرے میں سب سے زیادہ بدنصیب جرمنی ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۸۴ء تک پرنس بسمارک کے نزدیک نوآبادیوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ اس کے بعد جرمنی نے افریقہ کی طرف توجہ کی تو اس وقت وہاں باقی کیا تھا؟

حریفاں بادہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہا کردند و رفتند

کینیا۔ مشرقی افریقہ۔ جنوبی مغربی افریقہ۔ اور کمرون ٹوگو لینڈ جرمنی کو ملے۔ اور یہ تمام علاقے ریگستان اور بنجر ہیں۔

جرمنی اور اطالیہ کے عزائم

افریقہ کی تقسیم میں جرمنی کو جو کچھ ملا تھا۔ وہ اس کے عزائم کے اعتبار سے ناقابلِ اطمینان تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ برطانیہ سے یوگنڈا اور سوڈان۔ بلجیم سے کانگو۔ پرتگال سے موزامبیک۔ اور انگلستان اور فرانس سے مغربی ساحل کا کچھ حصہ لے کر وسط افریقہ میں اپنی ایک زبردست نوآبادی قائم کرے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کا باعث جرمنی کا یہی جذبۂ استعماریت تھا۔ اور موجودہ جنگ بھی جرمنی کی اسی ملوکیت پرستی کا نتیجہ ہے۔

جرمنی کی طرح اطالیہ بھی افریقہ کے حصے بخرے میں ناکام رہ گیا تھا۔ اسے صرف لیبیا۔ ایری ٹریا اور سمالی لینڈ ملے تھے۔ اور وہ زوال یافتہ شہنشاہیت کو از سرِ نو عروج مند بنا کر بحیرۂ روم پر اقتدار قائم کرنے کا متمنی تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اس نے اسی مقصد کے پیشِ نظر شرکت کی تھی۔ لیکن اس جنگ میں اس کی یہ دیرینہ آرزو بارآور نہ ہوئی۔ اب بھی اس کے سینے میں ٹیونس، کیریا اور مصر پر قبضہ و تصرف حاصل کرنے کی آرزوئیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ اطالیہ کو اُمید ہے کہ جرمنی کی رفاقت میں اس کی یہ آرزوئیں تکمیل پذیر ہو جائیں گی۔ جرمنی اور اطالیہ کی بنائے اتحاد اطالیہ کی یہی اُمید ہے۔

اسپین کی نقل و حرکت

اسپین اب تک اپنی اندرونی پیچیدگیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس لئے اسے افریقی سیاست کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ تھی۔ لیکن جب سے فرانس کو شکست ہوئی ہے اور محوری طاقتوں کو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے سپین کے حوصلے بھی بڑھ گئے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ جون میں اس نے طنجہ پر قبضہ کر لیا تھا اور اب اس کی آنکھیں فرانسیسی مراکو اور الجیریا پر لگی ہوئی ہیں۔

افریقہ کی اہم ترین طاقتیں

اس وقت افریقہ کی دو طاقتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اول برطانیہ اور دوم اطالیہ۔ باقی طاقتیں یا تو غیر موثر ہیں یا انہی دونوں میں سے کسی کا ساتھ دے رہی ہیں۔ بلجیم اور پرتگال کی نوآبادیاں برطانیہ کے زیرِ اثر ہیں۔ فرانس کی شکست کے بعد فرانسیسی نوآبادیوں میں سے کچھ تو استقلالِ فرانس کی تحریک کے علمبردار جنرل ڈیگال کے زیرِ اثر ہیں اور برطانیہ کا ساتھ دے رہی ہیں اور کچھ پر اطالیہ اور جرمنی کا اثر ہے۔ لیکن فرانس اس جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کی نوآبادیاں فاتحین کے راستہ میں رکاوٹیں ڈال رہی ہیں۔ اور اسپین ابھی غیر جانبدار ہے۔

۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس کی رو سے جرمنی کی جتنی نوآبادیاں تھیں برطانیہ کے قبضہ میں آگئیں اور کچھ بلجیم۔ فرانس اور پرتگال کو ملیں۔ اس لئے اس وقت افریقہ میں جرمنی کی کوئی نوآبادی نہیں ہے۔ لیکن وہ اب بھی وسط افریقہ میں اپنی شہنشاہیت کے قیام کا متمنی ہے اور اپنے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے اطالیہ کو افریقی مہم شروع کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

مصر کی مغربی سرحد پر لیبیا واقع ہے۔ اور اس کی مشرقی سرحد پر ایری ٹریا۔ یہ دونوں علاقے اطالیہ کے مقبوضات میں شامل ہیں۔ شمالی لینڈ اور ابی سینیا بھی اطالیہ کے پاس ہیں اور اب فرانس کی شکست کے بعد جبوتی اور برطانوی سمالی لینڈ پر بھی اطالیہ کا قبضہ ہو گیا ہے اس سے بحیرۂ احمر کا تقریباً تمام مغربی حصہ اطالیہ کے دخل و تصرف میں آگیا ہے۔ لیکن جب تک عدن۔ مصر اور نہر سوئیز پر اطالیہ کا قبضہ نہیں ہو جاتا پورے بحیرۂ احمر پر اطالیہ کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ابی سینیا اور لیبیا وغیرہ اطالوی مقبوضات کے درمیان بھی مصر اور برطانوی سوڈان حائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اطالیہ مصر۔ اور سوڈان پر برطانوی پرچمِ اقتدار بہت دنوں سے کھٹک رہا ہے۔

لیکن ان اطراف و جوانب میں برطانیہ کی پوزیشن اتنی مستحکم ہے کہ اطالیہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مصر کے تمام اہم فوجی مقامات برطانیہ کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ سیدی بارانی۔ اسکندریہ۔ پورٹ سعید وغیرہ پر زبردست برطانوی فوجیں موجود ہیں۔ جابجا ہوائی مرکز بھی قائم ہیں۔ اس لئے مصر کی غیر جانبداری کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مصر حقیقی معنوں میں برطانیہ کے ساتھ ہے یوگنڈا۔ کینیا۔ ٹرانسوال اور جنوبی افریقہ کے دوسرے صوبوں سے بھی برطانیہ کو زبردست امداد مل رہی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جنوبی افریقہ کی سیاست میں تھوڑی سی ناہمواری پیدا ہوگئی ہے جنرل ہرٹزوگ اور ڈاکٹر ملن مخالف پارٹی کے لیڈر ہیں اور وہ نہ صرف اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ جنوبی افریقہ شریکِ جنگ نہ ہو بلکہ وہ ہٹلر کی جانب بھی مائل نظر آتے ہیں۔ لیکن اکثریت جنرل سمٹس کے ساتھ ہے اس لئے جنوبی افریقہ برطانیہ کا ساتھ دے رہا ہے۔

محوری طاقتوں نے جنرل فرانکو کو میدانِ جنگ میں لانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوا۔

فوجی طاقت اور فوجی مستقر

اطالیہ بحیرۂ روم کی ایک طاقت ہے اور وہ لیبیا سے صرف تین سو میل کے

فاصلے پر ہے۔ سامان رسد کی بہم رسانی کے لئے اس کے پاس ایک اچھی بحری فوج اور ایک جہازی بیڑہ بھی ہے جس میں دو بڑے جہاز اور چند چھوٹے جنگی جہاز ہیں۔ لیکن اطالیہ کے پاس ہوائی فوج ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ اور نہ پانسو سے زیادہ ٹینک کی ٹکڑی ہے۔ ڈوڈیکنیز۔ لیبیا اور ایری ٹریا وغیرہ میں ڈیڑھ دو لاکھ فوجیں ہوں گی۔ مگر اطالیہ کہیں بھی برطانیہ کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ افریقہ میں اطالیہ کے جتنے مقبوضات ہیں وہ سب برطانیہ کی زد میں ہیں۔

عدن پر برطانیہ کا قبضہ ہے۔ شمالی لینڈ۔ ایری ٹریا۔ ابی سینیا وغیرہ میں کوئی بھی ایسا نہیں جو محفوظ ہو۔ کینیا اور یوگینڈا سے بھی برطانوی فوجیں اطالوی مقبوضات پر حملہ آور ہوسکتی ہیں۔

اطالیہ برطانوی سوڈان کو عبور کئے بغیر مصر تک نہیں پہونچ سکتا۔ اور سوڈان کو عبور کرنا آسان نہیں ہے۔ مصر میں بھی برطانوی فوجیں موجود ہیں۔ اسکندریہ وغیرہ میں اس کے ہوائی مستقر ہیں۔ نہر سویز پر برطانیہ کا قبضہ ہے۔ اس لئے اطالیہ کا ابی سینیا وغیرہ جانے کا راستہ بند ہے۔

مصر کی مغربی سرحد پر تقریباً دو سو میل کا ریگستان ہے۔ اور سوڈان کی مشرقی سرحد پر تقریباً چھ سو میل کا۔ برطانوی فوجیں اطالوی افواج کو اتنا موقع نہیں دے سکتیں کہ وہ ان ریگستانوں سے گذر کر مصر تک پہونچ سکیں۔ مختلف مصالح کے پیش نظر تھوڑے عرصہ تک برطانیہ اطالیہ کے مقابلے میں مدافعت کی پالیسی پر کاربند رہا اس لئے اطالیہ کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ لیکن برطانیہ کے صرف چند روز کے جارحانہ اقدام نے دنیا کو دکھا دیا کہ برطانوی طاقت کے مقابلے میں اطالیہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ہٹلر کے ہی مشورے سے موسولینی نے یونان پر بھی اپنی فوجیں بھیجی ہیں۔ اس جدید مہم کے شروع کرنے سے محوری طاقتوں کا مقصد یہ ہے کہ یونان کے بعد ٹرکی کو فتح کرکے شام وغیرہ پر قبضہ کرلیا جائے تاکہ مشرق قریب پر محوری طاقتوں کا اقتدار قائم ہوجائے لیکن ہٹلر اور موسولینی کو اس مقصد میں بھی سخت ناکامی ہو رہی ہے۔ اور ان کا یہ خواب پریشاں کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

(مشہور شامی اخبار "المینا" سے بوساطت "الاہرام" قاہرہ)

غزل

از اثر چکوالی بی۔ اے۔

جی چاہتا ہے آپ کی وادی میں آؤں میں
کون و مکاں کے حادثوں کو بھول جاؤں میں

واللہ یہ قصور مری بے خودی کا ہے
تیرے حسیں لبوں کو اگر چوم آؤں میں

منزل ہے آگہی کی گمانوں کے موڑ پر
میری دعا ہے ہوش میں ہرگز نہ آؤں میں

آنسو اُمڈ نہ آئیں نگاہِ حیات میں
روداد غم جو دل کی زباں سے سناؤں میں

ممکن ہے تیرے نام پہ میں چپ سا ہو رہوں
یہ تو محال ہے۔ کہ تجھے بھول جاؤں میں

آسودگیٔ زیست کا ارشاد ہے اثر
ہر آستاں پہ اپنی جبیں کو جھکاؤں میں

روگ کا راگ

ایک گیت

(اپنے ایک ڈرامے سے)

از اختر شیرانی

اُنھیں جی سے میں کیسے بھلاؤں سکھی! مرے جی کو جو آکے لبھا ہی گئے
مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے
کئے میں نے ہزار ہزار جتن کہ بچا رہے پریت کی آگ سے من
مرے من میں اُبھار کے اپنی لگن وہ لگاؤ کی آگ لگا ہی گئے
بڑے سُکھ سے یہ بیتے تھے چودہ برس کبھی میں نے چکھا نہ تھا پریم کا رس
مرے نیناں کو شیام دکھا کے درس مرے ہردے میں چاہ بسا ہی گئے
کبھی سپنوں کی چھاؤں میں سوئی نہ تھی کبھی بھول کے دُکھ سے میں روئی نہ تھی
مجھے پریم کے سپنے دکھا ہی گئے مجھے پریت کے دُکھ سے رلا ہی گئے
رہے رات کی رات سدھار گئے مجھے سپنا سمجھ کے بسار گئے
میں تھی ہار گلے سے اُتار گئے میں دیا تھی جسے وہ بجھا ہی گئے
سکھی! کوئلیں "ساونی" گائیں گی پھر نئی کلیاں بھی چھاؤنی چھائیں گی پھر
مری چین کی راتیں نہ آئیں گی پھر جنھیں نین کے نیر مٹا ہی گئے
مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں سکھی! چاہ کو من میں دبائے رکھوں
انھیں دیکھ کے آنسو جو آ ہی گئے مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے!

اطالیہ کی خوش فہمی

ایک مصری اخبار کی حقیقت افروز پیشنگوئی

از :- ادارۂ شاہکار

جن دنوں اطالوی فوجیں صحرائے افریقہ کو طے کرتی ہوئی مصر کی جانب بڑھ رہی تھیں کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنے پیروں چل کر موت کے منہ میں جا رہی ہیں لیکن ایک مصری اخبار "زہرۃ الشرق" نے بالکل اسی طرح کی پیشنگوئی کی تھی اب آپ "زہرۃ الشرق" کا مقالہ ملاحظہ کیجئے۔ اور اس کی روشنی میں ان واقعات کو دیکھئے جو آج کل افریقہ میں رونما ہو رہے ہیں۔

"زہرۃ الشرق" "الکعت سفی ید النعیم" یعنی بندر کے ہاتھ میں ناریل کے عنوان سے رقمطراز ہے۔

"کچھ روز ہوئے عوام کی زبان پر اس کے سوا کوئی ذکر نہ تھا کہ اطالوی فوجوں نے ہماری مصری حدود میں بھی قدم رکھ دیا۔ اور صحرا میں ایک سو کلومیٹر تک بڑھ آئے۔ اطالوی پروپیگنڈے نے بھی خوب طبلہ اور ساز بجایا۔ موسولینی نے اپنی کمر رومال سے کس کر اپنی ٹولی سمیت ناچنا شروع کیا۔ اطالوی ریڈیو نے بھی اطالوی جرأت و بہادری اور جنگی درک و مہارت کے نغمے چھیڑ دیئے۔

اس تمام اچھل کود اور ہاؤ ہو کی وجہ محض یہ ہے کہ اعلان جنگ کے مہینوں بعد اطالوی لق و دق صحرا کے چند کلومیٹر پر جو زندگی کے ہر طرح کے آثار و علائم سے یکسر محروم ہے قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہاں ایک شہر سلوم بھی اطالویوں کے ہاتھ لگ گیا۔ جس سے نہ دشمنوں کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے اور نہ اتحادیوں کو کوئی نقصان۔ کیونکہ وہ ایک غیر اہم اور چٹیل مقام ہے۔

بے شک اطالویوں کو حق ہے کہ وہ اس مفروضہ کامیابی پر شادیانے بجائیں کیونکہ مثل مشہور ہے کہ بندر کے ہاتھ ناریل لگ گیا۔ جب سے اطالیہ نے اعلان جنگ کیا اطالویوں کو کوئی ایسی کامیابی نصیب نہیں ہوئی جس کی بنا پر اطالوی قوم اس جنگ میں شرکت کو حق بجانب ٹھہرا سکے۔ جو موجودہ حکومت اور اپنے قائد سے شاکی ہے۔

لیکن کیا سلوم پر اطالویوں کا قابض ہو جانا اطالوں کی کامیابی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور کیا حدود مصر میں اطالوی فوج کی پیش قدمی کے یہ معنی ہیں کہ برطانوی فوجیں اطالویوں کی پیش قدمی روکنے اور سلوم وغیرہ کی حفاظت سے معذور رہیں؟ بالفاظ دیگر کیا اس صورت حال سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اطالوی فوجیں برطانوی افواج کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہیں اور جنگ میں زیادہ مہارت رکھتی ہیں؟

کوئی بصیرت مند شخص اس سوال کا جواب اثبات میں ہرگز نہیں دے سکتا حقیقت یہ ہے کہ برطانوی افواج نے سلوم میں جو اطالوی فوج کی مزاحمت نہیں کی اس میں ایک زبردست جنگی حکمت عملی مضمر تھی۔ برطانوی افواج کا مقصد یہ تھا کہ اطالویوں کو یہاں پھانس لیا جائے۔ اور انھیں ان کے مورچوں اور قلعہ بندیوں سے دور کر دیا جائے اور اس بے آب و گیاہ صحرا میں ان کے خطوط دفاع کو زیادہ سے زیادہ دور تک پھیلا دیا جائے۔ تاکہ وہ برطانوی طیاروں کے بموں کے لئے نہایت عمدہ نشانہ بن سکیں اس لئے کہ وہاں اطالویوں کو نہ کوئی جائے پناہ میسر آسکے گی نہ اسباب سامان بچانے کا کوئی ٹھکانا ملیگا۔

ہمارے دعوی کی دلیل ان کامیاب حملوں سے مل رہی ہے جو برطانوی طیارے اطالوی لشکر پر مسلسل کر رہے ہیں۔ ہوائی جہازوں نے اپنی بمباری سے نہ صرف اطالوی افواج کے پرخچے اڑا دیئے ہیں بلکہ ان کے ڈپوؤں۔ موٹروں اور ذخیروں کو بھی برباد کر دیا ہے اور ایسے شدید نقصانات پہونچائے ہیں جن کی تلافی ناممکن ہے۔ فوجوں نے جو اطالویوں کو سلوم سے نکالنے کی کوشش نہیں کی اس کی وجہ ان کی مجبوری نہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اطالوی چوہوں کو چوہے دان میں پھنسانا اور فسطائی بھیڑیوں کو ان کے بھٹوں سے نکلنے کا موقع دینا چاہتے تھے تاکہ برطانی فوجیں ان قوتوں کو پامال اور ان کے ذخیروں کو نیست و نابود کر سکیں۔

موسولینی سلوم کی فتح کی خوشی میں جتنا چاہے ناچے اس کا ناچنا ویسا ہی ہے جیسا چوہے کا اس چارے کے گرد ناچنا جو چوہے دان میں لگا ہوا ہے اور اس دام کو بھول جانا جس میں وہ پھنسا ہوتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جو لب اوقات حالت انتظار میں طویل معلوم ہوتا ہے ہم دیکھ لیں گے کہ کس خوبی سے ایک تیار شدہ اسکیم کے ماتحت صحرائے مصر میں اطالوی لشکر روک لیا جاتا ہے اور بالآخر اطالویوں کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس وقت گرزیانی کو معلوم ہو جائیگا کہ اس کی مثال بالکل اس اندھے ریچھ کی سی تھی جو اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے جال میں پھنس گیا تھا"

[illegible]

سرزمین افریقہ پر رومن امپائر کا لاشہ بے گور وکفن

از :- ادارۂ "شاہکار"

موسولینی اور ہٹلر دونوں ڈینگیں مارنے، شیخی بگھارنے اور پُرفریب باتیں کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور اپنی ایسی باتوں کی بدولت وہ ڈکٹیٹر بنے ہوئے ہیں اُنھوں نے اپنی قوم کو ترقی و کامرانی کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ قوم نے ان کو اپنے عروج و ارتقاء کا دیوتا مان کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ یہ دونوں ڈکٹیٹر اب بھی اپنی قوم کو دھوکہ دینے اور بے وقوف بنانے سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ جب بارڈیہ فتح ہوا تو موسولینی کے اخبار "پوپولو ڈی اٹالیا" نے لکھا کہ بارڈیہ کی تسخیر اٹلی کی فتح ہے بتائیے اس سے زیادہ قوم کو اور کیا بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اگر آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہو تو اندھوں کو بھی یقین دلانا مشکل ہے کہ اس وقت دن نہیں رات کے بارہ بجے ہیں۔ چنانچہ اب روم ریڈیو کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ افریقہ میں برطانوی فوج نے نہایت نظم و ضبط کے ساتھ حملہ کیا ہے۔ اور اطالیہ کو زبردست نقصان پہونچا ہے۔

افریقی جنگ کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر اور اہم پہلو یہ ہے کہ اطالیہ اور افریقہ کے درمیان سلسلۂ مواصلت منقطع ہو چکا ہے۔ اس لئے اب اطالیہ سے افریقہ کی رومن فوج کو امداد پہونچانے کا ہوائی جہاز کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے لیکن مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کی ہوائی طاقت اتنی زبردست اور مستحکم ہے کہ اطالیہ ہوائی جہاز کے ذریعہ بھی رومن فوج کی امداد پر قادر نہیں ہو سکتا۔

روم ریڈیو کے اس اعترافِ شکست اور اقرارِ بے دست و پائی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بحرِ روم پر جسے اطالیہ اپنا گھریلو سمندر سمجھتا تھا برطانیہ کا کامل اقتدار قائم ہے۔ اب اطالیہ نہ افریقہ میں فوج بھیج سکتا ہے نہ رسد اور نہ سامان جنگ اس کے برعکس برطانیہ کو افریقی محاذ کے متعلق ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہو گئی ہیں۔ اب وہ اپنی فوج کو مزید طاقتور اور اپنے مورچوں کو مزید مستحکم بنا سکتا ہے۔ اس صورت حال کا جو نتیجہ ہوگا اس کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ برطانیہ افریقہ میں اطالیہ کو بالکل کچل کر رکھ دے گا۔ بارڈیہ کے بعد طبروق پر برطانیہ اور اطالیہ سے جنگ ہو رہی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ طبروق کی قلعہ بندی بارڈیہ سے بھی مستحکم ہے اور اطالیہ طبروق کی زبردست مدافعت کرے گا۔ لیکن کئی روز کے محاصرے اور جنگ کے بعد اطالیہ کے اس مورچے کو بھی برطانوی فوج نے سر کر لیا۔

اب وقت قریب آ گیا ہے کہ ابی سینیا سے بھی رومن اقتدار کا جنازہ نکلتا دکھائی دے۔ ٹائمز کے نمائندے نے شاہ ابی سینیا ہیل سیلاسی سے ملاقات کی تھی۔ ہیل سیلاسی فوج فراہم کر رہا ہے۔ جیسے ہی فوج کی فراہمی پایۂ تکمیل کو پہونچی وہ اطالیہ کو ابی سینیا سے بھیک جیسی دو دو گوش نکال باہر کرے گا۔

اطالیہ کو حبشہ پر قبضہ کئے کئی سال ہو گئے۔ لیکن حبشیوں نے ایک روز کے لئے بھی اطالوی تسلط کو برضا و رغبت قبول نہیں کیا۔ اور انھیں جب بھی موقع ملا اپنے جذبات حریت کے مظاہرے سے باز نہیں آئے۔ پھر اب کہ قدرت نے انھیں یہ زریں موقع عطا کیا ہے کہ وہ اپنے شانوں سے رومن اقتدار کے جوئے کو اُتار پھینکیں ہمیں کامل یقین ہے کہ حبشی اپنے بادشاہ کی قیادت میں سر اور دھڑ کی بازی لگا کر اپنی آزادی کی واپسی کے لئے اطالیہ کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں گے اگر ابی سینیا میں بغاوت شروع ہو گئی تو اطالیہ کے لئے اس کا فرو کرنا آسان نہ ہوگا۔ جس طرح لیبیا میں اطالیہ سے مدد نہیں پہونچ سکتی ابی سینیا میں بھی مدد نہ پہونچ سکے گی۔ اور ابی سینیا میں اطالیہ کی جس قدر فوج اور سامان جنگ ہے اسے ہرگز کافی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر برطانیہ بھی ابی سینیا کی فوج اور سامان جنگ سے مدد کرے گا۔ اس لئے ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ ابی سینیا کے اطالوی کتوں اور گیدڑوں کی موت مر کر ختم ہو جائیں گے۔

اطالیہ کی اس شکست و ہزیمت اور تباہی و بربادی سے ہٹلر بھی پریشان ہو رہا ہے لیکن وہ بھی اطالیہ کی کوئی نتیجہ خیز اور موثر امداد سے قاصر ہے۔ بحرِ روم میں اطالیہ اور برطانیہ کے درمیان جو مقابلہ ہوا تھا اس میں جرمن ہوائی جہاز اطالیہ کی امداد کر رہے تھے۔ لیکن ان ہوائی کارروائیوں سے افریقہ میں اطالیہ کے ختم ہونے ہوئے اقتدار کو سنبھالا نہیں مل سکا۔ اگر ہٹلر اپنے ٹینک اور اپنی توپیں افریقہ میں پہونچا سکتا تو بے شک اس کی امداد سے اطالیہ کو فائدہ پہونچ سکتا تھا لیکن اگر ہٹلر اس پر قادر ہوتا تو سب سے پہلے وہ انگلستان پر ٹینکوں اور مشین گنوں سے حملہ کرتا۔ مگر اس غریب کی بحری قوت تو اٹلی سے بھی کمزور ہے۔ وہ کس برتے پر افریقہ میں اپنے ٹینک، توپ اور مشین گن پہونچا سکتا ہے۔

بارڈیہ کی فتح سے افریقہ میں رومن اقتدار کو زبردست نقصان پہونچا تھا اب طبروق کے سقوط نے اس کو بالکل نیم جان بنا دیا ہے۔ اطالوی فوج بارڈیہ کی فتح کے بعد بہت ہار چکی تھی۔ اب اس میں قوت مقابلہ کا اور بھی فقدان ہو گیا ہے۔ قتل اور قید ہوتے ہوتے اطالوی فوج تعداد کے اعتبار سے بھی بہت بے اثر ہو گئی ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جن کے پیش نظر کسی مبالغہ کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب دنیا رومن اقتدار کے لاشہ کو سرزمین افریقہ پر بے گور وکفن دیکھے گی۔

تاثرات

از:- احمد ندیم قاسمی بی اے -

خطا معاف، عبادت کا وقت بیت گیا (۱) مری اُمید کے شعلوں پہ اوس پڑنے دو
دوائے دردِ جگر کی تلاش ہے بے سود مجھے خدا کے لئے ایڑیاں رگڑنے دو

جھکی کھجور کی شاخوں سے چاند اُلجھنے لگا (۲) ستارے۔ ریت کے ذروں پہ مسکرانے لگے
وہ ایک ٹیلے کے سائے میں دو دھڑکتے دل مذاق۔ گذرے ہوئے وقت کا اُڑانے لگے

بلک رہی ہے دمادم مشین آٹے کی (۳) گرج رہا ہے وہ پٹڑی پہ شعلہ بار انجن
وہ تنگ باڑوں سے بھیڑیں بلا رہی ہیں مجھے کہ آج پیٹ کے کہنے پہ تج رہا ہوں وطن

یہ پچھلی رات۔ یہ شرمیلی چاندنی کا غبار (۴) یہ اس غبار میں لپٹا ہوا خموش کھنڈر
کھنڈر کے سائے میں سرگوشیوں کی آوازیں کہ بوندیں گرتی ہیں سارنگیوں کے تاروں پر

وہ سبز کھیت کے اُس پار۔ اک چٹان کے پاس (۵) کڑکتی دھوپ میں بیٹھی ہے ایک چرواہی
پرے چٹان سے۔ پگڈنڈیوں کے جالوں میں بھٹکتا پھرتا ہے وہ، ایک نوجواں راہی

یہ کس نے جنگ سے یہ دردناک خط لکھا (۶) کہ آج توپ کے گولوں کی زد میں ہیں ہم لوگ
یہ کیا سبب ہے کہ پاتی ہوں ہر جبیں پہ شکن ہر ایک آنکھ میں آنسو۔ ہر ایک دل میں سوگ

خدا کے واسطے پیاری، مرے قریب نہ آ (۷) مری ترستی ہوئی زندگی پہ رحم نہ کھا
کہ آج صبح کو دیکھا ہے تیرے ہونٹوں پر وہ بوسہ جس میں لبِ غیر کپکپاتا تھا

وہ پانی بھرنے چلی اک جوان پنہاری (۸) وہ گورے ٹخنوں پہ پازیب جھنجھناتی ہے
غضب، غضب، کہ مرے دل کی سرد راکھ سے پھر کسی کی تپتی جوانی کی آنچ آتی ہے

کھڑے ہیں کس کے اشارے پہ یہ بلند پہاڑ (۹) یہ کس کے حکم سے لہریں ہیں محوِ رقص و سرود
یہ کون پردہ نشیں کھیلتا ہے مجھ سے مذاق کہ میرا شوقِ تجسس ہے سر بسر بے سود

یہ کس نے سر پہ ستاروں کا شامیانہ تنا (۱۰) یہ کس نے پاؤں میں سبزے کا فرش پھیلایا
یہ کس نے رات کی مسحور کن خموشی میں مجھے جگا کے شرارہ سا دل میں چمکایا

ہوائی حملے

از:- ادارۂ شاہکار

(مصری اخبار "المقطم" کے تازہ ترین مقالے کا ترجمہ)

نازی اور برطانوی اخلاق

گذشتہ ایک ششماہی سے نازی ہواباز انگلستان پر حملے کر رہے ہیں اور بم برسا رہے ہیں۔ برطانوی ہواباز بھی جواب دینے میں کوتاہی نہیں کرتے وہ بھی برابر جرمن علاقوں پر بمباری کرتے رہتے ہیں۔ لیکن نازی بمباری اور برطانوی بمباری میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

نازیوں نے جس طرح دوسرے معاملات میں اخلاق و انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اسی طرح بمباری کے معاملے میں بھی وہ اس کی پروا نہیں کرتے کہ ان کی بمباری سے شہری آبادی کے جان و مال کو نقصان پہنچے گا یا جنگی مرکزوں۔ تیل کے کارخانوں اور دوسرے سامانِ جنگ کو وہ اخلاق و انسانیت کے تمام آئین و اصول سے بے نیاز ہو کر اندھا دھند گولے برساتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک نازی بمباری سے برطانوی حکومت کی عمارتوں اور کارخانوں وغیرہ کے مقابلے میں برطانوی شہریوں ہی کے مکانوں۔ خانداروں اور جانوں کو زیادہ نقصان پہنچا ہے جن میں انگلستان کے تاریخی گرجا وغیرہ مذہبی اماکن بھی شامل ہیں۔

لیکن برطانوی ہواباز جرمن علاقوں پر حملہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کی بمباری سے شہریوں کی جان و مال کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ وہ صرف جرمنی کی سرکاری عمارتوں۔ تیل کے اڈوں رسد کے گوداموں اور اسلحہ سازی کے کارخانوں پر حملے کرتے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جرمن ہواباز ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ امن پسند شہریوں کی جان و مال کو نقصان پہنچانا۔ گرجوں اور عبادت خانوں کو برباد کرنا۔ عورتوں۔ بوڑھوں اور بچوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالنا۔ اخلاق اور انسانیت کے کس قدر منافی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ نازی حکومت پر اقتدار و تسلط کا جو بھوت سوار ہے اس نے نازیوں کو یہی تعلیم دی ہے کہ اخلاق و انسانیت محض بے معنی الفاظ ہیں۔ ہر وہ طریقہ جس سے مقصد برآری کی امید ہے اس کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔

جرمن ہواباز اس خیال سے زیادہ تر شہری ہی آبادی پر بمباری کرتے ہیں۔ اور حتی الامکان غیر سرکاری جان و مال کو زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں کہ برطانوی پبلک ان آلام و مصائب سے تنگ آ کر انقلابِ حکومت پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن نازی بمباری کا اثر اس کے برعکس مترتب ہو رہا ہے۔ اور جرمنی کے خلاف برطانوی پبلک کے جذبات اور زیادہ سخت و شدید ہوتے جا رہے ہیں۔

برطانوی ہوابازوں نے جرمن ہوابازوں کی نسبت حملے کم کئے ہیں لیکن جرمنوں کی فوجی قوت کو نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ کیسے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نازی ہوابازوں نے زیادہ تر شہری آبادی پر حملے کئے ہیں۔ اور برطانوی ہوابازوں نے تمام تر حملے سرکاری کارخانوں۔ اسلحہ سازی کے مرکزوں۔ اور تیل کے اڈوں اور رسدگاہوں پر کئے ہیں۔

برطانوی ہوابازوں کا یہ طرزِ عمل نہ صرف اخلاق و انسانیت پر مبنی ہے بلکہ حکمت و مصلحت کا بھی حامل ہے۔ نازی حکومت کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اگر برطانوی بمباری سے لاکھوں جرمن بوڑھے بچے اور عورتیں ختم ہو جاتیں جب بھی نازی حکومت پر اس کا اثر نہ ہوتا جو سرکاری کارخانوں اور جنگی سامانوں کے نقصان سے ہوا۔ گویا برطانوی ہواباز دشمن کی جس رگ پر ضرب لگا رہے ہیں وہ اس کی سب سے زیادہ دکھتی ہوئی رگ ہے۔

نازی حکومت عرصے سے جنگ کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس لئے اس نے جنگ شروع کرنے سے پہلے جنگی تیاریاں بھی مکمل کر لی تھیں۔ جرمنی کی یہ تیاریاں بڑی حد تک ہوائی جہاز اور بم پر مبنی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مبصرین کہا کرتے تھے کہ آئندہ جنگ زمین پر نہیں فضا میں ہوگی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم نے دیکھ لیا کہ اپنی ایک عرصے کی فراہم کردہ ہوائی طاقت کو ہر طرح کام میں لا کر بھی جرمنی برطانیہ کو نیچا نہ دکھا سکا۔ اور اب وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ امریکہ سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہوائی جہاز تیار ہو ہو کر انگلستان پہنچیں اور جس طرح برطانیہ کو بحری طاقت میں جرمنی پر فوقیت و برتری حاصل ہے ہوائی قوت میں بھی تفوق و غلبہ حاصل ہو جائے۔

(المقطم)

روس اور جرمن تصادم ناگزیر

از:-
ادارۂ "شاہکار"

سویٹ روس کا طرز عمل جنگ کے آغاز ہی سے پراسرار رہا ہوا ہے. جنگ کو شروع ہوئے کم وبیش ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ پھر بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سویٹ روس جس پالیسی پر عمل پیرا ہے اس کا آخری نصب العین کیا ہے۔ اعلان جنگ سے پہلے ہی جرمنی کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کر کے اس نے تمام دنیا کو وقف حیرت کر دیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ نازیوں کے ساتھ جنھوں نے جرمنی سے اشتراکیت کو بیخ وبن کے ساتھ اکھاڑ پھینکا تھا اور اشتراکیوں پر طرح طرح کے مظالم وشدائد ڈھائے تھے۔ روس رشتۂ الفت ومؤدت میں منسلک ہو جائے گا۔

قیصر جرمنی نے ۰۵-۱۹۰۴ء میں محض روس کو کمزور بنانے کے لئے مشتعل کر کے جاپان کے ساتھ آمادۂ جنگ کر دیا تھا۔ اس جنگ میں روس کو جس شکست دنا کامی کا سامنا ہوا اور بین الاقوامی دنیا میں اس کے اقتدار واثر کو جتنا شدید نقصان پہونچا۔ اس سے اصحاب اخبار وحوادث ناواقف نہیں ہیں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جرمن سیاستدانوں نے اپنے جاسوسوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ روس میں اپنے حسب خواہ پروپیگنڈا کر کے روس کی ساعی جنگ کو نقصان پہونچانے کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا تھا۔ بہر حال واقعات وحوادث شاہد ہیں کہ جرمنی نے روس کے رسوخ واقتدار کو نقصان پہونچانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ بایں ہمہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر وہ کون سے مفاد و مصالح تھے جنھوں نے روس کو جرمنی کے ساتھ رشتۂ اتحاد ومؤدت استوار قائم کرنے پر آمادہ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ سویٹ روس زار کے عہد کا روس نہیں ہے۔ یہ درست ہے لیکن سویٹ روس کی بظاہر تو یہ پالیسی کبھی نہیں رہی کہ ضعیف ناتواں اقوام کی تباہی وبربادی اور قاہر وجابر اقوام کی آمریت وشہنشاہیت کے قیام میں امداد واعانت کی جائے۔ اس کی غرض وغایت تو دنیا میں اشتراکیت کی تبلیغ واشاعت اور شہنشاہیت وسرمایہ پرستی کی بیخ کنی رہی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جرمنی سے معاہدۂ صلح واتحاد کر کے سویٹ روس اس پالیسی کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

سویٹ روس کی تمنا تو یہ ہونی چاہئے کہ تمام سرمایہ پرست اور شہنشاہیت پسند ممالک آپس میں متصادم ہو کر تباہ وبرباد ہو جائیں۔ اور ان کے کھنڈروں پر اشتراکیت پسند حکومتوں کا قیام عمل میں آئے. لیکن کیا سویٹ روس کی موجودہ پالیسی اس کی اس آرزو کی تکمیل میں ممد ومعاون ہو سکتی ہے کون نہیں جانتا کہ نازیت جمہوریت واشتراکیت کی بدترین دشمن ہے۔ لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اشتراکی روس نازیت سے رشتۂ الفت مؤدت قائم کر کے اسے حصول اقتدار وتسلط کا موقع بہم پہونچا رہا ہے۔ اور اس طرح اپنے ہی ہاتھوں جمہوریت واشتراکیت کی بنیاد ڈھا رہا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر سویٹ روس نے نازی جرمنی سے صلح واتحاد کا عہد نہ کر لیا ہوتا تو جرمنی کو پولینڈ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔

روس کا جغرافیائی ماحول

روس کا جغرافیائی ماحول بھی اس کے موجودہ پُراسرار طرز عمل کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ آثار وقرائن پہلے سے بتا رہے تھے کہ موجودہ جنگ میں جاپان برطانیہ کا ساتھ نہ دے گا۔ وہ جرمنی کے ساتھ اشتراک وتعاون کرے گا۔ ایسی حالت میں اگر روس جرمنی سے دشمنی مول لیتا تو مغرب کی طرف سے نازی اور مشرق کی جانب سے جاپانی فوجیں اس پر حملہ کر سکتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ روس کی موجودہ جنگی طاقت گذشتہ جنگِ عظیم کی نسبت کہیں مستحکم اور زبردست ہے۔ پھر بھی مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ بیک وقت دو طاقتور ملکوں سے معرکہ آرا ہونا روس کے لئے آسان نہ تھا۔ روس اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جاپان اس کا تاریخی دشمن ہے۔ اور وہ موقع پاکر اسے نقصان پہونچانے اور اس کے ایشیائی مقبوضات میں حصہ گیر ہونے سے کبھی باز نہیں آسکتا۔ لہذا یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ روس نے اسی خطرے کے پیش نظر نازی جرمنی سے معاہدۂ صلح واتحاد کر کے اسے اپنی جانب سے اطمینان دلانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ روس موجودہ جنگ میں نازی جرمنی کی فتح وکامرانی کا متمنی ہے۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ روس اسے ہرگز پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھ سکتا کہ اس کے پہلو میں ایسی زبردست اور طاقتور حکومت قائم ہو جائے جو ہر وقت ...

لڑنے کو تیار رہے۔ روس اس قدر بے بصیرت نہیں ہے جسے اتنا
ہو کہ اگر یورپ پر نازیت کا کامل اقتدار قائم ہو گیا تو وہ اشتراکیت
اپنے سامنے سر تسلیم خم کرائے بغیر معاف نہ کرے گی۔ روس اس حقیقت
حجاب و پردہ کے بغیر عریاں صورت میں دیکھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
جرمنی کے ساتھ رشتہ صلح و اتحاد قائم رکھتے ہوئے بھی اپنی بقاء و تحفظ کی
سے غافل نہیں ہے۔ اپنی مغربی سرحد کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنا
لینڈ کے نصف حصہ پر قابض و متصرف ہو گئے۔ بحر بالٹک کی ساحلی ریاستوں
رسوخ و اثر قائم کرنے اور رومانیہ سے بسرابیا اور بوکوینا کے صوبے لے
لینے میں روس کی یہی حفظ ما تقدم کی پالیسی کار فرما ہے۔

خلیج فن لینڈ کرلیلیا۔ اسٹونیا۔ لٹویا۔ اور لتھونیا میں سوویٹ روس کے
مرکز قائم ہو گئے ہیں۔ اب اگر بحر بالٹک سے روس پر سمندری حملہ ہو تو وہ
کی مدافعت کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم پوزیشن حاصل کر چکا ہے۔
لینڈ۔ بسرابیا۔ اور بوکوینا میں بھی زبردست روسی فوجیں موجود ہیں۔ جرمنی نے
بھی اپنی مشرقی سرحد پر فوجیں جمع کر رکھی ہیں۔ اگر روس اور جرمنی کا اتحاد حقیقی اور
مخلصانہ ہوتا تو ایک دوسرے کے خلاف ان تیاریوں کی کیا ضرورت تھی۔
حقیقت یہ ہے کہ اب بھی دونوں کے درمیان کامل بے اعتمادی موجود ہے
بحر بالٹک کی ساحلی ریاستوں میں روس کے رسوخ و اثر کی وسعت و ترقی کو جرمنی
نے اطمینان و پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اسی طرح ریاست ہائے بلقان میں
جرمنی کا رسوخ و اقتدار روس کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر ایک نے
دوسرے کے رسوخ و اثر کی وسعت و ترقی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تو
اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور رفیق
ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف اس قدر ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے سے
متصادم ہونا اپنے موجودہ مصالح کے منافی سمجھتے ہیں۔ جرمنی برطانیہ کے ساتھ
جنگ آزما ہے۔ اس لئے اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ بحر بالٹک کی ساحلی
ریاستوں میں روس کے بڑھتے ہوئے رسوخ و اقتدار کا حریف بنے۔
اگر وہ ایسا کرتا تو اسے اپنی مشرقی سرحد پر روس سے معرکہ آرا ہونا
پڑتا۔ علاوہ ازیں صلح و اتحاد کے ذریعہ اسے روس سے جو تجارتی مفاد
حاصل ہو رہے ہیں۔ ان سے بھی دستکش ہونا پڑتا۔ اسی طرح اسٹالن اور
مولوٹوف نے بھی اسے قرین مصلحت نہیں سمجھا کہ جنوبی مشرقی یورپ اور
بلقان میں جرمنی کے خلاف اقدام کریں۔ اس لئے کہ ایسی صورت
میں روس کو بیک وقت جرمنی اور جاپان سے مقابلہ آرا اور جنگ

سوویٹ روس اور بلقان

روس کی دیرینہ پالیسی یہ ہے کہ بلقان اور بحر اسود پر کسی بڑی طاقت
کا اقتدار قائم نہ ہو۔ روس کے مفاد کے لئے اب بھی اس کی ضرورت ہے کہ
بلقان و بحر اسود کسی بڑی حکومت کے اقتدار و اثر سے محفوظ رہیں۔ رومانیہ پر
نازی حکومت کے تسلط کے قیام کے موقع پر وہاں کے کمیونسٹوں نے نہایت
اضطراب و تنفر کا اظہار کیا تھا جس پر وہاں کے آہنی دستے نے کمیونسٹوں
[illegible] کے سپرد کر دئے گئے۔ روس نے آہنی دستے کی کارروائیوں کی
مذمت بھی نہیں کی۔ نہ صرف یہی بلکہ اس نے اپنے سفیر متعینہ بخارسٹ کو ماسکو واپس
بلا لیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض [illegible] معاملات کی بنا پر سوویٹ روس
اور نازی جرمنی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان
دونوں کو [illegible] ارباب فکر و بصیرت یہ نتیجہ نکالنے میں بالکل حق بجانب
ہیں کہ اشتراکیت و نازیت کے اصولی اختلافات دونوں میں کبھی حقیقی اور پائدار
اتحاد نہ ہونے دیں گے۔ دونوں میں کشمکش اور تصادم کی ایک نہ ایک صورت
ہر وقت ظہور پذیر ہوتی رہے گی۔

ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اگر بلقانی سیاست
سے روس کو دلچسپی نہ ہوتی اور وہ بلقان کے متعلق ہٹلر کی اسکیم کو اپنے مفاد
کے منافی نہ سمجھتا تو اب تک ہٹلر رومانیہ کی طرح بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کو بھی اپنی
آہنی گرفت میں لے چکا ہوتا۔ روس ہی کے خیال سے ہٹلر ان حکومتوں پر
اپنا اقتدار و تسلط قائم کرنے میں مذبذب اور متامل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ روس نے جرمنی کی بلقانی اسکیم کی علانیہ مخالفت نہیں کی
لیکن روسی سیاست دان خفیہ طور پر اس اسکیم کے خلاف برابر کوشش کرتے رہتے
ہیں۔ رومن فوجوں کے مقابلے میں یونانیوں کو جو فتح و کامیابی حاصل ہوئی ہے
اس سے بھی بلقانی ریاستوں کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں اور وہ بھی جرمنی کے
مقابلے میں ہمت سے کام لینے لگی ہیں۔ ہٹلر کے اشارے سے ہنگری نے
یوگوسلاویہ کو دول محور کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کی دعوت دی تھی
جسے ہنوز اس نے منظور نہیں کیا۔

روس اور درۂ دانیال

روس کی جہاں یہ خواہش ہے کہ بلقانی ریاستوں پر اقتدار حاصل کر کے
بحرۂ روم تک پہنچ جائے۔ وہاں اس کا بھی آرزومند رہا ہے کہ درۂ دانیال اور
باسفورس کے آبی راستے اس کے اقتدار و تصرف میں آجائیں۔ ۱۹۳۶ء کے

مانٹریکس کے سمجھوتہ کے مطابق درۂ دانیال کی جو بین الاقوامی حیثیت قرار دی گئی وہ روس کے نزدیک قابل قبول نہ تھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ہر طاقتور حکومت درۂ دانیال کے راستے اپنے بحری بیڑے کو بحر اسود میں لاکر کریمیا پر حملہ آور ہوسکتی ہے۔ یاد ہوگا کہ موجودہ جنگ کے آغاز میں ترکی سے سمجھوتہ کی گفتگو کرتے ہوئے روس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ درۂ دانیال اور باسفورس کے آبی راستے کو بیرونی حکومتوں کے لئے بند کردیا جائے۔ جس کے ماننے سے ترکی نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ایسا کرنا اس معاہدے کے منافی ہوگا۔ جو اس نے برطانیہ اور فرانس سے کر رکھا ہے۔

بہرحال اپنے اپنی مفاد و مصالح کے پیش نظر روس اسے کبھی گوارا نہیں کرسکتا کہ ترکی پر جرمنی یا اطالیہ کا اقتدار قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں بحر اسود کے روسی مقبوضات خطرے میں پڑ جائیں گے۔

گذشتہ جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد بھی جرمنی کی یہ خواہش رہی ہے کہ ترکی اور مشرق ادنیٰ کے مسلم ممالک اس کے اقتدار و تصرف میں آجائیں تو ان ملکوں کے تیل اور دوسری پیداوار پر اسے اختیار اور قابو حاصل ہو جائے۔ اب بھی اگر جرمنی کو بلقان پر اقتدار و تصرف حاصل ہوا تو وہ ترکی پر حملہ آور ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اور ترکی پر جرمن اقتدار و اثر کا قائم ہو جانا روس کے لئے جس قدر خطرناک ہوسکتا ہے اسے روسی ماہرین سیاست خوب سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں میری سیاسی فہم و بصیرت اسے کسی طرح قبول نہیں کرتی کہ دول محور بالخصوص جرمنی بلقان میں اپنے رسوخ و اثر کو برملا وسعت و ترقی دیتا رہے گا۔ اور روس ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش دیکھتا رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی مقام پر روس اور جرمنی میں تصادم ہوکر رہے گا۔

یہاں اس معاہدے کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جو کچھ عرصہ پہلے ترکی نے برطانیہ اور فرانس سے کیا تھا۔ اس زمانہ میں نہ صرف برطانیہ اور فرانس نے یونان اور رومانیہ کو امداد کی گارنٹی دی تھی بلکہ ٹرکی بھی ان دونوں سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ اس لئے خیال کیا جاتا تھا کہ موقع آنے پر ٹرکی بھی ان دونوں کی مدد کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اس معاہدے سے یہ توقع قائم کی گئی تھی اور ارباب سیاست نے بھی اس پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اس سمجھوتہ سے بلقانی ریاستوں کو خاص طاقت حاصل ہو جائے گی۔ اور جرمنی کے منصوبوں پر پانی پھر جائے گا۔ لیکن یہ پیشگوئی درست ثابت نہیں ہوئی اور ٹرکی بھی یونان کی امداد کے لئے تیار نہ ہوسکا۔

لیکن جس وقت بلغاریہ پر جرمن فوجوں کے حملے کا خطرہ پیدا ہوا ترکی نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر بلغاریہ اپنی غیر جانبداری پر قائم نہ رہے گا تو وہ بھی بلغاریہ پر حملہ کردے گا۔ چنانچہ بلغاریہ پر اب تک جرمن حملہ نہ ہونے کا ایک سبب ٹرکی کا یہ انداز بھی قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی بلقان کا سیاسی ماحول بدستور مکدر نظر آرہا ہے۔ اور اس امر کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ جرمنی بلغاریہ کو رومانیہ سے کچھ اور علاقے دلانے کا سبز باغ دکھا کر بلغاریہ کی طرف سے یونان پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر یہ خطرہ ظہور میں آگیا تو پھر نہیں کہا جاسکتا کہ ٹرکی اپنی دھمکی کے مطابق کارروائی کرے گا۔ یا بدستور سکوت سے کام لے گا۔ اس وقت روس کا طرز عمل بھی بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔ اگر روس کو بلغاریہ میں نازیوں کا داخلہ ناگوار گذرا تو وہ یقیناً ٹرکی کو مداخلت کے لئے آمادہ کرے گا۔ لیکن اگر ٹرکی نے مداخلت نہ کی تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ روس سے ڈرتا ہے۔ اور روس کے متعلق بھی یہ رائے غلط نہ ہوگی کہ وہ ابھی کچھ اور دور تک جرمنی کا ساتھ دینا چاہتا ہے۔

روس کا مشرقی حریف جاپان

جس طرح روس نے آغاز جنگ میں جرمنی سے معاہدہ کیا تھا اسی طرح جاپان سے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جاپان نے جرمنی اور اٹلی کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہے اس کا مقصد جہاں ایک طرف امریکہ کو خوفزدہ کرنا تھا وہاں دوسری جانب سوویٹ روس کے ارباب حل و عقد پر بھی یہ واضح کر دینا تھا کہ اگر انھوں نے دول محور کے خلاف کسی طرح کا اقدام کیا تو انھیں بیک وقت مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر معرکہ آرا ہونا پڑے گا۔ اگرچہ ابھی تک جاپان نے کوئی ایسی کارروائی نہیں کی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ یورپین جنگ میں اپنے رفقاء کی برملا امداد کرے گا۔ لیکن —— مشرقی ایشیا کے اس نئے نظام میں روس کا صوبہ سائبریا یا اس کا کچھ حصہ بھی آسکتا ہے۔ روس اور جاپان ایک دوسرے کے پرانے دشمن ہیں۔ اور بوقت ضرورت اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے ایک دوسرے کے بالمقابل آنے پر تیار معلوم ہوتے ہیں۔ شاید یہ خبر بھی بے اصل نہیں ہے کہ منچوکو کی سرحد پر اور منگولیا کے آس پاس دونوں ملکوں کی فوجیں جمع ہوں۔ روس چین کو علانیہ یا خفیہ طور پر جو مدد دے رہا ہے وہ خود اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ جاپان اور روس کے تعلقات مخلصانہ اور خوشگوار نہیں ہیں۔ روس کی اس امداد سے جاپانی حکومت کے ارباب حل و عقد یقیناً ناخوش ہوں گے اگر آج یورپ میں امن و سکون قائم ہوتا اور چین جاپان کی جنگ کے آغاز ہی میں یورپ کی فضا مکدر نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ روس چین کی [illegible]

املاک خواہ ایشیں کے لئے روس کو جاپان سے خود مقابلہ آرا کیوں نہ ہونا پڑتا۔ یورپ
کی موجودہ حالت میں بھی اس نے ابھی چین کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا ہے جس کے
مطابق وہ چین کو چائے کے بدلے اسلحہ دے گا۔

دول محور کے ساتھ روس کا عارضی سمجھوتہ

بہرحال جہاں تک واقعات وسواہد اور فکر ونظر کا تعلق ہے۔ یقین کے
ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دول محور کے ساتھ روس کا سمجھوتہ مستقل اور دیر پا نہیں
ہو سکتا۔ ان کے مفاد متضاد ہیں۔ اس لئے ان کا تصادم لازمی ہے بحالت
موجودہ اگر روس کا طرز عمل پُراسرار یا غیر واضح معلوم ہوتا ہے تو اس کا سبب
روس کا جغرافیائی ماحول ہے۔ اور دوسرا سبب روسی سیاستدانوں کا یہ خیال
کہ انتظار و تامل ہی کی پالیسی روس کے لئے فائدہ مند ہے۔ روس نے جرمنی کے
ساتھ جو اقتصادی یا تجارتی سمجھوتہ حال میں کیا ہے وہ بیری مانے میں صنعتی تماشی
ہے اتنا حقیقی نہیں ہے۔ جرمنی یہ دکھانا چاہتا ہے کہ جس طرح برطانیہ کو
امریکہ سے امداد مل سکتی ہے اسی طرح جرمنی کو روس سے مدد ملے گی۔ لیکن دنیا
کو معلوم ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے درمیان جو بلند جذبات کار فرما ہیں وہ
جرمنی اور روس کے درمیان قطعاً معقود ہیں۔ روس عرصے تک اور کافی مقدار میں
جرمنی کو اپنا مال نہیں دے سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ سٹالن نے حال ہی میں "ریڈ اسٹار" نام کے اخبار میں
یک مضمون لکھا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ روس میں جنگ کا خطرہ بہت
ترقی کر گیا ہے۔ نیو یارک کے اخباروں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ دریائے
ہنڈ کے شمالی ساحل پرلو سے لیکر اوڈیسا تک روسی فوجیں موجود ہیں۔ اگر یہ
یہ خبر صحیح ہے تو اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ فوجی کاروائیاں
محض دشمن خطرے کی بنا پر عمل میں لائی گئی ہیں۔ اس لئے کہ برطانیہ یا اس کی
کسی رفیق حکومت سے روس کو خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔

ان حالات وقرائن کو دیکھکر ارباب فکر وبصیرت یہ رائے قائم
کرنے پر مجبور ہیں کہ روس اور جرمنی کے درمیان اندر ہی اندر شکوک و
شبہات ترقی کر رہے ہیں۔ اور اعتبار واعتماد کا فقدان ہوتا جا رہا ہے
جس کا انجام ایک روز یقیناً روس اور جرمنی کے تصادم کی
شکل میں دنیا کے سامنے آ کر رہے گی۔

نظم

تمھیں ہو

از
کوکب شادانی بی۔ اے۔

چین تمھیں ، آرام تمھیں ہو
صبح تمھیں ہو ۔ شام تمھیں ہو
صبح کی رونق شب کی لطافت
جس پہ فدا جنت کی بہاریں
روحِ طلب ، پیغامِ مسرت
عکسِ جمالِ بادۂ رنگیں
جانِ طلب ، ایمانِ تمنا
بے ہوشی ہو۔ یا ہشیاری
میرا تخیل ۔ میرا تغزل
میرے دِل کی ، بیتابی کا

روحِ دلِ ناکام تمھیں ہو
رنگِ رخِ ایام تمھیں ہو
حسنِ فضائے شام تمھیں ہو
وہ رخِ لالہ فام تمھیں ہو
دورکنِ آلام تمھیں ہو
حاصلِ کیفِ جام تمھیں ہو
اُلفت کا ہر کام تمھیں ہو
پیشِ نظر ہر گام تمھیں ہو
کہئے جسے الہام تمھیں ہو
آغاز و انجام تمھیں ہو

متوالی بدری

گیت

از :-
محترمہ ع۔ جہاں بیگم آدا بدایونی

مستانہ ہوائیں آنے لگیں ـــــ ساون کا سندیسہ لانے لگیں
متوالی بدری چھائی سکھی !

کوئل کو ملے نغماتِ حزیں بلبل کو ملے گلہائے حسیں
اور گل کو ملی برنائی سکھی !

لالے کو ملا وہ داغِ جگر ہوں جس پہ نچھاور لعل و گہر
غنچوں کو ملی زیبائی سکھی !

سرسبز ہوئے اشجارِ کہن گلریز ہوئے گلزارِ وطن
سبزے نے بھی لی انگڑائی سکھی

پیمانہ بکف ہر برگِ سمن مدھ ماتی ایک اک شاخِ چمن
ساقی کی یہ بزم آرائی سکھی

امبوا پہ پپیہا بولا سکھی بھونرا بھی کنول پر آیا سکھی
پیتم کو نہ میں یاد آئی سکھی

یہ رات سہانی۔ کالی گھٹا سرشار ہوا۔ متوالی گھٹا
ساجن کی لہک لے آئی سکھی

بادل کی گرج سے دِل دھڑکے بجلی کی چمک سے جی سہمے
برکھا نہ ہمیں راس آئی سکھی

رِم جھم۔ رِم جھم میگھا برسے ـــــ ساجن سے ملن کو جی ترسے
میں پیت کئے پچھتائی سکھی

نپولین کی منگنی

از :- کے ، اے حمید بی ، اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لا

وائنا کے شاہی محل کے ایک خوشنما کمرے میں حریر و زربفت کے پردے آویزاں تھے - اور ہوا کے جھونکے ان سے کھیل رہے تھے - فرش پر ایرانی قالین فرش نوبہار کا سماں دکھا رہے تھے - سنہری روپہلی چھت خاموشی سے قالینوں کے لاجواب انتخاب کا جواب دے رہی تھی - وینس کی بیش بہا قندیلیں آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں -

دیواروں پر چین کے صناعوں نے وہ نقش کاری کی تھی کہ دیکھ کر انسان محو حیرت رہ جاتا تھا - کمرہ میں وہ تصویریں آویزاں تھیں جو فن مصوری کے اُستادوں کا شاہکار تھیں - باہر ہلکی ہلکی پھوار کیف سا پیدا کر رہی تھی - کمرے کے ایک کونے میں پیانو پڑا ہوا تھا - آسٹریا کے شہنشاہ فرانسس کی چہیتی بیٹی مریم لوئس اپنے اُستاد سے موسیقی کا سبق لے رہی تھی -

اُستاد نے اپنی ثریا مرتبہ شاگرد کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے کہا -

"کیا علیا حضرت شہزادی عالی جاہ وہ جانکاہ خبر سن چکی ہیں ؟"

"نہیں تو" شہزادی نے حیرت واستعجاب سے کہا "وہ کونسی خبر ہے جس نے آپ کو اس قدر بے چین کر دیا ہے !"

اُستاد نے اپنے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا -

"نپولین نے جوزفائن کو طلاق دے دی ہے"

شہزادی نے پیانو کے سروں پر غم و حسرت کا نغمہ بجاتے ہوئے کہا "تو کیا واقعی کارسیکا کے اس ظالم نے غریب جوزفائن کو تخت و تاج سے علیحدہ کر دیا ہے ؟"

اُستاد نے نہایت سنجیدگی سے کہا "حضور والا یہ نہایت مستند خبر ہے - جو فرانس کے شاہی گزٹ میں شائع ہوئی ہے - طلاق گذشتہ دسمبر کی ۱۵ تاریخ کو وقوع میں آئی تھی "

شہزادی نے کہا "شاہی محل میں سوائے فرنک فورٹ گزٹ کے اور کوئی اخبار میری نظر سے نہیں گذرتا - لیکن میں نہیں سمجھ سکتی کہ یہ خبر ہمیں کس طرح متاثر کر سکتی ہے "

اُستاد نے جھجکتے ہوئے کہا "اس طرح کہ اگر نپولین نے طلاق دے دی ہے تو اس کا ارادہ ضرور دوسری شادی کرنے کا ہوگا "

شہزادی نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دریائے ڈینوب کی لہروں کو محل کی دیواروں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے دیکھا اور بے پروائی سے کہا " یہ تو بالکل درست ہے " اس کی نظروں میں وہ دردناک منظر پھر گیا جبکہ آج سے چند ماہ پہلے آسٹریا کے لوگوں کی لاشیں بے محابا ادھر اُدھر دریا میں تیر رہی تھیں اور یہ دردناک حادثہ اس کارسیکن کا برپا کردہ تھا جس نے تمام یوروپ کو متزلزل کر رکھا تھا - وہ معاً کھڑی ہو گئی - پژمردگی اور حسرت اس پر چھا گئی - اور وہ کمرہ میں نہایت افسردگی سے ٹہلنے لگی -

اس کا سن اٹھارہ سال کا تھا - اس کی نیلگوں آنکھیں اس کی معصومیت کا اقرار کر رہی تھیں - وہ سرو قد تھی - اس نے اپنی سنہری زلفیں اپنے دوش پر ادھر اُدھر بکھیر رکھی تھیں - اس کے رخساروں پر چیچک کے داغ تھے - جن سے اس کے حسن میں بہت کمی واقع ہو گئی تھی - اس کی پیشانی کشادہ تھی - مگر باوجود ان باتوں کے اس میں وہ دلفریبی نہ تھی - جو دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لے -

وہ انگیٹھی کے سامنے کھڑی ہو گئی - اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی " آج یورپ کا کون شہنشاہ ہے - جو اس کا خسر بننا باعث صد فخر و مباہات نہ سمجھے -

اُستاد نے ایک اچھے مصاحب کی طرح شہزادی کی تائید کرنے کے لئے اپنا سر تسلیم خم کیا - اور کہا " حضور کا خیال بالکل درست ہے - مگر میں سمجھتا ہوں کہ نپولین نہایت بامذاق شخص ہے - اس لئے وہ نہایت خوبصورت لکھی پڑھی اور بامذاق عورت کو رفیقۂ حیات بنانا پسند کرے گا - میری دانست میں اس کی خواہش صرف یہ نہیں کہ اس کے ہاں اولاد نرینہ پیدا ہو - بلکہ وہ ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہے جو زندگی کی شاہراہ پر اس کی پوری پوری ممد و معاون بن سکے - اور میں جانتا ہوں کہ یورپ میں صرف ایک ایسی شہزادی ہے - جو . . . . . ؛

شہزادی نے بات کاٹتے ہوئے کہا " آپ کا کیا مطلب ہے - کیا آپ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ مجھ سے اس کے متعلق بات چیت کریں یہ ناممکن ہے - اس کارسیکن کے وہم میں بھی میرا خیال نہیں آ سکتا ہے آپ تو بہت سے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں - ذرا بتایئے تو کہ عوام کا اس کے متعلق کیا خیال ہے "؟

اُستاد نے کہا: "عوام میں اس بات کا چرچا ہے کہ حضور سے بہتر رشتہ ملنا ناممکن ہے۔"

مریم نے منہ چڑا کر کہا: "میں اس سے کیسے شادی کر سکتی ہوں"۔

وہ اس کمرہ سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ اس آہو کی طرح مضطرب تھی جو زخمی ہو گیا ہو۔ اور اپنے شکاری کے قرب سے کانپتا ہو۔ آخر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا: "کاش فریڈرک اسے گذشتہ اکتوبر میں جبکہ اس نے لشکون برگ پر ہماری فوجوں کو شکست فاش دی تھی قتل کر سکتا۔ آہ اگر وہ اسے مارنے میں کامیاب ہو جاتا تو دنیا کو ظلم و تعدی سے نجات مل جاتی۔ میں کسی صورت میں بھی اس کی بیوی بننا پسند نہ کروں گی۔ غور تو کرو اس نے ہمارے ملک اور خاندان پر کس قدر ظلم ڈھائے ہیں۔ ہمارے ملک کے حصے بخرے کر کے ٹریسٹ۔ کارنولا۔ کارنویا اور گیلی کا بیشتر حصّہ ہم سے چھین کر ہمارے ناموس کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ابھی تین ماہ کا عرصہ ہوا کہ اس نے ہمیں ایک رسواکن عہد نامے پر مجبور کر کے ہمارے خاندان کی سینکڑوں برسوں کی عزت ملیامیٹ کر دی ہے۔ اور وہ آج اس شہنشاہ کی شہزادی کو طلب کر رہا ہے جس کو اس نے شکست پر شکست دی۔ یقیناً وہ مکمل شیطان ہے اور میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ والدِ محترم مجھے اس کی بھینٹ نہ چڑھائیں گے"

اُستاد نے کہا: "شہنشاہ معظم نہایت رحم دل اور فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ان کے دل میں رعایا کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حاشا وکلّا مجھے کوئی بات یقین سے معلوم نہیں۔ میں نے یونہی تذکرۃً اس افواہ کا جو شہر میں گرم ہے۔ حضور سے ذکر کیا تھا"۔

شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کے لبوں پر مہرِ سکوت لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا خون منجمد ہو چکا ہے۔ آخر نہایت کوشش سے اس نے اپنے اُستاد کو ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود یاس و حسرت کی تصویر بنی کمرہ میں کھڑی رہی۔ اس نے نہایت کوشش سے اپنی کتیا کو جو کمرہ میں ایک صوفے پر سو رہی تھی اُٹھا لیا۔ اور زار زار رونے لگی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے رومال سے اپنے آنسو پونچھے۔ اور کتیا کو مخاطب کر کے کہنے لگی: "کیا تو نے بھی میری دردناک داستان سُنی ہے۔ مجھے اس کارسکین کے سپرد کرنا چاہتے ہیں جس نے یورپ کے امن کا خاتمہ کر کے ہمارے خاندان کو قعرِ مذلت میں گرا دیا ہے۔ پیاری کتیا وہ میری شادی کی رسم کی ادائیگی کے لئے مصر ہیں۔ حالانکہ میری عمر ابھی صرف اٹھارہ سال کی ہے۔ لیکن میں تجھ سے کہے دیتی ہوں کہ میں کبھی بھی اس بات پر رضامند نہیں ہوں گی۔ اباّ مجھے ہرگز اس شیطان کے سپرد نہیں کریں گے۔ وہ میری زندگی کا خاتمہ کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔ انھیں علم ہے کہ میں نہ صرف ان سے محبت کرتی ہوں بلکہ ان کی پرستش کرتی ہوں"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ اور پھر دیوانہ وار رو رو کر کہنے لگی۔

"ابھی ابھی میں کس قدر خوش تھی۔ اس ظالم نپولین کو میرا خیال کیسے آ گیا۔ وہ قصائی سے بڑھ کر ظالم ہے۔ وہ غاصب ہے۔ اور وہ یقیناً مسیح کے خلاف ہے"۔

وہ غیظ و غضب سے کانپ اُٹھی۔ اور انتہائی حقارت سے اس نے آتش دان میں تھوک دیا۔

شہزادی کو معلوم تھا کہ اس کے باپ کی حالت نہایت نازک ہے۔ نپولین کے مقابلے میں وہ کئی بار ہزیمتیں اُٹھا چکا ہے۔ گذشتہ چودہ سال سے وہ اس کے خلاف بڑی محنت اور بہادری سے لڑ رہا ہے۔ تاہم وہ نپولین کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ ہر دفعہ صلح کے موقع پر یہ ظالم آسٹریا کا کوئی نہ کوئی حصّہ نگل جاتا ہے۔ آہ کیمپو فورنو کی صلح میں وہ نیدرلینڈ۔ لیمبارڈی اور دریائے رائن کی بستیاں ہضم کر گیا۔ پیٹول میں آلی کا وہ حصہ جو ہمارے پاس تھا اُٹھا کر لے گیا۔ پریس برگ میں جرمنی پر دانت تیز کئے۔ اور آہ افسوس کس کو معلوم ہے کہ آسٹریا کا اب کیا حشر ہوگا۔

ان ایام میں وہ تمام بادشاہ اور شہزادے جو نپولین کے ہاتھوں مفلوک الحال ہو چکے تھے وائنا میں جمع تھے۔ ۱۴ اکتوبر کو نپولین کے ساتھ صلح نامے پر وائنا میں دستخط ہوئے اور آسٹریا نے اسے شکون برگ کا مالک مان لیا۔ جب مریم کو ان تمام باتوں کا خیال آیا تو وہ قریب قریب بے ہوش ہو گئی۔

۲۲ جنوری ۱۸۱۰ء کو اس کا باپ شہنشاہ فرانسس بوڈائیں آ پہنچا۔ اس خبر نے مریم کو اور بھی مضمحل کر دیا۔ وہ خوف سے کانپ اُٹھی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے والد کے حضور میں پیش کی گئی۔ وہ دزدیدہ نگاہوں سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ اور دل میں سخت ہراساں تھی۔ چند منٹ توقف کرنے کے بعد شہنشاہ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"بیٹی میں تم سے ایک اہم معاملہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں"۔

مریم نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا: "ابا میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

"غالباً تمھیں معلوم ہوگا کہ نپولین نے گذشتہ ماہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اور اب وہ ایک ایسی شہزادی کی تلاش میں ہے جو ......"

مریم نے باپ کو جملہ ختم نہ کرنے دیا۔ اور بے قراری سے بولی: "ابا میں جانتی ہوں۔ جو آپ کہنے والے ہیں۔ مگر میں کبھی بھی نپولین سے شادی نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں"۔

شہنشاہ نے بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" ابھی قطعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اور اس سلسلے میں مزید نامہ و پیام نہیں آیا۔"

شہزادی کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ فوراً چلا اٹھی۔" ابا آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک نجومی نے پیشگوئی کی ہے کہ وہ اس سال پیٹنے سے مر جائے گا۔"

شہنشاہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اس نے پریشانی اور یاس کی حالت میں مریم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔" میں تم سے کوئی بات مخفی نہیں رکھنا چاہتا۔ نپولین تم سے شادی کرنے پر مصر ہے۔"

" تو کیا آپ مجھے اس سے شادی کرنے پر مجبور کریں گے؟"

" نہیں نہیں جبر تو میں کرنا نہیں چاہتا۔ مگر تم ہی غور کرو کہ اس وقت میں جبکہ میں اور میری سلطنت اس کے رحم پر ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ کیا تم میری مدد نہیں کرو گی؟"

مریم کی حالت اس بکری کی طرح تھی۔ جسے قصائی مذبح کی طرف لے جا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے باپ کی طرف استمداد کی نظر سے دیکھا۔ مگر وہ اس کے استقلال کو دیکھ کر کانپ گئی۔

" ابا پیارے ابا کیا آپ نے حالات کا بنظرِ عمیق مطالعہ کیا ہے۔ آپ اپنی لخت جگر کو اس ظالم کے حوالے کرنے پر کس طرح رضامند ہو گئے ہیں۔ وہ القرب کا بھوکا ہے۔ اس نے آپ کی خالہ کو تختۂ دار پر لٹکوا دیا تھا۔ یقیناً آپ کو اس کے مظالم کی داستانیں ازبر ہیں۔ اس نے ہمارے راہبوں اور پادریوں کو جیلوں میں ڈال رکھا ہے۔ اور اس کے جرنیلوں نے پاپائے اعظم کی وہ بے عزتی کی ہے جس کا حال سُن کر انسان بے اختیار کانپ اُٹھتا ہے۔ نہیں نہیں ابا آپ میری شادی اس سے نہ کریں۔"

یہ کہکر شہزادی باپ کے قدموں پر گر کر زار زار رونے لگی۔ شہنشاہ کا دل بھر آیا۔ اس نے بچی کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور اس کے پریشان بالوں کو ہاتھ سے سنوارنے لگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا۔" بیٹی بادشاہوں کے لئے شادی ایسی چیز نہیں۔ جو دل کی خوشی کے لئے کی جائے۔ ایسے موقع پر سلطنت کی خوشحالی کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔"

شہزادی باپ کے یہ لفظ سُن کر نہایت متعجب ہوئی۔ اسے خوب یاد تھا کہ اس کا باپ کہا کرتا تھا کہ شادی ایسی چیز نہیں جو جبر و اکراہ سے کی جائے۔ شادی کے معاملہ میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔

آخر شہزادی نے کہا۔" ابا! تو آپ کے خیال میں شہزادیوں کی شادی سلطنت کی خوشی پر منحصر ہے۔"

" تو پھر۔ اپنی بچی کو اس شخص کے کیوں حوالے کر رہے ہیں جس نے سلطنت کی خوش حالی کو نیست و نابود کر دیا ہے۔"

شہنشاہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے انھیں پونچھتے ہوئے کہا " اس لئے کہ وہ ہماری باقی ماندہ خوش حالی کو تباہ نہ کر ڈالے۔ ہمارے بازوؤں میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ تم صرف ایک ایسا ہتھیار ہو جس سے ہماری سلطنت بچ سکتی ہے۔ بیٹی اگر تمھاری مرضی یہی ہے کہ ہزاروں انسان خون کے گھاٹ اُتار دئیے جائیں۔ لاکھوں کو تختۂ دار پر لٹکایا جائے اور انقلاب عظیم ہمارے خاندان کو نگل جائے تو بہتر ورنہ میری بات مان کر میری آبرو بچا لو۔"

شہزادی نے کہا۔" اگر میں صاف انکار کر دوں اور کہوں کہ میں کبھی بھی شادی نہ کروں گی۔"

شہنشاہ نے جواب دیا۔" مجھے تم پر اعتبار ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم اپنے باپ اور ملک کے خلاف کبھی ایسا قدم نہیں اُٹھاؤ گی۔ جس سے وہ تباہ ہو جائیں۔ میں اسے وعدہ دے چکا ہوں۔"

شہزادی زار زار رونے لگی۔ اس نے اپنی باہیں اپنے باپ کے گلے میں ڈال دیں۔ اور اپنی آنکھیں بند کر کے کہا " ابا بے شک آپ مجھے بھینٹ چڑھا دیں میں آپ کے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہوں۔"

شہنشاہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور کہا۔" بیٹی جاؤ۔ خدا تمھارے ارادوں میں برکت دے۔ کل شاہی محل میں منگنی کی رسم ادا کی جائے گی۔"

خیام اُردو میں

مترجمہ:
آختر شیرانی

مرے پیلے کو تو نے گرا دیا یا رب!
مری خوشی کا نشان تک مٹا دیا یا رب!
مری شراب بہا کر مرا قصور معاف
تو آپ مست ہے۔ تو نے بتا دیا یا رب

گناہوں سے ہو دامن پاک جس کا۔ کون انساں ہے
گناہوں میں مری انسانیت کا راز پنہاں ہے
بُرائی کے عوض تو بھی سزا دے گر بُری مجھ کو
تو مجھ میں اور تجھ میں فرق کیا ہے عقل حیراں ہے

افسانہ

کارواں

از:- شیر محمد اختر

ایک بھولا بھٹکا مسافر صحرا نوردی کے بعد تھکا ہارا نخلستان میں ذرا سستانے لگا تھا کہ اچانک ایک کارواں ادھر سے آنکلا۔ دم بھر میں ہر طرف چہل پہل ہوگئی مسافر اپنی تنہائی کو بھول گیا۔ اور نظارے میں ایسا محو ہوا کہ اُسے دُنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہ رہی ——— مگر اس کا خواب جلد ٹوٹ گیا — قافلہ رواں ہو چکا تھا۔ اگر کچھ باقی تھا تو گردِ کارواں اور صدائے جرس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہی حال افضل خاں کا ہوا۔ اس کی زندگی کے بیابان میں نخلستان نمودار ہوا — حسن وعشق کا کارواں آیا۔ دم بھر ٹھہرا اور اس کے دل میں یادِ رفتہ کی گرد اور کسک کا ہلکا ہلکا درد چھوڑتا ہوا چلا گیا — صوبہ سرحد کا ایک طالب علم۔ درمیانہ قد۔ چوڑا سینہ۔ فراخ پیشانی۔ خوبرو۔ تندرستی کے آثار چہرے سے نمایاں — مگر اس کے باوجود ناتراشیدہ نگیں — ہمارے محلہ میں آکر رہا — نچلی منزل کے ایک معمولی سے کمرے میں — جس کا سارا سامان آرائش ایک چارپائی۔ ایک ٹرنک۔ اور لکڑی کی ایک معمولی میز پر مشتمل تھا — وہ رات دن عربی کے تھکا دینے والے اسباق میں محو رہتا۔ جتنی عربی وہ زیادہ رٹ لے گا۔ اتنا ہی بڑا عالم سمجھا جائے گا۔ یہ اس کا خیال تھا۔ میری اس سے شناسائی ہوگئی۔ جو بڑھتے بڑھتے دوستی کی صورت اختیار کر گئی۔

اس کی زندگی ایک خاموش ندی کی طرح تھی۔ جو دھیمے دھیمے ایک سنسان جنگل میں بہ رہی ہو۔ محلے بھر میں اگر اس سے کوئی ملتا تھا تو وہ میں تھا۔ ورنہ ہمارا سارا محلہ زردرو مزدوروں اور متوسط درجے کے کلرکوں کا محلہ اس کی طرف سے بالکل بے پروا تھا — مگر میں جب بھی ذرا شام یا صبح فرصت پاتا افضل کے کمرے میں چلا آتا۔ اور اس تھکے ہارے طالب علم کا دل باتوں سے بہلانے کی کوشش کرتا۔ مجھے انسانی کرداروں کے مطالعہ کا شوق ہے۔ اس لئے افضل کا مطالعہ کرنے میں مجھے بڑا لطف آتا ہے — وہ ایک خالص سونا تھا۔ اُسے اپنی فطری ودیعتوں کو بروئے کار لانے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ سرحد کی زندگی نے — جہاں مرنا اور مارنا ہی کمال زندگی ہے اُسے ایسا بنا دیا تھا۔ ہمارا موضوع جب تک سرحد کی قبائلی زندگی تک محدود رہتا وہ خوب دل کھول کر باتیں کرتا۔ مگر جونہی موجودہ تہذیب وتمدن۔ سوسائٹی اور اس کے قوانین ایسے موضوعات پر گفتگو کا رخ بدلتا۔ تو وہ بالکل چپ ہو جاتا کبھی کبھی بپھر کر کہتا۔ "یہ بکواس ہے۔ سب بکواس ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مہذب اور متمدن لوگ زندہ نہیں ہوتے۔ زندگی کا مقصد غیرت ہے۔ اور غیرت سے مرنا مارنا"

مجھے اس جلتی شمشیر کی باتوں میں بڑا مزا آتا۔ فرق اتنا تھا۔ کہ پہاڑیوں میں گونجنے والی آواز شہر میں آکر دب گئی۔ گویا شمشیر نیام میں ڈال دی گئی۔ شہر اور شہری زندگی اس کی آزاد آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس رنگین زندگی میں کس قدر رومانیت ہے۔ میں نے جب بھی کبھی عورت کا ذکر چھیڑا وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھا کے رہ گیا۔ شاید اس کے مذہبی ماحول کا اثر تھا۔ یا سرحدی ماحول کا۔ جہاں عورت ایک پوشیدہ شے کا نام ہے۔ ان کے گرد چاردیواری اس قدر مضبوط ہوتی ہے جسے پار کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ یا شاید اُسے عورت سے محبت کے افشا کا ڈر تھا۔ جس کا انجام ہوتا ہے۔ پستول یا بندوق کی وہ گولی جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا —

ایک دن حسب معمول جب میں افضل کے کمرے میں گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ کمرہ خلاف معمول صاف تھا۔ حالانکہ اس سے قبل میں نے بارہا یہ کوشش کی تھی کہ افضل اپنے کمرے کی صفائی کی طرف توجہ کرے۔ مگر طالب علم اکثر بے پروا ہوتے ہیں۔ اس دن بستر کی چادر دھلی ہوئی تھی اور میز پر کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں —

گو یہ معمولی سا واقعہ تھا۔ مگر میں نے اس کی تہ میں کسی اور تحریک کو کارفرما دیکھا — چند دنوں میں افضل کی اس بدلی ہوئی حالت کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس کا چہرہ بھی بشاش رہنے لگا تھا۔ بستر کی صفائی کا وہ بہت زیادہ خیال رکھتا۔ شاید اس لئے کہ کمرے کو سجانے کے لئے سوائے بستر کے اس کے پاس اور کچھ تھا بھی نہیں — اس کے پریشان بال اب آشنائے شانہ ہو چکے تھے — سرحدی طالب علم تہذیب نو سے بالکل بے بہرہ اب جمالیاتی ہوا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں سوز آچلا تھا۔ مجھے وہ کبھی کبھی عربی کے عشقیہ اشعار پڑھ کر اس کا مطلب سمجھانے لگتا تھا۔

اس میں تبدیلی میرے لئے دلچسپی کا باعث بن رہی تھی۔ میں کچھ دنوں تک اس سبب کو تلاش کر رہا تھا۔ جو اس تبدیلی کا موجب بنا۔ میں نے افضل سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ شاید اُسے افشائے راز کا ڈر ہو۔ اس لئے میں نے آہستہ آہستہ افضل کی جمالیاتی حس کو بیدار کرنا شروع کیا

کیوپڈ اور سائیکی کا قصہ اُسے سنانے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرا دوست کہیں بلاواسطہ حملے سے بھاگ نہ نکلے۔ اس لئے بالواسطہ طریق اختیار کرنا پڑا۔ میں ایک ایسے نظریئے کا قائل ہوں جسے شاید آپ بُرا سمجھیں۔ میرے نزدیک انسان ذاتی طور پر بالکل خالی ہوتا ہے۔ اس کے اعمال و افعال نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کے ماحول کے اثرات کا۔ یہ نظریہ بحث طلب سہی۔ مگر افضل کے معاملے میں تو بہرحال یہ ٹھیک تھا۔ اس کے ماحول نے اس کے دبے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا۔

ایک دن میں دفتر نہ جا سکا اور خلاف معمول افضل کے ہاں شام کی بجائے دوپہر کو چلا گیا۔ میری طبیعت خراب تھی۔ اس لئے میں اس سے باتیں کرکے جی ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ میرا غیر متوقع طور پر آنا افضل کو بُرا سا معلوم ہوا۔ میں نے اپنی غلطی کو محسوس کیا۔ آخر مجھے کیا حق تھا۔ کہ میں خواہ مخواہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے دکھ بھی ہوا۔ وہ فطرتاً مہمان نواز تھا۔ میں زیادہ اس مخمصہ میں نہ رہا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ بالمقابل کے مکان کی چلمن میں حرکت ہوئی۔ اب موقع کی نزاکت کو تاڑ گیا۔ اور فوراً وہاں سے چلتا بنا۔

افضل کے کردار میں تبدیلی کا باعث مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن مجھے اس کی حالت پر رحم بھی آنے لگا۔ ایک نامکمل و موہوم سی [illegible] کے بیدار شدہ جذبات جنسیت کو دبا کر اس میں ذہنی کشمکش کا موجب بن جائے گی۔ مگر وہ بھولا بھالا سرحدی نوجوان ان باتوں کو کیا جانے۔

پردہ کی جنبش اس کے دل میں ہزاروں آرزوئیں پیدا کر دیتی تھی۔۔۔ سرور تھا۔ کسی پتھریلی زمین میں اگر پانی کا چشمہ نکل پڑے تو پتھر ملتا ہی جائیگا۔ اسی طرح افضل کا دل خوشی سے اُبل رہا تھا۔ وہ کسی سے حالِ دل کہہ جاتا تھا۔ مگر تقدس کا ایک پردہ اُسے حالِ دل کہنے سے روکتا تھا۔ فطرت کی آواز کو وہ دبا رہا تھا۔ میں تاڑ گیا۔ مجھے اس کی اس حالت میں ایک لطف بھی آتا تھا۔ جس طرح ایک پرسوز گانا گایا جا رہا ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے روحانی کوفت بھی ہو رہی تھی۔ آخر ایک دن میں نے اُسے چھیڑ ہی دیا۔ ساز کے تاروں کی طرح جو تشنۂ فریاد ہوں۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ مجھے اپنے گاؤں کے ایک "ڈان جوان" کا قصہ سنانے لگا۔ کہ کس طرح اُسے ایک لڑکی سے عشق ہو گیا اور اس نے اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا دکھ جھیلے۔ وہ ہر روز صبح ایک پہاڑی پر جا بیٹھتا۔ جہاں گاؤں کی لڑکیاں چشمے سے پانی بھرنے آتی تھیں اور وہ پشتو میں گایا کرتا۔ افضل نے مجھے دھیمے سُروں میں [illegible] گا کر سنایا۔ مجھے تو نہ آتی تھی۔ مگر سوز ضرور تھا۔ گانے کا مطلب یہ تھا۔

"اگر میں نے تجھے شادی شدہ بھی دوسرے سے نہ دیکھ لیا تو مجھے پھر مرد نہ کہنا۔

میں نے تجھ پر شرم و حیا قربان کر دی ہے۔ اب اگر تو مجھے موت کے بدلے بھی ملے تب بھی نہیں چھوڑ سکتا۔

تیرے حسن کا چوکیدار بنا بیٹھا ہوں اس وجہ سے میری نیند حرام ہو گئی ہے۔ تاکہ دشمن میرے حسن پر دست درازی نہ کرے۔"

وہ لڑکی کو حاصل نہ کر سکا۔ آخر کار جب لڑکی کی شادی ہو گئی۔ اور رخصتانہ کے بعد برات جانے لگی۔ وہ ایک پہاڑی رگھاٹ میں چھپا بیٹھا تھا تڑتڑ کی آوازیں آتیں۔ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دولہا اور اس کے بہت سے ساتھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔

یہ تھا افضل کا معیارِ عشق۔ وہ سرد مہری دکھا رہا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا۔ کہ ماحول کا اثر اُسے کچھ نہ کرنے دیگا۔ دوسری ایک نادان لڑکی جذبات کی رو میں بہی جا رہی تھی۔ اور نہ جانتی تھی کہ وہ جان بر کھیل جانے والے [illegible] کے ساتھ [illegible] کس رہی ہے۔ افضل کی بے تابی، انتظار اور [illegible] بڑھتا جا رہا تھا۔ پردہ کا ارتعاش اس کے جذبات کو دعوت نظارہ دیتا رہتا۔

میں نے آہستہ آہستہ افضل کے دل کی ساری باتیں سُن لیں۔ وہ شام کو میرا منتظر رہتا۔ دن بھر کے سارے واقعات مجھے سنا دیتا۔ پس پردہ بھی مجھ سے مانوس ہو چکی تھیں۔ میری موجودگی انھیں بھاگنے پر مجبور نہ کرتی تھی بلکہ میرے آنے پر عین پر ایک سم کا اطمینان سا ہونے لگتا۔ چلمن سے دو موٹی موٹی آنکھیں مجھے ایک داستانِ عشق سُنا جاتی تھیں۔ شاید اس تفصیل سے افضل انھیں باتوں کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکتا تھا۔

افضل کی فطرت میں بعض تبدیلیاں بر سر کار ہو چکی تھیں۔ جمالیات کا وہ دلدادہ ہو گیا۔ اب وہ لباس میں تمیز کرنے لگا۔ گانوں میں سوز اور ساز کو سمجھنے لگا۔ ریڈیو سننے کا مشتاق ہوگیا۔ لارنس باغ جانے پر اصرار کرنا۔ مکلوڈ روڈ پر جلوۂ جانانہ اُسے اب متحمل نہ تھا۔ بلکہ جہاں تک میں اُسے سمجھ سکا ہی نظارے اس کے بیداری کے خواب کی تصویر میں رنگ بھرنے کا کام کرتے تھے۔ افضل اپنے محبوب کے لئے تصور کا بنگلہ بنانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کا محبوب آئے۔ اس کا نمونہ وہ مال روڈ کے پار کے بنگلوں سے تیار کرتا تھا۔ بنگلے کے گرد باغ۔ اس کے لئے لارنس باغ کی حسین کیاریاں نمونہ کا کام دے رہی تھیں۔ لباس کا سوال مکلوڈ روڈ پر گشت کرتے ہوئے حل ہو جاتا تھا۔ غرض ذہنی تصویر کی تکمیل کے لئے اُسے نقوش مل رہے تھے۔ ایک اکھڑ پٹھان اب

ایک مصور بن چکا تھا - فن لطیف اور پچھان - یہ صرف ایک جذبہ کی ملوثیت کا کمال تھا -

الف لیلےٰ کے ایک ہیرو کی طرح افضل اپنے من کی دنیا میں خوش و خرم تھا - اپنی توقعات سے زیادہ بامراد ہو رہا تھا - عربی کے مضامین میں سے اُسے صرف اشعار سے دلچسپی رہ گئی تھی - وہ ہر وقت قیس عامری کے نغمات سنتے بیٹھا رہتا - عشق کا چشمہ اس کے پتھریلے دل سے اُبل اُبل کر ایک سمندر کی صورت اختیار کر چکا تھا - مجھے خدشہ ہونے لگا کہ کہیں اس میں وہ خود غرق نہ ہو جائے - پس پردہ کے غرق ہونے کا مجھے اندیشہ نہ تھا - کیونکہ افضل کے پاس صرف ایک چاقو تھا - اور پھر ماحول کا اثر -

---

ایک اُجڑے ہوئے باغ میں دو پرندے کہیں سے آ کر مل بیٹھے - ایک مغرب سے آیا تھا - دوسرا مشرق سے - اچانک بارش ہونے لگی - چند دنوں میں وہی سوکھا ہوا باغ ہرا بھرا ہو گیا - تنکوں کا گھونسلہ نشیمن بن گیا - ہر طرف خودرو پھول اُگ آئے - سبزہ مخمل کا فرش بن گیا - جس پر فیاض قدرت ہر صبح شبنم کے موتی نچھاور کرنے لگی - دونوں پرندے مل کر دن بھر گاتے انھیں نہ صیاد کا ڈر تھا - اور نہ خزاں کا - اُن کا ماضی تاریک تھا - حال روشن ہو گیا - اس لئے مستقبل سے وہ لاپروا ہو گئے - اُنھوں نے بہار کو جاوداں سمجھا ـــ بھولے بھالے پرندے انھیں کیا خبر کہ اسی بہار کی مسرت بار ہواؤں میں لاکھوں بجلیاں پوشیدہ ہوتی ہیں - شبنم کے موتی اپنے اندر باد و باراں کے ہزاروں طوفان لئے ہوئے ہوتے ہیں - صیاد ہمیشہ بہار میں ہی دام پھیلاتا ہے -

افضل بھی فکر فردا سے بے خبر تھا - وہ اپنی خوشی کو دوام سمجھ رہا تھا - اُسے کیا خبر کہ تصویر کا دوسرا رخ تاریک ہوتا ہے - مگر وہ خزاں کی تباہیوں سے بے پروا تھا - چلمن کے پردے ہلتے - گویا ساز کے شکستہ تاروں کی طرح ان میں سے آواز نکل کر دل میں درد پیدا کرنا چاہتی تھی - اشک آلود آنکھیں بے کسی کی ایک داستان سُنا کر ہماری سماج کا ماتم کر رہی تھیں - میں پرنم نگہ کے آنے والے منظر کو محسوس کر چکا تھا - مگر افضل بیچارا اس کا تصور بھی دل میں نہ لا سکتا تھا - وہ آنکھیں پُرنم دیکھ کر انھیں اپنے جذب محبت کا نتیجہ سمجھتا میں نے اُسے اس حسین دھوکہ میں رکھنا ہی مناسب جانا - مجھے ڈر تھا - کہ کہیں اس کا دل - جو اب نازک بن چکا تھا اس صدمہ سے ٹوٹ نہ جائے ـــ

مگر خزاں کے آثار خود بخود فضا میں محسوس ہونے لگے ہیں -

محلے بھر کو ڈھولک کی مکروہ آواز نے تنگ کر دیا - کئی دن سے افضل کے سامنے والے گھر میں ڈھولک بج رہی تھی - خزاں کے آثار نمودار ہو چکے تھے - چمن اُجڑنے والا تھا - نشیمن پر بجلی گر چکی تھی - تیلیاں جل رہی تھیں - پھول مرجھا کر کشتہ ناز کا ماتم کر رہے تھے - صیاد کا تیر - باد و باراں کی بجلیاں - خزاں کی آمد سب مل کر افضل کی دُنیا برباد کر گئے - اب وہ مرجھایا ہوا پھول تھا - اور منتظر کہ کب کوئی آئے اور اُسے پاؤں تلے مسل ڈالے - چلمن کا ارتعاش آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے معدوم ہو چکا تھا - اُمید کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا -

دل ہجوم غم سے باہر ہو جائے تو زبان خود بخود بند ہو جاتی ہے - افضل کی زبان کے ساتھ اس کا کمرہ بھی بند رہنے لگا - وہ دن بھر اندر بند رہ کر دل کی بربادی کا نظارہ کرتا - کہیں شادیانے بج رہے تھے - اور کہیں انھیں لمحات میں ماتم ہو رہا تھا -

آخر وہ گھڑی آن پہونچی جس کا مجھے خدشہ تھا - ایجاب و قبول کی حسین ترکیب کے دھوکے میں خرید و فروخت ہونے والی تھی - خریدار نے اپنا مال پسند کیا - اس کے ساتھی خریدار کی خوش بختی پر خوش و خرم شادیانے بجا رہے تھے - دن بھر خوب گھما گہمی رہی - شام سے قبل رخصتانہ ہونے والا تھا ـــ میری آنکھوں میں افضل کا ہیرو پھر گیا - وہ پہاڑی پر کھڑا پکار پکار کر کہہ رہا تھا -

اگر میں نے تجھے شادی شدہ بھی دوسرے سے نہ چھین لیا مجھے پھر تو مرد نہ کہنا -

میں نے تجھ پر سب شرم و حیا قربان کر دی اب اگر تو مجھے موت کے بدلے میں بھی ملے تب بھی نہیں چھوڑ سکتا -

میں حُسن کا چوکیدار بنا بیٹھا ہوں - اس وجہ سے میری نیند حرام ہو گئی ہے تاکہ دشمن ترے حُسن پر دست درازی نہ کرے -

برات جا رہی تھی - اور وہ کھڑا نائر کر رہا تھا - دولہا خون میں لت پت زمیں پر تڑپ رہا تھا - میرے تخیل نے اس نوجوان کو افضل کا روپ دے دیا - میں کانپ اُٹھا - مگر افضل کے پاس بندوق کہاں - لاہور کے ایک محلے میں "پہاڑی"! لیکن چاقو کے ایک وار سے وہ دولہا کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے - پہاڑی کی ضرورت نہ تھی - لیکن افضل ـــ ماحول نے اسے تبدیل کر دیا تھا - جس کے نزدیک زندگی کا مقصد فرحت یا مرنا مارنا تھا - اب وہ خود . . . . حُسن کا چوکیدار چور کے ڈر سے آنکھیں بند کر لینا ہی کافی سمجھے ہوئے تھا -

افضل کئی دن کے بعد مجھے ملا ہے - اب وہ بالکل تبدیل ہو چکا ہے - اس کے معصوم چہرے پر اب سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں - وہ ایسا معلوم ہوتا ہے - جیسے صحرا میں کوئی اکیلا رہ گیا ہو ـــ

نخلستان اچانک آباد ہو گیا تھا۔ اس نے اس آبادی کو جاوداں سمجھا۔ مگر قافلہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ یہی صحرانورد کی زندگی ہے —

اور وہ اکیلا بیٹھا گردِ کارواں میں اپنی روح کو سرگرداں دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے کان نالۂ جرس کی آواز میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی پکار دور سے سُن رہے تھے۔

غزل

از

حرماںؔ خیرآبادی

یہ کس ناشاد کی رودادِ غم دہرائی جاتی ہے
ہنسی بے ساختہ اُن کے لبوں پر آئی جاتی ہے

ذرا اُن کے پیامِ عذر کو کہتے ہوئے ٹھیرو
مرے دل کے تبسّم کی کلی مرجھائی جاتی ہے

یہ کہہ کر اس ستم ایجاد نے ٹھیرا دیا مجرم
کہ اس کے دل کے گوشے میں تمنّا پائی جاتی ہے

اگر وہ سحر پرور سامنے ہوتا تو بتلاتا
کہ کتنی سادگی سے چوٹ دِل پر کھائی جاتی ہے

نہ پوچھو حال اس طوفان بے پایاں میں ہستی کا
چراغ اس طرح روشن ہے کہ لَو تھرّائی جاتی ہے

شبِ مہتاب میں اللہ رے اُن کا حُسنِ زیبائش
ستارے دم بخود ہیں۔ چاندنی شرمائی جاتی ہے

سراپا آتشِ غم۔ برقِ خاطف جس کو کہتے ہیں
وہ میری زندگی کے خرمنوں میں پائی جاتی ہے

جہانِ بے کراں اور اک نفس کی زندگی یعنی
معاذاللہ۔ طوفانوں سے ٹکّر کھائی جاتی ہے

ارے توبہ، زمانے میں تفوّق کی یہ بیتابی
چمک ذرّے کی اور خورشید سے ٹکرائی جاتی ہے

کوئی حرماںؔ نجات و عفو کے طالب کو سمجھا دے
کہ ان توبہ کی باتوں سے کہیں سوئی جاتی ہے

بسمارک

حالات و سوانح

از :- سید بدر ابن عظیم صلاحی

ہم اپنی موجودہ تحریک ارتقا میں جو اپنی اساس و نظم کے لحاظ سے قوی اور قوت و فراست ایمانی کے لحاظ سے آہن سوز ہے سیاسی ثقافت کے سخت محتاج ہیں۔

لیکن سیاسی ثقافت کی طبعی رفتار بہت ہی سست ہے اور عموماً بہت دیر میں وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس شجر میں اس وقت تک برگ و بار آتے ہیں جب تک کہ تاخیر کا آخری موسم نہ آجائے۔ یہ اسی وقت مفید ہوسکتی ہے جب آہستہ آہستہ جزوی طریقہ سے تعمیر کی جائے۔

مثلاً فرض کیجئے کہ ایک قوم بیداری کی ابتدائی منزل پر ہے اور اس کو علمی بیداری۔ اقتصادی بیداری، صنعتی بیداری۔ اسی طرح دوسری ثقافتوں میں بیداری کی ضرورت ہے تو ابتداءً اس کی ثقافتی جد و جہد حصول دولت اور ترفہ حالی کی بنیاد پر شروع ہوتی ہے اور جب وہ ابھرنے والی جماعت ایک حد مناسب تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے تو اس کے میلانات کا مرکز پہلے ادبیات اور بعد ازاں سیاسیات کا میدان ہوتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم بیداری کی جد و جہد کے میدان میں اترتی ہے باوجودیکہ اس کی اقتصادی اور صنعتی بنیادیں بہت کمزور ہیں اس کے پاس علمی۔ ادبی سرمایہ نہیں۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ اپنی سیاسی مساعی میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کی کامیابی کو اصولی کامیابی نہیں کہا جا سکتا۔ ضرور ہے کہ اس کامیابی کی وجہ خارجی اثرات ہوں گے۔ نہ کہ اس کے عناصر اور نہ اس کامیابی کی بنیاد داخلی اجزا بن سکتے ہیں۔ بہرکیف یہ فن سیاسیات کا دقیق مسئلہ ہے۔ اور میں اس موقع پر اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ کیوں اور کس طرح؟ میرا مقصود اس تذکرہ سے صرف یہ بتانا ہے کہ سیاسی ثقافت بالطبع دوسری ثقافتوں کی جد و جہد کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی تاریخ ارتقا، وحصول مدارج مقصود میں سست رفتار ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس کوم میں جتنی کاوش اور جان فروشی غیر عاملانہ طور پر کی جائے اتنی ہی زیادہ کامیاب ہوگی۔

یہاں سیاسی ثقافت کی تشریح اس لئے کی گئی ہے کہ میں آئندہ جس مفکر کے حالات پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا محکمِ نظر بنیادی سیاست اور اس کی بنیاداً اصول ثقافت سیاست ہوگی۔ اگرچہ ابطال سیاست کے کارنامہ ہائے حیات بجائے خود اصول و بنیادی سیاسیات ہیں۔ بعض سیرۃ نگاروں کا تو خیال ہے کہ سیاسی تالیفات۔ درسی قوانین۔ دستوری تاریخ۔ اور ڈپلومیٹک نظریات پر غور کرنے سے بہتر اور مفید یہی ہے کہ ابطال سیاست کے کارنامہ ہائے حیات پورے غور و خوض کے ساتھ پڑھ لئے جائیں کہ یہی اس کی تکوین و ایجاد کے واحد دلیل اور اثباتی اسباب و اجزا ہیں۔ جب آپ کے سامنے چند سیاسی رہنماؤں کے حالات آئیں گے تو آپ بھی اس رائے سے اتفاق کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میں اس مضمون میں دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مفکرین میں سے ایک عظیم شخصیت سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو دنیا کی اہم ترین تاریخ سے وابستہ ہے اور جس نے اپنی قوت فکر و تدبر سے ایک قومی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ایک عظیم امپائر کا بانی بنا۔ جس نے جرمنی کو اتحاد کا درس دیا۔ اور فرانس کے جبین غرور حکومت اور پیشانیٔ عظمت و اعتلا۔ کی سلوٹوں کو مٹایا۔

یہ مختصر تعریف کس شخصیت کی ہے؟ یہ وہی پرنس اٹو ایڈورڈ لیوپولڈ فان بسمارک ہے۔ جس کے متعلق "ٹائمز آف برنز" کے دیہاتی وجرمنی کا سرحدی مقام ہے ایک ایڈیٹر موسیو پلونیز نے کہا تھا کہ انیسویں صدی نپولین اور بسمارک کے درمیان منقسم ہے۔ اول کے لئے نصف اور ثانی کے لئے نصف ثانی۔ اور بقیہ مشاہیر وقت۔ لیڈر، مصنفین۔ فلاسفر، اطبا، انجنیر اور اساتذہ۔ سب کو ایک الگ فہرست میں لکھنا چاہیئے۔ جس کے سر فہرست جلی حروف سے نپولین اور پرنس بسمارک کا نام کندہ ہو۔

بسمارک کا مولد و منشاء

اٹو ایڈورڈ لیوپولڈ فان بسمارک یکم اپریل ۱۸۱۵ء کو ایک شریف گھرانے اور خوش حال خاندان میں تولد پذیر ہوا۔ اس خاندان کے بیشتر افراد حکومت پروشیا میں بلند عہدوں پر فائض تھے۔ یہ خاندان۔ پروشیا بھر میں اپنی بلند ہمتی اور وسعت نظر کے لحاظ سے بہت مشہور تھا۔ بسمارک کے والد پروشی فوج میں ہیڈکوارٹر تھے۔ ان کی والدہ بہت ہی کریم النفس خاتون تھی۔ جو ورع و تقویٰ، حریت فکر اور استقلال رائے میں اسی طرح ممتاز تھی جس طرح ذہانت، فکر اور [illegible]

میں بلند درجہ رکھتی تھی۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بسمارک کی شجاعت بھی اس کی سیاسی دلچسپی۔ فراست اور صبر و مشقت کس طرح اس کی والدہ کا نسلی عطیہ ہے۔ چنانچہ اس کی والدہ نے بچپن میں جب دیکھا کہ یہ سیاست و متعلقہ سیاسی امور سے کافی دلچسپی لیتا ہے تو مناسب سمجھا کہ اس کو فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے بھی محروم نہ رکھے۔ بسمارک نے ان دونوں زبانوں کو بھی سیکھا۔ اور ان زبانوں کی بالخصوص انگریزی کی جس میں وہ گفتگو بھی زیادہ کرتا تھا۔ تقریباً تمام اچھی تصنیفوں کا مطالعہ کرلیا۔

تعلیمی زندگی کی داستان

بسمارک کی ابتدائی تعلیم برلن کے ایک خاص مدرسے میں ہوئی پھر وہاں سے منتقل ہوکر [illegible] چلا گیا۔ جب سترہ سال کا تھا تو [illegible] یونیورسٹی میں ایک سال سے کچھ زیادہ تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں برلن واپس ہوا۔ اور ۱۹۲۹ء میں اعلیٰ تعلیم ختم کرکے عام دنیاوی زندگی میں داخل ہوا۔

بسمارک چونکہ ایک بہادر و شجاع انسان تھا۔ اس لئے سیر و شکار کا بہت شوقین تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ [illegible] زمانہ تعلیم میں اس کے دو مشہور مشغلے تھے۔ ایک سیر و شکار اور دوسرے [illegible] سے مقابلہ جب وہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو ایک سال کے دوران میں اس نے ۲۹ مرتبہ طلبہ کے مقابلہ میں شرکت کی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ سوائے ایک مرتبہ کے کبھی شکست نہیں کھائی جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مقابلہ شدائد اور جد و جہد کا جذبہ اس میں فطرتاً ودیعت تھا۔ ظاہر ہے کہ واقعے کے خیر و شر دونوں رخ ہیں۔ مثلاً یہ ہے کہ اس سے ایک انسان کے نفس پرست۔ جاہ پسند اور ہوس پرست ہونے پر بھی استدلال کیا جا سکتا ہے پھر دنیا میں کون سا واقعہ ہے جس کے خیر و شر دونوں پہلو نہ ثابت ہو سکتے ہوں۔ میں تو کہہ سکتا ہوں کہ ہر معاملہ کے دونوں رخوں میں سے جس کو چاہوں ثابت کر سکتا ہوں۔ اس واقعہ کی خوبی کے لئے یہ کافی ہے کہ اس نے بسمارک کو ابتداء سے کامیابی۔ اور کامیابی و علو کے لئے شدید جد و جہد کا عادی بنا دیا۔

جس طرح اس طالب علم کے دل میں جو جماعت میں ایک مرتبہ اول رہا ہو پھر دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اول رہا ہو۔ اولیت کا قوی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جد و جہد اور مقابلہ کا بھی۔ پس وہ شخص جو جوان اس طرح ہوا ہو کہ مقابلہ و مبارزت کے آب و دانہ نے اس کی پرورش کی ہو ضرور ہے کہ اس کے دل میں بھی غلبہ اور فوقیت اور رفتہ رفتہ استعمار کی قوت پیدا ہو جائے۔

[illegible] درجہ کی حق پرستی کی عادت نے بسمارک کو درسیات سے فارغ

نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف وہ برابر امتحانوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرتا رہا میں نے اس بات کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا ہے کہ بعض عزیز نوجوانوں کو میں نے [illegible] دیکھا اور دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کے متعلق [illegible] اوقات خارج از درسیات اور دوسرے غیر ضروری مباحث میں صرف کرتے ہیں۔ اور اگر بہ نظر غائر دیکھئے تو حوالہ میں ان لوگوں کا نام پیش کر دیتے ہیں جو [illegible] دوسری مجبوری کی بنا پر درسیات سے پوری طرح [illegible] سکتے تھے مگر پھر بھی [illegible] کی وجہ سے مشاہیر کی صف میں آ گئے [illegible] تعلیم سے فراغت کے بعد [illegible] کے دارالقضاء کا رکن مقرر ہوا۔

[illegible] کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں [illegible] کا جذبہ بہت [illegible] تھا۔ [illegible] اس کی کچھ [illegible] کر دی جائے۔ [illegible] کو اپنے ارادہ کے مطابق [illegible] اور اپنے تقدم و غلبہ کا معترف [illegible] مگر اس [illegible] یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ [illegible] حاکم یا [illegible] بر حاکم [illegible] میں اس کو خصوص طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ [illegible] ذاتی بلکہ قومی جذبہ تھا۔ جس نے بسمارک کو کورٹ کی ملازمت سے علیحدہ ہونے پر مجبور کیا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ بسمارک کورٹ (عدالت) میں ایک شخص کی شہادت سن رہا تھا۔ اس کو گواہ کی بعض حرکتیں ناگوار معلوم ہوئیں اگرچہ وہ کمیٹی کا صدر نہیں تھا مگر اس کی ریاست پسند طبیعت نے اس کو مجبور کیا کہ وہ گواہ کو ڈانٹ دے چنانچہ اس نے گواہ سے کہا کہ اعتدال اختیار کرو ورنہ میں یہاں سے باہر نکال دوں گا۔ صدر کو بسمارک کا یہ دخل در معقولات سخت ناگوار ہوا۔ اس نے بسمارک سے کہا کہ جناب کہاں ہیں۔ ہوش میں رہئے۔ کہ یہ عدالت ہے اعتراض کا حق صرف مجھکو حاصل ہے آپ کو نہیں۔

ظاہر ہے کہ بسمارک اس زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے فوجی زندگی کا رخ کیا لیکن اس کی [illegible] فوجی زندگی کے مختلف پہلو کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ اس وقت شراب خوار بھی تھا اور زعامت و صدارت اور تفوق کا قوی جذبہ بھی اس کے دل میں متمکن تھا۔

ان حالات میں وہ کیونکر ملازمت کرتا؟ اور کیوں اپنے والد کی موروثہ کاشت کاری کی طرف رجوع نہ کرتا ۱۹۲۹ء کو اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے اب ملازمت سے قطع تعلق کرکے اپنے والد کی جائداد کی نگرانی شروع کی۔ یہ ایک ایسا میدان تھا جہاں نہ قاضی و صدر کے احکام کی تعمیل ضروری تھی۔ اور نہ کسی طرح کی قید و بند۔ یہاں کا حاکم اعلیٰ صرف وہ تھا۔ رعایا

کے تمام جھگڑے اس کے فیصلے کے پابند تھے۔ علاقے کے تمام مویشیوں اور انسانوں پر اسی کی حکمرانی تھی۔

ممالک یورپ کی سیاحت

۱۹۴۳ء میں وہ پیرس گیا۔ جب سفر سے واپس ہوا تو اس کی داڑھی لمبی ہوگئی تھی۔ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ داڑھی کے ذکر کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں داڑھی اپنے ساتھ ایک داستان منسلک رکھتی تھی۔ اس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ ایسا شخص فرانس کے سیاسی مذاہب کا پورا معتقد ہے۔ اور اپنے عقیدہ و رائے کا پوری طرح پابند رہے گا۔ اور اس کی طرف سے مدافعت بھی کرے گا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بسمارک پر خاندانی عادات اور تعلیمی زندگی کا بہت گہرا اثر تھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا۔ جس کی کشش نے اسے ابتدائی زندگی ہی میں آزادی رائے۔ آزادی مذہب اور مزدوروں کے حقوق جیسے خیالات کی طرف متوجہ کر دیا۔

اسی بنا پر ہم تصدیق کر سکتے ہیں کہ سفر پیرس نے اسکو فرانسیسی نظام سے اتفاق پر آمادہ کیا لیکن اس کی آئندہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ استقرار کے قوی جذبے نے اس کو دوسری طرف منعطف کر دیا۔ جس کے بعد وہ ہر اس راہ کی طرف چلنے پر آمادہ تھا۔ جس طرف وہ اپنی انتقاری قوت اور انانیت کو ساتھ لے جاسکے خواہ یہ انانیت آزادی رائے کے مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ یہ انتقار رجعت پسند ہونے کا الزام کیوں نہ لگائے۔ خواہ اس غلبہ و انتقار کی خاطر سے تی فرلقیہ کے ایک بادشاہ کو حکومت سے باغیوں کی جماعت کے ذریعہ قتل کرانے کے جرم کا ارتکاب کیوں نہ کرنا پڑے تاکہ وہ اپنے سیاسی غلبہ کی راہ پائے اور اپنے مقصد تک پہنچ جائے۔ پس وہ اس معاملہ میں سیاست کا بکیا فی ہے جو نہ عقیدے کا احترام کرتا تھا۔ اور نہ اس کے نزدیک اخلاقی اصول کی کوئی قیمت تھی۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ ۱۸۴۲ء میں پلوں کا نگراں اور زمیوں کا محافظ مقرر ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے دوبارہ ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اسی سال اس نے انگلینڈ۔ سوئزرلینڈ۔ اور فرانس کے ممالک کی سیاحت بھی کی۔

ازدواج ۱۸۴۷ء میں

اس کی شادی یوحنا نامی ایک عورت سے ہوئی۔ بسمارک کا عشق عجیب طرز کا تھا۔ وہ یوحنا سے محبت کرتا۔ اسی کا مجنوں اور اسی کا پجاری تھا۔ اس کو اس سے گفتگو کا کافی موقع ملتا تھا۔ وہ بھی بسمارک سے ملتی اور اس کے علم سے استفادہ کرتی تھی۔ گویا وہ اس معاملے میں بسمارک کی ذہنی خصوصیتوں کی معترف تھی۔ ان سلسلہ جنبانیوں کے باوجود ابتداءً جب بسمارک نے اظہار محبت کیا۔ تو اس نے اس اظہار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور کہدیا کہ میں ایسے شخص سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ جو بلانوش شرابی ہو۔ اپنے اوقات لہو و لعب اور عشق بازیوں میں ضائع کرتا ہو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ محبت کی ابتداء ہمیشہ نفرت سے ہوتی ہے۔ جب محبت کی آنچ نے اس کے دل کو خوب تپایا تو پھر ان ہی منکر نگاہوں نے حقیقت کا اعتراف بھی کیا۔ جس طرح بسمارک نے اس کی علمی اور ذہنی ترقیوں میں کافی مدد پہنچائی۔ اسی طرح بسمارک کی زندگی بھی یوحنا نے تعمیر کی۔ یوحنا نے اس کی رغبت لہو و لعب کے میدان سے ہٹا کر نافع و مفید خدمتوں کی طرف مائل کر دی۔

بسمارک کو اس سے محبت تھی۔ وہ اس کے حسن کا مفتوں تھا ان دونوں کی داستان محبت۔ طوالت کے لحاظ سے ایک ضخیم ناول بن سکتی ہے جس کی تفصیل کا یہاں کوئی موقع نہیں۔

بسمارک کے مستقبل کی تعمیر کیسے ہوئی؟

سیاسی کامیابی میں ایک حصہ جد و جہد کا ہے اور ایک حصہ تقدیر کا۔ یہ ایک حق ہے اور حق دلیل کا محتاج نہیں۔ یہ تجربہ کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

تقدیر کا فیصلہ تھا کہ بسمارک مع زوجہ۔ شادی کے بعد سوئزرلینڈ۔ اور اٹلی جائے۔ یہ بھی مقدر تھا کہ وہ شکار میں جائے۔ اور یہ بھی تقدیر کا فیصلہ ہی تھا کہ اس شکار کے ذریعہ فریڈرک ولیم رابع شہنشاہ پروشیا سے ملاقات ہو اور یہ بھی قدرت ہی کی مشیت تھی کہ وہ اپنے ملک کے بادشاہ کے یہاں کھانے پر مدعو ہو۔

یہ بھی تقدیر ہی کی بخشش تھی کہ بسمارک کو بادشاہ سے گفتگو کا موقع ملے۔ اور یہ بھی قدرت ہی کا فیضان تھا کہ بادشاہ اس گفتگو سے بسمارک کی ذہانت کا معترف و قدردان ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ اس شاہی ملاقات کا اثر اس کی زندگی پر کتنا گہرا پڑا۔ جس کے بعد وہ ملوکیت کا شدید ترین حامی بن گیا۔

پارلیمانی زندگی

حسن تقدیر سے وہ اسی سال جس سال کہ اس کی شادی ہوئی۔ اور

بادشاہ سے تفصیلی ملاقات کا موقع ملا۔ پارلیمنٹ کا ممبر بھی منتخب ہوگیا۔ اس وقت وہ برلن کے شرفا میں اہلیت وصلاحیت میں مشہور تھا۔ پارلیمنٹ میں وہ برابر ملوکیت کی حمایت کرتا۔ چنانچہ اس کا مشہور مقولہ ہے کہ "بادشاہ تخت شاہی پر خدا کی مشیئت سے متمکن ہوتا ہے نہ کہ سیاسی پارٹیوں کی مشیئت سے" اس نے حقوق ملکیت کی پوری طرح مدافعت کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب پارلیمنٹ میں اس نے ملوکیت کی حمایت میں پہلی تقریر کی تھی تو تمام ممبروں کا ضبط وغضب ہیجان میں آگیا تھا۔ لیکن بسمارک جیسی آہنی شخصیت نے ان عضبناکیوں کی مطلقاً پرواہ نہ کی۔ اور برابر حمایت ہی میں تقریریں کرتا رہا۔ ممبروں سے اس نے اس درجہ اظہار نفرت کیا کہ جب وہ اجلاس میں شرکت کرتا تو بجائے تجاویز پر غور وفکر اور تقریریں سننے کے کوئی رسالہ اپنی جیب سے نکال کر پڑھنا شروع کر دیتا۔

اخبارات سب اس کے دشمن ہو گئے۔ حملے کیے گئے۔ رجعت پسند اور ملوکیت پسند ہونے کا ملزم گردانا گیا۔ لیکن اس کے برخلاف وہ اپنی پالیسی پر پوری پابندی سے قائم رہا حتیٰ کہ ملوکیت کی حمایت میں اپنے خاص مصارف سے ایک اخبار بھی جاری کیا۔

ایک سال تک وہ پوری سرگرمی کے ساتھ اپنی کوششوں میں منہمک رہا۔ لیکن بادشاہ کو ۱۸۴۸ء میں آزادی پسند طبقہ نے مجبور کر دیا کہ ان کے مطالبات تسلیم کرے مطالبات کا تسلیم کرنا تھا کہ بسمارک سیاست سے الگ ہوگیا۔

لیکن ملوکیت کی حمایت میں اس کی جد وجہد رائیگاں نہیں گئی۔ درحقیقت اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ حکومت کی پارٹی کو پارلیمنٹ میں جگہ ملی۔ ورنہ آزادی پسندوں کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ اسی کی کاوشوں سے ۱۸۴۸ء کا انقلاب سنبھلا۔ اور پھر بادشاہ کا حق تسلیم کیا گیا۔

بسمارک کو سیاست سے الگ ہوئے زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ برینبرگ سے جدید پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوگیا۔ اس جدید نظام میں بھی وہ ملوکیت کی پوری سرگرمی سے حمایت کرتا رہا۔ اس کی تقریروں میں وہی تقریریں زیادہ زوردار ہیں جو انقلاب اور انقلابیوں کی مخالفت میں کی گئی ہیں لیکن ساتھ ہی وہ پروشیا کی خارجی سیاست میں انقلابیوں کا زبردست حامی بھی تھا۔ بسمارک کی طاقت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باوجود اختلاف عام پروشیا کا جدید دستور بھی تقریباً اسی کا تیار کیا ہوا تھا۔ اس اجمال کی مزید توضیح یہ ہے کہ جب پروشیا میں ۱۸۴۸ء کا انقلاب برپا ہوا اور ۱۸۵۰ء میں ایک نئی پارلیمنٹ بنائی گئی تو تجویز پیش ہوئی کہ بلجیم کا نظام حکومت پروشیا میں بھی رائج کیا جائے۔ اس موقع پر بسمارک ہی تھا جس نے کہا تھا کہ بلجیم کے دستور حکومت کی عمر ابھی صرف اٹھارہ سال ہے۔ اس لحاظ سے یہ طریقہ ابھی کامیاب ہی نہیں کہا جاسکتا۔ اٹھارہ سال کی دوشیزہ بے شک حسین ہوگی۔ لیکن دستور حسین نہیں ہو سکتا۔

سیاسی زندگی

جب بادشاہ نے دیکھا کہ اس وقت بسمارک سے بڑھکر ملوکیت کا حامی کوئی دوسرا نہیں مل سکتا تو ۱۸۵۱ء میں اس کو مجلس اتحاد جرمنی کا جو فرنکفورٹ میں تھی سیاسی نمائندہ مقرر کر دیا۔

جس طرح ایک حسین وجمیل۔ خوش اندام۔ خوش گفتار دوشیزہ سے شادی نے اس کو جنون رندی۔ آوارگی عشق اور بربادی صحت سے نجات دلائی۔ اسی طرح پارلیمنٹ کے اس انتخاب نے اس کو حیرانیٔ سیاست کے بارے سبکدوش کر دیا۔

پارلیمنٹ کا یہ انتخاب بسمارک کی سیاسی زندگی کی تعمیر میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعہ ایک مستقل سیاسی جد وجہد کا میدان اس کے سامنے آگیا جس نے اس کے دماغی توازن کو دوسری طرف مائل ہونے سے باز رکھا۔

جرمن ممالک میں آسٹریا کا مستبدانہ اقتدار قائم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۱۵ء سے ہی۔ جب سے کہ نپولین نے بربادی وہلاکت پھیلائی تھی جرمن ممالک میں کوشش جاری تھی کہ متحد ہو جائیں۔ لیکن آسٹریا اپنے بقاء اقتدار کی ہوس میں کوشش بلیغ کرتا رہا کہ ان کو متحد ہونے کا موقع نہ ملے اور اپنی سیاسی چالاکیوں اور دسیسہ کاریوں کے سبب سے برابر اپنے ارادہ میں کامیاب ہوتا گیا۔ اس موقع پر بسمارک کی فکر رسا قابل داد ہے۔ جس نے اس حکمت عملی کا راز فاش کیا اور صرف راز ہی فاش نہ کیا بلکہ آسٹریا کو شکست تک دے دی۔

ابتداءً بسمارک کا خیال تھا کہ اس کی جبین اطاعت کو ہمیشہ آسٹریا کی صداقت کا محافظ رہنا چاہئے۔ کیونکہ اس نے سمجھا تھا کہ پروشیا کا سب سے صادق دوست آسٹریا ہی ہے۔

اس خیال کا تلازمہ تھا کہ پروشیا کی حکومت آسٹریا کے طرز حکومت پر چلنی چاہیے۔ لیکن جب آسٹریا کے نفاق کا راز اس مدبر کی نگاہوں کے سامنے آگیا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ اس کی سیادت کو چھوڑے بغیر دم نہ لے گا وہ آئندہ سال تک اس کوشش میں لگا رہا اور بالآخر کامیاب ہوگیا۔ آسٹریا کو

شکست دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا یہاں تک کہ اس نے اخبارات و رسائل سے بھی جو اس کے مخالف تھے استدعا کی۔ اور اخبارات نے بھی لے دل کھول کر مدد دی۔ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ جب اس پر روشن ہو گیا کہ فرنکفورٹ اسمبلی میں پروشین حکومت کو وہ حق حاصل نہیں ہے جو آسٹریا کی پوزیشن ہے تو اس نے متعدد پُرجوش پُرعقیدہ تقریریں کیں۔ اس کی پُرجوش تقریروں سے اسمبلی ہال گونج اُٹھتا یہاں تک کہ عالم غضب میں کبھی کبھی اپنے کپڑے تک اُتار پھینکتا۔

بسمارک کے ان خطوط سے جو جنرل فان جرلاخ" کے نام ہیں پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت فرنکفورٹ اسمبلی میں اس کی کوششوں کے بہت سے کرشمے کارفرما تھے۔ جنھوں نے ممالک جرمنی میں حکومت پروشیا کو بہت بلند کر دیا تھا۔ اس کی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شہنشاہ پروشیا ہر سال اس کو برلن اس غرض سے مدعو کرتا تھا کہ مسائل عامہ میں اس کے مشوروں سے استفادہ کرے۔ مورخین کا بیان ہے کہ ایک سال تو بادشاہ نے تقریباً بیس مرتبہ مدعو کیا۔ ضروری ہے کہ اس موقع پر جرمنی او مستقبل جرمنی کے بارے میں بسمارک کی رائے نقل کر دوں۔

اس کا پختہ عقیدہ تھا کہ جرمنی کی فوجی طاقت کو پوری طرح تقویت دی جائے۔ تاکہ ایک طرف تو یورپ کے ممالک کو مطیع کیا جائے۔ اور دوسری طرف جرمنی کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ایک مرکزی حکومت کے تحت جمع کیا جا سکے۔ اور اخیر میں جمہوریت پسندوں کو مغلوب کر کے جرمنی کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا جائے۔

اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بسمارک اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا ناکام رہا۔

یہاں جواب دینے سے پہلے ہم یہ ذکر کر دینا چاہتے ہیں کہ اس عرصہ میں بسمارک کے وہ خطوط جو اس نے اپنی بیوی کے نام لکھے۔ شباب کے سوز و گداز سے پُر ہیں۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب اس کو شباب کی ہوس کاریوں پر کتنی ندامت اور کتنا افسوس تھا۔ جس کی جگہ اس کے دماغی میلانات کا مرکز توراۃ و انجیل اور التجائے رحمت بن گیا۔

اب میں ان دو سالہ واقعات پر ایک عاجلانہ نگاہ ڈالنا چاہتا ہوں جن کی تفصیل ضخیم کتابوں کی محتاج ہے۔ کیونکہ وہ اہمیت کے لحاظ سے بمنزلہ انیسویں صدی اور یورپ کی سیاسی تاریخ کے ہیں۔

سنہ ۱۸۵۹ء

یہ سنہ پروشیا کی تاریخ اور بسمارک کی زندگی دونوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پروشیا کی تاریخ میں اہم اس لئے ہے کہ اسی سال" فریڈرک ولیم رابع" کو اپنی عقلی کمزوریوں اور سیاسی غلطیوں کی بنا پر اپنے حقوق سے دست بردار ہونا پڑا۔ اور اس کا ایک نائب" پرنس ولیم مقرر ہوا اور بسمارک کے لئے اس لئے اہم ہے کہ وہ فرنکفورٹ کے بجائے روس کا سفیر مقرر ہو کر پیٹرزبرگ منتقل ہوا۔ جہاں چار سالہ خدمات کے عوض قیصر کے عزت و احترام کا مستحق بنا۔ اور ہمارے لئے اہم اس لئے ہے کہ اسی سال بسمارک نے اپنا وہ طویل رسالہ مرتب کیا جس میں جرمنی کی فوجی تقویت اور یورپ کے سیاسی انجام پر تفصیلی بحث کی تھی۔ جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔

سنہ ۱۸۶۱ء

بسمارک کی زندگی کا یہ دوسرا اہم سال ہے۔ کیونکہ وہ اسی سال اپنی حکومت کی طرف سے پیرس کا سفیر مقرر ہوا۔

اس موقع پر بقول "لڈوگ" اس کے راست باز دوست جنرل فان اون" کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔ جو وزارت جرمنی کی طرف سے وزیر حرب تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی لکھ دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں بسمارک کا اثر بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ آزاد وزراء کی جماعت بسمارک کے مشوروں کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اور یہ سمجھتی تھی کہ جرمنی کی فوجی تقویت کے بعد یورپ پر قابض ہونا محال ہے۔ یا وہ اس کی شخصیت اور آمریت پسند طبیعت سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان حالات میں بھی جنرل اون" جرمنی کی فوجی تعمیر کے اصلی عقیدہ سے متفق رہا۔

اس زمانہ میں آزادی پسند طبقہ کو تقویت حاصل ہوتی رہی۔ اور ملک میں اس کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ بادشاہ کو دست برداری کی فکر دامنگیر ہو گئی جب جنرل اون کو اس کا پتہ چلا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ مفکر وقت (بسمارک) سے استدعا کرے۔ بہتر ہو کہ اُسی کو وزارت بنانے کا حق دیدیا جائے کیونکہ میری نظر میں سوائے بسمارک کے کوئی معاملہ کو سلجھا نہیں سکتا۔ بادشاہ نے فوراً اس نصیحت پر عمل کیا۔ بسمارک نے وزارت بنائی جھگڑا فرو ہوا۔ چنانچہ بسمارک کے دوش پر اٹھائیس سال تک وزارت خارجہ کا ثقل گرانبار رہا۔

بسمارک حکومت میں

لڈوگ نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ بسمارک کی جسمانی قوت نے بہت سے خطوں میں اس کی خدمت کی۔ جن میں سے اس نے صرف تین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب بسمارک [illegible]

تو ایک دشمن نے اس پر اچانک وار کیا۔ لیکن وار خالی گیا۔ جب دوسرا وار کرنا چاہا تو شجاع بسمارک نے اپنے ہاتھ سے اس کو گرفت میں لے لیا اور ہتھیار زمین پر گر گیا۔ دوسرا واقعہ جوانی کے زمانہ کا ہے۔ ایک شخص دریا میں غرق ہو رہا تھا کہ بسمارک نے ان طوفانی تھپیڑوں سے مقابلہ کر کے اس کو بچا لیا۔ لڈوگ کا بیان ہے کہ بسمارک اس انسانی خدمت اور اپنی ارادی کامیابی پر اکثر فخر کرتا تھا۔ تیسرا حادثہ بادشاہ کی معزولی اور بسمارک کی بادشاہ سے ملاقات کے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کے بعد لڈوگ نے بسمارک کی مدحت سرائی میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں کہ اُس کے اعمال حیات کو دیکھ کر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے اور اس کی وہ خدمتیں جو روس کی سفارت سے لیکر پیرس کی سفارت تک اور دیگر مواقع دمجالس میں ظہور پذیر ہوئیں کس قدر مسحور کن ہیں۔

بلاشبہ لڈوگ نے بسمارک کی مدحت سرائی میں جو کچھ لکھا سب صحیح لکھا ہے۔ بالخصوص وہ حصہ تو پوری طرح درست ہے جو بسمارک کے فولادی ارادوں کی مدح میں ہے۔

فولادی ارادہ بسمارک کی زندگی کا جوہر اعظم ہے۔ اس کا فولادی ارادہ ہی سیاسی زندگی میں کامیابی کا سبب ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ حکومت کی مشکلات کا فاتح بلکہ حکومت پروشیا کی تعمیر کا سبب بن سکا۔

جب بسمارک سریر آرائے مسند وزارت ہوا تھا تو میدان سیاست ایسا عزم شکن تھا کہ اس پر یا تو بسمارک نے قابو پایا یا وہ پاتا جو بسمارک کی طرح فولادی ارادہ رکھتا ہو۔ ورنہ اور کسی کی ہمت نہیں۔ کیا سیاسی پارٹیاں اور آزادی پسند طبقہ اس کے خلاف نہ تھا؟ کیا اخبارات و رسائل اس کے دشمن نہ تھے؟ اور سب سے بڑھکر کیا خود بادشاہ حقوق قومی کی سکیم کا ارادہ نہ کر چکا تھا؟ لیکن بسمارک فاتح تھا۔ اس کے فولادی ارادوں نے تمام مشکلات پر قابو حاصل کیا۔

یہی وہ موقعہ تھا جب اس کے قتل کی کوشش کی گئی۔ لیکن قدرت کی امداد نے فتح عطا فرمائی یا بقول لڈوگ جسمانی قوت نے دشمن پر غلبہ حاصل کیا۔

غور کیجیے کہ اس مفکر انسان نے اس واقعہ سے کیا فائدہ اُٹھایا۔ اور یکایک سیاست کا رخ پلٹ گیا۔ جرمن جو فطرتاً شجاع ہیں ہر معاملہ میں صداقت۔ شجاعت اور عقل و حکمت کا غلبہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ نہ کہ بزدلی اور کمزوری کا ارتفاع۔ سبھوں نے بسمارک کی تائید شروع کر دی بادشاہ خود اس کے گھر گیا۔ اب بسمارک اپنے مخالف پارٹی کے سامنے شرف تفوق کے عظیم قصر میں تھا۔

بسمارک نے اپنی عقل و حکمت سے فتح حاصل کی۔ اپنی دانشوری و ہوشیاری سے کامیاب ہوا۔ بسمارک اس لئے غالب ہوا کہ اس کے فولادی ارادہ نے کامیابی کی نیت کر لی۔ بس اس کی ہر چیز ارادہ کی تابع تھی وہ جو چاہتا ہو جاتا۔

دوسرے اہم مسائل

بسمارک کے معاصرین بہت ہی چابک دست تھے۔ وہ ہر جگہ اس کے خلاف سازشیں کرتے۔ بادشاہ کے قصر میں اُنھوں نے سازش کا جال کھیلایا۔ اخبارات میں وہ سازش کرتے۔ نمائندہ اسمبلی میں ان کی سازشوں کا دور دورہ تھا۔ پارلیمنٹ میں بسمارک کو صرف پریشان ہی کرنے کے لئے یہ بحث چھیڑ دی تھی کہ قوم کو بادشاہ کے مصارف متعین کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔

لیکن بسمارک نے اُس بسمارک نے جو ابتداء زندگی ہی سے دشمنوں کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ جو صرف اپنے ارادہ کا مطیع تھا۔ جو استقلال کا عادی ہو گیا تھا۔ جو پیدا ہی اس لئے ہوا تھا کہ دشواریوں پر فتح حاصل کرے۔ اس نے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ پھر مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ عزم شکن مشکلات کا قلع قمع ہو گیا۔ اس نے اپنے ارادہ کی فتح تسلیم کرالی۔ اس نے تعلیم دی کہ دشواریوں کی سخت چٹانوں کو توپ اور فولادی ارادہ میں حل کرو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد سے اس کا نام فولادی وزیر رکھا گیا۔

اس موقع پر آپ سوال کریں گے کہ بسمارک نے اپنی قوم اور ملک کے لئے کیا کیا؟ بالخصوص جرمن کے مخالف آسٹریا اور فرانس کو کیسے زیر کیا۔

بسمارک بعینہ اسی پالیسی پر عمل پیرا تھا جس کی دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کی جاسکتی ہے کہ کل امور جوں باد قاتہ اور میں لکھ چکا ہوں کہ سیاسی معاملات میں سست رفتار رہے۔

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ بسمارک نے اپنی قوم کی دشواریوں کے حل کے لئے کیا کیا؟ اس سوال کے جواب سے آپ پر روشن ہو جائیگا کہ بسمارک کی عملی پالیسی۔ مجسب بندی پر عمل پیرا رہی اس کی تفصیل اور سوال کا جواب یہ ہے۔

بسمارک کی رائے تھی کہ اپنی قوم کو خارجی جنگوں میں مشغول رکھے۔ کیونکہ خارجی جنگ ضرور جرمنی کو موجودہ داخلی مشکلات سے نجات دے گی ——

کیا وہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب ہوا؟

بسمارک نے اپنے ایامِ سفارت میں جرمنی اور روس کے سیاسی تعلقات ہموار کئے۔ اور ان تعلقات کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے پولینڈ کے زمانۂ انقلاب میں الگزینڈر ثانی سے چاہا کہ روس اور جرمنی دونوں ملکر فرانس اور آسٹریا کو شکست دیں ——— کیا ایسا ہوا؟

بسمارک کا خیال تھا کہ اس کا ملک داخلی حیثیت سے قوی ہو۔ اپنے اجزاء کے لحاظ سے متحد ہو۔ اس کا ملک جب جنگ میں شریک ہو تو اسباب حرب کے لحاظ سے قوی ہو ——— کیوں؟ اس لئے کہ وہ وقتی کامیابی نہیں چاہتا۔

بسمارک حقیقی کامیابی کا متمنی تھا نہ کہ غیر حقیقی۔ وہ ملک کی صحیح ترقی اور طاقت کا خواہشمند تھا۔ نہ کہ وقتی اور عارضی ——— کیوں؟ اس لئے کہ وہ سچا لیڈر تھا۔ وقتی اور ہنگامی نہیں۔ سیاست کی نبض خوب پہچانتا تھا۔ اس کی تشخیص کبھی غلط نہ ہوتی تھی۔

سوال ہوسکتا ہے کہ اگر وہ "دیر آید" کی پالیسی پر کاربند تھا تو وہ کیوں اس طرح انتظار نہیں کرتا تھا کہ خود بخود اسباب مہیا ہو جائیں۔ اور وہ ایک ریاضی داں یا منطق کی طرح ترتیب مقدمات کے بعد خود بخود نتیجہ پر حاوی ہو جائے۔

بسمارک ہر کام کے لئے مناسب وقت کا انتظار ضرور کرتا تھا۔ لیکن وہ غیر ضروری انتظار کا قائل نہیں تھا۔ مثلاً "ڈنمارک" "ڈاکٹی شلزونگ اور ہلسٹین" کے معاملہ کو لیجئے۔ اس نے آسٹریا سے اس وقت تک کوئی چھیڑ نہ کی جب تک کہ یہ طے نہ ہو گیا کہ "ٹلی بھی آسٹریا سے نو آبادیات کا مطالبہ کرے گا۔ اسی طرح اس وقت تک اس نے کوئی اقدام نہیں کیا جب تک اطمینان نہ ہو گیا کہ فرانس اس کا مخالف نہ ہو گا۔ یا کم از کم اس کے خلاف کوئی مدد نہیں دے گا۔

معاً سیاسی میدان میں ایک نئی دشواری کا ظہور ہو گیا۔ یعنی فرنکفورٹ اسمبلی کے ممبروں نے بسمارک اور حکومت پروسٹیا کے خلاف مظاہرہ شروع کر دیا۔ سب کے سب پروشین حکومت اور بسمارک کے دشمن ہو گئے اور آسٹریا کی تائید شروع کر دی۔ کیا اس اجتماعی عمل سے بسمارک کا ارادہ کمزور ہوا ——؟

اس نے اجلاس طلب کر کے بہت سے ممبروں کو برطرف کر دیا اور فوراً اپنے ملک کے سامنے وہ مطالبات رکھ دیئے جن سے وہ پہلے انکار کر چکے تھے۔ چنانچہ اس نے ان سے اور آسٹریا دونوں سے جنگ کا اعلان کر دیا۔

بسمارک نے اپنی ارادی قوت سے اس جنگ میں عظیم الشان کامیابی حاصل کی۔ آسٹریا کو شکست دی۔ اور اس خیال کے تحت کہ جرمنی کی تمام ریاستوں کو ملا کر ایک متحد حکومت بنا دی جائے۔ شمالی جرمنی کو متحد کر دیا۔ اور جنوبی ریاستوں سے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا۔ کیونکہ اب اتحاد کا دشمن ملک شکست کھا چکا تھا۔

سیاست سے دلچسپی لینے والے حضرات اس لطیفہ سے خوب لطف اٹھائیں گے کہ جنگ کے بعد فرانس نے بسمارک سے اپنی خاموشی اور رفیقانہ اثر کا عوض یا قیمت طلب کی۔ لوگوں نے بسمارک سے دریافت کیا کہ اگر فرانس نے اپنے مطالبہ پر اصرار کیا تو آپ کیا کریں گے۔ ان کے جواب میں بسمارک نے اپنا مشہور مقولہ دہرا دیا۔ "صداقت! صداقت!! اور مخلص صداقت!!!" جس کے معنی طبعاً یہ تھے کہ "جنگ!! اور صرف جنگ!!"

اب ہم بسمارک کی زندگی کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ جہاں بسمارک نے فرانس سے جنگ عظیم شروع کی۔ یہ بسمارک کی زندگی کا بہت اہم کارنامہ ہے۔ اور بسمارک کے علاوہ دوسروں کے لئے سیاسی مغالطہ کا طویل ترین باب میری مراد سفیر فرانس کے واقعہ سے ہے جو جرمنی کی سفارت پر مامور تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرانس کے بادشاہ نے اس کو بسمارک کے پاس اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرائے۔ معاہدہ کی اساس یہ تھی کہ بلجیم کو ختم کر لیا جائے۔ کیونکہ فرانس اس وقت کسی حالت میں بھی اس کی آزادی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بسمارک نے دستخط تو نہیں کئے لیکن دستاویز وقت ضرورت کے لئے محفوظ رکھی۔ تاکہ اس کے ذریعہ بلجیم اور اس کے حلیف انگلینڈ کی حرارت غیظ و غضب کو مشتعل کر سکے۔

اس وقت کا آنا یقینی تھا۔ جب بسمارک اس یادداشت سے فائدہ اٹھا سکے۔ بالآخر وہ وقت آ گیا اور بہت جلد آیا۔

اسی اثنا میں اسپین میں انقلاب برپا ہوا۔ انقلاب کا تقاضا ہوا کہ ایک پروشین امیر لیوپولڈ کو بادشاہ منتخب کرے۔ لیکن فرانس اس کے خلاف تھا اس لئے کہ اس کی مصلحت متقاضی نہ تھی۔ چنانچہ شاہ فرانس کے پیغامات ملنے شروع ہوئے کہ وہ کوشش کرے کہ لیوپولڈ اسپین کا بادشاہ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جرمنی اس کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ جرمن امپائر نے ایک بیان نشر کیا یا نشر کرنے کے لئے تیار کیا۔ جس کا طرز بیان ایسا تھا جو یقیناً فرانس کو ناگوار ہوتا۔ بسمارک نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ اور اس کو خوب تر کیا۔ اور بیان کو تبدیل کر کے ایسی صورت دے دی۔ جس نے فریقین کے دلوں میں جنگی اسپرٹ پیدا کر دی۔

اصل بیان کا مفہوم یہ تھا کہ شاہ فرانس نے خواہش ظاہر کی ہے کہ جرمن پرنس امیر تخت اسپین کے لئے تائید کرے۔ جلالۃ الملک کا

خیال ہو کہ ایسا کرنا نہ تو قرینِ عدل و انصاف ہے اور نہ یہ اس کے بس کی بات ہے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ جرمنی اس بارے میں سوا اس کے جو فرانس کے ذریعہ معلوم ہوا۔ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ جلالتہ الملک کو منیر دل کی طرف سے مطلع کیا گیا ہے کہ کوئی شے ایسی موجود نہیں ہے جو جرمنی کو اس موضوع پر سفیر فرانس سے گفتگو کی دعوت دیتی ہو۔"

بسمارک نے بیان کا پہلا مقدمہ تو بجنسہٖ رہنے دیا جو حصہ تبدیل کیا وہ یہ تھا کہ جلالتہ الملک نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جلالتہ الملک سفیر فرانس سے کسی صورت میں گفتگو کے لئے آمادہ نہیں۔ جلالتہ الملک اپنے فوجی ارکان کو اس غرض سے سداد کر رہے ہیں کہ وہ سفیر کو مطلع کر دیں کہ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی داعی کوئی شے نہیں۔"

تاریخ شاہد ہے کہ بسمارک نے اس دن رات کا کھانا دو فوجی جنرل دن اور تو فلیک کے ساتھ تناول کیا۔ اس اثناء میں ان سے جنگی تیاری اور ملک کی فوجی صلاحیت کی کیفیت دریافت کی۔ جس کے بعد نمائندہ اسمبلی میں ایک تقریر کی جس میں کہا کہ فرانس اب ہم کو صرف دو چیزوں کا اختیار دیتا ہے یا ہم جنگ شروع کریں یا پھر ذلت کا داغ برداشت کریں۔"

تاریخ کا یہ بھی بیان ہے کہ اس جنگ میں فتح و کامرانی کا سہرا جرمنی کے سر رہا۔ یہ سب کچھ بسمارک کی مسلسل اور متواتر جد و جہد کا نتیجہ تھا۔ تاریخ کا یہ بھی بیان ہے کہ بادشاہ اواخر عمر میں بسمارک سے ناخوش رہا جس کے خمیازہ میں اس نے بقیہ زندگی رنج و تنہائی میں بسر کی۔

ضرورت تھی کہ اس موقع پر بسمارک کی اُن آراء پر بحث کی جائے جو صحافت تعلیم اور دوسرے مسائل سے متعلق تھیں۔ لیکن ہم بخوف طوالت دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ آج کی بحث صرف ان لوگوں کی تردید پر ختم کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ بسمارک کا خیال تھا کہ "اخبارات و رسائل صرف کاغذ اور روشنائی کا مسخ کردہ مجموعہ ہیں۔"

لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اس کے باوجود اخباری تبلیغ کا بہت اہتمام کرتا اور رسائل حاضرہ پر اخبارات کی رائیں بہت غور سے پڑھتا تھا کسی نے اس پر اعتراض کر دیا تھا کہ آپ اخبارات سے بے اعتنائی برتتے ہیں تو ان کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ لیڈر کے قدرت و اختیار سے باہر ہے کہ وہ اخبارات سے بے اعتنائی کرے۔ کیونکہ جس طرح لیڈر اور دوسری طاقتوں پر اعتماد کرتا ہے اس طرح اس کے نزدیک جمہور عوام بھی ایک طاقت ہیں۔ اس لئے کہ اگر رائے عامہ اس کے مخالف ہوگی تو اس کے اصلاح کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ وہ قوم کو فائدہ رسانی اور اپنی خدمات پیش کرنے پر بالکل قدرت نہیں رکھتا۔ اور اس کا واحد ذریعہ اخبارات ہیں۔

نظم

کاش!

از:- حسرت چکوالی

کاش! تم معلوم کر سکتے میں کیوں مغموم ہوں
اس جوانی میں سرور و کیف سے محروم ہوں

عالمِ تنہائی میں رہتا ہوں۔ میں مجبور رہوں
دِل میں بستے ہو۔ مگر تم سے میں کوسوں دُور ہوں

عشق کی ہر رگ سے بُو آتی ہے، وہ کافور ہوں
سازِ دِل ٹوٹا ہوا ہے یعنی چکنا چور ہوں

عالمِ ہستی میں۔ میں اِک ہستیِ معدوم ہوں
کاش تم معلوم کر سکتے میں کیوں مغموم ہوں

جامِ صہبائی

از

رباعیات

اثر صہبائی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل

(۱)

میرے دلِ زار کی تمنا تو ہے
ہے میرا وجود ایک ہنگامۂ شوق
میرے سرِ پرشور کا سودا تو ہے
اور حسنِ طرب فزا کی دنیا تو ہے

(۲)

دوشیزۂ صبح کا تبسم یارب
ہر پارہ ہے صبح و شام میرے دل میں
اور لیلیٔ شام کا ترنم یارب!
اک نغمہ و نور کا تلاطم یارب

(۳)

اے صبح کو بحرِ نور دینے والے
دے میرے خیال کو بھی نور اور سرور
اے شب کو یمِ سرور دینے والے
اے طور کو برقِ طور دینے والے

(۴)

اک ساغرِ جاں فزا پلا دے ساقی
سرمست ازل ہوئی میری مے ساری
سوئی ہوئی روح کو جگا دے ساقی
مستی آنکھوں کی بھی ملا دے ساقی

(۵)

آتا ہے ہجومِ غم تو آنے دے اسے
اے سرخوشِ عشق! عقل کی بات نہ سن
جاتی ہے اگر خوشی تو جانے دے اسے
یہ ہرزہ سرا ہے سر کھپانے دے اسے

(۶)

کھلتے ہیں فلک کے باب ہنگامِ سحر
وہ حسن کہ ہے ہزار پردے میں نہاں
اٹھ جاتے ہیں سب نقاب ہنگامِ سحر
ہو جاتا ہے بے حجاب ہنگامِ سحر

(۷)

انوارِ سحر کے کس قدر ہیں معصوم!
اک جلوۂ پاک ہے جہاں پر طاری
معصوم ہیں گل، شجر حجر ہیں معصوم
معصوم فلک ہے بحر و بر ہیں معصوم

(۸)

یارب مرے دل کو رشکِ گلشن کر دے!
خورشید میں چاند میں ستاروں میں
ہر تارِ نظر کو گل بدامن کر دے!
وہ نور جو میری روح روشن کر دے

معاشرتی

"مجرم"

(افسانہ) از:-

ڈاکٹر حیات ملک

سکول میں چھٹی ہونے پر گھر پہنچا۔ تو شیلا چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی مجھے دیکھتے ہی سر تھام کے اُٹھ بیٹھی "آپ آ گئے"۔ اتنا کہا اور پھر اس کا سر گھومنے لگا۔ اور اس سے پہلے کہ میں اُسے تھام سکتا۔ اس کا سر چارپائی کے پائے سے جا ٹکرایا۔ میں نے لپک کے اُسے اُٹھا لیا۔ اور اس کا سر آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ اس کا بدن تپ رہا تھا۔

"بخار میں تو جل رہی ہو۔ پھر اُٹھ کے بیٹھنے کا کیا مطلب"؟ میں نے پوچھا

"آپ جو آ گئے تھے تو میں پھر یونہی کیسے پڑی رہتی"۔

شیلا کی اس طرح کی بے جا کسر نفسی اور خود فراموشی سے میں اکتا چکا تھا۔ کئی بار سمجھایا کہ جب میں اُسے اپنی زندگی کا ساتھی سمجھتا ہوں تو پھر وہ اس قدر ادب اور تکلف کیوں کرتی ہے۔ لیکن جب سے والدہ مرحومہ سورگ کو سدھاریں تب سے وہ یہی کہا کرتی کہ میں آپ کی داسی ہوں۔ آپ میرے پران ناتھ۔ میں آپ کے پیروں کی خاک ہوں۔ بس اس سے زیادہ اپنے آپ کو کبھی وقعت نہیں دیتی تھی۔ جب بھی میں گھر پہنچتا۔ وہ بالکل ان طلبا کی طرح جن کے کمرہ جماعت میں میرا پہلا قدم پڑتے ہی سلامی کے لئے کھڑے ہو جانا ایک ضروری امر تھا۔ شیلا بھی مجھے دیکھتے ہی جھٹ کھڑی ہو جاتی۔ اور اسے دیکھ کر سکول کی فضا جس کو چھوڑ کر سکول کی خاطر گھر پہنچا تھا پھر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی۔ سکول میں طلبا مجھے ہوا سمجھتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ادھر اُدھر چھپ جاتے۔ اور ایک دوسرے کو اشاروں اشاروں میں ہی اطلاع کر دیتے کہ وہ آیا ہیڈ ماسٹر۔ بعض دوست جنہیں اپنی قسمت کا گلہ ہے کہ خدا نے ان کی شکل و صورت میں رعب و دبدبہ کا خمیر تک کیوں نہیں رکھا۔ وہ اس کو میری خوش بختی سمجھیں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میں تو اس سے سخت نالاں ہوں۔ بھلا وہ زندگی ہی کیا ہوئی جو چوبیس گھنٹے ایک ہی فضا میں گذرے۔ اب شیلا کو بخار کی حالت میں میرے استقبال کے لئے اُٹھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ خواہ مخواہ دکھتے سر پر ایک اور چوٹ کھائی۔ اس وقت اس سے اس کے متعلق کچھ کہنا بے سود تھا۔ اس لئے خاموش رہا۔ اور جیب سے اسکل کے اسپرین کی ایک پڑیا جو میں ڈاکٹر کشور سے چند روز [illegible] لایا تھا۔ اُسے دی کہ کھائے تاکہ سر کا درد دور ہو جائے۔ میں نے [illegible] ۔ اور وہ پڑیا کھول کر منہ میں ڈالنے ہی لگی تھی کہ یکلخت ہاتھ روک لیا۔ اور دوا کو جھٹ نیچے پھینک دیا۔

"میں اسے نہیں کھاؤں گی۔ ہرگز نہیں کھاؤں گی"۔ وہ زور زور سے چلانے لگی۔ "پران ناتھ مجھے معاف کر دو۔ میں یہ نہیں کھاؤں گی"۔ وہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے اسے تسلی دی۔ میں اس کا سر دبانے لگا۔ اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ ایک ہاتھ میں میں اخبار تھامے پڑھ رہا تھا۔ اور دوسرا ہاتھ ابھی اس کے ماتھے پر ہی تھا۔ کہ مجھے اس کا دم گھٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ یکلخت میرے اس ہاتھ کو جو اس کے ماتھے پر پڑا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر چلانے لگی۔ گلا نہ دباؤ... گلا نہ دباؤ...... مجھے نہ مارو.......... نہ مارو پران ناتھ....."

میں نے اس کے سر کو سینے سے لگا لیا۔ "شیلا! شیلا!! ڈر کیوں گئیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ میں تو سر دبا رہا تھا۔ ڈرو نہیں۔ کوئی بات نہیں"۔

"آپ سر دبا رہے تھے؟ گلا نہیں دبایا؟ گلے میں درد کیوں ہو رہا ہے"؟ وہ خوفزدہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے دوبارہ اُسے تسلی دی۔ اور چارپائی پر لٹایا۔ اور خود باہر آ کر نوکر سے کہا کہ ڈاکٹر کشور کو بلا لائے شیلا کی حالت مجھے تشویشناک معلوم ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے اُس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ بخار یقیناً اس کے دماغ تک مسلط ہو چکا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ اور میں پاس ہی کرسی پر بیٹھا ڈاکٹر کشور کا منتظر تھا کہ وہ آ پہنچے۔ انھیں دیکھتے ہی شیلا پھر چلائی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ آپ کس لئے آئے ہیں۔ کس نے آپ کو بلایا ہے۔ کیا آپ یہی کہنے آئے ہیں کہ میں لاعلاج ہو چکی ہوں...... دو گھڑی کی مہمان ہوں........ کیوں اسی مقصد کے لئے بلائے گئے ہو نا... لیکن میں لاعلاج نہیں...... کون کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں...... ڈاکٹر صاحب میں اچھی بھلی ہوں....... آپ کو دھوکے سے بلایا گیا ہے..... مجھے علاج کی ضرورت نہیں........ آپ جائیے... .... جائیے....."

وہ نڈھال ہو کے بے ہوش ہو گئی۔ ہم دونوں کافی دیر تک اس کے سر پر برف ملتے رہے۔ جو کچھ وہ مجھے ان کے آنے سے پہلے کہہ چکی تھی وہ بھی ڈاکٹر صاحب کو بتایا۔ جسے سُن کے وہ کہنے لگے۔ بخار کی تیزی کی وجہ سے دماغ پر قابو نہیں رہا پرانی یادداشتوں کے بے ربط ٹکڑے منہ سے نکال رہی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ بخار اُترتے پر ٹھیک ہو جائے گی۔ شیلا اب ہوش میں آ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک بے ذائقہ سی دوا دے کر چلے گئے۔ جسے میں تھوڑے تھوڑے وقفہ بعد اُسے پلاتا رہا۔ بخار ٹوٹ رہا تھا۔ اور اُسے نیند آ رہی تھی۔ دوسرے روز بخار بالکل اُتر گیا۔

بخار وغیرہ کئی روز سے ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اس کی طبیعت ابھی تک بحال نہیں ہوئی تھی۔ میں جب بھی گھر آتا وہ اکثر سوئی ہوتی۔ کسی کام کو اس کا جی نہ چاہتا۔ روزانہ اس کا گلہ کرتی کہ نہ معلوم وہ کبھی تندرست بھی ہو گی کہ نہیں کئی بار میں نے اُسے روتے بھی دیکھا۔ میں دوبارہ ڈاکٹر کشور کے پاس گیا۔ اور اُسے سارا حال سُنایا۔ پچھلے واقعات بھی دہرا دیئے۔ کچھ دیر وہ سوچ کر کہنے لگے۔

"اس کے تحت الشعور میں ضرور کسی چیز کا ڈر اور وہم موجود ہے۔ میں آپ کی غیر موجودگی میں اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ شاید کچھ معلوم ہو سکے۔ آپ اگر چاہیں تو اس کے کمرے میں بیٹھ کے سب کچھ سُن سکتے ہیں۔ لیکن اس شرط پر کہ اس پہ یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ آپ ہماری گفتگو کو سنتے رہے ہیں۔ آج شام کو پانچ بجے کا وقت دے سکتا ہوں۔ اُس سے کہہ دیں کہ وہ اس وقت یہاں آ جائے۔ اور آپ بھی اُسے اطلاع کئے بغیر اس وقت ساتھ کے کمرے میں آ کے بیٹھ جائیں۔

میں نے گھر پہنچ کر بڑی مشکل سے شیلا کو رضا مند کر لیا کہ وہ باقی ماندہ تکلیف کے علاج کے لئے وقت موعودہ پر ڈاکٹر کشور کے مطب میں پہنچ جائے اُسے سمجھایا کہ پہلے بھی اُسی کے علاج سے فائدہ ہوا ہے۔ اب بھی رہی سہی تکلیف جلد جاتی رہے گی۔

شام کو پانچ بجے سکول سے فارغ ہو کر میں بھی سیدھا وہاں جا پہنچا۔ شیلا پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب اُسے یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے۔

"بشرطیکہ آپ کو ڈاکٹروں سے اس قدر ڈر نہ محسوس ہو۔ جس طرح کہ آپ نے اس روز مجھے دیکھتے ہی شور مچا دیا تھا۔"

"ڈر تو آپ لوگوں سے محسوس ہونا ہی چاہیئے۔ فرشتۂ موت کے پیغام بر جو ٹھہرے مرنے کو چار روز پہلے ہی موت کی اطلاع کر دیتے ہو۔"

"لیکن آپ کو کس نے موت کی اطلاع دی ہے؟"

"مجھے نہ سہی۔ میری ایک رشتہ دار کو تو زندہ درگور کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔ کہنے لگے لا علاج ہو چکی ہے۔ ایک آدھ مہینے تک ضرور مر جائے گی۔۔۔۔۔۔ کاش وہ یہ نہ بتاتے۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"پر وہ کون تھی۔ اور ڈاکٹروں نے کیا تشخیص کیا تھا؟"

ڈاکٹر کہتے تھے۔ اسے کینسر (Cancer) ہو گیا ہے۔ جو بوڑھی عمر میں ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اب بہت بڑھ چکا ہے۔ سارے جسم میں بیج کی طرح بو یا جا چکا ہے۔ آپریشن سے بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اور بڑھیا ایک آدھ مہینے کی مہمان ہے۔۔۔۔۔ موت کے وقت کا علم ہونا بھی اُف!۔۔۔۔ کس قدر تکلیف دہ ہے۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ (وہ رو رہی تھی)۔۔۔۔۔۔ انھوں نے یہ کیوں کہا۔۔۔۔۔۔ مجھے اس کی کس نے خبر ہونے دی۔ اس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ جب ہچکیاں ذرا کم ہوئیں تو ڈاکٹر صاحب بولے۔

"یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ وہ کون بڑھیا تھی۔ کیا وہ آپ کی والدہ تھی؟"

"نہیں۔ نہیں!! وہ پھر چلائی۔" ڈاکٹر آپ کس طرح کہتے ہیں کہ وہ میری ماں تھی۔۔۔۔۔۔۔ وہ بڑھیا میری ساس تھی۔۔۔۔۔ ہاں ساس۔۔؟"

"کوئی بہت ہی اچھی ساس ہو گی۔ ورنہ ساس اور بہو میں تو عموماً اتنی محبت نہیں ہوا کرتی۔"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ اُسے مجھ سے محبت تھی۔ اُسے تو مجھ سے سخت نفرت تھی۔۔۔۔ کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔۔۔۔۔ اُف وہ کس قدر چڑیل تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے بدگمان کیوں ہو گئی۔ شروع شروع میں تو بہت اچھی تھی۔ لیکن مرنے سے کچھ دن پہلے تو وہ ہم میاں بیوی کو اکٹھے بیٹھا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے کہتی کہ تو نے میرے بیٹے کو بگاڑ دیا ہے۔ انھیں کہتی تمہیں تو سوائے اپنی رنگ رلیوں کے اور کسی کی کچھ خبر ہی نہیں جب دیکھو اس ڈائن کے پاس لٹو کی طرح گھوم رہا ہے۔ میں مر رہی ہوں۔ میری ذرا پرواہ نہیں۔ لیکن ہم اس کا کر بھی کیا سکتے تھے۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ پھر بھی وہ ہمیں ہر وقت مطعون کرتی رہتی۔"

"لیکن آپ نے اس چیز کا خیال نہ کیا کہ جوں جوں بیماری کا درد بڑھتے اس کی طبیعت چڑچڑی ہو چکی تھی۔ اگر وہ آپ دونوں کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی تو اس بیماری کا تو کچھ قصور نہ تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ مرنا کہاں آپ نے [illegible]

ایسا ہی کرنے پر مجبور تھی۔ (اور پھر آہستہ آہستہ) وہ مجبور تھی۔۔۔۔۔۔ ہاں اُسے ہر وقت رہتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اکثر درد سے بلبلا اُٹھتی تھی۔۔۔ (وہ پھر رونے لگ گئی)۔۔۔۔۔ ہاں وہ بے قصور تھی۔" دیر تک سسکیوں کی آواز آتی رہی۔ پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہا۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب۔ میں اب چلتی ہوں۔ علاج کے لئے کل شام کو پھر آؤں گی۔ اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔۔۔۔۔۔ اُف میری قصور ساس۔۔۔"

وہ دروازہ کھول کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن کچھ۔ سوچ کر پھر لوٹ آگئی۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ سہمی کھڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔

"باہر سڑک پر ایک سپاہی موجود ہے۔۔۔۔ میں ہمیشہ ان کی نظروں سے بچ کر رہتی ہوں۔ انہیں دیکھتے ہی میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ میری تلاش میں ہی سرگرداں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کیا کبھی کسی کے چہرے پر بھی کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جو پڑھا جا سکے؟

"کیوں"؟

میرے ماتھے پر صاف صاف موٹے حروف میں لکھا ہے۔ مجرم۔۔ قاتل۔۔۔۔ کیوں نہیں؟ میں تو یہی محسوس کرتی ہوں۔ اپنی ساس کی موت کی میں ہی ذمہ دار ہوں۔۔۔۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ یہی کہیں گے کہ وہ بچ ہی کب سکتی تھی۔ اسے ضرور مرنا تھا۔ مرنا کیسے نہیں۔ لیکن اس تکلیف میں مجھے اس کی اچھی طرح خدمت کرنی چاہیے تھی۔۔۔۔ اُسے ہر طرح کا سکھ پہنچانا چاہیے تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن میں ہی اس کی موت کا سبب بنی۔ کیوں یہ قتل نہیں۔۔۔۔۔؟ صاحب صریح قتل ہے۔ اسی لئے سپاہی میری تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ اب تو وہ شاید پتہ پا چکا ہوگا۔ میں منہ ڈھانپ کے جاؤں گی۔"

دوسرے روز مقررہ وقت سے میں ذرا پہلے ہی پہنچ گیا۔ شیلا نے آتے ہی کہا۔

"ڈاکٹر صاحب میں تو خیال کرتی تھی کہ آپ کے ہاں آنے سے میری طبیعت کچھ ہلکی ہو جائے گی۔ اور شاید اسی طرح آرام بھی آ جائے۔ لیکن آپ نے تو میرے پہنچتے ہی ساس کا تذکرہ چھیڑ کر میری سب اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ۔۔۔ مجھے پہلے سے دگنا کر دیا۔ کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔ چاہتی ہوں کہ ۔۔۔ لیکن نیند سے بھی خوف آتا ہے۔ آنکھ بند کرتے ہی ڈراؤنے خواب آنے لگتے ہیں۔ کبھی دیکھتی ہوں کہ خاوند میرا گلا دبا رہا ہے۔ اور اس طرح اپنی مرحوم ماں کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں پکار پکار کر کہتی ہیں۔ تو ہی میری ماں کی قاتل ہے۔ بچ کر کہاں جائے گی۔ پھر کسی وقت محسوس کرتی ہوں کہ دم گھٹ رہا ہے۔ پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔ قے پر قے اور دست پر دست آ رہے ہیں اور دونوں خون آلودہ۔ میں زہر زہر چلاتی ہوئی جاگ اُٹھتی ہوں۔ اور بیداری کی حالت میں بھی دیر تک تھوکتی رہتی ہوں۔ جیسے واقعی میں نے زہر کھا لیا ہو۔ آج صبح چائے کی پیالی میں کھانڈ ڈالتے ڈالتے میری طبیعت کچھ ایسی خراب ہوئی کہ قے آ گئی۔ اور سب کچھ وہیں چھوڑ دیا۔ جس رات بیمار ہوئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے دردِ سر کے لئے ایک سفید سی دوائی کی پڑیا دی۔ لیکن اُسے دیکھتے ہی میں نے پھینک دی۔ ڈاکٹر صاحب سفید رنگ کے زہر کا کیا نام ہے؟"

"سفید رنگ کے کئی زہر ہوتے ہیں۔ لیکن عام زہر تو یہی سنکھیا ہے"

"ہاں سنکھیا۔ سنکھیا۔ ٹھیک کہا آپ نے۔ پانی میں ذرا مشکل سے حل ہوتا ہے۔ اس زہر سے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن مجھے اس کا کیا علم تھا۔۔۔ اُف بیچاری بڑھیا کا بہت بُرا حال ہوا مجھے نہیں چاہیے تھا۔۔۔ آخر ساس تھی۔۔۔ (وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی) خدا بُرا کرے ان ڈاکٹروں کا۔۔۔۔ انھوں نے یہ بتایا ہی کیوں کہ وہ کسی صورت نہیں بچ سکتی۔ جب موت آتی مر جاتی۔۔۔ جلدی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ میں اس کے طعنے نہ سُن سکتی تھی۔ مجھ سے اس کا درد میں چلانا نہیں دیکھا جاتا تھا۔۔۔ لیکن۔ پھر بھی یہ قتل۔۔۔ صریح قتل ہے۔۔۔۔ پُردرد قتل (وہ اونچی آواز سے رو رہی تھی) میں نے اپنے خاوند سے دھوکا کیا۔ چپکے چپکے اس کی ماں کو مار ڈالا۔ اُسے معلوم ہوگا تو کیا کہے گا۔ کیا وہ اپنی ماں کے خون کا بدلہ نہیں لے گا۔۔۔ ڈاکٹر صاحب خدارا۔ انھیں نہ بتانا۔۔ میں درخواست کرتی ہوں مجھے یقین ہے آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔۔ اب چلتی ہوں۔ معاف کیجئے آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔ اچھا خدا حافظ"۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں بھی ڈاکٹر صاحب سے مل کے آہستہ آہستہ گھر کو روانہ ہو گیا۔ شیلا مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ کھڑکی سے مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں خاموشی سے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ اور اُسے آواز دی۔ وہ آ کے دروازے میں خاموش کھڑی ہو گئی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے جھٹ وہ لڑکا یاد آ گیا۔ جو امتحان کا پرچہ نقل کرنے کے جرم میں آج صبح میرے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ وہ خوف زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تمام جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں اُٹھا اور مضبوطی سے اُسے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ "شیلا میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے"۔

"معاف کر دیا ہے؟" "ہاں معاف کر دیا ہے۔ اپنی ماں کا خون! سچے دل سے کہتا ہوں اب تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ وہ اسی طرح کچھ دیر مجھ سے چمٹی رہی۔ پھر کہا۔ "کتنا بڑا ہے دل آپ کا۔ میں ان کانوں سے اس کی آواز سن سکتی ہوں"

نظم

عیش پیری

از :-

خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر بی اے (علیگ)

ہم جوانی پہ اشکبار نہیں　غم پیری میں سوگوار نہیں
ہے جوانی کا نام دیوانی　یارِ ناداں کا اعتبار نہیں!
اے خوشا وقتِ پیر روشن رائے　جس کے سر پر جنوں سوار نہیں
مستِ عیشِ مدام پیرِ مغاں　نوجوانی کا- خواستگار نہیں
فلکِ پیر رقص میں ہے مدام　اپنی پیری سے دلفگار نہیں
کیجئے ماتمِ جوانی کیوں　جب جوانی کو بھی قرار نہیں
پیر، معصومیت پہ ہے مجبور　اس کو عصیاں پہ اختیار نہیں
نوجوانی و پاک دامانی　اس کا امکاں ہے. اعتبار نہیں
نوجواں گر سیاہ کار نہیں　ہے وہ لالہ کہ داغدار نہیں
کیوں کرے ماتمِ خزاں بلبل　کیا خزاں قاصدِ بہار نہیں
ہے رواں، کاروانِ عمر مدام　اس کو منزل پہ اختیار نہیں
گرمِ محفل ہے دل کی گرمی سے　برفِ پیری کا سر پہ بار نہیں
برق گرتی نہیں ہے خرمن پر　اب غمِ شعلہ و شرار نہیں
رات بھر مستِ خواب رہتے ہیں　کسی وعدہ کا انتظار نہیں
نہ سواروں میں ہیں نہ پیادوں میں　خوفِ میدانِ کارزار نہیں!
حال میں مست اپنی کھال میں مست　چاکرِ شہر و شہریار نہیں
نہ ستاتی ہے بھوک اور نہ پیاس　اب غم و فکرِ روزگار نہیں
یہ نہ سمجھیں جواں کہ پیری میں　عشق کا کوئی کاروبار نہیں
ہم ہیں شمع ازل کے پروانے　یارِ ناپائیدار یار نہیں
نفس پرور ہوس پرستوں کو　بزمِ روحانیاں میں بار نہیں
یادِ محبوب میں ہیں مستِ الست　اس نشے میں کوئی خمار نہیں
خوب کہدی رواروی میں غزل　گو یہ ناظر کا شاہکار نہیں

اُردُو زبان پر حامیانِ ہندی کے عام حملے

ہم اور ہماری زبان

از :-
ابو محمد امام الدین رام نگری

بنگال سے لے کر پنجاب تک افتراق پسند ہندی بھگتوں نے اردو کے خلاف فیصلہ کن جنگ شروع کر دی ہے۔ جس میں یو پی جو اردو کا گہوارہ اور مسکن ہے اور پنجاب جس میں اُردو کے بڑے بڑے جرائد و صحائف ہندو حضرات کے ہاتھوں میں ہیں۔ ہندی نوازی اور اردو دشمنی میں پیش پیش ہیں۔ کانگریس کا دعویٰ ہے کہ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت تمام باشندگان ملک کی نمائندہ ہے۔ لیکن افسوس کہ اس میں بھی مہا سبھائی عنصر داخل ہو گیا ہے۔ اور وہ بھی افتراق پردازی اور اردو دشمنی کی آگ کو ہوا دے رہا ہے۔ چنانچہ آج اُردو کے مقابلے میں نام نہاد کانگریسی اور مہا سبھائی ہندی بھگت شانہ بشانہ صف آرا نظر آ رہے ہیں۔ مگر اردو جرائد و صحائف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حامیان اردو کو ہندی بھگتوں کی اس یورش اور ہنگامہ آرائی کی خبر نہیں ہے یا وہ اردو کی حمایت و حفاظت کی طرف سے افسوسناک بے اعتنائی و بے توجہی برت رہے ہیں۔

میں نے ہندی بھگتوں کی اس اردو دشمنی اور حامیان اردو کی غفلت و بے خبری کے متعلق شمس العلما حضرت علامہ تاجور کو لکھا اور ان کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ "شاہکار" میں اردو ہندی کے متعلق ایک مستقل عنوان قائم کر کے اس کے تحت حامیان اردو کو بتایا جائے کہ حامیان ہندی کی طرف سے اردو کے خلاف کیا کیا جا رہا ہے اور کون کون سی کوششیں اور تدبیریں عمل میں لائی جا رہی ہیں تاکہ اردو کے حامیوں میں اُردو کی حفاظت و حمایت کا جذبہ پیدا ہو۔ اور وہ اردو کی حیات و بقا کے لئے مناسب اور ضروری وسائل و ذرائع اختیار کر سکیں۔

حضرت علامہ نے اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا۔ اس لئے میں اس سلسلے کو شروع کر رہا ہوں۔ اردو کے ادبا و اہل قلم اور مدیران جرائد و صحائف سے درخواست ہے کہ "شاہکار" میں اردو ہندی کے متعلق جو کچھ لکھا جائے اسے وہ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ اور اردو کی حمایت و حفاظت کے لئے جس سعی و تدبیر کی ضرورت محسوس ہو اُسے خود بھی عمل میں لائیں اور دوسرے حامیانِ اردو کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین و ہدایت کریں۔

اردو کی حیات و بقا کے سلسلے میں ایک مسئلہ خاص طور پر محتاج غور و فکر ہے۔ شمالی ہند خصوصاً یو۔ پی اردو کا گہوارہ اور مسکن ہے اور اسی حصۂ ملک کی زبان کو کانگریس نے "ہندوستانی" اور قومی زبان کا معیار قرار دیا ہے۔ لیکن یہی حصۂ ملک اردو ہندی کا سب سے بڑا میدان معرکہ ہے اور اسی میں اردو پر سب سے زیادہ سخت و شدید حملے ہو رہے ہیں۔ یو پی کے ہندی بھگت اپنی اکثریت کے بل بوتے پر علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ اس صوبے کی زبان ہندی اور رسم الخط ناگری ہے۔ یہاں اُردو زبان اور اردو رسم الخط کے لئے قومی زبان اور قومی رسم الخط کی حیثیت سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آج یو۔ پی کی زبان اردو ہی ہے۔ اور اردو رسم الخط کو ہندو مسلمان دونوں کی اتنی زیادہ تعداد استعمال کر رہی ہے کہ بلا خوف تردید اردو رسم الخط کو یو۔ پی کا قومی رسم الخط کہا جا سکتا ہے۔ اردو کا اخبار جو یو۔ پی کا شاید سب سے بڑا اُردو اخبار ہے۔ منشی نول کشور آنجہانی کی یادگار ہے۔ عربی فارسی اور اردو کا اتنا بڑا پریس شاید آج بھی یو۔ پی میں کسی مسلمان کا نہیں ہے جتنا بڑا نول کشور پریس۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار منشی نوبت رائے نظر دیا شنکر نسیم کو اردو کا مورخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ "زمانہ" کانپور نہ صرف یو۔ پی بلکہ ہندوستان کا قدیم ترین اور موقر ترین اردو ماہنامہ ہے۔ اردو منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں نکلتا ہے۔ منشی پریم چند آنجہانی کو ملک نے سب سے پہلے اُردو افسانہ نگار کے نام سے جانا۔ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اردو کے وہ قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر ہیں جن کو یو۔ پی ہی میں نہیں ہندوستان بھر میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح یو۔ پی میں اردو کے اتنے ہندو ادبا اور اہل قلم ہیں جن کے صرف نام لکھنے کے لئے صفحات کے صفحات کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ سر تیج بہادر سپرو جو اردو کے زبردست علمبردار ہیں یو۔ پی ہی کے باشندے ہیں۔ انڈین پریس الٰہ آباد نے اردو کی جتنی درسی کتابیں شائع کی ہیں۔ یو۔ پی کے کسی مسلم پریس نے شائع نہ کی ہوں گی۔ اور انڈین پریس ہندو حضرات کی ملک ہے۔

لیکن حالات میں بسرعت کمال انقلاب ہو رہا ہے۔ جن ہندو گھروں میں خالص اور شستہ اردو بولی جاتی تھی ان میں سنسکرت آمیز زبان کا رواج

ترقی پزیر ہے جو خاندان ناگری خط سے صورت آشنا بھی نہ تھے وہ بڑی تیزی کے ساتھ اُردو خط کو ترک کر کے ناگری خط اختیار کر رہے ہیں۔ پریم چند آنجہانی اس انقلاب و تغیر کی ایک زبردست مثال تھے۔ وہ ہندی کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر کے دُنیا سے گئے۔ ہندی کا مشہور رومتا نہ ہنا "ہنس" انہی کی ہندی نوازی کی یادگار ہے۔ انڈین پریس سے ہندی کا ہفت روزہ "دیش دوت" کے نام سے نکل رہا ہے۔ نول کشور پریس سالہا سال سے ماہنامہ "مادھوری" شائع کر رہا ہے جو ہندی کے صفِ اول کے رسائل میں شمار ہوتا ہے۔

بہرحال یو۔پی میں نہایت تیزی کے ساتھ انقلاب ہو رہا ہے۔ اردو کی جگہ ہندی لے رہی ہے۔ اور عام بول چال میں بسرعت تمام سنسکرت الفاظ داخل ہو رہے ہیں۔ مختلف ملکی تحریکات نے عوام میں ہمہ گیر بیداری پیدا کر دی ہے جس کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ لوگوں میں اخبارات و رسائل کے مطالعہ کا مذاق عام ہو گیا ہے اور یہ مذاق شہروں سے گذر کر دیہات تک پہونچ گیا ہے۔ جنگ نے اس مذاق کو اور ترقی دی ہے۔ ہندی اخبارات و رسائل خاص اہتمام کے ساتھ سنسکرت آمیز زبان استعمال کر رہے ہیں۔ یہ حالات بھی عام طور پر زبان میں انقلاب و تغیر پیدا کرنے کا باعث ہو رہے ہیں۔

اس انقلاب و تغیر کو روکنے والی بظاہر کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی ضابطہ اور آئین کسی کو اس بات سے روک نہیں سکتا کہ وہ ہندی کے اخبارات و رسائل نہ نکالے۔ ہندی زبان اور ناگری خط استعمال نہ کرے۔ اپنی زبان میں سنسکرت الفاظ داخل نہ کرے۔ اور یو۔پی میں چونکہ اکثریت برادرانِ وطن کی ہے۔ جو اُردو زبان اور اردو خط کو ترک کر کے ہندی زبان اور ناگری خط اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آج نہیں تو کل یو۔پی کی عام زبان ہندی ہو جائے گی۔ جس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہو گی۔ کانگریس نے شمالی ہند کی زبان کو "ہندوستانی" اور قومی زبان کا معیار قرار دیا ہے۔ وہ اسی زبان کو ملک میں رائج کرنے کی کوشش کرے گی۔ اسی زبان میں درسی کتابیں لکھی جائیں گی۔ اور مدارس و مکاتب میں پڑھائی جائیں گی۔ وہ ہندوستانی یا قومی زبان کیسی ہوگی؟ اردو کے حامیوں کو اس سوال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ یہ سوال ظن و قیاس پر نہیں بلکہ روشن اور مبرہن حقائق و شواہد پر مبنی ہے۔ اس سوال کو اردو کی حیات و بقا سے بہت زبردست تعلق ہے۔

اردو ملک کی حقیقی زبان رہی۔ ہر طرح کے محاسن سے آراستہ رہی۔ ہندو مسلم اتحاد کی یادگار رہی۔ لیکن اکثریت اسے ترک کر کے ہندی بولتی ہے۔ ہندی لکھتی ہے۔ ہندی میں تقریر کرتی ہے۔ حامیانِ اُردو کے پاس کیا چارۂ کار ہے؟ یہ سوچنا اور چارۂ کار تلاش کرنا اُردو کے ہر حامی کا فرض ہے۔

میرے پاس تمام ہندی اخبارات و رسائل نہیں آتے۔ پھر بھی ہندی جرائد و صحائف کے جتنے اقتباسات میں پیش کر رہا ہوں ان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندی دنیا میں اُردو کے خلاف کس قدر ہمہ گیر شورش و ہنگامہ برپا ہے۔

پنجاب کے قانون تعلیم ابتدائی کے خلاف شورش

دہلی سے ہندی کا ایک ماہنامہ "کودی" کے نام سے جاری ہوا ہے اس میں ہندی کے مشہور اہلِ قلم مسٹر جے نندکمار لکھتے ہیں۔

"ابھی بریلی میں رام نرائن مصر مل گئے۔ وہ کاشی ناگری پرچارنی سبھا کے موجودہ صدر ہیں اور اس کے بانیوں میں ہیں۔ حال میں مدراس گئے تھے۔ وہاں سے حیدرآباد اور پنجاب کا دورہ کر کے واپس آ رہے تھے۔ ان سے جو بات چیت ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ ہندی کو تصادم کا سامنا ہے۔ کئی طرف سے اس پر مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ اگر ہندی والے ہوشیار نہ ہوئے تو آئندہ کی خیر نہیں۔

پونا ساہتیہ سمیلن کے صدر سمپورنا نند جی کا خطبۂ صدارت ہر جگہ شائع ہو گیا ہے۔ اس سے بھی ہندی کی اُلجھنوں کا اور اس پر ہونے والے ہمہ گیر حملوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستانی کا سوال پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہندی کو اپنی فکر ہے۔ اردو کو اپنا خیال ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے بے اعتمادی ہے۔ ایسی حالت میں ان دونوں کے اشتراک سے بننے والی ہندوستانی کے پہلو کو کمزور ہو جانا یقینی ہے۔

مصر جی نے کہا کہ ہندی کے خادموں کو پنجاب جانے کی ضرورت ہے۔ وہاں ابتدائی تعلیم کے بارے میں جو حالت پیدا ہو گئی ہے وہ ہندی کے لئے ناقابلِ برداشت ہے اس کے معنی ہندی زبان اور ہند و تہذیب کی بیخ کنی کی تیاری سمجھئے۔ مصر جی نے اس لئے دعوت دی کہ ہندی کے جوا طلبہ پنجاب میں اپنا کچھ وقت صرف کریں۔" د کو [illegible]

ہندی ہفت روزہ "دیش دوت" الہ آباد ۱۹ جنوری ۱۹۴۱ء کے ایک اداریہ شذرے میں لکھتا ہے۔

"اس وقت قومی زبان ہندی پر ہر چہار طرف سے حملہ ہو رہا ہے کیا فرقہ پرست اور کیا دشمنان ملک ہر طرح جی جان سے اس کوشش میں سرگرم ہیں کہ جس سے قومی زبان کی دُرگت ہو۔ بحالت موجودہ اس مذہب کا مرکز پنجاب ہو رہا ہے۔ پنجاب تعلیمی بل نے اس وقت ایک ایسی وقت پیدا کر دی ہے جس سے وہاں کے قومی زبان کے ہوا خواہ مضطرب ہو اُٹھے ہیں۔

سر سکندر حیات خاں پاکستان کی خواہ مخالفت کر رہے ہوں۔ لیکن اردو کے سوال اور ہندی کی مخالفت میں اُنھوں نے جو رویہ اختیار کیا ہے اسے پاکستانی اسکیم کے ایک جزو کی تکمیل کی ہی کوشش سمجھنا چاہیئے۔ اسکولوں کے بچوں پر اردو پڑھانے کا جو ایک زبردست بوجھ لادا جا رہا ہے ہندی کی مخالف پالیسی کا ایک زبردست ثبوت ہے"۔

آگے چل کر لکھتا ہے۔

"اسے کون نہیں جانتا کہ ہندوستانی اکثریت کی زبان ہندی اور خط دیوناگری ہے۔ ایسی حالت میں ہر ہوا خواہ ہندی کا فرض ہے کہ وہ پنجاب حکومت کی ہندی کش پالیسی کی زبردست مخالفت کرے۔ باشندگان پنجاب متحد ہو کر حکومت پنجاب کی ہندی کش پالیسی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ بہت ٹھیک کر رہے ہیں۔ قومی زبان کا سوال سوراج کا سوال ہے۔ سارے ملک کا سوال ہے۔ قومی تہذیب کا سوال ہے۔ باشندگان کی اکثریت کا سوال ہے۔ اکثریت ہی کا نہیں قومیت کا۔ اپنی زبان اور اپنے خط کا تحفظ ہی اپنے حق اور اپنے نصب العین کا حقیقی تحفظ ہے"۔

بنارس کے ہندی روزنامہ "آج" نے پنجاب کے قانون ابتدائی تعلیم کے خلاف ایک مستقل افتتاحیہ لکھا ہے۔ جس کے آخر میں لکھتا ہے۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ پنجاب کے ہندوؤں کی مادری زبان اُردو ہے۔ مادری زبان اُسے کہتے ہیں جو مائیں بولتی ہیں۔ جس کو بچے پیدا ہونے کے بعد پہلے سنتے ہیں۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ [illegible] عورتیں اپنے گھروں میں ہندی بولتی ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پنجاب کی ہندو عورتیں ہندی پرچے زیادہ خریدتی ہیں نہ کہ اُردو۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دِلّی اور پنجاب کے اردو رسالوں کا رواج بھی روز بروز کم ہو رہا ہے۔ اور اسی تعداد میں ہندی رسائل کا رواج روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ دراصل پنجاب کی مادری زبان اُردو نہیں ہے"۔

پنجاب کے قانون تعلیم ابتدائی کی حقیقت کا جہاں تک تعلق ہے حکومت پنجاب کے مشہور ہندو رکن چودھری سر چھوٹو رام کی تصریح موجود ہے۔ کہ قانون میں کسی زبان یا رسم الخط کے لئے تخصیص موجود نہیں۔ اب ۱۲ جنوری کو خود سر سکندر حیات خاں نے اپنے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ قانون تعلیم ابتدائی کے متعلق جہاں تک ذریعۂ تعلیم کا تعلق ہے کسی قسم کی تبدیلی قبول نہیں کی گئی۔ اس بیان کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ جہاں تک قانون کے نشا کا تعلق ہے اس سے نہ تو اردو کو کوئی فائدہ ہو پہنچتا ہے اور نہ ہندی گورمکھی کے لئے کسی قسم کے نقصان کا احتمال ہے بلکہ سب زبانوں کی حیثیت یکساں سی رہے گی"۔ لیکن اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے ہندی بھگت ملک بھر میں افتراق پسندی کا زہر پھیلا رہے ہیں۔

"آج" کہتا ہے کہ پنجاب کے ہندوؤں کی زبان اُردو نہیں ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر "ملاپ" "پرتاپ" "ویر بھارت" وغیرہ اردو روزنامے اور متعدد اردو ہفت روزہ اور ماہانہ جرائد و صحائف جو اُردو زبان میں نکلتے ہیں اور ہندو حضرات کی ملک ہیں وہ کس لئے شائع ہوتے ہیں۔ اور کیوں شائع ہوتے ہیں؟ اگر اسے سچ مان لیا جائے کہ ہندوؤں میں دِلّی اور پنجاب کے اردو اخبارات و رسائل کا رواج گھٹ رہا ہے اور ہندی جرائد و صحائف کا رواج ترقی کر رہا ہے تو یہ اس امر کا زبردست ثبوت ہے کہ دِلّی اور پنجاب کی موجودہ زبان اُردو ہے۔

ہندی کے بغیر سوراج بھی منظور نہیں

"آج" بنارس کا مشہور کانگریسی اخبار ہے روزانہ اور ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ اس کے مالک بابو شیو پرشاد گپت کانگریس کے نامور لیڈر ہیں۔ پنڈت کملاپتی شاستری ایم۔ ایل۔ اے۔ جو "آج" کے حلقۂ ادارت میں داخل ہیں۔ وہ بھی کانگریس کے لیڈر ہیں۔ اور ستیاگرہ کر کے جیل جا چکے ہیں۔ اس "آج" اخبار کے ایک نوٹ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے جو "اردو یعنی ہندوستانی کے حامی" کے عنوان سے ۹ جنوری ۱۹۴۱ء کے پرچے میں شائع ہوا ہے "آج" لکھتا ہے۔

"ساہتیہ سیلن کے صدر کی حیثیت سے مسٹر ٹنڈن نے جو

خطبہ لکھا تھا۔ اس سے الہ آباد کے کئی کانگریسی دوست مسلمان ناراض ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے ایک پرچہ شائع کر کے اس خطبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے فرقہ داریت سے معمور قرار دیا ہے۔ اور کانگریس کے ارباب حل و عقد خصوصاً مہاتما گاندھی سے اس امر کے لحاظ رکھنے کی درخواست کی ہے کہ آئندہ ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے۔ آخر سمپورنانند جی نے ایسا کون جرم کیا ہے جس پر یہ آتشباری کی جا رہی ہے۔

اس پرچے کے شائع کرنے والوں ہی کے قول کے مطابق مسٹر سمپورنانند نے کہا ہے کہ ملک کی زبان ہندی ہے۔ ملک کی زبان کا کوئی گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ اور جو لوگ اُردو یا ہندوستانی کو قومی زبان بنانے کی بات کی حمایت کرتے ہیں ان کی باتیں دلیل سے خالی ہوتی ہیں کیا یہی جرم عظیم ہے؟ اگر یہ جرم ہو تو ہم بڑے فخر اور زور کے ساتھ کہیں گے کہ اس کے سب سے بڑے مجرم ہم ہیں۔ ملک کی زبان وہی ہو سکتی ہے جس کی اصل ملکی ہو۔ اور جس کے ذخیرے میں زیادہ سے زیادہ الفاظ ملک کے ہوں۔ اس کے زیادہ تر الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جو ملک کی تہذیب کے حامل ہوں۔ اور انھیں ملک کے تمام صوبوں میں زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکتے ہوں۔ اگر یہ وصف ہندوستانی یا اردو میں ہو تو ہم ان دونوں کو ملکی زبان بھی کہیں گے۔ اور ہندی بھی۔ اگر ان میں یہ اوصاف نہ ہوں اور وہ دونوں زبانیں غیر ملکی الفاظ سے لبریز ہوں تو وہ کبھی ملکی زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ جن وجوہ سے انگریزی اس ملک کی زبان نہیں ہو سکتی انہی وجوہ سے عربی۔ فارسی۔ الفاظ سے لبریز۔ ان کے صرف و نحو سے مقید۔ عرب و فارس کی تہذیبوں کو اپنانے کی مضحکہ انگیز ہی نہیں بلکہ شرمناک کوشش کرنے والی زبان کبھی ملک کی قومی زبان نہ بنے گی۔ اردو یعنی ہندوستانی کے حمایتوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کے آم کے درختوں پر بسنت کے موسم میں کوئل ہی کوک سکتی ہے۔ بلبل چہک نہیں سکتی۔ اس حقیقت [illegible] کانگریس [illegible] اقتدار بھی

بدل نہیں سکتا۔ اس کی کوشش کرنا ہی آزادی کے دن کو دور ٹالنا ہے۔ (روزانہ "آج" مورخہ ۵ر جنوری ۱۹۴۱ء)

"آج" کے اس شذرے سے حامیان ہندی کے عزائم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ زبان کے معاملے میں کانگریس کے اقتدار کو بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کون حامیان ہندی؟ مہاسبھائی نہیں کانگریسی۔ کانگریس کے زیر علم حکومت سے جنگ کرنے والے، کانگریس کے زیر علم حکومت سے جنگ کر کے جیل جانے والے۔ وہ ہندی کے مقابلے میں آزادی کی بھی پروا نہیں کر سکتے۔ آزادی کا مبارک دن جس کے لئے وہ قید و بند کی سختیاں جھیل رہے ہیں اور ہر طرح کی قربانیاں کر رہے ہیں دور ہو جائے تو دور ہو جانے۔ لیکن وہ ہندی کے قومی زبان بنانے کے مطالبے سے ایک انچ نہیں ہٹ سکتے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جن مسلمانوں نے مسٹر سمپورنانند کے خطبے کے خلاف کانگریس کے ارباب حل و عقد اور گاندھی جی کو توجہ دلائی ہے ان میں مولانا فاخر شاہدی بھی ہیں۔ جو کانگریس کے زیر علم حکومت سے جنگ کرتے ہوئے بار بار جیل جا چکے ہیں۔ اور یہ زادے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے بڑے طبقے میں محض کانگریسی ہونے کی وجہ سے اپنی ہر دلعزیزی کھو چکے ہیں۔ حامیان ہندی اگر ان کی بھی رعائت کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ کسی کی رعایت نہیں کر سکتے۔ حامیان ہندی کے نزدیک عربی اور فارسی زبانیں اسی طرح بدیشی ہیں جس طرح انگریزی وہ جس طرح انگریزی کو ملک بدر کر دینے کے قابل سمجھتے ہیں اسی طرح عربی و فارسی کو بھی۔ ناروا داری اور تعصب کی انتہا ہے۔

اُردو کی مخالفت میں مردم شماری کے بائیکاٹ کی تلقین

۵ر جنوری ۱۹۴۱ء کے آج میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"ہینو دے ترے" نام کی کتاب میں مردم شماری کے کارکنوں کو ہدایتیں دی گئی ہیں جن میں اٹھارہواں سوال یہ ہے۔ درج کیجئے کہ اس شخص کی مادری زبان کیا ہے۔ یعنی اس شخص نے کون سی زبان سب سے پہلے بولی۔ دودھ پیتے بچوں اور گونگے بہرے لوگوں کی زبان وہ درج کی جائے گی جو ان کی ماں کی ہے۔ صوبے کی عام لوگوں کی زبان کو ہندوستانی درج کیجئے۔ اُردو یا ہندی نہ درج کیجئے۔ پہاڑی بولی کے لئے بھی ہندوستانی درج ہوگی۔"

یو۔ پی کی مردم شماری سے متعلق اس سرکاری حکم کی جانب ہم تمام ہندی دوست اداروں [illegible]

چاہتے ہیں۔ اس حکم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس صوبے میں اس کا پتہ کسی کو نہ چل سکے گا کہ اردو بولنے والے کتنے ہیں اور ہندی بولنے والے کتنے۔ اور اس طرح یو۔پی میں ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کی تبلیغ و اشاعت کرنے والوں کا پلہ کمزور رہ جائیگا۔

دوسرے صوبوں مثلاً پنجاب میں بسنے والوں کی مادری زبان اردو یا ہندی لکھی جائے گی مگر جہاں ہندی بولنے والوں کی تعداد سب جگہ سے زیادہ ہے وہاں ہندی کالعدم کر دی جائے گی۔ ہندی زبان اور ناگری خط پر اس صوبے میں حکمراں طبقے کی جانب سے کس طرح مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ یہ بھی ہے۔ یہ حملہ بڑی حد تک ان کی زبان ہی پر نہیں بلکہ ان کی تہذیب پر بھی ہے۔ "ہندوستانی" نام سے کون سی زبان مراد لی جاتی ہے۔ اس کا پتہ مندرجہ صدر اقتباس ہی سے چل سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے اسے ناگری خط میں چھپی ہوئی کتاب سے لیا ہے۔ اس کتاب کے شائع کرنے والوں کی رائے کے مطابق "مادری زبان" ہندوستانی ہے "ماتری بھاشا" نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عربی۔ فارسی خط پڑھنے سے مجبور کارکن مادری زبان اور اسی طرح کے دوسرے عربی فارسی الفاظ سمجھ سکتے ہیں سنسکرت کے "ترجمہ" یا "تتسم" لفظ نہیں سمجھ سکتے۔ ہندی اور ہندو تہذیب پر ہونے والے یہ حملے اب ناقابل برداشت ہو رہے ہیں۔ ہندوؤں اور حامیان ہندی میں اگر کچھ بھی زندگی ہے تو انھیں کسی تاخیر و توقف کے بغیر اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو مردم شماری کے بائیکاٹ کی تحریک بے خوفی اور جرأت و استقلال کے ساتھ کرنا چاہئے"۔

ہم حامیان اردو کو کسی مزاحمت کے بغیر جینے اور پھلنے پھولنے دینا چاہتے ہیں پر نہ معلوم کیوں۔ وہ ہمارا گلا گھونٹتے ہیں۔ اور حکام تہذیب کشی کے اس کام میں ان کی امداد کر رہے ہیں۔"

"آج" ۵ جنوری ۱۹۵۱ء

حامیان اردو "آج" کے اس شذرے کو غور سے پڑھیں۔ یہ شذرہ یو۔پی کی زبان کے متعلق ہے جسے اردو کا گہوارہ اور مسکن کہا جاتا ہے۔ اس صوبے کی اکثریت زبان کے "ہندوستانی" نام تک کو گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ نہ وہ اس زبان کو برداشت کر سکتی ہے جس میں "مادری زبان" کی قسم کے الفاظ موجود ہوں پھر اپنے وطن میں اردو کا انجام کیا ہوگا؟

"آج" ہی کے شذرے پر موقوف نہیں ہے۔ مردم شماری کے مسئلے پر ہندی حلقوں میں ایک بڑے پیمانے پر عرصے سے شورش برپا ہے۔ بنارس کے موقر ہندی ماہنامہ "ہنس" نے اپنی دسمبر کی اشاعت میں ہندی حلقوں کی اس شورش پر ایک نہایت متین اور بصیرت آموز شذرہ سپرد قلم کیا ہے۔ جس کے بعض ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں:-

حکومت ہند کی زبان سے متعلق پالیسی کا ردعمل ہندی بولنے والوں کے دماغ پر یہ ہے کہ حکومت ہند ہندی کو کوئی زبان ہی تسلیم نہیں کرتی۔ ریڈیو کے خلاف یہ الزام بہت پرانا ہے لیکن ابھی ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں مادری زبان ہندی یا اردو لکھنے کے بجائے ہندوستانی لکھی جائے گی۔ جس کے متعلق پنڈت بنارسی داس چترویدی نے اس مصیبت کے خلاف اخباروں میں ایک خط شائع کرایا ہے۔ اور خاص کر بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور دوسرے کارکنوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے تاکہ یہ مصیبت کہیں آئندہ مردم شماری میں بھی جا کر رجسٹروں کے خانوں میں جگہ حاصل نہ کرے۔ امید تو یہی کی جاتی ہے کہ اب کے سال تک ہندی ساہتیہ سمیلن اور پنڈت بنارسی داس کے لئے ان کو یہاں تک رہنے والے ایجی ٹیشن کرنے کا یہ مناسب موضوع بن سکے گا۔

پنڈت بنارسی داس کا کہنا ہے کہ پنجاب حیدرآباد اور کشمیر کے حکمراں ہی ہندوستانی کو اردو کہتے ہیں یا بنا رہے ہیں۔ لیکن وسطی ہند کی ریاستوں کی زبان ہندوستانی لکھی جائے گی پھر ہندی کہاں کی زبان ہے؟ سوال درست ہے لیکن چترویدی جی کو معلوم ہے کہ حکومت نے اپنی پالیسی کی صراحت کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ہر صورت میں اردو ہندی نہیں ہندوستانی لکھی جائے۔ ایسی حالت میں پنجاب کے وزیراعظم کیا کہتے ہیں۔ اور حیدرآباد میں کس زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور کشمیر کی مادری زبان کیا ہے۔ اس سے کیا بحث؟ وہاں کے لوگوں کی مادری زبان ہندوستانی ہی لکھی جائے گی۔ اب اردو والے بھی کہہ سکتے ہیں کہ "ہندوستانی" کے کیا معنی ہیں اور کیا ہندوستانی کوئی زبان نہیں ہے؟ بہرحال پنڈت بنارسی داس کی وکالت

فرقہ وارانہ ہے۔ اگر حکومت کی پالیسی سے صدمہ پہنچا ہے تو دونوں زبانوں کو یکساں طور پر۔ اس لئے ہمارا قلب اتنا وسیع ہونا چاہئے کہ ہم اپنے ہی جوتوں کی کیل سے درد کو درد نہ سمجھیں بلکہ ساتھی کے درد کے متعلق بھی ہمدردی کا اظہار کریں۔

پنڈت بنارسی داس جی نے حکومت کی اس مطلق العنانی کے خلاف ایک اور نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ اگر ہندی ساہتیہ سمیلن اور انجمن ترقی اُردو دونوں آپس میں سمجھوتہ کر کے اس طرح کی کوئی تجویز حکومت کے پاس بھیجتے" کہ ہندی یا اردو کے مقام پر ہندوستانی لکھا جائے تو بھی کوئی بات تھی۔ لیکن اس صورت میں چترویدی جی کے نزدیک یہ چیز قابل قبول ہو سکتی۔ کتنا مضحکہ خیز نقطۂ نظر ہے گویا اس طرح کے سمجھوتہ سے حکومت کی یہ پالیسی بجائے مضر ہونے کے مفید بن جاتی لیکن یہ سوال تو اس وقت بھی پیدا ہوتا کہ کیا ہندی کوئی زبان ہی نہیں ہے"۔

آگے چل کر "ہنس" لکھتا ہے۔

پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا ہم حکومت کی پالیسی سے متفق ہیں۔ اس بارے میں ہم دو باتیں واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ (۱) ہم ہندوستانی کے حامی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندی اور اُردو کے غیر فطری گٹھ بندھن سے قومی زبان ہندوستانی کی نشوونما ہو سکے گی۔ بلکہ اس کی ترقی تو دونوں کے فطری ہی امتزاج سے ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابھی ہندی اور اردو کو آزادانہ صورت میں برقرار رکھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ دونوں زبانیں اپنے خاص اور شستہ ادب کی رو کو برابر ترقی پذیر کرتی اور آگے بڑھاتی رہیں۔ اسی حالت میں دونوں کا تہذیبی تعلق دائمی اور فطری ہو سکے گا۔ یعنی ہندوستانی کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ ہم ہندی اردو کی آزادانہ ترقی کے بھی حامی ہیں۔
(۲) ہندی اُردو اور ہندوستانی کے معاملے میں ہم فرقہ پرستی کی کسی بھی صورت کا ارباب غور و فکر کے دماغ میں نادانستہ طور پر بھی پیدا ہونا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ نقصان رساں سمجھتے ہیں۔ اس لئے گاہ گاہ بلند ہونے والی چیخ پکار کو کہ "کیا ہندی کوئی زبان ہی نہیں ہے" یا "ہندی کا خون ہو رہا ہے" یا "ہندی کے مقابلے میں اردو کو فوقیت دی جا رہی ہے"۔ ہمارے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں اور ہم انھیں محض پست ہمتی اور دنائت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں"۔

خطرے کی گھنٹی کو اس کے مقام پر رکھنے کے بجائے اگر ہم اسے اپنے گلے میں باندھ کر گھومیں گے تو وہ جسم کی ہر حرکت کے ساتھ بجے گی۔ اور شاید لگاتار بجے گی۔ اور اگر اس کی ٹن ٹن کو سُن کر اصلی خطرے کا گمان کر کے ہم چونکنے اور اُچھل کود مچانے لگے تو اس کی ٹن ٹن اور زور سے بجے گی۔ یہی حال ہندوستانی کا سوال اُٹھنے کے وقت سے ہمارے ہندی بولنے والوں کا ہو رہا ہے۔ انھیں ہر وقت اور ہر مقام پر خطرہ ہی نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوئی ہے"۔

"آج" کانگریسی اخبار ہے اسے "ہنس" سے زیادہ معقولیت پرست اور اتحاد پسند ہونا چاہئے تھا لیکن "ہنس" کے اس شذرے کو دیکھ کر بھی اس میں معقولیت اور سنجیدگی پیدا نہ ہو سکی۔

اصطلاحی الفاظ صرف سنسکرت سے بنائے جائیں گے

ہندی ساہتیہ سمیلن نے خاص خاص موضوع کی تحقیق و تکمیل کے لئے علیحدہ علیحدہ مجلسیں قائم کی ہیں سائنس سے متعلق بھی ایک مجلس ہے۔ اس سال اس مجلس کی صدارت ڈاکٹر ستیہ پرکاش ڈی۔ ایس سی نے کی۔ "آج" نے اپنی ۶ جنوری ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں ڈاکٹر ستیہ پرکاش کے خطبے پر تبصرہ کیا ہے۔ جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

آپ نے سائنس کے کسی پہلو پر غور نہیں کیا ہے۔ مگر اس علم کی اشاعت کے لئے جس زبان کی ضرورت ہے اس کے خدو خال اور اس زبان سے متعلق مسائل پر بڑی قابلیت سے بحث کی ہے۔ یہی اس خطبے کی خصوصیت ہے۔ آپ ہندی کی ترقی چاہتے ہیں۔ اور اس کی اشاعت و ترویج کو تمام ملک کے لئے مفید سمجھتے ہیں"۔

آپ نے اپنی تقریر میں دو باتوں پر زور دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ تمام صوبوں میں ایک ہی طرح کے اصطلاحی الفاظ استعمال کئے جائیں۔ دوسرے یہ کہ بلند پایہ سائنٹفک ادب کے لئے تمام صوبے ہندی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیں۔ ہم خود کئی بار کہہ چکے ہیں کہ تمام صوبوں میں اصطلاحی الفاظ ایک ہونے چاہئیں۔ اس سے علم وحکمت کی اشاعت [illegible]

میں سہولت ہوگی۔ اور باہمی ہمدردی میں اضافہ ہوگا۔"

"ڈاکٹر ستیہ پرکاش کی دوسری تجویز نہایت اصولی اور اہم ہے جو پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی تو ایک روز سارا ملک آپ کا احسان مند ہوگا۔ ڈاکٹر ستیہ پرکاش کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ اصطلاحی الفاظ سنسکرت ہی سے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہاں اُردو کا سوال پیش کیا جاتا ہے جس کا جواب بھی آپ نے ٹھیک دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں اُردو ہندی دونوں زبانوں کے اصطلاحی الفاظ یکساں نہیں ہو سکتے۔"

"کچھ ہی دنوں پہلے ہم نے کہا تھا کہ اگر اردو والے چاہیں تو اپنے لئے عربی یا فارسی سے اصطلاحی الفاظ بنا لیں، لیکن ہندی میں یہ الفاظ سنسکرت ہی کے ہو سکتے ہیں۔ آپ نے اس مسئلے کا بہت غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ علم و حکمت کے میدان میں نام نہاد ہندوستانی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہماری ہندوستانی کمیٹی نے اصطلاحی الفاظ بنانے کی جو کوشش کی ہے اس کی آپ نے سخت الفاظ میں تغلیط کی ہے۔"

کمیٹی نے اصطلاحی الفاظ بنانے میں ان تین اصولوں کی پابندی کی ہے۔

(الف) تا امکان اصطلاحی الفاظ مروجہ بولیوں سے لئے جائیں سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور دوسرے ذریعے سے نہیں۔

(ب) جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں مغربی ممالک میں مروج الفاظ لئے جائیں۔

(ج) اور جہاں یہ دونوں باتیں ممکن نہ ہوں وہاں سنسکرت اور عربی یا فارسی سے الفاظ بنائے جائیں اور استعمال کے وقت دونوں میں سے ایک کو قوسین میں درج کیا جائے تاکہ طلبہ دونوں طرح کے الفاظ جان لیں۔ کمیٹی کے اس طرز عمل پر ڈاکٹر ستیہ پرکاش نے نہایت دل نشین تنقید کی ہے۔ آپ کی رائے ہے اور ہم اس سے متفق ہیں کہ بول چال کے الفاظ حکمت و فلسفہ کے میدان میں کام نہیں دے سکتے۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ہمیں اپنی علم و حکمت کی [illegible] لاطینی اور یونانی زبانوں کے الفاظ سے بھر دینا چاہئے۔ کیونکہ مغربی ممالک کے اہل سائنس یورپ کی اپنی دونوں قدیم زبانوں سے نئے الفاظ وضع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں میں اس کے معنی بالفاظ واضح یہ ہیں کہ ہم یونانی اور لاطینی الفاظ کو قبول کرنے کو تو تیار ہیں لیکن فارسی اور سنسکرت زبانیں ہمارے لئے اچھوت ہو گئی ہیں۔ یہ کیسی شرمناک اور جگر خراش حالت ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ کچھ اردو دوست اصحاب سنسکرت کو چھونا نہیں چاہتے۔ یہ حالت کب تک قائم رہے گی [illegible] اردو اور سنسکرت الفاظ سے مخلوط ہندی کو ملانے کی فضول کوششوں میں ہم اپنا کتنا سخت نقصان کر رہے ہیں۔ کیا اس طرف توجہ کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟

[illegible] کے پیچھے پڑ کر ہماری قوم کو ایک [illegible] پڑے گا۔ ہندو اور مسلمان یا ہندوستانی تہذیب کے [illegible] تہذیب کے [illegible] دونوں کا مفاد [illegible] اور دوسروں کو زندہ رہنے [illegible] دینے کا موقع ملے [illegible] سائنس [illegible] اصطلاحی الفاظ کا استعمال کرنا ہوگا جن کو عوام [illegible] سمجھ سکیں۔ ایسے الفاظ سنسکرت ہی سے لئے جا سکتے ہیں۔ بیشک مسلمان اس کی مخالفت کریں گے۔ لیکن ایک چھوٹی سی مخالفت کے باعث ہم پورے ملک کے مفاد کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر ستیہ پرکاش کے ساتھ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی انہی لفظوں کا استعمال کریں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے لئے عربی فارسی سے اصطلاحی الفاظ بنا لیں۔ ہندوستان کے اصطلاحی الفاظ سنسکرت ہی کے ہو سکتے ہیں۔ اور ہوں گے۔"

("آج" ۷ جنوری ۱۹۴۰ء)

"آج" نے بار بار دعوی کیا ہے کہ حامیان ہندی چاہتے ہیں کہ اردو بھی پھولے پھلے۔ اور ہندی کو بھی پھولنے پھلنے کا موقع ملے۔ لیکن جب تمام ہندوستان کی قومی زبان ہندی ہوگی۔ جب تمام صوبوں میں ہندی ہی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے گا۔ جب تمام صوبوں میں یکساں اصطلاحی الفاظ استعمال ہوں گے اور وہ صرف سنسکرت سے لئے گئے ہوں گے۔ جب موسم بہار میں آم کے درخت پر بلبل کو بولنے کی اجازت ہی نہ ہوگی۔ کوئل ہی کوک سکے گی تو سوال یہ ہے کہ چمن

اردو پھولے پھلے گی کہاں اور کیونکر؟ کیا صرف مسلمانوں کی مسجدوں۔ خانقاہوں اوران کے گھروں کی چہار دیواری کے اندر؟ کیا جس زبان اور رسم الخط کو سرکاری یا قومی حیثیت حاصل نہ ہو اس کی بقاء و ترقی ممکن ہے؟

حامیان ہندی اتنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں کہ پنجاب کے پرائمری مدارس میں اُردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ حالانکہ پنجاب کی اکثریت اردو بولتی ہے۔ اردو میں شاعری کرتی ہے۔ اُردو میں فسانے اور مضامین لکھتی ہے۔ اُردو میں اخبارات و رسائل نکالتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں میں اردو شعراء و ادبا۔ اردو علماء و فضلاء اور اردو اخبار نویسوں اور صحیفہ نگاروں کی بڑی تعداد موجود ہے۔

ریڈیو پر اُردو نوازی کا غلط الزام

کلکتہ سے ہندی کا ایک ہفت روزہ جریدہ "دیکھا" شائع ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک شذرے میں "ریڈیو اور ہندی" کے عنوان سے لکھتا ہے۔

عہد حاضرہ میں ریڈیو کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے تبلیغ و اشاعت کے لئے ریڈیو موجودہ زمانے کا سب سے بہتر ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اپنی ہمہ گیری کے باعث وہ تہذیب و تمدن کے نشو ونما کا ایک کامیاب وسیلہ بن گیا ہے۔

ہندوستان میں ریڈیو کا سوال ہندی والوں کے لئے ایک ہولناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہندی کو حکومت کی سرپرستی نصیب نہیں۔ ریڈیو میں بھی ہندی کو بُری طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ریڈیو کے ذریعہ ہندوؤں پر مسلمانوں کی تہذیب لادی جا رہی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہندوستان کی دو جلیل القدر ہستیوں کی یادگار ابھی حال میں منائی گئی ہے۔ لیکن ان میں جو فرق و امتیاز ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم تہذیب کو فوقیت دی جا رہی ہے۔ اور ہندو تہذیب کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یکم جنوری کو "یوم حالی" منایا گیا۔ اور لکھنؤ۔ لاہور۔ اور دہلی تین جگہوں سے منایا گیا۔ حالی اُردو کے شاعر ہیں۔ ان کے یوم کے لئے ۲۰۰ منٹ ریڈیو پر دیئے گئے۔ اور ۶ جنوری کو ہندی کی عظیم شخصیت بھارتیندو ہریشچندر کی یادگار منائی گئی۔ مگر یہ یادگار صرف لکھنؤ ریڈیو سے سنائی گئی اور ۳۰ منٹ میں ختم کر دی گئی۔

اس طرح کی نہ جانے کتنی زیادتیاں ہو رہی ہیں زبان میں بھی ہندوستانی کے نام پر اردو کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس امر کو مدنظر رکھکر گذشتہ چند مہینے سے لکھنؤ سے "آکاش بانی" کے نام سے ایک پندرہ روزہ پرچہ شائع ہونے لگا ہے۔ ہم اس پرچہ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس پرچہ کے ذریعہ ہندی کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے"۔

اس شذرہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندی نواز حضرات کی تنگدلی اور تنگ نظری کس افسوسناک حد تک ترقی کر چکی ہے۔ اب یہاں تک نگاہ رکھی جا رہی ہے کہ کس کے لئے کتنے منٹ دیئے جاتے ہیں۔

اگر یوم حالی کا پروگرام تین ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کیا گیا اور اس پر دو سو منٹ صرف کئے گئے اور بھارتیندو کا پروگرام صرف لکھنؤ سے براڈ کاسٹ کیا گیا اور اسے محض تیس منٹ دئے گئے تو اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ریڈیو والوں کو حالی مرحوم سے کوئی خاص عشق تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارتیندو جی کو ننانوے فی صدی ہندو بھی نہیں جانتے اور حالی مرحوم سے فی صدی نوے ہندو حضرات بھی واقف ہیں۔ حالی ایک ملکی شاعر تھے کون ایسا ہندو ہے جس نے اسکولوں میں اردو تعلیم پائی ہو۔ اور اسے حالی کی نظمیں یاد نہ ہوں؟ خصوصاً حالی کی مثنوی "حب وطن" حالی کی نظموں کا ایک معقول ذخیرہ ہندی میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔ بہرحال ریڈیو اسٹیشن کو نہ کسی سے محبت ہے اور نہ نفرت۔ وہ تو وہی چیز پیش کرتا ہے جس سے ریڈیو سننے والوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اور حالی سے دلچسپی رکھنے والوں کی ملک میں زیادہ تعداد ہے۔ اسی لئے اُنھوں نے بھی حالی کے پروگرام سے زیادہ دلچسپی لی۔

ریڈیو اسٹیشنوں کی ایک خاص شکایت یہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے پروگرام میں ہندی کی نسبت اُردو کو زیادہ جگہ دیتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ بھی نہیں کہ ریڈیو اسٹیشن والے ہندی کے مقابلے میں اردو کی کوئی بے جا رعایت کرتے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ہندی کے پروگرام سے صرف ہندی بھگتوں کا مختصر سا طبقہ دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اردو سے تمام ہندو مسلمان اور سکھ یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اردو سب جانتے ہیں۔ سب میں اُردو کے ادیب اور اہل قلم ہیں۔ اور سب اُردو میں اخبارات و رسائل نکالتے ہیں۔ بہرحال ریڈیو والے جو کچھ کرتے ہیں اپنے مفاد و مصالح کے پیش نظر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حامیان اردو کو بھی ان سے کافی شکایتیں ہیں: چنانچہ "ہندوستانی" کے نام سے اُردو زبان کو ریڈیو سے جو نقصان پہونچ رہا ہے اس کی شکایتیں اہل

اخبارات و رسائل برابر کرتے رہتے ہیں۔

سائنٹفک لغات

"ویکلی" نے اس نمبر میں "دی گیانگ شبدا ولی" (سائنٹفک لغات) کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ لکھا ہے۔

"حکومت ہند کی مرکزی مجلس مشورت نے ایک سب کمیٹی اس لئے بنائی ہے کہ وہ سائنٹفک الفاظ کی فہرست تیار کرے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ہندوستان کی صوبہ جاتی زبانوں میں سائنٹفک لغت کا فقدان ہے۔ اور حکومت ہند جو کام انجام دے رہی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ لیکن کام جس طرح کیا جا رہا ہے اسے دیکھکر دفعتہً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے! اور کیوں ہو رہا ہے؟

آج ہندوستان کے سامنے ہندو مسلم سوال ہولناک صورت سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ہندو مسلم سوال، مختلف تہذیبوں کا سوال ہے۔ جس کا پاکستان کی اسکیم بنانے والوں نے بار بار اعادہ کیا ہے۔ پاکستانی لیڈروں کا یہی کہنا ہے کہ ہندو تہذیب مسلم تہذیب کو غارت کر دے گی یہی وجہ ہے جو ہندو مسلم سمجھوتہ منظور نہیں کر سکتے۔

کانگرس والوں نے پاکستان کی بات غلط ثابت کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ ہندو تہذیب کو نقصان پہنچا۔ لیکن کانگرس والے اس کے باوجود مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بہرحال تہذیب کا سوال باقی ہی رہا۔ حالانکہ ہندو بری طرح دبتے رہے۔ اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب تمام ہندو مسلمان ہو جائیں اور سارا ہندوستان مسلم تہذیب کو قبول کر لے۔ جہاں تک ہندوؤں کے مسلمان بن جانے کا مسئلہ ہے۔ اس میں بہت دقتیں واقع ہوں گی۔ اس لئے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ تمام ہندوستان مسلمانوں کی تہذیب کو قبول کرے۔

حکومت ہند کی پالیسی ادھر کچھ عرصہ سے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی رہی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ... مسلم تہذیب و تمدن کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

اب مذکورہ بالا سب کمیٹی کے دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند نے کتنی اچھی اسکیم صرف ہندو تہذیب کو دبانے اور مسلمانوں اور مسلم تہذیب کو ترقی دینے کے لئے تجویز کی ہے۔ سب کمیٹی کی تشکیل حسب ذیل ہے۔

صدر: سر اکبر حیدری ایل ایل ڈی۔ پریسیڈنٹ اگزکٹو کونسل حکومت نظام۔

اراکین: دیوان بہادر سر کے۔ رما مینن

ایس۔ سی۔ ترپاٹھی۔ آئی۔ ای۔ ایس ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات حکومت اڑیسہ۔

مسٹر ڈبلیو۔ آئی۔ ایف۔ آرم اسٹرانگ آئی۔ ای۔ ایس ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات حکومت پنجاب

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔

پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی

شمس العلماء ڈاکٹر یو۔ ایم۔ داؤد پوتا ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات حکومت سندھ۔

حکومت ہند کے تعلیمی کمشنر

ڈاکٹر عبد الحق۔ سکریٹری آل انڈیا انجمن ترقی اردو دہلی۔

ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ بھٹناگر او بی ای۔ سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل تحقیقات و مطالعہ کے ڈائرکٹر۔

نواب مہدی یار جنگ بہادر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور رکن تعلیم حکومت نظام۔

ڈاکٹر حبیب الدین قریشی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے ماہر کیمیا و صدر شعبہ کیمسٹری۔

ہندوستان میں ۷۵ فی صدی ہندو ہیں اور ۲۵ فی صدی مسلمان نیز ہندوستان کی تقریباً تمام زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں پھر اس سب کمیٹی میں فارسی والوں کی اس قدر اکثریت کیوں ہے؟

اس موضوع پر الہ آباد کے ہندی ہفت روزہ "دیش دوت" لکھتا ہے۔

"حکومت ہند نے ایک ایسی کمیٹی مقرر کی ہے جو دیشی زبانوں کا ایک سائنٹفک لغت تیار کر رہی ہے۔ اس کمیٹی کے ممبر صرف پنڈت امرناتھ جھا ایسے شخص ہیں کہ جو ہندی کے ہمدرد ہیں۔ اور دوسرے اشخاص اردو کے حامی اور عالم ہیں۔ اس کمیٹی کا نام حیدری کمیٹی ہے۔ کیا حکومت ہند جس لغات کی تیاری کیلئے

ساعی ہے وہ اردو کے حامی حضرات ہی کے اشتراک و تعاون سے تیار ہو سکتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ قومی زبان کا مرتبہ ہندی کو حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے ہندی علماء کے اشتراک و تعاون اور آل انڈیا ہندی ادارات کے مشورے کے بغیر اس سائنٹفک لغات کی ترتیب و تشکیل کی کیا قدر و وقعت ہو سکتی ہے؟ اس لغات کو کون قابل تسلیم قرار دے گا؟ اس لئے ہم صاف طور پر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہندی دنیا کے مشورہ کے بغیر حکومت کی کسی طرح بھی ہندی کی مخالف پالیسی کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔ حکومت ہند کی ہندی کش پالیسی کی مخالفت قومی زبان ہندی کے ہر حامی اور خیر اندیش کا فرض ہے۔"

حامیان اردو دیکھیں کہ کوئی ایسا پہلو اور گوشہ نہیں ہے جہاں ہندی بھگت اردو پر حملے نہ کر رہے ہوں۔

نظم

ظالم رات

از
اختر بریلوی

وہ ایک شب جسے عشرت کا ماحصل کہئے
شب فراق کے صدمات کا بدل کہئے

جو زندگی میں فقط ایک بار آتی ہے
جلو میں لے کے سکون و قرار آتی ہے

وہ جس کے آنے کی خوشیاں منائی جاتی ہیں
اُمنگیں جس کے لئے کسمائی جاتی ھیں

وہ جس کے سانولے چہرے پہ شمع کا غازہ
ہر اک نفس میں لئے زندگی کا شیرازہ

وہ رات جس کو جوانی کی رات کہتے ہیں
خلاصۂ طربِ کائنات کہتے ھیں

وہ رات کیف میں ڈوبی ہوئی سہانی رات
شباب و حُسن کے جلوؤں کی جاودانی رات

چراغ ہائے تمنّا سے جگمگاتی رات
مہکتی، جاگتی، خاموش، مسکراتی رات

وہ رات جس کی مجھے بھی کبھی تمنّا تھی
مگر کچھ اور ہی اس وقت دِل کی دُنیا تھی

ترے سوا جو کوئی اور ہمنشیں ہو گا
تو سچ یہ ہے میں کہیں اور دِل کہیں ہو گا

جو دِل کی دِل ہی میں رہ جائے میرے دل کی بات
خدا کرے کہ نہ آئے کبھی وہ ظالم رات

سانیٹ

سراب محبت

از:- اختر ہوشیارپوری بی اے ایل ایل بی -

کوئی ترانہ نہ گایا تھا زندگی نے ہنوز
ابھی خیال کو حاصل نہ تھے پرِ جبریل
دل و نگاہ کی دُنیا تھی تشنۂ تکمیل

نقابِ رخ نہ اُٹھایا تھا بیخودی نے ہنوز
ہنوز سجدے کی خاطر جبیں جھکی بھی نہ تھی

حسین چاندنی راتوں میں سوز و ساز نہ تھا
شراب و شعر کی دُنیا میں کچھ گداز نہ تھا

رہِ وفا میں جوانی ابھی مٹی بھی نہ تھی
شباب، وصل کی لذت سے بے خبر تھا ہنوز

ہر ایک شے مری نظروں میں ناتمام سی تھی
جو آرزو بھی تھی کوئی تو وہ بھی خام سی تھی

کمالِ جذبِ محبت بھی بے اثر تھا ہنوز
کہ چشمِ شوق کو جلوہ دکھا کے چھوڑ دیا
ستم! ستم! مجھے اپنا بنا کے چھوڑ دیا

مشورہ

(افسانہ) از :۔

معاشرتی

محمد قمرالدین۔ رام نگری

رات کو نیل کنٹھ دیر میں سویا تھا۔ اس لئے صبح ذرا دیر سے اس کی آنکھ کھلی۔ پورب کی کھڑکی سے آنے والی فرحت بخش ہوا کے نرم اور لطیف جھونکے جو اسے تھپکیاں دے دے کر سلا رہے تھے اب بند ہو چکے تھے۔ اس کی بجائے سورج کی نیم گرم سنہری کرنیں اسے چھیڑ چھیڑ کر جگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسی حالت میں کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ آنکھیں کھلنے پر اس نے دیکھا چندرا ایک ہاتھ میں ناشتے کی طشتری اور دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی لئے کھڑی ہے۔

نیل کنٹھ کی چارپائی کے پاس رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی میز پر ناشتے کی طشتری اور چائے کی پیالی رکھتے ہوتے چندرا نے کہا۔

"تمہاری نیند کی بھی کوئی حد ہے۔ نیلو بھیا۔ دیکھو تو کتنا دن نکل آیا ہے یہ میں دوسری بار چائے بنا کر لائی ہوں۔ پہلی چائے تو بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھی بھلا ایسا بھی کیا سونا"

نیل کنٹھ بولا۔ تم نے جگایا کیوں نہیں دیا۔ چندرا۔ میں کچھ سو تو رہا نہیں تھا۔ آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ تم جانتی ہو۔ اس کھڑکی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جلدی اٹھنے دیتی ہے؟

چندرا نے کہا۔ خیر اب تو اٹھو۔ آج تمہیں بہت کام کرنا ہے۔ گھر میں دال ہے۔ نہ ساگ ترکاری۔ گھی تو رات ہی کو ختم ہو چکا ہے۔

"اور آٹے کا نام لینا کیوں بھول گئیں؟ تمہارے ہاں تو ساری دنیا کی چیزیں ایک ساتھ ہی ختم ہوتی ہیں"

"خیر اٹھو بھی کہ پڑے ہی پڑے باتیں بناتے رہو گے"؟

یہ کہکر چندرا رسوئی گھر کی طرف چلی گئی۔ چائے پیتے پیتے نیل کنٹھ کی نظر میز کے گلدان پر پڑی جو گلدستے کے بغیر سونا سونا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ چندرا!

چندرا تھالی میں چاول رکھے صاف کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں تھالی لئے نیل کنٹھ کے پاس چلی آئی۔ بولی۔ کیا ہے بھیا؟ اور چائے لاؤں؟

چائے واسے نہیں چاہیئے۔ میں پوچھتا ہوں۔ آج تم نے میری میز ننگی کردی تھی؟

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے"؟

گلدان میں گلدستہ نہیں ہے اس لئے پوچھ رہا ہوں"

چندرا مسکرا کر بولی۔ یہ بات ہے! اب کچھ دنوں گلدان یوں ہی رہے گا؟

"کچھ دنوں یوں ہی رہے گا۔ کیا معنی؟"

"مالن کی لڑکی کہہ گئی ہے۔ وہ اب گلدستہ نہ لائے گی"۔

"نہ کیوں لائے گی۔ میں نے تو چار پیسے روزانہ کے حساب سے مہینہ بھر کے پیسے پیشگی دیدئیے ہیں"۔

"پیسوں کی بات نہیں ہے۔ کچھ اور وجہ ہے۔ باقی پیسے واپس کرنے کو کہہ گئی ہے"۔

"آخر کون سی وجہ ہے۔ چندرا کچھ میں بھی تو سنوں"۔

"وجہ کیا ہے؟ لوگوں کی خام خیالی ہے"۔

"پھر بھی"۔

چندرا کہنے لگی۔ کل مالن کی لڑکی گلدستہ دینے آئی تو کہنے لگی۔ اب میں گلدستہ دینے نہ آؤں گی۔ میں نے پوچھا کیوں؟

بولی ماں کہتی ہیں صبح ہوتے ہی تو گنگا نہانے چلی جاتی ہیں۔ بابو گھر میں تنہا رہتے ہیں۔ تو جوان لڑکی ہے۔ تیرا تنہائی میں وہاں جانا اچھی بات نہیں ہے۔ اپنی ماں کی نسبت کہتی تھی وہ آج کل بیمار ہے۔

نیل کنٹھ نے ایک خشک مسکراہٹ کے ساتھ چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ اوہو۔ یہ بات ہے۔ عفت کی دیوی مالن تک کو ہمارے اخلاق پر بھروسہ نہیں ہے۔

"اس گنوار عورت کے کہنے سے کیا ہوتا ہے"۔

"کیوں نہیں ہوتا چندرا۔ آخر وہ بھی تو اسی سماج سے تعلق رکھتی ہے جس نے اخلاق و شرافت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے"۔

"اچھا وہ گلدستہ نہیں لاتی نہ لائے۔ اس کی خوشی"۔

"اور میری خوشی کوئی چیز نہیں ہے چندرا"؟ نیل کنٹھ نے [illegible] کہا۔

"یہ میں کب کہتی ہوں۔ لیکن صبر کرو۔ دو چار روز میں جب مالن اچھی [illegible] تو وہ خود گلدستے دے جایا کرے گی"

"مجھے گلدستے کی پروا نہیں ہے۔ مجھے صدمہ ہے مالن کی [illegible] بات سے میرے دل کو بڑا اذیت پہنچی ہے [illegible]

اب اگر مالن آئے تو کہہ دینا باقی پیسے لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ اور اب ہمیں اس کے گلدستوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

چندرا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ نیل کنٹھ نے میز پر سے خوبصورت اور قیمتی گلدان کو اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ چندرا بھائی کا یہ رخ دیکھ کر بغیر کچھ کہے رسوئی گھر کی طرف چلی گئی۔

۲

لڑکیوں کے ایک اسکول میں ایک ماسٹر کی ضرورت تھی۔ نیل کنٹھ نے اس کے لئے درخواست دی تھی۔ اسکول کی مجلس انتظامیہ کے صدر نے آج اسے بلایا تھا۔ اس لئے وہ نو بجے گھر سے چلا گیا تھا۔

چندرا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ابھی تک اس نے کھانا نہیں کھایا تھا اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ مگر اکیلے کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جیسے جیسے نیل کنٹھ کے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے ہو رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اس خیال سے یک گونہ تسکین بھی ہو جاتی تھی کہ ممکن ہے اسے جگہ مل گئی ہو اور اس نے آج ہی سے کام شروع کر دیا ہو۔

کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چندرا نے اوپر سے دیکھا۔ نیل کنٹھ ایک ہاتھ میں پھلوں کا لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں برف لئے کھڑا تھا۔ چندرا نے دروازہ کھولا۔ نیل کنٹھ اپنے چہرے کو شگفتہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کی دلی کیفیت اس مصنوعی شگفتگی کی صاف غمازی کر رہی تھی۔

نیل کنٹھ نے کہا۔ مجھے افسوس ہے چندرا کہ میرے انتظار میں تم اب تک بھوکی رہیں۔ چلو جلدی سے کھانا کھالیں۔

یہ کہہ کر نیل کنٹھ اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ چندرا اس کی ملازمت کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی مگر موقع نہ دیکھ کر خاموش رہی اور رسوئی گھر میں جا کر کھانا نکالنے لگی۔

کھانا کھاتے ہوئے چندرا نے پوچھا۔ نوکری کے بارے میں کیا ہوا؟

"دوسرا آدمی رکھ لیا گیا۔"

"دوسرا آدمی کیوں رکھ لیا گیا؟ کل تو تم کہتے تھے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ میں رکھ لیا جاؤں گا۔ تمہارا طرزِ تعلیم بھی دوسرے اُمیدواروں سے بہتر تھا۔"

لیکن قابلیت ہی تو سب کچھ نہیں ہے چندرا۔ اور بہت سی باتیں بھی تو ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

[illegible] کون سی بات تھی؟

[illegible] نہ تھی۔ لیکن اب دُنیا کی سمجھ کو کیا جانئے؟

"بہرکیف وہ تھی کون سی بات؟"

"پہلے تو اُنھوں نے مجھے رکھنا طے کر لیا تھا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بے شادی شدہ ہوں تو اُنھوں نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ وہ لڑکیوں کے اسکول میں ایک بے بیاہے نوجوان کو رکھنا خطرناک سمجھتے ہیں۔"

"تو وہاں کوئی اور مرد ماسٹر نہیں ہے؟"

ہیں تو دو تین مگر وہ شادی شدہ ہیں یا سن رسیدہ۔

چندرا "ہوں" کہہ کر چپ ہو گئی۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ مگر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی نیل کنٹھ نے جیسے ہی دوسری روٹی ختم کی چندرا نے اس کی تھالی میں ایک روٹی اور رکھنی چاہی مگر نیل کنٹھ نے روک دیا۔ کہا۔ اب بھوک نہیں ہے چندرا۔

"چندرا بولی بھوک نہیں ہے۔ یا آج کھانا اچھا نہیں پکا ہے؟"

"نہیں کھانا تو ٹھیک پکا ہے۔ لیکن دیر ہونے کی وجہ سے بھوک جاتی رہی"

یہ کہہ کر نیل کنٹھ اُٹھ گیا۔ چندرا سے بھی تنہا کھایا نہیں گیا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

نیل کنٹھ اپنے کمرے میں جا کر اپنے جدید مجموعہ نظم کا پروف دیکھنے لگا۔ اس کی عادت تھی کہ اگر اس کو کسی طرح کی پریشانی لاحق ہوتی تو دل بستگی کے لئے اپنا یا کسی دوسرے شاعر کا کلام لے کر بیٹھ جاتا۔

ابھی نیل کنٹھ کی پریشانی دور نہیں ہوئی تھی کہ مالک مکان کا منیم آموجود ہوا۔ اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ رسمی آداب و تسلیم کے بعد پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

نیل کنٹھ نے پوچھا۔ کیسے تکلیف کی منیم جی؟

منیم بولا۔ یوں ہی مزاج پُرسی کے لئے حاضر ہو گیا۔ کہئے سب خیریت ہے نہ؟

"آپ کی عنایت ہے۔ کرائے کے لئے تو میں کہہ چکا ہوں کہ پندرہ تاریخ تک مل جائے گا۔"

"میں کرائے کے لئے حاضر نہیں ہوا ہوں۔ سیٹھ جی نے ایک اور غرض سے بھیجا ہے۔"

"فرمائیے۔"

اگر آپ کو یہ مکان خالی کرنا پڑے تو ایک مہینے کی مہلت ضرور دی ہوگی یا آپ جلد ہی دوسرے مکان کا بندوبست کر لیں گے؟

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

صاحب بات یہ ہے کہ اسی بلڈنگ کے دوسرے کرایہ دار آپ کا یہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہم تو روزگاری ٹھہرے۔ ایک کے لئے چار کو ناخوش کرنے سے تو ہمارا کام چل نہیں سکتا۔"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ میں اکیلے آدمی کو مکان نہیں دیتا اور میں اپنی بہن کے ساتھ رہ رہا ہوں"۔

"آپ تو اپنی بہن کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن لوگ تو ایسا نہیں سمجھتے"

"لوگ کیا سمجھتے ہیں؟"

"اجی صاحب۔ لوگوں کی باتوں کو پوچھ کر کیا کیجئے گا؟"

"پھر بھی تو مجھے معلوم ہونا ہی چاہیے کہ لوگ کہتے کیا ہیں"؟

"اب میں آپ کو کہاں تک بتاؤں۔ کوئی کہتا ہے یہ ان کی بیوہ بہن نہیں ہے اسے کہیں سے اڑا لائے ہیں۔ کوئی کہتا ہے نہ صرف آپ کا اس سے ناجائز تعلق ہے۔ بلکہ آپ اس سے پیشہ بھی کراتے ہیں وقت بے وقت نوجوانوں کا آپ کے ہاں آنا جانا اس شبہے کو اور تقویت پہونچاتا ہے۔ میرا مطلب . . ."

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا" نیم جی کی بات کاٹ کر نیل کنٹھ نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

نیل کنٹھ کا دل چاہا ابھی اس بدمعاش کے سینے پر چڑھ کر اس کی زبان گدی سے کھینچ لے۔ لیکن حالات کا لحاظ کر کے وہ خون کا گھونٹ پی کر چپ رہ گیا۔

پھر وہ یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور گرج کر بولا ــ لیکن نیم جی کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے مکان کے سامنے رہنے والی وہ نرس وہ مسز پیس۔ وہ پاس کے مکانوں کے دونوں سرکاری بابو رات دن کے ۲۴ گھنٹوں میں کیا کچھ کرتے رہتے ہیں؟ میں ان کی حرکتوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ لیکن میں نے ان کے بارے میں کبھی آپ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ نہ مجھے اس کا کوئی حق ہے۔ لیکن خیر جانے دیجئے ان باتوں کو آپ یہاں سے تشریف لے جایئے۔

نیم کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو تکلیف دی اور ہاں سیٹھ جی سے کیا کہہ دوں؟

"کہہ دیجئے گا اگر انہیں عقل کا ہیضہ ہو گیا ہو تو کسی اچھے حکیم یا ڈاکٹر سے علاج کرائیں"۔

نیم نے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ ہاہا ــ ہاہا۔ تو آپ کو مکان خالی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ یہی کہہ دوں گا؟

سامنے کونے میں پڑے ہوئے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیل کنٹھ نے کہا۔ یہ آپ ان سے پوچھئے۔

"آپ شریف ہو کر شریفوں کے بارے میں ایسا کہتے ہیں"؟

نیل کنٹھ نے کہا جب شرافت کے نام پر رذالت کی جانے تو اور چارہ ہی کیا ہے؟ سیٹھ جی سے کہہ دیجئے گا کہ میرے پاس ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے"

نیم خاموش چلا گیا۔

۳

"آج کوئی خط تو نہیں آیا چندرا؟" گھر میں داخل ہوتے ہوئے نیل کنٹھ نے پوچھا۔

"ہاں آئی ہے ایک رجسٹری" چندرا نے ایک لفافہ نیل کنٹھ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

نیل کنٹھ نے لفافہ کھولا۔ چندرا نے پوچھا۔ کس کا خط ہے"؟

نیل کنٹھ نے لفافے کو پھاڑ کر خط پڑھا۔ اسے چاک کر کے ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یونہی کوئی خاص بات نہیں ہے"۔

"آخر کس کا خط تھا"؟

"مالک مکان کا"

"کیا لکھا تھا"؟

"لکھا ہے۔ ایک مہینے کے اندر مکان خالی کر دو۔ ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ باقی کرائے کی ادائیگی کے لئے بھی لکھا ہے"۔

"پھر تم نے کیا طے کیا؟"

"طے کیا کیا۔ اسی میں رہیں گے"۔

"اس سے فائدہ"؟

"فائدہ نہیں تو نقصان ہی کون سا ہے؟"

نقصان کیوں نہیں ہے۔ قانونی چارہ جوئی کے نتیجے کو تم مجھ سے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو۔ ضد کرنا بے سود ہے۔ جب مالک مکان ہمیں نہیں رکھنا چاہتا تو ہم زبردستی کتنے دنوں رہ سکتے ہیں۔ پھر وہ پیسے والا ہے۔ ہم اس سے جیت بھی تو نہیں سکتے۔ اس لئے اس سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لینا مناسب نہیں"

میں کب کسی سے جھگڑا مول لینا چاہتا ہوں بھلا چندرا؟ لیکن کسی پر خواہ مخواہ بدگمانی کر کے اور اس پر بہتان لگا کر مکان خالی کرانا تو کوئی انسانیت اور شرافت نہیں ہے"۔

"یہ تو صحیح ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اس زیادتی کے مقابلے میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں"؟

"نہ کامیاب ہوں۔ لیکن اس طرح اس مکان کو خالی کر کے بھی تو ہم [illegible] زیادتی سے پناہ نہیں پا سکتے۔ آج جو کچھ یہ مکان والا کر رہا ہے۔ کل [illegible] دوسرا مکان والا بھی کرے گا۔ اس طرح تو ہماری زندگی [illegible] ہم ذاتی مکان تو اگر رہ نہیں سکتے۔ اور کرائے پر [illegible]

ہوا؟"

"یہ سب درست۔ لیکن آخر مالک مکان کی مرضی کے خلاف ہم اس میں کب تک رہ سکتے ہیں؟"

"جب تک ممکن ہو۔ اس لئے کہ اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے۔"

"اچھی بات ہے جو تمھاری سمجھ میں آئے کرو۔ میں تو جانتی ہوں کہ تم میری بات ماننے والے نہیں۔" یہ کہکر چندرا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نیل کنٹھ نے کپڑے چارپائی پر ڈال دئیے اور پنکھا لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چندرا کو ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چندرا کی بیوگی ہی اس کے لئے کیا کم مصیبت تھی کہ نیل کنٹھ بھی اس کی دل شکنی کر کے اسے اور رنج پہونچاتا۔ لیکن وہ اسے کو مکان چھوڑنے پر تیار نہ پاتا تھا۔ وہ خود بھی محسوس کرتا تھا کہ مالک مکان سے جھگڑ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اس پر بہتان باندھ کر اس سے مکان خالی کرایا جائے۔

وہ ابھی اسی طرح نہ جانے کب تک اپنے خیال میں غرق رہتا کہ چندرا نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کے سلسلۂ خیال کو شکست کر دیا۔ وہ نیل کنٹھ کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اور کرسی کے دونوں بازوں پر ہاتھ رکھکر بولی۔

ایک بات پوچھوں بھیا برا تو نہ مانوگے؟

اگر برا ماننے کی بات ہوگی تو کیوں نہ برا مانوں گا۔ کیا تم مجھ سے یہ فخری حق بھی چھیننا چاہتی ہو؟

"تو پھر میں نہ کہوں"؟

"نہیں نہیں۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو"؟

"یہاں کوئی ودھوا آشرم نہیں ہے"؟

"ودھوا آشرم کو پوچھ کر کیا کروگی"؟

"یوں ہی پوچھ رہی ہوں۔ تمھیں معلوم ہے یا نہیں"؟

نیل کنٹھ نے کہا۔ کسی خاص آشرم کا تو پتہ نہیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی آشرم تو ضرور ہی ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے بدبخت ملک میں یتیموں اور بیواؤں کے نام پر پیٹ پالنے والوں اور سیوا کے نام پر پاپ کمانے والوں کی تو کمی نہیں ہے۔

"میں جاننا چاہتی ہوں یہاں کوئی ایسا آشرم ہے یا نہیں جس میں شریف گھرانوں کی بیواؤں کو روزی کمانے کے کاموں کی تعلیم دی جاتی ہو؟

"ٹھیک تو نہیں معلوم۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آخر تمھیں ایسے آشرم کی تلاش کیوں ہو رہی ہے"؟

چندرا جو کچھ کہنا چاہتی تھی اس کے کہنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی

نیل کنٹھ نے کہا۔ بتاؤ نہ چندرا۔ کیا بات ہے؟

"برا نہ مانو تو کہوں"؟

"اچھا کہو۔ برا نہ مانوں گا"

"میں کسی ودھوا آشرم میں داخل ہو کر پڑھنا اور کچھ کام سیکھنا چاہتی ہوں۔ تمام دن بیکار بیٹھے بیٹھے میرا دل گھبراتا ہے"

"یہ خیال تو اچھا ہے۔ چندرا۔ بشرطیکہ اس کی تہ میں کوئی اور جذبہ نہ ہو"

"اور کون سا جذبہ ہو سکتا ہے"؟

"تو صاف کیوں نہیں کہتیں چندرا کہ تم مجھ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہو؟

نہیں بھیا میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں تمھارا زیادہ تر وقت باہر ہی گذرتا ہے اور میں یہاں بیکار بیٹھی رہتی ہوں۔ اس سے اچھا ہے کہ وقت کو کام میں لایا جائے۔"

نیل کنٹھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنے بڑے بھائی کو دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم جانا ہی چاہوگی تو میں تمھیں روک نہ سکوں گا۔ لیکن جانے سے پہلے تمھیں ماں کی تصویر پر جو سامنے ٹنگی ہے ہاتھ رکھکر اور پتا جی کی یاد کو گواہ بنا کر کہنا پڑے گا کہ تم صرف اپنا مستقبل بنانے اور اپنے وقت کو بہتر طور پر کام میں لانے جا رہی ہو۔ کسی بدگمانی یا غلط فہمی کی بنا پر اپنے بدنصیب بھائی کو نہیں چھوڑ رہی ہو۔"

نیل کنٹھ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سانس زور زور سے چل رہا تھا ہونٹ کانپ رہے تھے۔ چندرا بھائی کی یہ حالت نہ دیکھ سکی اور اس کے پاؤں سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جوش گریہ نے اسے بے قابو کر رکھا تھا۔

نیل کنٹھ نے چندرا کو اٹھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تم یہ کیا لڑکپن کر رہی ہو چندرا۔

چندرا اسی طرح روتی رہی۔ نیل کنٹھ نے اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا اور خود کوٹ ٹوپی لے کر باہر جانے لگا۔

چندرا نے اپنے آپ کو سنبھال کر ساری کے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے اور بھائی کا راستہ روک کر کوٹ ٹوپی چھینتے ہوئے بولی۔ میں ابھی تمھیں کہیں نہ جانے دوں گی بھیا۔ ٹھہر کر جا سکتے ہو۔

نیل کنٹھ نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ تمھارے ہی کام سے جا رہا ہوں چندرا۔ کسی ودھوا آشرم کا پتہ لگانے۔ اب چندرا میں نیل کنٹھ کے سامنے کھڑے رہنے کی تاب نہ تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور نیل کنٹھ

کے کوٹ ٹوپی کو چارپائی پر ڈال کر بلکنے لگی۔

نیل کنٹھ کھڑا کھڑا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح کھڑا رہا۔

چندرا کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے خود ہی اپنے کو ایک ایسی مصیبت میں ڈال دیا ہے جس سے مدت العمر نجات کی اُمید نہیں۔ روتے روتے اس کی آنکھیں ورم کر آئی تھیں۔ تکیہ تر ہو گیا تھا۔ اس نے رات کو کچھ کھایا بھی نہیں۔ نیل کنٹھ بھی اسی طرح رہ گیا۔ دونوں میں کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی۔

رات کا دودھ اسی طرح رکھا تھا۔ چندرا کو اب بھی بھوک نہ تھی۔ لیکن نیل کنٹھ کا خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس نے صبح جلدی سے اُٹھکر چائے تیار کی۔ اور ناشتہ لے کر نیل کنٹھ کے کمرے میں گئی تو وہاں اس کا پتہ نہ تھا۔ میز پر دو لفافے رکھے تھے۔ ایک چندرا کے نام کا دوسرا مالک مکان کے نام کا۔

چندرا نے اپنے نام کا لفافہ چاک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا

"چندرا!

بے پایاں محبت! میرے خیال میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ مجھے تمھیں اس طرح کا خط لکھنا پڑے گا۔ لیکن ہماری زندگی میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جو ہمارے وہم وگمان سے باہر ہوتے ہیں تمھارے مستقبل کا خیال کر کے مجھے جو صدمہ ہو رہا ہے اسے کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔

میں چاہتا تھا کہ تم سے بالمشافہ صاف صاف باتیں کر لوں لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے کو اس سے بالکل قاصر پا رہا ہوں۔ نہ تم سے پہلے کی طرح صفائی اور بے تکلفی سے باتیں کرنے کی ہمت ہو رہی ہے اور نہ آنکھ اُٹھا کر تمھاری طرف دیکھنے کی۔ میں اپنی اسی کمزوری کے باعث زبان کی بجائے قلم سے کام لے رہا ہوں تاکہ مجھے اس کا نتیجہ اور اثر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنا پڑے۔

میں تمھیں لکھنے تو بیٹھ گیا چندرا۔ لیکن خیالات کی کتنی الجھنیں ہیں جو قلم کو چلنے نہیں دیتیں۔ قدرت نے ہمیں جس رشتے میں باندھ رکھا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ تمھیں کیا لکھنا مناسب ہے۔ اور کیا نہیں۔ کاش میں کسی طرح تمھیں سمجھا سکتا کہ اس وقت میرے قلب و دماغ کس کشاکش میں مبتلا ہیں۔

میں جس بات کو تم سے کہنے میں شرم محسوس کرتا تھا اس کے لکھنے میں اس سے کہیں زیادہ شرم محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن سبب بتائے بغیر میرا یکایک تمھیں چھوڑ کر چلدینا تمھارے لئے جس قدر پریشان کن اور مصیبت ناک ہوگا۔ اس کے تصور ہی سے میری روح لرز جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو میں اپنے کو چار و ناچار تمام باتیں لکھنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی بات مبہم اور تشنۂ توضیح رہ جائے تو میری اس کمزوری کو معاف کر دینا۔ اسی طرح اگر کہیں مجھ سے ضرورت سے زیادہ صاف بیانی اور حیا باختگی کا اظہار ہو جائے تو اسے بھی میری مجبوریوں پر محمول کر کے نظر انداز کر دینا۔

ہم میں سے کس نے کسے سمجھنے میں غلطی کی اور بچپن سے ایک ساتھ رہنے والے حقیقی بھائی کو علیحدگی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ اس بحث میں پڑنا عبث ہے۔ لوگوں نے ہم دونوں کے بارے میں کیا کچھ بداندیشی اور بدگمانی نہیں کی کیا کیا نہیں کہا۔ تمھیں عصمت فروش بتایا۔ مجھے اخلاق باختہ۔ بدطینت اور عصمت فروش کی روٹی کھانے والا۔ ہم کیا ہیں اور کیسے ہیں؟ ہمارا اخلاق و کردار کیا ہے اسے ہم جانتے ہیں۔ لیکن دنیا نے تو ہمیں ذلیل اور اخلاق باختہ ٹھہرانے اور ہمارے متعلق بد سے بدتر فیصلہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو ہماری اتنی فکر کیوں ہے۔ اور لوگ کیوں رسوا اور بدنام کرنے میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں؟ میں ان باتوں کو انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کر رہا تھا اور آئندہ بھی نہ جانے کب تک اسی طرح برداشت کرتا رہتا۔ لیکن جب تم نے ودھوا آشرم میں جانے کا خیال ظاہر کیا تو میری ہمت چھوٹ گئی۔ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ میں تو برداشت کر سکتا ہوں مگر تمھارے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی ہے اور اب ہم دونوں کا ایک ساتھ رہنا دشوار ہے۔

اب تک میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا کہ ایک مرد تو ہر طرح کی رسوائی اور بدنامی کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر ایک جوان بیوہ لڑکی اس کی ہمت نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے جو تم ودھوا آشرم میں جانا چاہتی ہو تاکہ تمھارے خلاف پھر کسی کو لب کشائی کا موقع نہ ملے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ تمھیں اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار کرنے اور ودھوا آشرم میں نہ جانے دینے کا لوگ کیا مطلب لگائیں گے اور اس سے لوگوں کی بدگمانی کو کتنی قوت پہونچے گی۔ البتہ تم نے اسے سمجھ لیا اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ میں اب تک تمھیں ویسی ہی بھولی بھالی بچی سمجھتا تھا جیسے ماں باپ اور تمھارے شوہر نے تمھیں مجھے سونپا تھا اور میں اپنے کو اسی طرح تمھارا زندگی بھر کے لئے محافظ خیال کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کی کوئی بات میرے پائے استقلال میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن گذشتہ چند دنوں سے جب میں تمھیں دیکھتا کہ تم میرے سامنے آنے اور نظر اونچی کر کے میری طرف دیکھنے میں شرم و حجاب محسوس کرتی ہو تو میرا کلیجہ شق ہو جاتا خیر اس طرز زندگی سے ہمیں ایک بہت بڑا تجربہ یہ ہوا کہ تنہائی کی صحبت بھائی خطرہ۔ اس کا شک اور برائی کا ذہنی ماحول کہیں زیادہ برے اثرات کا حامل

ہوتا ہے۔

تمھیں تنہا اور لاوارث چھوڑتے ہوئے طرح طرح کے خطرات میرے دماغ کو پریشان کر رہے ہیں۔ کل سے گھر کے ماحول میں جو انقلاب رونما ہو گیا ہے وہ میرے لئے اور پریشان کن ثابت ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں میں بدل گیا ہوں یا تم۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اب ہم دونوں کا پہلے کی طرح ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں یہی وجہ ہے جو میں سینے پر پتھر کی سل رکھ کر چلا جا رہا ہوں تم اپنی ذات پر بھروسہ کرنا۔ سمجھ لینا کہ جس طرح تمھاری ماں مر گئی۔ باپ اور شوہر مر گیا۔ اسی طرح تمھارے بدنصیب بھائی نے تمھارا ساتھ چھوڑ دیا۔

میرے پاس کیا تھا جو تمھیں دیکر جاتا۔ میرے سرہانے تکیہ کے نیچے سات روپے اور کچھ پیسے پڑے ہیں۔ اگر وہ تمھارے کچھ کام آسکیں تو خوشی سے کام میں لاسکتی ہو۔ مالک مکان کے نام جو خط ہے اسے ان کے منیم کو دے دینا۔ اور کہہ دینا کہ ان کے روپے مارے نہ جائیں گے دیر بیشک ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے وہ معاف کریں گے۔

مجھے ایک بات تم سے اور کہنی ہے۔ یوں تو اپنے متعلق تمھیں ہر طرح کا اختیار ہے۔ لیکن اگر اپنے بھائی کی ایک بات مان لوگی تو وہ سکون و اطمینان کی زندگی گذار سکے گا۔ آشرم میں داخل ہونے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تم کسی شریف اور رحمدل کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدو۔ میں جانتا ہوں کہ تمھیں دوسری شادی کرنے سے کتنا شدید انکار ہے۔ لیکن دھوا آشرم کی زندگی کے تصور ہی سے میرا دل لرز جاتا ہے تم دوسری شادی کئے بغیر ان خرابیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتیں جن میں تم جیسی حسین بیوائیں مبتلا ہو جاتی ہیں یا زبردستی مبتلا کر دی جاتی ہیں۔ سماج کے نزدیک شادی کرنے کے بعد جہاں انسان ایک سے ایک فعل کے لئے آزاد ہو جاتا ہے وہاں شادی کئے بغیر انسانیت کے معمولی حقوق کا بھی مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ مرد کسی حد تک سماج کے اس لغو اور بے ہودہ اصول و نظریہ کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن عورت تو محض بے اصل شکوک و شبہات کی بنا پر بھی آوارہ اور بدیافتہ قرار دیدی جاتی ہے۔ اس لئے اگر تم یہ فضول خیال کہ بیواؤں کی شادی دھرم کے خلاف ہے دماغ سے نکال کر اپنی دوسری شادی کر لو تو تمھارے لئے بہت بہتر ہے۔

ممکن ہے تم سوچو کہ میں نے خود تو زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تمھیں دوسری شادی کرنے پر کس قدر زور کیوں دے رہا ہوں؟ لیکن تم اپنی اور میری حالت پر غور کرو گی تو معلوم ہو گا کہ ہماری حالت ایک دوسرے سے مختلف ہے تمھاری شادی کے معنی یہ ہیں کہ تمھیں موجودہ پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات مل جائے لیکن میری شادی کے معنی میری موجودہ پریشانیوں اور ذمہ داریوں میں مزید اضافے کے ہیں۔ ممکن ہے ذمہ داریوں سے گھبرانا اور گریز کرنا میری بزدلی اور کمزوری ہو لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب سماج ہماری ازدواجی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری لینے پر تیار نہیں تو وہ اس کو انسانیت و شرافت کی ایک لازمی شرط کے طور پر زبردستی ہمارے سر منڈھنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

میں شادی کو انسان کی ترقی کے لئے ضروری خیال کرتا ہوں۔ مجھے اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن میں اس کے لزوم و وجوب کو تسلیم نہیں کرتا۔ خیر اس بارے میں تمھیں زیادہ لکھنا عبث بلکہ غیر ضروری ہے اس لئے اب خط کو ختم کرتا ہوں۔ تمھارا انیل کنٹھ"

چندر اس خط کو بار بار پڑھتی اور سوچتی رہی۔ لیکن معلوم نہیں وہ اپنے بارے میں سوچتی تھی یا انیل کنٹھ کے بارے میں۔ ماضی کے متعلق یا مستقبل کے متعلق۔

غزل

از: رئیس الشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش مرحوم

جو چاہیے کیجئے۔ مری جاں یا نہ کیجئے
لیکن کسی کے دل کو دکھایا نہ کیجئے

للہ آپ خونِ تمنا نہ کیجئے
شمعِ حیات ہے اسے ٹھنڈا نہ کیجئے

ملنے کا آج بھی کوئی وعدہ نہ کیجئے
ضد آپڑی ہے آپ کو اچھا نہ کیجئے

لکھ کر زمیں پہ نام مٹانے سے فائدہ
چاندی کے ہاتھ ہیں انھیں میلا نہ کیجئے

پہلے تو اک نگاہ سے دیوانہ کر دیا
اب منتیں ہیں یہ ہمیں رسوا نہ کیجئے

اک عمر صرف کی تو یہ نکتہ ملا ہمیں!
دنیا میں اعتبار کسی کا نہ کیجئے

دم لینے کا مقام نہیں تنگنائے دہر
پھر اُس پہ یہ کرم ہے کہ شکوہ نہ کیجئے

حبِ وطن ہے داخلِ ایمان واقعی
اس میں کبھی لحاظ کسی کا نہ کیجئے

شاعر جوان لوگوں کا ہے کام فکرِ شعر
اب تم میں دم نہیں یہ تمنا نہ کیجئے

نظم

دوشیزۂ صحرا
یادِ ایام کی روشنی میں

از:-

ثاقب سلمانی بی اے

زمیں پر ایک حسن و نور کی چادر بچھاتی تھی
بہاریں کھیلتی تھیں جس کی سبزہ پوش وادی سے
جھلک وہ نقرئی بہتے ہوئے مستانہ دریا کی
یہی اُس حسن کی دیوی کے نظاروں کا مسکن تھا
غرورِ حسن کی شوخی سے نکھری تھی جبیں اس کی
چھلکتی تھی مئے دوشیزگی جوشِ جوانی سے
چمک جاتی تھیں جب رعنائیوں سے چتونیں اُس کی
اُبھرتی تھیں ہزاروں دھڑکنیں پانی کی لہروں پر
وفورِ شوق سے پانی حسیں موتی اگلتا تھا
ادا و ناز کی رنگین پریاں رقص کرتی تھیں
وہ ساقِ صندلی اس کی اور اس کی کیف سامانی
نظارے سرمہ سائی کی ہوس میں رنگ بھرتے تھے
اُمنگیں حسنِ نظارہ کی تابش سے بھڑکتی تھیں
وہ اس کا قامتِ رعنا اور اُس کی خلعتِ موزوں
تماشا دم بخود ہو کر تڑپتا تھا فضاؤں میں

کوئی دوشیزۂ صحرا حسیں جلوے لٹاتی تھی
اُسی کہسار کے دامن میں وہ بستی بساتی تھی
افق کی دِل نشیں پہنائیوں میں جگمگاتی تھی
اسی دریا کے دامن میں وہ اکثر آتی جاتی تھی
جو اُس کے چاند سے چہرے پہ آ کر کھیل جاتی تھی
کہ جو بالیدگیٔ ذوق کو کوثر پلاتی تھی
لطافت گدگداتی تھی صباحت مسکراتی تھی
وہ جب دھیمے سُروں کی لے میں اکثر گنگناتی تھی
وہ اپنے مرمریں ہاتھوں سے جب چھینٹیں اڑاتی تھی
جہاں وہ یاسمیں جلووں کا بستر سا بچھاتی تھی
طبیعت کو بہارِ کیف سی اک گدگداتی تھی
نگاہِ شوق کی بالیدگی کیا رنگ لاتی تھی!
اور ان کی شعلہ سامانی بدن میں تھرتھراتی تھی
جو میٹھی نیند میں سوئے ہوئے فتنے جگاتی تھی
گدازِ جسم کی رخشندگی آنکھیں دکھاتی تھی

میں اب بھی سیر کو جاتا ہوں دریا کے کنارے پر
بہے جاتا ہے پانی اب بھی دریا کی روانی سے
مری نظروں سے اوجھل ہیں ترے رنگین نظارے
گلِ صحرا بتا تو کھا گئی کس کی نظر تجھ کو
سِسکتی ہے ابھی تک وہ دبی سی آرزو دل میں
مری دزدیدہ نظروں کو ابھی چھننے کی حسرت ہے

نہانے کے لئے جس جا پہ تو ہر روز آتی تھی
تو جس میں بے دریغ اپنی بہاروں کو لٹاتی تھی
جھلک پانی کی جن کے حسن کو شیشہ دکھاتی تھی
تری نظروں کی رنگینی بھی اک جادو جگاتی تھی
جو پہلو میں کسی تتلی کی صورت پھڑپھڑاتی تھی
وہ حسن و ناز کے موتی جو تو پہلے لٹاتی تھی

چنگاری

(افسانہ) — معاشرتی

مترجمہ:- اکرام قمر بی اے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں میں آئیون نامی ایک کسان رہا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ تینوں جوان تھے۔ سب سے بڑے کی شادی ہو چکی تھی۔ منجھلے کی نسبت قرار پا چکی تھی۔ اور شادی ہونے والی تھی۔ چھوٹا بیٹا بھی اچھا سیانا ہو گیا تھا۔ وہ گھوڑا ہانک سکتا تھا اور کاشتکاری کر سکتا تھا۔ آئیون کی بیوی ہوشیار اور سلیقہ شعار تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی بہو بھی صابر، فرماں بردار اور امورِ خانہ داری سے پوری طرح واقف تھی۔ آئیون اور اس کے کنبے کی زندگی نہایت اطمینان سے بسر ہو رہی تھی۔ گھر میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو کام سے معذور تھا۔ یعنی آئیون کا باپ۔ وہ دمے کے مرض میں مبتلا تھا۔ اور سات برس سے آتش دان کے پاس چارپائی پر پڑا تھا۔ تمام ضروری سامان آئیون کے پاس موجود تھا۔ تین گھوڑے تھے اور ایک بچھڑا۔ ایک گائے اور پندرہ بھیڑیں تھیں۔ عورتیں ضرورت کے مطابق کپڑا بُن لیتی تھیں اور کھیتی باڑی کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتی تھیں۔ مرد کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ ہر فصل پر اتنا غلہ ہو جاتا تھا جو دوسری فصل تک کافی ہو جاتا تھا۔ اور بعض اوقات بچ بھی رہتا تھا۔ باجرہ فروخت کر کے لگان ادا کر دیا جاتا تھا۔ اس سے بالائی اخراجات بھی پورے ہو جاتے تھے۔ مگر آئیون اور اس کے ہمسایہ گاردی اڈالف کے بیٹے جبرئیل میں جھگڑا ہو گیا۔ اگر یہ جھگڑا نہ ہوتا تو آئیون اپنے بال بچوں سمیت ہمیشہ بڑی راحت و اطمینان سے اپنی زندگی بسر کرتا۔

جس زمانہ میں گاردی زندہ تھا۔ اور آئیون کا باپ گھر کا کام کاج کیا کرتا تھا۔ اس وقت تک ان کسانوں میں دوستی تھی۔ اور دونوں شریف ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔

اگر کسی کو چھلنی، پرات، بوری یا گاڑی کے پہیئے کی ضرورت ہوتی تو دوسرے کے گھر سے مانگ کر اپنا کام چلا لیا جاتا تھا۔ دونوں گھرانے حقیقی ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ ایک کا بچھڑا اگر دوسرے کے کھلیان میں چلا جاتا تو وہ اس کو باہر کر کے دوسرے سے کہہ دیتا "ہمارا بچھڑا ہر طرف چلا جاتا ہے۔ بچھڑے کو ذرا سنبھال لو"۔ وہ نہ تو کھلیان اور ڈیوڑھی میں ... ایک دوسرے سے اپنی چیز چھپاتے اور نہ ایک دوسرے ...

بڈھوں کے زمانے کی بات ہے۔ لیکن جب بیٹے گھر کے مالک ہوئے تو سب رنگ ہی بدل گیا۔ ایک چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اور عداوت و نفرت نے محبت و ہمدردی کی جگہ لے لی۔

اس جھگڑے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ آئیون کی بہو کی مرغی نے وقت سے کچھ پہلے ہی انڈے دینے شروع کر دیئے۔ بہو انڈوں کو ایسٹر کے لئے جمع کرتی جاتی تھی۔ گاڑی کے اسارے میں اس کو ہر روز ایک انڈا مل جاتا تھا۔ لیکن ایک دن بچوں نے مرغی کو چمکا دیا۔ مرغی دیوار پر سے اڑ کر ہمسائے کے احاطے میں جا بیٹھی۔ اور وہیں انڈا دے دیا۔ بہو نے مرغی کی آواز سُنی لیکن سوچا کہ ابھی کام میں مصروف ہوں۔ اتوار قریب آ رہا ہے۔ گھر کو صاف کرنا ہے۔ بس سے انڈا پھر اٹھا لاؤں گی۔ لیکن جب شام کو وہ اسارے میں گئی تو انڈا نہ ملا۔ اُس نے اپنی ساس اور بڑے دیور سے دریافت کیا کہ کسی نے انڈا تو نہیں اٹھایا۔ دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن چھوٹے دیور تراس نے کہا کہ تمھاری مرغی نے ہمسائے کے احاطے میں انڈا دیا ہے۔ وہیں وہ کڑکڑا رہی تھی۔ اور وہیں انڈا دے کر دیوار پر سے اڑ کر واپس آئی ہے۔

بہو نے جا کر مرغی کو دیکھا۔ مرغی موجود تھی۔ مگر اس سے کیا پوچھتی؟ وہ بعد ازاں ہمسائے کے گھر گئی۔ اس کو دیکھتے ہی جبرئیل کی ماں باہر نکل آئی اور بہو سے پوچھا "کیوں بیٹی کچھ کام ہے؟"

بہو نے کہا "ہماری مرغی دیوار پھاند کر ادھر آ گئی تھی۔ دیکھنے آئی تھی کیونکہ وہ یہیں کہیں انڈا دے گئی ہے"۔

بڑھیا نے جواب دیا "ہم نے تو انڈا نہیں دیکھا۔ خدا کے فضل سے ہماری اپنی ہی مرغیاں بہت دنوں سے انڈے دے رہی ہیں۔ اس لئے ہمیں دوسروں کے انڈوں سے کیا مطلب؟ ہم دوسروں کے گھروں سے انڈے مانگتے نہیں پھرتے"۔

بہو نے اس بات پر بُرا مانا اور ایک کی دس سنائیں۔ بڑھیا بھی پیچھے ہٹنے والی نہ تھی۔ دونوں میں گالی گلوچ ہونے لگی۔ آئیون کی بیوی پانی لاتی ہوئی ادھر سے گذر رہی تھی۔ وہ بھی لڑائی میں شامل ہو گئی۔ جبرئیل کی بیوی بھی آواز سُن کر گھر سے نکل آئی۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ سب چلا رہی تھیں ایک ایک بات میں دو دو گالیاں سناتی تھیں۔

"تو ایسی ہے"۔ "تو ویسی ہے"۔ "تجھ میں سو عیب ہیں"۔ "تو چور ہے۔ اور تو بدچلن ہے"۔ "تو اپنے سُسر کو بھوکوں مارتی ہے۔ میری چھلنی لے گئی۔ اور اس میں شیطان کی بیٹی نے چھید کر دیا۔ ہمارا بانس لے گئی۔ اب اسی پر پانی لاتی ہے۔ لا میرا بانس ابھی دیدے"۔

اُنھوں نے بانس چھین لیا۔ پانی بہ گیا۔ ایک دوسرے کے کپڑے پکڑ کر نوچا کھسوٹی ہونے لگی۔ جبریل کھیت سے واپس آیا تھا۔ وہ بھی اپنی بیوی کی حمایت کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر آئیون اور اس کا بیٹا بھی بھاگا ہوا آیا۔ آئیون مضبوط آدمی تھا۔ اس نے سب کو ڈانٹا۔ اور باتوں ہی باتوں میں جبریل کی داڑھی پکڑ لی۔ پڑوس والوں نے جب یہ شور سنا تو وہ دوڑے دوڑے آئے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ اُنھوں نے بیچ بچاؤ کر کے سب کو الگ کیا۔

اس مختصر سے جھگڑے نے مستقل عداوت کی شکل اختیار کر لی۔

جبریل کی داڑھی کے چند بال (ہاتھا پائی میں نوچے گئے تھے جبریل نے ان بالوں کو کاغذ میں لپیٹ لیا اور عدالت میں نالش کر دی۔ وہ سب سے یہی کہتا کہ میں نے داڑھی اس لئے نہیں رکھی تھی کہ پاجی آئیون اسے نوچے۔ اس کی بیوی الگ غصہ میں بھری ہوئی تھی۔ وہ بھی یہی کہتی پھرتی کہ آئیون کو ضرور بالضرور سزا دلا کر سائبیریا بھجواؤں گی۔

غرض فساد بڑھتا گیا۔

آئیون کے بوڑھے باپ نے بہتیر سمجھایا کہ ایسا نہ کرو۔ مگر بوڑھوں کی بات پر کون کان دھرتا ہے۔ وہ آئیون سے کہتا: ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا بیوقوفوں کا کام ہے۔ ایک انڈے کے لئے اتنا جھگڑا! کیا خبر کہ انڈا کوئی بچہ ہی اُٹھا لے گیا ہو۔ ایک انڈے کی بات ہی کیا ہے۔ خدا سب کو رزق دیتا ہے۔ فرض کرو پڑوسیوں نے کوئی بات سخت بھی کہہ دی تھی تو تمھیں صبر کرنا چاہئے۔ انھیں تمھارے صبر سے معلوم ہو جائے گا کہ شریف آدمی کیسے ہوتے ہیں۔ زندگی میں جھگڑا تو کبھی کبھار ہو جاتا ہے مگر اس کو اتنا طول دینا نادانی ہے۔ دوسروں کو کیا الزام دیں ہم سب خود گنہ گار ہیں۔ صلح کر کے جھگڑے کو یہیں ختم کر دو۔ دل میں کدورت رکھو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے"۔

جوانوں کے خون میں جوش موجزن تھا۔ وہ بڈھے کی اس نصیحت کو بے معنی بکواس سمجھتے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آئیون کا سر پڑوسی کے سامنے جھکے۔ آئیون نے کہا: "میں نے اس کی داڑھی کب نوچی؟ اس نے آپ ہی نوچی تھی۔ یہ دیکھو اس کے بیٹے نے میرا کوٹ پھاڑ دیا ہے۔ اور اس کے سارے بند ادھیڑ دیئے ہیں"۔

مقدمے کی سماعت پہلے چھوٹی عدالت اور پھر ضلع کی عدالت میں ہوئی۔

اسی مقدمے کے دوران میں جبریل کی گاڑی کا دھرا گم ہو گیا۔ جبریل کے گھر کی عورتوں نے آئیون کے بیٹے پر الزام لگایا۔ وہ کہتی تھیں کہ ہم نے اسے رات کے وقت گاڑی کے پاس جاتے دیکھا ہے۔ اور فلاں شخص کہتا ہے کہ دھرے کو وہ سرائے کے مالک کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا۔

ایک اور مقدمہ دائر ہو گیا۔ کوئی دن خالی نہ جاتا جب ان میں کوئی جھگڑا نہ ہوتا ہو۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی بچوں نے بھی ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ جب عورتیں ندی پر کپڑے دھونے جاتیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر گالیاں دینی شروع کر دیتیں۔ ہاتھ سے زیادہ زبان چلتی! اور ایسی ایسی فحش گالیاں دیتیں کہ سننے والا کانوں میں انگلیاں دے لیتا۔

شروع شروع میں تو محض گالیوں پر ہی اکتفا کی جاتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ چوریوں تک نوبت پہونچ گئی۔ بچوں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کر لیا۔ دونوں گھرانوں کی زندگی جہنم ہو گئی۔ آئیون اور جبریل کے درمیان گاؤں کی پنچائیت میں چھوٹی کچہری میں اور ضلع کی عدالت میں برابر مقدمات چلتے رہے۔ حتیٰ کہ حکام عدالت بھی عاجز آ گئے۔ کبھی آئیون کامیاب ہو جاتا اور کبھی جبریل کو کامیابی اور آئیون کو سزا ہو جاتی۔ ان مقدمات کی ہار جیت نے ان کی آتش مخاصمت کو اور تیز کر دیا۔ کتوں کی طرح دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دونوں میں مقدمہ بازی جاری تھی۔ کبھی ایک کو قید یا جرمانہ ہو جاتا۔ اور کبھی دوسرے کو۔ ہر مقدمہ کے فیصلہ پر شکست خوردہ فریق دوسرے سے بدلہ لینے پر آمادہ ہو جاتا۔ چھ سال تک یہی کیفیت رہی۔ اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ بڈھا بار بار نصیحت کرتا۔ لیکن اس کی بات کون سنتا تھا؟

ساتویں برس ایک شادی کے موقعہ پر آئیون کی بہو نے جبریل کے متعلق یہ کہا کہ وہ گھوڑا چراتے پکڑا گیا ہے۔ جبریل نشے میں تھا۔ غصہ کو ضبط نہ کر سکا۔ اور اس زور سے اس کے گھونسا مارا کہ وہ ایک ہفتہ تک بستر پر لیٹی رہی۔ وہ حاملہ تھی۔ آئیون اس خیال سے خوش تھا کہ اسے جبریل پر مقدمہ کرنے کا ایک اور موقعہ میسر آ گیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس مقدمے میں اگر جبریل کو سائبیریا نہ بھیجا گیا تو اسے قید تو ضرور ہو گی۔ اور اس طرح یہ روگ ختم ہو جائے گا۔ مگر آئیون کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ عدالت نے مقدمہ خارج کر دیا۔ آئیون نے مرافعہ دائر کیا۔ مقدمہ صدر عدالت کی طرف منتقل ہو گیا۔ آئیون نے بڑی تگ و دو کی۔ منشی اور سررشتہ دار کو دو بوتلیں شراب کی دیں۔ فیصلہ جبریل کے خلاف ہوا۔ اور اسے بیس درّے کی سزا کا حکم دیا گیا۔

آئیون نے فیصلہ سن کر فاتحانہ انداز میں جبریل کی طرف دیکھا۔ جبریل کا منہ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ ایک طرف ہو گیا۔ آئیون بھی باہر نکلا اور اپنا گھوڑا سنبھالنے لگا۔ اسے یہ آواز سنائی دی کہ "اگر میرے درّے لگیں گے تو کیا مضائقہ ہے تمہاری وہ آگ لگاؤں گا کہ عمر بھر یاد رہے"۔

آئیون جلدی سے کمرۂ عدالت میں واپس آکر کہنے لگا "حضور عالی! ابھی ابھی چار آدمیوں کے سامنے جبریل نے میرے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی ہے"۔

جبریل کو طلب کر کے عدالت نے پوچھا "کیا تم نے آگ لگانے کی دھمکی دی ہے؟"

جبریل نے کہا "سرکار! میں نے کچھ نہیں کہا۔ آپ کو اختیار ہے۔ چاہے مجھے درّے لگوائیں یا قید کر دیں۔ میں کچھ بھی نہیں کرتا۔ لیکن سزا مجھے مل جاتی ہے۔ اور آئیون جو چاہے کرے اسے کوئی نہیں پوچھتا"۔

جبریل کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ عدالت کا عملہ بھی خائف ہوگیا کہ کہیں یہ بڈھا کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

بڈھے حاکم نے کہا "دیکھو! اب تم ہوش میں آجاؤ۔ صلح کرو۔ جبریل کیا تمہارے لئے یہ مناسب تھا کہ تم حاملہ عورت کو مارتے؟ میری بات مانو۔ اور آئیون سے معافی مانگ لو۔ اگر یہ تم کو معاف کر دے گا تو میں بھی تمہاری سزا منسوخ کر دوں گا"۔

سررشتہ دار نے ہنس کر کہا۔ جناب عالی! دفعہ ۱۱۷ کی رو سے یہ ناممکن ہے۔ جب فریقین میں صلح نہ ہوئی تو عدالت نے فیصلہ کر دیا۔ اب فیصلہ کی تعمیل لازمی ہے"۔

حاکم نے سررشتہ دار کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "تم خاموش رہو۔ خدا محبت کا سرچشمہ ہے۔ اس کا حکم ماننا انسان کا سب سے بڑا فرض ہے"۔

عدالت نے فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ کیونکہ جبریل معافی مانگنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ جبریل نے کہا "اگلے سال میری عمر ساٹھ برس کی ہو جائے گی۔ ایک بیٹا ہے۔ اس کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ درّوں کی سزا اب تک نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کینہ پرور آئیون نے یہ سزا بھی دلائی۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس سے معافی مانگوں۔ میں نے بہت کچھ صبر کے ساتھ برداشت کیا ——— مگر آئیون بھی کیا یاد

جبریل کی آواز بھرّا کر تھرّانے لگی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

گاؤں سات میل کے فاصلے پر تھا۔ آئیون غروب آفتاب کے وقت گھر پہنچا۔ اس نے زین اتارا۔ اور گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ عورتیں جانوروں کو لینے گئی ہوئی تھیں۔ اور لڑکے ابھی تک کھیت سے واپس نہیں آئے تھے۔ آئیون اندر گیا اور بیٹھ کر سوچنے لگا کہ جبریل سزا سنتے ہی کس طرح زرد پڑ گیا تھا۔ اور اس نے کس طرح دیوار کی طرف اپنا منہ کر لیا تھا۔ یہی منظر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہی سزا مجھے ملتی تو مجھ پر کیا گذرتی؟ یہ خیال آتے ہی وہ لرز اٹھا۔ اس کو جبریل پر رحم آنے لگا۔ اسی اثنا میں اس کا باپ کھانسا۔ وہ بدستور انگیٹھی کے سامنے چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور نیچے اتر کر آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ اور ایک بڑھئی کے قریب آکر اس پر بیٹھ گیا۔ یہاں تک آنے میں اس کا سانس پھول گیا تھا۔ کھانسی بھی اٹھنے لگی تھی۔ بہت دیر بعد اس کا سانس درست ہوا۔ تب میز کا سہارا لے کر اس نے آئیون سے پوچھا۔

"کیا اس کو سزا ہوگئی؟" آئیون نے جواب دیا۔ "ہاں بیس درّوں کی"۔

بڈھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا "بہت برا ہوا۔ آئیون! تم بہت برا کر رہے ہو یہ بہت برا ہوا۔ اس کا اتنا نقصان نہیں ہوگا۔ جتنا تمہارا ہوگا ——— آہ! اس کو درّے لگیں گے تو تمہیں کیا مل جائے گا؟"

آئیون نے کہا "آئندہ وہ ہوش سے کام لے گا"۔

"کس معاملے میں وہ ہوش سے کام لے گا؟ تم سے زیادہ برا کام تو اس نے نہیں کیا!"

"کیوں؟ اس نے کیا ہمارا کوئی کم نقصان کیا ہے۔ میری بیوی کو مار مار کر ادھ موئی کر دیا۔ اور اب میرے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دیتا ہے۔ کیا ان باتوں کے لئے اس کا شکریہ ادا کروں؟"

بڈھے نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔ "آئیون! تم ادھر ادھر پھرتے ہو۔ لیکن میں برسوں سے اس انگیٹھی کے پاس پڑا ہوں۔ شاید تم خیال کرتے ہوگے کہ تم سب کچھ دیکھتے ہوگے۔ اور میں کچھ نہیں دیکھتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل نہیں دیکھتے ہو۔ دشمنی نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی تمہیں نظر آجاتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ اس نے کونسی برائی کی یا کیا بری بات کہی؟ اگر صرف اس نے ہی بدکلامی اور برائی کی ہوتی تو کیا یہ جھگڑا کھڑا ہو سکتا تھا؟ تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے۔ جھگڑا دونوں کے بغیر نہیں ہوتا۔ وہ برا ہی۔ لیکن اگر تم بھلے بنے رہو تو جھگڑا کیوں ہو؟ اس کی داڑھی کس نے نوچی؟ اس کے بھوسے کو کس نے تباہ کیا؟ اسے عدالت میں کس نے

ہو گا یا؟ تم سارا الزام اسی کو دیتے ہو! تم خود اپنی زندگی خراب کر رہے ہو۔ اور یہی سارے جھگڑے کی جڑ ہے۔ ہم لوگ اس طرح نہیں رہتے تھے۔ یہ باتیں میں نے تمھیں نہیں سکھلائیں۔ کیا اس کا باپ اور میں اس طرح رہتے تھے؟ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم لوگ کیسے رہتے تھے! ہم اسی طرح رہتے تھے۔ جیسے ہمسایوں کو رہنا چاہئے۔ اس کے گھر میں آٹا ختم ہو جاتا تو اس کے گھر کی کوئی عورت آکر ہمارے گھر سے جتنا جی چاہتا آٹا مانگ لے جاتی۔ اگر اس کا باپ نہ ہوتا تو تمھیں اس کے گھوڑے کی دیکھ بھال کے لئے کہہ دیتا۔ جب کبھی مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی میں جاکر گاردی سے مانگ لاتا۔ ہم لوگوں کی زندگی بڑے آرام اور مزے سے گذری۔ لیکن اب کیا حال ہے؟ اس روز ایک سپاہی جنگ پلونا کا حال بیان کر رہا تھا۔ مگر تم لوگوں کی لڑائی تو جنگ پلونا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ لوگ کیا اس طرح رہا کرتے ہیں؟ تم گناہ کر رہے ہو۔ تم سمجھدار ہو۔ گھر کے مالک ہو۔ تمام ذمہ داری تم پر عاید ہوتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کو تم کیا سکھا رہے ہو؟ لڑنا جھگڑنا اور گالیاں دینا! ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں کہ وہ ذرا سا چھوکرا تراسک ہمسائی آرنی کو گالیاں دے رہا تھا۔ اور اس کی ماں پاس کھڑی ہنس رہی تھی۔ کیا یہی ہونا چاہئے؟ ان باتوں کا جواب تمھیں دینا ہوگا۔ ذرا اپنے دل میں سوچو کہ کیا یہ باتیں تمھارے لئے مناسب ہیں؟ تم نے ایک بات کہی، میں نے دو سنائیں۔ تم نے ایک گھونسا مارا اور میں نے دو! بیٹا یہ مسیح کی تعلیم کے خلاف ہے۔ کوئی تلخ بات کہے تو صبر سے سنو۔ اس کا ضمیر خود اس کو ملامت کرے گا۔ یہی خدا کی تعلیم ہے کہ اگر کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو۔ اور کہو بھائی! اگر تو یہی درست سمجھتا ہے تو لے دوسرے گال پر بھی تھپڑ مار دے! اس کی روح اس کو مضطرب کر دے گی۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اور وہ پھر تمھاری طرف جھک جائے گا۔ یہ ہے خدا کی تعلیم! خداوند نے غرور و تکبر کی تعلیم نہیں دی۔ بولتے کیوں نہیں؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

آئیون خاموشی سے سنتا رہا۔ بڈھے نے کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر کہنا شروع کیا۔

شاید تم خیال کرتے ہوگے کہ مسیح کی تعلیم صحیح نہیں ہے۔ کیوں؟ میں تمھارے بھلے کی کہتا ہوں۔ جب سے تم نے لڑائی شروع کر رکھی ہے۔ ذرا سوچو کہ تمھیں فائدہ پہنچا ہے۔ یا نقصان؟ ذرا حساب تو کرو کہ تھوڑا تھوڑا کرکے عدالت کتنا روپیہ کھا گئی؟ آنے جانے اور کھانے پینے میں کیا خرچ ہوا؟ تمھارے بیٹے جوان ہو رہے ہیں۔ مگر تمھاری قسمت گردش میں ہے۔ یہ کیوں؟ اسی بے وقوفی کی وجہ سے! تمھارے تکبر کی وجہ سے! تمھیں لڑکوں سمیت کھیت میں کام کرنا چاہئے تھا۔ تمھیں جتنے بونے کی فکر ہونی چاہئے تھی۔ لیکن تمھارے سر پر تو شیطان سوار ہے جو کبھی تمھیں عدالت میں کھینچ لے جاتا ہے۔ اور کبھی کسی دوسری جگہ۔ اگر تم نے وقت پر نہ جوتا اور نہ بویا تو فصل کہاں سے ہوگی؟ اس سال جوار کی فصل کیوں نہیں ہوئی؟ تم نے کتنی دیر سے جوار بوئی تھی؟ تمھیں کیا نفع ہوا؟ ایک اور بوجھ سر پر آ پڑا—— بیٹا، اپنے کام کی دیکھ بھال کرو۔ لڑکوں کو ساتھ لے کر کھیتی باڑی میں لگو۔ گھر کا کام کاج سنبھالو۔ اگر کوئی تم سے بدکلامی کرتا ہے تو اسے معاف کر دو۔ خداوند یہی چاہتا ہے۔ اس کی مرضی پر چلو گے تو زندگی آرام سے گذرے گی۔ اور طبیعت بھی مطمئن رہے گی!"

آئیون بدستور خاموش تھا۔ بڈھے نے پھر کہا۔ "پیارے آئیون! اپنے بڈھے باپ کی بات مانو۔ جاؤ گھوڑے پر زین کسو اور فوراً عدالت میں پہنچ کر ان سب جھگڑوں کو ختم کر دو۔ اور کل کو جبریل کے پاس جاکر خدارا صلح کر لو۔ کل تہوار ہے۔ کل شام کے کھانے پر ان لوگوں کو مدعو کرو۔ صلح کرنے کے لئے یہ وقت اچھا ہے۔ اس قضیئے کو اب کسی طرح ختم کر دینا چاہئے۔ تاکہ آئندہ زندگی آرام سے گذرے۔ اور ہاں عورتوں اور بچوں کو بھی سمجھا دو!"

آئیون نے ٹھنڈا سانس بھرا اور سوچنے لگا۔ "اباجی کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔" اس کے دل میں جھگڑا ختم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مگر جھگڑا اتنا بڑھ چکا تھا کہ مصالحت کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

لیکن بڈھا اس الجھن کو تاڑ گیا وہ سمجھ گیا کہ آئیون اس وقت کس خلفشار میں ہے۔ اس نے کہا۔ "آئیون جاؤ۔ کسی کام کو ٹالنا اچھا نہیں ہوتا۔ آگ کو زیادہ بڑھنے سے پہلے ہی بجھا دینا چاہئے۔ اگر شروع میں غفلت کی جائے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔" بڈھا کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس اثنا میں گھر کی عورتیں بولتی ہوئی آپہنچیں۔ یہ انھیں پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ جبریل کو دروں کی سزا ملی ہے اور یہ کہ جبریل نے ان کے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی ہے۔ وہ یہ سب کچھ سن چکی تھیں۔ کچھ اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر انھوں نے یہ ساری باتیں جبریل کے گھر کی عورتوں کو کھیت ہی میں سنا دی تھیں۔ انھوں نے گھبرا کر کہا کہ۔ جبریل کی بہو ایک اور مقدمہ دائر کرنا چاہتی ہے۔ سنا ہے کہ جبریل نے حاکم کو اپنی طرف کر لیا ہے۔ اس لئے ابکی دفعہ فیصلہ ہمارے خلاف ہوگا۔ اسکول کے مدرس نے زار کی خدمت میں عرضداشت روانہ کر دی ہے۔ جس میں شروع سے آخر تک آئیون کا کچا چٹھا تحریر کر دیا ہے۔ دھرے کی چوری اور [illegible] والی بات سب کچھ بیان کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر [illegible]

پر قبضہ کئے بغیر پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔" یہ باتیں سُن کر آئیون کا دل پھر مکدر ہو گیا اور جبریل سے صلح کرنے کی تجویز پس پشت ڈال دی گئی۔

کسان کو ہر وقت ایک نہ ایک کام رہتا ہے۔ آئیون نے عورتوں سے بالکل بات نہ کی۔ سیدھا کھلیان اور اُسارے کی طرف چل دیا۔ وہاں کچھ جھاڑتا اور صاف کرتا رہا۔ اسی دوران میں سورج غروب ہو گیا اور اس کے بیٹے بھی کھیت سے واپس آ گئے۔ وہ جاڑوں کی فصل کے لئے کھیت کی جتائی کر رہے تھے۔ آئیون نے کام کاج کے بارے میں ان سے کچھ پوچھا۔ اور سب چیزیں مناسب جگہ پر رکھوائیں۔ گھوڑے کی گردن کا پٹا ٹوٹ گیا تھا۔ اس کو مرمت کے لئے الگ رکھا۔ کھلیان میں کڑیاں کھنے جا رہا تھا کہ بالکل اندھیرا ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے چارا ڈالا۔ پھاٹک کھول کر ان گھوڑوں کو باہر نکالا جنھیں تراس رات کو چرنے کے لئے لے جانے والا تھا۔ پھر پھاٹک بند کر دیا۔ وہ اب کھانے پینے سے فارغ ہو کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ گھوڑے کی پٹا لے کر وہ اپنے گھر کی طرف چلا۔ اسے نہ تو جبریل کا کوئی خیال تھا اور نہ بوڑھے باپ کی نصیحت کی کوئی [illegible]۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہونے لگا۔ اس کے کان میں پڑوسی کی آواز [illegible] وہ کسی سے بہت زور سے کہہ رہا تھا۔ "وہ کم بخت بنا کیا پھرتا ہے۔ اس کا تو قصہ ہی پاک کر دینا چاہیے۔" ان الفاظ کو سنتے ہی آئیون کے دل میں پھر کدورت پیدا ہو گئی۔ آئیون کھڑا جبریل کی باتیں سنتا رہا۔ اور جب جبریل چپ ہو گیا تو آئیون بھی گھر میں چلا گیا۔

گھر میں ایک چراغ روشن تھا۔ بہو چرخہ کات رہی تھی۔ بیوی کھانا پکا رہی تھی۔ بڑا لڑکا کھڑاؤں کے لئے لکڑی ٹھیک کر رہا تھا۔ منجھلا بیٹا بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ تراس کھیت جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اگرچہ اس گھر میں راحت و آرام کی ساری چیزیں موجود تھیں مگر پڑوسی کے جھگڑے نے ساری حالت ہی بدل دی تھی۔

آئیون غصہ میں بھرا ہوا اندر آیا۔ بلی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کو اٹھا کر پٹک دیا۔ پھر عورتوں سے بگڑنے لگا۔ جبریل کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ نالش کی دھمکی کا اُسے خیال آیا۔ ابھی ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ "اس کا تو قصہ ہی ختم کر دینا چاہیے۔" یہ الفاظ اس کے دل پر نقش ہو گئے۔ اس کی بیوی نے تراس کو کھانا دیا۔ کھانا کھا کر تراس نے پوستین پہن لی۔ اور ڈیرے سے نرمل لیا۔ کمر میں پٹکا ڈالا۔ کچھ روٹیاں ساتھ لیں اور گھوڑوں کو سنبھالنے کے لئے باہر نکل گیا۔ بڑا بھائی اس کو پہنچانے جا رہا تھا کہ خود آئیون نیچے اُترا۔ بیٹے کو رخصت کر دیا۔ اور گھوڑے کو پیچھے ہانک دیا۔ تراس کھیت کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن آئیون وہیں کھڑا ٹاپوں کی آواز سنتا رہا۔ تراس گاؤں کے اور لڑکوں کے ساتھ ہو لیا۔ جب سب دور نکل گئے تو آئیون بھی واپس مڑ کر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ جبریل کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ وہ آگ لگا دوں گا جو عمر بھر یاد رہے۔

آئیون نے سوچا کہ کیا تعجب وہ کچھ کر گذرے۔ چاروں طرف پھونس ہی پھونس ہے۔ ہوا بھی اس وقت زوروں پر ہے۔ ممکن ہے وہ پچھواڑے کی طرف آگ لگا کر چلتا بنے۔ ہمارا گھر خاکستر ہو جائے گا اور وہ تو کا بچا صاف بچ جائے گا۔ اور اگر کہیں وہ آگ لگاتے پکڑا گیا تو چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گا۔

یہ خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ وہ گھر میں نہ گیا بلکہ موڑ پر جا نکلا۔ اس نے سوچا کہ پہلے گھر کے چاروں طرف چکر لگاؤں گا۔ نہیں معلوم وہ کیا کر بیٹھے۔ آئیون دبے پاؤں پھاٹک سے نکلا اور دوسرے موڑ پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیوار کو دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ دوسرے کونے پر کوئی چھت سے نکل کر پھر غائب ہو گیا۔ آئیون چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کی پتیاں ہوا میں کھڑکھڑاتی تھیں۔ کبھی پھونس کے چھپر سے ہوا سنسناتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ پہلے تو بالکل اندھیرا دکھائی دے رہا تھا لیکن جب آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو گئیں تو دوسرا کونہ نظر آنے لگا۔ وہاں ایک ہل اور چند بنڈیر سے پڑے تھے۔ اس نے اچھی طرح دیکھا لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔

آئیون نے خیال کیا کہ شاید مجھے مغالطہ ہوا ہے۔ تاہم مجھے چل کر دیکھ لینا چاہیے۔ آئیون کے پیروں میں کھڑاویں تھیں لیکن وہ ایسی آہستگی سے چلا کہ خود اس کو اپنے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دیتی تھی۔ جب وہ کونے کے پاس پہنچ گیا تو اس کو ایسا معلوم ہوا کہ ہل کے قریب کوئی چیز چمک کر غائب ہو گئی ہے۔ آئیون کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ رک گیا۔ اور کہتا تھا کہ ایک بار پھر کوئی چیز تیزی سے چمکی۔ اسی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کی طرف پیٹھ کئے کوئی شخص بیٹھا ہے۔ اس کے سر پر ٹوپی ہے اور ہاتھ میں خشک سلگتی ہوئی گھاس ہے۔ آئیون بے چین ہو گیا۔ حملہ کرنے کے لئے جلدی جلدی اس کی طرف چلا۔ اس کا خیال تھا کہ اب جبریل موقع پر پکڑا جائے گا۔ اور بچ کر نہیں جا سکے گا۔

ابھی آئیون اس کے پاس پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسری جگہ زور سے شعلہ بھڑک اٹھا۔ بنڈیرے کے پاس چھپر جل رہا تھا۔ شعلے چھت تک پہونچ رہے تھے۔ انہی شعلوں کے قریب جبریل کا پورا جسم صاف نظر آ رہا تھا

جیسے باز ممولے پر جھپٹتا ہے ویسے ہی آئیون جبریل کی طرف جھپٹا۔ وہ جبریل کو پکڑنا چاہتا تھا۔ مگر شاید جبریل نے اس کے پاؤں کی آہٹ سن لی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف گھوم کر کھلیان کے اندر سے ہوتا ہوا خرگوش کی طرح بھاگا۔ آئیون اس کے پیچھے چلاتا ہوا دوڑا کہ "پاجی اب بچ کر کہاں جائے گا؟"

آئیون جبریل کو پکڑنے ہی لگا تھا کہ جبریل بچ کر نکل گیا۔ لیکن آئیون نے اس کے کوٹ کا دامن پکڑ ہی لیا۔ کوٹ پھٹ گیا۔ آئیون گر پڑا۔ لیکن جلدی سے اٹھا اور زور زور سے چلانے لگا "مارو پکڑو! چور۔ قاتل"۔ اور پھر اس کے پیچھے بھاگا۔ جبریل اب اپنے گھر کے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب آئیون وہاں پہنچا اور جبریل کو پکڑنے لگا تو اس کی کنپٹی پر کوئی پتھر سی سخت چیز اس زور سے آ کر لگی کہ وہ چکرا گیا۔ اس کا سر بھنا اٹھا۔ ابھی اس چوٹ سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ جبریل نے ایک ڈنڈا زور سے مارا۔

آئیون کا سر چکرا گیا۔ پہلے تو آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ پھر ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد وہ لڑکھڑا کر گر پڑا جب ہوش آیا تو جبریل کا وہاں کوئی پتہ نہ تھا۔ دن کی طرح روشنی تھی۔ اس کے گھر کی طرف سے کسی انجن کے چلنے کی سی آواز آ رہی تھی۔ آئیون نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے مکان کے پچھواڑے کا اسارا جل رہا ہے بغلی اسارے میں بھی آگ پہنچ چکی ہے۔ ہر طرف سے شعلے اور دھواں چنگاریاں اڑ اڑ کر اس کے دوسرے چھپروں کی طرف لا رہے تھے۔

آئیون دو ہتڑ مار کر چلانے لگا "یارو یہ کیا؟ چھپر کے نیچے سے تھوڑا سا پھونس کھینچ کر رگڑ دیتے آگ ختم ہو جاتی۔ یہ کیا ہو گیا؟" وہ بار بار یہی بڑبڑاتا۔ وہ چلانا چاہتا تھا مگر منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اس نے بھاگنا چاہا۔ مگر پاؤں میں سکت نہ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلا۔ لیکن لڑکھڑانے لگا۔ سانس پھول گیا۔ تھوڑی دیر دم لینے کو ٹھہر گیا۔ پھر چلا۔ جب وہ پچھواڑے کے اسارے تک پہنچا۔ بغلی اسارا بھڑک اٹھا اور مکان کا بھی ایک کونہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے بعد پھاٹک کا چھجا بھی جلنے لگا۔ مکان سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ آنگن میں بھی پہنچنا ناممکن تھا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ مگر کوئی بھی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ہمسائے اپنا مال اسباب بچانے کی فکر میں تھے۔ اور جانوروں کو اسارے سے باہر نکال رہے تھے۔ آئیون کے گھر کے بعد جبریل کے گھر کو آگ لگی۔ آگ اتنی تیز ہو گئی تھی کہ گلی کی دوسری طرف بھی پہنچ گئی۔ آدھا گاؤں جل کر راکھ ہو گیا۔

آئیون کے گھر کے لوگ اس کے بوڑھے باپ کو کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی اپنی جانیں اور صرف پہنے ہوئے کپڑے بچا سکے۔ جو گھوڑے کھیت پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے سوا اور کچھ نہ بچا۔ تمام جانور مرغیاں۔ گاڑی۔ ہل۔ عورتوں کے کپڑوں کے صندوق اور غلے کے ذخیرے سب خاکستر ہو گئے۔

جبریل کے گھر میں جانوروں کے علاوہ دو چار اور چھوٹی چھوٹی چیزیں بچ گئیں باقی سب کچھ جل گیا۔ آگ رات بھر جلتی رہی۔ آئیون اپنے گھر کے سامنے یہی رٹ لگاتا رہا "یارو یہ کیا ہو گیا؟ ذرا سا پھونس کھینچ کر رگڑ دینے سے آگ بجھ جاتی"۔ جب چھت گر گئی تو آئیون آگ میں گھس گیا۔ اور ایک جلتے ہوئے شہتیر کو کھینچ لایا۔ دوسرا شہتیر لانے کو بڑھا تھا کہ ٹھوکر لگی اور آگ میں گر گیا۔ اس کا بیٹا جلدی سے بڑھا اور اس کو کھینچ کر باہر لایا۔ آئیون کے سر کے بال اور داڑھی جھلس گئی۔ بدن کے کپڑے جل گئے تھے۔ ہاتھ پر بھی زخم آیا تھا۔ لیکن اسے کچھ نہ محسوس ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے حواس باختہ ہو چکے ہیں۔ آگ جل رہی تھی۔ اور آئیون کھڑا چلا رہا تھا "یارو یہ کیا ہو گیا؟ ذرا سا پھونس کھینچ کر رگڑ دینے سے آگ بجھ جاتی"۔

صبح سویرے گاؤں کے نمبردار کا لڑکا آئیون کو بلانے آیا "بھائی آئیون تمہارے ابا جان قریب مرگ ہیں۔ تمہیں آخری بار دیکھنا چاہتے ہیں"۔

آئیون کے حواس اتنے بگڑ چکے تھے کہ وہ باپ کو بھی بھول گیا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس سے کیا کہا گیا ہے۔ اور پوچھنے لگا "کیسا باپ؟ کس کو بلایا ہے"؟

اس نے جواب دیا "وہ تم سے آخری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ میرے گھر میں ہیں۔ اور بستر مرگ پر ہیں۔ جلدی چلو"۔ اتنا کہہ کر نمبردار کا لڑکا آئیون کا ہاتھ کھینچنے لگا۔ آئیون اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا جب بڈھے کو نکالا جا رہا تھا تو وہ بھی کچھ جھلس گیا تھا۔ لوگ اسے نمبردار کے گھر چھوڑ آئے تھے۔ کیونکہ اس کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے پر تھا۔ اور وہ جگہ آگ کی زد سے باہر تھی۔

جب آئیون ۔۔۔ اپنے باپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ نمبردار کی عمر رسیدہ بیوی بھی اس کے پاس ہی بیٹھی ہے۔ آتش دان کے قریب چند بچے کھیل رہے تھے۔ باقی لوگ آتش زدہ جگہ گئے ہوئے تھے۔ بوڑھا ایک صوفے پر پڑا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف موم بتی روشن تھی۔ بیٹے کو آتا دیکھ کر وہ ذرا کھسک گیا۔ نمبردار کی بیوی نے اس کو بتایا کہ تمہارا بیٹا آ گیا ہے۔ بوڑھے نے اسے

[illegible] قریب ہو گیا۔

بوڑھے نے کہا: "آئیون! میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ گاؤں بھر کو کس نے جلایا؟"

آئیون نے جواب دیا: "اباجی! اس نے! میں نے خود اسے چھپر میں آگ لگاتے دیکھا۔ اگر میں آگ لگا ہوا پھونس کھینچ کر رگڑ دیتا تو آگ فوراً بجھ جاتی۔"

بوڑھے نے کہا: "آئیون! میں قریب المرگ ہوں۔ تمھیں بھی ایک بار مرنا ہے۔ بتاؤ قصور کس کا ہے؟"

آئیون اپنے باپ کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

بوڑھا کہنے لگا: "خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو قصور کس کا ہے۔ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟"

اب آئیون کو ہوش آیا۔ سسکیاں بھرتے ہوئے اس نے جواب دیا: "ابا جان۔ سارا قصور میرا ہے۔" اور دوزانو ہو کر کہنے لگا: "مجھے معاف کر دو۔ میں آپ کے اور خدا کے سامنے قصوروار ہوں۔"

بوڑھے نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر لے جا کر شاید دعا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ کر سکا۔ وہ رک گیا اور کہنے لگا۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! - اور پھر آئیون سے پوچھا۔

"آئیون اب تمھیں کیا کرنا چاہئے؟"

آئیون رو رہا تھا۔ اس نے سسکیاں بھر کر جواب دیا: "ابا جان میں نہیں جانتا۔ کہ ہم لوگوں کی حالت اب کیا ہو گی!"

بوڑھے نے آنکھیں موندلیں۔ اور ہونٹ دبائے گویا کچھ اور بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول کر کہا۔

"آئیون دیکھو! اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا کہ آگ کس نے لگائی ہے۔ اگر تم کسی کی پردہ پوشی کرو گے تو خدا تمھیں دگنا اجر دے گا۔"

اس کے بعد بوڑھے نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں موندلیں۔

آئیون نے باپ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے جبریل کے متعلق کچھ نہ کہا۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ آگ کس نے لگائی تھی۔

اب آئیون کا دل جبریل کی طرف سے ذرہ بھر بھی میلا نہ تھا۔ جبریل حیران تھا کہ آئیون نے کسی کے پاس میرا نام کیوں نہیں لیا۔ پہلے تو جبریل سہما سہما رہتا تھا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد یہ خوف دور ہو گیا۔ دونوں نے لڑنا جھگڑنا ترک کر دیا۔ بیوی بچوں نے بھی ایک دوسرے کو کوسنا چھوڑ دیا۔ جب تک دونوں نے اپنے گھر دوبارہ نہ بنا لئے دونوں ایک ہی گھر میں رہے۔

جب گاؤں ازسرنو آباد ہوا تو اگر آئیون اور جبریل چاہتے تو اپنے گھر ایک دوسرے سے دور بنا سکتے تھے۔ لیکن دونوں نے اپنے گھر پاس پاس ہی بنوائے اور پہلے ہی کی طرح ہمسائے بنے رہے۔

بعد ازیں یہ لوگ شریف ہمسایوں کی طرح رہنے لگے۔ آئیون کو اپنے باپ کی نصیحت یاد تھی کہ خدا کے حکموں پر کاربند ہونا چاہئے۔ اور آگ کو شروع ہی میں فرو کر دینا چاہئے۔ اب اس کو اگر کوئی گزند پہنچاتا تو وہ انتقام ہرگز نہ لیتا بلکہ صلح کر لیتا۔ کوئی بری بات کہہ دیتا تو اچھی باتیں بنا کر اس کو نیکی کا راستہ دکھاتا۔ اور یہی تعلیم وہ اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو بھی دیتا۔

آئیون نے اپنا گھر دوبارہ سنوار لیا۔ اور اس کی حالت اب پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور اچھی ہو گئی۔

(طالسطائی)

غم کو زندگی جانا زندگی کو غم سمجھے
زندگی کو سمجھا ہے کوئی گر تو ہم سمجھے

رو کے مسکراتے ہیں مسکرا کے روتے ہیں
دردِ زندگانی کا جب سے کیف و کم سمجھے

ٹہر کی نگاہوں میں کون جانے کیا کچھ تھا
آپ اسے ستم سمجھے ہم اسے کرم سمجھے

خاک کیجے دل جوئی ایسے قلبِ ناداں کی
شادماں جو ہو غم سے جو خوشی کو غم سمجھے!

بزمِ ناز میں تم نے کی نظر کو فہمائش
بے خرد تماشائی اس کو بھی ستم سمجھے!

تیرے آنسوؤں میں ہے ایک دکھ کی دنیا
فطرتِ محبت کوش آج تجھکو ہم سمجھے

ایم عبدالعزیز فطرت

نظم

بے نیازی

از:-
ملک امتیاز اللہ خاں ہمایی۔ اے

جستجوئے الم نہ کر اے دوست!
تجھ کو معلوم نہیں حال سیہ خانوں کا
غم کے ان ہوش رُبا قصوں کا افسانوں کا

جن کی تقدیر میں تاریکی ہی تاریکی ہو
نالۂ نیم شبی نغمہ و موسیقی ہو

آہ! وہ لوگ کہ ہو موت مسرت جن کی
آہ! وہ لوگ کہ دو اشک ہوں عشرت جن کی

پھول پیتے ہوں جو نومیدی کے میخانوں سے
اور گل کھاتے ہوں جو دل کے گلستانوں سے

جن کا انجام نہ ہو کوئی بھی آغاز نہ ہو
آہ! وہ لوگ جنھیں جرأتِ پرواز نہ ہو

ایک نقطے پہ سمٹ آئی ہو ہستی جن کی
اور صہبائے محبت سے ہو مستی جن کی

شوق و اُمید کے افکار میں رہنے دے اُنھیں
عشق کی وادیٔ پُرخار میں رہنے دے اُنھیں

آرزوئے ستم نہ کر اے دوست

(افسانہ)

رقص و سرود

از :-

قیوم بٹالوی

"مجھے معاف کرو بھائی - میں آج نہ جا سکوں گا - صبح فلسفہ کا پرچہ ہے اور ابھی مجھے آدھی سے زیادہ کتاب دیکھنا ہے" کرسی پر بیٹھے بیٹھے تجمل نے اپنی گردن پیچھے کی طرف گھما کر کہا ——— اور اس کے بعد وہ پھر کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔

ٹھک - ٹھک - ٹھک

دروازہ پھر کسی نے کھٹکھٹایا - اور ساتھ ہی باہر سے آواز آئی ———

"دروازہ کھولتے ہو یا توڑ دوں اسے! میرا پرچہ نہیں ہے کیا؟ بڑے آئے پڑھنے والے کہیں کے" . . . . . کھولو دروازہ۔

کھڑ - کھڑ - کھڑ -

"دروازہ کھولو - ورنہ یہ ٹوٹ جائے گا"

کھڑ - کھڑ - کھڑ . . .

تجمل پہ اس کا مطلقاً کوئی اثر نہ تھا - وہ آج تہیہ کئے ہوئے تھا کہ ساری کتاب ختم کر کے ہی اُٹھے گا - کبھی کبھی وہ غصہ سے دروازہ کی طرف دیکھ لیتا۔

جس کو توڑنے کے لئے رشید باہر کھڑا اپنی ساری طاقت صرف کر رہا تھا۔

رشید نے غصے میں آ کر دروازہ کا اوپر والا شیشہ توڑ ڈالا ———

اپنے ایک ہی پُرجوش مُکے سے ——— مگر شیشہ کے ساتھ ہی اُس کا ہاتھ بھی زخمی ہو چکا تھا - ہلکی ہلکی خراشوں سے خون بہہ رہا تھا - زخم تو خاص تکلیف دہ نہ تھے - مگر اُس نے ارادۃً ایک چیخ ماری - اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کراہنا شروع کر دیا۔

اسی اثنا میں ——— تجمل ——— شیشہ ٹوٹنے کی آواز سننے کے بعد - کتاب کو فوراً سامنے والی میز پہ رکھ - دروازہ کے پاس پہنچ چکا تھا - چیخ سنتے ہی اس نے چٹخنی کھولی اور کمرے سے باہر نکل آیا ——— رشید نے اس کی طرف قہر آلود آنکھوں سے دیکھا - اور بغیر کچھ کہے سُنے آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا - تجمل اس کے ہاتھ سے خون بہتا دیکھ کر دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا - اور خود کو کوس رہا تھا - رشید کافی دور جا چکا تھا اور وہ مبہوت ——— کھڑا سوچ رہا تھا۔

کچھ دور جا کر رشید پھر کراہا ——— اس کی کراہ کو سُن کر وہ چونکا ——— کمرے کی طرف لپکا - اندر سے تالا لے کر کمرے کے باہر لگایا - اور جلدی جلدی رشید کے پیچھے ہو لیا۔

رشید میرا دوست ہے - اور کالج میں سب سے زیادہ عزیز ——— میں اُس کو تکلیف میں ڈالنا تو نہ چاہتا تھا ——— یہ تو ایک مجبوری تھی کہ میں نے دروازہ کھولا ——— ایک اتفاق تھا جو رشید کو چوٹ آ گئی۔

——— اس میں میرا کیا قصور؟

لیکن ——— نہیں غلطی میری ہی تھی ——— اگر میں اُس کے ساتھ رقص دیکھنے نہیں جا سکتا تھا تو نہ سہی - مگر میں نے دروازہ کھولنے میں کیوں تامل کیا؟ ———

یہ سب میرے ہی سبب ہوا - کتنی تکلیف ہوئی بیچارے رشید کو ——— . . . . . .

وہ انھیں خیالات میں خورشید کے کمرے کے سامنے جا کر رُکا - دروازہ کھلا تھا - اور رشید کمرے میں داخل ہو کے ابھی بیٹھا بھی نہ تھا -

محمود اور رفعت کمرے میں بیٹھے رشید کے ہاتھ کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے تھے - پیشتر اس کے کہ وہ کچھ پوچھیں - تجمل کمرے میں پہنچ گیا -

"کچھ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی" تجمل نے اُس نے پیچھے کا دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا -

"تم جاؤ اپنے پرچے کی تیاری کرو - میری چوٹ سے تمھیں کیا غرض" اپنی کراہ کا اعادہ کرتے ہوئے اُس نے طنز یہ لہجے میں جواب دیا -

"نہیں بھائی مجھے معاف کرو - مجھ سے غلطی ہوئی - پرچے ورچے کی مجھے اب کوئی پروا نہیں - تجمل نے اس کی منتیں کرتے ہوئے کا جواب دیتے ہوئے کہا -

——— مگر رشید بغیر جواب دیئے اس کی طرف گھورتا رہا ———

"ہاتھ تو دکھاؤ مجھے ——— دیکھوں تو سہی - کتنی چوٹ آئی ہے"

"نہیں ——— تمھیں کوئی چوٹ ووٹ نہیں آئی ——— اب آ گئے پوچھنے ——— جاؤ جا کے کمرے میں بیٹھو ——— اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ آئندہ سے میرے تمہارے تعلقات ختم ہوئے - اور بس . . . . ." رشید نے زخمی ہاتھ کو پیچھے چھپاتے ہوئے نہایت ہی مرعوب کن الفاظ میں کہا -

"نہیں بھئی - خدا کے لئے ایسا نہ کہو - مجھ سے غلطی ہوئی - مجھے . . . ."

"قصہ کیا ہے" محمود نے تجمل کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا -

رشید تیزی سے بولا - بات کیا ہوئی تھی - کل خود ہی آنجناب سے

ے پروگرام ہوا یا کہ آج شام سٹینلز ہوٹل میں رقص دیکھنے چلیں گے۔"

"جی پھر" محمود نے پوچھا۔

"اور صلاح یہ ٹھہری تھی کہ آپ کو اور رفعت کو بھی بلا لیا جائے۔ چنانچہ پ کو بھی تکلیف دی گئی کہ دو گھڑی شغل رہے۔ آپ خود ہی کتاب لے کے یٹھ گئے ہیں۔ اور کہتے ہیں ساری ختم کر کے ہی اُٹھوں گا۔ کمرے کا دروازہ ا نہیں کھولتے تھے۔ آخر میں نے تنگ آ کے توڑنے کی کوشش کی۔ ان کا باگیا؛ ہاتھ تو اپنا ہی زخمی ہوا۔ اب آگئے ہیں چاپلوسی کرنے۔"

"کیوں تجمل! اگر ہم سے تمہیں اتنا ہی ڈر محسوس ہوتا ہے تو پھر صاف ہ دیا ہوتا۔ اس بے چارے کا ہاتھ کیوں زخمی کرایا۔ دروازہ کھولتے کیا تھ دُکھتے تھے؟" رفعت نے گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں تو کل سے ہی چلا رہا تھا کہ اس طرح روز روز مجھ سے آوارہ ردی نہ ہو سکے گی۔ صبح میرا امتحان ہے۔ اس لئے آج میں خاص طور پر آپ کا تھ دینے سے معذور تھا۔ مگر یہ برابر اصرار کرتے رہے کہ محمود اور رفعت توجا رہے ہیں۔ ہم بھی ضرور چلیں گے۔ قابل دید رقص ہے۔ آج میں نے ن چھڑانے کے لئے دروازہ بند کر لیا تو غصہ میں آ کے اپنا ہاتھ زخمی کر آئے ں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟" تجمل نے جواب دیا۔

"خوب بھئی خوب۔ بنانا تو خوب جانتے ہو۔ ایک تو اپنی غلطی نہیں مانتے پھر اُس کو بھی جھٹلا رہے ہو۔ واہ صاحب۔ واہ۔ یہی توقع کر سکتے ہیں ہم آپ سے؟" محمود نے تجمل کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کب کہتا ہوں کہ غلطی میری نہیں۔ میں تو مانتا ہوں کہ سبھی کچھ مجھ ہی سے ہوا۔ لیکن اب اس کا علاج بھی تو کوئی ہو۔ چاہیں تو کوئی جرمانہ مجھ پر کر سکتے ، اور چاہیں تو سزا دے سکتے ہیں۔ اور بتائیں میں کیا کروں۔ رفعت صاحب پ ہی سفارش کیجئے کہ معاف کر دیں۔" تجمل نے نہایت ہی عجز کے ساتھ ۔"

معافی کی کوئی بات نہیں صاحب۔ جائیے۔ جا کے پڑھئیے۔" رشید نب نہایت رعب سے گویا ہوئے۔

نہیں صاحب اس قدر خفا نہ ہو جئیے۔ چوٹ آ گئی تو کیا ہوا۔ دوستوں ، ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ دونوں اصحاب مجھے منصف مانتے ہیں صلح کرنے کو تیار ہیں تو فیصلہ ابھی کئے دیتا ہوں۔ کیوں تجمل صاحب؟" رفعت پوچھا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کے لبوں پر شرارت آمیز ہنسی ناچ رہی تھی۔

"جی مجھے منظور ہے۔"

"اور آپ کو رشید صاحب"

جیسے آپ کی مرضی"

اچھا تو خیر فیصلہ ہوا کہ تجمل صاحب اپنی غلطی کی تلافی کے لئے ــــــــ آج شب ہم سب کو رقص دکھائیں۔ اور دیگر اخراجات بھی برداشت کریں۔"

خوب۔ خوب۔ خوب۔ میں اس شرط پر تجمل سے صلح کر لیتا ہوں۔ جائیے تجمل صاحب کپڑے بدل کے تشریف لائیے۔

"لیکن"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جلدی سے واپس آئیے۔ اس اثنا میں میں ڈاکٹر سے پٹی بندھوا آتا ہوں۔"

بہت اچھا کہہ کر تجمل کمرے سے باہر نکل گیا ــــ

"کیوں بھئی کتنی چوٹ آئی ہے؟" محمود نے اُس کے جانے کے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"ارے یار چوٹ کیسی یہ تو اس بے چارے کے پھنس جانے کا بہانہ ہو گیا۔ ساتھ ہی نہ چلتا تھا۔ اب دیکھا کیسا مزا آیا۔"

"پھر تو قیمت وصول ہو گئی صاحب۔ دیکھا میں نے کیسا خوب پھانسا۔ ہاں اور بھئی یہ پٹی تو باندھ کہیں سے۔"

"باندھ لیتا ہوں۔ کسی پھٹے ہوئے سفید کپڑے کی تلاش کر رہا ہوں۔" . . . .

چار روپے فی ٹکٹ۔ اور پھر دیگر اخراجات . . . . . . کم از کم بیس روپے کا خرچ . . . . . . میرے پاس کل تیس روپے ہیں ــــ اور پھر . . . . پھر دو دن بعد مجھے کالج کی فیس بھی ادا کرنی ہے . . . . . نام خارج ہو جائے گا۔ گھر رپورٹ . . . . . . امتحان . . . . امتحان . . . میری زندگی کا مدار . . . . . . صبح . . .

یہ خیالات اُس کے دماغ میں بار بار چکر لگا رہے تھے۔ رفعت کے اس فیصلے سے اُسے اتنی کوفت ہوئی تھی کہ قتل کے مجرم کو پھانسی کی سزا سننے پر بھی شاید نہ ہو۔ وہ کپڑے اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ نئے کپڑے پہنے۔ مگر وہ اپنے کو اتنا مفلوج محسوس کر رہا تھا۔ اُس میں کپڑے اُتارنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اور پھر وہ لپکا یک ــــ بغیر کپڑے اُتارے ــــ میز پر جا بیٹھا ــــ ہاتھ میں کتاب لی۔ اور پڑھنے میں محو ہو گیا۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور محمود۔ رشید۔ رفعت تینوں کمرے میں داخل ہوئے۔

"ارے تم کپڑے نہیں بدلے کیا؟"

"ہم تو وہاں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے تھے"

"جی نہیں۔ میں ساتھ نہیں جا سکوں گا" اس نے رشید کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں"

"جی ہاں۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے ہم سب کی توہین کی ہے۔ اتنا جھوٹا انسان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا آپ سے کوئی سروکار نہیں۔ آئندہ ہم کبھی آپ سے نہ ملیں گے"۔ رفعت نے نہایت گرمی سے کہا۔

محمود بولا۔ "چلو جی چلیں۔ ایسے انسان کے منہ کیا لگنا"۔

"بھائی جان میرا مطلب یہ نہیں۔ میں نے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا کرتا ہوں تم تو یونہی ناراض ہو جاتے ہو۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ آپ ٹکٹوں کے دام لے کر چلے جائیں اور مجھے یہیں رہنے دیں"

"ہم بھیک منگے نہیں ہیں صاحب۔ ہمارے پاس بھی پیسے ہیں۔ اگر آپ کو ہم سے صلح کرنی ہے تو ہمارے ساتھ چلیں"۔

"اس طرح نہیں چلے گا یہ۔ آپ اسے کپڑے پہنائیے"۔

"اجی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اجی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ۔ اچھا ۔ میں چلتا ہوں بھئی"

پرچہ تو خیر خدا کی مہربانی سے اچھا ہی ہو گیا۔ مگر یہ بیس روپے یونہی حرام گئے۔ بہت پیچھا چھڑایا۔ مگر ظالموں نے ایک نہ مانی۔ یہیں بیچ رہتے تو اچھا تھا ۔ خیر جو ہونی تھی ہو گئی ۔ کچھ دن کا گم ہو گئے۔ مل تو جائیں گے ہی۔ لیکن طعن ہی ہے نا تھوڑی سی ۔ سہہ لیں گے ۔ ہاں اور ۔ سوشیلا سے بھی ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہاں جانے کے لئے کم سے کم بیس روپے جیب میں ہونے چاہئیں ۔ کتنا اچھا گاتی ہے ظالم ۔ جی چاہتا ہے کہ اگر ہزار روپیہ بھی پاس ہو تو ایک ہی تان پر نثار کر دوں ۔ یوں بھی کہتی تھی کہ دن رات مجھے ہی یاد کرتی رہتی ہے ۔ جب جاؤں میرے سوا کسی سے بات تک نہیں کرتی ۔ اور بھی تو ساتھ ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوشیلا واقعی کتنی سوشل ہے ۔ امن ۔ سب سے ۔

ہری پورہ کے اسٹیشن پر گاڑی کے رکنے سے اُس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہوا۔

اسٹیشن سے باہر آ کے اُس نے تانگہ لیا اور تانگہ والے کو بستی پور چلنے کے لئے کہا۔

تجمل بستی پور کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ وہاں معمولی زمیندار تھا۔ ایسا زمیندار جسے کاشتکار ہی کہا جا سکتا ہے۔ کسی زمانے میں اگرچہ اُس کے آبا و اجداد بہت امیر تھے۔ لیکن عیش پرستی اور مہاجن پوجا نے انھیں اس درجہ تباہ کر دیا تھا کہ تجمل کے باپ غیاث کو ورثے میں تقریباً کچھ نہ ملا۔

غیاث ایک نہایت ہی بلند عزم اور وسیع الخیال انسان تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اپنی بے پناہ کوششوں اور ہزارہا مصیبتوں کے بعد اُس نے رہنے کے لئے ایک معمولی سا مکان اور کچھ زمین خرید لی تھی۔ اپنی زمین کا بیشتر حصہ وہ خود ہی کاشت کرتا تھا۔ اپنی مفلسی ہی کی وجہ سے وہ جوانی میں شادی نہ کر سکا۔ جب اُس کی شادی ہوئی تو اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔

ساٹھ برس کی عمر میں وہ دن رات محنت کرتے ہوئے بھی نہ تھکتا ۔ وہ جو کچھ کرتا تجمل کے لئے ۔ وہی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ ایسا مرکز ۔ جو اس کی زندگی کا ماحصل تھا ۔ جس کو روز بروز وسیع تر ہوتے دیکھ کر وہ پھولا نہ سماتا ۔ تجمل کی تعلیم کے لئے وہ سب کچھ قربان کر دینے پر تیار تھا۔ وہی اس کا پہلا ۔ آخری ۔ اور واحد سہارا تھا۔

تجمل اگلے سال بی۔ اے کا امتحان دے گا ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بن جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موٹریں ۔ ۔ ۔ کوٹھیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوکر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آرام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انھیں خیالات میں غرق غیاث کھری چارپائی پر لیٹا ۔ اپنی کھدر کی پگڑی بغیر کسی ترتیب کے تہہ کئے ۔ سر کے نیچے دبائے۔ محض ایک تہہ بند باندھے حقے کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ اُس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ چند روز سے وہ بخار میں مبتلا تھا۔ وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا ۔ قریب ہی چارپائی پر بیٹھی اس کی بیوی سُوت کی انٹیاں بنا رہی تھی۔

تجمل تانگے میں گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے اس وقت اپنے مکان کے دروازہ پر پہونچ چکا تھا ۔ اس نے دروازہ پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک نحیف سی آواز آئی۔

"میں ۔ ۔ ۔ تجمل ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی کھولو"

"تجمل ۔ اس وقت ۔ امتحان کے دنوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا خیر" ۔ ۔ ۔ بڑھے نے جب پلٹ کر دیکھا تو تجمل کی ماں دروازہ کھولنے کے لئے جا چکی تھی۔

"جیتے رہو بیٹا" ماں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"خیر تو ہے؟"

"ہاں اماں خیر ہی ہے۔ ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ صبح چلا جاؤں گا ابا جان کہاں ہیں؟"

"وہ اندر لیٹے ہیں بیٹا۔ اُنھیں آج کل بخار آرہا ہے"۔

یہی باتیں کرتے ہوئے ماں بیٹا ایک معمولی سے کمرے کے دروازہ پر پہنچ گئے۔

بیٹے کو دیکھ کر باپ خوشی میں چارپائی سے نیچے اُتر آیا۔ اور بیٹے کو گلے سے لگا لیا

"کیوں بیٹا خیر۔۔۔۔"

"آپ کو کب سے بخار آرہا ہے۔ ابا جان! کون سی دوا استعمال کرتے ہیں آپ؟ میرا خیال ہے ملیریا ہے"۔ تجمل نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پرسوں سے۔ بیٹا دوا وغیرہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہم بوڑھوں کو یہ بخار کیا کہے گا۔ اُتر جائے گا خود ہی"۔

"دوا کہاں سے لاتے بیٹا۔ پیسہ تو پاس نہیں تھا۔ جو ہوتا ہے تمھیں بھیج دیتے ہیں۔ یہاں جانے روٹی بھی کیسے کھاتے ہیں"۔ ماں نے غم انگیز لہجہ میں کہا

"اری باؤلی اس بچے سے کیا کہتی ہے۔ کیوں اس کا دل پریشان کرتی ہے نہیں بیٹا کچھ نہیں۔ مجھے دوا سے ویسے ہی نفرت ہے"۔ اُس نے تجمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابا جی آپ کو دوا ضرور پینا چاہئے تھی۔ میرے سوٹ کیس میں شاید کچھ کونین ہو۔ وہ سونے سے پہلے ضرور دودھ کے ساتھ کھا لیجئے گا"۔

"اچھا بیٹا خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بتاؤ کہ اس وقت کس لئے آئے ہو"۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"آپ بیٹھ تو جائیں ابا جان"۔ وہ سب بیٹھ گئے۔

تجمل نے اپنی آنکھوں میں مصنوعی آنسو لاتے ہوئے اپنا افسانہ شروع کیا۔۔۔!

"ابا جان! آپ نے جو روپے مجھے بھیجے تھے اُن میں سے کچھ تو میں نے دے دلا دیئے۔ اور باقی چالیس روپئے میں نے ٹرنک میں تالے کے اندر رکھے ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے پرسوں تالا کھلا رہ گیا۔ میں کمرے کے باہر "تالا لگا کے کالج چلا گیا۔ جب میں واپس آیا تو تالا ٹوٹا ہوا پایا۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور ٹرنک سے سب روپے غائب تھے۔ جیسا کہ میں نے خط میں لکھا تھا۔ امتحان شروع ہے۔ کل اتوار کی چھٹی ہے۔ میں آج کا امتحان دے کے گاڑی میں سوار ہوا تھا۔ صبح گیارہ بجے کی گاڑی سے واپس جانا چاہتا ہوں۔ مجھے فوراً چالیس روپے چاہئیں"۔

بڈھے کا خون رگوں میں جم گیا۔ ماں چپ بیٹھی رو رہی تھی۔ لیکن تجمل دل ہی دل میں اپنے افسانے کی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا۔

"میری کمائی اتنی سستی نہیں ہے بیٹا کہ تم اُسے اس طرح برباد کرو۔ میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ اگر تمھارے یہی اطوار رہے تو میری تمنائیں پوری نہ ہو سکیں گی"۔ بڈھے نے گلو گیر آواز میں کہا۔

"مگر ابا جان۔ اس میں میرا کیا۔۔۔۔؟"

"اگر مگر میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ جاؤ جاکر سو رہو۔ صبح کچھ کروں گا"۔

تجمل ساتھ کے کمرے میں چلا گیا۔ اور بستر بچھا کے لیٹ گیا۔ وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں باپ کو کونین دینا بھی بھول گیا۔

بڈھے کو ساری رات نیند نہ آئی۔ آخر صبح کے قریب اُس نے اس عقدہ کو حل کر لیا۔ اور سو گیا۔ مگر آہیں بھرتا ہوا۔

صبح کو جب تجمل نے اُسے جگایا تو سات بج رہے تھے۔

"جلدی کیجئے ابا جان مجھے جانا ہے"۔

اتنا کہہ کر وہ بغیر جواب سُنے کھیتوں کی طرف ہوا خوری کے لئے نکل گیا۔

جب وہ واپس آ رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ باپ گائے کی رسّی تھامے اُس سے کچھ فاصلہ پر آ رہا ہے۔ رونی صورت بنائے۔

"ابا جی کدھر جا رہے ہیں آپ"

بڈھا چونکا۔

"ساتھ والے گاؤں کو بیٹا۔ ایک ضروری کام یاد آگیا تھا"۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ "تم فکر نہ کرو۔ تمھارے روپے گھر میں رکھے ہیں۔ ابھی آکے دیتا ہوں"۔

"اور اسے ابا؟"

کسے ۔۔ اس کی نظریں غیر ارادی طور پر گائے کی طرف اُٹھ گئیں ۔۔۔ اگرچہ ۔۔ اب ۔۔ وہ اس کی طرف دیکھنا نہ چاہتا تھا ۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

گائے کو۔۔۔ اسے۔۔۔۔ یونہی۔۔۔۔۔ اسے۔۔۔۔ اس کو۔۔۔۔ اس کے لئے دوا لینے جا رہا ہوں ۔۔ یہ بیمار ہے"۔

تجمل کی آنکھیں جھک گئیں۔ اور ان میں بھی آنسو آگئے۔ لیکن ان آنسوؤں نے اس کی آنکھوں سے پٹیاں اُتار پھینکیں۔

جب کچھ دیر بعد اُس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے سامنے دیکھا تو باپ اُسے دور جاتا ہوا دکھائی دیا۔

گاڑی چل رہی تھی۔ تجمل اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا ——
اُنھیں روک نہیں رہی تھی ۔۔ وہ اُن کو چپ نہیں ۔۔ میرے [illegible]
[illegible] ۔۔ اس میں پیش آرام ۔۔ **رقص درویش**

تضمین

گم کردہ راہ

از :- لالہ تلوک چند محروم بی-اے -

تا چند پنہاں از من سرِ من　　تاریک باشد تا کے رہِ من
سوزید قلب نا آگہِ من　　از من بروں نیست منزل گہ من
من بے نصیبم، راہے نیابم!

میرا ہی دل ہے جب اس کا مسکن　　کیوں تیرگی میں ہے مثلِ مدفن
تارِ نفس میں کیوں ہے یہ اُلجھن　　از من بروں نیست منزل گہ من
من بے نصیبم، راہے نیابم!

کہسار و دریا - صحرا و گلشن　　پھر پھر کے ڈھونڈا اس کا نشیمن
اُلجھا ہوا ہے کانٹوں میں دامن　　از من بروں نیست منزل گہ من
من بے نصیبم - راہے نیابم!

خود اپنا رہبر - خود اپنا رہزن　　صحرا بہ صحرا - گلشن بہ گلشن
پھرتا ہوں اب تک حسرت بدامن　　از من بروں نیست منزل گہ من
من بے نصیبم، راہے نیابم!

دائم فروزاں وہ شمعِ روشن　　بے نور لیکن ہے خانۂ تن
نفسِ زبوں ہے دیوارِ آہن　　از من بروں نیست منزل گہِ من
من بے نصیبم، راہے نیابم!

مزاحیہ

گھریلو مشاعرہ

از -

علامہ ظریف

اجی سُن رہے ہو؟
کیوں ؟ کیا تم نے کچھ کہا تھا؟
نہیں اب کچھ کہنا چاہتی ہوں
تو کہنے سے پہلے ہی ہم کیوں کر سُن لیتے۔ اور کیا سُن لیتے؟
اچھا اب سن لو!
سناؤ۔ کیا سنانا چاہتی ہو؟
دیکھنا۔ آپ نے سُنا ہے لاہور میں ہزاروں سینما ہیں - وہی نا جنھیں ہمارے ہاں بائیسکوپ کہتے ہیں۔ ہیں نا؟
- ہزاروں تو پورے صوبے میں بھی نہ ہوں گے۔
ہزاروں نہ سہی - سیکڑوں میں تو کلام ہی نہیں -
- ہیں تو اس میں بھی کلام ہے۔
- پھر وہی کٹ حجتی - میں نے کوئی پَٹ ہوؤں کی مردم شماری کی ہے؟
- سینماؤں کی مردم شماری کبھی ایک ہی کہی - آدمیوں کی مردم شماری تو ہوتی آئی تھی - سینماؤں کی مردم شماری تمھیں سے سنی ہے -
- توبہ تم سے کوئی بات کرے
- ٹھکانے کی بات تو ہم سے ہر وقت کی جا سکتی ہے۔
- تو میں خدا نہ کرے بے ٹھکانے بات کیا کرتی ہوں۔ کوئی میرے دشمن پاگل تو نہیں۔
نہیں تم تو نہیں۔ اکثر بیویاں بے تکے ہی بات کیا کرتی ہیں۔
- اور شوہر؟
شوہروں کمبختوں کو بات کرنے کی مہلت ہی کب دی جاتی ہے؟
اُنھیں بات کرنے کی مہلت ہی کون نہیں دیتا!
وہی جس کی باتوں کا آغاز و انجام ازلی و ابد سے وابستہ رہتا ہے یعنی بیوی۔
چور کی داڑھی میں تنکا۔
یہ محاورہ اسی دن کے لئے یاد کیا تھا؟
نہیں بلکہ اس کا استعمال ایسے ہی موقعے پر کیا جاتا ہے۔
تو ہم چور ٹھیرے اور تم ساہ؟

۲۶ - تم چور نہ ہم ساہ - محاورات تو دراصل استعارات ہوتے ہیں۔
۲۷ - کل کو کوئی گالی دے کر کہہ دینا کہ گالی تو استعارہ ہوا کرتی ہے۔
۲۸ - تعلیم یافتہ لوگ استعاروں ہی میں گالیاں بھی دیا کرتے ہیں۔
۲۹ - کسی دن میرے سر پر لٹھ رسید کر کے اُسے بھی استعارہ بنا دینا۔
۳۰ - لٹھ بازی بھی ایک قسم کا استعارہ ہی ہے - مگر ذرا جلی قسم کا استعارہ ہے
۳۱ - تو ان جلی اور خفی استعاروں کی مشق کے لئے میں ہی رہ گئی ہوں؟
۳۲ - اپنی سہیلیوں پر ان استعاروں کی مشق تم بھی کر سکتی ہو۔
۳۳ - جان ہار سہیلیوں نے کیا قصور کیا ہے - کہ اُنھیں تختۂ مشق بناؤں۔ میں تو یہ استعارے تم پر مشق کرنا چاہتی ہوں۔
۳۴ - شوق سے مگر پہلے ان استعاروں کو ہم سے سیکھ لو - ہمارا اندازِ تعلیم تم جانتی ہو۔ "ڈائرکٹ میتھڈ" کے اصول پر ہوتا ہے۔ لٹھ بازی کے جلی استعارے کی عملی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی تم اگر اس قابل رہیں کہ ہم پر اس کا تجربہ کر سکو تو ضرور کر لینا۔
۳۵ - تم نے اس نگوڑے استعارے کی عملی تعلیم کس سے لی تھی؟
۳۶ - اپنے مرحوم اُستادوں سے۔
۳۷ - پھر تمھارا سر کیونکر سلامت رہ گیا؟
۳۸ - ہمارے سر کے گنگا جمنی بالوں میں جو یہ ٹیڑھی ترچھی شاہراہیں نظر آتی ہیں اُسی تعلیم کی یادگاریں ہیں۔
۳۹ - تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ یہ شاہراہیں میرے سر میں بھی قائم کی جائیں
۴۰ - سر کی یہ شاہ راہیں باغِ جنت پر ختم ہوتی ہیں۔ تم نے سنا ہو گا کہ اُستاد کی مار بدن کے جس حصّے پر پڑ جاتی ہے۔ اس پر آتشِ دوزخ حرام ہو جاتی ہے۔
۴۱ - بس معاف رکھو۔ مجھے اس رستے سے جنت پہونچنا منظور نہیں تمھیں کو اس شاہ راہ سے وہاں پہونچنا مبارک رہے۔
۴۲ - یہ تو کچھ بات نہ ہوئی - ہم اس شاہ راہ سے جنت ضرور پہنچیں گے - مگر تم جنت کے رستے سے کترا کر جہنم رسید ہو گئیں تو تمھارے بغیر جنت سونی سونی نظر آئے گی۔
۴۳ - سونی نظر آئے یا آباد - میں تمھارے ساتھ جنت جانے ...

۴۴۔ اور کہاں جانا چاہتی ہو۔
۴۵۔ جہاں خدا لے جائے۔
۴۶۔ خدا کو کیا غرض میرے تمھارے درمیاں کیوں ہو؟
۴۷۔ شاعری کا بحران کیوں ہونے لگا؟ مت پڑھا کرو بات بے بات شعر۔ مجھے یہ کلموئی شاعری چڑ ہو گئی ہے۔ قرآن میں جبھی تو شاعروں کو گمراہ بتایا گیا ہے۔ مولانا حالی بھی ان نٹے شاعروں سے تنگ آ کے یہی فرماتے ہیں کہ ؎
"گنہگار تو بخشے جائیں گے سارے ٭ جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے"
۴۸۔ شاعری کا بحران متعدی ہوتا ہے۔ دیکھو تم بھی اس میں مبتلا نظر آتی ہو۔
۴۹۔ مجھ سے نشتر پرے دور۔ تو ج میں شاعر بنوں۔ تمھیں کو یہ بیماری مبارک ہو۔
۵۰۔ آخر تم ایک شاعر کی بیوی تو ہو۔ کہہ دو نہیں ہوں۔
۵۱۔ ہاں ہاں میں کسی شاعر واعر کی بیوی نہیں۔ شاعر بھی کوئی آدمی ہوتا ہے۔
۵۲۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم شاعر ہیں۔ اور نکاح کے رجسٹر میں لکھا ہے کہ تم ہماری بیوی ہو۔ اور شاعر تمھارے خیال میں آدمی نہیں ہوا کرتا۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ تم کسی آدمی کی بیوی نہیں ہو۔
۵۳۔ میں کسی کی بھی بیوی نہیں۔ مت کہا کرو مجھے بیوی۔
۵۴۔ تمھارا خدا بھلا کرے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ نان نفقہ۔ مہر و ہر یہ سب آئے گئے ہوئے۔ اب ہم ہیں اور ہماری تنخواہ۔ اپنی بھوک کھانا اور اپنی نیند سونا۔ یہی تو ہم چاہتے تھے۔

۵۵۔ جی ۔ کیوں نہیں چاہتے تھے۔ بس ایک تم۔ ایک تمھارا چاہا۔ باقی جوتا کل سنسار میں اور میری تنخواہ۔ کیا کہنے تمھارے اور تمھاری تنخواہ کے تنخواہ تمھاری کہاں سے آئی۔ میاں ۲۵ رُپلی پاتے تھے۔ میرا آنا ایسا بھاری ہوا کہ اب ڈیڑھ سو ل رہے ہیں۔ بس اپنے پچیس نکال کے باقی سوا سو سیدھی طرح میرے میکے بھیج دیا کرو۔ میرا سوا لاکھ روپے کا مہر اس کی جلد فکر کرو۔ رہے تمھارے بچے انھیں سنبھالو چلتی کا نام گاڑی ہے۔ باڑا اکسپریس کل صبح مجھے میرے گھر پہنچا دے گی۔ پھر بیٹھے شاعری کدبگا رتے رہنا۔
۵۶۔ بچے ہم سنبھالیں؟ یہ کیوں؟ تمھیں ان سے کچھ واسطہ نہیں؟
۵۷۔ کیا خدا نہ کرے میں انھیں جہیز میں لے کر آئی تھی؟
۵۸۔ تو کیا ہم شادی کے جوڑے کے ساتھ لے کے گئے تھے؟
۵۹۔ مجھے نہیں معلوم لے کے گئے تھے یا نہیں۔ مجھ سے مت بولو۔ جبھی تو نانی اماں کہا کرتی ہیں کہ یہ مردوے نگوڑے نہ ہوتے تو دنیا بہشت نظر آتی انھیں ہستیوں نے اسے جہنم بنا دیا۔
۶۰۔ اللہ بخشے ہمارے دادا میاں بھی فرمایا کرتے تھے کہ عورت آدمی کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لئے اس کا دماغ ٹیڑھا۔ مزاج ٹیڑھا۔ فطرت ٹیڑھی یہ خود ٹیڑھی ہے۔ اس کا ٹیڑھ پن کسی صورت نہیں جا سکتا۔ یہ جب سے دنیا میں آئی ہے۔ جینے والوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ بس اس کے ٹیڑھ پن کا ایک ہی علاج ہے۔
۶۱۔ کیا ہے وہ علاج؟ میں بھی تو سنوں! دیکھوں تو وہ تمھارے بہشتی بزرگ عورت کے ٹیڑھے پن کا کیا علاج بتا گئے ہیں۔
۶۲۔ یہ پھر بتائیں گے۔ دو بج چکے ہیں۔ چوکیدار بول رہے ہیں۔ سونے بھی دو گی یا نہیں۔ اس مشاعرے کو پھر کے لئے اٹھا رکھو!

شباب کیا ہے اگر معصیت پناہ نہیں
قسم ہے لطف جوانی بجز گناہ نہیں

کسی بشر کو یہاں جرأت نگاہ نہیں
تمھارے حسن کے ہمسر یہ مہر و ماہ نہیں

یہاں مدام میسر ہی کس کو ہوتی ہے
کبھی کبھی کا تو پینا کوئی گناہ نہیں!

انھیں خلوص محبت سے بدگمانی ہے
ہمیں فریب وفا پر بھی اشتباہ نہیں!!

ہمیں یہ فخر کہ مرتے ہیں ان کی یاد میں ہم
انھیں یہ ناز ہم ایسوں سے رسم و راہ نہیں

کوئی خراج ستائش عطا کرے فارغ
یہ آرزو مرے دل میں خدا گواہ نہیں

(فارغ بخاری)

ایڈیٹر

از :-

راجہ عزیز احمد بھٹی بی۔اے۔

مسٹر سیکنڈ ماسٹر! آپ سکول میگزین کے ایڈیٹر مقرر کئے جاتے ہیں۔ رہے نا!

احباب کی محفل گول میز کانفرنس کا "نشستند و گفتند" والا منظر پیش کر رہی "برخاستند" کی نوبت آنے کو تھی۔ کہ یہ پروانہ جاری ہوا۔ لیکن "منظور ہے نا" لفاظ سے قبول یا عدم قبول کا حق بحق ایں سرکار محفوظ کر دیا تھا۔ یہ الفاظ صاحب صدر کے نطق سے خراج حاصل کرنے کے بعد محفل میں سنائی دیئے۔ (غالباً محفل کی کارروائی میں راقم الحروف کے ہمہ تن گوش ہو کر حصہ لینے لت دلیل ہے) اور ان کی زد ایک نحیف دُبلے پتلے جینیوں کے چہرہ کا خاکہ نے والے اور ہٹلر کی مونچھوں پر عملاً استہزاء کرنے والے۔ یہ صورت ن۔ آنریبل ممبر آف دی انگلش سٹاف وحال ایڈیٹر پر پڑ رہی تھی۔

جی دھک سے رہ گیا۔ ہمت نے جواب دے دیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ کہ ہیں! یہ بم کیسے؟ کن حالات میں؟ اور ہاں مجھی پر کیوں گرا؟ —— اُف اس مخلوق کے نام سے کانپ اُٹھا کرتا تھا۔ اس کی ت کا تصور جسم پر کپکپی طاری کرنے کو کافی تھا۔ اور چشم تصور سند جاتی تھی پر اس کا ذہنی بھوت مستقل تسلط جما لیتا تھا۔ اس کی معنی خیز تحریر رعب میں کبھی ناکام نہ رہی تھی۔ یا تو وہ حال یا یہ کہ ایک اچھے خاصے بھلے انسان سے بیٹھے بٹھائے بے جرم و بے قصور ایڈیٹر بن گیا ؏

انقلابات ہیں زمانے کے

زبان مختار کی حیثیت سے قینچی کی طرح چلنے لگی۔ "نا صاحب! ہمت نہ ہوگا۔" "ہم میں یہ لیاقت ہی کہاں ہے"، "ہم سے قابل ترین اشخاص میں موجود ہیں"۔ لیکن سر فرد ربلند ہو کر زبان کی خیانت ترجمانی کو آشکارا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا۔ "میاں! یہ الفاظ جو زبان سے لڑھک ل رہے ہیں۔ ان کا مجھ سے کب تعلق ہے؟ ایڈیٹر بننے کی ہوس سے تمہارے دل میں پرورش پا رہی تھی۔ آج آرزو پوری ہوتی نظر ریاکارانہ باتیں بنانے کے لئے زبان کو متعین کر دیا ہے۔ کہیں ان سے بنا بنایا کھیل ہی نہ بگڑ جائے۔ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری مفت میں بن گئے۔ شکرانے میں دو نفل ادا کر دو۔ سردیوں کے دن ہیں۔ وضو ت نہ پڑے۔ تو بے وضو ہی سہی۔

"بہت اچھا جناب" کہہ کر فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب اپنے اختیارات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ خیالات گدھوں کی طرح منڈلانے لگے۔

ایڈیٹر —— ارے ایڈیٹر تو دنیا سے نرالے ہوتے ہیں۔ اخبار کے ہوں یا بیگار کے۔ پلٹن کے ہوں یا رسالے کے۔ لیکن اخبار والوں کا تو کیا کہنا۔ دنیا کے قوانین کی کتاب اُنھیں مرعوب کرنے سے عاجز ہے۔ اور تو اور تعزیرات ہند بھی اپنے بھاری بھر کم جسم اور قانونی ٹوٹکوں کے باوجود جناب ایڈیٹر کے دماغی توازن کو قائم رکھنے کے لئے ناکافی ہے۔ یہ نرالی مخلوق جب ادبی دولتیاں جھاڑ پر اُتر آئے۔ تو اس کی زد قریب کھڑے ہوئے اشخاص کی نسبت دور بیٹھے ہوئے اَن دیکھے لوگوں پر زیادہ پڑتی ہے۔ بس یہ سمجھئے کہ ایک ہنگامہ بپا ہوتا ہے کوئی کان کی خبر لے رہا ہے۔ کسی کی چندیا گنجی ہوئی جاتی ہے۔ کسی کو اپنی ناک کی فکر دامنگیر ہو رہی ہے۔ مولوی کو اپنی دستار فضیلت کے تار تار ہونے کا خدشہ ہے تو پنڈت جی کو اپنی روایتی دھوتی پھٹتی نظر آ رہی ہے۔ جوانوں کو اس کے مقابلے پر آتے ہوئے ہمت جواب دے رہی ہے۔ تو پیران کہن سال اپنے عقل کی جمع جتھا سمیت سامنے آتے ہوئے غم کھاتے ہیں کہ کہیں ریش مبارک کی سلامتی ہی خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ غرضیکہ بوڑھے۔ ضعیف و توانا چرند و پرند جن و انسان حتیٰ کہ پولیس والے بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتے

اس مخلوق کی پیدائش سے پیشتر ہمارا ادب بہت سی نادر اصطلاحوں کے وجود سے خالی تھا۔ منظوم گالیوں کی ایجاد کا سہرا ایڈیٹر ہی کے سر ہے۔ منظور طنز یہ تعیدسے اس کے ذوقِ ایجاد کا روشن ترین پہلو ہیں۔ شریف آدمیوں کی پگڑیاں اچھالنے میں پورے بازو کو حرکت نہیں دیتا بلکہ صرف تین انگلیوں (دو مادہ اور یک نر) سے یہ معجزہ دنیا کو دکھاتا ہے۔ شرافت میں سیاسی۔ مذہبی خاندانی۔ سِنی یا شعوری کی کوئی قید نہیں۔ بکھ ہو۔ بس "وہ کچھ" جائے اور ایڈیٹر صاحب کا "السیف زشکن قلم"۔

اور اگر تخریب کی بجائے تعمیر پر آمادہ نظر آئیں تو اُجڑے دیار پھر سے آباد کر دیں۔ کھنڈروں میں سلف کے پُر معنی تذکرے سے شاہی ایوانوں کی شان پیدا کر دیں۔ گمنام شخصیت کو چار چاند لگا دیں۔ بھکاری کو شہ ہفت اقلیم کے خطاب سے نوازیں۔ رند بادہ نوش کو صوفی صافی کے لقب سے ملقب کر دیں۔ بازاری عورت کے لئے نایاب۔ فخر ہندوستان۔ فنِ تمثیل میں غنیمت ...

شہرت قلم اشارس . . . . . کا عنوان جلی حروف میں لکھ کر ناظرین کے سامنے اپنی خلاقانہ قوت کی جھلک دکھائیں۔ اور اپنے زورِ قلم سے عنوان کی صداقت منوالیں۔ قوم اور وطن کے غدار کو دنیا میں فدائے قوم و ملت کے نام سے زندہ کردیں۔ پیشہ ور چندہ خوار کو قائد ملک و قوم حضرت مولانا و بالفضل اولانا ابوالفلزات مولوی . . . . . کے مقدس و پرشوکت نام سے پکارتے میں جھجک محسوس نہ کریں۔ سلطنت برطانیہ کے حدود میں بستے ہوئے ایسے لوگوں کی روایات کے خلاف سال بھر میں کئی مرتبہ خطابات کی بوچھاڑ کرتے رہیں۔ اور پھر ان میں ترمیم و تنسیخ تو چوبیس گھنٹوں میں چھپیس مرتبہ کریں۔

اور لیجئے! کیا جناب ایڈیٹر ہی قوم کو خطرے کے وقت اخباری ٹن ٹن سے خبردار نہیں کرتے۔ اتوار کو گرجا گھر کے گھنٹے کا خاموش ہوجانا ممکن۔ لیکن خطرہ کے وقت ایڈیٹر صاحب کے قلم کا رکنا ناممکن۔ اگر ہندو مسلم۔ سکھ اخبارات کے محترم ایڈیٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر اور بھگوان۔ خدا اور واہگورو کا واسطہ دے دے کر اپنی اپنی قوم کو بیدار نہ کریں۔ تو ہندی اقوام کی ماہیت معلوم؟ اتحاد کی اپیلیں خلوص پر مبنی تو محض ایڈیٹروں کی ہی ہوتی ہیں۔ ذرا گرد و پیش پر نظر تو ڈالئے اتحاد و یگانگت کے دریا ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔ اور اب ان دریاؤں کی طغیانی اپنے شہری کناروں سے اچھل کر ہمارے پس ماندہ اور غیر مہذب دیہات تک بھی آپہنچی ہے۔ ہمارا بھی جیون سپھل ہوا چاہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی مقدس مخلوق کے صدقے میں۔ کیا ملک کی یہ سیوا بجائے خود قابل قدر نہیں۔

خیالات نے ارادے کو پختگی بخشی۔ اپنی اہمیت پر اترانے کو جی چاہنے لگا۔ چشم زدن میں واقعی ہو بہو ایڈیٹر بن گئے۔ کیل کانٹے سے لیس۔ قلمدان ادب سنبھالے۔ ارادوں کی گٹھڑی باندھے اور قلم کا لٹھ اٹھائے نامعلوم حریف یا حریفوں کو پچھاڑنے کے لئے کمر لیتے۔

حضرت ایڈیٹر کا نام ہی چھپاں کرنا ہے نا۔ مشکل کونسی ہے۔ رسالہ کا کوئی سا نام تجویز کر لو۔ راولپنڈی سوری کمرشل ایجنسی سے فونٹین پن حاصل کرنا۔ (کرائے پر ہی سہی) اور مضامین کو الٹی سیدھی ترتیب دینا دو ہی تو باتیں ہیں جو ایڈیٹر کو کرنا پڑتی ہیں۔ ہاں عینک بالضرورت یا بلاضرورت استعمال کرنا۔ ہاتھ میں چھڑی اور اسے مستقل گردش میں رکھنا سونے پر سہاگہ ہوگا۔ اور ہاں یہ درد سر مول لینے کی کیا ضرورت کہ رسالہ "کثیر الاشاعت" ہو۔ تاکہ آپ کا نام ایڈیٹر کے لفظ کا دُم چھلا لئے زیادہ سے زیادہ پڑھنے والوں کی نظر سے گذرے۔ کیا پنڈی کی گرنتھ کے ایڈیٹر۔ ایڈیٹر صاحب نہیں ہیں۔ اور لیجئے۔ کیا ایڈیٹر کے لئے کسی ڈگری کا حامل ہونا لازمی امر ہے۔ ہم ساہوکار تھوڑا ہی ہیں۔ جو غریبوں کا خون چوسنے کو جونک سے بھی بازی لے جائیں۔ اور ڈگری کے حصول کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھریں۔ اور اس کے بغیر چارہ نہیں تو ادھر ادھر نظر دوڑائیے۔ کئی بار لکھا دیکھا ہوگا "ایڈیٹر۔ مسٹر پیارے لال کھنہ" "اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ خان خوشدل خان یزدانی" یہ ڈگری تو کبھی کی تمہیں حاصل ہے۔ بسم اللہ کیجئے لکھ دیجئے گا "ایڈیٹر۔ عزیز احمد بھٹی" اور اگر کسر رہ گئی ہو تو "راجہ" کا اضافہ کر لیجئے جھجکنے کا مقام نہیں۔ ماڈرن راجہ عام طور پر بے رعایا ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور دہلی یا مشرقی پنجاب میں تیز دعا راد زاروں کی دعا اور برکت سے کچھ نہ کچھ کما ہی لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کی بھی قید نہیں۔

اب دیکھتے ہیں۔ کون ایڈیٹر صاحب سے آنکھ ملاتا ہے۔ اور ہم ایڈیٹر بھی جنگجو فوجی قوم کا سپوت۔

آج محفل میں ہے رقصاں مئے گلرنگ کی رَو
آکہ اب بھول بھی جائیں غمِ دیرینہ ولو

دیکھئے پرتوِ اُمید سوادِ دل میں
جیسے ظلمت کدۂ غم میں ہو مہتاب کی ضو

زلف بردوش مری بزم میں آؤ تو ذرا
آج تو ساغر و مینا بھی ہیں صرفِ تگ و دَو

چھلکیاں جس طرح لے دل میں مے یادِ حبیب
یوں ہے لرزش میں سرِ بزم تری شمع کی لَو

کروٹیں لیتے ہیں یوں سینے میں ارماں دل کے
جیسے ساغر میں ہو رقصاں مہ و خور کا پرتو

آج وہ ترکِ قبا پوش ہے آیا سجاد
کیوں نہ ہو بزم مری غیرتِ جشنِ خسرو

سجاد ہاشمی

طیور آوارہ

ادبی پارے

از :- درشن سنگھ بی اے (آنرز)

پس مرگ

معصوم دوست !

جب میں اس دُنیائے فانی سے رحلت کر جاؤں تو میرا
ماتم مت کرنا -
جب ناقوس کی آواز لوگوں کو اس دنیا سے میری روانگی کی اطلاع دے -
جب میں اس گھر کو چھوڑ کر ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں قیام کروں جہاں اندھیرے
بھوت اور زمین کے کیڑے میرے ساتھی ہوں گے -
میرے لئے کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار مت کرنا -
اگر کبھی تجھے ان الفاظ کو پڑھنے کا موقع ملے - ان الفاظ کے تحریر کرنے
والے کو بھول کر بھی یاد نہ کرنا -
اگر تجھے مجھ سے حقیقی محبت ہے تو مجھے اپنے شیریں تصور میں بھی آنے
کی اجازت نہ دینا -
اگر کبھی تو غلطی سے مجھے اپنے دائرۂ تصور میں داخل ہونے کی اجازت
دے گا - تجھے اس سے دکھ ہو گا -
میرے لئے اپنی محبت کو میری زندگی تک ہی محدود رکھنا -
میری زندگی کے بعد مجھے بھول جانا -
گم شدہ چیز کے ذکر سے کیا فائدہ ؟ ——— مردہ دوست کی یاد سے
کیا حاصل ؟
اس سے صرف جگ ہنسائی ہوتی ہے -
اگر میری موت کے بعد تو نے میرا ماتم کیا - لوگوں پر ہمارا راز محبت
افشا ہو جائے گا -
تو بدنام ہو جائے گا - کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا -
آہ — پھر کیا ہو گا - گر یہ راز سب پر کھل گیا -
اے نگار عفیف -
اے شاہد معصوم ! اے حسن شریف
اگر تجھے مجھ سے محبت ہے - - - - -
اگر تو اک غم آشنا کی یاد میں نالاں ہے -
مجھے بھول جا ———
ہاں ——— بالکل بھول جا -

اے شاہد معصوم !

اگر تجھے مجھ سے حقیقی محبت ہے تو مجھ کو بھول جا -
اسی میں تیری بہتری ہے - میں تیری بہتری کا خواہاں ہوں -
اگر میری موت کے بعد تو نے میری یاد میں نوحہ خوانی کی
لوگ پوچھیں گے -
تمہارے دوست میں کیا خوبیاں تھیں کہ تم موت کے بعد بھی اس کی محبت
میں نالاں رہتے ہو -
تجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑے گا -
لوگ تیرا مذاق اڑائیں گے -
تیرے ساتھی تجھے پاگل کہیں گے - جب تو بازار سے برہنہ پا اور برہنہ سر
گذرے گا - بچے تجھے پتھر ماریں گے -

اے شاہد معصوم

بہتر یہی ہے کہ تو مجھ کو بھول جا -
میں بے نوا تھا - میں بدقسمت تھا - میں آوارہ تھا - لوگ مجھے حقارت کی
نظر سے دیکھتے تھے - میں دنیا میں بدنام تھا -
جب دنیا پر ظاہر ہو گا کہ تجھے مجھ سے محبت ہے - لوگ تجھ سے نفرت
کریں گے -
تو لوگوں کے سامنے میری بے حد تعریف کرے گا - مجھے تمام خوبیوں کا
مجسمہ بتائے گا -
میری خاطر تو یہ سب جھوٹ بولے گا - میری خاطر تو گنہگار بنے گا -
میں اسے کس طرح برداشت کر سکتا ہوں - میرا دل کس طرح اس کی
اجازت دے سکتا ہے -
لوگ تجھے جھوٹا کہیں گے — مجھے اس سے دکھ ہو گا - میری روح
بے چین ہو گی -
میری موت کے بعد کبھی میرا نام نہ لینا - کبھی ہماری محبت کا اظہار نہ کرنا -
میرے نام کو میرے جسم کے ساتھ ہی دفنا دینا
ہماری محبت کو میرے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دینا -
نہ کبھی خود شرمندہ ہونا — نہ مجھے شرمندہ کرنا -

شاہد معصوم حسن

میری موت کے صدمے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔
کیونکہ میری موت ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔
میں ہمیشہ تیرے پاس رہوں گا۔
تو معصوم ہے۔ تو محبت اور موت کے اس بھید کو سمجھ نہیں سکتا۔
اگر تو اسے سمجھ سکتا تو آج رونے کی بجائے خوش ہوتا۔
میرا جسم موت کے زیر اثر ہے۔
میری روح موت سے آزاد ہے۔
اس زندگی میں میرے جسم کا تعلق دنیا سے ہے۔
میری روح کو صرف تیری محبت سے واسطہ ہے۔
جب میں مر جاؤں گا — میرا جسم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے گا — یہ جسم نیست و نابود ہو جائے گا۔
صرف روح باقی رہ جائے گی۔
میرا تعلق دُنیا سے بالکل ٹوٹ جائے گا۔
میں صرف تیرے لئے رہ جاؤں گا۔
تجھے خوش ہونا چاہئے۔
کیونکہ۔
جسم موت کا حصہ ہے۔ لیکن روح اس سے آزاد ہے۔
میری روح تیری ہے۔ یہ میرا بہترین حصہ ہے۔
ہماری محبت کا رشتہ روح کے ذریعے ہے۔ جسم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر جسم کی موت سے ہماری محبت میں کیسے فرق آ سکتا ہے۔
میری موت تیرے لئے ماتم کی کوئی وجہ نہیں رکھتی۔ یہ صرف خاکی جسم کی موت ہوگی۔ یہ جسم ایک حقیر چیز ہے۔ یہ مجھے تیری جانب سے ہٹا کر دنیا کی طرف لے جاتا تھا۔ یہ سخت مجرم ہے۔ اسے زندہ رہنے دینا غلطی ہے۔
یہ جسم فانی ہے۔ ایک حقیر چیز ہے۔ یہ کیڑوں کی خوراک ہے۔
تجھے اس سے کیا مطلب۔ یہ حقیر چیز تیرے قابل نہیں۔
جسم کی قدر صرف روح سے ہے۔ کیونکہ یہ اس کا مسکن ہے۔
تجھے میری روح سے محبت ہے۔
جب روح اس جسم میں نہ رہی تو یہ جسم ناکارہ ہے۔ بے سود ہے۔
تجھے اس کی موت سے کیا۔
اب میری روح ہمیشہ تیرے پاس رہے گی۔ اب یہ صرف تیرے پاس
اب میں صرف تیرے لئے ہوں گا۔
تجھے میری موت سے خوش ہونا چاہئے — دنیا ماتم کرے گی۔ تجھے
اس سے کیا مطلب

(ماخوذ)

ہستی ناپائیدار

یہ سیلگوں ندیاں خوشی خوشی — میری آنکھوں کے نیچے — ایک محویانہ انداز میں — کسی عاشق صادق کے استقلال کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔
نہایت بیری اور تندی سے — برفانی ہوائیں — پہاڑوں کی جانب سے — فضا میں چل رہی ہیں۔ کالے کالے بادل متواتر ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔
ہر ایک دل خوشی خوشی زور زور سے حرکت کر رہا ہے۔
پوری خوشی کے ساتھ سب چیزیں اپنے ازلی فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔
لیکن۔
ان کی زندگی ایک زندگی مستعار ہے — ان کی ہستی ایک ہستی ناپائدار ہے۔
یہ بہتی ہوئی ندیاں خاموش ہو جائیں گی۔
فضا میں چلتی ہوئی ہوائیں رک جائیں گی۔
دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔
یہ ہستی ناپائدار ہے — پھر کبھی موسم بہار نہیں آئے گا۔
اے مغرور انسان!
موت تیرے دروازہ پر دستک دے رہی ہے — دیکھ ہمارے تمام ساتھی آہستہ آہستہ مجلس رقص و سرود کو الوداع کہہ رہے ہیں — ہم سب تیرے منتظر ہیں — جب باری آئے گی۔ ہمیں جانا پڑے گا —————
یہ — بہت بہتر — کہیں اندھیرے میں ہمارا مسکن ہوگا — ایک عالمگیر خاموشی ہوگی — وہاں بلبل کے دلخراش نغمے سنائی نہیں دیں گے — پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی ہوائیں ہماری نیند میں خلل انداز نہیں ہوں گی۔
او بدنصیب!
سُن!
موت بلا رہی ہے — جب کہ میں تجھ سے مخاطب ہوں — موت تجھ پر غالب آ رہی ہے۔ تیرے گلابی عارضوں پر زردی چھا رہی ہے — تیرے اعضا کمزور ہو رہے ہیں — کارکنان قضا و قدر تیرے گرم خون میں برف ملا کر اُسے ٹھنڈا کر رہے ہیں — آنکھوں کی حرکت بند ہو رہی ہے — ناقوس

کی آواز آتی ہے۔
الوداع۔
یہ پرانی دنیا — بہت عرصہ پہلے پیدا ہوئی —— ہر چیز کے لئے جو
پیدا ہوتی ہے موت لازمی ہے —— اس دنیا کی موت لازمی ہے ——
برفانی ہواؤں کو پہاڑوں سے ٹکرانے دو۔
سمندر کی نیلگوں لہروں کو کنارے سے ٹکرانے دو۔
یہ صبح اور شام ابد تک پھر تمہیں کبھی نظر نہیں آئیں گے۔
تم پھر دوبارہ نہیں آؤ گے —— ہم سب موت کے منتظر ہیں۔
یہ ہستی ہستیٔ ناپائدار ہے۔ یہ زندگی زندگیٔ مستعار ہے (ماخوذ)

ہستی پائدار

میری آنکھوں کے سامنے بہتی ہوئی ندیوں کی پرشور روانی اور دریاؤں کی گراں وقار حرکت اپنے کٹھن سفر سے چکنا چور ہو کر کب خاموشی اور سکون حاصل کرے گی۔
فضا میں چلتی ہوئی ہوائیں اپنی اس راہ بے منزل سے تھک کر کب آرام اور سکون کی تلاش میں کسی منزل پر اس سفر کو ختم کریں گی۔
آسمان میں دوڑتے ہوئے بادل آخر کب ایک دوسرے کا تعاقب ختم کریں گے۔
دل کی یہ متواتر حرکت آخر کب بند ہو گی — یہ دنیا کب خاموش ہو گی۔
نہیں — ہرگز نہیں — دنیا کی کوئی چیز کبھی ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہو گی ندی بہتی رہے گی — ہوا چلتی رہے گی — بادل ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہیں گے۔ دل کی حرکت جاری رہے گی۔
کوئی چیز ختم نہیں ہو گی — سب کچھ تبدیل ہو جائے گا ——
ایک مدت دراز میں۔
گرمی اور خزاں کو رخصت ہوئے مدت گزر چکی ہے — زمین خشک ہے — لیکن ایک اور مسافر — نیا اور سرسبز — موسم بہار — پھر خاموش ہوا میں ایک ٹھوکر کی جنبش سے ایک نئی حرکت — ایک وسیع دائرے میں — اندر ہی اندر — یہاں اور وہاں — پیدا کر دے گا —
تمام فضا اور زمین ایک نئی زندگی سے معمور ہو جائے گی۔
یہ دنیا کسی ایک وقت — ایک دفعہ — اور ایک جگہ — بیٹھ کر نہیں گھڑی گئی — یہ دنیا بدل جائے گی۔
لیکن یہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔
پرانی دنیا کی جگہ ایک نئی دنیا لے گی۔
یہ قدرت کے عناصر کبھی خاموش نہ ہوں گے — ندیاں بہتی رہیں گی ہوائیں چلتی رہیں گی — بادلوں کی دوڑ جاری رہے گی —— دل کی حرکت جاری رہے گی۔
صبح و شام ازل سے ابد تک ایک دوسرے کا تعاقب جاری رکھیں گے۔
کوئی نئی چیز کبھی وجود میں نہیں آئی —— کوئی پرانی چیز کبھی مٹ نہیں سکتی
یہ سب چیزیں نئی اور پرانی ایک نئے روپ میں تبدیل ہونے کی منتظر ہیں — (ترجمہ)

محبت اور موت

چاند ابھی اس نورانی حسن سے بے بہرہ تھا — ابھی وہ نور کے بکھرے ہوئے ذروں کو اکٹھا ہی کر رہا تھا۔ جبکہ محبت بہشت کی معطر فضاؤں میں بصد ناز و انداز چہل قدمی کر رہی تھی۔
اس کی روشن آنکھوں سے چاروں طرف روشنی پھیل رہی تھی۔
اچانک جب وہ ایک خوشبودار درخت کے گرد پھری۔ اُسے سامنے موت نظر آئی جو ایک زہریلے درخت کے نیچے اکیلی پھر رہی تھی۔
موت نے خشمناک لہجہ میں کہا۔
"یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ میری راجدھانی ہے"۔
محبت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس کے رخساروں پر گرنے لگے۔
وہ رونے لگی۔ اُس نے اپنے سنہری چمکدار پر اڑنے کے لئے پھیلائے۔
لیکن اُڑنے سے پہلے اُس نے کہا۔
اس وقت تیری حکومت ہے۔
موت زندگی کا سایہ ہے۔
جس طرح درخت دھوپ میں ہوتا ہے اور اُس کا سایہ نیچے۔
جب درخت گر جاتا ہے — سایہ خودبخود ختم ہو جاتا ہے۔
اسی طرح خدائی نظام میں
انسانی زندگی ایک درخت کے مانند ہے۔
موت اس کا سایہ ہے۔
جس طرح درخت کے گرنے سے سایہ خودبخود مٹ جاتا ہے۔
اسی طرح زندگی ختم ہونے پر موت خودبخود ختم ہو جائے گی۔
موت کا حلقۂ اثر زندگی تک ہی محدود ہے۔
اس کے بعد میں تاابد سب پر حکومت کروں گی۔
میں موت سے ناآشنا ہوں۔
میں دائمی ہوں دائمی۔ میں ابدی ہوں ابدی — (ترجمہ)

ب کے پھول سے

گلاب کا پھول کیوں اس قدر پیارا ہے

ب کا پھول کیوں اس قدر حسین اور دل کش ہے۔
اس کی کیوں اتنی قدر اور عزت ہوتی ہے۔
یہ بہت حسین اور خوشنما ہے۔ یہ آنکھوں کو بہت اچھا لگتا ہے۔
لیکن۔
دوسرے پھول بھی تو اسی قدر حسین اور خوشنما ہیں۔
کئی پھول اس سے بھی زیادہ خوشنما ہیں۔ ان کا رنگ بھی گلاب کی طرح سرخ ہے۔ ان کے حسن کی حفاظت کے لئے بھی کانٹوں کے نگہبان مقرر ہیں۔ وہ بھی گلاب کی طرح شگفتہ ہیں۔ دوسرے پھول بھی موسم گرما کے سانس سے مست ہو کر اپنے لباس کو پھاڑ دیتے ہیں۔
وہ کیوں کسی حسین کے گلے کا ہار نہیں ہوتے۔ ان کی کیوں کوئی قدر نہیں ہوتی۔
کوئی ان سے کیوں پیار نہیں کرتا۔
وہ کس مپرسی کی حالت میں مرجھا جاتے ہیں۔
ان کا حسن صرف ان کی صورت تک محدود ہے۔
گلاب کے پھول سے صرف اس کی دل کش صورت کی وجہ سے پیار نہیں کرتے۔
اس کی عزت اس کے رنگ کی وجہ سے نہیں۔
بلکہ لوگ اس کو اس کی معطر خوشبو کی وجہ سے پیار کرتے ہیں۔ جو اس کے اندر ہے۔
اسی خوشبو کی وجہ سے۔
گلاب کسمپرسی کی حالت میں مرجھا نہیں جاتا۔ مرجھا کر مٹی نہیں بن جاتا۔
بلکہ اس کی مرجھائی ہوئی پتیوں سے خوشبودار عطر نکالے جاتے ہیں۔
اسی طرح دوست۔
انسان کی قدر صورت سے نہیں ہوتی
حقیقی حُسن کا راز حسین صورت نہیں۔
بلکہ وفا کا جوہر ہے۔ دوست کی سیرت ہے۔
جو دوست کی قدر و منزلت بڑھاتا ہے۔
جو دوست کے حسن کو دو بالا کرتا ہے۔
وفا اور سیرت دوست کے حسن کو دو بالا کر دیتی ہے۔ (ماخوذ)

جگر کی سوزشیں ہم آہ سے مٹا نہ سکے
جو آگ دل میں لگی تھی اُسے بجھا نہ سکے

وہ انقطاعِ تعلق کا عالمِ مجبور
نظر ملا کے وہ مجھ سے نظر ملا نہ سکے

رہے جو قید میں صحرا کی وہ جنوں ہے خام
جنوں ہے وہ جو دو عالم میں بھی سما نہ سکے

یہ انتہائے تغافل ہے یا فریب نصیب
کہ اُن کو یاد دلایا یہ یاد آ نہ سکے

بُرا ہو اشکِ گلوگیر کا کہ ہم اُن کو
گئے تھے حال سنانے مگر سنا نہ سکے

وہ میرا جذبِ محبت تھا یا نزاکتِ حُسن
چھڑایا آپ نے دامن مگر چھڑا نہ سکے

بنا ہے جوشِ جنوں پردہ درِ وفا اپنا
ہزار اس کو چھپایا مگر چھپا نہ سکے

(شیخ غلام حسین وفا ایم اے)

اردو ادب کا علمی تعلیمی فنی و ادبی

ماہنامہ

شاہکار

The SHAHIKAR

1941
دسمبر

مدیر اعلیٰ شمس العلماء علامہ تاجور

مدیر مسئول عبدالحلیم انصاری

سالانہ چندہ چھ روپے ششماہی تین روپے آٹھ آنے

قیمت فی پرچہ ۱۲/-

شاہکار لاہور

مدیر معاون مسٹر قیصر جمشید واصل بی اے۔

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء

جلد ۱۳

نمبر ۱۲

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور بیرون تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار رتن چند روڈ [illegible] لاہور سے شائع کیا

"واپسی"

از
رشید ذوقی (کاندھلہ)

یاد ان کو بار بار کیا اور آ گئے — رہ رہ کے انتظار کیا اور آ گئے
بے تاب تھے سجودِ محبت، بکھر گئے — اُس در کو کعبہ زار کیا اور آ گئے
معصوم و نامراد امیدوں کی روح کو — کچھ اور بے قرار کیا اور آ گئے
جذبِ جنونِ شوق پہ قابو نہ چل سکا — رگ رگ کو خونفشار کیا اور آ گئے
ذرّوں سے چھین چھین کے انوارِ منتشر — نظروں کو جلوہ زار کیا اور آ گئے
ویرانیوں میں خلوتِ امید وبیم کی — تا دیر انتظار کیا اور آ گئے
گذرے ہوئے روابطِ رنگیں کی یاد میں — آنکھوں کو اشکبار کیا اور آ گئے
بے تابیوں کو درس دیا صبر و ضبط کا — اخفائے حال زار کیا اور آ گئے
مستقبلِ وفا سے کچھ امید باندھ کر — ہر غم کو خوشگوار کیا اور آ گئے
پا، اور نقوشِ پا کو ترستی رہی جبیں — طاعت کو شرمسار کیا اور آ گئے
شب تاب گیسوؤں کے بہکتے خیال میں — دامن کو تار تار کیا اور آ گئے
اک اک کلی کو چوم لیا خانہ باغ کی — پھولوں کو رازدار کیا اور آ گئے
بجھتے ہوئے چراغِ تمنائے دید پر — حسرت کو سوگوار کیا اور آ گئے
پردوں کو بزمِ ناز کے جنبش نہ ہو سکی — دستِ طلب فگار کیا اور آ گئے
خالی فضا کو سوزِ محبت سے بھر دیا — آہوں کو شعلہ بار کیا اور آ گئے

بیداریاں انہیں کسی صورت نہ پا سکیں
خوابوں پہ اعتبار کیا اور آ گئے

دسمبر ۱۹۵۱

اقبال کے بعد

جدید شاعری پر تعمیری و تنقیدی مقالات

از
قیصر جمشید واصل بی اے
مدیر معاون

مجلس اول

مقالہ اول

تمہیدی کلمات کسی مصور کے متعلق یہ قصہ زبان زد عام ہے کہ اس نے فن صورت گری کا ایک بےنظیر نمونہ بنایا۔ اور اس کی فنی جزئیات کی صحت پر اسے اس قدر ناز تھا کہ اس نے اسے شہر کے چوک میں آویزاں کر کے نیچے یہ تحریر کر دیا کہ جو صاحب اس میں کوئی خامی پائیں۔ وہاں نشان کر دیں۔ دوسری صبح وہ چوک میں پہنچا۔ تصویر کو دیکھا تو سر پیٹ لیا۔ سیاہ نشانات کی کثرت سے تصویر شہد کی مکھیوں کا چھتہ بن گئی تھی۔ مصور واپس آیا۔ ایک اور تصویر کھینچی۔ اور اپنی ہنرمندی کے اس نگین شاہکار کو پھر اسی چوک میں آویزاں کر دیا۔ لیکن اس مرتبہ نیچے یہ الفاظ لکھے۔ کہ جو صاحب اس میں کوئی نقص پائیں اس کی درستی کر دیں۔ دوسری صبح جا کر دیکھا۔ تو تصویر پر ایک بھی نشان نہ تھا۔

اس قصے کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ افراد عامہ تخریبی تنقید میں "فطرتاً" ماہر ہوتے ہیں لیکن تعمیری تنقید کرنا ان ہستیوں کا حصہ ہے جنہوں نے بطور فن اسے حاصل کیا ہو۔ اور ذوق سلیم کے قلم سے اس میں رنگ بھرا ہو کسی فن لطیف کو فروغ دینا ہو۔ تو اس فن کے ماہرین کے شاہکاروں پر تعمیری تنقید کے ذریعہ ہی بہترین خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جو ادبی خط و خال کے عیوب و محاسن کو ان میں اضافہ کرنے کے بغیر ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

تخریبی تنقید اور تعمیری تنقید کے فرق کو نمایاں طور کرنے کے لئے استعارتاً یوں سمجھئے۔ کہ ایک رند خرابات بدمستی کی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا گھر آتا ہے۔ اور نشہ کے زور سے سوقیانہ انداز میں چلا چلا کر بےمعنی باتیں بک رہا ہے۔ اس کے ہمسایوں کی اس کے رویہ پر دلشکن نکتہ چینی، تیغ آور طعن و تشنیع اور زد و کوب کو ہم "تخریبی تنقید" کہیں گے۔ یہ چیزیں اصلاح کے لئے کبھی بھی سود مند ثابت نہیں ہو سکتیں بجائے اس کے اگر اس کا کوئی غمخوار دوست فطرت انسانی کا شناسا اس کے پاس آئے اسے شراب کی اونچ نیچ سے آگاہ کرے تاریخی واقعات کی مدد سے اسے جتائے۔ کہ دختر رز کی جادو بھری مشعل ازیں سے کس کن کو تباہ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی انہیں کو نہ معاف نہ کرے بچانے کے لئے حقیقت بھی کہہ ڈالے کہ ہاں اگر اعتدال سے پی جائے۔ تو حرج بھی نہیں ہے۔ تو یہ "تعمیری تنقید" ہوگی۔

تعمیری تنقید ہی فنون لطیفہ کے فروغ دینے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سے جہاں کسی خاص انداز تحریر یا افسانہ وغیرہ کی اغلاط اور خامیوں کو برہنہ کر دیا جاتا ہے وہاں اس کے محاسن اور دلکشی کے راز کو بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں رکھا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر کے عیوب کو چھوڑ کر محاسن کو اختیار کرتی ہیں۔

انگریزی زبان میں تخریبی تنقید کے کافی نمونے موجود ہیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ ایک شاعر نے ایک نظم لکھی لیکن اس کے ایک ہمعصر شاعر نے تعصب سے یا رقابت سے اس پر ایسی تنقید کی۔ کہ دنیا کو اس نظم میں خامیاں الفاظ کی تعداد سے بھی زیادہ نظر آئیں۔ اس قسم کی تنقید ادبی نکتہ نگاہ سے چنداں حیثیت نہیں رکھتی۔ اور نہ ہی ہم ایسی تنقید سے کسی کی ادبی کاوشوں کو پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام لے سکتے ہیں۔

قحط الرجال۔ ہندوستان میں نقادان ادب اس طرح بحیثیت جماعت موجود نہیں ہیں۔ جیسے معلمین یا طلبا۔ اور نہ ہی فن تنقید کی تدریس کا کوئی ادارہ ہے جہاں پر تنقید کے اصول سکھائے جائیں۔ برخلاف اس کے اگر ہم یورپ اور امریکہ کے علمی اداروں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جہاں علم ادب کے ساتھ ساتھ علم تنقید کے سکھانے کا سامان مکمل طور پر موجود نہ ہو جہاں پر علوم کے طلبا جہاں ادبی جواہر ریزوں سے ان کو پرکھ کر نکلتے ہیں۔ وہاں ان کے پرکھنے کی صلاحیت بھی پیدا کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک نظم یا تمثیل سے پورا پورا لطف اٹھاتے ہیں تاکہ وہ کھینچی جاتی ہے۔ دل سمجھتا جاتا ہے۔ اور روح پر ان ہر دو کی سعی مشترک سے ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے

مغربی ممالک میں فن تنقید پر سینکڑوں کتب اور صدہا رسالے لکھے جا چکے ہیں اور مدرسوں اور کالجوں میں امتحان کے موقع پر کسی شاعر کا کلام دے کر اس پر باقاعدہ تنقید کروائی جاتی ہے۔

(چونکہ ان مقالات میں بحث کا موضوع صرف اردو شاعری ہے اس لیے ہم پیکار توجہ صرف اتنی ہی توسن لگائیں گے۔ جو اصناف سخن اور کلام شعرا کو اپنے خم میں لئے ہے اور نثر کو اس کی حد بندی سے دور رکھیں گے)

ہمارے نقادان فن ۔ ہندوستان میں جہاں جہاں اردو اور فارسی کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔ وہاں سوائے ایک آدھ کتاب علم العروض پر پڑھانے کے اور دو چار صنائع و بدائع سکھانے کے فن تنقید کے اس شعبے سے بھرما۔ تغافل برتا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے علمی گہواروں میں دو چار نشتر چل جاتے ہیں۔ اور چند ایک اسرافیل اور تنقید محض عروضی نقائص پر انگلی رکھنے کا نام رہ جاتی ہے۔

تنقید کرتے وقت الفاظ کی برجستگی، تراکیب کی بندش، افعال کی موزونی، الفاظ کی خاموش موسیقی اور اس کی نفس مضمون سے ربط مصرعوں کی چستی ان کو اور ایسی کئی اور باتوں کو ذہن سے بالکل دور رکھا جاتا ہے۔ اور ہمارے ہمعصر نقادان فن کی نگاہوں میں تنقید نام ہے محض عروض اور زبان کی غلطیاں نکالنے کا۔

ذیل میں تنقید کا ایک قابل قدر نمونہ دیکھئے۔

" اخبار صداقت بمبئی میں جناب ابن حرس مائکوٹی کے چند "نکات" شائع ہوئے ہیں جنہیں ایڈیٹر صاحب کی موزونی طبع نے "فلسفیانہ حقائق" کا لقب عطا کیا ہے۔ ان فلسفیانہ حقائق میں سے ایک دو نکتے ملاحظہ فرمائیے۔

یہ کام کی دنیا ہے آرام کہاں اس میں
آرام کے طالب کا کیا کام اس دنیا میں
واللہ! اس دنیا اک ظرف حقیقت ہے
اوہام کے طالب کا کیا کام اس دنیا میں

دونوں شعروں کے پہلے مصرعے تو صحت سے بحری کے مہلک حملے سے محفوظ ہیں۔ ان کا وزن صحیح ہے۔ یعنی مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن۔ لیکن دونوں شعروں کے دوسرے مصرعوں کی عروضی حیثیت ماپنے کے لئے سب مائکوٹی کاغذ کا پیمانہ بنانے کی ضرورت ہے۔ البتہ اگر اس کے "س" کی سلامتی سے ہاتھ دھو لئے جائیں۔ یا "دنیا" کی "د" ذال میں تبدیل کر دی جائے تو اہل صاحب کی امانتداری پر کوئی حرف نہیں آسکتا لیکن یہ کام کون کرے
خانۂ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند ۔ "

جریدہ زمیندار مورخہ ۱۱/۴ ۳۴ء

ذیل میں ایک اور تنقیدی اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

" مدینہ " میں ملا رموزی صاحب کی ایک نظم "ملالت" کے عنوان سے چھپی ہے اس کے بعض اشعار ملاحظہ فرمائیے (ہم صرف ایک شعر ہی نقل کریں گے)
نزاکت کو صبح مسنوں ابھی اکبار دیکھا ہو کر اک بہار کے بستر پہ تجھے بیمار دیکھا ہے

دیکھا۔ بھوپال کے پہلوان نے صحیح کی جائے حلی کو کس درجے ثخنی دی کہ بیچارا فردوسی قبر میں کانپ اٹھا۔ باقی رہا شعر کا مضمون تو وہ موری کے روڑوں سے ہے۔ تیرے جرأت کو سی قسم کے ایک شعر پہ یوں ادا کی تھی۔ کر تم شعر کسا کسا عار اپنا چوما چاٹا کہہ لیا کر دل لے

(اقتباس از مطائبات)

یا اگر نقادوں نے ذرا بھر کر جست لگائی۔ تو اشعار زیر تنقید میں کسی ایسے لفظ کی طرف اشارہ کر دیا۔ جو غلط طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ اور جس کے غلط طور پر استعمال کئے جانے کا احساس اردو زبان سے معمولی شد بد رکھنے والے انسان کو بھی ہو جائے۔

ایک مقامی روزنامے میں چند اشعار چھپے جن میں شاعر نے ایک جگہ لفظ "موسیقار" معنی "گویا" استعمال کیا تھا تیسرے روز بعد ایک نقاد صاحب نے مزاحیہ کالم میں اس نظم پر تنقید لکھی۔ اور کہا کہ صاحب نظم اگر کسی بھی لغت میں موسیقار کے معنی گویا دکھا دیں تو ہم ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کر دیں گے۔ اردو دان حضرات اس قسم کی تنقیدیں پڑھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

مولانا چراغ حسن حسرت نے بھی ملا رموزی کے اس شعر پر ؎

کھٹک سے درد کی نیز بدلتے تھے ترے لیکن
انہیں بھی غمزۂ خونبار و گلبار دیکھا ہے

یوں تنقید کی ہے۔

" شعر بے معنی ہے۔ دونوں مصرعوں میں کوئی تعلق نہیں۔ مرے نزدیک اگر ملا صاحب غمزۂ خونبار و گلبار کہتے تو درست تھا۔ جب غمزہ کو خونبار اور گلبار دونوں کی جانب مضاف کیا ہے تو مصدری کا حرف عطف کیوں لائے"

اس قسم کی تنقید کرنا مدرسی کے فرائض سرانجام دینا ہے اور الفاظ پر اس قسم کی تنقید مدرسے کے کمرہ تک ہی محدود رہنی چاہئے۔

مقاصد دو گونہ ۔ اگرچہ اردو زبان کے ادبا و فضلا اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ "گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" لیکن جہاں تک اردو شاعری میں اصناف سخن کا تعلق ہے مصنفین میں پرانے خیالات کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے۔ جو کہ اسلوب بیان قافیہ و ردیف کی پابندی اور نظم کی ظاہری ساخت کے سامنے "یہ پہلی بحث کا ہے" اور اسی فرسودہ لکیر کا پرانا فقیر ہے۔ جو اردو کی سے اقبال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس گروہ کے نکتہ نظر سے رواجی اصناف میں کسی قسم کے تصرف سے کام لینا ادبی بدعت کے مترادف ہے۔

انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اونٹ اپنے آپ کو جسمانی لحاظ سے بہت بڑا سمجھے۔ تو اسے کسی پہاڑی کے مقابل کر دو۔ ان مقالات میں ہم اردو کے اونٹ کو انگریزی پہاڑی کے مقابل لائیں گے۔

اور اس اقدام سے ہیں ان مقاصد دوگونہ کی تکمیل مقصود ہے جو ان مقالات کی تحریر کے محرک ہوئے ہیں یعنی پہلا تو یہ کہ انگریزی علم ادب کی تاریخ سے ثابت کیا جائے کہ انگریزی شاعری میں اصناف سخن، اسلوب بیان اور نفس مضمون میں قرون وسطیٰ سے بیسویں صدی کے آغاز تک کس طرح قرن بہ قرن تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اور یہ کہ کسی ایک انداز بیان یا نظم کی کسی ایک قسم کی عمر سو سال سے تجاوز نہیں کر سکی۔ ا دکا حدود از خود آشکار ہو جائیگا۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ نوجوان شعرا کے تخیل کو بے راہ روی کی ان سنگلاخ وادیوں سے نکالا جائے جن میں وہ اصولوں کی عدم موجودگی کے باعث ٹھوکریں کھا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بے ڈھنگی نظم کو "طرز جدید" کا لقب دیکر عوام کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے اور ڈر ہے کہ اس سے جدید شاعری کو ابتدائی مراحل میں ہی ناکامی اٹھانی پڑیگی اصولوں کی عدم موجودگی میں عموماً شاعر کا ذوق سلیم اس کو راہ دکھاتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور ان کا موزون استعمال۔ مصرعے کی بندش وغیرہ میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب شاعر نے طبع ہی موزون پائی ہو صرف اصول چنداں کارگر نہیں ہوتے۔

اصولوں کی موجودگی میں ان اصولوں میں موقع اور محل کے مطابق ترمیم و تخریب کرنا شاعر کی اپنی وہبی قابلیت پر منحصر ہے کیونکہ سخنوری دماغ اور دل دونوں کی سعی باہم کا نتیجہ ہوتی ہے اس مطلب کو واضح تر کرنے کے لئے ہم ایک عجیب واقعہ لکھتے ہیں۔

ایک جاٹ انجنیر ولایت سے فن تعمیر کی اعلےٰ ترین ڈگری لے کر آیا اور صحت کو بحال کرنے کے لئے اس نے اپنے موروثی گاؤں میں عارضی قیام اختیار کیا۔ ایک روز گلیوں میں سے گذرتے گذرتے وہ ایک ایسے مقام پر آیا جہاں ایک زمیندار ایک نیا مکان تعمیر کروا رہا تھا دیہات میں مکانات عام طور پر کچی اینٹوں کے ہوتے ہیں سو وہاں بھی کچی اینٹوں اور مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ انجنیر صاحب پر نظر پڑتے ہی مالک مکان تعظیماً جھکا اور سلام کر کے کہنے لگا کہ خدا کی مہربانی ہوئی کہ آپ ادھر آ نکلے۔ ذرا مکان کی تعمیر کے متعلق کچھ ہدایات دیتے جایئے۔ آپ نے آمرانہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھا پھر ان دو تین مزدوروں کو جو وہاں کام کر رہے تھے اشارے سے پاس بلایا۔ اور اینٹوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ دیکھو ان تمام اینٹوں کو پانی میں ڈال دو اور چوبیس گھنٹے تک بھیگی رہیں کیونکہ ہماری سائنس کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اینٹوں کو استعمال کرنے سے پہلے کم از کم دس گھنٹے تک پانی میں ڈبو رکھنا چاہئے۔

ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہر فن میں اور خصوصاً شاعری میں صرف اصولوں پر ہی چلنے کر ہم ادبی شاہکار پیدا نہیں کر سکتے بعض وقت یوں بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر نے ادبی اصولوں کے ماتحت رہکر ایک لطیف چیز لکھی لیکن نظر ثانی کرتے وقت ان ادبی اصولوں سے ذرا انحراف کر کے اس چیز کو لطیف تر کر گیا۔

لیکن جدید شاعری میں شعرا مغربی طرز کے تتبع میں بعض وقت بےجا تصرف سے کام لیتے ہیں۔ وہ انگریزی نظموں کی ساخت کو اردو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انتا نہیں سمجھ سکتے۔ کہ انگریزی زبان میں ایک خاص قسم کی ساخت کا تعلق الفاظ کی موسیقی کے زیر و بم اور جذبات کے مد و جزر سے کیا ہے۔ وہ صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ انگریزی زبان کی بعض نظموں میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ اور بس اتنا اشارہ پاتے ہی خود بھی اردو زبان میں ایک نظم گھسیٹ ڈالتے ہیں جس میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوں۔ ایسے حضرات کی کورچشمانہ تقلید کی وجہ سے جدید شاعری کو بعض وقت بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ہم ذیل میں مثال کے طور پر ایک نظم آزاد لکھتے ہیں۔ اور اس کے پہلو میں اس نظم پر لکھی ہوئی ایک پیروڈی بھی درج کرتے ہیں یہ نظم آزاد فی الحقیقت اسی سزا کی مستحق تھی۔ کہ اس پر پیروڈی لکھی جاتی (اس نظم پر مفصل تنقید ہم نے کسی اور مقالے میں لکھی ہے)

پیروڈی

دھوکا	دھوکا
(از صادق قریشی ایم اے)	(از عاشق صاحب ایم اے۔ ایم۔ او۔ ایل)
میں نے ایک تصویر بنائی	میں نے اک دن کھیر پکائی
اس پر لکھا نام کسی کا	اس کی خوشبو پا کر آیا
سلمیٰ	کتا
سلمیٰ شرم و حیا کی دیوی	کتا شرم و حیا سے عاری
پیکر سا اخلاص و وفا کا	پیکر گویا حرص و ہوا کا
سلمیٰ	کتا
جانے کب پیچھے سے سلمیٰ	جانے کب پیچھے سے کتا
آگئی سب کی آنکھ بچا کر	آگیا سب کی آنکھ بچا کر
اندر	اندر
سب چیزوں سے آنکھ اٹھا کر	سب کھانوں سے دھیان ہٹا کر
اس تصویر کی کر لی	میری تھی جو کھیر کی تھالی
چوری	کھالی
سلمیٰ خوب رہا یہ دھوکا	کتے خوب رہا یہ دھوکا
تم نے تو اک چیز چرائی	تم نے تو اک چیز ہے چاٹی
نقلی	نقلی
اصل ہے دل کے آئینہ پر	کھیر رکھی ہے الماری میں
کاغذ پر تھی نقل اتاری	تھالی میں تو تھوڑی سی تھی
یونہی	یونہی
اس کو نہیں چوری کا کھٹکا	اس کو نہیں چوری کا کھٹکا
ہمت ہے تو اس کو چراؤ	ہمت ہے تو اس کو اڑاؤ
آؤ۔	آؤ۔

(باقی [illegible] صفحہ ۱)

کلامِ تاجورؔ

از
شمس العلما حضرت علامہ تاجورؔ

غم کی تنہائی میں جب وہ خوابِ حسیں یاد آتا ہے۔
یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل کو جانے کیا ہو جاتا ہے

اُلٹی گنگا بہتی ہے یہ کیسی عشق کی دنیا میں
دل سے بھلانے والا دوست ہی دل کو بہت یاد آتا ہے

سورج، چاند کو پوجنے والے، میں تو اُس کا پجاری ہوں
سورج جس کے آگے ماند ہے، چاند کو جو شرماتا ہے

راتوں کو جب تارے گنتے گنتے گھبرا جاتا ہوں
دوست کی یاد میں دوست کی یاد سے دل مجھ کو بہلاتا ہے

وہ کافر ہوں کہ یادِ خدا میں بھی دوست کی پُوجا کرتا ہوں
کیا کیجے ہر پھر کے اُسی کا نام زباں پر آتا ہے

تاجورؔ اِس بے خواہش جینے سے اتنا دل تنگ نہ ہو
موت تری مشکل آسان کرے گی، کیوں گھبراتا ہے

(زمزمہ)

انسان کی بغاوت

از
مسٹر انور کمال بی اے

گرمی آنے کو تو آگئی لیکن اس کا اثر یکساں نہ ہوا۔ دولت مند لوگ برف کے بڑے بڑے تودوں کے پیچھے پوری رفتار سے پنکھا چھوڑ کر گرمی کا مذاق اڑانے لگے۔ لیکن کبھی کبھی اپنے غریب دوستوں کا دل رکھنے کے لئے سارے کی مدحانی میں برابر کے شریک بننے کے لئے کہدیتے غضب کی گرمی ہے لیکن غضب کا لفظ استعمال کرتے وقت وہ اس کے مفہوم کو پوری طرح نہ سمجھ سکتے تھے۔ گرمی آئی بھی۔ تو غریبوں کے ستانے ہی کے لئے۔ نہ جانے قدرت کے قانون غریبوں کے ساتھ امیروں اور دولتمندوں کی طرح کیوں سلوک کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں غریب تمام دن کی محنت و مشقت کے بعد شام کو تھک کر میٹھی نیند سو جاتا ہے اور امیروں کو گدے دار بچھونوں پر بھی نیند نہیں آتی۔ ایک کو اگر بھوک کی نعمت کا احساس ہے تو دوسرے کو اپنی امیری کی کسک۔ یہ خیالات رنگین تو ہیں لیکن ان میں اصلیت کہاں۔ غریب مزدور جو دھوپ کی شدت میں تمام دن سڑک پر کام کرتا ہے کیا شام کو تھک کر میٹھی نیند سو سکتا ہے نہیں نہیں ایسا نہیں ہوتا ایسا نہیں ہوا کرتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا جس کی مرچ ساسی یا زیادہ سے زیادہ پیاس بجھانے کے لئے گرم پانی۔ جیسے دولتمند اور ان کے دولتمند دوست ڈاکٹر کہتے ہیں کہ برف کے پانی سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ پیتے ہیں۔ اور اپنی تمام طاقت کو پسینے کی شکل میں ٹپکتا دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ کاش وہ خوش کئے جا سکتے۔

حیات بھی غریب تھا۔ وہ اپنی عمر کا وہ حصہ طے کر رہا تھا جو امیروں کو میراث ہی میں نہیں ملتا۔ اس کے پاؤں اب اس کے جسم کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ وہ کبھی ایک معمولی زمیندار تھا لیکن اب وہ زمین کے لئے ایک بوجھ تھا۔ ایک ناقابل برداشت بوجھ۔ اس کی بیوی جو نسبتاً کچھ جوان اور تندرست تھی گاؤں والوں کا تھوڑا بہت کام کرتی۔ اور ان دونوں کی گذر اوقات اسی پر ہوتی۔ حیات البتہ گاؤں کے نمبردار کے پاؤں دباتا۔ یا کبھی کبھی بیگار میں پکڑ لیا جاتا۔ اور اب یہی اس کی زندگی تھی۔

آج جون کی سخت گرمی میں بوڑھے حیات کو مرغیوں کا ایک ٹوکرا دیکر نمبردار نے ساتھ کے شہر میں جانے کا حکم دیا۔ یہ نمبردار نے اپنے کسی افسر کے پاس اپنی وفاداری کا ثبوت روانہ کیا تھا۔ چالیس مرغیوں کا ٹوکرا دیتے وقت اُسے یہ خیال۔ آیا کہ بوڑھا اس بوجھ کو اٹھا بھی سکے گا۔ لال کلغی والے تندرست مرغے اور موٹی تازی مضبوط مرغیاں دیکھ کر یقیناً اس کا افسر بہت خوش ہوگا۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا۔

حیات صبح سویرے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پندرہ میل کی مسافت تھکے ہوئے کمزور پاؤں جون کی سخت گرمی اور ڈیڑھ من وزن۔ چار میل بوڑھے نے جوں توں طے کیا۔ پھر بیل کی پنڈلی دکھی۔ بوڑھا اسے دیکھتے ہی رونے لگا پچھلے واقعات آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں آنے لگے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کا چہرہ اس کی دھندلی دھندلی آنکھوں پر محیط ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو بڑے قطرے نکلے۔ اور اس کی گھنی داڑھی کے سوکھے ہوئے بالوں میں جذب ہو گئے۔

"خالق میرے چاند" "کاش تو زندہ ہوتا" اور پھر سارے واقعات اس کے دماغ میں چھا گئے۔ اس کے خون میں بغاوت کے جذبات ہیجان پیدا کرنے لگے۔ وہ بڑبڑایا۔

"خداوند کیا دنیا کے سارے سُکھ امیروں ہی کے لئے ہیں۔ اور یہ آنسو۔ یہ سرد آہیں کیا ہم غریبوں کی ہی جاگیر ہیں۔ کیا دھن والوں کو ان میں سے کچھ بھی نہ ملے گا۔ کیا اپنے قیمتی لباسوں کے مضبوط دامنوں میں ہماری تمام خوشیاں ہمارے تمام قہقہے دبوچے بیٹھے رہیں گے۔"

اُسے یاد آگیا کہ زبیدہ اس کی معصوم بچی کی عصمت کس طرح اس بڑے زمیندار کے جوان لڑکے نے خراب کر دی اور جب اس کے پیٹ میں زمیندار کے لڑکے کی ناپاک روح سانس لینے لگی تو وہ شہر کی طرف بھاگ گیا اور یہ کچھ نہ کر سکا۔ پھر وہ سوچنے لگا اپنی گذری ہوئی تلخ زندگی کے واقعات۔ زبیدہ معصوم زبیدہ کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اس بیچاری نے کھرپے سے اپنا پیٹ چاک کر لیا جس وقت بوڑھے کے سامنے وہ وقت آیا اس کے منہ سے ایک لمبی آہ نکلی اور آنسوؤں سے اس کی تمام داڑھی بھیگ گئی۔ . . . پھر بدنامی گاؤں بھر میں ان بیچاروں کا کنبہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ وہ امیر تھے جنہوں نے ان کے خاندان کے سر پر سیاہی مل دی تھی پھر سے وصل کئے لیکن یہ کالک کون مٹاتا۔ اس کالک کو کون مٹا سکتا ہے۔ اس کالک کو مٹانے کا غریب کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے۔ موت ابدی کی موت!

خالق بوڑھے کے بیٹے نے یہ فیصلہ کچھ پہلے کر لیا اور اس پٹڑی کو جسے بوڑھا بزدل بوڑھا ابھی ابھی طے کر آیا تھا۔ اپنے خون سے رنگ دیا۔ بوڑھا اور اس کی بیوی دونوں زندہ رہ گئے دنیا کے طعنے سننے کے لئے اس عمر میں ڈیڑھ من بوجھ اٹھانے کے لئے لیکن آج بہت گرمی تھی بوڑھے کا سانس رُک رُک کر چل رہا تھا۔

"میں کتنا بزدل ہوں۔ دنیا والوں کو اب تک اپنی منحوس صورت دکھا رہا ہوں" اور خالق۔ چوڑے سینے اور توانا جسم والا خالق۔ میرا بیٹا دنیا کے سامنے موجود نہیں؟ وہ دونوں ضعیف پاؤں حرکت کرتے رہے۔ لمبی سڑک پر ایک مشین کی طرح یکایک اسے موٹر کے ہارن کی آواز آئی پاس کا کمزور دل ایک مرتبہ پھر بہادر بننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے مرغوں کا ٹوکرا ایک طرف پھینک دیا۔ آج وہ اپنی جان دیکر ایک سرمایہ دار کو تھوڑی دیر کے لئے ہراساں کرنا چاہتا تھا۔ مصیبت میں پھنسانا چاہتا تھا۔ سمرزند تا تھوڑی دیر ...

اس کے سامنے سے گذر گئی۔ اور وہ کچھ نہ کر سکا۔ مرغیاں نیچے پڑی ہوئی اپنے پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ بوڑھے کو حسب معمول پھر ایک شکست ہوئی۔ موٹر کی پسماندہ خاک اڑ رہی تھی۔ اور اس میں سے بوڑھے کا دھندلا دھندلا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ موٹر کو دور لمبی سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے کو ایسا معلوم ہوا جیسے مرغے بھی اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہ اپنے خدا سے باغی ہو چکا تھا۔

موت سے ....

از
فارغ بخاری

ترا یہ آہنی چنگل بلا کا وحشت افزا ہے
متاعِ زندگی کے لوٹنے کا تجھ کو سودا ہے

بھیانک شکل تیری دیکھ کر سب تھرتھراتے ہیں
بشر تو کیا ہے سب ذی روح تجھ سے سہم جاتے ہیں

لرزتی ہے جوانی کانپتی ہے زندگی تجھ سے
جوانمردوں پہ ہو جاتی طاری کپکپی تجھ سے

تری دہشت سے کہساروں کا زہرہ آب ہوتا ہے
ترا طوفان وہ ہے ناخداؤں کو ڈبوتا ہے

تری تلخی سے نازک شیشۂ دل پاش ہوتا ہے
تری آمد سے سارا رازِ ہستی فاش ہوتا ہے

بچھڑنا جب گلستانِ جہاں معلوم ہوتا ہے
تری آغوش میں جانا گراں معلوم ہوتا ہے

اسے تو کیا ڈرائے گی جو مرنے سے نہیں ڈرتا
تری تلوار کے ہیں گھاٹ اترنے سے نہیں ڈرتا

قسم لے لے جو جینے کی ہو کچھ خواہش مرے دل میں
میں آسودہ ہونگا اس ترے سنسان محل میں

مگر ملک و وطن کو میرے جینے کی ضرورت ہے
شرابِ حریت کو آبگینے کی ضرورت ہے

بہت سی باتیں اہلِ دہر تک پہنچانی ہیں مجھکو
بہت سی زندگی کی گتھیاں سلجھانی ہیں مجھکو

کلامِ آزاد

از

جگن ناتھ آزاد بی اے (آنرز)

پھر حسنِ خود نما پہ نظر کر رہا ہوں میں
پھر امتحانِ قلب و جگر کر رہا ہوں میں

پھر ہو رہا ہے درہم و برہم سکوتِ شب
نالوں سے چاک شب کا جگر کر رہا ہوں میں

دنیا میں مجھکو جنسِ وفا کی ہے جستجو
کیوں خاک میں تلاشِ گہر کر رہا ہوں میں

اب دل کو ناپسند ہے پھولوں کا رنگ و بو
یعنی بلند ذوقِ نظر کر رہا ہوں میں

پھر دل میں آرہی ہے کسی بیوفا کی یاد
دنیائے دل کو زیر و زبر کر رہا ہوں میں

اک منظرِ جمیل ہے آنکھوں کے سامنے
دل کو نثارِ حسنِ سحر کر رہا ہوں میں

اب لطفِ صبح و شام گیا صبح و شام سے
کچھ اس طرح حیات بسر کر رہا ہوں میں

تسکینِ جانِ زار ترے انتظار میں
گو جانگزا ہے صبر مگر کر رہا ہوں میں

اک مردِ باکمال[1] کے قدموں میں بیٹھکر
حاصل متاعِ علم و ہنر کر رہا ہوں میں

[1] شمس العلما مولانا تاجور مدظلہ

افسانہ

ستارہ

از
مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری

رات کا وقت تھا۔ جتیندر کے سامنے دوربین رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس دوربین کے ذریعہ آسمانی دنیا کی سیر میں محو تھا۔ جھلملاتے ہوئے ستارے اس کے قلب و دماغ میں نہ جانے کیسے کیسے احساسات و تصورات پیدا کر رہے تھے۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی جس پر کاغذ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنسل تھی جتیندر اپنے تصورات و احساسات کو نوٹ کرتا جاتا تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی آسمان کی طرف ہوتیں کبھی کاغذ پر۔

جتیندر جس زمانے میں کالج کا اسٹوڈنٹ تھا اسی زمانے سے اسے فلکیات سے عمیق دلچسپی تھی۔ اب اس نے مسلسل تحقیق و مطالعہ سے اس علم میں معقول درک حاصل کر لی تھی۔ یہ علم اطمینان اور فراغت چاہتا ہے۔ اور جتیندر بدقسمتی سے بے مایہ اور تہیدست واقع ہوا تھا۔ اس کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ اس علم سے متعلق ضروری آلات فراہم کر سکتا۔ حال میں ایک بوڑھے سائنسدان نے اس کے ایک مقالے سے خوش ہو کر اسے ایک دوربین دیدی تھی۔ ورنہ اس کے قبل تو آنکھوں کے سوا جذبۂ شوق کی تسکین و تکمیل کا کوئی اور ذریعہ بھی نہ تھا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا دوربین کے ذریعہ زحل کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی رفتار وغیرہ کے متعلق جو کچھ اس کی سمجھ میں آتا تھا کاغذ پر نوٹ کرتا جاتا تھا۔ وہ اس ستارے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسپیکٹرومیٹر نہ ہونے کے باعث اس مقصد کی تکمیل میں سخت دقت واقع ہو رہی تھی ایسے مواقع پر اسے اپنی بے مائیگی سے بالخصوص بہت اذیت ہوتی تھی۔

کچھ دیر زحل کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے بعد جتیندر نے دوربین کا رخ زہرہ کی طرف پھیر دیا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار اس سیارے کے بارے میں مشاہدہ و مطالعہ کر چکا تھا لیکن ہنوز اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا خیال تھا کہ زہرہ کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا سیارہ ہے۔ اس سیارے کی تلاش و جستجو کو جتیندر اپنا مقصد زندگی سمجھتا تھا۔

اتفاقاً نلنی اس طرف سے گذری۔ وہ جتیندر سے بالکل ناواقف تھی پھر بھی وہ اس کی تجربہ گاہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے بھی علم نجوم سے دلچسپی تھی۔ اور اسی علم کی کشش وہ ایسا کر رہی تھی۔ اس کا شوق اسے تجربہ گاہ کے اندر کھینچے لئے جا رہا تھا لیکن اجنبیت اس کے پاؤں پکڑ کر روک رہی تھی۔ وہ عجب کشمکش میں پڑ گئی تھی۔

نلنی ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ وہ بہت زیادہ حسین و جمیل نہ تھی۔ پھر بھی رنگ کی گوری تھی۔ اس کی رگوں میں دوشیزگی کا خون دوڑ رہا تھا۔ عضو عضو سے جوانی پھوٹی پڑتی تھی۔

نقاد اسے حسین نہ سمجھتے ہوں۔ مگر کالج کے متعدد نوجوان اسے پیار و محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے مگر وہ کسی کی محبت کو درخور التفات نہیں سمجھتی تھی۔ اسے نوجوانوں پر بھروسہ نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی محبت آنی اور عارضی ہوتی ہے۔ جہاں ان کے متعلق جذبات کی سیری ہوئی ان کی محبت کا سارا جوش و خروش سرد پڑ جاتا ہے۔

ہیم نلنی سے بھی محبت کرتا تھا۔ نلنی بھی ایک حد تک اس کی محبت کی قائل تھی۔ لیکن خود نلنی کو ہیم سے محبت نہ تھی۔ اس لئے وہ اس کی التجائے محبت کے جواب میں چند ہمدردانہ الفاظ کے ساتھ "نہیں" کر دیا کرتی تھی۔ آج بھی سہ پہر کو دونوں میں بات چیت ہوئی تھی۔ نلنی نے ہیم کی درخواست کو "نہیں" کر کے مسترد کر دیا۔ ہیم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر درد بھرے لہجہ میں کہا "نلنی! کیا تم نے ہاں۔ نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ کیا میں طے کر لوں کہ تمہاری "نہیں" کبھی ہاں میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ کیا میں تمہاری طرف سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جاؤں؟"

ہیم کے ان دلدوز الفاظ نے نلنی کو تڑپا دیا لیکن وہ اب بھی اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ اس نے کہا۔ "اچھا نلنی تو میں اب جاتا ہوں۔ اب یہ ہے کہ آئندہ پھر اس بارے میں تم مجھ سے کوئی بات نہ سن سکو گی۔ میرا آخری سلام قبول کرو۔"

یہ کہہ کر ہیم چلا گیا۔ نلنی کے کانوں میں اب بھی اس کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ جب تک ہیم اس کے سامنے موجود تھا، وہ ان لفظوں کی حقیقت پر غور نہ کر سکی۔ لیکن اب اسے بار بار اندیشہ ہو رہا تھا۔ ہیم فرط یاس میں خودکشی نہ کر لے۔ نلنی کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا اور وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے اطلاع ملی ہیم نے خودکشی کر لی۔

نلنی یہ وحشت انگیز خبر سنکر کانپ اٹھی۔ اگر اسے پہلے سے یقین ہوتا کہ ہیم مایوس ہو کر خودکشی کریگا۔ تو جیسے بھی ممکن ہوتا تو وہ اپنے دل کو ہیم سے محبت کرنے کیلئے مجبور کرتی مگر اب تو وقت ہاتھ سے جا چکا تھا۔ نلنی کے اندوہ و غم اور ندامت و پشیمانی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنے کو بار بار سمجھاتی تھی۔ کہ اگر ہیم نے خودکشی کر لی۔ تو اس میں اس کا کیا قصور ہے لیکن اس کا دل کہتا کہ جو بھی ہو لیکن ہیم کی خودکشی کا باعث تو وہی ہے اگر وہ ہیم کی محبت کو اس بیدردی کے ساتھ ٹھکرا نہ دیتی۔ تو وہ خودکشی کیوں کرتا؟

نلنی اپنی رسوائی اور بدنامی کے خیال سے بھی سخت پریشان تھی۔ وہ سوچتی

تھی کہ کل کالج کیسے جائے گی۔ کالج کے بہت سے لڑکوں کو معلوم ہے کہ ہیم اس سے محبت کرتا تھا۔ کالج کے لڑکے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ہیم کو ہمیشہ مایوس کن اور حوصلہ فرسا جواب دیا کرتی تھی۔ پھر کیا اسے دیکھ کر کالج کے دیوار و در اور اینٹ پتھر تک انگشت نمائی نہ کریں گے؟ یہ صحیح ہے کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ کوئی کسی کو محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ نہ کسی سے زبردستی محبت کرائی جا سکتی ہے لیکن دنیا کی زبان کون روک سکتا ہے۔ وہ تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتی ہے۔ اور جا و بیجا رسوا و بدنام کرنے میں انتہائی حظ و سرور محسوس کرتی ہے۔ پھر بھی انہیں ان باتوں کی پرواہ کرنی چاہئے۔ جس طرح ہیم اس سے محبت کرتا تھا اور نوجوان بھی تو اس سے محبت کرتے تھے۔ اگر سب اس طرح خودکشی کرنے پر تیار ہو جاتے۔ تو وہ کیا کرتی؟ ان سب میں سے ایک ہی کی خواہش تو پوری کر سکتی تھی۔ سارا کالج گلے پھاڑ پھاڑ کر چلائے کہ نلنی ہی کے لئے ہیم نے جان دی۔ پھر بھی اس کا قصور ثابت نہیں ہو سکتا۔ قصور بہرحال ہیم کے سر عائد ہوگا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بدنامی اور رسوائی سے تو محفوظ نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک مرتبہ پھر کانپ اٹھی۔

نلنی انہی متضاد خیالات سے پریشان ہو کر گھر سے نکلی تھی جتیندر کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس جائے اور اس سے بات چیت کرے لیکن اسے کام میں مشغول دیکھ کر نلنی کو کمرے کے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن کام ختم کرکے جتیندر نے دوربین اور چارٹ وغیرہ کو ایک طرف رکھنا شروع کیا تو نلنی آہستہ آہستہ اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

جتیندر نے نلنی کے پاؤں کی آہٹ سن کر ادھر نگاہ پھیری۔ تو نلنی کو دروازے کے پاس کھڑا دیکھ کر کہا "اندر تشریف لایئے" نلنی اندر جا کر بیٹھ گئی۔

جتیندر نے کہا "معاف فرمایئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمایئے۔"

اپنے کام کے ساتھ جتیندر کو جو گرویدگی اور دلچسپی تھی۔ اسے دیکھنے سے نلنی کے دل میں اس کی خاص قدر پیدا ہو گئی تھی۔ اب اس کے شریفانہ اور بااخلاق لب و لہجہ نے اس قدر اس میں محبت کا رنگ پیدا کر دیا۔ وہ محبت آمیز لہجے میں بولی "جی نہیں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ گھر بیٹھے بیٹھے کچھ الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ دل بہلانے نکلی تھی۔ کہ آپ کو ریسرچ میں مصروف دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے بھی اس علم سے دلچسپی ہے۔ ایم اے میں میں نے یہی موضوع لیا ہے۔"

"تو آپ کالج میں پڑھتی ہیں؟"

"جی ہاں"

"آپ کا اسم مبارک؟"

"مس نلنی اور آپ کا اسم گرامی؟"

"جتیندر"

"تو کیا جرائد و رسائل میں سائنس کے عنوان سے آپ ہی کے مضامین ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں"

"آپ کے مضامین زیادہ تر زہرہ کے بارے میں ہوتے ہیں!"

"مجھے زہرہ کے پاس ایک اور چھوٹا سیارہ معلوم ہوتا ہے۔ گذشتہ کئی سال سے زہرہ کی رفتار تیز تھی مگر اب اس میں کمی آ رہی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ زہرہ کے آس پاس کوئی چھوٹا سیارہ اور بھی ہے۔ جو اس کی رفتار میں خلل انداز ہوتا رہتا ہے۔ اب تک تو میں شائد اس نئے سیارے کی تلاش میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ مگر ہی تہیدستی اور بے مائیگی کی وجہ سے انسٹرومنٹس نہیں منگا سکا۔ یہ دوربین بھی خریدی ہوئی نہیں ہے۔ بطور عطیہ مل گئی ہے"

"میں بھی کچھ ریسرچ کرنا چاہتی ہوں سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ زحل سب سے بڑا اور پلوٹو سب سے چھوٹا سیارہ ہے لیکن میرا خیال ہے کہ زحل سے بڑے اور پلوٹو سے بھی چھوٹے سیارے موجود ہیں جن کا ہمیں اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔"

اہل علم حسن کی طرف بہت کم مائل رہتا ہے لیکن اگر حسن کے ساتھ علم بھی ہو۔ تو وہ بے اختیار اس کی جانب کھنچ جاتا ہے یہی حال جتیندر کا ہوا نلنی کا حسن تو چنداں جتیندر پر اثر انداز نہ ہوا مگر اس کے علم نے اس کے حسن میں جتیندر کے لئے ایک عظیم کشش پیدا کر دی۔ اب تک جتیندر کا دل کیوپڈ کے تیروں کے لئے ایک آہنی دیوار ثابت ہوا تھا مگر اس وقت ان تیروں نے اس آہنی دیوار کو بھی چھلنی بنا دیا۔

جتیندر نے اپنے نرم لہجے میں مزید نرمی پیدا کرکے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر خصوصاً یہ معلوم کرکے کہ آپ کو علم نجوم سے خاص دلچسپی ہے۔ کمال مسرت ہوئی ہے۔ ریسرچ میں آپ کا اشتراک و تعاون میری خوش قسمتی کا باعث ہوگا۔ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟"

نلنی نے جواب دیا "میں بڑے شوق سے آپ کی رفاقت کے لئے حاضر ہوں مگر مجھے آتا ہی کیا ہے؟"

اس کے بعد بھی کچھ دیر تک جتیندر اور نلنی میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ دوسرے روز آنے کا وعدہ کرکے چلی گئی۔

ابھی نلنی جتیندر کی تجربہ گاہ سے چند ہی قدم آگے بڑھی ہوگی۔ کہ پھر ہیم کا تصور اس کے دماغ پر آ مسلط ہوا۔ ساتھ ہی اپنی بدنامی و رسوائی کا خیال اور کالج کے لڑکے لڑکیوں کے طعن و تشنیع کا خوف بھی اسے پریشان کرنے لگا۔ اس نے سوچا۔ اس معاملے میں اسے جتیندر سے مشورہ کرنا چاہئے تھا۔ وہ یقیناً اسے بے قصور قرار دیتا۔

لیکن اس نے پھر سوچا۔ اس نے جتیندر سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا اچھا ہی کیا۔ وہ آئندہ بھی اس کے متعلق اس سے کچھ نہ کہے گی۔ وہ نہ جانے اس کے بارے میں کیا خیال کرے جو بات اس کی ذلت و رسوائی کا باعث ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی زبان سے اسے کیوں کہتی پھرے ؟ اور وہ بھی کس لئے ؟ اس لئے کہ اسے بیگناہی کا سرٹیفکیٹ حاصل ہو جائے۔ لیکن وہ اس کی فکر بھی کیوں کرتی ہے ؟ دنیا کی زبان کون بند کر سکتا ہے، وہ انہی خیالات میں ڈوبتی تیرتی گھر پہنچی۔ اور منہ لپیٹ کر پلنگ پر پڑ رہی۔

صبح اپنے معمول کے مطابق آفتاب کی زریں شعاعوں اور نغمہ طراز طائروں کی زمزمہ پیرائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی لیکن نلنی کے لئے آج کی صبح میں ہمیشہ کی سی کیف زائی اور دل آرائی نہ تھی۔ اس کے دل و دماغ کو تو کالج میں پیش آنے والے معاملات اور واقعات پریشان کر رہے تھے۔

نلنی سوچنے لگی اگر وہ کالج نہ جائے تو کیا ہرج ہے ؟ نہیں یہ تو اور نامناسب ہوگا۔ اس کی غیر حاضری سے لڑکوں کے خیالات اور خراب ہوں گے۔ وہ کالج جائے گی اور ضرور جائے گی۔ اور وہاں جو حالات بھی پیش آئیں گے۔ ان کا صبر و استقلال سے مقابلہ کرے گی۔ جب اس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا ہے۔ تو اسے ڈرنے کی وجہ کیا ہے ؟ لیکن پھر اس کے خیال میں انقلاب ہوا' وہ سوچنے لگی باعتبار نتیجہ گناہ اور بدنامی میں فرق ہی کیا ہے ؟ بدنامی ہی کے ڈر سے تو آدمی گناہ سے بچتا ہے۔

نلنی کالج گئی لیکن اس روز پڑھائی نہیں ہوئی۔ ہیم کی تعزیت میں جلسہ کرنے کے بعد ایک روز کے لئے کالج بند کر دیا گیا۔ مگر اتنی ہی دیر میں لڑکوں کی سرگوشیاں اور انگشت نمائیوں سے نلنی کی جان پر بن آئی۔ تمام لڑکے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے "آخر یہ نلنی ہے کون ؟ ایک لڑکا تو خود بخود نلنی ہی سے یہ سوال کر بیٹھا جس کے جواب میں نلنی کو آنسو بہاتے ہوئے کہنا پڑا۔ کہ میں ہی وہ بد نصیب ہوں۔

اس لڑکے کا نام سرتیش تھا۔ اس نے نہایت شریف دل اور سنجیدہ دماغ پایا تھا۔ وہ سماجی پیچیدگیوں کو سماجی عینک سے دیکھنے کا عادی نہ تھا۔ ہیم کی موت کے بارے میں اس کے خیالات کالج کے عام لڑکوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس کے نزدیک نلنی بالکل بےقصور تھی۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ اس نے نلنی سے یہ سوال کر کے اس کے دل کو اتنا صدمہ کیوں پہنچایا۔ نلنی کے آنسو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں۔ اس نے کہا آپ بالکل بےقصور ہیں۔ آپ کو اس طرح رنج کرنے اور آنسو بہانے کی کوئی وجہ نہیں ہے جو لوگ آپ کے خلاف انگشت نمائی اور طعن و تشنیع کر رہے ہیں وہ بھی آپ کو بےقصور سمجھتے ہیں لیکن ایسے مواقع سے لوگ عموماً ناجائز دلچسپی لیا کرتے ہیں۔ وہی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ آپ کو ان کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ یہ خود ہی خاموش ہو جائیں گے۔

سرتیش کی ہمدردانہ باتوں سے نلنی کے مضطرب اور پریشان دل کو بہت تقویت پہنچی۔ سرتیش کے بیجا سوال سے نلنی کو جو صدمہ پہنچا تھا۔ اس کا سرتیش پر بھی اتنا اثر تھا۔ کہ وہ اس کی تلافی کے لئے کالج سے نلنی کے ساتھ ساتھ اس کے گھر تک گیا۔ اور برابر اسے تسکین اور دلاسا دیتا رہا۔ نلنی بھی اس کی شرافت اور نیک طینتی سے اس قدر متاثر ہوئی کہ میرا تو خیال ہے اگر وہ اپنا دل جتیندر کو نہ دے چکی ہوتی۔ تو بڑی خوشی سے سرتیش پر نچھاور کر دیتی۔

نلنی برابر کالج جاتی رہی۔ کچھ دنوں تک تو کالج کا ماحول اس کے لئے اذیت ناک بنا رہا لیکن جیسے جیسے دن گذرتے گئے۔ لوگ ہیم کو بھولتے گئے۔ رفتہ رفتہ لوگ نلنی پر فقرے کسنے بھی بھول گئے لیکن نلنی کے دل کی خلش اب بھی دور نہ ہوئی۔ کوئی لڑکا اس کی جانب دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا وہ اس کے سوانح حیات کے پچھلے صفحات الٹ رہا ہے۔ اس وقت نلنی کے دل کے مندمل زخم از سر نو ہرے ہو جاتے۔

ایسے تمام مواقع پر سرتیش نلنی کے زخمی دل پر ہمدردی و غمخواری کا مرہم رکھتا اسے تسکین و تسلی دیتا۔ وہ کالج سے نلنی کے ساتھ ہی گھر آتا۔ نلنی بھی کبھی کبھی اس کے گھر چلی جاتی۔

نلنی سرتیش کو اپنا سچا ہمدرد و غمخوار سمجھتی تھی لیکن وہ اسے اس سے زیادہ سمجھنے پر تیار نہ تھی لیکن سرتیش اسے کچھ اور ہی سمجھتا تھا۔ اور کسی دوسری ہی نظر سے دیکھتا تھا۔ نلنی سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی۔ لیکن وہ جتیندر کو دل دینے کے بعد کسی اور کو اپنے دل میں جگہ دینے پر تیار نہ تھی۔ وہ جتیندر کے ساتھ ہی ریسرچ کر رہی تھی۔ اس لئے اس کے ساتھ اس کے تعلقات بھی بہت وسیع ہو گئے تھے۔

نلنی جتیندر سے دوسرے روز ملنے کا وعدہ کر آئی تھی لیکن ہیم کی خودکشی کے حادثے کا اس کے دل پر اتنا اثر تھا۔ کہ وہ جتیندر سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہوئے بھی اس سے ملنے کے لئے نہ جا سکی۔ وہ تیسرے روز جتیندر کے ہاں گئی اور اس کے ساتھ گھنٹوں فلکیات پر بحث و گفتگو اور تبادلۂ خیالات کرتی رہی۔ چوتھے روز سے دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ریسرچ کا کام شروع کر د

نلنی نے کچھ نئے " انسٹرومنٹس " کے لئے بھی آرڈر دیدیئے جن کو اب تک جتیندر اپنی بےمائیگی کے باعث منگا نہیں سکا تھا۔

جیسے جیسے نلنی اور جتیندر کا مطالعہ آگے بڑھتا جاتا تھا۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ وہ آسمانی دنیا کے ساتھ ساتھ شاید ایک دوسرے کے دل کا بھی مطالعہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز دونوں نے ایک پر زور بوسے کے ساتھ باہمی محبت کی مہر ثبت کر دی۔ ان کو یقین تھا کہ وہ ہفتے دو ہفتے تک ازدواجی تعلق کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس روز فضا ابر آلود ہو رہی تھی۔ اس لئے نلنی اور جتیندر ریسرچ کا کام

بالکل ذکر نہ کیا اس روز دونوں کا سارا وقت پیار محبت کی باتوں میں ہی گزر گیا ۔

جتیندر نے نلنی سے کہا "اب ہم دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہئے ۔"

نلنی نے شرمائی ہوئی آواز میں "ہاں" کہا اور فورحیا سے جتیندر کی جانب نگاہ پھیر کر کمرے کی دیوار کی طرف دیکھنے لگی ۔

جتیندر نے پوچھا "کب"

نلنی نے جواب دیا "آپ جب کہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ جب تک اپنے مجوزہ سیارے کی تلاش میں مشغول ہیں ہمیں صبر سے کام لینا چاہئے ۔ آپ کی کامیابی کا دن ہمارے لئے یوم شادی ہونا چاہئے ۔" اور مجھے امید ہے کہ ہفتے دو ہفتے کے اندر آپ اس سیارے کی تلاش میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ آپ نے زہرہ کی رفتار کا جو اندازہ قائم کیا ہے ۔ وہ مجھے بالکل درست معلوم ہوتا ہے ۔"

جتیندر نے کہا "اچھی بات ہے ۔ اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں مجھے تین مہینے کے لئے یورپ جانا پڑے گا ۔ اس کے لئے تمہیں خرچ کا بھی انتظام کرنا ہوگا ۔"

نلنی بولی "میں خوشی سے خرچ کا انتظام کر دوں گی ۔"

جتیندر نے کہا "اور ہاں نلنی ، مجھے امید ہے کہ اس درمیان میں تم مجھ کو بھول نہ جاؤ گی ۔"

نلنی جتیندر سے اس قدر محبت کرتی تھی ۔ کہ اس کے آخری الفاظ سنکر نلنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اس نے کہا "جتیندر ، میں اور تمہیں بھول جاؤں ، تم تین مہینے کو کہتے ہو میں زندگی بھر تمہارا انتظار کر سکتی ہوں ۔"

اس کے بعد دونوں نے ہم آغوش ہو کر اس عہد پر بوسوں کی مہر ثبت کر دی ۔ نلنی اور جتیندر کی محبت سے دونوں کے والدین واقف تھے ۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں کو بھی علم ہو چکا تھا لیکن سریش کو اس کی بالکل خبر نہ تھی اور نلنی چاہتی بھی نہ تھی کہ جتیندر اور اس کی محبت کا سریش کو علم ہو ۔ عورت کے دل کو عورت کے سوا کون سمجھ سکتا ہے ؟

سریش جس مقصد سے نلنی کے ہاں آتا تھا ۔ وہ نلنی سے پوشیدہ نہ تھا ۔ اسے سریش سے محبت نہ تھی اس لئے وہ چاہتی کہ سریش کو اپنے ہاں آنے سے منع کر دے لیکن اس کی ہمدردیوں اور غمخواریوں کا احساس نلنی کی زبان کا قفل بن جاتا ۔

جتیندر کے باہر چلے جانے کے بعد سریش نلنی کے ہاں آتا تو بارہ بارہ بجے رات تک اسی کے ہاں بیٹھا رہ جاتا ۔ اس نے ابھی تک اپنی آنکھوں ہی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اب وہ زبان سے بھی اظہار حال کر دینا چاہتا تھا ۔ اور اس کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں تھا ۔

ایک روز شام کو سریش آیا ۔ اور نلنی کو ٹہلنے کے لئے اپنے ساتھ لے گیا ۔ نلنی جانا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ انکار بھی نہ کر سکی ۔ اور بادل ناخواستہ سریش کے ساتھ ہولی ۔ آج سریش یہ طے کر کے کہ نلنی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ وہ اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے گا ۔

جب رات کی سیاہ چادر نے دنیا کی ہر چیز کے ساتھ نلنی اور سریش کو بھی ڈھک لیا ۔ تو سریش نے نلنی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "نلنی !"

اتنا کہنے کے بعد جیسے سریش کے لبوں پر مہر لگ گئی لیکن اسی ایک لفظ نے اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیا ۔ اور اسی جوش و ہیجان کی حالت میں اس نے نلنی کا منہ چوم لیا ۔

نلنی اس کے لئے بالکل تیار نہ تھی ۔ اس نے چاہا سریش سے صاف کہہ دے کہ آئندہ اسے ہرگز ایسی جسارت نہ کرنی چاہئے لیکن اس کا دل حد سے زیادہ کمزور تھا ۔ اس کے علاوہ سریش کی گذشتہ ہمدردیوں کا احساس بھی اس کے ہونٹوں پر قفل لگائے دے رہا تھا ۔ اس نے اپنی تمام طاقتوں کو فراہم کر کے کہا "سریش !" اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی ۔

تاریکی کے باعث سریش نلنی کے چہرے کے ناگوار اثرات کو تو دیکھ نہیں سکتا تھا ۔ اس لئے اس نے نلنی کے کہنے کا مطلب برعکس سمجھا ۔ اس نے کہا "تم نہیں جانتی نلنی کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں ۔ کیا تم میری محبت کی پیشکش کو قبول نہ کرو گی نلنی ۔"

نلنی نے سریش کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا "اب بہت اندھیرا ہو گیا ۔ سریش اب چلو گھر چلیں ۔"

سریش بولا "تم میری بات کا جواب دے دو تو چلیں ۔"

نلنی چاہتی تھی کہ صاف صاف کہہ دے کہ میں جتیندر کو دل دے چکی ہوں اس کے سوا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتی میں تم سے معافی چاہتی ہوں لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا ۔ وہ ابھی اپنی ہمت ہی فراہم کر رہی تھی ۔

سریش نے کہا "جواب دو نلنی ۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں ۔"

نلنی میں نہ جانے کیسے ہمت پیدا ہو گئی ۔ اس نے دبی زبان سے کہا ۔

"نہیں ۔"

سریش نفسیات کا ماہر تھا ۔ نلنی کے مزاج اور اس کے طور طریق کے متعلق اس کا جو مطالعہ تھا اس کی بنا پر اسے یقین تھا کہ نلنی اس سے محبت کرتی ہے اس نے اپنے رازدار دوستوں سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ نلنی چند روز کے اندر اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائے گی ۔ اس کے وہم میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ نلنی اس کی التجائے محبت کے جواب میں "نہیں" کہہ دے گی ۔

سرلیش نے گلوگیر آواز میں کہا "نلنی میری آرزوؤں کو اس طرح خاک میں نہ ملاؤ۔ میری تمناؤں کو اس بیدردی سے پامال نہ کرو میں تمہیں دل وجان سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر تمہارا انکار اقرار میں تبدیل نہ ہوا۔ تو جو انجام ہیم کا ہوا۔ وہی میرا بھی ہوگا"

ہیم کا نام سنتے ہی نلنی کانپ اٹھی۔ اسے ہیم کی خودکشی کا واقعہ یاد آگیا! اور اس واقعہ کے باعث اس کی جو بدنامی و رسوائی ہوئی تھی۔ اس کا نقشہ بھی اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ کہ اگر پھر انہیں حالات کا اعادہ ہوا۔ تو کتنی مصیبتوں کا سامنا ہوگا۔ وہ فکر و تشویش کے دریا میں غوطے کھانے لگی۔

سرلیش نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "نلنی تمہیں ابھی نہیں کہاں سے بدلنا ہوگا میری محبت تمہارے انکار کو اقرار میں تبدیل کر کے رہے گی۔ اگر تم نے میری التجائے محبت کو قبول نہ کیا۔ تو تم کل ہی سن لوگی۔ کہ ہیم کی طرح سرلیش نے بھی خودکشی کر لی۔

نلنی پر سر سے پاؤں تک لرزہ طاری تھا۔ گو ہیم نے خود اپنے کو ہلاک کیا تھا اس کی موت میں نلنی کا ہاتھ شامل نہ تھا۔ پھر بھی ہیم کی خودکشی کو اس کی ذات سے ایک طرح کا تعلق تھا۔ اس تعلق کی بنا پر نلنی بھی ایک حد تک اپنے سر اس کی موت کا بار محسوس کرتی تھی۔ آج پھر اس کے سامنے بالکل وہی صورت موجود تھی۔ اگر لوگوں کو پتہ چل گیا۔ کہ ہیم کی طرح سرلیش نے بھی نلنی کے باعث جان دی تو لوگ اسے کیا کہیں گے۔ اور کالج کی تو ایک ایک اینٹ اس پر لعنت بھیجنے کے لئے زبان بن جائے گی کالج کے رنگ کے طعن و تشنیع کے تیروں سے اس کا کلیجہ چھلنی کر دیں گے لیکن وہ کرے تو کیا کرے۔ کیا جتیندر سے بدعہدی اور بے وفائی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے سرلیش خود ہیم کے اقدام خودکشی کو بے جا اور ناجائز قرار دے چکا تھا لیکن آج وہ خود اسی غلط اور بیجا اقدام کے لئے تیار تھا۔ اگر اس وقت زمین شق ہو کر نلنی کو اپنی پناہ میں لینا چاہتی تو وہ خوشی سے اس کی پناہ قبول کر لیتی۔

نلنی نے کہا۔ سرلیش میں سچ کہتی ہوں میں تم سے محبت کرنے سے مجبور ہوں میرا دل دوسرے کا ہو چکا ہے لیکن میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں تم خودکشی نہ کرنا۔ ورنہ میں کہیں کی نہ رہ جاؤں گی۔ تم میرے دل کے سوا جو کچھ بھی مانگو میں دینے کو تیار ہوں۔

سرلیش خاموش تھا۔ وہ نفسیات کا ماہر تھا۔ وہ نلنی کی کمزوری کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا اس نے کہا "تمہارے جو جی میں آئے کرو نلنی میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا لیکن اتنا سمجھ لو کہ تمہارے بغیر میری زندگی ناممکن ہے میرا تو خیال تھا تم مجھ سے محبت کرتی ہو مجھ یہ ہی کیا موقوف ہے میرے دوستوں تک کو یقین تھا۔ کہ ہم جلد ہی باقاعدہ ایک دوسرے کے شریک زندگی بن جائیں گے لیکن آج تم صاف انکار کر رہی ہو تو میں بھی صاف کہے دیتا ہوں کہ میں بھی زندہ نہ رہوں گا۔ خیر جب تمہیں میری پروا ہی نہیں تو تم کو اس سے کیا کہ میں زندہ رہوں گا یا نہیں۔ اب تم خوشی سے اپنے گھر جا سکتی ہو"

نلنی روپڑی اس نے کہا "میں ابھی چلی جاتی ہوں لیکن تم وعدہ کرو کہ خودکشی نہ کرو گے"

سرلیش بولا "میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ آدمی وعدہ تو اس کے ساتھ کرتا ہے جو اس کا لحاظ رکھتا ہو۔ میں نہیں سمجھتا تھا نلنی کہ تم میرے ساتھ اس بے رحمی اور سنگدلی سے پیش آؤ گی"

نلنی کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ سرلیش خودکشی کئے بغیر نہ رہے گا۔ اس کا ایک ایک عضو پیپل کے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ایک نوجوان کی جان جا چکی تھی۔ دوسرے کی باری تھی لیکن اسے جتیندر کا خیال آگیا اس نے کہا "سرلیش مجھے معاف کرو"

سرلیش بولا "اب مجھ سے تم کو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ پھر معافی کے کیا معنی"

"میں مجبور ہوں سرلیش اس لئے دیکھو خودکشی کے ارادے سے باز آجاؤ"

"تم چلی جاؤ میں کچھ سننا نہیں چاہتا"

"نہیں سرلیش میں یوں نہ جاؤں گی۔ تم عہد کرو کہ خودکشی نہ کرو گے"

"میں تو ایک عہد کر چکا ہوں نلنی جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی"

یہ کہکر اس نے تیزی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول نکال کر بولا "میں اسی پستول سے ابھی اپنے سینے میں گولی مار لوں گا"

سرلیش نے نلنی کی کمزوری کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ اور اسی لئے وہ اس طرح دھمکی دے رہا تھا اس نے پستول کی نالی اپنے سینے کی طرف کر کے کہا "یہ دیکھو یہ چلی" بولی "دھمکی بھی کامیاب ہوئی نلنی نے جھپٹ کر پستول پکڑ لیا اور خوفزدہ لہجہ میں کہا "سرلیش۔ الیتور کے لئے [illegible] میں وعدہ کرتی ہوں۔ کہ تم سے محبت کروں گی"

نلنی نے کس طرح اپنے کلیجہ پر پتھر رکھا اور اپنے دل کا خون کر کے یہ الفاظ کہے۔ اسے نلنی کے سوا کون جان سکتا ہے۔ سرلیش نے پستول جیب میں رکھ لی۔

نلنی کی شادی سرلیش کے ساتھ ہو گئی جتیندر نے یورپ جا کر اپنی تحقیقات مکمل کر لی۔ وہ جس ستارے کی تلاش میں تھا اس کا پتہ چل گیا۔ اب اسے اپنی تحقیقات و مشاہدات کو صرف کتابی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا باقی تھا۔ وہ خوش تھا کہ ہندوستان پہنچتے ہی نلنی کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے گی۔ وہ اپنے دل میں ائندہ ازدواجی زندگی کی مسرتوں کا ایک طوفان لئے ہوئے ہندوستان واپس آیا لیکن یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ نلنی نے سرلیش کے ساتھ شادی کر لی۔ تو اس کے سرور و شادمانی اور شوق و تمنا کے خرمن پر بجلی سی گر پڑی۔

وہ نلنی سے ملا نلنی نے اسے تمام حالات سمجھائے اور اس کے قدموں پر سر رکھکر روتے ہوئے کہا "جتیندر میں نے تم سے بدعہدی کی تم مجھکو معاف کر دو"

جتندر اپنے سینے میں فراخ اور شریف دل رکھتا تھا۔ اس نے نلنی کی دلدہی کرتے ہوئے کہا۔ نلنی تم نے بدعہدی کہاں کی؟ تم نے تو کہا تھا کہ میں زہرہ کے ماتحت ستارے کی تلاش کر لوں گا۔ اس وقت میری تمہاری شادی ہوگی لیکن اس ستارے کی تلاش میں مجھے کامیابی کہاں ہوئی۔ یہاں تو میرا خیال تھا کہ زہرہ کے ساتھ اس کا ایک ماتحت سیارہ بھی ہے لیکن لندن کی آبزرویٹری کے ذریعہ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ زہرہ تنہا ہی ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی اور سیارہ نہیں ہے۔

جتندر کا قلب کتنا وسیع اور اس کا حوصلہ کتنا بلند تھا۔ وہ نلنی سے سچی اور بے لوث محبت کرتا تھا۔ اس لئے محض اس نے نلنی کی خاطر اپنی اس قدر عظیم الشان تحقیقات پر ہمیشہ کے لئے پردہ ڈال دیا۔ اس کی تحقیقات کبھی کتابی صورت میں دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ اور دنیا ایک روشن حقیقت سے ہمیشہ کے لئے نابلد رہ گئی۔

نذرِ صائب

از
تلوک چند محروم

(۱)

بیزار رنج و راحتِ دنیا سے دل ہوا | حیراں تھا میں کہ اس کا کروں اب علاج کیا
دیکھا مجھے اُداس تو صائب نے یوں کہا | روشن گہر کسے است کہ ہر خوب و زشت را
برخویشتن چو آئنہ ہموار کردہ است

(۲)

کس طرح دنیائے فانی میں رکھوں میں تجھکو شاد | جا کے جو واپس نہ لوٹے آہ اے دل انکی یاد
ہر گھڑی آمادۂ رحلت ہے جانِ نامراد | روح را داغ عزیزاں نعل در آتش نہاد
ورنہ تا صد سال آہنگ سفر از تن نداشت

(۳)

ہر اک بہار کو ہے خدشۂ خزاں در پیش | ہر ایک نوش میں پوشیدہ ہے جراحتِ نیش
نہ رنگ و بو کی ہوس میں ہو خستہ و دلریش | دو ہفتہ گرمئے ہنگامہ اش نہ باشد بیش
علاقہ ہر کہ چو بلبل بہ رنگ و بو دارد

شہنشاہ ہمایوں

از

(مس، س۔ ف حسین

تاریخ عالم میں ہندوستان کے چھ مغل بادشاہوں کی مثال ایسی ہے جس کی نظیر کسی اور ملک یا زمانے میں نہیں ملتی۔ بابر سے لیکر اورنگ زیب تک جتنے بادشاہ گذرے ہیں سب ایسی شخصیتوں کے مالک تھے کہ اگر ساری دنیا کے بادشاہوں کی صف آرائی کی جائے تو یہ سب یقیناً پہلی صف میں جگہ پائیں گے۔ یورپ کے مورخ جو ہر بادشاہ کی شخصیت کا اندازہ اسکی زندگی کی کامیابی یا ناکامیابی سے لگاتے ہیں ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے کیریکٹر اکثر غلط سمجھتے ہیں اور ہمارے سامنے بھی وہی غلط زاویہ نگاہ پیش کرتے ہیں۔ اور چونکہ اس وقت یورپین مورخوں کی تاریخ ہی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی تاریخ کے متعلق اکثر غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ہمایوں بادشاہ بھی ان بادشاہوں میں ہے جن کے ساتھ مورخوں نے بے انصافی سے کام لیا ہے۔ اور میں اس کے کیریکٹر کے متعلق غلط فہمیوں پر ڈال رکھے ہیں نے ہمایوں کے کیریکٹر کو دور کر کے لیکر اسے حقیقی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے

۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو بابر نے دنیا کو خیرباد کہا اور ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کے ہاتھ میں چھوڑ گیا۔ اس طوفانی فضا میں جبکہ مغلوں کی کشتی افغانوں اور راجپوتوں کے تھپیڑوں سے ڈگمگا رہی تھی۔ ایک ایسے ناخدا کی ضرورت تھی جو اسے ساحل پر لگا سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمایوں اس فرض کو احسن طریق پورا نہ کر سکا اور اس کی ناخدائی میں کشتی پانی سے بھر گئی۔ خاندان مغلیہ کی کچی عمارت جو بابر نے کھڑی کی تھی۔ ہمایوں کے زمانے میں گر پڑی اور اس کی بنیادوں پر شیر شاہ نے افغانی عمارت قائم کر دی۔ اور پورے پندرہ برس تک ہمایوں ہندوستان واپس نہ آسکا۔

یورپین مورخوں کا خیال ہے کہ ہمایوں کا کیریکٹر اس کی حکومت کے واقعات سے معلوم ہو جاتا ہے لیکن یہ فیصلہ بے انصافی اور تنگ نظری پر مبنی ہے کیونکہ ہمایوں کی سلطنت کے واقعات یعنی شیر شاہ کے ہاتھوں اس کی شکست اور اس کی جلاوطنی اس کے کیریکٹر کی عظمت کو واضح نہیں کرتے۔ بلکہ محض اس کی کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اس لئے ہمایوں کے کیریکٹر کو جانچنے کے لئے پہلے اس کے ماحول کا جائزہ لینا چاہئے۔ اور ان مشکلات اور تکالیف کا اندازہ لگانا چاہئے جن کا اسے سامنا کرنا پڑا۔

ہمایوں کا زمانہ ایک انقلابی زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ مغل، افغان اور راجپوت تین طاقتور قومیں ہندوستان کی بادشاہت کے لئے دست و گریبان تھیں۔ ایسے وقت میں صرف وہی بادشاہ کامیاب ہو سکتا تھا جو اپنے قوی بازو سے ہر مخالفت کو کچل ڈالتا۔ اور جو اپنی چیرہ دستی سے دشمنوں کے دلوں پر خوف اور رعب طاری کر دیتا۔ مگر ہمایوں کی زندگی اور اس کی سیرت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں میں جہاں اور سب کچھ تھا۔ وہاں یہ فولادی بازو نہ تھا اور اس لئے اس شور و شر کے ماحول میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہمایوں ایک ایسا بادشاہ گذرا ہے جس کی ذات میں دو مختلف شخصیتیں نمایاں ہیں۔ ایک شخصیت بحیثیت بادشاہ کے اور دوسری شخصیت بحیثیت انسان کے۔ اور ان دو شخصیتوں میں اتنا فرق تھا کہ ہمایوں بادشاہ ہمایوں انسان سے بالکل مختلف معلوم ہوتا تھا۔ ایک انسان کی حیثیت سے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے شرافت اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جان جائے پر آن نہ جائے۔ نظام الدین احمد مورخ کہتا ہے۔ اس کی ملکوتی سیرت ہر دل عزیز خصلت سے مزین تھی۔ دلیری اور علم داری کے اعتبار سے وہ اپنے ہمعصر شہزادوں سے بہت آگے تھا۔" ایک مورخ فرشتہ لکھتا ہے "اس کی طبیعت کی نرمی اور نیکی حد سے گزر گئی تھی وہ ایک بہادر سپاہی تھا اور خوش اخلاق دوست تھا۔ بہ اعتبار اخلاق اپنے باپ سے کم نہ تھا۔ کیس دربار داری اور سخاوت میں اس سے بڑھ کر تھا۔ وہ دیندار اور خدا ترس تھا۔ خدا کے بندوں کا طالب تھا اور ساتھ ہی خوش طبع اور نہایت رحمدل تھا۔ اپنے ناشکر گزار سنگدل بھائی کامران کو اس نے بار بار معاف کیا۔ اور بار بار اس نے ہمایوں کے خلاف بغاوت کی جب امیروں اور وزیروں نے صاف صاف کہدیا کہ اگر کامران کو زندہ چھوڑا گیا تو ہم بادشاہ کا ساتھ نہ دیں گے۔ اس وقت ہمایوں اسے اندھا کرنے پر راضی ہوا۔ ایک انسان کی حیثیت سے ہمایوں کو کسی زاویہ نگاہ سے دیکھئے وہ ایک عظیم الشان ہستی معلوم ہوتا ہے وہ ایک فرمانبردار بیٹا، مشفق باپ، چاہنے والا شوہر اور وفادار دوست تھا۔ ان محاسن کے علاوہ اس میں اور بھی خوبیاں تھیں۔ وہ ایک ذی شان بادشاہ، بلند پایہ شاعر، نجوم، حساب، ہندسہ اور جغرافیہ کا ماہر تھا۔ اس کی خوش خلقی اور ملنسار طبیعت نے اسے ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ بایزید اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ "اس کے آنے سے ہمارے دل گلاب کی کلیوں کی طرح شگفتہ ہوگئے اور ہماری آنکھیں مشعلوں کی طرح روشن ہوگئیں۔"

ہمایوں کے دل و دماغ کی خوبیاں ہمارے سامنے ایک زریں تصویر پیش کرتی ہیں لیکن اس کی صفات کی یہ رنگا رنگی محض سراب نظر آن کر رہ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے عظیم الشان سلطان کے کیریکٹر میں ایک عیب ایسا تھا جس نے اس کے تمام محاسن پر پانی پھیر دیا۔ ہمایوں کی سب سے بڑی کمزوری عیش پسندی تھی۔ اس کی ایک کمزوری نے اس کی تمام زندگی پر اتنا اثر کیا جتنا اس کی تمام خوبیاں نہ کر سکیں۔ ایک بادشاہ کی حیثیت سے یہ اس قدر بڑا نقص تھا کہ ہمایوں کو اس کی شکستوں کے لئے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر

فتح حاصل کرنے کے بعد وہ افیم کھا کر حرم کی رنگین فضا میں کھو جاتا تھا۔ اور قیمتی ساعتوں کو خوشنما خوابوں میں بدل دیتا تھا۔ ہمایوں کے کیرکٹر کا اگر بحیثیت ایک بادشاہ کے تجزیہ کیا جائے۔ تو اس میں بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی خامیاں نکلیں گی۔ جو ایک معمولی انسان میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن قدرت نے اسے بادشاہ بنایا تھا۔ اور اس کے کندھوں پر سلطنت کا بوجھ اور ذمہ داری ڈالدی تھی۔ اس لئے اس کی چھوٹی چھوٹی خامیاں بڑے بڑے عیب بن گئیں اس کی لاابالیانہ بے پرواطبیعت اس کی مصیبتوں کا باعث بن گئی۔ غالباً وہ ضرورت سے زیادہ نیک فیاض سخی اور مہربان تھا۔ یہ خوبیاں ایک انسان میں جتنی ہوں کم ہیں لیکن ایک بادشاہ میں جب حد سے گذر جائیں۔ تو خامیاں بن جاتی ہیں۔ اگر وہ ہندوستان کا تاج اپنے سر پر رکھنا چاہتا تھا۔ تو اسے کامران کو معاف نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اور شیر شاہ کو وعدہ شکنی کی سزا دینی چاہئے تھی۔ لیکن ہمایوں اپنے دشمنوں کو ہمیشہ اپنی طرح سچا اور قول کا پکا سمجھتا رہا۔ اگر آجکل موجودہ زمانے میں پارلیمنٹ کی مدد سے ہمایوں بادشاہت کرتا۔ تو شاید اس سے بہتر کوئی بادشاہ نہ ہوتا۔ غالباً وہ اپنے وقت سے پہلے آیا تھا۔ قرون وسطیٰ میں ایک سخت گیر جفاکش اور حیلہ گر بادشاہ ہی کامیاب ہو سکتا تھا۔ اور چونکہ ہمایوں میں یہ سب باتیں نہ تھیں۔ اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

لیکن ہمایوں کے کیرکٹر کو ہی اس کی تمام مصائب و آلام کا ذمہ دار نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس سے انکار نہیں کہ بڑی حد تک اس کا کیرکٹر اس کی تکالیف کا باعث ہوا لیکن اگر قسمت اس کا ساتھ دیتی۔ تو شاید وہ سنبھل سکتا۔ لفظ "ہمایوں" کے معنی ہیں خوش قسمت لیکن اس بدقسمت بادشاہ کا لقب صرف قدرت کی ستم ظریفی ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ وہ افیم کھا کر کچھ وقت کے لئے اپنے غموں کو بھول جاتا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اسے کبھی چین نصیب نہ ہوا۔ وہ گر گر کر سنبھلا۔ مگر پھر سنبھل سنبھل کر گرا۔ گرنا اس کی زندگی کا سب سے اہم فعل تھا۔ اور جب بھی گرنے کا موقعہ ملا ہمایوں گرے بغیر نہ رہا۔ یہانتک کہ اس نے جان بھی گر ہی کر دی۔

غزل

از

افسوں بھوپالی

ترے صدقے تری جبتک پشیمانی نہیں جاتی / مری وارفتگی و شوق سامانی نہیں جاتی

وہ جلوے جن کو دنیا نے نہیں دیکھا نہیں سمجھا / مری نظروں سے ان جلووں کی تابانی نہیں جاتی

کبھی لب پہ نہیں لاتا فسانہ بے نیازی کا / نہیں جاتی مگر ان کی پشیمانی نہیں جاتی

یہ بحر غم ہے اس میں تہ نشیں رہنا ہی بہتر ہے / جہاں ابھرو ذرا پھر اس کی طغیانی نہیں جاتی

خود اپنی گمرہی کا ہو نہ ہو احساس واعظ کو / مگر سرگرمیٔ تبلیغ عرفانی نہیں جاتی

کئے جاتا ہوں برپا کیسے کیسے روز ہنگامے / کسی صورت مگر اس دل کی ویرانی نہیں جاتی

وہیں پہ چھا رہا ہوں میں باایں حالت باایں ہیئت / جہاں کوئی دلیل عاشقی مانی نہیں جاتی

یہ راہ شوق ہے افسوںؔ گذر جا بے نیازی سے
یہاں کی بیکسی بھی بیکسی مانی نہیں جاتی

ذہنی تربیت

از
پروفیسر عبیداللہ قدسی۔ ایم اے۔

میں اپنے کچھ خیالات آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو انسانی حیثیت سے
ہر دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ ان کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ کبھی تو ان
کو مذہب سوسائٹی اور سماج کی بندشوں کے خوف کی وجہ سے بیان نہیں کرتے ہیں۔
اور کبھی اپنے خیالات پر قدرت نہیں ہوتی۔ اور کبھی اخلاقی کمزوری مانع آتی ہے۔ بہرکیف
آزادی تحریر و تقریر ہم میں سے سلب ہو چکی ہے۔ اور اکثر مصلحت اور ضرورت کا
نام لیکر نقلی خیالات کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر خالص سمجھے اور سمجھانے
اور مسائل کو سلجھانے کے لئے علم و ادب افراد اور سوسائٹی سے متعلق تمام شکوک
اور خیالات صفحۂ قرطاس پر رکھ دیئے جایا کریں۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے لیکن
جہاں ہر شخص اپنے خیالات کو دوسرے سے زبردستی منوانا چاہتا ہے۔ وہاں ہر
شخص خیالات میں عام اصولوں کا بوجھ دل پر رکھ دینا بھی ضروری سمجھتا ہے۔
آیئے چند باتوں کی نسبت ہم ماحول سے بے فکر ہو کر سوچیں اور ذرا چھان بین اور
جائزے سے کام لیں۔ کہ آیا ہم اس طرح زندگی گذارنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ دنیا
انقلاب چاہتی ہے۔ اور یقیناً انقلاب سے ترقی ہوتی ہے۔ خواہ مغرب ہو یا مشرق تمام
پرانے اصولوں میں تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔ لیکن جہانتک عمل کا تعلق ہے۔ انسان پرانی
بات چھوڑنے اور نئے خیالات پر عمل کرنے میں گھبراتا ہے بہت کم مخلوق نڈر اور بے خطر
ہو کر مصائب کا مقابلہ کرنے اور اپنی حیات کو خطرے میں پھنسا کر نئی شاہراہ تلاش کرنے
کے لئے تیار ہوتی ہے خصوصاً ہندوستانی ماحول نئے اثر سے بہت کم متاثر ہوتا ہے اور
یہی وجہ ہے کہ آپ آسمان پر جب ہوائی جہاز اڑتا ہوا دیکھتے ہیں۔ جو چند لمحوں میں اپنی
گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ کوسوں نکل جاتا ہے۔ اسی وقت سڑک پر پگڑی باندھے
ہوئے ہاتھ میں ٹیڑھی لکڑی لئے ہوئے ایک گاڑی بان کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو سڑک
پر اونگھتے ہوئے گاڑی گھسیٹتا چلا جا رہا ہے۔ اور بیلوں کی دم مروڑتے ہوئے دو پہیوں
کی سیدھی سپاٹ گاڑی ہانکے جا رہا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اور شاید چار پانچ ہزار
سال کا آدمی زندہ ہو کر ہمارے گاؤں میں چلا آئے۔ تو وہ قطعاً کوئی بیگانگی اور جدت
محسوس نہیں کریگا۔ یہ دو پہیوں کی گاڑی ہی ہماری قدامت پسندی کا بہترین نمونہ ہے
ہم اسی طرح اپنے تمام حالات و واقعات میں قدیم ترین تہذیب کے پیرو ہیں۔
مہاتما گاندھی اسی پراچین تہذیب کی طرف ہمیں لے جا رہے ہیں۔ اور ان کے
جھنڈے کے نیچے اکثریت کا جمع ہو جانا قدامت پسندی کی بہترین دلیل ہے۔ اس
خیال کے اظہار تک یقیناً نہایت خوشی سے ناظرین میرے ہمنوا ہونگے لیکن میں مردوں کے
صبر کا جائزہ لینے کے لئے ایک اور اہم خیال آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے
جبر کرنے کے بجائے احتساب نفس کی طرف توجہ فرمایئے گا۔
ابھی تک مذہب اخلاق کے نام پر عورت کے ساتھ جو ستم روا رکھا گیا ہے وہ
ہماری انسانیت پر بدنما داغ ہے۔ اور کسی نہ کسی زمانے میں ہماری تنگ نظری پر بھی طرح
گفتگو ہوگی ـــــ ہم میں سے اکثر تعلیم یافتہ نسوں کے حامی ہیں۔ عورتوں کو بھی انسان ہی
سمجھتے ہیں۔ اور لڑکی لڑکے کو ایک ہی ماں باپ کی برابر کی اولاد خیال کرتے ہیں۔ دونوں
کی مساوات کے بھی قائل ہیں لیکن عملی طور پر عورتوں کے ساتھ جو ظلم روا رکھا جاتا ہے
کیا آپ کہہ سکتے ہیں مساوات اسی کا نام ہے؟
ایک مرد نیک اور خلیق ہونے کے باوجود اپنی سوسائٹی میں غیر عورت پر تنقید
کر سکتا ہے بازاروں اسٹیشنوں اور گلیوں میں نہایت احترام کے ساتھ کسی عورت کی
طرف محبت آمیز نگاہ ڈال سکتا ہے لیکن اگر یہی بات ایک عورت کی جانب سے ظاہر
ہو۔ تو مرد کا درجۂ حرارت انتہائی ڈگری پر پہنچ جاتا ہے۔ اگر عورت سے روز روز نقاب
ڈالنے کا مطالبہ ہے۔ تو مرد کبھی کبھی اپنے چہرے پر نقاب کیوں نہیں ڈال لیا کرتے؟ اگر
مرد روز روز ایسے جلسوں میں اکیلے شریک ہوتے ہیں جہاں غیر عورتیں بھی ہوتی ہیں
تو کبھی کبھی عورتیں بھی اکیلا ایسے جلسوں میں جانے دیں۔ جہاں غیر مرد ہوتے ہیں۔
اگر ایک طالب علم لڑکی کے مکان پر آ سکتا ہے۔ تو طالبہ لڑکے کے مکان پر کیوں نہیں
جا سکتی؟ عمومیت کے ساتھ مرد اپنی شادی میں مختار ہے لیکن لڑکیوں کی شادی میں
ماں باپ کا مشورہ اور حکم ناطق ہے۔ عورت اور مرد سب ہی محبت کرتے ہیں۔ لیکن
مرد کا راز طشت از بام ہونے پر وہ سوسائٹی کی نگاہ سے اس قدر نہیں گرتا جس قدر
ایک عورت۔ عورت ایک دفعہ محبت کا گناہ کر کے قابل دار ہے۔ اور مرد معاف کیا جا سکتا
ہے حالانکہ عصمت دونوں کی برابر ہے۔ بھاگا ہوا لڑکا واپس آنے پر سب کی نگاہ میں
عزیز ہے۔ اور بھاگی ہوئی لڑکی واپس آنے پر ذلیل خواہ اس کا ثبوت مل جائے کہ لڑکی
معصوم تھی۔ اور لڑکا شریر۔
یہ تمام قوانین اور اصول اعتباری اور فرضی ہیں۔ اور یہ اعتبارات مرد کے ذمے
ہیں۔ اگر عورتیں بغاوت پر آمادہ اور ان کا نظام مرتب ہو جائے۔ تو یہی جبر اور تشدد صلح
سے تبدیل ہو جائے گا۔ اور مرد پھر دوسری طرح رہنا بھی سیکھ جائیں گے۔
عورتوں کے ذمے خانگی امور ہیں اور مرد کے ذمے بیرونی انتظام۔ معاشیات کا مسئلہ
بہت اچھی طرح حل کیا گیا ہے۔ اور ہم نے اس تقسیم عمل کو تسلیم بھی کر لیا۔ لیکن اگر یہ

تقسیم عمل ذلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ مساوی ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ فرصت کے دنوں اور تعطیلوں میں مرد باورچی خانے کے کاموں میں ہاتھ نہیں بٹاتا حقیقت میں عورت کے لئے جو کام مقرر کئے گئے ہیں۔ اس میں اس کی سبکی ہی ہے۔ اور جس دن عورت میں نسائیت او غیرت کا جذبہ ابھر آیا اور اس نے اس توہین کے خلاف احتجاج کر دیا اسی روز سے مرد کو اپنے اصولوں کی خامی کا احساس ہو جائے گا۔ اس موقع پر میں ان حضرات سے جو کٹر مذہبی ہیں یہ عرض کروں گا کہ ان کا مذہب قطعی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کھانا پکانا عورت کے فرائض میں داخل کر دیں۔

ہر دکاندار اپنا اچھا مال خریدار کے سامنے رکھتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی اپنے بہترین اخلاق و کردار دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اندرونی جذبات و اعمال دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اسی لئے دنیا دھوکے اور فریب کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ ہر شخص اپنے تمام افعال و اعمال کو سوسائٹی کے سامنے پیش کرنے کا حوصلہ پیدا کرے اور اسی طرح ہر آدمی دوسرے کو مجرم قرار دینے کے بجائے اپنے گریبان میں منہ ڈال لیا کرے۔ تو طعن و تشنیع کی بجائے بہت جلد ہم اعلیٰ سوسائٹی پیدا کر سکتے ہیں۔

اس دور میں اگر دنیا نے اپنے بزرگوں کی نسبت کچھ ترقی کی ہے۔ تو وہ وسعت خیال اور طاقت برداشت ہے لیکن اب بھی تنگ نظری اور تعصب ہم میں اس قدر کارفرما ہے کہ حقیقی طور پر ہم ایک دوسرے کی خرابیاں برداشت نہیں کر سکتے اگر کوئی شخص آپ کے مذہب آپ کے اخلاق و اطوار کو قبول نہیں کرتا۔ تو آپ اس سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اور اسی وجہ سے دوسرے اپنے اعتبار سے آپ کو بے وقعت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا محبت اور وسعت کی بجائے ایک دوسرے کی طرف سے دلوں میں نفرت کا بیج ترقی کر رہا ہے۔ ہم صرف اپنے افعال کے ذمے دار ہیں۔ دوسرا خواہ کیسے ہی اعتقادات اور خیالات کا حامل ہو۔ بحیثیت انسان اس کی عظمت ہماری نظر میں اسی قدر رہنا چاہئے جس قدر ہماری عظمت ہماری نگاہ میں ہے۔

اس ظاہری نمائش اور اندرونی کثافت کی دوعملی پالیسی کے بارے میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں اس سے شاید میرا مفہوم آپ پر واضح ہو سکے گا۔ ہمارے مکانات کی وضع قطع اس طرح ہے کہ ہمیشہ نشست گاہ (ڈرائنگ روم) کی حیثیت اصل مکان سے زیادہ شاندار اور امتیازی ہوتی ہے۔ ہم دوسروں کو فریب دینے کے لئے بیرونی کمروں کی سجاوٹ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے لیکن اندر کا فرنیچر آپ دیکھیں گے۔ تو وہ حقیقت کا آئینہ دار ہو گا۔ ایک شخص نے اس سلسلہ میں زیادہ سائنٹیفک طریقے اور کمال سے کام لیا تھا۔ اس نے دو کمرے نشست کے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ ایک میں گورنمنٹ افسروں اور مغربی لوگوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اور ان تصویروں کی پشت پر مذہبی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جب کوئی حکومت کا فرد آتا۔ تو مغربی تصاویر سامنے ہوتیں۔ اور جب مذہبی شخص آتا۔ تو مذہبی تصویروں کو دیوار پر پلٹ دیا جاتا۔ دوسرے کمرے میں سوشلسٹ اور آزاد خیال لیڈروں کی تصویریں تھیں اور ان کی پشت پر مسلم لیگ (یا سمجھ لیجئے مہاسبھا) کے لیڈروں کی تصاویر چپکی ہوئی تھیں۔ اس شخص نے انفرادی طور سے برسوں تک اس طرح سلسلہ تعلقات قائم رکھا اور ہر طبقہ اس کو اپنا ہم خیال سمجھتا رہا۔

نواب صاحب بھوپال نے مہاتما گاندھی کی تشریف آوری کے وقت اپنے محل کا فرش پردے اور صوفے سب دیسی کپڑے کے بنوا لئے تھے۔ اور اس طرح عمر فاروق کا لقب حاصل کر لیا تھا۔ وائسرائے ہند نے آتے ہی بیلوں کی پرورش شروع کر دی تھی۔ اور اس طرح گئو رکھشا کے سب سے بڑے ہمدرد تسلیم کئے گئے تھے۔ ہم اس طرح رات دن ان سب ترکیبوں کو دیکھتے ہیں۔ اور کبھی صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے۔

ہمارے احباب اپنے مکان کی ظاہری سجاوٹ سے ہمیں سب ورد زیب لے رہے ہیں۔ اور ہم دانستہ اس فریب میں مبتلا ہیں۔ کیا اس چالاکی اور مکاری کے خلاف کبھی ہم نے آواز بلند کی؟ پرانے زمانے میں کہا کرتے تھے۔ کہ دہلی والے ایک جیب میں چنے رکھتے ہیں اور ایک جیب میں پستے۔ کیا یہی حال ہم میں سے ہر ایک کا نہیں ہے جو کچھ آپ صبح شام کھاتے ہیں۔ اسی پر دوسروں کو مدعو نہیں کرتے بعض احباب تو دعوتوں میں ایسے کھانوں تک کا اہتمام کرتے ہیں۔ جن کا استعمال پہلے خود کبھی نہ کیا ہو۔
بھڑکیلے اور چمکیلے سامان اور جھاڑوں کی بھرمار سے آپ کے ذوق آسائش و آسودگی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب دوسروں کو دکھانے کے لئے ہے ورنہ جو بستر سفر میں باندھا جاتا ہے۔ وہ گھر میں بھی مستعمل ہوتا۔ جو لباس باہر پہنا جاتا ہے۔ وہ اندر بھی پہنا جاتا۔ اور جو چیزیں باہر کھائی جاتی ہیں۔ وہ اندر بھی کھائی جائیں۔!

حقیقت یہ ہے کہ ہم مخلص اور صحیح انسان اس وقت ہوتے ہیں جب ہم تنہا ہوں۔ ورنہ دوسروں کے سامنے پر تکلف و مصنوعی زندگی برتنے کے عادی ہیں۔ اور اگر ہمارے دن بھر کے حالات کا تجزیہ کیا جائے۔ تو ہم عجیب و غریب قسم کے جانور ثابت ہوں گے!

استقبال

از
حضرت باقی صدیقی

فسونِ شب مسلط ہے جہاں پر
ستارے اونگھتے ہیں آسماں پر
سکوں منڈلا رہا ہے ہر مکاں پر
فضا میں چاندنی لہرا رہی ہے

وہ میرے تمکدے میں آ رہے ہیں
نشے میں مست ہیں لہرا رہے ہیں
مسرت بن کے مجھ پر چھا رہے ہیں
مرے غم کو ہنسی سی آ رہی ہے

ہوا ہے ان پہ الفت کا اثر کچھ
ادا کچھ کہہ رہی ہے اور نظر کچھ
وہ یوں شرما رہے ہیں سوچکر کچھ
بہارِ دو جہاں شرما رہی ہے

نگاہوں میں محبت کا تلاطم
تنفس میں امیدوں کا ترنّم
لبوں پر دل کے زخموں کا تبسّم
محبت معجزے دکھلا رہی ہے

نگاہوں سے نگاہیں مل رہی ہیں
دل و جاں کی طنابیں ہل رہی ہیں
تمنّاؤں کی کلیاں کھل رہی ہیں
امنگوں پر جوانی چھا رہی ہے

تمنائیں نگاہیں بن گئی ہیں!
طرب انگیز آہیں بن گئی ہیں
مرے سینے میں راہیں بن گئی ہیں
مسرت روح میں لہرا رہی ہے

مسرت سے کلیجہ پھک رہا ہے
خوشی سے سانس دل میں رک رہا ہے
زمیں پر خود بخود سر جھک رہا ہے
مسرت موت بن کر چھا رہی ہے

منشی تلوک چند محروم

از
پرمان سنگھ ایم اے

ایک دن میں نے جناب محروم سے استفسار کیا کہ آپ کے خیال میں آپ کی بہترین نظم کونسی ہے۔ تو انہوں نے ایک ایسی نظم کا نام لیا جس کو میں نے کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ .... مگر اس خیال سے کہ شاعر اپنی کسی نظم کو بلا وجہ اپنا شاہکار تصور نہیں کرتا۔ میں نے "مدرسہ کی یاد" کا بغور مطالعہ کیا۔ اس کے متعلق میری رائے میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی۔ مگر اتنی بات ضرور ہوئی۔ کہ محروم کے لڑکپن اور زمانہ مابعد کی نسبت ایک نکتہ ہاتھ آیا۔ اور وہ یہ کہ لڑکپن محروم کا نہایت پُرمسرت زمانہ تھا۔ لیکن بعد میں محروم کا دل ناگفتہ بہ مصائب کا شکار رہا۔ اور اسی رنج و الم نے عہد طفلی کی یادیں اور تڑپ بھر دی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

میری امیدوں کا تو اے مدرسہ گہوارہ تھا

آہ جب میں وقف حسرتہائے گوناگوں نہ تھا ! آہ جب میں واقف نیرنگئے گردوں نہ تھا
میری نظروں میں تھی جب دنیا مسرت کا مقام ! ہاں یہی دنیا جو اب ہے لاکھ عبرت کا مقام

محروم کی نظموں میں اس قدر سوز ہے۔ کہ بعض حضرات نے سوز و گداز کو ہی کلام محروم کی خاصیت ٹھہرایا ہے مگر شاعری اور سوز و گداز لازم و ملزوم ہیں جس شعر میں سوز نہیں وہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ شاعر کا دل ایسے ارمانوں سے پُر ہوتا ہے جن کے نکلنے کی توقع ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اکبر کی ہنسی اقبال کے گریہ سے کم دلگداز نہیں۔ یہ درست ہے کہ کلام محروم میں معمول سے زیادہ سوز ہے۔ مگر سوز کو کلام محروم کی خاصیت ٹھہرانا تنقید میں داخل نہیں۔

محروم کے ابتدائی کلام میں امید اور حسرت کا بے پناہ طوفان ہے۔ شاعر کا دل دردِ قومی کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ مگر اس خیال سے کہ اس درد کا مداوا ہونے والا ہے۔ وہ مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور محروم جوش طرب میں گانے لگتا ہے

وہ دن بھی نہیں ہیں دور کہ جب بھارت کا ستارہ چمکے گا
دیکھے گا مغرب مشرق کو جب بخت ہمارا چمکے گا !
پھر اوج سپہر قومی پر اقبال کے تارے نکلے ہیں
کہتے ہیں منجم دنیا کے' یہ دیس دوبارہ چمکے گا !
مصنوعی تری تہذیب ہے یہ اے مغرب ! اس پر ناز نہ کر
تارے کی طرح گر اوج پہ ہو کیا خاک غبارہ چمکے گا !

محروم عنفوان شباب میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور گریہ و زاری کرنے کا عادی نہ تھا۔ مصائب ملی کو دیکھکر اس کا خون جوش میں آتا ہے۔ وہ فلسفہ قنوطیت نا آشنا ہے۔ اُسے برادران وطن کی ہمت پر اعتماد ہے اور ان میں ذوق عمل پیدا کرنے کے لئے بول اُٹھتا ہے۔

یہ مجبوری و بینوائی کی باتیں | یہ ناطاقتی نارسائی کی باتیں
زمانے کی بے اعتنائی کی باتیں | یہ ہیں سر بسر جگ ہنسائی کی باتیں
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

محروم کا دل حب وطن کے جذبات سے لبریز ہے۔ وطن کے پُر فضا میدانوں۔ مترنم اور متلاطم دریاؤں۔ ہیبت ناک پہاڑوں۔ اور دیگر مناظرِ قدرت کو دیکھکر محروم کے دل میں مسرت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ اسے صبح و شام وطن سے از حد کیف حاصل ہوتا ہے اس کے قلم میں اتنا زور ہے کہ اس کیف کو شعر کا جامہ پہنا کر ہمارے دلوں تک پہنچا دیتا ہے۔ "شام وطن" سے دو بند پیش کرتا ہوں ؎

کیا سانولی صورت ہے تیری | اے شام وطن ! اے شام وطن
کیا موہنی مورت ہے تیری | اے شاہد لیلےٰ فام وطن
واپس چوپائے چرواہے | کھیتوں سے گھروں کو آتے ہیں
گھنٹی کی صدا کے کانوں سے | کیا دل کو لوٹے جاتے ہیں

میانوالی پنجاب کا ایک دُور اُفتادہ ضلع ہے۔ شعر و شاعری تو درکنار وہاں تعلیم بھی عام نہیں۔ اردو کا چرچا وہاں بہت کم ہے۔ اسی پسماندہ ضلع کو محروم کا مولد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اسی صحرا میں بقول سر عبد القادر "صدائے وہ خود رو پھول پیدا کیا۔ جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی" کلام محروم کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ آپ کو غیر فصیح الفاظ اور تراکیب مطلق نظر نہ آئیں گی محاورہ اور روزمرہ کو دہلی اور لکھنؤ کے کہنہ مشق استادوں کی طرح باندھتے ہیں۔ "توصیف بادِ گل" اور "خرامش باد صبا" تو روز ازل سے شاعروں کے پیش نظر رہی ہیں۔ ایسے حسین مناظر کے دوش بدوش محروم نے آندھی کا منظر بھی دکھایا ہے۔ اور اس غیر شاعرانہ مضمون کو بھی محروم کے قلم جادو رقم نے گل و لالہ کی دلکشی عطا کی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے | بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صحت میں ہے اگرچہ یہ باہر شمال سے | آتی ہے فوج دیو نظر ماہل ڈھال سے
روپوش اسکی خون سے کوہ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ ندرخ آسماں ہوا
آتی ہے شکل اژدہے سے اپھکارتی | مکارتی فلک کو زمیں کو پکارتی

زندوں کو تا پرچم چہارم ابھارتی   اڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اتارتی

یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی

ہل چل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ محروم کا قلم جس چیز کو بیان کرتا ہے۔ سماں باندھ دیتا ہے۔ محروم کے کلام میں بیسیوں تصویریں ہیں مگر وہ ساکن و جامد نہیں بلکہ جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ ان میں رنگ کے ساتھ ساتھ نور صورت اور حرکت بھی ہے۔ اور یہی دو چیزیں ہیں جو شاعری کو مصوری سے ممیز کرتی ہیں۔

مذہب کے لحاظ سے محروم بہت فراخدل واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے مختلف مذاہب کے بزرگوں کی عظمت کو محسوس کر کے اسے نظم کیا ہے۔ میں نے انہیں مختلف مذاہب کی کتب مقدسہ کا مؤدبانہ مطالعہ کرتے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا۔ جی چاہتا ہے مسیح کے متعلق اپنے جذبات کو نظم کروں۔

" فرصت کشاکش غم نہاں سے گر ملے "

وہ ابوت الہیٰ اور اخوت انسانی کے قائل ہیں۔ اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنا انسان کا فرض اولین تصور کرتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی توصیف و توصیف میں مسلمان اتنا ہی مبالغہ کرتے ہیں۔ جتنا ہندو اس کی مذمت میں۔ محروم نے دونوں فرقوں کے متعصب افراد کو اس معاملہ میں رواداری کا سبق دینے کے واسطے بن یمین کے مندرجہ ذیل شعر پر تضمین لگائی ہے۔ ؎

ہر کہ با زندہ از پے مردہ   می کند جنگ سخت نادان است

عین شباب میں محروم کو ایسے صدمات پیش آئے جنہوں نے ان کی شاعری کو نغمہ شادی سے نوحۂ غم میں تبدیل کر دیا۔ فرقہ وارانہ فسادات اور دیگر قومی مصائب نے وطن کے متعلق محروم کی امیدوں کا خون کر دیا۔ ان واقعات کا محروم کے دل پر ویسا ہی اثر ہوا جیسا انقلاب فرانس کا ورڈزورتھ کے دل پر ہوا تھا اس کے خیال میں یا انقلاب بنی نوع انسان کی آزادی کا پیش خیمہ تھا لیکن انقلابیوں کی بے اعتدالیوں سے ورڈزورتھ کا توازن ذہنی جاتا رہا۔ اس کی بہن کی بے لوث خدمت نے ورڈزورتھ کو بچا لیا۔ محروم اتنا خوش قسمت نہیں۔ اسے مصائب ملی کے ساتھ ساتھ مصائب ذاتی بھی برداشت کرنے پڑے۔ ان کی نوجوان بیوی کی موت سے ان کے دل میں طوفان غم اُمڈ آیا۔ کرشن، جانب بسرو۔ نادر اور چکبست جیسے ہمنواؤں کی وفات نے محروم کو ترجمان دل بیقرار بنا دیا۔ ان ایام کے کلام میں الفاظ کی برجستگی بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ سوز بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسے پڑھکر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ محروم کا قلم جہاں عیش و نشاط اور امید کی تصویر بنا سکتا ہے۔ وہاں غم واندوہ کا نقشہ کھینچ کر قاری کے دل میں سوز و گداز کا طوفان بھی برپا کر سکتا ہے۔ محروم کی مشہور نظم نور جہاں کا مزار اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی "خواب جہانگیر" ہے جس کے دو بند پیش کرتا ہوں۔

مژدۂ عیش نسیم سحری لائی ہے   دوش بر دوش صبا نکہت گل آئی ہے

پردہ تو سے میں محبِ شانِ دلارائی ہے   وقت منیوشی ہے اے شاہ گھٹا چھائی ہے

منتظر محفل عشرت ہے شہا جاگ کہیں

ادصبوحی کش مستانہ ادا جاگ کہیں

آہ طاری ہے یہ کیا خواب گراں متوالے! نہیں سنتا جو رعیت کی فغاں متوالے!

کس تصور میں ہے پھرتا ہے کہاں متوالے! دیدۂ خلق سے کیوں ہو گئے نہاں متوالے

چھوڑ کر تخت شہی زیر زمیں جا سویا

بدلی کروٹ بھی نہ صدیوں کے یہ اچھا سویا

طوفان غم سے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

محروم یہ تو مجھکو بھی معلوم ہے کہ ہم   جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی   اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

محروم نے عزیزوں کی بوقت موت پر خوب آنسو بہائے اور ان کے آنسو گہر آبدار بن کر ادب اردو کی زینت بنے جب شاعر رنج و غم پر قابو پالیتا ہے۔ تو اسے نغمہ میں مقید کر دیتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جب غم کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ دل کا بوجھ نہیں رہتا۔ محروم نے عہد شباب میں رنج و غم کا شعر میں اظہار کیا۔ مگر عالم جوانی کے ساتھ دل کی تاب و تواں بھی رخصت ہوئی۔ قضا کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس۔ ایسی حالت میں بھی محروم کا پیچھا نہ چھوڑا۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ ان کی نوجوان لڑکی انہیں داغ مفارقت دے گئی۔ اس صدمہ سے میں کتنا رنج ہوا۔ میرا قلم اس کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ میں ان سے ملنے گیا۔ تو فرمانے لگے "بھئی بہت صدمے سہے مگر اب کے تو میرا دل جل کر راکھ ہو گیا۔ میرے آنسو خشک ہو گئے" ان کی دلی کیفیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اب تک اس جوانمرگ کے متعلق کوئی نظم نہیں لکھ سکے۔ ایک دفعہ ایک صاحب کی صدارت کرنے کے لئے ان سے پرزور التجا کی گئی۔ تو اس تازہ صدمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ازراہ معذرت لکھ بھیجا۔

تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر   ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے

دو ایک باتیں عرض کرنا باقی ہیں۔ ان کے تازہ مجموعہ کلام "گنج معانی" کی ترتیب خالی از نقص نہیں۔ اس میں نظموں کو موضوع کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر انہیں اسی ترتیب سے پیش کیا جاتا جس میں وہ لکھی گئی تھیں۔ تو گنج معانی یکسانیت کے عیب سے مبرا ہو کر تاریخ کی حامل بن جاتی۔ اور اس سے شاعر کے ارتقا کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا۔

میرے خیال میں اب یہ کہنا بیجا ہے کہ "گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے"۔ اردو ارتقا کی انتہائی منازل پر پہنچ چکی ہے پنجاب بھر کے لئے عموماً اور ضلع میانوالی کے لئے خصوصاً یہ امر باعث فخر ہے کہ حضرت محروم اردو کی مشاطگی میں کسی سے پیچھے نہیں رہے

کلکتہ لارڈ کارنوالس کے عہد میں

از
کے اے حمید بیرسٹرایٹ لاء لاہور

جب مرزا غالب اپنے دوستوں کی یاد میں کلکتے کے عشرت کدوں سے تڑپ اٹھے ۔ اور خوب کہا ؂

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ۔ اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

ڈیڑھ سو سال کا زمانہ ہوا جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف تھے ۔ ان کے وقت کی مالی و اقتصادی حالت کا نقشہ ٹامس ٹویل نے جو حسن اتفاق سے کلکتہ میں موجود تھے خوب کھینچا ہے ۔ ٹامس ٹویل کی زبانی سر ولیم فاسٹر نے کلکتہ کے انگریزوں کی تہذیب و تمدن کا نقشہ ۱۹۳۳ء کے ٹائمز آف انڈیا میں سپرد قلم کیا تھا ۔ جو از حد دلچسپ ہے ۔ ان دنوں انگریزوں کی دن رات یہی خواہش تھی کہ وہ دولت سے مالا مال ہو کر جلد انگلستان واپس ہو جائیں ۔ چونکہ کلکتہ ہندوستان کا پایۂ تخت تھا ۔ اس لئے

"رہتے تھے منتخب ہی وہاں روزگار کے"

ہر وہ خوش قسمت متنفس جو کمپنی میں ملازمت حاصل کر سکتا بشب و روز روپیہ کی فراہمی میں ہمہ تن مصروف رہتا ۔ ان لوگوں کی تنخواہیں نہایت معقول تھیں اور بالائی آمدنی کے وسائل بہت زیادہ تھے ۔ ملازمتوں اور ٹھیکوں کا حاصل کرنا رسوخ پر منحصر تھا ۔ اس لئے وہ لوگ جو ٹھیکوں اور ملازمتوں کے جویاں تھے ۔ لندن سے بڑے بڑے آدمیوں کی سفارشی چٹھیاں لاتے جن افسران سے یہ ملازمتیں اور ٹھیکے ملتے تھے بہت بھاری رقم چڑھائی جاتی رہتی تھیں ۔ ہر ڈاک میں گورنر جنرل کے نام سفارشی چٹھیوں کے پلندے آیا کرتے تھے کمپنی کے ڈائرکٹر وزراء اور شاہی خاندان کے ممبر گورنر جنرل کو خطوط لکھتے ملازمت کے حصول کے لئے قابلیت کوئی معیار نہ تھی مشہور مورخ میکسلے جوان دنوں میں کلکتہ میں موجود تھا ۔ ایک نہایت لطف انگیز لطیفہ لکھتا ہے کہ ایک بار ایک ایسے شخص کو فارسی کا مترجم گورنمنٹ آف انڈیا میں مقرر کیا گیا جو قطعی طور پر فارسی نہیں جانتا تھا ۔

ہندوستان میں جو کچھ ہوتا تھا وہ انگلستان کی حکومت کی نقل تھا ۔ کلکتے کے وہ لوگ جو ان ٹھیکوں اور اسامیوں کو پکڑے ہوئے تھے انگریز تھے ہندوستانی بہت کے ادنیٰ ملازم تھے یا زیادہ سے زیادہ تاجر جماعت کے طور پر ان کا کوئی وقار نہ تھا ۔ انگریز کمپنی کے ملازم ہر طرح سیاہ و سفید کے مالک تھے ۔

ان دنوں کے اخراجات کو احاطہ تحریر میں لانا ناممکن ہے ۔ اشرفیوں کا کوئی شمار نہ تھا ۔ اشرفیاں پانی کی طرح خرچ کی جاتیں ۔ لندن میں جس طرح اڑھائی شلنگ کی وقعت تھی ۔ وہی اشرفی کی قیمت شمار کی جاتی ۔ ایک اشرفی کا بدل سولہ روپیہ تھا ۔ میکسلے نے ایک معمولی سا مکان ساڑھے چار سو پونڈ سالانہ کرایہ پر لے رکھا تھا متعدد مکانوں کا کرایہ سولہ ہزار روپے سے بھی زیادہ تھا چالیس ہزار روپیہ مکان کی آرائش و زیبائش پر خرچ کیا جاتا تھا ۔ میکسلے رقمطراز ہے کہ تھوڑی مدت ۔۔۔ ری کے بعد بھی اس کا خرچ سالانہ پانچ ہزار روپیہ سے زائد ہے ۔"

غرضیکہ کا مکان اچھے کوارٹر میں واقع نہ تھا تاہم اسے تین سو پونڈ سالانہ کرایہ دینا پڑتا تھا ۔ وکلا ، پادریوں ، ڈاکٹروں کی فیس کا کوئی شمار نہ تھا ۔ ان لوگوں کے پو بارہ رہتے تھے بچے کو بپتسمہ دینے کے لئے دس پونڈ پادری کو ادا کرنے پڑتے نکاح خوانی کا معاوضہ چالیس پونڈ تھا قبر پر کم از کم سو پونڈ خرچ آتے تھے ۔ ڈاکٹری فیس دو پونڈ تھی ۔ وکلاء سے مشورہ کے لئے دو پونڈ دینے ضروری تھے معمولی درخواست یا نوٹس لکھوانے کے لئے چار پونڈ پیش کرنے پڑتے تھے تھیٹر کا ادنیٰ درجہ کا ٹکٹ ایک پونڈ تھا ۔ بھیڑ اور سور کا گوشت ساڑھے بارہ شلنگ فی پونڈ کے حساب سے بکتا تھا ۔ بسا اوقات انگریزی خواتین اپنے بدن کی آرائش و زیبائش پر تیس سے چالیس ہزار روپیہ ایک دن میں خرچ کر دیا کرتی تھیں

انگریزوں کے ہاں نوکروں کا تانتا بندھا رہتا تھا ۔ میکسلے رقمطراز ہیں "انگلستان میں مشہور تھا کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے لوگوں کو بھوک کم لگتی ہے مگر میرا مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے ہم دو بجے دوپہر کو کھانا کھاتے ہیں ۔ جو شوربہ ۔ مچھلی ۔ مرغ مسلم ۔ چاول ۔ قورمہ ۔ بھنی بائی ۔ بھنا ہوا گوشت ۔ پڈنگ ۔ پنیر ۔ تازہ مکھن اور روٹی پر مشتمل ہوتا ۔ بھیڑ کی قیمت دو روپیہ تھی ۔ بھیڑ کا بچہ ایک روپیہ کو مل جاتا ۔ مرغ ایک روپیہ کو کبوتر ایک روپیہ کے بارہ ملتے ۔ پنیر تین یا چار روپیہ پونڈ کے حساب سے ملتا ۔ کھانا کھانے کے دوران میں شراب کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ اس کثرت سے ہوتا کہ بازار سنسان نظر آتے گویا آدھی رات کا عالم ہے ۔ سہ پہر کو ہر شخص ہوا خوری کے لئے نکل جاتا واپسی پر چلے ۔ ناشتہ کی جاتی ۔ رات کو دس بجے کھانا کھایا جاتا جو دوپہر کے کھانے سے زیادہ پر تکلف ہوتا تھا ۔"

عام گھروں میں شراب کا استعمال کثرت سے تھا ۔ ایک بوتل روپیہ اوسط درجے کے گھرانے کا خرچ تھا حقے کا استعمال عام تھا انگریز دعوتوں میں اپنا اپنا حقہ اور ملازم ساتھ لے جاتے تمباکو کا استعمال فیشن میں داخل تھا ۔

بازاروں کی حالت قابل دید تھی سنہری روپہلی گاڑیوں میں انگریز خواتین سنگار کر کے اس طرح نکلتیں گویا وہ فردوس بریں میں سیر کر رہی ہیں سڑکوں کے دونوں طرف سربفلک عمارتیں عجب شان دکھاتی تھیں ۔ عمدہ اور شفاف سڑکیں بہار دکھا رہی تھیں ۔ انگریز بچے پالکیوں میں تفریح کے لئے نکلا کرتے بعض پالکیوں میں کتاب کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے ۔ عوام گھوڑوں پر سیر کرتے ۔ الغرض ہر طرف چہل پہل ہوتی جس کا احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں ۔

عکسِ لطیف

(تاثراتِ حسن از کیٹس)

از
پروفیسر پرشوتم لال ضیا ایم اے

شادیٔ جاوید ہے وہ شے جو جانِ حسن ہے
بے نیازِ مرگ ہیں وہ بے زباں پرکاریاں
رفعتوں سے اِن کی ہیں جذبات کے چشمے شروع
زندگانی کے جواں خوابوں کے گہوارے ہیں یہ
ہیں انہیں چشموں سے جاری ندیاں جذبات کی
ان سے وہ جذبے ابلتے ہیں بصد ناز و ادا
جن کے آگے سر بہ خم تا ہکیے ایام ہے
یہ بساطِ رنگ و بو اک دل نشیں تصویر ہے
یہ اماں گاہ و ضیائے آفتاب و ماہتاب
یہ زمرد فام سبزہ یہ گلِ زریں لباس
سینۂ صحرا کے اندر لہلہاتا سبزہ زار
یہ وہ نظارہ ہے جو رکھتا نہیں اپنا جواب
جن کے افسانے پڑھے جاتے ہیں سینہ تھام کر
مشربِ لافانی کا گویا چشمۂ بے انتہا
نشۂ جاوید ہے جس کی شرابِ نور یں
ہے لبِ ذرات پر رقصاں انوکھی داستاں
لیکن ان جذبات کے جوہر کا احساسِ لطیف
نغمہ بار اشعار جس انداز میں گردِ حرم
ویسے ہی مہتابِ ضو انگیز و اشعارِ جمیل
بربطِ الفت نہیں ہے بربط اس لے کے بغیر

اس کی روز افزوں لطافت ترجمانِ حسن ہے
کنجِ گل انگیز ہے جن کا تبسم ہے عیاں
زندگی کے خواب شیریں ان سے ہوتے ہیں طلوع
شوق کے آغوش میں نکہت کے فوارے ہیں یہ
ہر شگوفہ ایک چنگاری ہے محسوسات کی
جن میں اک کیفِ دوامی کا ہے زندہ ماجرا
جن کی محفل میں دو زانو جادوئے اوہام ہے
حسن اندر حسن ہے، تنویر در تنویر ہے
یہ تجلّی کی سہانی کشتیاں، سایوں کے خواب
یہ کنارِ جو خنک موسم، شمیمِ بے قیاس
جانِ شوق و آرزو با غنچہ ہائے مشکبار
سو رہے ہیں اس میں ماضی کے ہزاروں انقلاب
نام بھی لیتی ہیں جن کا مخملیں یا چشمِ تر
ہے کنارِ عرش سے روحِ رواں میں بہ رہا
امتیاز اصلا نہیں ذرے میں برقِ طور میں
گوش شنوا اس جگہ کرتے ہیں تکمیلِ زباں
ایک لمحہ بھی نہیں ہوتا تخیل کا حریف
اہلِ سجدہ کے لئے ہوتے ہیں یکسر محترم
روح کی لذات اور عصمت کے ہوتے ہیں کفیل
منتشر شیرازۂ ہستی ہے اس شے کے بغیر

یہ مناظر ہوتے ہیں جس دم مرے پیشِ نظر
رنگ کا سا عکس پڑتا ہے ضیائے روح پر

رومان!

نوشتہ:- ای ٹیمپل تھرسٹن
مترجمہ:- شہاب سلطانی

یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا رومان ہمیشہ ہی دلچسپ اور خوشگوار ہو۔ کبھی کبھی آپ کا رومان بہت عجیب واقعہ ہوتا ہے جس کا اختتام ناخوشگوار ہوتا ہے۔ اور پھر ——— یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کے رومان کو دیکھیں۔

دوسرے اشخاص ہمیشہ اپنی زندگی میں ایسی چیز رکھتے ہوں گے۔ جو آپ کی زندگی کو اچھی طرح سمجھنے کے لائق بنائے۔ اگر آپ اس کو تلاش کریں گے تو پھر کسی طرح سے سیکھ سکیں۔ تو آپ ہر جگہ رنگ پائیں گے۔ رومان کا رنگ یا یہ رومان ہے۔ کہ آپ دور کے پہاڑوں میں نیلگوں اور ارغوانی رنگ دیکھیں ——— درختوں کے نیچے کا گہرا بنفشئی رنگ دیکھنا بھی ایک رومان ہے!

یہ سب رومان ہے۔ کیونکہ اگر آپ دور کے پہاڑوں پر چڑھ کر دیکھیں۔ تو وہاں سب کو سبز رنگ نظر آئیگا۔ اور اگر آپ درختوں کے سایہ سے جس قدمی کریں۔ تو آپ کو سبزہ ہی سبزہ نظر آئیگا۔ لیکن زندگی میں بھی رنگ ہیں ——— اگر چہ اصل آپ کی زندگی میں نہیں تو کسی اور کی زندگی میں ——— یہ رنگ بالکل سفید دھبوں یا نہیں ہے۔ جیسا کہ اندر جھانکنے پر دکھائی دیتا ہے۔

میں دوسروں کے رومان کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اور اگر مجھ میں دوسروں کے رومان پسند کرنے کا مادہ نہ ہو۔ تو میری زندگی اچھی طرح نہ گذر سکے ——— کیونکہ جب کبھی میرے دن گھرے گھرے میں گذرتے ہیں۔ اور چاروں طرف دھند ہی دھند نظر آتی ہے۔ جب سامنے کا منظر نامکمل ہوتا ہے۔ اور سینکڑوں افق دھند میں غائب ہو جاتے ہیں ——— کسی دوسرے کے رومان کی طرف قدم بڑھاتا ہوں۔

لیکن میں اس فن میں پورا ماہر نہیں ہوں۔ ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں کہ۔ جو صلاحیت رکھتے ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنے آپ کو بالکلیہ محو کرنا بھول جانا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔

ایک مرتبہ ایک مختصر عمدہ سا رومان تھا لیکن میں اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا میں نے اسے چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس میں میں خود اپنے آپ کو سنبھال سکا اور لڑھک گیا۔

کوئی دوسری ہستی فلاں چائے کی دکان پر تھی۔ وہ ایک ننھی سی چڑیا معلوم ہوتی تھی۔ سرخ و سپید چہرہ اور خوشنما و خوبصورت پتلے پتلے ہونٹ۔ اگر انہیں چھوئیں تو نہایت سرد۔ ایک عورت کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام تشبیہ ہے لیکن صحیح ہے۔

ہر عورت کے ہونٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ پنکھڑیاں سحر زدہ ہوتی ہیں۔ آفتاب کی تمازت سے محفوظ۔ کچھ پنکھڑیاں آتشیں کرنوں سے پژمردہ۔ اور کچھ کمہلائی ہوئی پنکھڑیاں۔ موسم گرما کے چلے جانے کے بعد کی ——— لیکن میں ان کو تخیل میں لانا بھی پسند نہیں کرتا۔

خیر ——— اس کے ہونٹ صبح کی گلاب کی پنکھڑیوں کے مانند تھے ——— اتنی سویرے کی شبنم اب تک ان پر چمک رہی تھی ——— وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور سرگوشیاں کرنے لگی ——— میری زبان اس کو بیان کرنے سے قاصر ہے ——— اس کے لبوں نے سرگوشی کی ——— اس نے سرگوشی کی۔

"فرمایئے! ——— کیا پیش کروں؟"

جی ہاں۔ اس نے مجھ سے سرگوشی کے لہجہ میں میرے اتنے قریب ہو کر کہا۔ کہ اس کا نفس مجھے صاف سنائی دینے لگا ———!

کبھی کبھی میں اس سے باتیں کیا کرتا ——— اس کی صحت کے متعلق۔ اور یہ کہ اس کی چھٹیاں کب ہوں گی ——— ایسی ہی سادہ لوحی کی باتیں جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں اس سے باتیں کرنے کا مشتاق ہوں۔ اور اس کا رومان پوچھنا چاہتا ہوں۔

مجھے تم اپنی ایک تصویر دو گی۔ میں نے ایک روز اپنی تمام طاقت کو مجتمع کر کے کہہ ہی دیا ——— یہ سچ اور بیباکی اس کے ناز سے ہنسنے کرتے ہی ——— میں نے ایسی گستاخانہ بات اس سے کبھی نہ کی تھی۔ وہ اس بات کو سننے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔

"میں نے ایک مرتبہ تصویر کھنچوائی تھی" اس نے میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر میرے قریب جھکتے ہوئے کہا "وہ بھی رات کے لباس میں۔ لیکن اب میرے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں ہے میں نے اس کی آخری کاپی اپنی چچی کو بھیج دی۔ جبکہ چچا کا انتقال ہوا۔"

"کیا اس تصویر کو دیکھ کر ان کا رنج دور ہو گیا" میں نے پوچھا ——— یہ ایک بیہودہ پر مذاق سوال تھا ——— میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے پر مذاق پائے لیکن اس لحاظ سے میری اسکیم ناکام رہی ——— اس کی چمکتی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی اس نے آہستہ سے کہا۔

"پندرہ دن بعد چچی بھی چل بسی!"

دیکھا آپ نے ——— وہ مجھ سے زیادہ پر مذاق تھی ——— اگر میں ایک سال بھی سوچنے کی کوشش کرتا۔ تو اس سے زیادہ نفیس مذاق نہیں سوچ سکتا تھا۔

"اچھا ——— تو کیا تم ایک ہی تصویر کھنچوا سکو گی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا "اگر میں ——— میں اس کی قیمت ادا کر دوں!" خوشی کے مارے اس کا سانس پھول گیا ——— اس نے اپنے دونوں ہاتھ دبائے؛

"اوہ! کتنی اچھی بات ہے!" اس نے زور سے کہا اتنے زور سے کہ لوگ میز پر پیچھے منہ کے قریب نہ جھکنا پڑا اور اس کی آواز صاف سنائی دی۔ — "تو اس طرح تم مجھے پہچان نہ سکو گی" میں نے کہا "لعد ایک" اس کو — "میں جان کر خاموش ہو رہا!

اس کی بھویں سکڑ کر قوس قزح کی مانند ہو گئیں!

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے سرگوشی کے لہجہ میں پوچھا۔

"میں" اس کی تصویر تمہاری آنکھوں میں دیکھ سکتا ہوں!" میں نے کہا "اور میں اس کی بابت سب کچھ سننے کا مشتاق ہوں۔"

"میں اب زیادہ بات نہیں کر سکتی!" اس نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا — وہ اس وقت بالکل ایسی معلوم ہوتی تھی گویا کوئی چڑیا کیک کے پیچھے سے خوفزدہ نگاہوں سے جھانک رہا ہو — ہاں! — اور کیسا کیک!

وہ مجھ سے سب کچھ کہنا چاہتی تھی!

"تو پھر کب کہو گی؟" میں نے اصرار کیا۔

"میں نہیں جانتی!"

"اس اتوار کو تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم دونوں ساتھ ساتھ "ایپنگ" جا رہے ہیں!"

"اچھا! — اور اس کے بعد والے اتوار؟"

"وہ ہر دوسرے اتوار کو مشغول رہتا ہے!"

"تو پھر اگلے اتوار تم فارغ ہو؟"

"ہاں!"

"تو پھر ہم کیو باغ چلیں گے۔ اب وہاں عام تفریح کی اجازت مل گئی ہے — اور جب تمہاری آنکھیں "بلیو بیلس" سے بھر جائیں گی تو تم مجھ سے اس کی بابت سب کچھ کہہ دو گی — بھولنا مت — چیرنگ کراس انڈر گراؤنڈ — تین بجے ٹھیک۔ اگلے اتوار کو — "اس" کو اپنے وہاں آنے کی خبر کر دینا — اس سے سب چھپانا — میں اسے ایک اپنا دوست بھیج دوں گی۔ تاکہ وہ مجھے دیکھ سکے۔ میں کہتا ہوں — اور جب تم میری پلیٹ صاف کر دو گی۔ تو تمہیں اس کے بعد ایک ایسی چیز ملے گی۔ جو تمہارا فوٹو گرافر کو خوش کر سکے گی — اگلا اتوار — تین بجے — چیرنگ کراس — بھولنا مت!"

ہاں! — اس واقعہ میں رومانوی رنگ کی آمیزش تھی — لیکن بہت زیادتی کے ساتھ — اور میں نے اس موقعہ کو بالکل کھو دیا — اور صرف اس لئے کہ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا — !

— بہت ہی کم ایسے اتوار آئے ہیں جن کا میں نے بے چینی سے انتظار کیا — اور بہت ہی کم ایسے اتوار گذرے ہیں جن کا خیال اور تصور میرے لئے شرم اور رنج کا باعث ہوتا ہے!

میں وہاں تین بجکر پانچ منٹ پر پہنچ چکا تھا۔ مجھے بلیو بیلیں نظر آ رہی تھیں میں ان کے درمیان اس ننھی چڑیا کی سرگوشیوں کی آواز سن سکتا تھا — وہ مجھے اپنی سرگوشیوں میں اپنے "اس" کے متعلق سب کچھ بتا رہی تھی۔ کب ان کی شادی ہوگی اور ان دونوں کا کہاں رہنے کا ارادہ ہے۔

وہ تھوڑی دیر بعد "دیرس اسٹریٹ" سے آئی — وہ! لیکن اب وہ ایک چڑیا نہیں تھی۔ سرگوشیاں کرنے والی خوبصورت چڑیا! بلکہ "سوکر" معلوم ہوتی تھی — اس کا ننھا سا خوبصورت چہرہ اور خوبصورت بھورے بال سب ایک غیر طبعی رنگ کے بھدے ہیٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ اور ستم پر ستم یہ کہ ہیٹ پر اسی بھدے رنگ کے پروں کا ڈھیر تھا — ساری سڑک پر سب ہیٹوں میں وہی ایک ہیٹ نمایاں نظر آ رہا تھا — چاروں طرف سے اس پر فقرے کسے جا رہے تھے۔ نوجوان اس کو دیکھ کر مسکرا پڑتے تھے۔ لڑکے اس پر فقرے چست کر رہے تھے — میں نے "بلیو بیلس" کے درمیان اس ہیٹ کو تصور میں دیکھا۔ اور مجھے اس سے نفرت ہو گئی میں نے بھاگ جانا چاہا — اور وہ! — وہ اسی ہیٹ کو اس شان اور فخر کے ساتھ پہنے چلی آ رہی تھی گویا قلوپطرہ انطونی کی بغل میں ہاتھ ڈالے دنیا کے حسن مذاق سے بے فکر چلی جا رہی ہو!

کیا ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن پر عورتیں فخر کرتی ہیں؟

یہی وہ موقعہ تھا کہ میں سنبھل سکا — مجھے اس کے ہیٹ کی وجہ سے نفرت پیدا ہو گئی رومان کا خیال دل سے کافور ہو گیا — کیا میں ایسے ہیٹ والی بدمذاق عورت کو اپنے ساتھ لیجا کر جگ ہنسائی کراؤں — میں اپنے ان خیالات میں اتنا محو ہو گیا کہ مجھے یہ سوچنے کا موقعہ نہ ملا کہ یہ ہیٹ "اس" کے لئے کس قدر رومان انگیز تھا؟

میں ایک بک اسٹال کے پیچھے چھپ گیا۔ اور اس کو آتے ہوئے دیکھنے لگا — پلیٹ فارم پر وہ انتظار کرنے لگی اس کے چہرے پر مغرورانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی جب لوگ اس کی طرف تعجب خیز نظروں سے دیکھتے۔ تو وہ تعریفیہ مسکرا پڑتی۔ گویا وہ اپنے رومان کا تمام حال مجھ سے کہہ دیگی۔

آخر کار میں اپنی پوشیدہ جگہ سے نکلا۔ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس گیا میں نے ایک مصمم ارادہ کر لیا تھا — اپنا ہیٹ اتار کر اور سلام کرنے کے بعد میں نے کہا۔ "آگئیں! — ماشاء اللہ تمہارا حسن تو آج غضب ڈھا رہا ہے" اس کے چہرہ پر فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ کر میرا جی جل گیا۔ "کیا تم جلدی سے دو ٹکٹ خرید لاؤ گی جب تک میں اخبار خریدتا ہوں — اور میں نے ایک پونڈ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا! کبھی کبھی جب مجھے اس واقعہ کا خیال آ جاتا ہے۔ تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ اس نے "ملو بیلس" کو دیکھے تھے یا نہیں؟ ، یا کوئی نوجوان شخص اس کے بھدے ہیٹ کے ہوتے ہوئے بھی اس سے رومان باری کرنے پر آمادہ ہو

شبخون

از
انور مختار صدیقی

محاذ کی پشت پر اس چھوٹے سے خوبصورت شہر کے عبرت افزا کھنڈرات تھے۔ جو کبھی ایک بارونق ہنستی اور مسکراتی بستی تھی۔ ویران سڑک بڑے بڑے گڑھوں کے ناسور سینے پہ لئے خشک چٹیل میدان میں سے ہوتی ہوئی لہرا کر مغرب کی جانب جاتی تھی جس پر جا بجا شکستہ لاریوں اور مسلح موٹروں کے "نقوشِ باقی" ان کے المناک انجام کی شہادت دیتے تھے ۔۔۔۔ جھلسے ہوئے درخت جن پر جانور برائے نام کو بھی نہ رہ گئے تھے۔ لنڈ منڈ کھڑے اس منظر کو اور زیادہ وحشت انگیز بنائے دیتے تھے۔ اور یہ منحوس فضا ہماری اور دشمنوں کی لاشوں کو آغوش میں لئے موت کا راگ سنا کر تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ "زندگی کی وسعتوں میں موت کے آثار نے عروج میں سکڑ دیکھے ہیں ۔۔۔۔"

ہمیں اس محاذ پر تبدیل ہوئے دو ہی دن ہوئے تھے۔ مگر ابھی تک "جبریت" ہی رہی تھی بعض اوقات دونوں طرف سے توپوں اور مشین گنوں سے باڑیں ماری جاتیں لیکن نسبتاً فضا کچھ پر امن سی معلوم ہوتی تھی۔ معلوم کیوں؟ ۔۔ ہاں ہمارے ہیڈکوارٹر یہیں دور جنوب کی طرف ہراول عساکر کے محاذ کی طرف سے شدید گولہ باری کی مسلسل گرج سنا دیتی تھی۔ شاید وہاں صورت حالات کچھ زیادہ امید افزا نہ تھی۔

میں اور مارٹن خندق کے زینے پر کھڑے ریت کی بوریوں کا سہارا لئے بغیر مقصد کے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ غار دار تاروں کے دوسرے نمبر کے جنگلوں میں سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر جرمن خندقیں صاف نظر آتی تھیں۔ کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ درمیانی علاقہ بین (NO MANS LAND) میں ایک طرف ایک جرمن سپاہی کی لاش پڑی سڑ رہی تھی ایک گدھ دفعتاً اس کے قریب ہی بیٹھا۔ دھوئیں اور گرد و غبار کے غلیظ بادل میں اس کے جسم کے ٹکڑے اڑتے نظر آئے۔ مارٹن کانپ کر نیچے اتر گیا ۔۔۔ "لعنت بکار شیطان!" اس کے منہ سے نکلا۔

مجھے جھرجھری آگئی۔ آپ شاید اسے بزدلی سمجھیں مگر میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے بہ نکلے۔

تیز قدموں کی چاپ نے مجھے چونکا دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ہمارے سرجنٹ میجر گلاسی تھے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے دانتے کے جہنم (Dante's Inferno) کا خیال لاشعوری طور پر آجاتا تھا۔ دبلے پتلے منحنی سے آدمی تھے۔ مگر انداز میں چیتے کی سی صفائی اور پھرتی تھی۔ پچکے ہوئے گال سیاہ آنکھیں اور بلا کے سرخ ہونٹ۔

ہمیں دیکھتے ہی اہرمن (Lucifer) کے نائب نے بے ساختہ پوچھا "تم دونوں مجرد ہو؟ ۔۔۔"

"ہاں سرجنٹ۔" ہم نے اس غیر متوقع سوال پر کچھ حیران ہو کر بیک وقت جواب دیا۔

"بہت خوب" انہوں نے پسندیدگی کے لہجہ میں کہا اور پھر جرمن خندقوں کی طرف سکنے ہوئے انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے بولے "افواہ ہے کہ وہاں تازہ دم فوج نے پرانی پلٹنوں کی جگہ لی ہے۔ نہ معلوم کیا نئی افتاد پڑے۔ تاہم حکام کو کسی مصلحت کی بنا پر ایک جرمن قیدی مطلوب ہے۔ اور کرنل صاحب نے ایک شبخون مارنے کا حکم جاری کیا ہے۔ مجھے چھ رضاکار چاہئیں۔ سنا تم نے؟ ۔۔۔"

ہم ہچکچائے۔

"ہاں ہاں! میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر کسی نہ کسی کو تو یہ مشکل آسان کرنا ہی ہوگی"

اس کی آواز میں سختی کافی نمایاں تھی۔

۔۔۔ "ہاں تو کیا رائے ہے۔ نام لکھ لوں؟"

ہم جانتے تھے کہ اگر ہم نے انکار کیا۔ تو انجام بخیر نظر نہیں آتا۔ اس لئے سوائے ہاں کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

"شاباش!" انہوں نے کچھ خوش ہو کر کہا۔ اور ہمارے نام اور نمبر ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں درج کر لئے ۔۔۔ بولے "دیکھو اب تمہیں چھٹی ہے لائنوں میں جاؤ تھکے ماندے ہو جی بھر کے سو لو اور کل دس بجے کرنل صاحب کے دفتر میں حاضر ہو جاؤ ۔۔۔۔"

رہی سہی امیدوں پر بھی اوس پڑ چکی تھی۔ شبخون کی قسم کے حملے از بسکہ خطرناک اور سو فیصدی جان لیوا تھے۔ موت یقینی تھی۔ مگر ادائے فرض اس سے بھی یقینی بات تھی۔ ہم دونوں سونے کے محفوظ مقاموں کی طرف آ رہے تھے۔ کہ راستے میں رولو رسپاہی ملے ایک بالکل نوعمر لڑکا۔ اتنا کمسن کہ ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں معصوم چہرہ ملکوتی اور بشاشت کی تصویر دوسرے کے چہرے پر بلا کی المناکی اور بے پایاں حزن و ملال کے آثار۔ رتے مکمل آشنا سی معلوم ہوئی۔ دبلا زرد خوبصورت چہرہ۔ تیکھے نقوش بڑی بڑی غمناک آنکھیں۔

بولا: "واہ کیا کہنے ۔۔۔ تم بھی آگئے۔ کہو بیلی اچھے تو ہو؟"

میں نے "دور سے پہچانا۔ یہ آکسفورڈ کے ہونہار اور ہر دلعزیز شاعر بیکر تھے یونیورسٹی کے طالبعلموں کی آنکھ کا تارا اور ہزاروں عقیدت مندوں کا "کامیاب" اب صرف نہ دیں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔

میرے سینے سے کوئی چیز اٹھ کر حلق میں اٹکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بیکر دیوتا کی ایسی اعلیٰ صورت سے جیسے کلیجے پر چھریاں چل گئیں ۔۔۔ عنس دل کو یہ ہندوئیں کو جاودہ سے دیکھ کر کتنا افسوس ہوتا ہے۔ میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا "تمہیں کیا

ہو گیا ہے "کام دیوتا"؟

اس نے ایک غمناک ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے کیا ہو گیا؟ تہذیب کے علمبرداروں کے خوفناک مرض نے پوری طرح مجھ پر قابو پالیا ہے۔ زخمیوں کی چیخ پکار، توپوں کی مہیب گرج، مشین گنوں کی بے رحم باڑیں، سڑتی ہوئی بے گور و کفن لاشیں، ویرانی، تباہی ۔۔۔ آخر یہ مرض ہی تو ہے ۔۔۔ تمہاری صحت اچھی ہے تم اس میں مبتلا ہونے سے بچ گئے ہو۔ میں ناتواں تھا اس لئے شکار ہو گیا ہوں!"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اتنے میں سارجنٹ ملنز اور کیلورٹ آئے اور چھ جانبازوں کا دستہ پورا ہو گیا۔ سارجنٹ نے ہمیں راشن تقسیم کی۔ اعلیٰ شراب کی دگنی مقدار [illegible] والے سگار ہم پہنچائے گئے۔ غرضیکہ جملہ ضروریات خورد و نوش کے فراہم کرنے میں کوئی [illegible] نہ کیا گیا۔

"دیکھئے ہبلی ۔۔۔" کام دیوتا سسکی بھری ہوئی آواز میں بولا۔ "سنا کرتے تھے کہ پھانسی سے پہلے بدنصیب مجرم کی اسی طرح تواضع کی جاتی ہے ۔۔۔"

"لاحول ولا قوۃ"۔ نوعمر لڑکے رابرٹ نے سگار کے دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے کہا "ہبلی صاحب! آپ تو ہر چیز سے یوں بیزار ہیں گویا آخری وقت قریب ہے۔ میری سنئے۔ ہمارا درست ہے ہمیں ڈرانے آئے" اور ساتھ ہی سینہ تان کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے دشمن کی گولی سینے پر لینے کو مستعد ہے!

میرے منہ سے بےساختہ آفرین نکلی۔

غمگین شاعر کسی تصور میں غرق تھا۔ تھوڑے تامل کے بعد بولا۔

"ہبلی!"

"ہاں کام دیوتا!"

"نوٹ بک رکھا ہے۔ لا دو مجھے ورق۔"

نوٹ بک لیکر کام دیوتا نے آہستہ آہستہ کچھ لکھنا شروع کیا۔ رابرٹ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے اشارہ سے خاموش رہنے کی ہدایت کی ۔۔۔ "کام دیوتا" نظم کہہ رہے تھے۔

نصف شب کے قریب تک نظم مکمل ہو گئی۔ عنوان تھا "موت کے منہ میں"۔ ندرت خیال کے ساتھ سوز و گداز کی چاشنی، اور بےمثل اسلوب میں تہذیب جدید کے جاں گداز مرثیے کے پیرایہ میں مہلک زخم کھا کر دم دینے کی کیفیت اس طرح بیان ہوئی کہ سننے والوں کے آنسو نکل پڑے۔۔۔۔

رات بھلا کس کی آنکھ لگتی۔ ہاں رابرٹ اور کیلورٹ مزے سے سوتے رہے اور ہم نے اسی طرح کروٹیں لیتے اور نظم "موت کے منہ میں" کے اشعار پڑھتے پڑھتے ہی صبح کر دی۔

پو پھٹتے ہی صبح ہم سب مل کر کرنل صاحب کے دفتر میں پہنچے۔ وہ ہم [illegible] ایک بڑی میز پر محاذ جنگ کا نیلا سا نقشہ پھیلائے پائپ پی رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی نقشے پر جھکے۔ اور سرخ پنسل سے نیلے نقشہ پر دکھاتے ہوئے "ایک راستہ پرستان لگا ہوا ہے یہاں ہمارے خاردار تاروں کے جنگل میں ایک دروازہ ہے۔ آپ لوگ اس راستہ سے باہر نکلیں گے۔ درمیانی قطعہ زمین طے کرنے کے بعد جرمن جنگلہ کے تار سارجنٹ ملنز یہاں سے کاٹیں گے۔ اس کے بعد شہباز کی تند و تیز جھپٹ اور آپ لوگ اچانک جرمن خندقوں کے درمیان پائیں گے ۔۔۔ مسٹر کیلورٹ ہر آن کی مخالف فرائض تعزیتیں کرنے پر متعین ہیں ۔۔۔ یاد رکھئے آپ لوگوں کو ایک جرمن قیدی ضرور لانا پڑے گا۔ کامیابی کا انحصار صرف مستعدی اور چابکدستی پر ہے۔ ہمارا میدانی توپخانہ اس دفعہ میں دشمنوں کو کافی مشغول رکھے گا۔ میمنہ و میسرہ کی طرف سے مشین گنوں کی باڑیں آپ لوگوں کو سیدھے رکھیں گی۔ پھر کہتا ہوں کہ کامیابی کا انحصار صرف تیزی اور جرأت پر ہے۔ ذرا چوکے اور مارے گئے ۔۔۔"

ہم سب نے فوجی سلام کیا۔ انہوں نے ہر ایک سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور "بسلامت روی و بازآئی" کہہ کر توپ خانے کی طرف چل دیئے۔

(۳)

شام کے سائے گہری تاریکیوں میں تحلیل ہو گئے۔ شفق کی گود میں پلی ہوئی خونیں بدلیاں اپنے تاریک دامنوں میں روپوش ہو گئیں۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوائیں دھیمے سُروں میں کوئی ماتمی گیت پڑھتی تھیں۔ تارے نکلے تو چھ جانبازوں کا مختصر سا دستہ چوبی زینہ کو طے کر کے ریت کی بوریوں پر سے ہوتا ہوا جنگلے کے دروازے کے قریب سینہ کے بل لیٹ گیا۔ اتنے میں توپخانہ کا ایک افسر وارد ہوا جس سے معلوم ہوا کہ جلد ہی توپوں کے دہانے کھول دیئے جائیں گے۔

تاریکی زیادہ رہتی مگر ہم نے چونکہ اپنی وردیوں کے بٹن اور جملہ ساز و سامان، اپنے ہاتھ پاؤں اور منہ سیاہ کر دیئے تھے اس لئے صرف ہماری سانسیں ایک دوسرے کی موجودگی کا اعلان کرتی تھیں۔ ورنہ دیکھنا ناممکن تھا۔ مسٹر کیلورٹ نے پھر ہمیں شراب تقسیم کی۔ رابرٹ نے پینے سے انکار کر دیا۔ سارجنٹ ملنز نے کہا۔

"واہ بیٹا ۔۔۔ اتنی پرہیزگاری۔۔۔؟ مگر برخوردار شراب کے دو گھونٹ حلق سے اترنے دو۔ تو فائدہ رہے گا!"

"کیوں؟" رابرٹ نے بھولپن سے سوال کیا۔

"عجیب احمق ہو۔" مسٹر کیلورٹ نے کچھ تلخی سے کہا۔ "میاں صاحبزادے۔ اوسان بجا رہیں گے۔ نئی امنگ، نیا عزم اور نیا جوش محسوس کرو گے ۔۔۔ ورنہ یوں تو مجھے ڈر ہے کہ تمہارے دل کی حرکت ہی نہ بند ہو جائے!"

"مسٹر کیلورٹ!" رابرٹ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ گولی ابھی تیار نہیں ہوئی۔ جو رابرٹ کی جان کی دعویدار بنے گی۔ نیز میری ماں نے مجھے فوج میں شراب پینے اور سپاہیوں کی طرح واہی تباہی بکنے سے سخت

منع کیا تھا۔ میں نے اس کا کہا ہمیشہ مانا ہے۔ مجھے تو معاف کیجئے، میں نہیں جیتا!"

"اچھا میرے ننھے پولین" —— مسٹر کیلورٹ نے زچ ہو کر کہا۔ "جیسے تمہاری مرضی" دروازے سے گذر کر ہم گولوں کے تباہ کن اثرات کے طفیل ناہموار زمین پر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے بڑھے۔ دفعتاً زمین دھما ایک مہیب گرج سے کانپ اٹھی۔ برطانوی توپخانے کی پہلی باڑ کے ساتھ مشین گنوں سے گولیوں کی بے پناہ بوچھاڑیں شروع ہوئیں۔ ہم بڑھتے گئے۔ دشمن ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد ایک جگہ ایک بہت بڑا گڑھا ملا۔ جو شاید کسی طاقتور توپ کے گولے کی کارفرمائی تھی۔ مسٹر کیلورٹ نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ سامنے جرمن خندقوں کا جنگلہ صاف نظر آتا تھا۔

سارجنٹ ٹمنز اور مسٹر کیلورٹ میں آپس میں سرگوشیوں میں کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد سارجنٹ ٹمنز پیٹ کے بل رینگتا جرمن خندقوں کی طرف بڑھا۔

گولہ باری اور بھی شدید ہو گئی ——

گولوں کی خوفناک گرج اور گولیوں کی بے پناہ "دھائیں دھائیں" میں جرمن خندقوں سے گھبرائی ہوئی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ شاید اس بے وقت گولہ باری کے لئے وہ لوگ تیار نہ تھے۔ مجھے کرنل صاحب کا قول یاد آیا۔

"کامیابی کا انحصار صرف سرعت اور جگری پر ہے"

میرے ماتھے پر پسینہ نکل آیا اور اگر ذرا سی تاخیر بھی ہوئی تو ۔ ۔

مارٹن میرے پاس ہی کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا "یوں جی نہ ہارو مارٹن دل کڑا کرو ——!"

مارٹن نے لرزتے ہوئے جواب دیا "مجھ سے مجھ سے یہ انتظار کی تلخی برداشت نہیں ہو سکتی —— دل اچھلا جاتا ہے . ."

رابرٹ نے ہلکا سا ایک قہقہہ لگایا اور کہا "کیسے مارٹن صاحب، آپ بھی طرفہ آدمی ہیں!!" ——

درحقیقت یہ گھڑیاں بڑی کٹھن تھیں۔ سارجنٹ ٹمنز کے واپس آنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں ہم سب پھر تیار ہو گئے ——

"دوڑو" مسٹر کیلورٹ نے حکم دیا۔ اور ہم سب پھر اندھا دھند ٹوٹتے ٹکراتے لڑھکتے جرمن خندقوں کی طرف چلے۔

(۴)

یکے بعد دیگرے ہاتھوں اور پاؤں پر چوپایوں کی مثل چلتے ہوئے ہم خاردار تاروں کے نیچے سے لہولہان ہو کر نکلے۔ تاریکی میں تاریں اچھی طرح نہ کاٹی گئی تھی۔ اس لئے ان ہی کانٹوں نے جی بھر کر ہمارے جسموں سے خون پینے کی کوشش کی۔ رینگتے رینگتے ہم پشتہ کے پاس پہنچے اور ریت کی بوریوں کی اوٹ میں دبک گئے۔

اب کوئی آواز نہ آتی تھی۔ جرمن جانباز سنبھل کر مستعدی سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے میرا دل بیٹھ گیا شاید ان لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع ہو گئی جو اس طرح دم سادھے ٹھنڈے دل سے ہمیں حلال کر دینے کی فکر میں ہیں!!

ہر ایک آدمی میں دو دو بم تقسیم کر دیئے گئے۔ مسٹر کیلورٹ نے سرگوشی کے لہجہ میں آرڈر دیا۔ سب نے پہلے بم سے سیفٹی پن نکال لی ——

"دو تین" کہتے پر ہم نے ایک ساتھ خندق میں بم پھینکے بس قیامت برپا ہو گئی گھبرائی ہوئی آوازیں اور زخمیوں کے کراہنے کی دلخراش صدائیں بموں کی فلک شگاف گرج کے ساتھ مل کر جیسے میرے دل میں پیوست ہو گئیں۔

دوسرا بم پھینکا گیا۔ شور اور دونا ہو گیا!!

مسٹر کیلورٹ نے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ خندق گرتے ہوئے پشتوں آگ اور خونی منظر سے دوزخ کا نمونہ بن رہی تھی۔ مارٹن کی سنگین ایک بوڑھے جرمن کے سینے سے پار ہو گئی اور گرم گرم خون کے فوارے میرے ہاتھوں اور منہ پر پڑے۔ مسٹر کیلورٹ نے ایک جرمن افسر کی اونچی خوبصورت پیشانی کو اپنے پستول کی گولی سے ریزہ ریزہ کر دیا۔ رابرٹ اور کام دیوتا بیکر ابھی پشتے پر سے دائیں بائیں بم پھینک رہے تھے۔ ایک بم قریب ہی پھٹا —— مسٹر کیلورٹ کے ٹکڑے اڑ گئے!!

سارجنٹ ٹمنز نے ایک نوجوان جرمن کو گلے سے پکڑ لیا۔

"پکڑو —— جانے نہ پائے" اس نے چیخ کر کہا۔

میں اور مارٹن اس کی طرف لپکے اور اس کے بازو تھام لئے۔ بیچارے کی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑتی تھیں۔

"رحم —— رحم!" وہ چلایا . . . .

"مجھے بہت افسوس ہے برخوردار —— مگر میں مجبور ہوں" سارجنٹ نے گلا پھاڑ کر جواب دیا۔ ساتھ ہی اس نے جھٹک کر اپنا ریوالور اس کی دونوں ٹانگوں پر خالی کر دیا۔ غریب بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سارجنٹ نے اٹھا کر زور سے پشتے کی طرف پھینکا۔

"تم دونوں اس کو اٹھا کر بھاگو —— جاؤ جلدی کرو۔"

ہم دونوں بجلی کی سرعت سے پشتے پر چڑھے بیہوش جرمن کو گھسیٹتے۔ گرتے، سنبھلتے بھاگے —— درمیانی قطعۂ زمین جہنم کا نمونہ تھا۔ جرمن لائنوں کے دونوں طرف سے مشین گنوں کی باڑیں قیامت برپا کر رہی تھیں پگھلی ہوئی آگ رنجنی کے بم اور انتہائی طور پر آتشگیر اور تباہ کن گولے ہر طرف پھٹ رہے تھے۔ تمام دنیا جیسے ایک مہیب زلزلے سے جڑوں تک ہل رہی تھی۔

دھوئیں کے عمیق بادل میں سے مڑ کر میں نے دیکھا۔ بیکر اور رابرٹ پشتے پر سے رینگتے دکھائی دیئے۔ نزدیک ہی ایک گولا ایک فلک شگاف گرج کے ساتھ پھٹا۔ دھوئیں اور کھدی ہوئی زمین کا ایک ٹکڑا ایک بہت بڑے تاریک بادل کی صورت میں تمام دنیا میں چھا گیا —— یکایک بارود کی سبزی مائل نارنجی روشنی سے تمام گرد و پیش منور ہو گیا۔

ـــے پھر مڑ کر دیکھا۔ رابرٹ اور کام دیوتا بنگلے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ دفعتہً رابرٹ سرو قد کھڑا ہو گیا، پیچھے ہٹا اور تیزی سے دوڑ کر ایک سمت میں جنگلے سے پار ہو گیا۔

کبھی رینگتے کبھی دوڑتے گڑھوں میں سر کے بل گرتے ٹھوکریں کھاتے ـــ ہم ... ملتے ملاتے ہم لوگ بڑھے چلے گئے۔ بارود کے دھوئیں اور گرد و غبار کی ... سے میرے نتھنوں میں ہلکا درد ہو رہا تھا سانس رک رک کر چلتی تھی۔ گرمی بہت تھی ... آنکھوں میں غضب کی سوزش تھی۔ اور سر میں قیامت کا سودا کم بخت جو ... بوجھل ہو رہا تھا۔

اتنے میں بیکر اور رابرٹ ہم سے آ ملے۔ کچھ فاصلے پر سرجنٹ ملنر ٹھوکریں کھاتا کھاتا آ رہا تھا۔

"بھئی واہ بیلی صاحب! آفرین ہے ہمت کیجئے، وہ رہی ہماری ...ٔ" رابرٹ نے خوش مزاجی سے کہا۔

"ارے میاں بہت تنی ہوا ہیں!" میں نے جل کر کہا، "مگر رابرٹ! تو ہم لوگ ... بچے یا کالج گراؤنڈ میں۔ جو اس طرح ہاکی ... کی مشق فرمانے لگے۔ اگر کوئی اصولی ... گولی بھی چل گئی تو بچہ ٹھیں ہو جاتے۔"

"مرنا قبول اگر اس منحوس تار کے پیچھے سے رینگ کر لہولہان ہو کر ... سطر ... " ملٹن نے کہا۔ "کیوں رابرٹ ہے نا یہی بات؟"

"آدمی نہیں شیطان کا باپ ہے"، "مقتول ابلیس کا" سرجنٹ ملنر نے ... سے کہا۔ "میلو جلدی کرو!"

ایک گولہ دل دہلا دینے والی گرج کے ساتھ ہمارے سر پر پھٹتا معلوم ہوا۔ سب ہم ایک گڑھے میں دبک گئے۔ ساتھ ہی گولیوں کی ایک ہولناک ... سنائی ہوئی اور کام دیوتا کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ رابرٹ جھپٹ کر قریب آیا۔

بارود کی جلتی ہوئی سنسناتی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ کام دیوتا کے سینہ سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ زخم پر ... رک رک کر کہا

"گولی کے ـــ کھاؤ ... ان دونوں ہاتھوں سے ـــ بھیج دو ـــ روح کا ... طائر ـــ اس راہ سے ... اڑ جائے! ـــ"

میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب نکلا۔ نظم "سمرسن کے سر میں" کا آخری مصرع تھا۔

کام دیوتا نے ایک ہچکی لی۔ اس کا خوبصورت سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ بڑی آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر اور بے جان ہو کر بجھ سی گئیں ـــ

رابرٹ نے ایک سسکی بھر کر کہا، "خدا حافظ بھیا، خدا تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے!"

بنگلے تک پہنچتے پہنچتے ہم مارٹن کو بھی خدا کو سونپ بیٹھے ـــ

کسی نہ کسی طرح جب بنگلے کے پاس ... میری یہ حالت تھی کہ دم گھٹا جا رہا تھا۔ ... میں نے اپنی خندقوں کو دیکھا نہیں مگر ... کسی نشیبی جگہ میں گر گیا ... ہو سے۔ جہاں سے سپاہیوں کے بولنے کی مبہم آوازیں میرے دل میں گھستی جا رہی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے اٹھا کر کہیں لیجایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد تمام دنیا گھومتی ہوئی ... دل اور تاریکیوں کے دائروں میں تھرکتی کہیں گم ہو گئی۔ معلوم نہیں کہاں؟

(۵)

میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر کوئی جھکا ہوا میرے بھینچے ہوئے جبڑوں کو کھول کر میرے منہ میں برانڈی ٹپکانے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ دو موم بتیوں کی ناتواں سی روشنی ہو رہی تھی۔ کمرے میں عجیب نامعقول سائے پھڑپھڑا رہے تھے۔

"تسلی رکھو میرے دوست گھبرانے کی کوئی بات نہیں!" کسی نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

میں نے تکیئے کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا۔

فرش پر سرجنٹ ملنر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ دائیں ٹانگ پر پٹیاں بندھی تھیں۔ ایک بازو گلے میں حمائل تھا۔ رابرٹ بخیر و عافیت ایک لکڑی کے صندوق پر آرام سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"تم زخمی ہو گئے سرجنٹ؟"

"ہاں مگر کچھ زیادہ نہیں ... تم کیسے ہو؟"

"اب تو طبیعت قدرے بحال ہے" میں نے ہاتھوں سے اپنے سر کو دباتے ہوئے کہا۔

اتنے میں میجر گلاسلی اور کرنل صاحب اندر آئے۔ میجر نے آتے ہی پوچھا، "باقی لوگ کہاں ہیں سرجنٹ، بیکر، مارٹن ...؟"

رابرٹ نے بات کاٹ کر کہا، "صرف ہم بچ کر آئے ہیں میجر صاحب ـــ"

"مجھے افسوس ہے خصوصاً بیکر کی بے وقت موت کا" کرنل صاحب نے آہ بھر کر کہا۔

میجر گلاسلی صاحب چونکہ قانون کے پورے عامل اور وہ گیر آدمی تھے سرجنٹ ملنر سے مخاطباً اور رابرٹ کا جواب ـــ "مسٹر ... اس پر کرنل صاحب کی مخاصمانہ آرائی!" میجر نے آگ بگولا ہو کر درشت آواز میں کہا۔

"مسٹر جنٹ ملنر ... جواب دو ـــ"

"لعنت بکار شیطان ـــ" سرجنٹ ملنر نے جل کر سگریٹ کا باقیماندہ ٹکڑا کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

میجر گلاسلی چونک پڑے مگر کرنل صاحب نے بڑے اطمینان سے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"میجر صاحب قیدی کہاں ہے؟"

میجر گلاسلی نے سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے جواب دیا۔ "حضور! یہ شبخون ایک خوفناک ناکامی پر منتج ہوا ہے۔ غالباً قیدی کو بڑی بے پروائی اور ناعاقبت اندیشی سے لایا گیا ہے۔"

ہم سب چونک پڑے۔ رابرٹ نے متعجب ہو کر پوچھا، "وہ کیسے میجر صاحب؟"

"ٹھیک تو کہہ رہا ہوں کہ تمہارا تجزیہ ناکام رہا ہے۔ مجھے نے درشتی سے کہا معلوم ہوتا ہے اس کی لازمی حفاظت نہیں کی گئی۔ لوہے کا ایک تیز ٹکڑا آپ لوگوں کے کھینچنے کی بدولت اس کے پیٹ میں یوں لگا کہ بیچارا" چورنگ ہو گیا صرف دس منٹ گذرے کہ کم بخت بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے جہنم رسید ہوا۔"

ہم سب پر جیسے بجلی گری تجزیوں کے تمام واقعات متحرک تصویروں کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اتنی عدیم المثال جانفشانی اور بے جگری کا صلہ یہ ملا کہ بہترین دوستوں کی قسمت پر ایک خشک وارننگ ہمارے لئے تھی۔

چند منٹ اسی طرح گذر گئے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ یکایک رابرٹ کا اونچا اور دلآویز قہقہہ کمرے کی خاموشی میں گونجا "کتنی دلچسپ جنگ ہے والد سے" اس نے پیٹ پکڑتے ہنستے ہنستے کہا۔

اور ہم سب بے اختیار ہنس دیئے !!

(ترجمہ)

آ گئے

از
منیر کمال (جالندھری)

یاس و غم کی ظلمتوں کو جگمگاتے آ گئے
خواب میں وہ مسکراتے مسکراتے آ گئے

بخش کر تاروں کی افسردہ نگاہوں کو شباب
وہ شبِ مہتاب میں جلوے لٹاتے آ گئے

ہو گئے ویرانے آباد اس خرام ناز سے
ہر قدم پر وہ نئی جنّت بساتے آ گئے

اک پجارن کی عقیدت خیز آہوں کی طرح
ساز پر دھیمے سُروں میں گیت گاتے آ گئے

شب کے وحشتناک سنّاٹے میں راوی کے قریب
بنسری کی لَے میں وہ تانیں اڑاتے آ گئے

آبشاروں کے حسیں منظر میں با چنگ و رباب
دیوتاؤں کے رسیلے گیت گاتے آ گئے

رس بھرے ہونٹوں سے چھلکا کر شرابِ ارغواں
فلسفیوں کو بھی دیوانہ بناتے آ گئے

گل بداماں، نغمۂ دلکش بلب، گیسو بدوش
زندگی کو میری افسانہ بناتے آ گئے

مصر کا ایک رنگیلا فرعون

از کاظمی فارابی

انسان شروع سے یہ دیکھتا آیا ہے۔ کہ اس سے پہلے اس دنیا میں بسنے والوں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی کی جس سے آنے والوں کو اپنے آبا و اجداد کا پتہ چلتا رہا۔ اور ان آثار قدیم میں ان نقوش باقی ہیں۔ دیکھ کر اب یہ بات گویا ہماری فطرت میں داخل ہو چکی ہے۔ کہ ہم زندگی کے ضروری دھندوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسی باتیں بھی کر رہے ہیں جو اگر نہ بھی کی جائیں۔ تو ہمارے موجودہ امن و راحت میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی اس قسم کے فالتو کاموں کی تکمیل کچھ زیادہ جذبۂ نام و نمود کی مرہون منت ہوتی ہے اور کسی حد تک ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے کام ہماری ذات کی نسبت زیادہ پائیدار ثابت ہوں۔ انہیں آئندہ نسلیں دیکھیں۔ ایسے پائیدار کاموں کی ابتداء اکثر سے عموماً حکومتیں ہی کراتی آئی ہیں۔ آج کی بات کو جانے دیجئے کل کی بات ہی پر غور کیجئے قطب مینار، تاج محل، لال قلعے، پیلے قلعے، باغات، گرجا، مندر، مسجد۔ جہاں [illegible] کی ذہانت کا [illegible] مل رہی ہیں۔ وہاں انسان کے اس جذبۂ نمود کا ثبوت بھی ہیں۔ اور یہ بات کچھ ہمارے ہی ملک تک محدود نہیں۔ نوع انسانی کرۂ ارض کے ہر خطے میں موجود ہے۔ اور یہ انسانی عنصر بھی ہر جگہ ایک سا واقع ہوا ہے۔

تاریخ کے دھندلکے کی چھان بین کرتے ہوئے ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان صرف انسان ہی بن کر رہ گئے ہیں۔ البتہ بعض ایسے بھی نکلے ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں کبھی کم از کم آنے والوں کی نگاہوں میں خود کو انسان سے بڑھا کر ایک دیوتا بنا ڈالا۔ ہندوستان کے برہمن یونان کے فلسفی اور مصر کے فرعون ہیں۔ انسانوں کا ایک ایسا گروہ معلوم ہوتے ہیں۔ جو صرف جسمانی لحاظ سے انسان دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ ان کی ہستی بھی اور لوگوں کی طرح ناپائیدار رہی لیکن ذہنی لحاظ سے ان کے کمالات آج بھی ہم میں اولوالعزمی پیدا کر رہے ہیں۔

ہندی میں ایک کہاوت ہے۔ کہ جتھا راجہ تتھا پرجا۔ اور یہ کہاوت مصر کی قدیم تہذیب و تمدن اور تاریخ پر بہت حد تک صادق آتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ ہمارا علم مصر کے بادشاہوں تک ہی محدود رہے۔ پھر بھی ان چند منتخب افراد ہی سے ہم اس اقلیم عظیم کے چلن اور رہن سہن کے بارے میں کافی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جو بیشمار صدیوں سے دریائے نیل تک شمالی افریقہ کے مشرقی حصے میں زندگی گزارتا رہا۔ مصر کے آثار قدیمہ میں فن تعمیر کے سب سے زیادہ مشہور مظاہر ابوالہول اور اہرام مصر ہیں اگر ہم تعصب کی پرواہ کئے بغیر [illegible] ان عمارتوں کو اپنی ذہنی آنکھ سے دیکھیں تو [illegible] کی نیند سے [illegible] پیدا ہوتا ہے۔ اور

اسی پہلی شان سے چلتا پھرتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ جب ان عمارتوں کے مقامات پر زمین کا سینہ صاف تھا۔ ذرا خیال کیجئے۔ کہ یہ بے تحاشا لمبے چوڑے مظاہرے کیونکر بنے ہوں گے۔ ان مصنوعی پہاڑوں کی تعمیر کے لئے ضروری مصالحہ اور دیگر ساز و سامان کیونکر بہم پہنچایا گیا ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام کا تمام مصر گدھوں اور چھکڑوں پر لادے ایک کارواں کی صورت میں چل دیا ہو گا۔ اور وہ چیزیں یہاں لایا ہو گا جنہیں ان گنت کاریگروں نے ایک ایسی شکل دیدی جسے دستبرد زمانہ سے بچ کر ہمارے دلوں پر ہیبت کا سکہ بٹھانے کی قسمت نصیب ہوئی لیکن ٹھہرئیے ہم کہیں ان ہیبت افزا مناظر ہی میں نہ ڈوب کر رہ جائیں ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ کہ ان لوگوں کا حال ان کے کاموں کا حال اور ان کے خیالات کا حال موجودہ انسان تک کیسے پہنچا۔ اس پہلو سے جب ہم غور کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر کی صرف سیاسی تاریخ ہی ہمارے لئے ان جانی ہے۔ اس کے برعکس یہاں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ ایک کھلی کتاب کا ورق ہے۔ قدیم مصریوں کا جوہر ذہانت ان کے مندروں اور مقبروں کی دیواروں پر نمایاں ہے۔ ان دیواروں کے نقوش میں ان کی نجی زندگی ان کی ہیکل کا روزنامچہ ان کے مذہبی رجحانات عقائد سب کا اظہار ہو رہا ہے۔ آریہ رومن یونانی چینی کسی بھی گروہ انسانی کی سماجی زندگی سے متعلق ہمیں اس قدر تفاصیل معلوم نہیں ہوتیں جتنی قدیم مصریوں کے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ اور اس علم کے لئے دو باتیں ہماری مددگار ثابت ہوتی ہیں پہلے شمالی مصر کی وہ خشک آب و ہوا اور وہ سرزمین جس نے آثار قدیمہ کے خزانوں کو صدیوں ہمارے لئے محفوظ رکھا اور دوسرے قدیم مصریوں کا یہ عقیدہ کہ مرنے کے بعد مرنے والے کو اپنی محبوب اشیاء کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ موت کے بعد روح کو بھی اسی طرح ضروریات زندگی کی حاجت ہوتی ہے۔ جیسے کسی چلتے پھرتے انسان کو اس لئے مرنے کے بعد غریب غربا اپنی حیثیت کے مطابق اور امراء اپنی حیثیت سے بڑھ کر اور حاکمان وقت اپنے جاہ و حشم کے لحاظ سے اپنے عزیزوں کے مقبروں میں زیر زمین ہر طرح کا سامان دفن کر دیتے تھے۔ تاکہ مرنے والے کی روح کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو اور بوقت ضرورت ہر چیز اس کے کام آئے۔ یہ دبی ہوئی چیزیں مرنے والے کے تو کام نہ آسکیں لیکن ہم زندوں نے جب ان گڑے مردوں کو اکھاڑا۔ تو یہ سب اشیاء زمانے کی [illegible] بیتے ہوئے دور کی سند قرار پائیں۔ بادشاہ [illegible] ہے کہ جب کسی ایسے دیوتا کو دبا دیا جاتا ہوگا

تو اس کے ساتھ کیا کچھ یونہی پیوند زمین نہ کر دیئے ہونگے۔ مختصر لفظوں میں یہی کافی ہے کہ اگر مصر کے کسی بادشاہ یعنی فرعون کے مقبرے کی چھان پھٹک کی جائے۔ تو اس کی پوری پرجا کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ہماری نظر میں یہ گئے گذرے بادشاہ سب برابر ہیں۔ اس لئے ان سب کی تاریخ کی بجائے مثال کے طور پر ہم ایک ایسے فرعون کا مختصر سا حال لیتے ہیں جس کی زندگی بہت سے پہلوؤں سے غور کے لائق ہے۔ ہماری مراد اس جگہ "توت عنخ آمن" سے ہے۔

اس پہلو میں سب سے پہلی دلچسپی تو یہی ہے کہ اس فرعون کے متعلق ابھی تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہمیں تقریباً کوئی بات بھی معلوم نہ تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہم فقط اسی قدر جانتے تھے۔ کہ وہ پیدا ہوا اور مر گیا۔ لیکن آج اس کی یادگاروں اس کے فرمانوں اور اس کے مجسموں سے ہم اس کے مختصر لیکن شاندار زمانے کا تصور قائم کر سکتے ہیں کسی بڑے انسان کی تقدیر کا حال تاریخ دان کے لئے خصوصاً دلچسپ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ تقدیر اس کے ہمعصر انسانوں کا ایک عکس ہوتی ہے۔ توت عنخ آمن بھی ایک ایسا ہی بڑا انسان تھا۔ اس کے مختصر زمانہ حکومت میں مصر کے باشندے ایک ایسے تاریخی دور سے گذرے جو نہ صرف قوموں کی قسمت کو بدل دیتا ہے بلکہ جس سے انسانیت کی کہانی زیادہ دلچسپ اور اہم ہو جاتی ہے۔ آیئے ہم اس بے نظیر فرعون کے ساتھ مل کر کچھ وقت گذاریں اسکی بیتی آپ بیتی سمجھیں بلکہ اس کے آس پاس والوں کو بھی اپنے ہمسائے خیال کریں تاکہ جو بات وہ ہمیں نہ بتائے اس کے ہمسایوں سے معلوم ہو جائے۔ کیونکہ توت عنخ آمن ایک تصویر ہے۔ اور اس کی پرجا اور اس کے درباری اور اس کے ہمسائے اس تصویر کا فریم ہیں۔

تخلیق ارض سے اب تک کی مدت میں تاریخ مصر ایک لمحہ ہے۔ اور تاریخ مصر میں توت عنخ آمن کا زمانہ حکومت ایک ثانیہ ہے۔ اس دور حکومت کی نمایاں خصوصیت شمالی اور جنوبی مصر کی باہمی کشمکش ہے شمالی حصہ دریائے نیل کا ڈیلٹائی خطہ ہے جسے سطح اعلیٰ کی نسبت سے تالاب کہا جا سکتا ہے۔ اور اس خطے کو سمندر کا ساتھ بھی ملا ہوا ہے۔ اس سمندر ہی کی وجہ سے یہاں کے رہنے والے شروع سے غیر ملکوں کے ساتھ ربط ضبط رکھتے رہے ہیں۔ اور حالات کے مطابق ہی باتیں اختیار کر کے ہمیشہ نئے رنگ میں ڈھلتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جنوبی حصہ اگرچہ دریائے نیل کی وسیع وادی ہے۔ لیکن تینوں طرفوں سے پہاڑوں نے اسے گھیر رکھا ہے یہاں کے رہنے والوں کی زندگی کا انحصار دریائے نیل ہی کی نعمتوں پر رہا ہے اس سے وہ ہمیشہ ایک ہی ذہنی اور روحانی مرکز پر رہتے رہے ہیں۔ اور اپنی مذہبی اور قومی روایات کا دامن سنبھالے زندگی گذارتے رہے ہیں۔ اسی دریائے نیل کے ارد گرد شروع شروع میں مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں لیکن اس دریا کے گہرے رشتے نے رفتہ رفتہ ان منتشر ٹکڑوں کو دو بڑی سلطنتوں میں تبدیل کر دیا۔ توت عنخ آمن سے کچھ مدت پہلے تک یہی دونوں

سلطنتوں میں اپنے مذہبی اور نظری رجحانات کے اختلاف کی بنا پر کشیدگی چلی آ رہی تھی۔ اور اس نزاع میں جنوبی باشندوں نے غلبہ پایا۔ اور تین ہزار تین سو برس قبل مسیح میں تمام مصر ایک وسیع سلطنت بن گیا۔ اس وسیع سلطنت پر مختلف وقتوں میں فراعنہ کے مختلف خاندانوں کی حکومت رہی۔ شروع میں اس متحدہ سلطنت کا دارالخلافہ تھیبس کا مقام رہا۔ لیکن فراعنہ کے چوتھے خاندان سے لیکر انتیس سو قبل مسیح سے پایہ تخت کو موجودہ شہر قاہرہ کے قریب ممفس (memphis) کے مقام پر تبدیل کر دیا گیا۔ ممفائی سلطنت کا قیام سات صدیوں تک رہا۔ اور اس دور میں مصر کی طاقت اور یہاں کی تہذیب کا ارتقا انتہائی بلندی پر جا پہنچا۔ سلطنت کی وسعت اور استحکام کے ساتھ ساتھ فارغ البالی اور فنون کی ترقی بھی اس زمانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس زمانے میں وہ مصنوعی پربت تیار کئے گئے جنہیں اہرام مصر کہتے ہیں۔

سلطنت کے دارالخلافے کی شمالی اور جنوبی حیثیت دونوں حصوں کو پوری طرح متحد نہ رکھ سکی۔ اس لئے حکومت کی ضروریات کے لحاظ سے کچھ مدت کے بعد دارالخلافے کو درمیانی مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ جگہ آجکل لشت کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ یہ بات فراعنہ کے گیارہویں خاندان کی حکومت میں ہوئی۔ اور اس وقت سے حکومت کو بھی وسطی سلطنت کہا جانے لگا۔ اس سلطنت وسطی کی انتہائی بلندی کا زمانہ بارہویں خاندان کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں سب سے نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ ماضی کے برعکس حکومت کے عہدے ورثے کی بجائے قابلیت کے نقطہ نظر سے مقرر ہونے لگے۔ اور عوام بھی نہ صرف حکومت میں حصہ لینے کے حقدار ہو گئے۔ بلکہ انہیں مساوی شہری حقوق ملے۔ اور زندگی اور موت میں ان کا درجہ امرا کے برابر سمجھا جانے لگا۔ ادب اور آرٹ نے پھر ترقی کی اسلوبی پھلی پھولی قصے کہانیوں کے جال اور پیچیدہ ہو گئے۔ اور فن کے ہر شعبے میں شاہکاروں کی تخلیق ہوئی۔

اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں اس سلطنت کو زوال ہوا۔ اس زوال کا نمایاں باعث ان صحرائی قبیلوں کی بغاوت تھی جنہوں نے مسلح مقابلوں سے شکست دیکر فراعنہ کا تاج اپنے سر پر رکھا۔ اور تمام شمالی علاقے کو فتح کر لیا۔ یہ ایک طرح سے جنوبی فاتح کا شمالی فاتح سے انتقام تھا لیکن آخر تھیبس سے ایک حکمران اٹھا۔ تو جدوجہد شروع کی۔ اور صحرائی قبیلوں کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ اور اس کے جانشین آمیس اول نے از سر نو ڈیلٹائی خطے کو فتح کر لیا۔ اور یوں اٹھارہویں خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس نئی حکومت نے اپنا پایہ تخت تھیبس مقرر کیا اور آمن کے مقامی مسلک کو قومی عبادت قرار دے دیا۔ اور اس طرح سے جنوب نے استحکام حاصل کیا۔ یہ بات ۱۵۰۰ قبل مسیح کی ہے۔ اس وقت سے مصر کی تاریخ کا زریں دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مصریوں نے اپنی تجارت اور تہذیب کی دھاک افریقہ ہی تک نہ رکھی۔ بلکہ ایشیا میں پے در پے فتوحات کے بعد ایک متحدہ سلطنت کی بنیاد ڈالی [illegible] فراعنہ کے تخت پر بڑا ہی قابل اور پرجوش حکمران [illegible]

نہ صرف مصر کی قومی عظمت انتہائے عروج پر تھی بلکہ یہ زمانہ فن تعمیر کا سنہری دور تھا جس نے تھیبس اور اس کے نواحی علاقوں میں بڑے بڑے عالیشان مندر بنائے۔ ۱۴۱۱ء سے ۱۳۷۵ء قبل مسیح تک آمینوفیس سوم کا دور تھا۔ اس کی حکومت نہایت امن سے گذری۔ اور جیسے بادشاہ جنت کو گئے تھے۔ اس کا بیٹا اس کا حکمران ہوا۔ آمینوفیس سوم کے بعد آمینوفیس چہارم تخت پر بیٹھا۔ یہ ایک مضطرب طبیعت کا مالک تھا پر جوش اور ضدی ہونے کی وجہ سے اسے تاریخ انسانی میں "فرد اول" بلکہ "پہلا پیمبر" بھی کہا جاتا ہے۔ تخت نشینی پر اسے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس نے ملک کے انتشار کو دور کرنے کے لئے فوجی طاقت کی بجائے خیالات سے کام لیا۔ اس نے ایک دیوتا کی پرستش کا رواج ڈالا تاکہ تمام سلطنت اس مرکز پر متحد ہو جائے لیکن اس طرح کا ہمہ گیر دیوتا مصر کا مقامی دیوتا نہ بن سکتا تھا چنانچہ آمینوفیس نے اس رتبہ کے لئے سورج دیوتا کو منتخب کیا جو بازندگی کو شمسی حرارت کی صورت میں پوجا جانے لگا فرعون نے خود اس نئے دیوتا کی مدح میں پر جوش مناجاتیں لکھیں جو ہم تک بھی پہنچی ہیں۔ اس بیباک اقدام کی حمایت صرف تھال کے پروہتوں نے کی۔ باقی اس کے شدید مخالف بن گئے۔ یہ وحدانیت ہر پرانی روایت کی ضد تھی۔ اس لئے پنپ نہ سکی۔ چنانچہ آمینوفیس کا جانشین توت عنخ آمن پھر سے قدیم مصری روایات مذہب کی طرف مائل ہو گیا کیونکہ کسی سلطنت کا اقتدار یا برتری اس کے حکمران کی ذاتی برتری کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ ملک اور قوم کے اعتقادات اور احساسات ہی کا زندہ نمائندہ حکمران ہوتا ہے اور اسی محکم بنیاد پر ملک کی سیاسی حیثیت خارجی اور داخلی لحاظ سے عظمت حاصل کرتی ہے۔

آیئے اب ذرا اس شاندار فرعون۔ توت عنخ آمن کی زندگی پر ایک چھپلتی ہوئی نگاہ ڈالیں۔ آسانی کے لئے ہم اس کی زندگی کے تین دور کئے لیتے ہیں۔ پہلا دور بچپن اور تعلیم کا۔ دوسرا دور جوانی کا اور حکومت کا۔ اور تیسرا دور انجام۔

توت عنخ آمن کے پیشرو حکمران فرعون آمینوفیس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ البتہ سات بیٹیاں اس کی سرکاری اولاد میں شمار کی جاتی تھیں توت عنخ آمن بیٹا تو آمینوفیس ہی کا تھا لیکن بیاہتا بیوی سے نہیں۔ بلکہ کسی داشتہ سے تھا۔ اس لئے تخت کا وارث بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اس کا رشتہ جائز خون شاہی سے کرایا جائے۔ اس مشکل کا حل آسان تھا۔ آمینوفیس کی ایک بیٹی سے اس کی شادی کر کے یہ کام بھی پورا ہوا۔ توت عنخ آمن ساتوں شہزادیوں کے ساتھ بچپن کی زندگی بسر کرتا رہا۔ دستور زمانہ کے مطابق شاہی محل کے مکتب میں دوسرے لڑکے بچوں کے ساتھ اس کی تعلیم ہوئی۔ نو سال تک شہزادہ اس دلچسپ اور خوشگوار مکتب میں ضروری علوم حاصل کرتا رہا۔ حوائج ضروریہ اور نہانے دھونے کے بعد پہلا سبق لکھائی کا ہوتا۔ یہ لکھائی تصاویر کے ذریعے الفاظ کا مفہوم ظاہر کرتی تھی شہزادیوں کو تحریر کی ضرورت نہ تھی۔ منشیوں اور دوسرے امراء کے بچے ہی اس تصویری تحریر کی مشق کرتے کیونکہ انہیں آئندہ نظام حکومت کی حفاظت کرنی ہوتی تھی۔ لکھائی کے بعد حساب کا سبق شروع ہوتا۔

توت عنخ آمن کو صرف جمع تفریق کے سوال سیکھنا ہوتے تھے۔ حساب دانی کے دوسرے مراحل فن تعمیر سے متعلق ہوتے۔ اور ان کی ضرورت انجینئری کے لئے تھی۔ شہزادیوں کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ مختلف چیزوں کی قیمتیں جمع کر کے کل رقم کا اندازہ لگا سکیں لیکن یہ قیمتیں سکوں میں نہ ہوتی تھیں بلکہ اناجوں میں ہوتیں۔ کیونکہ اس زمانے میں ابھی سکوں کا رواج نہ تھا۔ اس سے بڑھ کر انہیں صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ ایک چاند سے دوسرے چاند تک اپنی عمر کا اندازہ لگا سکیں۔ اس سلسلے میں توت عنخ آمن نے دیکھا کہ مصریوں نے سال کو تین موسموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پانی کا موسم، نباتات کا موسم اور فصل کا موسم۔ ہر موسم میں چار ماہ شامل تھے۔ اور یہ سال موجودہ عیسوی سن کے ماہ اگست کے آغاز میں شروع ہوتا۔ اس قدر درس تدریس کے بعد کھیل کی باری آتی۔ اور پھر دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔ کھانے کے بعد جب دن کی حرارت انتہائی درجے پر ہوتی۔ تو بچوں کے لئے سب سے اہم سبق شروع ہوتا۔ یہ سبق اخلاقیات کا تھا — ہر وقت اس کا خیال رکھو کبھی اپنے نفس کو ہونے کا موقع نہ دو۔ نہ اس کا موقع دو کہ وہ خدا ناخواستہ کچھ کہے اور خدا اس کی شکایت سن پائے — بڑے ہو کر باہر کی عورتوں سے محتاط رہو خاوند کی غیر موجودگی میں جو عورت تمہیں کہے کہ "میں خوبصورت ہوں" اس کی بات نہ سنو۔ اس کی بات سننا گناہ ہے۔ اور یونہی یہ اصول اخلاق کا دریا اپنی بیزار کن روانی سے بہتا رہتا۔ یہاں تک کہ طلبا تنگ آ جاتے اور اس بیزاری میں وزیر تاہتیپ کا درس ادبی انشاء پڑھتا جس کے ذریعہ سے ہونہار شاگردوں کو استاد بتاتا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے نیک چلن کے اچھے ضابطے کیا ہیں۔ — لیکن اس بیزاری کے بعد اس کو دور کرنے کیلئے طلبا کا محبوب ترین سبق شروع ہوتا۔ ایک بوڑھا معلم دوارے کے کنارے بٹھا کر انہیں وہ دلچسپ کہانیاں سناتا جو ہزار بار سنانے کے باوجود بھی من موہنی ہوتیں۔ سب سے پہلے وہ چیز کی آسمانی تخلیق کا بیان کرتا۔ وہ کہتا: یہ دھرتی اور آکاش دو پریمی ہیں اور یہ دونوں پریمی ہستی کے پردے میں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ ایک روز ایک نیا دیوتا شو ابدی پانی سے نمودار ہوا اور دونوں ہستیوں کے درمیان آ گیا۔ یہی دن تخلیق کا دن تھا۔ اس دیوتا نے آسمان کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اوپر اٹھایا۔ اور قائم کر دیا۔ دیوی کا تاروں والا جسم مشرق سے مغرب تک خلا پر محیط ہو گیا۔ اور آسمان بن گیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں دونوں طرف سے لٹک کر زمین کے ساتھ لگ گئے اور یوں افق بنی —— لیکن یہ حکایت سنا کر جلد ہی بوڑھا معلم اپنی طرف سے یہ اضافہ کرتا کہ اس حکایت پر زیادہ توجہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ آتن دیوتا نے اپنے بیٹے فرعون کے الہامی دین سے ہمیں بتایا ہے کہ وہی خالق اعظم ہے۔ اور اسی کی ان گنت کرنوں کی حرارت زندگی کی تخلیق اور قیام کا باعث ہے۔

یہ اہم سبق جلد ہی ختم کر کے معلم بچوں کو ان کہانیوں سے بہلاتا جن کی بنیاد انسانی سفر کے حقائق پر تھی۔ ان سفری کہانیوں کے علاوہ دیہاتی کہانیاں بھی ایک وسیع ذخیرہ تھیں۔ جن کی دلچسپی ختم ہونے میں نہ آ سکتی تھی۔

غزل

از

سید ضمیر جعفری

کچھ باتیں بھولی بسری سی کچھ یادیں دھندلی دھندلی سی
اب عہدِ محبت کے وہ دن موہوم سے کچھ افسانے ہیں

تو اپنے جنوں کی دھن میں رہ تو اہلِ خرد کی فکر نہ کر
یہ اہلِ خرد سودائی ہیں یہ اہلِ خرد دیوانے ہیں

میخوار اگر بدمست ہوئے قدموں پہ ساقی ہی کے گرے
دیوانے کے دیوانے ہیں فرزانے کے فرزانے ہیں

یہ شہدِ شباب و گلاب کے رس میں ڈوبے ڈوبے بول ترے
کچھ بہکے بہکے نغمے کچھ اڑتے اڑتے میخانے ہیں

لمحاتِ محبت بیت گئے ہاں یادِ محبت باقی ہے
آنکھوں میں کچھ بوندیں ہیں ہونٹوں پہ کچھ افسانے ہیں

پیتا ہوں شرابِ فطرت میں باغوں کی چاندنی راتوں میں
وہ چاند مرا میخانہ ہے یہ پھول مرے پیمانے ہیں

ہر چند برا ہے طرزِ تپاکِ اہلِ جہاں پر کیا کہیے
جب اپنے بھی اپنے نہ ہوئے بیگانے تو بیگانے ہیں

جاپان کے "نو" ناٹک

از یوسف ظفر

"نو" چینی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی "قابل ہونا" اور اس کا مفہوم "قابلیت" ہے۔ جسے دوسرے لفظوں میں "اظہار قابلیت" یا "ناٹک" کہنا چاہئے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک ناٹک کی قسم "ڈنگاکو نو" کے نام سے جاپان میں مقبول ہوئی جو دیہاتیوں کے سامنے مداریوں کی سی حرکات تک محدود تھی۔ چودھویں صدی عیسوی کے وسط تک یہی صنعت ترقی کرتے کرتے ایک قسم کے "اوپرا" opera کی شکل اختیار کر گئی جس میں ایکٹر باری باری ناچتے اور گاتے تھے۔ اس صورت میں اس کا نام "ساروگاکو نو" رکھا گیا۔ یہ "نو" دو شخصوں کے جوہر خداداد کی مرہون منت ہے۔ ایک "کوانامی کی اوسوگو" اور دوسرا "سی آمی موٹوکی او" جو چودھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ کوانامی نارا کے قریب ایک مندر کا پروہت تھا۔ ۱۳۷۵ء میں ایک فوجی افسر "یوشی متسو" نے اسے ایک مندر میں کسی مذہبی تمثیل کی اداکاری کرتے دیکھا اور اسی وقت اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یوشی متسو کا اقتدار رفتہ رفتہ بے حد زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ وہ ملک کا ایک بہت بڑا حاکم بن گیا لیکن ملک گیری کی مصروفیتوں کے باوصف یوشی متسو فنون لطیفہ کا دلدادہ اور مربی بنا رہا۔ اس نے کوانامی کو ایک چھوٹی سی جاگیر بخش دی جہاں یہ ایکٹر اور ڈرامہ نگار مندر کے فرائض سے سبکدوش ہو کر رہنے لگا۔ لیکن کچھ ہی مدت کے بعد ۵۲ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ مرنے کے وقت اس کا بیٹا "سی آمی" نوجوان تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یوشی متسو کے ساتھ اس کے تعلقات بھی نہایت استوار تھے۔ اس کا پتہ اس کے روزنامچے سے چلتا ہے۔

۱۹۰۹ء میں ۹ ابواب پر مشتمل ایک کتاب "کادین شو" یعنی "کتاب پھولوں کی پیشکش کے متعلق" شائع ہوئی۔ اس کا مصنف سی آمی بتایا جاتا ہے لیکن ۱۹۰[illegible]ء میں اسی کتاب کا ایک نیا نسخہ دریافت ہوا۔ جو پہلے نسخے سے بے حد مختلف تھا۔ یہ کتاب بلاشبہ سی آمی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں ۱۶ ابواب ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سی آمی "زین" کی تعلیمات کا حامی تھا اور اس مت میں اغلباً یوشی متسو اس کا معلم تھا۔ اس تصنیف کے کئی الفاظ زین مت کے لٹریچر سے ماخوذ ہیں۔ ان ۱۶ ابواب (جن پر یہ کتاب مشتمل ہے) کا مقصد اشاعت نہ تھا بلکہ اس سے بالخصوص اپنے بیٹے "موٹوشی" اور بالعموم تمام دیگر شاگردوں کو افادہ مطلوب تھا۔ ان میں بار بار تعلیمات کو مخفی رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کی وجہ اس زمانے کی عام ذہنیت تھی۔ اس وقت تمام تعلیمات کو پُراسرار سمجھا جاتا تھا۔ ان کتابوں میں اساتذہ کی تعلیم کو جادو سے تعبیر کیا جاتا تھا جسے الفاظ کی گرفت سے باہر سمجھا جاتا تھا۔

سی آمی کی تحریروں اور تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تصنیف اس کے باپ "کوانامی" کی تعلیم پر مبنی ہے۔

پہلے زمانے میں یہ ناٹک کھلی فضا میں رات کے وقت مشعلوں کی روشنی میں ہندوستان اور جاوا کے قدیم ناٹکوں کی طرح ہوتے تھے لیکن اب برقی روشنی اور دیگر لوازمات باقاعدگی کے ساتھ جمع کر لیے گئے ہیں مگر تماشے کے پروگرام کی جو صورت سولھویں صدی میں مقرر کی گئی تھی۔ آج تک تقریباً وہی چلی جاتی ہے۔

"نو" ناٹک کی سٹیج کا نقشہ یوں ہوتا ہے:۔

سٹیج سادہ اور صاف لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے جس کے پس منظر کے تختے پر ایک عجیب انداز کے درخت کی تصویر اور دوسری دونوں طرفیں کھلی ہوتی ہیں۔ سٹیج کے بالمقابل دو چین کمرے ہوتے ہیں جن میں بیٹھ کر حاکم وقت اور اس کے گھر کے لوگ دیکھتے ہیں۔ باقی دونوں طرف گول دائرے میں عوام کے لئے کٹہرے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ سٹیج کے بالکل پاس ایک نئی خلاسی رکھی جاتی ہے۔

"نو" ناٹک نظم اور نثر کے مجموعے ہیں لیکن مختلف جگہوں پر وقفوں کی خلا کو موسیقی سے پُر کیا جاتا ہے۔ سازوں میں ڈھولک اور بنسری وغیرہ شامل ہیں۔ "نو" ناٹک کی موسیقی بذات خود کوئی خاص موسیقی نہیں بلکہ یہ صرف رقص اور مکالمے کے لئے فضائے تمہید کا کام دیتی ہے۔ ایکٹروں کی تعداد کے متعلق آج تک بھی سی آمی کے اصول رائج ہیں۔ یہ تعداد بعض اوقات ۹، ۱۰ تک جا پہنچتی ہے۔ سی آمی کے آخری ایام میں کورس یعنی "کھتال" کی رسم ایجاد ہو گئی لیکن ذاتی طور پر وہ اس کے خلاف تھا۔

کھتال کا مقصد یہ ہے کہ بعض وقت ایکٹر کو حرکات و سکنات اور رقص میں اس قدر منہمک ہونا پڑتا ہے کہ مکالمے کی رفتار رک جاتی ہے۔ اس مشکل کا حل کھتال یا کورس سے کیا گیا ہے یعنی دس بارہ آدمی سٹیج کے دونوں طرف دو قطاروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور ایسے خاص موقعوں پر ایکٹر کی بجائے وہ مکالمہ بولتے ہیں۔ اور ایکٹر اپنی تمام تر توجہ رقص و حرکات و سکنات کی طرف مبذول کر دیتا ہے۔ کورس یا کھتال کے لئے دس بارہ آدمی اپنے معمولی لباس میں سٹیج پر دو طرفہ کھیل شروع ہونے سے پیشتر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ختم ہونے تک بیٹھے رہتے ہیں۔

یہ کہنا شاید ضروری نہ ہو کہ ناٹک کے تمام کردار مرد ہی ہوا کرتے ہیں۔ صرف کردار خصوصی اور اس کے ساتھی نقاب (mask) استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو عورتوں کے پارٹ ادا کرتے ہیں وہ بھی ان نقلی چہروں سے کام لیتے ہیں۔ بچوں اور بادشاہوں کے پارٹ ادا کرنے والے کردار ان چہروں کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ چہرے عمدہ لکڑی سے نہایت خوبصورت بنائے جاتے ہیں۔ ایکٹروں کے لباس تو آجکل محض رسمی رہ گئے ہیں لیکن سی آمی کے زمانے میں لباسوں پر خاص توجہ کی جاتی تھی۔ اور انہیں بے حد اہم سمجھا جاتا تھا جس جگہ ناٹک کے

مکالمے اور افسانے کا اثر کم ہوتا وہاں لباسوں کے رنگوں اور وضع سے کام لیا جاتا ہے۔ اسٹیج کے سٹینگ نہایت سادہ اور نامکمل ہوتے ہیں۔ لکڑی کے ایک چوکھٹے سے کشتی کا کام لیا جاتا ہے۔ یہی چوکھٹا ذرا مختلف صورت میں رتھ خیال کر لیا جاتا ہے۔ چار ستونوں پر ایک چھت قائم کرنے سے محل گھر جھونپڑی وغیرہ کا تصور ہو جاتا ہے۔ لیکن مقابلۃً جنگی ہتھیار زیادہ اچھے اور حقیقت سے قریب تر ہوا کرتے ہیں۔

نوناٹک کے مکالمے نظم اور نثر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور ان میں بے حد رسمی مشکل اور پر تکلف الفاظ حاکر سمجھے جاتے ہیں۔ نثر رفتہ رفتہ لَے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور لے رفتہ رفتہ نظم ولہر بن جاتی ہے۔ نظم کے حصے فن شعر کے لحاظ سے عموماً بے قاعدہ ہوتے ہیں لیکن اس کے با وجود اکثر جاپانی نظم کی تمام بحروں میں ہوتے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے رعایت لفظی اور صنعت ابہام سے کام لیا جاتا ہے۔ ناٹکوں کے افسانوں کی بنیاد مشہور روایات اشخاص گیت چینی اشعار یا بدھ مت کے مضمون پر رکھی جاتی تھی۔ اس لئے افسانوی اعتبار سے ناٹک مصنف کی تخلیق کا درجہ نہیں رکھ سکتا۔ عام طور پر ان ناٹکوں کے مصنف عوام کی پسند اور وقت کی رفتار کے قائل تھے۔ اور اجتہادی روش کی پابندی جائز نہ سمجھتے تھے۔ سی آمی کے خیال میں تیسری لحاظ سے نوناٹک کے تین حصے ہونے چاہئیں پہلا تعارف جس میں تماشائیوں کو افسانے اور اس کے موضوع سے متعارف کرایا جائے۔ دوسرا نشوونما جس میں مکالمہ (نظم ونثر) درجہ بدرجہ عروج کی طرف لیجایا جائے۔ اور تیسرا عروج جس میں انجام ہو۔ ظاہر ہے کہ ان کھیلوں میں جو صورت اور حجم کے لحاظ سے ایک ایکٹ کے لیکن موضوع کے اعتبار سے بالکل مبسوط ڈرامے ہیں تینوں باتیں باقاعدگی اور چابکدستی سے سرانجام دینا قادرالکلامی اور فن کی باریکیوں اور نزاکتوں سے واقف ڈرامہ نگار ہی کا کام ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ موضوع کے انتخاب پر بھی بیشمار پابندیاں عاید ہیں۔

ایجاد سے لیکر آجتک کس قدر نوناٹک لکھے گئے ہیں اس کے جاپانی نقادوں کی آرا بہت متضاد ہیں لیکن یہ جاننا بہت کافی ہے کہ اس وقت اڑھائی سو ناٹک رائج اور مقبول ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب نوناٹک پچپن کے دور سے گذر رہا تھا۔ اس وقت اسٹیج صرف مندر ہی ہوا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اونچے طبقے میں بڑے لوگوں کے یہاں ان کی نمائش ہونے لگی۔ اور آخر کار عوام کے سامنے بھی وہ چیز آگئی۔ جو پہلے فن کاروں کے رسم رواج کے مطابق پراسرار اور مخصوص رکھی جاتی تھی۔

سترھویں صدی میں ڈرامے کی دوسری صورتیں بھی جاپان میں متعارف ہوئیں اگرچہ انہوں نے بھی عوام کے مذاق سے زیادہ مطابق ہونے کی وجہ سے اس کی مقبولیت کی راہ میں روڑا اٹکایا لیکن اپنی قدامت پسندی کے باوصف کئی اصناف کے پہلو بہلو نوناٹک آج بھی موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ادبی تلمیحات کی کثرت کی وجہ سے عوام کی نظر میں ان کی مقبولیت نہیں ہو سکتی تھی لیکن یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ نوناٹک کے بنیادی قصے مشہور اور گیت مقبول ہوا کرتے تھے۔ اور ان کی ترتیب مذہبی کتب کے مطابق ہوتی تھی۔ ایک اوسط درجہ کی قابلیت کا انسان اپنی ذہنی رفتار کمیل کے ساتھ قائم رکھ سکتا تھا۔

سی آمی کے خیال میں نوناٹک کی تین بڑی قسمیں ہیں۔ سب سے پہلے وہ کھیل جو عبارت کے لئے خوب ہوں۔ دوسرے وہ جو سماعت کے لئے دلچسپ ہوں تیسرے وہ جو ذہن کی پرورش کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ تیسری قسم عوام کے لئے اس قدر پسندیدہ نہیں ہو سکتی جس قدر اول الذکر دو قسمیں۔

انسان کی متجسس فطرت سے کسی چیز کو چھپا کر اس کی دلچسپی بڑھانا ایک عام نظریہ ہے۔ اسی کے ماتحت سی آمی نے بھی نوناٹک سے متعلق ہر قسم کی باتیں فن کاروں کے علاوہ تقریباً ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ اور پوشیدہ رکھنے کی تاکید اپنی تحریروں میں کی ہے۔ اس کے خیال میں تماشائی غیر متوقع انجانی اور اچھوتی باتوں کے اظہار سے زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔

نوناٹک کے لئے ایکٹروں کی تعلیم و تربیت ایک خاص اور کٹھن مرحلہ ہے اس لئے ایکٹروں کی تعلیم و تربیت سات سے پچیس برس تک باقاعدہ کی جاتی تھی۔ ان کی عمر اس ریاضت کے لئے بے حد قاعدوں اصولوں اور پابندیوں کے ساتھ وقف کی جاتی تھی۔

لیکن سی آمی کا جو ناٹک کے اولین موجدوں میں سے تھا۔ انجام نہایت درجہ غمناک ہوا۔ اسی نے فن کے تمام نشیب و فراز اپنے بیٹے کو سکھائے۔ لیکن وہ جوانی ہی میں مر گیا۔ اس لئے اس کا بھانجا اونامی اس کا جانشین سمجھا گیا۔ چونکہ وہ فن سے آگاہ نہ تھا۔ اس لئے سی آمی نے جو جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اس کی مخالفت کی۔ لیکن بادشاہ وقت نے اسی کی حمایت کی۔ اور اُسے اس کا جانشین قرار دیا۔ سی آمی مرتے دم تک ایک جزیرے میں قید رہا اور یہ نوناٹک کا محسن ایکٹر ڈرامہ نگار اور نقاد اسی (۸۰) سال کی عمر میں قید اور جلاوطنی کے مصائب برداشت کرتا ہوا مر گیا۔

نوناٹک باعتبار فن اپنے کمال کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ اور شاید اس طرح میں سے دس بارہ ہی ایسے ناٹک نکل سکیں جنہیں ادبی شاہکاروں میں جگہ مل سکے۔ تاہم یہ صنف ادب جاپان میں ابھی تک زندہ ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ کسی آیندہ دور میں احیائے علوم کے سلسلے میں نوناٹک کسی ایسے رنگ میں نمودار ہوں کہ ان کی مثال نہ مل سکے۔

پولینڈ کا ایک منظر

از

خلیل احمد

[اس افسانے کا مقام روسی پولینڈ میں پروشین سرحد کے قریب ایک سرائے ہے جس کا مالک ایک یہودی ہرظلک نامی ہے جس کا پیشہ یہ ہے کہ وہ امریکہ بھیجنے کے لئے چند آدمی رات کے اندھیرے میں اغوا کرتا ہے۔ پردیس جانے والوں کے علاوہ ہرظلک کے پاس ایک بوڑھا فقیر اور اس کی بیوی تھی۔ جو اکٹھے بیٹھے ہوئے شراب پی رہے ہیں۔ ایک نوجوان قیدی جو ایک شخص پر قاتلانہ حملہ کی وجہ سے جیل میں تھا بھاگ نکلا ہے۔ اور اب چھپتا چھپاتا اسی سرائے میں آ پہنچا ہے]

مارچ کی ایک رات ـــ طوفانی ـــ زمہریری سردی ـــ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی جنگل سرتاپا بھیگا ہوا تھا۔ ایک برف زدہ جھونکا گاہے گاہے سارے جنگل میں لرزہ پیدا کر دیتا تھا۔ درختوں کی شاخیں اس طرح باہر نکلی ہوئی تھیں گویا طوفان کا مارا درخت ان شاخوں پر سے پانی جھٹکنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی برف کا درماندہ سکوت کسی پرندے کی پکار سے ٹوٹ جاتا تھا۔ ایک دفعہ پھر تند ہوا کے خشمناک جھونکے چلنے لگے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے جنگل میں کسی نے اچانک جھاڑو دے دی ہو۔ اور خلا میں سے بھیگے کچیلے بادل نے اٹھ کر تمام درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور کبھی نہ ختم ہونے والے قطرات گرنے شروع ہو گئے۔ جو اگر پتھر پر بھی متواتر پڑتے۔ تو اس میں سوراخ کر دیتے۔

سڑکیں تنہا رہ گئیں جن پر کیچڑ اور میلی کچیلی برف کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ دیہات میں دیو پھر گیا ہے۔ کھیت مرجھائے ہوئے تھے۔ دریاؤں کو برف نے پابجولاں کر لیا تھا۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس خطے نے کبھی انسانی زندگی کو نہیں دیکھا۔ چاروں طرف رات کی حکومت تھی۔

صرف سرائے میں ایک دھیمی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ ٹھیک سڑک کے چوراہے اور جنگل کے وسط میں یہ سرائے واقع تھی، پہاڑی کے دامن میں چند جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ باقی جو کچھ تھا اسے پُرہیبت جنگل ہی کہنا پڑے گا۔

یاشیک ونشد یک بڑی احتیاط کے ساتھ جنگل سے نکل کر سڑک پر آیا۔ اور ٹمٹماتی ہوئی روشنی دیکھ کر کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے کھڑکی میں سے اندر جھانکا۔ تو کچھ دیر کے لئے وہ گھبرا گیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن پھر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر سرائے میں گھس گیا۔

سرائے کافی وسیع تھی۔ فرش پکا نہیں تھا۔ دیواروں پر چونے کے نشانات بھی اُڑ گئے تھے۔ دو کٹہرے کہاں سامنے تھیں جن میں گھاس پھوس اٹکا ہوا تھا۔ لکڑی کی ایک گھڑونچی پر چند پیپے رکھے ہوئے تھے جس پر تعفن (مٹی کا تیل) کا چراغ جل رہا تھا چھت بالکل اندھیرا تھا۔ کبھی کبھی پرانے آتشدان میں سے آگ کی ایک چمک پیدا ہوتی تھی جس کے سامنے فقیروں کا جوڑا بیٹھا تھا سرائے کے دوسرے کونے میں چند اشخاص سمٹے ہوئے پُراسرار طور پر کانا پھوسی کر رہے تھے۔ شراب کے خم کے نزدیک دو کسان کھڑے تھے ایک کے ہاتھ میں بوتل تھی اور دوسرا گلاس سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنا سر جھٹک کر ایک دوسرے کی صحت کا جام اڑا رہے تھے۔ ایک موٹی اور سرخ عورت جنگلے کے پیچھے خراٹے لے رہی تھی۔ چاروں طرف گیلی مٹی اور بھیگے ہوئے چیتھڑوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی تو ایسا سکتہ طاری ہو جاتا کہ جنگل کی تمام آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ کھڑکی پر بارش کی بوندوں کی جھنکار اور آتشدان میں بلوط کی شاخوں کی تڑک سنائی دے رہی تھی۔ جنگلے کے قریب ہی ایک چھوٹے سے دروازے کے کواڑ چرچراہٹ کے ساتھ کھلے۔ اور ایک موری کا سفید سر نمودار ہوا۔ وہ سانولا دہ پہنے ہوئے تھا۔ ادھر آوازیں دبی ہوئی تھیں اس کے پیچھے کمرے میں موم بتیاں جھلک رہی تھیں اور سیتھ کے مذہبی گیت کی گونج تاریک کمرے میں سے آ رہی تھی۔

یاشیک نے یکے بعد دیگرے چند جام چڑھائے۔ وہ کبھی دروازے کی طرف دیکھتا اور کبھی کھڑکی کی طرف اور کبھی کان دھر کر کسانوں کی کانا پھوسی کو سنتا۔ ایک کسان نے اچانک بلند آواز میں کہا: "شادی؟ میں شادی پر لعنت بھیجتا ہوں میں ہرگز شادی نہیں کروں گا" اس کے بعد اس نے بوتل کو پیچھے پر مارا۔ اور بہت دور تک تھوک پھینکا۔

دوسرے نے آہستہ آواز میں کہا: "لیکن تمہیں شادی کرنا ہی ہوگی یا رقم واپس کر دو۔"

اس نے چبا کر کہا: "خدا جانتا ہے۔ کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اس چھوکری کی قیمت ہی کیا ہے ایک بوتل وسکی!"

دوسرے نے جواب دیا: "ارے میاں دولت بڑی چیز ہے۔ مگر عورت اس سے بھی بڑی ہے!"

پہلے نے پھر تحقیر آمیز لہجے میں کہا "نہیں صاحب! لعنت بھیجو۔ میں تو کبھی بھی شادی نہ کروں گا۔ اور اگر یہ کہتے ہو۔ تو میں اس بوڑھی رانڈ سے شادی کرنے کی بجائے اپنے آپ کو بیچ کر رقم واپس کر دوں گا۔"

دوسرے نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا: ارے یار! میں جاؤں۔ ذرا میری صحت دایک جام اڑاؤ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

پہلے نے پھر کہا: کیا سمجھا ہے تم نے؟ مجھ پر تمہارا جادو نہیں چل سکتا میں نے ایک ہ نہ کر دی ہے۔ اور اب یہ نہیں رہے گی۔ اور اگر مجھے مجبوراً شادی کرنی پڑی۔ تو میں ان ل کے ساتھ برازیل کی طرف بھاگ جاؤں گا۔ جانتے ہو وہ دنیا کا دوسرا کنارہ ہے؟"

"تم تو پاگل ہو گئے ہو میں جانوں ایک گھونٹ تو میری صحت کا پیئو۔ میں تم سے ۔یے کی بات کہوں گا۔"

اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کی صحت کا جام اڑانے لگے۔ اور پھر ایک ے کا منہ چومنے لگے اور خاموش ہو گئے۔ دوسرے کونے سے ایک بچے کے چلانے کی رلبند ہوئی۔

ایک دراز قد اور سوکھا ہوا کسان اندھیرے سے باہر نکلا۔ اور سرائے سے باہر نے لگا۔ یاشیک آگ کے نزدیک کھسک گیا۔ کیونکہ سردی اس کی ہڈیوں میں رچ چکی ہاس نے جیب میں سے ایک سوکھی ہوئی مچھلی نکالی۔ جو چمڑے سے بھی زیادہ سخت ۔ اور ایک لکڑی پر لگا کر آگ میں بھوننے لگا۔

یاشیک کے بدن پر اب آگ کی تپش پہنچ چکی تھی۔ اور اس کے لیے بھیگے ہوئے یں سے بھاپ نکلنے لگی۔ فقیر نے چھینک مارتے ہوئے آہستہ سے کہا: تم بری طرح بھیگے ے ہو۔"

یاشیک نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ہاں! اس کے بعد دروازے کی چرچراہٹ وازآئی۔ وہی دراز قد اور سوکھا ہوا کسان واپس آ رہا تھا۔

یاشیک نے فقیر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: وہ کون ہے؟ فقیر نے کتے ہوئے جواب دیا: وہ؟ میں اسے جانتا تو نہیں بلکہ یہ جانتا ہوں کہ یہ سب بیوقوف ۔برازیل کی طرف جا رہے ہیں!

یاشیک خاموش ہو گیا لیکن اپنے کپڑے خشک کرنے میں مصروف رہا۔ اور اس کی ی کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دبکے ہوئے کسان کبھی بیقرار ہو جاتے۔ تو اچانک ں باتوں کی آواز بلند ہو جاتی اور پھر دوسرے لمحہ میں اچانک سب خاموش ہو جاتے ی سے ایک نہ ایک چند لمحوں کے لئے باہر جاتا اور پھر جلدی ہی واپس آجاتا۔

اندرونی کمرے سے مسلسل گانے کی مدہم سی آواز ابھی تک باہر آ رہی تھی۔ ایک ؛ کتا خدا جانے کہاں سے آ دھمکا۔ آگ کے نزدیک پہنچکر فقیر ان پر بل پڑا۔ اور سا شروع کر دیا لیکن بوڑھے نے سر پر ایک ایسا ڈنڈا لگایا کہ چوں چوں کرنے لگا۔ ں بھاگ کر باہر نہیں نکلا۔ بلکہ کمرے کے وسط میں بیٹھکر چولھے پر رکھے ہوئے برتن بھاپ نکل رہی تھی۔ اس کی طرف حسرت کی نگاہیں ڈالنے لگا۔

یاشیک اب کافی حد تک گرم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی مچھلی بھی بھون کر کھا چکا تھا۔

لیکن ابھی اسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے کبھی کچھ نہیں کھایا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی جیبوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ لیکن اس میں کچھ ہوتا تو نکلتا۔ وہ مایوس ہو کر چولھے ا ربرتن پر نگاہیں جما کر بیٹھ گیا۔

"کچھ کھاؤ گے؟ فقیر عورت نے اطمینان سے پوچھا۔

"میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے!

فقیر نے عورت سے آہستہ آواز میں پوچھا: یہ کون ہے ---؟

عورت نے انتقامیہ لہجے میں غراتے ہوئے کہا: تم کیوں گھبرا گئے ہو؟ وہ تو تمہیں پیسہ نہیں دیگا۔ اور میرے خیال میں ایک دمڑی بھی نہیں۔"

"کوئی کسان ہے؟"

"ہاں تمہاری طرح ایک کسان ہے۔ جو دنیا میں آوارہ پھرتا ہے!" اس کے بعد اس نے چولھے پر سے ہنڈیا اتار کر نیچے رکھدی۔

فقیر نے یاشیک کو اپنی چھڑی کی نوک سے دھکیلتے ہوئے کہا: دنیا میں اچھے آدمی بھی ہیں اور وحشی بھی --- اور باڑے میں سؤر بھی --- کیوں؟"

یاشیک نے فقیر کی بات کو سمجھے بغیر کہدیا: ہاں! ہاں!"

فقیر نے کہا: "کچھ سوچ رہے ہو تم؟"

"ہاں میں کچھ سوچ ہی رہا ہوں!"

"ہمارے آقا یسوع مسیح ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ اگر تم بھوکے ہو تو کھاؤ۔ اور اگر پیاسے ہو تو پیو۔ لیکن اگر تم کسی غم میں مبتلا ہو۔ تو باتیں نہ کرو۔"

عورت نے نوجوان سے التجا کی: تھوڑا سا کھالو۔ گو یہ بھیک کے ٹکڑے ہیں لیکن تم سیر تو ہو جاؤ گے۔" یہ کہکر اس نے تھالی میں بہت سا شوربہ ڈالا۔ اور تھیلے میں سے سرخ رنگ کی۔ دلی کا ٹکڑا نکالا۔ اور تھالی میں پھینکدیا جب نوجوان تھالی دیکھکر آگے بڑھا۔ تو اس عورت نے اس کے چہرے پر پژمردگی کے آثار دیکھے۔ اور وہاں سوائے ہڈیوں کے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس عورت کو نوجوان کی صورت دیکھکر اتنا ترس آیا۔ کہ اس نے روٹی پر تھوڑی سی چٹنی بھی ڈال دی۔

یاشیک سے اب صبر نہ ہو سکا۔ اور دونوں ہاتھوں سے کھانا شروع کر دیا اور کبھی کبھی وہ ایک آدھ ہڈی کتے کی طرف پھینک دیتا تھا جو ملتجیانہ نگاہوں سے یاشیک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بوڑھا اب تک خاموشی سے سب باتیں سن رہا تھا جب بوڑھی نے اس کے ہاتھ میں بھی برتن دیدیا۔ تو وہ کہنے لگا: کھاؤ بھائی کھاؤ۔ یسوع مسیح کہا کرتے تھے۔ تم کسی محتاج کو ایک پیسہ دوگے۔ تو تمہیں اس کا اجر دس پیسوں میں ملے گا۔ خدا تمہارے ساتھ ہو۔"

وہ خاموشی سے لرانے چباتے رہے۔ پھر فقیر نے اپنے منہ کو آستین سے

پونچھتے ہوئے کہا: "کھانے میں تین چیزیں ایسی ہیں جو تمہاری بہتری کے لئے ہیں۔ شراب نمک۔ روٹی ساری عورت! ہمیں شراب تو پلا دے؟"

تینوں شراب پیتے رہے۔ اور پھر روٹی کھانے لگے۔ یاشیک تریب تریب اپنے حلرے کو بھول چکا تھا۔ اور اب وہ بزدل انسان کی طرح ادھر اُدھر نگاہیں بھی نہیں ڈال رہا تھا۔ چار دن کی بھوک جو اس کی ہڈیوں میں رچ چکی تھی اب آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھی۔ وہ گرم ہو چکا تھا۔ اور ایک اطمینان سا محسوس کر رہا تھا۔

دو کسان بڑے غم سے ہٹ کر پرے چلے گئے۔ لیکن کونے میں پڑے ہوئے کسان اپنے اپنے بستر سروں کے نیچے رکھے ہوئے گیلے فرش پر سو رہے تھے۔

بارش ابھی تک نہیں تھمی تھی۔ اور کہیں کہیں سے چھت بھی ٹپک رہی تھی۔ جہاں جہاں پانی گرتا تھا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی چمک رہا تھا۔

"اے آوارہ گردو! تمہارے لئے بھی میں نے کچھ بچا لیا ہے۔" یہ کہکر عورت نے کتے کے سامنے روٹی کے ٹکڑے پھینکے۔ جو کئی لقمے نگلنے کے بعد ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

بوڑھے فقیر نے تھالی کو نیچے رکھتے ہوئے کہا: "آدمی کے پیٹ میں اگر روٹی ہو۔ تو جہنم بھی بری جگہ نہیں ہے۔"

یاشیک نے کہا: "آپ نے مجھے کھانا دیا۔ خدا تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔"

یاشیک نے بوڑھے کا ہاتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے دبایا۔ بوڑھے نے نوجوان کے ہاتھ کو احتیاط سے محسوس کیا۔

"نوجوان! معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی برسوں سے کام نہیں کیا۔" یاشیک نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

بوڑھے فقیر نے کہا: "اطمینان رکھو، گھبراؤ نہیں یسوع مسیح کہا کرتے تھے۔ "وہ لوگ جو غریبوں اور یتیموں کی امداد کرتے ہیں نیک آدمی ہوتے ہیں۔ تم ڈرو نہیں میں نہ تو یہودی ہوں اور نہ ہی یہودیوں میں ایک دیانتدار مسیحی ہوں اور خود یتیم بھی ہوں۔"

چند لمحوں تک اس نے اپنی بات پر غور کیا۔ اور پھر سکوت آمیز انداز میں کہنے لگا۔ تین چیزوں کی طرف ہمیشہ مائل رہا کرو۔ یسوع مسیح سے محبت۔ کبھی بھوکے نہ رہو۔ اور اس آدمی کو خیرات دو۔ جو تم سے زیادہ بدقسمت ہے۔ ان تین باتوں کے علاوہ دنیا میں کچھ نہیں۔ باقی صرف خیال ہی خیال ہے۔ دانشمند آدمی اپنے لئے بے فائدہ سوچ نہیں کیا کرتا ۔۔۔ اور ہمارے سینے میں تو بہت راز ہیں۔ تم کیا کہتے ہو!"

بوڑھے نے اپنے کان کھڑے کر لئے لیکن نوجوان ایک ضدی انسان کی طرح خاموش تھا۔ وہ اپنا راز اگل دینے میں خوف محسوس کر رہا تھا۔ بوڑھے نے نسوار کی ڈبیا نکالی اپنی انگلی سے اسے جھاڑا۔ اور پھر ایک چٹکی بھر کے ناک میں چڑھا گیا اور چھینکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے وہ ڈبیا نوجوان کو دی۔ اور خود چولھے پر جھک کر کہنے لگا۔ "اب دنیا میں انصاف نام کو نہیں رہا۔ یہاں تو سب پاجی اور بدمعاش اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان کو فریب دینے کے لئے دھکیل دیتا ہے تاکہ اسے کھا ہی جائے۔ یسوع مسیح کا یہ ارادہ نہیں تھا۔ آہ! تم گرجے میں جاؤ۔ ٹوپی اتار کر گانا شروع کر دو۔ یسوع مسیح اور مریم کے سامنے دعا کرو۔ کچھ فائدہ نہیں، عبادت کرتے جاؤ، کچھ بھی نہیں ملیگا۔ یہ لوگ تمہیں روٹی کا ایک ٹکڑا دیدیں گے۔ کاش تم اندھے اور لولے ہوتے تاکہ فقیروں سے بھی بھیک مانگ لیتے۔ اس عبادت سے تو یہ شراب جو میرا گلا صاف کر دیتی ہے بہتر ہے۔" اس نے مایوس ہو کر زمین پر تھوکا اور پھر چھینک مار کر کہا۔

"کیا دوسرے لوگ اچھی حالت میں ہیں؟ کوئی کو تم جانتے ہی ہو گے۔ اس نے چھوٹا سا سؤر کا بچہ چرا لیا اور اسے کیا ملا؟ وہ بچہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے شراب کے پیالے میں ڈبو یا جا سکتا ہے۔ اس حقیر سی چیز کے لئے اسے گرفتار کیا گیا۔ اور اب وہ چھ مہینے کے لئے قید خانہ کی ہوا کھا رہا ہے۔ کس چیز کے لئے! اس چھوٹے سے سؤر کے بچہ کے لئے! گویا وہ سؤر کا بچہ خدا کا بنایا ہوا نہیں تھا۔ اور ہمارے شریف انسانوں کا اصول تو یہ ہے کہ بھوکے لوگ بھوک سے مر جائیں تو اچھا ہے۔ یسوع مسیح کہا کرتے تھے: جو چیز ایک مسکین لے جاتا ہے تو ایسا سمجھو گویا تم نے میرے نام پر اسے دیدی ہے۔ تم اور نہیں پیؤ گے؟"

"خدا تمہیں اس کا اجر دے۔ لیکن میرا سر چکرانے لگا ہے۔"

"پاگل! یسوع مسیح خود دعوتوں کے موقعہ پر شراب پیا کرتے تھے شراب پینا گناہ نہیں ہے۔ البتہ سؤر کی طرح غٹ غٹ کر کے پینا گناہ ہے۔ یہ تو خدا کی نعمت ہے۔ تمہیں میری صحت پر جام اڑانا چاہئے!"

اس کے بعد فقیر پینے لگا۔ اور پھر بوتل نوجوان کے سامنے کر دی۔

"پیؤ بچے! پیؤ۔ لیکن تین باتوں کو پیش نظر رکھو، ہفتہ بھر کام کرو۔ خدا کی عبادت کرو۔ اور اتوار کو مسکینوں اور غریبوں کو خیرات دو۔ اس کے بعد تمہاری روح کو سکون ہو جائے گا۔ ارے جوان! اگر تم ایک گیلن نہیں پی سکتے۔ تو گیلن کی چوتھائی تو پی جاؤ۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ عورت اپنے کاندھے پر سر جھکائے ہوئے سو رہی تھی۔ بوڑھے نے اپنی بے نور آنکھوں سے دھکتے ہوئے کوئلوں کی طرف دیکھا۔ کونے میں جو گھسر پھسر ہو رہی تھی۔ وہ بھی اب بند ہو چکی تھی۔ ہوا کے تند اور تیز جھونکے کھڑکی سے ٹکرا رہے تھے۔

یاشیک پر ووسکی اپنا اثر کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھر آئی۔ آگ کے سامنے اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں۔ اور آہستہ آہستہ تمام خطروں سے بے نیاز ہو کر سو گیا۔

کبھی کبھی وہ بیدار ہو جاتا اور فقیر کی طرف دیکھ لیتا جو سویا ہوا تھا لیکن بڑبڑا رہا تھا: "دنیا کی ساری روحیں آزمائش میں پڑی ہوئی ہیں۔ اچھے فقیر کی لاٹھی نوکدار ہونی چاہئے۔" اتنا بڑبڑانے کے بعد فقیر بیدار ہو گیا۔ تو اس نے محسوس کیا کہ

نوجوان کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہوں گی۔

"نوجوان! تم میری باتیں سن رہے ہو؟ اگر سن رہے ہو تو کان دھر کر سنو۔ میری صحبت کا جام پیو اور سنو، آدمی دانشمند ہونا چاہئے۔ لیکن اتنی دانشمندی اچھی نہیں کہ لوگ سمجھ جائیں کہ تم دانشمند ہو۔ ہر ایک چیز کو دیکھو لیکن دنیا کو یہ محسوس ہو کہ تم اندھے ہو اگر تمہیں کسی بیوقوف کے ساتھ رہنا پڑے۔ تو بڑے بیوقوف بن کر رہو۔ لنگڑے آدمی کی صحبت میں تمہاری ٹانگیں بیکار ہو جانی چاہئیں۔ اگر لوگ تمہیں ایک دمڑی دیں۔ تو ایسا خیال کرو۔ گویا انہوں نے تمہیں چاندی کا سکہ دیدیا ہے۔ اگر لوگ تم پر کتے چھوڑ دیں تو تم سمجھو کہ یسوع مسیح کے حضور میں قربانی کر رہے ہو۔ اگر تم میری باتوں پر عمل کر دگے تو تمہارا پیٹ ہر وقت بھرا رہیگا۔ اور پھر تم دنیا کو اس طرح اپنے پیچھے کھینچو گے۔ جیسے ایک اونٹ کو نکیل ڈال کر اونٹوں کی لمبی قطار کو کھینچا جا سکتا ہے۔ میں آج کے زمانہ کی پیداوار نہیں ہوں بہت باتیں جانتا ہوں۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ شخص جو دنیا کے طریقے پر غور کر لیتا ہے۔ وہ کبھی بھی مصیبت میں نہیں پڑتا۔ پادری کے گھر میں جا کر کسانوں کو برا بھلا کہو۔ تو وہ تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور دیدیگا۔ کسانوں میں بیٹھ کر پادری کو دو چار سنا دو۔ تو وہ تم پر خوش ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد اس نے پھر اونگھنا شروع کر دیا۔ اور اونگھتے ہوئے ہی وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "نوجوان! میری بات سولہ آنے درست ہے یسوع مسیح کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔" اور پھر وہ بنچ پر لیٹ گیا۔ عورت سوتے میں بڑبڑائی "خدا کے لئے غریب معذور پر رحم کرو۔" بوڑھے فقیر نے چونک کر کہا "چپ رہ پگلی!"

بڑا دروازہ دھماکے کے ساتھ کھلا۔ اور زرد بالوں والا یہودی کسانوں کے درمیان آگیا۔ اور اس نے پراسرار آواز میں کہا۔

"وقت ہو چکا ہے۔ سب لوگ سڑک پر اکٹھے ہو جاؤ!" اس کے بعد سونے والے خواب سے بیدار ہو گئے اور اپنا اپنا سامان اکٹھا کیا اور کاندھوں پر دھر لیا۔ اس مجمع میں سے عجیب پر اسرار آوازیں کچھ آہستہ اور کچھ بلند کمرے کی فضا میں گونجنے لگیں۔ کچھ لوگ عجیب وغریب اشارے کر رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ کچھ خدا سے دعا مانگ رہے تھے لیکن ان سب آوازوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی خطرہ ان لوگوں کو درپیش ہے۔

پاشیک بھی بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے گہری نگاہیں ڈال کر مجمع کی طرف دیکھا اور پھر اس نے فقیر سے پوچھا۔

"یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"برازیل!"

"وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"دنیا کے دوسرے سرے پر۔"

"یہ کیوں جا رہے ہیں؟"

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ بیوقوف ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ کہ بدقسمت ہیں۔"

"یہ لوگ راستہ بھی جانتے ہیں؟"

فقیر نے اسے جواب نہ دیا اور عورت کو دھکیل کر وہ کمرے کے درمیان پہنچ گیا۔ اور گھٹنے کے بل کھڑا ہو کر مجمع سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "تم ساتوں سمندر پار دنیا کے دوسرے کنارے پر جا رہے ہو۔ اے یتیم بچو! یسوع مسیح تمہاری امداد کرے۔ اس بے دست و پا انسان کو ایک پیسہ دیتے جاؤ۔ خدا کرے تم صحیح سلامت واپس آؤ۔"

بڑھیا بھی بوڑھے کے ساتھ دعا دیتی جا رہی تھی۔

سب لوگ دوزانو ہو گئے۔ آہستہ آہستہ رونے کی آوازیں بھی آ رہی تھی سارے سر جھکے ہوئے تھے۔ اور قسمت پر اپنی باگ ڈور ڈالنے والے نادار انسان دعاؤں کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگے۔ پھر "ہرضلک" "ہرضلک" کی آوازیں بلند ہوئیں وہ یہودی کو بلا رہے تھے۔

وہ اب اس بات کے مشتاق تھے۔ کہ وہ غیر معروف اور اجنبی دنیا میں پہنچ جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اب اس پرانی دنیا سے بھاگ کر نئی دنیا میں اپنے آپکو دیکھیں۔

پادری ہاتھوں میں ایک سیاہ لالٹین لئے باہر نکلا۔ اس نے گنتی کی اور حکم دیا کہ وہ دو دو آدمیوں کی قطار بنالیں۔ بڑا دروازہ کھل چکا تھا۔ اور یہ لوگ دھول کی ایک دکھ بھری فوج کی طرح حرکت کرنے لگے۔ یا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا چند سائے حرکت کر رہے ہیں۔ اور ایک لمحے میں یہ مصیبت کے مارے بارش اور اندھیرے میں گم ہو گئے۔ درختوں کے تاریک راستے میں ایک مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ جس کے پیچھے پیچھے وہ سب لوگ جا رہے تھے۔ اور دور ایک گیت کانپ اٹھا۔

"جس نے اپنے مولا پر بھروسہ رکھا۔"

اس کے بعد بپھرے ہوئے طوفان میں وہ آوازیں گم ہو گئیں!

پاشیک نے آہ بھر کر کہا "بیچارے مسافر!"

وہ واپس آیا تو کمرے میں قبر کی سی خاموشی تھی۔ روشنی بھی بجھ چکی تھی۔ بوڑھا فقیر اور بوڑھی خیرات کے پیسے گن رہے تھے۔ بوڑھے نے مایوس کن آواز میں کہا۔

"یسوع مسیح ان کی مدد نہ ہی کرے تو اچھا ہے۔ اتنا مجمع تھا لیکن کل چھ پیسے جمع ہوئے ہیں۔"

نوجوان پاشیک نے بوڑھے کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ اس نے اپنے گیلے لبادے کو اوڑھ لیا۔ اور چولھے کے نزدیک سو گیا۔

آدھی رات کے بعد کسی نے اسے بیدار کیا۔ لیمپ کی روشنی اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ "اٹھو! کون ہو تم؟ کہاں ہے تمہارا پاسپورٹ؟" دو سپاہی

بھول جاؤ گی

از
اختر ہوشیارپوری بی اے ایل ایل بی

جب بھیانک خلوتوں میں یاد آؤ گی مجھے
صاف ظاہر ہے کہ آوارہ پھراؤ گی مجھے
تم کہاں ایسی کہ خود رستہ بتاؤ گی مجھے

ہنس رہی ہو، خون کے آنسو رلاؤ گی مجھے
بھول جاؤ گی یقیناً بھول جاؤ گی مجھے

یہ بجا ہے حسن کی رنگیں ادائیں خوب ہیں
شعر و نغمہ کی فلک پیما صدائیں خوب ہیں
عشق کا موسم جوانی کی ہوائیں خوب ہیں

وہ بھی دن ہوگا تصور میں نہ لاؤ گی مجھے
بھول جاؤ گی یقیناً بھول جاؤ گی مجھے

میں تمہارے عشق کے قابل نہیں ہوں زینہار
میں تو داغِ دامنِ صحرا ہوں تم جانِ بہار
فطرتاً فصلِ بہاری کا نہیں کچھ اعتبار

بعدِ فصلِ گل خزاں لا کر دکھاؤ گی مجھے
بھول جاؤ گی یقیناً بھول جاؤ گی مجھے

کیوں دلاتی ہو مجھے اپنی محبت کا یقیں
میری آنکھیں جلوۂ دیدار کے قابل نہیں
آنسوؤں سے تر ہی رہنے دو یہ میری آستیں

کیونکہ تم خوابِ پریشانی دکھاؤ گی مجھے
بھول جاؤ گی یقیناً بھول جاؤ گی مجھے

لاکھ اُلفت ہو تمہاری خاطرِ دلگیر میں
جانتا ہوں جو بھی لکھا ہے مری تقدیر میں
بیشتر راتیں کٹیں گی نالۂ شبگیر میں

لن ترانی کی صدائیں تم سناؤ گی مجھے
بھول جاؤ گی یقیناً بھول جاؤ گی مجھے

قیمتی قربانی

(چینی ڈراما کا ایک شاہکار)

از
صالح محمد صدیق

افرادِ تمثیل

لی فان	ایک بیوہ
کیوانگ شو	لی فان کا اکلوتا لڑکا
شنگ شی	لی فان کے بھائی کی لڑکی
جنرل ارشیا	جاپانی افواج کا کمانڈر

سپاہی کلرک اور نائب کپتان وغیرہ وغیرہ

منظر:۔ رات کا وقت ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں جھکڑ چل رہا ہے بارش بڑے زور سے ہو رہی ہے چین کے ایک چھوٹے سے گاؤں آن چوکے زراعی علاقے میں جاپانی درندے اپنا تسلط جما چکے ہیں۔ ایک جھونپڑا سا ہے جو معمولی سامان سے مزین ہے۔ شنگ شی کھڑی ہے۔ اور لی فان اونچے سٹول پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کمرے کی دائیں جانب ایک دروازہ ہے۔ جو باہر کی طرف کھلتا ہے اس کے بالمقابل ایک دروازہ ہے جو باورچی خانے میں کھلتا ہے دائیں جانب دروازہ کے ساتھ ہی ایک کھڑکی ہے۔ شنگ شی کھڑکی کے قریب کھڑی باہر کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ بہت مضطرب و پریشان نظر آتی ہے)

شنگ شی:۔ رات کس قدر تاریک اور خوفناک ہے!

لی فان:۔ بارش ہو رہی ہے شاید!

شنگ شی:۔ ہاں! برابر بارش ہو رہی ہے۔ فضا سے مینہ کے قطرے ہوا کے دامن کو پکڑنے کے لئے بدستور لپک رہے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بادوں کے دم خم باقی ہیں۔ باہر جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ تاریکی بھی اس قدر خوفناک کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ مجھے تو سڑک پار کنارہ بالکل نظر نہیں آتا۔ ابھی خالہ بادوں کو تو دیکھو دم بدم بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ شاید آج دیوتا کو ہم پر غصہ آگیا ہے۔

لی فان:۔ بہت خوب!

(شنگ شی فرش کا چکر لگاتی ہے اور پھر غیر ارادی طور پر کھڑی ہو جاتی ہے وہ سخت مضطرب نظر آتی ہے۔ گویا کسی کا انتظار کر رہی ہے)

شنگ شی:۔ کیا میں چراغ کو کھڑکی میں رکھ دوں؟

لی فان:۔ کس لئے؟ کیا تمہیں اس کی نصیحت یاد نہیں؟

شنگ شی:۔ (سر ہلا کر) نہیں! کھڑکی میں چراغ رکھ دینے سے وہ مکان تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔

لی فان:۔ جب اس نے ایسا نہ کرنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ تو پھر ایسا کیوں کریں؟

شنگ شی:۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی تاریک رات میں زیادہ دیر سے مکان کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں آوازیں دے رہے ہوں۔ وہ آوازیں ہم تک نہ پہنچ سکی ہوں۔

لی فان:۔ اس قدر بے قرار نہ ہو۔ اس نے جو ہدایت کر رکھی ہے اس پر عمل کرو۔ آگ میں اور خشک پتے ڈال دو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔

شنگ شی:۔ (بڑھتے ہوئے اضطراب سے) اُف! کیا کروں، آج میرے دل سے ایک آواز اُٹھ رہی ہے۔ اور اسے میں صاف اور واضح طور سے سن رہی ہوں سب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج اس مکان پر ضرور کوئی آفت آئے گی۔ آہ! ذرا ہوا کی باتوں کی طرف کان تو لگایئے۔ رو رہی ہے بیچاری! کسی بے کس غریب کی روح کو دو ہمارے در تک لائی۔ لیکن ہم نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔

لی فان:۔ ایسی باتیں ذہن میں لا کر اپنے دل کو رنجیدہ نہ کرو بیٹی! کچھ خشک پتے آگ میں ڈال دو۔

شنگ شی:۔ (خشک پتوں کی ٹوکری سے پتے نکالتے ہوئے) جب سے میں۔۔۔۔ ہیں یہ کیا؟

(دونوں ہمہ تن گوش بن جاتی ہیں)

لی فان:۔ ہوا ہے۔ جو تدریج تیز و تند ہوتی جا رہی ہے۔

(شنگ شی آگ میں کچھ پتے ڈالتی ہے)

لی فان:۔ کیا آج تم نے دیکھا تھا کہ بہت سے رگ جا رہے تھے؟

شنگ شی:۔ نہیں! صبح سویرے چند جاپانی قوم کے ذلیل کتے شمال سے آتے دیکھے گئے تھے۔ نو بجے ان کی آمد کا سلسلہ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ ایک گھوڑے پر سوار جاپانی بھی تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف

لی فان:۔ اور کوئی جاپانی کتا نہیں آیا؟

شنگ شی۔ یہ ساری سڑک بالکل سنسان پڑی ہے۔ کیا وہ آئیں گے؟

لی فان۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ نہیں آئے گا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ پانچ دن گذرے وہ یہاں آیا تھا۔ اور یہاں سے گوشت اور پانی لیکر گیا تھا۔ لیکن جو سرد ھڑ کی بازی لگایا کرتے ہیں۔ وہ کھانے پینے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ تن وہ ضرور اپنی بوڑھی ماں کو ملنے کے لئے آئے گا۔ لیکن وہ صبح کے وقت نہیں آسکتا تھا کیونکہ جاپانی کتے ان کی دیکھ بھال کرتے ہوں گے۔

(ایک آواز سنائی دیتی ہے دونوں اسے غور سے سنتی ہیں)

لی فان۔ بتی جلاؤ شنگ شی!

شنگ شی۔ لیکن یہ آواز تو گھر کی پشت سے آ رہی ہے۔

لی فان۔ جس طرح میں کہتی ہوں کرو۔ دوسری طرف جاپانی کتے ہونگے۔

(بتی روشن کی جاتی ہے اور کھڑکی میں رکھ دی جاتی ہے اور شنگ شی دروازہ کھولنے کے لئے لپکتی ہے)

لی فان۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو کیا تم ایسی حالت میں دروازہ کھولو گی جبکہ کمرے میں اس قدر روشنی ہے کہ اگر کوئی داخل ہو تو باہر سے صاف نظر آجائے۔ کون جانتا ہے کہ کسی جاپانی کتے کی آنکھیں اس مکان کی نگرانی کر رہی ہوں۔ چراغ گل کر دو اور آگ کو ڈھانپ دو۔

(چراغ گل کر دیا جاتا ہے۔ اور دروازہ کی زنجیر اتار دی جاتی ہے۔ کوئی شخص اندر داخل ہوتا ہے)

شنگ شی۔ تمہارے ہاتھ برف کی مانند یخ ہو رہے ہیں۔

(کیوانگ شو بڑے اطمینان کے ساتھ سر ہلا کر جواب دیتا ہے)

لی فان۔ تمام کپڑے بھیگ گئے ہیں۔

کیوانگ شو۔ ٹنگ پو کے اردگرد جاپانی کتوں نے سخت پہرہ لگا رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں دریا کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

لی فان نے دوبارہ بتی جلائی اور آگ پھر جلا دی گئی۔

شنگ شی۔ ٹنگ پو کے اردگرد جاپانی کتے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔

...نگ شو۔ ہاں ٹنگ پو سے آٹھ میل کے فاصلہ تک۔

... کیا آپ بھی وہیں تھے؟

...ں ہیں اور میری پارٹی کے تمام ارکان ٹنگ پو کے شمال میں پہاڑیوں ... وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ ناگہانی ان جاپانی کتوں پر ... ن کر تباہ کر کے دم لیں گے۔

... زندہ باد!

۴۰۰...

لی فان۔ (بات کاٹ کر) ہاں ہاں اتنگ شی تمہارے لئے ابھی کھانا لے آتی ہے جو ہم نے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ بیٹی شنگ جاؤ وہ کھانا لے آؤ۔

(شنگ شی باورچی خانے کی طرف جاتی ہے)

کیوانگ شو۔ ہاں مجھے کچھ شکوک سے پیدا ہو رہے ہیں کہیں شنگ شی ان جاپانی کتوں کے ہاتھ متعلق کچھ بتا نہ دے۔

لی فان۔ شنگ شی نوجوان لڑکی ہے وہ ایسا کبھی نہ کرے گی۔ بھلا بتاؤ تو کیا کوئی یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کو جاپانی کتوں کے حوالے کر دے یہیں مادر وطن کی کوئی آبرومند لڑکی ایسا نہیں کر سکتی؟

کیوانگ شو بہت خوب ہیں آپ کو بتاتا ہوں کہ آجکل ہم کہاں ہیں؟

لی فان۔ کیا آجکل تم وہاں نہیں ہو جہاں ابھی تم نے بتایا ہے؟

کیوانگ شو۔ نہیں۔ جب میں یہاں سے گیا۔ تو وہ اپنی پہلی قیام گاہ سے جا چکے تھے۔ میں نے ان کی تلاش کی۔ تو وہ ہنگ یو کی پہاڑیوں میں مقیم تھے۔

لی فان۔ چلو۔ اچھا ہوا وہ تم کو مل گئے۔

کیوانگ شو۔ خوش سے اگر وہ نہ بھی ملتے۔ تو میں اکیلا ہی اپنی سرزمین سے ان جاپانی کتوں کو مار بھگانے کی کوشش کرتا۔

لی فان۔ شاباش! میرے بہادر بیٹے مجھے تم پر ناز ہے!

(وہ میز کے قریب بیٹھ گیا۔ بوڑھی عورت نے اس کے لئے ضروری چیزیں جمع کیں)

کیوانگ شو۔ ایسے موقعہ پر جبکہ جھکڑ اور بارش ہو رہی ہو آگ بہت ہی بھلی معلوم دیتی ہے۔

لی فان۔ تم رات یہیں آرام کرو۔

کیوانگ شو۔ میں یہاں آرام نہیں کر سکتا۔ جنہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر وطن پر جان نثاری کا تہیہ کر لیا ہو۔ وہ بھلا آرام چین حاصل کر سکتے ہیں؟ ذرا وطن کے ان بہادر سپاہیوں کی طرف نگاہ ڈالئے۔ اچھی اماں! جو وطن کی سرزمین سے جاپانی قوم کے ذلیل کتوں کو نکالنے کے لئے مصروف پیکار ہیں جن کا آرام۔ جن کا چین وطن کی آزادی کی قربانگاہ پر قربان ہو چکا ہے چینی بہادروں کی زندہ لاشیں وطن کی خاک پاک سے ہم آغوش ہو رہی ہیں۔ کیا ان سے ہمارا چین آرام اچھا ہے؟

(شنگ شی داخل ہوتی ہے)

لی فان۔ یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا لیکن پو پھٹنے سے پہلے تم اپنے مسکن تک پہنچ سکو گے؟

کیوانگ شو۔ ہاں۔ ہاں کیوں نہیں؟

شنگ شی۔ لیکن تم جاپانی کتوں سے کس طرح نظر بچا کر نکلو گے؟

کیوانگ شو۔ اگرچہ ٹنگ پو کے گرد و نواح میں جاپانی بھیڑیے اس طرح پھیلے ہوئے ہیں

جلیع کمیاں اُن میں سے گذرنا سخت مشکل ہے لیکن میں نے ان کو ایسا اُڑ بنایا کہ برسوں یاد کریں گے۔

شنگ شی۔ تو کیا تم ان کو دھوکا دے کر نکل آئے تھے؟

کیوانگ شو: ہاں! جب لپنے مسکن سے نکلا تو بارش ہو رہی تھی۔ میں سیدھا ننگ پو ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھا۔ چوکی کے قریب پہنچا۔ تو وہاں ایک جاپانی سپاہی کھڑا تھا میں نے اس کے بوٹ اٹھا لئے۔ کیونکہ ہمارے جوتوں کے نشان جاپانی کتوں کو سراغرسانی میں بڑی مدد دیا کرتے تھے۔

شنگ شی۔ تو وہ جاپانی سو رہا تھا کیا؟

کیوانگ شو۔ بھلا سوچو تو کہیں نے اس کے بوٹ کس طرح حاصل کئے۔ تم اتنے میں جواہر میں گوشت ختم کر لو۔

شنگ شی۔ (سر جھکا کر) وہ سو رہا ہوگا ہوں۔

کیوانگ شو۔ سو رہا تھا، ہاں وہ اب بڑے سکون و آرام کے ساتھ ہمیشہ سوتا رہیگا۔

(بوڑھی عورت میز پر سے خنجر اٹھا لیتی ہے اور پھر اسے رکھ دیتی ہے اور کیوانگ کی طرف دیکھتی ہے۔ کیوانگ آنکھوں ہی آنکھوں میں مطلب سمجھا دیتا ہے۔ کہ اس نے جاپانی سپاہی کو خنجر سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ شنگ شی لی فان کی طرف دیکھتی ہے۔ اور خنجر کو دھکیل دیتی ہے۔ خنجر میز سے نیچے گر پڑتا ہے)

لی فان: جاؤ بیٹی کیوانگ کے لئے کچھ پنیر بھی لے آؤ۔

[شنگ شی جاتی ہے]

مجھے اس کی ماں کی وہ باتیں یاد ہیں۔ جو اس نے بستر مرگ پر دم توڑتے وقت…

(دروازے پر دستک)

آواز۔ دروازہ کھولو۔

(دونوں اضطراب سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

لی فان۔ جلدی کرو۔ باورچی خانے میں گھاس پڑا ہے۔

آواز۔ دروازہ کھولو۔

(کیوانگ شو وہ تمام چیزیں اٹھا لیتا ہے جس سے اس کی موجودگی کا احساس ہو۔ سب چیزیں اٹھا کر وہ باورچی خانے میں گھس جاتا ہے۔ خنجر زمین پر پڑا ہے۔ لی فان دروازہ کھولنے کے لئے جاتی ہے)

لی فان۔ کون ہے۔ اور کیا کام ہے؟

آواز۔ دروازہ کھولو۔

(لی فان دروازہ کھولتی ہے۔ جنرل ارٹیا معہ سپاہیوں کے داخل ہوتا ہے۔ کمرے میں تمام سپاہی داخل ہو جاتے ہیں)

ایک سپاہی۔ آہ! پرندہ اڑ گیا۔

(جنرل ارٹیا کی ٹھوکر خنجر کو لگتی ہے۔ وہ اسے اٹھا لیتا ہے)

جنرل۔ لیکن پرندے کا گھونسلا ابھی گرم ہے۔ یہ دیکھو۔

سپاہی: معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ یہاں کھانا کھا رہا تھا۔ ہم نے آکر اس کے کھانے میں خلل ڈالا۔

لی فان: میں ایک غریب عورت ہوں جو اکیلی رہتی ہوں۔ آپ کو کسی نے غلط خبر دی ہے۔

جنرل ارٹیا۔ (خنجر کو دکھاتے ہوئے) اور یہ تمہارے دانت صاف کرنے کا خلال ہے؟ ہوں! ہم جس کی تلاش میں تھے۔ وہ مل ہی گیا۔

[سپاہی باورچی خانے سے شنگ شی کو پکڑ کر لاتے ہیں۔ جو وہاں خوف سے چھپی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک پنیر ہے]

ایک سپاہی۔ یہ کون ہے؟

جنرل ارٹیا۔ ایک لڑکی ——

لی فان۔ یہ میری بہن کی لڑکی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ میرے لئے پنیر لینے گئی تھی۔

جنرل ارٹیا۔ مکان کی پھر تلاشی لو۔ وہ بھی یہیں کہیں ہوگا۔

(لی فان کا تمسخر اڑاتے ہوئے) تو آپ خود کھانا تناول کر رہی تھیں۔ ہاں۔ اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ سلوک کرنے کا انوکھا طریقہ ہے۔ محترمہ نہیں آتی تم کو

(سپاہی کیوانگ شو کو لئے پھر کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

جنرل ارٹیا۔ میں نہ کہتا تھا کہ وہ یہیں ہے۔ کیوں محترمہ! یہ آپ کے بھائی کا لڑکا ہوگا ہوں۔ اور شاید یہ آپ کا باورچی ہوگا۔ بہت خوب! میں تمہیں ابھی سب کچھ بتا دونگا تم اس کو اپنا باورچی بتاؤ گی۔ لیکن جنرل ارٹیا اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کریگا۔ اسے ہمارے چند سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔ اگر اس نے جواب دیدیا۔ تو خیر ورنہ کل صبح اسے تختہ دار پر چڑھا دیا جائے گا۔

(جنرل ارٹیا میز کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک سپاہی پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک دروازہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک طرف میز کے قریب کمپنی امر بیٹھ جاتا ہے۔)

جنرل ارٹیا۔ کیوانگ شو سے! ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کو ان اشخاص کا پتہ ہے جو حکومت جاپان۔ کے سپاہیوں کے خلاف جنگ جیا دل لڑتے ہیں۔ چونکہ یہ خلاف قانون کارروائی ہے۔ اس لئے ہمیں ان اشخاص کی تلاش ہے ہمیں یہ بھی اطلاع ملی ہے۔ کہ تم ان کے لئے اسلحہ خود دوا وغیرہ مہیا کرتے ہو۔ یہ سب کچھ جاپان کی عسکری حکومت سے چھپ کر ایسا کام کرتے ہیں۔ ان سب اشخاص کے جرم سنگین ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کی تلاش ہے۔ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

کیوانگ شو۔ (خاموش ہے)

جنرل ارٹیا۔ کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو؟

کیوانگ شو۔ (بدستور خاموش ہے)

جنرل ارشیا۔ میرے اچھے بہادر! میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت تذبذب میں ہو۔ اس وقت امن و امان کا تمام انحصار ان کی گوشمالی پر ہے۔ تم ان کا پتہ بتا دو۔ یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہوگا۔ ادھر دیکھو۔ میں تمہارے ساتھ آزادانہ باتیں کرتا ہوں۔ تم کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سنتے ہو۔ اگر تم ہم کو ان کا پتہ بتا دو گے۔ تو تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔

(کیوانگ شو بدستور خاموش ہے)

جنرل ارشیا۔ (ایک سپاہی سے قدرے جوش سے) اپنی تلوار نکال کر اس گدھے کے سر پر رکھو۔ دیکھوں تو یہ کیونکر بات نہیں کرتا؟

کیوانگ شو۔ کیا تم آفتاب سے ٹھنڈک کی امید کرتے ہو؟ جنرل یہ تمہارا خیال خام ہے جنہوں نے عاقوں کو بیچ کر سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہو۔ وہ بھلا ایسی ذلیل حرکت کر سکتے ہیں۔ تم جو چاہے کرو۔ مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں لیکن یہ یقین رکھو کہ تم مجھ سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔

جنرل ارشیا۔ جن ہونٹوں سے اس وقت بڑھ بڑھ کر باتیں نکل رہی ہیں عنقریب انہی ہونٹوں سے شور و فغاں بلند ہوگا۔ تمہارا یہ غرور اور نخوت بھرا سر میرے بوٹ پر جھکے گا۔ تم رحم و کرم کے لئے گریہ و زاری کرو گے لیکن اس کو بلائے استحقار سے ٹھکرا دیا جائے گا۔ سمجھے!

کیوانگ شو۔ مادر وطن کا یہ فرزند اپنی جان موت کے سپرد کر دے گا لیکن کبھی اپنے سر کو ایک ذلیل کتے کے سامنے نہیں جھکائے گا۔

جنرل ارشیا۔ اوہ! اتنے جوش میں آگئے۔ برخوردار تم میری زبان پر اعتبار کرو۔ میں تمہارے ساتھ بُرا سلوک ہرگز نہیں کروں گا۔

کیوانگ شو۔ اعتبار کروں تم پر۔ لعنت ہے تم پر۔ تف ہے تمہاری ذات پر جاپانی قوم کے ذلیل کتو! تم ہی ہو جنہوں نے ہم چینیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ تم ہی ہو جو ہماری زمین پاک پر قبضہ جمانا چاہتے ہو۔ سنو کمینو! یاد رکھو جب تک مادر چین کا ایک بھی سپوت زندہ ہے۔ تم چین تو کیا چین کے ایک گز ٹکڑے پر بھی قبضہ نہیں جما سکتے۔

جنرل ارشیا۔ (غضبناک ہو کر) لے جاؤ اسے باہر لیجاؤ۔ ہم اس سے دوسرے طریقے سے پوچھیں گے۔ گھر کی مالکہ کو ما بدولت کے حضور میں حاضر کرو۔

[سپاہی بوڑھی لی فان کو پکڑ کر لاتے ہیں]

جنرل ارشیا۔ بڑھیا تم کو اس لئے ما بدولت کے حضور میں پیش کیا گیا ہے کہ ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ تمہارا لڑکا خلاف آئین سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے اور جہاں سے اس کے متعلق مستفسر کیا گیا۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ تم کو معلوم ہے کہ ایسے مجرموں کی سزا کیا ہوتی ہے؟ یہ سزائے موت!

سنتی ہو سزائے موت۔ اور اگر تمہارے لڑکے کو سزا دے دی گئی اور یقیناً دی جائے گی۔ تو پھر تم کہو گی کہ "میرے یتیم بچے پر ظلم ہوا"۔ میں نے تم کو اس لئے بلایا ہے کہ تم ہی ان لوگوں کا اتہ پتہ بتا دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے لڑکے کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔ جنرل ارشیا پر اعتبار کرو۔

لی فان۔ جنرل ارشیا پر کوئی بھی چینی عورت اعتماد نہیں کر سکتی۔

جنرل ارشیا۔ (لی فان کے جذبات کو ابھارنے کے لئے) تم جانتی ہو تمہارے بچے کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ کیا تمہیں یہ احساس ہے؟ یہ بہادر ماں ہے کہ نائی جو اپنے بچے کی زندگی کو بچانا چاہتی ہے۔ اپنے اس بچے کو جسے اتنا بڑا کرنے میں اس نے اپنا چین آرام گنوایا تھا (جنرل ارشیا ہنستا ہے) تم اس وقت کا خیال کرو کہ کتنی کہ اسے وہ وقت یاد نہیں جبکہ اس کا بچہ چھوٹا تھا۔ اور راتوں کو اندھیرے سے گھبرا کر پناہ لینے کے لئے اپنی ماں کی طرف دوڑتا تھا آج بھی ایسی ہی اندھیری خوفناک رات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بڑھی ماں کی آنکھوں کے آگے گزشتہ واقعات کے تمام نقشے سینما کی متحرک تصاویر کی طرح پھر رہے ہونگے۔ اسے صاف نظر آ رہا ہوگا کہ کس طرح اس نے اپنے بچے کی زندگی کو پروان چڑھانے کے لئے دن رات ایک کیا۔ کیا اب یہی ماں یہ برداشت کر سکتی ہے۔ کہ اس کے بچے کو اس کی آنکھوں کے سامنے تختہ دار پر چڑھا دیا جائے۔

لی فان۔ میرا لڑکا — میرا معصوم لال! لیکن میرا لڑکا گنہگار نہیں۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ وہ بیگناہ ہے معصوم ہے سچ کہتی ہوں معصوم ہے۔

جنرل ارشیا۔ تمہیں شاید میری زبان پر اعتبار نہ ہو۔ ان سے (ایک فوجی آفیسر کی طرف اشارہ کر کے) پوچھو کہ تمہارے لڑکے کا کیا قصور ہے؟

فوجی افسر۔ تمہارے لڑکے کے خلاف یہ الزام ہے کہ وہ جاپانی عساکر کے خلاف لڑنے والے چینی لوگوں کی امداد کرتا ہے۔ یہی بات اس کے مجرم ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

لی فان۔ تم میرے لڑکے پر بہتان لگاتے ہو۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

فوجی افسر۔ اس کا قصور یہ ہے کہ وہ اس وقت مسلح تھا۔ یہ قانون کی نظروں میں قابل سرزنش ہے۔

لی فان۔ قانون! تف ہے تمہارے ایسے قانون پر جو بے گناہوں کو خواہ مخواہ گنہگار ٹھہرائے۔

فوجی افسر۔ یہ خلاف قانون سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کو کھانا بہم پہنچاتا تھا۔ کیا یہ اس کے مجرم ہونے کے لئے ناکافی ثبوت ہے؟

لی فان۔ تم پر تین حرف! خدا کی لعنتیں تم پر۔ اس خدا کی جس نے تم جیسے لوگوں کو انسانیت اور تہذیب کے نام پر لوگوں کی آزادی کے لبادہ کو تار تار کرنے

کے لئے تیز ناخن عطا کئے۔ (وقفہ) آج تم میرے لال کو، میرے بچے کو تختہ دار پر کھینچ سکتے ہو لیکن یاد رکھو۔ وہ خدا جس نے تم ایسے ناہنجاروں کو دنیا میں قوت و توانائی عطا کی۔ وہ ضرور اس ظلم کا تم سے انتقام لے گا۔

جنرل اریٹا ۔ (خوب رو!!) بے اس خدا پر جس کا تو نام لے رہی ہے جس کے رحم و کرم کی تم منتظر ہو۔

لی فان ۔ بے شرمو! تمہیں شرم نہیں آتی جس کا کھاتے ہو اسی پر غراتے ہو جس خدا نے تمہیں طاقت و قوت بخشی، ڈرو۔ اس کے غضب سے ڈرو۔ سنتے ہو۔!

جنرل اریٹا ۔ خدا! (قہقہہ لگاتا ہے) خدا! کہاں ہے ——— خدا۔!

(وقفہ) وہ دیکھو اپنے خدا کا کرم —— دیکھا تمہارا اکلوتا لڑکا سامنے پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہے لیکن تمہارا خدا خاموش ہے۔ ہوں (ایک سپاہی سے) اسے بھی باہر لے جاؤ۔ تاکہ اپنے بیٹے کا حسرتناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جس خدا کا اسے بہت گھمنڈ ہے۔ اس کی قدرت کا اسے پتہ چل جائے۔

[سپاہی لی فان کو شانے سے پکڑ کر لے جاتا ہے۔ جنرل ریٹا کھڑکی کھول کر کھڑا ہو جاتا ہے]

[صبح کا وقت ہے۔ پو پھٹ رہی ہے۔ رات کا اندھیرا صبح کی سفیدی میں بتدریج مخلوط ہو رہا ہے۔ بارش تھم چلی ہے، بادل چھٹ چکے ہیں سامنے درخت کے پاس سیوانگ شو اور جاپانی سپاہی کھڑے ہیں۔ قریب ہی لی فان بڑی دسری کے ساتھ کھڑی تمام منظر کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ جنرل اریٹا یہ تمام نظارہ کھڑکی سے دیکھ رہا ہے۔ تنگ شی باورچی خانے میں کھڑی تمام باتیں سن رہی تھی جب کیونگ شو کے قتل کا حکم سنتی ہے۔ وہ دوڑی ہوئی آتی ہے]

تنگ شی ۔ اچھے جنرل ان کو قتل نہ کرو۔ کرو اچھے جنرل میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ ننگ پو کی پہاڑیوں کے شمال میں ہیں۔! اچھے جنرل اس کو قتل نہ کرو!

جنرل اریٹا ۔ اچھی لڑکی اب کچھ نہیں ہو سکتا میرا فیصلہ ہو چکا۔ اب تعمیل کی دیر ہے۔

[باہر گولی چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جنرل اریٹا باہر نکل جاتا ہے۔ تنگ شی رونے لگتی ہے۔ لی فان داخل ہوتی ہے]

لی فان ۔ تم رو رہی ہو۔ ۔ ۔ رو بیٹی! رونا کیسا۔ میری طرف دیکھو جس کے جگر کے ٹکڑے کو کاٹ کر پھینک دیا گیا ہے اس کی آنکھیں خشک ہیں۔ پھر تم کیوں رو رہی ہو کیونگ شو ایک بہادر تھا۔ وہ آزادی وطن کے لئے بہادرانہ موت مرا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔ کہ تمہارا بھائی چارپائی پر سسک سسک کر، مردوں کی موت نہیں مرا۔ سنتی ہو میں کبھی اپنے بچے کے لئے زر دوز کی کمل تک میں ایک بچے کی ماں تھی لیکن ظالم جاپانی کتوں نے میرے اس بچے کو موت کی وردی میں سلا کر آج مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔

(تنگ شی رو رہی ہے)

لی فان ۔ آج میری اور میرے بچے کی بہادری کا کارنامہ تاریخ عالم میں سنہری حروف میں لکھا جائیگا میرے بچے کا نام صدیوں تک بلند رہے گا۔ دنیا میں بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اپنی آزادی اور عزت کی حفاظت کی۔ آزمت کے تیر دکرنت ناحق سے ان کے جامہ حیات کو تار تار کر دیا لیکن میرا بچہ ایک معمولی سا انسان تھا اس نے بھی بڑا شاندار کام کیا۔ مائیں اپنے بچوں کو میرے بچے ایسا بننے کی تعلیم دینگی۔ کیونکہ وہ ایک بہادر تھا۔ بیٹی اپنے دل کو خوش کرو ——— سنتی ہو۔ ایک بات اور سنو عزت سے بھی زیادہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی اصلیت بہت اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے ——— (وہ آگے بڑھتی ہے تنگ شی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے)

لی فان ۔ آؤ اب اس کی لاش کو اندر اٹھا لائیں!

——— پردہ

شامِ فرقت

از
جگر قریشی لدھیانوی

شمع کی بے التفاتی خوب روشن ہے مگر
جلکے مر جانے کی حسرت اب بھی پروانے میں ہے

بے پیئے ہی کر دیا بیگانۂ ہستی مجھے
کیا کہوں مستی جوان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

شامِ فرقت جل رہے ہیں دل میں داغوں کے چراغ
تیرگی پاس پھر بھی میرے غم خانے میں ہے

بے وفائی پر بھی تجھ کو بے وفا کہتا نہیں
اک یہی خوبی ازل سے تیرے دیوانے میں ہے

دل ہے بہکانے میں محو اور عقل سمجھانے میں مست
اتنا ہی بس فرق اپنے اور بیگانے میں ہے

دھجیاں جیب و گریباں اور دامن تار تار
اے جگر کیا فرق تجھ میں اور دیوانے میں ہے!

اعترافِ رنگین

از ظفر شیرانی

ہر ایک پردہ نظر سے اٹھا دیا تم نے
جمالِ "شاہدِ فطرت" دکھا دیا تم نے
نظر سے "سازِ محبت" بجا دیا تم نے
ہر ایک نغمۂ رنگیں سنا دیا تم نے

ہر ایک "تارِ محبت" جگا دیا تم نے
غرض یہ ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

ہر ایک نظم پہ چھائی ہو رنگ و بو بن کر
چھپی ہوئی ہو مرے دل میں آرزو بن کر
رگوں میں دوڑتی پھرتی ہو تم لہو بن کر
نگاہِ شوق میں پنہاں ہو جستجو بن کر

نیاز و ناز کا قصہ مٹا دیا تم نے
غرض یہی ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

ہر ایک شعر میں میرے سما گئی ہو تم
سرور بن کے مرے دل پہ چھا گئی ہو تم
نشاط و کیف کے دریا بہا گئی ہو تم
ہر ایک "جذبۂ خفتہ" جگا گئی ہو تم

طریق شاعری مجھ کو سکھا دیا تم نے
غرض یہ ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

رہِ مجاز و حقیقت کو جانتا ہوں میں
کہ حسن و عشق کی فطرت کو جانتا ہوں میں
جہانِ دل کی شریعت کو جانتا ہوں میں
طریقِ راہِ محبت کو جانتا ہوں میں

ہر ایک رازِ محبت بتا دیا تم نے
غرض یہی ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

تجھی نے میری محبت کو تازگی بخشی
تجھی نے شمعِ سخن کو یہ روشنی بخشی
تجھی نے بزمِ تخیل کو دلکشی بخشی
تجھی نے خستہ و ناچیز کو خودی بخشی

بتاؤں تم کو کہاں تک کیا دیا تم نے
غرض یہی ہے مجھے شاعر بنا دیا تم نے

فردوس کی یادیں

(سانیٹ)

از اعجاز سکندر نارش

جہانِ دل میں جس کی حسرت بیتاب بستی ہے
مری نورجہاں ہے وہ مری حورِ جناں ہے وہ
مرے اجڑے ہوئے دل کی بہارِ جاوداں ہے وہ
مری چشمِ تماشا اس کی صورت کو ترستی ہے

حسیں ہے دل نشیں ہے ماہ پارا ہے جواں ہے وہ
مرا دل آئینہ خانہ ہے اس پرنورِ صورت کا
کہ مجموعہ ہے یکسر جو صباحت اور ملاحت کا
شراب و شعر کا پیکر، نشاطِ بیکراں ہے وہ

بہارِ خلد کے رنگیں نظارے مسکراتے ہیں
بہار آرا زمانہ ہے کسی کی نوجوانی کا
وہی بانی ہے خالق ہے محبت کی کہانی کا
مہ و خورشید تاباں ہیں ستارے مسکراتے ہیں
وہی ہے رونقِ عالم وہی ہے رونقِ دل بھی
وہی ہے جانِ نارش بھی وہی ہے جانِ محفل بھی

قطعات

از سید ضیا جالندھری

یاس

رات کے وقت چاند کا چہرا ڈھانپ لیتے ہیں جس طرح بادل
ناامیدی نے کر دیا یونہی میری تخییل سے تجھے اوجھل

تنہائی

فصلِ گل میں بھی مجھ سے دور ہو تم آہ میری یہ حسرتِ ناکام
یہ ہوائیں ہی تم سے کہدیں کاش میری آہوں کا دکھ بھرا پیغام

نغمۂ ماضی

روح بیکل ہے آرزو بے چین کھیلتی ہے مرے لبوں پر آہ
کس نے چھیڑا یہ نغمۂ ماضی روک لے کوئی روک لے للہ

اتفاقات

از

مشتاق احمد

کوئی ڈبہ نہ چھوڑا سارے ڈبے دیکھ ڈالے۔ کونہ کونہ چھان مارا۔ اور ایک آدھ دفعہ تو گارڈ کے ڈبے میں بھی گھس گیا لیکن بھائی صاحب کہیں دکھائی نہ پڑے۔ نظریں سارے سٹیشن کا جائزہ لینے لگیں۔ اور ساتھ ہی خیال ہوا۔ کہیں بچ کر نکل نہ گئے ہوں۔ مگر بھلا یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ ٹرین سے پہلے تو میں سٹیشن پر موجود تھا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے میں نے سوچا یہ آخر آئے کیوں نہیں۔ اگر آنا نہ تھا تو پھر خط کیوں لکھ بھیجا عجیب آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ مجھے پریشان کیا گیا، سنکی ہیں بالکل سنکی۔ دفعتاً قلی نے کہا "ہٹئے صاحب ہٹئے۔ گاڑی چھوٹ رہی ہے۔" میں گھبرا کر ہٹا کہ کہیں ایک آدھ بکس میرے سر پر نہ گر پڑے۔ اور ابھی سنبھلا ہی تھا کہ میں نے دیکھا پھر وہی لڑکی دھانی آنچل اڑاتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ایک ڈبے کی سمت بڑھی جا رہی ہے۔ اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میں نے بھی جواب میں ایک گہری نگاہ اس کی نگاہ میں ڈال دی۔ کچھ الفاظ ہونٹوں میں آ کر دب گئے۔ میں نے پھر آنکھ ملا کر دیکھا۔ وہی بالکل وہی کوئی فرق نہیں۔ وہی گداز گداز جسم۔ آنکھوں میں شراب جیسی مستی وہی زلفیں سیاہ لانبی اور نرم جیسے ساون کی جھکی ہوئی گھٹا چہرے پر۔ رنگی بالکل بھونروں کی طرح منہ چومتی ہوئی۔۔۔۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ جیسے ہی اس کا ڈبہ سامنے آیا نظروں کا پھر ایکبار تصادم ہو گیا کیسی نشیلی آنکھیں تھیں۔ میری رگوں میں تو خون شراب بن کر رہ گیا۔ اور میں نے کچھ بے بس الجھنوں کے ساتھ گھر کی سمت کار دوڑا دی۔ ایک بے نام سی خواہش دل کی خوابگاہ میں انگڑائیاں لینے لگی۔ ماضی کے تمام واقعات پل بھر میں پلکوں پر ناچنے لگے۔ وہ مجھے یاد آیا۔ کہ ایک دن میری طبیعت شام ہی سے مضمحل تھی۔ اور صبح تک تو اچھی خاصی حرارت ہو گئی خیال ہوا کہ چلو ڈاکٹر رسکر کے یہاں سے کچھ دوا ہی لیتے آئیں۔ ہمیں تم خیت بجا رہتا ہے اس خیال کے آتے ہی میں عابد شاپ والی سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہاں پہنچا تو روز کی طرح ایک اژدہام تھا۔ بڑی کوشش کے باوجود ڈاکٹر کی شکل نظر نہ آئی۔ بیٹھنے کو جگہ کیا ملتی۔ ایک دیوار کا سہارا لئے کھڑا ہو گیا۔ سامنے زنانہ پیشنٹس کا کمرہ تھا۔ طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کوئی بچہ جان چھوڑ کر رونے لگتا تو کبھی کسی عورت کی تیز آواز دیوار چیر کر کانوں میں بھالوں کا کام کرنے لگی۔ ادھر یہ اُدھر وہ بس تو سچ مچ بیمار ہو گیا۔ دفعتاً ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہی دروازے کے پٹ آپس میں جدا ہو گئے۔ سامنے ایک لڑکی آسمانی ساڑھی اور اس پر اودے رنگ کا جمپر پہنے ہوئے نظر آئی۔ سیدھی مانگ جیسے دو وادیوں کے درمیان پانی کی ایک تیز اور گہری لکیر، یاقوتی ہونٹوں پر پان کی ہلکی سی سرخی مجھے تو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میں جوانی کا ایک مرمریں خواب دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ وہ تیزی سے اس طرف لپکی اور دروازے کے پٹ بند کرتے وقت اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اور میں قدرت کی لطیف فسوں سازی پر مسکرا اٹھا ۔۔۔

اسی شام دل آپ ہی آپ گھبرا اٹھا۔ آج تک یہ وقت گھر میں نہ گزارا گیا۔ تو آج کیسے گزرتا؟ ایک سمت کو نکل پڑا۔ رستہ میں ایک دوست بھی مل گئے۔ کہنے لگے "کدھر؟" میں نے کہا "یونہی چہل قدمی"۔ وہ "خوب" کہتے ہوئے میرے ساتھ چلنے لگے۔۔۔۔ پھر کچھ سنیما کی باتیں چھڑ گئیں۔ کہ ہر کمپنی اچھے فلم تیار نہیں کر سکتی۔ یہ بڑی مشکل سی چیز ہے۔ یہی نہیں بلکہ لوہے کے چنے ہیں۔ فلم تو وہی ہے جس میں ساری باتیں ایسی نیچرل ہوں کہ انسان متاثر ہوتے ہوئے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ کہ اس کی اپنی کہانی پردے پر پیش کی جا رہی ہے اور ایکٹنگ یہ تو قدرتی آرٹ ہے۔ ہر شخص اس میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ کسی سین میں ذرا سی لغزش ہوا اور فلم دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو "موسیقی" کا بھی سب سے بڑا عنصر ہے۔ بغیر اس کے تو فلم میں رنگ ہی نہیں آ سکتا۔ بعض بعض وقت کسی موقع پر موسیقی کا خاص سنگم کس غضب کی دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ڈائرکٹر کا فرض تو سب سے زیادہ دشوار ہے۔ اس کو تو ایک فطری نگاہ چاہیئے ورنہ ڈائرکشن کا کام ہر ڈائرکٹر انجام نہیں دے سکتا۔ بہرحال ایک کامیاب فلم انتہائی قابلیت اور انتہائی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ورنہ ایسے ویسے تو فلم روز دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس اثنا میں "سنٹریز کمپنی" نظر آ گئی دونوں قدم غیر ارادی طور پر اس جانب اٹھنے لگے۔ میرے دوست نے کہا: "کہاں کہاں؟" میں نے کہا "صرف چاء اور ایک آدھ بسکٹ"۔ سامنے ہی گول اڑے میں ہم دونوں گھس گئے۔ اور ابھی بمشکل صرف آدھی پیالی پی گئی ہوگی۔ کہ ایک کار کمپونڈ میں داخل ہو کر بالکل ہمارے سامنے رک گئی۔ پردے تو لگے تھے لیکن جلوہ ریزی زیادہ تھی۔ میری نگاہیں پردوں سے مس ہوتی ہوئیں بڑی بڑی نرگسی آنکھوں تک گئیں میں نے پیشانی پر بل ڈال کر دیکھا۔ اور پھر بے اختیار سر کو اٹھا کہ ایک دن میں دو منظر دو جلوے وہی پھول جیسے رخسار عجیب بات عجیب اتفاق میرے بھی بڑے بھاگ ہیں۔ میرے لبوں پر ایک غیر محسوس تبسم کوندنے لگا۔ کار ہلکی سی شورش کے ساتھ لوٹ چلنے کے لئے بل کھانے لگی اور جب اس کی رفتار کچھ تیز ہوئی۔ تو ایک طرف کا پردہ ہٹ گیا۔ پھر ایکبار نظریں آپس میں لڑ گئیں کیسی ازلی چتون تھی۔ ہلکی ہلکی سی شاعر کے تخیل کی طرح مجھ پر تو ایک جذبہ کی کیفیت طاری ہو گیا۔ ایک بجلی تھی کہ رگ رگ میں دوڑ گئی۔ آنکھیں موندے پھر بھی وہی دھندلی

سی آنکھیں پیش نظر تھیں، اور میں تصویر کی دھندلی سی لکیر دن میں گم ہو گیا ... میرے دوست نے گھبرا کر پوچھا "کیا یہ کیا راز ہے؟" ——— میں نے کہا "تم کیا جانو"

ایک دن میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ایک کتاب کی ورق گردانی میں کھویا ہوا تھا کہ بھابی آئیں اور کہا سنیما چلنے ہو میں سوچنے لگا کبھی تو اتنی مہربانی نہیں کی گئی۔ پھر یہ آج کیسی؟ سمجھ گیا کہ ان لفظوں کی آڑ میں کوئی مقصد ضرور پوشیدہ ہے ———

میں نے کہا:۔

"نہیں آج طبیعت سست ہے"

وہ کہنے لگیں "چلو بھی طبیعت بہل جائیگی"

میں نے کہا "جی نہیں اور خراب ہو جائے گی"

وہ خفا ہو کر بولیں "ڈرائیور ہوتا تو تمہاری خوشامد کون کرتا"

میں نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا "اب تو اور بھی نہیں جاؤں گا"

اب کے وہ نرم لہجے میں بولیں "ٹکٹ ہمارے ذمے"

"اور ریفرشمنٹ" میں نے پوچھا۔

"آٹھ آنے اور سہی"

پھر تو میں بلا تامل تیار ہو گیا "ترنگی" کا پہلا دن تھا۔ ہر طرف ایک کثیر ہجوم۔ ہارنوں کی صداؤں سے تو کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کی موٹریں نظر آ رہی تھیں اور حقیقت میں دیکھا جائے تو عورتوں ہی کی دنیا ہے بیچارے مردوں کا تو اب کوئی حق ہی نہ رہا۔ یہ تو زمانے کی ستم ظریفی ہے کوئی کیا کرے ... میں نے بھابی کو آواز دیکر کہا "مجمع بہت ہے۔ موٹر کا وہاں تک پہنچنا سخت مشکل ہے یہیں سے اتر کر دوڑ جائیے" بھابی کہنے لگیں "ریفرشمنٹ کے آٹھ آنے نہیں ملینگے" اُف! یہ تو مجھے گوارا نہ تھا کیسی مجبوری تھی۔ رینگتے رینگتے بہ ہزار دقت پہنچنا ہی پڑا ——— ٹکٹ بڑی دشواریوں کے بعد حاصل ہو سکا کئی دفعہ تو ناک میں پھانسی بن گئی۔ اور میرا استری دار سوٹ آن کی آن میں ہزاروں شکنوں سے آراستہ ہو گیا اور غضب تو یہ ہوا کہ کوٹ کے دو بٹن کسی نے نوچ لئے۔ میں نے اسی وقت تصفیہ کر لیا کہ ان کے دام بھابی کو دینے ہونگے۔

کھیل بڑا پاکیزہ تھا۔ ویسے تو "نیو تھیٹر" کے سبھی کھیل معیاری ہوتے ہیں لیکن اس میں لیلا ڈیسائی کے ایک دو ناچ نے تو میرے دل میں ایک گہرا گھاؤ کر دیا۔ انٹرول میں لیمن پیا گیا۔ ایک دو کیک بھی کھائے گئے آئے اور پھر ایک گولڈ فلیکس کی ڈبیہ بھی [illegible] چاندنی ہی چاندنی تھی۔

کھیل ختم ہو گیا اور مجھے اپنے دل کے ہر جانب ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا [illegible] نہیں لگ سکتا اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی [illegible] ایک ایک قدم بڑھانا دشوار تھا۔ ہر پندرہ منٹ

کے بعد مجھے ایک کار کی جگہ حاصل ہوتی۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد میری کار سامنے والی کار کی جگہ لیتی۔ مجھے فکر کھا رہا تھا کہ ایسی صورت میں ٹھیک صبح کے چار بجے میں زنانہ گیٹ میں پہنچ سکوں گا۔ پھر خیال ہوا کہ عورتیں اتنی شوقین کیوں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی تو ایسی نہیں جس کی سمجھ میں آج کا کھیل آیا ہو۔ بس آنکھیں کی ضرورت حاصل ہوئیں۔ ذرا اور پر مجھے سخت غصہ آ رہا تھا کہ کم بخت کو آج ہی رخصت ملنی تھی نکل جاتا یا رس جاتا۔ ایک ہفتہ کے لئے مر جاتا لیکن کرتا تھا خدا خدا کر کے میں اس مخصوص جگہ پر پہنچ گیا جس کے لئے بار بار دعائیں مانگی جاتی تھیں میں نے کار روک لی اور بھابی کو ڈھونڈھنے کے لئے نظریں دروازے کی سمت دوڑائیں۔ تو زبان سے بے اختیار آمین نکل گیا۔ وہی پہچانی ہوئی شکل تشنہ تشنہ آنکھیں اور داہنے رخسار پر وہی ایک کالا سا تل دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر پلکوں کو زور زور سے پلکوں پر مار کر دیکھا سفید سفید ساڑھی اور اس پر سفید ہی بلاؤز ساری فضا گل بداماں ہو گئی۔ کانوں میں مکڑی کے جال کی طرح انتہائی دلاویز بندے جھکے ملے ہچکولے کھا رہے تھے۔ گوری گوری کلائیوں میں سبز چوڑیاں۔ جیسے کسی رخسار پر زلف پیچ و تاب کھا رہی ہو ... وہ دیکھتا رہا پھر کیا جانے کیا سمجھ کر دروازے کی آڑ میں ہو گئی اور میں زیر لب گنگنا اٹھا" جیسے وہ مجھ سے تو کیا رہی اک ادا نہ ہوئی" بھابی آئیں۔ کار میں بیٹھ گئیں اور مجھ سے کہا چلو لیکن اب موٹر ہے کہ کسی صورت سے اسٹارٹ نہیں ہوتی۔ پانچ منٹ دو منٹ دس منٹ مگر جواب صفر ہی ہے۔ اتنے میں وہی حسین سی لڑکی ایک سامنے والی سے کہنے لگی "ان سے کہو کر موٹر بڑھائیں۔ اور اگر موٹر چل نہیں رہی تو دھکیل کر ایک طرف کر لیں" کیسی شیریں وہ آواز تھی میں تو سمجھا کہ ساری دنیا نغمہ بن گئی ہے۔ اور میں اس ایک سیکنڈ سے دل میں حل ہوا جا رہا تھا۔ اسی کیف آگیں سرور میں مجھے یاد آیا۔ سوچ نہ ہوا ہی نہیں کہ کار کیسے چلتی۔ میں نے چلتے چلتے اس کے ... ایک گہری نظر ڈالی اور کچھ مسکرا کر جوابی محبت کا نغمہ شکر بھیگی ہوئی چاندنی کی طرح میری رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ بس غضب کی چہرے پر حسن کاری تھی سرخ سرخ سے جیسا لگ رہا تھا جیسے رات اور دن کا سنگم۔ سہرے سنہرے سے خواب آنکھیں کھوئے کھوئے یہی نظر آتے رہے۔ دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لینے لگی رات گئے تک میں ایسی ہی خیالات اور تخیلات کی رو میں بہتا رہا ———

اور آج سٹیشن والی لڑکی کو میں سوچنے لگا ایک اتفاق دو اتفاق چار چار اتفاق ... کوئی راز ہے کوئی معمہ ہے۔ ایک الجھی ہوئی بات ہے۔ جو انسان کی سمجھ سے دور بہت دور قدرت شاید ہم دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دینا چاہتی ہے۔ اور اسے ایک ایسا رشتہ قائم کرنے کی دھن ہے جس کو زمانے کے حادثات ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اگر ایسا نہیں ہے۔ تو پھر یہ بار بار اتفاق کیوں؟ محبت کے لطیف احساسات؟ ———

ایسے ہی خیالات مجھے کب تک پریشان کرتے رہے اور نجانے کتنی دیر ان ہی سوچ بچار کی الجھنوں کی تند غار نشیبوں میں لرزتا رہا ... لیکن پھر مجھے ایکدم یاد آیا کہ آج تو وہ چلی گئی

ایک صبح جب اٹھا تو معلوم ہوا کہ چند دوست بیٹھے ہیں۔ بڑا غصہ آیا۔ کہ اتنی سویرے بھی بھلا کوئی شریف آدمی اٹھتا ہے۔ مجھے پھر جانا ہی پڑا۔ یہ لوگ "نظام ساگر" کی سیر و مچھلیوں کے شکار کا پروگرام بنا کر آئے تھے۔ مجھے مجبور کرنے لگے کہ تمہیں چلنا ہی ہوگا۔ میں نے پوچھا "اور چلو گے کس پر"۔ تو سبھوں نے ایک آواز ہو کر کہا "تمہاری کار پر" بھلے تو ہم نے بڑے عذر سے کام لیا۔ مگر یہ دوست کبھی بات ماننے ہیں جو آج مان لیتے۔ مجبوراً مجھے تیار ہونا ہی پڑا ——— رات کے بارہ بجے "نظام ساگر" کا شاندار کنارہ دکھائی دینے لگا اور موجوں کی شورشوں کی ہلکی ہلکی صدائیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ ڈاک بنگلہ میں ہم سب اتر پڑے۔ راستے کی تھکن نے ہمیں فوراً ہی سلا دیا۔

صبح سویرے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی جلدی تیاری کی اور کنارے کی سمت سیر کے لئے نکل گیا۔ ہواؤں میں خوشگوار سی مستی پھیلی ہوئی تھی۔ منظر انتہائی پرکیف جیسے بہار چاروں سمت ناچ رہی ہو کیسی لطیف صبح تھی۔ وہ صبح بھی ہر طرف دھندلکا دھواں بن گیا تھا۔ موجوں کی گہرائیوں کو نگاہوں سے ناپتے ہوئے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دفعتاً وہیں کہیں میری نگاہیں نجانے کیا دیکھ گئیں۔ کہ میں حقیقت کو بھی خواب سمجھنے لگا۔ بے اختیار میری زبان گنگنا اٹھی۔

"آپ" اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور اس کی پیشانی پر ہزار ہا بل پڑ گئے۔

"یہ کوئی انسانیت ہے کہ آپ میرا برابر پیچھا کئے جاتے ہیں"

"میں یا آپ؟" میں نے جواب دیا۔ وہ کچھ اور جھنجلا سی گئی۔ اس سے نظریں بچاتے ہوئے مجھے کن نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھ گئی لہروں کا تلاطم نغمہ بن گیا۔ ایک عجیب محسوس سی گدگدی سارے جسم میں پھیل گئی تبسم بار بار میرے لبوں پر رقص کرنے لگا۔

دوپہر بھر شکار ہوتا رہا۔ گل پانی میں اور چھڑ ہاتھ میں مگر دماغ حسن کی گہرائیوں میں بھٹک رہا تھا۔ وہی ایک لطیف سی دھن دل کے ارد گرد مچلتی رہی۔ ان ہی پرکیف کیفیات میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ صبح کچھ اور نہ کہا گیا چاہئے تو یہ تھا کہ میں اس کا ہاتھ تھام کر اور پلکوں پر آنسوؤں کی بوندیں لئے ہوئے کہتا "اے دیوی اب میرے سامنے سے نہ جا! میں تیری پرستش ہی کے لئے بنایا گیا ہوں"۔ خیر کوئی حرج نہیں۔ اب بچ کے جائیگی کہاں! کیا شام ہوگی نہیں۔ وہ آئیگی کنارے پر ضرور آئیگی۔ پھر سمجھ لیں گے ———

تھوڑی دیر بعد دماغ قدرت کے ان فلسفوں میں گھر کر نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا جو زندگی کے حادثات بنکر زندگی سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں چند ہی لوگ ایسے ہیں نازحسن کا ساز گار رہتا ہے۔ مجھے ساری دنیا آپ ہی آپ رنگین دکھائی دے رہی تھی ———

شام کا دھندلکا تاریکی میں گم ہونے لگا، تاروں کی گھنی چھاؤں میں پانی کی سرتیز لہریں لرزنے لگیں میں اپنے دل میں لطیف سے لطیف حسین سے حسین تمناؤں کا بے پایاں ہجوم لئے ہوئے کنارے کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ اور ابھی میں ایک مسلسل تصورات کے سیلاب میں ڈوبنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک غیر مانوس صدا کانوں میں آئی "مشتاق مشتاق" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ریاض متبسم نظروں سے دیکھتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔

"ارے تم کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو تین ہفتے سے یہیں ہوں عجیب جگہ ہے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔" اس نے میرا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا "اُف! کتنی مدت بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے پورے چار سال۔ وہی علیگڈھ میں آخری بار گویا ملے تھے" میں پوچھنے لگا "کہو کیسے گذری شادی ہوئی کہ نہیں!" اس نے بتایا کہ شادی ہو گئی میں نے مبارکباد دیتے ہوئے دعوت نہ دینے کی شکایت کی پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ مجبور کرنے لگا کہ چلو کچھ دیر بیٹھکر باتیں کریں۔ اس پہلے ڈاک بنگلہ میں۔ کچھ خنکی بھی ہے تمہیں چائے بھی پلائیں۔ میں عذر کرتا گیا کہ تم چلو میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں کام تو کچھ نہیں مگر سامنے دیکھو کس قدر حیات آور منظر ہے۔ مگر وہ کب ماننے والا تھا۔ زبردستی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آگے بڑھے۔ میری نگاہیں کنارے کے ذرے ذرے میں زندگی ڈھونڈنے لگیں۔ اور یہ ساتھ ہی خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کے پاس بیٹھا رہوں اور وہ یہاں آ جائے پھر کیا ہوگا مگر میرا اس سے پیچھا چھڑانا سخت دشوار تھا میں مجبوراً اس کے ساتھ چلنے لگا ..

ہم چھوٹے سے باغ کی خوبصورت کیاریوں میں سے گذرتے ہوئے ڈاک بنگلہ میں داخل ہو گئے۔ اور وہ ایک صوفہ پر بیٹھتے ہوئے زور زور سے چیخنے لگا "جو ہی جو ہی"۔ وہ بالائی حصے سے "جی آئی" کہتی ہوئی نیچے آگئی۔ اور وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "یہ ہی ہیں جنہیں میری شریک زندگی بننے کا دعوے ہے!"..... میری آنکھیں حیرت ہو کر رہ گئیں حیرانیوں کا ایک کثیف سا پردہ آنکھوں پر چھا گیا پلکیں ندامتوں کے بوجھ سے کچھ جھک سی گئیں سینے میں دل آپ ہی آپ زور زور سے دھڑک اٹھا ..... اور پھر "پیٹرومکس" کی روشنی بتدریج مدھم ہوتی ہوئی معلوم ہوئی اور صبح میری کار حیدر آباد والی سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔

کوئی میرے دل سے پوچھے مرے ولولے قفس میں
یہ بہار کا زمانہ یہ سری بھری جوانی

(حسرت لکھنوی)

وہ دن

از
جمیل احمد بی اے

گاڑی رکی تو چند ایک مسافر ہی نیچے اترے سلیم اس کی بوا اور دو دیہاتی جو پھاٹک کے قریب سفید کوٹ پہنے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کھڑے تھے یا ٹکٹ کلکٹر چاروں ٹکٹ لیکر ایک طرف چلا گیا۔ اور دو دیہاتی لائن کی دوسری طرف جگہ جو نظر آ رہا تھا اس سمت چل دیئے۔ اب پلیٹ فارم خالی تھا۔ ساتھ کے مسافر خانہ میں البتہ دو آدمی بیٹھے تھے سلیم اور اس کی بوا جب ان کے پاس پہنچے۔ تو دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں ایک ہی بنچ پڑا تھا جو اب خالی ہو گیا۔ سلیم نے بوا کو اس پر بٹھا دیا اور خود سواری کے لئے دریافت کرنے لگا۔ ان دو آدمیوں میں سے ایک تانگے والا تھا۔ اس نے بتایا کہ بارشوں کی وجہ سے راستہ خراب ہے۔ اس لئے وہ کسی صورت انہیں لے جانے پر تیار نہ ہوا۔ دوسرا ایک چھوٹے قد کا بوڑھا تھا جس کے پاس ایک ہی گھوڑا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کو آواز دی۔ جو دوڑا دوڑا گیا اور پاس کے گاؤں سے ایک ٹچر لے آیا۔ بوڑھے نے بتایا کہ نہر کے کنارے کنارے راستہ اچھا ہے اور اس کا گھوڑا ہونے کی وجہ سے تانگے کے جھکولے ہوں گے اور نہ راستے میں جگہ جگہ جمع شدہ پانی کی دقت۔

راستہ بہت اچھا تھا۔ ایک طرف کھیت دوسری طرف نہر۔ اور اس سے پرے کھیت نہر کی پگڈنڈی بھی آگے چل کر کشادہ اور ہموار ہو گئی تھی۔ اگرچہ دوپہر کا وقت تھا گرمیوں کا موسم مگر سورج کے رخ کو رکے ہوئے بادل ڈھانپے بیٹھے تھے جس کی وجہ سے دھوپ تیز نہیں پڑ رہی تھی اور موسم خوشگوار ہو گیا تھا کھیتوں پر سے سرسے کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی

جب گاؤں ایک میل رہ گیا۔ تو سر راہ کی ایک مسجد کے کنوئیں سے انہوں نے پانی پیا اور کچھ دیر دم لینے کے لئے ٹھہریں سلیم نے انہیں گھوڑے پر سوار کرا دیا اور پھر چل پڑے یہ میل جیسے کیسے بہت جلد کٹ گیا گاؤں کے باہر بوا نے سلیم کو ٹوپی نکال دی اور دونوں دوش بدوش چلنے لگے حویلی کے پاس پہنچ کر گھوڑے لوٹا دیئے گئے۔

سیڑھیاں چڑھتے وقت بوا آگے تھی اور سلیم پیچھے۔ اوپر صحن میں کوئی متنفس نہ تھا بائیں ہاتھ کے ایک کمرے میں دونوں چلے گئے۔ اور پھر میل ملاقات کا سلسلہ شروع ہو گیا ادھر سے خیریت پوچھی گئی۔ اور کتنی ہی باتیں تھیں جو ایک دم کہہ ڈالی گئیں۔

سلیم کے لئے جب نزہت دودھ لائی۔ تو کمرے میں صرف نزہت کی چچی رہ گئی تھی سلیم نے اس کی ایک جھلک پہلے بھی دیکھی تھی اس وقت جب وہ آکر ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا کہ سامنے دوسری جانب کے عین مقابل کے کمرے سے نزہت یہ دیکھنے کے لئے نکلی کہ کون مہمان آئے ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے۔ اس گاؤں آئے گیارہ برس ہو گئے تھے بچپن میں بوا کے ہمراہ ایک دفعہ آیا تھا۔ اور اب بھی اگر ماں کی بیماری نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی بوا کے سسرال نہ آ سکتا۔

سلیم نے نزہت کے بکھرے بال دیکھے ... ہاتھ سے دودھ کا گلاس اپنے ہاتھ میں ... اور نزہت نے شرمیلی شرارتی نظریں ... وہ چہرہ اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ اور پھر وہ اس سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر ہی تو کھڑی تھی۔ سلیم کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اسے گلاس میں سے دودھ پینا نہیں آتا اور یہ بات ظاہر ہوئی جا رہی ہے جب سلیم نے گلاس لوٹایا تو دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کے لئے ملیں۔ نزہت کی آنکھوں نے کہا "ہم دوست ہیں" اور سلیم کی آنکھیں حیرانی سے کھلی رہ گئیں صرف "تاکہ پہچان سکیں کہ ہوں"

سامنے کے سنگار میز کے آئینے میں سلیم کو ایک چہرہ نظر آ رہا تھا منہ اور بالوں پر ہلکی سی گرد جمی تھی عکس صاف نظر نہیں آ رہا تھا سلیم اس چہرے کے حسن کو محسوس کر رہا تھا اور اس نے آئینہ پر سے نگاہیں ہٹا لیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ صحن میں آ گیا۔ ایک طرف حمید اور اس کا ایک ہم عمر لڑکا بیٹھے تھے ... کی کتاب سامنے کھلی تھی۔ نعیم ان کے پاس جا بیٹھا۔ دم میں جاوید بھی آ گیا۔

... کے وقت جب ... اور جاوید گھوڑے کی سواری کر کے واپس آئے۔ کھانے کے ... بھی نہیں ... نزہت ... کے پاس ہی آکر بیٹھ گئی۔ اور سلیم کی سواری کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ نزہت کہنے لگی کہ جب مجید وارث چھٹیوں میں آتے ہیں۔ تو ان کا یہ کام بھی یہی ہوتا ہے گھوڑوں پر زین کسوائی اور سوار ہو گئے۔ ابھی ویسے سرپٹ دوڑا رہے تھے۔ بوا نے کہا کہ سلیم کو گھوڑے پر سوار ہونا ہی کب آتا ہے پچھلی دفعہ سر کے بل گر پڑا تھا۔

"ہاں تمہاری سیکھنے کی بات ہے" سلیم نے نزہت پر ایک دزدیدہ نگاہ ڈالی۔ تو سلیم بولا "تم نے مجھے دیکھا تھا تمہیں میرا خیال ہے" یقیناً یہ دیکھنا اتفاقی نہ تھا۔ اور نزہت گو بوا کی طرف متوجہ تھی مگر اس کا دل کہہ رہا تھا "وہ گھوڑے پر سوار کتنے شاندار نظر آ رہے تھے"

کھانے کے دوران میں سلیم نے جب پانی پینا چاہا۔ تو سب سے پہلے نزہت نے اس کی اس ضرورت کو محسوس کیا اور انتظام کر دیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد جب جاوید کسی کام کے لئے اٹھ گیا۔ تو سلیم نے ایک لمحہ کے لئے نزہت پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا "نزہت تمہیں دیکھنے ہی میں زندگی ہے" مگر جب نزہت کی نگاہیں سلیم کی طرف اٹھیں۔ تو سلیم نے جلدی سے اپنی نگاہیں پھیر لیں پھر جاوید نے اسے باہر بلا لیا۔

سلیم کی چارپائی چھت پر تھی۔ سونے کے لئے جب وہ اوپر گیا۔ تو نزہت اس کے لئے دودھ لے آئی۔ ایک بڑا سا گلاس تھا۔ جو کہ لبالب بھرا تھا سلیم نے دل میں کہا۔ "کچھ ہو دو باتیں تو ضرور کروں گا" بولا "اتنا دودھ تو میں نہ پی سکوں گا" نزہت ہنس دی سلیم ابھی ہی ہی وہی سلیم نے حواس بجا رکھتے ہوئے کہا "نہیں تھوڑا نہیں لیجئے ایک اور گلاس لے کر

کم کریں۔

نزہت ہنسنا ختم کرکے مگر ابھی مسکراتے ہوئے بولی "کم ہی تو ہے" سلیم کے اصرار پر جب نزہت نے ایک اور گلاس لے کر دودھ کم کیا تو اتنا کہ باقی ماندہ مقدار میں کوئی خاص کمی پیدا نہ ہوئی پھر سلیم کا انکار اور نزہت کا اصرار غرض سب کو پینے ہی بن پڑی۔

اگلی صبح نہایت سہانی تھی۔ اٹھنے سے پیشتر جب اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وہ گاؤں میں ہے اور ایک لڑکی نزہت بھی وہاں ہے تو اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا ہو جو سیر وہ سیر کو باہر گیا۔ تو اسے صبح خاص طور پر شگفتہ نظر آئی۔ اس نے سوچا: "گاؤں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ یہ سہانا منظر یہ دھندلی صبح" اسی سہانے پن کا احساس دل میں لئے وہ گھر لوٹا۔ نزہت اسے صحن میں ملی۔ نزہت کا چہرہ بھی سہانا اور تازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور جب وہ مسکرائی۔ تو سلیم کو یقین ہو گیا کہ صبح واقعی ہو گئی ہے۔

نزہت نے کہا "چائے پئیں۔ بوا اور ممی بیٹھی ہیں" چائے پیتے وقت سلیم کو ایک تکلیف ہوئی۔ نزہت باتیں کم کرتی۔ وہ خاص طور پر کسی سے مخاطب نہ تھی۔ مگر سلیم کا خیال تھا وہ سب سے خطاب کر رہی ہے۔ نزہت کی باتیں بڑی میٹھی تھیں۔ انداز ایسے تھے۔ جیسے کسی سے ناز کر رہی ہو۔ سلیم نے سوچا اگر نزہت اس سے کھل جائے۔ تو اپنی بات منوانے کے لئے اکثر اس سے روٹھ جایا کرے گی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ اسے روٹھنے ہی کیوں دیگا۔ سلیم چائے بھی پیتا رہا۔ نزہت کی باتیں بھی سنتا رہا۔ مگر ان سب کے باوجود وہ بہت کچھ سوچتا رہا۔ سوچ ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے جب اس کا موضوع ایک حسین لڑکی ہو۔

دوپہر کی برسات سی قدرے گرم تھی۔ دوپہر کو وہ ایک کتاب پڑھتے پڑھتے وہ سو گیا جب سو کر اٹھا تو کتاب کے صفحے پر کھلی پاس پڑی تھی۔ مگر اس وقت اس کو پڑھنے کو جی نہ چاہا پلنگ سے اٹھا چند قدم چلا۔ پھر کچھ دیر ٹہلا پھر ایسے خالی صحن کو ... سے دیکھتا رہا اس وقت سلیم کا جی چاہتا کہ نزہت صحن میں نکل آئے۔ اور وہ اس سے مسکراہٹوں کا تبادلہ کرے۔ پھر نزہت اس سے پوچھے سو چکے اور وہ جواب دے "ہاں"

اور وہ نزہت ہی تو تھی۔ وہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں لئے۔ سلیم نے نزہت کو قمیص کے دامن کی شکن درست کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ سلیم کے دماغ نے کہا "اسے کہتے ہیں حسن خود آرائی۔ یہ لڑکیوں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ کسی کے سامنے آتے ہوئے ... نہیں کرنا چاہتیں" اور سلیم کے دل نے بھی دھڑک کر کہا "تو نزہت کو میرا اس طرح سے خیال ہے" نزہت جب اس کے پاس کھڑی تھی۔ تو پہلے کی طرح یوں نہ تھی کہ سنبھلی سنبھلی اپنے سر سے کھڑی ہے بلکہ یوں کہ آنچل انگلیوں میں آ جاتا۔ تو اسے بے تحاشا پھرانے لگ جاتی۔ یا جیسے اس کے دل میں کوئی کہہ رہا ہو "یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ان نگاہوں کی زد سے بچ کر ہی تو اطمینان کا سانس لے سکے گی" اگر اس وقت اسے کوئی ٹھوکر لگ جاتی۔ تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ اور وہ بری طرح پریشان ہو جاتی۔ مگر ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا مگر سلیم نے نزہت کے دلی جذبات اس کے چہرے اور انداز سے بہت کچھ پڑھ لئے

اس وقت نزہت بے وقت شرما جانے والی نوجوان لڑکی تھی۔ جس کے چہرے پر اکثر ہی شرم کی ہلکی ہلکی سرخی چھائی ہوئی ہو۔ اور ہر دم اندیشہ ہو۔ کہ اب اس کا چہرہ تمتما اٹھے گا اور ایک شعلہ سیمیں بن جائے گا۔

شام کو سونے سے پہلے بہت دیر باتیں ہوتی رہیں۔ سلیم کی بوا تھی۔ نزہت تھی۔ اور اس کی چچی۔ نزہت کی چچی نے سلیم کو بھی بلا لیا۔ اور اس سے کہانی کے لئے اصرار کرنے لگیں۔ نزہت بہت مصر تھی۔ بوا نے بھی کہا: "ہاں سلیم! کوئی سنا دو" سلیم کو جان چھوٹتی نظر آئی تو ٹالنے کے لئے کہانی کہہ دی کہ "ایک چوہا تھا" نزہت بول اٹھی: "چوہے کی نہیں کوئی اور" مگر نزہت کی چچی نے اسے چپ کرا دیا اور کہانی پھر شروع ہوئی: "ایک دفعہ وہ جنگلی سڑک پر سیر کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ سڑک صاف اور کشادہ تھی۔ اور ... شاندار درخت تھے۔ آگے چل کر اسے سڑک کے عین وسط میں ایک انڈا ملا جسے چوہے نے اپنی دم میں لپیٹ لیا۔ اور اپنے بل میں لے آیا۔ وہاں اس نے انڈے کو فرائی کرکے کھا لیا" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلیم نے اعلان کیا۔ کہ کہانی ختم ہوئی اور نزہت کی چچی ہنسنے لگ گئی۔ بوا نے کہا "واہ یہ بھی کیا کہانی ہوئی" نزہت البتہ بہت خوش نہ ہوئی۔ اس نے شاید ایک شاندار کہانی کی امید باندھ لی تھی جو پوری نہ ہوئی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں نزہت کی چچی بڑی باتونی تھی۔ تاہم نزہت نے بھی کافی باتیں کیں جنہیں اگر بوا نے جو اس کی چچی کی طرف متوجہ تھیں۔ نہ سنا سلیم کے پورے شعور نے سنا۔ نزہت نے کلو کی وادی کی سیر کی تھی سلیم کو اپنے اس سفر کی باتیں سناتی رہی۔ اور سلیم نے دل ہی دل میں سوچا "نزہت تم تو آسمانی مخلوق ہو۔ اس دنیا میں سیر کرنے آئی ہو" سلیم کو نزہت کے آسمانی مخلوق ہونے میں کوئی شک نہ رہا جب اس نے باتوں کے دوران میں ایک حسین انداز میں بالوں کی ایک لٹ کو چہرے سے ہٹا کر سر کے بالوں میں ملا دیا۔

اس رات وہ کچھ کھل گئے تھے۔ مگر اگلی صبح سلیم اور اس کی بوا کو واپس جانا تھا۔ سلیم نے دل کو سمجھایا "ارے مجھے نزہت سے محبت ہی کب ہے۔ اسے اگر میرا خیال ہے تو ہوا کرے۔ مجھے اس سے کیا" مگر دل نے کہا "کیوں بن رہے ہو تمہیں بھی اس سے محبت ہے بے پایاں محبت" اور سلیم کے دل اور دماغ نے مل کر سوچا "اب ہم جدا ہو جائیں گے پھر دیکھنے کا پھر شاید ہی موقع ملے۔ اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی تو ہے۔ ناکامی ہی محبت کا معراج ہے۔ نزہت یاد آیا کرے گی۔ تو اس کی یاد کتنی حسین ہو گی حسرتوں ہی میں مزا ہے اور پھر نزہت بھی تو مجھے یاد کیا کرے گی کبھی کبھی" سلیم کی حس شعری اس تصور سے جھوم اٹھی۔

رخصت کے وقت سلیم نے چاہا کہ وہ اپنی آنکھوں سے ہی نزہت کو رخصتی پیام دے جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس نے ایک نظر گریزاں نزہت پر ڈالی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے نزہت اسے عرصے سے تک رہی تھی۔ اور اس کا انداز جیسے کہہ رہا تھا "سلام نہیں کیجئے" آخر وہ اور بوا رخصت ہوئے۔ بوا گھوڑی پر سوار ہوئی۔ اور سلیم اور حمید سائیکل پر

ابھی وہ گاؤں سے باہر نہیں نکلے تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ کھیتوں میں ہوا کم ہے۔ اور بے حد گرم رہ گیا تھا۔ لو آگے چلتی گئی۔ اور سلیم اور حمید کھو کی طرف مڑے۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے سامنے پہنچکر سلیم نے حمید کو اوپر بھیجا۔ ابھی ڈیڑھ منٹ بھی نہ گزرا تھا۔ کہ نزہت نیچے آگئی۔ اس نزہت چھپے ڈیوڑھی میں آگئی۔ سلیم کچھ پریشان سا ہوگیا۔ نزہت بولی "واپس لوٹ آئے ؟ کیوں جانے کو جی نہیں چاہتا؟" سلیم اور پریشان ہوگیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ نزہت اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہی ہے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ نزہت نے اپنی ہی بات کی تردید کردی "میرا مطلب ہے۔ سائیکل کو جانے کو جی نہیں چاہتا۔" آخر حواس بجا کرکے سلیم نے کہا: "ہوا ابھرے تو پھر دیکھوں گا سائیکل کا جی کیسے نہیں چاہتا ہے گا۔" اس وقت سلیم کے خیالات اور جذبات میں ایک تلاطم برپا تھا۔ نزہت کچھ دیر اور ٹھہرتی تو شاید وہ پھوٹ بہتا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر عین اس وقت گلی میں ایک طرف سے دو آدمی باتیں کرتے آنکلے۔ نزہت اوپر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد حمید نیچے آیا۔ ہوا ابھری گئی۔ اور دونوں سوار ہوگئے۔ تالاب کے قریب پہنچکر حمید نے سلیم کو بتایا کہ نزہت کھڑکی میں کھڑی ہے۔ سلیم نے واپس مڑتے ہوئے پوچھا۔
"اور کون ہے؟" حمید نے جواب دیا "صاف دکھائی نہیں دیتا۔ غالباً اکیلی ہے۔" سلیم کے دل اور دماغ میں ابھی تک وہی طوفان تھا۔ اس نے سوچا پیچھے مڑکر دیکھے۔ پھر نجانے کیا خیال آیا۔ کہ سیدھا دیکھتا رہا۔ اور دوبارہ سنبھل کر سائیکل کو چلانے لگا۔

راستے میں ایک جگہ کھیتوں سے بانسری کی آواز آرہی تھی۔ سلیم نے سائیکل روک لیا اور اسے سننے لگا۔ چاروں طرف فضا میں ایک ہی آواز تیر رہی تھی۔ کائنات ساکت اور خاموش تھی۔ جیسے پورے انہماک سے سن رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد آواز دور ہوتی گئی اور مدھم ہوتی ہوئی بالکل معدوم ہوگئی۔

کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ اور مشتاق اندر داخل ہوا "خوب! پڑھے جاؤ میں کہتا ہوں خدا کی قسم مر جاؤ گے۔ سارے ہاسٹل میں اس وقت تک یا دو شاستری پنڈت پڑھ رہے ہیں یا تم۔ یہ کیا؟ کتاب اسی صفحہ پر کھلی ہے ایک گھنٹہ پہلے بھی جب میں یہاں سے اٹھکر گیا تھا۔ تو تم یہی صفحہ پڑھ رہے تھے۔ ہاں تو میں وہ کتاب لینے آیا تھا۔ صبح اٹھتے ہی اسے پڑھنے کا ارادہ ہے" سلیم نے صرف اتنا کہا "الماری میں ہے۔" مشتاق نے کتاب نکالی۔ میز پر پڑے ہوئے ڈبے میں سے ایک سگرٹ نکال کر سلگایا اور باتیں کرتا ہوا چلا گیا۔

سلیم نے کتاب پر نگاہیں جھکائیں۔ تو واقعی یہی صفحہ تھا۔ نگاہیں اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ایک پتنگا روشنی میں آیا۔ ٹیبل لیمپ کے بلب کے گرد دو ایک چکر کاٹے۔ اور پھر روشنی کے حلقے سے نکل کر کمرے کی تاریکی میں کہیں گم ہوگیا۔

آہ کیا سمجھا تھا میں!

از
جناب اُزیر احمد ارکولی

خندہ زن تو بھی ہے مجھکو گریہ ساماں دیکھکر — عندلیبِ زار تجھکو ہمنوا سمجھا تھا میں!
منتشر کردی چمن میں تونے میری داستاں — راز داں اپنا تجھے بادِ صبا سمجھا تھا میں!
تم سے وابستہ تھیں میری آرزوئیں حسرتیں — تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں!
"دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو" — تم کو دردِ زندگی کا مدّعا سمجھا تھا میں!
تم نے بھی مجھکو زمانے کی طرح ٹھکرا دیا — زندگی کے درد کی تم کو دوا سمجھا تھا میں!

عشق نے عقل و خرد پر کردیا پردہ اُزیر
زندگی کو ایک عیشِ جاوداں سمجھا تھا میں!

عہد

از

اختر بریلوی بی اے

جبر کروں گا دل زار پہ۔ غم کھاؤں گا   خود بھی تڑپوں گا تجھے بھی یونہی تڑپاؤنگا
دل جو ضد کرنے کی ٹھانے گا تو بہلاؤں گا   اپنی اس ہٹ سے کبھی باز نہ میں آؤنگا
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤنگا

اب نہ جاؤں گا تجھے روز ستانے کے لئے   روٹھنے کے لئے روٹھے کو منانے کے لئے
دو پہر کو تجھے سوتے سے جگانے کے لئے   اب تری نرگسی آنکھوں کو نہ شرماؤنگا
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤنگا

اپنے اشکوں کی قسم اور تری آہوں کی قسم   بھول جاؤں گا تجھے تیری نگاہوں کی قسم
ہاں تری نرم لچکتی ہوئی باہوں کی قسم   اپنے شانوں پہ ترے بال نہ بکھراؤں گا
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤنگا

یہ غلط ہے کہ ذرا بھی مجھے احساس نہیں   اور کچھ تیری محبت کا مجھے پاس نہیں
واقعہ یہ ہے کہ یہ رسم ہمیں راس نہیں   مان بھی جا کہ میں اس ضد سے نہ باز آؤنگا
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤنگا

یہ بھی سب جھوٹ کہ ڈر ہے مجھے رسوائی کا   اتنا کمزور نہیں دل ترے شیدائی کا
ہاں خطرناک ہے یہ دور شناسائی کا   خود سمجھ لے کہ نہ سب کچھ تجھے سمجھاوں گا
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤنگا

ڈر تو یہ ہے کہ محبت کا نہ چرچا ہو جائے   تو کہیں میرے توسل سے نہ رسوا ہو جائے
خود تجھے بھی نہ کوئی شکوۂ بیجا ہو جائے!   اس لئے اب ترے نزدیک نہیں آؤں گا
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤں گا

تجھ سے ہر روز کا ملنا مجھے منظور نہیں   اس قدر میل ملاقات کا دستور نہیں
ہم پہ آفت کوئی نازل ہو وہ دن دور نہیں   اپنے احساس شرافت کو نہ شرماؤں گا!
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤنگا

یہ یقیں ہے کہ تری یاد تو آئے گی مجھے   اور تو بھی نہ کبھی دل سے بھلائیگی مجھے
نہیں جاؤں گا کبھی بھی جو بلائے گی مجھے   تیری دنیائے تصور پہ مگر چھاؤں گا
میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤں گا

اب مجھے بھول بھی جا۔ یاد نہ آ۔ یاد نہ کر   خود بھی ناشاد نہ ہو مجھکو بھی ناشاد نہ کر
اس جوانی کو بنا رہنے دے برباد نہ کر   فائدہ کیا کہ نہ اس عہد کو ٹھکراؤں گا

میں ترے گھر نہیں جاؤں گا نہیں جاؤں گا

اویوکی

ایک جاپانی افسانہ

مترجمہ

علی احمد بی اے

دسمبر کی ایک سرد شام تھی جب موساکو اور مینوکچی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر گھر واپس آ رہے تھے۔ برفباری کے ایک طوفان نے انہیں گھیر لیا۔ وہ بدقت گھاٹ پہنچے لیکن ملاح کشتی کو دریا کے اس پار لنگر انداز کر کے جا چکا تھا۔ تیرنے کا کوئی موقع نہ تھا اس لئے ان لکڑہاروں نے مجبوراً ملاح کی جھونپڑی میں پناہ لی۔ اس تنگ میدان میں اتنا سہارا بھی بہت غنیمت تھا۔ جھونپڑی میں کوئی آتشدان نہ تھا۔ نہ کوئی ایسی جگہ تھی جہاں وہ آگ روشن کر سکتے۔ چھ مربع گز زمین پر کھڑی ہوئی لکڑی کی جھونپڑی میں صرف ایک دروازہ تھا۔ کوئی کھڑکی نہ تھی۔ اس میں دو آدمی سے زیادہ لیٹ نہ سکتے تھے۔ موساکو اور مینوکچی دروازہ بند کر کے آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ گھاس کے برساتی کوٹ ان کے جسموں ہی پر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ طوفان جلد تھم جائیگا۔

بوڑھا لکڑہارا تو بہت جلد سو گیا لیکن نوجوان مینوکچی دیر تک پڑا جاگتا رہا۔ تیز ہوا کے خطرناک تھپیڑوں اور دروازے پر برف کے ٹکرانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ندی گرج رہی تھی اور جھونپڑی طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کی طرح ڈگمگاتی ہوئی چرچرا رہی تھی۔ طوفان خوفناک تھا اور ہوا ہر لحظہ سرد سے سرد تر ہوتی جا رہی تھی۔ مینوکچی دیر تک اپنے برساتی کوٹ کے اندر لرزتا رہا۔ آخرکار انتہا درجہ کی سردی کے باوجود وہ بھی سو گیا۔

اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ برف کے گالوں کی بارش اس کے چہرے پر ہو رہی تھی۔ جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برف کے سفید اجالے میں اس نے ایک عورت کو دیکھا ـــ ایک سفید پوش عورت کو ـــ وہ اس کے ساتھی موساکو پر جھکی ہوئی اپنی سانس اس پر پھونک رہی تھی۔ اس کی سانس سفید دھوئیں کی طرح روشن تھی ـــ پھر وہ دفعتاً مینوکچی کی طرف مڑی اور اس کے اوپر جھک گئی۔ اس نے چلانے کی کوشش کی لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے حلق میں آواز اٹک گئی ہے۔ سفید عورت اس پر جھکتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ مینوکچی کے چہرہ کو مس کرنے لگا۔ اور اس نے دیکھا کہ بے حد حسین تھی۔ اگرچہ اس کی آنکھیں اسے خوفزدہ کر رہی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ اسے گھورتی رہی۔ پھر وہ مسکرائی۔ اور نہایت دھیمی آواز میں بولی ''میرا ارادہ تھا کہ تمہارے ساتھ بھی وہی کرتی جو تمہارے ساتھی کے ساتھ کیا ہے لیکن مجھے تم پر ترس آتا ہے کیونکہ تم ابھی جوان ہو ـــ تم بہت خوبصورت ہو مینوکچی میں تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچاؤں گی لیکن ـــ اگر تم نے کبھی کسی سے کہا ـــ خواہ وہ تمہاری ماں کیوں نہ ہو جو کچھ آج رات تم نے دیکھا ہے۔ تو مجھے معلوم ہو جائے گا ـــ اور پھر ـــ میں تمہیں ہلاک کر دوں گی ـــ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اسے یاد رکھو ـــ''

ان الفاظ کے ساتھ وہ پلٹی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور باہر کی طرف دوڑا لیکن عورت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ برف کا طوفان تیزی سے جھونپڑی میں داخل ہو رہا تھا۔ مینوکچی نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ حیران تھا کہ ہوا سے دروازہ کیسے کھل گیا ـــ اس نے سوچا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس کا وہم ہی تھا لیکن اسے یقین نہ ہو سکا۔ اس نے موساکو کو آواز دی لیکن اس کا خوف اور بڑھ گیا جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کا جواب نہیں دے رہا ہے۔ اس نے اندھیرے میں اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ موساکو کے چہرے کو چھو سکے۔ لیکن وہ ایک برف کا تودہ تھا۔ وہ مر چکا تھا۔

صبح ہونے سے پہلے طوفان تھم گیا۔ اور جب ملاح سورج نکلنے سے کچھ پہلے اپنی جھونپڑی میں پہنچا۔ تو اس نے موساکو کے منجمد جسم کے قریب مینوکچی کو بیہوش پڑا پایا۔ اسے ہوش میں لایا گیا لیکن اس خوفناک سرد رات کے اثر سے وہ بہت دنوں تک بیمار رہا۔ اس کے ساتھی کی موت نے اسے بہت خوفزدہ کر دیا تھا لیکن اس نے اس سفید پوش عورت کے متعلق کبھی کسی سے کچھ نہیں کہا اور جب وہ اچھا ہو گیا۔ تو حسب معمول جنگل کو جاتا اور شام ہوتے ہوتے لکڑی کے گٹھے لئے ہوئے لوٹتا۔ انہیں فروخت کرنے میں اس کی ماں مدد دیتی۔

دوسرے سال سردی کی ایک رات جب وہ اپنے گھر کے راستہ میں تھا۔ اسے ایک لڑکی ملی جو اسی پگڈنڈی سے جا رہی تھی۔ وہ ایک لانبی چھریرے بدن کی خوبصورت لڑکی تھی۔ مینوکچی کے سلام کا جواب اس نے ایسی مترنم آواز میں دیا۔ گویا وہ کسی گانے والی چڑیا کی الاپ تھی۔ تب وہ شانہ بشانہ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے چلنے لگے۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا نام اویوکی ہے اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے ماں باپ مدت ہوئی مر چکے ہیں اور وہ آج کل وہاں جا رہی ہے جہاں اس کے چند غریب رشتہ دار ہیں۔ شاید وہاں اسے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ مل سکے۔ مینوکچی کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ مسحور ہو گیا ہے۔ وہ جتنا اس کی طرف دیکھتا وہ اتنی زیادہ خوبصورت نظر آتی۔ اس نے پوچھا کیا اس کی نسبت کہیں ہو گئی ہے۔ وہ جھینپتی ہوئی بولی نہیں وہ آزاد ہے۔ پھر اس باری باری اویوکی نے مینوکچی سے وہی سوال کیا اور اس نے جواب دیا اگرچہ اسے صرف اپنی بیوہ ماں کی پرورش کرنی ہوتی ہے لیکن ابھی اس نے اس بات کی طرف غور نہیں کیا ـــ باتیں ہوتی رہیں اور گاؤں پہنچتے پہنچتے دونوں ایک دوسرے سے بہت آشنا ہو گئے اور جب مینوکچی نے اویوکی سے کہا کہ وہ کچھ دیر اس کے مکان میں آرام کر کے اپنا سفر جاری رکھے۔ کچھ دیر پس و پیش کرنے کے بعد آخر وہ راضی ہو گئی۔ اس کی ماں اویوکی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور اس کے لئے بہت اچھا کھانا تیار کیا۔ اویوکی کا طرز عمل اتنا اچھا رہا۔ کہ مینوکچی کی ماں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے ''کی دو'' جانے کا قصد چند دن کے لئے ملتوی کر دے۔ اس معاملہ کا فطری اختتام بھی ہوا کہ اویوکی ''کبھی کی دو'' نہیں گئی اور گھر کی سر پرست بن کے بیٹھ گئی۔

اودیوکی بہت اچھی بہو ثابت ہوئی ۔ اور پانچ سال بعد جب مینو کپی کی ماں مری ۔ تو مرتے دم تک اس کے لبوں پر اپنے بیٹے کی بیوی ہی کی تعریف تھی ۔ اودیو کی کی دس اولادیں ہوئیں ۔۔ لڑکے اور لڑکیاں سب کے سب نہایت حسین اور خوبصورت ۔

گاؤں کی عورتیں اودیوکی کو بڑے رشک اور حیرت سے دیکھتیں کیونکہ اس کی تمام خوبیاں اور تمام باتیں ان سے مختلف تھیں ۔ وہ دس بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی اتنی ہی جوان اور خوبصورت تھی جتنی کہ پہلے روز جب وہ اپنے گاؤں سے آئی تھی ۔

ایک رات جبکہ بچے سب سو گئے تھے ۔ اودیوکی کاغذی لیمپ کی روشنی میں کچھ سی رہی تھی مینو کپی اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولا ۔

کاغذی لیمپ کی ہلکی روشنی میں تمہارے چہرے کی دمک کو دیکھکر ایک عجیب واقعے کی یاد مجھے آرہی ہے ۔ یہ واقعہ مجھے اس وقت پیش آیا تھا جب میں صرف اٹھارہ سال کا تھا تب میں نے ایک عورت کو دیکھا تھا ۔ اتنی خوبصورت اور اتنی سفید جتنی کہ تم ہو ۔ یقیناً وہ بالکل تم سے مشابہ تھی "

نظروں کو بغیر اٹھائے ہوئے اودیوکی بولی ۔

"مجھے بتاؤ وہ کون تھی ۔ تم نے اسے کہاں دیکھا تھا ۔

تب مینو کپی نے ملاح کی جھونپڑی کی خوفناک رات والی سرگزشت سنائی ۔ سفید عورت کا اس پر جھکنا مسکرانا اور گفتگو کرنا ۔۔۔ پھر موساکو کی خاموش موت ۔ پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

" خواب تھا یا بیداری ۔۔۔ وہی ایک وقت تھا جب میں نے تم جیسی ایک ہستی دیکھی تھی حقیقت میں وہ انسان نہ تھی ۔۔۔ مجھے اس سے ڈر معلوم ہوتا تھا ۔۔۔ بہت ڈر ۔۔۔ لیکن وہ اس قدر سفید تھی ۔۔۔ مجھے اب تک یقین نہیں ۔ کہ دراصل وہ میرا خواب تھا یا میں نے حقیقت میں برف کی دیوی کو دیکھا تھا "

" وہ میں ہی تھی ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں ! اودیوکی ۔ اور میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تم نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے کہا تو میں تمہیں مار ڈالوں گی ۔۔۔ لیکن ان بچوں کی خاطر جو سو رہے ہیں ۔ میں تمہاری جان نہیں لیتی ۔۔۔ تم ان بچوں کی بہت اچھی پرورش کرنا ۔۔۔ بہت اچھی ۔ کیونکہ اگر انہیں کبھی تم سے شکایت ہوئی تو میں تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کرونگی جس کے تم مستحق ہو "

جیسے جیسے وہ چلاتی گئی ۔ اس کی آواز ہوا کی سنسناہٹ کی طرح باریک اور باریک ہوتی گئی ۔۔۔ تب وہ سفید اور چمکتے ہوئے کہر میں تحلیل ہوگئی ۔ جو چھت کی دیواروں کی طرف اٹھا ۔۔۔ اور دھواں نکلنے کے سوراخ سے پیچ و تاب کھاتا ہوا نکل گیا ۔۔۔ اور ۔۔۔ پھر وہ کبھی نظر نہ آئی ۔

روشنی اور سائے

از یوسف ظفر

چاند کے نور میں بھیگے ہوئے سایوں کے تلے
محو آرام ہے اک شاعر آسودہ خیال
جس کے ماتھے کی شکن چوم رہی ہے وہ کرن
جو بہت دور کسی سہمے ہوئے کمرے کی
ایک نادار سی مشعل کے ضیا خانے سے
پھوٹ کر کانپتے ہونٹوں سے چلی آتی ہے ۔۔۔
چاند کے نور میں بھیگے ہوئے سائے مل کر
شاعر مست کی شب رنگ گھنی زلفوں پر
اپنی بے داغ سیاہی کا حسین پیراہن
شب مہتاب میں یوں ڈال رہے ہیں جیسے
جھومر ڈھلکا اڑھاتا ہے بردا دلہن کو ۔۔۔
شاعر مست کی پلکوں کے سیہ سایوں پر

روشنی پھیلی ہوئی روشنی ۔ اک ناز کے ساتھ
کھیلتی ہے ، مگر اس طرح کہ جیسے کوئی
ساحرہ ایک فسوں پڑھتی ہو انداز کے ساتھ ۔۔۔
شاعر مست ہے مدہوش اُسے کیا معلوم
فطرت شوخ نے کس طرح سجایا ہے اُسے ۔۔۔
اس کو اتنی بھی خبر آج نہیں ہے شاید
کل یہی نور کی بھیگی ہوئی مدھم کرنیں
اس کے اشعار میں رقصاں و غزلخواں ہونگی
اور یہ سائے لپٹتے ہوئے ٹھنڈے سلسلے
اس کے گیتوں کے ترنم میں نمو پانے سے
تا ابد زندہ و تابندہ نظر آئیں گے ۔۔۔

امروز و فردا

جاپان

جب جمعیتہ الاقوام کے ذریعے دنیا کی تمام قوموں نے اپنی بحری قوت کا جائزہ لیا تو اس وقت جاپان خاموش رہا۔ اس نے اس نزاع کو اپنا راز سمجھا اور صاف انکار کر دیا۔ اس وقت دنیا کو احساس نہ تھا کہ جاپان بحری طاقت کے اعداد و شمار بتانے سے کیوں گریز کر رہا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ وہ برطانیہ اور امریکہ سے ٹکر لینے کے لئے خفیہ تیاری میں مصروف ہے۔ آج دنیا پر یہ حال کھل گیا۔ کہ جاپان کا ارادہ کیا تھا؟

مشرق بعید میں آتش خیز مادہ آہستہ آہستہ اندر ہی اندر جمع ہو رہا تھا۔ کہ اچانک آتش فشاں پہاڑ کے مانند خوفناک شعلے بلند ہو گئے۔ بحرالکاہل کے پانیوں میں دل دہلا دینے والی آگ بھڑک اٹھی اور جس امر کی توقع کی جا رہی تھی وہ ہو کر رہی۔ جاپان نے اپنے استاد ہٹلر سے جو کچھ سیکھا تھا۔ اس نے وہ دہرا دیا۔

جاپان کی بحری طاقت کا ابھی کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ سوائے جاپانیوں کے کسی بات کا علم نہیں کوئی بھی نہیں جانتا کہ جاپانی بحری جہازوں کی تعداد کتنی ہے اس کی آبدوزیں کتنی ہیں۔ اس کے جنگی جہاز کتنے ہیں اور کچھ دور نہیں کہ اس کی بحری طاقت بے پایاں ہو کیونکہ آج جبکہ وہ برطانیہ اور امریکہ کے مقابل صف آرا ہو گیا ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آخر اس کو اپنی طاقت پر اعتماد ہو گا۔ تب ہی وہ دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت سے نبرد آزمائی کو تیار ہو گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ بحرالکاہل میں وہ اکیلا ہے اور اکیلا ہی لڑنا چاہتا ہے چین، ہندوستان، برما، ملایا، برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی بے شمار فوجیں جاپان کو کچلنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ اور جاپان اکیلا خوفناک شعلوں میں کود پڑا ہے۔ ان ممالک کے علاوہ جزائر بھی جاپان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جرمنی اور اطالیہ خود مصیبت میں گرفتار ہے۔ اور وہ اس طویل مسافت کے بعد امداد بھیج بھی نہیں سکتا اس لئے جاپان کا جنگ کے شعلوں میں کود نا حیرت انگیز بات ہے بلکہ ایک معمہ ہے۔ اس سے وہی باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں پہلی تو یہ کہ جاپان کی بحری طاقت اس قدر زیادہ ہے کہ اسے اس بات کا یقین ہے کہ وہ امریکہ اور برطانیہ کا متحدہ مقابلہ کر سکتا ہے۔ دوسری قیاس آرائی یہ ہے کہ جاپان کو بحرالکاہل میں کمزور مقامات کا علم ہے اور وہ جانتا ہے کہ کس کس مقام سے [illegible] سے دنیا کی دو بڑی طاقتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا ہے۔

جاپان میدان جنگ میں کود پڑا اور اس سے مشرق میں جنگ کی سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ جاپان حقیقت میں ایک نیا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور آج دس برس پیشتر اس "نئے نظام" کا تصور جاپان کے خواب میں بھی نہیں آ سکتا تھا جب یورپ میں جاپان کے "بڑے بھائی" ہٹلر نے نئے نظام کا ڈھنڈورا پیٹا۔ تو جاپان نے ہی وہی سبق دہرا دیا۔ یہ نیا نظام کیا ہو گا۔ اس کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نیا نظام جاپان کی مطلق العنانی اور آمریت کا ایک نظام ہو گا جس کے لئے جاپان مدت سے تڑپ رہا ہے جب اس نے چین پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت وہ اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے بیقرار تھا جاپان جب اپنی جغرافیائی کم مائیگی پر ایک نظر ڈالتا تو شرمندہ ہو جاتا۔ اس نے دنیا بھر میں تجارت کا ایک طوفان برپا کر دیا ساری دنیا اس کی تجارتی سرگرمیوں کی گرویدہ ہو گئی۔ اقتصادی فوقیت حاصل کرنے کے بعد جاپان کو اپنی سلطنت کی وسعت کے خواب دیکھنے لگا اور چین پر حملہ آور ہوا پانچ سال سے وہ چین سے لڑ رہا ہے لیکن چین کو ابھی تک فتح نہیں کر سکا۔ اس سے جاپان کی عسکری استعداد کا کوئی حوصلہ افزا تصور ہمارے ذہن میں نہیں آتا لیکن اس کے باوجود وہ تنہا آج بحرالکاہل کی موجوں میں کود پڑا ہے وہ موجیں جو اس وقت تند و تیز ہو چکی ہیں۔

جاپان کی اس حرکت سے ہندوستان برما اور ملایا تینوں ممالک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے آج تک تو جنگ ہندوستان سے بہت دور رہی لیکن اب وہ دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ اور ہر ہندوستانی بڑی بے تابی کے ساتھ جاپان کی نقل و حرکت پر غور کر رہا ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ جاپان کا ارادہ کیا ہے۔

روس کے بعد بحرالکاہل محاذ جنگ بنا موجودہ تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے اور اس وقت صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے۔ اگر برطانیہ اور امریکہ نے متحدہ طاقت سے جاپان اور اس کے نئے نظام کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ تو مشرق میں ایک ابدی امن قائم ہو جائیگا۔ ورنہ یہ لگی ہوئی آگ اس وقت تک نہ بجھے گی جب تک کہ سارے ایشیا کا سکون درہم برہم نہیں ہو جاتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ اس وقت یورپ کے پانیوں کی رکھوالی کو ترجیح دیگا اور وہاں اس کی مصروفیتیں بے اندازہ ہیں لیکن آج کی سیاست کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے وقار کو قائم رکھے اور اس وقت تک قائم نہیں رکھا جا سکتا جب تک کہ جاپانی خطرے کا ہمیشہ کیلئے قلع قمع نہ کر دیا جائے۔

زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں ؏ اے فریبِ آرزو! تو کیا ہے کیا سمجھا تھا میں

(ڈاکٹر) تاثیر

میں نے گناہ کیا ہے؟

از
مسٹر انور کمال بی اے

اُسے دیکھ کر آج وہ چونک پڑا۔ اس کی آنکھوں میں بالکل پہلے کی سی چمک تھی۔ اور جب وہ ہنسی تو اس کے تینوں جیسے ہونٹوں میں وہی مٹھاس اور وہی کشش تھی۔ وہ ہنسی اور بالکل پہلے کی طرح اس کا ہنسنا اس کے لئے قیامت بن گیا۔ اس کا خوبصورت اور سڈول جسم بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا اس نے آج سے چار مہینے پیشتر دیکھا۔ لیکن آج وہ اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ اور جب وہ اس سے دو چار باتیں کر کے نگاہوں سے اوجھل ہوئی۔ تو وہ سوچنے لگا ایک عجیب بات

' میں نے گناہ کیا ہے' ؟

لیکن یہ احساس اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ وہ اُسے آج تک بالکل اسی طرح دیکھا کرتا جیسے وہ صرف دیکھنے ہی کی چیز ہے۔ اور اس کی یہ حرکت جو کل تک کچھ بھی نہ تھی آج گناہ بن گئی اور اس کا یہ خیال دم بدم تقویت پکڑتا جا رہا تھا۔

' میں نے گناہ کیا ہے'

چار مہینے ہی کی تو بات ہے۔ وہ اس سے ملنے کا کتنا خواہشمند تھا۔ اور اس نے گلی کی نکڑ پر بیٹھے ہوئے ایک آنکھ والے جوتشی کو اپنی تھوڑی سی آمدنی میں سے آٹھ آنے دے دیئے تھے صرف یہ پوچھنے کے لئے کہ کیا وہ اسے جیت سکتا ہے۔ اور آج جب اس نے ہنس کے اسے سلام کیا اور باتیں کرنے میں بھی پہل کی تو یہ منحوس خیال اس کے رگ و پے میں پھر سرایت کر گیا۔

' میں نے گناہ کیا ہے'

وہ سوچنے لگا آخر میں نے کونسا گناہ کیا ہے۔ صرف یہی کہ اسے دیکھا اور دو چار باتیں اس سے شرماتے ہوئے لہجے میں کیں۔ یہ گناہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک خوبصورت عنابی ہونٹوں والی لڑکی سے باتیں کرنا گناہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا دل یہ جاننے کے لئے تیار نہ تھا یہ تمام دلائل اسے بودے اور بے حیثیت معلوم ہوتے تھے اور اس کا ضمیر زور زور سے اس سے کہہ رہا تھا۔

' تو نے گناہ کیا ہے' ؟

اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ اسے ایکبار دیکھنے کے لئے اس سے باتیں کرنے کے لئے۔ وہ اس کے عنابی ہونٹوں کو ایک مرتبہ پھر اسی رعنائی سے وا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی اس کے سینے میں گھونسے مار مار کر پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

' تو نے گناہ کیا ہے'

اب اس کا دماغ کچھ زیادہ سرعت اور زیادہ تیزی کے ساتھ سوچنے لگا جب وہ میری ہو گئی میری مجبوری کی وجہ سے یا ماں باپ کی ضد کی وجہ سے تو پھر ایک دوسری لڑکی کو دیکھنا گناہ نہیں تو کیا ہے

لیکن یہ گناہ کیونکر ہو سکتا ہے کیا میں اپنی تمام عمر اسی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگانے میں صرف کر دوں گا وہی صبح وہی شام اور اس صبح اور شام کی کیفیت میں بھی وہی کبھی نہ ختم ہونے والی ہم آہنگی پھر مجھ میں اور ایک بے کل مشین میں کیا فرق ہوا؟ چاند اور سورج مجھ سے مختلف کس بات میں ہوئے؟ وہ بھی تو اپنی یہ کشمکش ایک ہی دائرے میں جاری رکھتے ہیں میں انسان ہوں حساس انسان لوہے کی مشین نہیں لیکن وہ ان تاویلوں سے اپنی تسلی نہ کر سکا اور پھر اس کے دل میں کوئی عجیب عجیب آواز سے کہنے لگا۔

' تو نے گناہ کیا ہے '

مذہب اس کے خلاف ہے سوسائٹی اس کے خلاف ہے میرے والدین اور رشتے دار اس کے خلاف ہیں لیکن وہ سوچنے لگا ان کے خلاف رہنے سے میرا کیا بگڑتا ہے یہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں مذہب بے جان چیز ہے غیر حساس پتھر کی طرح۔ سوسائٹی وہ تو ہماری ہی بنائی ہوئی ہے ہم جب چاہیں اس کے اصولوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ سکتے ہیں لیکن یہ تصریحات وقتی ثابت ہوئیں۔ وہ پھر اپنے آپ میں سمٹ آیا اور اس کا دل پھر دھڑکن کے ساتھ کہنے لگا۔

" تو نے گناہ کیا ہے"

لیکن وہ ہار کیسے مان جاتا۔ وہ پھر ضمیر کی اس غیر فطری آواز کے خلاف لڑنے لگا۔

دنیا میں ہر انسان یہی کچھ کرتا ہے میں نے اگر ایسا کیا تو کونسا آسمان پھٹ پڑا میں قصوروار نہیں میری جگہ کوئی بھی ہوتا ایسا کرتا لیکن یہ خیال بھی اس اندرونی بھیانک آواز کے سامنے جو دم بدم بڑھتی جا رہی تھی اپنا دم توڑنے لگے۔

یہ گناہ ہے مذہب کے اصولوں کے خلاف کوئی نہیں لڑ سکتا سوسائٹی کی آہنی زنجیریں میرے جیسا معمولی آدمی نہیں توڑ سکتا میں اب پھر کبھی اس راستے نہیں آؤں گا۔ مجھ پر میری بیوی کا حق ہے اس نیک بخت کا جو ہر وقت میری راہ تکا کرتی ہے۔

لیکن پھر دوسرے روز پھر وہ اسی سڑک پر ایک کھمبے کے ساتھ کھڑا تھا جب وہ گذری تو اس کی آنکھوں میں بالکل پہلے کی سی چمک تھی اور جب وہ ہنسی تو اس کے پتیوں جیسے ہونٹوں میں وہی مٹھاس اور وہی کشش تھی۔ وہ ہنسی اور اس کا ہنسنا اس کے لئے بالکل پہلے کی طرح قیامت بن گیا۔ اس کا خوبصورت اور سڈول جسم بالکل پہلے کی طرح تھا۔ وہ جا رہی تھی۔ اسے مذہب کے اصولوں کی چٹانیں ریت کے انبار سے زیادہ نرم۔ سوسائٹی کی آہنی زنجیریں کچے تاگے سے زیادہ کمزور معلوم ہو رہی تھیں۔ اور جب وہ گذر گئی۔ تو وہ سوچنے لگا۔

" کیا میں نے گناہ کیا ہے ؟

ترکیہ کا جدید نظریہ تعلیم

از
محمد عمر اصفہانی ایم اے

ارتقائی منازل پر ایک نظر

موجودہ جنگ کے خوفناک شعلے یورپ کے ہر ایک کونے سے بلند ہو کر دنیا کی ہر چیز کو بھسم کر دینے پر تلے ہوئے ہیں اور اس خوفناک آگ میں ترکیہ جس شان سے اکیلا کھڑا ہوا نظر آتا ہے اس پر بحث کرنا ایک خالص سیاسی مرحلہ ہے لیکن اس زندہ قوم نے پچھلے دس برس میں جو ارتقائی منازل طے کئے ہیں ان میں تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا حصہ ہے اور قوموں کی کتاب زندگی میں بھی سب سے بڑا باب یہی ہے جس پر آنے والی نسلوں کی بنیادیں قائم ہوا کرتی ہیں۔ اسی لئے ترکیہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر ہوگا (ایڈیٹر)

آزاد ممالک دس برس کی مدت میں بھی اپنی تقدیریں بدل لیا کرتے ہیں۔ دنیا حیران تھی اور اب تک حیران رہے گی کہ یورپ کا مرد بیمار جس کا یورپی سیاست نے کچومر نکال کر رکھ دیا تھا دس برس میں کیونکر زندہ ہو گیا۔ تاریخ آج اس حیرت زا واقعہ کو معجزہ تصور نہ کرے لیکن آج سے سو برس بعد دنیا اسے معجزہ کہہ کر ہی یاد کرے گی۔ ایک مرد مجاہد اٹھا اور اس نے تنہا وہ تمام غیر ذمہ دار عناصر نابود کر دیئے جو قوموں کے راستے میں حائل ہوا کرتے ہیں بلکہ زنگ لگا ڈالنے والے ہیں۔ ان عناصر میں ہمیں مذہب کے بھی چند شائبے نظر آتے ہیں لیکن اگر ہم یہ ثابت نہ کر سکیں کہ دنیا کے سب سے بڑے مدبر نے چند غیر ضروری مذہبی رسوم کا انقطاع کر کے قوم کو ایک ایسی ہلاکت سے بچا لیا جس کے واقع ہو جانے سے یورپ کے نقشے پر ایک اسلامی قوم کا نام مٹ جاتا۔ تو تاریخ لکھنے والے لوگ یہ ثابت کر کے ہی چھوڑیں گے کہ ترکی قوم نے جو کچھ کیا وہ ایک ہی راستہ تھا۔

خطروں کے خارزار وادی میں کودنے والی یہ قوم آج ایک بار پھر آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ یورپ کے شاطر اپنے اپنے مہرے کمال چابکدستی سے لڑا رہے ہیں جہنم کی ایک ایسی آگ جلتی پھرتی نظر آ رہی ہے جس میں اس یورپ کی تہذیب راکھ ہو رہی ہے جس کا دعوےٰ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے اسی نے تہذیب اور تمدن کا سبق دیا۔ انقلاب فرانس کے بعد جو امن کے پرچم لہرائے گئے کہ دنیا کی تاریخ میں آج جمہوریت کا باب شروع ہوتا ہے امن [illegible] انسانوں کی آبادی میں اترا ہے اگر ان نادانوں نے اسی وقت یہ محسوس کر لیا ہوتا کہ امن کا فرشتہ تو مدت ہوئی عرب کے ریگزاروں میں اتر چکا ہے اور ساری دنیا پر سایہ [illegible] تو آج ان دعویداروں کو اس ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ بطحا کی وادیوں سے جب امن اور مساوات کا پیغام دیا گیا تو وہ آج تک امن کا پیغام ہی رہا لیکن جنہوں نے اپنی سیاست کو جغرافیائی حدود میں قید کر دیا ان کے امن کا دیوتا اس دعوے کے بعد [illegible] تہذیب کئی بار خوفناک آگ میں جل کر راکھ ہوئی۔ ان سیاست دانوں نے اس راکھ کو پھر ہوا میں اڑا کر انسانوں کو فریب میں پھنسانے کی کوشش کی۔

آج ہمارے سامنے پھر امن کا دیوتا اپنی آنکھوں سے شعلہ ریزیاں کر رہا ہے۔ یورپ کی ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک تہذیب امن مساوات اور انسانیت کو آگ کے بیتاک شعلوں میں جلتا ہوا دیکھ رہا ہے لیکن سچا نہیں ہو سکتا سچا ہے بھی کیونکہ ان کی سیاست کی ابتدا ہی غلط اصول پر ہوئی ہے۔ قوموں نے اپنے لئے اصول ہی ایسے مرتب کئے ہیں جن سے دس یا پندرہ برس کے لئے تو جارحانہ طاقتوں کا انسداد ہو جاتا ہے مگر یہ عارضی فتنہ صرف دبایا جاتا ہے نابود نہیں کیا جاتا۔ پندرہ بیس برس کے بعد فتنہ ایک مرتبہ پھر سر بلند کرتا ہے۔ اور وہ طاقتیں جو امن کی اجارہ دار ہیں پھر اس فتنہ کو دبانے کی مساعی عمل میں لا رہی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس عالمگیر بحران کا ذمہ دار فتنہ ہے یا وہ طاقتیں جو اسے ہمیشہ کے لئے نابود نہیں کر سکتیں۔

آج یورپی قومیں ایک دفعہ پھر موت اور زندگی کے درمیان حیرت زدہ نظر آتی ہیں۔ اس مختصر سے مضمون کے ساتھ ترکیہ پر کیا اثر ہوگا جو بھی ترکی نہ تنہا ایک سیاسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ کیا آتش فشاں پہاڑ میں اپنے کو نابود کرے گا یا وہ اپنے دامن کو جلائے بغیر ہی صاف بچ نکلیگا۔ اس سوال کا جواب دنیا مانگ رہی ہے۔ اہل اسلام تو اس سوال کے جواب کے لئے بے قرار ہیں لیکن ماہرین سیاست و تدبر بھی جواب دینے میں تامل کر رہے ہیں کہ

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

موجودہ ترکی کے تعلیمی دور کے متعلق ابتداً تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں جب ترکیہ کی باگ ڈور کمال اتاترک نے اپنے ہاتھوں میں لی تو یہ معاشرتی تعلیمی اور تمدنی انقلاب ترکیہ کی سرزمین کے رگ و ریشہ میں سرایت کرنے لگا۔ اور پھر ۱۹۲۴ء میں جب جمہوریہ ترکیہ کے سامنے اتاترک نے تقریر کی اس وقت ایک ایسا تعلیمی پروگرام پیش کیا گیا جس کا کبھی وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

۱۹۲۰ء سے پہلے ترکیہ میں تعلیم ایک بے معنی سا لفظ تھا۔ برطانیہ اور امریکہ نے چند مخصوص اسکول جاری کر رکھے تھے جن میں ان کے اور متمول ترکوں کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ مغرب میں تعلیم کا جو تصور تھا۔ ترکیہ کے باشندے اس سے قطعی ناواقف تھے۔ البتہ وہاں کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور وہ تعلیم بھی اس قدر کہ عربی زبان

کو زبان کو بغیر سمجھے بوجھے صرف پڑھ سکیں، اور اسی پر اکتفا کی جاتی تھی۔ بعض خاندان بچوں کے لئے یورپین گورنس بھی رکھا کرتے تھے۔ اور اپنی بچیوں کو تعلیم دلاتے تھے۔ لڑکیوں کے لئے مدرسے نہ تھے۔ بعض معزز گھرانوں کے بچے یورپین ممالک میں بھی تعلیم پاتے تھے۔ اور ان دو راندیش والدین کے بچے جنہوں نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم پائی وہ جدید ترکی میں ممتاز ترین انسان تصور کئے جاتے ہیں۔

گذشتہ جنگ عظیم سے پہلے تو یہ حالت تھی کہ اگر تعلیمی یا دوسرے اصلاحی معاملے پر آج کوئی تجویز پیش ہوتی ہے۔ تو بیس برس تک وہ مسل دفتروں میں گھومتی تھی۔ اور پھر بھی حکومت کی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں صادر ہوتا تھا۔ ایک یورپین سیاح لکھتا ہے کہ دو سال ہوئے میں استنبول کے ایک مدرسے میں گیا جہاں بچے بے حد تسنا سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس مدرسے کی دیواریں تو پرانی ہیں لیکن چھت بالکل نئی ہے۔ حیران رہ گیا میں نے پوچھا کہ کیا کسی طوفان سے یہ چھت اڑ گئی ہے۔ جواب ملا کہ اس سکول کی عمارت جنگ عظیم سے پیشتر شروع ہوئی تھی تیس سال تک دیواریں کھڑی رہیں اور چھت کی تعمیر کے لئے حکومت کی طرف سے منظوری نہیں ملتی تھی۔ آخر کار جب اتاترک برسر کار ہوا۔ تو یہ چھت فوراً تعمیر کر دی گئی۔

۱۹۳۵ء میں جب نیشنل کانگرس کا اجلاس ہوا۔ تو اس میں جدید ترین تعلیم کے فروغ اور ترقی کے لئے پروگرام مرتب کیا گیا۔ سب سے پہلے تو یہ اصول مرتب ہوا کہ ہر ایک شہری تعلیم کے سلسلہ میں حکومت ترکیہ کا انتہائی احترام پیش نظر رکھے کیونکہ اس کے بغیر تعلیم کے سارے مدارج طے نہیں ہو سکتے۔ اتاترک کو معلوم تھا کہ تعلیم مادی دنیا سے جنگ کرنے اور مادہ پرستوں کے مقابلے میں اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب ترکیہ کا ایک ایک باشندہ حکومت کے حکم کا احترام کرے۔ آج تک تعلیم صرف چند مذہبی کتابوں کو پڑھ لینے کا نام تھا۔ لیکن تعلیم کا مقصد خاص طور پر یورپ میں کچھ اور ہی ہے۔ اور اتاترک مغربی قوموں سے ٹکر لینا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے تعلیم کو صرف اس نظر سے دیکھا جس سے اس کی قوم ہمسایہ ممالک سے آگے نہ بڑھ سکے۔ تو کم از کم ہمدوش تو ہو جائے۔ آج ترکیہ کی تعلیم میں صرف ترقی اور وطن پرستی کا جذبہ کار فرما ہے اور انہی بنیادوں پر اتاترک نے قوم کو اتنا سربلند کر دیا کہ حیرت ہوتی ہے اس سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ترکی قوم توہمات کا ایک سرچشمہ تھی جس میں اخلاقی اور معاشرتی کمزوریاں تھیں۔ یہ کمزوریاں چاروں طرف پھیل رہی تھی ہر ایک اقوام نے چونکہ ترکی قوم کو بالکل مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اس لئے مسکتے دم توڑتے کا منظر یورپین قوموں کی آنکھوں کے سامنے تھا اور یہ عادت صرف یہیں رہ گئی ہے کہ ایک نجات دہندہ پیدا ہوا جس کا نام مصطفےٰ کمال اتاترک تھا اور جس نے بیسویں صدی یہ معجزہ بھی کر دکھایا کہ مردوں میں روح بھی پھونکی جا سکتی ہے۔

جب تک کسی قوم کے بچے صحیح راہ پر تعلیم حاصل نہ کریں گے تو قوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک ذہنی تعمیر نہ ہوگی۔ کوئی قوم برے اور بھلے میں تمیز کیونکر کر سکتی ہے چنانچہ اتاترک نے سب سے پہلے تعلیم کی طرف توجہ کی اور لطف یہ ہے کہ وہ محض ایک سپاہی تھا لیکن جب ترکیہ کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں آئی تو وہ ایسا مدبر ثابت ہوا کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس نے خود تعلیمی نصاب مقرر کئے۔ اور ان تمام مرحلوں پر غور کیا جس سے ترکیہ میں تعلیم نہ صرف عام ہو جائے۔ بلکہ ہندوستان کی طرح محض نوکریاں تلاش کرنے کا ایک ذریعہ بن جائے۔

ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ترکیہ میں اندھا دھند کالجوں میں تعلیم نہیں دی جاتی۔ بلکہ ماہرین تعلیم ہر ایک بچے کے ذہنی رجحان کا معائنہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد بعض بچوں کو صنعتی تعلیم کی درسگاہوں میں بھیج دیتے ہیں۔ اور یونیورسٹی میں اعلیٰ حاصل کرتے ہیں ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج ترکیہ میں بچیاں اور بچے دونوں اکٹھے تعلیم حاصل کر رہے ہیں آج سے پچیس برس پیشتر اگر کسی ترکی باپ سے کہا جاتا کہ ترکیہ میں لڑکے اور لڑکیاں دوش بدوش تعلیم حاصل کریں گے۔ تو شاید وہ ہنس اٹھتا لیکن یہ صرف ایک آدمی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ یورپین اثرات سے بے نیاز ہو کر اس نے تعلیم و تربیت کے وہ دروازے کھول دئے جن کو روایات کے قفل پڑے ہوئے تھے۔

اتاترک پر دنیائے اسلام میں سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ اس نے اسلامی تعلیم کے تصور کو چھوڑ کر ملک پر خالص مغربی رنگ چڑھا دیا۔ اس مقالہ میں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر اتاترک نے مساجد کے مدرسوں کو منسوخ کیا تو اس کی خاص وجہ تھی سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ ترکیہ کو باقی یورپ کے ساتھ ٹکر میں لانا چاہتا تھا اور وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ آرٹ اور سائنس کے تمام شعبوں پر اس کا ملک حاوی نہ ہو جائے اور ملک اس وقت تک حاوی نہیں ہو سکتا تھا جب تک جدید طرز کی تعلیم ملک کے کونے کونے میں پھیل نہ جاتی۔ دوسرا افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ علماء متعصبانہ رنگ میں مساجد کے کونوں میں بیٹھ کر ریاست کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے چنانچہ خلافت ترکیہ کے صدی کی تاریخ ان سازشوں کا ایک ہولناک باب ہے اتاترک چند ہی دنوں میں ایک ایسی دوڑ لگانا چاہتا تھا کہ یورپ جو تعلیمی معاشرتی تمدنی اور سیاسی طور سے صدیوں آگے بڑھ چکا تھا۔ اس کے ہمدوش ہو جائے اور کون نہیں جانتا کہ یہ اہم مرحلہ صرف اسی صورت میں طے ہو سکتا تھا اتاترک نے عربی رسم الخط کو چھوڑا۔ تو محض اس لئے کہ وہ تاخیر اور تعویق جو تعلیمی منزلوں میں حائل ہوتی ہے۔ اس سے نجات حاصل ہو جائے۔ اور اس کی قوم ایک قلیل مدت میں تعلیم و تربیت کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہو جائے اتاترک نے اگر لباس میں مغربی رنگ ڈھنگ کا تتبع کیا۔ تو اس میں بھی یہی راز پنہاں تھا کہ اس کا مقابلہ دنیا سے نہیں بلکہ یورپ سے ہے۔ اس یورپ سے جو ترکیہ کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے پر تلا ہوا تھا۔ اور جب تک اس فضا میں رہ کر یورپین قوموں کے مانند کھڑے نہ کئے جاتے۔ ترکی قوم کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔

آج ترکیہ کی کسی یونیورسٹی سے گذر جائیے۔ تو آپ کو اس کا معیار یورپ کی کسی یونیورسٹی سے کم نظر نہیں آئیگا عورتوں اور مردوں کے لئے جابجا صنعتی ادارے قائم ہیں۔ ملک کی

تجارت پر کیسے ضبط کیا جا سکتا ہے، اس کے متعلق ادارے قائم کر دیئے گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ترکیہ اپنی رائے کا آپ مالک ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک کا کسی پہلو میں بھی محتاج نہیں۔ اتاترک نے تعلیمی ادارے بناتے وقت سب سے پہلے یہ سامنے رکھا تھا کہ کوئی ترک بیکار نہ رہے چنانچہ آج ہر ایک ترک ملک کی فلاح و بہبود کا برابر کا حصہ دار ہے۔

ترکیہ میں صرف لکھنے پڑھنے کو تعلیم نہیں کہا جاتا۔ ملک میں ہزاروں مسائل ایسے ہیں جن سے متعلق ہر دو راور ہر عمر میں تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے چنانچہ ترکی قانون میں یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم کا نصاب اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک متعلم اور متعلمہ اتنی عمر کے نہیں ہو جاتے کہ وہ درسگاہ میں نہ بیٹھ سکیں اب وہاں پر کوئی بڑھا طوطا نہیں رہا۔ جو لکھ پڑھ نہ سکے۔ اور قومی ضروریات کے متعلق آگاہ نہ ہو غیر ملکی زبانوں میں انگریزی فرانسیسی اور جرمن تینوں کا درجہ ایک ہی ہے اور ترکیہ کے ۷۰ فی صدی باشندے ان تینوں زبانوں سے بیگانہ نہیں سمجھتے۔ ترکیہ میں ایک خاص تعلیمی مجلس بنائی گئی ہے جس کا کام یہ ہے کہ مختلف مدرسوں میں جا کر یہ دیکھے کہ خاص استعداد کے بچے کہاں ملتے ہیں طبعی رجحان کی یہ تفتیش محض اس لئے کی جاتی ہے کہ اگر کوئی ہونہار بچہ ان کی نظر پڑ جائے۔ تو اسے فوراً ایک کالج میں داخل کیا جاتا ہے۔ جہاں ہر پیشے کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے تمام اخراجات حکومت کے ذمے ہوتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک بچے کے تیور یہ بتا رہے ہیں کہ وہ بڑا ہو کر سیاستدان بنے گا۔ تو اسے سیاست کی مکمل تعلیم دی جائے گی طبعی رجحان کی کھوج بے حد ضروری ہے اور ترکیہ کے ماہرین تعلیم اس بات سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں رہتے۔

محکمہ تعلیم نے ایک مرکز رکھا ہوا ہے۔ جہاں اس قسم کی طلبہ کے متعلق رپورٹ درج ہوتی ہے اساتذہ ہر ہفتے اس مرکز میں جاتے ہیں اور حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ماہرین تعلیم اساتذہ کے نام ہدایات جاری کرتے ہیں۔ اور تعلیم کے نئے نئے پہلوؤں سے جملہ اساتذہ کو آگاہ کرتے ہیں۔

اپریل میں "قومی ہفتہ" کا تہوار بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے اور درسگاہوں کے تمام طلبہ اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اور سال بھر کی استعداد اور کسب علم و کمال کا مظاہرہ کرتے ہیں اس ہفتے کے بعد حکومت کی طرف سے پبلک کے نام ایک سرکلر جاری کیا جاتا ہے جس میں طرز تعلیم پر نکتہ چینی کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور قومی ہفتے میں جو کچھ عوام نے دیکھا ہے۔ اس میں کیا کیا خامیاں تھیں، اس کے متعلق عوام آزادی سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔

ترکیہ کی عورتوں نے موجودہ تعلیم میں پورا حصہ لیا ہے اور تعلیمی اور صنعتی لحاظ سے کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس میں عورتیں کام نہ کر رہی ہوں بیس ہزار عورتیں بنکوں میں کلرک ہیں۔ دو ہزار سے زیادہ ڈاکٹری کا کام کر رہی ہیں۔ دو ہزار سے اوپر وکالت اور ججوں کے ساتھ "اسیسری" کرتی ہیں۔ یہاں پر عورتوں کی پولیس بھی ہے ہوا باز عورتیں تو روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

تعلیم و تربیت کے اس مطمح نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ترکیہ اپنے معصوم بچوں کی ایک ایسی قوم بنا رہا ہے جس کو دنیا کی کوئی طاقت جنبش نہیں دے سکیگی۔ وہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے ملک کی بہبود کیلئے ہوتا ہے اور جو کچھ بھی ہوگا قوم کو سربلند کرنے کیلئے ہوگا۔ آج جبکہ ترکیہ کے چاروں طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں ترکیہ صحیح سلامت درمیان میں کھڑا ہے یورپ کی بڑی بڑی طاقتیں اس پر ہاتھ اٹھانے سے ہچکچا رہی ہیں بلکہ بڑی طاقتیں اس بات میں فخر محسوس کرتی ہیں کہ ترکیہ کے ساتھ ان کا معاہدہ ہو تعلیم و تربیت بشرطیکہ وہ صحیح ڈگری پر ہو قوم کی معراج ہے ترکیہ نے اس امر کو پا لیا اور چند سال ہی میں مردہ قوم پھر زندہ ہو گئی اور یہ زندگی باقی مردہ قوموں کے لئے ایک نمونہ معلوم ہوتی ہے۔

درد کیف

از
حضرت اثر چکوالی بی اے

سینہ میں اک درد اٹھا ہے
کس نے مجھکو یہ دیکھا ہے
شام و سحر بھرتا ہوں آہیں
کیسے کہوں میرا بھی خدا ہے
کس کی خاطر؛ کس کے صدقے
میں نے غم کو مول لیا ہے
خشک ہوئی جاتی ہیں آنکھیں
جیسے ساون بیت گیا ہے
کس لئے طعنہ زن ہو مجھ پر
عشق بھی جیسے کوئی خطا ہے
جانے میرے دل کو تم سے
کیسی شکایت کیسا گلا ہے
تو نہیں معلوم مجھے بھی
آپ سے کیسے عشق ہوا ہے
کون ہے وہ کیا نام ہے اس کا
جس نے اثر کو موہ لیا ہے

سالِ نو

از
عزیر احمد ارکوی (پٹنہ)

ں آپ سے کس طرح کہوں
نہ
سالِ نو مبارک ہو ——— ؟
ہیشہ
یک معینہ عرصے کے بعد
یا سال آتا ہے
ر اس کے ساتھ
ئی نئی امنگیں نئی نئی تمنائیں!
سال گذشتہ کے دکھوں اور مصیبتوں کی یاد
ھندلی پڑ جاتی ہے
ر ان کی جگہ
سالِ نو کی خیالی مسرتیں لے لیتی ہیں!
لیکن!
نئے سال کی تباہ کاریاں
پچھلے سال سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوتی ہیں
ر ہم ایک اور
نئے سال
کے تصور میں کھو جاتے ہیں!
ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے!
مگر میں آپ سے کس طرح کہوں
کہ
سالِ نو مبارک ہو۔

ممتا

از: قمر فکری

دریا شباب پر تھا ——— موجیں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔
ماں پوجا کر رہی تھی ——— بچہ پانی سے کھیل رہا تھا۔
بچے کا پیر ناگاہ پھسل گیا۔ اور ایک چیخ کے ساتھ پانی میں جا گرا
ماں کا سلسلۂ خیال درہم برہم ہو گیا ——— پریشان ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی
بچہ موجوں کی رَو میں آ چکا تھا ———
ماں عالم بیکسی میں اس کی طرف لپکی ——— ٹھٹھکی ——— اور
نہ جانے کیا سوچ کر دریا میں کود پڑی۔ پانی کے پیہم تھپیڑوں سے چور چور ہو گئی ———
متواتر جد و جہد کے بعد ——— ہانپتی ——— کانپتی بچے کے قریب پہنچی
——— اس کو آغوش میں دبایا ——— چمٹا لیا ——— لیکن تلاطم کی چیرہ
دستیوں سے رہائی پانا محال تھا۔

(۲)

وہ غربت و فلاکت کے انتہائی مدارج پر پہنچ چکی تھی۔ اس کا بچہ سخت بیمار
تھا ——— جاں بلب تھا۔
وہ بے حد فکرمند تھی ——— اس کی آرزو تھی کاش وہ اس کے لئے
دوا دارو کا انتظام کر سکتی!
امید کے افق پر ہلکی سی روشنی دیکھ کر ——— وہ گھر سے نکلی۔ ہر ایک کے سامنے
ہاتھ پھیلایا ——— لیکن اُسے یاس و ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا ———
ایک متمول جوان نے ——— جس کا چہرہ بہیمی جذبات کی شدت سے
متوحش تھا ——— معنی خیز اشارہ کیا۔ وہ مطلب کی تہ تک پہنچ گئی ——— اور
کھلے ہوئے کمرے میں تیزی سے داخل ہو گئی۔
دروازہ ایک منحوس چرچراہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ چند لمحے بعد وہ باہر
آئی ——— وہ پسینے میں شرابور تھی۔ اس کا چہرہ بشاش تھا۔ لیکن ضمیر
مردہ ہو چکا تھا۔

شعر

ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں
حرفِ محبت ترکی نہ تازی (اقبالؔ)

اقتصادیات

ٹرنر مارلیسن

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی نے ہندوستان میں ایسا نام پیدا کیا ہے جو اس وقت تک نہیں مٹ سکتا جب تک کہ یہاں مسلمان قوم آباد ہے۔ اس کمپنی کے ماتحت "مغل لائن" کے جہاز حاجیوں کو اپنی منزل مقصود پر لے جاتے ہیں۔ "مغل لائن" بطریق احسن اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے حاجیوں کی سہولتوں کے لئے بدرجۂ اتم انتظامات کئے گئے ہیں اور حاجیوں کو آج تک جہازی انتظامات کی شکایات پیدا نہیں ہوئیں "مغل لائن" محفوظ سفر کی ایک ضمانت ہے

فضلی برادران لمیٹڈ

ڈائرکٹر حسنین نے "قیدی" پیش کر کے دنیائے فلم میں ایک نئے باب کا افتتاح کر دیا تھا۔ اب انہوں نے "معصوم" پیش کیا ہے۔ مسٹر حسنین اسلامی معاشرت کے افسانے پیش کرنے میں سبقت لے گئے ہیں جس سے مسلمانان ہند ان کے بجا طور پر ممنون ہیں اور شکر کا مقام ہے کہ اب پروڈیوسروں کو اس بات کا بھی احساس ہو چلا ہے کہ خالص تماشا فلموں کی ترقی کے راستے میں سنگ راہ بنی ہوئی ہے مسٹر حسنین کی مساعی جمیلہ ہر لحاظ سے قابل داد ہیں

منروا ٹاکیز

منروا ٹاکیز کو دنیائے فلم میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اس کے ڈائرکٹر اعلیٰ مسٹر سہراب مودی نے "شیشہ" "ٹوٹ" "جیلر" جیسے بلند پایہ تصاویر پیش کی ہیں کہ ہندوستان اس پر فخر کر سکتا ہے "پکار" نے تمام ریکارڈ مات کر دیئے تھے۔ اور اب "سکندر" نے ہندوستانی فلم کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ منروا ٹاکیز بلاشبہ ممتاز ترین فلم کمپنی ہے۔

تاج محل ٹاکیز

مسٹر مفتی جو پہلے منروا فلم کمپنی میں تھے اب مس نسیم کی معیت میں علیحدہ ہو گئے ہیں اور تاج محل ٹاکیز کا افتتاح کر چکے ہیں اور اس کمپنی کے ماتحت فلم "اُجالا" تیار کر رہے ہیں مسٹر مفتی اور مس نسیم کے نام "اُجالا" کی کامیابی کی ضمانت کا حکم رکھتے ہیں۔

بمبئی ٹاکیز

[illegible] کی وفات کے بعد یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ شاید بمبئی ٹاکیز مرحوم پڑ جائے۔ لیکن دیوکا رانی اور رائے بہادر چونی لال کی مساعی قابل داد ہیں کہ بمبئی ٹاکیز کی شہرت میں قطعاً فرق نہیں آیا۔ اس کمپنی کی فلم "جھولا" عنقریب پیش کی جائے گی۔

سنٹرل بنک آف انڈیا

سنٹرل بنک ہندوستان کے قدیم ترین بنکوں میں سے ہے اور اپنی تجارتی سرگرمیوں سے ہندوستان بھر میں مشہور ہو رہا ہے۔ یہ بنک بھی عوام کا محبوب ترین بنک ہے اور سرمائے کے لئے محفوظ ترین جگہ ہے۔

سنٹرل ایکسچینج بنک لمیٹڈ

سنٹرل ایکسچینج بنک نے پنجاب میں سرمایہ کے لحاظ سے بہت نام پیدا کیا ہے عوام اس بنک میں روپیہ جمع کرا کے مکمل مطمئن ہو جاتے ہیں اور بنک کا انتظام اس درجہ مکمل ہے کہ آج تک کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کا محفوظ ترین مقام سنٹرل ایکسچینج بنک ہے۔

فیڈرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ

مسٹر ایچ سی ماتھر کی زیر نگرانی یہ بنک کافی عرصہ سے نہایت تسلی بخش کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں اس بنک کی ایک شاخ ماڈل ٹاؤن میں بھی کھولی گئی ہے خوش معاملگی اور کفایت شعاری کے سبب یہ بنک خاص طور پر مشہور ہو رہا ہے۔ اس کی ڈائرکٹریٹ ذمہ دار، فرض شناس اور تجربہ کار اشخاص پر مشتمل ہے۔

بیلی رام اینڈ برادرز

یہ ادارہ انگریزی ادویات کی ساخت میں ہندوستان بھر میں نظیر نہیں رکھتا۔ اچھی اور اعلیٰ دوا کا جب نام لیا جاتا ہے تو اس وقت بیلی رام برادرز کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ایک مدت دراز کے بعد بھی اس ادارے کے مقابلے میں کوئی اور فرم پیدا نہیں ہو سکی۔ اور یہ اس فرم کی ہر دلعزیزی اور دیانتداری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

نیا ادب

جب انسان نے پہلے پہل گہوارہ فطرت میں آنکھ کھولی اور دماغ نے ماحول کے تاثرات کو قبول کیا۔ اور زبان ان تاثرات کی ترجمان بنی۔ تو تخیل کی قوس صرف ان افراد کائنات کو ہی اپنے خم میں لے سکی جو انسان کے نزدیک ترین رفیق تھے یعنی قریب منظر نے انسانی دماغ پر اپنا حق جمایا۔ خانہ بدوش عربوں نے ریتیں ریگزار، رنگ زاروں کھجوروں کے درختوں، اونٹوں کے قافلوں اور قبائل کی سدائیں کعبہ برادری پرستش کی۔ روسی قزاقوں (COSSACKS) نے گھنے جنگلوں، بھیڑیوں کے گلوں اور برف کی سرد اور بلوریں سفیدی کو شعر کی دنیا میں متعارف کرایا۔ ہمالیہ کے جنگ دست معنیوں، سبز پوش وادیوں، رواں ندیوں اور ہرے بھرے مرغزاروں کے گیت گائے۔ سکاٹ لینڈ کے شاعروں نے برف کے سرسراتے ہوئے طوفانوں، جھیلوں اور سمندر کے حیات پرور ساحل کی تصویر کھینچی۔ ہند کی شاعری میں پپیہا، کوئل، آم کے درخت، برکھا رت اور جمنا کے گھاٹ نے انسانی تخیل کو جنبش دی۔ المختصر جس ماحول میں انسان کا بچپن کھیلا تھا تصور نے اس سے بیگانگی اختیار نہ کی

ایسے تصور کی مثال طوطے کے اس بچے سے دی جا سکتی ہے۔ جسے بے بال و پری کے عالم میں ہی کسی درخت کی کھوہ سے نکال کر پنجرے میں بند کر دیا جائے اور اس کی آنکھ ہی پنجرے میں کھلے۔ وہ بچہ نشو و نما بھی پائیگا پر و بال بھی نکالیگا لیکن ایک دو سال بعد اگر پنجرے سے اسے نکالا جائے تو وہ قید و بند کا عادی آزادی سے گھبرائیگا اور پنجرے کے باہر اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھکر اسی میں پناہ لینے کی کوشش کریگا۔ یہ ایک روزمرہ کے مشاہدے کی بات ہے۔

ہاں تو ابتدائی شاعری بیانیہ نظموں تک ہی محدود رہی۔ لیکن قرن ہا قرن بعد جب ذہنی ارتقا کے منازل طے کرتے کرتے انسان نے دیکھا کہ زندگی اور موت مسولا تخیل عقدے اس کے سلجھنے میں تو اس کے سلجھانے یا ان کی تاویل کرنے کے لئے بھی اس نے گردوپیش کی اشیا سے ہی مدد لی اور حیات و ممات کے فلسفہ اور ہر وہ چیز جو ان سے وابستہ ہے یعنی رنج و غم و شادی کامرانی و ناکامی قضا و قدر کے میدانوں میں مرکب تخیل کو جولانی دی۔

ذیل کی نظم ہمیں قرون وسطیٰ کے دھندلکے میں بھی جھانکتی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے۔ جس میں ایک ماہی گیر کی دنیا کی وسعت اس کی جھونپڑی سے سمندر کے کنارے تک ہے جس کی مسرتوں کی انتہا ایک بہت بڑی مچھلی کا اس کے جال میں پھنس جانا ہے اور ایسے روز تو وہ شاید تمام گاؤں کو دعوت رقص دیتا ہوگا اور اس کی مچھلی کا ذکر مدتوں تک گاؤں والوں کی زبان پر رہتا ہوگا۔ جھونپڑی، جال اور ایک کشتی اس کی مختصر سی جائیداد ہے۔

شاعر اس ماہی گیر کے گاؤں میں جا نکلا ہے جہاں اسے ماہی گیر کی لاش نظر آتی ہے

اس بجھے ہوئے شرارے کی راکھ اور اس سکوت مرگ میں شاعر کو اس کے گذشتہ عمل و حرکت کا نقشہ نظر آتا ہے۔ ماہی گیر کی بے بسی پر اس کا دل بھر آتا ہے خیالات میں سلسلہ و ربط کا آغاز ہو جاتا ہے وہ سوچتا ہے۔

"اس ماہی گیر کی ٹوکری میں مچھلیاں بھی اسی طرح بے حس و حرکت رہ جایا کرتی تھیں آج یہ خود بھی بے حس و حرکت پڑا ہے"

معاً شاعر کے دل میں کسی اس سے بڑے ماہی گیر کا خیال آ جاتا ہے جس نے اس انسانی مچھلی کو بے طرح قبضے میں کیا ہے۔ اس کے دل میں خیالات امڈے چلے آتے ہیں۔

"اور کیا اور کیا ہے اے ملاح؟ تو بھی اک بدنصیب مچھلی ہے"

موت کا پیغام کس قدر واضح ہے اور کس قدر بیم انگیز! انسان کی مجبوری۔ اُف!

نظم کے لئے الفاظ کے انتخاب میں کچھ زیادہ جستجو سے کام نہیں لیا گیا الفاظ میں شوکت اور حسن صوت نہیں ہے اور صرف مضمون کی بلندی اور فلسفے کی چاشنی نے نظم کو تھام رکھا ہے۔ مضمون کی بلندی کے ساتھ ساتھ اگر الفاظ کی مناسبت ترکیبوں کی موزونیت اور ان کے صوتی اثر کا ذرا زیادہ خیال رکھا جاتا۔ تو نظم بہت بہتر ہو جاتی۔ نیز میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اس چار مصرعے کی ہیئت ترکیبی کی بجائے کوئی اور ہیئت جو جستجو سے مل سکتی تھی مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں زیادہ ممد ثابت ہوتی

اب آپ یہ نظم پڑھیں۔

قیصر جمشید واصل

ملاح کی لاش

تیری کشتی لرزتی ہے تنہا۔ مچھلیاں سب پکڑنے دور گئے
اُٹھ کر دریا بلا رہا ہے تجھے تو کنارے پہ یوں پڑا ہے کیا
تیرے ہمراہیوں نے پانی میں دیکھ وہ کتنے جال ڈالے ہیں
جیسے جذبات نوجوانی میں تند، تیکھے، بلند بھالے ہیں
کیا تو یہ سوچتا ہے اے ملاح! تو بھی صرف اک غریب مچھلی ہے
اور کیا، اور کیا ہے اے ملاح، تو بھی اک بدنصیب مچھلی ہے
کوئی مچھلی پکڑنے والا ہے! آج جس نے پکڑ لیا ہے تجھے
کتنا مضبوط جال ڈالا ہے کتنا کس کر جکڑ لیا ہے تجھے

ادبی دنیا ستمبر ۱۹۴۲ء

روشن دین تنویر۔

شش جہات

آمد بہار

(پروفیسر ظفر تاباں صاحب ایم اے)

اٹھا وہ جھوم کے ابر بہار اے ساقی ۔ بدل گئی روش روزگار اے ساقی
فضائیں دوڑ رہی ہیں شراب کی موجیں برس رہی ہے مے خوشگوار اے ساقی
ہر اک چیز پہ مستی ہر اک شے میں جمال جہاں ہے جلوہ گہ حسن یار اے ساقی
بچھی ہوئی ہے ہر اک سمت دشت صحرا میں بساط زندگی نو بہار اے ساقی
گلوں سے روئے زمین پر شفق کی رنگینی شفق سے رنگ فضا لالہ کار اے ساقی
بنا ہوا ہے خرابات نو بہار چمن ہر اک شے ہے یہاں بادہ خوار اے ساقی
کلی کلی ہے صراحی شراب رنگیں کی ہر ایک گل مست رنگ زار اے ساقی
ہر ایک شاخ میں ہے پائے رند کی لغزش ہر ایک برگ کف رعشہ دار اے ساقی
فضائے باغ جواہر فروش ڈگر ہر بیز ہوائے صحن چمن مشکبار اے ساقی
چمن ہے کان گہر اشکہائے شبنم سے ان آنسوؤں پہ ستارے نثار اے ساقی
ترے حضور میں لایا ہوں کچھ تمنائیں ترے کرم کا ہوں امیدوار اے ساقی
جہاں کو تو نے سکون و قرار بخشا ہے
مجھے بھی بخش سکون و قرار اے ساقی (ادیب دہلی)

ہندوستانی کے چند دلچسپ نمونے

• ہمارے پرستاؤ کی کھلی اڑائی گئی پر تو اب سے آگیا ہے کہ ہندوستان اپنے بھاگیہ کا نرنے کرے" (مسٹر جے پرکاش نرائن جنرل سکریٹری کانگریس سوشلسٹ پارٹی)

• "بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کاری کے پرکھ سے تھا کانگریس کارشٹی کے بھوت پورو سدسے" (مہادیو نرائن ٹنڈن پردھان منتری کانگریس سوشلسٹ پارٹی آگرہ)

• "اس سبھا کا پتیتو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو کارن پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا سلیقہ کا رتہ ہوتا اور اس لئے کم سے کم دوش کا رن ہوتا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم" (دستور ہندی) (علیگڑھ میگزین ملکہ صفحہ ۲۲۹ منقول از کتاب "ہندوستانی" مصنف دین محمد)

یہ وہی اردو ہے جو ہندی کے نام سے ملک کی قومی زبان بنائی جا رہی ہے اور مصلحت جس کی تفسیر سب ہندوستانی سے کی جا رہی ہے گویا اردو کی نوک پلک کاٹ کر اسے ایسے حدائق کا حامل بنایا جا رہا ہے جن کا پولہ ہن کر یہ بدقسمت ملک آگے بڑھنے کے بجائے تین چار ہزار سال پھر پیچھے لوٹ جائے۔ (اثر زبان دہلی)

مکالمہ دارا شکوہ و بابا لال

بابا لال بیراگی ذات کا کھتری اور قصور کا باشندہ تھا۔ لیکن اس کا استھان دھیان پور (بٹالہ) میں تھا۔ میاں جیو کا دوست تھا۔ اس لئے دارا شکوہ کو بھی اس سے عقیدت تھی۔ اپنی کتاب شطحیات میں بابا لال کے متعلق لکھتا ہے

"بابا لال ہندیہ کہ از کمال عرفاست و در مسود بدرمان و متانت دیگرے کسے دیدہ نشدہ مدالگفت در ہر قومے عارف وکامل می باشد کہ حق سبحانہ تعالی بہ برکت او آں قوم را نجات می دہد و تو منکر ہیچ قومے مباش" (صفحہ ۳ مطبع مجتبائی)

مجمع البحرین میں بابا لال بیراگی کا نام مسلمان صوفیہ کرام کے ساتھ آیا ہے (صفحہ ۲)

دارا شکوہ ۱۰۶۲ھ میں قندھار کی مہم سے واپس آیا۔ تو لاہور میں بابا لال سے ملا اور دونوں کی گفتگو سات مجلسوں میں ختم ہوئی۔ ان مکالموں کو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے میر منشی چندر بھان برہمن نے قلمبند کر لیا تھا۔ مکالمے دلچسپ ہیں جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ حق و صداقت کسی ایک مذہب کی ملکیت نہیں۔ اب سے بہت پہلے یہ رسالہ مع اردو ترجمہ کے مطبع مجیب ہند دریا گنج دہلی سے چھپ گیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ایک ہندو لالہ چرنجی لال نے کیا ہے۔ (معارف)

ایک چینی نظم کا ترجمہ

صراحی میں شراب بھر کر میں گلستاں کو جاتا ہوں تاکہ پھولوں میں بیٹھ کر شغل مے نوشی کروں

ہماری بزم طرب تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے میں میرا سایہ اور چاند
خوش قسمتی سے چاند پینا نہیں جانتا اور میرے سائے کو پیاس نہیں لگتی ۴۴

(باقی صہ ۶۹ پر)

نقد و نظر

نغمۂ زندگی (حضرت فضلی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ)

تقطیع ۲۲×۱۸/۱۶ ۔ حجم ۱۸۴ صفحات

قیمت دو روپے (جلد چرمی) ڈیڑھ روپیہ (جلد ولایتی کاغذ)

ناشران فضلی برادران لمیٹڈ، کلکتہ

یہ لطیف مجموعۂ اشعار سید فضل احمد کریم فضلی بی۔ لٹ (آکسن) آئی سی ایس بنگال کے فکر طبع کا نتیجہ ہے۔ دیباچہ میں دیوان کو بے دیباچہ چھاپنے کا اظہار یوں کیا ہے۔ "سارے دیوانوں میں دیباچے ہیں

ہم یونہی چھاپ دیں بدعت ہوگی"

دیوان شعری تقسیم کے لحاظ سے غزلیات، قومی نظموں اور رباعیات پر مشتمل ہے غزلیات کی ترتیب میں عام دواوین کا انداز ترتیب ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے یعنی حروف ہجی کے لحاظ سے ردیف وار غزلیں جمع کی گئی ہیں غزلیات کی زبان سادہ اور سلیس ہے کہیں کہیں محاورہ کو نہایت خوبی سے نبھایا گیا ہے فارسی کے دقیق اور بوجھل الفاظ سے زبان پاک ہے اشعار تخیل کی چاشنی سے پر ہیں اور اس زمانے میں جبکہ پرانی شاعری پر توار رہی ہے پرانی ادبی روایات کے حامی غزلیات کے اس دیوان کو اپنے مجموعہ کتب کی زینت بنائیں گے۔

حضرت فضلی دنیوی جاہ و جلال کو حقیر سمجھنے اور انفرادی آزادی کے حامی ہونے کی حیثیت سے (اسلوب بیان کے لحاظ سے نہ سہی) خیال کے لحاظ سے غالب مرحوم کا عکس ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب مرحوم مرغ دانا کی طرح دام کے فریب میں آتے تھے۔ اور حضرت فضلی پھنس جاتے ہیں تو پھر باہر نکلنے کے لئے پر پھڑپھڑاتے ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

مانا کہ بڑی چیز ہے یہ آئی۔سی۔ایس ٭ چاندی کا سہی ہے تو مگر ایک قفس

اس قید کا کیا حال بتاؤں فضلی ٭ دم گھٹنے لگا رہنے دے ظالم بس بس!!

قومی نظموں میں مسلمانوں کی موجودہ پستی کا رونا رویا ہے۔ قوم کے سامنے بھولے ہوئے سبق دہرائے ہیں کہ شاید اس کی رگ حمیت پھڑک اٹھے۔ "عید الفطر" پر کہتے ہیں

کل انہیں دیوانوں کے ہاتھوں میں تھا جام حیات

آج اک پیالہ سوئیوں کا مسلمان کی عید!!

ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن ترقی اردو دہلی ۔

عکسِ جمیل

تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ حجم ۹۶ صفحات

شاعر جذبات حضرت اختر رضوانی کے کلام کا مجموعہ "عکس جمیل" کے نام سے چھپکر شائع ہو گیا ہے۔ اس کی ایک کاپی ہمیں بھی بغرض ریویو موصول ہوئی ہے۔ اختر صاحب کا نام نامی و اسم گرامی ہی ان کے مجموعہ کلام کے بلیغ ہونے کا ضامن ہے۔ شاعرانہ تنقید تو کسی فرصت کے وقت کی جائے گی۔ البتہ اس وقت ہم اتنا ہی لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قارئین کرام اختر صاحب کی حوصلہ افزائی میں فراخ دلی سے کام لے کر ادب اردو پر احسان فرمائیں۔ یہ کتاب مصنف سے مندرجہ ذیل پتہ پر مبلغ عمر میں مل سکتی ہے :-

اختر رضوانی دفتر ہفتہ وار "دیہاتی" میکلوڈ روڈ لاہور

مشیر الاطفال

تقطیع ۲۲×۱۸/۸ لکھائی چھپائی عمدہ۔ صفحات ۱۴۶

ملنے کا پتہ :- دفتر مشیر الاطبا خواجہ دل محمد روڈ لاہور

یہ کتاب لاہور کے مشہور رسالہ مشیر الاطبا کی اشاعت خاص ہے۔ اس میں اطفال کے متعلق مفید معلومات جمع کی گئی ہیں۔ بچوں کی تمام بیماریوں کا طریق علاج نہایت وضاحت سے لکھ گیا ہے۔ اور مجرب نسخہ جات بھی درج کئے گئے ہیں حفظان صحت کا باب نہایت عمدہ ہے اور بچہ کی نفسیاتی اور دماغی نشوونما کے باب میں قابل اطبا نے نہایت گراں قدر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

غرضیکہ یہ رسالہ جہاں طبیبوں کے لئے مفید ہے۔ وہاں عوام بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

---

۴۴ جب میں گاتا ہوں تو چاند خاموشی سے سنتا رہتا ہے اور جب میں ناچتا ہوں تو میرا سایہ بھی ناچنے لگتا ہے۔

ہر بزم طرب کے خاتمے پر ساقی جدا ہو جاتے ہیں مگر میرے ساقی کبھی نہیں بچھڑتے جب میں گھر جاتا ہوں تو چاند بھی میرا ساتھ دیتا ہے اور میرا سایہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ (میرزا طالب شیرازی) (رہنماؤں)

انڈین ٹی

موجودہ جنگ عظیم کی وجہ سے جبکہ شہریوں کے دل و دماغ پر چاروں طرف سے لڑائی کا اثر پڑ رہا ہے۔ وہاں پر چائے اپنا کمال دکھا رہی ہے۔ ان کی عقل درست کرنے اور لڑائی کے اثر دور کرنے میں چائے ان کی بڑی مدد کر رہی ہے۔ لارڈ وولسٹن جو برطانیہ میں خوراک کے وزیر ہیں۔ انہوں نے مجبور ہو کر انگریزی سپاہیوں کو خوراک کے لئے چائے جیسی عمدہ اور لذیذ پینے کی شئے کو لازمی طور پر شامل کر دیا ہے۔ انہوں نے چائے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو برطانیہ میں پینے کی چیزوں میں سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس کے پینے سے جسم کو گرمایش پہنچتی ہے اور پینے والوں کے دل و دماغ پر اثر کرتی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ گرم چائے کی ایک عمدہ پیالی کس قدر امید افزا اور فرحت کن ہوتی ہے۔ انگلستان کی شہری آبادی کو چائے جس قدر دلجوئی اور آرام پہنچا رہی ہے اس کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے ہو جائے گا جو حال ہی میں لندن سے موصول ہوئی ہیں۔

لندن میں ایک مکان کے گرنے سے کوئی چالیس آدمی اندر پھنس گئے۔ وارڈنوں کی ایک قطار چائے کی پیالیاں ان پھنسے ہوئے آدمیوں تک پہنچا رہی تھی جب ان آدمیوں کو نکال لیا گیا۔ تو ان میں لنکاشائر کے ایک انجینئر بھی تھے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میں سہ منزلہ پر منہ کے بل ایک آہنی شہتیر پر پڑا پایا گیا۔ بجلی کے تار میرے جسم میں لپٹے ہوئے تھے نہ صرف یہ بلکہ چاروں طرف تار پائپ اور ٹوٹے پھوٹے چھلے پڑے تھے۔ جو ہی بچانے والے لوگ مجھ تک پہنچے انہوں نے بڑی مشکل سے ایک سوراخ کر کے سب سے پہلے چائے کی پیالی مجھے دی میں نے اپنی عمر میں اس سے زیادہ میٹھی اور لذیذ چائے نہیں چکھی تھی۔ تب میں پیٹ کے بل آہستہ آہستہ کھسک کر باہر نکلا

حال ہی میں کلائیڈ سائیڈ ایک شہر پر جرمنی بم باری کے بعد ایک وارڈن نے دیکھا ایک سوراخ سے کچھ دھواں نکل رہا ہے۔ یہ دیوار دو مکانوں کو آپس سے علیحدہ کرتی تھی ایک مکان تو بالکل تباہ ہو کر صاف ہو چکا تھا۔ دوسرے کی چھت غائب ہو چکی تھی اور دیواریں تو نام تک کو بھی نہ تھیں۔ وارڈن جلدی سے مکان کے چار منزلہ پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑھیا اپنی رضائی کو ایک ٹوٹے ہوئے سوراخ میں جو کبھی کھڑکی تھی جھٹکا رہی ہے۔ وارڈن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس خوفناک بربادی کے بعد بھی ایک جاندار انسان موجود ہے اس نے کہا کہ میم صاحب یہاں تو آگ لگی ہوئی ہے۔ عورت نے جواب دیا مجھے بھی ابھی تو میں نے اسے بجھایا ہے جب وارڈن کمرے کے اندر داخل ہوا تو ... کی کیتلی چولہے پر چڑھ رہی ہے۔ اور چائے دانی آگ کے پاس رکھی ہے عورت اس مکان میں ... ہو کر چائے تیار کر رہی تھی۔

India's Foremost Illustrated Literary & Educational Monthly

MASTER PIECE

اُردُو زبان کی پانچصد سالہ تاریخ میں

"اُردُو مرکز لاہور"

شاندار علمی کارنامہ

پچاس ہزار روپے کے صرف سے کئی سال تک کے اُردو ادب کا نچوڑ

۲۰ مجلدات میں

ملک کے ۷ نامور اہل قلم نے

علامہ تاجور کی زیر سیادت

اور

آنریبل سر عبدالقادر خان بہادر شیخ نور الٰہی آئی ای ایس اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب و پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی

زیر نگرانی

اُردو لٹریچر کے بیکراں انبار کی چھان بین اور لاکھوں صفحات کے مطالعے کے بعد اُردو کے جاندار اور کارآمد حصوں کا تاریخی ترتیب کے پیش نظر

شعبہ وار انتخاب حسب ذیل ۲۰ مجلدات میں مرتب کیا ہے

(۱) [illegible] کا انتخاب [illegible] قدیم بلند پایہ مرثیہ نگاروں کے تاجپیہ مرثیوں کا انتخاب مع تصاویر انکی خصوصیات شاعرانہ کی تفصیل مرثیہ پر تاریخی دیباچہ اُردو مرثیے پر تنقید - ۴ جلدوں میں۔

(۲) [illegible] دلچسپ سبق آموز دلکش افسانوں کا انتخاب مع تصاویر و تبصرہ و دیباچہ تاریخی ۱۱ جلدوں میں۔

(۳) [illegible] منتخب [illegible] نظمیں - مع تصاویر و خصوصیت نگارش و دیباچہ ۵ جلدوں میں۔

(۴) مجلدات [illegible] محکمہ تعلیم [illegible] منظور شدہ ہے پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے حسب سرکلر لیٹر نمبر [illegible] حکم دیا ہے۔

[illegible] مکمل نہیں ہو سکتی جا سکتی ہر کتاب کی نہایت بصورت مجلد ہر کتاب [illegible] کی مقرر کردہ قیمت کل ایک پیسہ [illegible] کے [illegible] کے عام اُردو خواں [illegible] کے مطالعے کیلئے ارزاں [illegible]

دفتر اُردو مرکز بک ڈپو - لاہور

اردو ادب کا علمی تعلیمی فنی و ادبی

ماہنامہ

شاہکار

The SHAHKAR

1942

(جنوری)

مدیر اعلیٰ شمس العلما، علامہ تاجور

مدیر مسئول عبدالحلیم انصاری

سالانہ چندہ چھ روپے ششماہی تین روپے آٹھ آنے

قیمت فی پرچہ

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

شاہکار لاہور

مدیر معاون قیصر جمشید واصل بی۔اے

جلد ۱۴ — نمبر ۱

فہرست

مستقل عنوانات

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور پرانی تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار نیو محمود متصل [illegible] سے شائع کیا

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی کی روایتی بدنظمی:-

گذشتہ تیس سال سے پنجاب یونیورسٹی کی بدنظمی کی شکایات ہوا ستان ہائے غم کی صورت صوبے کے تعلیمی طبقات اور صحافتی حلقوں میں اشاعت پا رہی ہیں۔ مدتہائے مدید سے یونیورسٹی کی انتظامی مشینری پر جو ایک خاص جماعت مسلط چلی آتی ہے اس نے نہایت شاطری سے اوچھے　　اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ ان نام نہاد اصلاحی نمائندوں کا کام ابتداء سے یہ رہا ہے کہ اپنے مفاد کے پیش نگاہ ملی مفاد کو قربان کرتے ہوئے اسلامیان پنجاب کو "سب اچھا" سنا سنا کر مسلط جماعت کو من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے سہولتیں بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور جب کبھی صحافتی یا تعلیمی اداروں سے اس جماعت کی بے راہ روی کے خلاف کوئی آواز بلند ہوئی۔ اسے یہ کہہ کر صدا بصحرا بنا دیا گیا کہ:-

"یہ غوغائی حضرات علم کے اس چشمۂ صافی کو بھی فرقہ داری کے زہر سے مسموم بنانا چاہتے ہیں۔ بدبخت اتنا نہیں سوچتے کہ علم کوئی مذہب نہیں رکھتا۔"

ان عقلمندوں سے کوئی کہہ دے کہ غرض کے پرستارو علم تمہاری طرح بے دین و بے آئین نہیں علم کا مذہب ہے دیانت و صداقت اس کا آئین ہے عدل و انصاف اور بے غرضی۔ تمہارے لئے علم کی دسعتوں میں قدم رکھنے کی گنجائش نہیں۔

علم اپنے حدود ترقی و حفاظت میں پرستاران غرض کے تسلط و اقتدار کو برداشت نہیں کرے گا تمہارے لئے بہتر راستہ یہ ہے کہ اپنی درازیائی سے کنارہ کش ہو کر علم کے حظیرہ قدس سے خود ہی نکل آؤ اس وقت سے پہلے نکل آؤ جبکہ علم کے سچے اور بے غرض خدمتگذار تمہاری گدیوں سے ہاتھ پکڑ کے اٹھا دیں گے۔

ہاں تو یونیورسٹی کی بدنظمی کے خلاف جب بھی کسی گوشے سے آواز اٹھتی ہے یونیورسٹی کے غرض پسند ممبر اسے مختلف تہمتیں تراش کر دبانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہر تعدی کی ایک انتہا ہوتی ہے صحیح کے لئے ناکام نہیں بنایا جاسکتا چنانچہ علمی و تعلیمی طبقات اور صوبے کے چند با اصول اخبارات کے متحدہ احتجاج کا یہ اثر ہوا کہ حکومت نے سرکاری طور پر ایک تحقیقاتی مجلس مقرر کر کے مشہور ماہر تعلیم سر جارج اینڈرسن کو اس کی صدارت کے لئے انگلستان سے مدعو کیا۔ اس تحقیقاتی بورڈ کی راہ میں اگرچہ فرقہ داری اور فرقہ دار (جو در حقیقت ہندو ہیں نہ مسلمان بلکہ غرض پرست ہیں) سنگ حائل بنے رہے۔ اور اس لئے اپنی محدود و　　کے دائرے میں بورڈ جو کچھ کرسکتا تھا نہ کرسکا مگر ہجوم موانع کے باوجود جو کچھ بھی کر گیا اگر یونیورسٹی کے ارباب اختیار بورڈ کی رپورٹ کو یونیورسٹی کی نئی زندگی کا مرکز بنا کر اس کی روایتی بدنظمیوں کو دور کرنا چاہتے۔ تو اس سلسلہ میں صوبے کے تعلیمی مفاد کی بہت کچھ حفاظت ہو سکتی۔ افسوس کہ وہ ایسا نہ کرسکے۔ اور صد افسوس کہ یونیورسٹی اپنی بدعنوانیوں کا بدستور گہوارہ بن رہی ہے۔

انکوائری کمیشن کے بعد یونیورسٹی کی سٹھ سالہ طویل زندگی میں ایک انہونی بات ضرور ہوئی۔ وہ یہ کہ وائس چانسلر شپ پر سے یورپین اجارہ داری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اگرچہ ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں تو مدت مدید سے وائس چانسلر ہندوستانیوں ہی کو بنایا جا رہا ہے۔ مگر پنجاب کی تعلیمات میں ہندوستانی وائس چانسلر کا تقرر سب کے بعد ہی سہی مگر ایک حادثہ ضرور تھا۔ اس وقت قوم پرور حلقوں کی جانب سے ہندوستانی وائس چانسلر کی سرکاری حیثیت پر نکتہ چینی ہوئی لیکن اسے پبلک نے اس لئے　　نہ کرنا کہ سرکاری وائس چانسلر اب بھی اپنے حدود و اختیار میں اس قدر آزاد ہو گا کہ اس نے یونیورسٹی کی فضا کو غرض پرستوں کی پیدا کردہ بدعنوانیوں سے پاک کرنے کی مسلسل کوشش کی تو کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے دیسی وائس چانسلر نے کچھ نہ کچھ اصلاحات ضرور نافذ کیں اور اس کے لئے وہ تمام صوبے کے اعتراف کے مستحق ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان کی ذات سے اس پہلو میں جو اچھی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں۔ پوری نہ ہو سکیں۔ یہاں تک کہ بعض یورپین وائس چانسلر خصوصاً اخیر زمانے کے دو وائس چانسلر حریفانہ کشمکشوں کے علی الرغم جس آہنی عزم کے ساتھ کام کرتے رہے۔ نئے وائس چانسلر کی کارکردگی کا ذکر ان کے کارناموں کے مقابلے میں غیر ضروری بن جاتا ہے۔

اگر کوئی وائس چانسلر مروت۔ دوست نوازی اور فریقانہ کشاکش سے

سے بےتعلق و بےخوف ہوکر کام کرے۔ تو اس کا عہد یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے یادگار بن سکتا ہے۔ موجودہ وائس چانسلر کے متعلق بہت سے طبقات میں یہ شبہ کیا جا رہا ہے۔ کہ وہ اپنے بعض یونیورسٹی دوستوں کے زیر اثر ہیں۔ اور ان کی پشت پناہی کو سہارا بنا کر ان کے یہ خود مطلب دوست یونیورسٹی کے میزانیہ پر بار گراں بنے ہوئے ہیں۔ ان کی میعاد ملازمت کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔ مگر اس اقتصادی بدحالی اور بےروزگاری کے زمانے میں بھی یونیورسٹی میں بعض ملازموں کو توسیع پر توسیع ملتی جا رہی ہے۔ اس توسیع بازی کا مالی نقصان یونیورسٹی کے مالیات کے لئے ناقابل برداشت ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ملازم جو اس وقت اٹھارہ سو روپیہ ماہانہ یونیورسٹی سے تنخواہ پا رہا ہے۔ اسی تنخواہ پر اُسے ایک نہ دو اکٹھے پانچ سال کی توسیع دے دی جائے۔ تو یہ بے تحاشا اور بیجا فیاضی یونیورسٹی فنڈ کے لئے حسب ذیل صورت میں اثر انداز ہو سکتی ہے۔

اگر اس ملازم کو ختم میعاد ملازمت پر سبکدوش کر کے کسی نئے آدمی کو اس کا جانشین بنا دیا جائے تو اس وقت تعلیمی بازار میں لائق سے لائق ولایت کا ڈگریدار دو سو روپے ماہانہ پر مل سکتا ہے۔ الہ آباد۔ آگرہ۔ بنارس اور علیگڈھ کی یونیورسٹیوں کی جدید تقرریوں کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے

ہاں تو پانچسال میں (پہلا سال اصلی تنخواہ پر) دو سو روپے پانے والے کو ۲۵ روپے سالانہ ترقی کے اصول پر زیادہ سے زیادہ سو روپے ترقی ملے گی اور پانچ سال گذرنے پر اس کی تنخواہ تین سو روپے ہو جائے گی۔ اس صورت میں اسے پانچسال میں نو ہزار چھ سو روپے بطور تنخواہ اور تین ہزار بطور تدریجی ترقی کے گویا کل بارہ ہزار چھ سو روپے یونیورسٹی ادا کرے گی۔ لیکن اگر اٹھارہ سو روپے پانے والے زاید المیعاد ملازم کو پانچسال کے لئے یونیورسٹی کے سر مڑھ دیا جائے۔ تو اس صورت میں اس کی صرف پنجسالہ تنخواہ ہی کی مجموعی رقم ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے ہو جائے گی۔ اس میں سے نئے تقرر پر کام کرنے والے ملازم کی پانچسال کی تنخواہ اور ترقیوں کی بارہ ہزار چھ سو روپے کی رقم لو منہا کر لیا جائے تو پچانوے ہزار چار سو روپے کا خالص خسارہ یونیورسٹی فنڈ کو اٹھانا پڑیگا۔ آجکل ولایت کی اعلیٰ ڈگری پائے ہوئے لائق سے لائق حضرات علم کی عام کساد بازاری اور بےروزگاری کے ہاتھوں پریشان پھر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی ادارے یا محکمے کے زائد المیعاد ملازموں کو توسیع ملنا نہ ادارے ہی کے ساتھ کوئی انصاف ہے۔ اور نہ مستحق بے روزگاروں ہی کے علمی استحقاق سے کوئی ہمدردی حکومت کے تمام محکمے مدت سے توسیع میعاد کے اصول کو خیرباد کہہ چکے ہیں مگر ہماری یونیورسٹی کی نئی نواز پالیسی بدستور جاری ہے۔ یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار رائے بہادر الیشر داس ایم اے نے اپنے عہد ملازمت میں بڑی قابلیت سے کام کیا چنانچہ ان کے ریٹائر ہونے پر خود یونیورسٹی کی جانب سے ان کی بےمثال قابلیت اور عمدہ کارکردگی کا اعتراف کیا گیا۔ لیکن میعاد ملازمت کے ختم ہونے پر انہیں سبکدوش کر دیا گیا۔ بالکل ٹھیک' ایسا ہی ہونا چاہئے تھا لیکن اس یونیورسٹی میں بعض حضرات ایسے بھی اب تک موجود ہیں جن کی میعاد ملازمت ختم ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں مگر انہیں سبکدوش کرنے کی بجائے توسیع پر توسیع دی جا رہی ہے۔ آخر یہ کیوں؟ جو لوگ اپنے کسی دوست کو نوازنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنی جیب سے اس نوازش بیہم کو وابستہ کرنا چاہئے پبلک فنڈ پر یہ فیاضی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

رہا یہ غلط اور گمراہ کن سوال کہ ایسے قابل لوگ یونیورسٹی کو نہیں ملیں گے۔ اس قسم کے سوالات کے پس منظر اب پیش منظر کی عریانی حاصل کر چکے ہیں جاننے والے اس فریب طلسم سے آگاہ ہیں۔ کہ جب کسی پر نوازش کرم کی بارش کرنی مقصود ہوتی ہے۔ اس کی نام نہاد قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ اس تبلیغ ناروا سے اب کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ پبلک کو غلط پروپیگنڈے سے گمراہ کر کے اپنے کسی دوست کی ممی یونیورسٹی کے میوریم کے لئے ہمیشہ کے لئے محفوظ بنا لیں گے انہیں اپنے اس زعم فاسد کی اصلاح جلد کر لینی چاہئے

"تم کچھ دنوں کے لئے کچھ لوگوں کو تو فریب دے سکتے ہو مگر ہمیشہ کے لئے تمام لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے"

(باقی آئندہ) ادارہ

اردو سبھا لاہور۔

اس نام کی ایک ادبی انجمن دو سال سے لاہور میں قائم ہے۔ میں مدت سے اس کا نام سُن رہا تھا۔ گذشتہ اتوار کو اس کے ہفت روزہ اجلاس کی صدارت کرنے کا مجھے موقعہ ملا۔ میں اس کے دستور عمل کو دیکھکر بےحد مسرور ہوا۔ اردو سبھا ادب و شاعری کی ایک تربیت گاہ ہے جس میں نوجوان ادیب و شعراء پہلے اپنے اپنے مضامین نظم و نثر پڑھتے ہیں۔ اور بعد کو ہر مضمون پر اہل مجلس آزادانہ تنقید کرتے ہیں۔ اور صاحب مضمون کو اس کے پیش کردہ مضمون یا نظم کے محاسن و معائب سے

آگاہ کیا جاتا ہے۔ نہایت احترام کے لہجے میں اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ اور صاحب مضمون نہایت شکرگزاری سے معقول نکتہ چینی کو قبول کرتا ہے کہ یہ ہے کہ میرے لئے صدارت کے وہ دو گھنٹے ایک سال کی مجموعی مسرتوں سے زیادہ دل خوش کن ثابت ہوئے۔

آج کل کے نوجوان اس مقولے کو کہ۔

"شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جا سکتا۔"

جزو ایمان بنا کر کسی ماہر فن سے اصلاح و مشورے کو فیشن کے خلاف تصور کرنے لگے ہیں۔ اس گمرہی کا نتیجہ ہر صاحب بصیرت کی نگاہوں کے سامنے ہے کہ جس کے ہاتھ میں قلم دیکھئے۔ وہی

"خود غلط، املا غلط، انشا غلط"

کا مصداق نظر آتا ہے۔ جدید نسل کے بہت سے افسانہ نگار اور شعر جنہیں چند ادبی ماہناموں کے بے خبر یا بے پروا ایڈیٹروں نے اچھال اچھال کر رسوائے ہر کوچہ و بازار بنا دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی خامیاں اب پختہ ہو چکی ہیں یعنی وہ چاہیں تو اپنی پختہ کارانہ نومشقی کے نقائص کو دور نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ ادبی مرگ انبوہ کے اس جشن میں جدید ادبا کی ایک تعداد کثیر شامل نظر آتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی نگارشوں کے عیب کا احساس نہیں رہا ہے۔ وہ اس واقعیت کو محسوس ہی نہیں کرتے۔ کہ ان کی غلط نگاریاں ادب و شعر کو رطب و یابس کا انبار بنا رہی ہیں۔ اس جامد اور غرور زدہ ماحول میں اردو سبھا اور ایسی ہی دوسری انجمنوں کا قیام نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جن میں شامل ہو کر باہمی بحث و تمحیص سے خام کار اپنی خامیوں سے آگاہ ہو کر قلم سنبھال کر لکھنے کے خوگر بنائے جاتے ہیں۔

اردو سبھا کے اجلاسوں میں عوام کے لئے اذن عام نہیں۔ سبھا کا کوئی ممبر کسی دوست کو ساتھ لے آئے۔ تو وہ نووارد مہمان ایک خاموش تماشائی کے حدود سے گذر کر دخل در معقولات کی جرات نہیں کرتا۔ ایسے مفید اور بصیرت افزا جلسے پہ ہزار ہنگامہ کا مشاعرے قربان کئے جا سکتے ہیں۔

میری رائے تو یہ ہے کہ اردو سبھا کے رنگ کی تنقیدی مجالس ہر ضلع اور ... جہاں جہاں ادبی جگہ کوئی ادبی مجلس قائم ہے۔ اسے اسی سانچے ... ضرورت ہے مجالس عوام و ساحل ادب و شعر کو سازگار ... مشاعروں میں ہمہ گیر بدذوقی کا زیادہ تر باعث جلسوں ... اردو سبھا کی ترقی پذیرنیگی کا سہرا ... کے سر ہے۔ انہوں نے اقرار کے

اجلاس میں پچھلے جلسہ کی جو رپورٹ پڑھی اس سے ان کی ادبی بالغ نظری کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اساتذہ کا شکوہ۔

بعض اساتذہ ہم سے گلہ گذار ہیں کہ مدت سے مدارس میں اساتذہ کی حق تلفی کے سلسلے میں کوئی آواز بلند نہیں کی گئی ہمارا جواب یہ ہے کہ ہاں مگر یہ خاموشی کچھ اس لئے نہیں کہ ہم اساتذہ کی مشکلات زندگی سے بے پروا ہو گئے ہیں نہیں کبھی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اساتذہ کی اپنے حقوق کی جانب سے بے حسی ہمیں ان کی مشکلات سے بے خبر رکھے ہوئے ہے یعنی جن پر بیت رہی ہے۔ وہ اپنی بپتا سنانے سے ڈر رہے ہیں یا بقول غالب۔

"مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"

گویا ہجوم مصائب نے مصائب سے مانوس کر دیا ہے پھر اس صورت میں کہ اساتذہ کی مشکلات کا علم ہی نہیں ہم ان کے متعلق کیا لکھیں اور افسران محکمہ کو کس طرح توجہ دلائیں ضرورت ہے کہ دو چار باخبر اساتذہ محکمہ تعلیم سے متعلق شکایات کی تفصیل سے دفتر شاہکار کو وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہیں۔ اور ہم ان مشکلات کی جانب محکمے کے ارباب نظم و نسق کو توجہ دلانے کے لئے ایک سلسلہ مضامین شروع کریں ہمیں یقین ہے کہ افسران محکمہ بالخصوص محترم رائے بہادر مسٹر منموہن ڈپٹی ڈائرکٹر استادوں کی جائز اور صحیح شکایات کے ازالے میں ایک لمحے کا توقف بھی روا نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ صاحب موصوف خود بھی مدت مدید تک ایک استاد کی حیثیت میں خدمت علم و تعلیم انجام دے چکے ہیں اور ایک استاد کی ضروریات زندگی اور حقوق خدمت سے اچھی طرح باخبر اور اس جماعت کے درد آشنا ہیں

شاہکار سے متعلق۔

جنوری کا شاہکار ہدیۂ نظر کیا جا رہا ہے شکر ہے کہ ہم ناقابل عبور مشکلات میں بھی وقت پر یہ نمبر شائع کر رہے ہیں کاغذ کی گرانی اور نایابی کا رونا رونے سے کیا فائدہ؟ جب کہ شاہکار کے خریداران آنسوؤں کو کوئی وقعت اور اس داستان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے یعنی وہ یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ شاہکار اور شاہکار کے خریداروں کی حیثیت میں خود وہ بھی موجودہ جنگ عالمگیر کے سبب غیر معمولی حالات سے دوچار ہیں حالانکہ اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں یہی حضرات اشیا کی حد سے بڑھی ہوئی گرانی سے پریشان اور آٹھ پہر اس کے گلہ گزار بھی رہتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ جب ایک پرچے کی خریداری کا سوال آتا ہے تو یہی لوگ یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں کہ جنگ کا سب سے تباہ کن اثر کاغذ کی درآمد پر پڑ رہا ہے ؎

کون سنتا ہے سنائیں کس کو حال سوزِ دل، پہ ساری محفل میں کوئی دمساز ملتا نہیں

... نظم و نثر ملاحظہ فرمائیں گے خواجہ آثر صہبائی ایم اے بیرسٹر منیر کمال بی اے جالندھری۔ چودھری محمد اکبر خان صاحب بی اے چودھری

یہ زمیں

[ڈاکٹر خالد کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ اب آپ کا مجموعہ کلام سرور نو زیر طبع ہے۔ مرقومۂ ذیل نظم اسی مجموعہ سے لی گئی ہے آئندہ مسٹر خالد کا تازہ کلام اکثر شاہکار کے صفحات کی زینت ہوا کریگا۔] ——— مدیر معاون]

یہ زمیں!
عشق کے شعلوں، پتنگوں، صرصروں
پھولوں کی رنگیں کشمکش
اس خاک پر جبتی گئی،
رُوحِ انسانی کو حسنِ جاودانی مل گیا
حیرتوں کا راز ہے یہ سجدہ گاہِ قدسیاں
محسودِ چشمِ آسماں!
اس مقدس آستاں پر زندگی کا گھر بنے۔

ڈاکٹر تصدق حسین خالد بار ایٹ لاء

پھر شب ہوئی

پھر شب ہوئی!
تاریکیاں، اُف! بیکسی
بیچارگی...... !
پھر مہرباں ہم پر ہوئی
بیچارگی۔
کوئی خدا سے تو کہو
اَے خالقِ شمس و قمر
وہ خواب ہی دے دے مجھے
دیکھا تھا جس میں ایک شب
اپنا دیا، جلتا ہوا

قیصر جمشید اصل

وہم کے سحر نے آدم کی قوت ارادہ کو سلب کر لیا تھا .... اسے کرجتے طوفانوں ہولناک لہروں اور باد و باراں کی بے پناہ یورشوں کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور کر دیا .... اور .... اس کی نگاہوں میں

عناصر کی شکست

کے معنی تھے دیوتاؤں کی شکست .... جو انی للکارتی ور . . .

اس کے سر پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا میں اُسے بھانپ چکا تھا میں جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اور شہر کی گلیوں نے اس سے دیکھنے کی قوت چھین لی ہے بہادر کے ساتھ اگر بھروسہ بھی ہو تو جنیاب یہ دانائی کی طرف پہلا قدم ہے لیکن یہ شہروں کے رہنے والے کتابوں سے جو کچھ سیکھ لیتے ہیں محض اسی پر بھروسہ رکھنے کے باعث خطرات [illegible] میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا پڑھتے پڑھتے ان کی سمجھ پر اندھیرا چھا گیا ہے۔

کاتک شروع ہوتے ہی میں نے اسے خبردار کرنا شروع کر دیا ان دنوں تیز ہوا سنسناتی ہوئی جھونپڑوں ٹیلوں اور چٹانوں میں [illegible] ہے۔ اور اگرچہ دیودار صنوبر اور شمشاد کے لمبے تڑنگے پیڑ نچنے ہوئے بگولوں کے تھپیڑے کھاتے رہتے ہیں۔ پھر بھی جھکڑوں کی [illegible] ابھی اونچے آسمانوں میں ہی ہوتی ہے اور نیچی دنیا میں پُر سکون ہوتی ہے ہم میں سے ہر ایک شخص جانتا ہے کہ جب تک تاریکی پوری طرح چھا نہ جائے۔ ہم خطرے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

میں اسے گھر سے ذرا فاصلے پر ٹیلوں کے دامن میں اپنے ساتھ لے گیا یہاں ان پہاڑوں کا لمبا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو بہاریں پریوں کا ملک اور جاڑے کی تاریکی میں بھوتوں کا مسکن بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف سمندر کالے دھاگے کی طرح پہاڑ کے قدموں میں لپٹا ہوا ہے وہی سمندر جس کی بپھری ہوئی گرج چند دنوں بعد ہمیں اپنے بستروں میں چونکا دیگی۔ اور جو آج اتنا چپ چاپ تھا کہ علاقے سے ناواقف انسان کبھی یہ جان ہی نہ سکے کہ یہاں سمندر ہے۔

میں نے آسمان میں کونجوں کے غول کی طرف اشارا کیا جو گرتی [illegible] طرح چکر لگا رہی تھیں جیسے تیز ہوا کے جھونکے میں [illegible] پتے بے بسی سے پھڑپھڑاتے ہوئے گھوما کرتے ہیں یہاں طوفان پہنچ چکا تھا میں نے کہا "موسم بدل دیکھا ہے اب تاریک زمانہ آنے ہی والا ہے"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "تاریک زمانہ" در اصل میں نے یہ الفاظ جان بوجھ کر کہے تھے۔ کیونکہ کتابوں کی دنیا میں رہنے والے ان الفاظ کا مطلب جلد سمجھ لیتے ہیں۔ وہ بڑی بے پروائی سے [illegible] کونجوں کی قلابازیوں کا تماشا دیکھ رہا تھا مجھ سے پوچھنے لگا "یہ کہیں رہتے ہیں" [illegible] میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "یہ تاریکی کے جانور ہیں۔ اور تاریکی میں خوش ہوتے ہیں۔"

[illegible] اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ کہنے لگا "[illegible]"

[illegible] کے کھیتوں میں ہل چلائے جا چکے تھے اور زمین پر دور تک ایسا نقش سا بن رہا تھا جس کے نقش سیاہ قالین کی طرح محسوس تو ہوتے تھے مگر پہچانے نہیں جاتے تھے۔ قدرت کی اس تحریر کو میں جاہل ہوتے ہوئے بھی خوب پڑھ سکتا تھا۔ اور وہ کتابوں کا کیڑا ہونے کے باوجود کچھ نہیں جانتا تھا۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد میں نے کہا "وہم نہیں" [illegible] اور چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے بچالوں۔ شہر کی دنیا میں وہ یوں قید رہا تھا جس طرح پنجرے میں پرندہ۔ اپنے کمرے کی دیواروں کو تکتے تکتے اس کی بینائی جاتی رہی تھی۔

وہ بڑے اطمینان سے مسکرایا اور کہنے لگا "وحشیوں کی سی خوبو ابھی تم سے نہیں گئی۔ شاید تم چھپ چھپ کر سورج کو بھی پوجا کرتے ہو اور بادل کی گرج کو بھی کچھ بھینٹ چڑھایا کرتے ہو"

جذبات کے ہجوم نے مجھے ٹھنڈا سانس بھرنے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ اگر مجھے اس کو بچانا ہے۔ تو الفاظ کے بھدے ذریعہ ہی سے اس کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہو گی۔ ان شہر والوں کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔ وہ صحیح علم سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ اور صرف انہیں باتوں کو تھوڑا بہت پہچان سکتے ہیں جو کہی جا سکیں یا لکھی جا سکیں اور میں ڈرتا تھا کہ اس ضدی اور اندھے نوجوان کی کمزوری سے مقابلہ کرنے کی طاقت مجھ میں ہے بھی یا نہیں۔ میں بولا۔" میں تمہیں خبردار کرنے کے لئے یہاں لایا ہوں"

"خبردار کرنے؟ کس چیز سے خبردار کرنے؟"

"ان طاقتوں کے خلاف خبردار کرنے جو اندھیرے میں راج کرتی ہیں۔ دیکھو۔ ابھی سے ان کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک مہینے تک تمہارے لئے شام کے بعد سمندر کے کنارے ان چٹانوں تک جانا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ تم میری بات کا یقین نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو لیکن میری نیک نیتی کو جانتے ہوئے میری بات مان تو لو"

وہ پھر مسکرایا۔ گویا مجھ پر احسان کر رہا ہے بولا۔" یہ طاقتیں ہیں کیا آخر ان کتابوں میں گم رہنے والوں کی حالت بھی قابل رحم ہے۔ کوئی بات ہو جھٹ کہیں گے۔ نام بتاؤ۔ تعریف کرو یعنی کوئی بات کیوں نہ ہو۔ یہ اس پر شناخت کا ظاہری نشان جب تک لگا نہ لیں' ان کی تسلی نہیں ہوتی خواہ وہ ایک فقرہ ہو یا ایک پوری جلد۔ اگر وہ ایسا کر لیں تو یوں مطمئن ہو جاتے ہیں گویا علم کا خزانہ ہاتھ آ گیا یا ایک جاہل جس اعتقاد اور عزت سے تعویذ کو دیکھتا ہے۔ اسی عزت اور اعتقاد سے یہ عالم لوگ الفاظ کو دیکھتے ہیں۔

میں نے کہا کون جانتا ہے؟ ہمیں ان قوتوں کے وجود کا علم ہے اب جس نام سے تم چاہو پکار لو۔ ان کی اصلیت تو بدل ہی نہیں جائیگی"

"اچھا۔ تو وہ کرتی کیا ہیں۔ کیا تم نے بھی انہیں دیکھا ہے" اس کے لہجے میں رواداری کا رنگ غالب تھا۔ گویا مجھے بہلا پھسلا کر اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ میں ان طاقتوں کو بارہا دیکھ چکا ہوں۔ اور اس وقت بھی دیکھ رہا تھا۔ لیکن ان کی وضاحت کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جو شخص اندھا پیدا ہوا ہو۔ اسے آسمان کی رنگین کمان کے رنگ کیونکر سمجھا سکیں گے۔ اور چٹانوں پر سمندر کی لہریں جو راگ گاتی ہیں۔ ایک بہرہ شخص اسے کیونکر سن سکتا ہے؟ پھر وہ چیز جسے میں نے لفظوں اور ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ روح کی بینائی سے دیکھا تھا۔ اس نوجوان کو کیونکر سمجھا سکتا تھا میں نے کہا۔" تم نے کبھی ہوا کو دیکھا ہے"

وہ ہنسا۔ جیسے کسی بچے کی بات پر ہنسا ہو۔ کہنے لگا۔" اچھا تو آخر مجھے کچھ تو سمجھا دو۔ کوئی دلیل۔ کوئی ثبوت۔ کوئی نشان"

اسے مطمئن کرنے والا جواب تلاش کرنے کے لئے میں نے اپنا دماغ ٹٹولنا شروع کیا۔ دور سمندر میں روشنی کا مینار دیکھتے ہوئے کہا۔

" اگلے لوگ کہتے تھے کہ روشنی کا مینار جنگلی چڑیوں کو اسی طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور یہ ننھے جانور اسی طرح دیوانہ وار سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان دے دیتے ہیں جس طرح شمع پروانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور وہ اس کے چاروں طرف گر گر کر فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب معلوم ہو گیا ہے کہ یہ پرندے دراصل اندھیرے سے جان بچانے کے لئے روشنی کی جانب لپکتے تھے۔ اور پناہ کی جگہ تلاش کرنے میں سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاتے تھے اب جو ان کے بیٹھنے کے لئے مینار کے چاروں طرف جگہ بنا دی گئی ہے۔ تو کوئی پرندہ ہلاک نہیں ہوتا۔"

وہ مسکرایا اور بولا۔" بالکل ٹھیک۔ اس کے بعد؟"

" جب اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو یہ پرندے اندھیرے کی طاقتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور جان بچانے کا آخری سہارا ان کے لئے یہی ہوتا ہے کہ وہ حفاظت کرنے والی روشنی کی پناہ میں آ جائیں ......"

" لیکن سمندر کے بڑے بڑے پرندے۔ اور خشکی کے سارے جانور بطخ، شتر مرغ وغیرہ ان سب کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں"

میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جس پر صاف لکھا تھا۔" یہ بھی کوئی دلیل ہے" میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔

(۲)

اسی رات دس بجے کے قریب میں اسے مکان کے دروازے سے باہر لے گیا۔ تاکہ فضا کے بالائی حصے میں طوفان کا شور و غل سن لے۔ نئے چاند نے ابھی اتنی روشنی حاصل نہیں کی تھی۔ کہ وہ تیرتے ہوئے سیاہ بادلوں میں سے چھن کر اس پار آ سکے۔ زمین پر ہر طرف اندھیرا تھا۔ اور سکوت میں نے کہا۔" سنتے ہو" وہ کانپا اور بولا۔" راتیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں"

دن گھٹتے اور راتیں بڑھتی گئیں۔ بادل زیادہ دلیری سے فضا میں دندنانے لگے۔ دنیا روز بروز اندھیرے میں لپٹتی جا رہی تھی میں کچھ کچھ امید کرنے لگا تھا۔ کہ میری تنبیہ کارگر ہو گئی۔ کیونکہ اگرچہ منہ سے تو اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن سورج ڈوبنے سے پہلے ہی گھر لوٹ آتا تھا میں اس خیال سے اطمینان محسوس کرنے لگا۔ کہ فطرت

کی زبان سمجھ لینے کی کچھ نہ کچھ صلاحیت ابھی اس میں باقی ہے، چنانچہ ایک دن پچھلے پہر میں اسے سمندر کے کنارے چٹانوں کے عین بیچوں بیچ اپنے ساتھ لے گیا۔ میں جانچنا چاہتا تھا۔ کہ کیا سچ مچ کچھ بصیرت ابھی اس میں باقی ہے؟

اس روز ہوا کہیں چھپ رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ سمندر کے افق پر فضا کی گہرائیوں میں کہیں نہ کہیں وہ موجود ہے۔ جو جھونکے اس کمین گاہ سے بے اختیار نکل بھاگتے تھے۔ ان کے ڈر سے سفید بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آسمانوں میں دیوانہ وار دوڑتے پھر رہے تھے۔ جوار بھاٹے کی کشمکش میں سمندر خوف سے چیختا چلاتا خشکی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور اور لہریں کراہتی ہوئی ساحل کے پتھروں پر سر ٹپک رہی تھیں۔ تمام کائنات طوفان کی طاقت سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

اس وقت آنے والے خطرے کے متعلق میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ ہم عین سمندر کے کنارے پر پہنچ گئے۔ لہروں کے پہاڑ گڑگڑاتے ہوئے خشکی کی طرف بڑھتے اور چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے۔ سارا ساحل جھاگ جھاگ ہو رہا تھا۔ اور فنا ہونے والی لہروں کا پانی کروڑوں بوندوں میں بکھر کر ہماری طرف یوں لپک رہا تھا۔ جیسے کوئی مصیبت زدہ انتہائی مایوسی میں ہاتھ اٹھا کر مدد مانگ رہا ہو۔

ہم نے دیکھا کہ اندھیرا دور سے ہماری طرف رینگتا چلا آ رہا ہے ہم سمندر سے لوٹ پڑے اور دیکھا کہ کس طرح اردگرد کی پہاڑیاں اس اندھیرے میں ڈوب رہی ہیں۔ بیچاری زمین اندھیری رات کا سامنا کرنے کے لئے اپنے دل کو پتھر بنا دینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا: معاذ اللہ! کتنا سنسان مقام ہے!"

اُسے یہ مقام سنسان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے پودوں، کھیتوں، دیو قامت درختوں اور بکھرے ہوئے پتھروں کی اوٹ میں حرکت محسوس کر رہا تھا۔ اور مجھے یہ جگہ ضرورت سے زیادہ آباد معلوم ہوتی تھی پھر بھی اس کے اکیلے پن کے احساس کو میں نے اچھا شگون سمجھا کیونکہ یہ احساس بسا اوقات ظاہر کرتا ہے کہ اب کسی شخص میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

پھر جب جاڑے کی تاریکی پوری طرح چھا گئی۔ تو میرا خیال تھا کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے۔ وہ شام سے پہلے گھر آ جاتا اور جاڑوں تک کبھی نہیں [illegible] کبھی کبھی وہ میری طرف اس طرح دیکھتا۔ جیسے اس کے دل [illegible] گویا وہ میرے علم سے الجھ پڑنے کو تیار ہے۔

میں نے کبھی اسے جرأت نہ دلائی۔ کہ وہ بولے۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح وہ کبھی کچھ نہیں جان سکیگا۔ اور نہ میرا کوئی لفظ اس کی کچھ مدد کر سکتا ہے میرا یہ خیال تھا بھی درست لیکن اس نے مجھے بولنے پر مجبور کر دیا۔

ہم تاریک زمانے کے شباب میں تھے۔ ایک روز پچھلے پہر وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ گویا میری مخالفت پر تلا بیٹھا ہے۔ بولا "علم کی بڑائی کا یہ اظہار کچھ فضول سا ہے۔ تصنع چھوڑ کر اگر تم مجھے اپنے وہم کی تائید میں کسی دلیل سے قائل نہیں کرو گے۔ تو مجھے باہر جا کر خود تجربہ کرنا ہو گا۔"

میں اپنی کمزوری کو جانتا تھا۔ اس لئے اسے ٹالنا چاہا۔ اور کہا "دلائل تو میں دے چکا ہوں"

"تم جانتے ہو۔ وہ دلیلیں بالکل بودی تھیں"

"اچھا تم کچھ انتظار تو کرو۔ کیا تم اس سے بھی انکار کرو گے۔ کہ ابھی تم نوجوان ہو"

"جوانی جرأت اور تجربے کا زمانہ ہے"

"تمہارا مطلب ہے فضول تجسس اور ناعاقبت اندیشی کا زمانہ"!

"میں جا رہا ہوں"

"تم واپس کبھی نہیں آؤ گے"

"اگر میں لوٹ آیا۔ تو کیا تم مان لو گے کہ میں راستی پر ہوں"

میں اس کے بے ہودہ چیلنج کو قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "بعض لوگ بچ بھی نکلتے ہیں"

"جب تک تمہیں یقین نہیں آ جاتا میں ہر رات جاؤنگا۔ جاڑا نکلنے سے پہلے پہلے تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ میں تمہیں اس خوف سے نجات دلا کر دم لوں گا"

مارے غصے کے میں نے منہ پھیر لیا میں نے سنا کہ وہ باہر جا رہا ہے لیکن میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے پیچ و تاب میں خیالات سے لڑنے کے لئے میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ آخر میں نے دل کو تسلی دی کہ شام تک وہ لوٹ آئے گا۔

شام تک میں نے انتظار کیا لیکن وہ واپس نہیں آیا۔

میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ کھڑکی کھول کر میں نے دیکھا کہ مغرب میں ہلکی سی زردی ابھی باقی ہے میں اس کی طرف اسی فکر اور مایوسی سے دیکھ رہا تھا جس طرح اس چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو کو جو طوفانی رات میں پہاڑیوں سے اس پار آنے والے مسافر کی رہنمائی کے لئے روشن کیا گیا ہو۔

خوفزدہ بادل سمندر کے کنارے سے اُچھل اچھل کر اوپر نیچے چکر لگاتے ...کل رہے تھے۔ گویا آنے والی مصیبت کی دہشت سے کھوکھلے آسمان ...بازو پھیلائے بھاگے جا رہے ہوں۔

میں واپس کمرے میں چلا گیا۔ ٹوپی تلاش کی۔ پھر دروازے پر آیا۔ تمام اندھیرے میں مجھے قدموں کی آہٹ کا انتظار رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد بھی وہ چٹانوں میں ٹھہرا رہیگا۔ اپنی ...ش کے سامنے ٹال مٹول کرتے ہوئے میں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ رات ...ی طرح چھا گئی۔

اس نے مجھے بُزدلی کا طعنہ دیا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ اب مجھے ...کو ڈھونڈھنے کے لئے جانا ہی ہوگا۔ لیکن دروازہ کھولنے سے قبل میں ...ایک مرتبہ اور سننے کی کوشش کی۔ آہٹ پالینے کی خواہش نے میرے ...ن پر ایسا زور ڈالا کہ کھلتے ہوئے دروازہ کی چرچراہٹ اور قدموں کی چاپ ...مرتبہ میں نے سُنی لیکن اسے سنتے ہوئے بھی مجھے پورا علم تھا۔ کہ یہ ...راصل نہیں۔ بلکہ میرے ہی دماغ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

آخر میں ایک دم تیزی سے باہر بھاگ نکلا۔

میں باہر کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ دیا۔ فضا دل ہلا دینے والی صداؤں سے ...پری تھی۔ بے شمار بادل چیخیں مارتے بھاگے جا رہے تھے۔ اور جھاڑتے ...ھاڑتے ان کے پیچھے لپکے آرہے تھے۔ اوران کے ساتھیوں کے رہنے ...کائنات میں زلزلہ سا پیدا ہوگیا تھا۔

مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی۔ کہ اوپر نظر اٹھا کر دیکھوں میں نے ...نے سر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوط تھام لیا۔ اور گرتا پڑتا بے تحاشا اس ...نڈی کی طرف بھاگا جہاں سے ان خطرناک چٹانوں پر چڑھنے کا راستہ ...ا تھا۔

میں نے اسے پکارنے کی کوشش کی لیکن میری آواز کو ہوا کے ...بوط ہاتھوں نے تندی سے مسل کر پاش پاش ہونے والے جھاگ کے ہزاروں ذرّوں میں بکھیر دیا جو بے بسی اور بے چارگی میں ہرطرف سرپٹک ...رہے تھے۔

طوفان پورے زور پر تھا۔ دیودار صنوبر اور شمشاد کے اونچے اونچے ...ت پاگلوں کی طرح جھوم جھوم کر دُہرے ہوئے جاتے تھے تند اور ...جنگزان درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں میں سے ایک جلوس کی شکل میں ...عار... [illegible] ...اور وحشی ...

ہو کر موت کا راگ الاپتے ہوئے اس کی تانوں پر کوئی انوکھا ناچ ناچ رہے ہیں۔ سمندر کی گونج اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ یہ مہیب گانا جسم میں خون اور ہڈیوں میں مغز خشک کئے ڈالتا تھا۔ میرے پاؤں پتھر بن گئے میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے جواب دے دیا۔

فطرت پاگل ہو کر کھیل رہی تھی۔ ہرطرف ایک ہنگامہ بپا تھا۔ ابھی بوندا باندی۔ ابھی موسلا دھار بارش۔ ابھی شور محشر۔ ابھی موت کا سا سکوت اندھیرے سے میرا دم گھُٹتا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بجلی بار بار چمکے لیکن جونہی بجلی کوندتی میں گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا۔ مجھ میں یہ سماں دیکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ طوفان کی طاقتیں مجھے ڈرا دھمکا کر چٹانوں کی طرف ہانک دینا چاہتی تھیں۔

شور سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ فطرت غیظ وغضب میں دانت پیس رہی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس طوفان میں اس کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے میں جانتا تھا کہ اب اسے ڈھونڈنا بیکار ہے۔

کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا میں واپس سڑک تک پہنچا۔ اور پھر بے تحاشا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

طبیعت میں سکون پیدا کرنے کے لئے میں بہت دیر تک آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ انتہائی تلخی سے میں اپنے تئیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کہ اسے کیوں روک نہ لیا میں ہار مان لیتا۔ ظاہر کرتا۔ کہ مجھے اس کی بات کا یقین ہے یا کم از کم اس کی بے ہودہ جہالت اور جوش سے کچھ ہمدردی ظاہر کر دیتا۔

پھر میں نے اس خیال سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کی کہ یہ اس کی قسمت تھی اور جو کچھ ہوا وہ آخر ہو کر ہی رہنا تھا۔ جن طاقتوں نے اس کی تباہی کا تہیہ کر رکھا تھا۔ انہیں میری خواہشوں اور کوششوں کی کیا پروا تھی۔ آسمانوں میں ناچتے ہوئے جنات کی دھمک میرے دل میں اتری جا رہی تھی اور زمین کی چیزوں کو برباد کرنے والے بھوتوں کے شور اور غل سے میرا دماغ پریشان ہوا جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری کوشش اسے کبھی نہ بچا سکتی۔۔۔۔۔۔۔

پھر جب باہر کا دروازہ کھل کر زور سے بند ہوا۔ اور میں نے سچ مچ اس کے قدموں کی چاپ سُنی تو میرا خیال تھا کہ مرتے وقت اس کی روح آخری مرتبہ مجھ سے ملنے آرہی ہے لیکن جب وہ چمکتی ہوئی آنکھوں اور دمکتے ہوئے رخساروں سے ہنستا اور پیشانی کے بال پیچھے ہٹانے کی خاطر سر کو جھٹکتا میرے پاس آیا۔ تو میں حیران ہوا کہ مجھے غصہ آرہا ہے۔ میں نے کہا "اتنی رات گئے تک تم کہاں رہے ہو میں تمہاری تلاش میں چلا ہوا

تک ہو آیا ہوں۔

"میں تو یہ خیال کرچکا تھا کہ تم مر گئے۔"

"تم چٹانوں تک آئے تھے!" میرا غصہ اور بھی بڑھ گیا لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا "نہیں چٹانوں تک جانے والے راستے کے سرے تک"۔

"اوہ لیکن ایسے موسم میں تمہیں چٹانوں پر کبھی نہیں جانا چاہئے"۔

"تو گویا۔ اب تمہیں میری بات کا یقین ہو گیا ہے نا؟"

وہ مسکرایا "مجھے یقین ہے کہ اس موسم میں ان چٹانوں پر جانا تمہارے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ تمہارے دل میں اندھیرے کی بلاؤں اور طوفان کی قوتوں کا یقین ہے۔ اور تم ڈرتے ہو"۔

وہ دروازے میں کھڑا تھا۔ طوفان سے مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تازہ جوانی میں اور بھی تازگی آگئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھی جو کوئی نئی چیز پالینے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ میں اُسے کچھ جواب نہ دے سکا۔ البتہ میرے دماغ میں یہ الفاظ گھوم رہے تھے۔

"جوانی ..... تجسس ..... جرأت ..... تجربہ ..... کامیابی!!"

مترجمہ سیّد اکبر علی

نغمات

گذرے ہیں کچھ زمانے ایسے بھی زندگی میں
صبحِ کفن کے جلوے دیکھے ہیں چاندنی میں

او مسکرانے والے تاروں کی دل کشی میں
اندھیر ہے مسافر لُٹ جائے روشنی میں

جنّت بھی ہے اسی میں دوزخ بھی ہے اسی میں
کچھ بھی نہیں ہے لیکن سب کچھ ہے زندگی میں

اے ناخدائے ہستی ہے دور میری بستی
بہنے بھی دے یہ کشتی موجوں کی رہبری میں

تقسیم بیخودی کا آیا ہے دورِ مستی
ساغر چھلک رہے ہیں میخانۂ خودی میں

افسانۂ چمن کی تکمیل جن سے ہوگی
ایسے بھی چند سادہ اوراق ہیں کلی میں

ہے وہ ہی ایک داتا مانگوں تو کیا نہ پاؤں
وسعت کہاں سے لاؤں پیمانۂ تہی میں

آجاؤ مل کے گائیں، رومانِ دل سنائیں
نغمے تڑپ رہے ہیں سانسوں کی بانسری میں

گلچیں کی دسترس سے ناآشنا ہیں کلیاں
لٹ جائنگی بہاریں اک دن ہنسی ہنسی میں

شام فریب نکلے صبح ازل کے جلوے
دنیا نے موت لے لی ارمانِ زندگی میں

وہ اے نثار شامِ وعدہ بھی گر نہ آئے
سوچا ہے مر رہیں گے آغوشِ بیکسی میں

نثار اوناوی

درسِ ہُو

ہو نہ شکارِ بے دلی' لذّتِ غم اُٹھائے جا   دل نہ بنا' نہیں سہی' درد کو دل بنائے جا

وہ بھی عطائے دوست ہے۔ یہ بھی اسی کی دین ہے   عیش میں قہقہے لگا۔ طیش میں مُسکرائے جا

دستِ طلب نہیں رسا' دستِ کرم تو ہے دراز   مل ہی رہے گا کچھ نہ کچھ' ہاتھ یونہی بڑھائے جا

سازِ بہارِ جانفزا' خود تری لَے بڑھائے گا   پیروئی ہزار کیا' اپنی ہی دُھن میں گائے جا

سارے جہاں کے فلسفے' ہیچ ہیں اس کے سامنے   عشق کا امتحان نہ لے۔ عقل کو آزمائے جا

عرضِ ثبوتِ زندگی' یوں بھی ہے اور یوں بھی ہے   ہنس نہ سکے ہنسائے جا' رو نہ سکے رُلائے جا

محفلِ ناز دُور ہے' حُسن ہے دیر آشنا   نغمہ کو اور کر رسا۔ ساز کی لَے بڑھائے جا

برقِ بہار اک نظر! کون اب آئے گا اِدھر   تیری تجلیوں کی خیر' شمعِ لحد جلائے جا

مل گئی تجھ کو راہِ دوست۔ پھر کوئی اور آئے کیوں   اپنے قدم بڑھائے جا' نقشِ قدم مٹائے جا

دعوتِ بزمِ انقلاب' ہو نہ اگر نگاہ یاب   اس کا جواب کامیاب یہ ہے کہ بِن بُلائے جا

یاد پہ تیری منحصر ہے یہ حیاتِ مختصر   مجھ کو نہ یاد کر مگر۔ تو مجھے یاد آئے جا

زندگی اور موت میں فرق بقیدِ غم نہیں   اب بھی اگر جِلائے تو تیری خوشی جِلائے جا

اے نگرانِ کائنات' میں ہوں ترا ہی عکسِ ذات   بگڑی ہوئی ہے میری بات' جیسے بنے بنائے جا

بیٹھ کے دِل کے روبرو' آگ لگا دے چارسُو   سیکھ لے مجھ سے درسِ ہُو۔ کون و مکاں پہ چھائے جا

علم جہاں میں وارثیؔ ہو نہ مذاقِ آگہی
رازِ و نیازِ عاشقی' فاش نہ کر چھپائے جا

علامہ سیماب اکبر آبادی

میں نے شادی کی کیونکہ اس

رفیق تنہائی

کو بھگانے کے لئے ——— ایک رفیق تنہائی کی ضرورت تھی

میرے عزیز دوست تم کہتے ہو کہ اس معمّے کو آسانی سے سمجھنا مشکل ہے میں بھی اس کو مانتا ہوں تمہارا خیال ہے کہ میں پاگل ہو گیا ہوں ممکن ہے یہ درست ہو لیکن اس کے وجوہ وہ نہیں جو تمہارے دماغ میں ہیں۔

میرے نظریات اور عقاید میں قطعاً کوئی تغیر نہیں آیا ——— آ ہی نہیں سکتا میں ازدواجی زندگی کو ایک احمقانہ لغزش تصور کرتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ دس شوہروں میں سے نو شوہر اپنی بیویوں کی بیوفائی کا رونا روتے ہیں۔ شادی کر کے وہ اپنی زندگیوں کو تباہی کے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اپنے رنگین تخیل کے پروں کو باندھ دیتے ہیں۔ وہ محبت کی لذت چکھ ہی نہیں سکتے محبت، دنیا کا واحد بہترین اور مسرت انگیز جذبہ، تم جانتے ہو میرا مطلب کیا ہے میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہا ہوں، کہ میری محبت کسی ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتی، میں ہزار ہا پُرگداز بانہوں لاتعداد نرم نرم ہونٹوں کا دلدادہ ہوں میں بیک وقت اپنے آغوش میں اس حسین مخلوق کا ہجوم دیکھنا چاہتا ہوں

لیکن اس کے باوجود میں شادی کر رہا ہوں!

میں تم کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اس لڑکی کے متعلق بہت کم جانتا ہوں، جو کل میری رفیقہ حیات ہوگی میں نے اس کو صرف چار پانچ مرتبہ دیکھا ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ اس کی فطرت میں کوئی عیب بات نہیں، اور میری دلی تسکین کے لئے یہ کافی ہے۔ وہ توانا خوبصورت اور اوسط قد کی دوشیزہ ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ پرسوں تک میں قدرتاً ایک دراز قد، سیاہ رنگ اور کمزور بدن دوشیزہ کی خواہش شدت کے ساتھ محسوس کروں گا" وہ امیر گھرانے سے نہیں اس کا تعلق اوسط طبقہ سے ہے۔ اس میں کوئی ذاتی خصوصیات بھی نہیں، اور کوئی برائیاں بھی نہیں۔ تم مجھ سے پوچھو گے" کہ میں شادی کیوں کر رہا ہوں"

اس کی وجہ کیا ہے میں تمہیں یہ عجیب اور ناممکن سی وجہ بتاتا [illegible] احمقانہ فعل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہرکیف یہ

حقیقت ہے کہ میں اپنی تنہائی سے ڈر گیا ہوں اکیلے پن سے خوفزدہ ہو گیا ہوں میں اب نہیں چاہتا کہ رات اکیلا رہ کر گذار دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس کوئی دوسری ہستی موجود ہو جس کا ہاتھ میرے دل پر ہو اور جو مجھ سے پیاری پیاری باتیں کرے!

میں چاہتا ہوں کہ کوئی صبح سویرے مجھے جگانے کے لئے میرے سرہانے کھڑا ہو جس سے میں اچانک سوال کر سکوں گو وہ سوال کتنے ہی احمقانہ اور لایعنی کیوں نہ ہوں تاکہ میں کوئی انسانی آواز سن سکوں اور یہ محسوس کر سکوں کہ یہاں میرے آس پاس ہی کوئی جیتی جاگتی روح موجود ہے جب میں جلدی سے شمع روشن کروں تو اپنے قریب ہی کوئی انسانی چہرہ دیکھ سکوں، کیونکہ - - - - - کیونکہ . . . . مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے . . . . . کیونکہ . . . . میں تنہائی سے گھبرا گیا ہوں اکیلا رہتے رہتے چلا اٹھا ہوں۔

او! تم مجھے نہیں سمجھ سکتے!

مجھے کوئی خوف نہیں ڈرا سکتا میں کسی خطرے سے مضطرب نہیں ہوتا کوئی شخص اگر میرے کمرے میں گھس آئے تو میں بغیر کسی گھبراہٹ اور اضطراب کے اس کو قتل کر سکتا ہوں میں چڑیلوں اور بھوتوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں ان کا قائل ہی نہیں ہوں!

میں مردوں سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ میرا اعتقاد ہے۔ کہ جو شخص ایک دفعہ مر جاتا ہے وہ دوبارہ دنیا میں واپس نہیں آتا۔

ہاں یقیناً مجھے یہ بتانا پڑے گا۔ کہ میں اپنے آپ سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ ایک بھیانک احساس سے ڈر گیا ہوں۔ تم مجھ پر ہنس سکتے ہو، میری اس بزدلی پر مسکرا سکتے ہو۔ کیونکہ میں اس چیز پر اثر انداز نہیں ہو سکتا میں کمرے کی دیواروں، میز کرسیوں اور تاریک گوشوں سے خوف کھانے لگا ہوں، فقط یہ ہی نہیں میں اپنے خیالات و تصورات سے بھی ڈرنے لگا ہوں جب میں بولتا ہوں تو مجھے اپنی آواز سے خوف آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے دروازے کے پیچھے، پردوں کی اوٹ میں اور

بستر کے نیچے کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ اکثر چلتے چلتے پیچھے مڑکر دیکھنے لگتا ہوں اس خیال سے کہ میری پشت پر کوئی آرہا ہے۔ بیں مستقل ہوجاتا ہوں خوف سے تھرتھرانے لگتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو کمرے میں بند کردیتا ہوں۔ اور آنکھوں کو ایک نامعلوم عرصہ کے لئے بھینچ لیتا ہوں یہ جانتے ہوئے کہ میری شمع بستر کے پاس ہی میز پر پڑی جل رہی ہے اور جس کو مجھے بجھانا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اس کو بجھانے کی جرات نہیں کرسکتا۔

کتنا بھیانک اور خوفناک ہے اس طرح کا جینا یوں زندگی کے دن گذارنا! کیا یہ غلط ہے؟

اس خوفناک جذبے کی اثرانگیزی سے پہلے میری یہ کیفیت نہ تھی۔ میں ایک مخصوص سکون کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا تھا۔ مجھے کوئی بھیانک خیال مضطرب نہیں کرسکتا تھا۔ اگر اس وقت مجھے کوئی پاگل کہہ دیتا۔ تو میں بے اختیار اس کی کم ظرفی پر ہنس دیتا۔ میں اندھیرے میں ہی کمرے کے دروازے کھول دیتا تھا۔ کمرے کو بغیر مقفل کئے ہی سوجاتا تھا۔ آدھی رات کے وقت مجھے جاگنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا مکان کے تمام دروازے بند ہیں کہ نہیں۔

اس حادثے کی ابتدا خزاں کی ایک شام کو عجیب انداز سے ہوئی۔ جب کہ میرا خادم مجھے کھانا کھلاکر کمرے سے چلا گیا۔ تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔ اس وقت میرا دل نہ تو کوئی کام کرنے کو چاہتا تھا اور نہ ہی مطالعہ میں جی لگتا تھا۔ باہر بارش ہورہی تھی۔ میں کسی سے باتیں کرنا چاہتا تھا کسی کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ لیکن فوراً میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں! یہ خیال آتے ہی مجھے اپنا کمرہ پہلے سے بھی زیادہ خالی نظر آنے لگا۔ مجھ پر تنہائی کا ایک شدید سا جذبہ چھا گیا مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ میں بیٹھ گیا۔ لیکن ایک کرب نے مجھے اٹھ کھڑا ہونے پر مجبور کردیا۔ میری ٹانگوں میں آگ سی بھردی۔ اور میں دوبارہ کمرے میں ٹہلنے لگا

لیکن میری بے چینی بتدریج بڑھتی جارہی تھی۔ میرے پاس کوئی نہ تھا جس سے میں اس بے چینی کا اظہار کرسکتا۔ میں گھر سے باہر نکل گیا۔ کسی دوست کی تلاش میں جو میرا ساتھ دے سکے۔ لیکن افسوس کہ مجھے کوئی دوست نہ مل سکا۔ اس لئے مجبوراً مجھے سڑک پر گھومنا پڑا۔ لیکن بارش کے باعث نم آلودہ سڑک بہت دیر تک مجھے ٹہلنے کی اجازت نہ دے سکی میں آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا۔ دل میں یہ کہتے ہوئے کیا مجھے کوئی ہستی نہیں ملے گی جس سے میں ہمکلام ہوسکوں؟

میں مختلف قہوہ خانوں میں جھانکنے لگا جہاں میں نے کئی افراد کو دیکھا۔ جو میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور جن میں اتنی طاقت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی منگائی ہوئی چیزوں کو ختم کرسکیں۔ ایک لامحدود وقت کے لئے میں بغیر کسی مطلب کے ایک آوارہ گرد کی طرح ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اور آدھی رات کے قریب گھر کو لوٹا۔ میں ازحد تھک گیا تھا۔ میرے خادم نے مجھے دیکھتے ہی فوراً دروازہ کھول دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا پڑوسی بھی ابھی ابھی واپس گھر لوٹا ہے۔

جب میں گھر سے باہر جاتا ہوں تو میرا معمول ہے کہ میں اپنے کمرے کو مقفل کرکے جاتا ہوں۔ لیکن اس رات میرے کمرے کے کواڑ بند تھے لیکن مقفل نہ تھے جس نے مجھے حیران سا کردیا۔ لیکن میں نے خیال کیا شاید میری غیرحاضری کے دوران میں میرے کوئی خطوط آئے ہوں۔

میں اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ انگیٹھی میں آگ ابھی تک جل رہی ہے جس نے کمرے میں ایک مدھم سی روشنی پیدا کردی تھی۔ اور جب میں شمع کو روشن کرنے کے لئے آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ کوئی میری آرام کرسی پر آگ کے پاس بیٹھا ہوا ہے جس کی پشت میری طرف تھی۔ میں ذرہ بھر بھی خوفزدہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا میرا کوئی دوست یا واقفکار ہوگا جو مجھے ملنے کے لئے آیا ہوگا اور بہت ممکن ہے۔ میرے خادم نے میری طویل غیرحاضری سے اُکتا کر کمرے کی دوسری چابی اس کے حوالے کردی ہو۔ مجھے اپنے دوست کا صرف سر ہی نظر آرہا تھا اور جیسے وہ کرسی پر میرا انتظار کرتے کرتے سوگیا تھا۔ اس لئے میں اس کو جگانے کے لئے اس کے قریب گیا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا دایاں بازو نیچے لٹک رہا تھا اور اس نے اپنی ٹانگیں ایک دوسرے پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دل میں کہا "یہ کون ہوسکتا ہے"! میں اس کو صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ کمرے میں تاریکی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھنے کے لئے آگے بڑھایا۔ لیکن وہ کرسی کی پشت پر جا پڑا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کرسی خالی تھی ــــ

میں ایک بھیانک خوف سے اُچھل پڑا اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے میری راہ میں دفعتاً کوئی خطرہ حائل ہوگیا ہو۔ میں دوبارہ آرام کرسی کی جانب بڑھا ـــ کانپتے ہوئے دل اور تھرتھراتی ہوئی روح کے ساتھ۔

لیکن میں ایک ٹھنڈے دماغ کا مالک ہوں۔ میں نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پالیا۔ میں نے اس کو محض ایک وہم خیال کیا۔ میں فقط ایک چھلاوے کا شکار ہورہا تھا۔ جس میں میرے دماغ کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ صرف میری آنکھیں تھیں جنہوں نے مجھکو یہ دھوکا دیا تھا۔ ایک ایسا

دھوکہ جو بعض اوقات سادہ لوح لوگوں کو معجزوں کا قائل کر دیتا ہے۔

میں نے شمع کو روشن کر دیا' اور جب آگ کے قریب گیا' تو میں ایک بار پھر اچھل پڑا' جیسے مجھے کسی نے مجھے چھو دیا ہو' میرا دل ابھی تک اضطراب کی لہروں میں ڈوب رہا تھا' میں نے اسی بے چینی کو دور کرنے کے لئے زور زور سے گنگنانا شروع کر دیا' تب میں نے کمرے کو مقفل در مقفل کر دیا جس سے میرے دل کو ایک اطمینان سا ہو گیا' کیونکہ باہر سے اب کوئی نہیں آسکتا تھا۔

میں اس واقعہ پر کافی دیر تک غور کرتا رہا — غور کرتے کرتے سو گیا لیکن چند لمحوں کے بعد میں نیند سے چونک سا پڑا' شمع بجھ چکی تھی' اور آگ بھی بجھتی جا رہی تھی جس کا تھوڑا سا عکس کرسی کے قریب فرش پر پڑ رہا تھا میں نے دیکھا کہ وہ شخص پھر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے جلدی سے دیا سلائی جلائی' لیکن مجھے غلطی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا' بہر کیف میں اٹھ کھڑا ہوا' اور کرسی کو بستر کے پیچھے چھپا دیا اور سونے کے لئے کوشش کی' کیونکہ اب کمرے میں مکمل تاریکی تھی' لیکن ابھی مجھے اس واقعہ کو بھولے ہوئے بمشکل پانچ ہی منٹ ہونے ہونگے' کہ میں یہ تمام منظر خواب میں دیکھنے لگا' جس سے میں چونک پڑا' شمع کو روشن کر کے میں بستر پر ہی بیٹھ گیا۔ اسونے کی ذرا سی خواہش کے بغیر۔

دو مرتبہ مجھ پر نیند نے غلبہ کیا' لیکن دو ہی مرتبہ میں نے خواب میں وہی کریہہ منظر دیکھا' اور میں نے محسوس کیا' جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں' جب سویرا ہوا' تو میں نے اطمینان سا محسوس کیا' اور دوپہر تک آرام و سکون کے ساتھ سویا رہا۔

میں نے وہ شام خوب زور شور سے منائی' ایک بہترین ریسٹوران میں کھانا کھایا' اور پھر تھیٹر چلا گیا' اور آدھی رات کے قریب واپس گھر لوٹا لیکن جو نہی میں گھر کے قریب آیا' مجھ پر ایک ہیبت ناک سا خیال چھا گیا میں اس کی موجودگی سے خوفزدہ نہیں ہو رہا تھا' کیونکہ میں چڑیلوں اور بھوتوں کا قائل نہیں' میں آنکھوں کی فریب دہی سے ڈر رہا تھا' ایک تازہ وہم کا شکار ہو رہا تھا

مسلسل ایک گھنٹہ تک میں سڑک پر گھومتا رہا۔ یعنی پھر میں نے محسوس کیا کہ میں فی الواقع بہت بڑا احمق ہوں۔ جو خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ اور آہستہ آہستہ کمرے کی جانب چلنے لگا۔ اور اس کے سامنے آکر رک گیا۔ اور ایک شدید جرأت کے ساتھ تالا کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا' میں نے ایک خوفزدہ نظر انگیٹھی کی طرف دوڑائی' لیکن وہاں کچھ نہ تھا' اور شمع روشن کر دی! کتنی اطمینان اور مسرت انگیز تھی یہ بات' میں کمرے میں ایک حوصلہ مند دل کے ساتھ ادھر ادھر چلنے لگا' لیکن مجھے ابھی پورا اطمینان نہ ہوا تھا' ابھی تک کمرے کے گوشوں کے عکس مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھے۔

اس وقت سے میں رات کو اکیلا ہونے کے باعث ڈرتا ہوں۔ مجھے اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے' کہ وہ میرے قریب ہی ہے' میرے ارد گرد ناچ رہا ہے' یہ جانتے ہوئے کہ اس وہم کی کوئی حقیقت نہیں' وہ کون تھا' یہ مجھے معلوم نہیں میں یہ جانتا ہوں کہ اس کا وجود سوائے میرے بزدلانہ دماغ کے اور کہیں موجود نہیں۔ اس کے بغیر اس کی جگہ ہو ہی کہاں سکتی ہے' میں یہ جانتا ہوں' کہ میں اس کو دوبارہ نہیں دیکھ سکتا' لیکن اس کے باوجود میں گھر میں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ میرے کمرے میں موجود ہے — میرے خیالات میں موجود ہے۔ وہ دروازوں کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے' وہ الماری کی آڑ میں ہے' میرے بستر کے نیچے براجمان ہے' وہ ہر تاریک گوشے میں ہے کتنا احمقانہ خیال ہے یہ ؟ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں ؟ مگر اس کمرے میں اگر ہم ایک کی بجائے دو ہوں' تو مجھے یقین ہے' کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے گا۔ ایک منٹ کے لئے بھی وہاں نہ ٹھہر سکیگا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک وہاں ہے۔ جب تک میں اکیلا ہوں' —— صرف اس لئے کہ میں اکیلا ہوں۔

مترجمہ

آثر چکوالی۔ بی اے

ماہ مارچ سے "شاہکار" میں انعامی افسانوں کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے

تفصیل کے لئے صفحہ ۳۳ ملاحظہ فرمائیے

غزل

جذبِ صادق ہے مرا ذوقِ طلب خام نہیں
ہاں مجھے وسوسۂ گردشِ ایام نہیں

میری راحت طلبی سے کوئی کہدے کہ حیات
رقصِ بسمل ہے تماشاءِ لبِ بام نہیں

ایک راہی ہوں کہ جس کی کوئی منزل نہ مقام
میری تقدیر میں آسودگیٔ شام نہیں

سوزشِ قلب و جگر، ذوقِ نظر، لذتِ درد
یہ وہ دولت ہے جو دُنیا میں ابھی عام نہیں

حُسن اور عشق میں بنتی نہیں پھر بھی اے دوست!
حُسن خود بیں ہی سہی عشق تو خود کام نہیں

صبحِ آغاز کے عُقدے کو تو سُلجھانے دو!
میری نظروں میں ابھی ظُلمتِ انجام نہیں

اب چمکتی سی، دمکتی سی کوئی صبح کہاں؟
اب مہکتی سی، بہکتی سی کوئی شام نہیں

آدمی کتنے علائق میں ہے پابند و اسیر
اور ظاہر میں کہیں دانہ نہیں، دام نہیں

کتنے گذرے ہوئے طُوفانوں سے بچ نکلا ہے
اتنا ناکام بھی میرا دِلِ ناکام نہیں

تو میرے جینے کا مقصد بھی بنا جاتا ہے
اور تجھ سے کوئی مطلب نہیں کچھ کام نہیں

مجھ سے در پردہ محبّت کا ہے مظہر یہ بھی
اُن کی محفل میں مرا ذکر نہیں، نام نہیں

حُسنِ سیمیں بدناں اور یہ فراغت بھی ضمیر
پھر بھی کیوں رُوح کو تسکیں نہیں، آرام نہیں

سید ضمیر جعفری بی اے

جوانی نے ایک حسین غلطی کی' **دل** کی رہنمائی میں۔ اور پرکاش کا گھر تباہ ہو گیا۔ اس نے تلافی کی کوشش کی'
عقل کی رہنمائی میں۔ اور اس کا ضمیر بھی تباہ ہو گیا' غرض یہ

دوگونہ عذاب

کا اسیر ذہنی کشمکش کی قربان گاہ پر.............

پرکاش نے اپنا گرم چہرہ کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے کے ساتھ لگا دیا۔ اس کی ماں کی سسکیاں بند دروازے میں سے بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا باپ غم و غصہ سے بھری ہوئی آواز میں گرج رہا تھا... یہ کبھی ممکن نہیں ہو گا۔ لالہ بہادر کا بیٹا گاؤں کے چمار کی بیٹی سے بیاہ نہیں کرے گا... اگر اس لڑکے نے میری بات نہ مانی' اور اس لڑکی کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ آج کل کے زمانے میں کوئی بی اے پاس کہیں روٹی کما کے دکھائے تو جانوں۔ پرکاش کانپ گیا یہ سچ تھا۔ آجکل کے زمانے میں بی اے پاس کے لئے روٹی کمانا بھی مشکل ہے۔ وہ خود کئی ہفتے نوکری کی تلاش کر چکا تھا جب اس نے چمپا سے بیاہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اسی دن سے اس نے نوکری ڈھونڈھنا شروع کر دی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ماں باپ اس کی شادی کی مخالفت کریں گے۔ آخر جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو اس نے گھر والوں کو اپنا راز بتا دیا۔ گھر والوں سے اسے ہمدردی کی بجائے جھڑکیاں مل رہی تھیں۔

اس کی بہن کملا جو بچپن سے اس کی غمخوار رہی تھی جس نے کبھی کسی بات میں اس کی مخالفت نہ کی تھی۔ سب گھر والے "بھیا کی وکیل" کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر بات میں پرکاش کی طرفداری کرتی تھی...... آج اس نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا...... وہ صوفے کے گدوں میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی...... وہ جانتا تھا کملا کیوں رو رہی ہے...... وہ اپنی سہیلی لیلا کو اپنی بھاوج بنانا چاہتی تھی.....

لیلا...... جو اپنے کالج میں سب سے لائق سمجھی جاتی تھی جس کے چہرے کا رنگ کتب خانوں کی مصنوعی روشنیوں کے نیچے بیٹھکر پڑھنے سے زرد سا ہو گیا تھا..... جس کی حسین بھوری آنکھیں برسوں کی دماغی محنت کی وجہ سے کچھ کمزور ہو گئی تھیں...... جسے دور سے کوئی چیز دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں سکیڑنا پڑتا..... کسی زمانے میں پرکاش کو لیلا سے محبت تھی۔ وہ اسے حسین سمجھا کرتا تھا لیکن گرمیوں کی ایک سہانی شام نے اس کی زندگی کو بدل ڈالا...... وہ شکار کھیل کے واپس آ رہا تھا جبکہ دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس نے ایک لڑکی کو تالاب سے پانی بھرتے دیکھا...... اس نے دیکھا...... اور پھر کچھ اور دیکھنے کا اسے ہوش رہا۔ نہ طاقت رہی۔ جب وہ چلتی تھی۔ تو یوں معلوم دیتا تھا۔ جیسے دریا کی لہروں نے ناچنا' اور درختوں کی ڈالیوں نے جھومنا اسی کی چال سے سیکھا...... اس کی چمکیلی سیاہ آنکھوں میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی ایک دوسری سے لپٹی ہوئی تھیں.......

پرکاش نے اس سے باتیں کیں ..... اس کے بعد وہ روز شام کو اس کے پاس جاتا اور یہ دونوں تالاب کے کنارے پتھروں پر بیٹھ کر گھنٹوں پریم کی باتیں کرتے.....

پھر وہ دن آیا جب چمپا کے باپ نے پرکاش سے کہا کہ یا تو میری لڑکی سے بیاہ کر لو یا یہاں آنا چھوڑ دو۔ اسی دن سے پرکاش نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی تھی...... آج آخری دن تھا۔ چمپا کے باپ نے کہا تھا۔ کل میں لڑکی کا بیاہ ساتھ والے گاؤں کے ایک نوجوان چمار سے کر دوں گا... جب پرکاش یہ سوچتا تھا تو اس کے سینے پر برچھیاں سی لگتی تھیں۔ میری چمپا چمار کے گھر؟ اس کا خون کھولنے لگتا۔ وہ گھبرا کر کمرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ کملا صوفے پر سسکیاں لے رہی تھی۔ پرکاش نے اسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ "سن کملا بہن۔ وہ غریب سہی۔ بہت غریب سہی۔ لیکن وہ ۔۔ کملا۔ وہ رانیوں سے بڑھکر حسین اور دیویوں سے زیادہ پاکیزہ ہے......"

"لیلا سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہو سکتی۔" کملا نے اپنا ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی.....

پرکاش دیوانہ سا محسوس کرنے لگا...... اس کی آنکھوں کے آگے سیاہی چھانے لگی...... اسے چمپا کے یہ لفظ یاد آ رہے تھے......"بابوجی اگر تم مجھ سے بیاہ کرنے نہ آئے تو میں دریا میں ڈوب جاؤں گی..." پرکاش جانتا تھا کہ اگر وہ دریا میں نہ ڈوبی۔ تو صبح کو اس کا بیاہ ایک چمار سے ہو جائے گا......

اس نے پاگلوں کی طرح ہوا میں ہاتھ مارنے شروع کر دیے۔ جیسے وہ چمپا کو کسی اور سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے...... دفعتاً وہ ٹھہر گیا...... نہ جانے اسے کیا خیال آیا... اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ اسے میز کی دراز میں ڈالا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

کملا کو نیند نہیں آ رہی تھی...... آخر اس نے سوچا کہ کچھ پڑھنے کا کام ہی کروں۔ نئی قلم میں سیاہی ڈالنے کے لئے اس نے پرکاش کی دراز کو کھولا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ آیا جو سب گھر والوں کے نام لکھا گیا تھا۔ ......اس نے چند ہی سطریں پڑھیں۔ اور پھر بڑے زور سے چیخ ماری......

تمام گھر جاگ اٹھا۔ کملا بے ہوش پڑی تھی......اس کے ہاتھ میں پرکاش کا لکھا ہوا......خط تھا......"میں اور چمپا اگر اکٹھے جی نہیں سکتے۔ تو اکٹھے مرنے سے تو ہمیں کوئی نہیں روک سکتا......کل ہمارے بے جان بدن پاس پاس پڑے ہونگے۔ دیکھنے والے کہیں گے۔ یہ دریا میں ڈوب کر مرے ہیں لیکن وہ غلط کہیں گے۔ ہم دریا میں نہیں اپنی امیدوں کے خون میں غرق ہو رہے ہیں...... وہ خون جو میرے گھر والوں نے اور سماج نے بہایا ہے......پرکاش کو چمپا سے جدا کرنا جسم کو جان سے جدا کرنا تھا۔

وغیرہ عورتیں تو رو ہی رہی تھیں۔ رائے صاحب کے بھی یہ خط پڑھکر ہوش اڑ گئے۔ انہیں خیال نہیں تھا کہ پرکاش یہاں تک بات پہنچا دے گا۔ وہ سمجھتے تھے۔ بگڑا ہوا امیر زادہ ہے۔ خود کچھ دنوں میں راہ پر آ جائے گا......گاؤں کا پتہ تو انہیں معلوم ہی تھا۔ وہ اسی وقت موٹر میں بیٹھکر روانہ ہو گئے۔ اور پرکاش اور چمپا کو دریا کی طرف جانے والی سڑک پر جاتے ہوئے جا پکڑا...... پرکاش نے انہیں دیکھکر بھاگنا چاہا لیکن رائے صاحب نے موٹر سے اتر کر بیٹے کو گلے لگا لیا......اور کہا "تمہیں تو میرے گھر کا چراغ ہو تمہاری خوشی میں ہماری راحت ہے تم گھر چلو۔ جہاں تم چاہتے ہو وہیں تمہارا بیاہ کیا جائے گا"۔ چنانچہ اگلے دن پرکاش کی شادی چمپا سے ہو گئی......

اب چمپا شہر کے ایک مشہور رائے صاحب کی بہو تھی۔ وہ کوٹھی میں رہتی تھی...... درجن بھر نوکر اس کی خدمت کے لئے تھے......ہر طرف عیش و آرام کے سامان مہیا تھے۔ لیکن عجب بات یہ ہے کہ چمپا خوش نہ تھی......

پہلے تو اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن جو کانٹا ہر وقت چبھتا رہے۔ اس کی طرف آخر توجہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اسے کسی بالکل نئی دنیا میں بھیج دیا گیا ہے جس کے آداب و رسوم اسے کسی نے سکھائے ہی نہ تھے......اس کی نند بی اے میں پڑھتی تھی جب اس کی سہیلیاں آتیں اور باتیں کرتیں تو چمپا کو ایک لفظ بھی سمجھ نہ آتا تھا جب کوئی لڑکی ہنس کر اس کی طرف دیکھتی تو چمپا سمجھتی کہ یہ شہری لڑکیاں میرا ہی مذاق اڑا رہی ہیں۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ گھبرا کے کہتی بھگوان! میں کہاں آ گئی ہوں؟

ایک دن وہ بڑی غمگین ہو کر کمرے میں بیٹھی تھی۔ پرکاش نے پوچھا کیا بات ہے۔ وہ بولی۔ مجھے یہاں کسی کی بولی سمجھ میں نہیں آتی۔

"کیوں؟ ہم ہر وقت تو انگریزی نہیں بولتے۔" پرکاش نے کہا۔

"جب تم انگریزی نہیں بولتے۔ پھر بھی مجھے کسی بات کا پتہ نہیں لگتا... تھوڑی تھوڑی بات سمجھ میں آتی ہے ساری نہیں......"

پرکاش سوچنے لگا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ جب ہندوستانی بھی بولتے ہیں۔ تو بہت سے لفظ دوسری زبانوں کے بول جاتے ہیں......"

چمپا بہت روئی۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی اور ہی دیس میں آ گئی ہوں......"

پرکاش نے کہا "دیکھو روؤ مت۔ میں تمہیں آج ہی انگریزی پڑھانا شروع کر دوں گا......" اور پرکاش نے اسے انگریزی پرائمر لا دی۔

لیکن اے۔ بی۔ سی۔ ڈی یاد کر لینے سے چمپا کی مشکلات کا خاتمہ نہ ہوا۔ وہ رائے صاحب کے گھر میں......اس امیرانہ کارخانے میں ہر وقت گھبرائی سی رہتی تھی۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور بات بات پر بے وقوف بنائی جاتی۔ ایک دن اس نے کھڑکی میں سے شوفر اور خانساماں کو باتیں کرتے سنا ایک ہی فقرہ اس کے کان میں پڑا "آخر چمار کی بیٹی ہے نا......" اس کے دل پر نشتر سا لگا......اب وہ ہر ایک سے شرمانے لگی...... وہ دروازوں کے پیچھے چھپ کر چلتی......جب گھر میں کوئی آتا تو وہ سامنے نہ جاتی......اس کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا۔ کہ نہ جانے میں کیا غلطی کر رہی ہوں......اور میرا کتنا تمسخر اڑایا جائے گا۔

بچپن میں ایک دفعہ اسے ایک تالاب میں سے پیدل چل کر دوسری طرف جانا پڑا تھا۔ اسے وہ بات اب تک یاد تھی...... وہ قدم قدم پر لرزتی تھی کہ نہ جانے اگلا پاؤں کسی گڑھے میں پڑے گا۔ یا کسی ٹوٹی ہوئی بوتل پر

یا کسی کٹے ہوئے سرکنڈے کی جڑ پر۔ وہ ہانپتی کانپتی بڑی مشکل سے اس پار پہنچی تھی۔ ... بالکل وہی احساس اسے آج کل اس گھر میں رہنے سے ہوتا تھا..... وہ سہاگن میں پکڑ کر کہتی۔ پرکاش میں کبھی اس تالاب کے پار بھی پہنچ سکوں گی

پرکاش کی سالگرہ کے دن بہت سے لوگ جمع تھے کھانا کھا چکنے کے بعد سب اکٹھے بیٹھکر باتیں کر رہے تھے۔ بچپن کی شرارتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے سنایا کہ جب میں چھوٹا تھا۔ تو مجھے موٹر چلانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن جب ڈرائیور پاس نہ تھا میں نے موٹر میں بیٹھکر اس کے سارے بٹن یکے بعد دیگرے گھما دیئے۔ یکایک موٹر نے چلنا شروع کر دیا۔ مجھے لگا ڈر۔ میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا میری آواز سن کر گھر کے بڑے آگے اور انہوں نے مجھے موٹر سے نکالا۔ کملا نے وہ واقعہ سنایا جب وہ چھوٹی سی تھی تو اس نے اپنی ماں کی ساڑھے سات سو روپیہ کی قیمتی ساڑی ان کے ٹرنک میں سے نکال لی تھی۔ اور اپنے اسکول میں جا کر پارٹی کے دن پہنی تھی۔ اس کی ماں کو جب خبر ہوئی تو اس نے کئی دن تک اس کا جیب خرچ بند کر دیا تھا..... اسی طرح سب اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے چمپا بت بنی بیٹھی تھی اس نے نہ کھانے پر کوئی بات کی تھی۔ اب بول رہی تھی۔ ایک صاحب بولے بھئی۔ اب ہم مسز پرکاش سے کوئی بات سنیں گے۔ دیکھئے آپ ضرور کچھ کہئے .... جب سب نے بہت اصرار کیا۔ تو چمپا نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا.... کہنے لگی ... ہمارے گھر کے پاس ایک بڑھیا اپلے بیچا کرتی تھی۔ میں اس سے ایک دن پیسے کے اپلے لینے گئی میرا اس کا جھگڑا ہو گیا۔ میں مانگتی تھی پیسے کے بیس اور وہ دیتی تھی پندرہ۔ وہ دیتی تھی بیس اوپر دس..... کتنی دیر ہو گئی.. آخر مجھے ایک بات سوجھی میں نے سہمی ہوئی شکل بنا کر کہا۔ اری اماں! تیری کوٹھڑی میں سانپ! بڑھیا تھی ڈرپوک..... گھبرا کر باہر آئی۔ اور جانے کدھر کو نکل گئی۔ اور میں نے پیسہ بھی بچا لیا.... اور اپلوں کی ٹوکری بھر کر اپنے گھر بھاگ آئی۔ چمپا کی بات پر کسی کو بھی ہنسی نہ آئی۔ شہر کی نفیس خواتین نے اپلوں کا نام سنتے ہی ناک پر رومال رکھ لئے تھے۔ اور مرد سب کنکھیوں سے پرکاش کی طرف دیکھکر مسکرا رہے تھے.... پرکاش کا چہرہ ان اشاروں کنایوں سے غصے کے مارے سرخ ہو گیا۔

اس کے بعد پرکاش کو اپنی بیوی سے ڈر سا آنے لگا۔ وہ اسے اپنے دوستوں کے سامنے نہ آنے دیتا۔ اور نہ اسے اپنے ساتھ باہر لے کر جاتا۔ کہتا اس کا کچھ بھروسا نہیں۔ نہ جانے کیا بات کر دے گی؟

اور لڑکے ہفتوں تک میرا مذاق اڑاتے رہیں گے....

ایک دن وہ کملا کے ساتھ ایک پارٹی پر گیا۔ چائے کے بعد وہ اپنی کرسی پر اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ اکیلا اس لئے تھا کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لایا تھا۔ اور آج کل کی مخلوط سوسائٹی میں یہ بات معیوب سمجھی جاتی ہے.... جب وہ کسی کنواری لڑکی سے بات کرنے لگتا۔ تو وہ آہستہ آہستہ سرکنے لگتی۔ اور پھر کسی بہانے سے بھاگ کر دوسری لڑکیوں سے جا ملتی۔ اور جب وہ کسی بیاہی عورت سے بات کرتا۔ تو اس عورت کا شوہر آہستہ آہستہ سرکنے لگتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو پرکاش اور اپنی بیوی کے عین بیچ میں ثبت کر دیتا اور بے بیوی کا شوہر پرکاش پھر اکیلا بیٹھا رہ جاتا۔

آج اسے رہ رہ کر کملا کی سہیلی لیلا یاد آ رہی تھی۔ ... اس کا حق نہ تھا کہ اب اسے یاد کرتا۔ اس نے خود ہی چمپا کی خاطر اسے چھوڑا تھا..... پھر بھی بار بار اس کا چہرہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگتا...... اب وہ کہاں ہے؟ اس کی بھوری بھوری متین آنکھیں یاد آ رہی تھیں جنہیں مدتوں کی دماغی محنت نے کچھ کچھ کمزور کر دیا تھا اور اس کی ہلکی ہلکی ہنسی جو اس کے ہونٹوں پر صرف مسکراہٹ بن کر دکھائی دیتی تھی.... اسے وہ دن یاد آیا جب لیلا کو شیکسپیئر کے ایک ڈرامے میں اچھا پارٹ کرنے کے صلہ میں ایک کتاب انعام میں ملی تھی.... اس نے سب سے پہلے اپنا انعام پرکاش کو دکھایا تھا۔ پرکاش نے ٹھنڈی سانس لی.. اس زمانے میں مجھے اس سے محبت تھی... پھر... پھر چمپا کی محبت ایک بے پناہ سیلاب کی طرح آئی جس میں اور سب کچھ غرق ہو گیا.... اب وہ طوفان گذر چکا تھا۔ اور ڈوبی ہوئی چیزیں ایک بار پھر دکھائی دینے لگی تھیں..... اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ لیلا پارٹی پر نہیں آئی کیا؟..... پھر اسے وہ دن یاد آیا جب چمپا سے اس کا بیاہ ہوا تھا .... سامنے بیٹھکر لیلا نے اسے بہت مبارکباد دی۔ لیکن جلد ہی اٹھکر وہ اپنی موٹر میں جا بیٹھی تھی۔ اس کا بیگ کمرے میں ہی رہ گیا تھا۔ پرکاش کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑا اس نے موٹر میں جھانکا .... لیلا دور نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے اونچے نیچے بہت سے قطرے امڈ رہے تھے... اس نے پرکاش کی طرف دیکھا۔ مایوس نگاہوں سے.... اور پھر جلدی سے موٹر چلا کر باہر نکل گئی... پرکاش کو اس کی آنکھیں رات بھر یاد آتی رہیں اس کی خوبصورت آنکھوں میں حسرت کے آنسو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ٹوٹا ہوا راج محل بارش میں بھیگ رہا ہو....

ہاں۔ - پرکاش نے سوچا..... اسے مجھ سے محبت تھی۔ میں نے اس کا دل توڑ دیا.... وہ بیٹھے بیٹھے اکتا سا گیا۔ اس نے اپنے میزبان سے اجازت مانگی۔ اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا.....

اپنے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو چمپا دونوں کہنیاں میز پر رکھے ہل ہل کر پرائمر یاد کر رہی تھی..... پرکاش کو دیکھکر بولی..." جاد کرلیا میں نے..... پرکاش کو چمپا کی غلط بولی سے عموماً تو شرم سی آتی تھی۔ لیکن نہ معلوم اسے اتنا غصہ کیوں آ رہا تھا.. اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی تمام تکلیفوں کا باعث یہی جنگلی لڑکی ہے۔ ..." کیا جاد کرلیا تم نے ؟" اس نے تلخی سے کہا....

چمپا جلدی جلدی سنانے لگی " کیٹ۔ پھیٹ۔ کیٹ ..." پرکاش کا خون ابلنے لگا۔ اس نے بڑے زور سے میز پر مکا مار کے کہا... "پھیٹ نہیں فیٹ کہو ! جاہل ... گنوار لڑکی !" چمپا تھرا گئی ...

سچا الزام۔ جھوٹے الزام کی نسبت زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ سچے الزام کی چوٹ دل پر یوں آ کے لگتی ہے۔ جیسے ننگے بدن پر چابک ... کسی ماہ رو حسینہ کو کالی چڑیل کہئے۔ وہ ہنس کے منہ چڑا دے گی. لیکن کسی لڑکی کو گنوار کہئے ...

چمپا تھرا گئی .... اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبالیا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں جن میں دن کی روشنی۔ اور رات کی سیاہی ایک دوسری سے لپٹی ہوئی تھیں.... آنسوؤں سے تھرتھرانے لگیں..... اس لرزتی ہوئی آنکھوں کو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ٹوٹا ہوا تاج محل بارش میں بھیگ رہا ہو..... دفعتہً پرکاش کو ایک خیال آیا۔ خیال کیا تھا۔ ایک گھن سا تھا۔ جو اس کے دماغ پر آ کے لگا ... وہ تڑپ کر باہر نکل آیا

" نہیں ! نہیں !!" اس نے اپنے آپ سے کہا... ایک آواز اس کے کانوں میں چلا رہی تھی " تم نے دو عورتوں کے دل توڑے ہیں۔ دو بے گناہ عورتوں کے دل..... جن کا صرف اتنا قصور تھا۔ کہ انہوں نے تم سے محبت کی ...." وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور کہا۔ یہ میرا فرض ہے .....

اگلے دن اس نے چمپا کے لئے شہر میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور اسے وہاں لے گیا.... " لو چمپا" اس نے کہا۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ یہاں جیسے تم چاہو گی۔ ویسے رہنا.... چمپا بہت خوش ہوئی۔ وہ اپنے نئے گھر کو اسی طرح چلانے لگی۔ جیسے وہ گاؤں میں اپنے باپ کا گھر چلاتی تھی ......

شروع میں وہ کچھ تنہائی محسوس کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے محلے کی شہری عورتوں سے ملتے جھجکتی تھی۔ اور کوئی اس کا واقف نہیں تھا۔ لیکن دنیا میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی رفیق ضرور مل جاتا ہے چمپا نے بھی اپنے محلے کی مہترانی بندو کے ساتھ بہناپا کرلیا۔ اب اس کی بہت اچھی کٹ رہی ہے۔ بندو اپنا کام ختم کرکے چمپا کے گھر آجاتی ہے۔ اور وہ دونوں اکٹھی بیٹھکر گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہیں ....

پرکاش جب دفتر سے کام کرکے نکلتا ہے تو نہ جانے کیوں اس کا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا وہ ایک کھوئی ہوئی روح کی طرح ادھر ادھر سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہ دوسرے مردوں سے بھی نہیں ملنا چاہتا وہ سب لوگوں سے بھاگتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر آپ شام کو لارنس گارڈن میں جائیں۔ اور اتفاق سے اس بنچ کا رخ کریں جس پر آپ سے پہلے پرکاش بیٹھا تھا۔ تو آپ کو پرکاش نہیں صرف اس کے کوٹ کا آخری حصہ درختوں کے پیچھے چھپتا ہوا دکھائی دے گا

(لیڈی ڈاکٹر) **این، فاطمہ بٹ**

رباعی

نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

اقبال رحمۃ اللہ علیہ

قطعات

(۱)

محبت میں ڈوبا ہوا پھول آیا — اڑا کر بہاریں جوانی کی لایا
وہی حسن و نزہت، وہی کیف و نکہت — مگر خود تو آیا، او نہیں بھول آیا

---

(۲)

فضاؤں میں جگنو اڑا کر گئیں تم — حسین تیتری کا سا دم بھر گئیں تم
ستارا سا ٹوٹا، شرارا سا چمکا — مری نرم آواز سے ڈر گئیں تم

---

(۳)

بہاروں سے فردوس کی تازہ تر ہے — فرشتوں کے سجدوں سے پاکیزہ تر ہے
نزاکت کا حامل، لطافت کا حاصل — ترا نام تجھ سے بھی دوشیزہ تر ہے

---

(۴)

ترے اک تصور کے رنگیں نظارے — بہاروں میں بجلی خزاں میں شرارے
ترے اک تبسم کے پاکیزہ جلوے — گلستاں میں کلیاں، فلک پر ستارے

---

(۵)

معطر نفس میں خمستاں ہے آباد — نگاہوں میں اک انجمستاں ہے آباد
تبسم کے [illegible] نم خوردہ عارض — گلستاں میں گویا پرستاں ہے آباد

رشید ذوقی کاندھلوی

حسیات

اِن زیست کے غمگین لمحوں پر غم اور اس سے کیا چھا جائیں
اک ہُوک سی دل میں اُٹھتی ہو آنکھوں میں آنسو آ جائیں

وہ عہدِ گذشتہ اُف وہ مری چنچل سیتل رنگیں شامیں
اے کاش وہ گھڑیاں آج افق سے جھانک پڑیں تڑپا جائیں

وہ عالم اُف وُہ عالم وُہ الفت کی گھاتیں کیا کہیئے؟
وہ دل کا بھید سمجھ جائیں ہم شوخ نگاہیں پا جائیں

اس ماتھے پر کالی کالی زلفوں کا سنور جانا توبہ
جنّت کے حسیں منظر بھی چلے آئیں تو یہاں خم کھا جائیں

سوگند ان مست نگاہوں کی پینے سے تو ضد سی ہے لیکن
ایسے میں کہاں انکار وہ دل پر ساون بن کر چھا جائیں!

کیوں دِل پر بار سا رہتا ہے کیوں سہما سہما رہتا ہوں
یہ دردِ نہاں ہے جن کی عطا کچھ آ کے مجھے سمجھا جائیں

اس حالت میں جعفر کیا جانوں مرنا کیا جینا کیسا
دو دل آپس میں مل جائیں دو آنکھیں جب شرما جائیں

جعفر شیرازی

ایک لنڈنی رات کی یاد

لندن کی ایک رات

[ہمارے رفیق محترم مسٹر کامران الماس ایک جواں سال مگر کہنہ مشق ادیب ہیں۔ آپ ایک عرصہ تک انگلستان میں رہنے کے بعد آغاز جنگ سے چند ہفتے پہلے ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔ اب آپ نے ہماری فرمائش پر لندن کی زندگی کے متعلق ایک سلسلہ مضامین اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے جس کی پہلی قسط ہدیۂ ناظرین ہے ـــــ اس مضمون کو پڑھکر دل سوچتا ہے کہ لندن کے یہ عشرت کدے جو صفحۂ قرطاس پر موجود ہیں۔ آج دس ماہ کی وحشیانہ بمباری کے بعد صفحۂ زمین پر بھی ہیں یا نہیں مسٹر الماس کو یقین ہے کہ وہ صحبت گاہیں ان کا پھر انتظار کر رہی ہیں۔ - واصل]

ریاض کو اور مجھے لندن میں رہتے ہوئے تین سال گذر گئے تھے۔ اور ہم دونوں اس سے اس قدر مانوس اور آگاہ ہو چکے تھے کہ اگر کوئی ہماری آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دیتا۔ تو ہم آسانی سے شہر کا چکر لگا سکتے تھے۔ لیکن محمود کی حیثیت ابھی نووارد کی تھی۔ وہ وہاں کی سردی، دھند اور برفباری سے اکتا گیا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ عروس البلاد کے پہلو میں رہتا تھا۔ وہ انارکلی کی یاد میں بے کیف سا رہتا تھا۔

اسی اثنا میں باقر بھی لنڈن آپہنچا۔ اب ہماری چار یاری جسے لنڈن میں فورسم (FOURSOME) کہتے ہیں مکمل ہو گئی تھی۔ تازہ واردان کا دل بہلانے کے لئے ہم نے دستور بنا لیا تھا۔ کہ ہم ہر شنبہ کی رات کو لنڈن کے بہترین علاقہ "ویسٹ اینڈ" میں نئے نئے فیشن کے نظارے اور جگمگاتی ہوئی دکانوں کی سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ باقر کو "ورائٹی شو" دیکھنے کا شوق زیادہ ہو چلا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے پرنس آف ویلز تھیٹر THEATRE جانا ہمارے پروگرام کا اہم عنصر بن گیا۔

ان تفریحات سے فارغ ہو کر ہم پکاڈلی کے ایک خوبصورت رسٹورانٹ کی تحت الارض منزل میں جہاں اکل و شرب، در و دیوار کے نظارے۔ روشنیاں اور فانوس اور مطربوں کے ملبوسات ہسپانوی طرز اور فیشن کے ہوتے تھے فروکش ہو جایا کرتے۔ اور نصف شب تک گرمیٔ محفل سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

ہر چند کہ محمود اور باقر نے لنڈن کے مشہور مقامات اور دیدہ و دل کی ضیافت کے سامان دیکھ لئے تھے۔ لیکن بال روم ڈانس کے وہ تاحال شاہد نہ تھے۔ حسن اتفاق سے اس کی نوبت بھی جلدی آگئی۔ مغربی لنڈن کی مشہور رقص گاہ "ہیمرسمتھ پیلس (HAMMERSMITH PALACE) میں سینٹ ویلنٹائن ڈے (ST VALENTINE DAY) کی تعطیل میں ... کو وسیع پیمانہ پر "کارنیوال ڈانس" کا اہتمام کیا گیا۔ اس دن کے متعلق پرانی روایت چلی آتی ہے۔ کہ دوشیزہ لڑکی کو اپنا "نصف بہتر" اور "ناکتخدا لڑکے" اپنی "رفیقۂ حیات" منتخب کرنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ اس رقص کی ایک اور دلکشی یہ بھی تھی۔ کہ لنڈن کے مشہور و معروف مطرب ایمبروس AMBROSE اور اس کا آرکیسٹرا منگوایا گیا۔ اور آرکیسٹرا کے ساتھ ایک گانے والی لڑکی تھی جس کا نام ای ولین ڈیل (EVELYN DALE) تھا۔ ایوان رقص کی مشہوری، آرکیسٹرا کی ہر دلعزیزی اور ای ولین کی آواز اور حسن کی شہرت سن کر ہم بھی گئے۔

ہیمرسمتھ پیلس ایک وسیع ہال تھا جس کے صرف فرش پر تقریباً پچاس ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ یہ فرش نہایت قیمتی اور نایاب لکڑی کا تھا۔ بڑے بڑے ہنرمندوں اور باکمالوں کو اس فرش پر رقص کا شوق لنڈن کے مضافات سے کشاں کشاں لے آیا کرتا تھا۔ اس رات رونق انتہا سے زیادہ تھی۔ ایوان کی چھت پر بے شمار بلوریں جھاڑ فانوس، جھنڈیاں اور غبارے لٹک رہے تھے۔ فرش کو خوشبودار اور پھسلنا بنانے کے لئے پاؤڈر چھڑکا گیا۔ تاکہ ناچنے والے اور ناچنے والیاں آسانی سے مچھلیوں کی طرح تیر کر نکل جائیں ہم میں سے کوئی بھی رقص نہیں جانتا تھا۔ تاہم جب ہم ایوان رقص میں پہنچے۔ تو وہاں کی شمع طراز لڑکیوں کے جلوے۔ ان کی زرق برق پوشاکیں مختلف رنگوں کی روشنیاں اور مسرور اور معطر فضا دیکھ کر ہمیں بھی رقص کی بے تحاشا ترغیب ہونے لگی۔

یکایک بینڈ کے بجتے ہی مشتاق جوڑے فرش پر نکل آئے۔ اور بینڈ کی تال پر تھرکنے اور گھومنے لگے ہمارے سامنے حسن، موسیقی، روشنی رنگ، خوشبو اور زندگی کی پریڈ ہو رہی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہال ساغر مے کی طرح گھوم رہا ہے ہم کرسیوں پر بیٹھے اس سین کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ جب پہلا ڈانس ختم ہو گیا۔ تو محض ہمدردی کے خیال سے

ریاض نے باقر سے پوچھا۔

"کہو اس بال روم ڈانس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

باقر تاریخ کا ماہر تھا۔ اس نے رقص کی تاریخ قبل مسیح سے بیان کرنی شروع کی اس عرصہ میں دوسرا رقص شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہوگیا لیکن باقر کا مضمون طویل ہوتا گیا۔ محمود باقر کی تقریر سے سراسر بے التفات ہو رہا تھا۔ اور جب تیسرا رقص شروع ہوا تو وہ اس کے نظارے میں پھر مستغرق ہوگیا میں نے اس کا ذوق وشوق دیکھ کے ریاض سے کہا۔

"ہاتھوں کے طوطے اڑنا اس کو کہتے ہیں۔"

ریاض مسکرایا۔ مگر محمود تصویر بنا بیٹھا رہا۔ ریاض نے محمود کو متوجہ کرکے کہا۔

"حضرت بلبل کی موہوم امید پر آپ نے طوطے کیوں اڑا دیئے۔ کچھ تو پاس رکھا ہوتا۔" ہم سب ہنس پڑے۔

ہماری اس مداخلت سے باقر کو رقص کی ہسٹری ناتمام چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ اس نے پلٹ کر محمود سے اس کا بدلہ لے لیا۔

"تمہاری بے لبی اور سکوت دیکھ کے مجھے مصر کا ابوالہول یاد آتا ہے۔" ہم پھر ہنسنے لگے۔ اس دفعہ محمود بھی مسکرایا۔ ہم اسی دل لگی میں مشغول تھے کہ دفعتہً

ای وین نقرئی لباس میں اچک کر بینڈ کے سامنے آکھڑی ہوئی یہ معلوم ہوا کہ آسمان سے ستارہ ٹوٹ کر زمین پر آگیا ہے۔ اس کے بال بجلی کی روشنی میں مقیش کے تاروں کی طرح جھلملاتے تھے۔ اس کے جسم پر دو ہی چیزیں سرخ تھیں۔ ایک اس کے لب، دوسرے اس کے ناخن۔ ورنہ وہ سرتاپا چاندی کی لعبت نظر آتی تھی۔ لیکن جب وہ گانے لگی۔ تو بیسویں صدی کا معجزہ صادر ہونے لگا۔ یعنی چاندی پارہ بن گیا اور لعبت شعلۂ جوالہ۔

ایوان رقص میں کہرام مچ گیا۔ لوگ رقص بھول گئے اور ای ڈلین کے گرد جمع ہوگئے۔ جیسے حاتم کے دروازے پر حاجت مند۔

یہ دیکھ کے محمود بھی کرسی سے اٹھ کر سٹیج کی طرف چل دیا۔ ریاض نے ہنستے ہوئے آواز دی "حضرت یہ عدم تعاون ہم سے کس جرم کی پاداش میں ہے۔"

محمود اپنی جلد بازی پر خفیف ہوا لیکن میں غالب کا فتویٰ لیکر فوراً اس کی اعانت کو پہنچا "اے شوق یاں اجازت تسلیم دہوش ہے" محمود میری وکالت سے مطمئن ہوگیا۔ بالآخر ہم ناظرین اور سامعین کے حلقہ میں جا کھڑے ہوئے۔ اور آتش عذار اور آتش نفس ای ڈلین کا کرشمہ دیکھنے اور گانا سننے لگے۔

کبھی وہ عاشقانہ انداز میں جھک جاتی اور تعظیم بجا لاتی۔ اور کبھی وہ معشوقانہ ناز سے تن جاتی۔ جیسے دنیا اسی کے نیم غمزہ کی خیرات پر پل رہی ہے۔ کبھی وہ سہم جاتی جیسے گستاخ نگاہوں سے شرما گئی ہے۔ اور کبھی بپھر کر ابھرتی جیسے حملہ کرنے لگی ہے۔ کبھی وہ اس طرح لپکنے لگتی۔ جیسے شرابی میکدے کے دروازے پر ساقی کو اشیر باد دے رہا ہے۔ اور کبھی اسی طرح لہلہاتی۔ جیسے نسیم صبح گاہی سے شمع کا ارتعاش۔

جب وہ ارمان بھری آواز میں عشرت وصل کی آرزو بیان کرتی۔ تو فردوس اس کے چہرے پر ہویدا ہوجاتا۔ اور جب وہ حرمان نصیبی کا شکوہ کرتی۔ تو سننے والوں کے دل شدت الم سے پھڑکنے لگتے۔ وہ گاتی تھی۔ تو مسکراتی جاتی تھی۔ وہ مسکراتی تھی تو تڑپتی جاتی تھی۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ موسیقی کے آتشکدے میں سیماب قائم النّار لرزاں کا سانپ وجد ذوق میں تڑپ رہا ہے۔

باقر کو ایک باریک بینی اور معنی آفرینی کی عادت زیادہ تھی۔ اور نیز رقص وسرود کی محفل میں یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ چنانچہ جب گانا ختم ہوگیا۔ تو میں نے اس کے تاثرات سے مطلع ہونا چاہا۔

"تمہارے ذہن میں اس زندہ خواب کی تعبیر کیا ہے؟"

محمود عالم تحیر سے بیدار ہوچکا تھا۔ اس نے پیش لفظی کی۔ اور باقر کی طرف سے طنز یہ جواب دیا۔

"حضرت ایسی نائٹ میئر (ڈراونا خواب) تو ہم نے ساری عمر نہیں دیکھی تھی۔

یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا مگر باقر نے بڑی سنجیدگی سے میری بات کا جواب دیا۔

"کامران حسن اور موسیقی پر کون حرف گیر ہوسکتا ہے؟"

جب میں باقر کے اس خیال کی تعریف اور تائید کر رہا تھا تو ریاض نے ہم دونوں کی طرف لطیف اشارہ کیا

"محمود ملاحظہ کیا تم نے حسن اور موسیقی انسان کو کس قدر عالی ظرف بنا دیتی ہے؟"

یہ سن کر ہم سب نے قہقہے لگائے۔ محمود نے کہا۔

"بے شک مگر باقر کی یہی حالت رہی تو ہمیں اس کی بیوی کو شکایت نامہ لکھنا پڑے گا۔"

محمود اپنے اعمال نامہ کو باتر پر چسپاں کر رہا تھا۔ مذاحیہ گفتگو کو دعوت دینے کا یہ اس کا ایک طریقہ تھا جس کا باتر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

رات کے بارہ بجے بینڈ نے قومی گیت "یارب رہے سلامت فرماں روا ہمارا" بجایا اور عیش ونشاط کی کتاب کو تہ کر دیا۔

جب ہم ہیمر سمتھ پیلیس سے باہر نکل رہے تھے۔ تو ای ولین سفید سمور کا کوٹ پہنے بڑی تیزی سے ہمارے پیچھے سے آئی اور بینڈ کے لیڈر ایمبروس کے ساتھ ایک عالیشان کار میں بیٹھ کر نکل گئی۔ یہ معلوم ہوا جیسے وہ جاتی ہوئی ایوانِ رقص کے چراغ گل کر گئی ہے۔ محمود یہ دیکھ کر ادل تو ساکت رہ گیا۔ پھر عجب وارفتہ حالی سے یہ شعر پڑھا ؎

"نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی"۔

دوسرے مصرعہ میں ہم چاروں یک زبان ہو گئے۔

"جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں"۔

یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب لنڈن پر آگ برسنے کی بجائے امن و آشتی کی ہوا چلتی تھی۔

کامران الماس

مقرر سے!

[یہ نظم فرانسیسی شاعری کی ایک فارم "ترائیلیٹ" (TRIOLET) میں کہی گئی ہے۔ ترائیلیٹ کے علاوہ دیگر بے شمار قاعدے ہیں۔ جو فرانس کے دربار کے زیر اثر پروان چڑھے۔ ان میں ایک خاص قسم کی موسیقی سادگی اور رنگینی ہوتی ہے۔ ایک مصرعہ بار بار کچھ ایسے انداز سے دہرایا جاتا ہے کہ ان مختصر بولوں میں بہت لطیف سا ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ اردو میں نت نئے اسالیب بیان پیش کرنے کے مدنظر میں نے اس میدان میں اس حالت میں قدم رکھا ہے۔ کہ مجھے اس کی افقی دھندلاہٹوں میں بے شمار رنگینیاں رقص کناں دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ نئی راہ سجھانے کے لئے میں بھائی محمد حسن عسکری کا مرہونِ احسان ہوں۔ ندیم]

کاروانِ زندگی

زیست اک کاروانِ نادیدہ
جس کی منزل ہے کہکشاں سے دُور
ننھے بچّوں کا خواب ژولیدہ
زیست اک کاروانِ نادیدہ
غم بھری داستانِ بوسیدہ
جس کے کردار ہیں تھکن سے چور
زیست اک کاروانِ نادیدہ
جس کی منزل ہے کہکشاں سے دُور

احمد ندیم قاسمی

اقبال

جدید شاعری پر تعمیری

گذارش۔ ان مقالات پر رائے زنی کرنے والے اصحاب کی خدمت میں التماس ہے ابتدائی مقالات میں سے کسی ایک کو انفرادی حیثیت سے نہ دیکھیں بلکہ ہر اشاعت آئندہ

تصحیح گذشتہ مقالہ میں بعض جگہ **نکستہ نظر** لکھا گیا اسے **نقطہ نظر** پڑھیں۔ **تعلیم** الفاظ کے بعد "تعلم کی کسی ایک قسم کی عمر سو سال سے تجاوز نہیں کر سکی۔ — یہ فقرہ ایزاد حس میں وہ ابتدائی مراحل میں رہی اور نہ ہی وہ مدت شامل ہے جس میں وہ رفتہ رفتہ انحطاط پذیر رہ

مجلس اول

مقالہ دوم

منظوم بوالعجبیان۔ مقالہ گذشتہ میں ایک نظم بعنوان "دھوکا" دی گئی تھی اور اس سے اس تلخ حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ کہ جدید شاعری میں ہیئت شعری کی ساخت کا معاملہ ابھی تک خام کاروں کے ہاتھ میں ہے۔ نظم آزاد کے ماتحت چھوٹے بڑے مصرعے بغیر کسی وجہ جواز کے ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور بعض وقت تو شاعر مضحکہ خیز آزادی سے کام لیتا ہے بہت سی نظموں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک مصرعے کے دو ٹکڑے کرکے دو مصرعے اس طرح پر بنا دیئے گئے ہیں۔ کہ دوسرا مصرعہ حرف جار سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً غالب کے اس مصرعے کو "نہ کھینچو تم جو دامن کو کشاکش درمیان کیوں ہو" نئے ادب کا علمبردار یوں لکھ دیگا

نہ کھینچو تم جو دامن
کو کشاکش درمیاں کیوں ہو'

یہ محولہ نظم "دھوکا" میں ہی ملاحظہ فرمایئے۔
"آگئی سب کی آنکھ بچا کر
اندر"
اور "اپنی اس تصویر کی کرلی
چوری"

جدید شاعری میں ہیئت کی منظوم بوالعجبیاں آپ کو بکثرت ملینگی ہیئت سے قطع نظر کرکے اگر آپ جدید ادبی نمونوں میں نفس مضمون پر غور کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ انگریزی

جدید شاعری میں اب اس عیب نے ہنر کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اور یہ چیز ایک خوبی بن کر اردو نظم میں آرہی ہے کہ ماحول یا احساس یا جذبہ کے ماتحت مصرعے کو چھوٹا بڑا کر دیا جائے۔

مثال کے طور پر مسٹر قیوم نظر کی نظم "تھکن" میں یہ تین مصرعے دیکھئے۔

"تھم گئی ہے شعلہ پرور دن کے محشر خیز ہنگاموں کی جوئے تند رَو
رفتہ رفتہ بہتے بہتے اپنی منزل کے سکوت مضمحل کی چھاؤں میں
تاب جنبش ہی نہیں بے کیف تنہائی کی زنجیروں سے بوجھل پاؤں میں

تھکا ہوا درماندہ شاعر منزل کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن اس کا قدم نہیں اٹھتا۔ انتہائی تکان کی وجہ سے ٹانگیں ایک مریض کی نکاہت کو دامن میں لئے ہیں اور مصرعے کالبنان خود شاعر کے احساس بیچارگی کا حامل ہے۔ رفتار کی تیزی ظاہر کرنے کے لئے مصرعے ہمیشہ مختصر اور چست ہونے چاہئیں۔ اس کی بہترین مثال "آب لوڈ ور" ہے

ایک ہی نظم میں مصرعوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی مثال آپ کو نظم "دھوکا" میں مل چکی ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے ہم مصرعوں کو خارج از بحر نہیں کہتے۔ بلکہ ان کو جائز سمجھتے ہوئے تنقید کو صرف اس بات پر مرکوز کرتے ہیں کہ شاعر کامیابی سے ایسا کر سکا ہے یا نہیں۔

طریقہ دوم یعنی مروجہ ہیئیات میں ترمیم و تحریف سے ایک نئی ہیئت قائم کرنے کے متعلق انگریزی ادب میں سولھویں صدی کے شاعر سپنر کی مثال لیجئے۔ اس کے زمانے سے پہلے ایک خاص بند موجود تھا۔ اس نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسے اپنا لیا۔ اور اب وہ ترمیم شدہ بند سپنسری بند کے نام سے معروف ہے (اردو دان اصحاب کے لئے اس کی تفصیل غیر ضروری ہے)

اردو ادب میں یہ چیز مطلقاً موجود نہیں ہے ہمارے شعرا نے شعر کی پرانی اصناف کو خیرباد کہہ دیا اور کسی ایک نے بھی کوشش نہیں کی۔ کہ ان پرانی اصناف کو کسی نئے رنگ میں پیش کیا جائے۔

میں نے خود تجرباتی طریقے پر سات مصرعوں کی ایک نظم وضع کی اور اس میں قافیہ کا بھی ایک خاص انداز ملحوظ رکھا۔ جو یہ ہے۔ مصرعہ نمبر ۱ و ۳ و ۵ ہم قافیہ۔ مصرعہ نمبر ۲ و ۴ ہم قافیہ اور اخیر پر دو ہم قافیہ مصرعے یعنی تمام نظم میں تین قسم کے قوافی ہیں۔ ایک نظم ملاحظہ ہو

میرے صبح و شام کو۔۔۔۔۔۔
اے کہ میری خامشی کے راز کا جویا ہے تو
میرے اس کہنہ خرابے پر جو آئی شام دیکھ
جو رہا ہے دیدۂ گریاں سے پھر دل کا لہو

محمود اپنے اعمال نامہ کو باقر پر چسپاں کر رہا تھا۔ مذاحیہ گفتگو کو دعوت دینے کا یہ اس کا ایک طریقہ تھا جس کا باقر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

رات کے بارہ بجے بینڈ نے قومی گیت "یارب رہے سلامت فرماں روا ہمارا" بجایا اور عیش و نشاط کی کتاب کو تہ کر دیا۔

جب ہم ہیمر سمتھ پیلیس سے باہر نکل رہے تھے۔ تو ای ولین سفید سمور کا کوٹ پہنے بڑی تیزی سے ہمارے پیچھے سے آئی اور بینڈ کے لیڈر ایمبروس کے ساتھ ایک عالیشان کار میں بیٹھ کر نکل گئی۔ یہ معلوم ہوا جیسے وہ جاتی ہوئی ایوان رقص کے چراغ گل کر گئی ہے۔ محمود یہ دیکھ کر اداس

مقرر

(یہ نظم فرانسیسی شاعری کی ایک فارم "ترائیلیٹ" (TRIOLET) میں فرانس کے دربار کے زیر اثر پروان چڑھی۔ ان میں ایک خاص قسم کی موسیقی دہرایا جاتا ہے کہ ان مختصر بولوں میں بہت لطیف سا ترنم پیدا ہو جاتا۔ اس میدان میں اس حالت میں قدم رکھا ہے۔ کہ مجھے اس کی ابھی دھندلا نئی راہ سمجھانے کے لئے میں بھائی محمد حسن عسکری کا مرہون احسان ہوں

کاروان

زیست اک کارواں
جس کی منزل ہے
ننھے بچوں کا خواب
زیست اک کارواں
غم بھری داستاں
جس کے کردار ہیں تھے
زیست اک کارواں
جس کی منزل ہے کہ

کی کوئی موزوں و مناسب شاخ ابھی تک نہیں ملی

جدید شاعری میں آج کل صرف تین اصناف سخن رواج پا رہی ہیں ایک تو Blanverse جسے نظم بے قافیہ یا نظم معرا کہہ کر عوام سے متعارف کیا جا رہا ہے۔ دوسرے ایسی نظمیں جن میں قافیہ تو خواہ ہو یا نہ ہو لیکن ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ان میں مصرع چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کو نظم آزاد کا نام دیا گیا ہے اور تیسرے وہ نظمیں جن میں کہیں کہیں قافیہ کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔

نظموں کی یہ تقسیم قطعی نہیں ہے۔ بسا اوقات نظم معرا میں نظم آزاد کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اور بعض اوقات نظم آزاد میں قافیہ کی موجودگی پائی جاتی ہے غرضیکہ تینوں اصناف سخن ایک دوسرے سے اس طرح مختلف نہیں ہیں جس طرح غزل، رباعی سے یا قطعہ مسدس سے۔ ہیئت شعری کو ابھی تک کسی خالق کا انتظار ہے۔

ہیئت شعری۔ پرانی شاعری اب پر تول رہی ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ شاخ اردو پر دوسرے طیور بسیرا لینگے۔ نوجوان طبقہ ان فرسودہ مضامین اور کہنہ انداز بیان سے جو مدتوں سے چلے آ رہے ہیں، اکتا چکا ہے۔ اب اسے ادب کے دسترخوان پر کسی دوسرے قاب کی تلاش ہے۔

ایک نئی ہیئت شعری کو پبلک سے متعارف کراتے وقت شاعر کو دو گونہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سے پہلے شاعر کے سامنے کوئی مثال کسی نظم پابند کی یا بحر کی صورت میں موجود نہیں ہوتی جس کے سہارے وہ اپنی ادبی جدت کو پیش کر سکے شاعر اپنی ادبی کاوش کے نتیجہ کو اس کی اپنی خوبیوں کے بل پر بازار میں رکھتا ہے اور اگر ذوق سلیم اور حسن طبع نے شاعر کی رہنمائی کی ہو۔ تو ایسے اپنی جنس کے خریدار مل جاتے ہیں ورنہ شاعر کے اشعار شاعر سے پہلے مر جاتے ہیں۔

دوسری مشکل جو شاعر کو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے اپنے ادبی نمونوں کے لئے عوام میں مذاق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور مذاق پیدا کر دینے کے بعد اسے اس مذاق کو برقرار رکھنے کے لئے اور بھی زیادہ جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ شاعر اپنی ذہنی تخلیق کے قوپ کو عوام کے کام و دہن سے آشنا کرنے کے بعد اور یہ دیکھنے کے بعد کہ وہ فی نفسہٖ انہیں پسند ہے۔ اس خاص شئے کو اس طریقے پر پیش کرتا جائے۔ کہ انہیں اس کی چاٹ پڑ جائے صرف اس مرحلے پر پہنچکر ہی ایک خاص ہیئت شعری ادب میں مستقل حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔

حالی مرحوم نے اردو شاعری میں ایک نئی طرح ڈالی لیکن بعد میں وہ عوام کی توقعات کے مطابق پورا نہ اتر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان کی شاعری محض تاریخی حیثیت سے اہم ہے حقیقی لحاظ سے قابل تحسین نہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری میں جس سادگی الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ورڈز ورتھ کی سادگی الفاظ ہے

جو جگہ جگہ بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے سیاسی شاعری میں مزاحیہ طنز کا طریقہ اختیار کیا اور اس خوبصورتی سے اسے نباہا کہ وہ اپنے حلقے میں الگ نظر آرہے ہیں۔

اقبال مرحوم نے ایک نیا پردہ لے کر اس پر تصویر کشی شروع کی اور خود ہی اس کی تکمیل کر گئے۔ اور اب نئی نسل اس پردۂ تصویر کو دیکھ دیکھ کر نقل اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انگریزی ادب میں سپنسر نے جو کہ سولھویں صدی عیسوی کا ایک عالم شاعر گذرا ہے۔ ایک نئی قسم کا بند وضع کیا۔ جو مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ اور سپنسری بند کے نام سے معروف ہوا۔ اس کے بعد مختلف شعرا نے اسی بند میں نظمیں لکھیں۔

توضیع ہیئت شعری۔ ہر زبان کے ادب میں کوئی نئی ہیئت شعری قائم کرنے کے لئے جدت پسند طبقے کے سامنے صرف تین راہیں ہوتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ پرانے نمونوں کو کانٹ چھانٹ کر یا ان پر پیوند لگا کر انہیں اس طرح بدل دیا جائے کہ انہیں اپنے آبا و اجداد سے کوئی وجہ مناسبت ہی نہ رہے دوسری یہ کہ صحیح ذوق رکھنے والے شعرا خود نئے بند وضع کریں یا قافیہ کی کسی خاص ترتیب سے ایسی قسم کی نظم ایجاد کریں جو پہلے موجود نہ ہو۔ اسے قبول عام کی سند حاصل ہونا یا نہ ہونا اور بات ہے۔

تیسری یہ کہ دوسری زبانوں کے ادب سے استفادہ کیا جائے اور ان کی مروجہ ہیئات کو اپنی زبان میں متعارف کرایا جائے

(ان ہر سہ موضوعات پر مفصل بحث مختلف مقالات میں دیکھئے)

جہانتک طریقۂ اولیں کا تعلق ہے یعنی مروجہ جو اور بند وغیرہ میں ترمیم و تحریف کر کے ایک نئی بحر یا نیا بند ادب میں لایا جائے۔ انگریزی ادب میں اس کی مثالیں کبثرت دستیاب ہو سکتی ہیں۔ انگریزی نظموں میں یہ بات عام دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک بحر کے ارکان میں کسی اور بحر کا ایک رکن شروع میں یا اخیر میں یا درمیان میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ محض ایک ہی بیان کی جاتی ہے۔ اور وہ ہے تنوع پیدا کرنا یعنی وہ لوگ اتنے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں کہ کسی ایک نظم کے تمام مصرعوں میں ترنم کی یکسانیت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پرانے ادب میں مثنوی کو ہی لیجئے شاہنامہ میں ہزارہا اشعار ایک ہی بحر میں لکھے گئے ہیں۔ اور انہیں پڑھتے پڑھتے ہم ان کے ترنم کی یکسانیت سے مطلقاً نہیں اکتاتے اور یہ اصول ناقابلِ تنسیخ طریقہ پر رواج پا چکا ہے کہ کوئی ایک نظم یا مسدس یا غزل شروع سے اخیر تک ایک ہی بحر میں لکھی جائے اور کسی ایک مصرعے کا بحر سے خارج ہو جانا عروض کی ناقابل معافی غلطی تصور ہوتا ہے۔

جدید شاعری میں اب اس عیب نے ہنر کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اور یہ چیز ایک خوبی بن کر اردو نظم میں آرہی ہے کہ ماحول یا احساس یا جذبہ کے ماتحت مصرعے کو چھوٹا بڑا کر دیا جائے۔

مثال کے طور پر مسٹر قیوم نظر کی نظم "تھکن" میں یہ تین مصرعے دیکھئے۔

"تھم گئی ہے شعلہ پرور دن کے محشر خیز ہنگاموں کی جوئے تندرو
رفتہ رفتہ بہتے بہتے اپنی منزل کے سکوت مضمحل کی چھاؤں میں
تابِ جنبش ہی نہیں بے کیف تنہائی کی زنجیروں سے بوجھل پاؤں میں

تھکا ہوا درماندہ شاعر منزل کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن اس کا قدم نہیں اٹھتا۔ انتہائی تکان کی وجہ سے ٹانگیں ایک مریض کی نکاہت کو دامن میں لئے ہیں اور مصرعے کا لبنان خود شاعر کے احساس بیچارگی کا حامل ہے۔ رفتار کی تیزی ظاہر کرنے کے لئے مصرعے ہمیشہ مختصر اور چست ہونے چاہئیں۔ اس کی بہترین مثال "آب لوڈ ور" ہے

ایک ہی نظم میں مصرعوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی مثال آپ کو نظم "دھوکا" میں مل چکی ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے ہم مصرعوں کو خارج از بحر نہیں کہتے۔ بلکہ ان کو جائز سمجھتے ہوئے تنقید کو صرف اس بات پر مرکوز کرتے ہیں کہ شاعر کامیابی سے ایسا کر سکا ہے یا نہیں۔

طریقہ دوم یعنی مروجہ ہیئات میں ترمیم و تحریف سے ایک نئی ہیئت قائم کرنے کے متعلق انگریزی ادب میں سولھویں صدی کے شاعر سپنسر کی مثال لیجئے۔ اس کے زمانے سے پہلے ایک خاص بند موجود تھا۔ اس نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسے اپنا لیا۔ اور اب وہ ترمیم شدہ بند سپنسری بند کے نام سے معروف ہے (اردو دان اصحاب کے لئے اس کی تفصیل غیر ضروری ہے)

اردو ادب میں یہ چیز مطلقاً موجود نہیں ہے ہمارے شعرا نے شعر کی پرانی اصناف کو خیرباد کہہ دیا اور کسی ایک نے بھی کوشش نہیں کی کہ ان پرانی اصناف کو کسی نئے رنگ میں پیش کیا جائے۔

میں نے خود تجرباتی طریقے پر سات مصرعوں کی ایک نظم وضع کی اور اس میں قافیہ کا بھی ایک خاص انداز ملحوظ رکھا۔ جو یہ ہے۔ مصرعہ نمبر ۱ و ۳ و ۵ ہم قافیہ۔ مصرعہ نمبر ۲ و ۴ ہم قافیہ اور اخیر پر دو ہم قافیہ مصرعے یعنی تمام نظم میں تین قسم کے قوافی ہیں۔ ایک نظم ملاحظہ ہو

میرے صبح و شام کو ......
اے کہ میری خامشی کے راز کا جویا ہے تو
میرے اس کہنہ خرابے پر اترتی شام دیکھ
بہ رہا ہے دیدۂ گریاں سے پھر دل کا لہو

حسن کی پوجا کا' آکر' قرمزی انجام دیکھ
ہمفت سراب زندگانی' لغف مآلِ آرزو

انتہا کی لذتِ امید دلوا دے کوئی
میرے صبح شام کو پھر تیکھے لوٹا دے کوئی

ہمارے نوخیز شعرا میں ابھی تک اس قسم کی تجرباتی مساعی کے شوق کا فقدان ہے جہاں تک طریقۂ سوم یعنی غیروں کے ادب سے خوشہ چینی کا سوال ہے ہر زبان میں ادہر عہد میں ایسا ہوتا آیا ہے۔ اور یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے احتیاط صرف اس بات میں لازم ہے۔ کہ کسی دوسری زبان کے اصناف سخن میں سے کسی ایک کو ہم بجنسہ اور بغیر کسی قسم کے ردوبدل کے اپنی زبان میں نہیں لاسکتے۔ کیونکہ نظم کی ایک قسم جس زبان یا قوم یا ملک سے متعلق ہوتی ہے۔ اس میں اس زبان کی خصوصیات الفاظ' محاورہ' تراکیب۔ اس قوم کی طبائع کے رجحانات اور اس ملک کی جغرافیائی اور سیاسی خصوصیات کا پورا پورا رنگ ہوتا ہے۔ اور اسے بجنسہ کسی دوسری زبان یا دوسرے ملک میں لا بٹھانا اس طرح ہے جس طرح افریقہ کے تاریک جنگلوں میں رہنے والی ایک حبشی عورت کو لندن کے بازاروں میں چھوڑ دیا جائے یا کسی سمور پوش اسکیمو کو اسی ہیئت کذائی میں عرب کے جہنم بداماں ریتیلے صحراؤں میں مسکن دیدیا جائے۔

دوسری زبانوں کے اصناف سخن میں سے کسی ایک کو اپناتے وقت اس میں قطع و برید ایک ضروری امر ہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدید شاعری میں انگریزی کی (Blank Verse) اور sonnet نئے آ چکے ہیں۔ (Blank Verse) کے لئے تو شعراء نے نظم معرا کا نام تجویز کر لیا ہے لیکن sonnet کے لئے ابھی تک کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا۔ اسے سانیٹ ہی لکھا جاتا ہے۔ جس طریقے پر نظم معرا اور سانیٹ کو اردو شاعری میں ہم سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔ وہ کچھ زیادہ قابل ستائش اور قابل قبول نہیں ہے۔ کیوں؟

(اس پر مفصل بحث ہم ایک علیحدہ مقالے کے لئے محفوظ رکھتے ہیں جو وقت کی رفتار سے آپ کے سامنے آجائیگا)

قیصر جمشید واصل بی۔اے

مدیر معاون

محبّت

محبت آپ ہوتی ہے محبت کی نہیں جاتی
مگر بدنام کرتے ہیں محبت کرنے والے کو
گرا دیتے ہیں نظروں سے وفا پر مرنے والے کو
اسے بدنام کرتے ہیں اسے دشنام دیتے ہیں
حیاتِ سرمدی کو موت کا پیغام دیتے ہیں
ملا تھا خلد میں پہلا سبق اُلفت کا آدم کو
کہ یہ سمجھے حیاتِ جاوداں اس سوزِ پیہم کو
مگر دنیا محبت پر کبھی ایمان نہیں لاتی

محبت اک امانت ہے خدا کی قلبِ انساں میں
محبت روحِ انساں کیلئے اک خوابِ نورانی
جوارِ خلد کی نزہت ستاروں کی درخشانی
کہ جیسے حور رہتی ہو کوئی چھپکر گلستاں میں
محبت دل کی گہرائی میں اپنا گھر بناتی ہے
محبت آسمانی خواب کی تعبیر ہوتی ہے
محبت کائناتِ دہر کی تعمیر ہوتی ہے

ش۔ا۔ شمیم جالندھری

مازورا قرون وسطیٰ کی حسین عفریت تھی جس کے دو حربے تھے تبسم شیریں اور جام زہر۔ اور........ دونوں کارگر........ آخر

مازورا

کارشتۂ حیات پیچ در پیچ ہو کر اس قدر اُلجھ گیا کہ ناخن تدبیر نے اظہار عجز کر لیا۔ اور مازورا نے اپنی زندگی کی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کے لئے .... اسے کاٹ دیا

روم جس کو روم ابدی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اگر کبھی فن بت گری اور دیوتاؤں کی پُوجا کے عروج کا مرکز بنا۔ تو عین اس کے برعکس گناہ کی پرستش اور ظلم و فریب کا گہوارا بھی رہا ہے۔ اس کے نشیب و فراز دنیا کے کسی شہر کو نصیب نہ ہوئے ہونگے۔ یہ شہر کئی بار آباد ہو کر اجڑا۔ اس نے انسانی ضمیر کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالا یہی وجہ ہے کہ روم کی تاریخ تحقیق و تنقید کے لئے گوناگون دلچسپیوں کا مرقع ہے۔ اگر دسویں صدی عیسوی کے روم کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے۔ تو نیرو کا ظلم، نادرشاہ کا قتل وخون۔ قلوپیٹرا کی سنگدلی اس زمانے کے حالات کے سامنے ماند پڑ جائے گی۔

بعض مورخوں کے خیال کے مطابق یہ تاریخ انسانیت کا تاریک ترین عہد تھا۔ گو اس عہد کے حالات کا پتہ لگانا کچھ اتنا سہل نہیں۔ لیکن جو کچھ بھی تحقیق کی روشنی میں تاریخ عام کو میسر آ چکا ہے۔ وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ کہ پستی کے اعتبار سے اس وقت روم کی تاریخ بابل کے گھناؤنے اور تاریک مناظر سے زیادہ داغدار تھی۔

دسویں صدی میں اٹلی کی حکومت کسی ایک شخص کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اور یہ ملک ایسے مقتدر روسا اور نوابوں کی نذر ہو چکا تھا۔ جو اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں باہمی خانہ جنگیوں کا بازار گرم رکھتے تھے۔ یہ لوگ اٹلی کے جنوب میں بسنے والی عورتوں کے حسن کے بہت دلدادہ تھے۔ خود ان میں کوئی وصف نہ تھا۔ وہ پرلے درجہ کے نادان اور سوجھ بوجھ سے کوسوں دور تھے۔ نہ تو ان کا کوئی تمدن تھا۔ اور انہیں کسی تمدنی یا معاشرتی اصول کی چاہ تھی صرف صنف نازک کے حُسن اور عشوہ گری کا چسکا تھا اور بس۔

یہی مازورا کا عہد تھا جو اس زمانے کے ذی اقتدار امرا کی منظور نظر تھی۔ دنیا کی ذلیل ترین عورتوں کا دامن اتنا ناپاک نہ ہوگا جتنا مازورا کا تھا۔

گو حسب نسب کے لحاظ سے وہ ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی ماں تھانرہ نے ایک پادری سے شادی کر رکھی تھی لیکن تھانرہ کی زندگی بھی کئی ایک معاشقوں اور سازشوں سے خالی نہ تھی۔ عیسائیت محض برائے نام تھی۔ روم کا لاٹ بشپ جسے پوپ کہا جاتا تھا چند ایک ذی اثر امرا کی اغراض کا آلہ بنا ہوا تھا۔ وہ اسے جس وقت چاہتے۔ پوپ کی مسند پر بٹھا اور اتار دیتے وہ زمانہ ابھی بہت دور تھا۔ جب پوپ کی حیثیت براعظم کے روحانی پیشوا کی کی صورت اختیار کرنے والی تھی جب اسے بادشاہوں کی تقدیر کا خالق بننا تھا۔ اور وہ انہیں بے دین کہکر ملک بدر کرنے کا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہونے والا تھا۔

مازورا حسین تھی۔ اس کے خدوخال شہزادیوں کے سے تھے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی اور لبوں پر تبسم کھیلتا رہتا تھا۔ اس کے گداز لب اور مرمریں جسم اس کی جوانی کے بےمثل گوہر تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی ماں کے ذریعہ اٹلی کے مشہور شاہی خاندانوں کے افراد سے جس میں ٹسکنی کے شہزادے اور سپالٹو کے روسا بھی شامل تھے۔ گہرے مراسم پیدا کرلئے ٹسکنی کے شہزادے خانہ جنگیوں میں سب سے پیش پیش تھے۔ اسی وجہ سے سینٹ پیٹر کی گدی بھی انہیں کے اختیار میں تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے پادریوں کی معونات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خود ہی گدی کا جانشین مقرر کر دیا کرتے تھے۔

مازورا جانتی تھی کہ وہ نہایت حسین ہے۔ اس لئے وہ ایسے موقعہ کی تلاش میں تھی جب وہ اپنا اثر و رسوخ کو بروئے کار لائے۔ اس کے لئے مازورا نے گائیڈا سے شادی کرلی۔ جو ٹسکنی شہزادوں کی روح رواں تھا۔ اس کی آواز سارے روم کی آواز تھی۔ کوئی پوپ اس کے ارادوں کے خلاف پوپ کی گدی پر نہ بیٹھ سکتا تھا۔ وہ شادی ہوتے ہی مازورا کی جائز و ناجائز خواہشات کو پورا کرنے لگا یہاں تک کہ جب شادی کے چند دن بعد مازورا

نے اپنے عاشق سرگوس کو جو ایک ٹسکنی کونٹ کا بیٹا تھا۔ پوپ بنانا چاہا۔ تو اُسے بغیر کسی سیل وحجت کے انتخاب کر لیا گیا۔ انہی ایام میں پوپ کا اقامتی مکان دریائے ٹائبر کے مضبوط قلعے میں ہوا کرتا تھا۔ مازورا اور سرگوس نے یہ قلعہ اپنے عیش وعشرت کی آماجگاہ بنا لیا۔ پانچ سال کے بعد جبکہ وہ سرگوس سے ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ وہ اپنے عاشق سے دل برداشتہ ہوگئی۔ وہ کسی اور کی تلاش میں تھی۔ ایسے نوجوان کی جستجو میں جو سرگوس سے بھی زیادہ جاہ وحشمت کا مالک ہو۔ وہ محبت میں نیا رنگ بھرنا چاہتی تھی۔ ایسے شخص کی مدد سے جو مازورا کو پھر سے حسین کہے۔ اور اپنی انگلیوں کے لمس سے اس کی سرد آزرین رگوں میں گدگدی پیدا کر دے۔ سرگوس پُراسرار طریقے سے اچانک مر گیا لیکن کسی کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ مازورا زہریلی اشیاء کے مرکب بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

جب پادری سرگوس کی لاش کو دفنانے کے لئے قبرستان میں لائے۔ اور اس لئے بھی کہ آخری بار پوپ آنجہانی کی خدمت میں تعظیم بجا لائیں۔ تو مازورا نے تجہیز وتکفین کے متعلق تمام پادریوں سے صلاح ومشورے کرنے چاہے۔ دراصل ان سب باتوں سے اس کا مقصد اپنے اثر ورسوخ کے دائرے کو وسیع کرنا تھا۔ وہ ایک مرصع کرسی پر بیٹھی پادریوں کو اپنے سامنے ایک ایک کر کے گذرتے دیکھ رہی تھی۔ پادری اسے سلام کرتے۔ اور وہ تمکنت کے ساتھ سر کو ذرا جنبش دیتی اور دوسرے پادری کی طرف اشارہ کرتی۔ آخر کار ایک خوبصورت نوجوان پادری اس کے سامنے آیا۔ جس کی موجودگی نے مازورا کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا۔

"تمہارا نام" مازورا نے پُرشوق انداز میں پوچھا۔

"مجھے اناطیہ کہتے ہیں"! پادری نے خوفزدہ ہو کر جواب دیا۔

"تم کس عہدہ پر کام کرتے ہو"؟

"میں ایک معمولی پادری ہوں۔ جو حضرت پوپ آنجہانی کی خدمت میں مامور تھا۔ موت نے آج ہمیں اس طاقت کی یاد دلائی ہے جس کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے مگر جس کا سمجھنا ہمارے قیاس سے بہت دُور ہے"

مازورا کو زندگی اور موت کے فلسفہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے خواہشات کے لئے ایک نئی دنیا استوار کرنا چاہتی تھی۔

"اناطولیہ" مازورا نے نوجوان پادری کے نام کو دُہرایا۔۔۔ "اس سے پہلے بھی کئی پوپ اس نام کے ہو گذرے ہیں نا"؟

نوجوان پادری بڑا سمجھدار تھا۔ وہ تاڑ گیا کہ مازورا اسے غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے فوراً حالات کا جائزہ لیا۔ اور اپنی بیکسی کی داستان بیان کرنے لگا۔ وہ مازورا کے قدموں پر گر پڑا۔ اور اعتراف کیا۔ کہ وہ کئی سال سے اس کی پوجا کر رہا ہے۔ سرگوس کی زندگی اس کے لئے سدِ راہ تھی۔ اور اب وہ آزاد ہے۔ اور پکتے ہوئے پھل کی طرح کسی کے مشتاق ہاتھوں کا منتظر ہے! یہ باتیں جن میں جذبات اور خواہشات کا بے پناہ طوفان تھا۔ مازورا کو لبھا گئیں۔ وہ خود بے باک تھی اور اپنے چاہنے والوں میں بے باکی کے عنصر کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں نوجوان پادری کو مطمئن کر دیا۔ جو ایک روشن مستقبل کے انتظار میں دن گذارنے لگا۔

مازورا نوجوان پادری کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ایک معمولی پادری تھا۔ مازورا ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے کھلم کھلا وہ اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ ایک پست حیثیت ذات کے پادری سے اس کی محبت سماج کے اصولوں کے خلاف تھی۔ مازورا نے سوچا "وہ پادری کی قسمت کو بدل سکتی ہے۔ سرگوس کا جانشین بھی یہی نوجوان ہو سکتا ہے"

اگلے اتوار اناطیہ کو پوپ کا جانشین نامزد کر دیا گیا۔ مگر اناطیہ مازورا کی محبت میں ثابت قدم کس طرح رہ سکتا تھا۔ وہ پوپ بننے سے پیشتر ہی مازورا کی چھوٹی بہن نائرہ کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ اس کی چالوں کو بھانپ گئی "وہ دو دلوں سے فریب نہیں کر سکتا" اس نے کہا۔ یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو ناسور بنتا جا رہا تھا۔ مازورا کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ وہ اناطیہ کو اس کی مکاری کی سزا دے۔ یہ کام اس کے لئے بہت آسان تھا۔ وہ غضبناک شیرنی کی طرح جھپٹی اناطیہ کا وہی حشر ہوا جو سرگوس کا ہوا۔ اب پوپ اس کے لئے مٹی کے کھلونے تھے جنہیں وہ صرف انگلی کے اشارے سے بنا اور بگاڑ دیتی۔ وقت گذرتا گیا۔ یہاں تک کہ مازورا کا حسن بھی پھیکا پڑنے لگا۔ اس کے ارمان سرد ہونے لگے۔ اب وہ ادھیڑ عمر کی عورت بن چکی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام واقعات پر نظر ڈالی۔ جوں جوں، وہ گذرے ہوئے حالات پر غور کرتی۔ اس کے دل میں ڈر سا محسوس ہوتا۔ جب وہ یہ سوچتی۔ کہ اس نے بیشتر گناہ اپنی ہوس اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کئے۔ تو وہ حیران ہو کر سہم جاتی۔

جان سرگوس اب جوان ہو چکا تھا۔ یہ اس کی پہلی محبت کی یادگار تھی۔ "پوپ کا بیٹا پوپ ہی ہو سکتا ہے"! آج یہ خیال کئی بار اس کے دل میں آیا تھا جان سرگوس اس کا اپنا بیٹا تھا" اسے ضرور پوپ بننا چاہئے۔ وہ اس منصب کے لئے پیدا ہوا تھا" مازورا بولی۔ وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے آسمان کو بغور دیکھ رہی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور رات کے

سانپ نے زمین سے نکل کر دنیا کو تاریکی کی چادر پہنا دی تھی مازورا کو اپنی جوانی کے دن یاد آ رہے تھے "آہ! میں کبھی کتنی حسین تھی"۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر گیسوؤں کو سنوارنے لگی۔ اس نے گالوں کی پژمردگی کو مصنوعی طریقوں سے دُور کیا۔ وہ لباس زیب تن کیا جسے پہن کر وہ سرگرس سے ملنے جایا کرتی تھی۔ زہر آلودہ شراب کی بوتل لے کر وہ اس کام کے لئے چیل کی طرح جو اپنے ننھے ننھے بچوں کو معصوم چڑیوں کے خون سے پالتی ہے چلی۔ اور اپنی خادماؤں کے اُٹھنے سے پیشتر ہی گھر لوٹ آئی۔

پوپ کے مرنے کی خبر تمام شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی کئی افواہیں اُڑ رہی تھیں "شاید اس نے خودکشی کر لی ہے"۔ "نہیں وہ حرکتِ قلب کے بند ہونے سے مر گیا" "وہ دنیا سے بیزار تھا"۔ "اسے کسی دشمن نے زہر دے دیا ہے"۔ پوپ اناطیہ کی اچانک موت ایک معمہ بن گئی۔

مگر اس کی موت کا راز مازورا کے سوا کون جانتا تھا... جلد ہی سرگرس پوپ منتخب ہو گیا.....

آج مازورا کے دل میں سکون اور اطمینان تھا۔ گو وہ قاتل اور ظالم تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اتوار کوئی دور نہیں۔ پوپ۔ ہاں اس کا بیٹا جان سرگرس۔ وہ اس سے زندگی بھر کے گناہ بخشوائیگی حضرت مریم کے نام پر۔ وہ ضرور اپنے مظالم کا اعتراف کریگی۔ لاٹ بشپ کے روبرو۔ اپنے بیٹے کے روبرو۔ وہ اقبال کر لیگی کہ اس نے کون کون سے گناہ کئے کس کس کے ساتھ ظلم روا رکھا کس کس کو موت کی نیند سلا دیا۔ وہ ہوس پرست تھی... لوگوں کے جذبات سے کھیلنے والی"۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس کا تمام خون اس کے چہرے میں آ کر منجمد ہو گیا۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔

"کیا میں خدا کو بھی فریب دے سکوں گی؟" یہ کہہ کر وہ بے خود سی ہو گئی اس کے ہاتھ کسی چیز کو تلاش کر رہے تھے۔ وہی شراب جسے وہ اپنی زندگی کا عزیز ترین جزو بنا چکی تھی۔

وہ پھر چلائی۔ کل اور پرسوں۔ اتوار دور نہیں۔ وہ تمام گناہ بخشوائیگی۔ مازورا نے پیالے کو مُنہ لگایا۔ اور لگاتے ہی دھڑام سے نیچے گر پڑی۔ اس کی روح جسم سے پرواز کر کے فضا کی نامعلوم وسعتوں میں گم ہو گئی۔

مگر اتوار کا دن دُور نہ تھا کل اور پرسوں۔

منیر کمال بی اے (جالندھری)

انعامی افسانے — ہمارے قلمی معاونین توجہ فرمائیں — انعامی افسانے

ماہ مارچ کی اشاعت سے ہم انعامی افسانوں کا ماہوار سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ مبلغ دس روپے کا ایک انعام اس افسانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ جو ادارے کے نقطۂ نظر سے بہترین اور قابلِ اشاعت ہو۔ مبلغ پانچ روپے کا انعام دوسرے درجہ کے افسانہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ افسانے اور ان کا حق اشاعت "شاہکار" کی ملکیت متصور ہوں گے۔

ادارے کو حق حاصل ہے کہ موصول شدہ افسانوں میں سے چیدہ چیدہ افسانے مصنفین کو معاوضہ دیئے بغیر شائع کر دے ماہ مارچ کے لئے افسانہ کا پس منظر سدرشنؔ ہو۔ اور افسانے میں صرف کردار نگاری ہی نہ ہو بلکہ پلاٹ بھی ہو۔

شرائط

(۱) افسانہ اچھے خط میں فلسکیپ کاغذ کے ایک طرف لکھا جائے (۲) افسانہ کے خاتمے پر فرستندہ کا نام و پتہ مکمل و خوش خط لکھا ہوا ہو (۳) لفافے کی پشت پر جلی حروف میں "افسانہ برائے ماہ مارچ" تحریر ہو۔ (۴) تمام افسانے جو ماہ مارچ کے "شاہکار" کے لئے بھیجے جائیں۔ وہ دفتر ہذا میں ۲۰ فروری تک موصول ہو جانے چاہئیں۔

مہتمم "شاہکار" لاہور

حقائق

(۱)

دل ایسا کہ جو درد ذرا سہہ نہیں سکتا
وہ درد کی دُنیا میں کبھی رہ نہیں سکتا

اِس درد کی لذت سے جو محروم ازل ہو
وہ درد کے عالم کو بُرا کہہ نہیں سکتا

(۲)

بیدرد کو اس درد کی لذّت کی خبر کیا
کیا جانے خُذف کشتۂ کہ ہوتا ہے گہر کیا

سینے میں اگر دل ہی تو ہے درد بھی اس میں
پتھر پہ کہیں ہوتا ہے پانی کا اثر کیا

(۳)

اس درد کی دُنیا میں ذرا درد تو سہہ دیکھ
اس موج مقدس میں تو اک بار تو بہہ دیکھ

ہم جانگئی دل کا کہیں پول نہ کھل جائے
بن دیکھے بُرا درد کی دنیا کو نہ کہہ دیکھ

(۴)

میخانۂ ہستی کی ہے جو مے وہ یہی ہے
کچھ تیرا بنا سکتی ہے جو شے وہ یہی ہے

ناداں کوئی کیا جانے کہ یہ درد ہے کیا چیز
جس سے کہ امیں اپنی بقا ہے وہ یہی ہے

امین حزیں سیالکوٹی

غریب کا مال دنیا کی ملکیت ہوتا ہے۔ اولاد کا ورثہ نہیں ہوتا۔ اس کی دنیا اس کی اپنی دنیا نہیں ہوتی۔ اور

غریب کی بہلی

اس کی اپنی بہلی نہ تھی ..... گویا وہ ایک امانت تھی۔ جو دنیا نے واپس لے لی لیکن ..... واپس لینے کا طریقہ ذرا مختلف تھا.....

شام کا وقت قریب تھا سورج اپنی زرد کرنوں کی مدھم روشنی سے رات کے پھیلتے ہوئے دامن کو چاک کرنے کی سعی میں پسپا ہو رہا تھا۔ دریا کا کنارہ رات کے اندھیرے میں موت اور حیات کے درمیان حد فاصل بن کر حائل ہونے والا تھا۔ پانی کی گہرائیاں موت کی آماجگاہیں بننے کے لئے تہ در تہ تاریکیوں سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ لہریں ان گہرائیوں کو موت کی ہلاکت خیز پستیوں میں منتقل کرنے کے لئے بے قرار ہو کر خشکی کے رہنے والوں کو دعوت غرقابی دے رہی تھیں۔ اس منحوس گھڑی میں جبکہ دونوں وقت مل رہے تھے ایک بہلی دریا کے کنارے کنارے چلی آتی دکھائی دی۔ ایک شخص جس کے جسم کو چند ایک چیتھڑے بمشکل ڈھانپ رہے تھے۔ بہلی میں جتے ہوئے دو جانوروں کو ہانک رہا تھا۔ یہ دو جانور جو اس بہلی کو کھینچ رہے تھے۔ یک جنس نہ تھے۔ ایک بیل تھا دوسرا گدھا اور دونوں نہایت ہی لاغر۔ بڑھتے بڑھتے یہ بہلی پل کے قریب پہنچی۔ ہانکنے والے شخص نے اسے روک دیا اور دو پیسے محصول طلب کیا۔ بہلی والا اس مطالبے کی نوعیت کو سمجھ نہ سکا اور بہلی ہانکنے لگا لیکن سامنے ایک شہتیر نے راستہ روک رکھا تھا اور دو پیسے کی ادائیگی پر شہتیر کو ہٹا کر راستہ دیا جا سکتا تھا۔ بوڑھے بہلی والے کے پاس دو پیسے چھوڑ دو کوڑیاں نہ تھیں جو ادا کرتا۔ اس نے چار و ناچار بہلی پھر موڑ لی اور جدھر سے آیا تھا ادھر واپس ہو لیا۔ رات کی تاریکیاں زمین کے مساموں میں سے سیاہ بخارات کی طرح اٹھ اٹھ کر فضا میں لقیہ دھندلی سی روشنی کو محصور کرنے کے لئے غلیظ تر ہو رہی تھیں بوڑھا اسی دھندلکے میں کچھ دیر چلتا رہا حتیٰ کہ تاریکی کا غلبہ مکمل ہو گیا۔ اب راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بوڑھا رکا اور اپنی نشست سے نیچے اترا اس نے بہلی کے اندر سے ایک بھبکا نکالا۔ ممکن ہے کہ اس بھبکے کو کسی امیر کے گھر میں کسی وقت چلنے کا ٹین کہہ کر بھی پکارا گیا ہو لیکن اس وقت اس کی حالت خستہ تھی۔ وہ زنگ آلود بھی ہو چکا تھا۔ بوڑھا اس بھبکے کو لیکر دریا کے کنارے کی طرف چلا بہلی میں سے ایک بچے کی توتلی آواز آ رہی تھی۔ شاید اسی بچے نے پانی مانگا تھا۔ بوڑھا کنارے کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کا دل جذبات کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ خیالات جو اس کی روح کی پہنائیوں میں بادہ پیمائیاں کر رہے تھے۔ اس کے غیر تربیت یافتہ اور ناخواندہ ہونے کی وجہ سے غیر مشخص تھے۔ اس کا دماغ اگرچہ ان کو متشکل کرنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا لیکن ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔ رات کی تاریکی اس کو پرسکون معلوم ہوتی تھی۔ اسے اس قسم کے صدمات متعدد بار پہنچے تھے لیکن کبھی اس کو ان کا اس طرح احساس نہیں ہوا تھا جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔ اس کا دل گذشتہ تمام عمر کے صدمات کے اجتماعی اثر کے نیچے دب رہا تھا۔ وہ راحت اور سکون کا طلبگار ہو رہا تھا۔ اس کی ساری دنیا اپنی زندگی کے تجربات ہی تک محدود تھی۔ دھکے جھڑکیاں۔ گالیاں بیگار فاقے زد و کوب۔ موسم گرما اور سرما کی سختیاں اور ایسی ہی لاتعداد تلخیاں۔ وہ کنارے پر پہنچا۔ اور بے توجہی میں پانی لینے کے لئے جھکا۔ جھکا ہی تھا کہ کوئی بڑی سی چیز اچھل کر پانی سے باہر نکلی اور اسے گھسیٹتی ہوئی پانی کی چادر کے نیچے لے جا کر غائب ہو گئی۔ صرف ایک چیخ کی آواز سنسان فضا میں گونج پیدا کر کے لہروں کے شور و غوغا میں کھو گئی۔ بچے نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر رونے لگا۔ وہ روتے روتے کبھی رک جاتا اور خوف زدہ آواز سے "بابا بابا" کہہ کر پکارتا۔ اور جب کوئی جواب نہ ملتا تو پھر رونا شروع کر دیتا۔ آخر روتے روتے وہ سو گیا۔ رات تاریک تھی۔ لہروں کا شور تھا۔ جنگلی جانور متحرک سایوں کی طرح ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ درخت بھوتوں کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ اونچی اونچی گھاس میں سے تیز ہوا کی سرسراہٹ

سے سانپوں کے پھنکارنے کی آواز پیدا ہو ہو کر دلوں کو دہلا رہی تھی لیکن نیند اور موت توام بہنیں ہیں۔ نیند میں موت اکثر سر سے گذر جاتی ہے۔ اور سونے والے کو خبر تک نہیں ہوتی۔ یہ بچہ بے خبر سوتا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔ اور اس نے تیز کرنوں کے نشتروں کو بڑھا کر تاریکیوں کو پسپا کرنا شروع کیا۔ رات کی سیاہ چادروں میں شگاف پڑ گئے۔ اور پھر ہلکے جالے کی طرح نسیم سحر ان کو اڑا کرلے گئی۔ رات ختم ہوئی۔ دن کا آغاز ہوا۔ بچہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے بند مٹھیوں سے انہیں ملنا شروع کیا۔ اور ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ رونا بھی۔ جب اس کی آواز سن کر حسب معمول نہ تو کوئی اس کے پاس آیا اور نہ کسی نے آواز دی۔ تو اس نے چیخنا شروع کر دیا لیکن بھلا کبھی اس دنیا کی چیخ پکار اس دنیا میں بھی پہنچی ہے۔ اگر کبھی پہنچی ہوتی۔ تو پھر یہ نظام یہ صورت حالات۔ یہ اور وہ... گویا سب کچھ۔ یہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت نظام عالم ضرور بدل جاتا۔ بچے کی آواز کسی کے کان تک نہ پہنچی۔ وہ تھک کر پھر سو گیا۔ سورج جب ذرا اور ابھرا تو قریب کے گاؤں سے مویشیوں کا ایک گلہ آتا دکھائی دیا۔ ایک دو لڑکے اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے جب بہلی دیکھی۔ تو سیدھے اس کی طرف چلے آئے۔ بہلی میں سوائے بچے کے اور کیا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی اور شخص نظر نہ آیا۔ البتہ دریا کے کنارے پڑا ایک جوتا اور ایک میلا سا پٹکا کسی کے کھو جانے کی شہادت ضرور دے رہے تھے۔

ان لڑکوں نے معاملہ بھانپ لیا۔ گاؤں واپس جا کر چوکیدار اور نمبردار کو اطلاع دی۔ چوکیدار اور نمبردار قانون کے محافظ اور حفظ امن کے ذمہ دار آئے۔ ان کے ہمراہ کچھ اور کسان بھی تھے۔ ان کو دیکھ کر بچہ جو پھر رونے لگا تھا۔ سہم گیا اور سسکیاں بھر بھر کر آہستہ آہستہ رونے لگا۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا۔ کہ بہلی کو ہانک کر گاؤں لے جایا جائے۔ اور لڑکے کو پولیس کی معرفت شہر کے یتیم خانے میں داخل کروا دیا جائے۔ چنانچہ بہلی گاؤں میں پہنچی۔ چوکیدار لڑکے کو لیکر شہر روانہ ہو گیا۔ تاکہ تھانے میں رپورٹ لکھوا کر بچے کو پولیس کے حوالے کر دے۔ بیل کو نمبردار نے اپنے پاس رکھ لیا اور گدھے کو بھی کسی اور ایسے ہی معتبر شخص کے سپرد کر دیا گیا۔ ایک دو روز میں یہ تمام ماجرا رفت گذشت ہو گیا لیکن ابھی ایک ہفتہ نہ گذرا تھا کہ خانہ بدوش قوم کی ایک عورت پھٹے کپڑے پہنے ننگے پاؤں جھولی گلے میں ڈالے بہلی کے پہیوں کے نشانوں کے پیچھے پیچھے چلتی اس گاؤں میں آ پہنچی اور لوگوں سے بہلی کے متعلق دریافت کرنے لگی۔ وہ اسے نمبردار کے پاس لے گئے۔ نمبردار نے بتایا کہ بوڑھا تو غالباً دریا میں ڈوب گیا اور بچہ پولیس کی معرفت شہر کے یتیم خانے میں بھیج دیا گیا ہے عورت بے چاری مامتا کے درد سے رونے لگی۔ اور پھر ذرا رکی۔ اور پوچھنے لگی۔ بیل اور گدھا کیا ہوئے۔ نمبردار نے بے اعتنائی سے جواب دیا بیل سخت کمزور تھا مر گیا اور گدھا ایک اور شخص کے پاس ہے۔ اس شخص کو بلوایا گیا۔ تو اس نے کہا کہ وہ تو دو دن ہوئے مر گیا میں نے اس کا بہتیرا خیال رکھا چارہ وغیرہ بھی خوب ڈالا لیکن بیچارہ ختم ہی ہو گیا۔ نمبردار نے بھی اس کی بات کو دہرایا اور کہنے لگا کہ میں بھی بیل کو بے سود چارہ ڈالتا رہا۔ عورت یہ سن کر خاموش ہو گئی اور پھر بین لگا کرتی اٹھی اور چلنے لگی۔ تھوڑی دور جا کر پھر لوٹ آئی۔ اور کہنے لگی۔ بہلی تو ضرور کہیں ہو گی۔ کہاں ہے؟ غربت نے دیہاتیوں کو ہر چیز کو استعمال میں لے آنا خوب سکھا رکھا ہے۔ وہ کوئی چیز رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ بھلا بہلی کیوں نہ کسی مصرف میں آتی۔ ایک دیہاتی کی بہلی کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ چھت اکھاڑ کر لے گیا۔ ایک اور کو جوئے کی ضرورت تھی۔ وہ جوا اتار کر لے گیا۔ اسی طرح بعضوں کو پہیوں تیروں۔ پٹڑیوں اور دیگر ایسے حصوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے بھی اپنی ضرورتوں کو اس طرح پورا کر لیا تھا۔ وہ گاؤں پہنچ چکی تھی۔ عورت کے اس سوال پر لوگ جو جمع ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ عورت کہہ رہی تھی۔ بھلا بوڑھا دریا میں ڈوب گیا۔ بیل اور گدھا مر گئے لیکن بہلی کہاں گئی۔ کیا اس کو بھی موت آ گئی؟ عورت نے چیخ چیخ کر دریافت کرنا شروع کیا۔ نمبردار کسی اور طرف دیکھنے لگا۔ مجمع خاموش اور بناوٹی طور پر غیر متوجہ ہو گیا۔ جب خانہ بدوش عورت نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ تو ایک منچلے نے کہا چوٹی کہیں کی جرائم پیشہ۔ بس اب کیا تھا۔ یہ بات سب کی زبان پر چڑھ گئی۔ اور سب نے اسے چوٹی چوٹی کہنا شروع کیا۔ بھلا عورت ذات اس کی بساط ہی کیا تھی۔ بیچاری گھبرا کر ایک طرف کو ہولی۔ تمام مجمع اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔ سب چوٹی چوٹی پکار رہے تھے۔ ایک نے ڈرانے کے لئے روڑا اٹھایا۔ اب سب نے روڑے۔ ڈھیلے۔ ٹوٹے جوتے۔ اور ٹوٹی ہوئی ہنڈیوں کے ٹکڑے جو جو کچھ بھی ہاتھ آیا اٹھا اٹھا کر اس بیچاری پر پھینکنے شروع کر دیئے۔ ان بلیاروں سے جان بچانے کے لئے وہ بھاگنے لگی۔ مجمع پیچھے تھا اور وہ آگے آگے بھاگی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ گاؤں کی حد سے باہر نکل گئی۔ اس نے تھانہ کا رخ کیا لیکن وہاں کیا دھرا تھا۔ تھانے میں کس کی فریاد کرتی۔ وہ خود مجرم تھی۔ اور اس کا جرم تھا..... غربت۔

کفایت علی

تجلّیات

کس اَوج پہ چمکا ہے مقدّر کا ستارا   تو میرا سہارا ہے مَیں دنیا کا سہارا
کیا جانے ترے نام میں یہ سحر ہے کیسا   ہے ذکر ترا میرے ہر اک درد کا چارا
تم سامنے آجاؤ تو کیا جانیے کیا ہو؟   طوفانِ محبت ہے تصوّر بھی تمہارا
رگ رگ میں ترے جلوؤں کا طوفان بپا تھا   جب نام ترا لے کے تجھے دِل نے پکارا
اب اس میں نہیں کچھ بھی بجز نغمہ و خوشبو   تیرے لئے کاشانۂ دل کو ہے سنوارا
پہنائی کونین پہ ہے اس کا تسلّط   جس ہاتھ میں آیا ترے دامن کا کنارا
اِک ایسے سمندر میں رواں کشتیٔ دل ہے   ہے سرحدِ امکاں سے پرے جس کا کنارا
دنیا کے ہر اک حُسن سے محبُوب ہے مجھکو   یہ صبح سکون بخش کا معصُوم ستارا

بیگانۂ کونین ہے صہبائیِ بیخود
لب پر ہے مگر شام و سحر نام تمہارا

آثر صہبائی

بہشت کی بازیافت

خاندانی روایات کا اثر تھا یا لائق استادوں کی صحبت کا فیض کہ ہم اپنے گھر میں گھر کے سو فیصدی مالک کی حیثیت سے رہنے کے پرانے اصولوں پر کاربند تھے۔ اس اصول کی پابندی اس سختی سے کی جاتی تھی۔ کہ ہم گھر کے معاملات میں بیگم کی رائے پر عمل کرنے کو ایک شوہر کی انتہائی کمزوری اور سفاہت سمجھتے تھے۔ اسی سلسلے میں یہاں تک احتیاط ملحوظ تھی کہ اگر کسی معاملے میں اپنی رائے بھی وہی ہو۔ جو بیگم اپنی طرف سے پیش کر بیٹھیں تو اس سے عمداً اظہار اختلاف ظاہر کرتے ہوئے بیگم کو چپ کرا دیا جاتا تھا کہ خدا نے تم کو مرد کا (یعنی مرد متعلقہ کا) حکم ماننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ بیچاری خاموش دم نہ مار سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہمارے معاملات میں دخل دینے کی عادت اور ہماری رائے کو بدلوانے کی خواہش رفتہ رفتہ ان کی طبیعت سے نکل چکی تھی۔

(۲)

ایک دفعہ ہمیں یکایک نوبتی بخار آنے لگا جب بخار کا حملہ ہوتا تو یوں ہوتا تھا کہ کسی نے مشکیں کس کر تنور میں جھونک دیا ہے یا تیز دھوپ میں تپتی ریت پر چت لٹا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہونے لگا کہ سارے جہان کا درد سمٹ سمٹا کر ہماری دونوں کنپٹیوں کے درمیان آبسا ہے۔ آنکھوں کے سامنے کبھی بالکل اندھیرا چھا جاتا تھا اور کبھی مطلع صاف نظر آنے لگتا تھا۔ کبھی یوں نظر آتا تھا کہ پہاڑی جنگل ہر طرف چھائے ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے سورج اور ہمارے درمیان ایک بلند دیوار کھڑی کر دی ہے۔ کبھی ہوا کا جھونکا آ کر اونچے درختوں کی ٹہنیوں کو حرکت دیتا ہے۔ تو دھوپ کو کہیں کہیں سے جھانکنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

(۳)

اس بیماری میں بیگم نے ہماری جس قدر خدمت کی اسے دیکھ کر بے اختیار منہ سے یہ دعا نکلتی تھی۔ کہ خدائے قادر کریم اسے مرنے کے بعد بھی ہم سے جدا مقدسے آزاد نہ کرے جس دن سے ہمیں بخار ہوا۔ اور نیم بیہوشی کی حالت میں بستر پر دراز ہوئے جس رُخ کروٹ بدلتے انہیں کھڑا پایا کرتے تھے بخار سے تپتی ہوئی آنکھوں میں شکریئے کے آنسو جھلکنے لگتے تھے۔ اور طبیعت اس نظریئے کو بدلنے کی طرف تیزی سے مائل ہوتی تھی۔ کہ مرد اور عورت میں کوئی پیدائشی فرق موجود ہے۔ بار بار دل میں آتا۔ کہ اپنے اس ذہنی انقلاب کا اعلان بلند آہنگی سے کر دیا جائے۔ لیکن مدت دراز کے ان منجمد خیالات کی تردید پر اپنے آپ کو آمادہ نہ پاتے تھے جن کی حمایت میں اب تک بیگم سے سینکڑوں گرما گرم مباحثے ہو چکے تھے۔ دوسرے ہمارے مردانہ وقار کو یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ کہیں ایسی حالت میں کہ ہم صاحب فراش اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں بیگم کے محتاج ہیں۔ ہماری رائے کی مخلصانہ تبدیلی کو خوشامد پر محمول نہ کر لیا جائے۔

ہمیں اپنے گھر میں آمرانہ اختیارات حاصل ہوتے ہوئے بھی ایک حسرت ہمیشہ رہی۔ کہ بیگم ہمارے بلانے پر گنبد کی صدا کی طرح آوازنہ دیتی تھیں۔ اور ہمیشہ "ننھے کو نہلا رہی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہوں۔ دھوبی کے کپڑے لکھ رہی ہوں۔ کنجڑے کے پیسے چکا رہی ہوں" کی قسم کے بیسوں تمہیدی فقرات کے بعد مخاطب ہوتی تھیں۔ لیکن ہمارے بخار نے بیگم کی گویا طبیعت ہی بدل دی تھی۔ ادھر ہم نے آواز دی اور وہ موجود۔ ہم نے جدھر کروٹ بدلی۔ فوراً تکیہ رکھ دیا ہم نے مکھی اڑانے کو ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ تو اس نیک بخت نے فوراً اٹھ کر سر دبانا شروع کر دیا۔

بیگم کی عادت تھی کہ اگر ایک دفعہ برتن دھو دھلا کر الماری میں بند کر دیئے اور استعمال کے وقت کسی نے پھر دھونے کی فرمائش کر دی تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی تھیں "ایک دفعہ برتن منجھ چکتے ہیں اور شیشے کی الماری میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ تو انہیں وہاں کونسی دیمک چاٹے لگتی ہے یا ان پر کون سی مکھیاں بھنبھنانے لگتی ہیں؟ گھر بھر کا کام سنبھالے ہوئے ہوں۔ ایسی بدتمیز نہیں کہ کسی کو گندے برتن میں کھانے کی چیز ڈال کر دے دوں۔ ایک دفعہ دھو دھلا کر برتنوں کو ٹھکانے لگا چکی ہوں اب انہیں پھر کیوں دھوؤں؟ جاؤ نہیں دھوتی"۔ لیکن اب ہماری بیماری میں دھلے ہوئے برتنوں کو بھی جب تک کھولتے پانی میں نہ ڈال لیتی تھیں۔ انہیں ہمارے سامنے نہ لاتی تھیں۔

اس کے علاوہ اگر ہم پہلے کبھی گھر کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے کرنے بیٹھ جاتے۔ تو بیگم کو ہمارا ہاتھ بٹانے کی قسم تھی چاہے ہم سے اس کام میں ائی غلطی بھی ہو رہی ہو۔ تو بھی وہ ہماری رہنمائی نہ کرتیں۔ بلکہ آتے جاتے سکرا مسکرا کر گویا ہمیں اپنی کم فہمی کا احساس کراتی تھیں۔ لیکن بیمار پڑے بیگم نے ہمیں اپنے ہاتھ سے دوا تک نہ پینے دی جب وقت ہوتا۔ دوا تیار رکے لاتیں اور تکئے کے سہارے ہمارا سر اونچا کر کے دوا کا پیالہ ہمارے ہونٹوں سے لگا دیتیں۔ آسانی سے ہم فوراً پی جاتے کہ دوا کی تلخی کی شکایت بھی زبان پر نہ لاتے۔ ہماری بیماری کی کیفیت بیگم خود ہی ڈاکٹر سے بیان کرتیں دہی ہمارے کھانے کے متعلق ہدایات حاصل کرتیں۔ اور ہمیں ضرورت کی ہر شے بستر پہ بیٹھے بٹھائے بغیر زبان ہلائے مل جاتی تھی۔ دل ہی دل میں لتہ میاں کا سو سو شکر کرتے جس نے ہمیں ایسی سلیقہ شعار بیوی کا میاں بنایا۔

(۴)

لیکن آہستہ آہستہ معاملے کا ایک اور پہلو ہماری نظر کے سامنے نے لگا جس نے ہمارے اطمینان کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا ہمیں احساس ہونے لگا کہ اب اس گھر میں ہمارا راج نہیں بلکہ اب راجہ سے پرجا بن چکے ہیں۔ ایک دن ہم نے کہا " بیگم نوکر سے کہو کہ ہمارا جوتا اور چھڑی نکال ے۔ آہستہ آہستہ بازار تک جانا چاہتے ہیں۔ گھر میں اکتا گئے ہیں۔ ذرا ی بہل جائے " بیگم نے کہا " نوج۔ تمہارے جیسا بھی کوئی اپنی صحت کا من ہو بخار ابھی اُترا نہیں چکا اور میاں چلے ہیں ٹہلنے کو " ہم نے کہا ـ ٹہلنے تھوڑی جا رہے ہیں اور سچ پوچھو تو ٹہلنے کی ہمت ہی ابھی ہم میں ب ہے۔ ایسے ہی ذرا ایک جگہ بیٹھکر بازار کی سیر دیکھیں گے۔ ارے نذیر ذ تالا ؤ ہمارا اور چھڑی بھی۔ بیگم نے ہم سے تو کچھ نہیں کہا۔ ہاں وہیں بیٹھے بیٹھے نوکر کو ایک ڈانٹ بتا دی " خبردار! جو کسی کو جوتا یا چھڑی وڑی لاکے ی " ہم نے اپنی زندگی میں یہیں پہلی مرتبہ دیکھا کہ نوکر ہمارے حکم کو سننے لے باوجود کھڑا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بیگم کے حکم کا منتظر کھڑا ہے۔ ناچار ہم نے بھی نوکر کو ایک ڈانٹ دی "...... کے بچے حکم نہیں سنا ہمارا؟" ابھی آخری لفظ ہمارے مُنہ میں ہی تھے کہ بیگم برس پڑیں " حکم ہیں سُنا ہمارا؟...... نوکر نہیں سنے گا تمہارا حکم۔ تم تو ٹھہرے بیمار۔ ہمیں کون پوچھے گا سب کہیں گے۔ وہ تو بیمار تھے۔ بیمار اونچے کی رائے یا؟ لوگ مجھے بُرا بھلا کہیں گے کہ اس نے کیوں جانے دیا۔ سب سے یادہ تمہارے بہن بھائی میرے گلے کا ہار ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر کیا کہیگا ں نے تمہیں ہدایت نہ کر دی تھی۔ کہ جب تک میں مشورہ نہ دوں انہیں بستر سے نہ اُٹھنے دینا خبر بھی ہے تمہیں یہ سب علاج ولاج کس کی ذمہ داری پہ ہو رہا ہے؟ میری ذمہ داری پر۔ میں نہ ہوتی تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ کوئی ایسا ویسا مرض نہیں تھا۔ بخار تھا نربتی بخار۔ اب سرکار ہیں کہ ذرا سی ہدایت پر عمل نہیں کرتے۔ لاکھ سر پٹکتی ہوں۔ ماننے میں نہیں آتے "

بیگم نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور ہم تھے کہ نقاہت اور ندامت کے مارے گڑے جاتے تھے۔ زندگی کا یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی نے ہم پر یوں غصہ اتارا ہو اور ہم نے دم نہ مارا ہو۔ مگر وہ جو مثل مشہور ہے۔ قہر درویش بر جان درویش، اس کے بعد بیگم کی کسی بات کا جواب تو درکنار مُنہ سے اُف تک نہ کر سکے۔

ایک دن جب ڈاکٹر ہمارا معائنہ کر چکا۔ تو ہمت کر کے اس سے پوچھ بیٹھے " کیوں صاحب کتنے دن میں اچھے ہو جائیں گے؟"

ڈاکٹر نے ہمارے سوال کو سُنا تو ضرور لیکن جواب بیگم کو دیا " بیگم صاحبہ یہ ہفتے عشرے میں اچھے ہو جائیں گے لیکن کھانے میں پرہیز اور دوائیں احتیاط شرط ہے " ہم نے پوچھا " ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ بازار تک چلے جانے میں کوئی ہرج تو نہیں؟ " ڈاکٹر صاحب نے اپنا مُنہ تک ہماری طرف پھیرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اور ہمارے سوال کو بیگم کا سوال تصوّر کرتے ہوئے کہا " بیگم صاحبہ انہیں ابھی بازار تک نہ جانے دیں۔ اگر یہ جانا بھی چاہیں تو انہیں روک دیا جائے " اب تو ہماری خفت اور غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی ہم نے کہا " سنئے ڈاکٹر صاحب! فیس آپ ہماری جیب سے لیتے ہیں یا بیگم کی جیب سے! ہمیں کوئی احمق یا سٹری سمجھ رکھا ہے آپ نے۔ سوال ہم کرتے ہیں اور جواب ملتا ہے بیگم صاحبہ کو۔ ڈاکٹر تو ہماری یہ ڈانٹ سنکر چپکا چل دیا لیکن اس کی خاموشی کی کسر بیگم نے پوری کر دی۔

" احسان فراموش دنیا کو خدا جانے کس جہنّم کا ایندھن بنایا جائے گا۔ میاں کو وہ وقت یاد نہیں جب بے ہوش پڑے تھے مُنہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ دو گھڑی کے مہمان نظر آتے تھے۔ بیگم بدبخت نے اپنے آرام کو آرام نہیں سمجھا۔ اس دن سے سر میں پانی نہیں ڈالا۔ کپڑے نہیں بدلے میاں کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا جس احتیاط کی ڈاکٹر نے ہدایت کی۔ اس پر پورا عمل کیا اور آج اگر ڈاکٹر نے بیگم کو میاں کی صحت کے متعلق کچھ بتایا تو ڈاکٹر کو قتل کر دو۔ بیگم کو پھانسی دے دو۔ تاکہ میاں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو "

(۵)

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو ہم نے گذشتہ واقعات پر ناقدانہ نظر دوڑائی۔ آخر بیگم کے ایک بے زبان محکوم سے یوں یکایک مختار مطلق بن جانے

ں وجہ کیا ہے؟ اپنے تاریخی مطالعہ سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ قل نے رہنمائی کی اور ہمیں سمجھایا کہ بیگم شعوری یا غیر شعوری طور پران فرمانرواؤ لے نقشِ قدم پر چل رہی ہیں جن کا مقولہ ہے "آرام اور آسائش کی عادت ڈالو اور حکومت کرو" یہ لوگ محکوموں کے لئے دنیا جہان کی آسائشیں بہم پہنچا دیتے ہیں جو آہستہ آہستہ ان کی زندگی کا جزو بن جاتی ہیں۔ اور تو او ن کے گھروں کی حفاظت تک اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اور محکوم چور اور ڈاکو کے خوف سے بے فکر پڑے سوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ محکوم یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ آزادی اور خودمختاری کی تمنا کرنا امن و عافیت سے ہاتھ دھونے کے برابر ہے۔ اس لئے حاصل شدہ آسائشوں کو چھوڑنے پر محکومی اور غلامی کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ اور دوسرے کی اچھی حکومت کے سامنے اپنی حکومت کو ہیچ تصور کرلیتا ہے۔ بیگم نے ہماری اس قدر خدمت کی۔ کہ اب ہم بیگم کا کلمہ پڑھنے لگے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر بھر سے ہما ب اٹھ گیا۔ اور ہم حاکم سے محکوم بن کر رہ گئے۔

آخر ہم نے اپنے چھنے ہوئے تخت اور کھوئی ہوئی بہشت کو پھر سے حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔

(۶)

ہماری بیماری کے دوران میں دوست عیادت کے لئے آتے رہے لیکن بیگم کا نادرشاہی حکم تھا کہ کوئی ہم تک پہنچنے نہ پائے۔ نوکر سب کو باہر سے باہر ہی لوٹا دیتا تھا۔

ہمارے دوستوں میں شیخ صاحب نہایت مخلص دوست ہیں وہ کئی دفعہ بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے لیکن انہیں ہم سے ملنے نہ دیا گیا نوکر نے اوپر ہی اوپر یہ کہدیا کہ ڈاکٹر نے ملاقات بند کردی ہے لیکن جب کبھی شیخ صاحب یا کسی اور دوست کو ہم سے ملے بغیر اس طرح لوٹا دیا جاتا تھا۔ تو ہمارے سینے پر سانپ سا لوٹ جاتا تھا۔ اور ہم غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھ کر رہ جاتے تھے ؎

یارِ دیرینہ قدم رنجہ مفرما کایں جا
ایں نگنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

لیکن اب ہمارے دل میں اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پانے اور گھر میں نئے سرے سے اپنا سکہ جمانے کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ بس موقعہ کا انتظار تھا۔

(۷)

ایک روز دروازے کی گھنٹی بجی۔ اور اس کے بعد کان میں شیخ صاحب کی آواز آئی۔ جو نوکر سے ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے "کیوں بھئی۔ ابھی تک ہمارے دوست ڈاکٹر کی قید سے رہا ہوئے کہ نہیں؟" بیگم اس وقت دوا بنانے میں مصروف تھیں۔ شیخ صاحب کی آواز سن کر نوکر کو ہدایت دینے کے لئے اٹھیں۔ ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے پورے زور سے چلّا کر یہ شعر پڑھا ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ہماری آواز شیخ صاحب کے لئے اندر چلے آنے کی دعوت تھی۔ وہ فوراً تشریف لے آئے اور ہم نے اُن سے بآوازِ بلند کہا "اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی کا حکم نہیں مانیں گے کسی کی ہدایت پر عمل نہیں کریں گے اپنے دوستوں کو کھلے بندوں ملیں گے۔ بازار جائیں گے۔ اور جو جی میں آئے کھائیں گے۔" شیخ صاحب حیران تھے۔ کہ جب ہمیشہ سے ہماری یہی عادت ہے تو از سرِ نو اس قسم کے ارادے باندھنے کا مطلب کیا ہے؟ لیکن اگرچہ ظاہرا ہماری گفتگو کے مخاطب شیخ صاحب تھے لیکن دراصل ان کے پردے میں ہم بیگم صاحبہ کے خلاف اعلانِ بغاوت کر رہے تھے۔ جو باورچی خانہ میں دبکی بیٹھی تھیں ٹیپ کے بند کے طور پر ہم نے اسی جوش کے ساتھ بآوازِ بلند کہا کہ "اگر کوئی متنفس (عورت یا مرد) ہمارے ارادے میں مزاحم ہوا! تو اسے اپنی حماقت پر پچھتانا پڑیگا۔

شیخ صاحب کے چلے جانے کے بعد بیگم نے نہایت شکست خوردہ آواز میں [illegible]

[illegible] پوچھو کہ وہ [illegible] ہمیں اپنا کھویا ہوا بہشت واپس مل چکا تھا۔

محمد اکبر خاں بی اے

ایک شعر ؎

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں

ابوالاثر حفیظ

آزادی

دارالسلطنت سے دُور چنگیزی محلات کے قریب شاہی تفریح گاہ دُنیاوی عجائبات کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ حسین خواصیں نیم عُریاں لباس پہنے دردریز ستار کے تاروں سے کھیلتی نظر آتیں۔ روح پرور نغمات جب فضاؤں میں رقص کرتے تو فطرت پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اُمنڈتے ہوئے چشمے کی شفاف سطح پر سبزے کی دیوی اٹکھیلیاں کرتی پھرتی موسمِ گُل میں کھلتے ہوئے پھول ذِلّت زدہ عنادل کو آمدِ بہار کا پیغام پہنچاتے۔ گُل و بلبل کے علاوہ یہاں چند خونخوار درندے بھی مدّت ہوئی آزادی کو الوداع کہہ چکے تھے۔ ان میں ایک شیر بھی تھا۔ جیسے شاہی غلام نینوا کے صحرا سے پکڑ لائے تھے۔

صبح کی دیوی جب بسترِ شب سے انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی تو چنگیزی لونڈیاں بھی ساز لئے ہوئے چمن کے سوتے ہوئے عناصر کو جگانے آتیں۔ محبت کی وجد آفرین راگنیاں جب فضاؤں میں گونج کر ہوا کے شانوں پر پرواز کرتی ہوئیں شاہی محلات تک پہنچتیں اور پھولوں کے سیج پر آسودہ خواب بادشاہ کے کانوں میں اپنی نرم نازک اور لوچدار آواز سے ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتیں۔ تو بادشاہ کی رُوح اس کے جسم کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتی۔ راگنیاں اُسے اُکسا کر آہستہ آہستہ سیرگاہ کی جانب کھینچ لاتیں۔

غُصیلا چنگیز جب سیرگاہ کے اندر قدم رکھتا تو میٹھی راگنیاں اُس کا خیر مقدم کرتیں۔ ظالم بادشاہ کی پُرشکن جبیں ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے چاند کی طرح چمکنے لگتی۔

بادشاہ زندہ حُسن کے اس جھرمٹ میں سے کسی ؞؞ین خواص کو اپنے شبستانِ عشرت کے لئے انتخاب کرتا۔ پھر مست خرام انداز ؞؞ مہ جمالوں کے درمیان سے گذر کر چشمے کے قریب رکھے ہوئے شیر کے پنجرے کے پاس جا پہنچتا چنگیز کی آمد پر شیر ایک دلخراش آواز بلند کرتا۔ لیکن خونخوار بادشاہ اس کی آہوں پر مسکرا دیتا۔ بادشاہ کی خوبصورت چھڑی پنجرے کے سوراخوں پر کھیلنے لگتی۔ جسے شیر پنجوں میں پکڑ کر چھیننے کی ناکام کوشش کرتا۔ دونوں زور آزمائی میں اس طرح مصروف ہو جاتے۔ گویا دو بادشاہ ایک دوسرے کی سلطنت پر قبضہ جمانے کے لئے برسرِ پیکار ہوں۔ بالآخر غلام کی شکست اور آقا کی فتح ہوتی۔ چنگھاڑتا ہوا شیر پھر چھڑی پر لپکتا مگر بادشاہ شکست خوردہ حریف کا مدِمقابل ہونے سے گریز کرتا۔ اس طرح ہر روز اس کے قہقہے شیر کی خوفناک گرج میں گم ہو کر فضاؤں کو لرزا دیتے غلاموں کی بےبسی بادشاہ کی دلفریب جنت تھی ہزاروں دوشیزاؤں کا پاکیزہ حُسن بادشاہ کی پُرشوق نگاہوں کی آماجگاہ بنتا اور اُن کا دامن گناہ سے ملوث ہو کر رہ جاتا بس یہ تھے چنگیز کی زندگی کے محبوب مشاغل۔

ایک شب جب چاندنی نُور برسا رہی تھی کھلے ہوئے پھول نورانی چادر اوڑھے شگفتہ کلیوں سے غلامی کا افسانہ کہہ رہے تھے۔ لالہ آنکھیں بند کئے خاموشی کے ساتھ کسی آزاد فضا کے تصوّر میں کھویا سا دکھائی دیتا۔ تفریح گاہ کی رنگین تتیریاں پھولوں کے دامن میں بےحس وحرکت سو رہی تھیں تاہم پُرنور سناٹا اپنے دامن میں بہت سی دلچسپیاں لئے تھا۔ خلافِ معمول بادشاہ اپنے اراکینِ سلطنت کے ساتھ ٹہلتا ہوا شاہی باغ کی جانب آنکلا۔ گذری ہوئی فتوحات اور آنے والی شکستوں سے بےخبر بادشاہ آج شراب کے سہارے ٹہلتا پھرتا تھا۔ اُمرا و وزرا پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ بادشاہ آج ایک ترنگ اور سرشاری کے ساتھ تخیل کی روانی میں بہے چلا جاتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چشمے کے قریب پہنچا۔ اس نے خلافِ توقع اوک سے پانی پیا اور اُٹھ کر پنجرے کے شاہی قیدی شیر کی جانب دیکھنے لگا۔

دو ننھے پرندے پنجرے کی چھت پر بالمقابل بیٹھے چاندنی کی ردا اوڑھے چہچہا رہے تھے۔ بادشاہ نے وزیر سے پوچھا۔ یہ ننھے پرندے کیا پیغام سنا رہے ہیں بےوقت کے سوال نے وزیر کے ہونٹوں پر خاموشی مسلط کر دی۔ وہ حیران تھا۔ اس اُلجھن کو کیونکر سلجھاؤں؟ وہ جانتا تھا کہ چنگیز کا خوفناک غصہ میرے ساتھ عزیز و اقارب کی تباہی کا پیغام بن سکتا ہے ہر وزیر کے دل میں خوفناک خواب کی تعبیر گھومنے لگی۔ موت کا تخیل انسانی ذہن کو دنیا و مافیہا سے بےخبر بنا دیتا ہے۔ ان کے دل ساکت ہو گئے۔ وہ درختوں کے سائے تلے بےحس وحرکت کھڑے تھے۔ جیسے خزاں رسیدہ سوکھے ہوئے درخت تیز درانتی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہوں۔ پنجرے کے دوسری طرف جہاں اس کا سایہ سبز گھاس پر سیاہ چادر

۔اور سلاخوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی ایسا منظر پیش کر
تی۔ جیسے کسی جوہری نے سیاہ بلور پر جواہر ریزے بکھیر رکھے ہوں۔
ن تاریکی و روشنی کی حسین چادر۔ اوڑھے باغ کا بوڑھا محافظ جو سا
ے اپنے خون کے عوض باغ کی شادابی خریدتا رہا۔ کھڑا سر اٹھائے
ں کے راگ سننے میں محو تھا۔ وہ جانتا تھا کہ طائران چمن کا روح پرور
بھی کبھی دردناک گیت بھی سنایا کرتا ہے۔ اس کی کمان کمر۔ سفید داڑھی
ں کا آماجگاہ چہرہ۔ زندگی کے تلخ تجربات کی تفسیر پیش کر رہا تھا۔ مرتعش
ں کی بوسیدہ لاٹھی اس کی جان کا سہارا بنی تھی۔ بوڑھا خاموش ہمہ تن
تھا۔ اور پرندے لگاتار اپنے راگ الاپ رہے تھے۔

ایک پرندہ سامنے سے اڑ کر دوسرے پرندے کے ساتھ آ بیٹھا۔ سنا
ں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنائی دی۔ اب دونوں پرندے
ر منقار خاموش ہو گئے۔

بوڑھے میاں کا ایک خوفناک قہقہہ خاموشی کی سطحوں کو چیرتا ہوا فضا
وب گیا۔ اور ایک مسلسل پھڑپھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دونوں پرندے
ے درختوں کے تاریک پتوں میں روپوش ہو گئے۔

"جواب دو" بادشاہ کی رعب دار آواز ایک گونج کے ساتھ اٹھی۔ اور
ے شاخوں پر آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر گئی۔

وزرا لرز گئے۔ جیسے کسی نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہو۔ بوڑھے نے
سا مسلسل قہقہوں کے درمیان گھما کر پنجرے میں پھینکا۔ جو شیر کی کمر پر
زین کر گرا۔ بڈھا اپنے جذبات کی رو میں لگاتار قہقہے لگاتا ہوا باہر کی
بڈھا۔ شیر ایک مہیب گرج کے ساتھ اٹھا اور ڈر دکنے لگا۔ بڈھا

بلند بانگ قہقہوں کے درمیان لوٹا۔ اس نے اپنی شعلہ بار آنکھیں شیر
کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ شیر خاموش ہو گیا۔

"غلامی کو مجبوری سے تعبیر کرنے والے بزدل جواب دے۔ ان ننھے ننھے
آزاد پرندوں کی سرگوشیوں کا جو تیری محکومیت پر آزادانہ قہقہے بلند کرتے
غائب ہو گئے ہیں۔" شیر غرایا۔ گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے "کیا تم آزاد
ہو بوڑھے باغبان؟"

"آہ میں بھی تیری طرح ایک غلام ہوں جنگل کے بادشاہ"۔ بوڑھے نے
اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

شیر اب پنجرے کے در و دیوار سے ٹکریں مارنے لگا۔ اس نے اپنے
سامنے دونوں پنجے سلاخوں کے درمیان گاڑ دیئے۔ اس کے خوفناک
دانت سلاخوں کو چبانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

بوڑھا دونوں ہاتھوں سے جگر تھامے آہستہ آہستہ چشمے کی طرف
جانے لگا۔ ٹھوکر لگی اور اوندھے منہ گر پڑا۔ بادشاہ خاموش ڈھانچے کو بغور دیکھ رہا تھا
ایک وزیر نے بوڑھے کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور اپنی مایوس نظریں بادشاہ
کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ آہ یہ کس کی موت کا پیغام تھا اور یہ جذبہ غیرت
غلامی کا جذبہ تھا جس نے بوڑھے باغبان کو قید عناصر سے آزاد کر دیا۔

دوسرے دن تفریح گاہ کے کنارے ایک قبر دیکھی گئی جس پر لکھا تھا
"شہیدِ اسیری کا شہید"۔ اکثر ننھے ننھے پرندے اس مزار پر پھول چڑھاتے
دیکھے گئے۔ یہ وہی پرندے تھے جنھوں نے بادشاہ کے بوڑھے غلام کو
آزادی کا گیت سنایا تھا۔

کاوش

آنچہ فلک نہ خواست است ہیچ کس از فلک نہ خواست
ظرف فقیہہ مے نہ جُست، بادہ ما گزک نہ خواست
رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود
لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نہ خواست

غالب مرحوم

یہ رات

رات ہوئی اور چھٹکے تارے
ننھّے ننھّے پیارے پیارے
نور بھرے آکاش سے چھوٹے
شیتل سوتے کومل دھارے
رات کی راجکماری نکلی ہاتھوں میں پھلجڑیاں لے کر
دُنیا کی مایوس فضا میں عشرت کی کچھ گھڑیاں لے کر
ہونٹوں پر مدہوش تبسم
اور آنکھوں میں سرد شرارے
رات ہوئی اور چھٹکے تارے

(۲)

وہ مغرب سے چاند نے جھانکا
جگ کو سیمیں جال سے ڈھانکا
چرخ کے دامن پر فطرت نے
اک انمول جواہر ٹانکا
چاندی کا باریک سا پردہ دھرتی پر مہتاب نے تانا
اس پردے کے تار روپہلی اور سنہری تانا بانا
کس دھج سے شب یو راج آیا
تیکھا ٹیڑھا ترچھا بانکا
وہ مغرب سے چاند نے جھانکا

(۳)

کنور کو مل گئی راجکماری
وہ اس پر میں تجھ پر واری
وہ آکاش پہ ہم دھرتی پر
راس رچائیں باری باری
رات یہ کیا من بھاتی آئی بچھڑے پریمی آن ملے ہیں
ان گھڑیوں کو نعمت جانو پھر سے من کے کنول کھلے ہیں
ایشور نے یہ رات دکھائی
ایشور کی ہے لیلا نیاری

کنور کومل گئی راجکماری

(۴)

ان دونوں کے دل کی خوشیاں
تاروں کے ہونٹوں پر رقصاں
ہم دونوں کے من کی آشا
تتلی بن کر باغ میں پرّاں
ہم خوش ہیں اور ساتھ ہمارے پتے ناچیں شاخیں جھومیں
ان کی خوشیاں کرنیں بن کر پربت کے رخسار کو چومیں
گھڑی سہانی سماں سہانا
وہ بھی خنداں ہم بھی شاداں
تاروں کے ہونٹوں پر خوشیاں

(۵)

آج تو یہ ہے کل کیا ہوگا
رات کا جادو ٹوٹا ہوگا
چاند کے رخ پر زردی ہوگی
تاروں کا منہ اترا ہوگا
پھولوں پہ کچھ روپ نہ ہوگا تاروں میں تنویر نہ ہوگی
باتیں ہونگی کیف سے خالی باتوں میں تاثیر نہ ہوگی
رات کا ہر اک روشن جلوہ
ماند پڑے گا پھیکا ہوگا
آج تو یہ ہے کل کیا ہوگا

(۶)

تم جاؤگی صبح سویرے
غم ڈالے گا دل میں ڈیرے
لیکن کیوں ہو ایسا کیوں ہو
اب کیوں چنتا من کو گھیرے
کل جو ہوگا کل دیکھونگا آج کی شب جی بھر کر جی لوں
آج تمہاری مست آنکھوں سے مدھ کے ہنستے ساغر پی لوں
آج خوشی میں رونا کیسا
آج تو تم بھی پاس ہو میرے
تم جاؤگی صبح سویرے

منظور احمد منظور
بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

ڈاکو

(مشہور بنگالی فسانہ نگار پربھات بابو کا ایک بلند پایہ افسانہ)

نلنی علی پور میں پوسٹ ماسٹر تھا۔

تین بج رہے تھے نلنی امید وبیم کی حالت میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا پوجا نزدیک آرہی تھی۔ اس نے رخصت کے لئے عرضی دی تھی مگر تا حال افسر سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر پانچ بجے تک بھی رخصت کی منظوری آجائے۔ تو وہ اسی دن کی گاڑی سے عازم الہ آباد ہو جائے الہ آباد میں ان کے خسر رہتے تھے۔ اور یہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ ان سے ملنے کے لئے جا رہا تھا۔ اس نے ضروری سامان خرید لیا تھا اس کے ٹرنک بند رکھے تھے صرف منظوری کا انتظار تھا۔

چار بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹنگ۔ ۔۔ٹنگ ۔۔۔ ٹنگ ۔۔۔۔"

نلنی نے متوقعانہ انداز سے رسیور اٹھایا۔

"ہلو ــــــ!"

نہیں یہ اس کی رخصت سے متعلق نہ تھا۔ بلکہ ایک منی آرڈر کے بارے میں استفسار تھا جس کے متعلق غلط فہمی ہو گئی تھی۔

مایوس نلنی واپس آیا اور دھم سے اپنی کرسی پر گر گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور پڑھنے لگا۔ یہ خط اس کی بیوی کا تھا۔

سب سے زیادہ محبوب!

آپ کا نامۂ محبت شمامہ پڑھکر آنکھوں کو سرور حاصل ہوا کیتنی دلنواز خبر ہے کہ جدائی کے طویل ایام جلد ہی ختم ہونے کو ہیں۔ میرے دل کا طائر آپ کے لئے ہر وقت تڑپ رہا ہے مشتاق دید آنکھیں آپ کے لئے فرش راہ ہیں آپ کے دامن سے بندھے ہوئے دو سال ہو گئے۔ مگر ابھی تک مجھے آپ کی خدمت کا موقع نہ مل سکا۔ رخصت ملتے ہی فوراً یہاں آیئے۔ آپ کی مایوس حیات کنیز صرف شوق دید کے سہارے جی رہی ہے۔ کنبی بالا آج ہی دیناج پور سے آئی ہے۔ رخصت کب تک مل جانے کی امید ہے؟ کیا آپ چھٹی کے روز روانہ ہو سکتے ہیں؟ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے بھول نہ جائیں گے۔

صرف آپ کی۔ سروجنی

نلنی نے وفور کیف میں مکرر سہ کرر خط پڑھا پھر تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پانچ بجنے میں صرف ایک یا دو منٹ باقی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ نلنی نے دوبارہ رسیور کے منہ پر اپنا منہ رکھا۔

"ہاں ....."

"رخصت! رخصت!! رخصت!!!"

نلنی کو دو ہفتوں کے لئے رخصت مل گئی۔ اس کا دل الہ آباد پہنچنے کے لئے تڑپ رہا تھا سالی سے ہمکلام ہونے کا خوش آیند تصور اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔

جب نلنی کی شادی ہوئی تو اس کی وضع قطع سے نسوانیت جھلکتی تھی اس کی کلائیاں گول اور ہاتھ اتنے نرم تھے جیسے مکھن۔ رخسارے گداز اور آنکھیں شرمیلی تھیں۔ شوخ وشنگ سالی نے اسے دیکھکر پھبتیاں کستے ہوئے ٹیگور کا یہ شعر پڑھا تھا۔

"وہ یوں نظر نواز ہوتا ہے۔ جیسے سوسن۔ اور سوسن ہی اس کا نام ہے وہ اتنا نرم ونازک ہے جیسے اس کا نام!!"

طنز وتضحیک کا ایک لفظ غیرت مند کو نصیحت کے دس الفاظ سے زیادہ مشتعل وبرانگیختہ کرتا ہے۔ بالخصوص جب وہ لفظ کسی خوبصورت عورت کے لبوں سے نکلتا ہے۔ اور اگر وہ عورت سننے والے کی سالی ہو۔ تو الفاظ کی تلخی اور تیز تر ہو جاتی ہے۔

شادی کے بعد نلنی کلکتہ واپس چلا گیا اور اس کے خسر مع اہل وعیال الہ آباد چلے گئے۔ وہ یہاں کاروبار کرتے تھے۔

شادی کو عرصہ گذر گیا۔ شادی کی کتنی ہی باتیں اس کے ذہن سے فراموش ہو گئیں۔ مگر شوخ وشنگ سالی کے تیز فقرے اس کے لوح دل سے محو نہ ہو سکے۔

نلنی ایک روز پوسٹ آفس سے واپس آکر آرام کرسی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ دفعتہً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کوشش کرے۔ تو اپنے دامن سے نزاکت کا داغ مٹا سکتا ہے

معنوں میں قوی ہیکل مرد بن سکتا ہے۔ وہ دوسرے دن بازار گیا تو ۔۔ کے مگدر خرید لایا اور روزانہ ورزش کرنے لگا۔ اس نے کھانڈ۔ دودھ ۔۔ر چاول کے بجائے روٹی گوشت اور انڈے کھانے شروع کر دیئے ۔۔سال کی ورزش کے بعد اس کے اعضا کافی قوی ہو گئے۔ اس نے اپنے ۔۔پروقار بنانے کے لئے ڈاڑھی ترشوانا بھی ترک کر دیا۔ اور اپنے چند ۔۔ری احباب کے ساتھ دیہاتوں میں جا جا کر بندوق چلانا بھی سیکھ لیا اور ۔۔بیوں۔ بگلوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کرنے لگا۔

اس طرح دو سال کا عرصہ گذر گیا۔ اور اب نلنی وہ نلنی نہ تھا۔ اس کی ۔۔انی چربی سے خالی تھی۔ اس کی ٹھوڑی سخت ہو گئی تھی۔ بازو اور ٹانگیں ۔۔اد کی طرح ہو گئی تھیں۔ اور اب وہ صحیح معنوں میں اپنے نام کے بالکل ۔۔س بن گیا تھا۔

اپنی شوخ سالی کے فقرے وہ اب بھی نہ بھول سکا تھا۔ وہ اکثر سوچتا ۔۔ر اپنا نام بدل کر اس سے ملوں تو خوب لطف آئے۔

نلنی دو بجے الٰہ آباد اسٹیشن پر اُترا۔ تنگ مُہری کا پاجامہ۔ پنجابی وضع ۔۔لمبا کوٹ اور سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں ایک موٹی بید تھی۔ ۔۔س کے سامان میں ایک بندوق کیس بھی تھا۔ کیونکہ رخصتوں میں شکار کھیلنے ۔۔شوق تھا۔ گاڑی سے اتر کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے لینے کے لئے ۔۔کوئی نہ آیا تھا۔ حالانکہ اس نے کل اپنے خسر کو تار بھیجا تھا۔

اس نے ایک قلی کو بلایا۔ اور اسٹیشن کے احاطہ سے باہر آکر بگھی والے کو بلایا اور کہا "تم مہندرا بابو پلیڈر کا مکان جانتے ہو؟"

"ہاں بابو جی آیئے"

نلنی بیٹھ گیا۔ اور آدھ گھنٹے کے بعد بگھی ایک مکان کے وسیع صحن میں داخل ہوئی۔ بیرونی کمرے کے برآمدے میں ایک نو دس برس کی لڑکی کھیل رہی تھی قریب ہی ایک کنواں تھا جہاں ایک دیہاتی ملازم برتن مانجھ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر نلنی نے اس سے پوچھا "کیا یہ مہندر بابو پلیڈر کا مکان ہے؟"

"جی ہاں بابو جی"

"کیا وہ اندر ہیں؟"

"نہیں وہ کیدار بابو وکیل کے ہاں ٹینس کھیلنے گئے ہیں"

۔۔۔ اور کہو جیجے بابو آیا ہے"

۔۔۔ میں کھیلتی ہوئی لڑکی بھاگی ہوئی اندر گئی۔ اور جیجے بابو آگیا۔ جیجے بابو آگیا۔ کے شور سے سارا گھر سر پر اٹھا لیا ہے۔

ملازم نے جس کا نام رام سرن تھا مودبانہ انداز سے پوچھا "کیا آپ جیجے بابو ہیں؟"

نلنی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ملازم نے اپنے ہاتھ دھوئے اور قدرے جھک کر اسے سلام کیا۔ اور جلدی جلدی سامان اتار کر برآمدے میں رکھنے لگا مختلف شکل وشباہت اور قدوقامت کی لڑکیاں اور لڑکے باہر نکلے اور نلنی کو دیکھنے لگے۔

رام سرن نے نلنی کو دیوان خانہ پہنچا دیا۔ اندر سے ایک لڑکی آئی۔ اور اس کے سامنے ایک گلاس پیش کرتی ہوئی بولی ــــ "جیجے بابو آپ دور سے آرہے ہیں۔ پیاس لگی ہوگی۔ ذرا شربت پیجیئے۔"

نلنی نے منہ سے لگاتے ہی گلاس ہاتھ سے رکھ دیا۔ یہ نمکین پانی تھا۔ لڑکیوں نے مذاق کیا تھا۔ ایک کونے میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ خادم نے پردہ اٹھایا۔ اور کہا ــــ "بابو جی آیئے ذرا جلپان کر لیجئے" نلنی اٹھا اور ٹہلتا ہوا زنانخانے میں داخل ہو گیا۔ درمیان میں فرش پر ایک خوبصورت قالین بچھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے لقرئی تھالیوں۔ پیالیوں اور گلاسوں میں کھانے پینے کی پرتکلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ نلنی خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے کمرے سے پازیبوں کی چھم چھم آواز آئی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی دروازے میں آئی اور کہنے لگی "سالی آرہی ہے"

نلنی نے سمجھا کنبی بالا آرہی ہے۔ اس نے اپنے دائیں بازو کی آستین چڑھا لی۔ تاکہ وہ دیکھ لے کہ اس کی کلائی عورتوں کی طرح اب گول نہیں ہے بلکہ فربہ اور سخت ہو گئی ہے۔ چھم چھم کی آواز اور قریب آگئی ــ "بارے اتنی مدت کے بعد آپ کو ہماری یاد تو آئی" کہتی ہوئی ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی فوراً اساری کے پلو سے منہ چھپاتی ہوئی بدحواسی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ نلنی نے حیرت سے دیکھا یہ کنبی بالا نہ تھی۔

دوسرے کمرے سے دو تین عورتوں کی کرخت آوازیں نلنی کے کان میں آئیں ــــ "ارے تم واپس کیوں آگئیں؟ اتنی دور سے آئے ہونے کے ساتھ کوئی ایسی بے رخی برتتا ہے؟"

"ارے ہمیں سنبھالو۔ یہ وہ نہیں۔ کوئی اجنبی ہے۔۔۔۔ باہر نہ جانا۔۔۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا کہا ــ؟ کوئی اجنبی۔۔۔۔۔؟"

"کیا ہمارا سرت نہیں ہے؟"

" نہیں سرت کیوں ہونے لگا ؟"
" تو پھر یہ کون ہے ؟"
" میں کیا جانوں ؟"
" آخر کون ہے ؟ کوئی رہزن ہے ۔ ڈاکو ہے ..... ؟"
" اتنا قوی ہیکل موٹا مسٹنڈا ڈاکو ہو تو تعجب کیا ہے ؟"
ایک لڑکے نے گھر میں چپکے سے آکر کہا ـــ ارے وہ ایک بندوق
ن لایا ہے "

" کیا کہا ـــ بندوق ـــ ؟ آہ ہم لٹ گئے ..... برباد ہو گئے۔
ے اور رام سرن ، رام سرن ، کہاں چلا گیا ؟ دوڑ اور بابو جی کو جلدی سے
لا ..... "

اسی دوران میں نلنی کی نگاہیں کتابوں کی الماری پر گئیں قانونی
رٹوں کی مجلد کتابیں بالترتیب رکھی ہوئی تھیں ۔ اور ان کی پشت
لائی رنگ سے " ایم ۔ این ۔ گھوش " کا نام کندہ تھا۔

نلنی ایک ہی لحہ میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ۔ اسے سخت غلط
ں ہوئی ۔ اس کے خسر کا نام مہندر ا ناتھ بنرجی تھا ۔ اور یہ مکان مہندر اناتھ
ش کا تھا ۔ وہ غلطی سے دوسرے مکان میں آگیا تھا ۔ اس بیجا مداخلت
احساس سے وہ کسی قدر فکر مند ہوا اور جلدی جلدی کھانی کر فارغ ہو گیا۔

رام سرن ہانپتا ہوا اپنے مالک کو اس حادثہ کی اطلاع دینے کے لئے
ڑا ۔ آج تعطیل تھی ۔ اور کئی کھلاڑی کیدار بابو کے ہاں اکٹھے ہوئے تھے
ندا بابو گھوش اور مہندرا بابو بنرجی سین بابو چٹرجی ۔ کھیل خوب جما ہوا
ا ۔ رام سرن اپنے بابو جی کو دیکھتے ہی چلایا ـــ بابو جی ! بابو جی ! جلدی
چلیئے "۔ اس کا چہرہ متوحش اور خوفزدہ تھا۔

مہندرا بابو نے دریافت کیا ـــ " کیوں کیا بات ہے ؟ کوئی بیمار ہو
ہے
" اسے ..... اسے ..... ایک ..... ڈاکو ..... آگیا ..... ہے .....
، کے گھر "

گھوش بابو نے گھبرا کر پوچھا ـــ " ڈاکو ..... ؟ ڈاکو ..... ؟ دن دہاڑے
..... ؟"

" ہاں بابو جی ڈاکو ۔ یا کوئی ٹھگ یا پاگل ہو ۔ کون جانے ۔ وہ کہتا ہے ۔ میں
ں کا داماد ہوں "

ملازم کی بات سنکر سب کھل کھلا کر ہنس پڑے لیکن مہندرا گھوش نے
اسی بدحواسی کے عالم میں پوچھا ـــ " وہ کب آیا ہے ؟ کیا کر رہا ہے ؟"

" تین بجے آیا ہے ۔ ایک بندوق اور لاٹھی ساتھ لایا ہے ۔ زنانخانے
میں گھس کر بیٹھا ہے عورتیں بہت ہراساں ہیں " رام سرن ایک ہی سانس میں
کہہ گیا ۔

" وہ ایک بندوق اور لاٹھی بھی لایا ہے پاجی ؟ تو گھر کس کی حفاظت
پر چھوڑ کر آیا ہے ؟"

مہندرا بابو دوڑتے سہمتے تیز قدم اٹھاتے گھر کی طرف چلے ۔ اور دروازے
پر پہنچ کر باہر ہی سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے بولے " کہاں ہے ڈاکو ..... ؟"

نلنی کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا ۔ اور سنجیدگی سے سلام کرتے
ہوئے پوچھا ـــ " کیا آپ مہندرا بابو ہیں ؟ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں "
متوحش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مہندرا بابو نے پوچھا " تم کون
ہو ـــ ؟"

میرا نام نلنی کانت مکر ہے ۔ مہندرا بابو بنرجی میرے خسر ہیں ۔ میں نے
بگھی والے سے کہا تھا کہ مجھے مہندرا بابو پلیڈر کے گھر پہنچا دے ۔ وہ مجھے
یہاں لے آیا ۔ کتابوں پر آپ کا نام دیکھکر ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے
اپنی غلطی محسوس کی میں اب تک یہاں سے چلا گیا ہوتا لیکن ملازم آپ کو
بلانے کے لئے گیا تھا ۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے معافی
مانگ لوں ..... " نلنی نے لجاجت آمیز انداز سے کہا ۔

مہندرا بابو کا غصہ کافور ہو گیا ۔ انہوں نے نلنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لے کر ایک طویل قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ـــ " ایک ہی نام کے دو وکیل ہونے
کی وجہ سے بعض اوقات موکلوں میں بھی غلط فہمی ہو جایا کرتی ہے ۔ لیکن یہ
پہلا موقعہ ہے کہ دامادوں کے متعلق بھی غلط فہمی ہو گئی ہے ۔

مہندرا بابو نے کرایہ کی ایک گاڑی منگوا دی ۔ اور تھوڑی دیر کے بعد
نلنی انہیں سلام کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا ۔

مہندرا بابو کے چلے جانے کے بعد کیدار بابو کے ہاں تاش کا کھیل
بند ہو گیا ۔ اور لوگ مکاروں اور دغابازوں کے حیرت انگیز اور پر فریب قصے
بیان کرنے لگے ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مجلس برخاست ہو گئی ۔

مہندرا ناتھ بنرجی شاہ گنج کوارٹر میں رہتے تھے ۔ گھر واپس آکر انہوں نے
ملازم سے چائے اور حقہ طلب کیا ۔ اور بیٹھک میں آرام کرسی پر لڑھک کر
چسکی لگائی ۔ چائے پی ۔ ملازم نے حقہ پر ایک نئی چلم رکھ دی ۔ اور بیٹھک کی
ہوا دینے لگا ۔ تاکہ آگ بھڑک ... [illegible] ... حقہ کی

ہے منہ میں لے لی۔ اور وفورِ کیف میں آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کرائے کی گاڑی ان کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ چونکہ یہ ایک مشہور وکیل تھے۔ کتنے لوک آیا جایا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ صرف ایک بار نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ ساتھ ہی ایک ناما موس آواز کانوں میں آئی ——"کیا مہندرا بابو کا یہی مکان ہے ——؟"

"جی ہاں۔ کہئے کیا کام ہے؟"

"اندر خبر کر دو کہ بابو جی کا داماد آیا ہے۔"

"داماد کا لفظ سُن کر مہندرا بابو اپنی کرسی سے گھبرا کر اٹھے۔ کھڑکی کا پردہ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ ایک مضبوط و توانا شخص سامنے نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی لاٹھی تھی۔ اور ڈرائیور بگھی میں سے بندوق کا کیس نکال رہا تھا۔ مہندرا بابو چلاتے ہوئے برآمدے میں آئے۔ ——"کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے ......؟"

ان کی متوحش صورت دیکھ کر نلنی گھبرا گیا کہ کیا قصہ ہے؟

مہندرا بابو خوف اور غصہ سے کانپتے ہوئے بولے ——" ابھی چلا جا ..... سب جگہ سے گھوم کر میرے گھر آیا ہے؟ جھوٹا۔ مکار۔ بدذات۔ بدمعاش داماد بن کر آیا ہے ——؟"

مہندرا بابو کی چیخ و پکار سُن کر سارے ملازم جمع ہو گئے۔ انہوں نے للکار کر کہا ——" باہر نکالو اس کو۔ اس کی گردن پکڑ کر دھکیل دو۔"

نوکروں کا رخ دیکھ کر نلنی سمجھ گیا کہ جان کی خیر نہیں۔ اس لئے اس نے اپنی لاٹھی گھمانا شروع کی۔ اور کہتا ہوا آگے بڑھا ——"میں جا رہا ہوں لیکن کوئی میرے پاس آیا۔ تو ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔"

نلنی کی سرخ سرخ آنکھیں اور غصہ سے تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر سارے ملازم خاموش ہو گئے۔ اور حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ نلنی نے مہندرا بابو سے پھر کہا ——"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں آپ کا داماد نلنی ہوں۔"

مہندرا بابو طیش میں آ کر بولے ——"جھوٹا کہیں کا۔ تو اپنے سسر کو پہچانتا ہے۔ میں اپنے داماد کو نہیں پہچانتا؟ کیا میرا داماد تمہاری طرح غنڈہ ہے؟ یہاں سے فوراً چلا جا۔ ورنہ پولیس کو بلواتا ہوں۔"

سر پھرے خسر کی باتیں سن کر نلنی کچھ نہ بولا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف واپس چلا گیا۔

[illegible] جانے کے بعد مہندرا بابو زنانخانے میں گئے۔ ان کی بیوی نے پوچھا ——"کیا تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ اپنے داماد کو پکڑ کر بھگا دیا؟"

مہندرا بابو نے سنجیدگی سے کہا ——"تم کسے اپنا داماد کہہ رہی ہو؟ اس فریبی مکار غنڈے کو؟"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ مکار اور فریبی تھا؟"

انہوں نے کیدار بابو کے ہاں سُنا ہوا قصہ دُہرایا اور کہا تم ہی بتاؤ جھوٹا۔ فریبی اور غنڈہ نہیں تھا تو اور کون تھا؟"

جب ایک ہی نام کے دو وکیل ہیں اور دونوں بنگالی ہیں۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ غلطی سے دوسرے کے ہاں چلا گیا ہو ——؟"

بیوی کی باتیں سُن کر مہندرا بابو کا ذہن بھی حقیقتِ حال کی طرف منتقل ہوا۔ اور انہیں افسوس ہونے لگا۔ کہ چھڑی اور بندوق دیکھ کر بدحواس کیوں ہو گئے۔ اور انہوں نے ٹھنڈے دل سے اس کی باتوں پر غور کیوں نہیں کیا؟

کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہا ——"اگر وہ میرا داماد ہوتا تو کم ازکم اپنے آنے سے پیشتر کوئی اطلاع دیتا۔ اور ہم لینے کے لئے اسٹیشن جاتے کیا ایک داماد پہلی بار اپنی سسرال اسی طرح آتا ہے؟ نہ کوئی اطلاع نہ خبر۔ وہ ضرور کوئی مکار تھا۔ تم عورت ذات کیا سمجھو۔ اس نے ہمیں ٹھیک تاریخ نہیں لکھی تھی۔ پھر بھی اس کے آنے کا امکان تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ پوجا سے پہلے آ رہا ہے۔ اس کا آنا تعجب کی بات نہ تھی۔

اپنے والد کو اس طرح تذبذب میں دیکھ کر کینی بالا نے کہا ——"وہ نلنی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

مہندرا بابو نے پوچھا ——"کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟ بتاؤ..... بتاؤ..... تم نے اسے کہاں سے دیکھا؟"

لوگوں کا شور وغل سن کر میں سیڑھی پر گئی۔ تو اس نے گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہمارا نلنی تو نرم و نازک گڑیا کی طرح مکھن کا بنا ہوا ہے میں نے ایک ہٹا کٹا غنڈہ دیکھا۔"

مہندرا بابو نے اس کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا ——" درست کہتی ہو میں نے اس کے منہ پر کہہ دیا تھا کہ بدمعاش غنڈے یہاں سے نکل جاؤ۔ ہمارا داماد تو ایک نرم و نازک خوش وضع شریف صورت نوجوان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے صرف شادی کے روز اسے دیکھا ہے۔ لیکن اتنا بیوقوف اور اندھا نہیں ہوں کہ اس کے بارے میں غلطی کر جاؤں۔"

اسی گفتگو کے دوران میں ایک ملازم نے آ کر مہندرا بابو کے ہاتھ میں ایک تار دیا۔ اسے پڑھتے ہی ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ یہ نلنی کا بھیجا

ہوا تار تھا جو ڈاک خانہ کے کارکنوں کے تساہل سے قدرے تاخیر میں ملا تھا۔

مہندر بابو کی بیوی نے پوچھا "کیوں کیا چیز ہے؟"

ایک مجرم کی طرح انہوں نے اپنا سر کھجلاتے ہوئے کہا "یہ نلنی کا تار ہے۔ وہ یقیناً ہمارا داماد تھا۔"

ان کی بیوی نے ترش رُو ہو کر کہا — "اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ ہم اسے کیسے واپس لا سکتے ہیں؟"

"میں جا رہا ہوں جس طرح ہو گا منا لاؤں گا۔" انہوں نے گاڑی والے سے اسٹیشن چلنے کو کہا تھا۔ وہ یقیناً گاڑی کے انتظار میں وہیں ہو گا۔"

نلنی جب واپس آیا۔ تو اس نے گذری ہوئی باتوں کا کنایۃً بھی تذکرہ نہ کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ گھر والے بے انتہا نادم اور متاسف ہیں۔ ہاں ایک روز بر سبیل تذکرہ اس نے صرف اتنا کہا۔ کہ ایک دوسرے شخص کے خسر کے گھر میری جو خاطر تواضع ہوئی۔ بسا اوقات لوگ اپنے سسرال میں اس سے محروم رہتے ہیں —!!

مترجمہ

مولٰنا امام الدین رام نگری

مختصر ترین افسانہ

یورپ اور امریکہ میں عوام میں ادبی شغف قرون وسطیٰ سے آج تک کسی زمانے میں بھی انحطاط پذیر نہیں ہوا۔ اور ادبی رسائل کے مدیران کو مذاق عامہ کے معیار کے مطابق ادبی سامان مہیا کرنے کے خیال نے ہمیشہ ایک کشمکش مسلسل میں مبتلا رکھا ہے۔ وہ کبھی اپنے سرپرستوں کی طرف سے غافل نہیں ہوتے۔ اور وہ ہمیشہ اس چیز کے قائل رہے ہیں۔ کہ تنوع ہی سے دلچسپی قائم رکھی جا سکتی ہے۔ ادبی تجربے وہاں کے مصنفین کے مقصد حیات کا ایک اہم جزو بن چکے ہیں۔

فن افسانہ نویسی میں بیسیوں اقسام کا تجربہ کیا گیا جذباتی، نفسیاتی، دیہاتی، غرضکہ ان کے ادب میں ہر قسم کے "نئے" افسانے لکھے گئے۔ اور اور مختلف اقسام ابھی ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ جدت پسند طبقہ ان میں ہر عہد میں موجود رہا ہے۔ اور وہ لوگ ادب کے پانیوں کو ہمیشہ حرکت میں دیکھتے ہیں۔

مدت کی بات ہے کہ ایک ادبی جریدے کے جدت پسند مدیر نے اپنے خریداروں کے شوق کو تازہ کرنے کے لئے اشتہار دے دیا کہ ایک مختصر ترین افسانہ لکھنے والے کو گراں قدر انعام دیا جائے گا چنانچہ اس کے جواب میں "بے شمار" "نئے" افسانے موصول ہوئے چند افسانے انعامات کے مستحق قرار دیئے گئے۔ لیکن جس افسانے کو بہترین سمجھ کر اول درجے کا انعام دیا گیا۔ وہ یہ تھا۔

دو آدمی ریل میں سفر کر رہے تھے
ایک نے دوسرے سے پوچھا "کیا
تم نے بھوت دیکھا ہے؟" اور کہہ کر
غائب ہو گیا۔

واصل

نیا ادب

الفاظ اپنی ذات میں دو قسم کے معانی رکھتے ہیں۔ ایک تو لغوی معنی جو ہر لغت ن ملتے ہیں۔ اور دوسرے صوری وصوتی نی بسو ی وصوتی معنی معلوم بننے کے لئے سوائے ذوق سلیم اور گوش حساس کے اور کوئی لغت نہیں ہے سا ہوا کی سرسراہٹ گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ نثر میں ایک خیال کے ظہار کے لئے ہم الفاظ عموماً ان کے لغوی معنوں کے پیش نظر استعمال تے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس نظم میں ایک خاص تاثر پیدا کرنے کے ... الفاظ کے لغوی معانی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں۔ کہ ان کی آواز اور صورت کسی حد تک مطلوبہ تاثر کو عمیق تر کرنے میں مدد دیتی ہے ی جستجو الفاظ اور انتخابِ الفاظ میں حد فاصل قائم کرتی ہے۔

جب ہم چند ہم معنی الفاظ پاتے ہیں۔ تو جس لفظ کی آواز نظم میں مطلوبہ حول یا تاثر پیدا کرنے میں سب سے زیادہ ممد ثابت ہوتی ہے۔ ہم سے اختیار کر کے باقی الفاظ کو ترک کر دیتے ہیں۔

جدید شاعری میں انتخاب الفاظ کے لحاظ سے میں مندرجہ ذیل نظم کی رف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ اس وقت نظم کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے سے بحث نہیں ہے۔ میں اس نظم کی مدد سے فن شعر کے صرف ایک ی پہلو (انتخاب الفاظ) پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ آپ پہلے نظم پڑھئے۔

وحشی

- گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں
۱۔ اس طرح لیٹے ہوئے تھے خانقاہوں کے جنوں پرور کھنڈر
۲۔ یاس کے سائے تلے سستا رہی ہوں جس طرح۔
- حسرتِ ناکام کی درد آفریں بے تابیاں
۵۔ ہر طرف بکھری پڑی تھیں شور آلودہ سی اینٹیں اور بوڑھی ہڈیاں۔
- وقت کے موہوم پاؤں کے نقوش
- اک طرف دو دیو پیکر "جھر جھرائے" وَن کھڑے۔
- سر ملائے کر رہے تھے جانے کیا سرگوشیاں
- اور بپن کر کھڑکھڑاتی پتیوں کی جھانجھنیں
- جا بجا منڈلا رہے تھے گرد پیکر گرد باد'
۱۱۔ جیسے بچوں کے خیال آباد میں
۱۲۔ الف لیلہ کے ہوں جادو کے محلوں کے ستون لہرا رہے'
۱۳۔ تن برہنہ بال ریچھوں کی طرح۔
۱۴ اور اک انداز استغنا لئے!
۱۵۔ اس طرح اک ڈھیر پر بیٹھا تھا وہ
۱۶۔ جس طرح مردار کھا کر اونگھتا سا گدھ کوئی'
۱۷۔ ٹھنٹھنا تا جا رہا تھا شور آلودہ سی اینٹوں کو وہ اک ہڈی سے بہم
۱۸۔ ———— بے خبر ہر بات سے!

(ماخوذ از ادبی دنیا) انجم رومانی

شاعر نے ہمیں مصرعہ ۱۳ کے لئے یعنی وحشی کے "تن برہنہ" "بال ریچھوں کی طرح" دکھلانے کے لئے پہلے بارہ مصرعوں میں الفاظ کے ذریعے ہماری کامیاب رہنمائی کی ہے۔ درشت اور ہیم افزا ماحول پیدا کرنے کے لئے "چلچلاتی دھوپ" اور پھر "خانقاہوں کے جنوں پرور کھنڈر" کا دہشت خیز تاثر اور اس تاثر کو عمیق تر کرنے کے لئے الفاظ کی صوتی معاونت قابل ستائش ہے "کھنڈر" کے ہم معنی الفاظ خرابہ یا ویران کدہ موجود ہیں۔ لیکن ان کی آواز میں نرمی ہے۔ اور کھنڈر کے لفظ کی آواز اپنے اندر کس قدر وحشیانہ ہیبت رکھتی ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑا ستون یک لخت گر جائے "سی اینٹیں اور بوڑھی ہڈیاں" کے لفظی قرب نے منظر کو کتنا "جنگلی" بنا دیا ہے۔ "کھڑکھڑاتی پتیوں کی جھانجھنیں" ہمارے کانوں میں ایک مسلسل دھماکے کی آواز پیدا کر رہی ہیں۔ اور ہماری نگاہیں کسی وحشتناک منظر کی منتظر ہیں۔ دل احساس کے تعطل کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے۔ اور اس احساس کے تعطل کو مصرعہ ۱۱ اور مصرعہ ۱۲ عمیق تر کر دیتے ہیں "الف لیلہ کے ہوں جادو کے محلوں کے ستون لہرا رہے" سے گذر کر آنکھیں پھاڑے ہوئے ہم اس لفظی تصویر کی مرکزی ہستی پر جا پہنچتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ "وہ تن برہنہ بال ریچھوں کی طرح" "اور اک انداز استغنا لئے ایک ڈھیر پر بیٹھا ہے۔ بیٹھنے کی جگہ کے لئے ڈھیر میں جو لفظی اور صوتی موزونیت اور وحشیانہ شوکت کا اندازہ کرنے (بقیہ مضمون دیکھیں صفحہ ۴ ۰ کے پیچھے)

سیاسیات حاضرہ

ایڈولف ہٹلر

(بیسویں صدی کا سب سے بڑا فتنہ کار)

اس دہشت بار جنگ سے ایک سال پیشتر یورپ کے ادبا اور مفکرین نے ہٹلر کی شخصیت سے متعلق زیادہ اعتنا دکی ہے۔ اسی طرح انہوں نے اجتماعی زندگی اور دنیائے تہذیب کے جرمن تصور پر قلم اٹھایا یہاں تک کہ یورپ اور امریکہ کے اہل قلم کا عام موضوع بحث جرمنی اور اس کا ڈکٹیٹر بن گئے۔ ان ادبا میں جی ہش ایڈورڈ بھی ہیں جنہوں نے اس مشترکہ موضوع سے بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ ذیل میں ہم ان کا ایک مقالہ جس کا عنوان ہے "بیسویں صدی کا سب سے بڑا فتنہ کار ایڈولف ہٹلر" ہدیۂ نگاہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے مقالے کو ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں کہ:-

"تم بتا سکتے ہو کہ آج جرمنی کس اضطراب میں زندگی بسر کر رہا ہے؟"

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ جرمنی میں موجودہ خلفشار کے نتائج کیا ظہور پذیر ہو سکتے ہیں؟"

یہ سوالات ہیں جو جرمنی میں یورپ کے سفیروں کے دماغوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

لیکن ٹھہرو! تم پر وہاں کے حالات کی اصلی حقیقت ابھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

پہلے تم مجھے اجازت دو۔ کہ خود تم سے ایک سوال پوچھوں"

کیا تم اپنے تخیل کی آخری پرواز میں بھی یہ تصور کر سکتے ہو کہ انگلستان میں ایک کسان کا بیٹا جس کے دردناک ماضی مضطرب حال اور مایوس مستقبل کی کیفیت جرمن ڈکٹیٹر سے ملتی ہو۔ جو شاہراؤں پر ہٹلر کی طرح کارٹ پوسٹ کی تصویریں بیچتا پھرتا ہو۔ اور اس طرح لوگوں کی جیب سے خیرات کے پیسے وصول کر کے نان شبینہ حاصل کرتا رہا ہو جس کے شکستہ اور میلے کپڑے کسی موسم کی مصیبتوں کے بھی پردہ دار نہ بن سکے ہوں جس نے اپنی گمنام زندگی میں افلاس و بے نوائی کی وہ وہ کٹھن گھڑیاں بسر کی ہوں۔ جو کسی آوارہ سے آوارہ پر بھی نہ گذری ہوں گی۔ اور پھر دس سال سے بھی کم مدت میں کامیابی اور عروج کی بے کراں وسعتوں کو اس طرح پھلانگ گیا ہو۔ یقیناً تم انگلستان اور اس جیسے تدریجی ارتقا کے خوگر ممالک میں اس حادثے کو خرق عادت خیال کرو گے۔ لیکن ہٹلر کے معاملہ میں یہ محال بھی ممکن ہو گیا وہ تھوڑی سی مدت میں حضیض نکبت سے اٹھا اور اپنے عروج کی آخری بلندیوں پر ایک چھلانگ لگا کر پہنچ گیا۔ آج وہ کسان کا گمنام اور بھکاری بیٹا اس اقتدار کا مالک نظر آتا ہے۔ کہ بڑے بڑے جرنلوں کے عزل و نصب میں اس کا اشارہ قانون بن رہا ہے۔ اس نے جرمنی میں اس قدر رفعتوں پر تسلط جما لیا ہے کہ قیصر ولیم اپنے عہد عروج میں بھی کبھی اس نفوذ و رسوخ کا مالک نہ بن سکا تھا کیا تمہارا تصور اس منظر کو انگلستان میں بھی دیکھ سکتا ہے؟

اس کا جواب آسان اور واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ عظمت و اقتدار کی یہ چھلانگیں انگلستانی زندگی کے لئے موجب حیرت ہو سکتی ہیں حتیٰ یہ کہ ہمارے منطقے میں ہر وہ واقعہ جسے عقل محال اور وجدان ناممکن الوقوع خیال کرے۔ جرمن فضاؤں میں اُمور عادیہ کی طرح عامۃ الوقوع بن سکتا ہے بلکہ بن جاتا ہے۔ لیکن ایسے محیر العقول واقعات کا ظہور جرمن میں گذشتہ جنگ عظیم کی ہولناک ہزیمت کے بعد سے ممکنات میں شامل ہو گیا ہے۔ اس طرح ان کا انجام بھی ان حوادث کی طرح یقینی بن گیا ہے۔ کیونکہ ۱۹۱۸ء کی ہزیمت کے بعد سے جرمنی مستمر فسادات و بدنظمی کا مستقل گہوارہ ہو رہا ہے ان فسادات اور مسلسل بدامنی کے زیر سایہ ایسے خارق عادات واقعات کا وہاں ظہور ہوتا رہتا ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کی ذلیل اور گراں بار شکست نے اہل جرمنی کے غرور و کبریائی کو بری طرح چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ اس زعم کو یقین بناتے ہوئے میدان میں لڑ رہے تھے کہ کوئی دن میں جرمن قوم تمام یورپ کی سیادت حاصل کر لے گی۔ اور جرمنوں کا وہ خواب شیریں جوان کے پیشرو دیکھتے دیکھتے تابوت کی امانت بن گئے۔ اپنی شیریں تعبیر کو ہمارا الوشتۂ تقدیر بنا دے گا۔ وہ

اپنے تابناک مستقبل کو دیکھ دیکھ کر سرشار ہو رہے تھے۔ کہ گردش ایام کے ایک ہی پلٹے نے انہیں عروج آسمان سے عمیق ترین پستی سے ہمکنار کر دیا۔ اس ناقابل برداشت احساس ندامت و شرمساری کے ساتھ ان کے دل اپنے لاکھوں نوجوانوں کی موت۔ لاکھوں ہی زخمی ہموطنوں کی چیخ و پکار اور لاکھوں ہی یتیموں اور بیواؤں کے بین و بکا سے پاش پاش تھے۔ رہی سہی کسر ان جانگسل مصائب نے پوری کر دی جن میں ہزیمت کے عقاب و نکال کے طور پر ان پر وقت کے مسلط کر دیا یعنی ایک زہرہ گداز خوف و دہشت جرمن قلوب پر حاوی ہو گئی۔ ایک عام قحط نے انہیں قوت لایموت سے محروم کر دیا۔ اس پر تاوان جنگ اس بے کراں مقدار میں ان پر عائد کیا گیا کہ شکست سے چکنا چور جرمنی اس کا سود بھی ادا کرنے کے قابل نہ رہی۔ لاکھوں جرمن باشندے نان شبینہ سے محتاج ہو گئے۔ ان کے رہنے اور شب بسری کے لئے زمین کے فرش اور آسمان کی چھت کے سوا سر چھپانے کو کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اقتصادی بدحالی بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھی کہ جرمنی کا سکہ (مارک) دنیا کے بازار کی خاک کے ہم قیمت بن گیا۔ فاقہ کش جرمن مرد اور عورتیں اپنے بیش بہا سامان راحت آسائش کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر رہے تھے۔ جرمن زندگی کے لئے ہر صبح کا سورج ایک قہاری لے کر طلوع ہو رہا تھا۔ دیروز گذشتہ سے امروز حال اور امروز حال سے فردائے مستقبل ان کے لئے تاریک سے تاریک ترین کر رہا تھا۔ امن فضائے جرمنی سے عنقا صفت معدوم تھا آفاق ملک پر مصائب و مضائق کے گھٹا ٹوپ بادل چھا رہے تھے۔ یاس و قنوط قلوب کی فضاؤں میں ابر کی طرح پھیل رہے تھے۔ اور سارا جرمنی قحط و گرسنگی کے سبب ہڈیوں کا ایک انبار بن کر رہ گیا تھا۔ ان عبرانیوں (یہود) کی صورت جو فلسطین میں ہیکل کی دیوار گریہ کو چمٹ کر روتے رہتے ہیں جرمن باشندے بھی زندگی کو نارسائی میں بسر کر رہے تھے۔ ان ہولناک ساعتوں میں جبکہ زندگی کی خواہشیں ناامیدی و یاس کے طوفانی جھونکوں سے غبار راہ بن گئی تھیں ایک شخص کی صورت میں جرمن زندگی طوفان کی صورت میں ابل پڑی۔ یہ وہی وائنا کی گلیوں کا تصویر فروش فقیر تھا جس نے افلاس و فقر کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ جسے زندگی نے شکم سیری سے محروم اور ستر پوشی سے ناچار بنا رکھا تھا اس کی افسردہ ہڈیوں میں برّاقی اور جامد رگوں میں خون زندگی کر دئیں لے رہا تھا اور جس کے ادراک و شعور نے احساس خودی کو بیدار کر کے اس کی فطری طاقتوں میں وہ بالیدگی بخش دی جو کبھی "جون آف آرک" پر الہامی پیغام بن کر طاری ہوئی تھی۔

ایڈولف ہٹلر نے جرمنی کی شکست کی خبر اپنے بستر مرض پر سنی۔ اس وقت وہ ایک اسپتال میں زیر علاج تھا۔ اس المناک خبر نے اس کے نظام زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ وہ بے اختیار رو پڑا۔ اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ اس قومی رسوائی سے تڑپ اٹھا۔ راتوں کی نیند اس کی آنکھوں کے لئے حرام ہو گئی۔ وہ دن رات اپنے قومی مصائب پر غور و غوض میں مشغول رہنے لگا ۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں اس نے میونخ کی ایک سرائے میں جو ایک سڑک کے کنارے بنی تھی۔ ایک اجتماع میں تقریر کی۔ یہ جلسہ صرف بارہ نفوس پر مشتمل تھا۔ اس نے اپنی آتشیں تقریر میں حاضرین کو بتایا کہ جرمن کا م کی کن ارادی غلطیوں کے سبب یہ شکست نصیب ہوئی۔ اور اس کے بعد کی ذلیل و رسواکن شرائط صلح سے ملک کو کن مصائب سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس تقریر نے اس مختصر سے مجمع پر جادو کا سا اثر پیدا کیا۔ اور اسی وقت ایک سوسائٹی کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ اور ہٹلر کو اس سوسائٹی کا صدر بنا یا گیا۔ اس کے بعد وہ جلد ہی عام اجتماعات میں آ گیا۔ اور اس نے اپنی آتش بیانیوں سے عوام میں بے حد اثر و رسوخ پیدا کر لیا ہمیں اس کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ جرمن کی نامراد و مایوس قوم میں ہٹلر کی تقریروں نے حماست حمیت کی روح پھونک دی اور ہر جرمن باشندہ اس حالت میں نظر آنے لگا۔ جیسے وہ ایک طویل خواب سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا ہے پرواز طائر کی طرح وہ جرمن آفاق پر گھوما۔ اس نے ان کی ذہنیت کو سمجھا اور ان کی خواہشوں کا جائزہ لے لیا۔ اس نے انہیں میں سے ایسے ایسے جوان کار افراد کو چن لیا۔ جو تربیت پانے کے بعد اس کی قوت بازو بنے اور جنہوں نے ساری قوم کو احساس حمیت سے قومی عروج کی بازگشت کے لئے آتش زیر پا بنا دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء کی میونخ کی تشکیل یافتہ سوسائٹی کے بارہ افراد بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۲ء میں ۵ لاکھ تک پہنچ گئے۔

وہ اگرچہ اس سال ہنیڈنبرگ کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوا۔ لیکن یہ ناکامی اس کے جوش حرارت کو کم نہ کر سکی۔ اور چند ہی ماہ کے بعد جبکہ مارشل ہنیڈنبرگ کو ایک مشیر (وزیر اعظم) کی ضرورت تھی۔ ساڑھے بائیس لاکھ ووٹ لے کر جرمنی کا وزیر اعظم بن گیا۔

اس انتخاب میں اس کی جماعت کو ریشتاغ (جرمن پارلیمنٹ) میں ۲۳۰ نشستیں حاصل ہوئیں۔ مارشل ہنیڈنبرگ اگرچہ میدان جنگ کا دیوتا تھا لیکن یہ بوڑھا سپاہی زندگی بھر سیاسیات کے مدوجزر کو دیکھ دیکھ کر ایک سیاس کی حیثیت میں ایک اعتدال پسند واقع ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جرمنی معاہدات کی پابندیوں کے مطابق رہتے ہوئے تدریجی طور پر اپنی جنگی غلطیوں کی تلافی کرے۔ اور ۲۵ سال کی مدت میں میانہ روی

باہم گامزن رہ کر اپنا کھویا ہوا اقتدار و عروج حاصل کرے ہٹلر کی جماعت کا ان اس کی راہ میں سنگ راہ نہ بنتا۔ تو وہ اپنے نصب العین کو یقیناً اس خوبی سے حاصل کر سکتا کہ دنیا کی کسی قوم اور کسی حکومت کو بھی اس سے وجہ پرخاش پیدا نہ ہوتی۔ خود برطانیہ عظمیٰ نے فرانس واطالیہ کی سخت گیریوں کے علی الرغم جرمن قوم کے اقتدار کو بحال کرنے میں اس کی مسلسل مدد کی۔ برطانوی قوم جرمنی سے انتقام لینے اور اُسے اس حد تک بے بس کرنے کے خلاف تھی۔ کہ وہ کبھی سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ پا سکے۔ مگر ہٹلر اعتدال پسندی اور میانہ روی کو قومی کمزوری خیال کرتا تھا۔ اس نے وزارت عظمیٰ کے منصب پر پہنچتے ہی جرمن چانسلر مارشل ہنڈنبرگ کو آنکھیں دکھانی شروع کر دیں۔ مارشل موصوف نے یہ رنگ دیکھا۔ تو اپنی عزت بچانے کی خاطر چانسلرشپ سے مستعفی ہو کر سیاسی زندگی سے دستکش ہو گیا۔ اس کے ریٹائر ہونے کے بعد اڈولف ہٹلر کو پادرازی کے لیے ایک آزاد میدان ہاتھ آگیا اور وہ ریشتاغ کا چانسلر بن کر جرمن قوم کا ڈکٹیٹر بن بیٹھا۔ ریشتاغ کے خوفزدہ ممبرں نے اسے سارے ریشتاغ کی طاقت سپرد کر دی۔ اور اب جرمنی میں کوئی پارلیمنٹ اور کوئی پارلیمنٹری حکومت نہ رہی۔ قانون سازی ریشتاغ کی بجائے ہٹلر کے چشم و ابرو کے اشارات سے متعلق ہو گئی۔ مختصر یہ کہ دیکھتی آنکھوں کے سامنے ہی جرمنی کے خاکستر سے ایک نیا جرمنی اور تاریخ میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا شیطان منصہ شہود پر رونما ہو گیا۔ خوشامدی ساتھیوں نے اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر جرمن ڈکٹیٹر کو پیغمبر آزادی کہنا شروع کر دیا۔ اس کے حاشیہ نشینوں نے کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ اور ان کتابوں میں اسے "مسیح زندہ" بنا ڈالا۔ اس کی کتاب "مائن کیمف" کو انجیل کا رتبہ دے کر انجیل عیسوی کو جرمنی کے قلمرو میں ممنوع الاشاعت قرار دیدیا۔ مختصر یہ کہ آزاد جرمنی کے آزاد باشندے ہٹلر کی غلامی میں شامل کر دیئے گئے۔

اے ہٹلر — ہاں ہٹلر کے لئے تاریخ عالم کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ ان صفحات پر تا ابد مورخین عالم انسانی زندگی کی بربادی سے متعلق ہٹلر کے جرائم ثبت کرتے رہیں گے۔ اور جہنم کی تاریک ترین گہرائیوں کے دروازے بھی اس کے لئے کھول دیئے گئے ہیں۔ جہاں اس کی روح ابد الآباد تک معمورۂ انسانیت کی تباہی کے عقاب و عذاب سے جلتی رہے گی۔

ادارہ

نیا ادب

(بقیہ صفحہ ۵۱)

کے لئے آپ دو چار اور جا ہائے نشستن کے نام دیکھئے۔ "کنار دریا' صحن چمن' لب جو' طرف کوہ' اور ان نرم نرم الفاظ سے نظر ہٹا کر پھر لفظ "ڈھیر" پر نظر جمائیں۔

مصرعہ ۶ میں تشبیہ کتنی بلیغ ہے: "جس طرح مردار کھا کر اونگھتا سا گدھ کوئی" اس کے لئے شاعر کے حسن انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا اور آخری مصرعے میں اس وحشی کا شغل دیکھیے۔ "ٹھنٹھناتا بار بار خشت شور آلودہ سی اینٹوں کو وہ ایک ہڈی سے بہم" لفظ "ٹھنٹھناتا" سے خود صفحہ قرطاس پر سے اینٹوں کی آواز پیدا ہو رہی ہے۔ اور پھر وحشی کا اینٹوں کو ایک ہڈی سے ٹھنٹھنانا اس کی وحشت کی تصویر کو کتنا مکمل کر رہا ہے۔ مصرعے کی لمبائی آواز کو وسعت تسلسل دے رہی ہے۔

یہ نظم ان معدودے چند اچھی نظموں میں سے ہے جن میں انتخاب الفاظ کے لئے شاعر کی رہنمائی دل کی بجائے دماغ نے کی ہے۔

قیصر جمشید واصل

قومی دواخانہ

زیر سرپرستی

عالیجناب شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی

قومی دواخانہ کا اجرا اس غرض سے کیا گیا ہے کہ جمہور کو خالص اور قابل اعتماد دوائیں مہیا کرے مرکبات کے قیمتی اجزا مثلاً مشک عنبر مروارید اور زعفران وغیرہ ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے شامل کئے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امرا اور رؤسا، اراکین اسمبلی، اعلیٰ حکام اور والیان ریاست تک قومی دواخانہ کے خریداروں کے حلقہ میں شامل ہیں۔

دماغی

ضعف دماغ اور ضعف حافظہ کا بہترین علاج

آجکل ضعف دماغ ایک عام بیماری ہو گئی ہے۔ نوجوانی کی غلط کاریاں اکثر اس کا سبب ہوتی ہیں زیادہ دماغی محنت کرنیوالے طالبعلم مصنف اور وکلا اکثر دماغی کمزوری میں مبتلا ہو جاتے ہیں ذرا سی سردی یا گرم ہوا ان لوگوں کو نزلہ میں مبتلا کر دیتی ہے جو مزید دماغی کمزوری کا موجب ہوتا ہے، **ضعف دماغ نزلہ دائمی اور یادداشت کی کمی کیلئے "دماغی" بہترین دوا ہے** کیونکہ اس سے بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ ہوا کی سردی یا گرمی باسانی برداشت ہو سکتی ہے نزلہ کی تکلیف نہیں ستاتی غرضیکہ دماغ کی کمزوری کے جملہ عوارض کے لئے اکسیر ہے۔

ترکیب استعمال ۲ ماشہ صبح و شام استعمال کریں قیمت فی شیشی پانچ روپے

دوائے عجیب

خون کے دباؤ بلڈ پریشر کی بہترین دوا

خون کا دباؤ آجکل ایک عام مرض ہو گیا ہے عصبی کمزوری۔ دماغی کام کی زیادتی اور دیگر کئی وجوہات سے خون کا دوران عروق شعریہ میں تیز ہو جاتا ہے سر میں درد اور پیشانی اور کنپٹیوں میں تناؤ محسوس ہوتا ہے قلب کمزور ہو جاتا ہے اور دل کی دھڑکن سخت پریشان کرتی ہے۔ یہ دوا ان مریضوں کے لئے واقعی عجیب ہے۔

ترکیب استعمال ہمراہ۔ قیمت ایک مہینہ کی دوا پانچ روپے (۵؎)

عرق ماء اللحم انگوری وطیوری

دل و دماغ کو فرحت بخشنے والا ایک شاہی نسخہ

اعضائے رئیسہ و شریفہ کو طاقت دینے کے لئے ہمارے ہاں کا ماء اللحم ایک خصوصیت رکھتا ہے بیشتر پرندوں اور جانوروں کا گوشت شامل کر کے عرق کھینچا جاتا ہے جس کے اندر مشک زعفران وغیرہ قیمتی اجزا بھی ملائے جاتے ہیں غرضیکہ خفقان غشی ضعف قلب ضعف دماغ ضعف باہ اور دیگر تمام جسمانی کمزوریوں کے لئے یہ ماء اللحم ایک تحفہ بے بہا ہے خون صالح کثیر مقدار میں پیدا کرتا ہے اور مردانہ قوت کے لئے خاص دوا ہے سردیوں میں اس کی ایک بوتل استعمال کر لینے سے صحت پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے جسم سرخ و سپید ہو جاتا ہے اور طبیعت میں شادمانی اور سرور آجاتا ہے

ترکیب استعمال تین تولے صبح و شام

قیمت فی بوتل چھ روپے چار آنے (۶؎)

اکسیر سل و دق

مریضان دق کو مژدہ

یہ عجیب و غریب کیمیا دی دوا سل و دق جیسے ہلاکت آفرین مرض کا یقینی اور شفا بخش علاج ہے پھیپھڑوں کے زخموں کو بھرنے کیلئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے بخار کی حرارت صرف دو ہی ہفتوں میں گھٹا دیتی ہے اور خون صالح پیدا کر کے جراثیم کا قلع قمع کر دیتی ہے کھانسی کی شدت تو چند ہی خوراکوں سے رفع ہو جاتی ہے اور صرف ایک مہینے کے عرصہ میں کمزور اور نیم جان مریض از سر نو زندگی حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ کے اعزہ میں سے کوئی شخص اس جانگسل مرض میں مبتلا ہو جائے تو فوراً اکسیر سل و دق کا استعمال شروع کر دیں آپ اس کے حیرت انگیز اثرات کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ خوراک صبح و شام کھائیں قیمت ۶۰ خوراک ایک مہینہ کے لئے دس روپے (۱۰؎) مفصل ترکیب استعمال ہمراہ ہے۔

پتہ:- ناظم قومی دواخانہ ۳۶ میکلوڈ روڈ لاہور

India's Foremost Illustrated Literary & Educational Monthly

MASTER PIECE

اُردو زبان کی پانصد سالہ تاریخ میں

"اُردو مرکز لاہور"

شاندار علمی کارنامہ

پچاس ہزار روپے کے صرف سے کئی سال کے اُردو ادب کا نچوڑ

۳۰ مجلدات میں

ملک کے ۷۰ نامور اہل قلم نے

علامہ تاجور کی زیر سیادت

اور

آنریبل سر عبدالقادر، خان بہادر شیخ نور الٰہی آئی ای ایس اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب و پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی

زیر نگرانی

اُردو لٹریچر کے بیکراں انبار کی چھان بین اور لاکھوں صفحات کے مطالعے کے بعد اُردو کے جاندار اور کارآمد حصوں کا تاریخی ترتیب کے پیش نظر

شعبہ وار انتخاب حسب ذیل ۳۰ مجلدات میں مرتب کیا ہے

(۱) جدید و قدیم اُردو مرثیے کا انتخاب۔ جدید و قدیم مستند مرثیہ نگاروں کے نام، جدید مرثیہ کی اصناف کی تصاویر کی خصوصیات شاعرانہ کی تفصیل مع دیباچہ اُردو کے تنقید ۱۴ جلدوں میں

(۲) ملک کے مستند افسانہ نگاروں کے سبق آموز دلکش افسانوں کا انتخاب مع تصاویر و تبصرہ و دیباچہ تاریخی ۱۱ جلدوں میں

(۳) ہر دور کے منتخب سربرآوردہ شعراء کی مستند نظمیں مع تصاویر و خصوصیات نگارش و دیباچہ ۵ جلدوں میں۔

(۳۰) مجلدات کا یہ سٹ محکمہ تعلیم کا منظور شدہ ہے تجارتی بک کمپنی نے حسب سرکلر لیٹر نمبر ۱۲۵۹ منظور کیا ہے

ہر لائبریری و کتب خانہ، اس تاریخی سیٹ کے بغیر مکمل نہیں کہلائی جا سکتی ہر کتاب کی نہایت صحیح بصورت مجلد اور ہر کتاب کی محکمہ تعلیم کی مقرر کردہ قیمت کل ایک روپیہ ہے

طالبات اُردو ادب کے موزوں اُردو ادب کے اساتذہ، امتحانات کے امیدوار طلبہ و طالبات نیز ہر وقت کے عام اُردو خواں مرد و خواتین کے مطالعے کیلئے ازبس ضروری ہیں

دفتر اُردو مرکز بک ڈپو - لاہور

شاہکار

جلد ۱۴ ماہ اپریل ۱۹۴۲ء نمبر ۴

فہرست

حصہ نثر

حصہ نظم

احسان امرغان تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور پرانی تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار فتح محمد روڈ متصل تکیہ ادلی سے شائع کیا

مختصرات

مردم شماری کی بوالعجبیاں

گذشتہ جنگ عظیم سے قبل شیعہ سنی جماعتوں میں جب کبھی کسی جگہ کوئی ہنگامہ ضرب و ضرب برپا ہوکر دونوں طبقات میں کشیدگی ہوجاتی تھی۔ تو شیعہ کانفرنس میں اس حادثے کے خلاف اظہار ناراضگی کی قرارداد پر تلخ لہجہ مقرر جوشِ خطاب میں یہ بھی کہہ جایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں مومنین (شیعہ حضرات) کی جماعت ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ رہی مومن برادری (نوربافوں کی برادری) ہمیشہ سے عام مسلمانوں میں مدغم رہی۔ اس کی کوئی الگ حلقاتی تنظیم نہ تھی۔ دستکار طبقات میں اس کا شمار رہا۔ اور مردم شماری میں تین پینتالیس لاکھ کے درمیان اس کی تعداد تھی لیکن اصلاحات ملنے پر جب سے اقوام و طبقات کو سیاسی حقوق ملنے لگے۔ ملک کا ہر طبقہ اور ہر فرقہ اپنی اپنی تنظیم میں مصروف ہوگیا۔ اور ہر جماعت نے اس سلسلہ میں اپنے اپنے سلسلۂ نسب کی سراغ رسانی شروع کر دی۔ مسلمانوں میں ہر طبقے کے تعلیم یافتہ حضرات نے تحقیق و تفحص کر کے کسی صحابی کسی مشہور پیر طریقت یا کسی عربی قبیلے کے کسی سردار تک نسل و نسب کی ڈور کھینچ تان کر پہنچا دیا اور دیکھتے دیکھتے عجیب و غریب تاریخیں تیار ہوگئیں حضرت سلیم الرامی ارائیں طبقے کے پیر کامل (ایک خدا رسیدہ صوفی) کلالوں کے "بنو امیہ" قصابوں کے "قریش مکہ" میراثیوں کے "انصار مدینہ" مومن برادری کے، افغنہ بن ارمیا (ابن حضرت طالوت علیہم السلام) افغانوں کے مورث اعلیٰ قرار پائے۔

نسبی مجد و تقدس کے انتظام سے فارغ ہوکر ان میں سے کچھ طبقے سیاسی حقوق میں سب سے بڑے حصہ دار بننے کی خاطر اپنی مردم شماری کی تصنیف کی جانب متوجہ ہوگئے۔ شیعہ بھائیوں کو نسبی کاوشوں سے تو یوں نجات مل گئی کہ وہ پہلے ہی سے حسنی اور حسینی ہیں البتہ دوسری مصروفیت میں انہوں نے جی لگا کر کام کیا۔

وہ ایک کروڑ کے ادعا سے یک زقند ڈھائی کروڑ بن گئے اور دوسری زقند میں جس کی حد ۱۹۴۳ء تک ہے ساڑھے تین کروڑ ہوگئے اور تیسری چھلانگ میں ساڑھے چار کروڑ ہو چکے ہیں بالفاظ دیگر بیس سال میں ایک کروڑ کی آبادی میں ساڑھے تین کروڑ کا اضافہ ہوگیا جاؤ جل

جماعت مومنین پاک کی دیکھا دیکھی "مومن برادری" (جماعت نوربافاں) کو بھی حرص دامنگیر ہوئی اور اس کے لیڈر پہلی زقند میں ساڑھے تین کروڑ اور دوسری نصف میں ساڑھے چار کروڑ ہو کر اگلی زقند کی تیاری کر رہے ہیں۔ الحاصل اب ہندوستان میں مومنین کی یہ دونوں جماعتیں آٹھ کروڑ افراد کی مالک بنی بیٹھی ہیں حالانکہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس ملک میں مسلمان آٹھ کروڑ چند لاکھ ہیں گویا مومنین کی ہر دو جماعتوں کے ادعا کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے کم و بیش تیس چالیس لاکھ غیر مسلموں کو مسلمان بنانا پڑیگا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمام کو اس مذہبی ایثار پر آمادہ کرنا بھی ضروری ہو جائیگا کہ وہ ہندوستان کے [illegible] پٹھانوں، شیخوں، راجپوتوں، راعیوں، قصبوں، لوہاروں، مرچیوں اور بے شمار مسلم طبقات کو اپنی جاتی میں شامل تصور کرنے لگیں۔

دوسری طرف خطرہ یہ بھی ہے کہ قصابوں اور لوہاروں کی جماعتیں جن میں ہر جماعت واقعۃً مومن جماعت اور مومن برادری سے دوچند ہے کہیں ان کے جماعتی لیڈروں میں زندگی کی کوئی تڑپ پیدا ہوگئی۔ اور اکثریت سازی کے شوق بیقرار نے انہیں بھی مردم شماری کی تصنیف کی جانب مائل کر دیا۔ تو یہ دونوں جماعتیں اپنی "پیشرو برادریوں" سے روشنی لے کر بیس کروڑ بن کر بھی دم نہ لیں گی۔ اور ان کے بعد یا ساتھ ہی شیخ برادری نے بھی اگر اپنی سیاسی تنظیم کے لئے کوئی کروٹ بدلی۔ تو ان کی چار شاخوں سے تو اسلامی ہند کے چاروں گوشے بھرے پڑے ہیں۔ ہر شاخ نے ڈھائی کروڑ کا دعوےٰ بھی دائر کر دیا۔ تو دس کروڑ سے کم کی ڈگری پر شیخ رہنما بھی راضی نہ ہوں گے پھر اس امکان پر اس امر محال کی تعبیر ناگزیر ہو جائیگی کہ ہندوستان کی ساری آبادی میں ہندو عیسائی سکھ اور پارسی نام کے کسی جاندار کا وجود بھی باقی نہیں بلکہ نظری مسکر حس سے امان اٹھا دیگا۔ تمام مشاہدات نظر کا دھوکہ کہلائیں گے اور تیس کروڑ جیتے جاگتے انسان مرزا غالب کے "اصنام خیالی" بنکر رہ جائیں گے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں پانچ سال پیشتر کے اخبارات اٹھا کر پڑھ لیجئے اُن میں آپ کو شیعہ اور مومن کانفرنسوں کی قراردادوں میں "ساڑھے تین کروڑ" کا ادعا بہ مشاہدہ واضح نظر آئیگا۔ تفرقہ پرداز سبھائی اخبارات میں وہ قراردادیں چار کالمی سرخیوں میں جاذب توجہ کالموں میں مندرج ملیں گی لیکن دو سال سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان قراردادوں کے الفاظ وہی ہیں جو ۱۹۳۵ء میں تھے۔ البتہ ہر دو جماعتوں کے رہنماؤں نے "ساڑھے تین کروڑ" کے مرکب عددی کو "ساڑھے چار کروڑ" سے تبدیل کر لیا ہے۔ گویا تین سال کی قلیل مدت میں ہر دو جماعتوں پر افزائش نسل کا ایسا دورہ پڑا کہ ایک کروڑ افراد کا ہر ایک میں اضافہ ہوگیا۔ یہ بے تحاشا اضافہ اگر واقعۃً صحیح ہے تو سمجھ لیجئے کہ آئندہ ۲۵ سال تک اس برِ اعظم کی بے کراں وسعتیں انسانی آبادی کے لئے قفس بن جائیں گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس انداز میں ریاضی کے اعداد کے ذریعہ سیاسی شاعری کی جا رہی ہے۔ مگر اس شاعری کا رواج عرب کے "عہد جاہلیت" کے ساتھ ختم ہو چکا ہے جبکہ اچھے شعر کی تعریف "اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُہٗ" (سب سے اچھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ دروغ بیانی سے کام لیا گیا ہو) کی جاتی تھی۔ اب یہ سکہ نہیں چلے گا۔

گذشتہ تیس سال میں تین بار ہندوستان کی مردم شماری ہو چکی ہے۔ ان

مردم شماریوں کی سرکاری رپورٹیں ملک کی تمام لائبریریوں میں محفوظ اور ملک کے ہر ضلع اور ہر قصبے میں مل سکتی ہیں۔ انہیں اٹھا کر پڑھ لیجئے۔

پارسال جو مردم شماری ہوئی۔ اس کی رُو سے شیعہ حضرات کی تعداد تیس لاکھ اور مومن برادری پچاس لاکھ کے لگ بھگ نکلتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہر دس سال کے بعد جو مردم شماری کی جاتی ہے۔ حکومت کے زیر اہتمام کی جاتی ہے۔ حکومت کے بغیر یہ مہم سر بھی نہیں ہو سکتی۔ آج تک یہ بھی کبھی نہیں سنا گیا کہ کوئی مردم شماری غیر سرکاری طور پر بھی کبھی ہوئی یا ہو سکتی ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مردم شماری کرنے والوں کو جن میں ہندو مسلمان اور مسلمانوں میں شیعہ سنی، نوربافت اور طوربافت سبھی جماعتوں کے افراد ہوتے ہیں۔ شیعہ جماعت یا مومن برادری سے کوئی ذاتی بغض ہے اور شیعہ اور مومن کو بھی وہ سنی اور شیخ لکھ دیتے ہیں۔ پھر آخر شیعہ رہنماؤں اور نوربافت لیڈروں کی قوت باصرہ پر چند سال سے اس قدر ویدانتی رنگ کیوں چھا رہا ہے کہ

"جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تُو ہے"

خاتمہ گذارش کے طور پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ راقم السطور کانگریسی ہے نہ مسلم لیگی، احراری نہ نام دھاری سیاسیات کے دائرے سے بارہ پتھر باہر ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے اور بس!

تاجور

اسلامیہ کالج لاہور:-

سنا جاتا ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور نے پرنسپل کو ارباب نظم ونسق نے اس انداز میں زائد المیعاد بنا کر کالج کی خدمات سے سبکدوش کر دیا کہ دو دن پیشتر تک نہ طلباء کو اس حادثے کی اطلاع تھی۔ نہ اسٹاف کو اور بہ روایت بعض اساتذہ نہ خود پرنسپل کو۔ اور اس سلسلے میں اس قدر شتاب کاری کو برتا گیا۔ کہ نئے پرنسپل کے لئے نہ اعلان شائع ہوا۔ نہ درخواستیں طلب کی گئیں۔ نہ اس منصب کے لئے کسی کا انتخاب زیر غور آیا۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو انتہا درجہ اندوہناک ہیں۔ محترم خواجہ دل محمد صاحب جیسی ایک معزز شخصیت کے مالک ہیں پنجاب کے مشہور ماہر ریاضی ہونے کے ساتھ ہی ان کی متنوع قابلیتوں نے انہیں تمام طبقات میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے ایک ایسے باوقار و ذی وجاہت تعلیمی رہنما کو یہ یک گردش قلم اس انداز میں پرنسپل شپ سے سبکدوش کر دینا حمایت اسلام کی انتظامی بوالعجبیوں میں ایک افسوسناک اضافہ ہے ـــــ ہم ارباب انتظامیہ سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ صوبے کے اس سب سے بڑے اسلامی ادارے میں ان بے تکی کاریوں کا سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں، آخر وہ ساعت سعید کب آئیگی جبکہ کالج کو ایک مستقل آزاد ولائے اور آزاد کار پرنسپل کی خدمات میسر آسکینگی۔ انجمن کے ارباب حل وعقد کا روائی طرز عمل دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اس خواب کو کبھی تعبیر بھی نصیب ہوگی۔ مسٹر ہنری مارٹن، مسٹر عبداللہ یوسف علی، مسٹر ایم اے غنی کے بعد پرنسپل کی اچانک سبکدوشی یہ اس صوبے کے تعلیمی واقعات ہیں جن کے پیش نظر اسلامیان پنجاب کی رہنما انجمن کے اقتدار پرست ارباب سے یہ مطالبہ کرے تو بیجا نہ ہوگا کہ تم اس امانت کے

سامنا

یوں ہوا تھا بارِ اول اُن کا میرا سامنا

جس طرح آوارہ نغموں کو بہم کر دے فشار
یا کسی طوفان سے ہو جائیں موجیں ہمکنار
ٹوٹ کر جیسے فضا میں ناگہاں تارے ملیں
یا کہیں پردیس میں دو درد کے مارے ملیں
یوں ہوا تھا بارِ اول اُن کا میرا سامنا
کیا کہوں اے ہمنشیں! تھا کس مزے کا سامنا

بارِ اول جب ملے تو مل کے یوں گھُل مل گئے

جس طرح موجِ صبا میں حل ہو پھولوں کی شمیم
جس طرح سیراب ہو شبنم کو پی پی کر نسیم
جس طرح ہو برگِ گل میں رنگ و بو کا امتزاج
جس طرح افلاس کے رُخ پر ہو نورِ احتیاج
بار اول جب ملے تو مل کے یوں گھُل مل گئے
دل ملے، امید کے گویا شگوفے کھِل گئے

ہدیۂ دل لے لیا اور ہدیۂ دل دے دیا

وہ اُدھر خوش ہیں کہ یہ سودا تو وجہِ غم نہیں
یعنی یہ جامِ سفالیں جامِ جم سے کم نہیں
دل اِدھر شاداں کہ اس کو مل گیا اوجِ قبول
جوہری کی بھول تھی لیکن بہت دلچسپ بھول
ہدیۂ دل لے لیا اور ہدیۂ دل دے دیا
سادگی! بدلے خزف کے ماہِ کامل دے دیا

چوہدری منظور احمد منظور بی اے ایل ایل بی

غزل

نگاہِ مست نظر میں سمائی جاتی ہے	نیاز و ناز کی دنیا بسائی جاتی ہے

یہ دلفریب نظارے، یہ دلنواز حسین	حقیقتِ غمِ ہستی چھپائی جاتی ہے

کچھ اس طرح سے نگاہوں کے تار ملتے ہیں	کہ حسن و عشق میں بجلی سمائی جاتی ہے

عروسِ ماہ کی سرکار میں تعالے اللہ	شرابِ حسن نظر سے پلائی جاتی ہے

وہ برقِ حسن جو لہرا رہی ہے ہونٹوں پر	بہار بن کے مرے دل پہ چھائی جاتی ہے

عیاں نہ ہونے دے نظروں سے جذبۂ الفت	یہ من کی آگ ہے من میں جلائی جاتی ہے

سمجھ رہا ہوں خزاں کو نوید موسم گل	کچھ اس طرح خلشِ غم مٹائی جاتی ہے

نظر وہ برقِ جمال اور وہ پیام سرور	اسی سے آگ لگائی بجھائی جاتی ہے

یہ رقصِ جام یہ دُنیائے رنگ و بو یہ بہار	یہ مجھ سے کیوں مری جنت چھڑائی جاتی ہے

ادائے حسن ہے کچھ اس قدر لطیف و گداز	نظر پہ چڑھتی ہے دل میں سمائی جاتی ہے

یہ درسِ ضبط ہے احسن کہ امتحانِ وفا
بڑھا بڑھا کے محبت گھٹائی جاتی ہے

بیوی

تعارف

سر شنکر شرما	ادھیڑ عمر کے پروفیسر
مادھوی	سر شنکر کی نوجوان بیوی
للت کمار	مادھوی کا لڑکپن کا دوست
رام دیو	سر شنکر کا ملازم
مقام	مادھوی کا ڈرائنگ روم
وقت	پونے ۹ بجے شب

سر شنکر۔ (آپ ہی آپ) ابھی تک للت نہیں آیا۔ اچھا ہے مجھے کچھ اور موقع مل گیا جب تک میں کچھ اور انتظام کروں گا (جیب سے گھڑی نکال کر) ابھی نو بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں میرا تو خیال تھا عشاق بے صبر ہوتے ہیں وہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ پہلے ہی آ موجود ہوگا مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا (گھڑی کو جیب میں رکھتے ہوئے) خیر اب آتا ہی ہوگا ٹھیک نو بجے آنے کو لکھا تھا (بلند آواز سے) رام دیو! رام دیو!

رام دیو۔ جی آیا۔ (رام دیو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے)

سر شنکر۔ کیوں رام دیو کوئی آ تو نہیں رہا ہے؟

رام دیو۔ جی نہیں۔

سر شنکر۔ خیر (رام دیو جانے لگتا ہے) ذرا سنو رام دیو۔ کچھ دیر پہلے اطلاع ملی ہے کہ لیڈی شرما کا کوئی پرانا دوست نو بجے ان سے ملنے آ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم ہے کہ وہ بوا جی کے ہاں گئی ہیں میں نے سوچا ممکن ہے انہیں واپس آنے میں دیر ہو اس لئے میں فوراً گھر چلا آیا اگر وہ شخص آ جائے تو لیڈی شرما کو پوچھے تو اسے سیدھے کمرے میں پہنچا دینا لیکن اسے خبر نہ ہونے پائے کہ لیڈی شرما گھر پر موجود نہیں ہیں سمجھ گئے نا!

رام دیو۔ جی حضور!

سر شنکر۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔

(رام دیو چلا جاتا ہے)

سر شنکر۔ (خود بخود) ابھی تک مادھوی بالکل بچی ہے کہیں دوست کے خط کو بھی کوئی اس طرح بے پروائی سے ٹیبل پر پھینک دیتا ہے۔ وہ تو کہو میری ہی نظر پڑی اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو کیا خیال کرتا؟ اور کچھ تعجب بھی نہیں جو کسی کی نظر پڑ گئی ہو میں نے کتنی کوششوں سے اسے بوا کے ہاں جانے پر رضامند کیا ہے ساتھ بولا تاکید تو کر دی ہے کہ نو بجے میری کار جائیگی اور اسے واپس لے آئیگی پہلے اسے آنے نہ دیگی اس طرح مجھے آدھ گھنٹے کا وقت

اور مل گیا ہے (ٹہلتے ہوئے) للت نے اپنی سابقہ نسبت کو یاد دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے تمام محبت نامے میرے پاس بحفاظت موجود ہیں

امید ہے کہ میرے خطوط بھی تمہارے پاس محفوظ ہوں گے

(ایک کرسی پر بیٹھ کر) میں نے ہی غلطی کی ۴۰ برس کی عمر میں بیس برس کی نوجوان لڑکی سے شادی کر لی کہاں کی دانشمندی تھی؟ پھر مجھے تعلیم و تدریس کے سوا دوسرے کسی مشغلے سے دلچسپی نہیں اور وہ ہے ایک امیر کبیر ماں باپ کی بیٹی اور کلکتہ کی سوسائٹی میں اسے نہ جانے کتنے نوجوانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا اس لئے میں کس طرح اطمینان سے کہہ سکتا ہوں اگر الٹی صورت میں وہ مجھے پسند کرتی ہو تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میری بیوی ہے اس کو مجھ سے محبت ہو یا نہ ہو اس کی عصمت کی حفاظت میرا فرض ہے اگر وہ مجھ سے ترک تعلق کرے تو بیشک اس کے اس معاملے سے مجھے کوئی واسطہ نہ ہوگا مگر اس کے پہلے … (یکایک خاموش ہو جاتے ہیں)

(للت کمار داخل ہوتا ہے مگر کرسی کی آڑ میں ہونے کے باعث وہ سر شنکر کو نہیں دیکھتا)

للت کمار۔ (ادھر ادھر دیکھ کر خود بخود) عیش و عشرت کے یہ سامان … مادھوی سے محبت کے معاملے میں حسن نے میں نہیں کیا ایک عورت کے لئے دولت و ثروت سازو سامان اور عیش و راحت ہی سب کچھ ہے اس کے نزدیک محبت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میں مادھوی کے لئے اتنے سامان فراہم نہیں کر سکتا تھا پھر بھی میں اسے آرام و اطمینان سے رکھ سکتا تھا اول اول جب ہم دونوں میں ملاقات و شناسائی ہوئی مادھوی پندرہ سال کی تھی اس کے بعد چار سال تک ہم دونوں گہرے دوست کی حیثیت سے برابر ملتے جلتے اور ایک ساتھ نشست و برخاست کرتے رہے جب میں ولایت جا رہا تھا تو اس نے کس وثوق کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ میرا انتظار کریگی لیکن ایک ہی سال میں … لیکن نہیں اس نے اپنی رضامندی سے شادی نہ کی ہوگی اس کے باپ نے اسے شادی کرنے پر مجبور کیا ہوگا اس میں کچھ شک نہیں کہ مادھوی میرے سوا کسی سے محبت نہیں کر سکتی وہ میری ہے اور میری ہی رہیگی۔ وہ اب تک مجھ سے محبت کرتی ہے ورنہ اس وقت ملنے کے لئے مجھے خط کیوں لکھتی؟ اس نے لکھا تھا کہ آج سر شنکر بورڈ آف ڈائرکٹرس کی آکسٹرا کی معمولی میٹنگ میں جائینگے اس لئے ان کی واپسی میں یقیناً دیر ہوگی تم نو بجے تک ضرور آ جانا میں تمہارے انتظار میں رہونگی۔ …

سر شنکر۔ نو بجنے میں صرف چھ منٹ اور باقی ہیں۔

للت (چونک کر) ایں یہ کون؟

سر شنکر (کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے) کیا کہا آپ نے؟

للت "میں ... میں نے پوچھا آپ کون ہیں؟

مسٹر شنکر "واہ کیا خوب! آپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میرے دل میں بھی یہی سوال پیدا ہوا تھا۔

للت "لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کو میرے متعلق یہ جاننے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟"

مسٹر شنکر "کچھ خاص ضرورت تو نہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ انسان کو ایک دوسرے سے واقف ہونا ہی چاہئے۔"

للت "لیکن کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ آپ میرے متعلق آپ اپنا یہ خیال ترک کر دیں گے؟ میں اس صاف گوئی کے لئے معذرت ...

مسٹر شنکر "نہیں نہیں اس معذرت خواہی کی ضرورت نہیں۔ (وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

للت "آپ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے آپ اس گھر کو بالکل اپنا گھر سا خیال کئے بیٹھے ہیں۔"

مسٹر شنکر "جی ہاں، لیکن ایسا خیال کرنے کی کوئی وجہ تو نہیں معلوم ہوتی۔

للت "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ مسٹر شنکر اور لیڈی شرما کا مکان ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ لیڈی شرما کے کمرے میں اتنی بے تکلفی کے ساتھ کیسے تشریف فرما ہیں؟

مسٹر شنکر "بیشک۔ مگر آپ کو اس طرح کے سوال کا جتنا حق ہے اس کے جواب نہ دینے کا مجھے اس سے کم حق حاصل نہیں۔

للت "لیکن شاید آپ اسے بھول رہے ہیں کہ میں آپ کو لیڈی شرما کے کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔"

مسٹر شنکر "نہیں میں اسے بھول نہیں سکتا۔ میں پہلے کھڑا تھا اس کے بعد بیٹھ گیا۔ اور اگر آپ تھوڑی دیر اور کر کے آتے تو شاید مجھے سوتا ہوا پاتے۔ اور ہاں آپ نے خوب یاد دلایا کیا میں بھی آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ یہاں کس غرض سے آئے ہیں؟"

للت "میں ... میں لیڈی شرما سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔"

مسٹر شنکر "کیا خوب! میرے آنے کی غرض بھی یہی ہے۔"

للت "کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ لیڈی شرما جیسی شادی شدہ خاتون کے کمرے میں رات کے وقت ایک اجنبی کی موجودگی کس قسم کے شکوک کا موجب ہو سکتی ہے؟"

مسٹر شنکر "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک بڑے خطرے سے ہوشیار کر دیا میرا خیال اب تک اس طرف نہیں گیا تھا۔ آپ یقیناً ایک دوراندیش آدمی ہیں۔ اچھا تو کہئے اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

للت "شریف آدمی کے لئے تو بس ایک ہی صورت ہو سکتی ہے ...

مسٹر شنکر "میں نے آپ سے اپنی شرافت کے بارے میں کب کہا تھا؟ خیر اس بات کو جانے دیجئے مجھے وہ صورت بتائیے۔

للت "بس یہاں سے فوراً رفوچکر ہو جائیے۔"

مسٹر شنکر "صورت تو آپ نے بہت معقول بتائی مگر میں سوچتا ہوں میرے چلے جانے کے بعد آپ کی موجودگی بھی شبہات کا باعث ہو سکتی ہے۔"

للت "میری موجودگی شبہات کا باعث کیوں ہونے لگی؟"

مسٹر شنکر "فرض کیجئے میں آپ کے کہنے کے مطابق یہاں سے چلا گیا اور آپ تنہا رہ گئے تو حیثیت ایک شریف آدمی کے آپ کے لئے بھی وہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ آپ بھی یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

للت "آپ کا خیال صحیح نہیں۔ ہم دونوں کی حالت یکساں نہیں ہے۔ میں لیڈی شرما کے خاص بلاوے پر یہاں آیا ہوں۔"

مسٹر شنکر "اگر یہ بات ہے تو ہم دونوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں۔ میں بھی خاص دعوت ہی پر یہاں آیا ہوں۔"

للت "میں اس پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا کہ آپ کو یہاں آنے کے لئے دعوت دی گئی ہے۔ لیڈی شرما بیک وقت ہم دونوں کو ہرگز بلا نہیں سکتیں؟"

مسٹر شنکر "آپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میرے دل میں بھی یہی خیال پیدا ہوا تھا اور اب بھی مجھے یقین نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کو اس وقت یہاں آنے کے لئے مدعو کیا ہوگا۔"

للت "کیا آپ نے ایک لمحے کے لئے بھی اس بات پر غور کیا ہے کہ مسٹر شنکر کو آپ کے آنے کا علم ہو جائے تو لیڈی شرما پر کیا گذرے؟"

مسٹر شنکر "کیا فرمایا؟"

للت "میں کہہ رہا ہوں اگر مسٹر شنکر کو آپ کے آنے کا پتہ چل گیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ لیڈی شرما کا کیا حشر ہوگا؟"

مسٹر شنکر "اجی مسٹر شنکر کو وہ کب خاطر میں لاتی ہیں پھر انہیں پرکیا موقوف ہے آج کل عام عورتوں کے نزدیک شوہر کی کوئی حقیقت نہیں۔"

للت "تو آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لیڈی شرما پر مسٹر شنکر کا کوئی دباؤ نہیں؟"

مسٹر شنکر "جی ہاں، اس لئے کہ ماڈرن عورتوں کے نزدیک شوہروں کی حیثیت تانگے کے ٹٹو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ شوہروں کو اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ایک آلہ کار سمجھتی ہیں اور بس۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ آپ اس فضول مسئلے پر مغز پاشی کیوں کر رہے ہیں؟"

للت "اس لئے کہ لیڈی شرما سے میرے دیرینہ تعلقات و مراسم ہیں، اس بنا پر ان کی نیک نامی و بدنامی کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔"

مسٹر شنکر "میں آپ کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا لیڈی شرما سے میرے دیرینہ مراسم نہیں لیکن ان کے شوہر مسٹر شنکر میرے پرانے دوست اور کلاس فیلو ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کبھی آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔

للت "آپ کو ایسی بات کرتے شرم نہیں محسوس ہوتی۔ آپ بنتے تو ہیں مسٹر شنکر کے پرانے دوست اور کلاس فیلو اور آتے ہیں تنہائی میں ان کی بیوی سے ملنے۔"

مسٹر شنکر "اس میں شرم محسوس ہونے کی کونسی وجہ ہے؟ میرے سوا دوسرے خوش قسمت لوگوں کو بھی تو ایسے مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر میں ہی کیوں محروم رہوں آجکل تمام دنیا کی یہی حالت ہو رہی ہے عورتیں خفیہ طور پر جو کچھ کرتی ہیں اگر ان کے شوہروں کو پتہ مل جائے تو وہ دو ہی دن میں پاگل ہو جائیں ہی کو دیکھ لیجئے آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں؟"

لت "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایک ہی بات کیوں دہراتے رہتے ہیں؟ آپ نے سنا نہیں کہ میں لیڈی شرما کے خاص اصرار پر یہاں آیا ہوں لیکن آپ تو اپنے آنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں بتلاتے۔"

شنکر "اور میں مسز شنکر کی بار بار خوشامد پر . . . ."

لت ۔ ان کی بیوی کے کمرے میں ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ کیوں؟ کیا بات فرما رہے ہیں آپ؟"

شنکر "ہم دونوں کا آپس میں فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اب اس معاملے کو لیڈی شرما پر ہی چھوڑ دینا چاہئے۔

لت "آپ نے مذاق کی بھی حد کر دی۔ ارے جناب میرے ان کے پانچ سال کے تعلقات ہیں۔"

شنکر "میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ پندرہ سال کی ایک لڑکی کا آپ جیسے حسین و خوبرو نوجوان کے ساتھ بآسانی تعلق قائم ہو سکتا ہے لیکن بیس برس کی ایک دوشیزہ کا آسانی سے کسی کے قابو میں آنا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس عمر میں پہنچکر وہ دنیا کو سمجھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ وہ صرف صورت پر ریجھ نہیں سکتی لیکن آپکے پاس تو اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ لیڈی شرما سے آپکے قدیمی مراسم ہیں۔"

لت ۔ آپ تو ناحق میرا دماغ چاٹ رہے ہیں۔ یہ لیجئے (جیب سے خطوط کا ایک بنڈل نکالکر) یہ دیکھئے یہ تمام خطوط انہیں کے ہیں جو انہوں نے مجھے کبھی کبھی لکھے تھے۔ اب کہئے اس سے زیادہ ثبوت آپ کو اور کیا چاہیئے؟

مسٹر شنکر ۔ (جیب سے کاغذوں کا پلندہ نکال کر) اگر خطوط ہی تعلقات کا ثبوت ہیں تو خطوط تو انہوں نے مجھے بھی لکھے ہیں جن میں اپنی محبت کا اظہار بھی کیا ہے ممکن ہے ان خطوں میں انہوں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ ان کے دلی خیالات نہ ہوں پھر بھی یہ خطوط تو ہیں انہیں کے لکھے ہوئے!

لت "غلط بالکل غلط میں اس پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ کہ انہوں نے آپ کو عشقیہ خطوط لکھے ہوں گے۔"

مسٹر شنکر "اگر آپ کو یقین نہیں تو آیئے شرط لگا لیجئے۔"

لت "کس بات کی شرط؟"

مسٹر شنکر "لیڈی شرما ہم میں سے جس کے تعلقات و مراسم کی تصدیق کر دیں گی۔ وہ دوسرے کا بنڈل جیت لیگا۔ کیوں۔ آپ پس و پیش کیوں کر رہے ہیں للت بابو؟

لت "میں بالکل پس و پیش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یقیناً جیت میری ہی ہوگی۔"

مسٹر شنکر "تو پھر آیئے قسمت آزمائی کر لی جائے۔ پہلے آپ کوشش کیجئے گا اور بعد میں میں لیکن ایک شرط ہے۔"

[illegible] "وہ کیا؟"

[illegible] "میں ابھی پاس کے کمرے میں چلا جاؤں گا تا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں اور [illegible] سے میرا ذکر نہ کریں"

[illegible]

مسٹر شنکر ۔ تو میں پاس کے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔"

(مسٹر شنکر چلے جاتے ہیں)

لت (دل ہی دل میں) معلوم نہیں یہ کون شخص ہے؟ اور مادھوی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ . . . . تعجب ہے کہ صرف ایک سال کے اندر مادھوی میں اتنا انقلاب کیسے آگیا؟ آخر اس جیسی رومانٹک گرل ایک بوڑھے وہ بھی خشک طبع پروفیسر سے کیونکر محبت کر سکتی ہے۔"

(لیڈی شرما کا داخلہ)

لت (قریب جاکر) مادھوی!

لیڈی شرما : اچھا مسٹر للت آپ آگئے۔"

لت ۔ "مجھے تمہارے اس طرز خطاب پر تعجب ہے تمہیں یاد نہیں کہ کچھ ہی دنوں پہلے تم مجھے للت بھیا کہکر مخاطب کیا کرتی تھیں"

لیڈی شرما ۔ مگر آپ بھی تو یہ سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔ کہ میں اب مادھوی نہیں لیڈی شرما ہوں"

لت : "اس میں غلطی کی کونسی بات ہے؟"

لیڈی شرما "ممکن ہے آپ کے نزدیک غلطی نہ ہو لیکن میرے نزدیک تو بہت بڑی غلطی ہے۔"

لت : "ممکن ہے تمہارا ہی کہنا درست ہو۔"

لیڈی شرما "ممکن نہیں یقیناً۔ اور آپ کا فرض ہے کہ آئندہ مجھے لیڈی شرما کہکر مخاطب کریں۔"

لت ۔ "بہت بہتر۔ انسان کی یہ ایک عام فطرت ہے کہ اگر وہ نرخ قیمت پر کوئی جواہر خرید لے اور اسے یقین ہو جائے کہ اس نے اصلی جواہر کی قیمت دیکر غلطی سے نقلی جواہر خرید لیا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے کو تسلی دینے کے لئے نقلی جواہر بڑے فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھرتا ہے۔"

لیڈی شرما ۔ "اس کے کیا معنی؟"

لت ۔ "اس کے معنی سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ تم خوب سمجھ رہی ہو کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟"

لیڈی شرما "خیر یہ بتایئے آپ نے مجھے اس کے لئے کیوں مجبور کیا کہ میں آپ کو یہاں ضرور بلواؤں۔"

لت "کس طرح کہہ رہی ہو مادھوی؟

لیڈی شرما "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟"

لت "خیر چھوڑو اس بات کو میں سمجھتا ہوں میرے اس وقت آنے سے تمہیں جس قدر خوشی ہوئی ہوگی۔ مسٹر شنکر موجود ہوتے۔ تو تمہیں اتنی خوشی نہ ہوتی۔"

لیڈی شرما "اگر آپ ان سے واقف ہوتے تو ایسے خیال کا اظہار نہ کرتے۔"

لت "اوہو! تب تو وہ بہت دلچسپ آدمی ہوں گے۔" (دفعتاً ایک لہجہ بدل کر) مادھوی میری سمجھ میں نہیں آتا تم میرے ساتھ اس قدر بیگانہ وار کیوں پیش آرہی ہو؟ کیا تم ان مسرت آگیں ایام کو بھول گئیں۔ میں تو انہیں کی شیریں یاد کے

سہارے اب تک جی رہا ہوں ورنہ ......"

لیڈی شرما: "مجھے امید ہے کہ آپ اسی طرح جیتے رہینگے یہانتک کہ ایک روز ایک ہستی آکر آپ کی زندگی کو پُر کیف اور سرور آفریں بنا دیگی"

للت: "تم میرا مذاق اڑا رہی ہو مادھوی!"

لیڈی شرما: "مذاق نہیں میں ایک دوست کی حیثیت سے واقعی بات کہہ رہی ہوں"

للت: "تو کیا ہم ایک دوسرے کے صرف دوست ہی تھے!"

لیڈی شرما: "شاید اس سے کچھ زیادہ مگر آپ کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ میں اس وقت ایک کمسن اور ناتجربہ کار لڑکی تھی اور میرے والد آپ کو ایک متمول نوجوان سمجھ کر آپ سے تعلق قائم رکھنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اس وقت میرے والد بازار میں بہت بدنام تھے اس لئے کوئی ان کے ہاں کام کرنے کے لئے رضامند نہ ہوتا تھا یہی وجہ تھی جو والد صاحب آپ کو پاکر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو کہئے اس وقت انہوں نے میری بات نہیں مانی ورنہ آج جبکہ آپ قلاش ہو چکے ہیں میرے ساتھ ان کو بھی پچھتانا پڑتا۔ آپ ان کے ہاں جایئے۔ دیکھئے وہ آپ کے ساتھ پہلا سا سلوک روا رکھتے ہیں"

للت: "لیکن مادھوی تم ...."

لیڈی شرما: "میں نے آپ کو بار بار سمجھا دیا کہ اب میں مادھوی نہیں لیڈی شرما ہوں لیکن افسوس اتنی سی بات بھی آپ کے دماغ میں نہیں اترتی"

للت: "تو کیا تمہارا اظہار عشق و محبت اور شادی کا وعدہ وپیمان بھی تمہارے باپ کے تعلقات و مراسم کی طرح محض فریب تھا"

لیڈی شرما: "آپ حقیقت حال کے سمجھنے سے دانستہ یا نادانستہ گریز کر رہے ہیں للت بابو آپ جب کی بات کہتے ہیں میرا دنیا وی تجربہ بہت محدود تھا اس وقت میں نے جو کچھ کہا وہ میری نادانی اور ناتجربہ کاری کا نتیجہ تھا اس لئے اس عہد وپیمان سے کوئی ذمہ داری عائد بھی ہوتی ہو تو وہ مادھوی پر عائد ہو سکتی ہے۔ نہ کہ لیڈی شرما پر جو ایک ناتجربہ کار اور نادان لڑکی نہیں بلکہ بائیس برس کی ایک باصیرت مدبر اور زمانہ شناس عورت ہے"

للت: "لیکن اس کو عورت بننے پر مجبور کیا گیا"

لیڈی شرما: "دیکھئے للت بابو دائرہ تہذیب سے تجاوز نہ کیجئے آپ پندرہ برس کی نادان لڑکی مادھوی سے باتیں نہیں کر رہے ہیں"

للت: "کاش میں مادھوی ہی سے باتیں کرتا ہوتا۔ وہ نادان و ناتجربہ کار ہونے کے باوجود تمہاری طرح محبت کو دولت و ثروت اور عیش و عشرت کے عوض فروخت نہیں کر سکتی تھی"

لیڈی شرما: "اگر آپ کو اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو بہتر ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ مجھے ایسی اہانت آمیز باتوں کے سننے کی تاب نہیں"

للت: "بہتر ہے لیکن کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟"

لیڈی شرما: "اس لئے کہ میری نادانی اور ناتجربہ کاری کی یادگار آپ کے پاس میرے جو خطوط ہیں۔ انہیں آپ سے واپس لے لوں"

للت: "کیوں؟"

لیڈی شرما: "ضرورت ہے"

للت: "کون سی ضرورت ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں؟"

لیڈی شرما: "میں ایک شوہر پرست عورت ہوں اور اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی ہوں۔ اس لئے اگرچہ ان خطوط میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پھر بھی ممکن ہے وہ خطوط ان کے جذبات و احساسات کے منافی ثابت ہوں۔ اس لئے میں ان کو آپ سے واپس لے لینا ضروری خیال کرتی ہوں"

للت: "یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہ تم پر شبہ نہ کریں۔ اس لئے تم ان خطوں کو واپس لینا چاہتی ہو"

لیڈی شرما: "اچھا اب آپ مہربانی کر کے میرے کمرے سے نکل جائیں"

للت: "میں جا رہا ہوں لیکن ایک مرتبہ غور کر لو کہ اگر یہ خطوط تمہارے شوہر کے علم میں آگئے تو تمہارے حق میں اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

لیڈی شرما: "آپ اطمینان رکھئے میں نے سب کچھ غور کر لیا ہے آپ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے"

للت: "مجھے تم سے محبت ہے اور بے پناہ محبت! اس لئے میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے خطرناک سے خطرناک اقدام کرنے میں بھی پس و پیش نہ کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ سر شنکر سے تمہاری شادی ہو چکی ہے لیکن تم ان سے محبت نہیں کرتیں صرف محبت کا پارٹ کرتی ہو جسے اب میں ختم کر دینا چاہتا ہوں"

لیڈی شرما: "آپ جاتے ہیں تو جایئے۔ ورنہ میں خود چلی جا رہی ہوں"

(لیڈی شرما جانا چاہتی ہیں)

للت: (دروازہ روک کر) "نہیں نہیں جانے کی ضرورت نہیں تم یقین کرو میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لئے میں تمہارے راز کو سر شنکر پر ہرگز ظاہر نہیں کر سکتا"

لیڈی شرما: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میرے آپ کے درمیان کوئی راز ہی نہیں ہے تو آپ کسی پر ظاہر کیا کریں گے"

للت: (جیب سے خطوط کا بنڈل نکال کر) "اور یہ خطوط جو تمہارے خلاف زبردست شاہد کی حیثیت سے موجود ہیں (یکایک لیڈی شرما کا ہاتھ پکڑ کر) بولو۔ مادھوی! کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟"

لیڈی شرما: (ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) "دیکھئے میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ ورنہ سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہیں"

(سر شنکر یکایک بغل کے کمرے سے نکل کر پہنچ جاتے ہیں للت ہاتھ چھوڑ دیتا ہے لیڈی شرما پر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے)

سر شنکر: "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ دونوں کے معاملے میں مخل ہوا"

للت: "اُف! مجھ کو ذلیل کرنے کے لئے یہ اسکیم بنائی گئی تھی"

سر شنکر: (للت سے) "اب تو شاید آپ خود تسلیم کریں گے کہ آپ ہار گئے۔ اس لئے مجھے تو امتحان دینے کی ضرورت نہیں"

للت: "جی ہاں۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں ہار گیا لیکن اس ڈرامے کو یہیں ختم ....

ابھی اس کا آخری سین باقی ہے۔ گھنٹی بجتا ہوا" (گھر کے نوکر چاکر!) لیڈی شرما کے کمرے میں آکر دیکھو۔ دس بجے رات کی تنہائی میں کس لطف سے عشق و محبت کے کھیل کھیلے جا رہے ہیں"

(رام دیو آتا ہے)

رام دیو۔ (مسٹر شنکر سے) حضور نے مجھے بلایا ہے۔

مسٹر شنکر۔ "ہاں"

للت۔ "حضور! آپ ... آپ کون ہیں؟"

مسٹر شنکر۔ جس سے لیڈی شرما سوسائٹی اور مذہب کے ضابطے کے مطابق محبت کر سکتی ہیں یعنی مسٹر شنکر شرما۔ اس لئے لائیے شرط کے مطابق خطوط ادھر عنایت کیجئے۔"

مسٹر شنکر۔ (للت کے بے حس ہاتھوں سے خطوط کا بنڈل لیکر رام دیو سے) "رام دیو! آپ کو سڑک تک پہنچا آؤ۔"

رام دیو (للت سے) "چلئے!"

(للت سر جھکائے رام دیو کے ساتھ کمرے سے نکل جاتا ہے)

لیڈی شرما۔ میں سخت نادم اور شرمسار ہوں۔ اور اپنے کئے کی معافی چاہتی ہوں۔

مسٹر شنکر۔ "مجھے قبل از شادی کسی معاملے سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور آج سے تم میری وفادار بیوی ہو۔ اس کا تم نے بخوبی ثبوت دیدیا ہے۔"

لیڈی شرما (مسٹر شنکر کے پاؤں پر گر کر) تم نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ علاوہ ازیں میرے یہ خطوط میرے جرم کی شہادت دے رہے ہیں۔"

مسٹر شنکر۔ (بیوی کو قدموں سے اٹھا کر) "بے شک مجھ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے پھر بھی میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں جو تمہاری جیسی وفادار رفیقۂ زندگی ملی۔ ان خطوط کی میرے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔"

(مسٹر شنکر جیب سے دیاسلائی نکال کر خطوط کے بنڈل کو آگ لگا دیتے ہیں اور خطوط جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ لیڈی شرما ان کا پاؤں چھونے کے لئے جھکتی ہے۔ مسٹر شنکر اسے سینے سے لگا لیتے ہیں)

محمد قمر الدین رام نگری

ڈچ نیوگانسان جزائر میں سے ایک ہے جو آسٹریلیا کے قریب واقع ہیں۔ آجکل جاپان نے اس جزیرے کے ساحلوں پر اپنی فوجیں اتار دی ہیں۔ اب یہاں آبادی کافی ہے لیکن جب یہ جزیرہ دریافت ہوا۔ اور ڈچ سیاح اور محقق اس کے اندرونی حصوں میں گئے تو انہوں نے تین تین فٹ قد کے خطرناک چوہوں کو جنگلوں میں گھومتے دیکھا۔ کنگرو پالتو جانور ہے لیکن اس علاقہ میں کنگروؤں نے سیاحوں کے لئے مشکلات پیدا کر دیں۔ سیاح کنگروؤں کو پکڑنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے لئے ان جانوروں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ سیاح جہاں بھی جاتے کنگرو ان کا تعاقب کرتے تھے۔

ارمغانِ دوست

یہ چنبیلی کے حسین و سیم رنگ پھولوں کا ہار

میرے بالیں کی زینت ہے۔

گویا کسی حور کے نفیس و پاکیزہ خیالات کا سلسلہ ہے۔

نرم و نازک جذبات کی بے رنگ تصویر۔

یا حرم کے سفید پوش کبوتروں کی ایک منحنی قطار

جو منجمد ہو کر رہ جائے۔

یا کسی خوش قسمت کی مسرت و انبساط کی گھڑیاں،

غم و الم کی سیاہی سے پاک

کمرہ ان کی نکہتِ عطر بیز سے اس طرح معمور ہے،

جیسے کسی منتظر کا دل دوست کی آمد کے خیال سے۔

مس نیاز بیٹ ایم اے

ادب جدید

جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟
تم یہاں واپس نہ پھر آؤ گی کیا؟
پھر دلِ مضطر کو تڑپاؤ گی کیا؟
رنج دیکر مجھ کو کل پاؤ گی کیا؟
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟

سانس کو ہونٹوں پہ جلتا چھوڑ کر
آگ کا طوفاں اُبلتا چھوڑ کر
جان جاتی، دل اُچھلتا چھوڑ کر
مجھ پہ دانستہ ستم ڈھاؤ گی کیا؟
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟

چاہنے والوں سے تم ہو سرگراں
کیا دکھانے کو ہے دورِ آسماں
گلشنِ امید اور نذرِ خزاں
میرے ارمانوں کو ٹھکراؤ گی کیا؟
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟

یہ تکلم یہ حسیں خاموشیاں
یہ محبت سے بھری سرگوشیاں
یہ نگاہِ مست کی مدہوشیاں
ان سے پھر آنکھوں کو ترساؤ گی کیا
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا

رات دن آنسو بہیں گے ہجر میں
بے اثر نالے رہیں گے ہجر میں
کس سے حالِ دل کہیں گے ہجر میں
رحم مجھ پر تم اب نہ کھاؤ گی کیا
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا

تم کو اس قلبِ شکستہ کی قسم
شورشِ ایامِ رفتہ کی قسم
تلخیٔ عہدِ گذشتہ کی قسم
یہ بتا دو پھر کبھی آؤ گی کیا
اور اب سچ مچ چلی جاؤ گی کیا

جاؤ گی نجمہ سے کیا منہ موڑ کر
جاؤ گی عہدِ محبت توڑ کر
جاؤ گی مجھ کو تڑپتا چھوڑ کر
ظلم پر اپنے نہ شرماؤ گی کیا؟
جاؤ گی سچ مچ چلی جاؤ گی کیا؟

نجمہ تصدق

طالب علم ایڈیٹر

آجکل تو پنجاب یونیورسٹی نے جرنلزم کی ایک کلاس کھول رکھی ہے جس میں ایڈیٹری کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے لیکن جب ہم ایڈیٹری کے طالب علم تھے۔ تو ہمیں ایڈیٹری اسی طرح سیکھنی پڑی جس طرح موچی یا نائی کا کام سیکھا جاتا ہے پیشہ وروں کے ہاں بچے بٹھا دیئے جاتے ہیں جو اُستاد کے کام کو دیکھ دیکھکر اپنا پیشہ سیکھ لیتے ہیں۔

مجھے الٹی سیدھی مضمون نویسی تو آتی ہی تھی۔ اس لئے ایک روزانہ اخبار میں جا بھرتی ہوا چونکہ میں نو آموز تھا اس لئے میری تنخواہ اتنی ہی مقرر ہوئی جتنی جوتے گانٹھنے والا مہینے میں کما لیتا ہے۔ کام سیکھنا تھا اس لئے میں نے غنیمت سمجھا کہ چلو گھر سے کھا کے تو کام نہ سیکھنا پڑا۔

پہلے ہی دن چیف ایڈیٹر صاحب نے مجھے ایسوشی ایٹیڈ پریس کے چند تار ترجمے کے لئے دیئے۔ میں نے ان کو پڑھکر دیکھا تو ایسے مشکل نہ تھے کہ میں ترجمہ نہ کرسکوں۔ مثلاً ایک تار میں لکھا تھا۔

500 Head goats were taken away by the tribes men.

اس میں ایک بھی لفظ ایسا نہ تھا جس کے معنے مجھے نہ آتے ہوں میں نے قلم اٹھایا اور اس کا حسب ذیل ترجمہ لکھ دیا۔

قبائلی لوک بھیڑوں کے ۵۰۰ سر کاٹ کر لے گئے۔ "کاٹ کر" فالتو لفظ تھے۔ جو میں نے اپنی گرہ سے لگا دیئے کیونکہ تار میں کاٹنے کا ذکر نہ تھا۔ بہرحال میں اتنا بیوقوف نہ تھا کہ یہ بھی نہ سمجھ سکوں کہ آخر قبائلی سر لے گئے تو کاٹ کر ہی لے گئے ہوں گے۔

جب میں یہ ترجمہ لیکر چیف ایڈیٹر کے پاس گیا۔ تو وہ ترجمہ دیکھکر میرے منہ کی طرف تکنے لگا میں حیران تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ مجھے اطمینان تھا کہ میں نے کسی ایک لفظ کا ترجمہ بھی غلط نہیں کیا۔ اس وجہ سے چیف ایڈیٹر کی نگاہیں مجھے اچھی معلوم نہ ہوئیں۔ آخر اس نے کہا۔ "تمہاری انگریزی تعلیم کہاں تک ہے؟" میں نے جواب دیا "کہ مڈل پاس ہوں"۔ چیف ایڈیٹر مسکرایا اور بولا معلوم ہوتا ہے کہ تم پڑھاوؤں کے کوٹھے میں پڑھے ہو"

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے۔ آخر چیف ایڈیٹر بولا۔ ارے میاں مویشیوں کے ساتھ head کا لفظ اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح اردو میں "راس" کا۔ مثلاً ایک راس بیل۔ ایک راس گدھا۔ ایک راس تم۔

یہ ایڈیٹری کا پہلا سبق تھا۔ دوسرے دن ایک تار میں یہ الفاظ تھے۔

His 15 years old son.

یہ سارے الفاظ اتنے آسان ہیں کہ چوتھی پانچویں جماعت کا طالب علم ان کا ترجمہ کرسکتا ہے۔ اور پھر میں تو ایک دم مڈل پاس تھا میں نے اس کا یہ ترجمہ لکھا۔

"اس کا پندرہ سال بڈھا لڑکا"

اس کے ترجمے کو لے کر چیف ایڈیٹر صاحب کے پاس گیا۔ تو وہ بولا "ارے بھئی! ایڈیٹری کرنا کیا ضرور ہے؟ تمہارے لئے یہ اچھا ہے کہ دلی دروازے کے باہر پان کی دکان کر لو"

اس دفعہ تو مجھے بھی ذرا سا غصہ آگیا۔ اور میں نے کہا کیوں جناب کیا غلطی ہے؟ آپ ہی تبلائیے کہ His کے معنی "اس کا" نہیں؟ 15 پندرہ نہیں؟ years کا ترجمہ سال نہیں؟ اور old "بڈھے" کو نہیں کہتے ہیں۔ اور son کے معنی "بیٹا" نہیں۔

چیف ایڈیٹر "ہاں۔ ہاں" کرتا گیا لیکن آخر میں بولا کہ ترجمہ پھر غلط ہے۔ میں نے پوچھا "وہ کس طرح؟" اس نے جواب دیا کہ بھلے مانس ۱۵ سال کا آدمی بھی بڈھا ہوتا ہے"؟ میں نے کہا "نہیں تو لیکن یہ تار کے حروف کی غلطی ہے میری نہیں۔ دراصل ۱۱۵ ہوگا تار والوں نے ایکا اڑا دیا ہے۔

اس پر چیف ایڈیٹر نے قہقہہ لگا یا اور تمسخر آمیز لہجہ میں کہا کہ بھائی یہاں old کے معنی عمر ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہوگا۔ "اس کا ۱۵ سال عمر کا لڑکا"۔ میں نے عرض کیا کہ کس کی بات مانی جائے۔ ماسٹر کی یا ایڈیٹر کی۔ ماسٹر نے تو ہمیں old کے معنی "بڈھا" ہی بتائے تھے بہرحال دونوں ٹھیک ہیں "ڈ" دونوں میں مشترک ہے۔

ایک دن چیف ایڈیٹر نے مجھے نصیحت کی کہ ترجمہ کرتے وقت اپنی اردو تحریر میں خوبی پیدا کیا کرو یہ ضروری نہیں کہ ترجمہ بالکل لفظی ہے آزاد ترجمہ ہونا چاہیئے۔

اس نصیحت کے بعد جو تار میرے پاس ترجمہ کے لئے آیا۔ وہ صرف دو سطروں پر مشتمل تھا جس میں لکھا تھا کہ بارش کے باعث پالم پور کے قریب ایک ندی کا پل ٹوٹ گیا۔

میں نے سوچا کہ اس تار کے ترجمہ میں چیف ایڈیٹر صاحب کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لیکر قلم اٹھایا اور لکھا:۔

رات کا بھیانک سماں ہر طرف تاریکی خوفناک تاریکی۔ ندی کی سطح پر ابھی چند گھنٹے پہلے آفتاب کی سنہری کرنیں رقص کر رہی تھیں لیکن اب اس پر ظلمت چھائی ہوئی تھی سکوت طاری تھا صرف اس سکوت کی مہر کو پانی کی لہریں توڑ رہی تھیں جو بچوں کی طرح مچل کر ایک دوسری سے کھیل رہی تھیں۔ دفعتہً شمال کی طرف سے گرجتا ہوا ابر اٹھا بجلی کوندنے لگی اور آن کی آن میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جل تھل ایک ہو گئے ندی میں اس قدر طوفان اٹھا کہ اس کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اتنے میں پانی کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا جو ندی کے پل کو کاغذ کی طرح بہا کے لے گیا ... وغیرہ۔

یہاں میں نے اختصار سے کام لیا ہے لیکن اصل ترجمہ پورے فلسکیپ کاغذ پر تھا۔ میں مطمئن تھا کہ آج چیف ایڈیٹر صاحب بہت خوش ہونگے چنانچہ میں فلسکیپ کا غذ اور اس

کے ساتھ تار کا چھوٹا سا پرزہ لے کر چیف ایڈیٹر کے کمرہ میں گیا۔ اس نے پہلے تار کو پڑھا پھر ترجمہ کو۔ وہ پڑھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا جب ختم کر چکا۔ تو اس نے سرخ پنسل اٹھائی اور کاغذ کی پیشانی پر لکھ دیا "پہلا باب" اور مجھ سے کہا کہ اچھا ناول ہے اسے ختم کرو۔

ترجمہ کے مراحل سے گذرنے کے بعد "رپورٹنگ" کا کام میرے سپرد ہوا۔ میں جلسوں میں جاتا اور ان کی روئیداد لکھکر دفتر لاتا۔ سیاسی لیڈروں کے پاس جاتا۔ اور مختلف سیاسی واقعات کے متعلق ان کی رائے قلمبند کرتا۔ ایک سیاسی لیڈر کی تقریر رٹ رکھی ہے صرف موضوع کے مطابق اس میں تھوڑا سا تغیر و تبدل کر لیتا ہے۔

ایک دفعہ ان صاحب نے باغبانپورہ میں تقریر کرنی تھی۔ شام کے وقت میں باغبانپورہ جانے لگا۔ تو راستہ میں ایک دوست مل گئے اور مجھے ورغلا کے اپنے ہاں لے گئے۔ میں نے بھی سوچا کہ تقریر تو وہی ہوگی جو ہمیشہ ہوا کرتی ہے صرف اس میں شہید گنج کا اضافہ ہوگا۔ میں دو تین گھنٹے اپنے دوست کے ہاں بیٹھا رہا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے باغبانپورہ کی تقریر مرتب کر لی۔ وہاں سے ٹھیک دفتر پہنچا۔ اور رپورٹ نائٹ ایڈیٹر کے حوالے کر دی۔

اگلی صبح کو ہمارا پرچہ نکلا۔ تو یہ تقریر پوری کی پوری ہنگامہ خیز عنوانات کے ساتھ شائع ہوئی۔ عنوان یہ تھے۔

خدا کا گھر قیامت تک خدا کا گھر ہے

دنیا کی کوئی حکومت مسلمانوں سے مسجد شہید گنج نہیں چھین سکتی۔

مسلمان مسجد کو حاصل کرنے کے لئے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

باغبانپورہ میں حضرت ...... کی ولولہ انگیز تقریر

لیکن جب میں نے دوسرے اخبارات دیکھے تو ان میں لکھا تھا کہ حضرت ...... علالت کی وجہ سے باغبانپورہ میں تقریر نہیں کر سکے۔ آئندہ تاریخ کا اعلان بعد میں ہوگا۔

حاجی لق لق

معلوم نہیں کہ ہندوستان میں بھی کتنے شوہر ہونگے جو بیویوں سے ڈرتے ہوں گے لیکن یورپ و امریکہ میں تو ایسے شوہروں کی کمی نہیں چنانچہ یورپ و امریکہ کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ہر سال ہزاروں شوہر اپنی بیویوں کے خوف سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور سالہا سال تک گھر واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔

ایک ۳۱ سالہ اطالوی فوجی افسر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جنگ سے پہلے بھاگ کر فرانس آگیا اور اس نے پولیس کو بتایا کہ میری بیوی قیامت ہے میں مسولینی سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ اپنی بیوی سے چنانچہ وہ فوج کے قانون سے نہ ڈرا لیکن بیوی کے ڈر سے فوج کو چھوڑ کر فرانس بھاگ گیا۔

امریکہ کا ایک لکھ پتی سان فرانسسکو میں رہتا ہے وہ اپنی بہت بڑی جائیداد نیویارک کے علاقہ میں چھوڑ آیا ہے اس کا بیان ہے کہ وہ اپنی بیوی سے اس قدر ڈرتا ہے کہ کھانا پینا تک بھول جاتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یورپ و امریکہ کے تقریباً ۲۰ ہزار شوہر بیویوں کے خوف سے ہر سال بھاگ جاتے ہیں اور بعض نے تو خودکشی تک کر لی ہے۔

غزل

غیب سے عشق کو ندا آئی

بیخبر! مظہرِ حیات ہے تو

اے یمِ کائنات کی مستی!

ناز کر نازِ بے جہات ہے تو

تیرے نالوں سے گرمیٔ محفل

مطربِ بزمِ کائنات ہے تو

خون سے تیرے دشت رشکِ جناں

قیسِ لیلائے ممکنات ہے تو

عشق! تو ہے دنوں میں عید کا دن

اور شبوں میں شبِ برات ہے تو

جانتا ہے مقام کو اپنے؟

ماورائے تعینات ہے تو

اک تسلسل ہے تیری ہستی میں

یعنی زنجیرِ واردات ہے تو

وادیٔ ابتلا میں ہمت کر

آپ اپنی امیںؔ نجات ہے تو

"غم اگر جنس جانگسل نہ بدے"

"ابنِ آدم امیںؔ دل نہ بدے"

امین حزیں سیالکوٹی

فرانسیسی رقاصہ

فرانسیسی میدان جنگ کے آخری کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ دن رات کی طرح تاریک ہو رہا تھا۔ جرمن فوج کے حملوں سے برباد شدہ چھوٹا سا گاؤں اس طرح خاموش اور ساکن تھا جیسے کسی حسین و جمیل دوشیزہ کی لاش!

جرمن سپہ سالار میجر گرافان فان برگ اپنے معتمد علیہ جاسوسوں اور کئی مرکٹے سپاہیوں کو لئے ہوئے ایک مہینہ ہی سے اس علاقے میں پڑا ہوا تھا۔ کمانڈر انچیف نے حال ہی میں تمام علاقے کے امن و امان کی حفاظت و نگرانی اس کے سپرد کی تھی۔ گاؤں کا سب سے بڑا مکان ان سب کا مسکن بنا ہوا تھا۔ مکان کا نام شیودی وال تھا۔

شام کا وقت تھا۔ میجر گرافان اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا جرمن اخبارات اور اپنے خطوط دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر رکھے ہوئے کافی کے پیالے سے بھاپ نکل رہی تھی۔ میجر کے منہ میں خوشبودار تمباکو کا پائپ تھا۔ اپنے عظیم و جسیم جسم، شعلے کی طرح روشن چہرے اور چوڑے چکلے بازو اور سینے کے اعتبار سے گرافان انسان نہیں دیوزاد معلوم ہوتا تھا۔

خطوط دیکھ چکنے کے بعد میجر نے دو لکڑیاں اور آگ میں ڈال دیں۔ یہ لکڑیاں گاؤں کے آدمی جنگل سے کاٹ کر لاتے تھے۔ اس لئے یہ خوب فراخدستی کے ساتھ جلائی جاتی تھیں۔ میجر نے شیشے کی کھڑکی کھول کر ایک پرشین قومی گیت گنگنانا اور اس کے ساتھ بوٹوں کی نوک سے تال دینا شروع کیا۔ اتنے میں دروازے پر ہلکی سی کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔ میجر گھوم کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "اندر آؤ"

جو شخص اندر داخل ہوا وہ میجر گرافان کا اسسٹنٹ کیپٹن بیرن فان کال وسٹن تھا۔ اس کی صورت ہی سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی شیطانی خیال اس کے دماغ میں چکر لگا رہا ہے۔ ایک روز رات کو اس نے نہ جانے کیوں سامنے کے دانت تڑوا دیئے جس کا راز اب تک نامعلوم ہے۔ اب یہ پوپلے منہ سے اس طرح بولتا کہ اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں نہ آتی۔ اس کی چندیا بالکل صفاچٹ تھی لیکن سر کے گرد ہلکے سرخ رنگ کے گھنے بال کافی موجود تھے۔ میجر نے آگے بڑھ کر کیپٹن سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد کافی کے پیالے کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ صبح سے یہ اس کی چھٹی پیالی تھی۔ کیپٹن نے رات کی قابل اطلاع باتیں میجر کو بتائیں۔ اسی دوران میں خانساماں نے کھانے کے لئے آواز دی جسے سنتے ہی دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں تین فوجی افسر پہلے سے موجود تھے۔ ان کے نام تھے لفٹننٹ اوٹوفان گروسلنگ، لفٹننٹ فریشتے برگ، لفٹننٹ بیرن فان ہیرک۔

اس آخری شخص کی نسبت یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شکل و شباہت [illegible] جرمن افسروں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے حسین چہرے، متبسم آنکھیں اور بڑے بڑے گھنگریالے بال دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہ فوج کی افسری کی بجائے رومانی شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا۔ فرانس آنے کے بعد سے اس کے ساتھی اس کو "مادام فیفی" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اپنی پتلی کمر، نسوانی چہرے اور تیز آواز کے باعث اس علاقے میں یہ کافی مشہور ہو گیا تھا لیکن اس کے اخلاق و اطوار بالکل جنگلی درندوں کے سے تھے۔ اس میں نام کو بھی انسانیت نہ تھی۔ قیدیوں کے ساتھ اس سے زیادہ ظالمانہ سلوک اور کوئی فوجی افسر روا نہ رکھتا تھا۔ اگر وہ ذرا مشتعل ہوتا تو معلوم ہوتا بارود میں آگ لگ گئی۔

کھانے کے کمرے کو قیمتی ساز و سامان سے خاص قرینے کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ جو فوجی افسروں کی رقص گاہ میں تبدیل ہو جانے کے باعث بالکل درہم برہم ہو گیا تھا۔

کھانے کی چیزوں کے ختم ہونے کے بعد شراب کا دور شروع ہوا۔ شراب میں پیسے تو خرچ ہوتے نہیں تھے جو زیادہ اور کم کی پروا کی جاتی۔ بوتل پر بوتل صاف ہونے لگی۔ ہنسی مذاق، ظرافت اور گانے کے شور و غوغا سے ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ شراب ختم ہو چکی تو سگار کا سلسلہ شروع ہوا جس کے بے پناہ دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آتشیں مرچشمہ ہو۔

یکایک مادام فیفی بول اٹھا۔ "ارے کبھی کچھ شغل بھی ہو گا یا اسی طرح بے لطفی میں وقت گذرے گا؟"

لفٹننٹ اوٹوفان اور لفٹننٹ فریز ایک ساتھ بول اٹھے "ہاں بھئی کچھ تو ہونا چاہئے۔ طبیعت گھبرا رہی ہے"

مادام فیفی نے کہا "میجر صاحب کو اعتراض نہ ہو تو میں تفریح کا کچھ بندوبست کروں۔"

میجر نے پائپ کو منہ سے الگ کرتے ہوئے کہا "کیا بندوبست کرنا چاہتے ہو بیرن فان؟"

مادام فیفی نے کھڑے ہو کر بڑے جوش سے کہا "لے ڈیو پر ان چلے جائیں گے وہاں سے چند فرانسیسی دوشیزاؤں کو لے چلے آئیں گے۔ رات بڑے لطف سے گذرے گی۔"

میجر ایک سن رسیدہ آدمی تھا اس کو اس مشغلے سے زیادہ دلچسپی نہ تھی وہ منع کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی بول اٹھے "آپ منع نہ کیجئے میجر۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں ہماری زندگی کس بے کیفی میں گذر رہی ہے۔ مادام فیفی جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرنے دیجئے۔"

میجر مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

مادام فیفی نے لے ڈیو پر کو بلوایا۔ یہ عجیب طرح کا منحوس سپاہی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہیں دیکھی گئی تھی۔ یہ افسروں کے حکم کی تعمیل میں سنگدلی اور بے رحمی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا۔ وہ آکر مادام فیفی کو سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا اور اس کا حکم سن کر اسی طرح سلام کر کے چپ چاپ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ہی پانچ گھوڑوں کی فوجی گاڑی کھڑکھڑاتی باہر

نکل گئی جرمن فوجی افسر فرطِ سرور سے قومی گیت گانے اور سیٹی بجانے لگے لیکن مادام فیقی کے اظہارِ مسرت کا طریقہ ان سب سے بلکہ ساری دنیا سے جدا تھا۔ وہ جب بہت خوش ہوتا تو تخریب اور تباہ کاری پر اتر آتا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ دیوار پر خوبصورت اور قیمتی تصویریں آویزاں تھیں جن میں ایک عورت کی تصویر بالخصوص فنِ مصوری کا دلفریب نمونہ تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا ایک جیتی جاگتی دوشیزہ دعوتِ کیف دے رہی ہے۔

مادام فیقی نے اپنی ریوالور سنبھالی اور دو گولیاں سر کر دیں۔ تصویر کی دونوں آنکھیں اڑ گئیں۔ مادام فیقی برہمی تیز لہجے میں بولا۔ بدبخت کہیں کی! گھورتی ہے جانتی نہیں مجھکو۔

اس کے بعد مادام فیقی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ آؤ مائین کھیلا جائے۔

مائین مادام فیقی کا ایک پسندیدہ کھیل تھا۔ اس کے ساتھیوں کو بھی اس کھیل سے کافی دلچسپی تھی لیکن میجر نے نہ جانے کیوں قدرے ناگواری کے لہجہ میں کہا۔ مجھے تمہاری حرکتیں پسند نہیں تمہیں جو کچھ کرنا ہو بغل کے کمرے میں جا کرو۔

مکان کا فرانسیسی مالک نہایت خوش ذوق آدمی تھا۔ اسے آرٹ سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ جرمنوں کے خوف سے مکان ساز و سامان روپیہ پیسہ سب اسی طرح چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بغل کا کمرہ اب بھی آرٹ کے نادر ترین نمونوں سے آراستہ تھا۔

مادام فیقی اپنے ساتھیوں کو لیکر اس کمرے میں گیا۔ اس میں چینی کا ایک خوبصورت مجسمہ تھا۔ مادام فیقی نے اس کے اندر بارود بھر دی۔ بندوق میں سے ایک فلیتہ اس کے منہ میں ڈال دیا جس کا ایک سرا باہر نکلا ہوا تھا۔ نشانہ باندھ کر ٹھیک اسی فلیتے پر ریوالور سے گولی ماری جس کے ساتھ ہی ایک ایسا خوفناک دھماکہ ہوا کہ ساری عمارت ہل گئی۔ اور اس میں آرٹ کے جتنے سامان تھے سب ٹوٹ پھوٹ کر خراب ہو گئے۔

اس وحشیانہ کھیل میں مادام فیقی کو تو اتنا حظ و سرور حاصل ہوا کہ وہ پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی فرطِ مسرت سے تالیاں بجانے لگے۔

تمام عمارت دھوئیں سے بھر گئی میجر نے اٹھ کر طعام خانے کی کھڑکی کھول دی بارش اب بھی ہو رہی تھی گاؤں کا گرجا سامنے ہی تھا۔ گاؤں کی تباہی اور اپنی زبوں حالی پر آنسو بہا رہا تھا جب سے گاؤں پر جرمنوں کا قبضہ ہوا تھا گرجے کے بڑے گھنٹے کے بجنے کی نوبت نہیں آئی تھی ہزار ہا منت سماجت کرنے کے باوجود گرجے کا پادری گھنٹہ بجانے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مادام فیقی اسے زبردستی شراب پلا چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مادام فیقی کے طرح طرح کے مظالم کا تختۂ مشق بنا رہتا تھا اگر میجر نے اجازت دی ہوتی تو وہ اب تک پادری کو اپنی ریوالور کی گولی کا نشانہ بنا چکا ہوتا۔

رفتہ رفتہ شام ہو گئی جرمن افسر کھانے کے کمرے میں آموجود ہوئے سب کے سب قیمتی لباس میں ملبوس تھے۔ مادام فیقی نے اپنے تمام ساتھیوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی بوڑھا میجر بھی عطر میں بس کر آیا تھا۔ لے ڈیوبر کے انتظار میں سب بے چین تھے اور اسے بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔

یکایک فوجی گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز سنائی دی سب جرنیل کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگے۔ لے ڈیوبر پانچ حسین و جمیل فرانسیسی دوشیزاؤں کے ساتھ گاڑی سے اترا اور انہیں لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا نازنینانِ فرانس کی یہ چھوٹی سی ٹولی کیا تھی خوش رنگ پھولوں کا ایک دل آویز گلدستہ تھا۔ ان کا نازک اور گداز جسم سردی کی شدت سے برف ہو رہا تھا۔

مادام فیقی نے ایک خوش جمال دوشیزہ کے حسین گال پر ایک ہلکا سا چانٹا لگا کر کہا۔ آؤ ڈارلنگ۔ لفٹننٹ اٹو اور کیپٹن فریز ایک ساتھ بول اٹھے۔ تم اس پر ڈورے نہ ڈالو مادام فیقی یہ میری ہے۔

مادام فیقی نے کہا لڑ مرنے کی ضرورت نہیں میں نے تقسیم کی ایک مناسب صورت سوچ لی ہے۔ یہ کہکر مادام فیقی نے پانچوں دوشیزاؤں کو قطار سے کھڑا کر دیا۔ اور کہا ان میں سے جو جس کے قد کے مطابق ہے وہ اس کی ہے۔

اس اصول کے مطابق دوشیزاؤں کی تقسیم عمل میں آئی جو حسینہ مادام فیقی کے حصے میں آئی وہ شاید یہودی تھی اس کا نام ریاچل تھا وہ حسن و جمال کے اعتبار سے سب میں ممتاز تھی۔

مادام فیقی نے تمباکو کا ایک زور دار کش لگا کر منہ میں دھواں بھرے ہوئے ریاچل کا اس طرح بوسہ لیا کہ کھانستے کھانستے اس کا برا حال ہو گیا۔

لفٹننٹ اٹو فان اپنی محبوبہ کو آغوش میں لئے اس کا گلا زور سے دبانے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا کہ ریاچل کی کھانسی سن کر بولا یہ کیا کر رہے ہو مادام فیقی؟

مادام فیقی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ مائین کھیل رہا ہوں۔

ریاچل نے کھانستے ہوئے اشک آلود آنکھوں سے مادام فیقی کی طرف دیکھا مگر وہ اس کی بربریت کے متعلق منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی۔

شراب کا دور شروع ہوا اور سب نے اتنی شرابیں پی لیں کہ نشے سے پاگل ہو کر بوتلیں پیالے توڑ ڈالے کرسیاں الٹ دیں دوسری چیزوں کو درہم برہم کر دیا۔ دوشیزائیں بھی آپے میں نہ رہیں جرمنوں نے انہیں اس قدر پلا دی کہ وہ بھی عالمِ بیخودی میں کمر تک برہنہ ہو کر ان کے ساتھ ناچنے لگیں۔ مادام فیقی نے ریاچل کو اپنے ناخنوں اور دانتوں سے نوچ کھسوٹ کر اس کی ہیئت خراب کر دی۔ اس کے کپڑے زیر و زبر ہو گئے اور جگہ جگہ سے جسم خون آلودہ ہو گیا۔ مادام فیقی پھر اسے آغوش میں لینے کے لئے اس کی طرف بڑھا۔ تو وہ چیخ کر کمرے کے ایک گوشے میں بھاگ گئی۔ وہ چھلانگ مار کر اس پر ٹوٹ پڑا جس سے ریاچل کا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ مادام فیقی نے فرطِ غضب سے اپنا دانت پیوست کر کے اس کے پھول سے ہونٹوں کو لہولہان کر دیا۔

اس کے ساتھیوں میں شراب کا از سر نو دور شروع ہو چکا تھا وہ ریاچل کو کھینچتا ہوا پھر اس طرف لے چلا سب کے سب ہاتھ میں شراب کا گلاس لئے ایک ساتھ وحشیانہ انداز میں چلا اٹھے

"پرشیا زندہ باد"

"آج تمام فرانس ہمارے قدموں میں ہے"

ریاچل نے غلطی غیرت سے بیتاب ہو گئی۔ اس نے کہا نہیں فرانس آزاد ہے۔ آزاد ہو کر رہے گا۔

مادام فیقی بولا چپ شیطان! فرانس ہمارا ہے۔ ہم اس کے دریا، پہاڑ، دولت و پیداوار اور اس کی عورت سب کے مالک ہیں۔

ریاچل تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرسی الٹ گئی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ تم سب بڑے بدذات ہو۔ فرانسیسی عورتیں تم کو کتوں سے زیادہ ذلیل سمجھتی ہیں۔

مادام فیقی بجائے غصہ ہونے کے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بولا۔ کہ اگر فرانسیسی ذلیل سمجھتی ہیں۔ تو ہمارے پاس آتیں کیوں؟

ریاچل فرط غضب سے زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ اس نے شیرنی کی طرح گرج کر کہا۔ ہمارا کیا ہے ہم تو بازاری عورتیں ہیں۔ تم نے ہم کو اپنی حیوانی خواہشیں پوری کرنے کے لئے بلایا ہم کو چلا آنا پڑا۔

مادام فیقی ریاچل کے سینے پر ایک گھونسہ رسید کر کے الٹی ہوئی کرسی سیدھی کرنے کے لئے نیچے جھکا۔ میز پر ایک چاقو پڑا ہوا تھا۔ ریاچل نے اسے اٹھا لیا۔ مادام فیقی کے تالو میں پیوست کر دیا اور کھڑکی سے کود کر گھنے اور تاریک جنگل میں گم ہو گئی۔

چند ہی منٹ کے اندر مادام فیقی کا کام تمام ہو گیا۔ خر بز اور آٹوفان نے تلواریں نکال لیں اور چاہا کہ ان چاروں دوشیزاؤں کو قتل کر دیں لیکن میجر نے ان کو روکا۔ اور سپاہیوں کو ریاچل کے تلاش کرنے کا حکم دیا۔ جرمن سپاہی تمام رات ریاچل کو تلاش کرتے اور قدم کی آہٹ پر گولیاں چلاتے رہے مگر ریاچل کا پتہ نہ چلا۔ صبح معلوم ہوا کہ انہوں نے اندھیرے میں اپنے ہی آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

صبح کو جرمن گرجا کے قبرستان میں مادام فیقی کو دفن کرنے لے گئے تو اس عجیب واقعہ سے سب حیران رہ گئے کہ گرجا میں خودبخود گھنٹہ بجنے لگا۔ اس کے بعد دن اور رات میں کئی کئی مرتبہ خودبخود گھنٹہ بجنے لگتا۔ تمام گرد و نواح میں شور ہو گیا کہ گرجا گھر میں کوئی بھوت ہے جو گھنٹہ کو بجاتا ہے۔ لوگوں نے بھوت کے ڈر سے گرجا میں آنا چھوڑ دیا۔

یہ حال دیکھ کر جرمن فوج اس گاؤں سے کوچ کر کے دور جنوب کی طرف چلی گئی۔ جس روز جرمن فوج یہاں سے روانہ ہوئی اسی روز گرجا سے ایک گاڑی نکلی جس کے جلوس میں گاؤں کے تمام باشندے تھے۔ گرجا کا بوڑھا پادری گاڑی ہانک رہا تھا۔ گاڑی پر ریاچل سوار تھی۔ اسی کی حب الوطنی اور جرات و بہادری سے گاؤں والوں کو جرمنوں کے مظالم سے نجات ملی۔ اس لئے گاؤں کے باشندے اس عزت و احترام سے ریاچل کو اس کے گھر پہنچانے لے گئے۔

گرجا میں کوئی بھوت نہ تھا۔ پادری نے بھوت کی افواہ اڑا دی تھی۔ ریاچل ہی گھنٹہ بجایا کرتی تھی۔ ریاچل کی اس حب الوطنی سے متاثر ہو کر ایک معزز فرانسیسی نوجوان نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔

رقاصہ ریاچل اب کسی شریف فرانسیسی خاتون سے کم قدر و منزلت کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔

ابو محمد امام الدین
(رامنگری)

غزل

بتوں کو کبریائی کیوں نہ آئی
خدا ہو کر خدائی کیوں نہ آئی

مزاج یار رنگیں تھا مرے کام
مری رنگیں نوائی کیوں نہ آئی

وفا بھی دلربائی کا ہے انداز
تمہیں یہ دلربائی کیوں نہ آئی

وفاداری ذرا تم کیوں نہ سیکھے
ہمیں کچھ بیوفائی کیوں نہ آئی

مجھے بادِ صبا سے یہ گلہ ہے
برائے دلکشائی کیوں نہ آئی

ہماری داستانِ درد سُن کر
انہیں رقت نہ آئی کیوں نہ آئی

مری کشتی ڈبوئی نزدِ ساحل
تمہیں کچھ ناخدائی کیوں نہ آئی

کلیم آئے جو سوئے طورِ سینا
تماشا تھا خدائی کیوں نہ آئی

شبِ غم کی نہ صورت دیکھتی میں
اجل روزِ جدائی کیوں نہ آئی

سکینہ محمود ایم اے

سرزمین پنجاب کے قومی افسانے کی ادبی تاریخ

تاریخ قصّہ ہیر و رانجھا

متمدّن انسان کی تقسیم اوقات

وقت متمدن انسان کی بہترین دولت ہے۔ اس کا اکثر بیشتر حصہ زندگی کی بیکار مصروفیتوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور ناسھا کار آمد بیکاریوں کی نذر ہوجاتا ہے۔ غرضکہ بہت سی مصروفیتوں اور چند ایک بیکاریوں کے مجموعہ کا نام زندگی ہے۔ پیٹ کے لئے دوڑ دھوپ، جاہ و احتشام کے لئے جدوجہد، ملک و قوم کیلئے ایثار و قربانی حیات، بعدمات کے لئے عبادت و ریاضت یہیں وہ مصروفیات جو انسانی زندگی کے حصہ بخرے کرلیتی ہیں۔ دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد قدرے آرام، سارے دن کی بیداری کے بعد ایک چند ایک گھنٹوں کی نیند، دماغی اور ذہنی کاوش کے بعد سیر و تفریح، معاشرتی پریشانیوں کے بعد کھیل تماشے یہ ہیں وہ بیکاریاں جو بادی النظر میں بیکاریاں معلوم ہوتی ہیں مگر انسانی زندگی کیلئے جزو لاینفک ہیں۔ فکر معاش دنیا جہان کی تمام رنگینیوں اور دنیا والوں کی تمام تفریحوں کو سمیٹ لیتی ہے جہاں پیٹ کی فکر ہو وہاں عشق و محبت کی کارفرمائیاں جلوہ گر نہیں ہوتیں ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ٭ کہ یاراں فراموش کردند عشق

خوشحالی اور عشق و محبت

اس کے برعکس جہاں خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو وہاں سب سے پہلے کیوپڈ (حضرت عشق) اپنے تیر و کمان کے ساتھ جلوہ بار ہوتا ہے۔ اس کے جلو میں فوراً رقص و سرود، نظم و موسیقی، داستان اور مصوری کی پریاں اس کی خوش فعلی کے لئے آموجود ہوتی ہیں۔ آرٹ ترقی پاتا ہے۔ مذاق سلیم آشنکا رہوتا ہے، لطائف و ظرائف خود رو نیر و دختی کی طرح بڑھتے ہیں۔ لمحات فرصت کو بہترین طریق پر گذارنے کے لئے ان سے بڑھکر اور کونسے مشاغل ہوسکتے ہیں۔

سرزمین پنجاب کی فنون لطیفہ کے لئے موزونیت

سرزمین پنجاب اپنے محل وقوع و دیگر جغرافیائی لحاظ سے حسن و عشق کی داستانیں اور ہجر و وصال کے قصہ کہانیوں کے لئے نہایت ہی موزون خطۂ ارض ہے۔ تمام فنون لطیفہ حسن و عشق کے خواصہ بردار ہیں۔ پنج کی بجائے سات دریا بشمول جمنا و سندھ پنجاب کو سیراب کرتے ہیں۔ یہ جنت ارضی پانچ دوابوں اور ایک فاصل آب کو لسبیط کئے ہوئے ہے۔ اگر لیلیٰ فیری کے لئے یہاں دشت و صحرا موجود ہیں تو کسی آبلہ پا کے لئے مغیلان کے جنگلات بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف شیریں جمالوں کے لئے سر بفلک محلات ہیں۔ تو دوسری طرف تیشہ آزمائی کے لئے سنگلاخ چٹانیں بھی موجود ہیں۔ دریاؤں نے اپنی گذرگاہوں کو بدل بدل کر چپہ چپہ زمین میں سونا بکھیر دیا ہے۔ یہاں کی سردی دلفریب، یہاں کی گرمی دلپذیر، یہاں کی خزاں بہار سے اچھی۔ یہاں کی بہار چمن زا اور گلزار خیز، یہاں کی برسات کا کیا کہنا، شدت و قلت دونوں سے محفوظ ہلکی ہلکی بوندیں۔ دھیمی دھیمی ہوا، مجبور دل کہہ اٹھتے ہیں ؎

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے ٭ جلد آجا کہ جی ترستا ہے

اس پر یہی فصلوں کی فراوانی، سرسوں پھولتی ہے تو جامہ چاک ہونے کو طبیعت چاہتی ہے۔ کپاس کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان مع ستاروں کے نیچے اتر آیا۔ باجرہ جوار اور مکئی کے دانوں پر خاکستری، روپہلی اور سنہری موتیوں کا گمان ہوتا ہے۔ کماد کی فصل میں گنے اور پونے کی پوریوں کو دیکھو معلوم ہوتا ہے بعضیں پہ ہاتھی دانت چڑھا ہے۔ گیہوں کی پکی ہوئی فصلیں سبحان اللہ ہر طرف سونا ہی سونا بکھرا ہے۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے شمشاد بیگم کا گایا ہوا ذیل کا گیت اس موسم کا بہترین مظہر ہے ؎

کنکاں دیاں فصلاں پکیاں نیں	آہا جی آہا واہ داتا
بدلاں وچہ خوشیاں وسیاں نیں	کنکاں دیاں ....
داڈھی دا موسم آیا اے	ہر پاسے نور سمایا ہے
جٹ پیلی دے وچہ گجدا اے	پکوان پکاندیاں جٹیاں نیں
کنکاں دیاں	آہا جی آہا ....

موسم برسات کے آغاز میں آم کے پیڑوں پر کور اور کیریوں کی مست کن خوشبو سے مست ہو کر کوئل کا کوکنا تو یقین عشق کو تڑپانے کے لئے کافی ہے۔ ان حالات کے ماتحت انسان آمادہ عشق نہ ہو تو گناہ نہیں تو کیا ہے۔ اچھی جوانی نکھرا ہوا حسن عمدہ آب و ہوا اور مستقل خوشحالی کی پیداوار ہیں پنجاب میں ان دونوں کی فراوانی ہے لہذا اس سرزمین سے جہاں کڑیل جوان پیدا ہوتے ہیں وہاں حسینوں اور جمیلوں کی بھی کمی نہیں۔ محمد اکرم غنیمت کنجاہی نے بھی پنجاب کو حسن آباد کہا ہے، نواب احمد یار خاں یکتا نے کشور حسن خیز کا خطاب دیا ہے۔ حضرت گرامی نے بھی اسے حسن آباد پنجاب کہہ کر اپنی آہ جگر تاب کی گرمی کو ٹھنڈا کیا ہے۔ جوش جوانی اور حسن نسوانی آمنے سامنے ہوجائیں تو ایک خاموش ٹکر کے بعد ایک غیر مرئی شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی شعلہ کا نام محبت ہے۔

پنجاب کا تمدن اور حسن و عشق

حسن و جوانی کے ساتھ پنجاب کے رہنے والوں کا تمدن اور ان کے مشاغل کچھ ایسے محبت پرور ہیں کہ طبیعت خواہ مخواہ عشق و محبت کی طرف کھنچ جاتی ہے غیر مسلم پردہ کی قید و بند سے بالکل آزاد ہیں معاشرتی مجبوریوں نے مسلم آبادی کے اکثر حصہ کو بھی پردہ سے بے نیاز ہی رکھا اکثر لوگ زمیندار اور کاشتکار ہیں۔ دیہاتی آبادی شہری آبادی کی نسبت کہیں زیادہ ہے کھیتوں کی پیداوار پر ان کی گذر اوقات ہے مرد عورت دونوں کو بلا امتیاز عمر دوشہ پہلو بہ پہلو مرغزاروں میں کام کرنا پڑتا ہے کپاس کی فصل کثرت سے ہوتی ہے کپاس بہت ہوتا

دیہات میں جوان لڑکیوں کا محبوب مشغلہ ہے۔گاؤں کی جوان جوان لڑکیاں ایک زمیندار کے مکان میں اکٹھی ہو کر چرخہ کاتتے ہوئے باہمی مقابلہ کرتی ہیں۔ اسے دیہاتی زبان عرف عام میں "تنجن" کہتے ہیں موسم بہار میں عجب بہار پڑتی ہے۔ دیہاتی حسن کے یہ چلتے پھرتے مرقعے یکجا جمع ہو کر جھولا جھولتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماع کے موقعوں پر بن بیاہی دوشیزگان اور بیاہتا اشخاص کے درمیان چوہلیں ہوتی ہیں۔ وہ کچھ دیکھنے اور سننے ہی کی چیزیں ہیں۔ گاؤں سے باہر کھیتوں میں کنوؤں پر نگاہ شوق کے لئے بڑے روح پرور مناظر دیکھنے میں آتے ہیں دیہاتی مویشی خانے اور چراگاہیں عشق خاموش کی نہایت موزوں پرورش گاہیں ہیں۔ کپاس بیلنا چرخہ کاتنا جھولا جھولنا چرسہ رہٹ کا چلانا۔ مویشی چرانا اور دودھ دوہنا۔ یہ سب کے سب کچھ اس قسم کے مشاغل ہیں کہ خاموشی ان کے رومان کو حسین بنتی ہے۔ ان مشاغل کو گیت قصے اور کہانیاں چار چاند لگا دیتی ہیں فصل کاٹنے کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ اگر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کھیتوں اور کھلیانوں میں جوگی اور بیراگی ڈھول اور سارنگی کے ساتھ راگ الاپتے نہ پھریں۔ زحمت کش انسانوں کی تفریح ہو جاتی ہے اور ان بیکار گداگروں کا پیٹ پل جاتا ہے

قصہ کہانی کی تخلیق اور پنجابی قصے

قاعدہ ہے کہ عشق و محبت کی داستان انسان فطرتاً زیادہ سننا پسند کرتا ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے چنانچہ بہت سے قصے کہانیاں زبان زد عام ہوئیں عشق و محبت کی ان داستانوں کو بہت سا مواد واقعات محبت سے مل گیا جو کبھی کبھی اور کہیں کہیں رونما ہوتے رہے اور اکثر حصے سراسر دماغی تخلیق کا نتیجہ ہیں بہادری اور جرأت آموزی کے قصے لکھے گئے بہت سی اخلاقی کہانیاں معرض قلم ہوئیں مگر پنجاب میں محبت کے افسانوں کو جو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی ہیر رانجھا سوہنی مہینوال مرزا صاحباں اور سسی پنوں۔ یہ وہ قصے ہیں جو جنوبی پنجاب کے علاوہ ہر ایک گاؤں میں گائے اور پڑھے جاتے ہیں۔

قصہ ہیر رانجھا اور اسکی مقبولیت

ہیر رانجھا ان قصوں کا سرتاج ہے۔ ہیر رانجھے کا چرچا پنجاب میں گھر گھر ہے گاؤں میں ہر ایک عاشق مزاج مرد کو رانجھے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہر وہ دوشیزہ جو کہیں محبت کا اظہار کر بیٹھے ہیر کہلاتی ہے۔ پنجابی عورتیں اکٹھی بیٹھیں تو ہیر رانجھے کا قصہ محفل کو گرما دیتا ہے۔ ہیر رانجھا گانے والے قوال بہت جلد مقبول عام ہو جاتے ہیں میلوں پر ہیر رانجھے کی تانیں اڑتی ہیں چرواہے ہیر رانجھا گا گا کر چراگاہوں میں پہاڑ سے دن کاٹتے ہیں کہیں عرس ہو تو رانجھا کو عاشق حقیقی اور ہیر کو معبود حقیقی کے استعاروں سے یاد کیا جاتا ہے۔ تانگہ چلانے والے۔ راہ رو گداگر بیوپاری قلی اور دیگر مزدور پیشہ لوگ اس مقبول عام قصے سے سارے دن کی تھکن اتارتے ہیں۔ اس قصہ نے پنجابی ادب میں آنا بیش بہا اضافہ کیا ہے کہ شاید فارسی زبان میں شیریں فرہاد اور عربی ادب میں لیلیٰ مجنوں نہ کر سکے ہوں۔ اس قصے سے فارسی اور اردو ادبیات بھی متمتع ہوئے بغیر نہ رہ سکیں ہندوستان کے کسی اور صوبائی خطہ میں کبھی ایک مقامی قصہ یا واقعہ کو اتنی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہوئی جتنی ہیر رانجھا کو پنجاب میں۔ یہ قصہ پنجاب میں ایک مستقل ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ادبی امانت ہے جو پوری چار صدیوں سے سینہ بسینہ اور قلم بقلم چلی آ رہی ہے اور ... کی اہمیت اور مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے ہیر رانجھا کی داستان عشق ... ہے جس کا تحفظ ہر پنجابی ... کا فرض عین ہے۔

عشق و محبت کی یہ سادہ سی داستان حسن و رعنائی کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ۔ ایثار و خلوص کی یہ معمولی سی مثال اخلاقیات معاشرات۔ مذہبیات اور تفریحات کا وہ بیش بہا گنجینہ ہے جس پر پنجاب اور پنجاب کے رہنے والے جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً دو سو سال سے ہیر کے حافظ چلے آتے ہیں۔ بقول سر جارج گرائرسن یہ قصہ ہندوستان کے دیہاتی قصوں میں مقبول ترین قصہ ہے۔

اسکی مقبولیت کی وجوہ

ہیر رانجھا اس قدر مقبول کیوں ہوا۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں

(۱) یہ پنجاب کی قومی زبان میں لکھا گیا

(۳) اس قصہ کے کردار پنجاب سے لئے گئے۔

(۴) یہ قصہ پنجاب کی دیہاتی معاشرت کا حامل ہے۔

(۵) اس قصہ کو سید وارث شاہ جیسا قادر الکلام پنجابی زبان کا بہترین شاعر صوفی منش درویش صفت عالم و عامل اور وسیع المطالعہ صاحب قلم ملا۔ جو اپنا سب کچھ عشق و معاشقہ کی نذر کر چکا تھا اور جسے بھاگ بھری کی محبت میں تمام منازل عشق طے کرنا پڑیں یہ قصہ پہلے بھی لکھا گیا مگر وارث شاہ کی کیفیات دلی اور محسوسات قلبی نے اسے روحانی اور وجدانی حیثیت بخش دی۔

واقعات قصہ

قصہ یوں ہے کہ اجو نامی تخت ہزارہ (ضلع سرگودہ) کا مہتر تھا۔ یہ قوم کا رانجھا تھا۔ اس کے جواں سال بیٹے کا نام دھیدو تھا جو اپنے گاؤں میں خاندانی نسبت سے رانجھا کے نام سے مشہور تھا ایک پنجابی جواں کی تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں جوانی اور اس پر چہرہ مہرہ کی مناسبت گاؤں کے حسن کلی کی وجہ سے لڑکیوں کی تمام نگاہیں اس طرف اٹھ جاتیں چونکہ آغاز شباب میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔ بھائی حسد اور بھاوجیں مذاق کرنے لگیں جائیداد کی تقسیم پر جھگڑا ہوا۔ بنجر زمین اس کے حصہ میں آئی۔ بھاوجوں کے طرز سلوک سے یہ پہلے ہی آزردہ خاطر تھا انہوں نے ہیر بیاہ لانے کا طعنہ دیا۔ جوانی اور طبع غیور یکجا اکٹھی ہو جائیں تو زمین و آسمان کو ملایا جا سکتا ہے۔ رانجھا فوراً ترک وطن کر کے ہیر کو بیاہ لانے کا منصوبہ باندھ کر جھنگ کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے چناب نے راہ روکا مگر عزم بالجزم کے سامنے پہاڑ تنکے بن کر اڑ جاتے ہیں صحرا سکڑ جاتے ہیں اور دریا خشک ہو جاتے ہیں۔ دریا نے راستہ دیا کشتی سے اترا لب دریا ایک باغیچہ میں پلنگ پڑا نظر آیا تھکا ماندہ تھا ہی وہیں پڑ کر سو رہا۔ یہ پلنگ اسی ہیر کا تھا جس کے لئے بادہ پیمائی کی تھی۔ ہیر جھنگ کے بڑے زمیندار چوچک سیال کی نوجوان تنخدا لڑکی تھی۔ جو اپنے دہقانی حسن و جمال کی وجہ سے قرب و جوار میں مشہور تھی۔ اپنی جوانی کو بہلانے کے لئے اپنی چند ایک سہیلیوں کے ساتھ حسب معمول دریا کی طرف آنکلی۔ اپنے پلنگ پر ایک سے بنے کئے مسٹنڈے کو پڑا دیکھ کر عزت حسن اور نخوت نسوانی کو چھپا نہ سکی سونے والے کو بڑے طمطراق سے جگایا۔ رانجھا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ پہلی ہی نظر میں ہیر کے حسن نے رانجھا کی جوانی کے سامنے سر تسلیم خم کیا کشور حسن کے اس فاتح کو ہیر ناز و کرشمہ کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنی ماں ملکی کے پاس بطور چاک (نوکر) کے لے گئی۔ وارفتگان محبت کی آزمائشیں۔ خدا کی پناہ۔ بارہ برس بھینسیں چرائیں جن و عشق آپس میں کھیل کھیل کر جوان ہوئے حسن عشق پر اور عشق حسن پر قربان ہونا چاہتا تھا کہ ہیر کا چچا کیدو معترض محبت کر نمودار ہوا۔ وہ ہر ہر گام پر مانع آیا ہیر کو ایک سے جو شادی کی قربانگاہ پر

چڑھا دیا گیا۔ رنگپور کے رہنے والا ایک کھیڑا سیدا نامی اسے بیاہ لے گیا۔ رانجھا کو گھر سے نکال دیا گیا۔ ادھر مریضۂ عشق سسرال گھر میں بہانہ بنا کر بیمار پڑ گئی۔ رنگپور سے جھنگ کی طرف جانے والی چند ایک عورتوں کو اعتماد میں لیکر رانجھا کو دعوت دیدار دی گئی۔ اس نے ٹلہ کے جوگی بالناتھ سے جوگ حاصل کیا، کان پڑوا کے مندریاں ڈالیں۔ بال بال میں بھبوت رمائی اور جوگیانہ چیتھڑے پہن کر رنگپور پہنچا۔ دنیا و مافیہا سے ایک بے خبر جوگی کا روپ دھار کر گاؤں سے باہر ایک کٹیا میں جا بیٹھا۔ رنگپور کے ایک عیال سے سیدا کھیڑا کے مکان کا پتہ لیا۔ کاسہ گدائی ہاتھ میں سنبھال خیرات حسن کی خاطر کوچۂ جاناں کی طرف جا نکلا نگاہیں ملیں۔ ادھر عشق تڑپا ادھر حسن جھپکا۔ عشق و مشک چھپے نہیں رہتے۔ سہتی اہیر کی نند تاڑ گئی۔ چونکہ خود مجبور تھی رقابت نے اپنا کام کیا۔ جوگی (رانجھا) سے الجھ پڑی۔ نند بھاوج میں نوک جھوک ہوئی۔ شدہ شدہ سہتی تحصیل مراد (اس کے محبوب کا نام بھی مراد تھا) کے لئے جوگی جٹا دھاری کے پاس پہنچی۔ اس سے مراد طلب کی۔ دنیا میں لین دین کا اصول کارفرما ہے۔ جوگی نے ہیر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ خود غرضی پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ سہتی ہیر کو لے کر کپاس کے کھیت میں گئی۔ عورتوں کے مکر و فریب مشہور ہیں۔ کانٹے کو سانپ بنا کر دکھا دیا۔ جنتر منتر ٹونے ٹوٹکے کے لئے جوگی بلوایا گیا۔ اس نے علاج معالجے کے لئے خلوت چاہی۔ راتوں رات جوگی ہیر کو لے کر بھاگ نکلا۔ سہتی مراد سے جا ملی۔ اطلاع ملنے پر کھیڑوں نے جوگی کا تعاقب کیا۔ محبت کے چور پکڑے گئے۔ ہیر کھیڑوں کو واپس مل گئی۔ سنتے ہوئے مجبور دلوں سے بد دعا نکلی۔ راجہ عدلی کے شہر کو آگ لگ گئی ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن　　اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید

راجہ نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ ہیر رانجھا سے اور رانجھا ہیر سے مل جائے۔ حکم کی دیر تھی دو رنگا محبت کا چھپا ملاپ ہو گیا۔ تخت ہزارہ کی طرف پلٹتے وقت جھنگ راہ میں پڑا۔ ہیر کے ماں باپ نے رانجھا سے باقاعدہ بارات لانے اور ہیر کو بیاہ لے جانے کی استدعا کی۔ محبت کیا کچھ نہیں کروا دیتی۔ مستقل ملاپ کے لئے عارضی جدائی گوارا کی۔ رانجھا تخت ہزارہ پہنچکر بارات کی تیاری میں مصروف ہوا۔ ادھر ہیر اپنے چچا کیدو کی مکاری کا شکار ہو کر زہر کھا رہی۔ رانجھا کو اطلاع ہوئی۔ دیوانہ وار ہیر کی قبر پر پہنچا۔ اس کی آہوں سے قبر شق ہوئی اور رانجھا آغوش محبوب میں ابدی نیند جا سویا۔

قصہ یا واقعہ واقعہ کو قصہ میں تبدیل کر دینا بُعدِ زمانہ کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ ماضی بعید کے تمام واقعات آہستہ آہستہ حکایات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ سال اور تاریخ کی قید و بند واقعہ کو قصہ میں تبدیل نہیں ہونے دیتی۔ زمان و مکان کا تعین واقعات کی ہمیشہ پاسبانی کرتا ہے (دنیا کی ہر ایک قوم کا ماضی مائتھولوجی (علم الاصنام) سے بھرپور ہے یونانی اور روما والے اپنی مائتھولوجی پر آج تک فخر کرتے ہیں)۔ رامائن اور مہابھارت کے واقعات بھی اب بمرورِ زمانہ حکایات سے زیادہ نہیں رکھتے۔ یوسف اور زلیخا کے واقعہ کو قرآن کی زبان نے احسن القصص کہا ہے۔ ہیر رانجھا ماضی قریب کا واقعہ (یا قصہ) ہے مگر قطعی دلائل سے نہ تو اسے واقعہ ثابت کیا جاسکا ہے اور نہ ہی قصہ۔ گو تواتر واقعہ کی طرف زیادہ ہے مگر اس کی رومانوی حیثیت اور واقعہ کی عمومیت اسے روز بروز قصہ میں تبدیل کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ضیاء محمد صاحب ایم اے مصنف یادگار وارث کی رائے نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔

(بعض محققوں کی رائے ہے کہ پنجاب کی عشقیہ داستانیں ساری کی ساری فرضی یا خود ساختہ ہیں اور شاعروں اور بھاٹوں کی جودتِ طبع کا نتیجہ۔ یہ قصے غالباً انہوں نے اپنے حاکموں یا آقاؤں کی تفریح طبع کے لئے گھڑے یا اصلاح عامہ کے لئے۔ محققوں کا خیال ہے کہ یہ قصے نہ تو آج کل کی تنقیدی کسوٹی پر کسے جاسکتے ہیں اور نہ ہی ان کا صحیح صحیح زمانہ معین ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں تو زمانہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

یہ صحیح ہے کہ پرانی داستانیں عموماً آج کل زمانہ کی تنقیدی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں مگر محض اس واسطے ان کو من گھڑت تصور کر لینا درست نہیں کیونکہ ہر زمانے کا تنقیدی معیار اور علمی مذاق یا تاریخی معلومات کا ذخیرہ عموماً مختلف ہوتا ہے۔ اور گذشتہ زمانہ کی نسبت عموماً زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ لہذا یہ فتوے صحیح نہیں۔

باقی رہا زمانہ کا تعین۔ اگر کسی واقعہ یا کسی شخص کی ہستی محض اسی وجہ سے معرض شک و شبہ میں آجائے کہ اس کے زمانہ کے تعین میں اختلاف ہے تو یہ چنداں قابل حجت نہیں کیونکہ دنیا کی تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات یا اشخاص ہیں جن کے زمانے کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ ....

عام تنقیدی معیار یا تعین زمانہ والے اصول پر پنجاب کی باقی عشقیہ داستانیں گر جائیں تو گر جائیں مگر قصہ ہیر رانجھا تو گرتا نظر نہیں آتا کیونکہ اس کے افراد اور مقامات تاریخی ہیں اور ان کی تحقیق و تفتیش کے لئے اب تک مسالہ موجود ہے مثلاً رانجھا کو لیں تو اس کا وطن تخت ہزارہ (ضلع سرگودھا) موجود ہے اس کی قوم رانجھا اب تک زندہ ہے اس کے جوگ لینے کا مقام ٹلہ (ضلع جہلم) موجود ہے۔ گرو وں کا سلسلہ بقید حیات ہے ہیر کو لیں تو اس کا وطن جھنگ موجود ہے اس کی قوم سیال اب تک زندہ ہے۔ کھیڑے اور رنگپور موجود ہے سب سے زیادہ تاریخی ثبوت جھنگ میں ہیر کا مقبرہ ہے۔)

اسی سلسلہ میں معشوقۂ پنجاب کا ایک اقتباس ہمارے ادعا کی جزوی تائید کرتا ہے۔

موضع قبولہ پاک پٹن سے تیسرا اسٹیشن ہے۔ کھنڈرات اب بھی اس کی قدیمی عظمت کا پتہ دیتے ہیں اور گر شکستہ فصیل ہے فصیل کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جو جلے کی راکھ سے اَن بجھی ہوئی چنگاریاں دھواں دیتی ہیں گرد و نواح کے بھولے لوگ اس کو ہیر کے جذبۂ عشق کی تاثیر بیان کرتے ہیں‘

غالباً یہ عدلی راجہ کی نگری ہوگی جو ہیر رانجھا کے مقدمہ کے فیصلہ کے وقت جل اٹھی تھی ہو سکتا ہے کہ عین فیصلہ کے وقت اس قصبہ کو کسی خارجی اسباب کی بنا پر آگ لگ گئی ہو مگر تطابق حوادث نے لوگوں کو اسے ہیر کے جذبۂ عشق کی تاثیر سمجھ لینے پر مجبور کر دیا ہو۔

تعین زمان سر جارج گریرسن مشہور مستشرق نے ہیر رانجھا کو یونانی قصہ ہیرو اور لینڈر کا چربہ بتلاتے ہوئے کہا ہے کہ سن عیسوی کی ابتدائی [illegible] میں یہ قصہ یونانیوں کے ساتھ پنجاب میں پہنچا۔ ہیر لفظ ہیرو کا اختصار ہے۔ ہیرو یونانی قصہ [illegible]

ہیر ایک قصہ ہیر دُن کے نام سے مشہور رہتا ہے مگر فارسی زبان میں لکھے ہوئے قلمی نسخے اس امر کی قابل تردید تصدیق کرتے ہیں کہ یہ قصہ سلطان محمد غوری جو ہندوستان کا سب سے پہلا شہنشاہ ہے کے زمانے میں لکھا گیا مگر اسے ایک نظریہ سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ مولوی محمد شفیع ایم اے پرنسپل اورینٹل کالج لاہور اسے سات آٹھ سو سال پہلے کا قصہ بتلاتے ہیں۔ مگر سوجان راے بنڈاری بٹالوی نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں اسے ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ء – ۹۶) کی تحریر بتایا ہے اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کا یہ چالیسواں سال تھا (مگر اکثریت کی رائے اسے جلال الدین اکبر کا زمانہ دیتی ہے) بعض اسے لودھیوں اور بابر کے زمانہ کا واقعہ بتاتے ہیں سر رچرڈ ٹمپل نے بھی اسے اکبر ہی کا زمانہ بتایا ہے ہیر کے سب سے پہلے ناظم دمودر داس نے بھی اسے اکبر کے زمانہ کا واقعہ بیان کیا ہے سید وارث شاہ نے عدلی راجہ غالباً مبارز خان عادل شاہ سوری (۱۵۵۲ء – ۱۵۵۶ء) حاکم پنجاب یا ملتان کو لکھا ہے۔ اکبر کے عہد کا آغاز ۱۵۵۶ء میں ہوتا ہے اور عادل شاہ کی وفات کا سال ۱۵۵۶ء ہے۔ لہذا اس قصہ کو اکبری عہد کی قربت ضرور حاصل ہے۔

ہیر رانجھا کی اخلاقی حیثیت

(جتنے ناظم و ناثر اس قصہ کو حاصل ہوئے ہندوستان تو کیا ادبیات عالم میں کسی دوسرے قصہ کو اس قدر صاحب قلم نہ ملے اور یہی قصہ کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل ہے) مجھے چودھری افضل حق کی رائے سے قطعی اختلاف ہے۔ وہ یہ لکھتے ہیں کہ (ان قصوں کا) پنجابیوں پر بلحاظ اخلاق نہایت ہی تباہ کن اثر پڑا جس قدر قصے لکھے گئے وہ ملک کے مخصوص حالات کے منافی ہیں اس لئے تمام کے تمام مخرب اخلاق ہیں۔ ... (بلاشبہ قصہ پورن بھگت ایک ایسا قصہ ہے جسے ہر ایک نوجوان تو زیر مطالعہ رکھنا چاہیے بقیہ مضامین بحق سرکار ضبط ہونے چاہئیں) اس معیار پر گلستان جیسی مقبول ترین کتاب بھی نہیں اترتی اس کا باب عشق ذرا پڑھ کر دیکھیے جس کتاب میں اس قسم کا مخرب اخلاق باب ہو کیا وہ کسی شریف گھرانے میں رکھے جانے اور پڑھے جانے کے قابل ہے مقامات حمیدی کے دو مقامے جلا دینے کے قابل ہیں مگر سالہا سال پنجاب یونیورسٹی کے امیدواران منشی و فاضل طلبا امتیاز زن و مرد اسے پڑھا لیے اخلاق کو بگاڑنے والے قصہ یوسف زلیخا سے بھی بُرے ہی نتائج اخذ کریں گے ایسے موقعہ پر دع ما کدر وخذ ما صفا کے زرین اصول کو مدنظر رکھ لینا چاہیے۔ مجھے پروفیسر ضیا محمد ایم اے مصنف یادگار وارث کے اس قول سے قطعی اتفاق ہے۔

> ہیر کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عشقیہ داستان ہے جو پنجاب کی دیہاتی زندگی کا پورا ایک نوٹ ہے اور جس کو سید وارث شاہ نے نہایت محنت اور کاوش سے منظوم کیا حقیقت میں اس نے تمام تمدنی خرابیوں، اخلاقی کمزوریوں اور بداعتقادیوں کا نقشہ کھینچا ہے اس طرح اس اخلاقی پستی اور تمدنی خرابی کی طرف سوسائٹی کو متوجہ کیا ہے اس کی اصلاح و علاج کے لئے اسرار شریعت اور رموز (اتقیٰ کی حقیقت بیان کی علم حقائق و معارف اور پند و نصائح کو جا بجا درج کیا ہے)

ہیر رانجھا کے ناظم و ناثر

اس واقعہ کو سب سے پہلے دمودر نے نظم کیا۔ دمودر داس سے پہلے بھی اس کا کوئی ناظم و ناثر نہیں ملتا اور نہ ہی اس سے قبل اس کا کوئی منظوم نسخہ ملتا ہے دمودر کا اصلی نام دامودر داس تھا۔ یہ اپنے آپ کو رانجھا کا ہمعصر معاصر لکھتا ہے۔ ذات کا کھتری تھا اور جھنگ کا پٹواری تھا۔ اکبر کا زمانہ تھا۔ دمودر کی ہیر تاریخی لحاظ سے اہم ہو تو ہو مگر ادبی لحاظ سے اسے کوئی حیثیت نصیب نہ ہوئی۔ اس کی تصنیف کا سن بھی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

مقبل دوسرا شخص ہے جو اس قصہ کا مشہور و معروف ناظم نظر آتا ہے سر جارج گرائرسن نے ہیر رانجھا لکھنے والوں میں سے سید وارث کو درجہ اول دیا ہے اور مقبل کو درجہ دوم۔ مقبل نے اپنی ہیر میں اپنے زمان و مکان کی نسبت کچھ نہیں لکھا مگر اس کے نظم کردہ جنگ نامہ سے اس کے زمانہ کا تعیین ہو سکتا ہے ؎

تیرزی قعد ستوی سوز دوم شنبہ پیر	یار اسے لائے اٹھوی سن ہجری تحریر
عہد محمد شاہ دا سن اُنتی جان	ایہہ رسالہ جوڑیا مقبل شاہ جہان
تخلص ایس فقیر دا مقبل ہے مشہور	ایہہ عاجز ہے بھائیو اکھیں تھیں مجبور

اشعار بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگنامہ بروز پیر ۱۳ ذی قعد ۱۱۵۸ھ میں لکھا گیا۔ اور یہ کہ ناظم کا نام مقبل شاہ تخلص مقبل اور آنکھوں سے نابینا تھا محمد شاہ کا عہد تعین ہوتا ہے اسی زمانہ کے لگ بھگ ہیر رانجھا کا قصہ منظوم ہوا ہوگا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے اور شرف الدین کا نقل کردہ ہے فارسی رسم الخط میں پروفیسر بنارسی داس جین ایم اے پروفیسر اورینٹل کالج کی تحویل میں ہے۔ اس کی تاریخ نقل ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۵۶ھ ہے اس کا دوسرا قلمی نسخہ گورمکھی رسم الخط میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اس کا لکھنے والا لال سنگھ ہے۔ اس کا تیسرا قلمی نسخہ گورمکھی رسم الخط میں ہجارا سنگھ کا لکھا ہوا ہے یہ بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت ہے۔ مفید عام پریس لاہور نے اسے ۱۹۱۲ء میں گورمکھی رسم الخط میں شائع کیا۔ اس نسخہ کو پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۲۱ء میں پروفیسر بنارسی داس جین ایم اے اورینٹل کالج لاہور کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رانجھا جھنگ سیالاں توں روان ہویا بھائی تخت ہزارے نوں آوندے نے
ویر بچھڑے بہت غمناک ہوئے پیے چھوڑ دے ان نہ کھاوندے نے
ملے حبیب سانوں کویں پھیر رانجھا پئے رب نوں نت دھیاوندے نے
مقبل یار وچھنیاں جگ ہیتے عاشق کونج واںگوں کرلاوندے نے

۱۱۸۳ھ میں اس قصہ کو فقیر اللہ لاہوری نے بزبان فارسی نظم کیا۔ یہ مثنوی نام دنیا کے نام سے مشہور ہوئی فقیر اللہ لاہوری وارث شاہ کا ہمعصر ہے۔

نواب احمد یار خاں متخلص بہ یکتا نے ہیر رانجھا کو فارسی زبان میں نظم کیا۔ اس کا نام مثنوی یکتا رکھا۔ یہ مثنوی ۱۲۱۱ھ میں تصنیف ہوئی۔ نواب صاحب کا سن وفات ۱۲۲۸ھ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سرزمینے کہ عشق را باب است	کشور حسن خیز پنجاب است
مزرع حسن و دشت محبوبی	گلشن ناز و جنت و خوبی
شہرہ وہ باغ حرم و دلکش	از گل حسن گلشن آتش
غرض پنجاب ارض محبوبی است	یوسفستان عالم خوبی است

سید وارث شاہ نے اس قصہ کو حیات جاوید بخشی سر جارج گرائرسن نے سید وارث شاہ

[illegible] پنجاب [illegible] صفحہ ،، [illegible] جھنگ کے سول اسپتال [illegible] سرکاری کی عدالت میں اسے [illegible] دکھایا گیا ہے [illegible] ہیر رانجھا [illegible] دیباچہ مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۱۔

[illegible] ہیر رانجھا مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ (فٹ نوٹ) [illegible] ہیر رانجھا مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ [illegible] دیباچہ ہیر رانجھا مقبل صفحہ [illegible] دیباچہ ہیر رانجھا مقبل صفحہ [illegible]

کو ہیر رانجھا کا بہترین ناظم تصور کیا جاتا ہے۔ سید وارث شاہ کی تاریخ پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر چودھری افضل نے مخزن پنجاب میں سن وفات ١٢٢٠ھ بتائی ہے۔ بیان وارث شاہ اپنی ہیر رانجھا ١١٨٠ھ یعنی ١٨٢٢ بکرمی میں تصنیف ہوئی۔

تدوں شوق ہویا قصہ جوڑنے دا گل عشق دی جدوں اظہار ہوئی

سن یاراں سو اسی نبی ہجری لے دیس دے وچ تیار ہوئی

سید صاحب جنڈیالہ شیر خان کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ شیخوپورہ سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کا مدفن بھی یہیں ہے۔ آپ ذات کے سید تھے والد کا نام سید قطب شاہ تھا۔ نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی چھوڑی۔ آپ نہایت ذہین اور علم و فضل کے شوقین تھے۔ حصول تعلیم کی غرض سے قصور پہنچے۔ اس زمانہ میں قصور پٹھانوں کے ماتحت علم و فضل اور اسلامی تمدن کے لیے مشہور تھا۔ آپ نے زانوئے ادب حافظ غلام مرتضےٰ المعروف مخدوم جہانیاں کے آگے تہہ کیا۔ سائیں بلھے شاہ ان کے ہم مکتب تھے۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ کسی مرشد کی تلاش میں پاکپتن پہنچے اور حضرت بابا فرید شکر گنج چشتی علیہ الرحمۃ کے خاندان کے ایک بزرگ سے بیعت کی۔ یہاں پر سلوک و معرفت کی تمام منازل طے کیں اور اپنے وطن مالوف کی طرف روانہ ہوئے۔ واپسی پر آپ ٹھٹہ جاہد کے پاس سے گذرے یہاں پر ایک حجرہ میں قیام فرمایا۔ یکسوئی اور تنہائی تو تھی ہی یہیں کے ہو رہے۔ حقیقت کو پہنچنے کے لیے مجاز کی راہ اختیار کی۔ ایک حسین و جمیل عورت بھاگ بھری پر فریفتہ ہو گئے۔ آخر اس عشق میں سخت سست سنا پڑا۔ اپنی محبوبہ کی فرمائش پر ہیر لکھی۔ بقول چودھری افضل حق یہ کتاب دو معنوں میں وارث شاہ کا کھلا عاشقانہ خط تھا جو بھاگ بھری کو لکھا گیا۔ یہ کتاب علاقہ کھرل ہانس (ضلع منٹگمری) میں لکھی گئی ہے

کھرل ہانس دا ملک مشہور ملکاں جتھے شعر کیتا نال راس دے میں

گوشے بیٹھ کے ہیر کتاب لکھی یاراں واسطے نال قیاس دے میں

یہی ہیر وارث شاہ ہے جس کے دو سو سال سے مرد و عورت حافظ ہوتے آئے ہیں۔ اور وارث شاہ کی ہیر پنجاب میں ہر جگہ گائی جاتی ہے۔ وارث شاہ کی ہیر پنجابی تہذیب و تمدن اور تصوف و معرفت کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ ہیر وارث شاہ کے نقاد بہت ہیں۔ مگر افسوس کہ ان کی تنقید افراط و تفریط کی حامل ہے۔ اور یہ۔ تفریط والے کہتے ہیں کہ اسے بحق سرکار ضبط کر لینا چاہیے۔ اور افراط والے اسے پنجابی زبان کا قرآن کہتے ہیں مگر سید وارث شاہ نے بذات خود اس کا ایسا فیصلہ کیا ہے جس پر نظر ثانی نہیں کی جاسکتی ہے

بعضے کہن ایہہ بہت فضول قصہ اوہ بھی کرن نہ سوچ وچاریاں

بعضے کہن قرآن ہے ہیر وارث اوہ بھی شستر نے بے بہا رمیاں

عقل والیاں واسطے ہے وارد ایہہ احمقاں نوں زہر مار میاں

خذ ما صفا ما کدر سمجھ ایس نوں ہو ہوشیار میاں

انتخاب ہیر وارث شاہ | ہیر وارث شاہ کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیں اور پڑھ کر اس کی خلاقی عظمت کا اندازہ لگائیں۔

عدل بناں سرداری ہے رُکھ اپھل رن گدھی اسے جو وفا وار ناہیں

خانزیاں ہے کنجی بانجھ جیہی مرد گدھا جو عقل دا یار ناہیں

بناں آدمیت انسان ناہیں بنا آپ قاتل تلوار ناہیں

ہمت باجھ جوان بن حسن دلبران باجھ طعام سوار ناہیں

بُرا کسب نہ نوکری جیڈ کوئی یاد حق دی جیڈ ا کار ی ی دے

علم ہنر دے باجھ نہ ہنچ کوئی عمل صالح جیڈ نہ رہبری دے

جیہڑے مرن سو فقر تھیں ہون واقف نہیں کم اے مرن تھیں نگیاں دا

شوق مہر تے صدق یقین باجھوں کیا فایدہ ٹکڑیاں منگیاں دا

من مارئیے جوگ نوں پالئے جہا مارئیے ناگ رکھ سوٹڑی نوں

ہتھ پکڑ مطہر یقین والی ماریں نفس شیطان دی کھوتڑی نوں

داغ دنب نے بہت سنبھال رکھیں چادر فقر دی چٹڑی دھوتڑی نوں

ایس لکھ توں جھوٹ ڈلیں جار لیاوناں اپنی کھوتڑی نوں

حال فقر دے نوں تاک نہ لائیں دلوں صاف رکھیں نیت کھوٹڑی نوں

وڈی ماں برابر ہی جانئیں تے بھین برابر ہی چھوٹڑی نوں

جتی ستی نمانیاں ہو رہیے ثابت رکھیے ایس لنگوٹڑی نوں

ہوئے اک دے نال نہ انب لگن ہو دے نہیں انار کریر ڈیلا

پتر کھوتیاں دے گھوڑے نہیں ہوندے بچوے اکھ نہ جیڈ جیوں لیلا

ہیر آکھیا عشق دی راہ پونا نہیں کم ملوانیاں قاضیاں دا

ایس عشق میدان دے کٹھیاں نوں رتبہ ہل دا کربل دے غازیاں دا

جتھے عشق دریا دی موج آوے اوتھے اوکھیاں تریاں تاریاں نی

جنہاں عشق توں جان قربان کیتی انہاں بخشیاں رب سرداریاں نی

کدی وارثاں نال نہ ہون چنگے جنہاں لگیاں عشق بیماریاں دے

لوح قلم پئی سجدے عشق اگے نہدی ہیر ہیں کون وچاریاں دے

سودے کرن بجاز دے بہت وچوں کوئی گاہک نہ حق حقانی دانی

جویں باجھ نماز دے بنن مومن تویں عشق تے عمل کمان دانی

سارے کرن منصور دا ورک دعوے کون سولیاں تے چڑھن دانی

شاہ شمس تبریز دے بنن طالب کیتوں حوصلہ چم لہان دانی

ماتم حسن حسین دا کرن لکھاں حکا کسے نہ ریس کسان دانی

نعرہ حق کا وانگ بلال موہوں بچے حق دے مار نہ کھان دانی

ایہہ عشق تصدیق ایمان دائے تصدیق بنا عشق تان دانی

وارث شاہ آن ناشاں ہون جیدم پورا اتر نام کم عاشقاں دانی

---

۵ حضرت سید بلھے شاہ صاحب قادری شطاری رحمۃ اللہ متوفی ١١٧١ھ ان کا مزار قصور میں ہے ان کی کافیاں مشہور ہیں۔ ١٩٣٣ء میں راقم الحروف کو امتحان آنرز ان اردو کے سلسلہ میں مدرسہ ... قصور ... تھا۔ میری جائے قیام کے سامنے ایک تانگہ چلانے والے کا گھر تھا۔ جو گوجرانوالہ کا باشندہ تھا۔ اس کی جوان سال لڑکی اور ایک بچے کی بیوی ... ہیر وارث شاہ ... [illegible]

رسم ایس جہان دی چپ رہنا موہوں بولیا سوئی او ماریا ئی
منصور نے عشق دا بھیت دتا اوہنوں ترت سولی اتے چاڑھیا ئی
جیہڑے عشق دی اگ دے تاتے انہاں دوزخاں نال کی واسطا ئی
دوزخ موریاں بن بے صدق جھوٹے جیہڑے نال لکن آس پاس دا ئی
پیٹ واسطے سب خرابیاں نے پیٹ واسطے خون گذارنے نی
پیٹ واسطے پھرن امیر دردر سیدزادیاں نے گدڑے چارنے نی
پیٹ واسطے حور تے پری زاداں جان جن تے بھوت تے وارنے نی
پیٹ واسطے رات نوں کرن چوری پیٹ واسطے اگ وچ سڑنے نی
پیٹ واسطے فقر تسلیم توڑن شاہ ملکاں نوں چے اجاڑ دے نی
پیٹ واسطے رات نوں چھوڑ گھر باہر ہو کے ہو کرے مارنے نی
سوال منناں کہ بہاوراں دا بھلا کردیاں ڈھل نہ لوڑیئے جی
جیہڑا آس کر کے دوارے آن ڈھکے جی اوس دا نہ تروڑیئے جی
منکر ہون جو پیر استاد کولوں انہاں ڈونگرے کھوہ نگھارنیگے
ماں باپ دے حکم توں عاق جیہڑے اوہ روز قیامت ہارنیگے
صحبت نیک دی نیک بناوندی اوگن ہاسیلی اوگن ہاردے نی
عطر لگسی انہاں دیاں لیڑیاں نوں جیہڑے صحبتی ہون عطار دے نی
بھاویں تخت بہیں بھاویں زمیں سوویں آخر خاک دے وچ رلیونائیں
وارث شاہ میاں انت خاک ہوناں لکھ آبحیات جے پیونائیں
گیا بیج تقدیر دے نال بھوٹھا ساتھوں ہمتے جاہ مٹ دی دے
تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے تقدیر پہاڑاں نوں پٹ دی دے
آدم حواں نوں کڈھ بہشت وچوں تقدیر زمین تے سٹ دی دے
سلیمان جھوکے بہت ماچھیاں دے تختوں چا تقدیر پلٹ دی دے
موسیٰ لنگھیا پار فرعون اتے تقدیر دریا الٹ دی دے
یوسف جیہے پیغمبر زادیاں نوں تقدیر کھوہ وچ سٹ دی دے
پنچھی مرگ پھاہی وچ آن پھاسے نہیں پھیر تقدیر دے جھٹ دی دے
تقدیر جیہدے سر تے تاج رکھے قدم اوسدے پر ٹمی چٹ دی دے
دتی زہر تقدیر نے حسن تائیں سیس شاہ حسین دا کٹ دی دے
وارث نبی دا اوند شہید ہویا تقدیر نہ کسے توں ہٹ دی دے
جیہڑے دلوں شرم نہ ہووے غیرت اس مرد توں چنگیاں تیویاں نی
پنج انگلیاں دیکھ نہ اکو جیہیاں اک اچیاں تے اک نیویاں نی
مایہ عیب چھپاوندی ناقصاں دے مایہ لاج رکھے سبھ تھاں میاں
مایہ باجھ نہ کوئی ہے یار بیلی مایہ باجھ نہ بہنڑ بھرا میاں
مایہ والیاں نوں آدری کرے خلقت مایہ باجھ نہ لیندا کوئی ناں میاں
مایہ باجھ عقل ہوش بیٹھ کے نک نہ رہے او دساں میاں
مایہ باجھ عقل دے کوٹ پورے مایہ باجھ او حیران میاں
مایہ واسطے دین ایمان دوین جنہاں تھاں کوئی آن میاں

ہیر وارث شاہ کے اکثر مصرعے ایسی زرات کی شکل اختیار کر گئے ہیں جو سرزمین پنجاب میں زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں۔ مثلاً:-

۱۔ رناں مار لئے امام زادے مار گھتیا پیریاں دلیاں نوں
۲۔ وارث فعلاں دے نال خراب ہوندے بندے پاک گناہ بھیں جمدے نی
۳۔ دولت دیس تے دھرم ایمان سبھے وارث شاہ ہے نال کمائیاں دے
۴۔ خالی ہتھ آیا تے جائے خالی وارث شاہ جو عمل تھیں مڑے بھیڑا
۵۔ جیہا بیجیئے وارث شاہ وڈھے لئے تکم وچہ حدیث دے آئیا ئی
۶۔ جیسا کرے کوئی تیسا پاوندا ہے سچے وعدے پروردگار دے نی
۷۔ پڑھن علم تے عمل نہ کرن جیہڑے وانگ ڈھول دے بول جو سکھدا ہیں
۸۔ وارث شاہ اوہ سدا ہی جیوندے نی جنہاں کیتیاں نیک کمائیاں نی
۹۔ جھوٹ ساڑ دا چاہیاں نوں جی جوں اگ ساڑ دے ککھاں ساریاں نوں
۱۰۔ انت سچ دا سچ ہی نترے کا کدے دیس نہ وسدے جھوٹھیاں دے
۱۱۔ قول ہار نا کم ہے پاجیاں دا جیہڑے دھن دے مگر دوڑیں قاضی
۱۲۔ شان قول زبان تھیں پھرن پیراں بُرے ذات دی رہبلنائیاں نی
۱۳۔ وارث اوہدا روانہ کار روز دحقداروں کرے حق جیہڑا
۱۴۔ جیہڑا حق نوں کرے ناحق میاں ایس جگ توں اس کی جھنائیں
۱۵۔ وارث شاہ جو عیب نہ کجدا اے رب اوسدا انہیں چھپاوندا ہے
۱۶۔ موہوں نکلی گل خوار کردی نہیں دلیندا کھولنا راز بھائی
۱۷۔ وارث شاہ مغرور نہ ہووے ہرگز کا لانہ شیطان کر دتا ئی
۱۸۔ ان دھن تے پچھی رب دلیسی وارث شاہ نوں کاسدی لوڑ ہے جی
۱۹۔ پڑھے علم تے عمل نہ کرن جیہڑے او شیطان مردود وبال دے نی
۲۰۔ بدل فضل دے جدوں آوسدے نی فیض سنجیدا ایاں نیچیاں نوں

وارث شاہ نے بیشمار آیات قرآنی کو تضمین کیا ہے۔ اس کے ان گنت اشعار قرآنی مضامین کے حامل ہیں۔ وارث شاہ نے جابجا اسلامی تلمیحات استعمال کی ہیں۔ حضرت آدم و حوا کا بہشتوں سے نکلنا۔ ہابیل و قابیل کی لڑائی۔ طوفان نوح۔ حضرت ابراہیم کا آتش نمرود میں پھینکا جانا۔ حضرت اسمٰعیل کا ذبیحہ۔ حضرت یعقوب کی بینائی کا فراق یوسف میں زائل ہونا۔ حضرت یوسف کا کنوئیں میں گرایا جانا۔ ان کا سر بازار بکنا۔ حضرت سلیمان کا بھٹ جھونکنا۔ حضرت ایوب کے جسم مبارک کا کرموں کی خوراک بننا۔ حضرت یونس کا شکم ماہی سے زندہ برآمد ہونا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت۔ حضور کا غزووں میں شریک ہونا۔ حضور کے دندان مبارک کا شہید ہونا۔ حضرت امام حسن کو زہر دیا جانا۔ حضرت امام حسین کا میدان کربلا میں شہید ہونا۔ تمس تبریز کی کھال اتروانا۔ منصور حلاج کا سولی پر چڑھنا۔ غرضکہ اسلامی تاریخ کا کوئی واقعہ نہیں چھوڑا جسے تلمیح نہ بنایا ہو جابجا احادیث نبوی کو باندھا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید وارث شاہ اپنے زمانے کے عالم اجل و فاضل اکمل تھے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ایک غزل کے علاوہ ان کا اردو کلام نہیں ملا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں محمد اکرم ایک فارسی زبان کا شاعر گذرا ہے۔ اس کا تخلص غنیمت تھا۔ عام طور پر ملا غنیمت کے نام سے مشہور ہوا۔ قصبہ کنجاہ ضلع گجرات اس کا وطن ہے۔ اس نے ایک مثنوی بزبان فارسی لکھی۔ اس کا نام نیرنگ عشق رکھا۔ اس مثنوی میں قصہ ہیر رانجھا کو فارسی زبان میں منظوم کیا گیا ہے۔ اسے حال ہی میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے از سر نو طبع کرکے شائع کیا ہے۔ قیمت صرف ۴ روپے رکھی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ندیدم کشور غارت گر تاب ۔ بہ خوبی ہائے حسن آباد پنجاب
فضائے نشئہ مستی ہوائش ۔ زمین وآسماں از خاک پائش
زلالش بادہ ساز مستی عشق ۔ نسیمش روح بخش مستی عشق
گلش بر خاک ہر جا سایہ انداخت ۔ زمین از آتش یاقوت گداخت
بتانش چوں زر دست مہر خوردند ۔ شکر گویند گوہر مے فروشند

اس قصے کو وارث شاہ کے زمانے کے آس پاس ہی ایک پنجابی شاعر احمد یار نے بھی پنجابی زبان میں نظم کیا۔ احمد یار موضع مرالہ ضلع گجرات کا رہنے والا تھا۔ یہ بڑا مشہور پنجابی شاعر گذرا ہے۔ صاحب خمسہ ہے۔ چالیس سال تک قصہ نویسی کی۔ قصہ سیف الملوک، قصہ یوسف زلیخا اور قصہ حاتم طائی کو مخصوص انداز میں لکھا۔ بڑا پُرگو و پُر نویس ہو گذرا ہے۔ اسے طبابت سے بھی شغف رہا ہے۔ طب احمد یاری لکھی۔ اپنے آپ کو ملک الشعرا کہا کرتا تھا مگر وارث کی قادر الکلامی کا معترف ہے۔ احمد یار نے کچھ عرصہ پیر کرم شاہ کی صحبت میں بھی گذارا۔ پیر صاحب موضع ہیر کھار ضلع جہلم میں مقیم تھے۔ طب احمد یاری اور قصہ حاتم طائی انہی پیر صاحب کی فرمائش پر لکھی۔ احمد یار تیز نویس اور خوش نویس بھی تھا۔ اس کے قصہ ہیر رانجھا کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ وارث شاہ کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔ پُرگوئی کے علاوہ ان کی اور کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر قسم کا رطب و یابس لکھ مارا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات کو دوام حاصل نہ ہو سکا۔ رنجیت سنگھ کے دربار سے اسے کچھ وظیفہ ملتا تھا۔ پنجابی زبان میں ان کی تصانیف ان گنت ہیں۔ کہتے ہیں کہ باتیں بھی پنجابی شعروں میں ہی کیا کرتا تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

وارث شاہ جنڈیالے والے واہ واہ ہیر بنائی ہا بن بھی ریس اوسے دی کرکے لکھی توڑ نبھائی
سیف ملوک دا عشق خلاصہ اول آخر تائیں ہا ویہلیاں ایہہ زور آوریاں سبھے حکم قضائیں
عاشق معشوق دیاں جنہاں جھمیاں چاپل جائیں ہا احمد یار تیاں جگ دکھاں چھنڈیاں عشق ہوائیں

اشعار بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد یار کے اشعار میں نہ سوز و گداز ہے اور نہ ہی ربط و ضبط۔

قصہ ہیر رانجھا کو محمد شاہ ایک پنجابی شاعر نے بھی نظم کیا۔ اس کا یہ منظوم کلام چار سہ حرفیوں پر مشتمل ہے۔ یہ گمنام شاعر علاقہ میرپور جو کہ ریاست جموں میں ہے ہو گذرا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ساڈیاں جیلیاں سبز رنگاں اساں اج چڑھائیاں رانجھنا وے
تیری خاطر ہار سنگھار کیتے دھڑیاں اج میں لائیاں رانجھنا وے
باغ باغ ہووے دل ویکھ تیرا داگاں اج گندائیاں رانجھنا وے
محمد شاہ تیری ملاقات کارن سیجاں اج وچھائیاں رانجھنا وے

اس کے اشعار میں درد اور سوز پایا جاتا ہے۔

فی زمانہ شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے ہیر وارث شاہ سے دوسرے درجے پر ہے فضل شاہ کے دوہڑے بھی پنجاب بھر میں مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام بھی سید قطب شاہ تھا۔ آپ متصل لاہور کے رہنے والے تھے۔ آپ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸ فروری ۱۸۹۰ء مطابق ۱۳۰۷ھ داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کا مزار گاؤں کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ آپ فنانشل کمشنر کے دفتر میں ایک دفتری کی اسامی پر متعین تھے۔ آپ کی دیگر تصنیفات یہ ہیں:
تحفہ فضل (۱۲۷۶ھ) سوہنی مہینوال (۱۲۶۹ھ) سسی پنوں (۱۲۸۲ھ) لیلیٰ مجنوں (۱۲۸۹ھ) یوسف زلیخا (۱۳۰۲ھ) سی حرفی جات (۱۲۸۲ھ) بارہ ماہ فضل و فضل کے دوہڑے۔ ہیر رانجھا کا سن تصنیف ۱۲۸۶ھ ہے چونکہ سید وارث شاہ اور سید فضل شاہ کے زمانے میں پون صدی کا فرق ہے اس لئے زبان میں بھی ایک نمایاں تفاوت نظر آتا ہے۔ آپ بھی احمد یار کی طرح صاحب خمسہ ہیں اور اپنے آپ کو ملک الشعرا کہلواتے تھے۔ آپ پہلے پنجابی شاعر ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں صنعت تجنیس کی عام طور پر رعایت رکھی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دوروں ڈھونڈ دی تیری جنج جاتی پئی موت دے اٹھ سوار سوہنا
وسے میں موئی بے دردیا موڑ داگاں لگی سانگ کلیجڑے کار سوہنا
ایہو ویڑا ای مینوں مل سایاں گل لاواں سینہ ٹھار سوہنا
میرا عرش دا کنگرہ ڈھا گیوں کئی کوک عرشوں لنگ پار سوہنا

قصے کو رائے بہادر منشی کنہیا لعل المتخلص بہ ہندی نے مثنوی نگارین نامہ کے نام سے بزبان فارسی نظم کیا۔ یہ زلیخا جامی کی بحر میں لکھا گیا اور ایک دو مرتبہ لاہور میں چھپ کر تقسیم ہوا۔ یہ قصہ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا اس کی زبان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہے قصے میں جا بجا ہندی جزئیات پائی جاتی ہیں۔ اول منشی صاحب نے وارث شاہ کی پیروی کی ہے۔ وجہ تصنیف نگارین نامہ کے تحت میں خود منشی صاحب نے لکھا ہے ؎

اگر پیشیں ازیں وارث سخنداں ۔ رقم کرد است نظم حال ایشاں
مگر نظمش بہ پنجابی زبان است ۔ کہ مطبوع دل مبتی بیان است

اشعار بالا سے منشی صاحب کی روانی بیان اور سلاست مضمون کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مگر صاحب دیباچہ ہیر وارث شاہ پیرانڈتہ ایڈیشن لکھتے ہیں کہ اصل میں یہ تصنیف منشی غلام لاہوری کی ہے اور ہندی کے نام پر لگائی گئی۔ مجھے ان کے اس بیان سے اختلاف ہے کیونکہ رائے بہادر منشی کنہیا لعل بڑے مسلم صاحب قلم رہ چکے ہیں۔ ان کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ کسی دوسرے شخص کے رشحات قلم کو اپنے نام کے ساتھ موسوم کرکے اپنے ادبی وقار کو ٹھیس لگاتے۔

صاحب دیباچہ یادگار وارث نے تین اور فارسی قصوں کا ذکر کیا ہے جو اسی موضوع پر لکھے گئے۔ ان میں سے ایک ہیر رانجھا مصنفہ منت دہلوی ہے۔ دوسرا ہیر رانجھا مصنفہ سندر داس آرام تیسرا مثنوی باقی مگر ان تینوں مصنفوں کے متعلق مفصل روشنی نہیں ڈالی

ا ؎ تاریخ ... سال ... میں میاں ... نے ۱۸۰۰ء میں اس نام کا ایک ... تصنیف کیا ... صفحہ ۲۰۰
۲ ؎ فہرست کتب ... ۳ ؎ ... ۴ ؎ یادگار وارث صفحہ ۱ ۵ ؎ دیباچہ ہیر وارث شاہ پیرانڈتہ ایڈیشن
۶ ؎ دیباچہ ہیر وارث شاہ پیرانڈتہ ایڈیشن ۷ ؎ دیباچہ ہیر وارث شاہ پیرانڈتہ ایڈیشن ۸ ؎ سید وارث شاہ کے والد کا نام بھی سید قطب شاہ تھا ۹ ؎ یادگار وارث صفحہ ۳۳ ۱۰ ؎ دیباچہ ہیر وارث شاہ ...

... ہی ان کے کلام کا نمونہ میسر آسکا ہے تاہم اس سے قصہ ہیر رانجھا کی فارسی زبان میں مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ جنت دہلوی کا اس پنجابی قصہ پر خاص احسان ہے کہ انہوں ... اُتی تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جو دہلوی حضرات کو ہر ایک ایسی چیز کے خلاف ... بیت کے لحاظ سے پنجابی ہو ہوتا ہے ایک پنجابی قصہ کو اپنی طبع آزمائی کے لئے منتخب ... اور قصہ کی تمدنی ثقالت ان کی دہلوی نزاکت پر بار ثابت نہ ہوئی۔

بھگوان سنگھ نے اس قصہ کو پنجابی زبان میں نظم کیا۔ یہ ۲۰۰ کتب پر مشتمل ہے ... ن علاقہ مالوہ کی استعمال کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان سنگھ بھی علاقہ مالوہ باشندہ ہے۔ یہ قصہ سکھ لوگوں میں زیادہ مقبول ہے اور دیوی ماتا کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ اس قصہ کا پہلا شعر ملاحظہ ہو ؎

کتھا کہواں ۔ ہیر کی پر کچھ آرمان لو بھگوان سنگھ وچ دوستاں کہے سچ دیال

... اور سکھ پنجابی شاعر جوگ سنگھ نامی نے بھی اس قصہ پر طبع آزمائی کی۔ یہ بھی کبتوں پر مشتمل ہے اور بازار میں عام ملتی ہے اس لئے نمونہ اشعار نہیں دیا جاتا۔

الہ دتا ارائیں ایک اَن پڑھ تاک بند نے بھی اس مشہور و معروف قصہ پر تک بندی ... ہے۔ یہ موضع ٹون میانی ضلع شاہپور کا رہنے والا تھا حال ہی میں وفات پائی۔ یہ قصہ ہیر ... وار کے نام سے مشہور ہے کلال لوگ عام طور پر ہیر رانجھا کا سوانگ بھر کر اس کی نقل اتارا کرتے ہیں ہیر کی وار کے اشعار ان لوگوں کو خوب ہی یاد ہوتے ہیں۔ یہ سوانگ عام طور پر بیاہ شادی کے موقعوں پر بھرے جاتے ہیں۔ اور اَن پڑھ آدمیوں کی ضیافت طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہیرے نی اک جوگی آیا گلیاں نے وچ دگدا
اڈ اڈ اندر دل جھاتی پاوے جس دروازیوں لنگھدا
اجڑ گیاں دی کوئی نہیں نگری نہ کوئی باپ نہ مائی
نہ کوئی بندہ خویش قبیلہ نہ کوئی بھین نہ بھائی

بقول مصنف دیباچہ ہیر وارث شاہ ہیر اندر ترگڑ والی اس قصہ پر میاں محمد صاحب مصنف سیف الملوک نے بھی طبع آزمائی کی ہے مگر اس کا نمونہ نایاب ہے ایک قصہ ہیر رانجھا حال ہی میں چھپا ہے اس کے مصنف پنجابی کے شاعر مولا بخش صاحب کشتہ ہیں۔ جو امرتسر کے باشندے ہیں۔ اس قصہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

سب تعریف اس مالک الملک تائیں جیہڑا جس نے کون و مکان کیتے
عقل فکر قیاس باہر راز آہے ذات پاک نے جو عیاں کیتے

اس قصہ پر بہت سی سی حرفیاں لکھی گئی ہیں۔ ان کا شمار مشکل ہے مگر بقول صاحب دیباچہ ہیر وارث شاہ حسب ذیل سی حرفیاں بہت مشہور و مقبول ہیں۔

۱۔ سی حرفی ہیر حسین۔ یہ شخص موضع گاجر گولہ علاقہ رسول نگر میں ہو گذرا ہے۔ بہت بلند پایہ شاعر تھا۔ نمونہ کلام ؎

... ماہی عشق یقین سیتی میری ماہی دے نال پریت ماسے
... جیہڑے سال تھیوساں نال ماہی اساں نال وعدے ہیومنیت ماسے
... ... عاشقاں دو رات ماسے

میری عرض ہے عرض حسین ایہو شالا پیت نہ ہووے پلیت ماسے

۲۔ سی حرفی ہیر جھیل نمونہ کلام۔

ب۔ بیدو کی جانن ہیرے دردمنداں دیاں آہیں ۔۔۔۔۔ بھڑکن بھائیں
باہجوں دردو بیدار نہ ہیرے ہن دردوں کجھ نہیں ۔۔۔ سمجھ کدائیں
الانتظار اشد من الموت جلی لکھ واراں ۔۔۔۔ انتظاراں
آن جان لباں تے جھیل کدی تے موڑ مہاراں ۔ ہگھ باراں

۳۔ سی حرفی ہیر روشن۔ یہ بازار میں عام ملتی ہے۔

۴۔ سی حرفی ہیر محمد۔ یہ سی حرفی ان میاں محمد مصنف سیف الملوک کی تصنیف ہے۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ دراصل ایک مخمس ہے ایک مرتبہ شائع ہوئی تھا دوسرا ایڈیشن نہیں نکلا اس لئے نایاب ہے اس کا ایک مصرعہ نہایت مشہور ہے ؎

پچھو جا محمد ہیر کولوں کرک جاندے عشق سو کھا لڑے لی

۵۔ سی حرفی ہیر سید فضل شاہ۔ ان کا مفصل ذکر اوپر آچکا ہے اب سی حرفی کا نمونہ ملاحظہ ہو

الف الٰہی میل ماہی نوں ہجر ماہی دے تلیاں پھاٹن تلیاں
ہک ماہی نوں نے گل لاون ہک ہتھ ڈھونڈ دے گلیاں اس غم کھلیاں
میں نہ بھلیاں ماہی تے کھے سکھ ہزاراں بھلیاں جھلیاں ہسیاں
ہک تڑفن فضل پیا دے باہجوں بیوں بن پانی کلیاں دل ملیاں

۶۔ سی حرفی ہیر میاں محمد عمر ساکن لکا ضلع جھنگ۔ اس کا نمونہ نہیں مل سکا۔

۷۔ سی حرفی ہیر سید شاہ شرف۔ بقول صاحب دیباچہ ہیر وارث ہیر اندہ۔ یہ سی حرفی بھی ابھی تشنۂ طباعت ہے

۸۔ سی حرفی ہیر شاہ جلال۔ نمونہ نہیں ملتا

۹۔ سی حرفی ہیر علی حیدر۔ یہ بڑی مشہور و معروف سی حرفی ہے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچے میں بہت بازی کو مقبولیت عام طور پر علی حیدر کی سی حرفی ہی سے ہوتا ہے قوال لوگ اس سی حرفی کے حافظ ہوتے ہیں جو دوہڑوں کی شکل میں گاتے ہیں۔ اس سی حرفی میں بڑا سوز و گداز ہے علی حیدر بڑے اعلیٰ پایہ کے صوفی منش پنجابی شاعر ہو گذرے ہیں۔ آپ ملتان کے رہنے والے تھے۔ آپ نے ۱۱۹۱ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

الف ازل الست دی یاری لگ رہی ہیر یتیم دی آ
میں تاں رانجھاں وچہ رسول دے طرف مینوں قسم جے عرش عظیم دی آ
اوہے موہنے تے کمل مزمل والا اوہدے ہتھ کھونڈی سیئن دی آ
علی حیدر رانجھا اج پچھاتا اوہ تے ظاہر صورت میم دی آ

قصہ ہیر رانجھا کو سید میراں شاہ نے ۱۳۰۳ھ میں سپرد قلم کیا تاریخ اختتام چھٹا روز ماہ رمضان لکھی ہے۔ شیخ محمد بخش فضل حسین نے الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ میں طبع کرا کر شائع کیا۔ اس قصہ کو اس طرح پر شروع کیا ہے۔ ؎

اول صفت خدا دی کریئے تا در قدرت والا ٭ ہر ہر دیوچ ذات ہے اُسدی سب تے رہے نرالا
کن فیکون آوازہ کر کے کیتا نور اجالا ٭ آدم جن فرشتے کیتے پیدا رب تعالیٰ
رازق رزق دیندا سب تائیں کر تقسیم نرالا

یں داقعات قصہ کا آغاز ہیر کی رانجھا ہونے سے شروع کیا ہے۔ تاریخ تصنیف قصہ تصنیف یوں بیان کی جاتی ہے:۔

ہیر ہوئی تمام ساری کیتا فضل الہی ٭ جیسی عقل تیری سی مینوں سو تمہید اٹھائی
و یاراں دا آکھنا مینوں طاب نہ کائی ٭ تیرہ سو ستاسی سن ہجری جاں ہیر بنائی
نماں نے چھیواں ونڈ بیہے پہ رکائی ٭ کل حقیقت رانجھے دی یار آکھ سنائی
لمہ پاک نبی دا جس امت بخشوائی ٭ میراں شاہ اس کلمہ سب دی بیڑی پار لنگھائی

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار اردو آمیز پنجابی میں ہیں۔

ہیر رانجھا انگریزی زبان میں بھی لکھی گئی۔ اس کے مصنف کا نام سردار محمد عبد الستار آفندی ہے۔

ہیر وارث شاہ کے بے شمار ایڈیشن مرتب ہوئے مگر ہیر پراندہ تر رڈوالی پیر محبوب عالم اور ہیر شیخ غلام علی تاجر کتب لاہور کے ایڈیشن نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب ہیں لطف یہ ہے کہ ان تینوں ایڈیشنوں کے متن کو سید وارث شاہ سے منسوب کیا جاتا ہے مگر ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ خود الگ قصے بن گئے ہیں جن کی زبان مختلف اور انداز بیان جدا ہے۔ ہیر پراندہ ان مصور ہے اور اس کے ساتھ ایک مبسوط دیباچہ زائد کیا گیا ہے جس سے راقم نے کہیں کہیں استفادہ کیا ہے۔

ہیر رانجھا تھیٹر کی سٹیج پر بھی کہیں کہیں کھیلا گیا اس قصہ کو کئی مرتبہ ڈرامہ بنایا گیا ہیر رانجھا مصنفہ ... عبد اللہ نہایت شہرت حاصل کر چکا ہے۔ حافظ صاحب موصوف ... کے رئیس ہیں۔ یہ پہلے امپیریل تھیٹریکل کمپنی اور میڈن تھیٹر آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی میں کام کرتے رہے اور بہت سے طبعزاد ڈرامے ان کی طرف منسوب ہیں۔ ڈرامہ ہیر موخر الذکر کمپنی میں کھیلا گیا حافظ صاحب کے دوسرے ڈرامے بس پرستان۔ ذات سبھا ... ستم فتنۂ عالم۔ پولیس ناٹک۔ عاشق جانباز۔ زہرہ و بہرام۔ انصاف محمود ... ہے۔ مؤخر الذکر ہیر رانجھا غالباً ۱۸۹۹ء میں لکھا گیا۔

قصہ اس قدر مقبول عام اور مرغوب خاص ہے کہ سینما کا پردہ بھی اس سے ... روڈ تون نے اس کو بہ ... فلمایا۔ اس فلم کا نام ہیر سیال ہے پنجاب کے شہر میں جہاں سینما گھر موجود ہیں یہ فلم مقبول چلا ملا ہو ہیں اس فلم نے ... نے ریکارڈ مات کر دیئے۔ اس کے مکالمے اور گانے بابو فیروز دین شرف پنجابی نے لکھے کہیں کہیں وارث شاہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

میرا یہ مقالہ تشنۂ تکمیل رہیگا اگر میں یہاں پر چودھری افضل حق صاحب مصنف ... و آزادی ہند کی معشوقۂ پنجاب کا ذکر نہ کروں۔ چودھری صاحب پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ... اور گڑھ شنکر کے رہنے والے۔ آپ احراری لیڈر ہیں۔ اور کئی مرتبہ جیل کی کال کوٹھڑیوں ... میں۔ اب بھی حال ہی میں بوجہ علالت طبع سزا کی میعاد سے پہلے ہی رہا ہو چکے ہیں۔ اکثر تصنیفات و صحیفات کہ جاتے تھے ... جیل کے ماحول۔ یکسوئی۔ [illegible]

زبان میں نثرایا گیا۔ گو سن تصنیف کا پتہ نہیں چلتا مگر حال ہی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے معشوقۂ پنجاب کریمی پریس لاہور میں چھپی ہے اور اسے میر نثار حسین نے شائع کیا ہے۔ قیمت ... رکھی ہے ابتدا میں ایک مختصر سا دیباچہ از مصنف درج ہے۔ کل کتاب ... صفحات پر مشتمل ہے۔ چھبیس چھوٹے چھوٹے بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے ہر ایک باب بذات خود ایک دلپذیر فسانہ ہے۔ ہر ایک باب کا متن اردو زبان میں چودھری صاحب کے مخصوص انداز تحریر کا حامل ہے۔ مگر عنوان پنجابی مصرعہ یا شعر سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً پہلا باب حسب ذیل پنجابی شعر سے شروع ہوتا ہے:۔

رانجھا پھل گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا
میں دشمن بھلے سنگھیا میرے لوں لوں رچ گیا

چونکہ معشوقۂ پنجاب عام ملتی ہے۔ اس لئے بخوف طوالت مونتہ کچھ درج کرنے سے درگذر کرتا ہوں۔ چودھری صاحب کے زور بیان نے اسے پڑھنے کی چیز بنا دیا ہے۔

نیاز احمد ترمذی بی اے بی ٹی

غزل

یہ موسم بہار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ
سینہ وہ داغدار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

ہر روز روز حشر ہے ہر شب شب حساب
ہمدم! وہ حال زار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

ہوتا جو اختیار میں مرنا! تھا کیا برا
جینا وہ مجھ پہ بار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

یارب یہ کس طرح سے بجھے گی لگی ہوئی
دل ایسا شعلہ بار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

پڑھتا رہا ہے رات اسی کی نماز لعل!
اک بت سے ایسا پیار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

آخری خط

لکھے لاکھوں ہی خط تم کو ہزاروں التجائیں کیں
ربابِ زندگی پر نغمۂ آہ و فغاں گایا
خیالی راحتوں سے دِل کے ارمانوں کو بہلایا

کیا رنگین اپنے خوں سے اُلفت کی کہانی کو
دیا آغوشِ ظلم و جور میں اپنی جوانی کو
تمنائے سکوں میں کاٹ دیں تاروں بھری راتیں
بُھلائے سے نہیں بھولیں تمہاری دلنشیں راتیں

فسُردہ حسرتوں کے خُوں سے کتنی ہولیاں کھیلیں
تمہیں اپنا سمجھ کر کیسی کیسی آفتیں جھیلیں
کبھی جب اضطرابِ شوق میں حد سے گذرتا تھا
تصوّر میں ہزاروں التجائیں تم سے کرتا تھا

دُعائیں کیں تمہارے واسطے اور بد دعائیں لیں
چراغِ زندگی اب ٹمٹما کر بجھنے والا ہے
پشیماں گر کبھی ہو جاؤ تم اپنی جفاؤں پر
تو دو آنسو بہا دینا مری لبیکیں وفاؤں پر

شبستانِ محبّت پر اندھیرا چھانے والا ہے
لکھے گا کون اب خط تم کو، اب تم کس سے رُوٹھو گی؟
ہمیشہ کے لئے یہ "آخری خط" پڑھ کے چھو لو گی؟

حفیظ قیصر نجیب آبادی

سیر و سیاحت

تسکار رنٹ ہال۔ ہاکی ٹینس کی طرح سیر و سیاحت بھی فارغ وقت کو صرف کرنے کا ایک اچھا طریقہ ہے۔ ہائکنگ میں شہری اور پر رونق زندگی کو کچھ دن کے لئے چھوڑ کر آدمی دیہاتوں میں پہاڑوں پر اور جنگلوں میں ایک آزاد اور بے فکر انسان کی حیثیت سے گھومتا ہے اور قدرت کا نظارہ کرتا ہے۔

ہر شخص کے دل میں دنیا کے عجائبات کے دیکھنے کا شوق ہے اور وہ چاہتا ہے کہ چل پھر کر اپنی نظر سے ہر پسندیدہ چیز کا معائنہ کرے۔ قدرت کا مشاہدہ مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے اگر فاصلہ زیادہ طے کرنا ہو اور کوئی خاص چیز کسی خاص جگہ پر دیکھنی مقصود ہو تو بحری اور ہوائی جہاز۔ ریل اور موٹر کا استعمال سب سے بہتر ہے اگر فاصلہ کم ہو۔ اور موٹر اور تانگے کے لئے سڑکیں موجود نہ ہوں۔ تو بآسانی گھوڑا استعمال میں لایا جا سکتا ہے لیکن بعض اصحاب گھوڑے کی سواری پر پیدل چلنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ پیدل چلنے میں بھی اول تو آدمی ہر چیز کو بخوبی دیکھ سکتا ہے اور دوسرے اس میں ٹانگوں کے علاوہ جسم کے باقی حصے بھی حرکت کرتے ہیں۔

عام لوگ تازہ ہوا کے فائدے سے واقف ہونے کے باوجود اس سے مستفید نہیں ہوتے۔ شہروں کی گھٹی ہوئی فضا اور تکلفات کی زندگی سے صحت خراب کر بیٹھتے ہیں۔ تو قدرت کے خزانوں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے سینکڑوں روپے ڈاکٹروں حکیموں اور وید وں کی نذر کر دیتے ہیں۔ کاش وہ جانتے کہ صاف اور کھلی ہوا نہروں سے بہتر دوا ہے اور ورزش انسان کے اکثر امراض کو دور کر دیتی ہے۔

ہائکنگ میں نہ تو اتنا زیادہ چلنے کی ضرورت ہے کہ آدمی بہت زیادہ تھک جائے اور نہ اتنا تھوڑا چلے کہ جسم کو بالکل معلوم ہی نہ ہو بہرحال باقاعدہ سیر نہایت ہی ضروری ہے اور یہ بھی بہتر ہے کہ ایسی سیر کے وقت کپڑے نہایت ہلکے ہوں۔ ہائکنگ میں بعض اشخاص اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ہمراہ جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ راستے میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں جس سے نہ صرف سیر ہی میں لطف ملتا ہے۔ بلکہ ایک آدمی دوسرے سے بہت سی نئی باتیں سیکھ لیتا ہے لیکن ایک اور طرح کے آدمی بھی ہیں جو اکیلا چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ چلتے ہوئے باتیں کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ خود ہی قدرتی نظاروں کو غور سے دیکھتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے گھر کے بھولے ہوئے تکلیف دہ واقعات کی یاد اس وقت پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے گھر، شہر اور تمام پرانی چیزوں کو بھولنے میں ہی مزا پاتے ہیں۔

اکثر مہذب ملکوں میں ہائکنگ کو دوسرے مفید کھیلوں کی طرح تنظیم دی گئی ہے کلب اور سوسائٹیاں قائم ہیں۔ ان کے بیسیوں ممبر ہیں۔ ہر سال ان ممبروں کی ٹولیاں

میں اضافہ کریں آپ اکثر ان باہمت اصحاب کا ذکر پڑھتے ہونگے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے پیارے وطن اور اس میں رہنے والوں کو خیرباد کہہ کر ہمارے ملک میں آتے ہیں۔ اور کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنی جان پر کھیل کر اپنے ہمجنسوں کو ان بلند چوٹیوں کے حالات سے آگاہ کریں۔ ان کی ہمت ہمارے لئے مشعل راہ بنی اور پچھلے سال یہ فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب ماؤنٹینئرنگ کلب کی بنیاد ڈالی جائے اور اس کی پہلی مہم اسی سال لاہول کی سب سے بلند برفانی چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کرے کیونکہ اس مہم میں بعض بہت زیادہ تجربہ کار نہ تھے فیصلہ ہوا کہ تمام ممبروں کی ہمت کا امتحان اشد ضروری ہے اس لئے تمام قافلہ شملہ سے روانہ ہوا۔ تاکہ اوٹ تک جو شملے سے ۔۔ میل دور ہے یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کون ممبر لاہول کی تکلیف کو برداشت کرنے کے قابل نہیں اور اسے کلو پہنچنے پر واپس جانے کی ترغیب دی جائے۔

آٹا چاول گھی مکھن، دودھ، شہد چینی سبزی پھل اور دوسری ضروریات زندگی کا بندوبست کر کے ہم نے اپنا سامان درست کیا اور گھوڑوں پر لادنے کے لئے گھوڑے والوں کے سپرد کیا۔ اس وقت گھوڑوں کی کافی قلت تھی کیونکہ آلوؤں کا موسم تھا اور اکثر گھوڑے آلو لادنے کے لئے وقف کر دیئے گئے تھے۔

جمعرات ہی سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور جب تک ہم کلو پہنچے بارش نے بھی ٹھہرنے کا نام نہ لیا۔ چونکہ ہم روانگی کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس لئے باوجود بارش کے ہر ایک نے اپنی برساتی سنبھالی اور ۱۲ اگست بروز جمعہ ۲ بجے دوپہر اپنی منزل پر روانہ ہوئے۔ کچھ فاصلے تک تو رنگا رنگ نظر آتے رہے لیکن اس کے بعد سوائے جنگلی جانوروں کے اور جھاڑیوں اور بلند درختوں کے کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ عام پہاڑی سڑکوں کی طرح اس سڑک کے ایک طرف بلند پہاڑ اور دوسری طرف کھڈ ہیں اور سڑک شروع میں تو ہموار ہے لیکن جس قدر ہم لوگ آگے بڑھتے گئے یہ آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی حتیٰ کہ ہم ناگو پہنچ گئے۔ ناگو سطح سمندر سے ۔۔۔ فٹ بلند ہے اور شملہ سے ۱۲ میل دور ہے یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ یہاں ہم نے آگ جلائی تاکہ اپنے کپڑے جو باوجود واٹر پروف کے بھیگ چکے تھے خشک کریں۔ ایک صاحب نے ڈاک بنگلہ میں پناہ لی اور باقی صاحبان نے خیمہ میں بسیرا کیا۔ یہ خیمہ ہم اپنے ہمراہ لاہور ہی سے اس مطلب کے لئے لے گئے تھے۔ یہاں کا ڈاک بنگلہ نہایت ہی کشادہ ہے اور بہت اہتمام سے بنایا گیا ہے اس کے علاوہ یہاں ایک سرائے بھی ہے لیکن اس کے کمرے گندے اور بدبودار ہیں اور ان میں ہوا پہنچنے کا خاطر خواہ انتظام نہیں۔

بھلا ان لوگوں کو جنہیں شہری اور پر رونق زندگی کے چھوڑنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا کیا معلوم کہ سیر و سیاحت میں کیا لطف ہے چند نمبر کا مطالعہ

نہ کسی قیام کا انتظار اور نہ کسی دوست اور رشتہ دار کی ملاقات کا خیال رہ جاتا ہے بھوک لگتی ہے
تو نہار پر پنگھوں آسمان تلے یا سرسبز وشاداب درختوں کے نیچے ڈیرا لگتا ہے سادہ
دال کھانے کو اور چشمہ کا صاف اور ٹھنڈا پانی پینے کو میسر آتا ہے لیکن بعض اوقات
ایسا بھی ہوتا ہے کہ میلوں چٹیل میدان اور ننگی چٹانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا لیکن
یہ نظارہ بھی لطف سے خالی نہیں ہوتا۔

ہم نے رات فاگو میں بسر کی دوسرے دن علی الصبح اٹھے اور ضروری مشاغل سے فارغ ہو کر گھوڑے والوں کا انتظار کرنے لگے لیکن وہ کچھ ایسے سست واقع ہوئے تھے کہ ۱۱ بجے سے پہلے چلنے کا نام نہ لیا۔ آخر ہم آہستہ آہستہ گپیں ہانکتے ہوئے روانہ ہوئے اور تھیوگ جا پہنچے۔ تھیوگ میں ایک خاصا اچھا بازار ہے جس میں دوسری دکانوں کے علاوہ دو تین معمولی ہوٹل بھی ہیں جن کا انتظام عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان دنوں بارش کی وجہ سے بازار کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اور چلنے کے لئے راستہ بھی ملنا مشکل تھا۔ تھیوگ میں ہم نے کھانا کھایا اور آگے چلے۔ ساڑھے چھ بجے شام متھیانہ پہنچے۔ یہ جگہ ناکرنڈہ ۱۴ میل کے فاصلے پر ہے اور اس کی بلندی ۸۰۰۰ فٹ کے قریب ہے۔ یہاں ایک بہت بڑی اور شاندار سرائے ہے جسے سرائے پوران چند کہتے ہیں یہاں بلا امتیاز رنگ و مذہب ہر شخص ایک ہفتہ کے لئے مفت قیام کر سکتا ہے۔ یہ عمارت سیمنٹ سے بنی ہوئی ہے اور اس میں رہنے کے لئے کافی کمرے موجود ہیں۔ سرائے کے پاس ایک باؤلی ہے جس کا پانی ٹھنڈا اور مزیدار ہے یہی پانی نہانے، کھانا پکانے اور پینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسرے دن یعنی اتوار کو آسمان صاف تھا اور بادل کا نام تک نہیں تھا ہم دس بجے صبح پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے لیکن ابھی مشکل آدھا راستہ طے کیا تھا کہ بارش نے آلیا۔ اس دن نارکنڈہ میں قیام کیا جہاں اڑھائی بجے دوپہر کو پہنچے نارکنڈہ متھیانہ سے ۵۰۰ فٹ زیادہ اونچا ہے اور ۱۱ میل دور ہے یہاں ایک پادری کے پرتکلف اور سجے ہوئے مکان میں پناہ لی یہ مکان ڈاک بنگلہ سے ذرا اوپر ہے۔

سوموار کو ساڑھے دس بجے ہم نارکنڈہ سے روانہ ہوئے اس دن ہم ۹۰۰۰ فٹ کی بلندی سے ۲۰۰۰ فٹ کی گہرائی میں پہنچنا تھا یعنی پہاڑ سے ہم میدان میں اتر رہے تھے۔ کہاں پہاڑ کی سنہری اور موسم اور کہاں میدان کی گرمی۔ یہ دن کافی مشکل اور تکلیف میں گذرا خیال تھا کہ آج بجائے لوری ٹھہرنے کے آنی جا ٹھہریں لیکن گرمی کے سبب ایک دن میں ۲۴ میل سفر کرنا مشکل نظر آیا۔ دوسرے گھوڑوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا لہٰذا لوری ٹھہرتے ہی بنی۔ لوری میں ایک چھوٹا سا ڈاک بنگلہ ہے جس میں صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ایک کمرہ پہلے ہی لگا ہوا تھا۔ دوسرے کمرہ پر ہم میں سے ایک صاحب نے قبضہ جما لیا اور باقی اصحاب نے رات آسمان تلے ہی کاٹی اور سامان اپنے خیمے میں رکھا۔ اس جگہ پانی کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے پانی کافی فاصلے سے لایا جاتا ہے کیونکہ یہاں بہت زیادہ گرمی تھی اس لئے دوسرے دن صبح سویرے ہم روانہ ہو گئے۔

لوری کے قریب دریا کافی کشادہ ہے اور خوب ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہتا ہے۔ لوری سے [illegible] میل کے فاصلے پر [illegible] فٹ کی بلندی پر سڑک دو پہاڑیوں کے درمیان چلتی ہے یہاں ٹھنڈی [illegible] اس سے آگے گرمی بتدریج کم ہوتی جاتی ہے راستہ بھی آسان ہے [illegible] بجے دوپہر کو پہنچے۔ آنی ۳۰۰۰ فٹ بلند جگہ ہے۔ اور یہ

پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے۔ رات آنی میں رہنے کے بعد دوسرے دن ہم پھر روانہ ہوئے۔ راستہ آج دشوار گذار تھا۔ آنی سے ۱۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر خناگ پہنچنا تھا۔ یہ جگہ آنی سے ۹ میل کے فاصلے پر ہے۔

۱۶۔ اگست کو دس بجے خناگ سے روانہ ہو کر سوچھا ہوتے ہوئے بنجار پہنچے جلوری جوت خناگ سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ۱۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان راستہ ہے جہاں سے گذرنے کے بعد ہمیں نیچے اترنا پڑا حتیٰ کہ ہم بنجار پہنچے جس کی بلندی ۵۰۰۰ فٹ سے زیادہ نہیں۔ بنجار تحصیل ہے اور پر رونق مقام ہے یہاں سکول اور ویٹرنری ہسپتال بھی ہیں۔

دوسرے دن بنجار سے ہم علی الصبح روانہ ہو گئے۔ آج دو بجے دوپہر سے پہلے لارجی پہنچنا تھا۔ جو بنجار سے ۱۵ میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں سے کلو تک اور کلو سے منالی تک پکی سڑک ہے اور یہاں موٹر کا انتظام ہے۔ ہم وقت سے کافی پہلے لارجی پہنچ گئے۔ کھانا کھایا اور لاری میں بیٹھ کر شام کو کلو ہوتے ہوئے منالی پہنچ گئے۔ کچھ دن منالی ٹھہرنے کے بعد پھر سفر کا ارادہ کیا اور روہتانگ پاس کو جو ۱۳۰۵۰ فٹ بلند ہے عبور کر کے برفانی چوٹی تک چڑھنے کی کوشش کی وہ نظارہ بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ کافی قلی نہ ملنے کی وجہ سے اپنا ضروری سامان ہماری پشت پر تھا پاؤں تلے سخت برف اور سر پر خوفناک بادل یا سخت دھوپ۔ خدا خدا کر کے آخر ۱۴۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور خوشی خوشی واپس ہوئے۔

واپسی پر ایک دو واقعات ایسے پیش آئے جو خالی از دلچسپی نہیں اس لئے ان کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک شام کو جب ہم منالی اور کلو کے درمیان ایک پر رونق مقام پر سیر کر رہے تھے سامنے چند گز کے فاصلہ پر ایک ٹیڑھی سی چیز پڑی تھی بچپن چونکہ عام طور پر ایسی چیزیں پہاڑی سڑکوں پر نظر آتی رہتی ہیں۔ نہایت بے پروائی سے ہم آگے بڑھنے لگے ابھی ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ ایک کتا جو ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ آگے بڑھا اور اس نے بھونکنا شروع کر دیا ہمارا ماتھا ٹھنکا اور ہم نے اپنی چھڑی سے اس بے حس چیز کو چھیڑا۔ پھر کیا تھا یکلخت وہ چیز ہلنے لگی اور نہ صرف زندگی کے تمام آثار اس میں ظاہر ہوئے بلکہ اس نے پھنکارنا شروع کر دیا اور پھر ایسی آواز نکالنے لگا ہم نے اپنی چھڑی کو گھمایا اور آن کی آن میں اس چیز کا جواب سانپ بن چکی تھی کام تمام کر دیا معائنہ پر معلوم ہوا کہ سانپ (KRAIT) کی قسم کا ہے

دوسرا واقعہ جو سندرنگر ہے ہم کلو سے لاری میں جو گندرنگر پہنچے اور وہاں ایک بہت بڑے کمرے میں جس میں ہر طرف سبزہ زار اور جھاڑیاں تھیں قیام کیا چونکہ اس مقام پر ہم دیر سے پہنچے چارپائیوں کا بندوبست نہ ہو سکا اس لئے فرش پر بستر کئے۔ نوکر کو پانی لانے کے لئے کہا اور خود باہر سیر کو نکلے واپس ہوئے تو گھڑا آنگنا پایا اسے ڈھانپ دیا گیا تاکہ کوئی چیز اس میں گرنے نہ پائے یہ گھڑا ہمارے بستروں کے بالکل قریب ہی پڑا تھا۔ رات کو اس پانی سے کسی نے ہاتھ دھوئے اور کسی نے منہ الغرض جب دوسرے دن اٹھے اور پانی لینے کے لئے گھڑے کا ڈھکنا اٹھایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پانی میں ایک سانپ بڑی پھرتی سے سر ہلا رہا ہے گویا راستہ کی تلاش میں ہے کبھی اوپر سر اٹھاتا ہے اور کبھی پھر آرام سے نیچے کر لیتا ہے کچھ دیر تک تو ہم یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ اور اپنی خوش قسمتی پر خوش ہوتے رہے پھر گھڑے کو باہر میدان میں لا رکھا تاکہ ڈھکنا اٹھانے پر اگر سانپ بھاگنے کی کوشش کرے تو کہیں چھپ نہ سکے اور ہم چھڑیاں اور پتھر لیکر مقابلہ

کے لئے کھڑے ہو گئے۔ بھلا ایک چھوٹا سا چیتھڑا اتنے سورماؤں کا کس طرح مقابلہ کرتا جونہی سر نکالا ایک ڈنڈا ایسا پڑا کہ ہوش گم ہو گئے پھر کیا تھا فوراً اسے قابو میں کر کے بوتل میں بند کر دیا گیا۔ اور دوسرے جانوروں کی طرح اسے بھی سفر کی نشانی کے طور پر ساتھ لے آئے یہ سانپ گھڑے میں کب کہاں سے اور کس لئے پہنچا ہم یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے ممکن ہے یہ کلوجی میں ہمارے بستر میں چھپا بیٹھا ہو یا ممکن ہے یہ جوگندر نگر میں کسی جھاڑی سے نکل گھڑے میں آن پڑا ہو لیکن جوگندر نگر کے چند رہنے والوں سے ہمیں تایا کہ انہوں نے ایسا سانپ وہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا سانپ کی شکل و صورت سے یہ ظاہر تھا کہ وہ پانی میں رہنے والا سانپ نہیں بلکہ زمین کا باشندہ ہے۔ یہ کریٹ تھا جس کا زہر ناگ کے زہر سے دگنا خطرناک ہوتا ہے۔

ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جنگلوں اور پہاڑوں کی آزاد فضا میں انسان وہ کچھ سیکھ سکتا ہے جو مہذب انسان پر رونق شہروں میں رہ کر نہیں سیکھ سکتا۔ اپنے گھر سے دور انسان کو صرف اپنی ہمت۔ طاقت اور عقل پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور وہ ایسے ایسے تجربات کرتا ہے جن کا شہر میں رہکر خیال تک نہیں آ سکتا۔

چودہری **نذیر احمد** ایم۔ ایس سی (آنرز)

غزل

دل مضطر کا ہر ذرہ درخشاں ہوتا جاتا ہے
زہے قسمت کہ سامانِ چراغاں ہوتا جاتا ہے

محبت میں تمیزِ دوست و دشمن نہیں ہوتی
یہاں جو آتا جاتا ہے وہ مہماں ہوتا جاتا ہے

بہاروں میں نہ جانے باغباں کو کیا یہ سوجھی ہے
کہ خود مائل بہ تخریبِ گلستاں ہوتا جاتا ہے

مری کشتی کو بھی اے ناخدا! طوفان بننے دے
کہ ساحل بھی شریک جوشِ طوفاں ہوتا جاتا ہے

بھلا ہو دشمنوں کا دوستوں سے پھر بھی اچھے ہیں
مرا ہر عیب اب مجھ پر نمایاں ہوتا جاتا ہے

مصائب کی فراوانی سے دل پُر نور ہے میرا
اندھیرا جتنا بڑھتا ہے چراغاں ہوتا جاتا ہے

تیرے ملنے کی تسکیں دیکھ کر میں اور کیا سمجھوں
مری تقدیر کا لکھا نمایاں ہوتا جاتا ہے

کہیں یوں بھی نگاہیں پھیر لیتا ہے کوئی شہرت!
مری ہستی کا شیرازہ پریشاں ہوتا جاتا ہے

[illegible]

غزل

خرد ہر گام پر سمجھا رہی ہے — جوانی پھر بھی ٹھوکر کھا رہی ہے

تمنّا دل میں میٹھی جا رہی ہے — کلی جیسے کوئی مرجھا رہی ہے

تجھے مرنے سے "وحشت" اور اے دوست! — مجھے جینے پہ بھی شرم آ رہی ہے

الٰہی خیر میری آرزو کی — کلی پہ پھول بنتی جا رہی ہے

قیامت ہے قضا کی برق پائی — نظر آتی نہیں اور آ رہی ہے

مسرت ہے اِک گریزاں حُسن جیسے — کوئی دلہن کھڑی شرما رہی ہے

تمنّا کا نتیجہ جانتا ہوں — طبیعت پھر بھی آئی جا رہی ہے

یہ کس نے ربطِ احساس چھیڑا — کہ رگ رگ میں نوا تھرا رہی ہے

جوانی کے رنگیلے گیت سُنکر — محبت جھومتی ہے، گا رہی ہے

یہ کون آیا تصور میں بہ مست — فضا مستی میں ڈوبی جا رہی ہے

کہاں ہو شربتی ہنستی سی آنکھو! — طبیعت زیست سے اکتا رہی ہے

ضمیر اشعار میں رس ہو نہ کیونکر
کہ میرے دل میں کوئی گا رہی ہے

سید ضمیر جعفری بی اے

کلرک

"دفتر میں کام کے اوقات کیا ہوں گے؟"

"صبح نو بجے سے چھ بجے شام تک؟"

ایک سال پہلے کا سوال اور رائے بہادر کا وہ جواب اس کے کانوں میں اسی طرح گونج رہا تھا جیسے ابھی ابھی کہا گیا ہو۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دفتری کلاک کی طرف دیکھا جس نے ابھی ٹن ٹن کر کے سات بجائے تھے۔ کلاک بدستور چل رہا تھا۔ سات بجا کر رک نہیں گیا تھا پھر وہ کیوں رک جائے۔ اور پیشتر اس سے کہ اس کی نظریں سوس کلاک سے میز پر منتقل ہوں اس کا قلم دوات سے سیاہی لے کر سامنے پڑی فائل کے کھلے صفحہ پر چلنے لگا۔

کلاک کی ایک آواز نے شنکر میں جو ستعدی پیدا کر دی تھی۔ دوسری آواز نے اسے فنا کر دیا ساڑھے سات بجے کی "ٹن" ہوئی۔ اور شنکر کا قلم پھر رک گیا۔ اس نے جوانی میں نیم سفید ہو جانے والا سر اٹھا کر نہ رکنے والے کلاک کی جانب اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذوں اور فائیلوں کے انبار کی جانب دیکھا۔ ابھی بہت کام باقی تھا لیکن یہ ختم کب ہوگا؟ یہ رائے بہادر کے دفتر کا کام۔ جو ان کے کرایہ داروں سے کرائے وصول کرنے کے لئے مقدمے لڑنے سے لیکر گھر میں آنے والے اُپلوں کے گننے تک پھیلا ہوا تھا۔

آج اسے چند دوستوں کے ساتھ سات بجے سینما دیکھنے جانا تھا۔ لیکن یہ کام ــــ

اس کی گہرے بھورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی پھیل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کرسی کی پشت پر اپنا بوجھ ڈال کر جیسے کچھ سوچنے لگا۔

لیکن کلاک نہیں رکا تھا اور اس کا کام ......

دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ان کے آخری قہقہے نے وہ افق پر ایک سرخ رنگ کے چمکتے ہوئے بادل کی صورت اختیار کر لی۔ باہر سڑک پر سیر کرنے والے دوستوں کی ٹولیاں اور ان کے قہقہے موٹروں اور ٹانگوں کے شور و شغب فضا میں ایک گونج پیدا کر رہے تھے۔ اور اس شور کے اوپر ہی اوپر تیرتی ہوئی وہ باجوں کی سریلی آواز ــــ شائد کسی نئی فلم کی اشتہار بازی کے لئے جلوس نکالا گیا تھا۔ یا کوئی برات جا رہی تھی۔ کتنی مسرور ہے دنیا۔

لیکن رائے بہادر کا کلرک ــــــــــ

"آخر اس کا کام کب ختم ہوگا؟"

اندھیرے نے آدھی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابھی تک پیچھے اندھیرے کے پھیلاؤ کی ابتدا تو ہی تھی کبھی کبھی دوستوں کی کوئی قہقہہ نا سننے کی بھی گذر جاتی۔ تو کیا ابھی تک دوستوں کی مجلسیں گرم ہیں؟ اور اس کے اپنے دوستوں کی مجلس؟ .. کیا وہ بھی ابھی تک کہیں بیٹھے ہوں گے .... ؟ لیکن اس کا کام ......؟ یہ کب ختم ہوگا؟ نہیں دوستوں کی مجلس کب کی ختم ہو چکی ہوگی۔ اب جلدی سے کیا فائدہ ....؟ کام ختم ہی کیوں نہ کر لیا جائے .... لیکن یہ ختم کب ہوگا؟

اور پھر ختم کیا ہی کیوں جائے؟ کیا کلرک کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ تیس پینتیس روپیہ ماہانہ کی خاطر زندگی کی تمام رنگینیوں اور تمناؤں کو ان موٹے موٹے اور بھٹی ہوئی جلد والے رجسٹروں کو کالا کرنے میں گم کر دے۔

اسے رائے بہادر کے ہاں نوکر ہوئے سال بھر ہو چکا تھا۔ اور رائے بہادر کا وہ اوقات کار کے متعلق روز اول والا جواب ابھی تک ایک تعبیر تشنہ خواب تھا۔ اول تو کام ہی ساڑھے سات آٹھ بجے سے پہلے ختم نہ ہونے پاتا۔ اور اگر ہو بھی جائے۔ تو اتنی دیر میں رائے بہادر ٹینس کھیل کر واپس آ چکے ہوتے اور اپنی تھکان اتارنے کے لئے محض اس غرض سے دفتر میں بیٹھ جاتے کہ ان کے دو تین کلرک ان کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں دست بستہ کھڑے رہیں اور آنجناب اپنی بے معنی اور بدذوقی کی حامل باتیں سناتے رہیں۔

رائے بہادر یا اسی میں راحت محسوس کرتے تھے کہ جب تک وہ رات کا کھانا کھا کر بستر پر دراز نہ ہو جائیں ان کے کلرک دفتر کی رونق بڑھاتے رہیں۔ شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ شاید ملاقاتی کسی وقت بھی آ جائے تو اس پر رائے بہادر کی عظمت کا ویسا ہی اثر پڑے جیسا بلی رام برادرز کی ۲۴ گھنٹہ سروس کا اس کے گاہکوں پر۔ ان کے دل میں کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ کلرکوں کے ہوتے رات کو چوکیدار کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن کلرکوں کو ناجائز تکلیف دینے کے خلاف ان کا ضمیر بغاوت کر دیتا تھا۔ جہاں ناجائز تکلیف دینا انہیں گوارا نہ تھا۔ وہاں انہیں ناجائز رعایت دینا بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں ہفتہ وار، ماہوار یا سالانہ تعطیل کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ ہاں اگر کلرک کا کوئی قریبی رشتہ دار مر جائے۔ تو رائے بہادر اپنا اصول توڑنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے شنکر کی آنکھوں کے سامنے رائے بہادر کی شکل پھر گئی .... ایک مکروہ شکل ... جس پر حرص و طمع کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی جس کے قہقہے کی آواز کئی مفلسوں کی سوکھی ہڈیوں کے چڑچڑانے سے مرکب تھی جس کے گالوں کی سرخی اس کے کاشتکاروں کی آنکھوں سے بہنے والے خون سے لی گئی تھی اور جس کی پیشانی پر انسانیت کا ایک بھی خط نہ تھا لیکن جسے خدا کی ایک دین نے سینکڑوں انسانوں کا مرجع بنا رکھا تھا۔ انسانیت .... انسانیت کے لئے رحم و انصاف

لازمی ہیں اور وہ ان سے کورا ہے۔ اسی لئے ..... لیکن کیا ہم میں انسانیت ہے ۔؟
انسانیت کبھی شیطنت کے آگے سرخم نہیں کرتی۔ پھر ہم .....

ہم جو دن میں کئی کئی مرتبہ اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں کیا ہم انسان ہیں۔ جو اس کے ہر روا و ناروا کو چپ چاپ برداشت کرتے ہیں۔ ہم سے وہ بہتر ہے اگر شیطان ہی ہے تو بھی ایک فاتح ہے ...۔ تڑاخ ..... شنکر کے ہاتھ میں قلم جانے کس جوش کے زیر اثر ٹوٹ چکا تھا۔

شنکر کے سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے بڑھے امین چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جس کی ایک کمانی ابھی تک صحیح سلامت تھی۔ ناک کی گھوڑی سے ایک لمحہ کے لئے اٹھا کر اس چھوکرے کی جانب کچھ عجیب ڈھنگ سے دیکھکر کہا "شنکر کیا سوچ رہے ہو، تمہارا کام کب ختم ہوگا ؟"

اس نے بڈھے کی جانب دیکھا جس کی بامعنی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔

"چھوکرے تم کس جھنجھٹ میں پھنس گئے ہو یہاں اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہاں فاتح کا قانون ہی انسانیت اور انصاف کہلاتا ہے۔ یہ دنیا ہے .... حقائق کی۔ تمہاری شاعری اور تصورات کی نہیں۔ تم شاعر مزاج ہو۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔"

شنکر اس نگاہ طنز کی تاب نہ لاسکا۔ اپنے سامنے پڑے کاغذوں کے انبار کی جانب دیکھنے لگا اور میز پر پڑے ہوئے ہر کاغذ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"تم شاعر مزاج ہو۔ احساسات کو زندہ رکھنے والے۔ اور اس دنیا میں آئے ہو شاعری کرنے ...... ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔؟"

اس نے سر دھن لیا۔ آنکھیں بند کرلیں لیکن کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔

"رائے بہادر کا کلرک اور پھر اس قدر حساس ۔ او ۔ ہو ۔ ہو ۔ ہو ۔ ہو !"

اس نے کانوں میں بھی انگلیاں دے لیں۔ کیا ایک کلرک کے لئے حساس ہونا گناہ ہے کیا اسے ایک زندہ لاش بن جانا چاہیے۔ ایک لاش جسے سہانی برساتوں کی گھنگھور اور سرمئی گھٹائیں بسنت کے نیلے پیلے اور اودے پتنگ۔ ہولی کی رنگ پاشیاں کسی بڑے تیوہار کے دن بیوی بچوں کا میلا دیکھنے پر اصرار یہ سب کچھ جسے اس دفتری قبر سے باہر نہ نکال سکے۔ ایک لاش جس کا جسم تو زندہ ہو لیکن احساس مردہ ہو چکا ہو۔

میں ایسی کلرکی سے باز آیا۔ اگر شادی کی جائے تو بیوی کو گھر کی چار دیواری میں صبح شام میں کیوں رکھا جائے۔ آخر نوکری کی غایت یہی ہے نا کہ خالی اوقات میں عیش سے زندگی بسر کی جائے۔ ... خالی اوقات ... یہ خالی وقت کب ملیگا ...؟ اخیر یہ کام کب ختم ہوگا؟

اس نے سامنے بیٹھے ہوئے امین چند کی جانب دیکھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اُسے بیوی کے احساسات یا عیش سے کیا لیکن بہاری لال تو ابھی پینتیس سال سے زیادہ کا نہیں اس کی بیوی بھی ماشاء اللہ خیر سے ابھی جوان ہی ہے۔ تو پھر اس کے احساس کو کیا ہو گیا ہے؟

اس نے بہاری لعل کی جانب دیکھا جس نے نیلے رنگ کے رجسٹر کا خانہ پری کرتے ہوئے اچانک سر اٹھایا لمحہ بھر کے لئے اس کی جانب دیکھا اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا لیکن اس ایک ہی لمحے میں اس کی نگاہیں شنکر کو جواب دے گئیں۔

[illegible]

چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوئی ورنہ تم ایسا نہ سوچتے۔ ہمارے احساسات کی راکھ میں سے اب بھی کبھی بھولے بھٹکے کوئی شرارہ تڑپ اٹھتا ہے۔ کبھی کبھی ہمارے دماغوں میں بھی زلزلے کے چند جھٹکے محسوس ہوتے ہیں لیکن ان سب کی شدت اس گہرائی تک نہیں پہنچتی۔ جو بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے خیال میں ہے ۔ لیکن تم خالی کیوں بیٹھے ہو تمہارا کام کب ختم ہوگا؟

شنکر کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔ سامنے فائیلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ نیچے سڑک پر ایک سائیکل سوار گھنٹی بجاتا ہوا جارہا تھا گھنٹی کی آواز سے اس کی تیز رفتاری کا اندازہ ہو رہا تھا شاید اسے گھر جانے کی جلدی ہے۔ شاید گھر بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کے بچے تو اب تک سو چکے ہونگے۔ اور کیا جانے بیوی بھی اونگھ رہی ہو۔ کھانا پروسنے کے لئے کئی مرتبہ سرخ پٹی کھولا ہوگا لیکن اس کا خاوند جلدی کیسے آجائے۔ آخر دفتر دفتر ہی ہے۔ مگر پیٹ پالنے ہی کے لئے دفتر جانا ہوتا ہے لیکن دفتر کا کام اس مقابلے پر پیٹ بھرنا مقدم نہیں ہوسکتا ۔

بہاری لعل کی بیوی بھی تو منتظر ہوگی ..... اور میری ہونے والی بیوی ......

لیکن یہ کام کب ختم ہوگا ...؟ یہ رائے بہادر کے دفتر کا کام ——

دفتر سے باہر نکلتے وقت کوٹھی میں ایک موٹر داخل ہوئی۔ شنکر نے دیکھنے کی کوشش کی کہ اس میں کون بیٹھا ہے لیکن سامنے کی تیز بتیوں نے نگاہ خیرہ کردی تھی۔ شنکر پھاٹک پار کر رہا تھا کہ کسی کے اونچی ایڑی والے بوٹوں کی "ٹھپ ٹھپ" گول کمرے میں سنائی دے رہی تھی اور ادھر کا کوئی آوارہ جھونکا اس کے لبوں سے نکلنے والے گیت کے چند بول شنکر تک پہنچا گیا۔

"ندی کنارے کھڑی ہوں ساجن —— تیرے من کی ماری"۔

شنکر نے آواز پہچان لی یہ رانی تھی۔ رائے بہادر کی چنچل لڑکی شاید سنیما دیکھکر لوٹی تھی۔ کتنی حسین ہے وہ۔ اور باپ سے کس قدر مختلف۔ وہ ایک بے کیف اور کڑوی دوائی کی بوتل ہے تو یہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا پیمانہ جس میں شعریت شراب کی صورت بن چھلک رہی ہے کہ اس میں رحم اور انصاف کا مادہ بھی بہت زیادہ ہے حسن ہمیشہ رحمدل ہوتا ہے۔ اس روز اس کے طلائی نیکلس کی کئی کڑیاں ریت میں گر گئی تھیں شنکر نے نہایت محنت سے ایک ایک کرکے ڈھونڈھ نکالیں۔ تو پھر ایک دھاگے میں پرو کر باندھ بھی دیا تو اس نے کس قدر تلطف آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا "منشی جی۔ آپ کتنے اچھے ہیں" اور پھر اس کی وہ مسکراہٹ تو ایسی ہی موتیا کے گملے میں ایک کلی چٹک پڑی تھی رانی نے اسے توڑا سونگھا اور بالوں میں لگا کر چلی گئی۔ اسی طرح بیبا کانہ ہنستی ہوئی مالن کے صحن میں لگے ہوئے تمام پھول کھلے ہوئے تھے۔ رانی ہنس رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ بھی اپنے آنگن میں پھولوں کا ایک پودا لگائیگا۔ اس نے پہلے بھی ایک دو مرتبہ اپنا کمرہ سجانے کی کوشش کی ہے لیکن ہر بار ماں یہی کہتی ہے۔ گھر کی سجاوٹ تو تیری بہو کے آنے پر ہی ہوسکے گی اور پھول لانے سے وہ ہمیشہ انکاری رہا ہے اپنا پیٹ بھرنے کی ابھی کوئی اچھی سبیل نہیں تو بہو لانا کیا معنی۔ رائے بہادر کی نوکری کا کیا بھروسہ۔ پیٹ بھرنے کا وقت ٹھہری۔ اور پھر اس جیسے بے غیرت [illegible] کی نوکری —— نہیں وہ یہ بات [illegible]

[illegible]

بدل دیا۔ اس نے مجھے آپ کہکر بلایا ہے۔ آپ ۔ کتنی خوش سیرت ہے اس کی پیشانی باپ کی طرح شکن آلود نہیں اس کے مسکراہٹ میں کھلے ہوئے لب شاید غصے کے مارے پھڑکنا نہیں جانتے۔ وہ صرف مسکرانا جانتے ہیں۔۔۔ اور پھر ان کے صحن میں کھلے ہوئے پھول یقیناً اس کوٹھی میں حسین اور رحمدل انسان بھی رہتے ہیں۔ جو کلرکوں کو "آپ" کہہ کر بھی پکار سکتے ہیں۔ اور ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر سکتے ہیں۔ اس کوٹھی میں اچھے آدمی بھی بستے ہیں مسکراتے چہروں والے اور پھر کوٹھی کے صحن میں کھلے ہوئے پھول۔۔۔ وہ بھی اپنے آنگن کے لئے ضرور شگفتہ پھولوں کا ایک پودا لائیگا۔

چند ہی روز کے بعد وہ کہیں سے گلاب کی ایک قلم لے آیا۔ انہی دنوں اس کی ماں نے شنکر کے لئے ایک خوبصورت لڑکی کا رشتہ ڈھونڈھ نکالا۔ منگنی ہوگئی۔ ماں شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی شنکر نے گلاب کی جو قلم لگائی تھی۔ اس میں ایک کونپل پھوٹ پڑی تھی۔

اچانک شنکر کو ٹھوکر لگی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سامنے موتی محل سنیما میں روشنیاں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ اسے پھر بہت دیر ہو جانے کا احساس ہوا۔ اس کی بوڑھی ماں کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ جو بیٹے کے انتظار میں سو بھی نہیں سکتی۔ ایسی ملازمت بھی کیا ہوئی ؟

سامنے سنیما کے باہر ایک انگوری رنگ کی کار کھڑی تھی جس میں ایک ڈرائیور بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ آخر یہ بیچارا بھی تو ملازمت ہی کرتا ہے نا ؟ اس کی زندگی کلرک سے بھی بدتر ہے۔ کیا جانے اسے کب چھٹی ہوگی ہو سکتا ہے کہ مالک سنیما سے نکلے تو کسی شراب خانے میں جا بیٹھے۔ اس بیچارے کی بھی بیوی ہوگی۔ وہ تو یقیناً انتظار نہیں کرتی ہوگی کیونکہ ہر انتہا میں سکون ہوتا ہے لیکن یہ تو لالہ کشوری لعل کی کار ہے۔ سنا ہے کہ اسے سرمایہ داری کی نخوت چھو تک نہیں گئی۔ اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتا ہے ہوتا ہوگا۔ آخر سرمایہ داروں میں تو اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ یہ ضرور خوبصورت ہوگا جیسی اچھی سیرت رکھتا ہے۔ رانی بھی تو خوبصورت ہے نا ؟۔۔۔۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ، وہ اس کے صحن میں وہ کھلے ہوئے پھول میرے پودے کی کونپل بھی اب کلی بن چکی ہوگی بس پہلے ہی دن اسے دیکھا تھا جب وہ پھوٹ رہی تھی۔ ادھر کئی دن سے دفتر جلدی جانا ہوتا ہے اور دیر سے آنا پڑتا ہے۔ اسے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ رانی کو بھی تو اس دن کے بعد سے نہیں دیکھا۔ وہ اس روز مسکرائے ہی جا رہی تھی۔ شاید وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے کیا اس لئے کہ اس کے صحن میں پھول ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ دفتر کے کلرکوں کی ابتر حالت دیکھے۔ کیا پھر بھی اسی طرح مسکراتی رہے لیکن نہیں اس سے یہ توقع فضول ہے۔ ابھی کل ہی رلدو السوئیا سنا رہا تھا کہ چھوٹی بی بی نے بے حیثیت مارا۔ وہ بوڑھا بیچارا ۔ وہ کہتا ہے اسے کبھی ہنستے نہیں دیکھا تو کیا وہ صرف نوجوانوں ہی سے مسکرا کر باتیں کرتی ہے۔ اور "آپ" کہکر بلاتی ہے پھر اسے کیا سمجھنا چاہئے اطاعت پروری یا نفس پروری۔۔۔۔۔

[illegible] سامنے اندھیرا چھیلتا جا رہا تھا سنیما کی چکا چوند روشنیاں بہت [illegible] اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

بوڑھے امین چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جس کی ایک کمانی ابھی تک صحیح سلامت تھی ناک کے اونچان سے ایک لمحہ کے لئے اٹھا کر اس کی جانب کچھ عجیب ڈھنگ سے دیکھکر کہا۔

" شنکر تم ابھی بچے ہو ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ رائے بہادر نے تمہیں جو برطرف کر دیا ہے تو ان کی مراد درحقیقت یہ نہیں بلکہ وہ تمہیں مایوسی کے اندھیرے میں دھکیل کر اس بات کا احساس کرا دینا چاہتے ہیں کہ ایسی غلطیوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے تاکہ تم آئندہ تم غلطی کے خوف سے لرزتے رہو۔ جاؤ دو تین مرتبہ گڑگڑاؤ گے تو ڈانٹ ڈپٹ ہی میں معاملہ نپٹ جائیگا۔ جاؤ اسی وقت جاؤ۔ وہ اندر ہیں۔ وہاں جاکر گڑگڑاؤ۔ عورتوں کا دل جلدی پسیج جاتا ہے۔ شاید تمہاری سفارش ہو جائیگی۔

شنکر نے سر جھکا لیا" عورتیں سفارش کر دیں گی۔ وہاں رانی بھی تو ہوگی۔ وہ یقیناً اسے بچا لیگی۔ آخر غلطی ہی تو ہوگئی۔ اسے سنگین غلطی کہنے سے کیا حاصل ؟ سنکیں یا معمولی کی تخصیص تو جب ہو اگر وہ جان بوجھکر کی گئی ہو غلطی محض غلطی ہی ہے

شنکر صحن میں داخل ہو چکا تھا سامنے ہی رانی کھڑی تھی مسکراتی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو جوان نفیس سوٹ زیب تن کئے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ جو کسی خاص وجہ سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

شنکر ایک لمحہ کے لئے رکا" یہ تو یہاں کھڑی ہے۔ وہاں میری سفارش کون کرے گا کیا یہ اندر نہیں آسکتی۔ اس خوبرو جوان کو چھوڑ کر لیکن۔۔۔۔۔ شنکر سوچتا جا رہا تھا لیکن رکا نہیں۔ برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ رانی کی آواز سنائی دی

"کہاں جا رہے ہو"

" رائے بہادر کے پاس "

" کیا کام ہے ؟"

شنکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا بتائے کیا کام ہے ؟ اسے چنچل حسینہ تو اس وقت اکیلی ہوتی۔ تو شاید بتا بھی دیتا۔ تجھے نفس پروری سے فرصت نہیں تو انصاف پروری کیا کریگی "

رانی نے کرخت آواز میں پھر پوچھا

" کیا کام ہے ؟"

" کچھ تھوڑا سا ۔"

" کچھ تھوڑا سا کے لگتے تمہیں پتہ نہیں کہ یہ وقت ان کے آرام کرنے کا ہے انہیں تھوڑی دیر تو چین کی سانس لینے دیا کرو۔ چلے آتے ہو منہ اٹھائے ۔"

شنکر نے جواب نہیں دیا چپ چاپ واپس آگیا۔ ایک سفید رنگ کا خوش نما پھول آگے کو بڑھا ہوا تھا اس نے اسے توڑ لیا اور پھر مسل کے پھینک دیا۔ اس میں آج کسی کے خون کی رنگت دکھائی دے رہی تھی سفید خوشنما ۔ اس کے قریبی برآمدے سے رانی اور وہ نوجوان ہنستے ہوئے گزر گئے۔ صحن میں لگے ہوئے پھول کھلے ہوئے تھے۔

پرلی کیاری میں مالی مرجھائے ہوئے پھولوں کے پودے اکھاڑ اکھاڑ کر باہر پھینک رہا تھا شنکر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

"وہ اب معافی مانگنے نہیں آئے گا نہیں وہ اب یہ ملازمت نہیں کریگا ایسے بدسیرت مالک کی نوکری جس میں انسانیت نام کو نہیں نہیں یہاں اس کا جذبۂ انسانیت بغاوت کرتا ہے یہاں اس کے تصورات کی دنیا آباد نہیں ہوسکتی۔ وہ کچھ اور کریگا۔ اگر ملازمت ہی کرنا ہے تو کہیں کسی اور جگہ ڈھونڈھ لیگا۔ سرمایہ داروں میں کئی اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ اور لالہ کشوری لعل بھی تو سرمایہ دار ہے۔

"آداب عرض —" شنکر نے چونک کر جواب دیا۔

"آداب عرض بھئی کہو مزاج اچھے ہیں۔ کیا دفتر سے آرہے ہو؟"

"کونسا دفتر —"

شنکر نے حیران ہوکر پوچھا "کیسی بات کرتے ہو؟"

"ہاں بھائی! مجھے لالہ کشوری لال نے برطرف کر دیا ہے"

"برطرف" شنکر کی آواز رک گئی "برطرف کس لئے کر دیا —؟"

"ارے بھائی سرمایہ داروں کی کیا پوچھتے ہو۔ انہیں وجہ جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیوی کے گاؤں کا کوئی لڑکا آیا تھا اسے ملازم رکھنا تھا۔ مجھے نکال دیا۔ اچھا مجھے ذرا جلدی ہے — آداب عرض —"

شنکر کتنی ہی دیر تک وہاں سے ہل نہ سکا۔ کشوری لعل نے بھی برطرف کر دیا یہی رام لعل کسی روز اس کے گن گاتا نہیں تھکتا تھا بھولا پنچھی۔ یہ نہیں جانتا۔ کہ شکاری خواہ خوبصورت ہو یا بدصورت وہ ہر حال میں شکاری ہے۔

سرمایہ داری نام ہے خون کے سفید ہو جانے کا۔ اس کی انگلیاں کچھ ایسی حرکت کر رہی تھیں۔ جیسے کسی سفید پھول کو مسل رہی ہوں۔

ہارن کی آواز نے اسے دہلا دیا۔ چوک کے عین درمیان وہ کھڑا تھا۔ اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر کسی سرمایہ دار کی لینیڈو باڈی کار "گھرڑ گھرڑ" کر رہی تھی پھر زور سے ہارن بجا۔ شنکر نے اس جانب دیکھا۔ ۱۹۴۲ء ماڈل کی بیوک کے چھپلے ہوئے جبڑے اور جانٹ ہار غصے سے کانپتے ہوئے پکار رہے تھے ہماری راہ سے ہٹ جاؤ نہیں تو کچلے جاؤ گے۔" ایک بار تو اس کی انسانیت بغاوت کرنے پر تل گئی اس نے چاہا کہ اپنی انسانیت کو سرمایہ دار کی اس انسانیت سے عاری موٹر سے ٹکرا دے۔ اگر اس کی انسانیت اس پر غالب نہ آسکے تو ایسی انسانیت کا فنا ہو جانا ہی لازمی ہے لیکن اس کی ماں .... وہ بوڑھی ماں جو اس کے انتظار میں سو بھی نہیں سکتی۔ اور .... اس کی منگیتر جسے اس کے گھر کی سجاوٹ کرنی ہے —؟

وہ راہ میں سے ہٹ گیا۔ موٹر فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔

ایک ہفتہ امید و بیم کی کشمکش کا ایک ہفتہ گذر گیا شنکر چاروں طرف سے تھک ہار کر اور دوسری نوکری کی کوئی سبیل نہ پاکر پھر اسی کوٹھی میں داخل ہوا دروازہ کے قریب ہی بھنگی ردی کاغذوں کے ڈھیر کو جلا رہا تھا اوپر ہی اوپر شنکر کو اپنے ہاتھوں کا لکھا کوئی کاغذ دکھائی دیا۔ اس نے تجسس کے خیال سے اٹھا لیا۔ جانے کب اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے جذبات قلمبند کئے تھے۔ وہ پڑھنے لگا۔ اگر ان میں انسانیت نہیں تو کیا ہم میں ہے؟ ہم جو کئی مرتبہ ان کے سامنے......" سامنے سے رائے بہادر نکلتے دکھائی دیئے شنکر نے دست بستہ کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔

رائے بہادر نے جواب دیا۔

"اب تمہاری عرض بیہودہ ہے۔ ہم نے نیا آدمی رکھ لیا ہے —"

رائے بہادر اندر جا چکے تھے شنکر کے ہاتھ میں پرانا کاغذ تھا جس کی آخری سطر ابھی پڑھی نہیں گئی تھی۔ کہ

"ہم سے وہ بہتر ہیں۔ اگر شیطان ہیں۔ تو بھی فرشتہ ہیں"

"ہا — ہا — ہا —" صحن میں سے رانی کے قہقہوں کی آواز آرہی ہے۔ شنکر نے اس طرف دیکھا صحن میں رانی ہنس رہی تھی۔ وہاں تمام پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے بھی اپنے آنگن میں گلاب کی ایک قلم لگائی تھی لیکن کئی روز سے اسے پانی نہیں دیا گیا تھا اور اس میں جو کلی لگی تھی۔ وہ پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھی۔

رامانند ساگر

غزل

تصور میں کسی کی پھر نگاہ مست کار آئی
مری مجروح امیدوں کی دنیا میں بہار آئی

شگوفے مسکراتے ہیں کہ بیچارے نہیں سمجھے
قضائے گل چمن میں صورت ابر بہار آئی

بڑی رسوائیوں کے ساتھ بزم یار تک پہنچا
بڑی ویرانیوں کے ساتھ شام انتظار آئی

فرید اب تک دل مایوس کی حالت نہیں بدلی
نہ کچھ صبر و شکیب آیا نہ کچھ تاب قرار آئی

حکیم فرید الدین فرید لکھیانوی

تانگے والا

"میرے تانگے نے میری زندگی میں ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ میرا تانگہ میری زندگی ہے میرے جیون کا ساتھی"

شروع شروع میں مجھے تانگہ کرنے میں کچھ دلچسپی نہ تھی مگر جس طرح جتا ہوا گھوڑا تانگے سے چھٹکارا نہیں پا سکتا میری حالت بھی اسی طرح تھی۔ میں بہت چاہتا کہ تانگے کے پہیوں میں چکر کھاتی ہوئی زندگی سے بھاگ جاؤں مگر مجھ پر اس زندگی کی گرفت اتنی سخت تھی جتنی لوہے کی سلاخ کی پہیوں پر۔ اور یہ گرفت جبھی ڈھیلی پڑ سکتی جب میری زندگی کی شاہراہ تانگے کے پہیوں کے نیچے سے تمام کی تمام پھسل جاتی۔

تانگہ سائیکل کے حادثے اکثر ہوتے رہتے ہیں مگر سائیکل والے بھی عجیب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر روز ہر وقت کوئی نہ کوئی حادثہ درپیش ہوتا ہے چلانے والا تو کم و بیش بچ جاتا ہے مگر سائیکل کی جو صورت بن جاتی ہے۔ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ کبھی پہیہ کچلا جاتا ہے کبھی ہینڈل ٹوٹ جاتا ہے کبھی فریم کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اور کبھی سارا سائیکل تانگے کے پہیئے کے نیچے سے یوں گذر جاتا ہے جیسے بیلنے میں سے گنا۔ حادثہ ابھی وقوع پذیر برپا ہوتا ہے کہ ایکدم تانگے والے پر حملہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ حملہ صرف سائیکل والے کی طرف سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ارد گرد کے تمام لوگ اتحادی بن جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اندھے بن جاتے ہیں تانگے والے۔ نہیں تو دکھتا ہی کچھ نہیں کوئی کہتا ہے "کیوں بے ہوش سے نہیں چلایا جاتا" کوئی پکارتا ہے "سالے گورنمنٹ سے بھی تو نہیں ڈرتے" اور دوسرا کوئی جواب دیتا ہے "کیوں ڈریں گھر کا راج جو ہے" اسی دوران میں سائیکل والا بھی زخمی سائیکل والا بھی فرسٹ ایڈ پہنچا کر تن جاتا ہے اس کے منہ سے زیادہ تر گالیوں کے بم چھوٹتے ہیں۔ ..پاجی .... نامعقول گدھا ...." اور نجانے ان بموں کی کتنی قسمیں ہیں۔ ایسے احوال میں اگر تانگے والا کچھ بولے بھی تو کیا بولے؟ کوئی یہ تو سوچتا نہیں کہ قصور کس کا ہے؟ اگر سائیکل والے کی غلطی ہے تو تانگے والے نے گھوڑا کیوں نہ روکا؟ یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ بے جان تو رک سکتا ہے مگر جاندار کو رکنے کے لئے وقت چاہئے۔ گھوڑے کو تو بریک نہیں لگ سکتی۔ اور پھر یہ بھی تو کسی کی عقل میں نہیں آتا کہ تانگہ تو سڑک پر سیدھا اپنا راستہ پکڑے جا رہا تھا سامنے کون آیا تانگہ یا سائیکل؟ دوڑتے ہوئے تانگے میں اگر سائیکل والا سائیکل مارے تو یہ خطا کس کی ہے؟ تانگے والے کی؟

یہی نہیں یہ جو سڑک پر لمبی تان کر سونے والے کتے ہوتے ہیں ان کی بھی بڑی شامت ہے۔ سو جتنا ہو سکا کوشش کرو پہلے تو اٹھیں گے نہیں اگر اٹھ بھی گئے تو رستے پر اس بے فکری کے ساتھ بیٹھتے ہیں گویا کسی تانگے والے نے انہیں جگایا ہی نہیں اور کئی ایک تو ایسے ہیں کہ تانگے کی آواز ان کے لئے تیسرے کی کوئی بات ہی نہیں ... اچھی ... تانگوں کے پہیوں میں منہ ...

ہیں۔ یہ قصور بھی تانگے والے کا شمار کیا جاتا ہے اور قانون کی زد میں بھی آہستہ چلنے والا تانگہ ہی آتا ہے تیز دوڑنے والی موٹروں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ جو فرسے کسی جاندار کو ختم کر کے نکل جاتی ہیں۔ اور لوگوں کو بعد میں خبر لگتی ہے کہ کوئی کتا پلا موٹر کی زد میں آ گیا ہے

میرے تانگے کے ساتھ بھی کئی حادثے ہوئے ہیں اور جن جن صورتوں میں میں نے جان بچائی ہے۔ وہ محض خدا کی مہربانی تھی۔ ایک دفعہ تو موٹر سے ٹکر ہو گئی کھلی سڑک تھی مگر شام ہی سے سیاہی زیادہ گہری ہو چلی تھی میں نے بتیاں جلا رکھی تھیں۔ دور سامنے سے مجھے کار آتی دکھائی دی اس کی بتیاں گل تھیں۔ اور وہ کچھ اس طرح ہرتی پھرتی آ رہی تھی کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ تانگا کس ہاتھ پر رکھوں۔ آخر کار میں نے ٹریفک کے عام اصول "بائیں ہاتھ چلو" پر عمل کیا مگر میری جان نکل گئی جب دیکھا کہ موٹر نے "دائیں ہاتھ چلو" پر عمل کر دیا ہے ٹکر یقینی تھی۔ کیونکہ اگر وہ کار روک لیتے تو میرا گھوڑا تو فوراً نہیں رک سکتا تھا۔ اور خصوصاً رکنے کے بارے میں میرا گھوڑا مجھے پسند نہ تھا۔ اسے چار قدم پہلے روکتے تو تب جا کر معین جگہ پر رکتا۔ اگرچہ اس شام گھوڑے کو خدا نے سمجھ دی کہ روکنے پر فوراً رک گیا مگر کار والے صاحب سے خدا سمجھے۔ کار تانگے میں دے ماری ان کی تو صرف مڈگارڈ ہی ٹیڑھی ہو گئی مگر میرے تانگے کی ایک بمب ٹوٹ گئی اور ایک پائیدان بھی اور قدرے گھوڑا بھی زخمی ہو گیا تھا۔ سواریوں کو جھٹکا تو محسوس ہوا مگر کوئی خاص چوٹ کسی کو نہ آئی۔ کیونکہ ٹکر کے وقت تانگہ بالکل رک چکا تھا اب موٹر والا حسب عادت مجھ پر لڑنا چاہتا تھا۔ کہ اچانک میرے تانگے میں سے ایک صاحب کچھ انگریزی میں بول اٹھے میں نے اس کے منہ سے صرف دو لفظ سمجھے "رائٹ اور لیفٹ" میری ہمت بندھ گئی۔ بولا "صاحب پہلے تو آپ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور دوسرے آپ لیفٹ پر نہیں چلے۔ مگر میں نے اپنے نقصان کے بارے میں کچھ نہ کہا اس کے جواب میں کار والے نے کہدیا کہ "ہماری مڈگارڈ ٹوٹ گئی ہے یہ کون بنائیگا؟" مجھے ایک آنریری وکیل مل گیا تھا۔ اس لئے مجھے بولنے کی حاجت نہ رہی معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ایک خالی تانگہ آ رہا تھا میری سواریاں اس نے لیں میں اپنے نقصان کی فکر میں لگ گیا۔

ایک اور حادثہ میرے ذہن میں گھسا ہوا ہے۔ ایک شام پانچ بج چکے تھے۔ وہ بچے جو دن بھر پنجرے میں پنچھیوں کی طرح اسکول میں رہتے ہیں آزاد ہو چکے تھے اور محلے کے وہ لڑکے جو ان کی عدم موجودگی میں اداس اداس بیٹھے رہتے ہیں اپنے گھروں سے نکل کر محلے کی گلیوں میں اکٹھے ہو چکے تھے شہروں میں کچھ ایسی بڑی سڑکیں بھی ہوتی ہیں جن کے دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی گلیاں چکر کاٹتی آملتی ہیں۔ میں ایسی سڑک پر گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی کا وقت ہو چکا تھا۔ اور کافی انتظار اور تلاش کے باوجود ریلوے اسٹیشن کی کوئی سواری بھی نہیں لے سکا تھا خالی تانگے کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی کہیں کے کہیں دوڑ دوڑ جاتا تھا خدا جانے میں کس سوچ میں تھا کہ پہیئے کے ساتھ اچانک کسی چیز کی ایک ہلکی سی ٹکر سے چونک اٹھا۔ ایک بچہ شدید طرح سے زخمی ہو چکا تھا میں نے تانگہ روک لیا اور اتر کر پیچھے کی طرف لپکا بھری سڑک پر مجمع

ہوتے دیر نہیں لگتی اور مجمع کو دیکھ کر تانگے والا کبھی حواس قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور خاص کر ٹریفک انسپکٹر کو موجود پا کر میں ڈر گیا۔ میری خیر نہ تھی۔ میرا جی چاہا کہ قبل اس کے کہ کوئی مجھ سے باز پرس کرے میرے پاس سننے کی قوت ہی نہ رہے۔ میں پاگل ہو جاؤں یا میری روح نکل جائے۔

خدا جانے اس میں میرا قصور تھا یا نہیں مگر حکومت کے سامنے یہ ایک سنگین جرم تھا۔ سرکار نے مقدمہ چلا دیا۔ غریب تانگے والا لوگوں کی دھمکیوں سے بھی ڈر جاتا ہے یہاں تو حکومت کی گرمیں تھیں۔ میری پہلے سے جان نکلی جا رہی تھی۔ مختلف لوگوں کے بیانات اور شہادتیں لی گئیں۔ بچے والے نے بہت زور لگایا۔ ان باتوں نے میری موت کو میرے قریب تر لا کھڑا کیا مگر ٹریفک انسپکٹر کے صحیح بیان اور بے لوث شہادت نے موت کو مجھ سے اتنا دور کر دیا کہ میں سمجھنے لگا کہ مجھے دوبارہ ایسی زندگی مل گئی ہے۔ اس نے بیان دیا کہ وہ حادثہ کے وقت موجود تھا کیونکہ وہ مذکورہ تانگے کے ساتھ ساتھ اپنے سائیکل پر آ رہا تھا اور اصل واقعہ یوں ہے کہ ایک دوسرا بچہ مذکورہ بچہ کے پیچھے اسے پکڑنے کے لئے دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ اور مذکورہ بچے کی نظریں تعاقب کرنے والے بچہ کی طرف مڑی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس کی ٹکر تانگے سے ضروری تھی۔ تانگے والا کسی صورت اس دوڑتے ہوئے اور غیر محتاط بچے کو نہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ عام سڑک پر چلنے والا معلوم نہیں کر سکتا کہ ملحقہ گلی میں کیا ہو رہا ہے۔ جب تک کہ کسی خاص طریقے یا آواز سے آگاہ نہ کیا جائے۔ اس لئے میرے نزدیک تانگے والا بے قصور ہے اور یہ غلطی مذکورہ بچے کی ہے یا اس بچے کی ہے۔ جو اس کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا۔ جسمانی طور پر تو میں اس مقدمہ سے بچ گیا۔ مگر میرے ذہن کو ایک ایسی سزا دی گئی تھی جس کی شدت جسم کی بڑی سے بڑی سزا سے بھی کم تھی۔ میں نے ایک بچے کو زخمی کیا تھا۔ وہ چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا اور اس کا ایک ہاتھ بھی ناکارہ ہو گیا تھا۔ اب اس کی کیا زندگی ہوگی؟ سہارے کا جینا بھی کوئی جینا ہے۔ سہارا چھوٹا تو پھر کچھ بھی نہ رہا۔ کون ہے جو دوسرے کا بار اٹھائے پھرے۔ مجھے تفکرات کھائے جاتے تھے۔ میری طبیعت سنجیدہ ہو گئی۔ میرے صفحۂ لب سے ہنسی کے حروف مٹا دیئے گئے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ خدا نے مجھے یہ سزا کیوں دی ہے؟ میں تو بے قصور ہوں۔ ہم حکومت اور لوگوں کی نظروں میں کیوں مجرم قرار دیئے جاتے ہیں اور اس طرح ہماری زندگیاں کیوں بے کیف بنائی جاتی ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی زندگیوں پر رشک آتا ہے جو میرے تانگے میں بیٹھتے ہیں۔

مجھے وہ بنیا خوب یاد ہے جو سٹی پارک سے واپس آ رہا تھا۔ بھاری بھرکم اور پا پیادہ۔ بیچارا ہانپتا ہوا آ رہا تھا اور دھوپ بھی تیز ہو چکی تھی۔ بڑی توند والے بڑے دھن وان ہوتے ہیں۔ تجوریوں کی تجوریاں بھری پڑی ہیں۔ اور پھر بھی روپیہ ہے کہ ان کی طرف پانی کی طرح بہا چلا آ رہا ہے۔ سچ ہے روپیہ روپے کو کھینچتا ہے مگر اس پر بھی یہ لوگ تانگے والے سے یوں لڑتے جھگڑتے ہیں کہ بیچارے پیٹ سے کاٹ کر کچھ دے رہے ہیں۔ میں گول سڑک سے مڑ کر اس طرف سے واپس آ رہا تھا کہ بنئے نے پیچھے کی طرف مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جان لیا کہ یہ شخص ضرور تانگے پر سوار ہوگا۔ میں نے رفتار کم کر دی۔ اس نے کہا۔ "بھائی سیٹھ چلو گے؟" میں نے دل میں کہا تم پیسے سے مجھے بھی خرید سکتے ہو۔ یہ تانگہ کیا ہے؟ میں نے جواب دیا "سیٹھ جی! آپ ہی تو غریبوں کے پالن ہار ہیں" سیٹھ جی کچھ رعونت کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گئے۔ وہ کیا بیٹھے میرے دل پر ایک بار بیٹھ گیا۔ سیٹھ جی کا ذہن کچھ کاروباری جولانیاں کم کر رہا تھا۔ مگر میرا ذہن مجھے کوڑے لگا رہا تھا۔ چار پیسے لو [illegible] اتنا بھاری بوجھ! یہ سیٹھ اگر زیادہ کرایہ دیدے تو کیا ہرج ہو؟ دریا سے ایک قطرے کی بجائے دو قطرے نکل جائیں تو کیا کمی ہو گی۔ نہیں یہ ہماری اپنی کمزوری ہے اگر ہم انہیں تانگوں میں سوار نہ کریں تو ان کی چربی پگھل جائے۔ اور یہ توندیں پچک کر پیٹھ سے جا لگیں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے اگر ہم یوں کریں تو ہمارے پیٹ ان کی توندوں سے پہلے پیٹھ کو جا لگیں۔ ہم ان کے خلاف کوئی قدم بھی تو نہیں اٹھا سکتے کیونکہ ہماری انجمنیں اور سبھائیں بھی تو ان سیٹھوں ساہوکاروں کے ہاتھوں میں چل رہی ہیں۔ ہم مزدوروں اور تانگے والوں کا تو نام ہی ہوتا ہے اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اور جنہیں چار سواریوں کے پیسے گننے کی سدھ بدھ نہیں۔ لو یہ پوچھیں تو۔۔۔۔۔ "ٹھہرو بھائی یہاں اتار دو" اس نے کہا۔ میرے ذہن کی دوڑیں سمٹ کر ایک ہی مرکز پر آ گئیں۔

مجھے یہ بھی تو یاد ہے کہ جب ایک تھانیدار صاحب نے میرے تانگے کی سواری کی اور منزل مقصود پر اتر کر یوں چلے گئے۔ جیسے وہ اپنے تانگے پر آئے تھے میں کچھ کہنے والا تھا مگر الفاظ حلق میں اٹک گئے پیسے تو ملنے سے رہے۔ الٹی ڈانٹ ڈپٹ مفت کی سوغات ملتی۔ طبیعت پر جبر کیا۔ اور گھوڑے کو تھپکی دیتے ہوئے چل دیا۔ آخر تانگے والا تھا۔

مگر ہم غریب غریبوں پر بھی تو رحم نہیں کھاتے۔ مجھے وہ واقعہ یاد ہے جب میں ریلوے سٹیشن کو جا رہا تھا اور کسی نے راستے میں کہا "کیوں بھئی کیا لو گے؟" میں نے رفتار کم کر دی میرے تانگے میں ایک آدمی کی جگہ خالی تھی۔ میں نے کہا "چار پیسے" اس نے کہا "دو پیسے لیلو" میں نے کہا "اپنی شکل بھی دیکھی ہے" وہ بیچارہ اپنا سا منہ لیکر رہ گیا اور میں نے تانگا تیز کر دیا۔ مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ میں نے کتنا سخت جواب دیا تھا۔ مجھ سے یہ سخت اور روکھا جواب سنکر وہ اسٹیشن کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا تھا شاید اس کا کوئی عزیز بیمار ہوگا۔ یا اسے کسی حاکم کے سامنے پیش ہونا ہوگا اگر میں اسے مفت سوار کر لیتا تو میں اس پر کتنا احسان کرتا اگر اس کے پاس چار پیسے ہوتے یا دے سکتا تو وہ ضرور دے دیتا۔

کبھی کبھی ہم دوسرے لوگوں کی خوشیوں میں بھی شریک ہو جاتے ہیں مگر یہ تانگے کی خوشی پھیکی اور بے اثر ہوتی ہے۔

جب میں کسی کو دریا پہ لے جاتا ہوں۔ تو مجھ میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ کتنی خوشی ہوتی ہے جب دوپہر بھی شہر کی ہاؤ ہو سے دور کسی دریا کے کنارے نکل جاتے ہیں جہاں پہنچ کر وہ وقتی طور پر سماجی اور قانونی بندھنوں سے کچھ کچھ آزادی محسوس کرتے ہیں جہاں کی اصلی ہوا اشتعال انگیز ہوتی ہے اور جہاں پانی کی لطیف لہریں دلوں کو گدگداتی ہیں اور جہاں زندگی پر کیف اور رنگین ہوتی ہے میں بھی تو دریا پر ان کے ساتھ جاتا ہوں مگر ایک خالی پیٹ آدمی کی طرح جس کی نظروں میں فطرت کی رنگینیاں کچھ کشش نہیں رکھتیں۔ نہ جانے وہ ان آزاد لمحوں میں زندگی کی کن راہوں کو پاٹتے ہیں مگر مجھے اپنی زندگی کے وہ لمحے تانگے میں اونگھتے اونگھتے کاٹنے پڑتے ہیں۔

اور کبھی کبھی جب میرا تانگہ کسی بارات کو لیکر چلتا ہے تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے تانگے میں پھول لدے ہیں اور پھر جب ساتھ والے تانگے پہ [illegible]

دھوپ میرے گھوڑے کے ٹاپوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور سڑک پر موسیقی بکھری جاتی ہے میں اس وقت بھول جاتا ہوں کہ میں تانگے والا ہوں میں اپنے آپ کو بارات کا ایک فرد تصور کرتا ہوں مگر جب وہ اتر جاتے ہیں۔ تو میرا تانگہ پھر بھاری ہوجاتا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے چھاؤں سے اٹھا کر دھوپ میں ڈال دیا گیا ہے۔

اسی طرح میری زندگی کا پہیہ چکر کھاتا رہتا ہے۔

آہ! ایسے لوگوں کی زندگیاں تانگے کے پہیے میں کیوں نہیں جکڑ دی جاتیں میں کیوں انہیں زندگی کی مختلف منزلوں پر لے جاتا ہوں۔ ان کی دنیا کیوں وسیع ہے؟ مگر میری دنیا شہر سے ریلوے سٹیشن تک اور وہاں سے شہر کی مختلف گلیوں تک کیوں محدود ہے؟ تیز رفتار پہیے رکھتے ہوئے بھی میں ان حدود کو عبور نہیں کر سکتا میری زندگی صرف اپنے محور پر گھوم رہی ہے میرے تانگے کے پہیے کی طرح۔

دلشاد کلانچوی ایم اے

غزل

آنکھ سے دیکھا ہے کیا کیا کچھ بیاں کیا کیجئے
اک جہاں کو درپئے آزارِ جاں کیا کیجئے

یہ حوادث کا تواتر یہ مصائب کا ہجوم
آرزوئے زندگیٔ جاوداں کیا کیجئے

باغِ ہستی میں کہ طوفانِ حوادث ہے بپا
زحمتِ عزمِ بنائے آشیاں کیا کیجئے

ہر کسی سے شکوۂ اہلِ جہاں کا فائدہ
ہر کسی سے شکوہ اہلِ جہاں کیا کیجئے

کیجئے خود ہی سبیلِ ابتدائے انقلاب
انتظارِ انقلابِ آسماں کیا کیجئے

مہربانی رحم کا ہے دوسرا نام اے وفا!
مہربانی پر محبت کا گماں کیا کیجئے

میلارام وفا

غزل

نگاہِ حسن کو میں کامیاب پاتا ہوں
جہانِ عشق میں اک انقلاب پاتا ہوں

جفا میں فرد وہ ہیں میں وفا میں ہوں یکتا
نہ اُن کا مثل نہ اپنا جواب پاتا ہوں

اب اس کو اور کہوں کیا بجز فریبِ نظر
کوئی حجاب نہیں اور حجاب پاتا ہوں

یہ انتظار کا عالم یہ شوقِ نظّارہ
کہ اپنی آنکھوں کو محرومِ خواب پاتا ہوں

ہے اُن کے حسن کا پرتو کہ میرا حسنِ نظر
ہر ایک ذرّہ میں اک آفتاب پاتا ہوں

سکوں شناس ہوا بھی جو دل تو کیا حاصل
سکونِ دل میں بھی اک اضطراب پاتا ہوں

جہاں کا رنگ بدلتا ہے ہر گھڑی نیساں!
ہر ایک سانس میں اک انقلاب پاتا ہوں

نیساں اکبرآبادی

قطعات

کیا گوہرِ شاہوار، ناسفتہ رہیں؟
داناؤں کے افکارِ حسیں، خُفتہ رہیں؟
اے ہمّت مردانہ! سخن ہائے دقیق
کیوں دہشت ابلہاں سے ناگفتہ رہیں؟

آفاق کے رخ پر ہیں نگاہیں تیری
کونین کے سینے میں ہیں راہیں تیری
پھولوں ہی پہ کب حصر ہے اے روحِ بہار
کانٹوں کے گلے میں بھی ہیں باہیں تیری

اے نوعِ بشر، عقدہ کشائے فردا
اے مشعلِ محرابِ سرائے فردا
مردانہ قدم بڑھا سوئے اوجِ کمال
اے "بندہ" امروز و خدائے فردا

تابش سے فضا چمک رہی ہے گویا
ہیرے پہ کرن جھلک رہی ہے گویا
یہ قد کی بلندی، یہ جھمکتا مکھڑا
نیزے پہ انی دمک رہی ہے گویا

جوش ملیح آبادی

غزل

غمگیں فضا کو عشق سے بھڑکا رہے ہیں ہم
تاریکئ حیات کو چمکا رہے ہیں ہم

دل اعتبارِ دوست سے بہلا رہے ہیں ہم
ہر روز اک فریب نیا کھا رہے ہیں ہم

دم آ کے رُک گیا میری آنکھوں میں وقتِ نزع
کس نے یہ دی صدا کہ ٹھہر آ رہے ہیں ہم

مے خانۂ جمال سے پی تھی کبھی مگر
اب تک اسی سرور سے لہرا رہے ہیں ہم

اے دوست تا بہ کے یہ تری پردہ داریاں
بے ننگ و نام دیکھتے ہوئے جا رہے ہیں ہم

پیشِ نظر ہے کس کا جمالِ جہاں فروز
بے کیف مہر و ماہ کو بھی پا رہے ہیں ہم

مدت سے درد و کرب میں کٹتی ہے زندگی
اس مستقل عذاب سے گھبرا رہے ہیں ہم

اس آستاں پہ پھر ہے جبیں اپنی سجدہ ریز
افسانۂ عشق کو دُہرا رہے ہیں ہم

ہے ان سے اب شکایتِ جور و جفا فضول
اپنے کئے کی آپ سزا پا رہے ہیں ہم

دل کے لئے جو مایۂ تسکیں ہے اے فداؔ
دل کو اسی کی یاد میں تڑپا رہے ہیں ہم

سری کرشن فدا

رُوسی کِسان

دُشمن کی توپوں کی بھیانک آوازیں دور و نزدیک سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں مگر گریگور سکیف کھانا کھا رہا تھا یکا یک اسے معلوم ہوا دشمن گاؤں کے بہت قریب آگئے ہیں اس نے کھانا سامنے سے اٹھوا دیا اور اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے اور سوچنے لگا۔

" وہ بہت قریب آگئے ہیں پیارے" اس کی بیوی ایرینا نے بظاہر سرسری لہجے میں اسے مخاطب کیا مگر اس کی بھوری آنکھیں تشویش کو نہ چھپا سکیں۔ دفعتاً اسے کچھ خیال آیا اور وہ کہنے لگی "مگر ہمیں ڈرنا نہیں چاہیئے بلکہ ہر خطرے کے مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہیئے" اور اس کی آنکھوں میں بہادری کی چمک پیدا ہوگئی میز کے پاس سے اُٹھکر وہ کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچی جہاں ان کا چار سالہ بچہ بورِیس پلنے میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔ ایرینا نے پالنا ہلا دیا اور لوٹ کر اپنے شوہر سے کہنے لگی "تم میری اور بورِس کی فکر نہ کرو۔ پگڈنڈی کی راہ سے ٹولا کا فاصلہ بہت کم ہے میں بورِیس کے ساتھ اسے آسانی سے طے کروں گی اور پھر میں اکیلی بھی تو نہ ہونگی، ماریا دوسری عورتیں ان کے بچے نیز سرکاری محافظ سبھی ہوں گے پھر ڈر کاہے کا؟

"گاؤں چھوڑنے سے پہلے تمہیں بہت کچھ کرنا ہے مگر افسوس ننھے بورِس کی وجہ سے میں تمہاری مدد کے لئے رُک نہیں سکتی — اور ابھی تو اطلاع بھی نہیں آئی۔ جانے کتنا انتظار کرنا پڑیگا؟ ایرینا نے بات ختم کی اور اس کی انگلیاں اس کے سیاہ ملائم بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔

" ہاں ارینا تم سچ کہہ رہی ہو۔ یہ انتظار تکلیف ضرور ہے مگر۔ بہرحال وہی کریں گے جو کامریڈ سٹالن نے کہا ہے" گریگور نے طویل خاموشی کے بعد سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "تم بورِیس کو لے کر جاؤ جب میں اپنا کام ختم کر لونگا۔ تو ٹولا میں تم سے آملوں گا — لیکن پہلے مجھے اپنا فرض انجام دینا ہے" یہ کہتے کہتے اس کی نگاہیں گھر کی خوبصورت دیواروں اور قیمتی فرنیچر کو دیکھتی ہوئی باہر گیہوں کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف گئیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ گھر — یہ ننھا حسین گھر جو یورال کی خوبصورت پہاڑیوں کے کنارے سر اٹھائے کھڑا ہے اور جس کے چاروں طرف گیہوں کے ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے ہیں — ایرینا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ شادی کے بعد سے برابر وہ یہیں رہے ہیں سُکھ اور خوشی کے پانچ سال انہوں نے اسی گھر میں ہنستے کھیلتے گذارے ہیں ان کی ازدواجی زندگی کی حسین یادگار — ننھا بورِیس — یہیں انہیں ملا ہے یہیں رہکر خود اپنی محنت اور لیاقت سے وہ اس حلقے کی ۲۳ زرعی انجمنوں (Collective Farms) کا نگرانِ اعلےٰ (Director) مقرر ہوا ہے یہاں اس کی زندگی ہر طرح سکھی اور مطمئن رہی ہے۔ مگر آج ۔۔۔۔۔ ؟؟؟

آج یہ گھر یہ لہلہاتے ہوئے کھیت اس کی آئندہ زندگی کی امیدیں اور اس کے پیارے بورِیس کا مستقبل سب کچھ برباد ہونے والا ہے۔ آج اس کی ہر وہ شے جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے اس سے چھین جانے والی ہے۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا مگر پھر اسے خیال آیا کامریڈ اسٹالین کی پالیسی ہی بہتر پالیسی ہے۔ اسی پر چل کر ہم اپنے ملک کو ہمیشہ کی غلامی سے بچا سکتے ہیں مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی ہوگا۔ روس کی آزادی اور حیثیت کے لئے اپنا سب کچھ میں خود اپنے ہاتھوں سے برباد کردوں گا — ہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں!!!

مگر ارینا اور بورِیس — ایرینا اور بورِس یقیناً سلامتی سے اپنا سفر طے کر کے محفوظ جگہ پہنچ جائیں گے اور اپنا فرض انجام دینے کے بعد میں بھی ان سے جا ملوں گا۔ پھر اس نے سوچا میں اپنے بچے اور بیوی سے کتنی گہری محبت کرتا ہوں پل بھر کے لئے بھی کبھی ان سے جدا نہیں ہوا مگر آج اس بے سروسامانی میں اتنے شدید خطروں کے باوجود میں انہیں تنہا بھیج دینے پر مجبور ہوں — مگر مجھے حکم مل چکا ہے اور میں اسے ضرور بجا لاؤں گا"

گریگور نے چہل قدمی جاری رکھی اور اس کا دماغ تجویزوں اور ارادوں کو بناتا بگاڑتا رہا — دشمن کی توپوں کی گرج زیادہ بھیانک ہوتی جا رہی تھی — وہ بالکل قریب آگئے تھے!

(۲)

دفعتاً کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور میکائیل پریالسکوف ہاتھ میں ایک اندھی لالٹین لئے اندر داخل ہوا۔

" وقت ہوگیا ہے پیارے!" اسے دیکھتے ہی ایرینا نے گریگور کو مخاطب کیا اور بورِیس کو پالنے سے اٹھا کر اسکے پھول سے رخسار چومنے لگی۔

"کیا خبر ہے میکائیل؟" گریگور نے نووارد کسان سے پوچھا۔

"وہ بہت قریب آگئے ہیں گریگور! عورتوں اور بچوں کو دور بھیج دینا چاہیئے۔ اب تم بھی ایرینا اور بورِیس کو رخصت کر دو۔ پہاڑی پگڈنڈی کی راہ سے یہ ایلکس ارلاف سے جا ملینگے اور وہ ان سب کو خفیہ راستے سے ٹولا پہنچا دیگا" کسان نے لالٹین میز پر رکھکر جواب دیا۔

" جرمن تیزی سے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے صبح سے پہلے ہی وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔"

گریگور کو خاموش دیکھکر کسان نے اس کے بازو کو ٹھوکا دیا اور کہا "اب سوچنے کا وقت نہیں ہے میرے دوست! انہیں رخصت کرو اور میرے ساتھ آؤ! ابھی ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں"

" رخصت ... پیاری ایرینا رخصت!" گریگور نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے سوئے ہوئے بورِیس کو بوسہ دیا — وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر تسلی کا ایک لفظ تک نہ کہہ سکا اسے اپنے حلق میں کچھ پھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا اس کی پلکوں میں رکے ہوئے آنسو تیزی سے بہنے لگے!

"رخصت — پیارے عمر تاج خدا تمہاری حفاظت کرے اور ٹولا میں ہم سے ملا دے"

سسکتی ہوئی ایرنیا نے اپنے شوہر کو حسرت سے دیکھا اور روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے گریگور نے پٹرول کا ٹین کھولا اور کمرے میں پڑے ہوئے سامان پر — جو میکائیل نے اکٹھا کر دیا تھا — پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی ... اور جب وہ کھیتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ دیواروں کے چٹخنے کی آوازیں ان کے کانوں میں آئیں مگر گریگور ایک بار بھی پیچھے مڑ کر وہ بھیانک منظر نہ دیکھ سکا۔ لیکن چاروں طرف کی اس آگ سے وہ کیسے آنکھیں بند کر لیتا جو اس کے ساتھی کسانوں کے گھروں اور کھلیانوں کو جلا رہی تھی!

گھروں کو جلا کر گریگور اور اس کے ساتھی کسان کھیتوں میں پہنچے اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو برباد کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ اسکیم انہوں نے اسی وقت بنائی تھی جب پہلی بار اسٹالین نے اپنی "مشہور پالیسی" (TOTAL) کا اعلان کیا تھا۔ مگر لہلہاتی ہوئی کھیتی کو برباد کرتے وقت کسانوں کے دلوں میں غم و غصہ اور انتقام کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے کیونکہ بہت جلد وہ وقت آنے والا تھا جب وہ اناج کاٹتے اور ان کے کھلیانوں میں غلے کے ڈھیر لگ جاتے لیکن درندہ صفت جرمنوں نے ان کی ساری محنت برباد کر دی اور آج وہی ہاتھ اس اناج کو برباد کرنے پر مجبور ہیں جنہوں نے اسے پیدا کیا تھا۔

یکایک اسے خیال آیا اب وقت آ گیا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے چل کر اپنی بیوی بچوں کے پاس ٹولا میں پہنچ جایا جائے — لیکن شمالی گھاٹی کی فصل ابھی تک باقی تھی!

دشمن کی توپوں کی آواز دم بدم قریب آ رہی تھی اور جرمن ہوائی جہاز بھی نظر آنے لگے تھے جو آتشیں بم برسا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر گریگور نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "تم سب پہاڑیوں میں چھپتے چھپاتے ٹولا کی طرف نکل جاؤ۔ تھوڑی ہی دیر میں میں بھی آتا ہوں۔ گھاٹی کی فصل برباد کرنی ضروری ہے اور یہ کر کے میں ابھی تم سے آ ملوں گا۔"

(۳)

گریگور نے اپنا کام ختم کیا ہی تھا کہ دو جرمن سپاہی سامنے سے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے فائر کیا اور گریگور زخمی ہو کر گر پڑا۔ جب وہ گریگور کے قریب آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے شانے پر گولی لگی ہے وہ درد سے کراہ رہا ہے مگر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اسے قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

جرمن کیمپ میں پہنچ کر گریگور نے دیکھا کہ ایک ہیبت ناک اور کریہہ منظر جرمن افسر ایک بڑی میز کے سامنے بیٹھا ہے اور میز پر اس ضلع کا نقشہ پھیلا ہوا ہے۔

"تم جرمن زبان بول سکتے ہو؟" جرمن افسر نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"ہاں" گریگور نے جواب دیا۔

"تم اس ضلع کی زرعی انجمنوں کے نگران اعلیٰ گریگور دسکیف ہو؟" جرمن نے گریگور کے چہرے پر اپنی بھیانک نظریں جما کر سوال کیا۔

"ہاں" گریگور نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"تمہیں میری بات کا جواب دیتے وقت مجھے 'کپتان بہادر' کہنا چاہئے" غضبناک جرمن افسر نے گریگور کے سوال کے جواب آپے سے چڑ کر کہا: "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم نے گاؤں کی ہر چیز برباد کر دی ہے حالانکہ یہ بدترین قسم کا جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے" اور اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی "مگر ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔ اگر تم ٹولا جانے کا خفیہ راستہ ہمیں دکھا دو — ہاں شاباش فوراً اپنی جان بچانے کا سامان کر لو۔"

گریگور کی تیوری چڑھ گئی اور جرمنوں کو غضبناک نظروں سے گھورتے ہوئے وہ مضبوط آواز میں کہنے لگا: "کپتان بہادر میں غدار نہیں ہوں۔ ایک روسی کسان کسی حال میں بھی اپنے ماتھے پر یہ کالک نہیں لگا سکتا۔"

جرمنوں نے غصے اور نفرت سے اپنے ہونٹ چبائے اور ان کا افسر چلایا: "تب تو تمہیں گولی سے اڑانا ہی پڑے گا" مگر فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر کسی شیطانی ارادے کی جھلک نمایاں ہوئی اور اس نے رک رک کر کہا: "لیکن ہمارے پاس ایک ایسا 'آلہ' بھی ہے جو تمہیں اپنا یہ خیال بدلنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ سمجھے!" ساتھ ہی وہ چلایا: "انہیں اندر لاؤ" اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

گریگور یہ دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا کہ ایرنیا پولیس کا ہاتھ پکڑے ایک چھڑی پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے کچھ لڑکھڑاتی ہوئی اندر آ رہی ہے اور دونوں کے پیچھے ایک جرمن سارجنٹ بھی ہے جس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔

"مجھے معاف کرنا پیارے!..." ایرنیا گریگور کو دیکھتے ہی چلائی "اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر میں پتھروں پر گر پڑی اور میرا شانہ بری طرح زخمی ہو گیا اس لئے..."

مگر جرمن افسر نے اس کی بات کاٹ دی: "انہیں دور رکھو۔ بولنے نہ دو" صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس وقت بہت خوش ہے اور اس دردناک منظر سے خوب لطف اٹھا رہا ہے!

"اچھا اب بتاؤ" اس نے گریگور کو مخاطب کیا: "یہ تمہاری بیوی اور بچہ ہے اور تمہیں ان سے زیادہ کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا: "اس حالت میں کیا تم گوارا کرو گے کہ انہیں ابھی فوراً گولی سے اڑا دیا جائے؟ — اگر نہیں تو ہمیں خفیہ راستے سے ٹولا پہنچا دو" اور گریگور کے چہرے پر انتہائی تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"گریگور —!" ایرنیا کی آواز ایک چیخ میں بدل گئی: "روس سب سے بڑھ کر ہے، خدا کے لئے غداری ...." مگر فوراً جرمن سارجنٹ کی ڈانٹ سنائی دی: "چپ رہو!" ساتھ ہی اس نے ایرنیا کے منہ پر زور سے گھونسا مارا۔

گریگور یہ نظارہ دیکھ کر بے تاب ہو گیا مگر تین آدمیوں کی گرفت سے نکلنا آسان نہ تھا! فوراً بیوی اور شوہر کی نگاہیں ملیں، ہونٹ کانپے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے انہوں نے کیا بات کی کہ گریگور کا سر بلند ہو گیا، سینہ تن گیا اور اس نے پرجوش آواز میں کہا: "میں غدار بننے سے انکار کرتا ہوں — سوویٹ روس زندہ باد"

جرمن افسر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔

"گولی مار دو — جہاں کھڑے ہیں وہیں گولی مار دو!" اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر ایرنیا اور پولیس کی طرف اشارہ کیا اور خود نقشے پر جھک گیا۔

"لیکن اس معصوم بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہ تو....."

غضبناک جرمن افسر نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔ ایرنیا کو غور سے دیکھا مگر جلد ہی اس کی نگاہیں نقشے کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں کھو گئیں [illegible]

...ن کٹر سے ہیں وہیں گولی مار دو"!

جرمن سارجنٹ نے پستول سیدھا کیا اور ننھے بورلیں کے سر کو نشانہ بنا کر گھوڑا دبا دیا۔ ماتا ...ایرنیا بورلیں سے لپٹ گئی اور اسے محسوس بھی نہ ہوا کہ سارجنٹ کی دوسری گولی اس کی پشت ...س کر اس کا کام بھی تمام کر چکی ہے!!

تھوڑی دیر کے لئے گریگور کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے اور بے ہوش ہو کر گرنے ...والا تھا کہ سپاہیوں نے مضبوط پکڑ لیا اور جب اس کے حواس بجا ہوئے تو جرمن افسر نے پوچھا اب بھی بتاتے ہو یا نہیں؟ اب بھی اگر ہمارا کہا مانو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے!

"اب کس کے لئے غداری کروں؟" گریگور نے روکھا جواب دیا۔

"باہر لے جا کر اسے بھی گولی مار دو . . ." افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "مگر پہلے اسی ...ہاتھ سے اس کی قبر کھدوا لو اور پھر سب مل کر اسے اس میں ڈال دینا — سوویٹ کسان ...موت بھی سوویٹ نظام کے مطابق ہی ہونی چاہئے!!" جرمن درندے نے مذاق اڑاتے ہوئے ...ہا اور پھر نقشے پر اپنی نظریں جما دیں۔

(۴)

سپاہی گریگور کو باہر لے گئے اور اس نے گڑھا کھودنا شروع کر دیا مگر اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اور انتقام سے مایوس ہو کر وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایرنیا اور بورلیس سے ملنے جا رہا ہے!

گڑھا تیار ہو گیا، ساتھ ہی فضا میں گڑ گڑاہٹ سی سنائی دی اور جب گریگور نے آسمان کی طرف دیکھا تو ایک روسی بمبار فضا میں تیرتا نظر آیا — بمبار نے جرمن کیمپ کے اوپر پہنچ کر دو بھاری بم گرائے جو کیمپ سے کچھ ادھر ہی گر گئے۔ گریگور نے اپنی "قبر" سے "شیلٹر" کا کام لیا اور جب بمبار چلا گیا۔ تو اس نے باہر نکل کر دیکھا تینوں جرمن سپاہی زمین پر مردہ پڑے تھے۔

گریگور قریب کی جھاڑیوں میں گھس گیا اور دن بھر چھپتا چھپاتا ٹولا کی طرف ہو لیا۔ اور رات کو جب وہ ٹولا پہنچا تو اس کی حالت ناقابل بیان حد تک بدلی ہوئی تھی — کپڑے تار تار، بال پریشان، شانہ زخمی، دماغ ماؤف اور متجسس آنکھوں میں وحشیانہ چمک، غرضیکہ اس کی ظاہری اور معنوی حالت بالکل ہی بدل چکی تھی۔ اور اب اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا — انتقام!!

دوسرے ہی روز وہ "موت" کا دستہ" نامی گوریلا روسی فوج میں شامل ہو گیا جس کا کام جرمن فوجی لائنوں کے عقب میں تباہی پھیلانا، جرمنوں کے سلسلۂ رسل و رسائل کو منقطع کرنا تھا۔

چند ہی روز کی تربیت کے بعد ایک صبح ٹولا کے کمانڈر نے اسے بلایا اور کہا۔ "تم نے اتنی تربیت حاصل کر لی ہے کہ ایک گوریلا دستے کی کمان کر سکو۔ اس لئے تمہیں اپنے دستے کے ساتھ آج ہی رات کو دشمن لائنوں کے عقب میں ہوائی چھتریوں کی مدد سے اتر کر اپنا کام کرنا ہوگا!"

گریگور کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیاری میں مشغول ہو گیا!

اسی رات تین اور گوریلا دستوں کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ دشمن فوجوں کے ... نقصان پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں — ... میں لوٹ آئیں!!!

(۵)

رات کو ساڑھے گیارہ بجے گریگور نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور وہ سب چھوٹی مشین گنوں، دستی بموں اور پستولوں سے مسلح ہو کر ہوائی جہاز سے دشمن لائنوں کے پیچھے کود پڑے — جب وہ زمین پر اترے تو سامنے ہی ایک چھوٹا سا دشمن کیمپ بھی نظر آیا —

بڑی احتیاط مگر تیزی سے پیش قدمی کر کے گریگور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیمپ میں گھس گیا اور سنتریوں کی نظر سے بچتا ہوا خیمے کے سامنے جا کھڑا ہوا خیمے کے اندر سے قہقہوں کی مکروہ آوازیں آ رہی تھیں۔

دروازے پر سنتری کھڑا تھا مگر اس کے چلانے سے پہلے ہی گریگور نے فائر کیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اپنے ساتھیوں کو وہاں چھوڑ کر گریگور خیمے میں گھس گیا۔

میز کے گرد بارہ یا تیرہ جرمن بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ سرے پر ان کا افسر بیٹھا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی گریگور نے پہچان لیا کہ "کپتان بہادر" ہے۔

"ہائیں — تم؟" گریگور کو دیکھتے ہی وہ بدحواسی سے چلایا۔

"ہاں — میں!" گریگور نے اطمینان سے جواب دیا مگر رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ "میرے جنرل کا حکم ہے کہ تم سب کو گولی مار دی جائے" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"مگر — مگر ہم تو نہتے ہیں!!" کریہہ منظر جرمن درندہ گریگور کے چہرے پر بے رحمی اور عزم صمیم کے آثار دیکھ کر کانپتے ہوئے بڑبڑایا!

"بے شک آپ نہتے ہیں کپتان بہادر!" گریگور نے طنزیہ انداز میں جواب دیا "مگر میری بیوی اور معصوم بچہ بھی تو نہتے تھے! کیا بھول گئے؟" گریگور نے کھوکھلا قہقہہ لگایا اور چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "یہ سب جہاں بیٹھے ہیں وہیں گولی مار دو!"

شریف چکوالی

دُعا

میں نہیں طالبِ چراغ، میں نہیں کچھ عوام سے
شامِ سیاہ کو مری زہرۂ تابدار دے

لالہ و گل تو کھل گئے بادِ سحر کے فیض سے
شاخِ حیات کے لئے بھی تو کوئی بہار دے

دل تو دیا کہ ہو رہے حسن کے اختیار میں
حسن پہ یارب ایک بار دل کو بھی اختیار دے

جھلک

"اے بھگوان رحم!"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ مورتی کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا اور بھگوان جیسے معاملے پر غور کرنے کے لئے سکوت میں آ گئے ہوں۔

مندر میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ تاریکیوں میں لپٹی ہوئی دیواریں رعب دار انداز میں اپنے متبرک ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔ وسط صحن میں لگا ہوا پیپل کا درخت آدھے سے زیادہ مندر پر سایہ کئے ہوئے تھا کسی بڈھے کی بے ترتیب داڑھی کی طرح اس کے تنے سے بیشمار جڑیں لٹک رہی تھیں جب ہوا پتوں سے سرسراتی ہوئی گذرتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بیشمار کبوتر آسمان میں قلابازیاں لگا رہے ہیں۔

پیپل کے نیچے متعدد قبریں بنی ہوئی تھیں جن کے سفید سفید گنبد ان مقدس پجاریوں کی تعداد بتا رہے تھے جو اپنی زندگی مندر کی سیوا کے لئے وقف کر چکے تھے اور مرنے کے بعد ان کی راکھ بھی یہیں دفن کر دی گئی تھی۔

سامنے اس دیوار کے بڑے بڑے پتھر لڑھک کر صحن میں جمع ہو گئے تھے۔ جو گذشتہ بارش میں گر گئی تھی۔ کچھ دور ندی کا پانی سینہ ارض پر لہرا رہا تھا۔ جو مندر کی سیڑھیوں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتا ہوا لوٹ جاتا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل گھبرائے ہوئے آدمیوں کی طرح ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔

بھگوان کی مورتی پُر وقار انداز میں کھڑی سوچ رہی تھی۔ اور پاس کی تھالی میں جلتے ہوئے دیئے آہستہ آہستہ جھلملا رہے تھے۔ جن کا عکس کالی سنگی دیوار پر کانپ رہا تھا۔

اس نے اپنا سر مورتی کے قدموں پر ڈال دیا اور بھگوان کی بے پناہ عظمتیں اس کے قلب میں تڑپ کر اپنے رحم و کرم کا یقین دلانے لگیں۔

"اے بھگوان!

میری بیوی اچھی ہو جائے۔ تو میں مندر کی ٹوٹی ہوئی دیوار بنوا دونگا" اس نے رُک رُک کر کہا۔

فضا تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر دو آنسو اس کے قلب کی گہرائیوں سے امڈتے ہوئے آنکھوں کی راہ سے پھوٹ نکلے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک رحم طلب نگاہ مورتی پر ڈالی اور لوٹ گیا لیکن تقدس کی وجہ سے اس نے اس وقت تک پیٹھ نہ پھیری جب تک مورتی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ خوشی کسی بے تاب موج دریا کی طرح اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ جیسے بھگوان نے اس کی دعا قبول کر کے اس کے ساتھ بڑا عظیم الشان احسان کیا ہے اسے کامل یقین تھا کہ اس کی بیوی اچھی ہو جائے گی۔

بادلوں کے ہجوم کی طرح بھگوان کی عظمتیں اس کے سینہ میں تڑپنے لگیں۔

کتنا اچھا ہے۔ بھگوان۔ اس نے دنیا پیدا کر کے مخلوق پر کتنا زبردست احسان کیا ہے اور پھر وہ اپنی پیدا کی ہوئی دنیا کا خیال بھی کیسا کرتا ہے۔ اس نے سوچا۔ زمین۔ چاند سورج ستارے سب اس کی ذات کا ادنیٰ سا کرشمہ ہیں اور پھر پنڈت جی کے لاکھوں ڈھلے ہوئے عظیم الشان الفاظ اس کے دماغ میں سرسرانے لگے۔ جو انہوں نے بھگوان کے متعلق کتھاؤں میں کہے تھے۔ اگر بھگوان دنیا نہ پیدا کرتا۔ تو۔ اس نے خیال کیا۔ اس سے آگے کیا ہوتا وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ اور ایک ہلکی سی کپکپاہٹ اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔

بچپن بھی عجیب چیز ہے جب لوگ اس سے کہتے تھے کہ یہ سب چیزیں بھگوان نے پیدا کی ہیں تو اسے یقین نہ آتا تھا بھلا بھگوان سب چیزیں کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ اگر وہ دنیا کے متعلق یہ مان بھی لے کہ بھگوان نے پیدا کی ہیں۔ تو چاند سورج ستارے اور آسمان تک بھگوان کے ہاتھ کیسے پہنچے ہوں گے یہ بات اس کے خیال میں نہ آتی تھی۔

جب ایک مرتبہ یہی سوال اس نے اپنے بڈھے دادا سے کیا جن کی گردن جاپانی گُڈے کی طرح ہمیشہ ہلتی رہتی تھی۔ اس وقت دادا نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر ایک موٹی سی کتاب نکال کر اس کی پیڑھی۔ آڑی ترچھی لکیروں کو غور سے دیکھتے رہے۔

بیٹا تو بڑا قسمت والا ہے تیرے ہاتھ کی (ریکھائیں) بہت اچھی اور صاف ہیں انہوں نے پوپلے منہ سے الفاظ چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے کہا۔

اور دادا جی آپ نے وہ تو بتایا ہی نہیں کہ ــ

ہاں ہاں ٹھیک ہے بیٹا اس کے دادا نے بات کاٹتے ہوئے کہا بھگوان آسمان پر ہی رہتا ہے۔

اور پھر یہ زمین اس نے کیسے بنا ڈالی؟

بے وقوف کہیں کا۔ ارے اس کے حکم سے بن گئی۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اس دن سے اس نے سمجھ لیا کہ بھگوان جو چاہے سو کر سکتا ہے بھگوان کی قوتیں بے پناہ ہیں۔

اور اب بیشمار دوسرے خیالات بھگوان کے متعلق اس کے دماغ میں آنے لگے۔

بھگوان کا محل کیسا عالیشان ہوگا۔ وہ سب کا سب خالص سونے کا ہوگا چمکتا ہوا جھلملاتا ہوا اور بھگوان کے نوکر کیسے اچھے اچھے لباس پہنتے ہوں گے۔ اور پھر بھگوان کا لباس تو سب سے ہی اچھا ہوگا۔ اور اگر بھگوان نہ ہوتا تو۔ یہ دنیا کون پیدا کرتا یہ چاند سورج ستارے آسمان زمین۔ اس کا گھر اس کا دادا۔ کچھ نہ ہوتا۔ وہ ڈر کر آنکھیں بند کر لیتا اسے ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے آسمان۔ زمین چاند ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر اندھیرے میں غائب ہو گئے وہ کانپ اٹھتا اور ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیتا۔ اور تمام کائنات جیسے اس کے خیالات پر کھڑی مسکرا رہی ہے۔

کیسے خراب خیالات تھے ان زمانے کے اس نے سوچا بھگوان کے متعلق

کھوکھیلی ہے؟ اور کیوں نہیں ہے کتنا بڑا پاپ ہے۔ اس نے ہزاروں مرتبہ توبہ کر ڈالی اور اس کا دل خوشی سے معمور ہو گیا بھگوان بڑا رحیم ہے۔ ضرور اس کی بچپن کی بے ترتیب باتیں معاف کر دیگا ۔ اور جب وہ بچپن میں ایک مرتبہ املی کے اونچے درخت پر چڑھ گیا تھا اور بیشمار املیاں گدر پکی کچی توڑ توڑ کر کھاتا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنی گود بھر لی۔ وہ املی سے نیچے اترنے لگا مگر نہ معلوم کیوں وہ اتر نہ سکا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سے نیچے اتر آئے مگر ہر مرتبہ اس کا دل نیچے پھیلی ہوئی نوکدار چٹانوں کو دیکھکر کانپ گیا۔ اور اطراف میں پھیلے ہوئے اونچے اونچے درخت اس کی آنکھوں میں ناچنے لگے۔

وہ کسی راہگیر کے انتظار میں ایک موٹی سی ڈال کو مضبوط پکڑ کر بیٹھ گیا اور دیر تک دور پھیلے ہوئے راستوں پر آنکھیں گاڑھے کسی آنے والے کی راہ دیکھتا رہا یہاں تک کہ املیاں کھاتے کھاتے اس کے دانت کھٹے ہو گئے۔

بھگوان سب کچھ کر سکتا ہے معاً اس کے دادا کے الفاظ اس کے ذہن میں اتر آئے اس نے خلوص دل سے گڑگڑا کر بھگوان سے پرارتھنا کی کہ جو وہ بچ جائے تو کبھی املی پر نہ چڑھے گا۔

دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے املی کے موٹے تنے کو پکڑ کر نیچے لٹک گیا جب اس کے پاؤں نے زمین کو چھوا اس نے آنکھیں کھولدیں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے بھاگتے ہوئے بیل کے گلے کی گھنٹی بجتی ہے۔ پیٹ پر سفید سفید خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اور کہنیوں کے چھل جانے سے ہلکا ہلکا خون جھلک آیا تھا۔ گود کی تمام املیوں کا خود بخود کچومر بن گیا تھا مگر وہ بچ گیا تھا ۔۔ لمبی لمبی نوکدار چٹانوں سے۔ ورنہ املی کے بیجوں کی طرح لڑھک کر جان دیدیتا۔

اس کے بعد وہ ہر مصیبت میں بھگوان سے دعا کرنے کا عادی ہو گیا۔

ایک دن جب وہ دن بھر گھر سے غائب رہنے کے بعد شام کو گھر پہنچا۔ تو مار کھانے کے ڈر سے وہ دروازے کے سوراخوں میں سے بڑی دیر تک کھڑا اپنے دادا کی ہلتی ہوئی سفید داڑھی دیکھتا رہا۔

اور جب بڈھے دادا نے اپنا موٹا لٹھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے کہا نہ معلوم شیطان کہاں رہ گیا۔ ذرا دیکھ آؤں۔ اور جھولتے ہوئے صحن میں قدم رکھا تو اس کی آنکھوں میں گھر میں جلتے ہوئے چراغ ناچنے لگے۔ اور پھر تھرتھراتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

بھگوان ۔۔ آج بچا لے پھر کبھی نہ جاؤں گا۔

اس دن وہ بہت پٹا اور دیر تک روتا رہا اگر بھگوان کے متعلق اس کے اعتقادات میں فرق نہ آیا۔

مگر بھگوان اسے آٹھویں جماعت میں پاس ہونے میں مدد نہ کرتا تو اس کے بڈھے دادا اسے کبھی کا گھر سے نکال چکے ہوتے اور آجکل کہ معلوم وہ کہاں ہوتا۔ اس کے سب پرچے تو اچھے ہوئے تھے لیکن جومیٹری اسے بالکل نہ آتی تھی اور بات اصل یہ تھی کہ اس نے ان ٹیڑھی آڑی لکیروں میں کبھی اپنا دماغ کھپانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

جومیٹری کے گھنٹے میں وہ اور اس کا دوست موہن دونوں سکول کی لنیہ میں بیٹھے [illegible] اپنے اپنے حساب پر تالاب تنظاہ دونوں یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ حساب میں کافی نمبر لے آئیں تو جومیٹری کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

اور جب حساب کا امتحان دینے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ موہن کے پورے چھ سوال ٹھیک ہیں اور اس کے ۲ غلط میں تو گویا دنیا اس کے سامنے اندھیر ہو گئی فیل ہو جانے کی ندامت تو خیر لیکن گھر سے نکالے جانے کا ڈر اس کے دماغ میں بے تحاشا چوٹیں لگا رہا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ آڑی ترچھی لکیریں قسمت کی لکیریں تھیں جنہیں وہ سمجھنا بھول گیا۔

وہ رات بھر پڑا کروٹیں بدلا کئے اور فیل ہو جانے کے بعد تاریک مستقبل کے بھیانک مناظر دیکھتا رہا۔

آخر کچھ نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے اس نے خیال کیا اگر وہ نقل کرے تو اور نقل کے لئے بھگوان کی معاونت کو ضروری خیال کرے۔ وہ رات بھر اسے اپنی مدد پر آمادہ کرنے میں مصروف رہا اور آئندہ کے متعلق لاکھوں وعدے بھگوان کے خوش کرنے کے لئے بھی کر ڈالے۔

صبح اٹھکر اس نے ضروری سوالات اپنی کتاب سے پھاڑ کر جیب میں رکھ لئے جب وہ امتحان گاہ میں داخل ہوا تو جیسے بیشمار آنکھیں اس کے بدن کے ریشہ ریشہ سے بھگوان کے سامنے رحم کی درخواست کر رہی ہیں۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پرچہ پڑھا اور پھر کتاب سے پھاڑے ہوئے اوراق کو رانوں کے اوپر رکھکر کرتے سے ڈھک لیا اور ڈیسک پر جھک کر بالکل کمان کی شکل میں سمٹ گیا۔

جب ہیڈ ماسٹر تمام لڑکوں کو غور سے دیکھتا ہوا اس کے پاس سے گذرا تو اس کی تمام نبضیں ساقط ہو گئیں اور اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کے جذبات لرزنے لگے۔

ہیڈ ماسٹر گذرتا چلا گیا۔ بلا ٹل گئی اور وہ کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی میں کتنے انقلابات آئے۔ اس نے آٹھویں جماعت کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس دادا جن کے سہارے وہ پڑھ رہا تھا آخرت کو سدھار گئے ۔۔ اسے نوکری کرنا پڑی۔ اور اس کی ماں نے کہہ سن کے اس کی شادی کرا دی۔ اور اب اس کی ساری کائنات اس کی بیوی تھی۔ اسے اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جب وہ سنتا کہ فلاں شخص اپنی بیوی کی پروا نہیں کرتا۔ تو کس قدر حیرت ہوتی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی بیویوں کی قدر نہیں کرتے۔ وہ اپنی بیوی کے خوبصورت سنہری بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتا۔

شاما مجھے حیرت ہے کہ لوگ تم جیسی بیویوں پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ جو دن رات مردوں کے آرام کے لئے اپنی جان کو جان نہیں سمجھتیں۔ اور شاما تم کہو تو میں تمہارے کام کے لئے ایک نوکر رکھ لوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ وہ اپنی بیوی کے خوبصورت گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہتا۔ اور جب اس کی بیوی اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر احسانمندانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھکر کہتی۔ کہ جب تنخواہ بڑھ جائے تو رکھ لینا۔ تو اس کا رواں رواں فرط مسرت سے جھوم اٹھتا۔

شاما تم میری زندگی ہو تم میری روح ہو اور بیشمار خوبصورت الفاظ اس کی زبان سے بے ساختہ پرواز کرنے لگتے۔

وہ دونوں بیٹھے بیٹھے مستقبل کے سنہری خوابوں میں کھو جاتے۔

جب سے شاما بیمار ہوئی تھی اس نے شہر بھر کے تمام حکیموں، ڈاکٹروں کے دروازوں کی خاک چھان ماری۔ وہ ہر قیمت پر شاما کو بچانا چاہتا تھا مگر وہ دن رات مضمحل ہوتی گئی اور مرض خطرناک صورت اختیار کرتا گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں پیلی پڑ گئیں۔ اور سیب کے مانند تر و تازہ رخسارے سوکھ کر پچک گئے۔ اب وہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکتی تھی۔ اس کی بوڑھی ماں اسے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دوا پلاتی تھی۔

ماتا۔ وہ روتے ہوئے کہتی آپ کیوں میرے لئے اتنی تکلیف برداشت کر رہی ہیں؟

نہیں بیٹی! تیری وجہ سے تو میرا گھر روشن ہے۔

اس دن شاما کی طبیعت خراب تھی۔ آج تک کسی دوا نے بھی مرض کو گھٹانے میں مدد نہ کی تھی۔ بلکہ دواؤں سے اور مرض شدید ہوتا جا رہا تھا۔

جا بیٹا! مندر میں بھگوان سے پرارتھنا کر۔ اس کی مرضی ہے تیری پرارتھنا قبول ہو جائے اس کی ماں نے کہا۔

اور ہزاروں امیدوں کے دیئے رات کی تاریکیوں میں جگمگانے لگے۔ اور اب جبکہ وہ واپس جا رہا تھا۔ بھگوان کے رحم و کرم کے بیشمار واقعات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔

رات کی تاریکیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر طرف خوفناک سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہوا کی طوفانی لہریں درختوں سے الجھ الجھ کر چیخ رہی تھیں۔ سنسان گلیوں اور ویران سڑکوں پر کتے بے تحاشا چلا چلا کر اندھیرے کو بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زمین سے بے شمار ملی جلی آوازیں نکل رہی تھیں جن سے فضا میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا اور اس کے دل کی تمام فکریں بھگوان کی بے پناہ عظمتوں کے بوجھ سے دب گئی تھیں۔ اسے یقین کامل تھا کہ اس کی بیوی بچ جائیگی۔

اپنے گھر کے دروازے سے چھنتی ہوئی روشنی جس نے تاریکی میں ہلکے ہلکے شگاف ڈال دیئے تھے۔ اسے نظر آنے لگی۔

وہ تیزی سے گھر میں داخل ہو گیا۔

بیٹا۔ گئی ۔۔۔ سدھار گئی ۔۔۔ اس کی ماں نے اپنے پوپلے منہ سے رک رک کر کہا۔ درد و موٹے موٹے آنسو اس کی بے نور آنکھوں سے نکل کر افسردہ چہرے کے نشیب و فراز پر بکھر گئے ۔۔۔۔ بھگوان ۔۔۔۔ اس نے چیخ مارتے ہوئے کہا۔ میری شاما کو تو نے کیوں چھین لیا۔ اور اس کے ہاتھ میں سے پوجا کی تھالی ۔۔۔ ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر آ رہی ۔۔۔ وہ سسکتا ہوا اپنی مردہ بیوی سے لپٹ گیا ۔۔۔ بھگوان ۔۔۔ دنیا ۔۔۔ آسمان ۔۔۔ زمین اس کی آنکھوں میں پارہ پارہ ہو کر بکھر گئے۔

آسمان پر گھبرائے ہوئے بادل خوفناک آواز کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے جیسے مندر کی باقی دیواریں بھی اڑا اڑا کر زمین پر آ رہی ہوں۔

بھگوان ۔۔۔ بھگوان کچھ نہیں۔ اگر ہوتا تو میری بیوی کو بچا لیتا۔ وہ سب کچھ اتفاق تھا۔ نرا اتفاق ۔۔۔ ماتا ۔۔۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

دور افق پر بجلی ایک کڑک کے ساتھ جھلملاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

سید مقصود علی ہاشمی بھوپال

"گنہ گارِ ہوس"

جب غمِ عشق کے گستاخ ارادوں کے لئے
تیری زلفیں تیرے شانوں پہ پریشاں ہو جائیں
آئینہ درسِ وفا دے تیری رعنائی کو
آرزوئیں تیری خلوت میں گل افشاں ہو جائیں
تیری آنکھوں کی سیاہی میں گداز آ جائے
مرمریں جسم میں کچھ شعلے سے رقصاں ہو جائیں
حسن میں درد کے انداز کی تخلیق سی ہو
عشق میں کیف کے آثار نمایاں ہو جائیں
تیرے لبہائے گلابی میں شراب آ جائے
آبگینے پہ مئے و نور کے لرزاں ہو جائیں
سرخ رخساروں پہ لہرائے شفق کی سرخی
سرمئی آنکھیں گھر ہائے شبستاں ہو جائیں
تری باہوں میں سکوں جھلکے خود آرائی کا
انگلیاں وجہِ شکستِ غم پنہاں ہو جائیں
تیرے سینے سے مہک اٹھے جوانی کا غرور
سرد آہوں کے یہ انوار فروزاں ہو جائیں
جب حیا کر نہ سکے ضبطِ خود آرائیِ عشق
جرأتِ ربط سے جب غنچے گلستاں ہو جائیں
رقص میں پھر در و دیوار نہ ہوں اے عذرا!
ایسے میں کون گنہ گار نہ ہو اے عذرا!

منیر کمال بی اے (جالندھری)

شاہکار

میں شائع شدہ مضامین (نظم و نثر) کے مسودات تاریخ اشاعت سے چھ ماہ بعد تک محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ چھ ماہ بعد ان مضامین سے متعلق اعتراضات کے لئے ادارہ جوابدہ نہیں ہوگا۔

شاہکار کا نرخنامہ اشتہارات

پورا صفحہ	پچیس ۲۵ روپے	فی اشاعت
نصف صفحہ	پندرہ	" "
چوتھائی صفحہ	آٹھ	" "

چوتھائی صفحہ سے کم کا اشتہار اشاعت پذیر نہیں ہو سکتا۔

ادارہ

India's Foremost Illustrated Literary & Educational Monthly

MASTER PIECE

اُردو زبان کی پانچصد سالہ تاریخ میں

"اُردو مرکز لاہور"

شاندار علمی کارنامہ

پچاس ہزار روپے کے صرف سے کئی سال کے اُردو ادب کا نچوڑ

۳۰ مجلدات میں

ملک کے ۶۰ نامور اہل قلم نے

علامہ تاجور کی زیر سیادت

اور

آنریبل سر عبدالقادر، خان بہادر شیخ نور الٰہی آئی ای ایس اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب و پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی

زیر نگرانی

اُردو لٹریچر کے بیکراں انبار کی چھان بین اور لاکھوں صفحات کے مطالعے کے بعد اُردو کے شاندار اور کارآمد حصوں کا تاریخی ترتیب کے پیش نظر

شعر و ادب کا انتخاب حسب ذیل ۳۰ مجلدات میں مرتب کیا ہے

(۱) جدید و قدیم اُردو شعرا کے کلام کا انتخاب [illegible] کی تصاویر کی خصوصیات شاعرانہ کی تفصیل مع تاریخی دیباچہ اُردو ہمت تنقید ۱۴ جلدوں میں

(۲) ملک کے مشہور افسانہ نگاروں کے [illegible] دلکش افسانوں کا انتخاب مع تصاویر و تبصرہ و دیباچہ تاریخی ۱۱ جلدوں میں

(۳) جدید دور کے منتخب [illegible] شعراء کی منظومیں مع تصاویر و خصوصیات نگارش دیباچہ ۵ جلدوں میں۔

۳۰ مجلدات کا سٹ محکمہ تعلیم کا منظور شدہ ہے [illegible] نے حسب سرکلر لیٹر نمبر ۴۵۹ منظور کیا ہے۔

[illegible] مکمل سیٹ کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی ہر کتب کی نہایت صحیح بصورت [illegible] اور ہر کتاب کی محکمہ تعلیم کی مقرر کردہ قیمت کل ایک روپیہ

[illegible] اساتذہ و امتحانات کے امیدوار طلبہ و طالبات [illegible] کے عام اُردو خواں حضرات کیلئے از بس ضروری ہیں

مفت نمونے

دفتر اُردو مرکز بک ڈپو۔ا

اردو ادب کا علمی تعلیمی فنی و ادبی

ماہنامہ

شاہکار

The SHAHKAR

1942
ستمبر

مدیر اعلیٰ شمس العلماء تاجور

مدیر مسئول [illegible]

سالانہ چندہ [illegible]

شاہکار لاہور

جلد (۱۴) فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء نمبر (۹)

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھا کریں۔ تاکہ تعمیل کرتے وقت ادارہ کو سہولت ہو۔ (مینیجر)

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقعہ [illegible] سے شائع کیا

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی

(۱۰)

سینٹ کے ایک ممبر کی بددیانتی

سرکاری محاسب حسابات کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے یونیورسٹی کے کلرکوں کے "ٹانگہ الاؤنس" کے تمام بلوں کو جعلی بتاتے ہیں - اس پر وائس چانسلر اس معاملے کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں اور پولیس کمان پر یونیورسٹی کے کلرکوں کی گرفتاری کا حکم دے دیتے ہیں چنانچہ ایک سب انسپکٹر پولیس کا ایک دستہ لیکر ہتھکڑیوں کے ایک انبار کے ساتھ یونیورسٹی کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے - ساٹھ ستر کلرکوں کی گرفتاری کے وارنٹ دیکھ کر یونیورسٹی کا رجسٹرار ایک غیر معمولی جرأت کے ساتھ سینہ سپر ہو کر سب انسپکٹر پولیس سے کہتا ہے، "یونیورسٹی کے آئین کے مطابق یونیورسٹی کا تمام آفس میرے قبضے میں ہے - وائس چانسلر کو اس دفتر سے کوئی تعلق نہیں - بہتر یہ ہے کہ آپ یونیورسٹی کے احاطے سے باہر ہو جائیں اور یا اپنے ذاتی خطرے پر قبول کر کے میرے کلرکوں کو گرفتار کر لیں ۔" رجسٹرار کی اس آہنی گفتگو سے سب انسپکٹر واپس ہو جاتا ہے -

وائس چانسلر رجسٹرار کی اس جرأت اور اپنے حکم کی بے اثری سے جز بز ہو کر اس معاملے کو سینٹ کے اجلاس میں پیش کر دیتے ہیں ادھر یونیورسٹی کے ڈیڑھ سو کلرکوں کی جماعت یونیورسٹی سینٹ کے اُن ممبروں کے پاس پہنچتی ہے جو عدالت عالیہ پنجاب کے جج بھی ہیں اور اُن سے عرض کرتی ہے :-

"بے شک ٹانگوں کے بل ہمارے بنائے ہوئے ہیں اور ان پر انگوٹھوں کے نشانات بھی ہمارے ہی ہیں - ٹانگے والوں کے نہیں - کیونکہ اکثر اوقات ٹانگے والوں سے رسید لینا بہت مشکل ہوتا ہے - وہ اتنی دیر اپنے ٹانگے کو ٹھہرانے پر رضا مند نہیں ہوتے کہ قلم دوات اور کاغذ لایا جائے، رسید لکھی جائے - اور اس پر ان کے انگوٹھے کا نشان لیا جائے - تمام سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں یہی ہوتا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ کی ہدایت پر کسی کلرک نے دفتری کام کے لئے ٹانگہ کرایہ لیا اور اس کام کو انجام دینے کے بعد کرایہ اپنی جیب سے کرایہ ادا کر کے ٹانگہ چھوڑ دیا اور پھر ضابطے کی خانہ پُری کرنے کے لئے ٹانگے کے کرایہ کا بل - - - ٹانگے والے کی طرف سے کرائے کی وصول یابی کی رسید بنا لی اور یونیورسٹی سے اپنی جیب سے ادا کیا ہوا کرایہ وصول کر لیا - مختصر یہ کہ ہم تمام دفاتر سرکاری و غیر سرکاری کے طریق عمل کے مطابق اور یونیورسٹی آفس کے دیرینہ طرز عمل کے پیش نظر فوری طور پر کرایہ اپنی جیب سے ادا کر دیتے ہیں اور پھر بعد کو یونیورسٹی سے وصول کر لیتے ہیں - دیکھنا یہ ہے کہ جن کاموں کی انجام دہی کے لئے ٹانگے لئے گئے ہیں وہ کام دفتر کو پیش آئے یا نہیں اور پیش آئے تو ان کی انجام دہی ہوئی یا نہیں؟ اگر اس بارے میں ہماری کوئی ذرا سی بددیانتی بھی ثابت ہو تو بیشک ہم دار و رسن کے سزاوار ہیں اور کسی رحم یا چشم پوشی کے مستحق نہیں - اس امر کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی جائے اور ہم اصرار کرتے ہیں کہ یہ محاسبہ ضرور ہو تاکہ ہماری دیانت و بددیانتی کا امتحان ہو جائے - "

لیکن حضور والا! ایک اور پہلو سے بھی اس واقعے پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے - وہ یہ کہ فرض کر لیجئے ہم نے جعل سازی کی ہے اور ٹانگوں کا کرایہ ادا نہیں کیا تو اس قسم کے تمام بلوں کے اخراجات کی رقم سو پچاس روپے سے زیادہ نہ ہو گی جو بل پیش کرنے والے ساٹھ ستر کلرکوں پر تقسیم کی جائے تو فی کلرک دو دو روپے بھی حصے میں نہ آئیں گے - ہم کلرک کلاس کے لوگ ہیں جن کی عیال داری کے اخراجات اس اقتصادی گرانی میں دُگنے ہو چکے ہیں اور

اور ہماری تنخواہیں بہت تھوڑی ہیں - ہم لوگ اس قسم کی بددیانتی کے مرتکب ہو جائیں تو گو قانون ہم پہ رحم نہ کرے گا لیکن سوسائٹی ہمیں معذور سمجھے گی - مگر اِسی یونیورسٹی میں جو لوگ ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ پا رہے ہیں اور یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور سینٹ کی ممبریوں کے دوہرے دوہرے اعزاز بھی رکھتے ہیں، اُن میں بھی تو بددیانتوں کی کمی نہیں، اُن کے لئے بھی پولیس کی ہتھکڑی اور وارنٹ کے تعزیری سامان مہیا کرنے کی ضرورت ہے کہ جرم بہرحال جرم ہے - کوئی تیس روپے کا کلرک اُس کا مرتکب ہو یا ڈیڑھ ہزاری منصب کا اعلیٰ ملازم - کوئی مہذب قانون کی گیرودار کسی کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتی - "

"ثابت کردہ اُن کی بددیانتی"

اس سوال پہ یونیورسٹی کے ماخوذ کلرک رجسٹر نکال لیتے ہیں اور ایک بل پیش کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اِس بل کو پیش کرنے والا یونیورسٹی سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتا ہے - سنڈیکیٹ اور سینٹ کا ممبر ہے - سنڈیکیٹ کی ہدایت پہ یونیورسٹی انسپکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت میں لائل پور اپنی کار پہ جاتا ہے - یونیورسٹی کے رولز کی رُو سے اُسے بل میں یہ بتانا چاہیئے تھا کہ اُس نے لائل پور کا سفر اپنی کار پر طے کیا ہے اور اُسے بل میں صرف پیٹرول کا خرچ پانچ چھ روپے درج کرنا چاہئے تھا - مگر اُس نے یونیورسٹی کی بیخبری سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈبل فسٹ کلاس ریلوے کرائے کا بل بنا کر پیش کیا اور بل کی رقم وصول بھی کر لی ہے - یہ ہے اُس کی رسید - آنریبل جج رجسٹر کے اندراجات بل اور رسید کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ممبر مذکور کی بددیانتی کے متعلق صحیح رائے قائم کرتے ہوئے یونیورسٹی کلرکوں کی فریادی جماعت سے فرماتے ہیں -

"ہاں یہ بددیانتی ہے - اب تم جاؤ اور اپنا مفوضہ کام جاری رکھو - "

یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ میں جب وائس چانسلر سرکاری آڈیٹروں (محاسبوں) کی رپورٹ اور پولیس کو باہر نکال دینے کی متعلق رجسٹرار کی گستاخانہ جرأت کا معاملہ پیش کرتے ہیں تو سنڈیکیٹ کے وہی آنریبل جج بددیانت ممبر سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کرتے ہیں -

"آپ نے یونیورسٹی انسپکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت میں لائل پور کا سفر ریل کے ذریعہ طے کیا ہے یا اپنی کار میں آپ وہاں گئے تھے؟"

ممبر مسئول - (کار کے ذریعہ اس سفر کے راز کو افشا ہوتے دیکھ کر) جناب اپنی کار کے ذریعہ -

آنریبل جج - پھر آپ نے ریلوے کے ڈبل فسٹ کلاس کرائے کا بل کیوں پیش کیا؟

ممبر مسئول - (عذر لنگ پیش کرتے ہوئے) جناب میرے کلرک نے میری اطلاع کے بغیر یہ بل بنایا اور مجھ سے بیخبری میں اس پر دستخط بھی کرا لئے -

حالات کی خطرناکی کو دیکھ کر سنڈیکیٹ کی دوست پرور جماعت نے تجویز پیش کر دی کہ رجسٹرار کے خلاف وائس چانسلر کی حکم عدولی اور اس ممبر کے غلط بل کا معاملہ داخل دفتر کر دیا جائے - اس پر اس ٹولی کے دوسرے ممبر ہاں ہاں کا شور کر دیتے ہیں اور اس طرح ممبر مسئول عنہٗ کی اس کھلی بددیانتی کا معاملہ دبا دیا جاتا ہے -

اب وائس چانسلر کی خدمت میں ہم اس حادثے سے متعلق چند سوالات پیش کر کے اُن کا تسلی بخش جواب طلب کرتے ہیں -

(۱) یونیورسٹی کے اس ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ پانے والے ملازم کا ایک فریب آمیز بل پیش کر کے یونیورسٹی فنڈ سے زیادہ رقم وصول کرنا کیا بددیانتی اور حیل سازی نہیں ہے؟

(۲) پھر اس شخص کا یہ کہنا کہ میرے کلرک نے میری ہمدردی کے جوشِ طوفان میں بہتے ہوئے یہ غلط بل بنا لیا اور اِس پہ بیخبری میں مجھ سے دستخط بھی کرا لئے گیا "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے ذیل میں نہیں آتا؟ اور کیا کوئی عدالت مجاز اس لچر اور فریب کارانہ عذر کو قبول کر سکتی ہے؟

(۳) اس عذر نما جرم کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو کیا اس کے پاس اِس سوال کا کوئی معقول عذر ہے کہ تمہارے کلرک کا غلط بل بنانا اور تم سے بیخبری میں دستخط کرا لینا مان بھی لیا جائے تو تمہارا اس بل کی رقم وصول کر کے اپنی جیب میں ڈال لینا بھی کلرک ہی کی غلطی ہے؟ رقم وصول کرتے ہوئے کیا تم اِس حقیقت سے بیخبر ہی رہے کہ یونیورسٹی سے کس کارکردگی کی یہ رقم مجھے مل رہی ہے؟

(۴) اس واضح اور بے تاویل بددیانتی کے بعد بھی اس ممبر کو پولیس کے حوالے نہ کرنا اُس وائس چانسلر کے فرائض نگرانی کے کہاں تک موزوں ہو سکتا ہے جو دو دو چار چار آنے کے ٹانگہ الاؤنس کو مشتبہ سمجھ کر یونیورسٹی آفس کی ساری کلاریکل جماعت کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس گارد کو بلا لیتا ہے -

۵) پھر یہ کہ کیا اس بددیانتی کے رسوا ہو جانے کے بعد اس بددیانت ممبر سے ناجائز رقم یونیورسٹی کے خزانے میں واپس کرائی گئی؟ نہیں کرائی گئی تو کیوں؟

(۶) قانونی عدالتوں کا طریقہ تو یہ ہے کہ زیادہ ذمہ دار مجرم کو عبرت دلانے کی خاطر عام مجرموں کی بہ نسبت زیادہ سخت سزائیں دیتی ہیں۔ تو کیا اس ممبر کو میعاد ملازمت ختم ہو جانے پر پانچ سال کی توسیع کے بعد ۱۸ ماہ کی فرلو دے دینا اس کی بددیانتی کے جرم کی کوئی عبرتناک سزا ہے؟

پنجاب یونیورسٹی لائبریری

(۱) یونیورسٹی سینٹ کے ایک ممبر نے اپنے ایک قریبی عزیز کو یونیورسٹی لائبریری میں ملازم کرا رکھا ہے اور خود وہ ممبر لائبریری سب کمیٹی کا ممبر بھی ہے۔ یہ صاحبزادے "سیّاں بھے کوتوال اب ڈر کا ہے کا؟" کی سازگار فضا میں سانس لینے کے عادی بن رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے گذشتہ سال کی تازہ خرید کردہ کتابوں کو ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا، اُن کا انبار اپنے لاابالی منتظم کی تغافل فرمائی کا فریادی ہے۔ اس لئے کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ تازہ عربی و فارسی لٹریچر کے مطالعے کا موقع نہیں پا سکے۔ اس سلسلے میں بعض اساتذہ کو شکایت ہے کہ عربی و فارسی سیکشن کا اسسٹنٹ لائبریرین سات بجے کی بجائے ۸ اور ۹ بجے گھر سے آتا ہے۔ اور وہ لوگ اس کا انتظار کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ کسی استاذ نے اس اسسٹنٹ کی تین دن کی مسلسل غیر حاضری سے متعلق تحریری شکایت لائبریرین سے کرتے ہوئے تحریری جواب طلب کیا، تو بے چارہ لائبریرین شش و پنج میں پڑ گیا۔ اور اپنی مجبوری حال کو پیش کر کے استاذ سے مستدعی ہوا کہ وہ اپنی تحریری شکایت کو واپس لے لیں۔ استاذ مذکور نے اس سے انکار کر دیا اور تحریری جواب پر مصر ہوا، اس پر لائبریرین "بڑے صاحب" تک پہنچا اور وہاں سے کچھ الہام حاصل کر کے اُس نے اپنے اس اسسٹنٹ سے گذشتہ تین دن کی ایک ایک گھنٹے کی رخصت کی درخواست لے کر استاذ کی شکایت کا تحریری جواب یہ دیا کہ پچھلے تین دن لائبریری کے وقت کے پہلے گھنٹوں میں عربی فارسی سیکشن کا اسسٹنٹ رخصت پر تھا۔

(۲) چیف لائبریرین کے دو سینیئر اسسٹنٹ ہیں یعنی اس کی غیر موجودگی میں اُنہیں میں سے کوئی قائم مقام لائبریرین بنتا ہے۔ اگر لائبریرین مستعفی یا ریٹائر ہو جائے تو اس کے بعد لائبریرین بننے کا انہیں دو میں سے کسی ایک کو حق پہنچے گا۔ گویا یہ اُن کا سرکاری درجہ ہے اور اس میں ردّ و بدل سنڈیکیٹ اور سینٹ کی منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ سینٹ کے اُس ممبر کا وہ عزیز لائبریری میں سب سے جونیئر ہے۔ ممبر مذکور موجودہ جنگ اور سابق لائبریرین کی اچانک موت کے سبب اپنے اس عزیز کو چیف لائبریرین بنانے کی اسکیم میں ناکام ہو کر اب اس فکر میں ہے کہ اسے کسی صورت سینیئر اسسٹنٹ بنا کر اس کے لئے کبھی لائبریرین بننے کی راہ پیدا کر لے۔ اس سلسلے میں اُس نے پہلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ ایک سینیئر اسسٹنٹ کو عربی و فارسی سیکشن میں بھیج دیا ہے اور اپنے عزیز کو جو سب سے جونیئر ہے۔ اُن کی جگہ منتقل کر دیا ہے۔ غالباً یہ عذر تراشا گیا ہوگا کہ اِن کا عزیز عربی و فارسی سے ناآشنا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی تہ میں یہی جذبہ کام کر رہا ہے کہ کسی جوڑ توڑ سے یہ لائبریرین کا فسٹ اسسٹنٹ بن جائے۔ اب وہ سینیئر اسسٹنٹ غریب اس جونیئر کی جگہ فریاد کار خاموشی اختیار کئے ہوئے کام کر رہا ہے۔ زبان سے اُف کہنے کی مجال نہیں رکھتا کہ کہیں لائبریری سے یہ یک بینی و دوگوش نکال نہ دیا جائے۔ کیا ہمارے وائس چانسلر جذبۂ مروت سے الگ ہو کر اس غریب کے ساتھ انصاف کریں گے؟

واقعہ یہ ہے کہ غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے تو اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب اسکیم کے عناصر کا انکشاف ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی

سنا جا رہا ہے کہ جس ناطق مصیبت کے پنجے میں پنجاب یونیورسٹی ۲۵ سال تک مبتلا رہی اب وہ بدبلا مسلم یونیورسٹی کی جانب قدم بڑھانا چاہتی ہے مسلم یونیورسٹی پروفیسر میمن عبدالعزیز جیسے علامہ اجل کی موجودگی میں پنجاب یونیورسٹی سے جس مجسمۂ ناقابلیت کو خریدنا چاہتی ہے۔ اُسے یہ سودا بہت مہنگا پڑے گا۔ ہم آئندہ شمارے میں اس تصویر کی نقاب کشائی کی رسم ادا کریں گے۔

ادارہ

جناب ریاض شمیم کے قلم سے

ماہرِ نفسیات

اختر صاحب کے لئے زندگی سے عارضی فرار از حد غنیمت تھا ——

ہر روز وہی سیمنٹ کا مرمت طلب ناہموار فرش، وہی عریاں زرد دیواریں وہی کرخت اور ٹھوس چوبی میز اور اس پر کاغذات کے انبار، ٹین کی کرسی جس کی چوتھی ٹانگ ہمیشہ ہوا میں معلق رہتی تھی، فرش پر جابجا سیاہی کے دھبے اور چھت پر ہر جگہ مکڑی کے جالے —— ہر روز وہی ماحول، وہی فضا، —— کاغذ پر دوڑنے والے قلم کے سوا ہر چیز پر جمود طاری، زنگ آلود ٹائم پیس کی سوئیاں بھی ساکن تھیں، نہ جانے کب سے، انہیں کبھی کسی نے چار بجے کے علاوہ اور کوئی وقت ظاہر کرتے نہ دیکھا تھا!

یہ اخبار کا دفتر تھا اور اختر صاحب اس میں ملازم تھے ——

اختر صاحب کے اپنے الفاظ میں اخباری دفتر کے ایک کلرک اور اخبار چھاپنے کی مشین میں صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ کلرک اپنا کام ختم کر چکنے پر گھر چلا جاتا ہے اور مشین اپنا فرض ادا کرنے کے بعد بھی وہیں کھڑی رہتی ہے۔ یوں تو گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے۔ لیکن بجانے بجانے میں فرق ہوتا ہے۔ ایک پیشہ ور فن کار کے لئے اس سے بڑھ کر اور راحت کچھ نہیں۔ لیکن ایک نفاست پسند اور حساس نوجوان کے لئے جسے ڈھول سے اسقدر ہی نفرت ہے جتنی ٹائی کی باریک اور پھیکی ہوئی گرہ سے، یہ سوہانِ روح ہے۔ اخبار کے دفتر کی ملازمت "آ بیل مجھے مار" قسم کے صاحب کے لئے شاید زیادہ موزوں ہوتی لیکن اختر صاحب کی امن پسند اور صلح جو فطرت کے یہ بالکل متضاد تھی۔ وہ تو یوں کہیئے کہ ان میں اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت انہیں سنبھالے ہوئے تھی ورنہ وہ بجانے کب کے یہ ڈھول گلے سے اتار پھینک چکتے۔ اور اس طرح نفسیات کا مطالعہ ان کے آڑے آ گیا تھا ——

ہاں، اختر صاحب ماہرِ نفسیات بھی تھے۔ نفسیات کا مطالعہ اُن کا محبوب ترین شغل تھا اور انسانی فطرت اُن کا مرغوب ترین مبحث، وہ ایک کامیاب اور مشہور افسانہ نویس تھے۔ اُن کے تمام افسانے فطرتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے بہترین تجزیے ہوتے تھے۔ اُن کی ملنسار طبیعت اور خوش اخلاقی اُن کے دائرۂ احباب کو بہت وسیع کر چکی تھی اور اُن کے افسانوں کے بیشتر کردار ان کے دوستوں کے عکس ہوتے تھے۔ اپنی روزمرہ زندگی میں معمولی معمولی واقعات سے وہ اپنے افسانوں کا مواد حاصل کر لیتے۔ اور یہی مشاہدے ان کے شاہکاروں کے محور بن جاتے تھے!

اختر صاحب چار سال سے اس دفتر میں کام کر رہے تھے اور اس طویل عرصے میں شاید ہی کبھی انہوں نے ناغہ کیا ہو۔ روزانہ صبح ساڑھے نو بجے وہ دفتر پہنچ جاتے اور چار بجے اپنی کرسی خالی کر دیتے۔ اگر کبھی کام ہلکا ہو تو وہ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر قلم دانتوں میں دبائے مقابل کی دیوار پر نظریں گاڑ دیتے جہاں پلستر اکھڑنے سے عجیب عجیب شکلیں بن گئیں تھیں یا پھر وہ زنگ آلود گھڑی کو گھورتے رہتے اور سوچتے کہ اگر گھڑی کے رکنے ہی گھڑی کی پرواز بھی رک جاتی اور آفتاب ہمیشہ کیلئے اُفق مغرب پر جھلکارہ جاتا، تو انہیں کبھی ساڑھے نو بجے دفتر نہ آنا پڑتا ——

دن، مہینے اور سال یونہی گزرتے چلے گئے۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر، یہ چکر حسب معمول بغیر کسی حادثے کے چلتا رہا۔ اختر صاحب رفتہ رفتہ اس بے کیف زندگی سے اکتا گئے۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی امن پسند طبیعت اب کسی ہنگامے کی تشنہ ہے۔ اُن کی یہ تشنگی تحت الشعور میں آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی گئی۔ ان کے افسانے بھی اب تخیلی ہوتے جاتے تھے۔ اپنے ماحول سے بے نیاز ہو کر عالمِ تصور میں وہ اکثر اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ پاتے تھے جہاں "ہمنفس کوئی نہ ہو اور ہمنوا کوئی نہ ہو" ——

اور پھر اچانک ایک حادثہ ہوا۔ اختر صاحب کے خواب حقیقت میں تبدیل ہو گئے۔ اخبار کے سلسلے میں انہیں چند ایام کے لئے کلو جانا پڑا۔

اختر صاحب کے لئے اپنی روزانہ زندگی سے یہ عارضی فرار از حد غنیمت تھا ——

کلو اختر صاحب کے لئے نئی جگہ نہ تھی، آٹھ نو سال ادھر کی بات ہے کہ انہیں ایک مرتبہ چند دوستوں کے ساتھ یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس طویل وقفے میں کلو کی فضا بہت تبدیل ہو چکی تھی۔ غالباً اس لئے کہ اب اختر صاحب طالب علم نہیں بلکہ اخباری دفتر کے ایک معمولی کلرک تھے اور زندگی کے اس موڑ کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ان کا ہموار راستہ نشیب و فراز سے ناآشنا تھا۔ لیکن سرائے کے پہاڑی چوکیدار کے لئے شاید دنیا اب بھی وہی تھی۔ آج صبح جب اختر صاحب سرائے سے باہر نکلے تو وہ انہیں جنگل کی طرف سے آتا ہوا ملا۔ وہ لکڑیوں کا ایک گٹھا اُٹھائے تھا، آٹھ نو سال پیشتر بھی اُس کا یہی معمول تھا —— فرق صرف اتنا نظر آتا تھا کہ اب اس کی کمر زیادہ خمیدہ ہو چکی تھی اور [illegible]

"کیا لے آئے بھئی؟" اختر صاحب نے پوچھا۔

بوڑھے نے گردن اٹھائی اور اختر صاحب کو دیکھ کر زرد دانت نکال دئے۔

"شوکھی شو لکھی لا کڑیوں کا گٹھا لایا مہاراج!"

"پہچانا نہیں تم نے شاید؟"

بوڑھا خاموش رہا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی غلیظ تبسم کھیل رہا تھا۔ اختر صاحب نے سوچا کہ یہ پہاڑیئے بھی کسقدر سیدھے ہوتے ہیں۔ انہوں نے بات کا رُخ پلٹ دیا۔

"اور وہ جینگا ندی کا پُل کدھر کو ہے معلوم ہے تمہیں؟"

"لوہے کا پُل مہاراج؟"

"ہاں، لوہے کا پل۔"

"شیدھا جانا جی — آگے بائیں ہاتھ پگڈنڈی پر ستے جانا — شا کھی کے ٹبتے کے پار ہے مہاراج۔"

"ہاں ہاں ٹھیک تو ہے، میں سمجھ گیا — اچھا بھئی!"

"نمشتے مہاراج"

"نمستے"

سرائے سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ایک ندی ہے۔ ایک مقام پر یہ دو مہیب پہاڑوں کی عمیق وادی میں ہو کر گزرتی ہے۔ اور اس جگہ ایک سسپنشن برج ہے۔ پل پانی کی سطح سے تین سو فٹ کی بلندی پر دو پہاڑوں کے درمیان مکڑی کے جالے کی طرح آویزاں ہے۔ اختر صاحب اس پُل کو کبھی نہ بھولے تھے۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جب انہوں نے پہلی مرتبہ اس پُل پر کھڑے ہو کر نیچے ندی کی طرف نگاہ ڈالی تھی تو ایک عجیب کیفیت محسوس ہوئی تھی، سر ہولے ہولے گھومنے لگا تھا، پاؤں جیسے نیچے ہی کھچنے جا رہا ہوں۔ بصیرت جیسے وادی کی گہرائی میں جذب ہو گئی ہو، ایک ہلکا ہلکا نشہ، ایک لطیف خمار —

پہاڑی رستہ گھٹتا معلوم نہیں ہوتا۔ میل کے بعد میل کم ہوتا جاتا ہے۔ اور تکان محسوس نہیں ہوتی۔ اختر صاحب گھومتے پھرتے دوپہر کے قریب پل پر پہنچ گئے۔ انسانی طاقت کا یہ آئینہ دار بھی اثرات وقت سے بچ نہ سکتا تھا۔ آہنی گرڈر زنگ خوردہ ہو رہے تھے۔ کولتار کا فرش خستہ ہو چکا تھا۔ اختر صاحب ٹہلتے ہوئے پل کے وسط کی طرف آ گئے۔ اُن کے پاؤں کی ہر جنبش پر پل لرزتا جاتا تھا۔ یہاں وہ رُک گئے اور جنگلے پر جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔ جینگا ایک شفاف لکیر کی طرح بل کھاتی جا رہی تھی — وادی پانی کے شور سے گونج رہی تھی۔ آفتاب کی شعاعیں [illegible] کھیل کر منعکس ہو رہی تھیں۔ اور اس طرح کبھی کبھی اس سفید سی لکیر پر ایک چمک پیدا ہوتی اور کھو جاتی۔ — ندی کے کنارے چند سیاہ دھبّے متحرک تھے، شاید کچھ لوگ پکنک کے لئے آئے تھے۔ — اختر صاحب کو پھر وہی کیفیت آور احساس ہوا، آنکھوں کے سامنے ندی کا منظر غیر واضح ہو گیا، سر ہولے ہولے چکرانے لگا اور توازن گم ہوتا محسوس ہوا — انہوں نے بروقت جنگلے کا سہارا لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا —

کھٹ، کھٹ، کھٹ!

پُل کے زیریں حصّے سے کچھ آواز آ رہی تھی — اختر صاحب دم بخود رہ گئے، انہیں پہلی مرتبہ یہ روح فرسا احساس ہوا کہ تین سو فٹ کی بلندی پر زمین اور آسمان کے درمیان لٹک رہے ہیں اور یہ مدتوں کا خستہ پُل شاید — شاید اُن کا وزن برداشت نہیں کر سکتا۔ کتنا وحشتناک تصور تھا! انہیں یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا؟ — خطرہ کے احساس پر اختر صاحب سمجھتے تھے کہ بھاگنا ایک فطری فعل ہے اور یہ تحت الشعور کے ایما پر انجام دیا جاتا ہے، لیکن ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے وہ اپنے تحت الشعور کو شعور پر کبھی غالب نہ آنے دیتے تھے — وہ سمجھتے تھے کہ اگر پُل اُن کا وزن برداشت کرنے سے قاصر ہے تو بھاگنے سے یقیناً ٹوٹ جائے گا۔ اور — مگر یہ بھی تو وحشت ہے کہ اتنا بڑا پل، آہنی پل ایک من بھر کے آدمی سے لچک جائے — نہیں، یہ بات نہیں۔ اختر صاحب کے مادہ استعجاب نے انہیں مجبور کیا کہ وہ جنگلے پر جھک پل کے زیریں حصّے کا معائنہ کریں —

انہوں نے دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ پُل سے چار ضرب چار فٹ کے تختے کا ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ اس پر ایک بوڑھا مستری کھڑا ایک ہتھوڑے سے پُل کی مرمت کر رہا تھا —

"کہو بڑے میاں کیا بن رہا ہے؟" اختر صاحب نے رسمی طور پر پوچھا۔

"دیکھ لیجئے" بوڑھے نے ایک نظر اُن کی طرف دیکھ کر کہا۔

بڑے میاں کا جواب کچھ حوصلہ افزا نہ تھا اور اب گفتگو جاری رکھنا ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ لیکن اختر صاحب جیسے ماہرِ نفسیات کو ایسے موقع خدا دے۔ انہوں نے بوڑھے کو سر تا پا دیکھا اور پھر مسکرا کر بولے۔

"بڑے میاں، آپ کو خوف نہیں آتا؟"

بوڑھا اپنے کام میں محو تھا۔ لیکن اختر صاحب کے حوصلے اسقدر جلد پست نہ ہو سکتے تھے۔

"اس قدر بلندی پر آپ اتنے سے تختے پر کھڑے ہو کر کام کر رہے ہیں

"یہ ہمارا روز کا کام ہے بابو جی"

اُس کا لہجہ بتاتا تھا کہ وہ ایک طفلِ مکتب کے علم میں اضافہ کر رہا ہے

"لیکن جب تم — جب آپ نیچے دیکھتے ہیں، ندی کی طرف —"

بوڑھا ہنس دیا — اُس کی ہنسی میں طنز اور مضحکہ تھا۔

"نہیں بابو جی میں نے کبھی دیکھا نہیں دیکھا — کام سے اتنی فرصت ہی کہاں کہ نظارہ بازی کر سکیں۔"

"اور میری مانیئے تو کبھی ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر نظارہ بازی کیجیئے بھی نہ۔"

وقفہ — اختر صاحب سوچ رہے تھے کہ نفسیات کے یہ مسائل اس بوڑھے کی سمجھ میں آ بھی سکیں گے کہ نہیں!

"آپ شاید نہیں جانتے کہ اتنی بلندی سے نیچے دیکھ کر دماغ پر کیا اثر پڑتا ہے — یوں سمجھیئے کہ دماغ منظر کی ہیبت سے مرعوب ہو جاتا ہے اور —، — اور نہیں تو کم از کم آپ کے اس جھولے کے چاروں طرف ایک جنگلہ ضرور ہونا چاہیئے!"

"بابو جی یہ بات تو ہمیں آج تک نہ سوجھی۔"

وہ اختر صاحب کی ہنسی اُڑا رہا تھا — جاہل!

"تعجب ہے، بھئی میں تو کسی قیمت پر بھی تمہاری جگہ نہ کھڑا ہوں۔ ابھی ابھی میں نے نیچے نظر ڈالی تو جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ تو کہیئے کہ جنگلہ پر ہاتھ جا پڑا ورنہ —"

بوڑھے نے اپنے ہاتھ روک لئے، اُسے پہلی مرتبہ اختر صاحب کی باتوں میں دلچسپی کا احساس ہوا۔

"کیوں — کیا ہوا تھا بابو جی؟"

وہ سچ مچ حیران تھا —!

"دماغ مرعوب — میرا مطلب ہے کہ اگر آپ نیچے دیکھیں — یعنی اتنی بلندی سے نیچے نگاہ ڈالیں تو عجیب کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ آپ شاید نہ سمجھ سکیں۔ لیکن ذرا تصور کیجیئے کہ جونہی آپ نیچے نظر ڈالتے ہیں۔ آپ کا سر ہولے ہولے گھومنے لگتا ہے۔ ہلکا سا چکر آتا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ وزن گم ہو جاتا ہے۔ آپ لڑکھڑاتے ہیں اور سہارے کے لئے — اے، اے بڑے میاں دیکھو سنبھلو!!"

اور واقعی بڑے میاں لڑکھڑا رہے تھے۔ ان کا توازن گم ہو چکا تھا اور ان کی بے نور آنکھیں بتائے دیتی تھیں کہ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا — انہوں نے سہارے کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے، پھر آگے کی طرف جھکے اور تختے سے علیحدہ ہو گئے!

اختر صاحب کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے بڑے میاں وادی کی گہرائی میں ایک دھبہ ہو کر رہ گئے اور پھر دھم سے ندی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی — چھینٹیں اٹھیں۔ سفید سی لکیر پر ایک ستارہ سا بنا اور گم ہو گیا!

ذرا تصور کیجیئے —

(مختار)

سانیٹ

اے رومان!

میکدہ بردوش ساون کی گھٹائیں آگئیں
قلزمِ جذبات میں طوفاں اٹھانے کیلئے
دل میں بے نام آرزوؤں کو جگانے کیلئے
لڑکھڑاتی جھومتی، ٹھنڈی ہوائیں آگئیں
ذرہ ذرہ میں جوانی کی ادائیں آگئیں
نو بہارِ کیف میں نغمے لٹانے کیلئے
بجلیاں سی پھر مرے دل پہ گرانے کیلئے
کوئلوں کی اور پپیہوں کی صدائیں آگئیں!!!

اپنے سینے میں رکھ میں رومان جیسیں لے چل مجھے!
مہر و مہ کی کہنہ و فرسودہ منزل سے پرے
اِس جہاں سے دُور ان تاروں کی محفل سے پرے
وادیٔ شعر و محبت میں کہیں لے چل مجھے!
قیدِ شورش گاہِ ہستی سے چھڑا لے تو مجھے
سرزمینِ نور و نکہت میں بلا لے تو مجھے

افضال شاہ آبادی

نقشِ الفت

کریں یاد تم کو کہ دل سے بھلا دیں
ہم آخر غمِ عشق کو کیا بنا دیں

ڈبو کر غموں کے سمندر میں خود کو
محبت کی کشتی کنارے لگا دیں

خرابات عالم کی ویرانیوں سے
اگر ہو سکے زندگی کو صدا دیں

عجب کیا کہ بجلی گرے میرے دل پر
مرے دردِ فرقت پہ وہ مسکرا دیں

مٹا دیں وہ سارے زمانے کو لیکن
یہ ممکن نہیں نقشِ الفت مٹا دیں

یہ پردے بھی اے دوست کیوں درمیاں ہوں
زماں و مکاں کے حجابات اٹھا دیں

حیاتِ محبت کی تکمیل کر کے
حدیں موت اور زندگی کی ملا دیں

نگاہیں مری چھیڑنے پر جو آئیں
رلا کر ہنسا دیں ہنسا کر رلا دیں

محبت سے مخمور کر کے دلوں کو
ان اجڑی ہوئی بستیوں کو بسا دیں

جہاں آگ برسے وہاں پھول برسیں
جہاں کے جہنم کو جنت بنا دیں

سرِ منزلِ دوست اہلِ محبت
مقدر کو بھی ٹھوکروں سے اڑا دیں

وہ نقشِ وفا ہوں جسے وہ نگاہیں
گھٹا دیں بڑھا دیں بنا دیں مٹا دیں

محبت عبادت بھی جرم و خطا بھی
وہ کس کو سزا دیں وہ کس کو جزا دیں

بناتے ہیں ناحق وہ کیوں شیخ و واعظ
جو ممکن ہو انساں کو انساں بنا دیں

ترے عشق کے درد سے مسکرا کر
شبستانِ غم کو نہ کیوں جگمگا دیں
کہانی کہیں شامِ فرقت کی نجمہ
ستاروں کو کچھ آپ بیتی سنا دیں

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔ اے

اخوند ظفر سجاد غلزئی

جنگ؟

قدرت کے ہر فعل میں دو رُخ پائے جاتے ہیں۔ دن کے بعد رات اور بہار کے بعد خزاں کی آمد لازمی اور اٹل ہے۔ اگر ان تغیرات پہ قدرے تدبر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دن رات کی بنیاد اور بہار خزاں کا پیش خیمہ ہے ——— زندگی ہی موت کا باعث بن جاتی ہے اور موت وجہ حیات ——— الغرض کسی چیز کو بھی لے لیجئے اس میں دو پہلو، بظاہر متضاد لیکن درحقیقت لازم و ملزوم، نظر آئیں گے۔

ایک بھوکا بھکاری ہزار دقت چند روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ چند ٹکڑے اس کی ہمیشہ کی بھوک مٹانے کو کافی ہیں؟ وقتی طور پہ اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد وہ ایک اور "بھوک" مول نہیں لے لیتا جسے مٹانے کے لئے اُسے دوبارہ کوشش کرنا پڑے گی؟ - تو بھوکا ہوئے بغیر انسان سیر نہیں ہو سکتا اور سیر ہوئے بغیر بھوکا ——— بالکل یہی مثال جنگ اور امن کی ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو جنگ کو امن سوز اور انسانیت کا قاتل بتاتے ہیں۔ اگر وہ ذرا غور سے بھی کام لیتے تو اُن پر واضح ہو جاتا کہ جنگ، امن کی بنیاد اور امن جنگ کا سبب ہے۔ امن اگر انسانی فطرت کا ایک جزو ہے تو جنگ دوسرا اور امن پسندی اگر شرافت کا معیار ہے۔ تو جنگجو ہونا شجاعت کی کسوٹی ———

تاریخ کے ہزارہا اوراق اُلٹ جائیے۔ جہاں کبھی بغاوت ہوئی یا کسی بیرونی دشمن نے حملہ کیا تو جنگ ہی ایک ایسا حربہ تھا جس کے ذریعہ ان کا مقابلہ کیا گیا۔ بنا بریں جنگ امن کی محافظ اور مظلوموں کی مددگار ہے ———

وہ کیا چیز تھی جس نے امریکہ کو آزادی دلائی ———؟ وہ کون ہتھیار تھا جس نے فرانس کو سرمایہ داروں کے پنجے سے چھڑایا؟ اور کس شے کے بل بوتے پر چین اور روس نے اب تک اپنی ہستی کو برقرار رکھا؟ ——— جنگ کے شعلوں میں آزادی کے نور کی جھلک ہے۔ توپوں کی گرج میں شجاعت کے نعرے پوشیدہ ہیں اور تڑپتے ہوئے لاشوں پر قومیت کی دیواریں استوار کی جاتی ہیں ———

کون کہتا ہے کہ وہ کونین بُری ہے جو ملیریا سے چھڑا دے؟ کس کا دعویٰ ہے کہ وہ جراحی مضر ہو جو گندے مواد کو نکال پھینکے؟ اور مرہم کی وہ جلن کسے ناگوار گذرتی ہے جس کا نتیجہ زخم کا اندمال ہو؟ ——— تو جنگ کی ان سختیوں کو بُرا بھلا کہنا کہاں کا انصاف ہے جس کا مقصد ظلم کا انسداد، صداقت کا احیا اور باطل کی تباہی ہو ———

ہمیں اقرار ہے کہ جنگ کے نتیجے میں سینکڑوں عمارتیں مٹی کا ڈھیر، ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن یہ قانون قدرت ہے کہ ہر تکلیف کے بعد راحت اور ہر راحت کے بعد مصیبت آتی ہے ——— اگر پیاس تکلیف دہ نہ ہوتی تو پانی کو نعمت کا خطاب نہ دیا جاتا۔ اگر بھوک کی شدت بے تاب نہ کر دیتی تو اناج کی توقیر دلوں سے اٹھ جاتی۔ اور اگر جنگ کے شدائد بظاہر تباہ کن نہ ہوتے تو امن کی اہمیت ضائع ہو جاتی ———

کہہ دو کہ فینائل کا استعمال بُرا، تالابوں میں تیل ڈالنا فضول کہ لاتعداد کیڑے مارے جاتے ہیں۔ گھروں میں زینے جلانا غلطی کہ ناحق پتنگوں کا خون ہوتا ہے۔ اور دودھ کو اُبالنا حماقت کہ یہ ہزاروں جراثیم کی تباہی کا موجب ہوگا۔ وگرنہ جنگ کو بُرا کہنے سے کیا حاصل ———؟

اگر لوہے کو کاٹنے کے لئے لوہا درکار ہے تو کیا وجہ ہے کہ ظلم کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا جائے ——— توپ و تفنگ کا مقابلہ گولوں اور بموں ہی سے کیا جا سکتا ہے اور ظلم کا قلع قمع سختی سے۔

جنگ کرنا فطری جذبہ ہے۔ ایک کمزور مرغی بھی اپنے بچوں کو بچانے کے لئے باز کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اور ایک ناسمجھ بچہ کسی کو اپنا کھلونا چراتے دیکھ کر اُسے سزا دینے پر تُل جاتا ہے لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ یہ مرغی کی اکڑ اور بچے کی جرأت کیوں؟ کیا ان کا مقصد اپنا امن اور چین کھو دینا ہوتا ہے؟ اگر نہیں تو ہماری جنگیں امن کی تباہی کا موجب کیونکر بن سکتی ہیں؟

پس جنگ کو امن اور انسانیت کا دشمن قرار دینا غلطی ہے ——— غلط استعمال تو ہر چیز کا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ بھلا گرمیوں میں اُونی شال اوڑھنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ خنجر کا کام ہی کاٹنا ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اسے دشمن کے گلے پر چلائیں یا اپنی گردنوں پر۔ تو بلا سبب کی لڑائی ویسی ہی مضرت رساں ہوگی جیسے چاقو کو قلم کی بجائے اپنی انگلی "بنانے" کے استعمال میں لانا ———

انقلاب

شہر سے باہر کی ویرانی کا عالم - الاماں — جس پہ اکثر کلبۂ احزاں کا ہوتا ہے گماں
ان مزاروں سے اٹھا ہے ہلکا ہلکا سا دھواں — رفتہ رفتہ رُخ ہوا ہے اس کا سوئے آسماں
لوگ کہتے ہیں کہ مزدوروں کی آبادی ہے یہ — قوم کے سینے پہ ناسوروں کی آبادی ہے یہ
اس جگہ رہتے ہیں وہ نالاں ہیں جن سے اہلِ زر — جن کی خاطر بند ہیں ان کے سدا دیوار و در
اس جگہ رہتے ہیں وہ بیگانۂ جاہ و حشم — تا بہ ایں دم جو رہے قدرت سے محرومِ کرم
یہ وہی ہیں، فاقہ مستی میں جو کرتے ہیں بسر — فارغ البالی کا کم ہوتا ہے ان کے ہاں گزر
یہ وہی ہیں، اپنی ہر حالت میں جو مسرور ہیں — فقر و ناداری میں اور عسرت میں جو مسرور ہیں
یہ چٹانیں ہیں، کہ جن پر برق و باراں بے اثر — ان کے آگے رہ گئی موجِ بلا سر پیٹ کر
یہ چٹانیں ہیں، کہ جن پر ثبت ہے مہرِ دوام — ہے ازل سے ہی فنا نا آشنا ان کا قیام
انقلاباتِ زمانہ ان کی خاطر بے ضرر — ان کو طوفانِ حوادث سے نہیں خوف و خطر

ان پہ بیداد و ستم کی تیغ چلتی ہی رہی
وقت کی آغوش میں یہ قوم پلتی ہی رہی

(۲)

کون سا کیا جانے قدرت لے رہی ہے انتقام — ہونے والا ہے تہ و بالا زمانے کا نظام
اس کی "آہِ سرد" کی "شعلہ فشانی" کچھ نہ پوچھ — بے لبسی کی، بے کسی کی، زندگانی کچھ نہ پوچھ
اس کے دامانِ جنوں کی چاک دامانی نہ پوچھ — اس کی دنیائے سکوں کی خشک سامانی نہ پوچھ
مجھ سے اس صحرا کے ذرّوں کی درخشانی نہ پوچھ — اس شرارِ طور کی کچھ برق سامانی نہ پوچھ
پھونک سکتا ہے یہ آہِ سرد سے کون و مکاں — اپنی آہِ سرد میں رکھتا ہے ایسی گرمیاں
قصرِ سرمایہ پرستی پر گریں گی بجلیاں — ایک جنبش سے بدل دے گا زمین و آسماں

"ہستیٔ مزدور" پھر رنگِ دگر لانے کو ہے
اس جہانِ رنگ و بو میں "انقلاب" آنے کو ہے

راز یوسفی

غیر معروف جرنلسٹ کے قلم سے

طرزِ نو کا افسانہ
جدید ترین ٹیکنک کے ساتھ

"پیارے کوئی کہانی سناؤ"

کہانی ختم ہو چکی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور شام کا سماں۔ ساون کی گھٹائیں اُمڈ رہی تھیں۔ افسانہ نگار نے مسودہ کو میز کی دراز میں رکھا اور "بہار توبہ شکن مے رسد چہ چارہ کنم" گنگناتا ہوا ابھی اُٹھنے کو تھا کہ بیوی نے کہا "پیارے کوئی کہانی سناؤ۔"

خاوند کے تھکے ہوئے دماغ نے یارانِ سرپل کی پُر لطف صحبت کا جو تصوّر باندھ رکھا تھا۔ یکایک اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس نے پہلے کھڑکی میں سے آسمان کی طرف نظر دوڑائی جہاں سیاہ بادلوں کے ٹکڑے مختلف شکلیں بنائے ایک دوسرے پر چھا رہے تھے۔ پھر اس نے بیوی کی طرف دیکھا جو والہانہ انداز سے چارپائی پر لیٹے ہوئے تکیہ کو سینے پر رکھے دونوں بازوؤں سے دبا رہی تھی۔

"کیسی کہانی؟" اس کے سوال میں احتجاج بھی تھا اور استغفار بھی وہ ازراہِ معذرت کچھ اور کہنے کو تھا۔ کہ بیوی نے جواب دیا۔

"مجھے سیدھی سادھی کہانی سناؤ۔" لیکن جانم (وہ کبھی کبھی اسے جانم کہہ کر پکارتا تھا) محبت کی کہانیاں تو بہت طویل ہوتی ہیں اور پُر پیچ۔

بیوی نے تکیہ کو سینے سے اٹھا کر پہلو میں رکھ لیا اور کروٹ بدلتے ہوئے کہا:۔ "تم اسے سادہ بنا سکتے ہو۔ میں ان کہانیوں سے اُکتا گئی ہوں۔ جن میں زندگی کے مسائل پر بحث ہو۔ حُسن اور عشق کے جھگڑے ہوں۔ جن میں ناگوار شخصیتیں ہوں مثلاً مدعی یا رقیب خنجر اٹھائے ایک دوسرے کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ مجھے ایسے کردار بھی پسند نہیں جو جنسیات کی رَو میں بہ رہے ہوں۔ بات بات پر ڈاکٹر فریڈ ایڈلر اور جُونگ کے حوالے دیتے ہوں۔ اور ہاں میں ایسی کہانی بھی سننے کو تیار نہیں جسے تم رومانی مثلث یا مثلثی رومان کہا کرتے ہو۔ جس میں ایک عورت کی خاطر دو مرد سرد آہیں بھر رہے ہوں۔ یا دو عورتیں ایک مرد کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ رہی ہوں۔"

خاوند نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "کچھ اور؟"

بیوی نے تکیہ کو سینے سے اٹھا کر پہلو میں دباتے ہوئے تبسّم آمیز متانت سے کہا۔ "ہاں میرے قابل افسانہ نگار شوہر میرے سامنے بے وفا بیویوں اور ہوس کار مردوں کے قصے بھی نہ چھیڑیئے گا۔ مجھے ایسی کہانی سناؤ جس کا ہیرو اور ہیروئن تمہارے اپنے الفاظ میں قدرت کی گود میں پلے ہوں۔ ان کے سینوں میں انسانی جذبات موجزن ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے ملیں اور پھر یہ نہ ہو کہ وہ ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں جدا نہ کر سکے۔ ان کی شادی ہو۔ اور وہ ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے ہوئے جوانی اور بڑھاپے کی منزلیں طے کریں۔"

اب وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ تکیہ کو رانوں پر رکھا اور اس پر کہنیاں ٹیک کر اپنے دلکش اور شگفتہ چہرہ کو حنا دیدہ ہاتھوں کے فریم میں رکھ لیا۔

خاوند سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی نظریں بے اختیار آسمان کی طرف اٹھیں جہاں اب گھنگھور گھٹائیں زمین والوں کو پہلے نرم اور آہستہ اور پھر تیز اور تند لہجے میں متنبہ کر رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"لیکن ایسی کہانی کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے۔ اور ایک عمر میں ایک ناول لکھ رہا ہوں جو شاید تمہیں پسند آ جائے۔"

بیوی نے چہرے کو فریم پر سے اٹھاتے ہوئے کہا:۔ "خیر آج اس ناول کا دیباچہ ہی سہی"

خاوند:۔ "اچھا آپ بیتی ہو یا جگ بیتی۔"

بیوی:۔ "جو آپ چاہیں۔ لیکن اس میں کوئی اُلجھن نہ ہو۔"

خاوند نے دراز میں سے ایک پرانا مسودہ نکالا اور کرسی کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہیں کہانی میں کسی جگہ الجھاؤ محسوس ہو تو مجھے وہیں ٹوک دینا۔ میں نے اس مسودہ میں ایک ناول سے متعلق نوٹ لکھے ہیں۔ سوال یہ ہے۔ کہ کہانی کا آغاز کیا ہو۔ اب میں یہ تو کہنے سے رہا۔ کہ جناب والا ایک تھا مرد اور ایک تھی عورت وہ دونوں بڑے پیار سے رہتے تھے۔"

بیوی نے کہا:۔ "میں سمجھتی ہوں کہ کہانی میں کسی حد تک بناوٹ کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ بستر پر لیٹ گئی اور پھر سے تکیہ کو پہلو میں دبا کر اپنا رُخ خاوند کی طرف پھیرتے ہوئے آنکھیں بند کئے ہمہ تن گوش ہو گئی اور کہا۔ "ہاں پیارے پھر کیا ہوا۔" اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں پر دراز پلکیں ریشمی جھالر کی مانند نظر آتی تھیں۔

خاوند نے کہانی شروع کی۔

شہر کے بارونق محلوں کی پیچ در پیچ گلیوں میں گھومتے ہوئے وہ تھک کر چُور ہو گیا۔ کئی دن سے متواتر یہی حال تھا کہ وہ دن کا بیشتر حصّہ اسی دوڑ دھوپ میں صرف کر دیتا۔ لیکن اس کے حسب پسند کوئی مکان نہ ملا۔ انہیں ایک سستے اور علیحدہ مکان کی ضرورت تھی۔ بھرے محلے میں ایک اکیلے غریب نوجوان کے لئے مکان کی تلاش کوئی آسان بات نہیں۔ آخر فیصلہ ہوا۔ کہ وہ دونوں مل کر اس مہم کو سر کریں گے۔ وہ ایک دُور افتادہ نئی آبادی میں چلے گئے۔ جو بظاہر میونسپلٹی کی حدِ اقتدار سے باہر تھی۔ انہیں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ دو کمرے برآمدہ کے ایک گوشہ میں باورچی خانہ اور ایک کشادہ صحن جس میں ایک نلکا بھی تھا۔ انہوں نے اس کا نام رکھا محل سرا۔ اور اسے فوراً آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنہیں ایک دوست کے ہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ پورا ہونے کو تھا۔ وہ وہاں سے چُپ چاپ کھسک جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کا تانگہ چوک میں آ کر رُک گیا۔ جہاں اینٹوں کے انبار کوئلہ کی راکھ ریت اور سنگریزوں کے تودے دیکھ کر گھوڑے نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ ہیرو نے اپنی نازنین سے کہا:۔ "ملکۂ عالم۔ آپ یہیں تشریف رکھئے۔ بس گئے ہاتھوں اس سامان کو محل سرا تک پہنچا آؤں۔" یہ کہہ کر اس نے اسباب کی بوری پیٹھ پر لادی اور دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ واپسی پر انہوں نے تقسیم کار کے اصول کی پیروی میں اسباب اُٹھائے ایک جلوس کی صورت محل سرا کا رخ کیا۔ راستہ میں نازنین نے کہا۔ پیارے ایک بات کہوں ابھی ابھی چوک میں سے ایک چھکڑا گذرا ہے۔ جس پر اچار کے ڈبے لدے ہوئے تھے۔ کیا تم میرے لئے ایک ڈبہ نہیں لا سکتے۔ ہیرو نے یہ الفاظ سنتے ہی تیزی سے قدم اُٹھائے۔ اور اسباب کو محل سرا میں رکھ کر وہ چھکڑے کے پیچھے اس انداز سے دوڑا۔ جس طرح ایک سال پہلے وہ فٹ بال کے میدان میں اپنی ٹیم کے کیپٹن کی حیثیت سے دوڑا کرتا تھا۔

چھکڑے کے قریب آ کر اس نے رفتار نرم کر دی۔ اور نگرد نظر دوڑائی۔ موقع پا کر اس نے ڈبہ چھکڑے میں سے اٹھایا اور اتنی تیزی سے دوڑا گویا اس نے اپنی ٹیم کو شکست سے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ محل سرا کے دروازہ پر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لئے رُک گیا۔ پھر ایک ایسے رکن حکومت کی طرح اس نے محل سرا میں قدم رکھا گویا وہ ملکۂ معظمہ سے نائٹ کا خطاب حاصل کرنے کے لئے شاہی دربار میں داخل ہو رہا ہے۔ نازنین صحن میں ایک چٹائی بچھائے بیٹھی تھی۔ ہیرو نے ٹرنک میں سے ایک چاقو نکالا اور ڈبہ کو کھول کر اس نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا۔

"میرے دل کی ملکہ یہ ادنیٰ خادم ایک ناچیز تحفہ پیش کرنے کی محبت آمیز جسارت کرتا ہے۔" ملکہ نے نیم وا آنکھوں سے اس تحفہ کو شرفِ قبول بخشا اور اچار کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ تیل کے قطرے اس کے احمریں لبوں کے گوشوں میں جمع ہوئے پھر ایک دھار کی صورت نوکدار ٹھوڑی کے دونوں طرف زمین پر ٹپکنے لگے۔

[افسانہ نگار نے اس مرحلہ پر پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں بادلوں کی سیاہ چادر میں بجلی نقری نقش و نگار بنا رہی تھی۔ بیوی نے آنکھیں کھول دیں اور متبسم التجا کے ساتھ کہا۔ ذرا اپنی کرسی میرے قریب لے آؤ۔ بہت دلچسپ کہانی ہے۔ پیارے پھر کیا ہوا۔ خاوند نے کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کچھ کہا کہ بیوی نے ہاتھ کے اشارہ سے اسے روک دیا۔ اس کے آویزے مشکبار زلفوں کے حلقے میں بے طرح اُلجھ گئے تھے۔ جنہیں چھڑانے کے لئے اس کی رنگین اور لانبی اُنگلیاں مصروف تھیں۔ خاوند نے دل میں کہا ان آویزوں کے سرخ موتی کالے بالوں میں دمک رہے ہیں۔ جس طرح کالے بادلوں میں بجلی۔ وہ اپنی کرسی کو چارپائی کے قریب لے آیا۔ اور سلسلۂ داستان کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا:]

وہ اس محل سرا میں رہنے لگے۔ جس کی زینت ان کا پریم تھا۔ محض پریم۔ وہ دونوں سٹیج کے شیدائی تھے اور یہی چیز کالج زندگی میں انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ موسیقی اداکاری محبت اور شادی کے لئے ان کے والدین رضامند نہ تھے اور جب کالج کے یوم تاسیس کی سالانہ تقریب پر ان دونوں نے ملکہ" جھونپڑی میں محبت" کے ڈرامہ میں ڈوئٹ گائے اور ان کے ترانوں سے مرکزی ایوان کی دیواریں گونج اُٹھیں۔ تو کالج کے پرنسپل پروفیسروں طلبا، طالبات اور چپڑاسیوں کا اپنے اپنے حلقہ میں یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ قدرت نے انہیں ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے۔

کنسرٹ کے بعد انہوں نے شادی کر لی۔ اور بہت جلد اس کا خمیازہ اٹھا لیا۔ ہیرو کو یہ امید تھی کہ کسی ایمچر کلب میں نہیں تو کسی کالج کی فٹ بال ٹیم میں ایک ماہر کی حیثیت میں کام کرنے سے گذارہ کی سبیل نکل آئے گی۔ اور واقعتہً کچھ مدت تک یہی صورت رہی۔ لیکن فٹ بال کا موسم بارہ مہینے نہیں رہتا اور سماج ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ اسٹیج پر معزز گھرانوں کی لڑکیاں لڑکوں کے شانہ بشانہ کام کر سکیں۔ حالات بتدریج بد سے بدتر ہوتے گئے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اُنہیں ایک دوست کے ہاں پناہ لینا پڑی اور پھر وہ ایک نئی غیر مانوس نو آبادی میں سر چھپانے کو مجبور ہو گئے۔

اچار کے ڈبے کے لئے اسے چور بننا پڑا۔ جب اچار کا تیل اس کی بیوی کے لبوں سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ کہ تم روتی کیوں نہیں ؟ ہیروئن نے جواب دیا۔ آخر کیوں ؟ رونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم ذرا اس اچار کا مزا آزما لو تو۔ اس یک منزلہ مکان میں جسے وہ فرط محبت سے محل سرا کہتے تھے۔ موسیقی کا یہ انتظام تھا کہ صبح سے شام تک مکھیوں اور شام سے صبح تک مچھروں کی بھنبھناہٹ رہتی اور ہفتہ میں ایک دو بار کپڑے دھونے کی آواز اس میں شامل ہو جاتی۔

[یکایک بجلی کی کڑک سے کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بیوی چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ ہوا میں ہر لحظہ خنکی پیدا ہو رہی تھی "کیسی خوشگوار ہوا ہے آج"۔ بیوی نے کہا اور قمیض اتارنے میں مصروف ہو گئی۔ افسانہ نگار خاوند نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل ان کے مکان کی چھت کے قریب تک آ گئے تھے۔ آسمان سے بارش کا ایک طوفان زمین پر اُمڈ پڑا۔ بیوی نے لیٹتے ہوئے تکیہ کو اپنے سینے پر رکھ لیا اور کہا پیارے ذرا اور قریب آ جاؤ۔

خاوند اپنے پاؤں چارپائی پر رکھتے ہوئے کچھ کہنے کو تھا۔ کہ بیوی نے زیر لب کہا بہت ہی پُر لطف ہے۔ تمہاری کہانی پیارے پھر کیا ہوا]

کہانی بہت لمبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان پر مصیبت کی گھٹا چھا گئی۔ کانسی کی جگہ پیتل اور پیتل کی بجائے مٹی کے برتن۔ پُرانے پاجاموں کے غلاف بن گئے اور بچھونے کی چادریں لحاف کا کام دینے لگیں۔ کپڑے دھونے اور ہاتھ منہ صاف کرنے کے صابن میں کوئی فرق نہ رہا۔ جس تیل سے سالن پکاتے وہی بالوں پر لگاتے۔ ایک مرتبہ ہیرو نے کہا۔ بلیڈ بہت مہنگے ہو رہے ہیں۔ اگر میں فرانسیسی طرز کی داڑھی رکھ لوں۔ تو تمہارے اس تل کی قسم جس نے تمہارے رخسار میں ایک قاتلانہ دلکشی پیدا کر رکھی ہے۔ لوگ مجھے ایک پروفیسر سمجھیں

"یا حجام" بیوی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ وضع داری نے انہیں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی اجازت نہ دی۔ برسات کا موسم تھا۔ شام کا وقت۔ وہ بھوک مٹانے کی غرض سے بار بار گانے رہے۔ تاآنکہ ہیروئن تھک کر سو گئی۔

ہیرو چپکے سے مکان سے باہر نکلا۔ موسلا دھار بارش پڑ رہی تھی۔ دور دور تک کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ محلہ کی دلدل کو عبور کرنے کے بعد وہ بڑی سڑک پر پہنچا جو شہر کو جاتی تھی وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بارش قدرے تھمی۔ اس نے بازار کی طرف رُخ کیا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ رات کی تاریکی میں وہ اپنے کسی دوست کے گھر بلائے گا۔ دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست والا مصرع دہرا کر اس نے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا تھا۔ صدر بازار کے چوک میں بھیڑ تھی۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا گزرنے والے تانگے چھکڑے اور موٹر کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹریفک رُک گیا۔ اس کے آگے ڈیری فارم کی موٹر تھی۔ دودھ کے خوش کن تصور سے اسے چائے پیسٹری مکھن توس کا خیال آ گیا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سامنے والی پیٹری سے متصل ایک موٹروان پر اس کی نظر پڑی۔ جس پر ڈبل روٹیاں لدی ہوئی تھیں۔ وہ موٹر کاروں اور لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا وہاں پہنچا۔ چوک کے وسط میں کنسٹیبل نے اشارہ دیا۔ موٹر کاریں حرکت میں آئیں۔ ہیرو نے موٹروان کے عقبی تختے پر کھڑے ہو کر اندر ہاتھ ڈالا۔ اور ایک پونڈ والی ڈبل روٹی اٹھا کر تختے سے اُتر رہی تھا۔ کہ "کھڑ بدمعاش کیا کرتا ہے"۔ کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے اور اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ وہ مضبوط بازوؤں کی گرفت میں ہے۔ ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا کر وہ اُلٹے پاؤں دوڑا۔ "چور چور لیجیو پکڑ لو جانے نہ پائے۔ بدمعاش لفنگا اٹھائی گیر" کے الفاظ اور پھر پولیس کی بلند بانگ سیٹیوں کی مسلسل آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ اس نے دور سے دیکھا۔ کہ اس کا ایک دوست فٹ بال کا کھلاڑی ہم سبق سامنے سے آ رہا تھا۔ "آخر یہ کیا ماجرا ہے۔" دوست نے پوچھا۔ ہیرو نے کہا "آگے چل کر بتاؤں گا ریل کے پُل کے پار اور یہ لو فٹ بال وہاں پہنچ جاؤ۔" یہ کہتے ہی اس نے ڈبل روٹی اپنے دوست کی طرف اس انداز سے پھینکی گویا وہ آخری انٹر یونیورسٹی مقابلہ میں ہراول میں کھیلنے والے ساتھی کی طرف گیند منتقل کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ خود چھوٹے بازار میں گھس گیا۔ نتیجہ یہ کہ پیچھا کرنے والوں کی دو جماعتیں بن گئیں۔ بیشتر لوگ تو اس کے دوست کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور وہ خود تھوڑے سے لوگوں کو بھول بھلیوں میں چھوڑ کر صاف نکل گیا۔

[بارش کی بوچھاڑ چارپائی پر پڑی اور بیوی گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی بند کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "تو گویا آپ کا ہیرو ایک چور ہے۔" افسانہ نگار نے کہا۔ "میری جان محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ واقعی کیسا سہاؤنا موسم ہے۔" بیوی کی ساڑھی بارش سے بھیگ کر اس کے مرمریں بدن سے چمٹ گئی تھی۔ وہ چارپائی سے اُٹھی اور ایک باریک سے دوپٹے میں لپٹ کر اپنی جگہ پر آ گئی۔ اس نے تکیہ سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔ کتنی کہانی باقی ہے۔ ہیرو ڈبل روٹی اپنے ساتھ لے آیا۔ پھر کیا ہوا]

اس ڈبل روٹی نے ان کی قسمت کو پلٹ دیا۔ پُل کے پار اس

کے دوست نے کہا "آخر تمہاری اس ہیئتِ کذائی کا مطلب؟"

مطلب یہ کہ محلہ کے دوستوں نے شرط لگائی تھی کہ ہم میں سے کون سہ پہر کی چائے کے لئے مفت ڈبل روٹی لاتا ہے۔ اس کی تلاش میں دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ وہ میرے انتظار میں ہوں گے۔ مزے سے گزر رہی ہے۔ زندگی کا لطف آرہا ہے۔"

"لیکن تم رہتے کہاں ہو۔ تمہارے کپڑوں کی حالت۔ اور یہ داڑھی!"

"نئی آبادی کے عین وسط میں ایک سر بفلک عمارت ہے۔ محل سرا کے سنہری حروف دور سے نظر آتے ہیں۔ گھر والوں سے صلح ہو گئی۔ یہی مناسب سمجھا کہ چند روز سماج سے علیحدہ تنہائی میں رہیں۔ اور کیوں یہ فرانسیسی داڑھی کیسی رہی اور دوست سچی بات یہ کہ بھیس بدلنے اور دوستوں کی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے یہ کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"لعنت ہے تم پر عجیب آدمی ہو۔ میں کئی ہفتوں سے تمہاری تلاش میں ہوں۔ شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ تھیٹر، سینما، نمائش اور کلب کوئی جگہ ایسا نہیں جہاں تمہیں ڈھونڈا نہ ہو۔ اخباروں میں گمشدگی کے اشتہار دیئے اخبار نہیں پڑھتے ہو آجکل!"

"گھر میں ریڈیو لگا رکھا ہے۔ اس سے خبریں سن لیتا ہوں۔ دوست بات یہ ہے کہ اب یہاں سے جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔ باہر جانے کی تیاریوں میں ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ تم سے خدا سمجھے۔ کالج والے تمہاری جان کو رو رہے ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں تو سنو۔ کالج کی منتظم کمیٹی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ امپورٹیڈ ڈرامیٹکل کلب کو مستقل کر دیا جائے۔ اور ظالم اس کے لئے تم سے بہتر ڈرامہ نگار اور ایکٹر کون ملے گا۔"

[روشن دانوں سے بارش کی بوچھاڑ اندر پڑی اور کہانی کا سلسلہ رُک گیا۔ افسانہ نگار نے روشندان بند کر دیئے۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکی اور ایک لمحہ کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر بیوی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "تمہارا ہیرو چور ہی نہیں بلکہ جھوٹا بھی ہے۔ اچھا پھر کیا ہوا۔ یہی نا کہ ان کی کایا پلٹ گئی۔ ہیرو اور ہیروئن امن چین سے رہنے لگے۔ اس کے بعد تمہارے ہیرو کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

افسانہ نگار خاوند نے مسودہ کو میز پر رکھ دیا اور کرسی سے چارپائی پر آ گیا۔ اور بیوی کے بالوں کو انگلیوں سے شانہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ اب وہ ڈرامے اور افسانے لکھتا ہے۔ ایکٹری کرتا ہے۔ کبھی کبھی سہانے موسم میں جب اس کے دوستوں کو اس کا انتظار حد سے گزر جاتا ہے تو بیوی اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر یہ فرمائش کر دیتی ہے کہ پیارے کوئی کہانی تو سناؤ۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ ایسی التجائے جمیل کو رد کرنے کی جرأت اسے کیونکر ہو سکتی ہے۔ خیر۔ بہت ہی کیف افزا موسم ہے آج پیاری......]

غزل

جلو میں کاروانِ آرزو لیکر شباب آیا
شباب آیا، جہانِ زندگی میں انقلاب آیا

اُٹھ اے ساقی! دُعا کا آسمانوں سے جواب آیا
وہ چمکیں بجلیاں، جھومی فضا گھر کر سحاب آیا

دلِ ویراں میں اپنے کر رہے تھے جستجو جس کی
بہار آتے ہی گلشن میں وہ جلوہ بے نقاب آیا

پھر اُسکی یاد نے سینے میں اک طوفاں اُٹھایا ہے
ہوئی مدت مجھے جسکا خیال آیا نہ خواب آیا

شبستانِ فلک میں اُڑ رہا ہے رنگ تاروں کا
لبِ بام آئے تم یا آسماں پر ماہتاب آیا

تجھے آزاد! خواہش تھی بہت خط کا جواب آئے
اُنہیں انکار ہے آنے سے، لے خط کا جواب آیا

جگن ناتھ آزاد

عبدالحلیم انصاری

مونٹے سوری سسٹم

کمسن بچوں کی تعلیم کا جدید ترین طریقہ مادام میریا مونٹے سوری کا رہین منت ہے۔ اور آپ کے مقرر کردہ لائحہ عمل کی نمایاں خوبی اس کی سائنٹفک نوعیت ہے۔ یورپ اور امریکہ کے ماہرین تعلیم نے سالہا سال کے تجربات کی بنا پر متفقہ حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے کہ بچوں کی جسمانی دماغی اور اخلاقی تربیت کے لئے اس سے بہتر طریقہ ہنوز معلوم نہیں۔ مادام میریا مونٹے سوری اٹلی کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ۱۸۹۴ء میں دارالعلوم رومہ سے علم طب میں اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کی اور حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی تعلیم کے مسئلہ میں آپ کی گہری دلچسپی کی محرک یہی طبی تربیت تھی۔ جس کی بدولت آپ کو بچوں کی ذہنی زندگی کے باقاعدہ مطالعہ کا موقع ملا۔ فارغ التحصیل ہونے پر یونیورسٹی میڈیکل کالج اور ہسپتال میں دماغی امراض کی تشخیص و علاج کا شعبہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ اس زمانہ کے پاگل خانوں میں کمسن جوان اور عمر رسیدہ بیماروں کو یکجا رکھنے کا قبیح دستور تھا جس کی اصلاح آپ کا پہلا کام تھا۔ آپ نے بیمار بچوں کے ذہنی توازن کو از سر نو قائم کرنے کے لئے مختلف قسم کے تجربے کئے۔ اور آخر ایک ایسا طریقہ معلوم کیا۔ جو بہت کامیاب رہا۔ اس سے پیشتر مہذب دنیا کا یہ خیال تھا۔ کہ ذہنی اعتبار سے ضعیف یا فاتر العقل بچوں کا علاج ڈاکٹر اور صرف ڈاکٹر کے سپرد ہونا چاہیئے۔ اس میں ماہر تعلیم کو کوئی دخل نہیں۔ ڈاکٹر مونٹے سوری نے اس خیال کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ اور اب ہر ترقی یافتہ ملک میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وہ انقلاب آفریں طریقہ جاری ہے۔ جو مونٹے سوری سسٹم کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ جنگ سے پیشتر آپ نے ہندوستان میں آکر مدراس میں اس جدید طریق تعلیم کا مرکز قائم کیا۔

اس طریق کا مرکزی اصول

اس طریقہ کے دائرہ اثر میں صرف ایسے بچے آسکتے ہیں جن کی عمر ۲½ سال سے لیکر ۶ سال تک ہو۔ اس طریقہ سے ایسے حیرت انگیز نتائج مترتب ہوئے۔ کہ یہ بہت جلد یورپ اور امریکہ کے معلمین کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اور امریکہ کے سربرآوردہ رسائل "میک لیور میگزین" ورلڈز ورک اور انگلستان کے علمی جریدہ "ایجوکیشنل ٹائمز" اور روزنامہ لنڈن ٹائمز نے اس جدید طریقہ کو مقبول عام بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ طریق اس اصول پر مبنی ہے کہ بچے کی ذہنی زندگی میں ڈھائی سال سے لیکر چھ سال تک مختلف مراحل آتے ہیں جنہیں کامیابی سے عبور کرنے کے لئے بچے کے لئے مختلف قسم کے ماحول کی ضرورت ہے۔

بچے کے دماغی قویٰ کو بروئے کار لانے کے لئے یہ زمانہ نہایت اہم اور موزوں ہے۔ ۲½ سال سے لیکر ۶ سال تک بچہ گرد و پیش کے حالات سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ اور اسی عمر کے تاثرات اس کی آئندہ ذہنی تعمیر کا سنگِ بنیاد بن جاتے ہیں۔ زندگی کے فطری اشتیاق سے اس کے حواس خمسہ میں ایک زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کو غور سے دیکھتا اور اس کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ تجسس اور نقد و نظر کے اس دور میں بچے کی جسمانی اور ذہنی زندگی کو مرتب بنانا معلم کا فرض اولین ہے اور اس فرض سے بوجوہ احسن عہدہ برآ ہونے کے لئے ڈاکٹر مونٹے سوری نے خاص قسم کے ساز و سامان کا اہتمام کیا ہے۔

سکول کو تفریح گاہ بناؤ

ان کی رائے عالیہ میں مدرسہ بچے کے لئے بہترین تفریح گاہ ہونی چاہیئے۔ ہوادار روشن کشادہ کمرے آرام دہ نشستیں چھوٹے چھوٹے خوشنما میز جسے بچہ جہاں چاہے خود اٹھا کر لے جائے۔ مونٹے سوری سسٹم میں لکڑی کے ان بھدے ڈسکوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں جن پر مادام موصوفہ کے الفاظ میں بچے اس طرح جم کر بیٹھتے ہیں۔ گویا تیتریوں کے پروں کو پن لگا کر انہیں بے حس حرکت کر دیا گیا ہے۔ ہر بچے کے لئے میز اور سٹول علیحدہ ہونا چاہیئے۔ کمرے کا فرش دیواریں اور چھت شوخ رنگوں کے نقش و نگار سے مزین ہوں۔ اور پردے سفید براق شیشے اور چینی کی نازک اور باصرہ نواز اشیاء مثلاً گلدان ہوں۔ مدرسہ پورے معنوں میں ایک دلفریب اور بصیرت افروز چمنستان بن جائے اس میں اس درجہ جاذبیت اور دلچسپی کا سامان مہیا ہو کہ کمسن بچے اسے قید خانہ سمجھنے کی بجائے تفریح و تفنن کا وسیلہ شمار کریں۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر مونٹے سوری نے اس نظریہ کے ذریعہ موجودہ اور آئندہ پود پر کسقدر احسان کیا ہے ہم میں سے جن کو مسجد کے ملاں یا پاٹھشالہ کے پنڈت یا میانجی مدرس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا ہے اور جن کی پشت کو

کوڑوں کی ضربوں سے مسطر بنانے کے بعد لاتوں اور گھونسوں سے اس پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ ان کے لئے ایام طفلی کی یاد کس درجہ کرب آلود ہے۔ اور اس کے برعکس ان بچوں کے دلوں میں عہد طفولیت کی یاد کتنی خوش آیند ہوگی جو جدید طریقۂ تعلیم کے ماتحت تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

دوسرا اصول

درس گاہ میں ننھی ننھی خوشنما چیزیں رکھنے اور سفید پردے لٹکانے کا اثر بہت جلد رونما ہو جاتا ہے۔ یہ اہتمام بچوں کے حساس دماغ میں نہ صرف جمالیاتی احساس کا محرک ہے۔ بلکہ وہ نازک اور خوبصورت اشیاء کو قرینے سے رکھنے کا سلیقہ خود بخود سیکھ جاتے ہیں۔ سفید پردے پہ ذرا سا داغ ان کے لئے چیلنج کا حکم رکھتا ہے۔ ان میں صاف ستھرا رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اخلاقی زندگی پر اس ابتدائی رجحان کا نتیجہ ظاہر ہے۔ بچوں میں اپنے جیون کو پاکیزہ اور بے لوث رکھنے کا خیال جاگزیں ہو جاتا ہے۔ بھلا ان کی زبان پر کوئی غیر شستہ یا نا ملائم خیال کیونکر آ سکتا ہے۔ وہ ایسی صحبت سے کنارہ کش رہیں گے جس نا ہمواری یا کثافت کا شائبہ ہو۔ وہ سچ بولیں گے اس لئے نہیں کہ فرمانِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ سچائی خوبصورتی میں داخل ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو بچہ ایسے ماحول میں رہے گا اس میں خود داری اور خودی کا ایک زبردست احساس پیدا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر مونٹے سوری کے طریقہ تربیت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ بچہ خود اپنا معلم ہے۔ کوئی شخص دوسرے کو تعلیم دینے کا اہل نہیں۔ استاد کا کام ہے کہ بچہ کے گرد و پیش سازگار حالات پیدا کر دے۔ فطرت خود بخود طبعی اور ذہنی نشو و ارتقا کے ذریعہ بچہ کی رہنما بن جائے گی۔ یہ کہنے کے بعد ڈاکٹر موصوفہ کے طریقہ کا تیسرا اصول کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

مدرسہ کی مرکزی شخصیت بچہ ہے

متذکرہ بالا اصول کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ دار العلوم کی مرکزی شخصیت معلم نہیں بلکہ متعلم ہے۔ مونٹے سوری سسٹم کے ماتحت زیر تربیت طلبا اور طالبات کے لئے عمر کے مطابق مختلف قسم کا ساز و سامان کمرے میں رکھ کر استاد کے زیر نگرانی بچوں کو اس میں چھوڑ دیا جاتا ہے بجائے اس کے کہ استاد بچوں پر سوالات کی بوچھاڑ کرے۔ بچے استاد پر جرح کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ استاد ایسے انداز سے جواب دیتا ہے کہ بچوں کی دلچسپی بڑھتی جائے اور ان کے مشاہدے میں بتدریج اضافہ ہوتا جائے۔ جدید تعلیمی نظام میں باقاعدہ درس نہیں دیئے جاتے۔ حواس خمسہ کو بروئے کار لا کر بچہ تربیت حاصل کرتا ہے۔ کھیل تماشا اور کھیل کود کے میدان میں بنیادی مقصد کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ کہ طلبا اور طالبات کے جسمانی اور ذہنی قوا کی متناسب تربیت ہو اور ان میں انضباطِ نفس اور خود اعتمادی کا مادہ پیدا ہو۔ اس جدید طریق میں ہر بچے کی جداگانہ تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کمرے میں موزوں ماحول کے علاوہ ڈاکٹر موصوفہ کے وضع کردہ "کھلونے" رکھے جاتے ہیں۔ جن کی ایجاد اور حیرت افزا کامیابی کے لئے ڈاکٹر مونٹے سوری کو عالمگیر خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

تعلیم و تربیت کی مختلف منازل

ان سائنٹفک کھلونوں کا مصرف بچوں کے حواس کی تربیت ہے۔ سب سے پہلے چھونے کی طاقت کو ابھارا جاتا ہے۔ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان سے مختلف اشیا میں بناوٹ، وزن اور حجم کے اعتبار سے فرق معلوم کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس طرح ان کی قوتِ ممیزہ کی تدریجی نشو و ارتقا کے لئے ایک مسلسل وسیلہ مہیا ہو جاتا ہے۔ دوسری منزل پر چھونے اور دیکھنے کی طاقتوں کو باہم مربوط کرنے کا انتظام ہے۔ پھر بچے مختلف حروف کی شکلیں پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ تو انہیں انہی شکلوں کو کاغذ پر منتقل کرنے کا ڈھنگ بتایا جاتا ہے۔ انگلیوں اور ہاتھوں سے کام لینے کی عادت تو انہیں شروع سے ہوتی ہے۔ لہذا مختلف شکلوں کو کاغذ پر اتارنا ان کے لئے اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ پانچ سال کا بچہ چھ ہفتوں کے اندر بے تکان لکھ سکتا ہے۔

ہر انقلاب انگیز تحریک کی طرح ڈاکٹر مونٹے سوری کے جدید طریقِ تعلیم کو بھی پہلے علانیہ و متصل مخالفت پھر تضحیک اور بالآخر کامیابی کی سہ گانہ منازل سے گذرنا پڑا۔ اس وقت تک ایک درجن زبانوں میں ان کی تصانیف کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اور تعلیمی و علمی رسائل میں ان کے وضع کردہ طریق پر تبصرے کئے جاتے ہیں۔

جناب شیر محمد اختر

جنازہ

آج مسعود کے ذہن کے ایوانوں میں ماتم ہو رہا تھا۔ ایک کہرام مچ گیا تھا۔ اس کے ایوان متزلزل ہو گئے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ ان محلات کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ اس کا جنازہ اس کے اپنے کندھے پر نکل رہا تھا۔ وہ خود اپنے آپ اپنا گلا گھونٹنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ وہ مجبور تھا۔ اس کی موت ہی اس کی زندگی تھی۔ اس کی رُوح کا مرجانا اس کو زندہ رکھ سکتا تھا۔ اس نے موت کو قبول کیا۔

مسعود ایک معمولی تعلیم اور اوسط درجے کے ایک گھرانے کا فرد تھا۔ اس کی بدقسمتی، وہ ادبی ذوق لیکر پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کی ابتدا خوب تھی۔ سولہ برس کی عمر کا تھا۔ میٹرک کے امتحان ختم ہوئے چوتھا دن تھا کہ وہ قتل کے مقدمے میں دھر لیا گیا۔ قتل کوٹھری، جیل خانے کی فضا، قیدیوں کی دردناک زندگی، اس نے چالیس دن وہاں رہ کر مختصر سی جیل میں بہت کچھ دیکھا اور سُنا۔ وہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے چالیس دن وہ راتوں جاگ کر استغفار پڑھا کیا۔ جب وہ آزاد ہوا تو اُسے باہر کی دنیا عجیب معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں تھیں۔ اُسے ہتھکڑی کے بغیر سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے ایک سنسنی سی محسوس ہوتی تھی۔

ہندوستان پر قدرت نے جتنی لعنتیں مسلط کی ہیں ان میں سے مقدمہ بازی ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ سونے سے بھری ہوئی تھیلیاں لیکر مقدمہ لڑنے نکلیں سار ہی تھیلیاں خالی ہو جائینگی۔ مسعود کے والدین کا سارا اندوختہ ختم ہو گیا تھا۔ مسعود کے ماموں نے ذرا سی عشق بازی کی تھی، محلے کی ایک لڑکی سے تعلقات بڑھائے تھے۔ راز فاش ہو گیا۔ جس کا نتیجہ فساد تھا۔ جس میں لڑکی کی طرف کا ایک بوڑھا آدمی مر گیا۔ کچھ زخمی ہوئے۔ جس کی وجہ سے مسعود بھی پکڑا گیا۔

جب مسعود آزاد ہوا۔ تو سب خاندان کی کفالت کا بوجھ اُسے ہی برداشت کرنا تھا۔ ہمت کہئے یا غیرت، اس نے جب سرکاری دفاتر کے سارے دروازے اپنے لئے بند پائے تو وہ صوبہ سرحد میں پولیس کا سپاہی بننے پر مجبور ہو گیا۔ وہ کمزور بدن کا تھا۔ خاموش، شرمیلا، نازک، ناز و نعمت کا پلا ہوا۔ اس کے لئے سپاہی کا کام ناممکن تھا۔ مگر پیٹ بری بلا ہے۔ وہ مجبور تھا۔ اسے زندہ رہنا تھا۔ اپنے چند اور بھائی بہنوں کو زندہ رکھنا تھا۔ اس کی کم عمری کے باوجود اُسے ملازم رکھ لیا گیا۔

خوش قسمتی سے عام سپاہیوں کی بجائے اُسے دفتر میں جگہ دے دی گئی۔ وہ کلرک بن گیا۔ یہ ترقی کا پہلا زینہ تھا۔ ایک سال میں ہی وہ ہیڈ کنسٹیبل ہو گیا۔ جرائم کی تفتیش کا اہم ریکارڈ اس کے سپرد تھا۔ وہ دن رات سنسنی خیز قتل اور ڈاکوؤں کی رپورٹیں پڑھا کرتا تھا۔ جن سے سارے صوبے میں ہلچل مچ جاتی۔ اس نے چار سالوں میں ہزار ہا رپورٹیں قتل اور ڈاکے کی مرتب کیں۔ وہ حیران ہوا کرتا تھا کہ صوبے بھر میں لوگوں کو اور کوئی کام نہیں تھا۔ انسانیت سوز جرائم جن کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ کرائے کے قاتل، ایک انسان کو مار ڈالنے کا معاوضہ صرف ایک سو روپیہ، پچاس پیشگی اور پچاس تختہ دار پر چڑھنے کے بعد ورثا کو دئے جاتے تھے۔ ننھے ننھے بچے صرف اس لئے اس دنیا سے مٹا دئے گئے تاکہ دوسرے خاندان کا انتقام لیا جا سکے۔ ایک معصوم انگریز بچی سے زنا بالجبر کیا گیا۔ اس لئے کہ افرنگی سے بدلہ چکایا جائے۔

اس نے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی لاشیں دیکھیں۔ وہ جوان مرد ڈاکو جن کے نام سے پولیس کانپتی تھی۔ جسے گرفتار کرنے کے لئے ایک پوری فوج گئی۔ گولیوں سے اس کا بدن چھلنی ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ خون سے لت پت بے گور و کفن لاش۔ تھانیدار سیاہ بوٹ سے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اُسے جس کے نام سے وہ کانپا کرتا تھا۔ اُس نے ڈاکو کی جوان بہن کو گالیاں دیں۔ وہ کیوں بھائی کا ماتم دیکھنے آگئی تھی۔ لاش بے جان پڑی بہن کی گالیاں برداشت کر رہی تھی۔ بہن خاموش تھی۔ بھائی کی طرح، اس کا سہارا لوٹ چکا تھا۔ وہ بھی تو مردہ تھی۔

اس نے جرائم کی دنیا کا خوب مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے ادبی ذوق کو ٹھوکر لگی تھی۔ جب وہ دفتر کے کام سے فارغ ہوتا تو اس کا تاریک کمرہ اُسے اپنے اندر پناہ دیتا۔ اس کی تاریکی اُسے کھا جاتی۔ وہ اسی میں خوش تھا۔ کتابیں اس کی رفیق ہوتیں۔ وہ پولیس کے افسروں کی بارکوں میں رہتا تھا۔ وہ بھی ایک افسر تھا۔ مگر سب سے نرالی قسم کا۔ جرائم کی روک تھام کرنے والے خود بھی تو مجرم ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ جرم کے خیال سے بھی ڈرتا تھا۔ شاید اس کا دل زیادہ حساس تھا۔ اس کے ساتھی جرم کرتے ہوئے نڈر تھے۔ ان کے ہاتھ میں قانون تھا۔ وہ اس کا استعمال کر سکتے تھے۔ اس لئے اُن کے جرائم اُسی قانون کی آڑ میں چھپ جاتے۔ مسعود کمزور دل تھا۔ وہ شباب کی مستیوں کے باوجود بوڑھا تھا۔ گرم خون رگوں میں دوڑتے ہوئے بھی اس کا دل بوڑھا ہو گیا۔ اس کے سامنے جوانی تھی۔ عہد شباب تھا۔ اسے کسی کا ڈر نہ تھا۔ وہ یہ چند برس، رومانی عہد، خوب گزار سکتا تھا۔

مگر اس حسین اور جاذب توجہ منظر کے پیچھے اسے ایک کثیف نظر آتا۔ جو مہینے کی آخری تاریخوں میں اس امید پر فاقے کرتا کہ دو تین تاریخ کو ڈاکئے ہرکارہ کی مانوس آواز سنائی دے گی۔

پہلی بار جب اُس نے تنخواہ لی تھی تو وہ سیدھا ڈاک خانے گیا۔ اس نے ایک معمولی سی رقم منی آرڈر کر دی۔ اس کے پاس چند روپے باقی تھے۔ مہینہ بھر کا خرچ۔ اُس نے اُن میں سے اپنے ننھے بھائی کے لئے ایک اُونی سویٹر خریدا اور ایک اونی ٹوپی۔ دونوں سرخ اون کے، دوکاندار زندہ دل تھا۔ اس نے سرخ رنگ پسند کرنے کی وجہ دریافت کی۔

"ننھا سفید رنگ کا ہے" وہ مسکرایا۔ اس کے لہجہ باعث فخر تھا اس کا بھائی سفید رنگ کا ہے۔" یہ سرخ سویٹر اور ٹوپی اُسے بھلی معلوم ہوگی۔" وہ رکا۔" وہ بالشویک بن جائیگا" مگر وہ دل میں ڈر بھی گیا۔ وہ تو خود پولیس کا ملازم تھا ـــــ وہ پولیس کا ملازم سہی مگر اس کا بھائی اقتصادی مسائل کو حل کر سکے گا۔

اس کے جذبات کا چشمہ اُبھرنے سے پہلے دب گیا تھا۔ اُسے زندگی سے صرف اسقدر دلچسپی تھی کہ وہ دن بھر کام کرتا۔ فارغ اوقات اپنی تاریک کوٹھری یا کسی معمولی لائبریری میں گزار دیتا۔ قتل، خون، ڈاکے ہر وقت وہ یہی باتیں پڑھتا، لکھتا اور سوچتا۔ ساری کائنات اس کے لئے قتل و خون اور لوٹ مار سے بھری پڑی تھی۔ نا انصافی دھڑا بندی سفارش رشوت اور نہ جانے کیا کیا برائیاں تھیں۔ جن کے نقشے ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔ سال بھر میں ہزار ہا بے گناہ انسانوں کے قتل کے مقدمات اسلئے داخل دفتر کر دیئے جاتے۔ کہ قاتل کی طاقت کے سامنے کسی کو آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

وہ اس زندگی سے گھبرا گیا۔ خاندان بھر میں وہ خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ نوجوانی میں سرکاری افسر، مگر وہ پریشان تھا۔ جب وہ دفتر میں کام کرنے بیٹھتا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے ارد گرد سب قاتل بیٹھے ہیں۔ ٹائپ کی ٹک ٹک اسے گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ معلوم ہوتی۔ اُسے فائلوں کے انبار انسانی چہرے دکھائی دیتے۔ مرجھائے ہوئے۔ جب وہ کسی فائل میں سرخ لیبل دیکھتا تو وہ محسوس کرتا کہ کسی مقتول کا خون بہہ رہا ہے۔ انسانی کھوپڑیاں اُسے گھور رہی ہیں۔ جب وہ کاغذ پر لکھ رہا ہوتا تو حروف اُسے زمین پر رینگتے ہوئے انسان دکھائی دیتے جو کسی کی گھات میں لگے ہوں۔

وہ فطری طور پر آرٹسٹ تھا۔ اُسے تخلیق کرنا تھی۔ مگر جب وہ اس تخریب کو دیکھتا تو وہ سوچا کرتا کہ خدا کا آرٹ عجیب ہے کہ اس [illegible] بنیادی اور تباہی کا عنصر بدرجہ اُتم ہے۔ نسل انسانی کی ابتدا قتل سے [illegible]۔ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کرتے وقت اسی خطرے کا اظہار کیا تھا۔ انسان کا خون انسان کے ہاتھوں بہہ رہا ہے لیکن وہ اپنی تخلیق کو ان باتوں سے دُور رکھے گا۔

یہ اس سے بھول ہوئی کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ حالانکہ فنکار کے لئے ابھی بہتی ہوئی خونی ندیوں میں ہزاروں قہقہے تھے۔ اس نے یہ نہ سمجھا کہ قہقہہ ہزاروں ارمانوں کے پائمال ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ آج تک وہیں ہوتا تو وہ ضرور زیادہ بہتر فنکار ہوتا۔

وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکا۔ مذہب کے آغوش میں اس نے جگہ لی۔ اس کے لئے مذہب ہی زندگی بن گیا۔ وہ ابھی ناتجربہ کار تھا بھٹک گیا۔ اس کو مذہب کا اسقدر جنون ہوا کہ اس نے مذہب کو پیشہ بنا لیا پیشہ وہ قعر مذلت میں گر گیا۔ وہ مذہب کو بیچتا تھا۔ اس نے اس خرید و فروخت کو جنت کا پیش خیمہ سمجھا۔ وہ قاتل سے نفرت کرتا تھا۔ اس لئے کہ قتل انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ مگر اُسے کیا معلوم کہ مذہبی ماحول میں قتل کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ فرق اتنا تھا کہ ایک خون بہا کر اپنے جرم کا افشا کر دیتا ہے، دوسرا دل میں نشتر چبھوتا ہے۔ مرنے والے کو تریاق کا دلاسا دیکر جینے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ زہر پلاتا ہے۔ جس کا اثر آہستہ آہستہ ہو۔

وہ اب فنکاری میں بڑھ رہا تھا۔ جرائم کی تفتیش اور اصل حالات پس منظر کا کام دیتے تھے۔ مذہبی ماحول اس کی ذہنی حسوں کو بیدار کر رہا تھا۔ اس کے دل کے ناسور اُبھر رہے تھے۔ اس کا قلم جب اپنے جگر کے رستے ہوئے خون سے گلکاریاں کرتا تو وہ آرٹ کا شہ پارہ بن جاتا۔

وہ اقتصادی بدحالی کا شکار ہو چکا تھا وہ جس ادارہ میں کام کرتا تھا۔ اس کے اراکین اپنی ذاتی وجاہت اور امارت کی وجہ سے ممتاز لوگ تھے۔ ان کے اس امتیاز کا باعث وہ مذہبی ادارہ تھا۔ جس کے بل بوتے پر وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر وہ کارکن جن کے خون اور گوشت سے اس ادارہ کی عمارت تیار ہوتی تھی سسک رہے تھے۔ چند سالوں میں اس نے اپنے تین ساتھیوں کو اپنے ہاتھوں دفن کیا تھا۔ وہ تینوں تپ دق کا شکار ہوئے۔ وہ تینوں نوجوان تھے۔ ان کے "قتل" کا باعث وہ مذہبی لیڈر تھے۔ جو منبر سے چلا چلا کر اخوت اسلامی کا وعظ کیا کرتے۔ جن کی زندگی کا مقصد مذہب کے ذریعے انسانیت کو بلند کرنا تھا۔ اتنا بلند کہ آقا و غلام کی تمیز مٹ جائے۔ مگر ان انسانی بھیڑیوں نے ان لوگوں سے اتنا کام لیا کہ وہ جان کھو بیٹھے۔ وہ قاتل تھے مگر انہیں کون قاتل کہہ سکتا ہے؟ یہ کسے جرأت تھی۔

یہ فضا اس کے لئے ایک مہمیز تھی۔ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کر جب وہ لکھنے بیٹھتا تھا اس کی آنکھیں اشک بار ہوتیں۔ وہ روتا اور لکھتا۔ جب اس کی تحریریں رسائل میں چھپتیں تو اُسے ہر طرف سے داد ملتی

مگر بد تی، یہ لفظ شرمندۂ معنی نہ ہوتا ـــــ وہ فن کار تھا - اپنی فطرت کی آواز سے مجبور تھا - وہ لکھتا - وہ درد و غم میں مبتلا ہوتا تو زیادہ لکھتا - مجبوریوں نے اُسے اور چمکایا -

اب اُس کا سرمایۂ حیات یہی الفاظ تھے - جو سفید کاغذ پر سیاہ رنگ کا جامہ پہن کر سماج، مذہب اور خدا کا ماتم کیا کرتے - اُسے یہ الفاظ بڑے عزیز تھے - اُس کی تخلیق - وہ بھوک اور اس کی شدّت سے بے نیاز ہو کر اپنی تخلیق میں محو ہو گیا - وہ مذہب سے بغاوت کرنے لگا تھا - اب اُسے جرم سے دلچسپی تھی - وہ مجرم کو بیمار جانتا تھا - اُسے اُس سے ہمدردی ہونے لگی تھی - عورت اُس کے لئے اب معمّہ نہ تھی - وہ اسے ایک ساتھی سمجھتا تھا - وہ ان سے بیباکی سے ملتا - ان سے باتیں کرتا - وہ انسانوں کے دلوں کے اندر جھانکتا - ہمدردی سے، اُن کے زخموں کو دیکھتا - اُسے اپنے زخم یاد آ جاتے - جب اپنے زخموں کی تکلیف اُسے بیتاب کر دیتی - تو وہ چلانے کی بجائے روتا - آنکھوں سے دل کا خون بہہ نکلتا - ہاتھ لکھنے لگتا -

جب وہ خوش ہوتا تو کنجوس کی طرح وہ اسے اپنے تک محدود نہ رکھتا بلکہ وہ اس میں ساری دنیا کو شامل کر لینا چاہتا - وہ ہنستا، دوسروں کو ہنساتا - اتنا ہنساتا کہ وہ لوٹ پوٹ ہو جاتے - اس کے زخم کھل جاتے - مگر وہ ہنسے جاتا - تاکہ دوسرے خوش ہوں - اس کے دکھے ہوئے بھائی -

اس نے اپنے کردار پیدا کئے جن سے وہ کھیلا کرتا - دیوانوں کی طرح وہ ہنسنے لگتا اور کبھی رونے، اس کا انہماک جاری رہتا - وہ حوادث کے طوفان میں بھی اپنے ان کرداروں کو سینے سے لگائے رکھتا - وہ اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھے - وہ اس کی رُوح تھے - اس کا مظہر، وہ آہستہ آہستہ ان میں ہی تحلیل ہوا جا رہا تھا - مسعود اب دو متضاد شخصیتوں کا نام تھا - ایک معمولی کلرک جو اپنی ضمیر کے خلاف دن بھر کام کرتا تھا - کام بھی لیتا ـــــ موثر خطوط لکھ کر خدا کے نام پر پیسے مانگنا - جنت کے قطعات فروخت کرنا ـــــ دوسرا ایک فن کار جو تخیّل کی بلندیوں پر اڑا جا رہا ہوتا - ہمدردی کا مجسمہ - جو مجرموں سے اس لئے محبت کرتا ہو کہ ان کا جرم سماج کے جسم کا ناسور ہے - وہ حسن فروش عورتوں کو اس لئے قابل ہمدردی سمجھتا تھا کہ خدا کا شاہکار ایک روٹی جیسی حقیر شے کے لئے متاعِ عزیز بیچ رہا ہے ـــــ دیوانگی کے ان لمحات میں جب مسعود کا جسم اپنے گھر میں ایک معمولی میز پر جھکا لکھنے میں مصروف ہوتا - تو اس کا دوسرا جزو کون و مکان کی وسعتوں پر چھا گیا ہوتا - یہ تخلیق کے اوقات تھے - جب کبھی اس پر ایسے لمحات آتے تو ان کا نتیجہ ایک ایسا شہ پارہ ہوتا جو پہلے سب خیالوں پر سبقت لے جاتا -

وہ وقت بھی آ گیا - جب اس کا چھوٹا بھائی جوان ہوا - زندگی کی کشمکش میں وہ کامیاب تھا ـــــ اُسے مسعود کی دیوانگی پر ترس آتا تھا - اس نے اقتصادی بدحالی سے مسعود کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا - دیوانگی اور بڑھنے لگی - خالق کی ایک صفت بے نیازی بھی ہے - وہ بھی خالق تھا - آرٹ اور اس کی قیمت مسعود آج تک اس معمہ کو حل نہ کر سکا - وہ اس خیال کو بھی گناہ سمجھتا تھا - آرٹ کو اس نے مذہب کا رتبہ دے رکھا تھا - مذہب کو بیچنا رُوح کو مسخ کرنا تھا - اس کا یہ نظریہ دوسروں کے نزدیک محض ایک عیاشی تھا - وہ اُسے ادبی عیاش کہا کرتے تھے -

وہ کچھ بھی تھا - مگر اس نے اپنے گرد ایک طبقہ پیدا کر لیا - انہیں اس سے محبت تھی - وہ اس کے آرٹ کے دلدادہ تھے - مسعود کی ساری توجہ اسی محفل پر تھی - وہ کتنا خوش تھا - اسے ان لوگوں سے مل کر کتنی خوشی ہوتی - اس کے لئے مرد اور عورت کا فرق نہ تھا - بلکہ وہ صرف چند رفیق تھے - جن کے ذریعے اس کا آرٹ شہرت حاصل کر رہا تھا -

وہ سماج کا باغی تھا - خدا کا منکر - لیکن اس کے باوجود اس کا آرٹ ایک خاموش ندی کی طرح تھا جو ہولے ہولے بہہ رہی ہو - طوفانی دنوں میں اس ندی کا پانی بھی کناروں سے نکل بہتا - مگر ایسا کم ہوتا - وہ بغاوت کرتا مگر ہمدرد بن کر - جن کے خلاف وہ بغاوت کرتا اُسے ان سے بھی ہمدردی تھی - خدا کی ہستی سے منکر وہ اس لئے تھا کہ وہ ظالم کا حامی ہے -

اس نے ذہن کے ایوانوں میں ایک نئی دنیا پیدا کی تھی - خاموش دنیا، جہاں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا - باغات، نہریں، چشمے، محلات، سکھ چین وہ خیال ہی خیال میں جسے دکھی دیکھتا اُسے اس فردوس میں لے آتا - اس کی دل جوئی کیلئے سارے لوازمات موجود ہوتے کسی کا دکھ اس سے دیکھا نہ جاتا -

وہ خود بھی تو دُکھی تھا - اس کے بچّے جب اُسے اُن کا خیال آتا - تو وہ کانپ اٹھتا - اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے سارے شہ پاروں کو اکٹھا کر کے ایک چتا بنائے اور اس میں بیٹھ کر جل مرے - اس کے گرد شعلے بلند ہونے لگتے - وہ چلاتا - "میرے بچو! یہ ہے تمہارا باپ! فن کار! خالق! وہ جل رہا ہے اپنی ہی تخلیق کے ہاتھوں - اس نے خالق ہونے کا دعویٰ کیا تھا - وہ خدائی کا دعویدار تھا - کافر! اس کی سزا! ـــــ وہ جل مرا ـــــ مگر ـــــ"

وہ رونے لگتا - عذاب اس کی جان تک محدود نہ تھا - اس کا اثر اس کے بچوں پر بھی ہوگا - وہ فاقوں مر جائیں گے -

مگر کون جانتا تھا کہ مسعود کے بچے بھوکے ہیں اور اس کے بچے ہیں بھی؟ وہ فن کار تھا - اس کا پیدا کیا ہوا ادب ہمیشہ زندہ رہے گا - وہ انسانیت کا ہمدرد تھا - خدا کا آرٹ ایک دوسرے کو تباہ کرتا ہے - وہ بھی خدا کا آرٹ تھا - اس کے بچے بھی خدا کا آرٹ - خوبصورت [illegible] وہ ان کو پیدا

کررہا تھا - اس کی حسین بیوی ہڈیوں کا پنجر بن گئی تھی - اس کا باعث وہ تھا - قاتل مذہبی لیڈروں کی طرح وہ گھن بن کر کنبہ کو کھائے جا رہا تھا -

اس کا بھائی جو اسے دیوانہ سمجھ کر ترس کھاتا رہا تھا - اب اُسے بھی اس سے نفرت ہونے لگی تھی - وہ مسعود کو جونک سمجھتا تھا - اس کے لئے اس کا فن محض تضیع اوقات تھا - وہ کاروباری آدمی تھا - وہ چاہتا تھا کہ ہر وہ لفظ جو مسعود لکھتا ہے - اس کی قیمت ملنی چاہئیے - مگر مسعود اپنی اولاد کو بیچنا گناہ جانتا تھا - انسانیت سوز گناہ ۔

نفرت ——— ہر طرف مسعود کو نفرت دکھائی دیتی تھی - اس کا بھائی جب اس کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا بھر کی نفرت اس کی نگاہ میں ہے - ایک وقت تھا کہ مسعود کا ایک ذرا سا اشارہ اسی بھائی کے لئے فرمان ہوتا تھا - مگر اب یہ حالت ——— اس کے بلکتے بچے، نحیف بیوی، ان سے اُسے ڈر لگتا تھا ——— لیکن اب وہ نفرت کی آگ میں پھینک دیا گیا - وہ جل رہا تھا - اسے جلانے کے لئے ہر روز نیا حربہ استعمال کیا جاتا - وہ حساس تھا - اُسے زیادہ صدمہ ہوتا - وہ یہ صدمے برداشت کرنے کا عادی نہ رہا تھا - اس نئی مصیبت نے اُسے پریشان کر دیا جب وہ اپنے افسانوں اور کتابوں کی طرف نگاہ اٹھاتا تو وہ اُسے ناچتے ہوئے دکھائی دیتے - اس کی برسوں کی کمائی ——— پھر وہ انسان بن جاتے - اس کی طرف حقارت سے دیکھنے لگتے - ان کی نگاہیں نفرت برساتیں ——— ہمارا خالق یہ ہے ——— مجنوں ——— دیوانہ ——— بے وقوف ——— خدا ——— " پھر یکایک ایسا ہوتا کہ ان کے ہاتھوں میں اس کے بچے اور بیوی کے سر ہوتے گردنوں سے لہو جاری ہوتا - وہ یہ نظارہ دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا - مگر یہ سین ذہن کی آنکھوں کے سامنے اور زیادہ روشن ہو جاتے ——— پھر ایک قہقہہ بلند ہوتا - ان کے پیچھے اس کا بھائی کھڑا قہقہے لگا رہا ہوتا ——— " ادبی عیاش ——— ظالم ——— طفیلی - لفافہ!" وہ اشارہ کرتا ان بریدہ گردنوں کی طرف ——— پھر حقارت سے وہ چند روپہلی سکے زمین پر پھینک دیتا ———

اس کی حالت خراب ہونے لگی - اس نے اپنا جہاں پیدا کیا تھا - جوانی دے دی تھی - اسے خیال تھا کہ وہ ادبی دنیا میں ایک نئے ادب کا اضافہ کرے گا - اس کو موت نہ آئے گی - جب تک اس کا ادب باقی رہے گا وہ زندہ رہیگا - اس نے اپنا مقام بلندیوں پر منتخب کیا تھا - اس کا معمولی گھر بھی اپنے اندر تمام دنیا کے لئے آرام لئے تھا - اس نے سکھ اور چین کو گھر میں جگہ دی تھی - وہ چاہتا تھا کہ سارے عالم کا آرام یہاں موجود ہو - یہی وہ اپنے بچوں کی تربیت کر رہا تھا -

نفرت کا جوالا مکھی ایک دن پھٹ گیا - اس کا گرم اور سُرخ لاوا نکل کر مسعود کے جسم کو جلانے لگا - اس کا بدن گرمی کی شدت سے پھنک رہا تھا - وہ بلبلا اُٹھا - پگھلتا ہوا سیال مادہ - آگ سے زیادہ تیز جلانے والا وہ تڑپ اُٹھا - اُسے توقع ہی نہ تھی کہ پہاڑ کی معمولی چوٹی ایک جوالا مکھی ہو سکتی ہے -

اس کا شفیق بھائی جس کی وہ پرستش کیا کرتا - اس کے احسانات سے مسعود کی گردن جھکی رہتی - اپنی شہرت اور آرٹ کا اسے موجب جانتا - لیکن وہ کریم انسان جوالا مکھی سے زیادہ غصہ سے پھنکار رہا تھا - نفرت کا اظہار ایسے سخت الفاظ میں کر رہا تھا - اس کے دوستوں کو ذلیل کر رہا تھا - مسعود کی بیوی اور بچے سہمے ہوئے رو رہے تھے - اپنی بدقسمتی پر - اپنے خاوند اور باپ کی بدقسمتی پر - جس درخت کے سائے تلے وہ بیٹھے تھے - وہی درخت کانٹے بن کر چبھ رہا تھا - ابر و باراں جس نے مسعود کے گلشن حیات کو بہار میں تبدیل کر دیا تھا - آج بادِ صرصر کا ایک طوفان بن کر سارے باغ کو جلا رہا تھا -

اس سارے انقلاب کا باعث صرف چند روپوں کی فراوانی تھی - مسعود کے پاس یہ روپہلی سکے نہ تھے - بھائی ان کا مالک تھا - مسعود کا فن - اس کی مالیت کیا تھی - چند الفاظ - روپہلی سکے ان سے اس کا بھائی اپنی زندگی بہتر بنا سکتا تھا - عیش کر سکتا تھا - مسعود کی موجودگی اس کی راہ میں ایک روک تھی - اس کے بچے جونک بن کر چچا کا خون پی رہے تھے -

چچا نے جونکیں اُتار پھینکیں - مسعود کا سارا فن دھرا رہ گیا - ادارہ جہاں وہ ملازم تھا اسے اسقدر تنخواہ بھی نہ دیتا تھا - جس سے وہ زندہ رہنے کے لئے خوراک خرید سکے - مسعود نے زندگی دقعت کی ہوئی تھی - توکل کی تلقین اور تھوڑی سی تنخواہ کافی سمجھی گئی تھی - اس کا فن بازار میں بک نہ سکتا تھا - اس کے باوجود اُسے زندہ رہنا تھا - مغموم بیوی - روتے ہوئے بچے - وہ ان سے سمٹا سوچ رہا تھا - اس کا جگر خون ہو کر آنکھوں میں آ گیا - وہ چاہتا تھا کہ بھائی کے قدموں پر سر رکھ دے اور اسے کہے کہ بھائی مجھ پر رحم کرو - مگر بھائی کی نفرت بھری آنکھیں ان سے وہ ڈرتا تھا - خوف سے اس کے حواس گم ہو رہے تھے -

اس کی بیوی نے رُکتے رُکتے اس کے کان میں کہا "آپ کہیں اور نوکری کر لیں - سُنا ہے فوج میں ——— "

"کر لوں گا" وہ خود بھی یہی سوچ رہا تھا -

ذہن کے ایوان لرز گئے - مسعود کی روح کا جنازہ اس کے اپنے کندھوں پر نکل رہا تھا - وہ دس برس کردار تخلیق کرتا رہا تاکہ وہ دنیا میں امن کا موجب بنیں - اس کا اپنا دل ان کرداروں کے جسم میں داخل ہو کر حرکت کرتا رہتا - اس نے جگر کا خون دیکر جن پودوں کو سینچا تھا انہیں خود

ے لگا تھا - خالق اپنی مخلوق کو چھوڑ کر جا رہا تھا - اپنے مدِ مقابل — کی تخلیق کو برباد کرنے - تباہ کرنے - خدا کے عذاب میں ایک بن کر انسانیت پر بم برسانے کے لئے وہ تیاری کر رہا تھا — قاتل — قاتل ہو گا - چند ٹکوں کے لئے - کرایہ کا قاتل ایک سو روپے کیلئے وں انسانوں کا خون کرے گا -

جوالا مکھی کا کھولتا ہوا مادہ اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا - وہ پریشان رسائل اور کتابیں حسرت سے اُسے تک رہی تھیں - سہیل - جمیل اُغا - فیروز - طاہرہ - زبیدہ - پشپا - اس کے کردار اس کا ماتم ہے تھے - اس کی موت کا انہیں صدمہ تھا - اُن کے خالق کا جنازہ اٹھا - وہ چتا میں جل رہا تھا - اس کا بھائی - پیارا بھائی نفرت کا تیل آگ کی اور روشن کرتا گیا -

بچوں کو اس نے گلے سے لگا لیا - وہ زیرِ خندہ ہو کر مُسکرایا - موت کی زندگی تھی - اس نے اپنے کرداروں کو زندہ جاوید بنا دیا تھا - سے تخریب کے لئے نکلا تھا - جوالا مکھی اُسے بھسم کر دینا چاہتا ں کے لئے صرف ایک ہی راہ فرار تھی - وہ تھا فوج میں نوکری — وہ اُٹھا اور اپنے بوسیدہ سارٹیفکیٹ تلاش کرنے لگا -

---

بلندی و پستی

(پروفیسر عباسی)

خارزار جنگلوں اور بیابانوں کو طے کرتے ہوئے ہم ایک سرسبز پہنچے - جہاں پہاڑی کے دامن میں ایک خوشنما جھیل تھی جس طرف رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے - میں نے کہا بس م کریں - مگر وہ نہ مانی - کہنے لگی ہم اس پہاڑی پر چڑھیں گے اور دنیا کا تماشا دیکھیں گے - میں نے ہر چند سمجھایا کہ پہاڑی بہت ہے - ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے - اس نے ایک نہ چڑھتی چلی گئی - میں مجبوراً پیچھے پیچھے ہو لیا - بھلا اتنے منازل کے بعد کس طرح ساتھ چھوڑ دیتا - آخر ہم دونوں چوٹی پر پہنچ ں نے نیچے کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں تو جھیل میں کودونگی - بھی آتا ہے - میں روکتا رہ گیا - کیونکہ میں نہ کودنا جانتا تھا - نہ تیرنا - ایک چھلانگ ماری - میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا - کچھ دیر تک وہ ں غائب رہی - پھر کیا دیکھتا ہوں - جھیل کے اُس پار ایک قہ میں لئے کھڑی مسکرا رہی ہے -

حفظِ جوانی

جوانی ہے فطرت کا نایاب غنچہ
مسلتا ہے بیدرد کیوں اس کلی کو؟
جوانی سے کامل ہوا ماہِ کنعاں
اِسی سے ملا زور مولا علیؑ کو

۲

جوانی کا غنچہ ہے جنّت بداماں
ہوا و ہوس کی لگے لُو نہ اس کو
مہکنا ہے اس کو ابھی کھِل کھلا کر
ملا خاک میں توڑ کر تو نہ اس کو

۳

جوانی توانائیوں کی ہے گنگا
مقاصد کے کھیتوں کو سیراب کرلے
بہارِ جوانی گذرنے سے پہلے
"گلِ سرخروئی" سے دامن کو بھر لے

۴

جوانی ہے پائے طلب زندگی کا
اِسی سے جنوں کوشئ جستجو ہے
کمالِ تمنّا اِسی کا کرشمہ
یہی پردہ دارِ رُخِ آبرُو" ہے

(خان بہادر) امین حزین سیالکوٹی

غزل

جی یہی چاہتا ہے تیری تمنّا کر لوں ۔۔۔ کیسے لُٹتی ہے جوانی یہ تماشا کر لوں
تیری مستانہ نگاہی کے تصدّق ساقی ۔۔۔ میں جوانی کو غریقِ مے و مینا کر لوں
لوگ کہتے ہیں ترے در پہ بدلتے ہیں نصیب ۔۔۔ میں بھی کیا آنے کی تکلیف گوارا کر لوں
تم نہیں ہو تو مجھے خواہشِ دُنیا بھی نہیں ۔۔۔ اِک ذرا آؤ کہ میں خواہشِ دُنیا کر لوں
کاش اُس نورِ مجسّم کی ضیاؤں سے کبھی ۔۔۔ اپنے تاریک سے لمحوں میں اُجالا کر لوں
اُس نے پھر اِک نگہِ خاص سے دیکھا تو ؟ ۔۔۔ اور کچھ روز میں جینے کی تمنّا کر لوں
عشرتِ لمحہ بھی گر تیرے شبستاں سے ملے ۔۔۔ عمر بھر کو میں غمِ ہجر گوارا کر لوں
میری نظروں میں ہے تعمیرِ جہاں کا منظر ۔۔۔ اِک ذرا نظمِ دو عالم تہ و بالا کر لوں
ناخدا دل کا تقاضا ہے کہ اب بہرِ نجات ۔۔۔ اِنہیں اُٹھتی ہوئی لہروں پہ بھروسا کر لوں
کر سکے ایک اشارہ بھی نہ تم، ورنہ میں ۔۔۔ موت تو موت ہے جینا بھی گوارا کر لوں
بہرِ طوفِ حرم و دیر بھی آ جاؤں گا ۔۔۔ پہلے خود اپنی تجلّی کو تو سجدا کر لوں

میرے غم خانہ میں بھولے سے جو وہ آ جائیں
اپنے اختر کو میں ہم اوجِ ثریّا کر لوں

اختر ہوشیارپوری

شام ملک بی۔ اے

ریڈیائی ڈرامہ
تاریخ کا ایک بھولا ہوا ورق

انعام

اداکار :-

سکندر اعظم ——— شاہِ یونان
کمپاسپے ——— محلوں میں ایک کنیز
اپلیس ——— مصوّر

(۱)

گجر پہ زور کی آواز - بعد میں سازوں پہ ہلکی سی دھن -
قدموں کی چاپ

سکندر اعظم - کمپاسپے!

کمپاسپے - اے عالم پناہ!

سکندر - اب تک کہاں تھیں کمپا؟

کمپا - میں محل سرا میں شہنشاہ کی آمد کا انتظار کر رہی تھی -

سکندر - کیا ہماری فتح یابی کی خبر تم تک نہ پہنچی؟

کمپا - پہنچی عالم پناہ - اور جہاں پناہ کے پایۂ تخت میں پہنچنے سے بھی پہلے -

سکندر - تو تم دربار میں کیوں نہ چلی آئیں؟ معلوم ہوتا ہے تم خوش نہ ہوئیں -

کمپا - میں ڈرتی تھی عالم پناہ -

سکندر - ڈرتی تھیں تم! کس لئے؟

کمپا - چاند کی موجودگی میں ایک دیئے کی کرن کا آنا مشکل ہے۔ میں ایک ناچیز کنیز ہوں -

سکندر - مابدولت کا حکم ہے - تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو - کیا تمہیں روکا کسی نے؟

کمپا - نہیں عالم پناہ ایسا کون ہے جو آپ کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی کرے - لیکن میں پھر بھی ڈرتی تھی عالم پناہ -

سکندر - جیوپٹر کی قسم میں کچھ نہ سمجھ سکا -

کمپا - شاید عالم پناہ نہ سمجھ سکیں -

سکندر - لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تم ڈرتی رہو - اور ہم غافل رہیں - ہم صاف صاف سننا چاہتے ہیں -

کمپا - تو سنئے عالم پناہ - ایک غریب کنیز کے پاس نذرِ شاہی کے لئے کیا رکھا تھا - جو وہ وہاں حاضر ہوتی -

سکندر - خوب - تمہارے پاس کیا رکھا تھا - بتاؤں کمپا! تمہارے پاس میری نذر کے لئے کیا رکھا تھا -

کمپا - غریب کمپا تاجِ شاہی کے لئے ایک پھولوں کا ہار لائی ہے - قدرتِ الٰہی کا ایک نازک ترین تحفہ

سکندر - پھول - اور پھول جو کمپا کے دل سے بھی نازک ہوں - ہمیں یہ کبھی خیال نہ آیا -

کمپا - آپ بجا فرماتے ہیں عالم پناہ -

سکندر - کمپا کے یہ پھول درباریوں کی اشرفیوں - خزانوں کے لازوال موتیوں سے بھی ہم کو زیادہ عزیز ہیں کمپا؟

کمپا - عالم پناہ -

سکندر - ہم جاننا چاہتے ہیں - کہ جب ہم پایۂ تخت سے دور میدانِ جنگ میں تلواروں اور نیزوں کے سایہ میں ہوتے ہیں - کیا کمپا کا دل دھڑکتا ہے - کیا کمپا کو ہم یاد آتے ہیں -

کمپا - آج تک پروانہ نہ کہہ سکا کہ وہ شمع پر کیوں جل جاتا ہے - عالم پناہ شاید اس کا جواب میں نہ دے سکوں -

سکندر - جیوپٹر کی قسم جواب لاجواب ہے - مگر کمپا ہم میدانِ جنگ میں واپس جا رہے ہیں - ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری صورت ہر وقت ہمارے روبرو رہے - آج ہم ایک نامی مصوّر کو بلایا چاہتے ہیں - تمہیں چند گھنٹے اس کے سامنے بیٹھنا پڑے گا - صرف چند گھنٹے -

کمپا - عالم پناہ میں ایک اجنبی کے سامنے آنکھیں نہ اٹھا سکوں گی -

سکندر - اپلیس ایک معصوم نوعمر لڑکا ہے - پایۂ تخت میں اس جیسا کوئی مصوّر نہیں - پھر مابدولت کا حکم ہے -

کمپا - عالم پناہ کا حکم سر آنکھوں پہ - کنیز کی جان بھی حاضر ہے -

سکندر - اب تم جا سکتی ہو -

(قدموں کی چاپ کمپا کا جانا)

(سارنگی پہ دھیما میوزک)

سکندر - دنیا ہمیں سکندر اعظم کہتی ہے - دنیا کو غلامی کی زنجیریں پہنانے

والا فاتح - دارا کی سلطنت کو گم کھاڑ دینے والا سکندر - دشمن کی صفوں میں گھس کر لڑنے والا شیر - حریف کے بالمقابل تھا - لیکن دنیا کہتی ہے - سکندر قدرت کے اس عظیم الشان شاہکار کے سامنے جس کو دنیا عورت کہتی ہے اپنے ارادوں کو بالکل پست پاتا ہے - صنفِ جمیل کے اس بے خطا ہتھیار کے آگے جسے دنیا آنسو کہتی ہے - سکندر اعظم کا تاج شاہی جھک جاتا ہے - عورت گلشنِ عالم کی بہار ہے - گلزارِ حسن و خوبی کا شگفتہ پھول - تخلیق لطافت - تصویر وفاداری -

(گھنٹے پر زور کی آواز)

(۲)

سکندر - ابلیس کو حاضر کیا جائے -

(دور سے قدموں کی چاپ)

ابلیس - ابلیس شہنشاہ کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہے -

سکندر - ابلیس -

ابلیس - عالیجاہ -

سکندر - کیا نوروز کو تمہیں ماہ دولت کے سامنے کیوپڈ کی تصویر لئے ہوئے حاضر ہوئے تھے ؟

ابلیس - عالی جاہ - اور عالم پناہ نے اسے بے حد پسند فرمایا تھا -

سکندر - ابلیس -

ابلیس - عالم پناہ -

سکندر - آج تمہیں کمپا کی تصویر بنانی ہوگی - قدرت کا عظیم الشان شاہکار جنسِ گراں مایہ - سرمایۂ حیات -

(پانچ سیکنڈ کا وقفہ)

کیوں ابلیس کیا سوچ رہے ہو - کیا تم کمپا کی تصویر نہ بنا سکو گے !

ابلیس - میں کوشش کروں گا - عالیجاہ - اگر دیوتاؤں کی برکتیں شامل حال رہیں تو شہنشاہ سے خاطر خواہ انعام پاؤں گا -

سکندر - خوب - تم ابھی سے کام شروع کر دو - تصویر مکمل ہونے پر دربار میں پہنچا دی جائے -

ابلیس - عالم پناہ کا حکم سر آنکھوں پر -

(قدموں کی چاپ)

(ابلیس کا جانا)

(۳)

(سازوں پر دھیمی دھن)

(ابلیس کی آہ بھرنے کی آواز)

ابلیس - اب آپ جا سکتی ہیں - تصویر مکمل ہو چکی -

کمپا - کیا تصویر مکمل ہو چکی ؟

ابلیس - تصویر ہر طرح سے مکمل ہے - میں شہنشاہ کی خدمت میں جا رہا ہوں -

(قدموں کی آواز)

کمپا - ٹھیرو ابلیس - میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں -

ابلیس - فرمائیے - میں حاضر ہوں -

کمپا - تمہاری ملول نگاہیں شاہد ہیں - کہ تم تصویر سے مطمئن نہیں ہو - شاید تصویر معیار پر پوری نہ اُتری -

ابلیس - نہیں کمپا پیسے - تمہاری تصویر یقیناً میرا شاہکار ہے -

کمپا - تو مجھے امید ہے کہ - - - یونان کا مصور سکندر اعظم سے منہ مانگا انعام پائے گا -

ابلیس - نہیں کمپا - مجھے انعام کی خواہش نہیں -

کمپا - تو تم شہنشاہ کو ناراضی کی دعوت دے رہے ہو -

ابلیس - غریب مصور کا دل پہلے ہی رنج و الم کا نشیمن ہے - کیا ہی اچھا ہوتا - اگر میں نے کمپا پیسے کی تصویر نہ بنائی ہوتی -

کمپا - ابلیس -

ابلیس - کمپا -

کمپا - یہ تم کیوں کہتے ہو ابلیس - میں ایک ناچیز کنیز ہی سہی - سینے میں دل رکھتی ہوں اور دل میں درد - کیا کمپا تمہارے دکھوں میں شریک ہو سکتی ہے ابلیس ؟

ابلیس - ایسا مت کہو کمپا - شہنشاہ خود تم سے الفت کرتے ہیں - میں ایک غریب مصور ہوں - مخملی فرشوں پر چلنے والی کمپا کانٹوں پر نہ چل سکے گی -

کمپا - مت بھولو ابلیس شاہی محلوں میں رہنے والی کمپا - محبت کے سریلے نغموں کی جھنکار سنتے ہوئے تنکوں کی ایک جھونپڑی میں سُکھ کے دن گزار سکتی ہے - میں تم سے محبت کرتی ہوں -

(سازوں کی زبردست جھنکار)

ابلیس - کمپا !

کمپا - ابلیس -

ابلیس - اس کا انجام کیا ہوگا - شاید کمپا اس سے بے خبر ہے - شہنشاہ ہم دونوں کو گردن اُڑا دینے کا حکم دیں گے -

کمپا - شہنشاہ میرے جسم و جان کے مالک ہیں - میرے دل کے نہیں

ابلیس - کمپا سوچ لو - موت یقینی ہے -

کمپا - ابلیس معلوم ہوتا ہے۔ تم موت سے ڈرتے ہو - آزادی کی موت طلائی قفس کی موت سے کہیں بہتر ہوگی - تمہاری غیر موجودگی میں یہ محل مجھے کاٹنے کو دوڑیں گے - میری زندگی ویران ہوگی - ایک بیابان کی مانند اُجاڑ ایک جنگل کی طرح - ابلیس تم مرد ہو جو عورتوں کی پستی ذلت کی طرف مرد کا پہلا قدم ہے - اب تم جاؤ اور شہنشاہ کو اطلاع دو کہ تصویر تیار ہے - شہنشاہ تم کو منہ مانگا انعام دیں گے۔

(قدموں کی چاپ ابلیس کا جانا)

(۴)

سکندر - خوب ابلیس خوب! تمہاری محنت واقع ہی قابلِ داد ہے - شاہی محلوں میں آج تک ایسی تصویر نہ بن سکی - مابدولت بہت خوش ہوئے - تم اپنا انعام خود تجویز کر سکتے ہو۔

ابلیس - عالم پناہ نے ایک ناچیز مصوّر کی تصویر پسند فرمائی - یہ خوشی کسی انعام سے کم نہیں -

سکندر - نہیں ابلیس - آج ہم بہت خوش ہیں - کہو تو شاہی خزانوں کے پٹ کھول دیئے جائیں - کہو تو جاگیر عنایت کی جائے - اگر شاہی دربار میں کسی عہدہ پر سرفراز ہونا چاہتے ہو - تو کہو - ابلیس - ابلیس - چپ کیوں ہو - آج مابدولت بہت ہی خوش ہیں - بہت ہی خوش -

ابلیس - عالم پناہ غریب مصوّر کا انعام بہت بڑا ہے - شاید آپ دے نہ سکیں -

سکندر - ابلیس تم مابدولت کے سامنے گستاخی کر رہے ہو - کسی اور کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اس کی موت کے مترادف ہوتے لیکن نہیں ابلیس - آج مابدولت بہت ہی خوش ہیں - تم نے کمپا کی تصویر بنائی ہے - بولو کیا مانگتے ہو؟ -

ابلیس - بہت بہتر عالیجاہ - تو غلام کی استدعا ہے - کہ مجھے وہ کنیز عطا کر دی جائے - جس کی تصویر میں نے خدمتِ عالی میں حاضر کی ہے۔

(گجر پر زور کی چوٹ - سازوں پر خوفناک تھرتھراہٹ۔
بھیانک میوزک)

بجلی کے کڑکنے کی آواز

سکندر - کیا کمپا؟ -

(تین سیکنڈ کا وقفہ)

"کمپا کو حاضر کرو۔"

(قدموں کی آواز)

کنیز شاہِ اقدس کی خدمت میں حاضر ہے -

سکندر - کمپا -

کمپا - عالم پناہ -

سکندر - یہ نوجوان مصوّر اپنے انعام میں تمہیں طلب کرتا ہے - کیا تمہیں منظور ہے -

کمپا - جی عالم پناہ - میں ابلیس کے ساتھ جانے کو تیار ہوں -

(گجر پر زور کی آواز بھیانک میوزک)

سکندر - ابلیس ہم تم کو مبارک باد دیتے ہیں کہ کمپا کا چناؤ سب سے اعلیٰ ہے - اب تم جا سکتے ہو - دیوتاؤں کی برکتیں تم پر نازل ہوں -

(دونوں کا جانا)

(سارنگی پر دھیما میوزک)

سکندر - کیا سکندر دنیا کا عظیم الشان بادشاہ - دنیا کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کرے گا کہ وہ ایک کنیز سے محبت کرتا تھا - اور کنیز نے ایک معمولی مصوّر کو اس پر ترجیح دی - نہیں نہیں ہرگز نہیں - عورت ہاں عورت - ایک خوبصورت دھوکہ ہے - مجسمۂ بے وفائی - شیریں تبسم میں زہر کی تلخی -

(سارنگی پر میوزک)

غزل

خدا رکھے محبّت حاصلِ صد زندگانی ہے
تبسم ہی تبسم ہے جوانی ہی جوانی ہے
یہی بس مختصر بیتابیٔ غم کی کہانی ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ جو بہہ جائے تو پانی ہے
نہ پوچھو اپنے دامن سے مرے بہتے ہوئے آنسو
گذرتی ہے جو دل پر یہ اسی کی ترجمانی ہے
نہ گھبرا ہم نفس اب جلد وہ ایام آتے ہیں
کہ جس کا ایک اک لمحہ سکونِ شادمانی ہے
عجب کیا؟ مر کے حاصل ہو حیاتِ جاوداں اختر
میں فانی ہوں مگر ان کی محبت غیر فانی ہے

سیدہ اختر حیدر آبادی

انتظارِ آزادی

ہم نشیں مجھ کو نہ دے پیغامِ رنگین بہار
ہوں وفورِ یاس و غم سے سرجیبِ انتشار

مجھ کو کیا گر ساری دنیا محوِ کیف و رنگ ہے
بزمِ ہستی غرقِ طوفانِ رباب و چنگ ہے

مجھ کو کیا فطرت اگر ہے مائلِ رقص و نشاط
گل فشاں ہے محفلِ امکاں کی فردوسی بساط

مجھ کو کیا گر پھول کی صورت ہے خنداں کائنات
گا رہی ہے سرخوشی کے زمزمے نبضِ حیات

مجھ کو کیا نسیم اگر کرتا ہے اعلانِ شگفت
مجھ کو کیا گر ہر نفس ہے موجِ طوفانِ شگفت

وہ اسیرِ قیدِ زنداں وہ گرفتارِ قفس
آشنائے تلخیٔ آزار و آلامِ ——— قفس

ٹھوکریں در در کی جو کھایا کرے لیل و نہار
بھیک کے ٹکڑوں پہ ہو شام و سحر جس کا مدار

التفات آمیز پردے ہیں بطورِ انتقام
جس پہ خوئے جور نے کر دی ہو ہر راحت حرام

لے اجازت لب کشائی کی جسے جرأت نہ ہو
جس کو اک فریاد زیرِ لب پہ بھی قدرت نہ ہو

ہو جو ہر دم وقفِ غیروں کی غلامی کیلئے
ذلت و ادبار کے حبسِ دوامی کے لئے

چھین لے بیداریٔ احساس جس سے مفلسی
محو کر دے جذبۂ خود دار جس سے بے کسی

جس کا نطق و لب بھی اور کلمات بھی محکوم ہوں
جس کے احساسات اور جذبات بھی محکوم ہوں

خاک لطف انگیز ہو سکتا ہے ان حالات سے
رنگ میں ڈوبے ہوئے آثار و کیفیات سے

آئیگا جس دن نظامِ گلستاں میں انقلاب
صبحِ تسکیں سے بدل جائیگی شامِ اضطراب

جب چمن آزاد ہوگا پنجۂ صیاد سے
ہر کلی محفوظ ہوگی خطرۂ بیداد سے

جب زباں بندی کو مل جائے گا حکمِ اختصار
ٹوٹ جائے گا قفس کی تیلیوں کا جب حصار

جب چمن پہ ہوگا اربابِ چمن کا اقتدار
ہوں گے جب بچھڑے ہوئے اک دوسرے سے ہمکنار

ہم نشیں ہونے تو دے اعلانِ تجدیدِ بہار
پھر مجھے آ کر سنانا مژدۂ عیدِ بہار

محمد شفیق الرحمن خاں شفق

شریف چکوالی

پسندی!

بارش ابھی تھمی نہیں تھی اور آسمان و زمین کا باہمی کھیل جاری ہی تھا کہ این - کے بوس ٹیکسی سے اُترا اور کچھ پریشان سا اپنے کمرے میں داخل ہوگیا - اس کے بعد جب اُس نے کمرہ اندر سے مقفل کر لیا تو اس کے چہرے پر اطمینان اور بے فکری کی جھلک اس طرح نمایاں ہوگئی، گویا وہ کسی مشکل آزمائش میں پورا اُترا ہے ——— پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر جا کھڑا ہوا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا -

سمتِ مخالف سے ایک خوبصورت کار برق کی سی تیزی سے آئی - اور اس کے دیکھتے دیکھتے دروازے پر رُک گئی، ایک حسین نوجوان لڑکی نے گاڑی سے اُتر کر ڈرائیور کو کوئی ہدایت کی اور گاڑی اسی تیزی سے لوٹ گئی -

یہ نظارہ دیکھ کر این - کے بوس کے چہرے پر تشویش کے آثار پھر نمودار ہوگئے، وہ میز کی طرف بڑھا اور ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا - لیکن فوراً ہی اُسے معلوم ہوگیا کہ کسی نامعلوم وجہ سے ٹیلیفون کے تار کٹ گئے ہیں اور وہ اپنا کام نہیں کر سکتا -

اس نے ریسیور رکھ دیا - پھر اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکالا اور کسی گہری فکر میں ڈوب گیا - دفعتہً وہ چونک سا پڑا جیسے اچانک کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو، اور میز کی ساری درازیں ایک ایک کر کے کھول دیں ——— وہ، اس بظاہر بے معنی کام میں مصروف ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی، گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس نے ایک خاص انداز سے اپنے سر کو حرکت دی - جیسے کسی قطعی فیصلے پر پہنچ گیا ہو!

گھنٹی کی آواز دوبارہ سنائی دی اور اب اسے دروازہ کھولنے جانا ہی پڑا - کیونکہ وہ اس گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا!

قیمتی لبادے میں لپٹی ہوئی وہی نوجوان لڑکی سامنے کھڑی تھی، مسٹر بوس کو دیکھتے ہی وہ ہلکی سریلی آواز میں "نلین" کہہ کر پیچھے ہٹی اور پھر "پیارے نلین" کہہ کر پورے جوش سے اُس سے لپٹ گئی ——— خوشی یا حیرت سے اس کی آواز چیخ میں بدل گئی تھی!

نوجوان این کے بوس محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو کہیں کسی دعوت میں دیکھا ہے - کب اور کہاں دیکھا ہے وہ اس پر غور ہی

دہلی میں ملے تھے!"

وہ پچھلے سال دہلی ضرور گیا تھا - اس سے ایک سال پہلے بھی دہلی میں تھا - اور اس سے پہلے کئی سال وہاں رہ چکا تھا - وہاں بہت سی لڑکیوں سے اُس کی جان پہچان تھی جو سب کی سب نوجوان اور خوبصورت تھیں، اس لئے اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کا نام کیا ہے؟ لیکا یک اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے رُک رُک کر کہا - "پریتما!" اور لڑکی نے پورے جوش سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا -

"پیاری پریتما!" ——— وہ جوش سے چلایا - اور اُس کے بازوؤں نے پریتما کو پوری گرفت سے اپنے حلقے میں لے لیا، مگر پریتما اس پُرجوش معانقے اور "نلین" کے جلتے ہوئے ہونٹوں کی گرمی سے کچھ بدحواس سی ہوگئی اور اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی: "نلین، عجیب بات ہے کہ تم مجھے پہچان ہی نہ سکے!"

"نہیں پیاری، یہ بات نہیں دراصل میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا - کہ اس طرح اچانک تم سے ملاقات ہو جائے گی ——— میں اپنے آپ کو اتنا خوش قسمت نہ سمجھتا تھا!"

یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا تاکہ پریتما کمرے کے اندر آ جائے - مگر وہ نہ جانے کس سوچ میں تھی کہ لمحہ بھر تک دروازے ہی میں کھڑی رہی - پھر اُس کے حسین ہونٹوں پر ایک پیاری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر وہ اندر چلی آئی -

کمرے کی ہر شے کو وہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور جب اس نے میز کی کھلی درازیں دیکھیں تو اُس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں عجیب چمک سی پیدا ہوگئی!

"تم نے اپنا کمرہ بہت اچھے ڈھنگ سے سجا رکھا ہے نلین، یقیناً تمہیں اس میں بہت آرام ملتا ہوگا!" اُس نے مسکرا کر عجیب بھولے پن سے سوال کیا!

"میں اس کی آرائش کا واقعی بہت خیال رکھتا ہوں اور اس لئے آرام ہونے میں بھی کوئی شک نہیں" اُس نے پریتما کی تائید کرتے ہوئے کہا اور پھر دفعتہً رُک کر بولا "اپنا لبادہ مجھے دے دو، یہ بھیگ گیا ہے اور تمہیں سردی

پرتیما نے خاموشی سے لبادہ اُتار کر اُسے دیدیا اور وہ دوسرے کمرے میں اُسے کھونٹی پر ٹانگنے چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو اُس نے پرتیما کو عجیب اور پُراسرار نظروں سے اپنی طرف دیکھتے اور مسکراتے پایا۔

"سچ مچ آج تم پہلے سے بہت زیادہ حسین نظر آتی ہو۔" مسٹر بوس نے اس کی معنی خیز نظروں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کیا میں؟" ـــــ وہ ناز سے اٹھلا کر بولی ـــــ "میں آج بہت خوش ہوں نلین! بے حد خوش!!"

اُس کی دلفریب مسکراہٹ سے مسحور ہو کر "نلین" پُرجوش انداز سے اُس کی طرف بڑھا اور قریب تھا اُسے اپنے بازوؤں میں لے لے کر وہ جلدی سے ایک طرف ہو گئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "میری طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔ سر چکرا رہا ہے، دل زور زور سے دھڑک رہا ہے اور حلق بھی سوکھ رہا ہے۔ میں کچھ پینا چاہتی ہوں!"

"ضرور! مگر کیا پیو گی؟ کوئی ٹھنڈی چیز یا گرم؟" "نلین" نے پوچھا۔

"تھوڑی سی چائے! مگر کیا تمہارے ہاں کوئی نوکر نہیں ہے؟" پرتیما نے سوال کیا۔

"نوکر کی ضرورت نہیں، میرے پاس بجلی کا چولہا موجود ہے۔ تم یہیں بیٹھو میں ابھی فوراً چائے بنا لاتا ہوں،" اُس نے جواب دیا۔

"مگر میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی ـــــ رہنے دو" پرتیما نے ہمدردانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"تکلیف؟ تکلیف کیسی؟ ارے یہ تو میری انتہائی خوش قسمتی ہے۔ ایسے موقعے روز روز تھوڑے ہی ملتے ہیں!" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور پرتیما کے روکنے کے باوجود باورچی خانے میں چائے بنانے چلا گیا۔ ـــــ باورچی خانے سے اُس نے دو ایک بار پرتیما کو مخاطب بھی کیا جس کا جواب پرتیما نے ہر بار اپنے مخصوص پیارے انداز میں دیا۔ اور جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ چائے بنانے میں لگا ہوا ہے اور اُسے آنے میں دیر ہو گی تو شاید وقت کاٹنے کے لیے وہ تصویریں، کتابیں میز کی درازیں اور کمرے کی دوسری چیزیں دیکھنے لگی ـــــ چائے تیار کرنے کے بعد جب نلین کمرے میں داخل ہوا تو پرتیما کھڑکی کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی!

"یہاں سے باہر کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے!" وہ پیچھے مڑتے ہوئے کہنے لگی "ارے تم چپ کیوں ہو؟ باتیں کرو نا!"

"ہاں خاموشی تو مجھے بھی نہیں بھاتی۔ مگر سوچ رہا ہوں کس موضوع پر بات چیت کی جائے" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور جب پرتیما بڑے گوچ پر نیم دراز ہو گئی تو اُس نے چائے کا سامان چھوٹی میز پر چُن کر اس کے سامنے رکھ دیا ـــــ پرتیما ایک دلفریب ادا کے ساتھ آگے کی طرف جھکی اور چائے انڈیلنے لگی۔ اس کے بعد اس نے آدھی پیالی چپ چاپ اس طرح پی لی۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ پھر کہنے لگی:۔

"کیا واقعی میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نلین؟"

"بے شک! تم بہت اچھی ہو اور میں تمہیں سچے دل سے چاہتا ہوں!" ـــــ مسٹر بوس نے جوش سے جواب دیا۔

پرتیما نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچا، اُس کے گھٹنے کوچ سے جا لگے، دونوں کے دھڑکتے ہوئے دل مل گئے اور ہونٹ ملنے ہی والے تھے کہ دروازہ کھلا اور دو اجنبی اندر گھس آئے۔ انہیں دیکھتے ہی "نلین" نے پرتیما کو چھوڑ دیا۔ اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

پرتیما نے سامنے والے غضبناک آدمی کو دیکھتے ہی ایک خوفناک چیخ ماری، اور بیہوش ہو کر گر پڑی!

اجنبی اپنی مضبوط چھڑی نلین پر تان کر زور سے چلایا:۔

"ذلیل کتے، یہ کیا حرکت ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، نہ یہ جانتا ہوں کہ میں نے کون سا قصور کیا ہے!" نلین نے عجب بھولے پن سے جواب دیا۔

"بدمعاش!" ـــــ اجنبی نفرت بھرے لہجے میں چلایا ـــــ "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ میری بیوی یہاں کیا کر رہی ہے؟ ـــــ ـــــ اکیلی، تمہارے ساتھ، تمہارے کمرے میں؟"

"یہ مجھے بتا رہی تھیں کہ جب سے ان کی شادی آپ کے ساتھ ہوئی ہے یہ بہت خوش اور سکھی ہیں!" نلین نے بدستور معصومانہ انداز میں جواب دیا۔ مگر غضبناک شوہر کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بالکل اُس آدمی کی طرح نظر آتا تھا جو اپنے ایک بڑے نقصان کا خیال کر کے پیچ و تاب کھا رہا ہو!

دفعتہً وہ جوشِ غضب سے دیوانہ سا ہو گیا اور قریب تھا اپنی چھڑی سے نلین کو مارنا شروع کر دے۔ کہ اس کے ساتھی نے اُس کی چھڑی پکڑ لی اور کہا:۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر چوہدری، اِسے قانون کے حوالے کر دینا ہی اس کا صحیح علاج ہے!"

"آپ کس حیثیت سے دخل دے رہے ہیں۔ جناب! جاسوس ہیں یا وکیل!" نلین نے دفعتہً عجیب و غریب سوال کیا۔

"بے وقوف چھوکرے! تیرے حق میں بہتر یہی ہے کہ چُپ رہے!" اجنبی نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں قانون دان ہوں اور اس واردات کا شاہدِ عینی! اب تم قانونی گرفت سے بچ نہیں سکتے!"

"اسقدر باتیں نہ کیجئے، وکیل صاحب! آپ کی زبان تھک جائیگی۔

اور فیس دینے والا تو یہاں کوئی ہے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" نلین نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، حامد!" غضنب کے شوہر نے اپنے ساتھی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مگر قانون کے حوالے کرنے کی ضرورت نہیں، میں خود ہی اسے ٹھیک کئے دیتا ہوں!"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا میں جان سکتا ہوں؟" نلین نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔

مگر اُس کے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے پرتیما کا شوہر اُس کے اور پرتیما کے بیچ میں کھڑا ہو گیا، پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "حامد، تم اس بے وقوف کے کمرے کی تلاشی لو، اور میں اس کی نگرانی کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ خط یہیں موجود ہے۔"

"بے کار پریشان ہوتے ہو!" نلین اُن کا مطلب سمجھ کر آرام کرسی پر لیٹتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کامیابی کیسے ہو سکتی ہے۔ جبکہ پرتیما جیسی چالاک لڑکی کامیاب نہیں ہو سکی؟"

"پرتیما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!!" مسٹر چوہدری نے حیرت سے دُہرایا۔ "ہاں پرتیما ——— تمہاری بیوی یا نہ جانے کون؟" نلین نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں نے اسے ہر طرح موقعہ دیا تاکہ یہ اچھی طرح اپنا اطمینان کر لے اور جب میں نے اسے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارتے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے بلا رہی ہے اور وہ ضرور آئیں گے!"

"افسوس شیلا، تم بالکل ہی نکمی نکلیں!" مسٹر چوہدری نے لڑکی کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو تم پرتیما نہیں ہو!!!" ——— مسٹر لوبس نے طنز بھرے لہجے میں سوال کیا ——— "اور نہ میں نلین ہوں!!!"

"کیا؟؟؟" تینوں حیرت زدہ ہو کر بیک آواز چلائے۔ "ہاں! تم لوگوں نے مجھے نلین سمجھا تھا، حالانکہ میں نلین نہیں ہوں!" مسٹر لوبس نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا۔

"ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ ہم خوب جانتے ہیں، تم کون ہو!" مسٹر چوہدری نے غصّے سے کہا۔

"ضرور جانتے ہو، مگر صرف اسی قدر کہ میں این سی لوبس ہوں، تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میرا نام نرمل کمار لوبس ہے۔"

"نلین کمار لوبس" نہیں!!!" مسٹر لوبس نے ہنس کر کہا۔

تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مگر خاموش رہے۔ آخر حامد بولا۔ "ممکن ہے نام کے معاملے میں غلطی ہو گئی ہو مگر ہمیں اچھی طرح معلوم ہے تم کیا کام کرتے ہو!"

"تم نلین ہو یا نرمل۔ اس سے بحث نہیں، لیکن کیا جانتے ہو، ہم کیا چاہتے ہیں؟" مسٹر چوہدری نے سوال کیا۔

"خوب جانتا ہوں" نرمل نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تم اس لفافے کی تلاش میں ہو جس میں ایک اہم فوجی دستاویز بند ہے اور جو تمہارا خیال ہے کہ میں قلعہ سے لایا ہوں!"

"مجھے خوشی ہے کہ تم ہمارا مطلب آسانی سے سمجھ گئے!" مسٹر چوہدری نے دفعتاً نرم ہو کر کہا۔

"مگر تم سب پہلے درجے کے بے وقوف ہو جو یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ میں ایسی اہم دستاویز ایسے غیر محفوظ مکان میں لایا ہوں اور جہاں سے وہ ہر وقت ضائع ہو سکتی ہے!" نرمل نے مقررانہ انداز میں کہا۔

"چھوکرے! تو ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تو وہ خط اپنے ساتھ لایا ہے اور اسے لیکر کل ہی تجھے دہلی جانا ہے۔ ——— اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت، اسی مکان میں کسی جگہ موجود ہے۔" مسٹر چوہدری نے پاگل کتے کی طرح غراتے ہوئے کہا۔

"کیا تم میں سے کسی نے محکمۂ ڈاک کا نام کبھی سنا ہے؟" مسٹر لوبس نے اچانک سوال کیا۔

"محکمۂ ڈاک!!!" تینوں نے حیرت سے دُہرایا۔

"جی ہاں، محکمۂ ڈاک ——— اور وہ خط اس وقت اسی کی تحویل میں ہے، خط پر ایک پرائیویٹ پوسٹ بکس کا پتہ لکھا ہوا ہے۔ جو دہلی کے جنرل پوسٹ آفس میں نصب ہے اور جب میں وہاں پہنچوں گا تو وہ خط مجھے مل جائے گا!" مسٹر لوبس نے پوری سنجیدگی سے بات ختم کر دی۔

دونوں آدمی حیران اور خاموش کھڑے تھے اور اُن کی آنکھوں سے مایوسی جھلک رہی تھی مگر لڑکی چلائی: "یہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ خط پوسٹ نہیں ہوا۔ میں نے قلعے سے نکلنے کے بعد سے اب تک اس کی نگرانی کی ہے اور جب یہ جنرل کولین سے رخصت ہو کر قلعے سے نکلا تو خط یقیناً اسی کے پاس تھا اور راستے میں یہ کہیں نہیں رکا!"

"تمہارا خیال یقیناً صحیح ہے شیلا!" مسٹر لوبس نے نیم تائیدی لہجے میں کہا۔ "واقعی قلعے سے نکلنے کے بعد میں نے خط پوسٹ نہیں کیا، مگر قلعے کے اندر بھی لیٹر بکس موجود ہے اور وہیں میں نے وہ خط ڈاک کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ ایک ایسی فوجی اور سیاسی خفیہ دستاویز جس کی اہمیت مسلّم ہے۔ قلعے سے باہر لانا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لینا سراسر حماقت ہوتی! مجھے معلوم تھا کہ تم جیسے لوگ ضرور میری تاک میں ہوں گے لیکن میرے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ معاملات اتنی عجیب و غریب [illegible]

دماغی شکل اختیار کر لیں گے!"

مسٹر لیوس کی اس طنزیہ تقریر مگر سنجیدہ اندازِ بیان نے تینوں کو پریشان کر دیا تھا مگر فوراً ہی وہ سنبھلے اور بیک آواز چلّائے: "اس کی باتوں پر یقین کرنا حماقت ہے!"

"تب جو جی میں آئے کرو!" مسٹر لیوس نے بے پروائی سے کہا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں ٹیلیفون کے تار خود تمہیں لوگ کاٹ چکے ہو!"

تینوں دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے اور سارے کمروں کا کونہ کونہ چھان ڈالا۔ حتیٰ کہ بستر کے گدّوں اور چادروں تک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا۔

"اگر یہ عورت دوسرے کمرے میں چلی جائے تو تم میرے پڑے ترواکر بھی دیکھ سکتے ہو!" مسٹر لیوس نے سنجیدگی اور طنز کے ملے جلے لہجے میں کہا ——— اور عجیب و غریب اجنبیوں نے یہی کیا بھی!

"معلوم ہوتا ہے وہ خط یہاں نہیں لایا گیا" حامد نے سرگوشی کے طور پر مسٹر چوہدری سے کہا۔ "کیونکہ وہ یہاں کسی جگہ نہیں ہے!"

"سچی بات کڑوی ضرور ہوتی ہے۔ مگر آخر کار اس پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔" مسٹر لیوس نے جلتی آگ پر تیل ڈالا!

دونوں نے قہر آلود نگاہوں سے اُسے گھورا اور مسٹر چوہدری نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "چلو چلیں، اب کامیابی کی کوئی امید بھی باقی نہیں رہی!"

تینوں لڑکھڑاتے قدموں سے زینے کی طرف بڑھے۔ شیلا پیچھے تھی۔ مسٹر لیوس نے اُسے پکارا۔ "تم اپنا لبادہ بھولی جا رہی ہو، شیلا ——— پیاری! ٹھہرو میں لا دیتا ہوں۔" اس نے لفظ "پیاری" پر زور دے کر کہا اور بھیگا ہوا لبادہ لینے ... دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے کھونٹی پر سے لبادہ اتار کر اس کی تہہ کھولی اور اس کے اندر سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھا اور باہر نکل آیا ——— بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے شیلا نے لبادہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگی۔

جب وہ لوگ سیڑھیوں سے اُتر گئے تو وہ سڑک کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی پر جا کھڑا ہوا اور اُس نے دیکھا کہ موٹر تینوں کو لئے طوفان کی سی تیزی سے اڑی جا رہی ہے!

کھڑکی سے ہٹ کر اس نے لفافہ اپنی جیب سے نکالا اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ کر بولا۔

"جب ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئے جہاں کوئی چیز چوروں سے محفوظ رہ سکے تو ایک عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ خود چور کی جیب سے یہ کام لے!"

وہ اپنی کامیاب پیش بندی پر مسکرانے لگا۔ (ماخوذ)

غزل

یہ کس کا انتظار کئے جا رہا ہوں میں
عمرِ رواں کو طول دئے جا رہا ہوں میں

ہر چند فصلِ گل میں دماغ رفو نہیں
دامانِ چاک چاک سیئے جا رہا ہوں میں

اُمید و اشتیاق کے پہلو ہزار ہیں
کیا کیا فریب دل کو دیئے جا رہا ہوں میں

جینا اسی کا نام ہے جینا ہی اور کیا
لاکھوں مصیبتوں میں جیئے جا رہا ہوں میں

دل سے بھی لے رہا ہوں میں کیفِ خیالِ دوست
آنکھوں سے بھی شراب پیئے جا رہا ہوں میں

رکھوں گا ذوق و شوق کی دنیا کو ساتھ ساتھ
گلشن کو بھی قفس میں لئے جا رہا ہوں میں

مرنے کی آرزو ہے مجھے جانِ صد حیات
مرنے کی آرزو پہ جیئے جا رہا ہوں میں

کوثر نصیبِ عشق میں ہونا تھا اور کیا
اک داغ ہے کہ دل پہ لئے جا رہا ہوں میں

[illegible]

رفیق علیخاں صابر

پھکنا

"پھکنا! ... پھکنا!!"

چند لمحے ننھے ننھے قہقہے فضا میں گونجے - اور ختم ہو گئے، ٹھیک اُسی طرح جیسے کسی بچے کا اُچھالا ہوا پھکنا فوراً ہی زمین پر آ رہے !!

جمیل اسی وقت رفو جنتہ کے برابر ہی مرزا عظیم بیگ مرحوم کا ناول "چمکی" لئے بیٹھے تھے - لڑکیوں کی باتوں کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں "ذرا دیکھو تو سہی!" ... "نا! ہنتو اماں سے پٹواؤں گی"... ! "کیوں عورتوں کا نام بدنام کرتی ہے - ڈرپوک!!" ... اوئی تمہیں مرد بننے کا شوق جو چرّایا ہے، بتو مگر چھچھوندر سے تو ڈرتی ہو"... اُدی کالی شلوار پر شبغون کا دوپٹہ! نرج کوئی جوڑ بھی ہو!" ——— کتاب تو کھلی ہوئی تھی مگر جمیل کے کان کہیں اور کام کر رہے تھے —— وہ اس وقت اپنے "کان سینک" رہے تھے، چور کا دل آدھا ہوتا ہے - چچی کے ٹوک دینے کا بھی خوف تھا - اسی لئے ذرا سی کھڑ بڑ پر چونک پڑتے! ——— ایک قہقہہ بلند ہوا جس کا تسلسل کئی سیکنڈ تک رہا !!

اُن کو افسانے لکھنے کا خبط تھا مگر اس وقت شاعری کی طبع آزمائی ہو رہی تھی - لڑکی کی ہنسی، اُف! جیسے رُوپہلی سنسان رات میں ہلکے سروں میں بانسری بجا رہا ہو، جیسے ستار پر انگلیوں کے آہستہ پڑنے کی آواز، یا کسی میم کے پیر میں کانٹا چبھ جانے کے بعد والی ہلکی سی چیخ! ——— ان کے افسانوں میں ان کے کردار کی جھلک ضرور ہوتی تھی - وہ اپنی شخصیت کو بہت ہی حسین دکھاتے.... شاید سمجھتے ہوں کہ افسانہ ہی پڑھ کر کوئی دوشیزہ دل پھینک بیٹھے لیکن شائقین افسانہ سمجھتے ہوں گے کہ مرزا صاحب مرحوم نے خود کو ہمیشہ بدصورت کہا - مگر تھے بہت حسین! اسی بنا پر جمیل .....؟ توبہ! ———

جمیل فی الواقعی حسین تھے - سولہ ہی نہیں بلکہ سوا سولہ آنے، مگر نئے ادب کی طرح نئے حُسن کے زمرے میں آتے تھے - عورتوں کی قدامت پسندی اور ان کی بدقسمتی کہ صنف نازک ابھی جدید جدید کی اس نئی تحریک کی معترف نہیں ہوئی ہے ——— ہاں! تو وہ تھے ڈھائی من کے ہلکے پھلکے نوجوان، پھر چھوٹی چھوٹی آنکھیں جیسے بورے میں سیپ کے بٹن، اُن پر کالا چشمہ، چار آنکھیں تھیں، یا چار چاند لگے تھے - لکھنؤ کے رہنے والے مگر انگلیاں ... پور کی موٹی گاجروں کی طرح، ناک کے نتھنے ذرا پھیلے ہوئے، ہونٹ اور دانت پان آلود ——— سراپا حُسن! ... کسی شاعر کا رنگین خواب!

ننھے ظہیر نے سُرخ پھکنا لا کر اُن کی گود میں رکھ دیا، اور ہونٹوں میں مسکراتا چلا گیا! .... بہت دیر تک وہ یہ ہی نہ سمجھ پائے کہ آخر اس پھکنے پر ہنسنے کی کون سی بات تھی - مگر چونکہ پھکنا بھیج کر شرکت ہنسی کی دعوت دی گئی تھی - اس لئے بے معنی طور پر وہ بھی تبسم فرمانے لگے!

چِک کے قریب حرکت ہوئی - چہرہ کی ایک ہلکی جھلک! .... ہرے دوپٹے اور بنفشی سوٹ کی نمایاں جھلک، چوڑیوں کی جھنکار ..... یہ سب کچھ لمحہ بھر میں ہو گیا، کبھی ہو نہ ہوئی مگر جمیل صاحب کے دل پر اندھیرا چھا گیا - ——— دل ہی دل میں عظیم بیگ مرحوم کی کتاب کے پلاٹ کو سراہنے لگے - کہ وہ کس حد تک unconsciously واقع ہوئے تھے! ..... یہاں پر افسانہ حقیقت بن گیا؟ ———

پھر پھکنا پھکنا کی آواز آئی، مگر اب اُن کے خیالی قلعے میں پھکنے نے بم کا کام کیا - اُنہوں نے چونک کر اپنی سُرخ قمیص اور سبک اندامی کو دیکھا - پھر مسکرانے لگے ——— مگر خفت آمیز طور پر!

گھڑ گھڑ گھڑ! ——— ریل انہیں کالج کو لئے جا رہی تھی، "پرستان" میں دس دن رہنے کے بعد وہ دو مہینے کے لئے "قبرستان" میں لے جائے جا رہے تھے، ان کے احساسات کو تو ریل کے پہیے کچل رہے تھے مگر تمناؤں اور آرزوؤں کا مدفن ہوسٹل کی چہار دیواری میں بننے والا تھا! ——— کیا نام رکھا اُس لڑکی نے میرا، پھکنا .... بلا کی شوخ! .... بڑی شریر ہوگی، کالج میں کتنی تو لڑکوں نے میرے نام رکھے ہیں - مگر وہ اتنے موزوں نہیں - اُف! اس نام نے تو میرا سب غرور خاک میں ملا دیا ——— آپا کہتی تھیں کہ وہ زیادہ خوبصورت نہیں! ... مگر شوخی و شرارت اسی کا حصہ ہے! ——— واہ! اونہہ! آجکل کے نوجوانوں میں تو خوبصورتی کا معیار سفید چمڑا ہی رہ گیا ہے! ———

چھٹیوں کا بہانہ پھر جمیل چچی کے گھر آ دھمکے ——— صبح کا وقت تھا، سر سے چادر اوڑھے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے، اگر محاورہ ان پر چسپاں ہے تو ان کے خراٹے اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ کوئی "عربی النسل" گھوڑا ہوگا ... ایک لوٹا ٹھنڈے پانی کا پڑنا تھا کہ "گدھے مزید کر" اُٹھ بیٹھے - دو چار پھریریاں سی لیں - کوئی دھم دھم کرتا کمرے میں غائب ہو گیا ... صورت حال سمجھ گئے کہ وہی پھکنے والی ہوگی - "میں نے ایک گھڑا پانی جو نہ ڈالا ہو

تو بات ہی کیا ہے۔ گھڑے کے پاس بار بار جا کر زور سے چلاتے۔ لیکن جب کمرے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آتی تو اور زیادہ چراغ پا ہوتے۔ آپا نے آکر کہا کہ ان کی ایک سہیلی نے دھوکے سے پانی ڈال دیا۔ وہ معافی مانگ رہی ہے "واہ آپا دُبلی پتلی اور مجھ میں کوئی فرق ہی نہیں، کمبخت!۔۔۔ یہ تو صریحاً شرارت ہے مجھی! قیامت تک تو معاف نہیں کروں گا"۔

"ساون من بھاون، لو ساون آیا رے" کوئی میٹھے میٹھے سُروں میں گنگنا رہی تھی، کبھی رُک جاتی کبھی پھر گانے لگتی۔ جیسے موسم کی خرابی کی وجہ سے ریڈیو کی آواز رُک رُک کر آتی ہے، گانے کی خوبی یہی ہے۔ کہ سماں بندھ جائے، اور دل میں اُترتا چلا جائے، ایسا گیت دوپہر کے وقت بدمذاقی اور بے وقت کی راگنی ضرور تھی مگر جمیل میاں کا حسنِ اعتقاد کہ وہ ایسی چلچلاتی دھوپ میں بھی کالے کالے بادل، ہلکی ہلکی پھوار تصور کر رہے تھے۔ پھر ساتھ ساتھ اُنکے جذبات بھی جھولا جھول رہے تھے ـــــ "سکھی پیا ملن کی آس"۔ اب سب لڑکیاں اپنی بے ہنگم آوازیں ملانے لگیں گانے میں عجب درد تھا۔ سب پیا والے مرض میں مبتلا تھیں رفتہ رفتہ گانے نے پیلو کے مرثیے کی صورت اختیار کر لی۔ ایک صاحبہ منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے میاں جنگ پر گئے ہوئے تھے، ایک دوسری بھی کچھ اُداس اُداس سی تھیں۔ کیونکہ ان کے شوہر مس زہرہ جان کو بمبئی کی سیر کرانے گئے تھے۔ غرض یہ دونوں آس سے بھی ہاتھ دھو چکی تھیں ـــ یکایک گانا رُک گیا، ایک لڑکی نے بطور احتجاج کہا۔ "ہم سب جھپکنے کو بھول گئیں"۔۔۔ پھر کیا تھا۔ جھکنا پھونک لگے اُڑ جائے۔ کسی بیٹھی شور مچانے لگی والی قوالی شروع ہو گئی ـــ پہلے تو جمیل لڑکیوں میں Popular ہونے کی وجہ سے خوش ہوئے مگر پھر اس خیال سے کہ صنفِ نازک ان کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ ان کے احساس مردانگی کو ٹھیس لگی اور وہ انتقاماً لڑکیوں کے کمرے میں گھس گئے۔ انگریزی مثل کے مطابق Like A Bull in A China Shop

اُوئی! اُوئی!! اوئی تین چار آوازیں بلند ہوئیں ـــــ

اور کمرہ خالی!!

اس وقت جمیل کی قوتِ حافظہ اپنے اوجِ کمال پر تھی۔ بھولی بسری باتیں یاد آ رہی تھیں ـــــ "امیرالعاشقین" اُن کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ پہلے انہوں نے ان کی زرّیں صلاحوں کی قدر نہ کی خاص کر جسم گھٹانے کے بے سود انہوں نے عشق کرنے کو کہا تھا ـــــ "امیرالعاشقین" اس عشق کے معاملے میں جہاں دیدہ اور بڑے گرگ باراں دیدہ تھے۔ اچھے خاصے بڈیوں کے ہار تھے۔ کم سے کم انہوں نے دو تین عشق تو کئے ہوں گے۔ پھر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "بھئی ایک عشق کا اور ہوں!" ـــــ جمیل بھی اسی پس و پیش میں تھے کہ وہ بھی "اس" لڑکی سے محبت کیوں نہ شروع کر دیں؟ ڈاک خانے میں محبت کی رسمِ افتتاح ہوئی، ایک خط امیرالعاشقین

کو؟۔۔۔ "ایک ماہ پارا سے شدید محبت ہو گئی ہے۔ وہ بھی مجھ پہ جان چھڑکتی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ میرا دم بھرتی ہے۔ تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے؟" ـــــ دوسرا پیٹھی بہن ہوا۔۔۔ آپا لوگ کہتے ہیں بلیک آؤٹ کی وجہ سے (؟۔۔) کی رونق روبہ انحطاط ہے۔ مگر مجھے تو یہ شہر اور جگمگ جگمگ کرتا نظر آتا ہے، یہ سب کیوں ہے؟ ملوں گا تو بتاؤں گا" ـــــ تیسرا وارڈن کے نام!۔۔۔ کئی دن سے جاڑا دیکر بخار آ رہا ہے۔ افاقہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اچھا بھی ہو گیا تو نقاہت باقی رہے گی۔ دس دن کی مہلت اور درکار ہے!" ـــــ آخر میں والد صاحب کو!۔۔۔ "چچی مصر ہیں کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں یہیں آکر رہوں۔ پوری چھٹیاں گزارنے کا وعدہ تو نہیں کیا۔ مگر دس پندرہ دن یہاں گزار کر گھر آؤں گا" ـــــ غرض عشق کا ابجد مہیا کیا گیا اور دیا سلائی بھی لگا دی گئی، اور غالب کا شعر گنگناتے ہوئے واپس ہوئے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

چچی کہتی تھیں کہ جمیل کے سر میں سینچر سوار رہتا ہے نہ ٹھیک سے چائے پیتا ہے اور نہ کھانا دل سے کھاتا ہے، محبت کے لئے سینچر کا نام لیا جائے۔ وہ چچی کی اس بدشگونی سے بڑے دل برداشتہ تھے ـــــ آج جمعہ کا دن تھا۔ دن اچھا تھا، خط لکھنے کی ٹھانی، کئی مضمون نظروں میں نہیں جچے۔ اسی لئے انہیں ردی کی ٹوکری کے نذر کیا گیا۔ پھر ایک "ماجرائے دل" بالفافہ کر کے، عطر چھڑک کر، بڑی تاکید سے ظہیر کو دیا اور ساتھ ہی ایک اکنی ہاتھ پر رکھ دی۔ ٹکٹ نہیں تھا لڑکیاں ٹکٹ کے دام تو انہوں نے اس ننھے سے قاصد کو دے دئے۔۔۔۔ خط!۔۔۔ "تم نے شاید سکندر فلم میں بڑے ارسطو کے الفاظ سنے ہوں گے۔۔۔ لڑکی تو صورت دیکھتی ہے دل نہیں دیکھتی۔ تم نے بھی میرا جسم دیکھا دل نہیں دیکھا، تم جو آج کل مجھ میں دلچسپی لے رہی ہو ضرور کسی لگاؤ کی بنا پر ہے!" ـــــ

کھانے پر ظہیر نے خوشخبری سنائی کہ جواب لے آیا ہوں۔ یہ مژدہ سُن کر اُن کے دل کی کلی کھل گئی۔ لقمے بڑی سرعت سے منہ میں منتقل ہونے لگے، بڑے مگن تھے، فقرے بھی چست ہو رہے تھے، چچی خلافِ توقع خوش پا کر پوچھ ہی بیٹھیں۔ میاں آج بڑے خوش ہو! وہ ہنس کر بولے ابا جان نے میری ایک جگہ شادی طے کر دی، چچی کے منہ سے لگاتار دعائیں اور مبارکبادیں نکلنے لگیں لیکن آپا اُن کے اس من گھڑت جھوٹ پر مسکرا رہی تھیں ـــــ انہوں نے ہاتھ دھو لئے۔ مگر ظہیر آہستہ آہستہ کھاتا رہا۔ وہ پریشان تھے۔ آپا بھی ان کی بے چینی کو محسوس کر کے لطف لے رہی تھیں ـــ جس وقت ظہیر نے خط دیا انہوں نے اسے دل سے لگا لیا گو بچے کے سامنے ایسی حرکت کرنے پر نادم ہوئی!۔۔۔ خط۔۔۔ "ہمارے آگے کسو نے چیتر اٹھا لیا"

فلمی دنیا

فلمی ریویو

بسنت

بمبئی ٹاکیز کی بسنت جس کا افتتاح ریجنٹ لاہور میں ہنگامہ خیز کامیابی سے ہوا۔ بعض اعتبار سے قابلِ ذکر بیچ ہے۔ اس سے پیشتر بمبئی ٹاکیز کے فلم اپنی افسانوی حیثیت ڈرامائی اپیل اور مختلف تفریحی پہلوؤں کے لحاظ سے تقریباً یکساں قسم کے رہے۔

پڑھا لکھا شریف الطبع نوجوان لڑکا حسین تربیت یافتہ لڑکی ان کی شادی کی راہ میں سماجی بندھن۔ ایک دائم المرض بزرگ جو قدامت پسند ہونے کے باوصف نوجوانوں کیلئے دل میں ہمدردی رکھتا ہے۔ کم از کم ایک کمسن بچہ۔ دو تین گیت جو جذبۂ قومیت سے لبریز ہوں۔ رقیب جو آخر کار اپنی نیک دلی کا ثبوت بہم پہنچا دے۔ پولیس اور ڈاکٹر اور ہاں ریل گاڑی بمبئی ٹاکیز کا کون سا سماجی فلم ہے جس میں ریل نہ ہو۔ مشہور امریکن ڈائرکٹر ارنسٹ لیوبٹش کا فتویٰ ہے کہ فلم میں ریلوے ٹرین کے آنے اور مسافروں کی ریل پیل اور ان کی مختلف حرکات سے دیکھنے والوں کیلئے ایک اچھی خاصی دلچسپی کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بمبئی ٹاکیز کے بیشتر سوشل فلموں میں متذکرہ بالا عناصر آپ کو مختلف صورتوں میں بار بار دکھائی دیں گے۔ نتیجہ یہ کہ فلموں میں تنوع پیدا نہیں ہو سکتا۔ بسنت نے یکسر لوپری کر دی۔ اس کی روش عام فلموں سے جداگانہ ہے۔ بلحاظ مضمون کے اعتبار سے بسنت کو سکرین اور سٹیج کا ایک بہار آفریں مرقع کہہ سکتے ہیں۔ کیا اسٹیج شریف عورتوں کے لئے موزوں نہیں۔ یہ مسئلہ کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ جسے پردۂ سیمیں پر بمبئی ٹاکیز کی روایتی دلفریبیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بسنت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے۔ کہ ہیروئن کے لئے بمبئی ٹاکیز والوں نے اپنی اس روایت کو پہلی مرتبہ نظر انداز کر دیا کہ وہ کسی فلم میں اہم رول ایسی عورت کو نہیں دیں گے جو پورے معنوں میں "سوسائٹی گرل" نہ ہو۔ ہمانسو رائے آنجہانی اس روایت پر سختی سے عامل رہے۔ دیوکا رانی، لیلا چٹنس، سینہ پربھا کے بعد اب ..... ممتاز شانتی! ڈیلی ہیرالڈ کے فلمی نقاد کا بیان ہے۔ کہ ممتاز شانتی اب مسٹر ولی ہے

لہٰذا رائے بہادر چونی لال نے بہت اچھا کیا کہ مسز موصوفہ کے آرٹ سے نہ صرف فائدہ اٹھایا۔ بلکہ اسے چار چاند لگا دیئے۔ اور حق یہ ہے کہ ممتاز شانتی بسنت میں از سرتا پا نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ بمبئی ٹاکیز کا کمال یہ ہے کہ اس نے سوہنی کمہارن کی ہیروئن کو بسنت کی ہیروئن بنا دیا۔ ایسے موقعوں پر سینمائی محاورہ یہ ہے کہ ڈائرکٹر نے ہیرو یا ہیروئن کی شخصیت کو "STreamLine" کر دیا۔ کیا معنی کہ اس کے ناہموار اور کھردرے پہلوؤں کو تراشیدہ کر کے مربوط اور بہ حیثیت مجموعی خوبصورت بنا دیا۔ بسنت دیکھنے کے بعد ایک دوست نے کہا یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا "کرنڈ آئیل" بمبئی ٹاکیز کی کیمیائی لیبوریٹری میں جا کر سیرڈل بن گیا ہے۔ اس کے متناسب اعضا شعریت سے بریز سکنات و حرکات مترنم آواز اور ناچ۔ غرضیکہ ممتاز شانتی کی شخصیت کا کوئی پہلو نہیں جسے بسنت میں بوجہ احسن بروئے کار نہ لایا گیا ہو۔ وہ ممتاز ایسے ماہر رقص کے بالمقابل ناچتی ہے۔ کامل کامیابی کے ساتھ۔ بلکہ اپنی نغمہ ریزی سے اس پر چھا جاتی ہے۔ بسنت کے تین چار گیت لوگوں کو مدت تک یاد رہیں گے۔ خصوصیت سے بالم دھیرے بول کوئی سن لیگا۔ میرے چھوٹے سے من میں چھوٹی سی دنیا رے۔ اور اُدھر چھوری گنگا کے پار ملن۔

ڈرامہ میں ٹیلی فون اور ریڈیو انتہائی دلچسپی کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ خاص کر ریڈیو ماں اور لڑکی کے ملاپ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ماں بیٹی کی ملاقات بہت اثر ریز یا گریہ انگیز ہے اور معاف کیجئے "پنجابیت" سے قطعاً مبرا۔ مطلب یہ کہ پنجابی فلم ہوتی تو اس سین میں ماں بال نوچتی سینہ کوبی کرتی اور اپنا اپنے بچی کا چہرہ لہولہان کرتی ہوتی۔ غش کھا کر زمین پر گر جاتی اور پھر خدا جانے کیا ہوتا اور کیا نہ ہوتا۔ لیکن بسنت کے ڈائرکٹر نے اس سین کو غلو و غرابت سے قطعاً محفوظ رکھا ہے۔ اور یہ اس کا انتہائی کمال ہے۔ پدمیلا نے غارت گر حسینہ کا پارٹ قابلِ تحسین خوبی سے ادا کیا ہے۔

کیا ناظرین تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیں گے۔ نرمل (الیاس) کا کردار فہم سے بالاتر ہے۔ وہ تھیٹریکل کمپنی کے مالک کا کیا تھا؟

ٹلی کو سٹیج کی فضا سے دُور رکھنے کی خاطر کلکتہ چلا جاتا ہے - بیوی اس کے لئے مر چکی ہے - اس کے باوجود اس نے اپنی لڑکی کو ایک نامور ریڈیو سٹار بنا دیا - وہ ناچتی بھی ہے - اور گاتی بھی ہے اور آخر کار بغیر کسی معقول وجہ کے اسے سٹیج کی اسی فضا میں دھکیل دیا - جہاں وہ سانس لینا بھی پاپ سمجھتا تھا - خیر - ممتاز شانتی اور ممتاز کی خاطر فرزندہ دلان پنجاب اس عارین تصویر کو بار بار دیکھیں گے - ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ - امید ہے کہ لبنت جس کی نمائش موسم برسات میں ہوتی ہے خزاں اور سرما کی منزلیں طے کرنے کے بعد آئندہ موسم بہار تک جاری رہے گی -

سٹیشن ماسٹر

"ریل بابو کی کہانی" اس فلم کا عنوان ہو سکتا ہے - ریلوے ملازموں کی زندگی - عینک لگائے میز پر جھکے ہوئے آنے جانے والی گاڑیوں کے اوقاتِ آمد و رفت کی پابندی - افسروں کے رعب سے دبے ہوئے نوکروں کی طرح ان کی نظریں زمین پر گڑی رہتی ہیں اور حُسنِ اتفاق سے انہیں سر اٹھانے کا موقع ملے اور کوئی پیاری صورت نظر آجائے تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر دوڑ جاتی ہے - ان کی زندگی کا ہر پہلو ہلکا اور حقیر سا نظر آتا ہے - معمولی اغراض کے لئے افسران بالا کو خوش کرنے کے لئے بہانے کے قصے (بنائے جاتے ہیں) چھوٹی چھوٹی سازشیں - پھر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ ریلوے ملازم کی ذرا سی غلطی کے باعث ہزاروں انسانوں کی زندگیاں فنا سے دوچار ہو سکتی ہیں - غرضیکہ یہ ریل بابو سٹیشن ماسٹر ہو یا کانٹے والا عظیم ذمہ داریوں کی گراں باری سے ان کے کندھے جھکے رہتے ہیں - اور غیر رومانی فرائض کی یکسانیت سے ان کے دل و دماغ فرسودہ ہو جاتے ہیں - اس غیر دلچسپ بیک گراؤنڈ کے بالمقابل پرکاش پکچرز نے ایک زبردست ہیجان پرور اور کیف آور فلم پیش کیا ہے جو لاہور کے رٹز سینما میں کئی ہفتوں سے عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے -

پرمانند سٹیشن ماسٹر کا کردار جگدیش سیٹھی نے اپنی روایتی شان سے نبھایا ہے - نیو تھیٹرز کا نظام منتشر ہونے پر فلمی ستارہ ایک سیارہ بن گیا اور اب بڑی کمپنیوں میں شاید ہی کوئی باقی رہ گئی ہو جس نے اس کیریکٹر ایکٹر کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھایا ہو - ایک ساتھ ہی چار فلموں میں مختلف اہم رول ادا کرنے کے باوجود اس کی اداکاری کا معیار بدستور بلند ہے - اور ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھر باک نہیں کہ سٹیشن ماسٹر کی ترجمانی میں وہ نیو تھیٹرز کے اونچے سے اونچے معیار تک پہنچ گیا ہے - کہانی کا سب سے طاقتور پہلو رتن مالا نے اوشا کی حیثیت میں پیش کیا ہے - اوشا سٹیشن ماسٹر پرمانند کی بھتیجی ہے - جس کے بیاہ کی چنتا اسے کھائے جا رہی ہے - اردن (پریم ادیب) گارڈ ٹرین کے ساتھ آتا ہے

اس طرح گارڈ اور سٹیشن ماسٹر کی لڑکی کہانی کے مرکزی کردار بن جاتے ہیں - پھر مانک بابو (جیون) ہیڈ کلرک ہے جو اردن گارڈ کو دامادی میں لینا چاہتا ہے اور اس کی لڑکی شاما کو شلیا ہے - کالی چرن سگنل مین اور اس کی بیوی سونا بڑے پیار سے رہتے ہیں - مانک بابو کی یہ کوشش ہے کہ اوشا کی شادی ریلوے افسر رنجن بابو سے ہو اور اس کی اپنی بیٹی شاما کا بیاہ اردن گارڈ سے ہو - اردن اور اوشا کے متعلق افواہیں پھیلنے لگیں - پرمانند سٹیشن ماسٹر سخت پریشانی کے عالم میں تھا - جس کے باعث گاڑیوں میں تصادم ہو گیا - تحقیقات کے نتیجہ میں پرمانند پر کوئی حرف نہ آیا اور یاس انگیز حالات ایک پُرلطف کامیڈی میں بدل گئے - اس فلم میں جگدیش رتن مالا اور پریم ادیب کے علاوہ نشاکر نے سگنل مین اور امیربائی نے سگنل مین کی بیوی سونا کی حیثیت میں اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں - پریم ادیب اوّل سے آخر ایک پیشہ ور گارڈ نظر آتا ہے - بلکہ ایک معاصر نے از راہِ طنز یہاں تک لکھ دیا - کہ پریم ادیب کو ایکٹر کی بجائے گارڈ بننا چاہیئے تھا - سٹیشن ماسٹر میں تفریح و تفنن کا سامان فراوانی کے ساتھ موجود ہے اور اس کے علاوہ یہ ریل بابوؤں کی زندگی کا صحیح مرقع ہے -

آنکھ مچولی

نشاط لاہور میں پنڈت راماشنکر چودھری نے ایک طویل مدت کے بعد اپنی ہدایت کاری کا نمونہ "آنکھ مچولی" میں پیش کیا ہے - کبھی زمانہ تھا - کہ امپیریل فلم کمپنی کے ڈائرکٹر چودھری کا سکہ ہندوستان کی فلمی دنیا پر جما ہوا تھا - یہ سلوچنا کے عروج کا زمانہ تھا - پھر چودھری کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا فلمی افق پر نئی نئی صورتیں جلوہ آرا ہو گئیں - فلم آرٹ نے ایک عظیم صنعت کی صورت اختیار کر لی - حال میں امر پکچرز کے مالک سیٹھ چمن لال ڈلیائی نے چودھری کو اپنے کمال کے مظاہرہ کا موقع دیا - جس کا نتیجہ آنکھ مچولی ہے - اس سراسر دلچسپ فلم سے یہ حقیقت ایک دفعہ پھر آشکارا ہو گئی ہے - کہ فلم پروڈیوسر کے لئے ایک درجن ایمچرا اور خام کار ڈائرکٹروں کی پلٹن رکھنے کی بجائے ایک پرانا تجربہ کار ماہرِ فن ڈائرکٹر رکھنا کہیں زیادہ نفع خیز ہے -

کہانی سینریو اور مکالمے یہ سب چودھری کے زرخیز دماغ کی تخلیق ہیں - کہانی کے کردار اپنے اپنے مخصوص خط و خال کے ساتھ نمایاں حیثیت سے نظر آتے ہیں - سر چونی لال سنہا ایک متمول زمیندار ہے - اس کی وفا شعار بیوی رادھا ہے - اور ان کی بچی ایکاوشی - پھر مشتبہ چال چلن کی عورت سونا ہے - رادھا یہ دیکھ کر میرا پتی اس عورت کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے - اپنی لڑکی کو ساتھ لئے کہیں دُور نکل جاتی ہے - گمنام اور

افلاس زدہ رادھا کی لڑکی شباب کی منزل پہ آتے ہی دعوتِ نظارہ دیتی ہے اور فلم میں نئے کردار داخل ہو جاتے ہیں۔ جو بے جو دھرم کی آڑ میں کیا کیا ذلیل حرکات کرتا ہے۔ جو بے ایک گرسنہ بھیڑیئے کی طرح معصوم ایکاوشی پر جھپٹنا چاہتا ہے۔ ڈائرکٹر چوہدری نے افلاس زدہ حسن کی بے بسی اور سماج کے ہوس کار گرگوں کی ستم رانی کا نقشہ صفائی و صحت سے پیش کیا ہے۔ اور مختلف واقعات کی دلچسپی کو عروجی مقام تک قائم رکھا ہے۔ ماں بیٹی ایک تلاطم خیز دریا کو انتہائی دُکھ درد کے بعد عبور کر کے سلامتی کے کنارہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ سرچونی لال سہنا ایکاوشی سے ملتا ہے۔ گو اسے معلوم نہیں کہ یہ میری بیٹی ہے۔ اس کے بعد اظہارِ حقیقت و ندامت اور غلط فہمیوں کا ازالہ اور گھر ملو مسرت و شادمانی کا نیا دَور۔ سابق ڈائرکٹر اے۔ پی کپور نے سرچونی لال کا پارٹ نمایاں کامیابی سے ادا کیا ہے۔ اس کا لب و لہجہ اور اندازِ تخاطب ہر توصیف سے بالاتر ہے۔ کتے کی طرح وفادار اور ”جی حضوری“ ٹھاکر کا کردار نگندرہ موزمدار نے کمال خوبی سے نبھایا ہے۔

کملا چیٹرجی ”پیاری“، اور ستیش چھوٹے ہیرو کی حیثیت میں شاد کام رہے۔ ان سب سے بالاتر پارٹ نلنی جے ونت کا ہے۔ اس آنکھ مچولی میں وہ درخشندہ ستارے کی طرح ہے جس سے سارا فلم جگمگا اُٹھا ہے۔ کہانی کا بار بیشتر اس کے نازک کندھوں پر پڑتا ہے۔ لیکن اس آزمائش میں اس نے فاتحانہ کامیابی حاصل کی۔

ڈائرکٹر چوہدری نے سلوچنا اور جلو کو آنکھ مچولی میں لا کر پرانا حقِ رفاقت ادا کر دیا ہے۔ سلوچنا جو کبھی شباب کی جملہ رعنائیوں سے عبارت تھی۔ اب ایک بھولا ہوا افسانہ ہے۔ جس کی یاد لمحہ بھر کے لئے آنکھ مچولی سے تازہ ہو جاتی ہے۔ جلو بھی وہ منزلیں طے کر چکی ہیں۔ جب اس کے آرٹ کی تعریف میں ایک کور ذوق فلم ایڈیٹر نے اسے ”لیڈی لان چینی“ کا بے معنی لقب دیا تھا۔

لان چینی آنجہانی سینمائی دنیا کا مشہور اداکار تھا۔ ایڈیٹر نے اپنی جہالت کے باعث جلو کو مرحوم کی ”لیڈی“ بنا دیا۔ بہرحال جلو بھی سینمائی اعتبار سے ایک داستانِ پارینہ ہے اور چوہدری کا کمال یہ ہے کہ اس نے اسی سلوچنا اور اسی جلو کے ذریعہ آنکھ مچولی میں خاص قسم کی دلفریبی پیدا کر دی ہے۔

ناظر بی۔ اے

فلمی نوٹ

پیلس لاہور میں فلم خاندان کی سلور جوبلی ہندوستان کی سینمائی دنیا کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ابھی کچھ زیادہ مدت منقضی نہیں ہوئی کہ ہندوستان کے فلمی نقشہ پہ پنجاب کا نام اتنے باریک حروف میں تھا کہ اسے ڈھونڈنے کے لئے شاید خوردبین کی ضرورت پڑتی۔ اب پنجاب فلمی اعتبار سے ہندوستان پر چھا رہا ہے۔ سیٹھ دلسکھ پنچولی نے پنجاب میں پروڈکشن کا کام نہایت ہمت شکن حالات میں شروع کیا۔ گذشتہ تلخ کامیوں کی یاد ابھی تازہ تھی اور سینمائی نظم و نسق میں پنجابی روایات ایسی دھیں جو ہمارے لئے قابلِ فخر نہیں۔ پنچولی نے غیر متوقع عجلت کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا۔ کامیابی نے استقبال کیا۔ خزانچی دراصل آل انڈیا پیمانہ پر ایک چیلنج تھا۔ بمبئی اور کلکتہ کے نام ”ذرا سنبھلنا پنجاب آ رہا ہے“۔ اس کے بعد خاندان نے اس چیلنج پر صداقت کی مہر لگا دی۔ اب زمیندار کی باری ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ زمیندار اپنے پلیش رو فلموں پر سبقت لے جائے گا۔ اب کی مرتبہ پھر ─── سید امتیاز علی تاج کا خامہ گل فشاں حرکت میں آیا ہے۔ افسان کی کہانی کے کرداروں کا حقِ ترجمانی ادا کرنے کے لئے شانتا آپٹے، منورما، غلام محمد، اسمٰعیل، نارنگ، بیبی اختر، انوری، اجمل اور انگریزی محاورہ ”بیٹ بیوٹی“ کے بالمقابل ”بلیسٹ“، یعنی درگا موٹا۔

پرکھات لاہور میں منگتی کو سلور جوبلی کی منزل طے کئے ہفتے ہو چکے ہیں۔ منگتی ان لوگوں کے لئے ایک مسکت جواب ہے۔ جو یہ سوال کرنے کے عادی ہیں کہ کیا کوئی پنجابی بھی فلمی کاروبار میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور ہمارے لئے یہ امر انتہائی مسرت کا موجب ہے کہ میسرز شوری سنیٹرا اور جو بیئر نے اس باب میں پنجابیوں کی لاج رکھ لی۔ اگر ناظرین است بین الاقوامی تحریک کی مخالفت نہ سمجھیں اور صوبائی طرفداری پر محمول نہ کریں تو اس حقیقت کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ پنجاب میں سو فی صدی پنجابی فلم کمپنی کامیابی سے بنانے کا سہرا شوری سینٹرا اور ان کے لائق فرزند روپ کرشن شوری کے سر ہے۔ پنجابی سرمایہ پنجابی اداکار پنجابی ڈائرکٹر اور پنجابی پبلسٹی انچارج از لبکہ منگتی کی حیرت افزا کامیابی اس کے داخلی محاسن یعنی افسانہ کی بصیرت افروزی مکالمہ کی شگفتگی موسیقی کی سحر کاری اور اداکاری کی نفاست پر موقوف ہے۔ لیکن اس میں بے شبہ پبلسٹی کو کافی دخل رہا ہے۔ مسٹر الیس۔ آر باصر شعبۂ نشر و اشاعت میں اپنے صحافتی تجربے اور ادبی لطافتوں کو ایسی خوش اسلوبی سے بروئے کار لائے ہیں کہ ان کے مرتبہ اشتہار میں بھی ایک خاص لطف ہوتا ہے۔ اور منگتی تازہ ترین ثبوت ہے اس دعوے کا کہ پبلسٹی کے لئے نصف درجن خوش پوش اناڑیوں کے بجائے ایک سیدھا سادا ماہر جرنلسٹ اقتصادی اعتبار سے کہیں بہتر ہے۔

چند اعداد و شمار

جنرل آف فلم انڈسٹری نے امریکہ اور ہندوستان میں سینما کے کاروبار سے متعلق ایسے کوائف بہم پہنچائے ہیں جن کی روشنی میں صنعتی اعتبار سے امریکہ کی برتری اور ہندوستان کی زبوں حالی آشکارا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تھیئٹروں کی تعداد ۱۶۹۵۱ ہے۔ جو ۸۴۸۸ قصبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سینما امریکی صنعتوں میں چوتھے درجے پر ہے۔ جسقدر روپیہ کسی فلم میں لگاتے ہیں۔ اس کا ۷۰ فیصدی حصہ تو اپنے ہی ملک میں وصول ہو جاتا ہے اور باقی ۳۰ فیصدی غیر ملکوں سے۔ فلم پر لگائے ہوئے سرمایہ کا ۶۰ فیصدی چھ سے ۹ مہینوں کے اندر اور باقی ۴۰ فیصدی ½ ۱ سال سے ½ ۱ سال کے درمیان واپس مل جاتا ہے۔ ہمارے معاصر نے دوسرے ملکوں کے اعداد و شمار پیش نہیں کئے۔ جنگ سے پیشتر یہ حالت تھی کہ روس میں دس ہزار جرمنی میں ۵ ہزار برطانیہ میں ۴۸۷۹ فرانس میں ۴۰۰۰ اٹلی میں ۴۰۰۰ سینما تھیئٹر تھے۔ روس میں ہر ۱۲ ہزار اشخاص کے لئے ایک تھیئٹر ہے اور ہندوستان میں ۵۲۴۵۸۷ اشخاص کے حصہ میں ایک تھیئٹر آتا ہے۔ گذشتہ ۲۵ سال کے دوران میں آبادی کی عظیم اکثریت کے لئے کسی قسم کی سینمائی تفریح کا انتظام نہیں کر سکے۔

ہندوستان کی ساری فلم انڈسٹری پر لگائے ہوئے سرمایہ کی مجموعی میزان ۱۵ اور ۲۰ کروڑ روپیہ کے درمیان ہے۔ تین سو فلم کمپنیاں ہیں۔ جن میں ۲۵ ہزار اشخاص کام کرتے ہیں۔ ہر سال ۳۵۰ تصویریں بنائی جاتی ہیں۔

مختلف نقطہ ہائے نظر

سر سٹیفورڈ کرپس

حال میں سر سٹیفورڈ کرپس نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا کہ جنگ کے باعث روس کی سینمائی سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جنگی مقاصد کے حصول کے لئے روس کے مرد عورتیں اور بچے انتہائی ایثار سے کام لے رہے ہیں۔ اس وقت روس میں اگر تفریح کا ذریعہ ہے تو وہ موسیقی ڈرامہ سینما اور رقص ہے اور روس کی عظیم کلچر کے لئے یہ اتحاد اربعہ سنگِ بنیاد کا کام دیتا ہے۔ سوویٹ حکومت نے ان فنون کو زمانہ امن میں اور اب بھی جبکہ جنگ جاری ہے۔ ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور کر رہی ہے۔

مسٹر بی۔ جی کھیر سابق وزیر اعظم حکومت بمبئی

چونکہ مہاتما گاندھی نے ہر یجن میں ریڈیو اور سینما کے خلاف چینی کی تھی اس سے متاثر ہو کر فلم انڈیا کے نمائندے نے مسٹر کھیر سے استفسار کیا۔ کیا مہاتما جی کے لئے یہ مناسب تھا کہ سینما دیکھے بغیر ہی اس کی مخالفت پر تُل جاتے مسٹر موصوف نے جواب میں کہا۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ مہاتما جی نے یہ نہیں کہا کہ سینما "ہمیشہ" برا ہوتا ہے بلکہ آپ نے فرمایا۔ کہ "بسا اوقات" برا ہوتا ہے۔ اس رائے میں سینما کی طرفداری کے لئے کسی قدر گنجائش ہے۔ مسٹر کھیر نے ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کہ میں سینما کے حق میں ہوں اور وزیر اعظم کی حیثیت میں میں نے ایک سکیم مرتب کی تھی۔ جس کے مطابق بمبئی میں ایک ورزشگاہ ایک تیرنے کا تالاب ایک ریسٹورنٹ اور ایک سینما نہایت ہی اچھی داموں پر مزدوروں کے لئے مہیا کیا جاتا۔ آپ کی رائے میں بالغوں کی تعلیم کے لئے سینما سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں اور بمبئی کی حکومت نے ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے تعلیمی فلموں سے کام لیا تھا۔ سینما کو اگر غیر پسندیدہ عناصر سے پاک کر دیا جائے تو یہ قومی تعمیر کا اہم ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

لالہ فقیر چند آنند

سب ایجنٹ سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ لاہور کا نیا اعزاز

دنیائے بنکنگ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اور بالعموم لالہ فقیر چند صاحب آنند کے احباب یہ سن کر نہایت خوش ہوں گے کہ انسٹی ٹیوٹ آف بنکرز لنڈن نے لالہ صاحب موصوف کو اپنا فیلو منتخب کر کے اُنکی وہ عزت افزائی کی ہے جس کے وہ ہر طرح سے مستحق تھے۔ بنک سے لین دین رکھنے والے کاروباری اصحاب کو لالہ جی کی وسعتِ قلبی کا پورا پورا اندازہ ہے۔ آپ کی تمام تر توجہ اپنے کاروبار سے متعلق اصحاب کی خدمت کرنے میں مبذول رہتی ہے۔

سنٹرل بنک کی روز افزوں ترقی کا راز بھی ایسے ہی ہمدرد اشخاص کی شبانہ روز کوششوں میں مضمر ہے۔ ہم لالہ جی کی خدمت میں اس عزت افزائی پر تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ چونکہ لالہ صاحب موصوف نے اپنے شعبہ میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ لالہ جی کی مختصر سوانح حیات اپنے ناظرین کی معلومات کے لئے درج کریں۔

"لالہ فقیر چند صاحب آنند ۲۶ اگست ۱۸۸۷ء کو بمقام کالا لوچ ڈلہوزی ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد آپ کی طبیعت کا رجحان بنکنگ بزنس کی طرف ہوا۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۰۲ء میں بنک آف بنگال لاہور سے اپنی بنکنگ لائف کا آغاز کیا۔ وہاں سے ۱۹۰۶ء میں لاہور بنک لمیٹڈ میں آ گئے۔ پھر ۱۹۱۶ء میں پنجاب نیشنل بنک لمیٹڈ لاہور نے آپ کو انسپکٹر آف برانچز کے جلیل القدر عہدہ پر فائز کر دیا۔

اس اثنا میں لالہ جی کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں جب سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ کی لاہور برانچ کا افتتاح ہوا تو بنک ہذا کے مینجنگ ڈائرکٹر سر ایس۔ این۔ پوچکھا نوالا نے لالہ جی کی خدمات کو سنٹرل بنک کے لئے حاصل کر لیا۔ یہاں اُنہیں اپنے جوہر نمایاں کرنے کا پورا موقع حاصل ہوا۔ چنانچہ اس بنک کی کئی برانچوں میں بطور ایجنٹ کام کر کے ۱۹۴۰ء میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے چیف آفس میں سب ایجنٹ مقرر ہوئے۔ اور حال ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف بنکرز لنڈن نے آپ کے ۳۸ سالہ بنکنگ بزنس کے تجربے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ کو اپنا فیلو منتخب کر لیا۔

وارڈن انشورنس کمپنی لمیٹڈ بمبئی

کمپنی ہذا کے ڈائرکٹران نے جو رپورٹ پیش کی ہے وہ نہایت حوصلہ افزا ہے جس میں دیگر امور کے علاوہ اس امر کا بھی ذکر ہے کہ کمپنی نے اپنا صدر دفتر احمد آباد سے بمبئی میں تبدیل کر لیا ہے۔ جہاں کمپنی نے اپنی ایک نہایت عالی شان بلڈنگ تعمیر کی ہے۔ مزید براں کمپنی نے فائر اور حادثات کے بیمہ کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔

آجکل جنگ کی وجہ سے بیمہ کا کاروبار بہت کم ہو گیا ہے۔ وارڈن نے ۲۵۹،۱۰،۳۶ روپیہ کا نیا بزنس کیا ہے۔ جس میں سے ۲۱۰۸ پالیسیاں یعنی ۲۹،۵۱،۸۴۴ روپیہ کی ہیں اور گذشتہ سال کی نسبت گرانقدر اضافہ ظاہر کرتی ہیں اس وقت کمپنی کا کل کاروبار مبلغ ۱،۰۵،۰۰،۰۰۰ روپیہ تک پہنچ چکا ہے۔ آٹھ سال کی قلیل زندگی میں اتنی بڑی رقم کے کاروبار پر کمپنی بجا فخر کر سکتی ہے۔

اخراجات وغیرہ وضع کرنے کے بعد کمپنی کی پریمیم انکم -/۶،۰۶،۱۵۵/۶ روپیہ ہے۔ جو گذشتہ سال کی رقم سے بقدر ۵۰،۰۰۰ روپیہ زائد ہے۔ شرح خرچ کا تناسب فقط ۳۴ فی صدی ہے۔ جو اس عمر کی کمپنیوں کے مقابلہ میں غالباً سب سے کم ہے۔

فائر اور حادثات کے بیمہ کی مد میں بھی خاصی ترقی ظاہر کی گئی ہے۔ حالانکہ ان محکمہ جات کو جاری ہوئے صرف چار ماہ کا عرصہ ہوا ہے۔

وارڈن انشورنس کمپنی نے حال ہی میں اپنا برانچ آفس لاہور میں کھولا ہے۔ جس کے مینجر مشہور انشورنس ایکسپرٹ مسٹر پی۔ وی مارکنڈن ایم اے ہیں ہمیں امید ہے کہ پنجاب آفس کمپنی کی ترقی و بہبودی میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوگا۔

اردو وادب کا علمی تعلیمی فنی ادبی

ماہنامہ

شاہکار

The SHAHKAR

1942

اکتوبر

مدیر اعلیٰ شمس العلما علامہ تاجور

مدیر مسئول عبدالحلیم انصاری

شاہکار لاہور

جلد (۱۴) فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر نمبر (۱۰)

مختصرات

اورینٹل کالج لاہور

یکم اکتوبر کو اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل مسٹر شفیع کالج کی پرنسپل شپ سے ریٹائر ہوگئے اور نئے پرنسپل نے چارج لے لیا۔ مسٹر شفیع کے رخصت ہونے پر تمام کالج اور خصوصاً مسلم اسٹاف کے ممبروں نے بہ یک زبان خدا کا شکر ادا کیا ہے۔ کیونکہ مسلم اسٹاف کالج میں اُن کی سخت گیر آقائی کو حدِ برداشت سے متجاوز سمجھ رہا تھا۔

یہ تو ہوتا ہے کہ کسی پرنسپل کے ماتحت اسٹاف میں اگر دس خوش ہوتے ہیں تو دو چار پرنسپل سے اپنے ذاتی مفاد کی ناپذیرائی کے سبب ناخوش بھی ہوا کرتے ہیں کہ کوئی شخص ہر کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے کہ پرنسپل شفیع کے ناروا طرزِ عمل سے ہر شخص جو کالج سے کسی نہ کسی صورت میں معاشی تعلق رکھتا ہے اُن سے بیزار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بیزاری کو اُن کے خوف سے کچھ لوگ دل ہی میں رکھتے تھے۔ مگر زیادہ تعداد اُن حضرات کی ہے کہ جو اِس جذبہ تنفر کے اظہار میں زبان کو بھی دل کا ترجمان بنائے ہوئے تھے۔

سابق پرنسپل نے اپنے سخت گیرانہ سلوک سے ماندازِ استعارہ اسٹاف اور عملۂ انتظام کو یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ اُن کو خدا کی مخلوق نہیں سمجھتے۔ بلکہ اپنی مخلوق تصور کرتے ہیں اور یہ کہ وہ ان کو بنانے بگاڑنے میں "فعّالٌ لما یُرید" کی حیثیت کے مالک ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے علوم عربیہ کے فاضل استاذ علامہ میمن عبدالعزیز جو ہندوستان کے علاوہ مصر اور شام میں بھی علمی شہرت رکھتے ہیں اور آج مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر کی حیثیت میں چھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پا رہے ہیں۔ بدنصیبی سے اِن کے ماتحت اورینٹل کالج میں کچھ مدت کام کرتے رہے ہیں، لیکن سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بھی ان کے لئے وہ کالج کی غیر ضروری لعنت بنے رہے اور بالآخر انہیں مستعفی ہونا پڑا۔

مولینا سید محمد طلحہ علوم عربیہ کے ایک وحید العصر فاضل اِن [illegible] کُش طرزِ عمل کے ہمیشہ شاکی رہے اور انجام کار میعادِ [illegible] کے ختم ہونے سے پہلے ہی استعفا دے کر چلے گئے۔

[illegible] حسن الدین صاحب ایم۔ اے جو فارسی ادب میں عبور تام [illegible] کے جور بے کراں کے کارٹون بن کر رہ گئے ہیں۔

وہ سخت جاں تھے کہ اپنے حقوق کی پامالی دیکھتے رہے اور اپنی علمی خود داری کو اِس آنچ سے بچاتے رہے۔ اب پرنسپل کے دورِ نامسعود کے خاتمے پر پہلی بار اطمینان کا سانس لینا انہیں میسر ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر پی، ایچ ڈی نے اپنی خود داری کی حفاظت میں ذہن پاش تکلیفیں برداشت کیں، اپنے مفاد کو تباہ کیا۔ مگر اُن پر آفریں ہے کہ ستم آرا آقائی کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے۔

جامعۂ ازہر (قاہرہ) کا ایک فاضل استاذ جو حالات سے بیخبری کے باعث اس کالج سے معاشی تعلق پیدا کر چکا تھا۔ واقف ہونے کے بعد پہلی فرصت میں کالج پر تین حرف کہہ کے رخصت ہوگیا۔

مولینا نور الحق منشی فاضل کلاس کے انچارج پروفیسر جو ادب عربی و فارسی میں یکساں وسیع نظر رکھتے ہیں۔ پرنسپل شفیع کی نقصان رسانی سے اپنے آپ کو ہمیشہ غیر محفوظ محسوس کرتے رہے۔

کالج کے ہیڈ کلرک مسٹر صدیق احمد خاں ایم۔ اے جو انگلش میں پرنسپل شفیع سے زیادہ قابلیت کے مالک ہیں۔ پرنسپل کی جا و بیجا جھڑکیوں اور سخت گیریوں کے آماجگاہ بنے رہے۔

بورڈنگ کا مسلمان سپرنٹنڈنٹ اس مظلوم کے داغہائے سینہ تو دیدنی نہیں ہیں۔ نا دیدنی ہیں۔

کالج میں دو ایک مسلمان استاد ایسے بھی ہیں کہ اُنہیں چپ لگی رہی۔ لیکن اُن کے ضبطِ فریاد کا پس منظر شعلۂ جوالہ بنا رہا۔ اُن کی خلوتی مجلسیں پرنسپل کے شکوہ ہائے بے کراں سے معمور رہیں۔

ایک دیانت دار اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنے والا انسان جو پرنسپل اور کالج کے حالات سے واقف ہو حلف اُٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ اس شخص کے ماتحت کام کرنا انسان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ اس افسوسناک کہانی کا ایک مضحکہ انگیز پہلو یہ ہے کہ اِس رستم داستان کی قہرمانی اسٹاف اور عملۂ انتظام کے غیر مسلم ممبران پر دانت پیسنے کی حد سے آگے قدم رکھنے کی مجال کبھی نہ پا سکی۔

کالج کے سابق ہندو ہیڈ کلرک پرنسپل شفیع کو کبھی خاطر میں نہ لایا۔ پرنسپل شفیع اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور سنا جاتا ہے کہ ان دونوں میں رابطۂ گفتگو بھی منقطع رہا۔ لیکن ہیڈ کلرک کا جاہ و جلال

ملاحظہ ہو کہ وہ دفتر کے کاغذات پرنسپل کی حضوری میں خود پیش کرنے کی بجائے چپراسی کے ہاتھ ان کے کمرے میں بھیج دیا کرتا تھا اور خود ان کے دفتر میں جانا اپنی خودداری کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس واقعیت کی عینی شہادت کالج اسٹاف کا ہر ممبر دے سکتا ہے۔

گذشتہ سال کالج کے ایک ہندو چپراسی کو اپنی روایتی خفگی کی لپیٹ میں انہوں نے لینا چاہا تھا مگر اُس نے ان کے آہنی حدود دیناکر اپنے حدود میں قدم رکھنے سے روک دیا۔ اس واقعے کی تفصیل ادارۂ شاہکار کی بجائے اسٹاف کی زبان سے سننے کے لائق ہے۔ مختصر یہ کہ پرنسپل شفیع اپنی خود ساختہ فرماں روائی کا تختۂ مشق صرف مسلم اسٹاف اور مسلم ملازمین ہی کو بنایا کئے۔ کالج کے غیر مسلم رقیبوں پر ان کے حاکمانہ اقتدار کا ارمان اخیر تک دل میں حسرتِ انفعال ہی کی صورتیں بدلتا رہا۔

شاہکار کے تعلیم یافتہ طبقے میں اورنٹیل کالج سے متعلق ہمارے بیانات ایک افسانۂ خواب کی صورت پڑھے جا رہے ہوں گے کیوں کہ جو لوگ کالجوں میں تعلیم پا چکے ہیں یا تعلیم دے رہے ہیں یا کسی کالج میں پرنسپل ہیں وہ اپنے اپنے مشاہدات کو ان بیانات سے منطبق نہ دیکھ کر حیرت زدگی میں مبتلا ہو رہے ہوں گے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عام کالجوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص مشکل ہی سے ان بیانات کو باور کرے گا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اورنٹیل کالج لاہور کو دوسرے کالجوں پر قیاس کرنا ہی صحیح نہیں اس کے نام کے ساتھ "کالج" کا لفظ تعلیم یافتہ طبقے کو اس مغالطے میں مبتلا کر دیتا ہے کہ عام کالجوں کی طرح یہ بھی ایک کالج ہے اور اس کے متعلق اندازے کی غلطی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

کبھی اپنے ابتدائی دور میں یہ کالج صحیح معنی میں مشرقی علوم والسنہ کا ایک مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اور اس عہد زریں میں اس کالج سے جو طلبہ تکمیل تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے وہ جہاں بھی پہنچے انہوں نے اپنا علم امتیاز بلند کئے رکھا لیکن اس دور کو ختم ہوئے ۳۵ سال کے لگ بھگ گزر چکے ہیں۔ مسٹر وولنر آنجہانی کی پرنسپلی سے کالج کی معنوی اور ظاہری حیثیت پر زوال کا آغاز ہوتا ہے اور ان کے بعد مسٹر شفیع کی پرنسپل شپ کا زمانہ اس آغاز کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔

مسٹر وولنر پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی تھے اور اورنٹیل کالج کے پرنسپل بھی۔ یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے باہر ان کی مصروفیتیں بےشمار تھیں۔ اس لئے انہوں نے کالج کے سیاہ و سپید پر کالج کے ہیڈ کلرک کو طاری کئے رکھا۔ کالج کے اساتذہ انگریزی نہ جاننے کے سبب پرنسپل کے لئے ناقابل خطاب و توجہ بن گئے اور اس لئے ہیڈ کلرک ہی عملی طور پر انتظام میں پرنسپل کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ اُس نے اپنے حدود اختیار کو اس قدر وسعت دی کہ کالج کے حدود سے علمی خودی اور تعلیمی خودداری عنقا ہو گئیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھا کہ کبھی ہیڈ کلرک کسی کلاس میں آتا تھا تو اورنٹل اور شمس العلماء علامہ مفتی عبداللہ مرحوم تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو جاتے تھے۔ شمس العلماء علامہ عبدالحکیم کلانوری مرحوم نے ایک بار اپنی خودداری کا اظہار کرتے ہوئے ہیڈ کلرک کے بلانے پر اتنا کہہ دیا تھا کہ "مجھ سے جو کچھ کہنا ہے لکھ کر بھیج دو، میں کلاس کو پڑھا رہا ہوں"۔ اس کا حشر یہ ہوا کہ وہ اپنی جرأت پہ قربان ہو گئے اور ایسا عدیم النظیر فارسی دان یک بینی و دو گوش کالج کے حدود کا خس و خاشاک بن کر اڑ گیا۔ مولوی عالم کے مدرس مولوی محمد علی نے ایک بار طالبعلموں کی گذارش پر کالج کے چپراسی کو جو ان کی کلاس میں سے پانی کا گھڑا لے کر بار بار گزرا کرتا تھا روکا تھا۔ اس کے چند ہی دن بعد وہ کالج کے آب و جغرافیے سے جو نکلے ہیں تو انہیں پھر آنا نصیب نہ ہوا۔ ان واقعات سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس عہد تاریک کا اورنٹیل کالج کس پہلو میں کالج کہلانے کا مستحق تھا؟ مسٹر وولنر کے وائس چانسلر بننے کے بعد پرنسپل شفیع پرنسپل بنائے گئے۔ تو اسٹاف کو توقع ہو گئی کہ ہماری معلمانہ حیثیت کا احترام بحال ہو جائے گا۔ مگر اس سلسلے میں اُس کی توقعات نہ صرف مجروح ہوئیں بلکہ بہت بری طرح کچلی گئیں، انہوں نے پرنسپل شپ کو گاڈشپ کا ہم معنی بنا کر اپنے خدائی اختیارات میں جباری و قہاری کے رنگ کو تیز کر کے کالج کے منحوس دور تاریک کو زیادہ مہیب صورت میں زندگی تازہ بخش دی۔ علمی خودی و خودداری حدود کالج کی اشیاء ممنوعہ بنا دی گئیں۔ اس اجمال کی تفصیلات بہت اندوہناک ہیں۔

کالج سے ان کی رخصتی ایک مصیبت طاری کے ختم ہونے کی برابر سمجھی گئی۔ ان کے اسٹاف نے الوداعی پارٹی دینے سے بھی احتراز کیا۔ اس کے برعکس نئے پرنسپل کی آمد پر تمام اسٹاف مسرور نظر آتا ہے، باہم مبارکبادوں کا سلسلہ جاری ہے اور مسلم اسٹاف تو بالخصوص اپنے جوش مسرت کو چھپا نہیں سکتا۔ کیوں کہ نیا پرنسپل جو بیس سال تک اسٹاف کا ایک ممبر بنا رہا ہے۔ حد درجہ شریف، علم نواز، منکسر المزاج قابل اور قابلیت دوست تصور کیا جاتا ہے۔ اگر سابق پرنسپل کے اُن دوستوں نے جو یونیورسٹی کے نظم و نسق پر حاوی ہیں اور جو مسٹر شفیع کی حمایت میں جا و بیجا کا امتیاز اٹھا چکے ہیں۔ نئے پرنسپل کو کام کرنے کا موقعہ دیا تو یقین ہے کہ کالج کی فضا ان تمام تاریک کثافتوں سے پاک و صاف ہو جائے گی۔ جو کالج کے تعلیمی معیار اور علمی وقار کو تباہ کرتی رہی ہیں۔

اورنٹیل کالج کی کالج کونسل

ہر کالج میں ایک کالج کونسل ہوا کرتی ہے۔ کالج کے [illegible]

جونیر اساتذہ اس کونسل کے ممبر اور پرنسپل صدر ہوتا ہے۔ کالج کے تمام انتظامی و تعلیمی معاملات اس کونسل میں پیش ہو کر کثرت رائے کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ کالج کے کسی معاملے سے متعلق کونسل کے ممبران کی اکثریت اور پرنسپل کی تجاویز باہم مختلف ہوتی ہیں مگر اکثریت کی رائے پر جو تجویز منظور ہوتی ہے۔ وہی نافذ سمجھی جاتی ہے اور پرنسپل کو بھی اکثریت کی رائے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس کونسل کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ پرنسپل اور اسٹاف میں تعاون و تعامل قائم رہتا ہے اور اسٹاف کا ہر ممبر کالج کی بہبودی اور ترقی کے لئے ساعی رہتا ہے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کا احترام پرنسپل کے لئے ضروری بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پرنسپل اپنے آپ کو اس سے زیادہ کچھ خیال نہیں کرتا کہ وہ بھی رستا کا ایک ممبر ہے اور اسٹاف کے تمام ممبر اس کے رفقائے کار ہیں۔

مگر اس عجیب و غریب کالج (اورینٹل کالج) کے انوکھے پرنسپل (مسٹر شفیع) چونکہ کسی صورت میں بھی اپنے اسٹاف کے ممبران کو سطح مساوی پر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے کالج کی کونسل میں اسٹاف کے صرف وہ دو تین ممبر لے رکھے تھے جنہیں پرنسپل کی رائے کو الہام آسمانی ماننے میں تامل کی جرأت نہ تھی اور کونسل کے باقی ممبر کالج سے باہر کے لوگ لئے جاتے رہے۔ حالانکہ ہر کالج کی کالج کونسل کالج کے تمام اسٹاف سے عبارت ہوتی ہے۔ بیرونی حضرات کو کالج کونسل میں ممبر بنانے کا تصور صوبے کے اور صوبہ کیا تمام ملک کے کسی پرنسپل کے دماغ میں کبھی نہ آیا ہوگا۔ اورینٹل کالج کی کالج کونسل میں ... کو اسی لئے "باہر کا آدمی" سمجھا جاتا رہا کہ ان پر ڈکٹیٹری انداز کا رعب طاری رکھنا مقصود تھا۔ خیر یہ دور مشوم ختم ہوا۔ زائد المیعاد پرنسپل اب

"اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہو کر"

امید ہے کہ اورینٹل کالج کا جدید ہر دلعزیز اور عالم دوست پرنسپل جانے والے کی باقیات السیئات کو ایک ایک کرکے مٹاتے ہوئے پرانی نام نہاد کالج کونسل کے خاکستر پر عام کالجوں کے مطابق نئی کالج کونسل بنائے گا اور اس طرح اساتذہ کے علمی وقار کو بحال کرے گا۔

(ادارہ)

نوٹ:۔ اگلے نمبر میں ہم یہ بتائیں گے کہ کسی زبان کے استاد کی قابلیت کا معیار کیا ہونا چاہیئے؟ اور ہمیں کس قسم کے نالائق لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے

(ادارہ)

علمی و ادبی صدمات

(۱) **حکیم الطاف احمد انصاری** کی رحلت کا صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ بہار سے مولینا فضل حق آزاد عظیم آبادی کے انتقال کی خبر ملی، حضرت آزاد مرحوم اردو شاعری کے متاخرین کے دور کی آخری شمع اور دور جدید کے رہنما کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ ان کی وفات دنیائے اردو کے لئے ناقابل تلافی نقصان متصور ہوگی۔

(۲) دہلی کے مشہور صوفی شاعر **پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی** بھی زندگی کی آخری منزل طے کر گئے۔ ساحر کو اگر شہید شاعری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نصف صدی تک اردو شاعری ان کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ رہا۔ یہ ان مقدس لوگوں میں سے تھے جن کے مشرب میں ہندو مسلم کا امتیاز اور دیر و حرم کی تفریق کلمۂ کفر خیال کی جاتی ہے اور حسرت ہے کہ اس بابرکت گروہ کے افراد ایک ایک کرکے ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔

(۳) اس صوبے کے مشہور قانون دان **مسٹر عبید اللہ ایڈوکیٹ** کی حسرتناک وفات کی خبر ملک کے علمی، قانونی اور مجلسی طبقات میں بڑے تحسّر کے ساتھ سنی جائیگی۔ انکی قانونی قابلیت ہمہ گیر تھی۔ دیوانی، فوجداری اور دیگر آئینی کاروباری شعبوں میں وہ یکساں طور پر قانونی مہارت و قابلیت کے مالک تصور کئے جاتے تھے۔ ملک کے کسی ایک وکیل میں اسقدر مختلف قانونی قابلیتیں بہت کم جمع ہوتی ہیں، شاید نہیں ہوتیں۔ مختلف علوم و السنہ بالخصوص سیاسیات عالم، مختلف اقوام و ممالک کے دستور ہائے آئینی اور تاریخ پر انکی نظر بعید وسیع تھی۔ بعض ایسے مقدمات کی پیروی کرنے کا بھی انہیں موقع ملا جو بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ گنج گراں مایہ موت نے ہم سے چھین لیا۔ ہم ان کے برادران خورد مشہور افسانہ نگار محترم شیخ عباد اللہ صاحب اڈیٹر عالمگیر اور ... سے اس صدمۂ جانکاہ میں دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ "الارض تبقی والاخلاء تذہب۔" تاجور

علامہ سیماب اکبرآبادی

نغمۂ وقت

دل اک جہانِ خودی چشمِ اعتبار میں ہے
دل اختیار میں ہے۔ سب کچھ اختیار میں ہے

زبسکہ دیر، شگفتِ مزاجِ یار میں ہے
ابھی بہار سرا پردۂ بہار میں ہے

مذاق ناز بھی انسان کے شعار میں ہے
ہزار میں جو نہیں ہے تو سو ہزار میں ہے

شکیب دل کو کچھ ایسا خیالِ یار میں ہے
کہ جیسے پھول کوئی دامنِ بہار میں ہے

مری نگاہ میں ہے، میرے اختیار میں ہے
وہ انقلاب جو تقدیرِ روزگار میں ہے

دل اور عشق میں ترکِ معاملہ ہے ہنوز
ہوس کے ساتھ ابھی نفس کاروبار میں ہے

کرے نگاہ سے معلوم خود مقام اپنا
وہ کارواں جو نہ منزل نہ رہگذار میں ہے

چمن کے سوزِ نہفتہ کا دے رہی ہے پتہ
یہ ایک جنبشِ پیہم جو برگ و بار میں ہے

کسی سے سستیٔ پیماں کا کیا کروں شکوہ
مرا سکون ہی فردائے اعتبار میں ہے

یہ ولولے دلِ مرحوم تک ہی زندہ تھے
نہ اب ہے قرب میں لذت نہ انتظار میں ہے

تری قبائیں ہیں تکلیفِ دوش اے منعم
طمانیت مرے دامانِ تار تار میں ہے

ہو ٹھوکروں سے نوازش کہ ناز و نفرت سے
نشاطِ سجدہ تمہاری ہی رہگذار میں ہے

نوا و ناز کو رخصت کرو کہ اب دنیا
صدائے صورِ قیامت کے انتظار میں ہے

ہے اپنی آخری حد پر مآلِ آدم زار
اور آدمی وہی فکرِ نشاطِ کار میں ہے

سپردِ خاک ہیں، پھولوں سے کھیلنے والے
چمن فروش ابھی اندیشۂ بہار میں ہے

عمل بقا ہے، فنا ہے سزائے بے عملی!
حیات و موت سب انساں کے اختیار میں ہے

مؤرخینِ چمن کو یہ راز ہے معلوم
ہمارا خون بھی رنگینیٔ بہار میں ہے

ہے مُردہ آج ہر انساں۔ مگر ہے فرق اتنا
کوئی مزار کے باہر کوئی مزار میں ہے

نظر لگے نہ اسے انقلاب کی سیماب
سکون و امن کی جنت مرے دیار میں ہے

(غیر مطبوعہ) (۱۳ دسمبر ۱۹۴۱ء)

کلرک کی زندگی

سید نصیر امام زیدی دہلوی
بی۔ اے

سعید میاں کا بچپن سے ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ پ کی اوقات اتنی نہ تھی۔ لیکن ایک تو اکلوتا بیٹا دوسرے ہونہار۔ تھیں۔ جس طرح بھی بن پڑی اپنا پیٹ کاٹا۔ سو ضرورتوں کو بند کا لیکن سعید کو بی۔ اے تک پہنچا ہی دیا۔ بیٹے نے باپ سے قول لے لیا تھا۔ ہ اسے ایم۔ اے ضرور کرا دیں گے۔ لیکن "تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ" بی۔ اے کے امتحان میں دو مہینے باقی تھے کہ باپ کو نمونیہ ا اور چار دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ سعید کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ تمام حسرتوں آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ گھر بھر کا بار سر پر پڑ گیا۔ پ جس کے سر سہرا تھا وہ ہی دم نہ رہا۔ اپنی تعلیم کا خرچ۔ بیوہ ماں۔ ن بہنیں، کرے تو کیا کرے۔ کہے تو کس سے کہے؟ بہتیرا سوچا کہ کوئی سست ایسی نکل آئے کہ دو مہینے تو کسی نہ کسی طرح لشتم پشتم گذر جائیں۔ بی۔ اے کا امتحان تو دے لوں، پھر محنت مزدوری کر دوں گا۔ اللہ لک ہے۔ لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ آخر ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ منہ سے ایک رف نہ کہہ سکا۔ ماں کی مامتا۔ دوڑ کر کلیجے سے لگا لیا۔ اور کہا میرے چاند اپنا جی بُرا نہ کر، مجھ رانڈ بیوہ کا جب تک سانس چل رہا ہے خود کو بیچ کر بھی تیرا یہ ہاتھ پورا کر دوں گی۔ یہ کہہ کر کوٹھری میں گئی اور اپنی چمپا کلی لا بیٹے کے ہاتھ میں یہ کہہ کر دے دی۔ لے ماں کی جان تو اپنا دل نہ کڑھا سے بیچ کر کالج کی فیس دے دے۔

سعید نے کانپتے ہاتھوں سے چمپا کلی لی اور اپنے مطالعے کے رے میں گھنٹوں بیٹھا اپنی پھوٹی تقدیر پر روتا رہا۔ ہزاروں خیالات سیلاب طرح امڈے چلے آتے تھے۔ ہر تصور جگر کے ٹکڑے کئے دیتا تھا۔ بھی سوچتا کہ ایک بہن جوان بیٹھی ہے۔ اسے کب تک گھر بٹھائے رکھوں گا۔ نجھلی اور چھوٹی بھی خیر سے خاصی ہوشیار ہو گئیں۔ آنکھ بند کرتے تین و سال گذریں اور وہ بھی جوان ہو گئیں۔ اگر ماں کا تار چھلا بھی اپنی تعلیم پر ب لگا دیا تو ان کے وقت پر کیا کروں گا۔ فقیر سے فقیر بھی ننگی بچی لڑکی گھر سے رخصت نہیں کرتا۔ دنیا میرے منہ پر تھوکے گی کہ بھائی کا راج [illegible] کا ایک تار بھی نصیب نہ ہوا۔ ایسے تو کنگال بھی [illegible] کا جا جا یا گھر تھا۔ دیگ کی کھرچن ہی بہت ہوتی ہے۔ ماں بھی لٹے گا تب بھی سوا لاکھ کا۔ کس کس کی زبان پکڑوں گا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ کسی کو کیا خبر کہ کیوں کر دن بیتر ہو رہے تھے۔ باہر تو سفید پوش رہنا ہی پڑتا تھا۔ ابا اللہ بخشے وضعدار آدمی تھے۔ مرتے دم تک اپنی وضع میں فرق نہ آنے دیا۔ آخر یہی سوچا کہ کچھ بھی ہو دو مہینے کی بات ہے، چودہ سال کی محنت اکارت ہوئی جاتی ہے۔ برسوں آنکھوں کا تیل نکالا ہے۔ بی۔ اے بھی نہ کیا تو کوئی دو کوڑی کو بھی نہ پوچھیگا۔ ہر چہ بادا باد۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمونکا کا کیا ڈر۔ ماں کا زیور بیچتے کیسی؟ جب ناچنے نکلی تو گھونگٹ کیسا؟ خدا کو منظور ہوا تو دن پھر ہی جائیں گے، وہ نہ رہے یہ بھی نہ رہیں گے اور اگر مقدر میں ہی پاپڑ بیلنے لکھے ہیں تو یہ چمپا کلی ہی کیا سہارا لگائے گی۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

بُری بھلی طرح دو مہینے گذارے، اللہ کا نام لے کر امتحان دیا۔ اور اس کی رحمت پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہا۔ دل کا خدا حافظ تھا۔ رات دن دُبدا اس پہ جان تھی۔ دیکھیے اللہ کیا کرتا ہے؟ باپ کی موت اس پہ ناداری، نہ دل ٹھکانے تھا [illegible] گیں خاک میں مل چکی تھیں اب تو امتحان ملے پڑا اڈھول تھا جو بجانا پڑا۔ نتیجے کا ایک ایک دن گنتا۔ رات دن نمازوں اور دعاؤں میں بسر ہوتی۔ خدا خدا کر کے وہ دن آیا اور اللہ نے سن لی۔ سعید نے دروازے سے ہی پکار کر کہا۔ اماں جان خدا نے اپنا بڑا کرم کیا۔ آپ کا [illegible] کامیاب ہو گیا۔ ماں سن کر اچھل [illegible] دوڑ کر بیٹے کو کلیجے سے لگا لیا۔ چٹ چٹ بلائیں لیں۔ ساتھ ہی دل [illegible] ہو [illegible] گیا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ کاش آج وہ زندہ ہوتے۔ اللہ بخشے قبر میں اپنے ساتھ یہ ارمان ہی لے گئے۔ اکثر حسرت سے کہا کرتے۔ خبر نہیں میری زندگی میں میرا بچہ کسی قابل ہو گا بھی یا نہیں۔ بیگم میں تو اس انتظار میں ہوں کہ سعید بی۔ اے کر لے۔ اگر جیتا رہا تو دیکھ لینا۔ نتیجہ آنے کے ایک ہفتہ کے اندر ہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ میں نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا آج تک پاپڑ ہی بیلے۔ بس ایک ہی تمنا پہ جیتا ہوں کہ اپنی آنکھوں سے سعید کو دولہا بنا ہوا دیکھ لوں۔ میں اکثر بگڑ کر کہہ دیتی کہ تمہیں بیٹے کی تو فکر پڑ گئی۔ بیٹی اللہ رکھے منہ کو آئی جاتی ہے، اس کا کچھ خیال نہیں۔ تو ہنس کر کہہ دیتے ہم باپ ہیں بیٹے کی فکر کر رہے ہیں۔ تم ماں ہو بیٹیوں کی فکر تم کرو

اس دن کی خبر نہ تھی کہ پڑا ارمان ہی سدھاریں گے - نہ بیٹے ہی کا کار کرنا نصیب ہوگا نہ بیٹی کا - یہ کہہ کر ضبط نہ ہو سکا - چیخیں نکل گئیں - ماں کو دیکھ کر بچے بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے - گھر بھر میں کہرام مچ گیا -

(۲)

سعید نے بادلِ ناخواستہ کالج کو خیر باد کہی - رات دن نوکری کی تلاش میں سرگرداں پھرتا - شام کو در در کے دھکے کھا کے بھوکا پیاسا گھر میں گھستا - باسی تازی دال چٹنی سے مل گئی تو کھا لی ورنہ اللہ کا شکر کیا اور پڑ رہا - دو مہینے کی رات دن پیروڑی کے بعد کسی دفتر میں چالیس روپے ماہوار کی عارضی نوکری جڑ گئی - خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا - ماں نے دو رکعت نماز شکرانہ پڑھی - بہنوں نے منتی روزے رکھے - سعید میاں دفتر جانے لگے - افسروں نے پہلے ہی اس کو کہہ دیا تھا کہ بھائی تمہاری ملازمت بالکل عارضی ہے - اگر محنت سے کام کرو گے تو مستقل ہو جاؤ گے ورنہ فوراً جواب مل جائیگا - دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے - تین مہینے بیکار جوتیاں چٹخاتے پھر چکے تھے - در در کے دھکے کھائے تھے - دفتر کے وقت سے گھنٹے آدھ گھنٹے پہلے پہنچتے اور چراغ جلے گھر میں آن کر گھستے - چودہ برس تعلیم حاصل کرنے میں لوہے کے چنے چبانے پڑے - اس سے فارغ ہوتے ہی نوکری کی بلا گلے پڑی سر منڈاتے ہی اولے پڑے - رات دن میں گھڑی بھر چین سے گذرنا نصیب نہ ہوتا - دن بھر دفتر میں دماغ سوزی کی، گھر میں قدم رکھتے ہی نون تیل لکڑی کی فکر میں سرگرداں ہوئے - جب کہیں رزق کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی - وہ بھی خیر سے روکھی سوکھی - چالیس روپلی کی اوقات ہی کیا - اس پر چار دم، پھر بہن کی بھی فکر کرنی لازمی - غنیمت یہ تھا کہ ماں سر پر موجود تھی - ہزار جوڑ توڑ کرتی اور جس طرح بن پڑتا سب ہی کچھ کرتی سال بھر بعد کسی نہ کسی طرح بیٹی کو گھر کا کر ہی دیا - جو کچھ قرض وام کیا تھا، رفتہ رفتہ اتارا - اب آخر ماں تھی - بیٹا اللہ رکھے جوان جہان بر سرِ کار تھا - کب تک نرا نروٹھا پھراتی - رات دن یہی فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح گھر میں بہو لے آؤں - خدا رازق ہے - وہ آئے گی تو اپنا رزق ساتھ لائے گی - بڑے میاں کی موت اور بھرداری کے فکروں نے مردہ کر دیا - سانس آیا آیا نہ آیا - آج مری کل دوسرا دن - باپ کا سایہ سر سے اٹھ ہی چکا - میاں بیوی کی آنکھ بند ہوئی تو لاوارثے کو بیٹی کون دے گا - لگے ہاتھوں یہ بھی کار کرتی جاؤں - ورنہ دل میں کہے گا اماں ٹانگ پسار کر مر گئیں - بیٹے کا فکر نہ کیا کہ وہ کیا کرے گا - یہ سوچ کر دل کڑا کیا - جان پر کھیل کر بہو گھر لے ہی آئیں - دین سے دنیا بھاری - کہنے کو تو بیاہ دیا - لیکن اکلوتے بیٹے کا پہلا کار کرنے بیٹھی تھیں - بہتیرا دانت بھینچ بھینچ کر بہت کام کیا لیکن کچھ نہ کرتے کرتے بھی ہزار بارہ سو کے پھیر میں آ گئیں - آخر پرائی لڑکی گھر لانی تھی - گڈے گڑیا کا بیاہ تو تھا نہیں کہ منہ کلیا پر ٹل جاتی - عمر بھر لوگوں کے ہاں کھایا تھا - آج کیسے ناک کٹا کر بیٹھ رہتی - دو دن نہ سہی دو وقت ہی سہی - دال ٹکیا سامنے رکھنی ہی تھی - بہو کو ستر ستائیس نہ سہی پانچ سات ہلکے بھاری جوڑے دینے لازمی - جھومر جھلنیا نہ سہی نتھ انگوٹھی ہاتھ گلے کا کچھ کرنا ہی تھا - غرض تھوڑا بہت بُرا بھلا سب ہی کچھ کرنا پڑا - اب کورے چالیس روپلے اور پورے کنبہ کا خرچ نئی بہو گھر میں دو بیٹیاں سینے پر سوار - ادھر قرض سے بال بال بندھا ہوا - کرے تو کیا کرے! کہے تو کس سے کہے؟ روز سوچتی کہ آج سعید سے کہوں گی بیٹا - سوکھی تنخواہ میں اب کیوں کر گذارہ ہوگا - کوئی ایک آدھ لڑکا ہی لگا لو - دس پانچ جو آئیں گے قرض میں ہی پھونکوں گی، کچھ تو بوجھ ہلکا ہوگا - لیکن جب بیٹا تمام دن کا تھکا ماندہ مغرب کے بعد گھر گھستا اور بے حال ہو کر پڑ جاتا تو منہ دیکھ کر رہ جاتی - ایک حرف کہنے کی ہمت نہ پڑتی - آمدنی وہی رہی - اور خرچ بڑھتے گئے - اب تک بہو بیٹے ہی تھے - اب پوتا پوتی والی ہو گئیں - نتیجہ ظاہر تھا - روٹی تک کے لالے پڑ گئے، ادھر بیٹیاں ادھیڑ ہونے کو آئیں - دن رات اسی ادھیڑ بن میں گذرتا - ساری ساری رات تارے گنتے [illegible] - [illegible]تی مصیبت کی ماری پھر اس پر ضعیفی اور رات دن کے فکروں [illegible] - [illegible] ہی دن میں مُرنڈا کر دیا - سوکھ کر ہدف ہو گئی - پلنے کی تو صورت ہی کیا تھی - غرض یونہی گھل گھل کر ایک دن ختم ہو گئیں -

(۳)

سعید کے لئے ماں کی موت تباہی کا پیش خیمہ ہوگئی - باپ کے سائے سے تو قدرت نے محروم کر ہی دیا تھا - ایک ماں کا دم رہ گیا تھا سب کو پروں تلے لئے بیٹھی تھی - لیکن وہی مثل ہوئی کہ اتنا بھی روپ کھو دوں تو کیا دے - پھر ایسی ناداری کی حالت میں مُرغی کو تکلے کا گھاؤ بہت کفن دفن فاتحہ درود سب ہی کچھ کرنی پڑیں - سو سوا سو روپلے کا قرض اور سر پر چڑھ گیا - چولہا میں سماتا نہیں دُم سے بندھ گیا چھاج - بہو اکثر ساس سے برگشتہ رہتیں - لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے - آج تک سمجھتی تھیں کہ اماں نہ معلوم بیٹے کی کمائی میں سے کیا کچھ ڈھب میں رکھتی ہونگی - لیکن جب اپنے ہاتھ [illegible] کیا تو آنکھیں کھل گئیں - پہلی تاریخ کو میاں نے کہنے کو [illegible] لا کر دئے - لیکن شام تک پانچ بھی نہ رہے - دس [illegible] کرا بیر دیا - پانچ روپے کمین دھوبی، سقے کو [illegible] کو کچھ اسے تو آئندہ [illegible] - چار [illegible]

پانچ روپے کا مرچ مصالحہ آگیا۔ آمدنی خرچ تقریباً برابر ہوا۔ رو پیہ دھیلی چٹ پٹ میں اُٹھ گیا اب چار پانچ روپے اوپر کا مہینہ۔ میاں غریب۔ دن بھر جان کھپانے کے بعد دو وقت کی روکھی سوکھی کا شرمندہ تھا اور بس۔ ماں کے سامنے سگرٹ چھوڑ بیڑی پہ آگیا۔ اب وہ بھی ختم ہوئی۔ صبح کا ناشتہ وغیرہ تو گیا بھاڑ میں۔ افیم کھانے کو دو پیسے جیب میں کبھی نہ ہوتے۔ لیکن غریب اُف نہ کرتا۔ صبح جو کچھ بیوی نے سامنے رکھ دیا اللہ کا شکر کر کے کھا لیا۔ اور کان دبا کر دفتر چلا گیا۔ شادی کی دعوت کے لئے دوستوں نے بیسیوں مرتبہ ایسا ایسا ذلیل کیا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن ہاں کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تہوار کو ایک ایک سے منہ چھپاتا پھرتا۔ ایک اچکن میں ساری گرمی گذر جاتی۔ اکثر لوگ جملے فقرے چست کرتے۔ میاں بیوی اماں سے کہو کہ اب یہ متی کپڑے بڑھائیں ورنہ بدن پر چپک کر رہ جائیں گے۔ یہ غریب گردن جھکا کر چپ ہو رہتا۔ گھر میں بیوی کہتی اے دیکھو تو مگوڑے بچے تپتی زمین پر ننگے پاؤں پھرتے ہیں لیتے آتے انگلی اُٹھانے کو نہیں۔ موئی چپلیاں لا دو! پاس پڑوس کی کوئی بیوی آنکلتی ہے تو غرق ہو جاتی ہوں۔ یہ دبی زبان سے کہہ دیتا بیگم کوڑی کوڑی تمہیں لا کر دے دیتا ہوں۔ مجھ سے کیا کہتی ہو۔ اللہ سے کہو۔ وہی اس بیڑے کو پار لگانے والا ہے۔ فی الحال تو منجدھار میں ڈوبتی نظر آتی ہے۔ بیوی بھی سن کر چپ ہو رہتی۔ میاں کے پاس ڈھکا چھپا ہو تو لڑتی بھی اچھی لگے۔ وہی بندھی تنخواہ اوڑھو بچھاؤ۔ بھرا موسم گذر جاتا مگوڑے بچے فصل کی پھل ترکاری کو ترستے رہ جاتے۔ لیکن ناکشتی کرنی بھی نصیب نہ ہوتی۔ محلے کے بچوں کی دیکھا دیکھی پیسے کے لئے ٹلک رہے ہیں۔ ماں کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ ہر چند بہلاتی ہے۔ لیکن بالک ہٹ مشہور ہے۔ عاجز آکر اٹھی۔ روٹی کے باسی کوسی ٹکڑے پر گڑ کی ڈلی رکھ کر پیار دلاسے سے ٹال دیا۔ لیکن دل کی جو حالت ہوتی، وہ ماں کے ہی دل سے پوچھئے۔ کلیجے کے ٹکڑے اُڑے جاتے تھے۔ ادھر سعید کو دو بہنوں کا فکر کھائے جاتا تھا۔ کہتا تھا ایسی کون سی گھڑی ہو جو یہ بالآخر خیریت کے اپنے گھر کی ہوں۔ مرحومہ ماں کی رُوح کلپتی ہوگی۔ جب کوئی صورت بن نہ آئی تو ایک روز بیوی سے عاجز اور دلگیر ہو کر بولا۔

سعید۔ تم سے بی سنتی ہو۔ مجھے آج تم سے ایک نہایت اہم مشورہ کرنا ہے۔

بیوی۔ ہے ہے۔ کیا کوئی نیا گل کھلا۔ خدا کے لئے جلدی بولو۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

سعید۔ تم اتنی گھبرا کیوں جایا کرتی ہو۔ اللہ کا فضل ہے سب طرح خیریت ہے۔ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری بہنیں تمہاری کون ہوئیں؟

بیوی۔ واہ یہ بھی عجیب بات پوچھی اے تمہاری بہنیں میری بہنیں۔

سعید۔ دل سے کہہ رہی ہو یا منہ دیکھے سے۔ تمہیں ہمارے سر کی قسم سچ کہنا۔

بیوی۔ مجھے پھیپھڑ دلاسے نہیں آتے۔ میں تو انہیں اپنی سگی بہنوں سے کم نہیں سمجھتی۔

سعید۔ بس تو بات ختم ہوئی، ان کی شادی کا جس قدر فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے، اتنا ہی تم پر۔ اپنا زیور مجھے دو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسے بیچ کر انہیں گھر بار کا کر دیں۔ خدا کو منظور ہوا تو پھر میسر آجائے گا۔

بیوی۔ بھلا اس ہیر پھیر کی بات سے کیا نتیجہ ہوا۔ سیدھے سبھاؤ کہہ دیتے تو کیا مجھے انکار ہوتا۔ جب میں ہی تمہاری ہوں تو ہر چیز تمہاری ہے۔ تمہارے ہی نشیب و فراز کے لئے جگا جگا کر رکھا تھا۔ بندہ بشر ہے ہزار موقعے پڑ جاتے ہیں۔ سو تمہیں اختیار ہے جب چاہو حاضر ہے۔

سعید۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) بیوی خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ آج بالکل ہر طرف سے مایوس اور عاجز ہو کر تم سے ذکر کیا ہے۔ کیا کرتے ان مظلوموں کا کون والی وارث بیٹھا ہے۔ ہر پھر کر ایک بھائی کا دم ہے۔ اور بس۔ میں ہی نہ کروں گا تو اور کون کرے گا۔

غرض بیوی کا کچھ زیور بیچا کچھ ساتھ کیا کسی نہ کسی طرح دونوں کو گھر کا کر ہی دیا۔ بیوی بیچاری کان ناک تک سے ننگی ہو کر بیٹھ رہی لیکن تیوری پر بل نہ آنے دیا۔

(۴)

بہنوں کی شادی کو مشکل سے سال بھر گذرا ہوگا کہ سب سے بڑی بہن بیوہ ہو گئیں۔ سسرال میں صرف میاں کا دم تھا وہ ہی قبر میں جا سوئے۔ ننھے ننھے اوپر تلے کے چھ بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے بھائی کو جو خبر ملی چکرا گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ رہا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ سوچتا تھا کہ اب ہوگا کیا۔ گرتا پڑتا بہن کے گھر پہنچا۔ وہ بدنصیب کھڑی اور پڑی پیٹ رہی تھی۔ بھائی کو دیکھتے ہی آکر لپٹ گئی اور رو رو کر کہا۔ بھیا تمہاری ماں جائی لٹ گئی۔ اچھے بھائی دعا کرو کہ میری میت بھی ساتھ ہی اٹھے۔ اب میرا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ میں اس کچے ساتھ کو لیکر کس گھر جاؤں گی۔

سعید نے بمشکل تمام اپنے کو سنبھال کر کہا بہن تیرا بھائی بے بس ہے، سہاگ تو واپس نہیں لا سکتا۔ لیکن جب تک اس کا سانس باقی ہے۔ بھیک مانگیگا محنت مزدوری کرے گا۔ پہلے تیرے بچوں کو کھلا کر پھر اپنے بچوں کی فکر کرے گا۔ میری مظلوم دکھیاری بہن اللہ کی مرضی پر شاکر رہو۔ وہ اپنے نیک بندوں کا اس دنیا میں ہی امتحان لیتا ہے۔ بی بی اس دردسے نہ رو، بھائی کا اب کلیجہ پھٹ جائے گا۔

بہن نے عدت پوری کی تو بھائی نے پندرہ روپے ماہوار کا مکان لیا۔ اور بچوں سمیت لے آیا۔ اب خیر سے چھ بچے بہن کے۔ چار اپنے۔ ایک بہن ایک بیوی ایک خود۔ تنخواہ میں تو روٹی بھی چلنی مشکل۔ آخر صبح کو ایک لڑکے کو پڑھاتا۔ دن بھر دفتر کا کام کرتا اور شام کے سات بجے سے رات کے دس بجے تک ایک سوداگر کی دوکان پر حساب کتاب لکھتا۔

آخر انسان تھا۔ حیوان بھی اتنی محنت مشقت کرے تو بیٹھ جائے۔ جب تک بن پڑی اپنے کو گھسیٹتا رہا۔ تین سال اسی کشمکش میں گذرے۔ صحت گرتی گئی۔ کبھی بخار ہے۔ کبھی معدے میں تکلیف ہے۔ پھر بیماری میں بھی آرام نصیب نہ ہوا۔ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح پلنا بخار میں ہل ہلا رہا ہے۔ سردرد کے مارے پھٹا جاتا ہے۔ گرمی کا یہ عالم کہ خدا کی پناہ۔ یہ مصیبت کا مارا اسی عالم میں اندر گودام میں بیٹھا حساب لکھ رہا ہے۔ رات کو ساڑھے دس بجے گرتا پڑتا گھر پہنچا۔ رات بھر درد میں لوٹتا رہا۔ بخار میں تپا کیا۔ صبح کو حالت ہی غیر ہوگئی۔ بہتیری ہمت کی۔ لیکن پلنگ سے اٹھا نہ گیا۔ دفتر سے تو سو جتن کر کے مہینہ بھر کی رخصت مل بھی گئی۔ لیکن صبح شام کے دونوں ٹھکانے چھوٹ گئے۔ اب تو روٹی کے ہی لالے پڑ گئے۔ کس کی دوا اور کیسی غذا۔ بیوی پہلے ہی کان ناک تک سے ننگی ہو چکی تھیں۔ بہن کا تار چھلا خاوند کی دوا دارو و فاتحہ درود میں برابر ہو چکا تھا۔ اور کوئی آسرا نہ وسیلہ۔ بیوی حسرت سے بیٹھی خاوند کا منہ تکتی رہتی، جب بے دوا غذا میاں کا تڑپنا نہ دیکھا جاتا تو گھبرا کر کوٹھری میں جا کر خوب دل کی بھڑاس نکالتی۔ ادھر بچوں کے بھوک سے بلکنے کی آوازیں آتیں، تو بے تاب ہو کر دوڑی آتی ایک ایک کو کلیجے سے لگاتی۔ دل میں سوچتی کہ اگر آج میرا گہنا پاتا ہوتا تو یہ بپتا نہ پڑتی۔ لیکن ایک حرف منہ پر نہ لاتی کہ میاں کو رنج نہ ہو۔ ادھر بہن بھائی کو اس حال میں دیکھ دیکھ کر پھڑکی جاتی۔ ندامت اور شرمندگی سے ان کے سامنے نہ ہوتی۔ پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ میں تاجہ بہن ڈائن بن کر آئی اور بھائی کو فراش کر دیا۔ اگر مجھ بدنصیب کا بار نہ پڑتا۔ تو یہ اس حال کو نہ پہنچتے۔ لیکن تنکے کا سہارا نہ تھا۔ اس کچے ساتھ کو لیکر کہاں جاتی، یہ کیونکر ممکن تھا کہ بچوں کی انگلی پکڑ کر سڑک پر جا بیٹھتی۔ دل ہی دل میں گھٹتی لیکن نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ اپنا چھڑا دم ہوتا تو بھائی کو کبھی مڑ کر نہ دیکھتا۔ اور اگر ایسا ویسا ننگ دیکھتی تو جس گھر جاتی محنت مزدوری کرتی ٹکڑا کھاتی۔ یا بھائی کے ہاں بیٹھ کر ہی آنے دو آنے کی سوئی سلائی کرتی تو ایک دم کو بہت تھی۔ لیکن اس چینٹیوں بھرے کباب کو کیا کرے۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ بھائی کی زندگی اس کے کارن خطرے میں آگئی۔ مگر کرے تو کیا کرے۔ کئی دفعہ اسقدر دم گھٹا کہ پکا ارادہ کر لیا کہ رات کو چپکے سے بچوں کو لے کر جدھر منہ اٹھے گا نکل جاؤنگی۔ عزت آبرو کو بٹہ لگے گا تو بلا سے، در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ تو آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک۔ میرا ماں جایا تو بچ جائے گا۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ایسا نہ ہو کہ وہی مثل ہو کہ

"آنا بھی روپ کھو دوں تو کیا رہے"

میں تو بھائی کے کارن دربدر ہو جاؤں اور بھائی دل میں سمجھے کہ جب تک بھائی کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے، بہن صدقے قربان ہوتی پھرتی تھیں۔ آج جب بھائی پر وقت پڑا تو اپنے بچوں کو لے چمپت ہوئیں۔ ایمان کی بات ہے۔ آج کے دم تک پہلے بہنوں کے بچوں نے سیر ہو کر کھا لیا۔ تو اپنے بچوں کو کھلایا۔ ان کا تن ڈھانک کر کچھ بچ رہا تو اپنی اولاد کی فکر کی۔ اس کا صلہ بہن نے یہ دیا۔ آخر میرے بچے بھی تو بھوک سے بلبلاتے ہیں۔ میں خود مرنے کو پڑا ہوں۔ دوا تو دوا غذا تک بھی میسر نہیں۔

یہ سوچ کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگتی۔ پاگلوں کی طرح کبھی گھبرائی گھبرائی پھرتی۔ پھر بھائی کے پلنگ کے گرد چکر کاٹنے لگتی اور رو رو کر کہتی۔ کہ بھیا! بہن تیری الا بلا لے کر مر جائے۔ ذرا آنکھ تو کھول! ارے میں تیری بے کسی کے صدقے فقط اشارے سے اجازت دے۔ میں بھیک مانگ کر تیری دوا دارو کروں گی۔ بھائی نے آنکھ کھولی اور عجیب حسرت کی نظر بہن پر ڈالی۔ بہن بھائی کو ندامت سے تکنے لگی۔ تمام بدن کانپ رہا تھا۔ اتنے میں بچے روتے ہوئے آکر ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئے اور کہنا شروع کیا۔ اماں بڑی بھوک لگ رہی ہے کل سے روٹی نہیں کھائی۔ اچھی اماں آیا پاس چلو اب ماموں جان روٹی نہیں دیتے۔ بچوں کے بھولے پن سے نکلے ہوئے الفاظ سعید کے دل پر نشتر بن کر لگے۔ بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ ایک آہ کی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ادھر بہن نے پچھاڑ کھائی۔ ادھر بیوی کی ہچکی بندھ گئی۔

(۵)

سعید کی حالت یک لخت بگڑ گئی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ تمام بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ تند بھا دہن سے تھی

شروع کیا۔ محلے والے جمع ہوگئے۔ انہی میں سے کسی اللہ کے بندے کو رحم آگیا۔ جاکر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہہ دیا۔ کہ قلب کی حرکت نے خوفناک صورت اختیار کرلی۔ کوئی شدید صدمہ پڑا ہے۔ دو تین منٹ سے زیادہ مریض کی زندگی کی امید نہیں۔ ڈاکٹر دروازے تک پہنچا تھا کہ سعید دارالمحن سے ہمیشہ کو رخصت ہوا۔

بہن اور بیوی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اپنوں کا تو ذکر ہی کیا غیر تک زار و قطار رو رہے تھے۔ اُن کے بین سُن سُن کر جگر پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ بچے بھوک سے بلک رہے تھے اور ماؤں کو ہوش نہ تھا۔ میت سے لپٹ لپٹ کر ہلکان ہوئی جاتی تھیں۔ بہن کہتی تھی۔ بھیا ڈائن بہن تم کو کھا گئی۔ اچھے تم ہی تو سرہو کر لائے تھے۔ مت جائے رانڈ بیوہ کے سر پہ ہاتھ رکھ کر لائے تھے۔ اب اسے کس پہ چھوڑے جاتے ہو؟ ارے میرا رنڈاپا تم سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ مجھے تسلی دیتے دیتے خود چیخیں نکل جاتی تھیں، اب اس دُکھیا کو چھوڑ گئے کہ کھادج کو رنڈسالہ پہنائے۔ ابھی بھیا اسی دن کے لئے بہن کو لائے تھے۔ ارے لوگو آج میں بن بھائی کی ہوگئی۔ مجھ بندی کو پانی پی پی کر کوسو۔ بیوی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ پیٹ پیٹ کر بدن نیلا کرلیا۔ بال نوچ ڈالے۔ بچے بلک رہے تھے۔ دل ہلا دینے والا سماں تھا۔ آج ایک پُر ارمان عمر بھر پا پیڑ بیل کر ننھے ننھے معصوموں کو یتیم اور بدنصیب شریک حیات کو بیوہ بنا کر تمام حسرت و ارمان کو سینے میں لے کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ آج جب بہن کو خیال آتا ہے کہ مقدر کے ہیٹے بھائی نے جب سے آنکھ کھولی ایک دن سکھ کا دیکھنا نصیب نہ ہوا تو دونوں ہاتھوں سے کلیجہ پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ بیوی جب اپنی۔ اپنے بچوں کی اور اس کے بچوں کی لاوارثی نظر آتی ہے۔ بے تحاشا چیخیں نکل جاتی ہیں۔ دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پُر ارمان کی میت بے گور و کفن سامنے پڑی دیکھ کر دیواروں سے سر ٹکراتی ہے۔ کاش سعید ایک غریب مزدور ہوتا تو ظاہرہ رکھ رکھاؤ نہ کرنا پڑتا۔ وضع داری کی فکر نہ ہوتی۔ دن بھر محنت مزدوری کرکے شام کو اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی وقت گذارتا۔ اگر معمولی تاجر ہی ہوتا تو سو دو سو ہزار پانچسو کا سرمایہ اپنے لاوارث کنبے کے لئے چھوڑ جاتا۔ کسی سوداگر کے ہاں ملازم ہوتا تو آج وہ اس کی احترام کے ساتھ منزل اوّل کرتا۔ اس کے ورثا کو تسلی ڈھارس دیتا۔ حتی الامکان ان کی مدد کرتا۔ قدمے درمے سخنے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کر [illegible] رکھتا۔ لیکن وہ ایک کلرک تھا۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے [illegible] مقدر کا لکھا اسے مل جاتا تھا۔ آج وہ اپنی خوشی نہیں بلکہ [illegible] ہمیشہ کے لئے بے حس و حرکت ہوگیا۔ اب اس کے حقوق ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے۔

قانون کی بے رحم اور غیر ہمدرد نگاہیں اس کی افسوسناک اور درد انگیز موت کو نہایت اطمینان کی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ مرنے والے کی عمر بھر کی خدمت گذاری۔ ورثا کی کس مپرسی کا عالم۔ ان کی گریہ وزاری چیخ پکار۔ رونا بلکنا پچھاڑیں کھانا اور ٹکرانا اس کی نظر میں دنیا کا روزمرہ ہے۔ اس قسم کے قیامت خیز منظروں سے اس کا دل نہیں پسیج سکتا۔ وہ نہایت مستقل مزاج ہے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ اسے اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ اس کے چہرے پر آثار حزن و ملال کے بجائے خفیف سی مسکراہٹ اور مسرت رقصاں ہے۔ اس خوشی پہ کہ اس کے ایک پرانے تھکے ہوئے مہنگے خدمت گار کے عوض اسے تر و تازہ نوجوان طاقتور اور سستے دو یا تین ملازم نہایت آسانی سے مل سکتے ہیں۔ روئے وہ اس کی موت پہ اس کی بلا کو کیا غرض ہائے کاش آج کوئی مرنے والے کے دل سے پوچھے کہ عمر بھر پاپڑ بیلنے کے بعد بھی اس کی رُوح کو چین نصیب نہ ہوا۔ اس کی روح اپنی ماں جائی اور بدنصیب شریک حیات کو اور اس کے معصوم بچوں کو تڑپتا بلکتا دیکھ کر کلپتی رہے گی اور وہ بے بسی سے دیکھے گا اور کوئی مدد نہ کرسکے گا۔

سعید کا تیسرے دن سیم ہوا۔ گھر میں دن بھر کہرام عظیم بپا رہا۔ تیسرے پہر نند بھاوجیں نڈھال اور بے حال ہو کر پڑیں کہ پوسٹمین نے آواز دی۔ مرحوم سعید کا بڑا لڑکا قسیم ایک بڑا سرکاری لفافہ لے کر داخل ہوا۔ ماں پھوپھی نے پوچھا اتنا بڑا لفافہ کس کا ہے اس نے رو کر کہا۔ ابا جان کے دفتر سے آیا ہے۔ دونوں مقدر کی ہیٹی اپنی کم فہمی سے سمجھیں کہ شاید دفتر کو مرنے والے کی پُر ارمان و حسرتناک موت پر اور اس کے ورثا کی لاوارثی پر رحم آگیا۔ اس لئے مرحوم کی خدمات کے عوض کوئی وسیلہ ہماری زندگی کے لئے مقرر کردیا ہے۔ قسیم نے خط کا ترجمہ بلند آواز سے پڑھا جو حسب ذیل تھا:۔

"دفتری یونین سعید احمد کلرک کی قبل از وقت موت پر انتہائی افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ اسے مرحوم کے وارثوں سے کافی ہمدردی ہے۔ وہ دعا کرتی ہے کہ سعید احمد کو پروردگار عالم جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اس خط کی نقل مختلف اخباروں میں بھیجی جا رہی ہے اور اس کی ایک کاپی یونین کے فائل میں شامل کردی گئی ہے۔"

خدا نہ کرے جو دنیا میں کسی کی امیدیں یوں بندھ کر پل بھر میں لُٹ جائیں اور وہ حسرت سے آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک جگر سوز ٹھنڈا

(خان بہادر) امین حزیں

پیامِ ادب

نشاط و عیش کے مسیلمہ[1] کو یہ پیام دو — کہ سازِ نغمۂ بدی نئے پیمبری نہیں
شباب اگر بگڑ گیا تو عمر بھر کا روگ ہے — بگڑ کے پھر سنور سکیں سبھی تو بھرتری[2] نہیں
جبھی تو ہے نہاں نقابِ رنگ میں شمیمِ گل — برہنگی کا نقش کچھ بھی ہو، مصوّری نہیں
ادب ہے ایک سلسلہ وفورِ ذوق و شوق کا — یہ وجد و حالِ قلب ہے جنونِ خودسری نہیں
جوانیوں کی مستیاں ہیں مستیاں ہی مستیاں — ادا فروشیاں کسی حسیں کی دلبری نہیں
سکھا نہ شاہباز کو کبوتروں کی سرخوشی — کمندِ عیش میں پھنسا ہوا جواں جری نہیں
نگاہِ مستِ میفروش[3] کی اشارتیں سمجھ — قلندری نہ ہو تو کام کی سکندری نہیں
جو پر کٹا ہو باز آسماں کی سیر کر چکا — وہ بیج ہو چکا شجر جو وقفِ خودگری نہیں
ہزار سحر پھونکئے کلیمؑ بے نیاز ہے — خلیلؑ کو جلا سکے مجالِ آذری نہیں
لبِ مسیحؑ کا پیام ہے نویدِ زندگی — نہ ڈال دے جو راہ پر خضرؑ کی رہبری نہیں

ادیب سے بعید ہیں ہلاکت آفرینیاں
کہ معصیت کی تربیت امیںؔ سخنوری نہیں

---

[1] مسیلمہ کذاب جو رسول صلعم کے عہدِ مبارک میں پہلے مسلمان ہوا لیکن بعد میں مرتد ہو کر مدعیٔ نبوت ہوا۔ اس نے قرآن مجید کے جواب میں کچھ خرافات بھی تصنیف کیں۔ خلیفۂ اوّل صدیق اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا۔

[2] بھرتری ہری۔ ایک عیاش راجہ جس نے بعد میں اصلاحِ نفس کر کے رشیوں کا درجہ حاصل کیا۔ بھرتری ہری کے اقوالِ حکمت حد درجہ صنعت کے انمول موتی ہیں۔

[3] میفروش سے یہاں مراد پیرِ ہندی علامہ سر محمد اقبال مرحوم و مغفور ہیں۔

پالش

پنڈت پرکاش بھوشن

سوا دو روپے کا ہیٹ۔ ایک روپیہ چھ آنے کی ٹائی۔ سات آنے کا کالر۔ ملا کے ہوئے چار روپیہ ایک آنہ اور یہ پانچ آنے کے موزے چار روپیہ چھ آنے ٹھیک بیہ تو نقدی نکل گئی۔ اب گیارہ گیا۔ ایک آنے کے تسمے اور ہاں پالش تو یاد ہی نہیں رہی۔

کل مجھے اپنے ایک واقف کار کی شادی پر جانا تھا۔ بس یونہی مل گیا راستے میں۔ مدت ہوئی وہ ہمارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ بیچارے نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ اپنے گھر لے گیا۔ بڑے تکلف سے چائے پلائی۔ دو بیڑے پان کے کھلائے اور تاکید کی کہ کل ٹھیک دس بجے ضرور آ جانا۔

میں ابھی ابھی حامی بھر کر چلا آ رہا تھا۔ کہ دل نے کہا۔ کیا یونہی الڑھ پن سے بنے جاؤ گے؟ ذرا سوٹڈ بوٹڈ ہو جاؤ۔ وہ بھی کیا کہے گا خوشی کا دن اور کھدر کے کپڑے۔ بٹوہ دیکھا۔ ساڑھے چار روپلے پڑے آرام کر رہے تھے۔ اُن سے کہا کہ میاں اٹھو۔ تمہارے آزمانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب جو ہاں بازار آیا تو یہ سب سامان خرید ڈالا۔ یہ ہیٹ۔ یہ ٹائی۔ یہ کالر۔ ..... دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ آخر جوان ہے۔ کوئی اُدھرا لوڑھا کھوسٹ تو ہے نہیں جو سوٹ بوٹ کا نام سنتے ہی کھا نے لگے۔ یہ آپا یار رہا تھا دل خوش ہو رہا تھا۔

"پالش بابوجی۔" سیاہ چمڑی والے ایک پور بیئے چمار نے میرے فلیکس کے بوٹوں کی طرف نگاہ جماتے ہوئے پیلے پیلے دانت دکھائے۔ اور اُس کے پاس کھڑا اُس کا دوسرا ساتھی یوں میرے منہ کی طرف تکنے لگا۔ گویا میرے منہ پر بھی پالش کرنا ہے۔ "ہاں۔ ہاں۔ مگر ذرا جلدی ....." کہہ کر میں اپنے تسمے کھولنے کیلئے جھکا۔

"دیکھ کرنہ کریں بابو بس جلکی ہی لیو ... آں ہاں۔ ہم کھولے لیتے ہیں۔ تم کاہے تکلیف کری۔" یہ کہہ کر اس کالے کلوٹے کلچر نے بڑی رحم دلی سے میرے تسمے کھولنے شروع کئے۔ اس کا ساتھی بھی اپنا بنچہ رکھ کر ڈٹ گیا۔ پھر دونوں نے ایک ایک بوٹ بانٹ لیا اور لگے بیے دردی سے اُن پر برش کو رگڑنے۔ میں نے بھی اپنا یہ نیا خریدا ہوا مال پاس کی ایک ٹولیٹ (TO LET.) دکان پر رکھ دیا اور لگا ان دونوں کو گھورنے۔

کالے چمار نے بوٹ پر انگلی سے پالش لگاتے ہوئے کہا: "سول بھی لگا دیں بابوجی؟"

"تجھے جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کر بھائی!" میں نے جواب دیا۔

"دیکھ بلوا۔ سالی مچ کا چمڑا لگے ہے۔" بوڑھے نے بوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"..." بلوا نے پوچھا۔

"تو اتنی دیر سے پنجاب میں رہے ہے پر یہ نہ جانت کہ مچ کا ہووے۔ ارے لساطو کے بیٹے بھینس جو ہوئی۔"

کالا کلچر۔ کالے بوٹ۔ کالی بھینس اور یہ کالی بولی، میرا جی متلانے لگا۔

"صبو سے یہ بابوجی کا ہی کام کیا ہے۔ یا دوپہر کو سنتری جی کے بوٹ پالش کئے تھے۔ پر وہ تو کسی گنتی میں نہ ---- اور دن بھر ادھر اُدھر کٹکتا ہی پھرا۔" بوڑھے نے پھر سے کان کھانے شروع کئے۔

"نہ دادا ---- میں نے تو یہ بابوجی کے پیسے ملا کر سوا سات آنے بنا لئے۔ باقی ابھی سارا دن پڑا ہے۔ گاہک اور موت کی کا خبر۔ جو ابھی چار آنے کا کام ایک دم آ جائے۔"

"تو کل کا لونڈا کا جانے ---- ان ہاتھوں نے چودہ چودہ آنے روج کی کمائی کی ہے۔ پر یہ بات ہے پرانی، کوئی پندرہ بیس برس کی۔ اب تو جو کوئی چار برس کا چھوکرا ہووے تو ڈبیا برس لے گھر سے نکل پڑے پالش کرنے۔ نہ گرو منتر نہ استاد۔ پھر کام نہ گھٹے تو اور کا ہو تیرا سر۔"

"دیکھ دادا خواہ مخواہ کی رنجس اچھی نہ لگے۔"

"ارے جا۔ رنجس کے لاڈلے لاٹ خاں گھر بیٹھ۔ سوا سات آنے کما لئے اور ابھی منہ کھولے بیٹھا ہے۔ کسی اور کو تو دو دھیلے کی کمائی کرنے دے۔"

"دیکھ دادا۔ میں پھر کہے ہوں۔ میرا غصو بڑا جالم ہے۔ نہیں جو آ جاؤں اپنے آپے میں تو اپنے باپ کی بھی کھال کھینچ کے رکھ دوں۔ تو تو ٹھہرا دور کا رستہ دار۔"

"عجت (عزت) سے بات کر۔ میں جو ابھی منہ میں تمبا کو ڈال پل پڑا تو تیرا کا کا تجھے سبل ہسپتال ہی لے جاوے ہے۔ میرے منہ کی طرف کا دیکھت ہے؟ کام کر ----"

نوجوان بلوے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑ سے میرا چمکیلا بوٹ بوڑھے کی ناک پر جمایا اور بوڑھے نے دھڑا دھڑ بلوے کی کھوپڑی پلپلی کرنی شروع کی۔ دونوں طرف میرے بوٹ کی شامت۔

آخر لوگوں نے بیچ بچاؤ کر ہی دیا۔ صرف بوڑھے کی ناک سے اور بلوے کے کان سے لہو بہہ رہا تھا۔ باقی سب خیریت تھی۔ البتہ میرا بوٹ فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ اگلی پچھلی چاروں طرف سے سلائی اکھڑ چکی تھی۔ میں نے دو چار صلواتیں سنا کر دکی بھر اس نکالی اور کہا کہ تمہیں ایک کوڑی نہ دونگا۔ اور مڑ کر اپنا سامان لیکر بھاگوں۔ مگر وہاں تو بالکل صفائی ہو چکی تھی۔

سید ضمیر جعفری بی اے

.... کے نام

میرے سانسوں میں بستی ہو، ہر سانس پہ یاد آجاتی ہو
اس پورب دیس میں یاد آ آکر دل میرا تڑپاتی ہو

جب بوجھل بوجھل قدموں سے دفتر کی جانب جاتا ہوں
تیری باتیں یاد آتی ہیں، تیری باتیں دہراتا ہوں

ہنگامِ رخصت ڈیوڑھی تک با چشمِ پُرنم آئی تھی
گردن بھی ذرا خم کھائے تھی، آواز بھی کچھ بھرائی تھی

رنگت بھی اُڑتی اُڑتی سی صورت بھی رونی رونی سی
جیسے کوئی مرمر کی مورت، حیرت میں کھوئی کھوئی سی

وہ سعیٔ ضبط میں بھی پیاری آنکھوں کا کٹورا چھلکا سا
وہ جلیٹھ کے سامنے بھی سر سے دوپٹہ ڈھلکا ڈھلکا سا

گھبرا کر پھرنا ہاتھوں میں دوپٹے کا کنارا لے لے کر
مبہوت کھڑے ہو ہو جانا کرسی کا سہارا لے لے کر

اُن نازک ہاتھوں کے پیارے خط مجھ کو یہاں جو آئے ہیں
وہ میرے دل کی ٹھنڈک ہیں، وہ میرے پیار کے سائے ہیں

اندر کی جیب میں رکھتا ہوں اُن پیار بھری تحریروں کو
"رومان گہہ گجرات" کے رنگیں خوابوں کی تعبیروں کو

افسوس معاش نے لا پھینکا دہلی میں تم سے دور بہت
جینا بھی تو اک مجبوری ہے جینے پہ ہوں مجبور بہت

کیا پوچھتی ہو کس طرح یہاں میرے اوقات گذرتے ہیں؟
مزدور ہوں، مزدوروں کی طرح میرے دن رات گذرتے ہیں

تھی فطرت میری شاہینی، پرواز بلند تھا کام مرا
افسوس میرے خوش خواہوں نے خود مل کے بچھایا دام مرا

مجھ کو میری اپنی دنیا سے اس بستی میں لے آئے
میری رفعت سے ناواقف اپنی پستی میں لے آئے

حالات نے بھی کچھ یاری کی اور اُن کا کام بنا ڈالا
یعنی مجھ کو بھی اپنی طرح نامردِ غلام بنا ڈالا

سواندرشن سکھ بی۔اے۔ (آنرز)

محبّت اور کائنات

دوست!

میری زندگی کیا تھی ——— ایک المناک کھیل۔

چند خام جذبات کا مجموعہ ——— رنگین مگر شکستہ آرزوؤں کا آئینہ ——— تلخ ناکامیوں کا روزنامچہ ——— تشنہ امنگوں کا مرجھایا ہوا گلدستہ ——— مایوس امیدوں کا ویران مسکن ——— پامال ارادوں کی زنگ خوردہ کڑی ——— تشنۂ تکمیل محوِ انتظار زندگی ——— حقیر و نفرت آمیز زندگی ——— غیر دلچسپ زندگی دنیا سمجھتی تھی میرے پاس سب کچھ تھا۔

دولت ——— سرمستی ——— عیش و عشرت کی محفلیں ——— رقص و سرود ——— دنیا کی دلچسپیاں شروع شروع میں میں نے بھی یہی محسوس کیا کہ میرے پاس سب کچھ ہے۔

مگر جلد ہی

دولت کا خمار اُتر گیا ——— سرمستی کا نشہ ہرن ہو گیا ——— عیش و عشرت کی محفلوں کا سرور فنا پذیر ثابت ہوا ——— رقص و سرود کا رنگین طلسم ٹوٹ گیا ——— دنیا کی دلچسپیاں اپنی حقیقت کھونے لگیں ۔ حسین آرزوؤں میں مہلک ترب نظر آنے لگا ——— کوہ اور سمندر کے نظاروں سے جی بھر گیا ——— نیلگوں آسمان دنیا کے رہنے والوں کا جانی دشمن ——— نظر آنے لگا۔

چاند اور ستارے میری مصیبتوں پر مسکراتے ہوئے نظر آئے۔

یہ سب روپیہ اور مٹی کا کھیل تھا ——— میری روح بے چین تھی ——— میری روح کی بیقرار آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے زندگی سے نفرت ہو گئی ——— مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی

... دولت کی پرستش کی مگر اس سے مجھے سکون قلب حاصل ... آگ لگا دی۔ دولت کو خاکستر بنا دیا مجھے ... سے نفرت ہو گئی۔

میں رقص و سرود کی مجلسوں میں شامل ہوا۔ لیکن سُکھ اور چین حاصل نہ ہو سکا۔ میں رقص و سرود کی مجلسوں سے کنارہ کش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں .... مجھے جینا دوبھر ہو گیا ——— مجھے زندگی سے نفرت ہو گئی ——— مجھے دنیا والوں سے نفرت ہو گئی ——— میں ایک نامعلوم تاریک سمندر میں چھلانگ لگانے کو تھا۔ مگر تو نے روک لیا ——— بالکل اور ہمیشہ کے لئے روک لیا ——— میں بےبس ہو گیا۔

مجھے تیری محبّت نے روک لیا ——— محبت نے مجھے ایک خطرناک گناہ کے ارتکاب سے روک لیا۔

ہم دونوں اچانک مل گئے ——— نہیں ——— اچانک کیوں! ——— ہمیں ملنا تھا ——— یہ ہماری تقدیر میں تھا ——— آخر ہم مل گئے ——— ہم ایک ہو گئے ——— محبت نے ہمارے دلوں میں گرمی پیدا کیا اور ہماری نواؤں نے ایک پاکیزہ ہم آہنگی پیدا کر دی ——— ہم پر زندگی کا راز روشن کر دیا ——— ہم زندگی کے بھید کو سمجھ گئے ——— محبّت زندگی کا بھید ہے۔ مجھے محبت کا راز موت کے راز سے زیادہ حسین نظر آنے لگا۔

محبّت نے ہمیں ایک کر دیا۔

ہم ایک ہی تقدیر کے دو پہلو بن گئے ——— ہمارے جسم ایک ہی روح کے دو پیرہن گئے ——— ہم اکٹھے اڑنے لگے۔

میری تاریک زندگی کی مایوس فضا میں پہلی بار امید کی کرن چمکی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے پاس کوئی چیز نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہے۔

کیونکہ مجھے تیری محبت حاصل ہو چکی تھی ——— محبت کے بغیر سب کچھ ہیچ ہے۔ محبّت کے ساتھ ہیچ بھی سب کچھ ہے۔

میری زندگی ایک حسین کھیل بن گئی۔ مجھے زندگی سے محبت ہو گئی، کیونکہ میری زندگی اب صرف میری زندگی نہ تھی۔ اب یہ تیری امانت تھی۔

زندگی دلچسپ بن گئی۔

میری امیدیں جاگ اُٹھیں ——— میری امنگیں بیدار ہو گئیں

زندگی کی تلخ ناکامیاں بھولا ہوا خواب بن کر رہ گئیں۔ تیری محبت نے مجھے زندگی کا نیا پیغام دیا ـــــ محبت کے جام سے میری تشنہ رُوح اپنی پیاس بجھانے لگی۔ دولت کا خمار۔ شراب کا نشہ ـــــ خواہشات کا دھوکہ ـــــ رقص و سرود کا سرُور ـــــ دُنیا کی دلچسپیاں ـــــ سب عارضی ثابت ہوئیں۔

مگر محبت کا سرور مستقل ہے ـــــ محبت دوامی ہے۔ ابدی ہے ـــــ موت سے ناآشنا ہے ـــــ وقت اور عمر کی قیود و بند سے آزاد ہے ـــــ محبت کا پھول ہمیشہ شگفتہ رہتا ہے۔

دوست!

جس سے میں پیار کرتا ہوں اور جو مجھ سے پیار کرتا ہے۔

وہ میری آرزوؤں کا گہوارہ ہے ـــــ میری امیدوں کا سرچشمہ ہے ـــــ میری دلچسپیوں کا مرکز ہے۔ اس کی حسین اور معصوم آنکھیں۔

جو میری منتظر رہتی ہیں ـــــ مجھے دیکھ کر چمک اُٹھتی ہیں۔

اُن کی چمک ـــــ اُن کی کشش ـــــ اُن کی معصومیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔

اس کی محبّت سے طبیعت کبھی سیر نہیں ہو سکتی ـــــ محبت کا نشو و نما بے کراں ہے۔ محبت رُوح کا کھیل ہے ـــــ محبّت زندگی کی حقیقت ہے ـــــ حسن و عشق کے عناصر سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے ـــــ محبّت سے زندگی کی بیل پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے ـــــ محبّت سے ہی قلبی سکون اور سرور حاصل ہوتا ہے ـــــ محبّت زندگی کی تکمیل ہے۔

تشنۂ محبّت زندگی سے موت اچھی ـــــ مگر محبّت کی زندگی زندگی اور موت دونوں سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

ہماری تاریک زندگی میں صرف محبت ہی ایک روشن اور حسین پہلو ہے۔

مگر اس کی روشنی زندگی کے سارے تاریک پہلوؤں کو روشن کر دیتی ہے۔

محبت کرنا جرم نہیں ـــــ محبت نہ کرنا جرم ہے۔

سنگین جرم ـــــ سنگین جرم ہی نہیں بلکہ سنگین گناہ بھی۔

دوست!

(۲)

محبت سے میری زندگی میں ایک نئی تبدیلی آئی ـــــ محبت نے مجھے زندگی کا نیا راستہ دکھایا۔

میں شرابی تھا۔ عیاش تھا۔ ظالم اور سنگ دل تھا۔

محبت میرے لئے شرافت اور پاکیزگی کا پیغام لے کے آئی۔

نیکی اور نرمی کا پیغام لے کے آئی۔

میں بادۂ محبت سے مست تھا۔ میں نے بلوریں جام کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اب دوست اپنی آنکھوں کے جام میں میرے لئے محبت کی صہبائے جاں فزا ڈھال دے۔

انصاف، رحم، قربانی ـــــ سب محبت ہی کے عطیے تو ہیں

محبت حُسن کا سرچشمہ ہے۔

حقیقی محبت میں۔

دو دل کھِل کر ایک پھول بن جاتے ہیں ـــــ دو جانیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔

زندگیوں میں موسیقی پیدا ہو جاتی ہے ـــــ کانوں میں ہر لمحہ حسین نغمے گونجتے رہتے ہیں۔

محبت ایک نعمتِ آسمانی ہے۔

دنیا محبت ہی سے حسین ہے ـــــ آسمان محبّت ہی سے روشن ہیں۔

جلوہ کارِ حُسن اپنی پاکیزہ شعاعوں سے تاریک دنیا کو روشن کرتا ہے۔ دنیا سے ظلم و ستم کو دُور کرتا ہے۔

کائنات کی ہر چیز کو مقدس بناتا ہے۔

محبت کے بغیر۔

دنیا تاریک ہو جائے ـــــ انسانی زندگی شرافت اور پاکیزگی۔ انصاف۔ رحم اور قربانی سے خالی ہو جائے ـــــ آرٹ بے جان ہو جائے ـــــ موسیقی بے معنی ہو جائے ـــــ موسیقی کے نغمے صرف فضائی حرکات بن کے رہ جائیں۔

زندگی کی حقیقت ایک تلخ دھوکا بن کے رہ جائے۔

(۳)

زندگی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں صرف محبت ہی روشنی کی ایک کرن بن کر آتی ہے اور جہانِ امکان کے ذرّے ذرّے کو جگمگا دیتی ہے۔

دنیا کی تاریک فضا میں محبت کی روشنی ہی زندگی کا راستہ [illegible]

محبت ستارہ سرشام [illegible]

اس کی روشنی [illegible]

[illegible] میں بھی۔

جہاں محبت کا شعلہ راجکمار کے دل میں روشن ہے۔ وہاں پریم کی شمع بھکارن کے دل میں بھی جل رہی ہے۔

محبت سے دونوں کی زندگیاں سکون اور راحت حاصل کرتی ہیں

محبت آرٹ کی جان ہے۔

محبت شاعری اور فلاسفی کی روح ہے — محبت ادب کی روح ہے۔

عشق اور آرٹ کا بڑا قریبی رشتہ ہے — عشق کے بغیر آرٹ کا تصور ناممکن ہے — جذبۂ عشق کے بغیر بلند آرٹ کی تخلیق ناممکن ہے۔

بہترین شاعری عشق ہی کی پیداوار ہے — ادب اپنی نشوونما اور عروج کے لئے عشق ہی کا شرمندۂ احسان ہے — محبت کے بغیر ادب کانوں کے لئے بار زحمت بن جاتا ہے۔

آرٹ کیا ہے؟ — حُسن و عشق کی تاریخ۔

محبت دو دلوں کو ملا کر ایک کر دیتی ہے — محبت ہی سے ہر گھر کی آگ روشن ہے۔ محبت ہی سے دنیا کی بنیادیں قائم ہوئیں — محبت ہی سے اس ناپائدار دنیا کی بنیادیں قائم ہیں۔

سب سے پہلے محبت ہی نے دوامی زندگی کا خواب دیکھا تھا۔

زندگی محبت کے نغموں سے معمور ہے۔

موسیقی محبت ہی کی نوسامعہ افروز آواز ہے۔

جو غم کو خوشی میں — دُکھ کو سُکھ میں — پریشانی کو سکون میں بدل دیتی ہے۔ جو جھونپڑوں میں شاہی محلات کے سکھ پیدا کر دیتی ہے۔ جو غریبوں کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

محبت اس حسین پھول کی خوشبو ہے جسے دل کہتے ہیں۔

محبت کے پاکیزہ جذبے کے بغیر انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔ اور یہ دنیا دوزخ سے بھی ہولناک تر لیکن محبت کے پاکیزہ جذبہ کی وجہ سے یہ دنیا بہشت سے بہتر ہے اور انسان فرشتوں سے بھی بہتر۔

(۴)

زندگی کے وسیع صحرا میں چاروں طرف کانٹے اور جھاڑیاں ہی نظر آتی ہیں۔ زندگی کی کٹھن شاہراہ پر سوائے دکھ اور مصیبتوں کے کچھ نہیں۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی۔ قدم قدم پر مسلسل ناکامیاں اور مسلسل مایوسیاں ہماری منتظر ہیں — جو قدم قدم پر ہماری [illegible] پامال اور ہمارے ارادوں کو متزلزل کرتی ہیں — ہمارے [illegible] ہیں۔ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے — ہم دنیا کی جھوٹی [illegible] ہیں۔ جہاں ہمیں اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ [illegible] کے اس صحرا میں صرف ایک حسین پھول ہے محبت۔

صنوبر کی طرح انسان کے دل میں یہ پھول صرف ایک ہی بار کھلتا ہے۔

محبت کا حسین پھول۔

تلخ زندگی کی پامال آرزوؤں کے کانٹوں میں کھل کر۔

انسان کی تشنہ و تاریک زندگی میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔

جیسے طوفان میں چمکتا ہوا ستارہ

دو دلوں میں محبت کا غنچہ مستور تھا۔

اچانک دو آنکھیں آپس میں ملیں — آنکھوں کے ملنے سے دل ملے — دو روحیں ملیں۔ دونوں مسکرا دیئے — مسکرا کر پھر خاموش ہو گئے — اس خاموشی کے پردے میں ایک انقلاب رونما ہو رہا تھا۔

راہرو کے قدموں کی آواز سن کر دل کے اندر چھپا ہوا غنچہ کھل کر پھول بن گیا — دل میں ایک ہل چل سی پیدا ہو گئی۔

محبت [illegible] ہو گئی۔

محبت کا پھول پاس سے گزرتے ہوئے راہرو کے قدموں پر جھک گیا۔

راہرو نے اس محبوب اور حسین پھول کو آنکھوں کے راستے دل کی زریں خلوتوں میں چھپا لیا — وہ اس پھول کو اپنے ساتھ ہی لے گیا — اس زندگی کے صحرا کے اس پار — آگے ہی آگے — بہت آگے — کسی اور دنیا میں۔

وہ راہرو کتنا خوش نصیب تھا۔

زندگی کے اس خاردار صحرا میں صرف ایک مکمل پھول ہے۔

"محبت"

ہماری اس تاریک زندگی میں روشنی کی صرف ایک ہی کرن ہے۔

"محبت"

اس ناامید زندگی کی مایوس گھڑیوں میں صرف ایک ہی خوش رنگ امید ہے۔

باقی سب کچھ صرف حسین دھوکہ ہے — ایک رنگین فریب ہے — پانی پر چلتا ہوا سایہ ہے۔ مایا ہے محبت انسان کے دل میں ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ جو خدا کی طرف سے انسان کو عطا ہوا ہے محبت کی خلش در حقیقت خدا کی ہستی کا ایک اعتراف ہے۔

محبت کی ابتدا جسم سے ہوتی ہے۔ مگر اس کا اصلی مسکن روح ہے اس کی بہت سی شکلیں ہیں مگر سب حسین۔ کوئی نہیں جانتا۔ یہ ستارہ کب اور کہاں سے طلوع ہوا۔ اور کہاں اس کی آخری منزل ہے۔

ہدری منظور احمد منظور
بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

شکستِ امید

ندگانی کا گراں بار اُٹھائے سر پہ
رصۂ دہر میں بڑھتا ہی چلا جاتا تھا
بس جگہ گاڑے تھی غیروں کی قیادت نے علَم
پھونک کر رکھتا تھا اُس راہ پہ میں اپنے قدم
جھ سے چُور تھا منزل سے بہت دُور تھا میں
بہ میں ہمت تھی کسی یاد سے مخمور تھا میں

کسی امید کا حاصل تھا سہارا مجھ کو
سی امید پہ اک عمر گذاری میں نے
ہ بہت جلد بہت جلد تجھے پالوں گا
ں تجھے سینۂ بیتاب سے لپٹا لوں گا
یری پھیلی ہوئی باہنوں میں سمٹ جاؤں گا
یگے ملبوس کی مانند لپٹ جاؤں گا
ہ تری آنکھیں وہ پُر نور ستارے جن پر
خسرو الیاس کا ہر آن گماں ہوتا تھا
زم وقت کی موجوں میں سفینہ اپنا
میں شمعوں کے اُجالے میں رواں ہوتا تھا

دشت و وادی میں نہیں پیشِ نظر پاتا تھا
یہ چراغِ سرِ منزل تھیں جدھر جاتا تھا
لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ یہاں کچھ بھی نہیں
وہ فلک بوس محل اور وہ مکاں کچھ بھی نہیں
اب وہ آنکھوں کے چمکتے سے دیئے ہیں خاموش
وقت کے بس بھرے جھونکوں نے کئے ہیں خاموش
عرصۂ دہر کا اب مجھ سے سفر ناممکن
اب وہ پُر ہول چٹانوں سے گذر ناممکن

آس وہ ٹوٹ گئی جس نے تسلی دی تھی
میری اِن خیرہ نگاہوں کو تجلی دی تھی
اب یہاں ڈھیر ہیں مرجھائے ہوئے پھولوں کے
نہ وہ نزہت نہ وہ نکہت نہ وہ عشرت کا ہجوم
دیکھ کر جس کو جھپکتی ہی نہ تھی چشمِ نجوم
اور کچھ پر ہیں اِدھر سوختہ پروانوں کے
یہی کردار ہیں بھولے ہوئے افسانوں کے
جن سے منظور [illegible]

کاشی ناتھ ابمہ - کنول
(آزاد ترجمہ)

جادُو

افرادِ ڈراما :- (۱) بوڑھی عورت (۲) نوجوان عورت

منظر

[گاؤں کے ایک بہت ہی شکستہ جھونپڑے کا کمرہ - جو رسوئی اور بیٹھک دونوں کا کام دیتا ہے - دروازہ وسط میں دائیں طرف ایک کھلی بھٹی جس میں ایندھن جل رہا ہے، بائیں طرف ایک سادہ میز جس کے پیچھے ایک کرسی ہے - آگ کے نزدیک ہی ایک بہت پرانی کرسی ہے جس پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہے اور گود میں رکھی ہوئی کسی چیز کی طرف دیکھتی ہوئی کچھ بڑبڑاتی ہے - کمرے میں صرف آگ کے مدھم شعلے کے سوا اور کچھ روشنی نہیں -

پردہ اُٹھنے کے بعد ایک لمحے کے لئے کامل سکوت ہوتا ہے - پھر دروازہ کھلتا ہے اور تھکی ہوئی بے ہمت سی ایک نوجوان عورت داخل ہوتی ہے - اس کے ہاتھ میں ایک لالٹین ہے - جو وہ میز پر رکھتی ہے]

نوجوان عورت :- وہ چلی گئی !

بوڑھی عورت :- کون - گائے ؟

نوجوان عورت :- ہاں . . . . وہ مرگئی !

بوڑھی عورت :- کیا بچھڑا زندہ تھا ؟

نوجوان عورت :- نہیں - وہ مردہ ہی پیدا ہوا !

بوڑھی عورت :- اُف ! اب کچھ بھی باقی نہ رہا -

نوجوان عورت :- (دفعتہً چونک کر) بہت ہی بُرا ہوا ماں ! بہت ہی بُرا - اب ہمارا کیا ہوگا ؟ ہم امیر ہوتے تو گائے - بچھڑے - چوزے سب مرجاتے تو معمولی سی بات تھی اور ہمارے پاس پھر بھی بہت کچھ رہ جاتا . . . . . لیکن اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں . . . . کچھ بھی نہیں ؟

[بازوؤں کو میز پر ڈھیلا چھوڑتی ہوئی وہ اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیتی ہے اور انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتی ہے]

بوڑھی عورت :- یقیناً اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ! [لمحہ بھر … نوجوان عورت کی رقت انگیز آہیں سنائی دیتی ہیں] لیکن اس طرح روتے رہنا فضول ہے - اس سے بیچارے حیوان واپس تو نہیں آئیں گے . . . . اب ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے !

نوجوان عورت :- تم بیسود باتیں کر رہی ہو ماں ! ہم اب کچھ نہیں کر سکتے . . . . ہم اب زندہ تو نہیں کر سکتے !

بوڑھی عورت :- یقیناً ہم اُنہیں زندہ نہیں کر سکتے . . . . لیکن ادھر دیکھو پیاری ! اس ساری مصیبت میں ہم کیوں گرفتار ہوئے ؟

نوجوان عورت :- (از حد مایوس اور مغموم لہجہ میں) خدا کی مرضی اور کیا !

بوڑھی عورت :- آہ ! یہ تمہاری بھول ہے - یہ مصیبت ہم پر خدا نے نہیں ڈالی - میں چالیس سال باقاعدہ گرجے میں جاتی رہی ہوں - اور مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوا جس کی وجہ سے میں ایسی سخت سزا کی مستحق سمجھی جاؤں - وہ ہم سے بدلہ لینے کے لئے کبھی ایسی مصیبت میں ڈال نہیں سکتا - نہیں ہرگز نہیں !

نوجوان عورت :- تو پھر ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے - جو . . . . .

بوڑھی عورت :- آہ ! جو کوئی بھی ہو - (دفعتہً خونخوار اور بھیانک لہجے میں) میں کہتی ہوں یہ شیطان کی مذموم حرکت ہے - اور . . . . . . تمہارے گاؤں میں اُس کے بھی پرستار ہیں اور تمہارے خدا کے بھی !

نوجوان عورت :- تم کیا کہنا چاہتی ہو ؟

بوڑھی عورت :- بچھڑے کس دن مرے تھے ؟

نوجوان عورت :- سوموار کو -

بوڑھی عورت :- اور چوزے ؟

نوجوان عورت :- منگل اور بدھ کو - بدھ کی شام کو وہ سب مرے ہوئے پائے گئے -

بوڑھی عورت :- آہ ! . . . . اور پچھلی اتوار کو یہاں کون آیا تھا ؟

نوجوان عورت :- صرف بوڑھی بیلے یز کا رٹ مجھے اچھی طرح یاد ہے

...... لیکن ماں! تمہارا اس سے مطلب؟

بوڑھی عورت: - میرا مطلب اس کے نام سے تھا - میں نام جاننا چاہتی تھی اور یقیناً میں ایسا کرنے کی آج تک سعی کر رہی تھی - ورنہ کسی کا نام پوچھنے کی مجھے ضرورت نہ تھی -

نوجوان عورت: - ماں! ..... یہ کیوں؟

بوڑھی عورت: - میں جانتی ہوں بیٹی! میں جانتی ہوں کیوں؟ (مسکراتی ہے)

نوجوان عورت: - (خوفزدہ ہوتے ہوئے) یہ تمہاری گود میں کیا ہے؟

بوڑھی عورت: - بیل کا دل!

نوجوان عورت: - (لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے خوف سے مغلوب ہو کر) کس لئے؟ ...... آہ! .. ماں! میں یہ پسند نہیں کرتی -

بوڑھی عورت: - پیاری! میں اس میں سوئیاں چبھو دوں گی - اور پھر اسے آگ میں بھون لونگی (آگ پر رکھنے کے لئے نیچے جھکتے ہوئے) میں اسے راکھ بنا دوں گی -

نوجوان عورت: - ماں!

بوڑھی عورت: - اور جب میں اسے آگ میں رکھوں گی - میری پیاری! پھر ..... پھر میں سب کچھ جانتی ہوں کیا ہو گا - سب کچھ!

نوجوان عورت: - (خوف سے سہم کر) ایسا نہ کرو ماں! ایسا نہ کرو! یہ شیطان کا کام ہے -

بوڑھی عورت: - میں سب کچھ جانتی ہوں - اتنے ہی یقین کے ساتھ جتنا مجھے کتاب مقدس پر ہے اور جونہی آگ اس دل پر اثر انداز ہونا شروع ہو گی - تو ہماری بدخواہ ہمارے دروازے پر ہو گی

نوجوان عورت: - ایسا نہ کرو ماں! میں ڈرتی ہوں!

[وہ اس گوشت کے لوتھڑے کو آگ سے نکالنا چاہتی ہے - لیکن بوڑھی عورت انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اسے دھکا مار کر پیچھے ہٹاتی ہے]

بوڑھی عورت: - چھوؤ مت پگلی! اگر تم ایسا کرو گی - تو میں تم سے نہیں بولوں گی اور مرتے دم میری بددعا تمہارا تعاقب کریگی -

[نوجوان عورت خوف سے سہمی ہوئی میز کے ساتھ جا لگتی ہے] میں اپنے دشمن سے بدلہ لینا چاہتی ہوں اور کوئی طاقت مجھے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی -

[وہ آگ پر جھکی ہوئی کچھ الفاظ بڑبڑاتی ہے - تھوڑے وقفے کے لئے کامل سکوت ہوتا ہے - دروازے پر دستک ہوتی ہے - نوجوان عورت ایک دلدوز چیخ مارتی ہے - اور اپنے منہ کو اپرن (APRAN) سے ڈھانپ لیتی ہے، بوڑھی عورت کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی نگاہیں دروازے پر گاڑ لیتی ہے - پھر دستک کی آواز آتی ہے - نوجوان عورت دوڑتی دوڑتی ماں کے قدموں پر جا گرتی ہے اور اپنا منہ اس کی گود میں چھپا لیتی ہے - بوڑھی عورت غصہ میں بیٹی کو جھنجھوڑتی ہے] کھڑی ہو جاؤ - نادان! [پھر کھٹکھٹانے کی مدھم سی آواز] کون ہے؟ [خاموشی] دروازہ کھولو - بے وقوف بچی!

نوجوان عورت: - (غشی کی حالت میں آنسو بہاتی ہوئی) میں! میں ایسا نہیں کر سکتی! ہرگز نہیں! ماں! مجھے ایسا نہ کہو!

بوڑھی عورت: - (اس کا بازو پکڑتی ہوئی) فوراً دروازہ کھولو

(نوجوان عورت آہستہ اور بیدلی کے ساتھ اٹھتی ہے - اور ڈر کے مارے دروازے کے نزدیک ہی کھڑکی سے جھانکتی ہے - پھر دفعتہً چیخ مار کر بوڑھی عورت کے پاس آتی ہے] کیا ہے؟

نوجوان عورت: - دروازے پر کوئی لیٹا پڑا ہے -

بوڑھی عورت لالٹین لے کر باہر جاتی ہے - جھک کر لالٹین کسی چیز پر رکھتی ہے - پھر مُڑ کر کمرے کے وسط میں آ کھڑی ہوتی ہے - جوان عورت آگ کے نزدیک ہی جھکی ہوئی ناظرین کی طرف پیٹھ کر کے ماں کو دیکھتی ہے -

بوڑھی عورت: - یقیناً! وہ مری ہوئی ہے!

نوجوان عورت: - (تکلیف دہ دبی آواز سے) کون؟ ماں!

بوڑھی عورت: - (آواز میں بمشکل فتح کے اظہار کو چھپاتی ہوئی) سیلی بینڈ کاٹ!

[نوجوان عورت ایک دلدوز چیخ مارتی ہے اور زمین پر گرتی ہے]

(پردہ گرتا ہے)

تصحیح

شاہکار بابت ماہ جون میں ایک غزل چودھری منظور احمد صاحب منظور کے ایل ایل بی کے نام سے شائع ہوئی تھی - حالانکہ دراصل اس کے کاریگر جناب منظور ایم - اے ایم - او - ایل ہیں - چودھری صاحب کے ارشاد پر یہ تصحیح شائع کی جاتی ہے ہر دو سخن طرازوں کی ہمنامی ادارے کی اس فروگزاشت کا سبب بنی [illegible]

... علی درانی

غزل

چشمِ نظارہ باز تھی تیرِ نظر کو کیا کہوں — دل میں اُتر اُتر گیا روزنِ در کو کیا کہوں
عقل و خرد ہیں شعلہ ور ابرِ کرم کو کیا ہُوا — خرمنِ ہوش جل گیا برقِ نظر کو کیا کہوں
کیفِ نگاہِ یار سے رات تھی میکدہ بدوش — نرگسِ نیمباز کے فتنہ و شر کو کیا کہوں
رونقِ کارگاہِ دل بنتے ہی ہائے مٹ گئی — تیرے کرم کو کیا کہوں تیری نظر کو کیا کہوں
کشتِ امید زیرِ آب، آرزوئے دلِ خراب — نقش بر آب ہوگئی، دیدۂ تر کو کیا کہوں
سرد پڑی ہے انجمن جل کے ہُوا ہے دل کباب — ساقیٔ آتشیں فروش! خونِ جگر کو کیا کہوں
کاکلِ یار مشکبیز، روئے نگار دلفریب — عالمِ عشق و حُسن کی شام و سحر کو کیا کہوں
دیدہ و دل کا ہیں لہو حُسن کی لاجوابیاں — خُونِ شفق کا رنگ ہے نُورِ سحر کو کیا کہوں
لغزشِ طفلِ اشک نے دل کی بنی بگاڑ دی — لختِ جگر کو کیا کہوں! نُورِ نظر کو کیا کہوں
کتنی نگاہ فریب ہے عالمِ حُسن کی نمود! — تیری کمر کا وہم ہے اپنی نظر کو کیا کہوں
قصۂ دل ہوا تمام سیلِ سرشک سے میرے — کارِ حباب کر گیا کاسۂ سر کو کیا کہوں
... جگا کے رکھ دیئے نیند حرام ہوگئی — کس نے حلال کر دیا، مُرغِ سحر کو کیا کہوں

مست کا اعتبار کیا! شیشۂ دل نہ توڑ دے!
پھرتی ہے یوں لئے لئے تیری نظر کو کیا کہوں

معروف جرنلسٹ طرزِ جدید کا افسانہ

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

یوں معلوم ہوتا تھا گویا سنتری کو ڈھال کر خاکی وردی کے قالب ، ڈال دیا گیا ہے۔ وردی اس کے بیڈول اور بھاری بھرکم جسم کا جزو گئی تھی۔ اس نے موٹر کار کا ٹکٹ اٹھایا اور موٹر انجن کا نمبر نوٹ بک درج کر لیا۔ صبح کا وقت تھا اور کڑاکے کی سردی تھی بے خوابی سے سنتری پپوٹے اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کو بار بار ڈھانپ رہے تھے۔ ب اس نے پچھلی نشست کا جائزہ لینا شروع کیا۔ برف پر دوڑنے ۔لئے پیّہ دار فولادی سینڈل اور لمبی نوک دار چھڑی۔ پھر اس نے موٹر لے کی طرف دیکھا۔ ننگے سر نوجوان لہراتے ہوئے بال۔ منہ میں سگرٹ لڈر جس پر سنہری بند لگے ہوئے تھے۔ نام پارکر سٹیفن بارکر۔

سنتری نے کہا :۔ "امریکن ؟"

نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ امریکن سیاح بھی عجیب لوگ ، ۔فروری کا وسط ہے۔ زمہریری ہوا کے جھونکوں میں یہ نوجوان ے پیلو رنش ہوڈل میں ننگے سر بے تحاشا موٹر چلا رہا ہے۔ خیر۔ وہ جانے ۔اس کا کام۔

سنتری نے کہا :۔ "جب آپ دوبارہ یہاں سے گزریں گے۔ تو آپ یہاں نہیں پائیں گے اور غالباً یہ سرحد بھی نہ رہے گی۔" سنتری نے ، کا دروازہ کھولا۔ موٹر حرکت میں آئی۔ نوجوان نے بے پروائی سے ہا :۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" سنتری نے نازی انداز میں ، اٹھاتے ہوئے نعرہ لگایا :۔ "ہائیل ہٹلر" اور کہا :۔ "پُل کے دوسری بن آسٹروی سپاہی سے پوچھ لینا۔"

پُل کے پار آسٹریا کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ چونگی خانہ کے افسر سٹیفن کا پاسپورٹ دیکھا۔ "آپ کے پاس کوئی قابلِ محصول چیز تو ں خوش آمدید" سٹیفن نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ۔ ں محسوس ہوتا ہے۔ گویا میں اپنے وطن میں آ گیا ہوں۔ مجھے سالسبرگ ہے۔ جہاں آپ کے ہم وطن مشہور ماہرِ موسیقی موزارٹ کی برسی نیا بھر کے راگی جمع ہو رہے ہیں۔"

"لیکن جلسہ تو گرمیوں میں ہوگا۔" آسٹروی افسر نے کہا۔

"ہاں اس اثنا میں اس خوبصورت سرزمین کی سیر کروں گا۔"

"میں نے آسٹروی شراب کی بہت تعریف سُنی ہے۔ جو دیکھنے میں قوس و قزح کے بوقلموں رنگوں سے زیادہ دلفریب اور ذائقہ میں ......"

"بادۂ عشق سے زیادہ کیف زا ہے۔ میرے دوست اور یہاں کی عورتیں ......" آسٹروی افسر نے ابھی بات ختم نہ کی تھی۔ کہ سٹیفن نے اسے سگرٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ہاں ہاں یہ مجھے معلوم ہے آسٹریا کی عورتیں حسن و جمال کا مجسمہ ہیں اور جس عورت نے مجھے جنم دیا وہ اسی حسن خیز خطہ کی رہنے والی ہے۔"

سٹیفن کو اپنی ماں کے الوداعی الفاظ یاد آ گئے۔ تختۂ جہاز پر اس نے سٹیفن کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا ۔ "خدا کے لئے پہلی لڑکی کو دیکھتے ہی اس سے اظہارِ محبت نہ شروع کر دینا۔ اگر شادی کا ارادہ ہو تو ایسی بہو کو یہاں لانا جو ہمارے خاندان کی شان کے شایاں ہو۔" باپ نے مسکراتے ہوئے ازراہِ تائید کہا تھا۔ "ہاں ہاں جو رنگ روپ میں تمہاری ماں سے کسی صورت کم نہ ہو۔" پھر کسی قدر متین انداز میں کہا "بیٹا ذرا دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ آؤ۔ واپس آنے پر تمہیں کاروبار سونپ کر میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" ہاں سٹیفن کی ماں نے یہ بھی کہا تھا۔ "اور میری جنم بھومی سالسبرگ کو میرا سلام کہنا۔ صدر بازار کے چوک میں اس تاریخی درس گاہ کو نہ بھولنا جہاں استادِ اعظم موزارٹ کے جانشین ابھی تک اس کی موسیقی کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دُور دور سے لوگ سالسبرگ کی یاترا کو آتے ہیں۔"

(۲)

والد کے مشورہ کے مطابق وہ سیدھا سالسبرگ کے سب سے بڑے ہوٹل میں پہنچا اور چار ماہ کے لئے ایک کمرہ ریزرو کرا لیا۔ گرمیوں میں سالسبرگ کے بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور ایک امریکن کروڑپتی کے لئے بھی چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لینا محال ہو جاتا ہے اب فروری کا وسط تھا اور سالسبرگ کا کوہستانی قصبہ بھٹکی ہوا ...

انتظار کرو - دیکھتے دیکھتے یہ برف زار ایک جلوہ زار بن جائے گا - ابھی سکیٹنگ کا موسم ہے - برف کی طرح گوری چٹی نوجوان عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ برفانی وادیوں میں گرمیٔ ہنگامہ پیدا کر رہے ہیں - اور ہر امریکی سیاح کو سونے کی کان سمجھ کر اس کے دل کی معصوم گہرائیوں کو اپنے لانبے حنا دیدہ ناخنوں سے کریدنا شروع کر دیتی ہیں - ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ان وادیوں میں ۔"

سٹیفن نے ڈنر کے بعد بڑے بازار کا رُخ کیا اور اس مشہور عمارت کے برآمدہ میں وہ ایک لمحہ کے لئے رُک گیا - جہاں اس کی ماں موزارٹ اکیڈمی میں گانا سیکھا کرتی تھی - مرکزی ایوان سے نغمے کی آواز اٹھی - سٹیفن نے آنکھیں بند کر لیں - سالسبرگ کا مشہور گانا -

اس نے بارہا اپنی ماں سے سُنا تھا - لیکن اس تازہ نغمے میں شباب کی حرارت اور عشق کی دعوت تھی - تھوڑی دیر بعد تیز و تند ترانوں میں ایک بھاری اور گہری آواز شامل ہو گئی - مردانہ آواز صاف اور مترنم - سٹیفن نے جھلا کر آنکھیں کھول دیں - تخیل کا طلسم ٹوٹ گیا "اس کی ماں تو کسی اجنبی کے ساتھ مل کر گا نہیں گا سکتی" وہ برآمدہ کی نیم تاریکی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا پھر وہ درمیانی کمرے کی کھڑکی تک آیا - اس نے دیکھا کہ ایک شخص پیانو بجا رہا ہے - لمبے لمبے گھنے سیاہ بال بظاہر اس کی جوانی قبل از وقت ڈھل چکی تھی - ایک نوجوان لڑکی اس کے پاس کھڑی گا رہی تھی "لڑکی کے تر و تازہ شباب کے مدِمقابل یہ چہل سالہ استاد کس قدر سن رسیدہ معلوم ہوتا ہے -" سٹیفن نے دل میں کہا - کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہ تھا - استاد نے کہا :-
"مس نینا تمہارا گلا سبحان اللہ کیا نورانی ہے اور راگ کس درجہ مکروہ - آخر کیوں ؟"

مس نینا کا جواب ایک سوال کی صورت میں تھا - "میرے استاد یہ بتایئے کیا سال بھر میں میں گانا سیکھ سکوں گی -"
"ہاں - لیکن تمہاری آواز میں یہ گریہ انگیز لہر کیوں ہے - بہار میں خزاں کیسی ؟"

" مجھے گھر والوں نے واپس بلا بھیجا ہے - میں فیس ادا نہیں کر سکتی - افلاس - قرض -"

[illegible] - اس نے اپنے دونوں ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھ دیئے [illegible] کرنے کی ضرورت نہیں - مجھے تم سے محبت ہے -"

[illegible] ہٹ گئی - اس کی بڑی بڑی آنکھیں وحشت و حیرت کی ترجمان بن گئیں - پھر اس نے بے اختیار کہا :- "یہ ناممکن ہے - تم میرے استاد ہو - میرے باپ کی طرح قابلِ احترام - میں تم سے محبت نہیں کر سکتی ..... آہ ! اب میری زندگی کا خواب پورا نہ ہو گا - موسیقی کے بغیر میرے لئے جینا محال ہے -"

وہ ایک ہرنی کی طرح جس نے شکاری کو دیکھ لیا ہو - دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھومنے لگی - پھر اس نے جوشیلے انداز میں کہا :- "تم موزارٹ کے جانشین تمہاری شہرت یورپ اور امریکہ کے کونہ کونہ تک پھیلی ہوئی ہے - اور اب گرمیوں میں سالانہ تقریب ہے . . . . ."

استاد نے کرب آلود لہجے میں یہ کہہ کر فقرہ ختم کر دیا :- "ایک طوفان اٹھنے والا ہے جس میں میرے ایسے ہزاروں خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے -"

"آخر کیوں ؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکی -" لڑکی نے حیرانی سے پوچھا -

"اس لئے کہ میں یہودی ہوں - اور مرنے سے پہلے میں تمہاری مرمریں باہوں کو اپنی گردن میں حمائل دیکھنا چاہتا ہوں -"

یہ کہہ کر استاد بازو پھیلائے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھا - عین اس وقت اس کی نظریں سٹیفن پر پڑیں - جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا - استاد نے مڑ کر دیکھا اور رُک گیا - سٹیفن نے آگے بڑھ کر کہا :-
"اس گستاخانہ جسارت کے لئے معافی چاہتا ہوں - میں اس درسگاہ کی زیارت کئے بغیر نہ رہ سکا - جہاں ۲۲ سال پہلے آپ لوگوں کی ایک ہم وطن سرزمین آسٹریا کا محبت انگیز ترانہ گا رہی تھی - اور ایک امریکن سیاح بازار سے گزرتا ہوا اس کی سحر کارانہ کشش سے بے اختیار کھچا آیا - اور گانے والی کا ہمیشہ کے لئے مالا و شیدا بن گیا - وہ گانے والی میری ماں تھی -

استاد نے نووارد اجنبی کی طرف غور سے دیکھا اور پوچھا "کیا نام تھا اس کا"
"ایبرہارٹ !"

ایبرہارٹ !" استاد نے اپنے سیاہ گھنے بالوں کو کھینچ کر اپنی پیشانی اور آنکھوں کو ڈھانپ لیا - اور زیرِ لب کہا :- "ایبرہارٹ - مجھے یاد ہے ۲۲ سال گزرے - میں اس وقت اس اکیڈمی کا جونیئر پروفیسر تھا . . . . . خیر"

تھوڑی دیر کے لئے اس پر سکوت طاری رہا - پھر اس نے لڑکی سے کہا - آؤ ہم دونوں مل کر سرزمین آسٹریا کا محبت انگیز ترانہ گائیں -

(۳)

"میں آج پہلی مرتبہ اپنی والدہ کی حکم عدولی کا مجرم ہوں"۔ سٹیفن اور نینا اکیڈمی سے باہر آ رہے تھے۔ نینا نے کہا:۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔" سٹیفن نے جواب دیا۔ "ماں نے متنبہ کیا تھا: "دیکھنا سالسبرگ میں پہلی لڑکی کو دیکھتے ہی کہیں اس پہ فریفتہ نہ ہو جانا۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہم سالہا سال سے اکٹھے رہے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں میری جان! ہمارے امریکہ میں ایسے موقع پر تکلفات سے کام نہیں لیا جاتا میں سالانہ تقریب تک تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ اس دوران میں مجھے وائینا اور بوڈاپسٹ جانا ہوگا۔"

وہ ہوٹل کے سایۂ دیوار میں آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ سٹیفن باتیں کرتا رہا۔ "میں ایک ہفتہ تک باہر جاؤں گا۔ تم مجھے روزانہ ملو گی نا۔ آؤ میرے کمرے میں ...... اچھا ابھی نہ سہی۔ جرمن زبان میں بات چیت کرنے کا سلیقہ آ جائے گا ..... میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ ہمارے ملک میں یہ مثل مشہور ہے کہ امریکن خاوند خدا کی بہترین نعمت ہیں ... مطلب یہ کہ وہ رات دن روپیہ کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور دنیا بھر کی دولت اپنی بیویوں کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں .... میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ حجاب اور شوخی کی کشمکش نے تمہارے چہرے میں کتنی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ..... مجھے معلوم نہیں کہ رخصت ہونے وقت یہاں مودبانہ طور پر سر جھکا دینے کا دستور ہے۔ یا بوسہ لیا جائے۔ ہاتھ کا بوسہ لیا جائے۔ یا منہ چوم لیا جائے ..... اچھا ہاتھ کا بوسہ لیتے وقت ایک گھٹنا زمین پر ٹیک دینا کافی نہ ہوگا یا مودبانہ ہونا ضروری ہے۔

سٹیفن نے جھک کر اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور مڑتا ہوا اپنے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

وی آنا اور بوڈاپسٹ کی ہنگامہ پرور رنگین راتیں ڈنیوب کے کناروں پر قہوہ خانوں کے صحن میں جپسی نغمے جن کے ہوشربا زیر و بم سے کبھی دل زور سے دھڑکنے اور کبھی ساکت ہونے لگتا ہے۔ اوپرا تھیئٹر اور شاہانہ مناظر غرضیکہ آسٹریا، ہنگری اور چیکوسلاویکیہ کی زندگی کا کوئی پہلو نہ ہوگا جسے سٹیفن نے اکیس سالہ تعلیم یافتہ اور متمول امریکن سیاح کی نظروں سے نہ دیکھا ہو۔ ابھی موزارٹ کی برسی میں دو ہفتے باقی تھے کہ وہ سالسبرگ میں دوبارہ داخل ہوا۔ اب شہر میں چہل پہل تھی۔ موسیقی کے جلسے شروع تھے۔ ہر حصہ یورپ کے دلدادگان موسیقی سالسبرگ میں جمع ہو رہے تھے۔ موزارٹ اکیڈمی کے ہال میں ہمہ

فرانز وولف کے شاگرد مداح احباب اور معاصر جوق در جوق آتے۔ میونخ کا مشہور موسیقار ہانس ہم باخ بھی آیا۔ نازی حکام نے درپردہ اس کے رستہ میں قدم قدم پر مشکلیں حائل کر دیں لیکن جس کی روح نغمات کے لئے تڑپ رہی ہو۔

وہ کب پروا کرے گا۔ شدید سیاسی اختلافات کے باوصف فن موسیقی نے انہیں یکجا کر دیا۔ حکومتیں ایک دوسرے کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن آرٹ کے یہ پرستار جھوم جھوم کر ایک دوسرے کے فن کی داد دیتے تھے۔ موسیقی کا یہ ہال ان کے لئے پناہ گاہ اور ایک مقدس استھان بن گیا۔ جس کی چار دیواری میں انہوں نے اپنے اپنے قومی اور نسلی تعصبات کو لباس کہنہ کی طرح اتار پھینکا۔ استاد فرانز وولف خوب گایا اور ایک لمحہ بھر کے لئے اس نے مس نینا اور سٹیفن کی طرف دیکھا جو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہمہ تن گوش تھے۔

(۴)

یکایک فرانز رک گیا اور اس کے دل کی گہرائی سے نکلا ہوا بلند بانگ نغمہ ہوا میں معلق رہ گیا۔ جس طرح پوری تیزی سے اڑتا ہوا پرندہ گولی لگنے پر ایک لمحہ کے لئے ہوا میں ساکت ہو جاتا ہے۔ فرانز نے دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا سنو۔ دور سے شور سنائی دیا۔ کوچ کرتے اور گاتے ہوئے سپاہیوں کے کوچ کی آواز جو ہر لحظہ قریب آ رہی تھی۔ گویا کوہستانی دریا بند توڑ کر ایک خوفناک سیل کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ اور فوجی نغمے پنچم سروں میں اس بزم موسیقی پر مسلط ہو گئے۔ استاد فرانز نے سر ہلاتے ہوئے کہا اب آپ اور قسم کی موسیقی سنیں گے جس کے لئے رباب اور وائلن اور پیانو کی بجائے مشین گن بم اور طیاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہم لوگ گاتے ہیں۔ تو سننے والے کے تار حیات سے کیف آفریں نغمے روح کو وجد میں لاتے ہیں۔ اور اب .....

"وہ آ گئے۔ اب خبر نہیں۔ کیا ہوگا۔ بیٹھے رہو سنو خاموش" کی غیر مربوط آوازوں میں دروازہ کھلا اور نازی سپاہی ہال میں داخل ہوئے۔ وہ قطار باندھے دیواروں سے متصل کھڑے ہو گئے [illegible] انہوں نے مجمع کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پڑے [illegible] قریب ایک بلند پلیٹ فارم تھا [illegible]

...بہت بیشتر سامعین استاد فرانز کے فن کی داد دے رہے تھے۔ ...کی حیرانی خوف میں بدل رہی تھی کہ ایک نازی افسر پلیٹ فارم ...رانز کے قریب آیا اور اس نے پوچھا "فرانز وولف تمہارا نام ہے" ...بات میں جواب ملنے پر اس نے ایک لفافہ فرانز کے سپرد کیا اور کہا۔ ...تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔ فرانز نے مضطربانہ عجلت کے ساتھ ...افہ کھولا اور چٹھی پڑھنے کے بعد اس نے بآواز بلند کہا :۔ "جواب ...بھی سن لو۔ نہیں نہیں نہیں۔ جب تک ہمارے جسم میں خون کا آخری قطرہ ...ی ہے دنیا کی کوئی طاقت ہمیں روک نہیں سکتی۔" یہ کہہ کر فرانز نے ...لفافہ واپس کر دیا۔ نازی افسر کے اشارہ پر ایک سپاہی قریب آیا۔ ...س نے جیب سے کارڈ نکالا۔ افسر نے یہ کارڈ استاد فرانز وولف ...کو دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے انکار کی یہ سزا ہے کہ تمہیں اسی وقت اس ...سٹیج میں جرمنی کا قومی ترانہ گانا ہوگا۔ ورنہ اس پلیٹ فارم پر تمہاری ...لاش تڑپتی نظر آئے گی۔"

فرانز نے مجمع کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر اس نے پکار کر کہا۔ "وہ قوم جس نے موزارٹ سا موسیقار پیدا کیا کبھی دب نہیں سکتی۔ تم لوگ مجھے ہلاک کر سکتے ہو۔ لیکن تمہارا قومی ترانہ میری زبان پر جاری نہ ہوگا۔ نہ ہوگا۔"

اس کے ساتھ ہی اس مجمع عظیم میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ نازی افسر کی چال ناکام رہی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ اور وہ ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ "آخر کیا معاملہ ہے۔ ان نازیوں کو ہمارے جلسے میں آنے کی کیوں کر جرأت ہوئی۔ حکومت کیا کر رہی ہے۔ پولیس کہاں ہے۔ آسٹریا زندہ باد فرانز زندہ باد۔۔۔۔"

شور کم ہوا۔ فرانز نے پیانو پر مختلف چیزیں سنائیں۔ میونخ کے موسیقار "ہانس ہم بارغ" نے نہایت دلکش اوپیرا کا اہتمام کیا اور یہ بزم رات کے دو بجے ختم ہوئی۔

بطور حفظ ماتقدم سٹیفن اور نینا نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ استاد فرانز وولف کو اپنے ساتھ ہوٹل میں لے جائیں۔ وہاں ہوٹل کے منیجر کے ساتھ مشورہ ہوا۔ ہوٹل کے پچھواڑے سے یہ تینوں شہر سے باہر نکل گئے اور منیجر خود موٹر کار لئے مقررہ مقام پر پہنچا۔ سٹیفن ...کے پاس پاسپورٹ ہے۔ اب چیکوسلاویکیہ کا رخ کرنا چاہیے ...صبح کی دھندلی لکیریں آسمان پر نمودار ہو گئیں۔ سرحد قریب آ رہی ...ایک دم ٹھٹک اٹھے۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی موٹر کار کے ...سگنل تھا۔ کہ ٹھہر جاؤ۔ ورنہ تمہاری خیر نہیں ...تم موٹر کو روک لو بحث کا وقت نہیں میں

ان سے تنہا نپٹ لوں گا۔ سٹیفن فضول باتیں نہ کرو۔ ایک اور گولی زیادہ قریب سے گذر گئی۔ نینا میری جان نینا خوش رہو۔ موٹر کار ٹھہر گئی۔ فرانز نے نینا کی پیشانی پر بوسہ دیا "سٹیفن اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ خوش رہو الوداع۔"

سٹیفن نے موٹر کار کو تیز کیا۔ وہ سرحد پر پہنچ گئے۔ وہاں سے رخ پھیرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ فرانز دونوں ہاتھ بلند کئے سڑک کے درمیان کھڑا ہے۔ اتنے میں بندوق کی آواز آئی۔ گولی فرانز کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ آسٹریا زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ زمین پر گر گیا۔

ضروری گذارش

مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ مضمون کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔ مضامین صاف اور خوشخط ہونے چاہئیں تاکہ ادارے کو پڑھنے میں سہولت ہو۔ نیز اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

(ادارہ)

پروفیسر عبدالسلام اختر ایم اے
(ناگپور یونیورسٹی)

سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہی تھیں

سحر کی بھیگی ہوئی شعاعیں چمن چمن جگمگا رہی تھیں
بہار نغمے الاپتی تھی گھٹائیں گھر گھر کے آ رہی تھیں
طلسم خاموش تھا مسلط اگرچہ ہر نفس زندگی پر
نفس نفس کے خموش سینے میں شوخیاں مسکرا رہی تھیں
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہی تھیں

ٹپک رہے تھے ہوا سے پیہم مسرتوں کے حسین ترانے
افق پہ اُترا ہوا سا جوبن۔ روش پہ آئے ہوئے زمانے
چمن کے اک جھنڈ کے تلے چند بھیگے پتوں کی آڑ لیکر
سحر کا تارہ سنا رہا تھا گذشتہ شب کے حسین فسانے
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہی تھیں

وہ جدوجہدِ حیات کا دم بدم اُبھرتا ہوا سا پارا
خموشیوں کا سکوں سے اٹھنا لجنوں کا لیتے ہوئے سہارا
وہ راہ چلتے ہوئے مسافر کوئی یہاں پر کوئی وہاں پر
کہیں پہ وبتی ہوئی امیدیں کہیں پہ اٹھتا ہوا شرارا
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہی تھیں

وہ دن بھی آئیگا جب تمہیں داستانِ فرقت سناؤنگا میں
کہاں کہاں کسطرح سے گذری یہ حال سارا بتاؤنگا میں
حقیقتیں جب مجاز کی بندشوں سے آزاد ہونگی اختر
تمہیں بٹھا کر قریب اپنے یہ آپ بیتی سناؤں گا میں
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہی تھیں

تعلیمات

عبدالحلیم انصاری

چند اہم مسائل

جنگ کا اثر جنگ کا تعلیمی نظام پر کیا اثر ہوا ہے ؟ جنگ کے ماحول میں جو طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی ذہنی نشوو ارتقا کا رجحان کیا ہوگا ؟ جنگ کے بعد جو حالات رونما ہوں گے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے؟

یہ چند سوال ہیں۔ جن کا جواب ہندوستانیوں کے لئے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ برطانوی کابینہ کے لیبر ممبر مسٹر بیون نے "ڈیلی ڈسپیچ" کے نمایندہ سے کہا۔ کہ جنگ کے باعث برطانیہ کی درس گاہوں میں ایک قسم کا جمہوری عنصر داخل ہوگیا ہے اور اس کا نتیجہ بہ درجہ آخر خوشگوار ہوگا۔ دوران جنگ میں بعض تعلیمی اداروں کو نقصان پہنچا ہے۔ اور عظیم جنگی مصائب کے باوجود دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے بلند تعلیمی معیار کو قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کریں۔ ہمارا عزیز ترین قومی سرمایہ ہمارے بچے ہیں۔ اگر ہم واقعی ایک بہتر سماجی اور سیاسی نظام کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ تو ہمارا فرض منصبی ہے۔ کہ ہم اپنے آیندہ شہریوں کے لئے بہترین ذہنی تربیت کا انتظام کریں۔ اور انہیں نئی دنیا میں تعمیری کام کرنے کے قابل بنائیں۔

مسٹر بیون نے ایک اور بصیرت افروز نکتہ پیش کیا اور وہ یہ کہ مشینوں کی فضا میں سانس لینے والے خود مشین بن جاتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں ایک ہی قالب میں ڈھلے ہوئے پرزوں کی سی یکسانی اور یک رنگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ان کی شخصیت میں تنوع نہیں رہتا۔ موجودہ جنگ کے دوران میں خصوصیت کے ساتھ مشینوں نے انسانی شخصیت کے سامنے ایک زبردست محاذ قائم کر رکھا ہے۔ ہم کھانا مشینوں کے ذریعہ پکاتے ہیں۔ برتن مشینوں کے ذریعہ دھوتے ہیں۔ خبریں پہنچانے سنانے اور سننے کے لئے مشینیں ہیں۔ شعر و نغمہ سے لطف اندوز ہونا ہو تو ریڈیو حاضر ہے۔ ایسے ماحول میں تمام لوگ ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ اس کا علاج کیا ہے۔ مسٹر موصوف [illegible] میں انسانی روح میں غیر محدود ترقی کے امکانات پوشیدہ [illegible] ماحول سے بالاتر ہو کر پرواز کر سکتی ہے۔ ہمیں ایسی تعلیم [illegible] ماحول کے قید و بند سے ہماری آتما کو آزاد کر دے۔ [illegible] سے نکھار آئے۔ اور ہم میں نقل و تقلید کی بجائے

خود اعتمادی صحیح تعلیم کی بنیادوں کو استوار کرنے میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ بچے کی جسمانی اور ذہنی تربیت پر مصنوعی بندشیں عائد نہ کی جائیں۔ ڈاکٹر میریا مونٹی سوری اپنی معرکہ آرا تصنیف "رازِ طفولیت" (The Secret of Childhood) میں اس بات کی شاکی ہیں کہ بچے سیڑھیوں پر خود چڑھنے کے لئے مچل رہے ہیں لیکن ہم انہیں زبردستی گود میں اٹھا کر اوپر لے جاتے ہیں۔ وہ پیدل چلنے پر مصر ہیں لیکن ہم انہیں بچہ گاڑی میں بٹھا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوفہ کا بیان ہے۔ کہ ایک تندرست سہ سالہ بچہ کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ ایک میل تک پیدل چل سکتا ہے۔ اب ہر ترقی یافتہ درس گاہ میں بچوں کے چڑھنے کے لئے موزوں قسم کے زینے ہیں۔ جنہیں عبور کرنے میں بچے جسمانی اور دماغی نشوونما کے ساتھ ساتھ ذہنی مسرت محسوس کرتے ہیں

ایک سوال کا جواب بچے پوچھتے ہیں "ننھا کہاں سے آگیا" انہیں جواب ملتا ہے "دایہ لے آئی" "کہاں سے لے آئی ؟" "ہسپتال سے" "کہاں سے۔ ہسپتال سے۔ وہ کیا ہے ؟" جواب میں خاموشی کے سوا والدین کو کچھ سوجھتا نہیں۔ ایسے سوالات کا مناسب جواب دینا چاہئیے۔ دایہ گری سے متعلق ایک ماہوار امریکی رسالہ کے اڈیٹر ڈاکٹر لورے نے بچوں کے تعلیمی اداروں میں [illegible] ظاہر کی ہے کہ بچوں کے سوالات کو ٹال دینے کی ناکام کوشش بچے کے حق میں چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی۔ والدین کے متعلق ان کے حسن عقیدت میں فرق آجاتا ہے۔ وہ سوچنے لگتے ہیں۔ کہ "نومولود" کو گھر میں لانے کے لئے والدین کو دایہ کی ضرورت پڑی۔ آخر کیوں ؟ زندگی کے مظاہرہ میں بچوں کی دلچسپی بالکل قدرتی امر ہے۔ ان کے سوالات معقولیت [illegible] مبنی ہوتے ہیں۔ وہ [illegible] بلیوں اور بلی کے بچوں کو دیکھتے ہیں کبھی کبھی چڑیوں یا کبوتریوں کے انڈوں کو گھونسلے سے گرتا دیکھتے ہیں "یہ کیا چیز ہے اماں جان" "اچھا چڑی کا بچہ اس سے نکلتا ہے۔ اب اس میں سے نکلے گا۔" ڈاکٹر لورے کا بیان ہے۔ کہ جس زبان میں ایسے سوالات کا جواب دینے کے لئے موزوں الفاظ نہ ہوں۔ وہ ادھوری زبان ہے۔ ان سوالات کی جنسی نوعیت سے گھبرانا نہیں چاہئیے۔ غیر اصطلاحی طور پر ان کا جواب دینے کی کوشش کرنا مناسب ہے۔

بچوں میں جمالیاتی احساس

ترقی یافتہ تعلیمی اداروں سے ملحقہ عجائب خانوں کا ابتدائی مقصد یہ ہے کہ تفریح و تفنن کے ذریعہ بچوں میں آرٹ کے لئے وابستگی پیدا کی جائے اور ان کے جمالیاتی احساس کو ترقی حاصل ہو۔ امریکہ کے نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی ایک تازہ رپورٹ سے اس ضمن میں از بس سبق آموز واقفیت حاصل ہوئی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ لڑکوں کو مکہ بازی یا لڑائی کے سین بہت پسند ہیں۔ اس کے برعکس لڑکیوں کو ایسے مناظر بھاتے ہیں جن میں خوشنمائی زیادہ ہو اور ایکشن (حرکت) کم ہو۔ مسرت و الم کے نظاروں سے لڑکے اور لڑکیاں دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ چند بچوں کو ایک نگار خانے میں لے جایا گیا۔ ان میں سے آٹھ سال کے دو بچوں نے کہا:-

"یہاں کسی حیوان کی تصویر نہیں" یہ کہہ کر وہ باہر آ گئے۔ تجربہ شاہد ہے کہ خوشنمائی یا بدنمائی کا احساس تیرہ سال کی عمر سے نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اس عمر کا لڑکا ہو یا لڑکی وہ بدصورت چہرہ دیکھ کر بیزار اور خوبصورت چہرہ دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ زمانہ حال کے مشہور فرانسیسی مصور نے عورتوں کی جو تصویریں تیار کی ہیں۔ ان کی امتیازی خصوصیت سادگی اور گرانباری یعنی "بھاری پن" ہے۔ آٹھ اور نو سال کے دو لڑکوں نے اس مصور کی ایک تصویر دیکھ کر کہا۔

"یوں معلوم ہوتا ہے یہ عورت اینٹوں سے بنائی گئی ہے"۔ ظاہر تھا کہ ان کمسن لڑکوں کے نزدیک نزاکت زنانہ حسن کا ضروری وصف ہے۔

چند معیاری درسگاہیں

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا تعلیمی نظام وہاں کی قومی زندگی سے کس قدر وابستہ ہے۔ اس کی تشریح کے لئے نیویارک کے صرف ایک سکول کا نصاب ملاحظہ ہو۔ جس میں طلبا اور طالبات کو پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔ یہ امر ہمارے وہم و گمان میں نہیں آ سکتا کہ ایک ہی درس گاہ میں قصاب باورچی اجناس خوردنی و نوشیدنی کی خرید و فروخت اور اس کے ساتھ ہی چائے پارٹیوں کے انتظام اور میزبانی کے اسلوب سکھائے جاتے ہیں۔ مشہور ہفتہ وار رسالہ "ٹائم" (ٹائمز نہیں) کے بیان کے مطابق اس سکول کے ڈائرکٹر نے اعلان کیا ہے۔ کہ کھانے پینے کا سامان بیچنے والی دکانوں پر لاکھوں آدمی کام کرتے ہیں۔ ان کی تربیت ہمارا قومی فرض ہے۔ حال میں جب یہ نیا نصاب جاری کیا گیا تو ۱۲ سو امیدواروں نے داخلے کے لئے درخواستیں دیں۔ ان میں پانسو بالغ تھے۔ درس گاہ کا ساز و سامان اتنے ہمہ گیر پیمانہ پر ہے اور اسے اس التزام سے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ کہ طلبا فارغ التحصیل ہوتے ہی پختہ کار پیشہ ور دکاندار بن جاتے ہیں۔ قہوہ پینے کی مشین سے لے کر برف خانہ تک اور برقی مطبخ سے لیکر کیش رجسٹر تک یہاں موجود ہیں۔ بہت جلد خراب ہو جانے والی اشیا مثلاً ڈبل روٹی فواکہ مٹھائی وغیرہ کو دیر تک محفوظ رکھنے کا سالم کارخانہ ہے۔ قصاب کی دکان ہے۔ طلبا گوشت کاٹتے یا قیمہ بناتے وقت سرجنوں کی طرح سفید لبادہ پہنتے ہیں۔ بیکری یعنی مطبخ میں سالگرہ کی شاندار کیک سے لیکر بچوں کے بسکٹ تک تیار کئے جاتے ہیں۔ درس گاہ کے مختلف کارخانوں کی تیار کردہ چیزیں دوسرے تعلیمی اداروں کے ہسپتال وغیرہ کے لئے مہیا کی جاتی ہیں۔ گویا سکول کارخانوں اور دکانوں کا مجموعہ ہے۔ چائے کی پارٹیوں کے لئے ہال ہیں۔ اور ان کا انتظام زیر تربیت لڑکوں اور لڑکیوں کے سپرد ہے۔

ٹیکنیکل تعلیم

اب موٹر کاروں کی صنعتی درس گاہ کو دیکھئے۔ بروکلن ہائی اسکول میں جو ابھی ابھی قائم ہوا ہے ۲۵ لڑکے داخل ہیں۔ جنہیں چار سال میں موٹروں کے صنعتی و تجارتی شعبوں میں طاق کیا جاتا ہے۔ یہاں ۵ لاکھ ڈالر یعنی تقریباً ستر لاکھ روپیہ کی مشینری ہے۔ ۲۶ دارالتجارب ہیں۔ جن میں ہر موٹر کے مختلف نمونے کھلونوں کی شکل میں تیار کئے جاتے ہیں۔ ۹۴ نئی موٹر گاڑیاں خرید کر انہیں پرزوں کی صورت میں طلبا کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ہر پرزہ کی ساخت و اہمیت کو عملی طور پر سمجھ لیں۔ طلبا کی اپنی موٹر کاریں قابل مرمت ہوں تو انہیں ٹیکنیکل مشورہ مفت دیا جاتا ہے۔ ایک "تصادم خانہ" بھی ہے۔ جہاں مختلف سمتوں سے آتی ہوئی موٹروں میں تصادم کرایا جاتا ہے۔ اس میں موٹروں کو جو نقصان پہنچتا ہے۔ اسے رفع کرنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ طلبا موٹروں کی خرید و فروخت کے متعلق تجارتی راز بھی سیکھتے ہیں۔ گویا یہاں ایک کلینر سے لے کر انجینئر اور ڈرائیور سے لیکر مینجر کی تعلیم ملتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کا نرالا انتظام

ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک شعبہ "انڈر گریجویٹ فیکلٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے گرانقدر مجلسی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد جو طلبا اعلےٰ تعلیم کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اس ایسوسی ایشن کے دفتر میں آتے ہیں۔ موزوں طلبا کو منتخب کرنے کے بعد یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ ایسوسی ایشن کے رضاکار لیکچر روم سے نکلتے ہی سید ھے دفتر پہنچتے ہیں۔ اور ان طلبا کو وہی لیکچر پڑھا دیتے ہیں ۱۹۳۸ء

غزل

خواجہ جمیل احمد
بی۔اے

تری نگاہوں میں شوخیاں بھی ہیں بجلیاں بھی ہیں کیف بھی ہے
وہ جس میں مستی چھلک رہی ہو میرے لئے انتخاب کر دے

خدا کرے تیرے بھی خیالوں میں آ بسے کوئی ایسی صورت
جو زندگی میں عذاب بھر دے جو تیری راتیں خراب کر دے

تیری نظر مائل کرم ہو تو کیا عجب ہے کہ یہ تجلی
چمک کے خاکِ چمن کے ہر ایک ذرے کو آفتاب کر دے

تیری نگاہوں کے ہوتے کوئی رہینِ مینا و جام کیوں ہو
نظر کے ساغر انڈیل، دنیا کو مستِ کیفِ شراب کر دے

نوازشِ حسن ہی سے ہوتی رہی ہے پرداخت عاشقی کی
تیرے سوا اور کس سے ممکن کہ جذبِ دل کامیاب کر دے

بہار غنچوں کی خوابگہ میں سکوت کی نیند سو رہی ہے
خرام کر ساحتِ گلستاں میں اور بپا انقلاب کر دے

ا[illegible] ہزار[illegible] اور گریجویٹ بیچروں نے کالجی تعلیم [illegible] اندر[illegible] بیٹے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت ایک ہزار غریب طلبا اس انجمن کی وساطت سے گریجویٹ بن چکے ہیں۔

فنِ خطابت کی تعلیم

کیلی فورنیا کے تین ہائی سکولوں میں جونیئر اسپیکرز بیورو" قائم ہیں جن سے یہ مقصود ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو مختلف موضوع پر تقریر کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔ گذشتہ پانسال میں ۵۷ تعلیمی مجالس علمی اور معاشری انجمنوں اور کلبوں نے اپنے جلسوں کی رونق بڑھانے کے لئے ان لڑکوں اور لڑکیوں کو مدعو کیا۔ ریڈ کراس سوشل لیگ، ورِ رفاہِ عامہ کے متعدد ادارے فنِ خطابت کے ان مظاہروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مختلف کاروبار تجارت صنعت فلسفہ سیاست مذہب شہریت وغیرہ سے متعلق کوئی اہم مسئلہ زیرِ بحث ہو۔ یہ نوجوان خطیب اس پر نئے انداز سے روشنی ڈالیں گے۔ بیورو مذکور نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا ہے کہ ہمارے طلبا ایک تقریب میں صرف پانچ منٹ تک تقریر کریں گے۔ ایک علمی کلب کے پنچ پر تقریر کرنے کے بعد طالب علم واپس آیا۔ تو اس نے اخباری نمائندہ سے کہا:-

"لطف آ گیا میری کرسی گورنر کے بالکل قریب تھی اور میں نے پانچ منٹ تک سب کو محوِ حیرت بنائے رکھا۔"

تصحیح

"ناک چنے چبوانا"

اُردو زبان کا یہ محاورہ کسی کے زیادہ تنگ کرنے کے موقعے پر بولا جاتا ہے۔

"زید نے مجھے ناک چنے چبوا دیئے"

پنجاب کے اکثر اخبار نویس اسے

ناکوں چنے چبوانا

لکھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں

محاورے میں ناک کا لفظ واحد ہے۔ جمع نہیں

تاجور

علمی و ادبی

سوال و جواب

سوالات

مولانا سید مختار احمد صاحب نے اپنی ایک تالیف میں آتش مغفور کے شعر

کسی کی محرم آب رواں وہ یاد آئی ؎ حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

کے متعلق لکھا ہے "آب رواں" اردو ہے اور محرم (انگیا کے معنی میں) بھی اردو ہے پھر (محرم آب رواں) کہنا کیونکر صحیح ہے؟

اسی شعر کے مصرع اولیٰ میں مرزا یاس یگانہ لکھنوی نے کچھ تصرف کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے ؎

کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی ؎ حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

"محرم بمعنی رازدار اور محرم بمعنی انگیا۔ ان دونوں لفظوں کا قالب ایک ہے اور معنی جدا جدا مگر دونوں کے معنی میں بھی ایک مناسبت ہے لہذا یہ لفظ مہند بالمعنی ہے۔ اس حالت میں عطف و اضافت صحیح ہے۔" کیا 'محرم آب رواں' صحیح ہے؟ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

۲۔ علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے لفظ "قسطنطینیہ" کو "قسطنطنیہ" نظم کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار ؎ مہدی امت کی سطوت کا نشان پائدار

علامہ مغفور کے علاوہ ایک محقق، اہل فن، شاعر و ماہر عربی و فارسی علامہ شبلی مرحوم نے بھی 'قسطنطنیہ' ہی لکھا۔ ان دو اصحاب کے علاوہ جہاں تک مجھے علم ہے کئی اور ادبا نے بھی قسطنطنیہ ہی لکھا ہے۔ میرے ناقص خیال کے مطابق لفظ مذکور شہنشاہ قسطنطین کے نام سے مشتق ہے اور لفظ 'قسطنطینیہ' میں یائے نسبت ہے۔ مگر حضرت اقبال نے جس طرح نظم کیا ہے اس صورت میں یائے نسبت کی بجائے یائے اصلی گر گئی ہے۔

آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور اہل تحقیق کیا کہتے ہیں؟

(اصغر حسین راغب مرادآبادی)

جوابات

۱۔ موجودہ اردو گرامر میری رائے ناقص میں موجودہ ترقی پذیر زبان کا ساتھ نہیں دے سکتی، زبان اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ اس کے لئے موجودہ گرامر قریب قریب بے کار ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اردو گرامر کے قواعد کی رُو سے۔

علمی دنیا، ادبی دنیا، فلمی دنیا، ایڈیٹر اتحاد، موسم برسات، ملکہ موسم [illegible] کی ترکیب بھی غلط ٹھیرتی ہے کیونکہ موسم بہ فتحہ میم مہند ہے اور لفظ مہند کی فارسی ترکیب اردو گرامر کی رُو سے غلط ہو گی اسی طرح کوٹھیات، ٹھیکہ جات، نمونہ جات، ریاستوں میں ایک عہدہ ہوتا ہے بندوبست کوٹھیات، رہائش، رہائشی مکان وغیرہ۔ ان الفاظ کو آپ کی گرامر غلط ٹھیراتی ہے۔ لیکن کیا مستند اہل زبان اور فصحائے اردو ان الفاظ کے استعمال سے اجتناب کر سکتے ہیں؟ آپ فصحائے اردو کا نثری کلام یا خطوط ملاحظہ فرمائیں گے تو اس قسم کے الفاظ کو ان میں کثیر الاستعمال پائیں گے۔ شمس العلما، مولانا آزاد نے ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم اور ججان ہائی کورٹ کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو "مکتوبات آزاد"۔ سر سید، مولانا حالی، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر ذکاء اللہ، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی وغیرہم کی کتابوں اور خطوں میں ہزاروں ایسے الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں جو گرامر کے قواعد کی رُو سے غلط ٹھہرتے ہیں۔ جب سرسید کے عہد میں تو ایسے الفاظ کا یہ درد رکھا تو آج کی ترقی یافتہ زبان قواعد صرف و نحو کی کیونکر پابند ہو سکتی ہے؟

میں اگرچہ بربنائے وہم ایسے الفاظ کے استعمال سے بہت حد تک احتراز کرتا ہوں، لیکن دوسروں کو روکتا نہیں۔ "محرم آب رواں" کی ترکیب فارسی کو بھی اسی بنا پر غلط نہیں سمجھتا۔ اس ترکیب میں اگرچہ محرم کا لفظ مہند ہے۔ اور آب رواں (کپڑے کی ایک قسم کا نام) مہند ہو یا نہ ہو، ضرور ہے۔ چونکہ ان دونوں لفظوں کی صورت بالکل عربی اور فارسی ہے۔ اس لئے اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ یہ اردو میں کس معنی استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا صورۃً عربی و فارسی ہونا میرے نزدیک فارسی ترکیب کے جواز کے لئے کافی ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اصل شعر میں "وہ یاد آئی" نہیں بلکہ مرزا یاس نے "آب رواں کی یاد آئی" جو لکھا ہے اصل شعر کے مطابق ہے۔ گویا مرزا صاحب نے شعر کی تصحیح کی ہے اس میں تصرف نہیں کیا۔

۲۔ اردو میں تو قسطنطنیہ بہ تلفظ قُسْ طُنْ طُنْ یَہ رائج ہے اور یہی صحیح ہے ہم غیر زبانوں کے الفاظ کے ماخذی تلفظ و معنی کے پابند نہیں۔ اردو میں غیر زبان کا لفظ جس تلفظ، جس معنی اور جس تصرف کے ساتھ عام و خاص کی زبانوں پر آ جائیگا۔ اُسی تلفظ، اُسی معنی اور اُسی تصرف کی صورت میں صحیح و فصیح ہوگا، لیکن اگر ضرورت شعری کے سبب کوئی مستند شاعر غیر زبان کے کسی لفظ کو ماخذی تلفظ یا وزن کی مجبوری سے ماخذی تلفظ کے مشابہ صورت

سوال و جواب

سوال ہٹلر نے کس طرح پوری جرمن قوم پر نسلی تفوق کا جنون سوار کر دیا ہے؟

جواب - ہٹلر اور اس کے ساتھی انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے موثر اور مسلسل پروپیگنڈے سے عام جرمنوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے۔ کہ تم دنیا کی سب سے اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے ہو اور بنی نوع انسان کی رہنمائی صرف تمہارا ہی حق ہے - اس بے پناہ پروپیگنڈے کا یہ اثر ہوا ہے کہ آج ہر جرمن یہ سمجھتا ہے کہ میں دنیا کی نجیب ترین نسل سے تعلق رکھتا ہوں - میرے جسم میں پاک خون رواں ہے - اور میں دوسروں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں - صرف یہی نہیں - جرمنی میں بچوں کو ابتدائی ایام سے ہی یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تم جرمن نسل سے تعلق رکھتے ہو - جرمن نسل بہادر ترین نسل ہے اور مستقبل میں تمام دنیا پر اسے اقتدار حاصل ہوگا - ہٹلر تمہارا نجات دہندہ ہے - اور وہ جو کچھ کہتا ہے سوچ سمجھ کر کہتا ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے - جو جرمنی کی قومی درسی کتاب سے لیا گیا ہے - یہ کتاب تمام بچوں کو پڑھنی پڑتی ہے -

ہمارے سب سے بڑے رہنما اڈولف ہٹلر

ہم تم سے محبت کرتے ہیں -

ہم تمہارے لئے دعا کرتے ہیں -

ہم تمہاری آواز سننا چاہتے ہیں -

ہم تمہارے لئے مشقت کرنے کو تیار ہیں -

جرمنی کے سکولوں میں پانچ پانچ چھ چھ برس کے بچے ایک دوسرے سے اس قسم کے سوال و جواب دہراتے ہیں :-

سوال :- آجکل دنیا میں حضرت مسیح کا نمونہ کون ہے

جواب :- اڈولف ہٹلر -

سوال :- اپنی وفاداری اور خودداری کے اعتبار سے حضرت عیسٰی کے حواریوں کے مانند کون لوگ ہیں ؟

جواب :- گوئرنگ - گوئبلز -

سوال میثاق سعد آباد کیا ہے؟ اس میں کون کون سی سلطنتیں شریک تھیں ؟ سلطنتوں اور دوسرے اسلامی ممالک کا جنگ کے متعلق کیا رویہ ہے؟

جواب "میثاق سعد آباد" سے مراد وہ تاریخی معاہدہ ہے جو دنیا کے چار اسلامی ممالک کے مابین ایک دوسرے کی مدد و اعانت کے متعلق قرار پایا تھا یہ چار ملک ٹرکی، ایران، افغانستان اور عراق ہیں - اس معاہدہ کی تکمیل قصر "سعد آباد" میں ہوئی تھی - اس لئے اس کا نام میثاق سعد آباد پڑ گیا - اس معاہدہ کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ یہ چاروں ممالک ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات قائم رکھیں گے، اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کی امداد سے گریز نہیں کریں گے - اس معاہدے کی نوعیت غیر جارحانہ ہے - یعنی اس میں یہ شرط نہیں کہ جنگ کی صورت میں میثاق سعد آباد پر دستخط کرنے والا ملک اپنے کسی حلیف کو فوجی امداد دینے پر مجبور ہوگا -

اس وقت اس معاہدہ میں شریک سلطنتوں کی پوزیشن یہ ہے کہ عراق اور ایران انگریزوں کے حلیف ہیں - ترکی اور افغانستان اس وقت تک رسمی طور پر غیر جانبدار ہیں لیکن بالفرض محال اگر انہیں جنگ میں شریک ہونا پڑے تو یہ ملک انگریزوں کا ساتھ دیں گے - کیونکہ اس وقت انہیں خطرہ برطانیہ سے نہیں بلکہ جرمنی سے ہے - اسلامی ممالک کی حکمت عملی یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے جنگ سے احتراز کیا جائے کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ سلطنتیں جرمنی کے مقابلے پر بہت کمزور اور ناتواں ہیں - پولینڈ، فرانس اور دوسرے یورپی ملکوں کے افسوسناک حشر کے پیش نظر ان کی یہ حکمت عملی کچھ قابلِ اعتراض نہیں لیکن اسلامی ممالک کی تمام ہمدردی جمہوریت کے ساتھ ہے اور وہ اس امر کے متمنی ہیں کہ دنیا کو آمروں کے ظلم و تشدد سے نجات ہو -

مصر میثاق سعد آباد میں شریک نہیں - لیکن وہ برطانیہ کا حلیف ہے - جرمنی سے اس کے سیاسی تعلقات منقطع ہو چکے ہیں - اس وقت تک مصر نے جرمنی کے خلاف اور انگریزوں کی حمایت میں اعلان جنگ نہیں کیا - اس کی وجہ محض یہ ہے کہ انگریزوں نے مصر کو اس بات کا اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جبتک مناسب سمجھے غیر جانبدار رہے - برطانیہ کی طرف سے اس پر جنگ میں شریک ہونے کے لئے دباؤ نہیں ڈالا جائے گا فلسطین کے عرب بھی برطانیہ کی حمایت کا اعلان کر چکے ہیں -

(ادارہ)

محترمہ ن ص صاحبہ

پیش گوئی

"اچھی نازلی!"

ایک طویل، کبھی ختم نہ ہونے والا پیار ——

تمہارا پیارا سا خط عین انتظار میں مل کر بے حد مسرتوں کا حامل ہوا۔ اس محبت نامہ کو پاکر میں چند نذیں لمحات کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر سی ہوتی جاتی ہوں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے گویا دنیا کی تمام مسرتیں میرے پاس ہی سمٹ آتی ہیں ۔ میں ایک حسین دنیا میں محو پرواز ہوجاتی ہوں۔ اچانک مجھ احساس ہوتا ہے جو پھر مجھے اس شب و روز کی دیرینہ کشمکش میں مبتلا کردیتا ہے ۔

نہ جانے تمہیں میری دکھ بھری کہانی سننے کا اتنا مطالبہ کیوں ہے؟ بہرحال اگر تم مجھ سے میری کہانی کہلوانا ہی چاہتی ہو۔ تو میں کہتی ہوں تم سنو میں سناتی ہوں۔ تم اپنا شوق پورا کرلو۔ میں اپنی شادی سے پیشتر واقعات سے ہی شروع کرتی ہوں۔

اس سے پیشتر اخبار و رسائل میں سے افسانے پڑھ کر کبھی مسرور وشادماں کبھی رنجیدہ و پشیماں ہوا کرتی۔ مجھے اکثر وہ افسانے جو مایوسی و ناچاری اور رنج و غم کی زندہ تصویریں ہوتیں۔ زیادہ ہی پسند ہوا کرتے تھے۔ شاید میری طبیعت کا یہ رجحان ہی اپنے رنج و الم سے معمور افسانۂ زندگی کی پیش گوئی تھی۔ دوسروں کے غم و حسرت کے افسانے میرے لئے وقت گزاری کا بہترین مشغلہ ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں میں اپنے آپ ہی کچھ اس طرح مست تھی کہ مجھے کائنات کی تمام چیزیں سیلاب مسرت میں ڈوبی نظر آتی تھیں۔ میری زندگی قلبی سکون کی حقیقی دولت سے مالا مال تھی۔ میں اپنے تصورات کی ایسی رنگین اور رُوح پرور دنیا میں بستی تھی کہ کبھی اپنی زندگی کے بھیانک مستقبل کو نہ دیکھ سکی۔

چونکہ میں بارہا صنفِ نازک کو بعد از "شادی" صنفِ قوی کے [illegible] جھونکوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے دیکھ چکی تھی۔ اکثر کتابوں [illegible] سے بھی مجھے یہی تلخ تجربہ ہوا۔ عورت کی داستانِ مظلومیت [illegible] کی پامالی نے مجھے صنفِ قوی سے حد درجہ بدظن کردیا۔ [illegible] مختصر سے عرصے میں شادی سے نفرت کرنے لگی۔ [illegible] کے پیہم اصرار کے باوجود مجھے کسی شادی میں شامل [illegible] آنکھوں سے کسی کو موت کے گڑھے میں دھکیلتے دیکھ نہ سکتی تھی۔ میری ہم عمر لڑکیاں اور خاص طور پر والدین میرے اس عجیب وغریب نظریے سے حیران ہوا کرتے تھے۔

آخرکار وہ وقت بھی آن پہنچا۔ جب میرے خیالات و تصوّرات کے حسین و دلکش دریا کی روانی کو مضبوط بند باندھ کر روک دیا گیا۔ میری خیالی دنیا کی عالیشان عمارت کے کواڑ اور بنیاد نہایت بے رحمی سے توڑنے کی کوشش ہونی شروع ہوگی۔ میری آرزوؤں کا خون کرنا شرعی قانون قرار دیا گیا۔ میری امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے کسی کا دل نہ پسیجا۔ میری آرزوؤں کے پُر رونق باغ میں اچانک خزاں آگئی۔ میں اپنی بے بسی و بے کسی پر آٹھوں پہر روتی۔ میرے دن بے کیف اور راتیں بھیانک ہو گئیں اور ہر لمحہ میرے لئے مصیبت کی آمد کا پیغام لاتا۔ میرے لئے دن اور راتیں اتنے طویل ہوگئے کہ کاٹنے سے نہ کٹتے۔ ہزار ایک بار میرے دل میں اس تکلیف سے رہائی پانے کا آسان سا علاج بھی آیا۔ میں چاہتی تھی کہ خودکشی کرکے ہر نئی آنے والی تکلیف و مصیبت سے چھٹکارا پالوں۔ لیکن اس کا انجام کتنا خوفناک، کتنا ہولناک تھا۔ اس سے بھی میں باخبر تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ "دین سے دنیا رکھنی مشکل ہوتی ہے" میرے بعد لوگوں کے عجیب و غریب شبہات۔ اپنے والدین کی عزت کا جنازہ —— ان سب کا تصوّر مجھے ایک زہریلے سانپ کی مانند کاٹنے کو دوڑتا اور میں اس کے تصوّر سے سرتاپا کانپ اٹھتی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے اپنا یہ ارادہ بھی ملتوی کردیا۔

آخرکار ایک منحوس گھڑی آئی کہ مجھے ایک بے بس و بے کس سمجھ کر ایک غضبناک ہستی کے ہاتھوں سونپ دیا گیا۔

اچھی نازلی! میری طبیعت سخت بے چین ہو رہی ہے۔ خدا معلوم کیوں؟ اس کے بعد کیا ہوا؟ —— اگلے خط میں لکھوں گی۔ اچھا خدا حافظ!

تمہاری بدنصیب .. ن-ص

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ جو ہر ایڈریس کے کونے میں تحریر ہوتا ہے۔ نیز اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔ تاکہ ادارہ کو جواب دینے میں سہولت ہو۔ (مینیجر)

محترمہ دل آرا - ع آبادی

پگڈنڈی کی کیچڑ!

بارش ابھی ابھی رُکی تھی - بادل آسمان کو اب تک گھیرے ہوئے تھے- میں سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے بالکنی پر آ کھڑی ہوئی- سبزہ پر پانی کی بوندیں بالکل موتیوں کی مانند نظر آ رہی تھیں - تیز آندھی پتوں سے بھری ہوئی بھاری ڈالیوں کو ایک پُر شور آواز کے ساتھ ہلا رہی تھی - سامنے کے کھیت میں بوئی ہوئی ککڑی کی بیلیں ہوا میں لہلہا رہی تھیں اور ہرے ہرے پتوں پر زرد پھول بہت ہی خوشنما معلوم ہوتے تھے - دور کہیں مور آم کی شاخوں پر بیٹھے بادل کی گرج پر کبھی کبھی چلّا پڑتے تھے - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارش ابھی ہو گی اور بہت زور سے ہو گی کھیت میں سے ہوتی ہوئی سامنے کی چند جھونپڑیوں میں جانے والی پگڈنڈی بارش کی زیادتی اور لگاتار آمد و رفت کی وجہ سے کیچڑ ہو کر رہ گئی تھی - اس پر سے جاتے وقت بیچارے کسانوں اور اُن کی عورتوں کے پاؤں کیچڑ میں لت پت ہو جاتے - ایسے کہ اُنہیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا گویا میرے پاؤں میں بہت سے کیڑے کاٹ رہے ہیں! ——— لیکن اسی پگڈنڈی سے کسانوں کے بچے اور ان کی عورتیں روز صبح شام ایسے گزرتے جیسے سمنٹ کانکریٹ پر چل رہے ہوں -

میری نظریں پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں اور میں پگڈنڈی کے اس کیچڑ میں ہندوستانیوں کی تڑپتی ہوئی روح کو پھنسا ہوا پا رہی تھی ——— یکایک اس کیچڑ میں جان پیدا ہو گئی - اس میں سے ایک پاؤں نکلا پھر دوسرا پاؤں - تیسرا پاؤں - چوتھا پاؤں ——— ہیں! یہ تو آگے بڑھ رہے تھے! ——— میں نے نظر اُٹھائی دو دیہاتی عورتیں جا رہی تھیں - ایک جوان عورت تھی - جس کی گود میں سفید چادر میں لپٹا ہوا بچہ تھا - دوسری عورت بڑھیا تھی - جوان عورت کا لباس کم قیمت ہوتے ہوئے بھی بھڑکیلا تھا - اس کا سرخ لہنگا اور پیلا دوپٹہ اس کے حسن کو دوبالا کئے ہوئے تھے - شاید وہ دونوں ساس اور بہو تھیں ——— لیکن وہ خاموش تھیں - حالانکہ دیہاتی بہت کم خاموش رہتے ہیں - خاموشی کے علاوہ ایک قسم کی افسردگی اور فکر کی علامت ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھی ——— تھوڑی دیر میں موڑ آ گیا اور وہ سڑک کی طرف مڑ گئیں - میں خدا معلوم کیوں ان کی خاموشی سے اتنی زیادہ متاثر ہوئی ——— اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پگڈنڈی پر بہت سے سانپوں کی دوڑ ہو رہی ہے-

دوسرے دن وہ ساس بہو پھر شہر کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیں - ان کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور نوجوان عورت کی آنکھوں میں میں نے کچھ چمکتی ہوئی چیز محسوس کی ——— بارش آج زیادہ ہوئی تھی اور پگڈنڈی کی کیچڑ بہت نرم اور چکنی ہو گئی تھی - ان دونوں کو میں نے دن میں دو بار شہر جاتے ہوئے دیکھا ——— اسی طرح ——— نوجوان عورت کی گود میں چادر میں لپٹا ہوا بچہ اور بڑھی عورت خاموش اس کے پیچھے پیچھے! کیچڑ میں مشکل سے چلتی ہوئی ——— شام کو وہ واپس ہوئیں - تو بچہ بڑھی عورت کی گود میں تھا اور نوجوان عورت گھونگھٹ نکالے پیچھے پیچھے آ رہی تھی - اس کی چال سے کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا - گویا اس میں چلنے کی طاقت نہیں ہے ——— وہ اپنے آپ کو زبردستی بوڑھی عورت کے پیچھے گھسیٹ کر لیجانے کی فکر کر رہی ہے! ——— خدا معلوم یہ دو عورتیں کیوں مجھے غمگین نظر آتی تھیں؟ آیا وہ سچ مچ کسی فکر میں محو راستہ طے کرتی تھیں یا میری ہی قوت متخیلہ انہیں میرے سامنے ایسا پیش کرتی تھی!

. بارہ بج رہے تھے - میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا ——— آندھی سائیں سائیں کرتی ہوئی درختوں سے ٹکرا رہی تھی - دھوپ سیاہ دیووں کی مانند بادلوں سے دھینگا مشتی کر رہی تھی ——— مجھے قدرت کے ان عناصر کی آپس میں زور آزمائی کے شور کے ساتھ انسانی آہ و بکا کی آواز سنائی دی - سامنے کی جھونپڑیاں ساکت کھڑی تھیں - اس سرے کی جھونپڑی میں سے رونے کی آواز اٹھتی اور دھوئیں کے مانند ہوا میں تحلیل ہو جاتی - میں نے کتاب بند کی اور کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی ——— پگڈنڈی کے کیچڑ پر سے دیہاتیوں کی ایک قطار آ رہی تھی ——— میں نے سلاخ میں سے منہ باہر کرنے کی کوشش کی سب سے اگلے دیہاتی کے دونوں ہاتھوں میں سفید چادر میں لپٹی ہوئی کوئی اکڑی ہوئی چیز تھی اور وہ کہہ رہے تھے! رام نام ست ہے! ——— میں نے [illegible] ہوئے کھڑکی بند کر دی اور پلنگ پر منہ کے بل گر پڑی ——— [illegible]

سانیٹ

کچّے راستے!

وہ کچّے راستے گاؤں کے اکثر یاد آتے ہیں!!
وہ اُونچے نیچے میدان، کھیت، ناہموار پگڈنڈی!
اِدھر گلبن، اُدھر جھاڑی، اِدھر نالے، اُدھر ندی!
وہ منظر، عہد رنگیں کے وہ منظر یاد آتے ہیں!!

جنونِ عشق و مستی وہ فسونِ حُسن و رعنائی!!
نہ بھولوں گا وہ اِک شام زرافشاں، وہ حسیں پنگھٹ
جہاں پہلے پہل دنیائے دل نے لی تھی اک کروٹ
جوانی کی پناہوں میں، محبت کی وہ انگڑائی!!

وہ پیپل کی سلونی چھاؤں، وہ رنگیں ملاقاتیں!!
فضائے رنگ و بُو میں غم کی تلخی کو بھلا دینا!
مرے شانوں پہ سر رکھ کر "کنول" کا مسکرا دینا!
نہ آئیں گی کبھی پھر لوٹ کر وہ چاندنی راتیں!!

وہ کچے راستے، پیپل کی چھاؤں، وہ حسیں لمحے!!
نہ بھولوں گا، نہ بھولوں گا، بہار و کیف کے جلوے!!

صہبا لکھنوی

جی۔ڈی چندن۔ بی۔اے

اگر

روزمرہ کی زندگی میں ہم بیسیوں مرتبہ لفظ "اگر" اپنی بات چیت کے دوران میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن شاید ہی کبھی کسی نے یہ غور کرنے کی تکلیف گوارا کی ہو کہ اس مختصر سے لفظ کو ہماری زندگی ـــ میں کتنی اہمیت حاصل ہے اور ہم کس حد تک اس لفظ کے گھن چکر میں پھنسے ہوئے ہیں تین حروف پر مشتمل یہ لفظ اپنے دامن میں کچھ ایسے اختیارات رکھتا ہے۔ کہ ہم اکثر اس کے حضور میں رحم کے ملتجی ہوتے ہیں۔

خاصیت کے لحاظ سے یہ شرطیہ بھی ہے اور قیاسی بھی۔ معنی اس کے جتنے سادہ اور آسان ہیں، بیان کرنے میں اتنے ہی مشکل اور دقیق۔ میں آپ سے پوچھوں کہ "کیوں صاحب، اگر کے معنی کیا ہیں؟" تو آپ فوری جواب نہیں دیں گے۔ بلکہ چند مثالیں پیش کر کے اپنے مطلب کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے جس پھرتی سے آپ "آگاہ" کے معنی "خبردار" یا "انبار" کے معنی "ڈھیر" بتا سکتے ہیں۔ اسی لہجے میں آپ "اگر" کے معنی نہیں بتا سکیں گے اور یوں گویا ہوں گے کہ "اگر حرفِ شرط ہے جو شرط کے محل پہ بولا جاتا ہے۔ جیسے اگر محنت کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے یعنی اگر کا استعمال کلام کو دو جملوں میں تقسیم کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس فعل کا نتیجہ یا بدلا ہے جو پہلے جملے میں بیان کیا گیا ہے۔"

جواب دینے والا اگر گرامر دان ہو۔ تو وہ یہ بھی کہے گا "کہ اگر، جو، جب، چونکہ، شرط کے معنی پیدا کرتے ہیں۔ اگر فارسی کا حرف ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے اور یہ نثر اور نظم دونوں میں آتا ہے۔" یعنی یہ سب ایک چھوٹے سے لفظ کو بیان کرنے کے لئے کہا جائے گا اور بعض قواعد دان قواعد بھی اضافہ کریں گے کہ "اگر کے استعمال کے ساتھ حرفِ جزا ضرور استعمال ہوتا ہے اور حروفِ جزا تو ہمیشہ پہلے جملے کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان کے استعمال کے بغیر فقرہ نامکمل رہتا ہے۔" اور تب متعدد مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔

اگر تم تھک گئے ہو تو ہم بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر مجھے پیشتر اس امر کے متعلق بتایا جاتا تو میں ضرور دھیان رکھتا۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو انکار کر دیتا۔ اگر سب مولشی ہوتے تو یہ دنیا ایک چراگاہ بن جاتی۔ اگر سب کو بیس سال کی عمر پانے پہ بیس لاکھ روپیل جایا کرتے تو کوئی بھی کسی کے مقابلہ [illegible] ذلت ہوتی۔ اگر [illegible]

مسرتوں اور قہقہوں میں بدل جائے۔

یعنی اس طرح مثالوں کا ایک دفتر لگا دیا جائے گا اور اگر کا دریافت کنندہ بالآخر اتنے لمبے چوڑے جواب کو بھی ناتسلی بخش قرار دے گا۔ کیونکہ اسے ایک مختصر سے لفظ کا مختصر سا جواب چاہیئے۔ "اختصار ظرافت کی جان ہے۔" شاید کسی اگر کے معنی پوچھنے والے نے ہی کہا ہوگا۔

بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جو لوگ زیادہ بولتے ہیں ان میں عقل و فہم کے جزو زیادہ ہوتے ہیں اور وہ تعلیم و مطالعہ سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں جو اکثر حالتوں میں خاموشی کو گفتار پہ ترجیح دیتے ہیں اور ان دونوں قسم کے افراد کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو خاموشی اور بیان دونوں سے ہی گریز کرنا چاہتا ہے۔ موخر الذکر کچھ اس قسم کا دماغی توازن رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک زندگی کے معنی موت سے کچھ کم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کو ہر قسم کے لوگ ایک ہی معنی میں لیتے ہیں۔ اگر کے مقام پہ سب لوگ ہم آواز ہیں اور اگر کو ایک عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔

لفظ ظاہری طور پر کچھ بھی نہیں ہوا کرتے۔ لیکن معنوی لحاظ سے ٹھوس اور مدلل ثابت ہوتے ہیں۔ آپ اگر کو ہی لیجیئے۔ معمولی سے تین حرفوں پر ختم ہے اور ان تینوں حرفوں کو علیحدہ علیحدہ لکھ دیجئے۔ تو ایسے معلوم ہوگا جیسے کوئی بچہ اپنے ہم سبق کی مشق کر رہا ہے۔ ان تینوں حرفوں کو الٹ پلٹ کر لکھئے ایسے معلوم ہوگا جیسے وہی بچہ خواہ مخواہ کسی کا نام لکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اگر یہی اگر آپ کسی شرط یا فرض یا قیاس کے محل پر کہیں تو آپ کا جملہ کافی اہمیت کا مالک ہوگا۔ تصورات کی دنیا میں بھی اگر ہمیشہ اندھے کی لاٹھی کی طرح سہارا دیتا چلا آیا ہے۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ اگر کا مرتبہ کتنا بلند اور اس کا استعمال کس قدر ناگزیر ہے تو اسے اپنی لغات سے کچھ دیر کے لئے معطل کر دیں۔ اپنے کلام سے منسوخ کر دیں۔ آپ چند ہی لمحوں کے بعد یہ محسوس کریں گے کہ آپ کی حالت اس گونگے کی طرح ہو گئی ہے جو اشاروں سے [illegible] سمجھاتا ہے۔

[illegible] کہ ہماری قوت گفتگو [illegible] امید کو ہماری زندگی میں [illegible]

جب ہماری امید بے رنگ ثابت ہوتی ہے تو ہم دل کو یونہی بہلا لیتے ہیں کہ "اگر یوں ہوتا تو ہمیں ناکامی نہ ہوتی" اور اس طرح اگر اور امید کا ایک خاص رشتہ ہے۔ کسی فیلسوف نے کہا ہے کہ "دنیا بہ امید قائم" اور اب جبکہ ہم اگر کو بھی امید کے حلقے میں مقیم دیکھ رہے ہیں تو ہمیں کہنے میں تامل نہیں کہ جب تک اگر ہے تب تک دنیا ہے۔ اگر اور امید میں بھائی بہن کا تعلق ہے اور اس تعلق کا معاہدہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ "تاریخ عالم" کا پہلا فقرہ اور یہ معاہدہ اتنا ہی پختہ ہے جتنی کہ ضعیف الاعتقادی کی تعزی کرڈی۔

خواہش امید کی بہن ہے اور قدرتی طور پر اسے اگر سے خاندانی الفت ہے۔ ہمارے اندر خواہش اور امید کی تگ و دو کچھ اس رفتار سے ہوتی ہے کہ ہم یہ نہیں جان سکتے کہ دونوں میں سے مقدم کون ہے۔ تاہم اس امر سے سب واقف ہیں کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے ہمارے دل و دماغ میں ظاہر ہوتی ہیں اور قدرے غور و خوض کے بعد ہمارا اندازہ یہ ہے کہ خواہش امید کی پیش رو ہے۔ خواہش اور امید کی رفتار وہی ہے جو حرفِ شرط اور حرفِ جزا کی۔ ہم پہلے خواہش کرتے ہیں اور پھر اس کی تکمیل کی امید رکھتے ہیں۔ گویا امید خواہش کا حاصل ہے۔

اب ذرا خواہش کا حسب و نسب ملاحظہ ہو کہ یہ تمام تکلیفوں کی بنیاد ہے۔ گوتم بدھ نے اپنی تمام عمر دشوار ترین اعمال میں گذار کر یہی معلوم کیا کہ اس دنیا میں ہر طرف مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں اور خواہش ہر مصیبت کا باعث ہے۔ اگر ہم خواہش کو کلی طور پر ترک کر دیں تو ہماری زندگی مجسم راحت بن جائے گی۔ ہر خواہش اپنے دامن میں کانٹے رکھتی ہے۔ اس لئے اس سے گریز کرنا ہی دوراندیشی ہے۔

یہ امر بھی نظر انداز نہ کیجئے گا کہ خواہش اگر سے وابستہ ہے۔ خواہش ہمارے دل سے اٹھتی ہے۔ اگر ہماری زبان سے ادا ہوتا ہے اور اس طرح دونوں ایک ہی مقصد کی طرف بڑھے چلتے ہیں۔

تصویر کے دوسرے رخ کا مطالعہ ذرا گہری نظر سے کیجئے۔

ظاہر ہوگا کہ اگر ہی ہماری بدبختیوں کے لئے ذمہ دار ہے۔ اگر ہی ہمارے لمحات کو ناشاد ساعتوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اور یہ اگر ہی ہماری کوششوں کو اپنی سپاہیوں سے ناکام بنا دیتا ہے۔ اگر ہم کو متواتر چوٹیں لگا رہا ہے اور ہم لڑھکتے ہوئے نہ معلوم کن پستیوں میں گر رہے ہیں۔

فلمی دنیا

فلم "صاحب کبیر" —— حاجی لق لق کی نظروں سے

یونٹی پروڈکشن کے مالک سیٹھ لاہوری رام تمام ہندوستان کی متعدد مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے "صاحب کبیر" جیسی پاکیزہ فلم بنا کر ملک بھر کے سر پر احسان کیا۔ فلم کیا ہے۔ اتحاد و اتفاق کا درس ہے۔ محبت و آشتی کی تلقین ہے۔ انسانی اخوت کی دعوت ہے۔ ہندو مسلم ملاپ کی تعلیم ہے۔

کبیر بنارس کے ایک مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ذات کے جولاہے تھے۔ لیکن بچپن ہی میں آپ کا دل و دماغ نور معرفت سے روشن ہو گیا۔ آپ کے متعلق بے شمار روایات مشہور ہیں۔ اور آپ کی زندگی بھی اس دور سے گزری جس سے پہلے آپ کے فلسفۂ اخوت کا مضحکہ اڑایا گیا۔ پھر کھلم کھلا مخالفت کی گئی۔ سماج نے اپنے روایتی تعصب سے کام لے کر آپ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ لیکن بالآخر حق کی فتح ہوئی اور آپ کا شمار ان برگزیدہ ہستیوں میں ہونے لگا جو مختلف زمانوں میں دنیا کیلئے شمع ہدایت بن کر آتی رہیں۔

فلم کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ایک غیر دلچسپ اور خشک داستان کو ایسی زینت سے پیش کیا گیا ہے۔ جو ایک رومانی افسانے سے کسی طرح بھی کم دلکش نہیں۔ عام فلموں کا سرمایۂ تفریح یہیں تک محدود رہتا ہے۔ کہ اس میں چند بازاری قسم کے گانے بھر دیئے۔ شراب خوری کے مناظر دکھا دیئے۔ مکالمے میں فحاشی داخل کر دی بھونڈے مذاق اور اخلاق باختہ "لطائف" شامل کر دیئے۔ ایک آدھ نیم برہنہ ناچ دکھا دیا۔ ہیرو اور ہیروئن کے معاشقے اور نغمہ سرائیاں پیش کر دیں۔ لیکن "صاحب کبیر" ان تمام فحاشیات سے یکسر پاک ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس درس بصیرت میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کبیر صاحب اور ان کی شاندار زندگی کے مختلف حقائق نہایت دلفریب انداز میں دکھائے گئے ہیں۔

کبیر جی کے دوہے اور گیت ایسے اثر ریز ہیں۔ کہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ وہ سین خصوصیت سے رقت انگیز ہے جبکہ آپ والدہ کے مرنے کے بعد دنیا کے دھندے چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی راہ لیتے ہیں۔ اور قدرتی مناظر میں اپنے دوہے گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:۔

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت رہا نہ کوئے

کون ہوگا۔ جس نے کبیر جی کا یہ دوہا نہ سنا ہو۔ لیکن ڈائرکٹر کی قابلیت داد کی مستحق ہے۔ کہ انہوں نے دوہے کے ہر ٹکڑے کے لئے بیک گراؤنڈ بنا کر دلچسپی پیدا کر دی۔ جونہی چکی کا لفظ کبیر جی کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ فوراً چلتی چکی کا نظارہ سامنے نظر آتا ہے۔ مکالمے صاف، سلیس اور عام فہم ہیں۔ اور اختصار کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ ریکارڈنگ بے عیب ہے اور عکاسی قابلِ تعریف۔

کبیر جی کی زندگی کے ہزارہا واقعات میں سے صرف وہ باتیں منتخب کی گئی ہیں۔ جو اپنے اندر روحانی اپیل رکھتی ہیں اور جنکی سحرکاری نے فلم کو بہت بلند معیار پر پہنچا دیا ہے۔ مسجد میں ملا وعظ کر رہے ہیں اور مندر میں پنڈت اُپدیش کر رہے ہیں۔ لیکن ان ملاؤں اور پنڈتوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ نوجوان کبیر کو بنارس سے نکلوا دیا جائے۔ جب وعظوں اور اپدیشوں سے کام نہیں بنتا تو یہ لوگ راجہ کے دربار میں فریادی بن کر جاتے ہیں۔ ملزم شاہی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے استغاثہ کی طرف سے ہنگامہ خیز تقریریں کی جاتی ہیں۔ اور سامعین کو یہ گمان گزرتا ہے کہ اب ملزم کی خیر نہیں۔ لیکن یہی وقت کبیر جی کی روحانی ظفرمندی کا ہے۔ وہ اپنی صفائی میں لفاظی سے کام نہیں لیتے بلکہ یہی کہتے ہیں کہ رام اور رحیم ایک ہیں۔ کرشن اور کریم ایک ہیں۔ یہ سیدھی سادھی باتیں راجہ کے دل میں تیر کی طرح لگتی ہیں اور راجہ کبیر جی کو دعوت دیتا ہے کہ کبھی کبھی دربار میں آ کر ہمیں اپنے کلام معرفت سے مستفیض فرمایا کریں۔ یہ سن کر ملا اور پنڈت خائب و خاسر گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔

واقعات کو نہایت خوبی سے (ایڈٹ (مرتب) کیا گیا ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر مستحق مبارکباد ہے۔

فلم کے ہیرو نے کبیر جی کا کردار پیش کرتے ہوئے [illegible]

[illegible] دکھائے ہیں۔ اور اصل ونقل کی حد فاصل کو مٹا دیا ہے۔ [illegible] کپ [illegible] لباس، وضع قطع اور لب ولہجہ تاریخی حقیقت کے عین مطابق ہے۔ بھگت جی کی ماں کا پارٹ کچھ کم اہم نہیں لیکن مہتاب نے ایک مشکل کردار کو قابل تعریف انداز میں سنبھالا ہے۔

کاسٹ میں جس بچے کو کبیر جی کا زمانۂ طفلی پیش کرنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا پارٹ دیکھ کر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایکٹر کی حیثیت سے اس کا مستقبل شاندار ہوگا۔ وہ سراپا روحانی پیکر بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کی میٹھی باتیں دل پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔

مظہر نے کبیر جی کے باپ کے روپ میں آکر ایک دفعہ پھر فن اداکاری کا شاندار مظاہرہ کیا ہے۔ فی الحقیقت یہ مشکل پارٹ تھا اور اس کے لئے ایک مظہر خاں کی ضرورت تھی۔ جوانی میں اس کا لب ولہجہ تنومند کا جوان کا تھا۔ لیکن بڑھاپے کے دور میں یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے اپنی کردار نگاری سے وہ فلم پر چھا جاتا ہے۔

ڈائرکٹر کی ہدایت کاری فلم کے ہر ایک اہم مرحلے پر نمایاں ہے۔ جولاہوں کی پنچایت کا سین دیکھ کر تماشائی سوچنے لگتا ہے۔ کہ کبیر جی کے زمانے کے اتنے جولاہے کس طرح ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنارس کے اصلی باشندے ہیں۔ جن کی بنی ہوئی بنارسی ساڑھیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اور عورت ذات کو کچھ کا کچھ بنا دیتی ہیں۔ لیکن ان کا پارٹ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سب کچھ ڈائرکٹر کی نظر انتخاب اور ایکٹروں کے فن کا مظاہرہ ہے۔

اس اتحاد پرور فلم کی ایک اور خوبی یہ ہے۔ کہ اس میں بھرتی کا کوئی سین نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ایک مربوط داستان کی کڑی ہے۔ ماں باپ نے اپنے لاڈلے بچے کے بیاہ کے لئے بڑے چاؤ سے زردوزی ٹوپی اور جوڑا تیار کیا تھا۔ ظاہر بین آنکھ اسے ایک بے معنی سی بات سمجھے گی۔ لیکن یہی جوڑا کبیر جی کی والدہ کے جنازے کو ڈھانپتا نظر آتا ہے۔ اور ایک نہایت اثر ریز سین کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پھر خیال ہوتا ہے کہ ٹوپی کا کیا بنے گا؟ یہی ٹوپی سفید ریش کبیر موت کے سائے میں زیب سر کرتا ہے۔ اور ایک کجکلاہ تاجدار کی طرح موت کو لبیک کہتا ہے۔ اس کی روحانی لغت میں موت ایک شادی سے عبارت ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی برات میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "آج میری شادی ہے۔" اس کا چہرہ ایک نئی شادمانی سے چمک اٹھتا ہے۔ غرضیکہ اس قسم کی بے شمار لطافتیں اس روحانی فلم میں پائی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں بہت کم ایسے فلم ہوں گے۔ جن میں کوئی رومان نہ ہو۔ اور وہ تماشائیوں کے دل ودماغ پر مسلط ہو جائے یہ ایک

شاندار، اتحاد پرور، دلفریب، تاریخی فلم جو روحانی حقائق سے معمور ہے "یہ فلم مبگھ کر کیلئے اس عنوان کو موزوں سمجھتا ہوں اور فلشا طاسینما کے منیجر اور دوسرے کارکنوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہوں کہ فلم کی ہنگامہ خیز کامیابی سے متاثر ہو کر انہیں تماشائیوں کے انبوہ کثیر سے نمٹنا پڑتا ہے۔

رائے صاحب

مجھے ایک دوست کی تحریک پر "رائے صاحب" دیکھنا پڑا۔ اور فلم کے خاتمہ پر میں اپنے دوست کی خوش ذوقی کی داد دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے یہ بلند بانگ دعوے کیا تھا کہ رتن بائی جس دلاویزی سے اس فلم میں گاتی ہے اس کی نظیر کسی دوسرے فلم میں نہیں ملتی۔ اگر اسے رتن بائی کے ایک "فین" کا مبالغہ آمیز بیان سمجھ لیا جائے تو بھی بلے تامل کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اداکاری اور موسیقی کا تعلق ہے اس فلم میں رتن بائی نے اپنا گذشتہ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ فلمی اصطلاح میں رائے صاحب کا شمار "الف" میں تو نہیں لیکن "ب" میں ضرور ہو سکتا ہے۔ یعنی غیر اصطلاحی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ رائے صاحب دوسرے درجہ کی اعلےٰ تصویروں میں سے ایک ہے۔

ایس۔ ایم یوسف نے ایک اچھی دلچسپ کہانی مرتب کی ہے جس میں وحید قریشی کی مکالمہ نگاری نے شگفتگی پیدا کر دی اور ان کی غزلوں اور گیتوں نے رتن بائی کی خوش گلوئی کے ذریعہ فلم کو کیف آور بنا دیا۔ رائے صاحب کے پارٹ میں جگدیش سیٹھی ایک دفعہ پھر خاص رنگ کا آرٹسٹ نظر آتا ہے۔ نیو تھیٹرز کو چھوڑنے کے بعد اس کے مداحوں کو یہ اندیشہ دامن گیر رہا۔ کہ وہ کلکتہ کے دیرینہ رفقائے کار کے دائرہ سے نکل کر بمبئی کی زرزدہ فلمی دنیا میں کہیں کھو نہ جائے لیکن آرٹ چھپا نہیں رہتا۔ بمبئی پہنچ کر اس نے تین تین چار چار فلموں میں ایک ساتھ کام کرنا شروع کر دیا لیکن ہر موقع پر اس کا مخصوص رنگ قائم رہا۔ رائے صاحب میں وہ مرکزی کیرکٹر ہے جسے اس نے نہایت نفاست سے نبھایا ہے۔

کوشلیا نے منورما لیلا اور شوبھا کا سہ گانہ اور رتلوک نے پرکاش اور رمیش کا دوگونہ پارٹ کمال خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ ایڈیٹر کا خاکہ اڑانے میں میرزا مشرف کامیاب رہے اور تھیٹریکل کمپنی کو خستگی سے بچانے کے لئے جوگی مشرف اور گوپی کی سازش مزاح کا اچھا نمونہ ہے۔

شاعری میں وہ عنصر نظر آتا ہے جسے طنزیہ طور پر پرو گیسو یا ترقی پسند کہتے ہیں مثلاً "کیوں چیخ اٹھی بجلی ..... چیخ اٹھی بجلی"

بتائیے جناب بجلی آخر اس غل غپاڑے کی وجہ۔

"اب من کی چیخیں سنتے سنتے جائے گی جوانی بہت بجلی۔"

اب معلوم ہو کہ یہ دل کی فریاد تھی۔ ورنہ چیخیں سن کر شاید ہمسائے گھر کا محاصرہ کر لیتے۔

خیر یہ تیرہ و تار رات کے بعد صبح ہوتی شو بھا، رمیش اور رائے صاحب تینوں یکجا ہوئے۔ رائے صاحب [illegible]

مختلف زاویہ ہائے نظر

شریمتی کملا دیوی چٹوپادھیا :-

بمبئی کے ایک فلمی معاصر سے دوران گفتگو میں شریمتی نے اپنی ابتدائی زندگی پر نظر بازگشت ڈالتے ہوئے کہا۔ کہ "میں سٹیج کی دلدادہ تھی اور سماج آرٹ اور آرٹسٹ کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ لوگوں نے میری مخالفت کی۔ لوگ تو ایک طرف، میرے اپنے خاندان کے افراد نے مجھے حقارت سے دیکھا۔ لیکن میں اپنے عزم پر قائم رہی۔ آخر تعصب کی دیواریں ٹوٹ گئیں اور اب زیادہ سے زیادہ عورتیں سٹیج اور سکرین پر آ رہی ہیں۔"

اس سوال کے جواب میں کہ آخر وہ کونسی چیز تھی جو آپ کو سٹیج کی طرف کشاں کشاں لے گئی۔ آپ نے کہا۔ کہ سٹیج! میں بلے اختیار اس کی جانب کھنچی چلی گئی۔ دل میں جذبۂ اشتیاق زوروں پر تھا۔ آرٹ کی جو روح مجھ میں کارفرما تھی۔ میں اس کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔ سکول میں اس کے لئے مجھے موقع مل چکا تھا۔ لیکن میری خواہش تھی۔ کہ زندگی میں داخل ہونے کے بعد میں سنجیدگی سے اپنے آرٹ کو ترقی دوں۔

سٹیج اور سکرین کا معاملہ

اخباری نمائندہ نے ایک بہت دلچسپ سوال پوچھا۔ کیا ہندوستان میں سٹیج کے لئے ترقی کے امکان ہیں۔ کیا فلموں نے تھیٹر پر مخالفانہ اثر نہیں ڈالا۔ شریمتی کملا دیوی نے کہا۔ کہ سٹیج کے لئے ترقی کے امکانات غیر محدود ہیں۔ سٹیج ہماری قومی کلچر کا لازمی جزو ہونا چاہیئے۔ قومی تعمیر میں اسے ایک اونچا درجہ دینا چاہیئے۔ آئرلینڈ کی تحریک آزادی میں سٹیج کو اہم دخل تھا۔ اور اب چین میں تو حکومت نے قومی اور سوشل بیداری کے لئے وسیع پیمانہ پر ڈراموں سے کام لینا شروع کیا ہے۔ کیا سٹیج سینما کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ سٹیج کی حیثیت جداگانہ ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سٹیج صرف زندہ ہی نہیں بلکہ زور شور سے زندہ ہے۔ تھیٹریکل ڈراموں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ ہفتوں پیشتر اپنی نشست ریزرو کرا لیتے ہیں۔ سینما اس معاملہ میں سٹیج کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ڈرامہ کے نشوونما کے لئے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔

وسنت بیلنا اور بھرے موتی میں پارٹ

[illegible] تھا - ابھی پورے شباب پر آیا تھا کہ سینما نے اس پر دھاوا [illegible] کی تاب نہ لا سکا - ایک ارزاں ذریعۂ تفریح نے گرانقدر [illegible] دھکیل دیا - اس کے باوجود یاد رہے کہ ہندوستانی سینما کو [illegible] تک جو فروغ ہوا ہے - وہ اس کے لئے سیٹیج کا مرہون منت [illegible] آپ نے کہا - کہ میں نے خود بھونانی کی وسنت سینا اور بعد کو بکھرے [illegible] میں پارٹ کیا تھا - لیکن دونوں کا ٹیکنیک علیحدہ ہے - جذباتی طور میں سینما کو اپنا نہ سکی -

مہاتما گاندھی کی مخالفت کا جواب

"شہباز" کے گذشتہ شمارہ میں سینما کے متعلق مہاتما گاندھی کی رائے قارئین کرام کی نظروں سے گذر چکی ہے - مسز کملا دیوی چٹو پادھیا سے استصواب رائے کیا گیا - تو آپ نے گاندھی جی کی رائے کو برحق قرار دیا - آپ نے کہا کہ ہر انصاف پسند سینما کی موجودہ حالت سے بیزار ہے - "ہمارے فلم حقیقت سے اسقدر دُور وقعیت سے اسقدر بیگانہ اور ہندوستانیوں کی آرزوؤں تمناؤں اور کشاکش مقاصد سے اتنے بے نیاز ہیں کہ وہ اول سے آخر تک ہالی وُوڈ کی نقالی کا پیکر بن گئے ہیں - ضرورت اس بات کی ہے کہ رائے عامہ کو صحیح راہ پر لایا جائے -

"آپ کو کس قسم کے فلم پسند ہیں؟" آپ نے کمال رجستگی سے اس سوال کا جواب دیا -

"میں ایسے فلم دیکھنے کی تمنائی ہوں - جن میں زندگی کی لہر موجزن ہو - مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ وہ المیہ ہوں یا مزاحیہ - وہ بہرحال دلچسپ ہوں -"

مسز چٹو پادھیا حال میں امریکہ جاپان اور چین کے دورہ سے واپس آئی ہیں - جاپانی فلموں کے متعلق آپ نے کہا کہ تاریخی واقعات کی بنا پر جو فلم جاپان میں دکھائے جاتے ہیں - وہ تو جاپانی قومیت کے اعتبار سے گوارہ ہیں - لیکن کامک فلم مذاق سلیم سے عاری ہیں - چین کی نئی روح چینی فلموں میں آشکارا ہے - حکومت چین نے تصویروں کے ذریعہ لوگوں کو تعلیم دینے میں روس کی کامیاب تقلید کی ہے - گو چینی فلم ٹیکنیک کے اعتبار سے روسی سینما کا مقابلہ نہیں کر سکتے -

[illegible] کوبرٹ

[illegible] "بیچارے افلاس زدہ اخباری رپورٹر [illegible] کلاڈٹ کوبرٹ سے پوچھا - [illegible] مشکل ہو جاتا ہوگا جبکہ ملکۂ مصر [illegible] تو آپ نے پہلے تو ایک

قہقہہ لگایا - اور پھر کہا: "فی الحقیقت بڑی مشکل سے گذارہ کر رہی ہوں؟"

کلاڈٹ کوبرٹ فرانسیسی عورت ہے - اور فرانس کی زیرک اور کفایت شعار عورتوں کی طرح کاروباری اور گھریلو انتظام میں اسے خاص سلیقہ حاصل ہے - اس نے ازراہِ تشریح کہا کہ ۷۵ ہزار پونڈ میں سے ۴۲۴۸۶ پونڈ مجھے انکم ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے - ۷۵۴۹ پونڈ میرا ایجنٹ جو میرا بھائی ہے لے جاتا ہے - ۲ ہزار پونڈ میرے ملازموں کی تنخواہ ہے - میرے دو سیکرٹری ہیں - - - - - - - - - - -

- - - دو مالی ایک ٹہلوا ایک شوفر ایک باورچی اور دو لوکرانیاں - امریکہ میں گھریلو خادموں کی تنخواہ ۳ سے لیکر ۶ پونڈ فی ہفتہ سے کم نہیں - ان مصارف سے قطع نظر ۵ سو پونڈ سالانہ موٹر کاروں پر صرف ہوتا ہے

کلاڈٹ کوبرٹ نے کہا کہ خرچ نکال کر میرے پاس صرف ۲۰ ہزار پونڈ رہ جاتے ہیں - کلاڈٹ کوبرٹ کی ماں اور ماموں اور پھر ماموں کے لڑکے اور لڑکیاں فرانس میں ہیں - ان سب کا خرچ اس کے ذمے ہے - اس نے کہا مجھے ہر سال نئی موٹر کار خریدنا پڑتی ہے - اور ہالی ووڈ میں اعلےٰ مجلسی حیثیت کا تقاضا ہے کہ وہ ہر سال نیا سمور کا کوٹ خریدے - جسے وہ نئے فلموں کی افتتاحی تقریب پر پہنتی ہے - اس کے معمولی لباس کی قیمت ۴۰ پونڈ سے کم نہیں -

امریکن اداکاروں کے کثیر معاوضے محض ان کی فنی قابلیت یا شہرت پر موقوف نہیں - تجربہ شاہد ہے - کہ بعض اعلیٰ درجہ کے فلم آمدنی کے لحاظ سے ناکام رہتے ہیں - اور اکثر اوقات متوسط معیار کے فلموں کی آمدنی خلاف توقع بڑھ جاتی ہے - ایسے فلموں کے اداکار آئندہ پروگرام کے لئے منہ مانگی تنخواہ لے سکتے ہیں اور لیتے ہیں -

مس سوشیلا لمبیا ایم - اے

مس موصوفہ نے ستمبر کے فلم انڈیا کے ذریعہ "دھارمک" فلموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے - وہ فلم سازوں سے اپیل کرتی ہیں کہ از برائے خدا دیوتاؤں کو سنگھاسن پر براجمان رہنے دو - انہیں تنگ نہ کرو - "میں بچپن میں دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتی تھی - لیکن جب سے میں نے انہیں فلموں میں دیکھا ہے - میرے دل سے ان کی عقیدت اُٹھ گئی ہے - میں انہیں برتر از وہم و گمان روحانی ہستیاں سمجھتی تھی - لیکن فلم سازوں نے انہیں ایسے روپ میں پیش کیا ہے - جس میں تقدس کا شائبہ تک نہیں - پردۂ سیمیں پر ہمیں ایسے دیوتا دکھائے جاتے جو بے طرح لحیم و شحیم ہوں - جن کے پیٹ بڑھے ہوئے ہوں بعض مچھلی کی طرح لاغر ہیں - بعض دراز قد معلوم ہوتے ہیں اور بعض بالشتئے - بعض دیوتاؤں کی داڑھی ناف تک پہنچتی ہے -

اور بعض "فارغ البال" ہیں۔ ان باریش اور بے ریش دیوتاؤں میں ایک قدر مشترک یہ ہے۔ کہ ان سب کے دانت شکستہ اور میلے ہیں یں پوچھتی ہوں۔ کہ دیوتاؤں کی کھوپری میں کوئی دندان ساز نہیں ہے۔ مہرشی نارد کو کبھی داڑھی مونچھوں کے ساتھ اور کبھی ان کے بغیر پیش کیا جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ہاں آرٹ کے واسطے ایک ایسے شخص کو چنتے ہیں۔ جو گھانا جانتا ہو لیں۔ پرماتمانے انسان کو اپنے روپ میں جنم دیا ہے۔ لیکن ہم جن دیوتاؤں کو فلموں میں دیکھتے ہیں۔ انہیں اس روپ سے کوئی واسطہ نہیں۔ بعض دیوتاؤں کی شکلیں تو بالکل انڈے کی طرح صاف ہیں۔ اور یہ ساری حماقتیں آرٹ کے نام پر کی جاتی ہیں۔

ناظر بی۔اے



نقد و نظر

شیخ و برہمن

ڈاکٹر اعظم کریوی کے سولہ افسانوں کا ایک دلپذیر مجموعہ شیخ و برہمن کے معنی خیز عنوان سے منظر عام پر آیا ہے۔ اسی عنوان کے افتتاحیہ افسانہ میں شیخ منیر اور پنڈت دیاشنکر کے برادرانہ تعلقات سے پریما کے فلم پجاری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس میں ٹھاکر اور مرزا کی دوستی نے گاؤں والوں کو باہم نفاق کے امن سوز شعلوں سے بچا لیا تھا۔ موضع کچھنا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زندگی کے حالات ڈاکٹر اعظم نے بدرجۂ کمال نفسیاتی اور فنی خوبیوں سے ایک بصیرت افروز کہانی کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ اس مجموعہ میں جو افسانے ہندو معاشرت سے متعلق ہیں ان کا لائق تحسین پہلو ہندو سماج کا گہرا مطالعہ ہے۔ ہندوانہ رسم و رواج ہندو ناری کی سماجی حیثیت اس کے جذبات مشترکہ خاندان میں نابالغ خاوند اور بہو کی بیچارگی و بے لبسی ساس اور خسر کا صبر آزما حد تک ستمرانہ سلوک اور بیشتر حالتوں میں اس سلوک کا ردِ عمل غرضیکہ فاضل مصنف نے ہندوؤں کے سوشل نظام پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے تیز اور بعض موقعوں پر خیرہ کن روشنی ڈالی ہے۔ "مایا" میں لکھتے ہیں :-

"رات کو بھی رادھا اپنی بہو کو اپنے پاس سلاتی تھی۔ جیسے کوئی لالچی مالی گنے کا رس خوب چوس چوس کر پیئے اور بچے دور سے دیکھ کر للچائے۔ یہی حال بسنت کا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیوی کا رس گرہستی (گرہست ؟) کی چکی میں پس پس کر مٹی میں ملایا جا رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

آخر ہولیوں کا کیف زا اور توبہ شکن موسم آیا۔ اور بسنت کو یارائے صبر نہ رہا ۔۔ ڈاکٹر اعظم کے ان افسانوں میں مقامی رنگ نہایت خوشی اور صحت کے ساتھ چمکتا ہے۔ کوئی کہانی ایسی نہیں جس کا کوئی پہلو توجہ کش نہ ہو۔ کسی میں سبق آموزی ہے۔ کسی میں دلچسپی۔ کسی میں یہ دونوں عناصر بہترین تناسب کے ساتھ شامل ہیں۔ ہیرو قیدی کی داستان ازبس دردناک ہے۔ ... کا پریم" ایک محبت زدہ نوجوان فقیر کا دلفریب اسکیچ ہے ... اونچی ذات کے ہندوؤں کی ناقابل برداشت ... داراب شاہ نے اپنی منہ بولی بیٹی رکھی ہے جو آخر کو "شریف ڈاکو" کے لقب کا سزاوار ہے۔ ساس اور بہو کے روائتی جھگڑے "پوجا" میں مضمر ہیں۔ "قربانی" پولیس والوں کی غاصبانہ دستبرد کی رُلا دینے والی کہانی ہے۔ "پریم کی پیاسی" کا پس منظر اوّل سے آخر تک شہری ہے۔ اور ایک منطق زدہ پروفیسر کی کایا پلٹ کا نفسیاتی مطالعہ۔ اسی طرح ایک اور شہری افسانہ "عہد داری" میں ہیرا طوائف کی شرمناک زندگی کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ایک حد تک رومانی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "یتیم" بعض یتیم خانوں کا عبرت اندوز مرقع ہے۔ ڈاکٹر اعظم کریوی کے آرٹ کی امتیازی خصوصیت اس کی "واقعیت" ہے۔ اور واقعیت کی حدود میں وہ اپنی فنی قابلیت کو وسیع عمیق یا بلند پیمانہ پر بروئے کار نہیں لا سکے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے افسانوں کی دلچسپی اور سبق آموزی سطحی ہے اور بس۔ ان کے کردار ہندوستان کی دیہاتی دنیا کے باسی ہیں۔ اس دنیا کی تصویر تو ڈاکٹر اعظم نے قابلِ تعریف صحت و صفائی سے کھینچی ہے۔ لیکن اسے تخیل کی رنگینی سے مزین نہیں کیا۔ شیخ منیر، دیاشنکر، بسنت کمار، پاروتی مایا، حمیدہ، ظفر علی، عنایت، پیارے لال۔ محمود، صفدر علی، کوشلیا، منوہر بالو کشوری رانی، خانصاحب دلدار علی۔ ٹھاکر نہال سنگھ دیوان جی، بسنت رام سکھیا، کرپا رام، ہیرا، اقبال، سریندر، چمپا، داروغہ عباس علی، رحمت، شنکر، اجیار بیروا اور رودیا تنگنائے دہر میں چلتے پھرتے بلکہ رینگتے نظر آتے ہیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کے مظہر نہیں۔ ان کے جذبات محدود ماحول سے اوپر نہیں اٹھتے ۔ ڈاکٹر اعظم کریوی اور پریم چند میں یہی بنیادی فرق ہے۔ پریم چند کے اکثر کیرکٹر عالمگیر نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں۔ ان کے تخیل کی روشنی نے بھارت کے شیخ و برہمن اور دہقان کو ہندستانی سے بالاتر انسانی روپ میں بے نقاب کر دیا ہے۔ اور دیہات کی خشک دنیا میں رومانیت پیدا کر دی ہے۔ "شیخ و برہمن" ۲۱۸ صفحوں پر محیط ہے۔ کتب خانہ دانش محل امین آباد پارک لکھنؤ سے دو روپیہ میں حاصل کیجئے۔

متین کے سو شعر :- یہ چھوٹی سی ارمغانی کتاب مولانا متین مچھلی شہری کے سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ جس کو سید سعدی جعفری نے مرتب کیا ہے اور مکتبہ ادب الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ شروع میں بطور دیباچہ حضرت سائل دہلوی کا ایک مضمون ہے۔ اس کے بعد دو مضامین اور ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب اچھے ہیں۔ قیمت کا علم نہیں۔ البتہ مکتبہ ادب۔ فاطمہ اسٹیٹ پریاگ الہ آباد یو پی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

ویسٹرن انڈیا لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ویسٹرن انڈیا لائف انشورنس کمپنی کی ۲۸ویں سالانہ رپورٹ ہمارے سامنے ہے۔ یہ رپورٹ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ختم ہونے والے سال کے لئے ہے۔ استحکام اور مضبوطی کے لحاظ سے کمپنی کا شمار پہلے سے ہی صفِ اول کی کمپنیوں میں ہونے لگا ہے۔ اور شروع سے ہی یہ اپنے پالیسی ہولڈروں میں معقول منافع تقسیم کر رہی ہے۔ رپورٹ مظہر ہے کہ سال زیر رپورٹ میں کمپنی نے ۴۹۱۳۱۷۸۶ روپے کا نیا بزنس مکمل کیا ہے۔ یعنی ۱۹۴۰ء کے مقابلہ میں دو لاکھ سے زیادہ بزنس کی زیادتی ہوئی۔ اس عرصہ کے اندر کمپنی کو پریمیم کی آمدنی ۲۵۹۳۱۸۲ روپے کی ہوئی۔ ۵۵۸۰۵۱ روپے دیگر ذرائع سے آمدنی ہوئی۔ اخراجات وغیرہ پورے کر چکنے کے بعد لائف فنڈ میں ۱۶۸۱۹۳۳ روپے کا اضافہ ہوا۔ یعنی سال کے اختتام پر لائف فنڈ ۱۳۱۶۴۷۴۴۱۴ روپے ہے۔ جنگ کی غیر یقینی صورتِ حالات کے باوجود یہ کارگذاری قطعاً تسلی بخش ہے۔

کمپنی کی انویسٹمنٹوں کی پوزیشن بھی بیحد تسلی بخش ہے۔ انویسٹمنٹوں کی قیمت خرید بیلنس شیٹ کے مطابق ۱۳۳۳۱۹۱۹ روپے ہے۔ لیکن مارکیٹ ویلیو ۱۴۰۳۹۰۵۱ روپے ہے۔ یہ بھی کمپنی کی مستحکم پوزیشن کی مظہر ہے۔ کمپنی کی سود کی اوسط یافت ۳ء۹۹ فیصدی رہی ہے۔ جو گذشتہ سال (۱۹۴۰ء) کے مقابلہ میں معمولی کم ہے لیکن حالات موجودہ میں یہ کمی ناگزیر تھی۔ یہ امر بھی خاص طور پر قابلِ تحسین ہے کہ جہاں آمدنی اور بزنس میں اضافہ ہوا ہے تناسب اخراجات میں کمی ہوئی ہے۔ تناسب اخراجات جو گذشتہ سال ۲۳۰۵۱ فیصدی تھا۔ اب کے سال ۲۱۰۴۱ فیصدی ہے۔ یہ کمپنی کے منتظمان کی کفایت شعارانہ پالیسی کی بین دلیل ہے۔ پھر اس امر واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تناسب کالعدمی میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں کمی ہوئی ہے۔ اور کلیم کا تجربہ بھی حسبِ سابق تسلی بخش ہے۔

غرضیکہ کمپنی ہر پہلو سے تسلی بخش ترقی کر رہی ہے۔ کمپنی کے چیئرمین نے جو ایڈریس سالانہ حسابات حصہ داران کے سامنے رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ اس میں لاہور برانچ کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یعنی

"اپنی پالیسی کی تقلید میں کمپنی نے لاہور میں برانچ آفس کھول دیا تھا اور اپنے سابق چیف آرگنائیزر مسٹر بے چند جین ایم اے کو ان کی گذشتہ قابل قدر خدمات کے پیش نظر کمپنی کے مستقل عملہ میں شامل کرتے ہوئے انہیں لاہور کا برانچ مینیجر مقرر کیا تھا یہ انتظام اس توقع کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اچھے نتائج برآمد ہوں گے اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اس سال پنجاب برانچ کے بزنس میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے"

روبی جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

یہ کمپنی زندگی کا۔ آگ کا اور دیگر متفرق بیمہ جات کرتی ہے کمپنی نے سال مختتمہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء میں بیمہ زندگی کے شعبہ میں ۵۲۷۲۷۶۹ روپے کا نیا بزنس حاصل کیا تھا۔ اس عرصہ میں پریمیم کی آمدنی ۴۰۵۸۱۸ تھی۔ لائف فنڈ ۱۴۷۰۳۵ روپے ہے اور ایک لاکھ کی وہ رقم جو اس مقصد کیلئے لمیٹڈ کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ہے فائر ڈیپارٹمنٹ میں سال زیر ریویو میں پریمیم کی آمدنی خالص ۲۰۵۷۴۸ روپے ہوئی جو کہ سال گذشتہ کے مقابلہ زائد از ۳ لاکھ روپیہ زیادہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں کمپنی نے ۱۲۸۰۶۴ روپے کے کلیم ادا کئے۔ گویا نقصان کا تناسب ۱۱٫۵ فیصدی ہے ۱۹۴۱ء کے آخر پر کمپنی کا فائر انشورنس فنڈ ۱۰۳۵۹ روپے ہے۔ بیمہ کے دوسرے شعبہ جات مثلاً موٹر حادثات [illegible] بیمہ میں کمپنی اعداد [illegible] ہیں۔ دراصل مسٹر جی۔ ایم برلا کا [illegible] کے استحکام [illegible] کمپنی کی خوش قسمتی [illegible] فنس [illegible] کا رکن بھی ایسے [illegible] میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں یعنی بیمہ زندگی کے شعبہ [illegible] اور

[illegible] ترقی [illegible] کو برقرار رکھا ہے تو ہم شاندار [illegible] کمپنی کے [illegible] کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

جیوپیٹر جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہیڈ آفس بمبئی

جس کا شمار ہندوستان کی بڑی بڑی کمپاؤنڈ بیمہ کمپنیوں میں ہوتا ہے ۱۹۴۱ء سے اس کے لائف ڈیپارٹمنٹ نے شاندار ترقی کی ہے۔ حالانکہ ملکی حالات بیمہ زندگی کے لئے سازگار نہ تھے۔ ۱۹۴۱ء میں اس نے ۱۹۴۰ء کے مقابلہ پر ۱۱۰ فی صدی زائد بزنس کیا ہے جس سے پبلک اعتماد ظاہر ہے۔ قابل قدر اور بکفایت انتظامات کی وجہ سے کمپنی کا لائف فنڈ بہت بڑھ گیا ہے

ہیڈ آفس میں کمپنی کا انتظام و انصرام مسٹر ای۔ ایس جول کے ہاتھوں میں ہے جو دنیائے بیمہ میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور پنجاب برانچ میں مسٹر آر۔ این شرما برانچ مینجر ہیں۔ جن کی کاوشوں سے پنجاب سے گذشتہ سالوں کی نسبت چار گنا زاید بزنس کیا گیا۔